٥

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفسیر ابنِ کثیر

تالیف

مفسرِ قرآن حضرت امام حافظ عماد الدین ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

علامہ محمد اکرم الازہری، علامہ محمد سعید الازہری

علامہ محمد الطاف حسین الازہری

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور کراچی پاکستان

نام کتاب	تفسیر ابن کثیر جلد اول
مفسر	حضرت امام حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	علامہ محمد اکرم الازہری، علامہ محمد سعید الازہری
	علامہ محمد الطاف حسین الازہری
	من علماء دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف
زیر نگرانی	قاری اشفاق احمد خان، محمد انور سعید
اشاعت	اپریل 2004ء
تعداد	ایک ہزار
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
کمپیوٹر کوڈ	1Z385

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔فون: 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: 7225085-7247350

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-2212011-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- zquran@brain.net.pk

ھدیہ : ۱۵۵۰ روپے

پندرہ سو پچاس روپے

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

حضور ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم محمدیہ غوثیہ کی صورت میں جو باغ لگایا تھا اور خون جگر سے جس کی آبیاری کی تھی اب وہ پھل پھول رہا ہے آپ نے اس کے متعلق جو خواب دیکھے تھے اب وہ حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں۔ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خواہش تھی کہ تصنیف و تالیف کا ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس کے اراکین ایسی علمی کاوشیں پیش کریں جو ایک طرف اسلاف کے علمی ورثہ سے ملت کے افراد کا ربط پیدا کریں اور دوسری طرف موجودہ دور کے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں امت مسلمہ کی راہنمائی کریں۔

چونکہ کسی بھی مقصد تک دفعۃً نہیں پہنچا جا سکتا بلکہ منزل آشنا ہونے کے لئے طویل عرصہ تک کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے چنانچہ سب سے پہلے افرادی قوت کی تیاری کے لئے تمام تر کاوشیں بروئے کار لائی گئیں اور اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ ایسے افراد تیار ہوں جو نہ صرف جدید و قدیم علوم پر دسترس کے حامل ہوں بلکہ زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر مسائل کا ادراک اور ان کا تدارک کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں نیز علمی و تحقیقی اسلوب کو اپناتے ہوئے اسلام کے آفاقی پیغام کے ابلاغ کی استعداد سے مالا مال ہوں۔

اللہ رب العزت کے فضل و کرم اور نبی مکرم ﷺ کی رأفت و رحمت کے تصدق دار العلوم محمدیہ غوثیہ مطلوبہ افراد کی معقول تعداد تیار کر چکا ہے۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کی دیرینہ خواہش کے مطابق امت مسلمہ کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا جائے۔ وقت کے اس اہم ترین تقاضے کے پیش نظر حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید جناب پیر محمد امین الحسنات شاہ صاحب پرنسپل دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کی سربراہی میں ادارہ ضیاء المصنفین کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

زیر نظر تفسیر ابن کثیر جو کہ محقق زمانہ شہرہ آفاق عالم دین ابو الفداء حافظ علامہ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف پرلطیف ہے کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ جو کہ اصل عربی کتاب کے عین مطابق چار جلدوں میں دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ کے فضلاء علامہ محمد اکرم الازہری، علامہ محمد سعید الازہری، علامہ محمد الطاف حسین الازہری نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے کیا ہے اور آپ تک پہنچانے کی سعادت ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور حاصل کر رہا ہے۔

اللہ کریم اپنے پیارے محبوب حضور نبی کریم ﷺ کا صدقہ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے۔ اور ہر خاص و عام کے لئے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

طالب دعا

محمد حفیظ البرکات شاہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله رب العالمین والعاقبة للمتقین۔ والصلوٰة والسلام علی سیدالانبیاء والمرسلین وعلی آله الطیبین وعلی اصحابه المکرمین

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ظاہری زندگی کو سنوارنے کیلئے، زندگی کا رشتہ برقرار رکھنے اور اس دنیا کو آباد کرنے کیلئے انسان کو ہر قسم کے وسائل، ذرائع اور صلاحیتیں بہم پہنچائی ہیں، اسی طرح اس کے باطن کو آراستہ کرنے، اس کے دل میں معرفت کا چراغ روشن کرنے اور اسے توحید کا سبق از بر کرانے کیلئے اپنے جلیل القدر پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ ان عظیم ہستیوں کی جلالت وعظمت اور ان کی نبوت کی صداقت و حقانیت ظاہر کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے معجزات سے نوازا جن کے سامنے لوگ دم بخود، عاجز اور لاجواب ہوگئے۔ ہدایت کا یہ کارواں پیہم محو سفر رہا لیکن قائد بدلتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اس کاروان کی ابدی قیادت اپنے سب سے آخری اور محبوب رسول حضرت محمد ﷺ کے سپرد کر دی اور بھٹکی ہوئی منتشر انسانیت کو راہ راست پر لانے اور اس کی شیرازہ بندی کرنے کیلئے آپ ﷺ کو ایسا صحیفۂ انقلاب مرحمت فرمایا جس کی ایک ایک آیت گم کردہ راہ انسان کی کایا کو پلٹ دینے کیلئے کافی ہے، جس کا ایک ایک لفظ رحمت خداوندی کا مظہر ہے اور جس کی تعلیمات ایسی سدابہار ہیں جنہیں خزاں کے جھونکے پژمردہ نہیں کر سکتے۔

اعجاز قرآن

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کو ان گنت کمالات اور معجزات سے نوازا لیکن ان میں سے قرآن کریم سب سے زیادہ کامل، جامع اور ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے۔ اس میں ایسی جاذبیت، کشش اور تاثیر ہے جس نے عربوں کے دلوں کو موہ لیا، یہ فصاحت و بلاغت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایسا سمندر ہے جس کے سامنے فصحائے عرب پسپا ہوگئے۔ شعر و سخن کے امام ادراک ہی نہ کر سکتے تھے کہ یہ کیسا کلام ہے۔ بالآخر وہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔ لبید زمانہ جاہلیت کا بہت بڑا شاعر تھا، اسلام لانے کے بعد انہوں نے شعر گوئی ترک کر دی۔ لوگ بہت متعجب ہوئے انہوں نے ترک شعر کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے: ''أَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟'' یعنی کیا نزول قرآن کے بعد بھی کوئی گنجائش باقی ہے؟ قرآنی فصاحت و بلاغت کے سامنے سرافگندی کا یہ اعتراف اس عظیم شاعر کی طرف سے ہے جو اپنے زمانے میں فصاحت و بلاغت کا امام تھا، گویا عرب کے سب متکبر قادر الکلام شعراء اور خطباء نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اس اعجاز کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ قرآن کریم نے اپنی حقانیت اور صاحب قرآن کی صداقت ثابت کرنے کیلئے انہیں چیلنج دیا کہ اگر تمہیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو اس جیسا لا کے دکھاؤ لیکن باوجود اپنی ذہانت وفطانت اور فصاحت و بلاغت کے وہ اس چیلنج کے سامنے مبہوت ہوگئے لیکن اپنی ہٹ دھرمی، تعصب اور ضد کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ پھر بھی ان کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ کلام کسی بشر کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ عتبہ بن ربیعہ، حضور ﷺ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے حاضر خدمت ہوا، متعدد چیزوں کی پیشکش کی اور دنیاوی مال ومتاع کا لالچ دیا اس کے جواب میں آپ ﷺ نے سورۂ حم سجدہ کی ابتدائی تیرہ آیات تلاوت کیں۔ اس تلاوت سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر کہنے لگا: والله لقد سمعت قولا ما سمعت بمثله قط، والله ماهو بالشعر ولا بالسحر ولا الکهانة فوالله لیکونن لقوله الذی سمعت بناء۔'' بخدا! میں نے ایسا قول سنا ہے جس کی مثل آج تک کوئی قول نہیں سنا۔ نہ وہ شعر ہے، نہ جادو اور نہ وہ کہانت ہے۔ بخدا! اس کلام کا بہت بڑا نتیجہ ظاہر ہوگا۔'' ایک اور مشرک، امام فصاحت و بلاغت ولید

بن مغیرہ نے جب حضور علیہ السلام سے تلاوت سنی تو اس پر سناٹا طاری ہو گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا: واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اعلاہ لمثرۃ وان اسفلہ لمغدق وما یقول ھذا بشر۔ انہ لیعلو ولا یعلی علیہ وانہ لیحطم ما تحتہ۔" خدا کی قسم! اس میں تو مٹھاس ہے، اس کا ظاہر چمکدار ہے، اس کا بالائی حصہ پھلوں سے لدا ہے اور زیریں حصہ شاداب اور کوئی انسان ایسا قول نہیں کہہ سکتا یہ ہمیشہ سر بلند رہے گا۔ اس پر کوئی بلند نہیں ہو سکتا اور جو اس کے مقابلہ میں آئے وہ اسے پیس کر رکھ دیتا ہے۔"

آخر قرآن پاک کے اندر وہ کون سا سحر تھا جس نے پوری قوم کو عاجز اور درماندہ کر دیا اور ان کی ادبی بساط کو لپیٹ کر اپنے ادب عالی کا سکہ بٹھا دیا؟ قرآن کریم کی وجوہ اعجاز تو بہت سی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ ایجاز، فصاحت و بلاغت، اثر آفرینی، امور غیبیہ پر آگاہی، سابقہ قوموں کے واقعات، ہیبت وجلال، موزونیت، مقصدیت، امرو نہی، وعدہ و وعید، عبارت کی دلکشی و زیبائی، علوم و معارف کا یہ بحر ذخار ان سب وجوہ کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ ان سب خصوصیات نے عرب ادباء کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا لیکن سب سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان کا کلام بھی انہی حروف سے تشکیل پاتا تھا جن حروف سے قرآن کریم ترکیب پاتا ہے۔ بظاہر حروف وہی ہیں لیکن انہیں موقعہ کی مناسبت سے تشکیل دینا پھر ہر کلمہ کو موزوں مقام پر رکھنا اور حالات کے تقاضا کے مطابق کلام کرنا بہت دقت طلب اور مشکل کام ہے۔ نظم کلام، کلام کا ایسا جوہر ہے جس کے بغیر عمدہ اور شستہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ بالا وجوہ کے علاوہ نظم قرآنی بھی ایک ایسا اعجاز ہے جس نے فصحاء و بلغاء کے دلوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ قرآن کریم سے پہلے وہ کسی منظم اور مربوط کتاب سے آشنا ہی نہ تھے۔ قرآن کی سورتوں اور آیتوں کے درمیان باہمی ربط و تعلق اور مناسبت و موافقت ہے۔ اسی لئے ترتیب نزول کو ترک کر کے موجودہ ترتیب اختیار کی گئی۔ اسی کلام معجز نظام کے ذریعے حضور آقائے دو عالم علیہ السلام نے کفار و مشرکین کے قلوب و اذہان کو بدل ڈالا، اسی معجزہ کی قوت سے درشت مزاج عربوں کے دلوں کو مسخر کیا اور ان میں ہدایت کی قندیلیں فروزاں کیں، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں، انسانیت کے خفتہ بخت کو بیدار کیا، ان کے اخلاق و عادات اور طبیعتوں میں توازن قائم کیا، توحید کا بھولا ہوا سبق از بر کروایا اور انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہی بخشی۔ تڑپتی اور سسکتی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا اور تکریم انسانی کا درس دے کر ہر شخص کو اس کے حقوق عطا فرمائے اور ظلم و بربریت اور استیصال سے بچا لیا۔ قرآن کریم ایسا دستور حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں کامل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ ایسا عالمگیر پیغام ہدایت ہے جو رنگ و نسل اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے ہر زمانہ اور ہر قوم کے افراد اس کے یکساں مخاطب ہیں۔ قرآن کریم کتاب ہدایت بھی ہے اور علم و معرفت کا چراغ بھی۔ اس کا اصل مقصد بگڑے ہوئے انسان کو سنوارنا اور اسے باعزت مقام عطا کرنا اور حرص و ہوا کے غبار سے آئینہ دل صاف کر کے اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کی جلوہ گاہ بنانا ہے تاکہ خود فراموش انسان نہ صرف خود شناس بلکہ خدا شناس بھی بن جائے۔

قرآن فہمی کیلئے ضروری لوازمات

قرآن پاک چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا، اس لئے قرآنی لطائف و دقائق کا ادراک کرنے کیلئے اس زبان پر کامل دسترس ضروری ہے۔ اس زبان کے اسالیب، قواعد، اسرار و رموز اور خصائص میں ملکہ اور ذوق حاصل کئے بغیر قرآن کریم کی لطافتوں، نزاکتوں، اشارات و تلمیحات اور تعریضات و کنایات کو سمجھنا نہایت دشوار ہے کیونکہ قرآن کریم عام ادب نہیں بلکہ سارے عربی ادب کا سرتاج ہے اور عربیت کے جملہ آثار سے زیادہ عظیم الشان اور قابل وثوق ہے۔ قرآن فہمی کیلئے جہاں متعدد خادم علوم میں مہارت کا حصول ضروری ہے، وہاں اس

ماحول کا مطالعہ بھی لازم ہے جس میں یہ سرچشمہ ہدایت نازل ہوا۔ قرآن کریم کے اولین مخاطب عرب تھے اور قرآن کریم کے معانی و مقاصد عربی لباس میں اترے، اس لئے عرب معاشرہ کے حالات، خصوصیات، خیر وشر کے معیارات، سیاسی وتمدنی نظریات، روزمرہ زندگی کے مشاغل اور مذہبی رسوم و معتقدات کو سمجھنا بھی ضروری ہے تاکہ اس فرقان حمید کی روح، مزاج، اسلوب اور مقاصد تک رسائی ممکن ہوسکے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے حالات، نظریات اور اعتقادات کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے کیونکہ بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں یہود و نصاریٰ کے افعال و اعمال سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور ان کے باطل نظریات اور عقائد کی پرزور تردید کی گئی ہے۔ اس لئے ان آیات کے مطالب و معانی تک رسائی حاصل کرنے کیلئے ان مخصوص حالات کا جاننا بھی ضروری ہے جن میں ان آیات کا نزول ہوا۔ مزید برآں ایک مفسر کیلئے ضروری ہے کہ اس کا ذہنی افق وسیع اور علمی پایہ بلند ہو اور وہ فہم و فراست اور معرفت و ادراک کی بے پایاں قوت سے مالا مال ہو۔ فہم و ادراک اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت ہے، جسے وہ چاہتا ہے، ارزانی فرما دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو قوت ادراک اور نور بصیرت کی وافر مقدار عطا کی۔

تفسیر، اس کا ارتقاء اور اقسام

تفسیر باب تفعیل کا مصدر ہے جس کا مادہ ''فسر'' ہے۔ اس کا لغوی معنی ہے: الایضاح والتبیین ''یعنی وضاحت کرنا اور کھول کر بیان کرنا، جہاں تک علم تفسیر کی اصطلاحی تعریف کا تعلق ہے تو ہم اس سلسلہ میں علامہ ابوحیان کی ''البحر المحیط'' میں بیان کردہ تعریف نقل کرتے ہیں۔ ''علم یبحث عن کیفیة النطق بالفاظ القرآن، ومدلولاتها، واحکامها الافرادیة والترکیبیة، ومعانیها التی تحمل علیها حالة الترکیب، وتتمات لذلك'' یعنی تفسیر وہ علم ہے جس میں ادائیگی الفاظ قرآن کی کیفیت، ان کے معانی و مفاہیم، ان کے انفرادی اور ترکیبی احکام، ان کے وہ معانی جن پر انہیں حالت ترکیبی میں محمول کیا جاتا ہے اور اس کے دیگر تتمات سے بحث کی جاتی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قرآن فہمی اور تفسیر کے معاملہ میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ اہل زبان تھے۔ مفردات و مرکبات کے مطالب ان پر واضح تھے۔ آیات کا نزول ان کے سامنے ہو رہا تھا۔ پھر بھی اگر انہیں کوئی مشکل پیش آتی تو وہ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنا مسئلہ حل کروالیا کرتے تھے۔ صحابہ کرام میں سے حضرات خلفاء اربعہ، ابن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم تفسیری خدمات میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

عہد صحابہ میں تفسیر کے مصادر

تفسیر قرآن کے سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مندرجہ ذیل مصادر پر اعتماد کرتے تھے:

(۱) قرآن کریم (۲) سنت نبی کریم ﷺ (۳) اقوال صحابہ

اب ہم بالترتیب ان مصادر کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

قرآن کریم

قرآن کریم کے عمیق مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآنی آیات باہم ایک دوسرے کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں۔ اگر ایک حکم کو

ایک جگہ اجمالاً بیان کیا گیا ہے تو اسے کسی دوسری جگہ وضاحت سے بھی لایا گیا ہے۔ کہیں ایجاز و اختصار ہے تو کہیں اطناب وطوالت۔ کہیں عموم ہے اور کہیں خصوص۔ اللہ تعالیٰ ہدایت پذیری کیلئے ایک ہی چیز کو مختلف انداز میں بار بار بیان فرماتا ہے۔ اگر کسی آیت کی وضاحت میں کوئی دوسرے آیت مل جائے تو تفسیر القرآن بالقرآن کا یہ طریقہ سب سے افضل ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہ آیت کریمہ مجمل ہے: فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ۔ اس کی تفسیر سورۂ اعراف میں بیان کرتے ہوئے فرمایا: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

(۲) سنت نبی کریم ﷺ

اللہ تعالیٰ نے بذات خود اپنے پیارے رسول ﷺ کو تعلیم دی اور آپ کے سینۂ اقدس کو علوم و معارف کے خزانوں سے مالا مال کر دیا۔ قرآن فہمی کے معاملہ میں صحابہ کرام اپنی مشکلات آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے تو آپ اپنے خداداد علم سے ان گتھیوں کو سلجھا دیتے اور مطلوبہ آیات کی تفسیر بیان فرماتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل:44)'' اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تا کہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کیلئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تا کہ وہ غور و فکر کریں''۔ کتب حدیث میں نبی کریم ﷺ سے منقول تفسیری روایات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ سے مروی ہے کہ ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' سے مراد صلوٰۃ عصر ہے۔

(۳) اقوال صحابہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب کے صحابہ کرام کو فہم و ذکاء، نور بصیرت اور اجتہادی صلاحیتوں سے آراستہ کر رکھا تھا۔ وہ زبان کی باریکیوں اور لطافتوں سے بھی واقف تھے اور ان حالات پر بھی آگاہ تھے جن میں قرآن کریم نازل ہوا۔ اگر انہیں کسی آیت کی تفسیر قرآن و حدیث میں نہ ملتی تو وہ اپنے فہم و ادراک اور اجتہادی استعداد کو بروئے کار لاتے ہوئے الفاظ کے پردوں میں مستور معانی کی نقاب کشائی کرتے۔ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیلئے یہ خصوصی دعا فرمائی: اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل۔ ''اے اللہ! انہیں دین میں سمجھ بوجھ عطا فرما اور تفسیر و تاویل کا علم ارزانی فرما''۔ اسی دعا کی برکت سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بہت بڑے مفسر کی حیثیت سے ظاہر ہوئے اور ترجمان القرآن کا لقب پایا۔

صحابہ کرام کے عہد میں علم تفسیر کے مدارس

حضور ﷺ کی ہجرت مدینہ شریف تاریخ اسلام میں ایک اہم موثر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں سے ہی اسلام کی ترویج و اشاعت اور ترقی کا آغاز ہوا۔ دنیا کے متعدد ممالک میں مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں۔ نور اسلام ہر سو پھیل گیا اور صحابہ کرام مختلف علاقوں میں قیام پذیر ہو گئے۔ قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے انہوں نے جا بجا حلقہ ہائے درس قائم کر لئے جن میں اساتذہ وہ بذات خود تھے اور شاگرد تابعین۔ ان میں سے جو علمی مدارس زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:

(۱) مدرسہ مکہ مکرمہ: اس مدرسہ کے استاد جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھے اور آپ کے شاگردان رشید میں حضرات

سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، طاؤس اور عطاء جیسے بلند مرتبہ تابعی تھے۔

۲۔ مدرسہ مدینۃ المنورہ: اس مدرسہ کے استاد عظیم صحابی حضرت ابی بن کعب ہیں اور شاگردان رشید میں حضرات زید بن اسلم، ابوالعالیہ اور محمد بن کعب القرظی نمایاں ہیں۔

۳۔ مدرسۃ عراق: یہاں مسند تدریس پر فائز ہونے والے بلند پایہ صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور آپ کے شاگردوں میں حضرات علقمہ، مسروق، مرہ، عامر، حسن اور قتادہ کے اسمائے گرامی زیادہ مشہور ہیں۔

عہد تابعین میں تفسیر کی تدوین

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں مسلمان مختلف علوم کو مدون کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے پہلے وہ حفظ اور زبانی روایت پر زیادہ تر انحصار کرتے تھے۔ تفسیر حدیث کے ساتھ مختلط تھی لیکن پھر ایسی تالیفات منظر عام پر آنے لگیں جن میں صرف تفسیر قرآن کو ہی کلیدی حیثیت دی گئی، اور ہر ہر آیت اور سورت کی الگ الگ تفسیر بیان کی گئی جیسے تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر نیشاپوری، تفسیر ابن ابی حاتم۔

تفسیر کی اقسام

قرآن کریم کے اولین شارح اور مفسر حضور نبی مکرم ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام نے اس فیضان کو عام کیا۔ شروع شروع میں جو تفسیری کوششیں معرض وجود میں آئیں، ان کا انحصار کلیۃً احادیث رسول ﷺ اور اقوال سلف پر تھا۔ یہ کوششیں تفسیر ماثور یا تفسیر منقول کے نام سے ظاہر ہوئیں اس کے بعد جوں جوں حالات بدلے، اقوال و آراء کا دائرہ وسیع ہوا، مختلف فرقوں نے جنم لیا، علماء نے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی اور ذخائر معلومات میں اضافہ ہوا تو مختلف رجحانات اور میلانات کے پیش نظر تفسیر میں بھی تنوع پیدا ہو گیا اور تفسیر کی مختلف اقسام منصۂ شہود پر ظاہر ہوئیں۔ ہر مفسر نے اپنے رجحان، ثقافت علمی اور مہارت فنی کو بروئے کار لا کر اس فن کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر میں داد تحقیق دی جس میں اسے کمال حاصل تھا۔

اب ہم اختصار سے ان اقسام کا تعارف کرواتے ہیں:

۱۔ التفاسیر بالمأثور

سب سے پہلی صنف تفسیر، تفسیر بالمأثور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر، قرآن کریم، احادیث رسول ﷺ اور آثار صحابہ و تابعین سے کرنا۔ چونکہ اس زمانہ میں دین کی ہیبت برقرار تھی اور اہل زمانہ کی متقی سطح اور ان کی عملی زندگی کی احتیاجات محدود تھیں، مزید برآں وہ تفسیر قرآن میں رائے زنی سے ڈرتے تھے اس لئے انہوں نے تفسیر کے معاملہ میں صرف روایت پر اعتماد کیا۔ اس قسم کی تفاسیر میں بعض ایسی ہیں جن میں اسناد کے ذکر کا بھی التزام کیا گیا ہے جیسے تفسیر ابن جریر طبری۔ ان میں سے بعض تفاسیر ایسی ہیں جن میں اسناد کا ذکر نہیں اور اقوال کو بغیر چھان پھٹک کے درج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ان تفاسیر میں موضوع احادیث اور اسرائیلی روایات بھی در آئی ہیں۔

علامہ ابن کثیر کی زیر نظر تفسیر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے، اس کے متعلق تفصیلی گفتگو عنقریب ہوگی۔

۲۔ التفاسیر اللغویۃ

اس قسم کی تفاسیر میں لغت ونحو کے مسائل کو زیادہ تر زیر بحث لایا جاتا ہے اور بکثرت شعر اور نثری شواہد پیش کئے جاتے ہیں جیسے واحدی کی تفسیر ''البسیط'' اور ابو حیان کی ''البحر المحیط''

۳۔ التفاسیر العقلیۃ

جب مختلف علوم وجود میں آئے تو علوم عقلیہ ونقلیہ کی کثرت نے تفسیر کو ایک اور ہی رنگ دے دیا چنانچہ نقلی روایت اور عقلی اجتہاد نے اس صنف تفسیر کو رواج دیا۔ اس صنف میں مفسرین کی دلچسپی زیادہ تر حکماء وفلاسفہ کے اقوال لانا، شبہات اور ان کا رد کرنے میں ہوتی ہے۔ امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر مفاتیح الغیب میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔

۴۔ التفاسیر الفقہیہ

ان تفاسیر میں احکام فقہیہ کے استنباط اور مختلف مذاہب کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور ان کے رد پر زور دیا جاتا ہے جیسے جصاص کی ''احکام القرآن'' اور قرطبی کی ''الجامع لاحکام القرآن''۔

۵۔ التفاسیر التاریخیہ

اس میں زیادہ تر واقعات اور گزشتہ قوموں کے حالات بیان کئے جاتے ہیں جیسے تفسیر ثعلبی اور خازن

٦۔ التفاسیر للفرق

یہ وہ تفاسیر ہیں جو مختلف فرقوں کے ساتھ تعلق رکھنے والوں نے اپنے عقائد، آراء اور خود ساختہ تاویلات کو رواج دینے کیلئے وضع کیں جیسے رمانی، جبائی، قاضی عبد الجبار اور زمخشری۔

۷۔ التفاسیر المتصوفۃ

ان تفاسیر میں ترغیب وترہیب کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور آیات سے باطنی اسرار اور رمزی اشارات اخذ کئے گئے ہیں۔ ان میں ابن عربی اور ابو عبد الرحمٰن السلمی زیادہ مشہور ہیں۔

تفسیر ابن کثیر

تفسیر ابن کثیر تفاسیر بالماثور میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام کی حامل ہے اور اسے ہر زمانہ میں یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''ذیل طبقات الحفاظ'' میں فرماتے ہیں: ''لم یولف علی نمطہ مثلہ ''یعنی اس قسم کی کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر کو متعدد ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ تفسیر ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم اور تفسیر القرآن الکریم۔

مؤلف نے تفسیر کا آغاز ایک اہم اور طویل مقدمہ سے کیا ہے جس میں ان امور سے بحث کی ہے جن کا تعلق قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ہے لیکن اس مقدمہ کا اکثر حصہ انہوں نے اپنے استاد ابن تیمیہ کے ''مقدمہ فی اصول التفسیر'' سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن کثیر نے

تفسیر بیان کرنے میں ایک امتیازی اسلوب اختیار کیا ہے۔ پہلے وہ ایک آیت ذکر کرتے ہیں پھر اس کی آسان اور مختصر الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں۔ اگر آیت کی توضیح کسی دوسری آیت سے ممکن ہو تو اسے ذکر کرتے ہیں اور دونوں آیات کے درمیان اس طرح موازنہ کرتے ہیں کہ معنی و مطلوب کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح علامہ موصوف نے تفسیر القرآن بالقرآن کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے۔ وہ اپنی تفسیر کے شروع میں خود فرماتے ہیں: ''ان اصح الطریق فی ذلك ان یفسر القرآن بالقرآن فما اجمل فی مكان فانه قد بسط فی موضع آخر فان اعیاك ذلك فعلیك بالسنة فانها شارحة للقرآن و موضحة له'' یعنی تفسیر کا بہترین اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے، اسی لئے کہ ایک چیز ایک جگہ مجمل و موجز ہے تو وہی چیز دوسری جگہ مفصل و مبسوط ذکر کر دی گئی ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو تفسیر بذریعہ حدیث کی جائے کیونکہ یہ قرآن کریم کی شرح اور توضیح کرتی ہے۔

علامہ ابن کثیر آیات کی توضیح میں بکثرت قرآنی آیات لاتے ہیں۔ بعد ازاں آیت کے متعلقہ احادیث لاتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے کون سی قابل حجت ہے اور کون سی قابل حجت نہیں۔ اس کے بعد صحابہ و تابعین اور دیگر علمائے سلف کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ مفسر موصوف صرف نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعض اقوال کو بعض پر ترجیح بھی دیتے ہیں، بعض روایات کو صحیح اور بعض کو ضعیف قرار دیتے ہیں اور راویوں پر جرح و تعدیل بھی کرتے ہیں، اس لئے کہ انہیں فنون حدیث اور رجال و علل کے متعلق مکمل آگاہی حاصل تھی اور وہ ایک بالغ نظر محدث تھے۔ ان کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے تفسیر کو اسرائیلی روایات سے چھانٹ کر الگ کر دیا۔ تفسیر ابن کثیر کے مصادر و مآخذ تفسیر ابن جریر، تفسیر ابن ابی حاتم تفسیر ابن عطیہ اور دیگر متقدمین ہیں۔

ابن کثیر اور اسرائیلیات

اسرائیلیات یہود و نصاریٰ سے ماخوذ وہ روایات ہیں جن کا تعلق سابقہ امتوں اور پیغمبروں کے واقعات سے ہے۔ قرآن کریم میں ایسے موضوعات بھی ہیں جو تورات و انجیل میں بھی مذکور ہیں لیکن قرآن کریم میں ان موضوعات کو اختصار کے ساتھ لایا گیا ہے اور صرف انہی پہلوؤں کے ذکر کو ترجیح دی ہے جو عبرت پذیری اور پند و موعظت کیلئے ضروری ہیں اور غیر متعلقہ تفصیلات سے احتراز برتا گیا ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کے زمین پر اترنے کا قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ۔ مسلمانوں کو اس ایجاز کی تفصیل یہود و نصاری کے پاس سے مل گئی تو انہوں نے بغیر تحقیق کئے ان کی صحت پر یقین کرتے ہوئے نقل کر لیا۔ لیکن تفسیر میں ان اسرائیلی روایات کا بہت برا اثر ہوا اور بہت سے خیالی اور من گھڑت قصے کہانیوں نے تفسیر میں جگہ پالی اور بکثرت خود ساختہ اخبار زبان زد عام ہو گئیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت کے علماء صالحین کو توفیق عطا فرمائی کہ انہوں نے کھرے اور کھوٹے، صحیح اور غلط میں امتیاز کر دیا اور مکمل چھان بین اور تحقیق و تدقیق کے بعد اسرائیلیات اور دیگر موضوع روایات سے تفاسیر کو بالکل پاک کر دیا بلکہ ایک ایسا معیار اور کسوٹی وضع کی جس پر کسی بھی روایت کے متعلق جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے۔ جن حضرات نے یہ کارنامہ انجام دیا، ان میں علامہ ابن کثیر بھی نمایاں طور پر شامل ہیں۔ علامہ موصوف کی خوبی ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں جابجا ان اسرائیلی روایات کی نشاندہی کرتے اور ہر ممکن قارئین کو ان سے متنبہ کرتے ہیں مثلاً سورۂ بقرہ آیت نمبر ٦٧ کے تحت بقرہ کا طویل قصہ اور اس کے متعلق مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں فرماتے ہیں: ''وهذا السیاقات عن عبیدة و ابی العالیة والسدی وغیرهم فیها اختلاف، والظاهر انها ماخوذة من كتب بنی اسرائیل، وهی مما یجوز نقلها ولكن لا تصدق ولا تكذب، فلهذا لا یعتمد علیها الا ما

وافق الحق عندنا''۔

اسی طرح سورۂ ق کی تفسیر کے آغاز میں اس قول کے متعلق کہ ق سے مراد کوہ قاف ہے، نقد و تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وکان هذا والله اعلم- من خرافات بنی اسرائیل التی اخذها عنهم بعض الناس لمارأی من جواز الروایة عنهم مما لایصدق ولا یکذب، وعندی ان هذا وامثاله واشباهه من اختلاق بعض زنادقتهم یلبسون به علی الناس امر دینهم......... فلیس من هذا القبیل''

اس طویل اقتباس کا ترجمہ یہ ہے: یہ بنی اسرائیل کی خرافات سے ہے جنہیں بعض لوگوں نے اس بناء پر قبول کر لیا کہ ان سے روایت جائز ہے اگر چہ ان کی تصدیق و تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ میرا موقف یہ ہے کہ یہ اور اس جیسی روایات بنی اسرائیل کے بد دینوں کی خود ساختہ ہیں تا کہ وہ دین کے معاملہ میں لوگوں کو اشتباہ میں ڈال دیں۔ اسی امت کو دیکھ لیں، باوجودیکہ اس میں جلیل القدر علماء، حفاظ و ائمہ حدیث موجود ہیں، پھر بھی بعض بد باطنوں نے اپنی طرف سے روایات گھڑ لیں حالانکہ نبی کریم ﷺ کو پردہ فرمائے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پھر بنی اسرائیل کا کیا حال ہوگا جن پر ایک طویل عرصہ بیت گیا، نہ ان میں حفاظ کی جماعت تھی اور نہ نقاد کی، اس پر مستزاد یہ کہ وہ شراب کے رسیا اور آیات و احکام میں تحریف اور تغیر و تبدل کا ارتکاب کیا کرتے تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اس فرمان ''بنی اسرائیل سے روایت بیان کرو، کوئی حرج نہیں'' میں ان روایات کے اخذ کو مباح قرار دیا ہے جو عقل و فہم میں آ سکیں لیکن جو روایات صریح عقل کے خلاف ہوں اور ان کا کذب اس قدر واضح ہو کہ سنتے ہی عقل ان کے کذب و بطلان کا فیصلہ دے دے تو وہ اس قبیل سے نہیں۔

علامہ ابن کثیر اور دیگر علماء کرام کے ہاں اسرائیلیات کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ مقبول: جس کی تصدیق ہمارے ہاں کسی آیت یا حدیث سے موجود ہو۔ اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔

۲۔ مسکوت عنہ: یہ وہ قسم ہے جس کی صحت یا کذب کے متعلق قطعی علم نہ ہو۔ اس کے متعلق سکوت اختیار کیا جاتا ہے نہ ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔ البتہ عبرت پذیری اور وعظ و نصیحت کی خاطر اسے بیان کرنا جائز ہے۔

۳۔ مرفوض: وہ جس کا کذب ہماری شریعت کے منافی ہونے یا صریح عقل کے مخالف ہونے کے سبب واضح ہو۔ اس قسم کی نہ تصدیق کرنا صحیح ہے نہ قبول کرنا اور نہ روایت کرنا درست ہے۔

علامہ ابن کثیر اور تفسیر بالرائے

قرآن کریم کو سمجھنا ایک وسیع میدان اور فراخ جولان گاہ ہے۔ زندگی کے ہر امر اور ہر شعبہ کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ ابتداء میں تفسیر کا دار و مدار منقولات پر تھا اور اکثر علماء کا یہی موقف تھا کہ تفسیر کی کسی کو مجال نہیں خواہ وہ کتنا ہی ادیب اور عالم ہو۔ صرف تفسیر بالمأثور پر ہی اکتفاء کرنا چاہئے۔ اس کے بعد زندگی کے تدریجی ارتقاء کا تفسیر کے ارتقاء پر بھی نمایاں اثر پڑا، زندگی کے اغراض و مقاصد نے اسے متاثر کیا اور علوم عقلیہ اور نقلیہ کی کثرت نے تفسیر کو جدید جہات سے متعارف کروایا اور انفرادی کوششوں کے نتائج بھی تفسیر میں شامل ہونے لگے۔ نقلی روایت اور عقلی اجتہاد نے تفسیر کو اپنے رنگ میں رنگ دیا لیکن عقل و اجتہاد قرآن و سنت اقوال سلف اور لغت کے تابع ہیں۔ محض اپنے ظن و تخمین اور اٹکل پچو سے تفسیر کرنا غلط ہے دراصل یہی تفسیر بالرائے ہے جسے علامہ ابن کثیر نے مسترد کرتے ہوئے کہا: ''اما تفسیر القرآن بمجرد الرأی فحرام'' یعنی اپنی رائے سے تفسیر کرنا حرام ہے۔ تفسیر کے مقدمہ میں مفسر موصوف نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔

علامہ ابن کثیر اور مسائل فقہ

تفسیر ابن کثیر کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ آیات احکام کی توضیح میں علامہ ابن کثیر فقہاء کے اقوال اور ان کے دلائل ذکر کرتے ہیں مثلاً سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۸۵ کی تفسیر کے تحت انہوں نے اس آیت کے متعلق چار مسائل بیان کئے ہیں اور ساتھ ہی ان مسائل کے بارے میں علماء کے اقوال اور ان کے مذاہب کے دلائل وضاحت سے لائے ہیں۔ اس طرح موصوف فقہی اختلاف، مناقشات، مذاہب اور دلائل بہت اعتدال اور ملائمت سے بیان کرتے ہیں اور کسی کو بے جا تنقید کا نشانہ نہیں بناتے۔

چند مشہور تفاسیر ماثورہ

۱۔ جامع البیان لابن جریر الطبری	(متوفی ۳۱۰ھ)
۲۔ بحر العلوم للسمرقندی	(متوفی ۳۷۳ھ)
۳۔ الکشف والبیان للثعلبی او الثعالبی	(متوفی ۴۲۷ھ)
۴۔ معالم التنزیل للبغوی	(متوفی ۵۱۶ھ)
۵۔ المحرر الوجیز لابن عطیۃ	(متوفی ۵۴۶ھ)
۶۔ تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر	(متوفی ۷۷۴ھ)
۷۔ الجواہر الحسان للثعالبی	(متوفی ۸۷۶ھ)
۸۔ الدر المنثور للسیوطی	(متوفی ۹۱۱ھ)

علامہ ابن کثیر کے حالات زندگی

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات عالم اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ نے خصوصاً تفسیر، حدیث اور تاریخ کے میدان میں ممتاز مقام حاصل کیا اور خاصی شہرت پائی۔ آپ کا نام اور سلسلہ نسب یہ ہے۔ عماد الدین، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر بن ذرع الدمشقی الشافعی۔ آپ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنی حصلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپکے سال ولادت کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ ''ذیل طبقات الحفاظ'' میں علامہ الحسینی نے لکھا ہے کہ آپ ۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ حافظ ابن حجر نے ''الدرر الکامنۃ'' میں آپ کے سن پیدائش کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی ولادت ۷۰۰ھ میں یا اس کے کچھ عرصہ بعد ہوئی جبکہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ذیل تذکرۃ الحفاظ'' میں سال ولادت ۷۰۰ھ درج کیا ہے۔ آپ شام کے شہر بصری کی ایک مضافاتی بستی مجیدل میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد یہاں مسند خطابت پر فائز تھے۔ ابھی آپ تین چار سال کی عمر کے کمسن بچے تھے کہ باپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور انہیں یتیمی کا داغ اٹھانا پڑا۔ اب بڑے بھائی نے اپنے زیر سایہ آپ کی تربیت کی اور آپ نے ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ ۷۰۷ھ میں اپنے بھائی کے ساتھ دمشق منتقل ہو گئے۔ علامہ ابن کثیر نے بذات خود اپنی کتاب البدایۃ والنہایۃ میں ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ مزید برآں انہوں نے اپنے والد اور خاندان کے متعلق بھی گفتگو کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک معزز اور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

دمشق میں آپ نے بہت سے علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے۔ متعدد اساتذہ کی خدمت میں حاضر رہے اور متون حفظ کرتے

رہے۔ داودی طبقات المفسرین میں لکھتے ہیں: ''وسمع الکثیر، واقبل علی حفظ المتون، و معرفۃ الاسانید والعلل، والرجال والتاریخ حتی برع فی ذلک و ھو شاب''

عنفوان شباب میں ہی آپ نے فقہ میں شیخ ابواسحاق شیرازی کی کتاب التنبیہ اور اصول فقہ میں علامہ ابن حاجب کی مختصر کو زبانی یاد کر لیا۔ اصول کی کتابیں آپ نے علامہ شمس الدین اصفہانی شارح مختصر ابن حاجب سے پڑھیں۔ فن حدیث کی تکمیل کیلئے آپ نے زمانہ کے مشہور اساتذہ فن کی طرف رجوع کیا۔ جن میں نمایاں نام یہ ہیں: عیسیٰ بن مطعم، قاسم بن عساکر، محمد بن زراد، ابن الرضی، ابن تیمیہ، حافظ ذہبی، حافظ مزی اور ابن سویدی۔ آپ نے سب سے زیادہ حافظ ابوالحجاج مزی مصنف تہذیب الکمال سے استفادہ کیا۔ خصوصی تعلق کے سبب انہوں نے اپنی صاحبزادی آپ کی زوجیت میں دے دی۔ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کے ساتھ علامہ ابن کثیر کو خصوصی شغف اور محبت تھی اور وہ ان کے عقائد ونظریات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اسی تعلق خاطر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ان مسائل میں اپنے استاد کی مکمل تائید کی جن میں وہ جمہور سلف سے بالکل الگ تھلگ اور منفرد نظر آتے ہیں بلکہ آپ اپنے استاد کے دفاع میں باقاعدہ جھگڑا کیا کرتے تھے۔ مسئلہ طلاق کے معاملہ میں تو انہیں اذیت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

علمی مقام ومرتبہ

علامہ موصوف کو تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔ حافظ حسینی ''ذیل تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھتے ہیں: ''وافتی و درس، و ناظر و برع فی الفقہ والتفسیر والنحو وامعن النظر فی الرجال والعلل ''یعنی وہ مفتی، مدرس، مناظر، فقہ، تفسیر اور نحو کے ماہر اور رجال وعلل حدیث میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ امام ذہبی المعجم المختص میں تحریر کرتے ہیں: ''ھو فقیہ متقن، و محدث محقق، و مفسر نقاد'' حافظ شہاب الدین بن حجی کہتے ہیں کہ علامہ ابن کثیر متون احادیث کے بہت بڑے حافظ اور تخریج و رجال احادیث اور صحیح وسقیم روایات کے عارف تھے۔ ان کے معاصرین اور شیوخ ان کی فضیلت علمی کے معترف ہیں۔ فقہ وتاریخ میں انہیں بہت کچھ یاد تھا ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ عربیت میں کمال مہارت حاصل تھی اور شعر بھی کہتے تھے۔ میں اکثر ان کے پاس حاضر ہوتا رہتا تھا۔ جب بھی حاضری ہوئی، استفادہ کیا علامہ ابن کثیر نے اپنی پوری زندگی درس افتاء اور تصنیف وتالیف میں گزاری۔ آپ بہت خوش مزاج اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان تمام مشاغل کے باوجود ذکر الٰہی سے بالکل غافل نہ تھے بلکہ بہت سا وقت ذکر وفکر میں صرف کیا کرتے تھے۔ عمر کے آخری حصہ میں بینائی جاتی رہی اور ۲۶ شعبان ۷۷۴ھ کو اس دار فانی سے عالم بقا کی طرف انتقال کر گئے اور اپنے محبوب استاد ابن تیمیہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تصانیف

علامہ ابن کثیر نے علوم قرآن، حدیث، توحید، فقہ، سیرت، تراجم اور تاریخ میں گرانقدر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ تفسیر القرآن العظیم

۲۔ فضائل القرآن وتاریخ جمعہ وکتابہ ولغاتہ

۳۔ جامع المسانید والسنن الہادی الی اقوم سنن

۴۔ الاحکام الکبریٰ فی الحدیث

۵۔ الاحکام الصغریٰ فی الحدیث

۶۔ شرح صحیح البخاری

۷۔ مسند الشیخین

۸۔ تخریج احادیث مختصر ابن الحاجب الاصلی

۹۔ ترتیب مسند احمد علی الحروف

۱۰۔ احادیث التوحید والرد علی الشرک

۱۱۔ مختصر علوم الحدیث لابن الصلاح

۱۲۔ الباعث الحثیث علی معرفۃ علوم الحدیث

۱۳۔ الاجتہاد فی طلب الجہاد

۱۴۔ شرح التنبیہ

۱۵۔ البلغۃ والاقناع فی حل شبہۃ مسئلۃ السماع

۱۶۔ الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول

۱۷۔ التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل

۱۸۔ طبقات الفقہاء الشافعین

۱۹۔ الواضح النفیس فی مناقب الامام محمد بن ادریس

۲۰۔ البدایۃ والنہایۃ

۲۱۔ الکواکب الدراری فی التاریخ

ترجمہ تفسیر ابن کثیر

کسی بھی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا نہایت دقت طلب کام ہے۔ ہر زبان کے اپنے قواعد وضوابط، ضرب الامثال۔ محاورات۔ اسالیب، مجازات اور فصاحت و بلاغت کے معاییر ہوتے ہیں۔ جب تک ان امور میں گہرائی، ذوق اور کامل دسترس حاصل نہ ہو، اس وقت تک نہ اس زبان کا ملکہ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی فنی مہارت تک رسائی ہوتی ہے۔ عربی زبان تمام زبانوں میں سرفہرست ہے اور یہ تمام لفظی ومعنوی، ظاہری و باطنی لسانی محاسن سے آراستہ ہے اور پھر وحی الٰہی متحمل ہونے کے باعث اس کی قدر و قیمت اور اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم نے اس عظیم تفسیر کو اردو کا جامہ پہناتے وقت حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ترجمہ سلیس، رواں، شستہ، لسانی و ادبی خوبیوں سے مزین اور زندہ اور مروجہ اردو زبان میں ہو جو تادیر زمانہ کا ساتھ دے سکے۔ دوران ترجمہ ضرورت کے پیش نظر بعض وضاحت طلب چیزوں کی حاشیہ میں توضیح کر دی گئی ہے۔ اس ترجمہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ تفسیر ماثور ہونے کے ناطے علامہ ابن کثیر چونکہ جابجا آیات واحادیث لاتے ہیں، اس لئے ان کی تخریج کر دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت علامہ ملک محمد بوستان صاحب لائق صد تبریک وتشکر ہیں جنہوں نے بڑی محبت اور لگن سے اس اہم کام کی تکمیل کرائی۔

جناب محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب اور جناب میجر (ر) محمد ابراہیم شاہ صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ تفسیر ابن کثیر کو جدید اور معیاری اردو زبان میں منتقل کیا جائے۔ ان دونوں حضرات کی حوصلہ افزائی سے ترجمہ کا کام جاری رہا۔ اگرچہ ہم ان کی خواہش کے مطابق جلد از جلد اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہے، پھر بھی اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کے فضل وکرم سے منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں محسنوں کو سعادت دارین سے نوازے اور انہیں بیش از پیش امت مسلمہ کی خدمت کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ ہم جناب علامہ افتخار احمد تبسم کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے مسودہ پر نظر ثانی کی اور احادیث کی تخریج کا کٹھن لیکن مبارک فریضہ انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکتیں عطا فرمائے۔

کسی بھی بشری کاوش میں نقص کا احتمال ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے تو پوری کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں کوئی سقم نہ رہے لیکن بشری تقاضا کے تحت اگر کوئی غلطی یا نقص ترجمہ میں موجود ہو تو قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ ضرور اس کی نشاندہی فرمائیں اور ہم اللہ رب العزت کی بارگاہ اقدس میں کامل عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی علمی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ وہ کریم ذات اپنے محبوب کریم ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے ہماری فروگزاشتوں سے صرف نظر فرمائے اور ہماری دانستہ اور غیر دانستہ خطاؤں پر قلم عفو پھیر دے۔ وہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کیلئے چن لے اور ہماری اس حقیری سی کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم

وصلى الله على حبيبه سيدنا محمد وعلى آله و اصحابه اجمعين

مترجمین

محمد سعید الازہری، محمد الطاف الازہری، محمد اکرم الازہری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ کتاب

یکتائے روزگار، مفسر قرآن، حضرت امام عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن خطیب ابو حفص عمر بن کثیر الشافعی رحمۃ اللہ علیہ (اپنی کتاب تفسیر کی ابتدا کرتے ہوئے) فرماتے ہیں تمام تعریفیں اس ذات وحدہ لاشریک کے لئے ہیں جس نے اپنی (لاریب) کتاب کی ابتدا ''الحمد'' سے کرتے ہوئے فرمایا: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ ایک دوسری جگہ فرمایا: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ۙ وَّ یُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ٭ مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِہِمۡ ؕ کَبُرَتۡ کَلِمَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاہِہِمۡ ؕ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا کَذِبًا (الکہف: 1 تا 5)۔ ''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی (اور معاش و معاد کو) درست کرنے والی ہے تاکہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بیشک ان کے لیے بہت عمدہ جزاء ہے۔ وہ ٹھہریں گے اس (جنت) میں تا ابد اور تاکہ ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنالیا ہے اللہ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ نہ انہیں اللہ (کی ذات وصفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو۔ کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے۔ وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سر تا سر) جھوٹ''۔ اسی طرح آفرینش کا ذکر بھی الحمد سے ابتدا کرتے ہوئے فرمایا۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوۡرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ (الانعام: 1)۔ ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو پھر بھی جنہوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ (اوروں کو) برابر ٹھہرا رہے ہیں''۔ اور حمد پر ہی تخلیق کائنات کا بیان ختم کرتے ہوئے اہل جنت اور اہل جہنم کے انجام کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: وَ تَرَی الۡمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیۡنَ مِنۡ حَوۡلِ الۡعَرۡشِ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ ۚ وَ قُضِیَ بَیۡنَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ قِیۡلَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (الزمر: 75)۔'' اور (اے حبیب!) آپ دیکھیں گے فرشتوں کو حلقہ باندھے کھڑے ہونگے عرش کے اردگرد تسبیح پڑھ رہے ہونگے اپنے رب (جلیل) کی حمد کے ساتھ اور فیصلہ کر دیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ اور کہا جائے گا سب تعریفیں اللہ کے لیے جو رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہے''۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ ہُوَ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاُوۡلٰی وَ الۡاٰخِرَۃِ ۫ وَ لَہُ الۡحُکۡمُ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ (القصص: 70)۔ ''اور وہی اللہ ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے۔ اسی کو زیبا ہے ہر قسم کی تعریف دنیا میں اور آخرت میں۔ اور اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ (السبا: 1)۔ ''سب تعریفیں اللہ کے لئے جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور ہر اس چیز کا جو زمین میں ہے اور اسی کے لیے ساری تعریفیں ہیں آخرت میں۔ اور وہی بڑا دانا ہر بات سے باخبر ہے''۔ یعنی اول آخر اسی کی تعریف ہے جو کچھ اس نے پیدا کیا یا جو کچھ پیدا کرے گا سب میں اسی کی تقدیس کے ترانے گائے جائیں گے۔ جیسا کہ نمازی (سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَمِدَہٗ الخ) کہتا ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الۡحَمۡدُ، مِلۡءَ السَّمٰوَاتِ وَ مِلۡءَ الۡاَرۡضِ، وَمِلۡءَ مَا شِئۡتَ مِنۡ شَیۡءٍ بَعۡدُ۔'' (اے ہمارے رب تیرے ہی لیے سب تعریفیں ہیں آسمانوں اور زمین کے برابر اور اسی چیز کے برابر جسے تو چاہے)۔ اسی لئے اہل جنت کو بھی حمد و

ثناء کا الہام کیا جائے گا جب وہ اللہ رب العزت کی عظیم الشان قدرت، اس کی دائمی نعمتوں، مسلسل رحمتوں اور پے در پے احسانات و برکات کو ملاحظہ کریں گے تو بلا تکلف ہر سانس کے ساتھ ان کی زبان بارگاہ خداوندی میں زمزمہ خواں رہے گی۔ اسی بات کو قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۞ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس:10-9)۔ ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائے گا انہیں ان کا رب (منزل مقصود تک) ان کے ایمان کے باعث، رواں ہونگی ان کے نیچے نہریں نعمت (و سرور) کے باغوں میں۔ (بہار جنت کو دیکھ کر) ان کی صدا وہاں یہ ہوگی پاک ہے تو اے اللہ اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ ''سلامتی ہو'' اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو''۔ اور تمام تعریفیں اس کے لئے ہیں جس نے اپنے رسول مبعوث فرمائے: رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ''بھیجے ہم نے یہ سارے) رسول خوشخبری دینے کے لئے اور ڈرانے کے لیے تا کہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر رسولوں کے (آنے کے) بعد.....'' (النساء:165)۔ اور رسولوں کا یہ سلسلہ نبی امی عربی مکی ﷺ پر ختم فرمایا۔ آپ ﷺ کو بعثت سے لے کر تا قیام قیامت تمام جن وانس کی طرف مبعوث فرمایا۔ ہدایت کی راہ سے لے کر تا قیام قیامت تمام جن وانس کی طرف مبعوث فرمایا۔ ہدایت کی راہ آپ ﷺ پر تمام کردی۔ قرآن کریم میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (الاعراف:158)'' آپ فرمائیے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف وہ اللہ جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی۔ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر جو نبی امّی ہے جو خود ایمان لایا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر اور تم پیروی کرو اس کی تا کہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ''۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ (الانعام:19)'' تا کہ میں ڈراؤں تمہیں اس کے ساتھ اور (ڈراؤں) اسے جس تک یہ پہنچے''۔ پس عرب وعجم، کالے وگورے اور جن وانس میں سے جس کسی تک یہ قرآن پہنچا، آقائے نامدار تاجدار مدینہ ﷺ اس کے لئے ڈرانے والے ہیں۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ (ہود:17)'' اور جو کفر کرے اس کے ساتھ مختلف گروہوں سے تو آتش (جہنم) ہی اس کے وعدہ کی جگہ ہے''۔ پس جو شخص بھی قرآن کا انکار کرے نص قرآنی کی رد سے جہنمی ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (القلم:44)'' پس (اے حبیب!) آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور اسے جو اس کتاب کو جھٹلاتا ہے ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا''۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ'' مجھے ہر سرخ وسیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے''۔ مجاہد کا قول ہے یعنی جن وانس کی طرف۔ پس آپ ﷺ تمام جن وانس کی طرف مبعوث فرمائے گئے ہیں تا کہ انہیں اس قرآن کریم کی تعلیم دیں جس کی وحی آپ ﷺ پر اترتی ہے اور جسے لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حم السجدہ:42)'' اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے، سب خوبیاں سراہے کی طرف سے''۔ اور ان کو اس کلام پاک کو سمجھنے کی بھی تاکید کردی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء82)'' تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں؟ اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر

اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر"۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص:29)۔ " یہ کتاب جو ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف، بڑی بابرکت تاکہ وہ تدبر کریں اس کی آیتوں میں اور تاکہ نصیحت پکڑیں عقلمند"۔ ایک اور جگہ فرمایا: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا " کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں"۔ چنانچہ کلام الٰہی کے معانی کی وضاحت اور صحیح تفسیر کرنا، اسے سیکھنا اور سکھانا علماء کرام کا فریضہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (محمد:24) " اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو تو (الٹا) انہوں نے پھینک دیا اس وعدہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے اور انہوں نے خرید لی اس کے عوض تھوڑی سی قیمت سو بہت بری ہے وہ چیز جو وہ خرید رہے ہیں" (آل عمران: 187)۔ ایک اور جگہ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ " بے شک جو لوگ خریدتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت یہ وہ (بدنصیب) ہیں کہ کچھ حصہ نہیں ان کے لئے آخرت میں اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ اور دیکھے گا بھی نہیں ان کی طرف قیامت کے روز اور نہ پاک کرے گا انہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے" (آل عمران: 76)۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت بیان فرمائی ہے کیونکہ انہوں نے اللہ کی کتاب سے منہ موڑ لیا تھا اور دنیوی مال ومنال کے جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ پس ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر اس کام سے رک جائیں جو اللہ تعالیٰ کی مذمت کا باعث ہو اور امورِ الٰہیہ کو بجالانے میں پوری طرح کوشاں رہیں اور کتاب اللہ کی تعلیم وتعلم میں پوری کوشش کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ " کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں ان کے دل یاد الٰہی کے لیے اور اس سچے کلام کے لیے جو اترا ہے اور نہ بن جائیں ان لوگوں کی طرح جنہیں کتاب دی گئی اس سے پہلے پس لمبی مدت گزر گئی ان پر تو سخت ہو گئے ان کے دل اور ایک کثیر تعداد ان میں سے نافرمان بن گئی۔ جان لو! اللہ تعالیٰ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مرنے کے بعد ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں تمہارے لیے (اپنی) نشانیاں تاکہ تم سمجھو" (الحدید: 16)۔ ان دونوں آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ذات قدوس جس طرح بنجر زمین کو زرخیز بنا دیتی ہے اسی طرح وہ دل جو گناہوں کی دلدل میں ڈوب کر مردہ ہو چکے تھے انہیں بھی ایمان وہدایت کے ساتھ شگفتہ اور تروتازہ فرما دیتی ہے۔ اس قادر کریم سے امید (بلکہ) التماس ہے کہ ہمارے دلوں کو بھی نرم کر دے اِنَّهٗ جواد کریم۔ آمین ثم آمین۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تفسیر کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ تو اس کی خدمت میں ہماری گذارش یہ ہے کہ اس کا مناسب اور صحیح ترین طریقہ تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر قرآن سے ہی کی جائے۔ کیونکہ ایک جگہ اگر کسی آیت میں اجمال ہو تو دوسری جگہ اس کی تفصیل بیان کر دی جاتی ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر حدیث کی طرف رجوع کریں کیونکہ حدیث بھی قرآن کریم کی شرح اور تفسیر ہے بلکہ حضرت امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے تمام فیصلے اور احکام قرآن کریم سے ہی ماخوذ ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا " بے شک ہم نے نازل کی

ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ تا کہ فیصلہ کریں آپ لوگوں میں اس کے مطابق جو دکھا دیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے اور نہ بنئے بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے''۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ''اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ''ذکر'' تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور وفکر کریں'' (النحل: 44) وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ''اور نہیں اتاری ہم نے آپ پر یہ کتاب مگر اس لیے کہ آپ صاف بیان کر دیں ان کے لئے وہ بات جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور (یہ کتاب) سراپا ہدایت ورحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایماندار ہے''۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' بے شک مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے مثل اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی''۔ یعنی سنت۔ واضح رہے کہ سنت بھی قرآن کی طرح وحی الٰہی ہے مگر یہ وحی غیر متلو ہے اور قرآن وحی متلو۔

مقصود یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر سب سے پہلے تو خود قرآن کریم سے کرنی چاہئے، اگر یہ نہ ہو تو قرآن کریم کی تفسیر سنت سے کرنی چاہئے۔ جس طرح رسول اکرم ﷺ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجنے لگے تو دریافت فرمایا کہ تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ انہوں نے عرض کی کتاب اللہ سے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اور اگر کتاب اللہ میں اس چیز کا حکم نہ ہو تو پھر کیا کرو گے؟ انہوں نے عرض کی سنت مبارکہ سے۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا اگر سنت میں بھی اس مسئلے کا حل نہ ہو تو پھر کیا کرو گے؟ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ یہ سن کر رسول اکرم ﷺ نے ان کے سینے پر اپنا دست مبارک مار کر فرمایا، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے قاصد کو وہ توفیق دی ہے جس سے اللہ کا رسول راضی ہے، یہ حدیث مسند ہے اور سند کے اعتبار سے عمدہ ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ پر وضاحت سے بیان کیا گیا ہے(1)۔ چنانچہ جب کسی آیت کی تفسیر قرآن وسنت میں نہ ہو تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا کیونکہ وہ نصوص قرآن وسنت کی شان نزول سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ علاوہ بریں انہیں کامل ترین سمجھ بوجھ، صحیح علم اور عمل صالح کی خصوصیات بھی حاصل تھیں۔ خصوصاً ان بزرگوں کو جو علم ومرتبہ میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ جیسے خلفاء اربعہ، حضرت ابن مسعود رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ۔ حضرت امام ابوجعفر بن جریر فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس ذات وحدہ لا شریک کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کوئی آیت نہیں اتری مگر میں اس کے بارے میں جانتا ہوں کہ کہاں نازل ہوئی اور کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ اگر مجھے پتہ چلتا کہ فلاں شخص مجھ سے زیادہ قرآن کریم کا علم رکھتا ہے اور میں کسی طرح اس تک پہنچ سکتا ہوں تو میں ضرور اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص جب دس آیات سیکھ لیتا تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتا جب تک ان کا مفہوم نہ جان لیتا اور اس پر عمل پیرا نہ ہو جاتا آگے تجاوز نہ کرتا۔ حضرت ابوعبدالرحمٰن السلمی فرماتے ہیں کہ ہم نے جن لوگوں سے قرآن کریم سیکھا انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ رسول کریم ﷺ کے پاس اسی طرح پڑھا کرتے تھے جب دس آیات پڑھ لیتے تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے جب تک ان کی تفسیر معلوم نہ کر لیتے اور اس پر عمل نہ کر لیتے غرضیکہ اس طرح انہوں نے قرآن کا علم اور عمل دونوں سیکھ لیے۔ انہی میں سے ایک البحر العلام حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ رسول اکرم ﷺ کے چچا زاد ہیں اور ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ہیں۔ حضور ﷺ نے ان کے لئے دعائے خیر فرمائی تھی۔ ''اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ''(2)۔ ''بارالٰہا! انہیں دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر قرآن کا علم عطا فرما''۔ ابن جریر کا قول ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی

1۔ مسند امام احمد: ج5، صفحہ 242،236،230 2۔ البخاری، کتاب الوضوء، جلد 1، صفحہ 48

اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ ''حضرت ابن عباس قرآن کے کتنے اچھے ترجمان ہیں''۔ یہ روایت مختلف صحیح اسناد سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال صحیح قول کے مطابق 23ھ میں ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کے بعد بھی چھتیس سال تک زندہ رہے۔ ذرا خیال فرمائیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعد آپ کے علم نے کس قدر ترقی کی ہوگی۔ حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو امیر حج مقرر فرمایا۔ آپ رضی اللہ عنہما نے اپنے خطبہ میں باختلاف روایت سورۂ بقرہ یا سورۂ نور تلاوت فرمائی اور اس کی ایسی خوبصورت تفسیر بیان کی کہ اگر رومی، اتراک اور اہل دیلم سن لیتے تو ضرور مسلمان ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی الکبیر اپنی تفسیر میں اکثر انہی دونوں بزرگوں (حضرت ابن مسعود و ابن عباس رضی اللہ عنہم) کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ ان دونوں اصحاب کے بیان کردہ اہل کتاب کے اقوال (اسرائیلیات) کو ذکر دیتے ہیں جن کی روایت کی سرکار دو عالم ﷺ نے اجازت فرمائی تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری طرف سے پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہی ہو، بنی اسرائیل سے روایت بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جس نے قصداً جھوٹی بات میری طرف منسوب کی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے(1)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو جنگ یرموک میں دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر اہل کتاب کی کتابیں ہاتھ لگی تھیں۔ وہ اس حدیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں سے بیان کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ بنی اسرائیل کی یہ مرویات بطور استشہاد بیان کی جاتی ہیں نہ کہ بطور دلیل۔ ان اسرائیلیات کو ہم تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ 1:۔ وہ روایات جن کی تصدیق و تائید کتاب و سنت سے ہو جاتی ہے۔ ان کی صحت میں کلام نہیں۔ 2:۔ جن کی تکذیب کی دلیل ہمارے ہاں موجود ہو یعنی قرآن کریم کی کسی آیت یا حدیث مبارکہ کے متضاد ہو ایسی روایات کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ 3:۔ جن کی تصدیق یا تکذیب پر کوئی دلیل نہ ہو اور کتاب و سنت ان کے بارے میں خاموش ہوں۔ ہم نہ تو انہیں بالکل صحیح سمجھتے ہیں اور نہ بالکل غلط۔ البتہ انہیں بیان کرنا جائز ہے۔ ان میں سے اکثر روایات وہ ہیں جن کا کسی دینی معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ باوجودیکہ خود اہل کتاب کے علماء کے درمیان بھی ان کے بارے میں کثیر اختلاف موجود ہے۔ اس اختلاف کے سبب ان روایات کو ذکر کرنے والے مفسرین میں بھی اختلاف کا آ جانا قدرتی امر تھا۔ مثلاً اصحاب کہف کے اسماء، ان کی تعداد، ان کے کتے کا رنگ، عصائے موسیٰ کس درخت کا تھا۔ ان پرندوں کے اسماء جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے زندہ فرمایا تھا۔ اس مقتول کا تعین جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں آیا ہے۔ اس درخت کا ذکر جس کے پاس اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا۔ اس طرح کے دیگر معاملات جنہیں قرآن کریم نے مبہم رکھا ہے۔ کیونکہ ان کے بیان میں مکلفین کے لئے کسی قسم کا دینی یا دنیوی کوئی فائدہ نہیں۔ تاہم اختلاف کو نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا '' کچھ کہیں گے اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا۔ کچھ کہیں گے وہ پانچ تھے۔ چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ تخمینے ہیں بن دیکھے۔ اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ آپ فرمائیے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان کی صحیح تعداد کو مگر چند آدمی سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے۔ اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب میں سے) کسی اور سے'' (الکہف:22) یہ آیت کریمہ ہمیں تعلیم دے رہی ہے کہ ایسے موقع پر

1۔ البخاری: 207/7

کیا کرنا چاہیے۔ اللہ رب العزت نے یہاں تین قول بیان فرمائے دو کو ضعیف قرار دیا اور تیسرے سے خاموشی اختیار فرمائی۔ یعنی اس پر ضعف کا حکم نہیں لگایا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح ہے کیونکہ اگر یہ بھی غلط ہوتا تو ان دونوں کی طرح اس کو بھی رد کر دیا جاتا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ ان کی صحیح تعداد کا علم تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اور فرمایا: قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ آپ فرمایئے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے ان کی صحیح تعداد سے آگاہ فرمایا ہے۔ اسی لئے فرمایا۔ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا (الکہف:22) سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے۔ یعنی بے مقصد بات کے پیچھے نہ پڑیئے اور ان سے مت پوچھئے کیونکہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور صرف اٹکل پچو سے کام لے رہے ہیں۔ اختلاف بیان کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ کہ تمام اقوال مختلفہ ذکر کر دیئے جائیں صحیح قول سے آگاہ کر دیا جائے اور باطل کو باطل قرار دے دیا جائے۔ اور اس اختلاف کا فائدہ اور ثمرہ بھی بیان کر دیا جائے۔ تا کہ نزاع بلا وجہ طوالت نہ اختیار کر لے اور کوئی شخص اہم اور غیر اہم کی بحث میں نہ پڑے۔ لیکن اگر کوئی شخص اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے سب لوگوں کے اقوال کو ذکر نہ کرے تو یہ اس کی کمزوری ہے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ صحیح قول وہی ہو جسے اس نے چھوڑ دیا ہے۔ یا وہ اختلاف کا تو ذکر کرے لیکن قول راجح کا ذکر کیے بغیر چھوڑ دے تو یہ بھی اس کا قصور ہے۔ اگر اس نے دانستہ غیر صحیح کو صحیح قرار دے دیا تو وہ جھوٹا ہے۔ اگر بوجہ لاعلمی ایسے کیا تو خطا کار ہے۔ اسی طرح جو شخص ایسی بات ذکر کرے جس کا کوئی خاص فائدہ نہ ہو یا ایسے متعدد اقوال ذکر کرے لیکن وہ سب اقوال نتیجۃً ایک یا دو اقوال میں محصور ہو جاتے ہوں تو اس نے وقت ضائع کیا اور لایعنی امر میں مشغول ہوا۔ اس کی مثال ایسے ہی جیسے کوئی شخص دو جھوٹے کپڑے پہن لے۔ اللہ تعالیٰ ہی بھلائی کی توفیق دینے والا ہے۔

فصل: جب کسی آیت کی تفسیر تمہیں قرآن وسنت اور اقوال صحابہ میں نہ ملے تو اکثر ائمہ کی رائے میں تابعین کے اقوال کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ جیسے مجاہد بن جبر رضی اللہ عنہ جو علم تفسیر میں خدا کی نشانی تھے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے سورۂ فاتحہ سے لے کر والناس تک پورا قرآن تین مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس پڑھا۔ میں ہر آیت پر ان کو روکتا اور اس کے بارے میں پوچھتا۔ ابن جریر ابن ابی ملیکہ سے روایت کرتے ہیں میں نے مجاہد کو دیکھا کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ کاغذ قلم ان کے پاس تھا۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما انہیں ارشاد فرماتے لکھو۔ اسی طرح انہوں نے پوری تفسیر قرآن نقل کر لی۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ تو فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت مجاہد کی طرف سے کسی آیت کی بابت کوئی تفسیر تمہیں پہنچے تو یہی تمہارے لیے کافی ہے۔ اسی طرح حضرات سعید بن جبیر، عکرمہ مولی ابن عباس، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، مسروق بن اجدع، سعید بن مسیّب، ابو عالیہ، ربیع بن انس، قتادۃ اور ضحاک بن مزاحم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین وغیرہ تابعین اور تبع تابعین اور ان جیسے مرتبہ کے لوگوں کی تفسیر معتبر مانی جائے گی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں ان لوگوں کے متعدد اقوال جب ذکر کیے جاتے ہیں اور ان کے الفاظ میں اختلاف ہو جاتا ہے تو بعض کج فہم لوگ اسے معنوی اختلاف سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہوتا بلکہ کسی نے اس چیز کی تفسیر اس کے لازم سے کی ہوتی ہے کسی نے نظیر سے۔ کوئی خود اس چیز کو ہی بیان کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر مقامات پر سب صورتوں میں معنی ایک ہی رہتے ہیں۔ یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیے واللہ الھادی۔ شعبہ بن حجاج وغیرہ کا قول ہے کہ تابعین کے اقوال جب فروعات میں حجت نہیں تو تفسیر قرآن میں کیسے حجت ہو جائیں گے؟ یعنی یہ اقوال ان کے مخالف پر حجت نہیں ہوں گے۔ شعبہ کا یہ قول صحیح ہے۔ تاہم اگر کسی شے کے بارے میں ان کا اتفاق ہو تو اس کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر وہ مختلف ہو جائیں تو ان کا قول نہ تو ایک دوسرے پر

حجت ہے نہ متاخرین پر۔ اس وقت لغت قرآن وسنت یا عام لغت عرب اور اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ صرف اپنی ذاتی رائے سے تفسیر کرنا حرام ہے۔ ابن جریر اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی یا بوجہ جہالت کچھ کہہ دیا تو اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا(1)۔ ترمذی، نسائی، اور ابوداؤد نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حدیث حسن قرار دیا ہے۔ یہی الفاظ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جس نے اپنی رائے سے قرآن میں کچھ کہا اس نے خطا کی۔ یہ حدیث ترمذی، نسائی اور ابوداؤد میں موجود ہے۔ امام ترمذی نے اسے غریب قرار دیا ہے۔ اس کے راوی سہیل پر بعض اہل علم نے اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اس حدیث میں یہ الفاظ مروی ہیں۔ ''جس نے اپنی رائے سے قرآن کریم میں کوئی درست بات بھی کر دی تو اس نے غلطی کی کیونکہ اس نے اس چیز کا تکلف کیا جس کا اسے علم نہ تھا۔ اس نے وہ راہ اختیار کی جس پر چلنے کا اسے حکم نہ تھا۔ گرچہ اس نے ٹھیک بات کہہ بھی دی ہے لیکن پھر بھی وہ گناہ گار ہے اس لئے کہ اس نے معاملے کو اس طریقے پر نہیں چلایا جس طرح کا اسے حکم دیا گیا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص بے علم ہو۔ اور فیصلے کرنا شروع کر دے۔ تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اگر اس کا فیصلہ صحیح ہو تو اس بات پر خطا کی نسبت اس سے مواخذہ کم ہوگا۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے تہمت لگانے والوں کو جھوٹے قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ''بس جب وہ پیش نہیں کر سکے گواہ (تو معلوم ہو گیا کہ) وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔'' (النور:18)۔ چنانچہ تہمت لگا کر گواہ نہ پیش کر سکنے والا جھوٹا ہے گو حقیقت میں وہ سچا ہی ہو۔ کیونکہ اس نے ایسی بات کی خبر دی ہے جس کا ذکر کرنا اس کے لیے مناسب نہ تھا۔ اگر وہ ایسی بات کا ذکر کرتا جو معلوم ہو سکتی ہے تو بھی اس نے بلاوجہ تکلف کیا۔ واللہ اعلم۔ اسی بنا پر سلف صالحین کی ایک جماعت ایسی بات کی تفسیر کرنے سے بچتی تھی جس کا علم نہ ہو۔ جیسے حضرت شعبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کونسی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر میں قرآن میں وہ کہوں جو میں نہیں جانتا''۔ ابوعبید قاسم بن سلام کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ''اور (طرح طرح کے) پھل اور گھاس'' (عبس:3)۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے کون سا آسمان سایہ دے گا اور کون سی زمین اٹھائے گی اگر میں تفسیر قرآن کریم کے بارے میں ایسی بات کہہ دوں جو میں نہیں جانتا۔ یہ روایت منقطع ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا۔ اور فرمایا: وَّ فَاكِهَةً (پھل) کے بارے میں تو ہمیں معلوم ہے لیکن یہ ''اَبًّا'' سے کیا مراد ہے؟۔ پھر خود ہی فرمایا! اے عمر اس تکلف میں کیوں پڑتے ہو۔ ایک دوسری روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ ہم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قمیص پر پیچھے کی طرف چار پیوند لگے ہوئے تھے۔ آپ نے اس آیت وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا کی تلاوت فرمائی۔ اور استغفار کیا کہ یہ ''ابّ'' کیا چیز ہے۔ پھر فرمانے لگے اس تکلف کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟۔ ان دونوں حضرات نے لفظ ''ابّ'' کی کیفیت کو جاننا چاہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں لفظ ''اب'' کا لغوی مفہوم معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے زمینی نباتات ہونے کا ذکر تو اس سے پہلی آیت میں موجود ہے۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ۙ وَّ عِنَبًا ''ترجمہ: پھر ہم نے اگایا اس میں غلہ اور انگور'' (عبس:27،28)۔ ابن جریر کا قول ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی شخص نے کسی آیت کے بارے میں دریافت کیا۔ تو آپ

1۔ الطبری:34/1

رضی اللہ عنہما نے اسے کوئی جواب نہ دیا حالانکہ اگر تم میں سے کسی سے اس آیت کی تفسیر پوچھی جائے تو فوراً جواب دو۔ اس کی سند صحیح ہے۔
ابن جریر ہی اپنی سند سے ابن ابی ملیکہ کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ قرآن میں ایک دن کو ہزار سال کے برابر قرار دیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو جواب دینے کی بجائے الٹا اس سے سوال کرتے ہوئے پوچھا بعض آیات میں ایک دن کو پچاس ہزار کے برابر قرار دیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ (يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ) ''ایک دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔'' اس آدمی نے عرض کی میں نے تو آپ سے دریافت کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان کا حقیقی علم صرف اسی وحدہ لاشریک کو ہے۔ اتنے بڑے مفسر قرآن ہونے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے تفسیر قرآن میں کس قدر احتیاط سے کام لیا اور جس بات کا علم نہ تھا اس کے ذکر کرنے سے صاف انکار فرما دیا۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ طلق بن حبیب جندب بن عبداللہ کے پاس آئے اور قرآن کریم کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ اگر تم مسلمان ہو اور میرے پاس سے اٹھ نہ جاؤ یا فرمایا میرے پاس بیٹھے رہو۔ حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ سے جب کسی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو فرماتے۔ ہم قرآن میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ آپ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جو کچھ معلوم ہوتا صرف وہی تفسیر میں ذکر فرماتے۔ ایک دفعہ ایک شخص کے دریافت کرنے پر فرمایا۔ مجھ سے قرآن کی تفسیر نہ پوچھو۔ قرآن کی تفسیر تو اس سے پوچھو جو یہ کہتا ہے کہ قرآن کی کوئی آیت مجھ پر مخفی نہیں یعنی (حضرت) عکرمہ (رضی اللہ عنہ)۔

یزید بن ابو یزید کہتے ہیں کہ ہم حضرت سعید بن مُسیَّب رضی اللہ عنہ سے حلال وحرام کے مسائل پوچھتے تھے اور آپ ان میں سب سے زیادہ عالم نظر آتے لیکن جب ہم قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھتے تو یوں خاموش ہو جاتے جیسے سنا ہی نہیں۔ ابن جریر ابن زید سے حضرت عبید اللہ بن عمر کا قول نقل فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ منورہ کے جلیل القدر فقہاء کو بھی دیکھا کہ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ حضرات سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، سعید بن میسّب اور نافع رحمتہ اللہ علیہم انہی میں سے ہیں۔ حضرت ہشام بن عروہ فرماتے ہیں۔ میں نے اپنے والد کو کبھی کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ حضرت محمد بن میرین فرماتے ہیں میں نے عبید سلمانی سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا جو لوگ قرآن کی آیات کی شان نزول سے آگاہ تھے وہ چلے گئے۔ اب تم اللہ سے ڈرو اور سیدھی راہ اختیار کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسلم بن یسار اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: جب تم قرآن کریم کی آیت کی تفسیر کرنا چاہو تو توقف کرو اور آگے پیچھے دیکھ لو۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں ہمارے سب ساتھی تفسیر قرآن کرنے سے بچتے تھے اور ڈرتے تھے۔ حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے قرآن کریم کی تمام آیات کا علم حاصل کر لیا ہے لیکن پھر بھی میں اسے بیان کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتا ہوں کیونکہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرنی ہے۔ حضرت مسروق رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ تفسیر میں بے حد احتیاط سے کام لو۔ تفسیر تو اللہ سے روایت کرنا ہے۔ یہ صحیح آثار اور ائمہ سلف سے منقول ان جیسے اقوال کا معنی یہ لیا جائے گا کہ سلف صالحین اپنی طرف سے قرآنی آیات کی تفسیر بیان کرنے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ ہاں جو چیز لغت عرب یا شریعت سے مفہوم ہو اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی لئے ان جلیل القدر علماء اور دیگر بزرگوں کے متعدد اقوال تفاسیر میں بکثرت منقول ہیں اور اس میں کوئی تضاد نہیں وہ جس چیز کا علم رکھتے بیان کر دیتے اور لاعلمی کی صورت میں خاموش رہتے۔ یہ ہر شخص کا فریضہ ہے۔ جس طرح لاعلمی کے وقت چپ رہنا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کسی چیز کے بارے میں پوچھا جائے تو اس کو بیان کرنا بھی لازمی ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: لَتُبَيِّنُنَّهٗ

لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ'' ترجمہ: تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں کیلئے اور نہ چھپانا اس کو'' (آل عمران: 187)۔

اسی طرح حدیث مبارکہ میں بھی ہے (جو کہ متعدد سندوں سے مروی ہے) '' جس سے کوئی بات پوچھی گئی اور معلوم ہونے کے باوجود اس نے چھپایا تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام دی جائے گی'' (1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی انہی آیتوں کی تفسیر فرمایا کرتے تھے جن کی تفسیر جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرض کی تھی۔ یہی حدیث ایک دوسری سند سے بھی حضرت ہشام سے مروی ہے لیکن یہ روایت منکر غریب ہے۔ اس کے راوی جعفر بن محمد بن خالد بن زبیر بن عوام قریشی ہیں بخاری کا قول ہے کہ حدیث میں ان کی اتباع نہیں کی جائے گی۔ حافظ ابوالفتح ازدی فرماتے ہیں کہ یہ منکر الحدیث ہیں۔ ابوامام جعفر نے بھی اس پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیات ایسی ہیں۔ جن کے معانی اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔ ان کے مطالب ومفاہیم حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیئے جاتے تھے۔ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس کی صحیح تاویل یہی ہے کہ قرآن میں ایسی آیات بھی ہیں جن کا علم محض اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ اور بعض ایسی آیات بھی ہیں جن کا علم علماء کو بھی ہے۔ بعض آیات اہل عرب زباندانی کے طبعی ملکہ کی بنا پر سمجھ جاتے ہیں۔ کچھ آیات ایسی بھی ہیں جن کا مطلب اس طرح ظاہر وواضح ہے کہ عذر خواہی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ابن جریر کا قول ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تفسیر کی چار اقسام ہیں۔ 1:۔ جسے عرب اپنی کلام سے جان لیتے ہیں 2:۔ جس کے نامعلوم ہونے پر کوئی معذور نہیں 3:۔ جسے علماء سمجھتے ہیں 4:۔ جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔ ابن جریر کے مطابق ایک مرفوع حدیث بھی اس کے بارے میں ہے لیکن اس کی اسناد میں کلام ہے۔ اس میں بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم کا نزول چار طرح سے ہوا ہے۔ حلال وحرام کی آیات۔ ان سے لاعلمی کا عذر کرنے والا قیامت میں معذور نہ ہوگا۔ وہ تفسیر جسے عرب بیان کریں۔ تفسیر جس کا ذکر علماء کرتے ہیں۔ متشابہات۔ جنکا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات کے ساتھ خاص ہے۔ جو شخص ان کے جاننے کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے (1)۔ اس حدیث پر اعتراض محمد بن سائب کلبی کی وجہ سے ہے وہ متروک الحدیث ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے موقوف روایت یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو ہی مرفوع حدیث سمجھ لیا ہو۔ (اس کی روایت اوپر گذر چکی ہے) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

مفید مقدمه

(تفسیر کی ابتدا میں سورۂ فاتحہ سے قبل یہ مفید مقدمہ ذکر کیا جا رہا ہے)

حضرت ابوبکر انباری اپنی سند کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت قتادہ نے فرمایا قرآن کی سورتوں میں سے سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، توبہ، رعد، نحل، حج، نور، احزاب، محمد، فتح، حجرات، رحمٰن، حدید، مجادلۃ، حشر، الممتحنۃ، الصّف، الجمعۃ، المنافقون، التغابن، الطلاق، التحریم (ابتدائی دس آیات)، الزلزال، سورۂ نصر۔ یہ سب سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ اور باقی تمام سورتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ قرآن کریم کی آیات کی تعداد چھ ہزار ہے۔ اس سے زائد تعداد میں اختلاف ہے اور متعدد اقوال مذکور ہیں۔ بعض نے تو اسی تعداد کو حتمی قرار دیا ہے۔ بعض کے نزدیک دوسو چار (چھ ہزار سے) زائد ہیں۔ بعض کے نزدیک دوسو چودہ، بعض کے نزدیک دوسو انیس، بعض کے نزدیک دوسو پچیس یا چھبیس، بعض کے نزدیک دوسو چھتیس آیتیں زیادہ ہیں۔ ابوعمرو الدانی نے اپنی کتاب البیان میں اسی طرح لکھا ہے۔ قرآن کریم کے کلمات کے بارے میں حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ یہ ستتر ہزار چار سو انتالیس کلمات ہیں۔ اس کے

1۔ سنن ابی داؤد: کتاب العلم: 321/3

حروف کی تعداد حضرت مجاہد کے قریب تین لاکھ اکیس ہزار ایک سو اسی ہے۔ حضرت فضل بن یسار کے نزدیک یہ تین لاکھ تیئیس ہزار پندرہ حروف ہیں۔ سلام ابو محمد الحمانی کا قول ہے کہ حجاج نے اپنے زمانے میں قراء، حفاظ اور کاتبوں کو جمع کر کے قرآن کریم کے حروف کی گنتی کرنے کا حکم دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ سب نے اتفاق کیا کہ یہ تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حروف ہیں۔ پھر حجاج نے کہا کہ حساب کر کے بتاؤ کہ حروف کے اعتبار سے آدھا قرآن کریم کہاں ہوتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سورۂ کہف میں (وَلْيَتَلَطَّفْ) کی فاء پر قرآن کریم کا نصف، سورۂ توبہ کی سویں آیت پر پہلی تہائی، اور سورۂ شعراء کی آیت نمبر سو یا ایک سو ایک پر دوسری تہائی اور تیسری تہائی آخر تک ہے۔ پہلی منزل (ساتواں حصہ) آیت کریمہ (فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ) کی دال پر۔ دوسری منزل سورۂ اعراف کی آیت (اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ) کی تاء پر۔ تیسری منزل سورۂ رعد میں (اُكُلُهَا) کے الف پر۔ چوتھی سورۂ حج کے (جَعَلْنَا مَنْسَكًا) میں جعلنا کے الف۔ پانچویں سورۂ احزاب کی آیت (وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ) کی تاء پر۔ چھٹی منزل سورۂ فتح کی آیت (الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ) کی واؤ پر۔ اور ساتویں منزل قرآن پاک کے خاتمہ پر ہے۔ ابو محمد سلام حمانی کا بیان ہے کہ ہم نے اس کام پر چار ماہ تک مسلسل محنت کی۔ حجاج کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر رات چوتھائی قرآن کریم پڑھا کرتا تھا۔ پہلا ربع (چوتھائی) سورۂ انعام کے خاتمہ پر ہے۔ دوسرا سورۂ کہف میں (وَلْيَتَلَطَّفْ) پر۔ تیسرا سورۂ زمر کے خاتمہ پر۔ چوتھا قرآن کے خاتمہ پر۔ شیخ ابو عمرو الدانی نے اپنی کتاب (البیان) میں ان باتوں میں اختلاف بھی نقل کیا ہے۔ رہی بات حصوں (احزاب) اور اجزاء (پاروں) کی تو قرآن کریم کے تیس مشہور پارے ہیں۔ ایک حدیث میں صحابہ کرام کا قرآن کریم کو "احزاب" میں تقسیم کرنے کا ذکر ہے۔ یہ حدیث مسند امام احمد، سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں ہے۔ اس کے راوی حضرت اوس بن حذیفہ کا ارشاد ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام سے پوچھا کہ آپ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کی تقسیم کس طرح کرتے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا ہم پہلی تین سورتوں کی ایک منزل بناتے تھے پھر پانچ، پھر سات، پھر نو، پھر گیارہ(1)۔ پھر تیرہ، اور پھر سو مفصل (یعنی سورۂ ق سے لے کر آخر تک) کی ایک منزل بناتے تھے۔ (اس طرح یہ سات منزلیں بنتی ہیں) **(فصل)** لفظ سورت کے لغوی معنی میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک اس سے مراد "اَلْاِبَانَةُ وَالْاِرْتِفَاعُ" بلندی اور منفرد ہونا ہے۔ نابغہ شاعر کا قول ہے۔

أَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَعْطَاكَ سُوْرَةً تَرَىٰ كُلَّ مَلِكٍ دُوْنَهَا يَتَذَبْذَبُ

(ترجمہ) (اے بادشاہ سلامت!) کیا آپ نے غور کیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو وہ مقام ومرتبہ عطا فرمایا ہے کہ ہر بادشاہ اسے دیکھ کر حیران و پریشان اور سرگرداں ہے۔ گویا قاری ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد اونچائی ہے۔ شہر پناہ (فصیل) کو اسی بناء پر عربی میں "سُوْر" کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک سورت کو سورت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ قرآن کریم کا حصہ اور جز ہے۔ یہ (أسار الاناء) سے ماخوذ ہے۔ برتن میں جو حصہ باقی بچ جائے اسے عربی میں "سُوْر" کہتے ہیں اس کی جمع "آسار" آتی ہے۔ اس صورت یہ مہموز ہوگا۔ ہمزہ میں تخفیف کردی گئی۔ پھر اسے واؤ سے بدل دیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ سورۃ کا معنی "تمام وکمال"، مکمل ہونا ہے۔ کیونکہ اہل عرب مکمل اونٹنی کو سورۃ کہتے ہیں۔ (میرے خیال میں) سورۃ کو یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ تمام آیات کو اپنے اندر جمع کر لیتی ہے جیسے شہر (یا قلعہ) کی فصیل اپنے مکانات اور حویلیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ "سورۃ" کی جمع سور (بفتح واؤ)، سورات اور سوارات بھی آتی ہے۔ جہاں تک لفظ آیت کا تعلق ہے اس کا لفظی معنی علامت (نشانی) ہے یعنی یہ اس

1۔ الطبری: 23/1 2۔ مسند امام احمد: 9/4

بات کا اشارہ ہے کہ سابقہ کلام یہاں ختم ہو رہی ہے۔ اور مابعد ماقبل سے جدا ہو رہا ہے۔ (قرآن کریم میں بھی یہ لفظ نشانی کے معنی میں استعمال ہوا ہے)۔ ارشاد ربانی ہے: "اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ" (اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ.....) (البقرہ: 248)۔ نابغہ شاعر کے اس شعر میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

تَوَهَّمْتُ آيَاتٍ لَّهَا فَعَرَفْتُهَا لِسِتَّةِ اَعْوَامٍ وَ ذَاالْعَامُ سَابِعٗ

ترجمہ:۔ مجھے اس گھر کی نشانیوں کا خیال آیا۔ پس میں نے اسے چھ سال سے پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد جمع کرنا بھی ہے کیونکہ آیت بھی قرآن کریم کے حروف کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ "خَرَجَ الْقَوْمُ بِاٰيَاتِهِمْ اَیْ بِجَمَاعَاتِهِمْ" (یعنی قوم گروہوں کی صورت میں باہر آئی)۔ کسی شاعر کا قول ہے۔

خَرَجْنَا من النقبين لا حي مثلنا بایاتنا نزجی اللقاح المطافلا

بعض علماء کے نزدیک اسے یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ حیرت انگیز اور معجز آمیز کلام ہے اس نے انسان کو اپنی نظیر لانے سے عاجز کر دیا تھا۔ سیبویہ کا قول ہے کہ یہ اصل میں اَيَيَةٌ تھا جیسے اکمۃ اور شجرۃ۔ یا متحرک ماقبل مفتوح الف سے بدل گئی آیۃ بن گیا۔ کسائی کا قول ہے کہ یہ اصل میں اٰيِيَةٌ بروزن آمنۃ تھا۔ یاء کو الف سے بدلا پھر بوجہ التباس حذف کر دیا۔ فراء کے نزدیک یہ اصل میں اَيَّيَةٌ تھا۔ پھر تشدید کی وجہ سے یاء کو الف سے بدلا۔ آیۃ ہو گیا۔ اس کی جمع آی، آیای اور آیات آتی ہے۔ جہاں تک لفظ "کلمۃ" کا تعلق ہے یہ ایک منفرد لفظ کو کہتے ہیں۔ کبھی اس کے دو حرف ہوتے ہیں جیسے ما اور لا اور کبھی یہ زیادہ حروف پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ ایک کلمہ میں زیادہ سے زیادہ دس حروف ہوتے ہیں جیسے "لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ" اور "اَنُلْزِمُكُمُوْهَا" اور "فَاَسْقَيْنَاكُمُوْهُ" کبھی ایک پوری آیت ایک ہی کلمہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ جیسے "وَالْفَجْرِ" اور "وَالضُّحٰى" اور "وَالْعَصْرِ" اسی طرح "الٓمّٓ" اور "طٰهٰ" اور "يٰسٓ" اور "حٰمٓ" (کوفیوں کے نزدیک) اور "حٰمٓ عٓسٓقٓ" ان کے نزدیک دو کلمے ہیں۔ دیگر علماء انہیں مستقل آیات کا نام نہیں دیتے ان کے نزدیک یہ کلمات ہیں جو سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔ ابو عمرو دانی کا قول ہے کہ ایک کلمہ کی آیت قرآن کریم میں (مُدْهَآمَّتٰنِ) کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ جو کہ سورۂ رحمٰن کی ایک آیت ہے۔

(فصل) قرطبی کا قول ہے کہ بالاتفاق علماء کرام کے نزدیک قرآن کریم میں عجمی تراکیب نہیں ہیں۔ اور یہ بات بھی متفقہ ہے کہ اس میں عجمی اسماء موجود ہیں جیسے ابراہیم، نوح اور لوط۔ یہ بات مختلف فیہ ہے کہ کیا قرآن کریم میں اس کے علاوہ کوئی چیز عجمی ہے یا نہیں۔ باقلانی اور طبری نے تو اس کا سرے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کی رائے میں وہ تراکیب یا الفاظ جو غیر عربی (عجمی) محسوس ہوتے ہیں فی الحقیقت وہ عربی ہی ہیں لیکن دوسری زبانوں میں بھی یہ استعمال ہوتے ہیں۔ اور ترادف میں کوئی حرج نہیں۔

سورۂ فاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورت کے متعدد اسماء ہیں **اَلۡفَاتِحَۃُ** کھولنے والی۔ کیونکہ اس سے قرآن کریم کی ابتداء ہوتی ہے۔ نماز کے دوران قرأت کی ابتداء بھی اس سے ہوتی ہے۔ **اُمُّ الۡکِتَابِ:** جمہور علماء کرام کے نزدیک یہ ام الکتاب بھی ہے جیسا کہ حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ لیکن حضرت حسن بصری اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہما نے یہ نام مناسب نہیں سمجھا۔ ان دونوں کا بیان ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ حضرت حسن کا قول ہے کہ محکم آیات کو ام الکتاب کہتے ہیں۔ **اُمُّ الۡقُرۡاٰنِ:** اسی وجہ سے دونوں مشائخ اس نام کے بھی قائل نہیں۔ ترمذی کی ایک صحیح حدیث میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ الحمد للہ رب العلمین (مکمل سورت) یہ ام القرآن، ام الکتاب، سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔ (1)

الحمد: **اَلصَّلٰوۃُ:** حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے (یہ حدیث قدسی ہے) اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے مابین تقسیم کر دیا ہے جب بندہ کہتا ہے "الحمد للہ رب العلمین" اللہ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے "حَمَدَنِیۡ عَبۡدِیۡ" "الحدیث" میرے بندے نے میری تعریف کی (2)۔ سورۂ فاتحہ کو صلوٰۃ (نماز) کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پڑھنا نماز میں شرط ہے۔ **اَلشِّفَاءُ:** جیسا کہ دارمی نے ابوسعید سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ "سورۂ فاتحہ ہر زہر کی شفا ہے" (3)۔ **اَلرُّقۡیَۃُ:** حضرت ابوسعید کی روایت صحیح میں ہے جب انہوں نے ایک مارگزیدہ شخص کو سورت فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ شفایاب ہو گیا۔ حضور ﷺ نے اس سے پوچھا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اس میں شفا ہے؟۔ **اَسَاسُ الۡقُرۡاٰنِ:** شعبی نے حضرت ابن عباس سے یہی نام روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا یہ قرآن کی اساس ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی بنیاد ہے۔ **اَلۡوَاقِیَۃُ:** یہ حضرت سفیان بن عیینہ کے نزدیک ہے۔ **اَلۡکَافِیَۃُ:** یحییٰ بن ابی کثیر نے اسے یہ نام دیا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے سے ماسوا سے کفایت کرتی ہے۔ اور کوئی دوسری سورت اس سے کفایت نہیں کرتی۔ بعض مرسل احادیث میں یہ بھی آیا ہے "ام القرآن (فاتحہ) عوض ہے دوسری سورتوں کا لیکن کوئی سورت اس کا عوض نہیں ہو سکتی" (4)۔ زمخشری نے کشاف میں ذکر کیا ہے کہ اسے سورۂ صلوٰۃ اور سورۂ کنز بھی کہتے ہیں۔ ابن عباس، قتادۃ اور ابو عالیہ کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ ابو ہریرہ، مجاہد، عطا بن یسار اور زہری کے نزدیک یہ مدنی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ دو مرتبہ نازل ہوئی ایک مرتبہ مکہ میں اور پھر دوسری مرتبہ مدینہ میں۔ پہلا قول زیادہ قوی ہے کیونکہ ایک دوسری آیت میں ہے۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ "اور بے شک ہم نے آپ کو عطا فرمائی ہیں سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی" (الحجر: 87) واللہ تعالیٰ اعلم۔ ابولیث سمرقندی کا بیان قرطبی نے نقل کیا ہے کہ اس کا نصف مکہ اور نصف مدینہ منورہ میں نازل ہوا۔ یہ قول بالکل ہی غریب ہے۔ بالاتفاق یہ سات آیات ہیں۔ عمر بن عبید کے نزدیک آٹھ اور حسین جعفی کے نزدیک چھ ہیں۔ یہ دونوں قول شاذ ہیں۔

کیا بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سورۂ فاتحہ کی مستقل آیت ہے یا نہیں اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور کوفی قراء، صحابہ و

1۔ ترمذی: حدیث نمبر 2875 2۔ ترمذی: حدیث نمبر 2903، مسند امام احمد: 285/2

3۔ الدارمی: فضائل القرآن 445/2:12 4۔ دارقطنی: 322/1

تابعین کی ایک جماعت اور متاخرین میں سے بعض لوگوں کا یہی قول ہے۔ یا یہ ایک مستقل آیت کا جزو ہے یا سرے سے ہی یہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے۔ جیسا کہ مدینہ کے قراء اور فقہاء کا قول ہے۔ یہ کل تین اقوال ہیں۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ علماء کرام کے نزدیک اس سورت کے پچیس کلمات اور ایک سو تیرہ حروف ہیں بخاری کتاب التفسیر کے شروع میں فرماتے ہیں کہ اس سورت کو ام الکتاب اس لئے کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی ابتداء میں لکھی جاتی ہے اور نماز کی قرأت بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ چونکہ قرآن کریم کے تمام مضامین اجمالی طور پر اس میں آگئے ہیں چنانچہ اسے یہ نام دیا گیا۔ ابن جریر لکھتے ہیں کہ اہل عرب کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر جامع امر کو یا جو چیز کسی شی کا پیش خیمہ ہو کو ام کہتے ہیں جیسے وہ جلد جو دماغ کو جامع ہوتی ہے ام الراس کہتے ہیں۔ لشکر کے جھنڈے اور علم کو بھی جس کے نیچے لوگ جمع ہوتے ہیں ام کہتے ہیں۔ بطور استشہاد ذوالرمۃ شاعر کا یہ قول پیش کیا جاتا ہے۔

عَلٰی رَاْسِہٖ اُمٌّ لَنَا نَقْتَدِیْ بِھَا جِمَاعُ اُمُوْرٍ لَیْسَ نَعْصِی لَھَا اَمْرًا

اس کے سر پر ہمارا نیزہ ہے۔ ہم اپنے تمام امور کی انجام دہی میں اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اس کی حکم عدولی نہیں کرتے۔ ''ام یعنی نیزہ'' مکہ مکرمہ کو بھی ام القریٰ نام دینے کی وجہ یہی ہے کہ یہ سب کا جامع ہے اور سب سے پہلے ہے۔ بعض کے نزدیک چونکہ زمین وہیں سے پھیلائی گئی ہے۔ الفاتحہ (کھولنے والی) اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ تلاوت کا افتتاح ہوتا ہے اور صحابہ کرام نے قرآن کریم کی کتابت کی ابتدا بھی اسی سے کی **السَّبْعُ الْمَثَانِیْ:** اس کا ایک صحیح نام سبع مثانی (بار بار پڑھی جانے والی) بھی ہے۔ کیونکہ ہر رکعت میں یہ سورت پڑھی جاتی ہے۔ اگرچہ ''مثانی'' کا ایک اور معنی بھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ام القرآن کے بارے میں فرمایا کہ یہ ام القرآن ہے۔ یہی سبع مثانی ہے اور یہی قرآن عظیم ہے(1)۔ ایک اور حدیث جس کے راوی بھی ابوہریرہ ہیں میں ہے کہ الفاظ میں یہ ام القرآن ہے یہی فاتحۃ الکتاب ہے اور یہی سبع مثانی ہے(2)۔ حافظ ابوبکر احمد بن مردویہ اپنی کتاب تفسیر میں اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سات آیتیں ہیں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بھی ان میں سے ایک آیت ہے۔ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے اور یہی ام الکتاب اور فاتحۃ الکتاب ہے(3)۔ دارقطنی نے بھی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل مرفوع حدیث ذکر کی ہے۔ ان کے بقول اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرات علی، ابن عباس اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے آیت کریمہ (سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ) سے مراد سورۂ فاتحہ ہی ہے اور بسم اللہ (تسمیہ) اس کی ساتویں آیت ہے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ تسمیہ کی بحث میں آئے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے (اپنے مرتب کردہ نسخہ) میں سورۂ فاتحہ کیوں نہیں لکھی؟ انہوں نے فرمایا اگر میں اسے لکھتا تو ہر سورت کے شروع میں لکھتا۔ ابوبکر بن ابوداؤد نے کہا اس کا مطلب ہے نماز میں پڑھے جانے کی حیثیت سے۔ انہوں نے فرمایا چونکہ تمام مسلمانوں کو یہ حفظ ہے اس لیے اسے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ قرآن کریم میں سب سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ بیہقی نے دلائل نبوت میں ذکر کیا ہے۔ باقلانی نے اس بارے میں تین اقوال بیان کیے ہیں(1)۔ یہ سورت فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی(2)۔ سورۂ مدثر سب سے پہلے نازل ہوئی جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے(3)۔ آیت کریمہ: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ سب سے پہلے نازل ہوئی یہی قول صحیح ہے۔ اس کی وضاحت اپنی جگہ آئے گی وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ۔

1۔ مسند امام احمد: 448/2 2۔ الدر المنثور: 3/1 3۔ بیہقی: 45/2

سورۂ فاتحہ کے فضائل

حضرت امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں حضرت ابوسعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ میں ایک دفعہ نماز پڑھ رہا تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مجھے بلایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا جب میں نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا۔ تم نے میرے پاس آنے میں دیر کیوں لگائی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! (ﷺ) میں نماز پڑھ رہا تھا۔ تو آپ نے فرمایا کیا تم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ''اے ایمان والو! لبیک کہو اللہ اور (اس کے) رسول کی پکار پر جب وہ رسول بلائے تمہیں اس امر کی طرف جو زندہ کرتا ہے تمہیں'' (انفال: 24)۔ پھر ارشاد فرمایا: میں تمہارے مسجد سے نکلنے سے قبل تمہیں بتا دوں گا کہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت کون سی ہے۔ فرماتے ہیں پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب آپ ﷺ نے مسجد سے نکلنے کا ارادہ فرمایا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے مجھے قرآن کی سب سے بڑی سورت کے بارے میں آگاہ کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے (1)۔ اسی طرح یہ روایت بخاری نے یحییٰ بن سعید بن قطان سے اپنی سند کے ساتھ بیان کی ہے اور اس روایت کو کتاب التفسیر میں دوسری جگہ ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ میں مختلف سندوں کے ساتھ یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ ابی بن کعب کے بارے میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ موطا امام مالک میں ہے جس سے آگاہ ہونا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب (رضی اللہ عنہ) کو آواز دی وہ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ آپ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے تو فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے ہاتھ پر رکھا اس وقت آپ ﷺ مسجد سے باہر نکلنا چاہ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ مسجد سے نکلنے سے پہلے تمہیں ایک سورت سکھاؤں اس جیسی سورت تورات اور انجیل میں نازل نہیں ہوئی بلکہ قرآن میں بھی اس کے مثل کوئی سورت نہیں۔ ابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے اس امید پر اپنی رفتار آہستہ کر دی۔ پھر عرض کی یا رسول اللہ وہ کون سی سورت ہے جس کا آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم نماز شروع کرو تو کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں نے ساری سورت مکمل کر دی۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ یہ وہی سورت ہے۔ یہ سبع مثانی اور قرآن کریم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے (2)۔ ابوسعید سے مراد ابوسعید بن معلیٰ نہیں ہیں جیسا کہ ابن اثیر نے جامع الاصول میں بیان کیا ہے ان کی اتباع میں بعض دیگر لوگوں نے بھی یہی سمجھا ہے۔ وہ ابوسعید انصاری صحابی ہیں جبکہ یہ بنو خزاعہ کے موالی میں سے ہیں اور تابعی ہیں۔ وہ حدیث متصل صحیح ہے اور ظاہر ہے منقطع قرار پائے گی اگر ابوسعید تابعی کا ابی بن کعب سے سماع ثابت نہ ہو۔ اور اگر ان کا سماع ثابت ہو تو یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔ واللہ اعلم علاوہ بریں یہ روایت ابی بن کعب سے متعدد سندوں سے مروی ہے۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف تشریف لے گئے۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے آپ ﷺ نے ان کو آواز دی وہ متوجہ ہوئے لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ آپ ﷺ نے پھر پکارا۔ انہوں نے نماز جلدی جلدی ختم کی اور حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور دریافت فرمایا اے ابی! جب میں نے تمہیں بلایا تو تمہیں جواب دینے سے کس چیز نے روکے رکھا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم

1۔ بخاری، جلد 6، صفحہ 77 2۔ المؤطا: نداء 37

نے یہ آیت نہیں سنی (اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ) انہوں نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہیں ایسی سورت سکھاؤں جو نہ تو تورات میں اتری ہے نہ انجیل، نہ زبور اور نہ ہی قرآن میں اس کی مثل کوئی سورت ہے۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس دروازے سے نکلنے سے قبل میں تمہیں بتادوں گا۔ فرماتے ہیں پھر آپ ﷺ میرا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرنے لگے میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی ایسا نہ ہو کہ آپ ﷺ دروازے تک پہنچ جائیں اور وہ بات رہ جائے۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو میں نے عرض کی یارسول اللہ! آپ نے مجھ سے کس سورت کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز میں کیا پڑھتے ہو؟ تو میں نے آپ ﷺ کو سورۂ فاتحہ سنادی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن میں اس جیسی کوئی سورت نازل نہیں فرمائی۔ یہ سبع مثانی ہے(1)۔ ترمذی نے اسے حضرت ابو ہریرہ سے بھی روایت کیا ہے۔ ان کی روایت میں یہ الفاظ زائد آئے ہیں کہ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس ایک روایت حضرت انس بن مالک سے بھی ہے۔ عبداللہ ابن احمد نے بھی اپنی سند کے ساتھ اسے حضرت امام ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ جس کو ہم مختصراً یا بالتفصیل ذکر کریں گے۔ اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے تورات وانجیل میں ام القرآن جیسی کوئی سورت نازل نہیں فرمائی یہ سبع مثانی ہے۔ رب اور بندے کے مابین نصف نصف منقسم ہے(2)۔ یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ ترمذی کا قول ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔

امام احمد حضرت جابر کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اس وقت استنجا سے فارغ ہوئے تھے۔ میں نے تین مرتبہ سلام عرض کیا تو آپ ﷺ نے میرے سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ فرماتے ہیں حضور ﷺ چلتے رہے اور میں آپ ﷺ کے پیچھے تھا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ اپنی قیام گاہ میں تشریف لے گئے۔ اور میں مسجد چلا گیا۔ میں پریشان حال بیٹھا تھا کہ حضور ﷺ وضو فرمانے کے بعد تشریف لائے اور تین مرتبہ فرمایا علیک السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ پھر فرمایا اے عبداللہ! کیا میں تمہیں قرآن کریم کی بہترین سورت کے بارے میں نہ بتادوں۔ میں نے عرض کی ضرور یارسول اللہ! فرمایا پڑھ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ حتیٰ کہ تو اسے مکمل پڑھ لے(3)۔ اس روایت کی سند عمدہ ہے اس کے راوی ابن عقیل کو ائمہ کبار حجت سمجھتے ہیں۔ عبداللہ بن جابر یہ صحابی ہیں۔ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ یہ عبدی ہیں۔ واللہ اعلم۔ حافظ ابن عساکر کے نزدیک یہ عبداللہ بن جابر انصاری بیاضی ہیں۔ اس طرح کی دیگر روایات سے استدلال کر کے اسحٰق بن راہویہ، ابوبکر بن عربی اور ابن صفار مالکی جیسے بہت سے علماء نے آیات اور سورتوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ ایک دوسرے گروہ کی رائے میں کلام اللہ سب برابر ہے ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس سے مفضل علیہ میں کمزوری کا شائبہ ہوتا ہے حالانکہ سارے کا سارا قرآن ہی فضیلت والا ہے۔ قرطبی نے اشعری، ابوبکر باقلانی، ابوحاتم، ابن حبان البستی، ابوحیان، یحیٰی بن یحیٰی سے یہی نقل کیا ہے اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ سے ایک روایت بھی یہی ہے۔ ایک اور حدیث بھی ہے جسے بخاری نے فضائل قرآن میں درج فرمایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ہم سفر میں تھے۔ ایک جگہ ہم نے پڑاؤ کیا۔ ایک لونڈی ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ ہمارے آدمی یہاں موجود نہیں۔ کیا تم سے کوئی ایسا ہے جو دم کر دے۔ ہم میں سے ایک شخص اٹھ کر ساتھ ہو لیا۔ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ شخص دم کرنا بھی جانتا ہے۔ اس نے وہاں جا کر کچھ دم کیا تو وہ آدمی بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس نے خوش ہو کر تیس بکریاں اور کچھ دودھ بھیجا۔ جب وہ واپس آیا تو ہم نے پوچھا کیا تم تعویذ وغیرہ جانتے ہو؟

1۔ مسند امام احمد: 413/2 2۔ نسائی: باب الافتتاح باب: 25 3۔ مسند احمد: 177/4

وہ کہنے لگا: میں نے تو صرف سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا ہے۔ ہم نے کہا کہ اس مال کو نہ کھاؤ تا آنکہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ جائیں۔ اور اس کے بارے میں آپ ﷺ سے دریافت کر لیں۔ جب ہم مدینہ منورہ پہنچے تو آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر تمام ماجرا عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے کیسے پتہ چلا کہ یہ دم کرنے والی سورت ہے۔ لاؤ میرا بھی حصہ نکالو(1)۔ اور باقی تقسیم کر لو۔ صحیح مسلم اور ابوداؤ میں بھی یہ حدیث شریف ہے۔ مسلم کی بعض روایات میں ہے کہ دم کرنے والے حضرت ابوسعید خدریؓ ہی تھے۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی میں ایک اور روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حضرت جبریل علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے آواز سنائی دی۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی نگاہ مبارک آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا آج آسمان کا ایک دروازہ کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ کھلا تھا۔ پھر اس میں سے ایک فرشتہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا اور عرض کی۔ خوشخبری ہو آپ (ﷺ) کو وہ دو نور عطا کئے گئے ہیں جو اس سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے 1۔ سورۂ فاتحہ۔ 2۔ سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ ان کا ایک ایک حرف نور ہے(2)۔ یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ صحیح مسلم میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز ناقص ہے ناقص ہے ناقص ہے (تین مرتبہ فرمایا) نامکمل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کی گئی اگرچہ ہم نماز میں امام کے پیچھے ہوں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا دل میں پڑھ لیا کرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (حدیث قدسی میں ہے) میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے مابین نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔ میرا بندہ جو کچھ مجھ سے مانگے میں اسے دیتا ہوں۔ جب وہ (بندہ) کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری تعریف کی)۔ پھر وہ بندہ کہتا ہے "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری حمد وثناء کی) پھر جب وہ کہتا ہے۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ ایک روایت کے الفاظ میں فَوَّضَ اِلَیَّ عَبْدِیْ یعنی بندے نے میرے سپرد کر دیا۔ پھر وہ کہتا ہے (اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور بندے کے درمیان ہے۔ اور میرا بندہ مجھ سے جو کچھ مانگے گا میں اسے دوں گا۔ جب وہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ تو اللہ فرماتا ہے (هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ)(3) یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے ہے جو کچھ وہ مانگے۔ نسائی نے اسحٰق بن راھویہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ دونوں نے یہ روایت ایک اور سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس کے الفاظ میں یہ اضافہ ہے (فَنِصْفُهَا لِیْ وَ نِصْفُهَا لِعَبْدِیْ، وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ) اس کا نصف میرے لیے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ کچھ ہے جو وہ سوال کرے۔ ابن اسحٰق نے حضرت علاء سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور مسلم نے بھی دو سندوں میں حضرت ابوالسائب سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ترمذی کا قول ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ میں نے حضرت ابوزرعہ سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ عبداللہ بن امام احمد نے بھی اس حدیث کو ابی بن کعب کے حوالہ سے مفصل ذکر کیا ہے۔ ابن جریر کا قول ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ وَلَهٗ مَا سَاَلَ ......) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان تقسیم کر لیا ہے۔ اس کے لیے وہ کچھ ہے جس کا وہ سوال کرے جب وہ کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ

1۔ بخاری 231/6 (باب فضائل القرآن) 2۔ مسلم: کتاب المسافرین: 554 3۔ مسلم: کتاب الصلوۃ 296

الْعٰلَمِيْنَ اللہ تعالیٰ کہتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ جب وہ کہے "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "تو وہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری توصیف بیان کی۔ پھر فرماتا ہے یہ میرے لیے ہے اور باقی اس کے لئے(1)۔اس سند سے یہ حدیث غریب ہے۔

اس حدیث میں سورۂ فاتحہ سے متعلق نکات کا بیان

اس حدیث میں متعدد علمی نکات ہیں چند ایک یہ ہیں:(1) اس حدیث میں صلاۃ کا لفظ مطلق آیا ہے۔اور اس سے مراد قرأت ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل:110)۔" اور نہ تو بلند آواز سے نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو اسے اور تلاش کرو ان دونوں کے درمیان معتدل راستہ"۔ بِصَلَاتِكَ اَیْ بِقِرَاءَتِكَ یعنی اپنی قرأت کو۔ جیسے صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس بات کی تصریح ہے۔اسی طرح مندرجہ بالا حدیث میں صلاۃ (نماز) سے مراد قرأت ہے۔اس نماز میں قرأت کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے یہ اس کا سب سے بڑا رکن ہے۔اس لیے کہ عبادت کا لفظ بول کر اس کا ایک جز مراد لیا گیا ہے۔جو کہ قرأت ہے۔جس طرح ایک دوسری آیت میں قرأت کا لفظ بول کر نماز مراد لی گئی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (بنی اسرائیل:78) "نماز صبح، بلاشبہ نماز صبح کا مشاہدہ کیا جاتا ہے"۔اس سے مراد نماز صبح ہے جیسا کہ صحیحین میں اس بات کی تصریح ہے کہ فجر کی نماز پر رات اور دن کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں قرأت کرنا لازمی ہے اور اس بات پر علماء کرام کا اتفاق ہے۔لیکن ایک مسئلہ میں علماء کرام کا اختلاف ہے جسے ہم دوسری صورت میں ذکر کریں گے۔وہ مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہی لازمی ہے یا قرآن میں سے جو کچھ پڑھ لے نماز درست ہو جائے گی۔اس بارے میں دو مشہور اقوال ہیں:(ا) امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں وغیرہ کی رائے تو یہ ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا متعین نہیں بلکہ قرآن میں سے جو کچھ پڑھ لے گا کافی ہوگا۔انہوں نے اس آیت کریمہ کے عموم سے استدلال کیا ہے: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل:20) "ترجمہ:۔پس تم اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو"۔ان کی دوسری دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی وہ حدیث ہے جو صحیحین میں مذکور ہے۔جس میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے جو تیز تیز نماز پڑھ رہا تھا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا "جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ پھر قرآن کریم میں سے جو آسان نظر آئے پڑھ لے"(2)۔وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس شخص کو صرف قرأت کرنے کا حکم دیا اور سورۃ فاتحہ اس کے لئے متعین نہ فرمائی۔یہ ہمارے موقف کی تائید کرتی ہے۔(ب) دوسرا قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا نماز میں واجب ہے اور اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔یہ رائے بقیہ ائمہ مالک، شافعی، احمد بن حنبل ان کے شاگردوں اور جمہور علماء کی ہے۔انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو اوپر گذر چکی ہے کہ جس نے نماز پڑھی اور سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز ناقص ہے۔ خداج کا معنی ناقص ہے اس کی وضاحت حدیث کے اندر ہی موجود ہے (غیر تمام) یعنی نامکمل۔اس کے علاوہ انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو صحیحین میں موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے(3)۔صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ نماز درست نہیں جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے(4)۔اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں۔مناظرانہ پہلو اختیار کرنے سے بات لمبی ہو

1۔الطبری:86/1
2۔بخاری: کتاب الاستیذان:68/8
3۔بخاری: کتاب الصلوٰۃ:192/1
4۔فتح الباری:241/2

جائے گی۔ ہم نے مختصراً ان حضرات کے دلائل کا ذکر کر دیا ہے۔ پھر امام شافعی اور اہل علم کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ سورۂ فاتحہ کا ہر رکعت میں پڑھنا واجب ہے۔ دیگر علماء کا قول ہے کہ اکثر رکعتوں میں پڑھنا واجب ہے۔ حضرت حسن اور اکثر اہل بصرہ کے نزدیک کسی ایک رکعت میں اس کا پڑھ لینا واجب ہے۔ وہ اس حدیث کو اپنے اطلاق پر رکھتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں۔ (لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ) ابوحنیفہ، ان کے ساتھی، ثوری اور اوزاعی یہ کہتے ہیں: اس کا پڑھنا متعین ہی نہیں بلکہ اگر اور کچھ پڑھ لے گا تو بھی کافی ہوگا۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل:20) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

ابن ماجہ نے حضرت ابوسعید سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جو شخص نماز کی ہر رکعت (خواہ فرض ہو یا نفل) میں سورۂ فاتحہ اور سورت نہ ملائے اس کی نماز نہیں ہوتی (1) البتہ اس حدیث کی صحت میں نظر ہے۔ اس طرح کی مباحث احکام کی بڑی کتب میں موجود ہیں۔ واللہ اعلم۔ ج۔ تیسری توجیہ یہ ہے کیا سورۂ فاتحہ کی قرأت مقتدی پر فرض ہے؟ اس میں علماء کرام کے تین اقوال ہیں: (1) سورۂ فاتحہ کا پڑھنا جس طرح امام پر فرض ہے اسی طرح مقتدی پر بھی فرض ہے وہ مذکورہ بالا احادیث کے عموم سے استدلال کرتے ہیں۔ (2) مقتدی پر سرے سے قرأت کرنا ہی واجب نہیں نہ سورۂ فاتحہ نہ کوئی اور سورت، نہ جہری نماز میں نہ سری نماز میں۔ جیسے حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے (2)۔ لیکن اس کی سند میں ضعف ہے۔ یہ خود حضرت جابر کے قول سے دیگر سندوں میں مروی ہے۔ گو اس حدیث کی اور مرفوع سندیں بھی ہیں لیکن کوئی چیز اس میں صحیح نہیں۔ واللہ اعلم۔ (3) تیسرا قول یہ ہے کہ جن نمازوں میں امام قرأت آہستہ آواز سے کرے ان میں مقتدی پر قرات واجب ہے۔ لیکن جن نمازوں میں بآواز بلند قرات کی جاتی ہے، ان میں واجب نہیں۔ ان کی دلیل صحیح مسلم کی وہ روایت ہے۔ جس کے راوی ابوموسیٰ اشعری ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے چنانچہ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو...... (3) الحدیث۔ سنن حدیث (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، اور ابن ماجہ) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب وہ پڑھے تو خاموش رہو"۔ امام مسلم بن حجاج نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ یہ دونوں حدیثیں اس قول کی صحت کی مؤید ہیں۔ حضرت امام شافعی کا قدیم قول بھی یہی ہے۔ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔

ہماری غرض ان مسائل کو ذکر کرنے سے یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ جس قدر احکام کا تعلق ہے کسی اور سورت کے ساتھ نہیں۔ حافظ ابوبکر بزار اپنی مسند میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم بستر پر لیٹو اور سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو تو موت کے سوا ہر چیز سے امن میں ہو جاؤ گے"۔ (4)

استعاذہ (اعوذ باللہ) اور اس کے احکام

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (اعراف:200-199) " ترجمہ: قبول کیجئے معذرت (خطا کاروں سے) اور حکم دیجئے نیک کاموں کا اور رخ (انور) پھیر لیجیے نادانوں کی طرف سے۔ اور اگر پہنچے آپ کو شیطان کی طرف سے ذرا سا وسوسہ تو فوراً پناہ مانگئے اللہ سے بے شک وہ سب کچھ سننے والا

1۔ سنن ابن ماجہ: کتاب الاقامہ: 274
2۔ مسند امام احمد: 339/3
3۔ مسلم: کتاب الصلوۃ: 304
4۔ مجمع الزوائد: 121/10

جاننے والا ہے''۔ ایک اور جگہ فرمایا: اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَصِفُوۡنَ ...... وَقُلۡ رَّبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ '' ترجمہ:۔ دور کرو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے برائی کو۔ ہم خوب جانتے ہیں وہ باتیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔ اور کہیے میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیرے شیطانوں کے وسوسوں سے''۔ اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں میرے اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ ایک اور مقام پر فرمایا: اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَكَ وَ بَیۡنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ۝ وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (حم السجدہ:33 تا36)'' ترجمہ: برائی کا تدارک اس (نیکی) سے کرو جو بہتر ہے پس ناگہاں وہ شخص تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے، یوں بن جائیگا گویا تمہارا جانی دوست ہے اور نہیں توفیق دی جاتی ان (خصائل حمیدہ) کی بجز ان کے جو صبر کرتے ہیں اور نہیں توفیق دی جاتی ان کی مگر بڑے خوش نصیب کو۔ اور (اے سننے والے) اگر شیطان کی طرف سے تیرے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو (اسکے شر سے) اللہ کی پناہ مانگ یقیناً وہ ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے''۔ ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ یہ حکم فرما رہے ہیں کہ انسانوں میں سے جو تمہارے ساتھ دشمنی کرے تو اس سے نرمی کرو، حسن سلوک اور مودّت سے پیش آؤ۔ تاکہ اس کی عمدہ سرشت اسے مجبور کرے اور وہ تم سے دوستی اور محبت کرنے لگے۔ اور شیطانوں میں سے دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے اپنی پناہ پکڑنے کا حکم دیا کیونکہ وہ حسن سلوک اور احسان کے باوجود بھی عداوت سے باز آنے والا نہیں بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے اس کی قدیم عداوت کی بناء پر اس کا مقصد وحید ہی بنی آدم کو تباہ وبرباد کرنا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّكُمُ الشَّیۡطٰنُ كَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡكُمۡ مِّنَ الۡجَنَّةِ '' ترجمہ: اے اولاد آدم! نہ فتنہ میں مبتلا کردے تمہیں شیطان جیسے نکالا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے (المومنون:96 تا98)۔ ایک اور جگہ فرمایا: اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا یَدۡعُوۡا حِزۡبَهٗ لِیَكُوۡنُوۡا مِنۡ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ (فاطر:6)'' ترجمہ:۔ یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تاکہ وہ جہنمی بن جائیں''۔ ایک اور جگہ فرمایا: اَفَتَتَّخِذُوۡنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِیۡ وَ هُمۡ لَكُمۡ عَدُوٌّ ؕ بِئۡسَ لِلظّٰلِمِیۡنَ بَدَلًا (الکہف:50)'' ترجمہ: (اے اولاد آدم!) کیا تم بناتے ہو اسے اور اس کی ذریّت کو اپنا دوست مجھے چھوڑ کر حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں۔ ظالموں کیلئے بہت برا بدلہ ہے''۔ (یہی ہے وہ بد بخت) جس نے ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے قسم اٹھائی تھی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ حالانکہ وہ جھوٹا تھا۔ (تو اب ذرا خیال فرمائیے) اس کا معاملہ ہمارے ساتھ کس طرح کا ہوگا۔ اس نے کہا تھا: فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِیَنَّهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ (ص:83-82)'' ترجمہ: کہنے لگا تیری عزت کی قسم! میں ضرور گمراہ کردوں گا ان سب کو۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے تو نے چن لیا ہے''۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے: فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۝ اِنَّهٗ لَیۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَكَّلُوۡنَ ۝ اِنَّمَا سُلۡطٰنُهٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَوَلَّوۡنَهٗ وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ (النحل:100-98)
'' ترجمہ:۔ سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے۔ یقیناً اس کا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں۔ اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے۔ جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں''(6)۔ قراء حضرات کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ تلاوت کے بعد تعوذ پڑھنی چاہئے۔ انہوں نے ایک تو اس آیت کریمہ کے ظاہری سیاق وسباق سے استدلال کیا ہے دوسرے ان کے

خیال میں اس سے عبادت کے بعد انسان غرور اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوگا۔ یہ حضرت حمزہ کا مذہب ہے جسے ابن قلوقا اور ابو حاتم السجستانی نے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ ابو القاسم یوسف بن علی الہزلی المغربی نے اپنی کتاب ''العبادۃ الکامل میں بیان کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے لیکن یہ غریب ہے۔ محمد بن عمر رازی نے اسے اپنی تفسیر میں ابن سیرین سے بیان کیا ہے کہ ابراہیم نخعی، داؤد بن علی اصفہانی ظاہری کا مذہب بھی یہی ہے۔ قرطبی نے ابوبکر ابن عربی کے حوالہ سے امام مالک کا مذہب یہ بیان کیا ہے کہ قاری کو سورۂ فاتحہ کے بعد تعوذ (اعوذ باللہ) پڑھنا چاہیے۔ لیکن ابن عربی اسے غریب کہتے ہیں(1)۔

ایک تیسرا قول یہ ہے کہ تلاوت کے اول آخر دونوں مرتبہ تعوذ پڑھنا چاہیے تاکہ دونوں دلیلوں پر عمل ہو جائے۔ رازی نے یہی نقل کیا ہے۔ جمہور علماء کرام کا مذہب یہ ہے کہ استعاذہ (تعوذ) تلاوت کے شروع میں پڑھنا چاہیے تاکہ شیطان کے وساوس دور ہو جائیں۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ: فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ (النحل:98) کا معنی وہ یوں کرتے ہیں (اَیْ اِذَا اَرَدْتَ) یعنی جب تم تلاوت کا ارادہ کرو۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ: اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَاَيۡدِيَكُمۡ (المائدہ:6)'' ترجمہ: جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کیلئے تو (پہلے) دھولو اپنے چہرے اور اپنے بازو''۔ میں ارادہ مراد لیا گیا ہے (اِذَا قُمْتُمْ اَیْ اِذَا اَرَدْتُمُ الْقِیَامَ) اس مفہوم کی تائید متعدد احادیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند کے حوالہ سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو نماز کے لئے کھڑے ہوتے۔ اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرتے۔ پھر ثناء (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ) پڑھتے پھر تین مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھتے پھر فرماتے: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ''(2)۔

اصحاب سنن اربعہ نے یہی حدیث جعفر بن سلیمان عن علی بن علی الرفاعی سے روایت کی ہے۔ ترمذی کا قول ہے اس باب میں سب سے مشہور یہی ہے۔ ''ہمز'' کا معنی گلا گھونٹنا، نفخ کے معنی تکبر اور نفث سے مراد شعر گوئی ہے۔ جیسے ابو داؤد اور ابن ماجہ نے جبیر المطعم سے روایت کیا ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں داخل ہوتے ہی اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا (تین مرتبہ) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا (تین مرتبہ) سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (تین مرتبہ) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ (ایک مرتبہ) پڑھا۔ عمر کا قول ہے، ہمزہ: گلا گھونٹنا، نفخہ: تکبر اور نفثہ شعر ہیں (3)۔ ابن ماجہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مختصراً بھی نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ وَ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے، ہمزہ: الموتۃ (گلا گھونٹنا)، ونفخہ: الکبر (غرور) ونفثہ: الشعر (شعر گوئی) (4)۔ امام احمد نے حضرت ابو امامہ باہلی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو تین مرتبہ تکبیر کہتے، پھر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (تین مرتبہ) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ (تین مرتبہ) پھر فرماتے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ'' حافظ ابو یعلی احمد بن علی موصلی اپنی مسند میں لکھتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو آدمی حضور سرور دو جہاں رسول اللہ ﷺ کے سامنے لڑنے جھگڑنے لگے۔ غصہ سے ایک آدمی کے نتھنے پھول گئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک چیز جانتا ہوں اگر یہ کہہ لے تو اس کا غصہ ابھی فرو ہو جائے۔ (وہ یہ کلمات ہیں) ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' اسی طرح نسائی نے بھی اپنی کتاب ''الیوم واللیلۃ'' میں روایت کیا ہے۔ مسند

1۔ تفسیر القرطبی: 77/1
2۔ مسند امام احمد: 253/5
3۔ مسند امام احمد: 50/3
4۔ مسند امام احمد: 253/5

احمد، ابوداؤد، ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔ نسائی نے الیوم واللیلۃ میں حضرت ثوری اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلی کے حوالے سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے دو آدمی گالی گلوچ پر اتر آئے۔ ایک آدمی شدید غصے سے کانپنے لگا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کلمہ کہہ لے تو اس کا غصہ سرد پڑ جائے۔ حضرت معاذ نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ کلمہ کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا اسے کہنا چاہیے (اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِكَ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ) حضرت معاذ نے اس شخص کو یہ پڑھنے کا حکم دیا لیکن اس نے نہ پڑھا اور اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا (1)۔ یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ ترمذی کا قول ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ اس لئے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ (جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں) کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنا ہی ثابت نہیں۔ بلکہ وہ بیس برس پہلے وفات پا چکے تھے۔ میرے خیال میں یہ ہوسکتا ہے کہ شاید حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہو کیونکہ اس واقعہ کے وقت متعدد صحابہ موجود تھے۔ (رضی اللہ عنہم)۔ صحیح بخاری میں حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دو آدمی ایک دوسرے سے لڑ پڑے ایک آدمی کا چہرہ غصے سے سرخ تھا اور وہ اپنے ساتھی کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ کہہ لے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے۔ اگر یہ کہہ دے ''اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ'' لوگوں نے اس آدمی سے کہا کیا تم سن نہیں رہے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کیا فرما رہے ہیں وہ آدمی کہنے لگا میں پاگل نہیں ہوں (2)۔ یہی روایت صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور نسائی میں مختلف سندوں اور الفاظ سے مروی ہے۔ استعاذہ (تعوذ) کے بارے میں دیگر متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ان سب کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ ان کے بیان کیلئے اذکار (وظائف) اور فضائل اعمال کی کتابیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام جب سب سے پہلے وحی لے کر آئے تو رسول اکرم ﷺ کو تعوذ پڑھنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ حضرت ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ پہلے پہل جب حضرت جبریل علیہ السلام حضرت محمد ﷺ پر وحی لے کر آئے تو فرمایا: اے محمد! (ﷺ) اعوذ باللہ پڑھئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''اَسۡتَعِیۡذُ بِاللّٰہِ السَّمِیۡعِ الۡعَلِیۡمِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ'' پھر حضرت جبریل نے کہا کہیے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ پھر حضرت جبریل نے کہا اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ (پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا فرمایا۔) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ سب سے پہلی آیت ہے حضرت جبریل علیہ السلام کی معرفت سب سے پہلے آپ ﷺ پر نازل ہوئی۔ یہ اثر غریب ہے اس کی سند میں ضعف اور انقطاع ہے ہم نے اسے صرف اس لیے بیان کیا تا کہ معلوم رہے۔ واللہ اعلم۔ **(مسئلہ)** جمہور علماء کا یہ قول ہے کہ تعوذ پڑھنا مستحب ہے واجب نہیں کہ اس کا تارک گناہ گار شمار ہو۔ رازی نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے نقل کیا ہے کہ جب بھی تلاوت کا ارادہ کرے اس کا پڑھنا واجب ہے (خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں) حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس نے زندگی میں ایک دفعہ تعوذ پڑھ لیا واجب ادا ہو گیا۔ رازی نے حضرت عطا کے قول کی تائید میں یہ دلائل ذکر کیے ہیں کہ آیت کریمہ میں ''فَاسۡتَعِذۡ'' یہ امر کا صیغہ ہے۔ اور (اصولی قاعدہ ہے کہ) امر (جب قرائن سے خالی ہو تو) وجوب کیلئے آتا ہے اسی طرح آقائے دو جہاں ﷺ کا اس پر ہمیشگی اختیار کرنا بھی وجوب کی علامت ہے۔ نیز اس سے شیطان دور ہوتا ہے اور شیطان کا دور کرنا واجب ہے اور جس چیز سے واجب کی تکمیل ہوتی ہے وہ بھی واجب ہے۔ علاوہ بریں تعوذ پڑھنے میں زیادہ احتیاط ہے اور یہ بھی وجوب کا ایک طریقہ ہے۔ بعض علماء کے نزدیک تعوذ پڑھنے کے وجوب کا حکم صرف حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہے آپ ﷺ کی امت پر واجب نہیں۔ حضرت امام

1۔ مسند امام احمد: 240/5 2۔ بخاری: 34/8

مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ذکر کی جاتی ہے کہ فرض نمازوں میں اعوذ باللہ نہ پڑھے۔ اور رمضان شریف کی پہلی رات کے قیام میں اعوذ باللہ پڑھ لے۔ **(مسئلہ)** حضرت امام شافعی الاملاء میں لکھتے ہیں کہ تعوذ زور سے پڑھے اور اگر آہستہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اور اپنی کتاب ''الام'' میں لکھتے ہیں کہ دونوں طرح پڑھنے میں اختیار ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے آہستہ پڑھنا اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے باآواز بلند پڑھنا ثابت ہے۔ پہلی رکعت کے سوا دیگر رکعتوں میں تعوذ پڑھنے کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ (استحباب وعدم استحباب) لیکن عدم استحباب (مستحب نہ ہونا) کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم۔ جب اعوذ باللہ پڑھنے والا یہ کہہ دے (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ) تو شافعی اور ابوحنیفہ کے نزدیک یہی کافی ہے۔ بعض نے اس پر یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ''۔ بعض علماء کی رائے میں یوں کہے گا۔ ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'' یہ رائے ثوری اور اوزاعی کی ہے۔ بعض نے آیت کریمہ سے مطابقت اور حدیث ضحاک بن قیس کی وجہ سے جس کے راوی ابن عباس ہیں (حدیث اوپر گذر چکی ہے) کہا ہے کہ وہ یوں کہے ''اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ''۔ لیکن صحیح احادیث ہی قابل اتباع ہیں۔ واللہ اعلم۔ (مسئلہ) نماز میں تعوذ تلاوت کی خاطر پڑھا جاتا ہے یہ رائے حضرت امام ابوحنیفہ اور محمد کی ہے۔ حضرت امام ابو یوسف کا قول ہے کہ یہ نماز کیلئے ہے۔ اس لئے مقتدی بھی تعوذ پڑھے گا۔ اگرچہ قرأت نہیں کرے گا نیز نماز عید میں تکبیر تحریمہ کے بعد عیدین کی تکبیرات سے قبل تعوذ پڑھے گا۔ جمہور کی رائے میں تکبیرات کے بعد قرأت سے پہلے پڑھے گا۔ تعوذ کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ لغویات اور فحش باتوں سے منہ میں جو ناپاکی پیدا ہوتی ہے وہ اس سے دور ہو جاتی ہے۔ اور منہ کلام اللہ کی تلاوت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ اللہ سے مدد طلب کرنا اور اس کی قدرت کا اعتراف کرنا ہے۔ اس باطنی کھلے دشمن کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور عاجزی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اسے صرف اللہ رب العزت ہی روک سکتا ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ انسانی دشمن کے برعکس وہ حسن سلوک اور احسان سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔ جیسے قرآن کریم کی ان تین آیات میں ہے جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (بنی اسرائیل:65) ترجمہ:۔ جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا اور (اے محبوب!) کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کیلئے۔ انسانی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے فرشتے نازل فرمائے۔ جو مسلمان ان ظاہری دشمنوں کا (کفار) کے ہاتھ سے مارا جائے وہ شہید ہے۔ لیکن جو اس باطنی دشمن کے ہاتھوں گھائل ہو جائے راندۂ درگاہ قرار پائے۔ جس پر ظاہری دشمن غالب آجائیں وہ عند اللہ ماجور ہے۔ لیکن جس پر خفیہ دشمن غالب آجائے وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ چونکہ شیطان انسان کو اس طرح دیکھتا ہے کہ وہ اس کو نہیں دیکھ سکتا انسان اس ذات کی پناہ مانگتا ہے جو شیطان کو دیکھ رہی ہے لیکن شیطان اسے نہیں دیکھ سکتا۔

(فصل) تعوذ سے مراد اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا اور ہر صاحب شر کے شر سے بچنے کیلئے اس کے دامن کرم سے وابستہ ہونا ہے ''عیاذۃ'' کا معنی برائی کو دور کرنا اور ''لیاذ'' کا معنی بھلائی مانگنا ہے۔ جیسے متنبی کا ایک شعر ہے

يَامَنْ اَلُوْذُ بِهٖ فِيْمَا اُؤَمِّلُهٗ وَمَنْ اَعُوْذُ بِهٖ مِمَّنْ اُحَاذِرُهٗ
لَا يَجْبُرُ النَّاسُ عَظْمًا اَنْتَ كَاسِرُهٗ وَلَا يَهِيْضُوْنَ عَظْمًا اَنْتَ جَابِرُهٗ

ترجمہ:۔ اے وہ ذات پاک جو میری تمام امیدوں کی پناہ گاہ ہے (اے وہ پروردگار) جس کی میں پناہ طلب کرتا ہوں ہو اس چیز پر جس سے میں بچنا چاہتا ہوں۔ لوگ (سب مل کر بھی) وہ ہڈی جوڑ نہیں سکتے جسے تو توڑ دے۔ اور جسے تو جوڑ دے اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔

(اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ) کا معنی یہ ہے کہ میں شیطان مردود سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی جناب میں پناہ کی درخواست

کرتا ہوں تا کہ وہ مجھے دین و دنیا میں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یا مجھے کسی ایسے فعل سے نہ روک دے جسے بجالانے کا مجھے حکم دیا گیا۔ یا کسی ایسے فعل پر مجھے برانگیختہ نہ کرے جس سے مجھے رکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ انسان کو شیطان سے بچانے والا اللہ کے ماسوا اور کوئی نہیں۔ اسی لئے اس ربّ العالمین نے انسانی شیطانوں سے محفوظ رہنے کے لئے ان کی خاطر مدارات اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا۔ تا کہ وہ نقصان پہنچانے سے باز رہے۔ اور جنات میں سے شیطانوں سے بچنے کی خاطر اپنی پناہ لینے کا حکم دیا کیونکہ اسے نہ تو رشوت دی جا سکتی ہے اور نہ کوئی نیکی اس میں اثر کر سکتی ہے۔ کیونکہ شریر الطبع ہے۔ اس کو تم سے روکنے والا تو صرف وہ خالق وحدہ لاشریک ہی ہے۔ یہی مضمون تین پہلی آیات میں گذر چکا ہے۔ میرے علم کے مطابق کسی اور آیت میں یہ بات مذکور نہیں ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف:199) اس کا تعلق انسانوں کے روپ میں دشمنوں کے ساتھ ہے۔ پھر فرمایا: وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (اعراف:200) اور سورۂ المومنون میں فرمایا: اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ.........رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (مومنون:98-96) اور سورۂ حٰمٓ السجدہ میں فرمایا: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ.........اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (حٰم سجدہ:36-34) (نوٹ: ان تینوں آیات کا ترجمہ ابھی گذر چکا ہے۔ مترجم)

لفظ شیطان لغت عرب میں شَطَنَ اِذَا بَعُدَ سے مشتق ہے اس کے معنی دور ہونا ہیں چونکہ یہ لعین بھی انسانی طبیعت سے دور اور اپنے فسق کے سبب ہر بھلائی سے بعید ہے۔ اس لئے اسے شیطان کہا گیا۔ بعض علماء کی رائے میں یہ شاط سے مشتق ہے کیونکہ وہ ناری مخلوق ہے۔ بعض علماء کی رائے میں مفہوم کے اعتبار سے تو دونوں معانی درست ہیں لیکن پہلا اصح (زیادہ صحیح) ہے۔ اہل عرب کے کلام میں اس کی تائید ملتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوت اقتدار کا ذکر کرتے ہوئے امیہ بن ابی الصلت کہتا ہے ؎

اَيَّمَا شَاطِنٍ عَصَاهُ عَكَاهُ　　ثُمَّ يُلْقىٰ فِي السِّجْنِ وَالْاَغْلَالِ

(ترجمہ: جو (خبیث) جن بھی آپ کی نافرمانی کرتا اسے کوڑوں کی سزا دیتے اور قید و بند میں ڈال دیتے۔) یہاں اس نے اَيَّمَا شَاطِنٍ کہا ہے اَيَّمَا شَائِطٍ نہیں کہا۔ نابغہ ذبیانی (زیاد بن عمرو بن معاویۃ بن جابر بن ضباب بن یربوع بن مرۃ بن سعد بن ذبیان اس کا نام ہے) کہتا ہے۔ ؎

نَأَتْ بِسُعَادٍ عَنْکَ نَوَی شُطُوْنُ　　فَبَاتَتْ وَالْفُؤَادُ بِهَا رَهِيْنُ

ان دونوں اشعار میں یہ لفظ شطن سے مشتق ہے اور دور ہونے کے معنی میں مستعمل ہے سیبویہ کا قول ہے اہل عرب کہتے ہیں ''تَشَيْطَنَ فُلَانٌ اِذَا فَعَلَ فِعْلَ الشَّيَاطِيْن'' یعنی جب کوئی شیطانی کام کرے تو یہ کہتے ہیں۔ اگر یہ شاط سے مشتق ہوتا تو تَشَيَّطَ فلان کہتے پس ثابت ہوا کہ شیطان شطن سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بعد اور دوری کے ہیں۔ اسی لئے حیوانات اور جنس و انس میں سے جو سرکشی کرے اسے شیطان کہہ دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (انعام:111) (اور اسی طرح بنا دیئے ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن (یعنی) سرکش انسان اور جن جو چپکے چپکے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوشنما باتیں (لوگوں کو) دھوکا دینے کیلئے) مسند امام احمد میں حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوذر شیاطین جن وانس سے پناہ طلب کر (فرماتے ہیں) میں نے عرض کی کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں'' (1)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت، گدھا اور کالا کتا نماز کو

1۔ المسند: 178/5

توڑ دیتے ہیں۔ میں نے عرض کی حضور سرخ اور زرد میں کالے کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا سیاہ کتا شیطان ہے (1)۔ ابن وہب کا قول ہے کہ حضرت عمر ایک مرتبہ ترکی گھوڑے پر سوار ہوئے وہ اترا کر چلنے لگا۔ آپؓ اسے مارنے لگے لیکن اس کی فخریہ چال میں اضافہ ہو گیا تو آپؓ نیچے اتر آئے اور فرمایا تم نے تو مجھے شیطان پر سوار کر دیا تھا میرے دل نے تکبر محسوس کیا تو میں اتر آیا۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔ رجیم یہ فعیل کے وزن پر مفعول کا صیغہ ہے۔ یعنی وہ محروم ہے ہر بھلائی سے دھتکارا ہوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِينِ (الملک :5) '' ترجمہ: اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے اور بنا دیا ہے انہیں شیاطین کو مارنے بھگانے کا ذریعہ''۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے: اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۣالْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (صافات :6-10) '' بلاشبہ ہم نے آراستہ کیا ہے آسمان دنیا کو ستاروں کے سنگھار سے۔ اور (اسے) محفوظ کر دیا ہے ہر سرکش شیطان (کی رسائی) سے۔ نہیں سن سکتے کان لگا کر عالم بالا کی باتوں کو اور پتھراؤ کیا جاتا ہے ان پر ہر طرف سے ان کو بھگانے کے لئے اور ان کیلئے دائمی عذاب ہے۔ مگر جو شیطان کچھ جھپٹ لینا چاہتا ہے تو تعاقب کرتا ہے اس کا تیز شعلہ''۔ ایک اور آیت میں فرمایا: وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ (الحجر :18-16) '' اور بے شک ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور ہم نے آراستہ کیا ہے آسمان کو دیکھنے والوں کیلئے۔ اور ہم نے محفوظ کر دیا ہے آسمان کو ہر شیطان سے جو راندہ ہوا ہے۔ بجز اس کے جو چوری چھپے سن لے تو (اس صورت میں) تعاقب کرتا ہے اس کا ایک روشن شعلہ''۔ وغیرہ دیگر آیات میں ہے۔ بعض کے نزدیک رجیم بمعنی راجم ہے (رجم کرنے والا) کیونکہ وہ لوگوں کو وسواس اور دھوکے میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور اور اصح ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ کی تفسیر اور احکام

(بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ)

(اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے)

صحابہ کرام نے کتاب اللہ کو اسی کے ساتھ شروع کیا۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۂ نمل کی ایک آیت کا جز ہے۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ ہر سورت کے شروع میں ایک مستقل آیت ہے یا ہر سورت کی آیت ہے اس کے شروع میں لکھی ہوئی ہے یا ہر سورت کی بعض آیت ہے یا یہ صرف سورۂ فاتحہ کی ہی آیت ہے اور دوسری سورتوں کی نہیں۔ یا یہ فواصل کیلئے یعنی سورتوں کو ایک دوسری سے جدا کرنے کیلئے لکھی جاتی ہے نہ کہ آیت کے طور پر۔ علماء سلف وخلف کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ کسی اور مقام پر اس کی تفصیل بھی موجود ہے۔ سنن ابوداؤد میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سورتوں کا باہمی فاصلہ معلوم نہیں ہوتا تھا حتی کہ آپ ﷺ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (تسمیہ) نازل ہوئی (2)۔ حاکم ابوعبداللہ نیشاپوری نے بھی اپنی مستدرک میں اسی طرح لکھا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر سے ایک مرسل حدیث بھی ہے۔ صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تسمیہ (بسم اللہ) کو نماز کے دوران سورۂ فتح سے پہلے پڑھا اور اسے ایک آیت شمار کیا۔ لیکن اس کے ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ہیں یہ ضعیف

1۔ مسلم: کتاب الصلوٰۃ، باب مایستر المصلی :365　　2۔ ابوداؤد: استفتاح الصلوٰۃ: باب 10

ہیں دارقطنی نے اس کی متابع ذکر کی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ ہیں۔ اسی کی مثل حضرت علی، ابن عباس وغیرہم سے بھی مروی ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ سورۂ توبہ کے سوا ہر سورت کی آیت ہے۔ ان میں حضرات ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر، ابو ہریرہ، علی رضی اللہ عنہم اجمعین، تابعین میں سے حضرات عطاء، طاؤس، سعید بن جبیر، حضرت مکحول، اور زہری شامل ہیں۔ یہی قول عبداللہ بن مبارک، شافعی، احمد بن حنبل (ایک روایت کے مطابق)، اسحٰق بن راھویہ، ابوعبید قاسم بن سلام رحمتہ اللہ علیہم کا ہے۔ مالک، ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے میں نہ تو یہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی دوسری سورت کی۔ امام شافعی سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ سورت فاتحہ کی تو آیت ہے لیکن اور کسی سورت کا جز نہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ سورت کی پہلی آیت کا جز ہے۔ لیکن یہ دونوں قول غریب ہیں۔ داؤد ظاہری کا قول ہے کہ یہ ہر سورت کی ابتدا میں ایک مستقل آیت ہے۔ لیکن سورت میں شامل نہیں۔ امام احمد بن حنبل سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ ابوبکر رازی نے ابوبکر کرخی کا مذہب بھی یہی بیان کیا ہے۔ یہ دونوں احناف کے اکابر مشائخ میں سے ہیں۔ یہاں تک تو تھی بحث بسم اللہ الخ کے سورۂ فاتحہ کا جز ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں۔ اب نماز میں اسے بلند آواز سے پڑھنا چاہیے یا نہیں اس اختلاف کی بنیاد بھی سابقہ اختلاف پر ہے۔ جو علماء اسے سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں کہتے وہ تو اسے بلند آواز پڑھنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہی رائے ان علماء کی ہے جو اسے سورۂ فاتحہ سے الگ ایک آیت مانتے ہیں۔ جن فقہاء کی رائے ہے کہ یہ سورتوں کے اوائل کا جز و ہے ان میں باہمی اختلاف ہے امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی یہ رائے ہے کہ اسے سورۂ فاتحہ اور ساتھ ملائی جانے والی سورت سے قبل باآواز بلند پڑھنا چاہیے۔ صحابہ، تابعین اور ائمہ مسلمین میں سے بعض اسلاف اور متاخرین میں سے بعض گروہوں کی یہی رائے ہے۔ صحابہ میں سے ابو ہریرہ، ابن عمر، ابن عباس اور معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین اسے بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ ابن عبدالبر اور بیہقی نے حضرت عمر اور علی رضی اللہ عنہم سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ خطیب نے خلفاء اربعہ (ابوبکر وعمر وعثمان وعلی) رضوان اللہ علیہم کے بارے میں بھی یہی نقل کیا ہے لیکن یہ غریب ہے۔ اور تابعین میں سے سعید بن جبیر، عکرمہ، ابوقلابہ، زہری، علی بن حسن ان کے صاحب زادے محمد، سعید بن مسیّب، عطاء، طاؤس، مجاہد، سالم، محمد بن کعب قرظی، عبید، ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، ابووائل، ابن سیرین، محمد بن المنکدر، علی بن عبداللہ بن عباس ان کے لخت جگر محمد، نافع مولی ابن عمر، زید بن اسلم، عمر بن عبدالعزیز، ازرق بن قیس، حبیب بن ابی ثابت، ابوشعثاء، مکحول، عبداللہ بن معقل بن مقرن (بروایت بیہقی) عبداللہ بن صفوان، محمد بن حنفیہ، (بروایت ابن عبدالبر) عمرو بن دینار شامل ہیں۔ ان سب کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ چونکہ باآواز بلند پڑھی جاتی ہے لہٰذا تسمیہ جو کہ اس کا جز ہے وہ بھی باآواز بلند پڑھی جائے گی۔ نسائی نے سنن میں، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے نماز کے دوران قرأت کرتے ہوئے باآواز بلند تسمیہ پڑھی اور فارغ ہونے کے بعد فرمایا میری نماز تمہاری نسبت رسول ﷺ کی نماز کے زیادہ مشابہ ہے۔ دارقطنی، خطیب، بیہقی وغیرہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز کو بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے شروع فرماتے تھے ترمذی کا قول ہے کہ اس کی سند اتنی ارفع نہیں ہے۔ مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ باآواز بلند تسمیہ پڑھا کرتے تھے (1)۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کی قرأت کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ ہر لفظ کو دراز کر کے پڑھتے تھے۔ پھر انہوں نے تسمیہ پڑھ کر سنائی بسم اللہ کو کھینچ کر پڑھا۔ پھر الرحمٰن کو لمبا کیا پھر الرحیم کو دراز کیا (2)۔

1۔ دارقطنی: 302/1　2۔ فتح الباری: 91/9

مسند امام احمد، سنن ابوداؤد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرأت کے دوران ہر ہر آیت پر رکتے تھے: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (1)۔ دارقطنی کا قول ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ حضرت امام ابوعبداللہ شافعی نے اور حاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور بسم اللہ الخ چھوڑ دی۔ مہاجرین صحابہ جو اس وقت موجود تھے انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا۔ چنانچہ جب وہ پھر نماز کیلئے کھڑے ہوئے تو انہوں نے بسم اللہ الخ پڑھی۔ اس قدر احادیث اور آثار جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اس مذہب کی دلیل کیلئے کافی ہیں۔ باقی رہے اس پر اعتراضات، غریب روایات، ان کی اسناد، ان کا مناقشہ (ان کو صحیح یا ضعیف قرار دینا) وغیرہ مباحث کے ذکر کرنے کی یہ جگہ نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ نماز میں تسمیہ کو باآواز بلند نہیں پڑھا جائے گا۔ خلفاء اربعہ، عبداللہ بن مغفل، سلف صالحین میں سے بعض تابعین اور چند متاخرین سے یہی ثابت ہے۔ ابوحنیفہ، ثوری، اور احمد بن حنبل کا یہی مذہب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ بسم اللہ الخ سرے سے پڑھی ہی نہیں جائے گی (نہ ہی سراً نہ ہی جہراً)۔ ان کی ایک دلیل صحیح مسلم میں مذکور حضرت سیدہ عائشہ والی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کو تکبیر تحریمہ سے اور قرأت کو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ سے شروع فرماتے تھے (2)۔ ان کی دوسری دلیل صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ والی روایت ہے آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی اکرم ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ سب قرأت کو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ سے شروع فرمایا کرتے تھے۔ مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ وہ قرأت کی ابتدا میں اور آخر میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ سنن میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ یہ ہیں ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے اس مسئلہ کے بارے میں دلائل۔ یہ سب قریب قریب ہیں کوئی بڑا اختلاف نہیں کیونکہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ آہستہ پڑھیں یا باآواز بلند نماز صحیح ہے۔ وَلِلّٰهِ الۡحَمۡدُ وَالۡمِنَّةُ۔

فصل بِسۡمِ اللّٰهِ کے فضائل

امام وقت، پیشوائے زمانہ ابومحمد عبدالرحمٰن بن ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ سے بسم اللہ کی نسبت سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے نام (اللہ) اور اس کے مابین اسی قدر قرب ہے جیسے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی میں۔'' ابوبکر بن مردویہ نے حضرت زید بن مبارک سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ حافظ ابن مردویہ نے ہی دو سندوں سے حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب ان کی والدہ نے استاد کے پاس بٹھایا۔ تو استاد نے کہا لکھئے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کیا لکھوں استاد نے کہا بسم اللہ۔ حضرت عیسیٰ نے استفسار کیا۔ بسم اللہ کیا ہے۔ استاد نے کہا مجھے علم نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ باء سے مراد ''بِهَاءُ اللّٰهِ'' ہے یعنی (اللہ کا انس وقرب) اسین سے مراد سَنَاءُ ہٗ (بلندی، روشنی) میم سے مراد اس کی مملکت ہے۔ اور اللہ سے مراد سب معبودوں کا معبود الرحمٰن سے مراد رَحۡمٰنُ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ (دنیا و آخرت میں رحم کرنے والا)، رحیم سے مراد

1۔ مسند امام احمد: 302/6 — 2۔ صحیح بخاری: کتاب الاذان: 189/1

آخرت میں رحم کرنے والا ہے۔" اس روایت کو ابن جریر نے اسی روایت کو ابن مسعود اور ابوسعید سے اسی طرح ذکر کیا ہے لیکن یہ بہت ہی غریب ہے ممکن ہے یہ کسی صحابی وغیرہ سے مروی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ روایت اسرائیلیات سے ہو مرفوع حدیث نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ جویبر نے حضرت ضحاک سے اس طرح روایت کیا ہے ابن مردویہ نے سلیمان بن بریدہ سے دو مختلف سندوں سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھ پر ایک ایسی آیت اتری ہے جو میرے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سوا کسی پر نازل نہیں ہوئی یہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہے" (1)۔ ابن مردویہ نے ہی اپنی سند کے ساتھ اس روایت کو حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت اتری بادل مشرق کی طرف چھٹ گئے۔ ہوائیں رک گئیں۔ سمندر جوش میں آ گیا جانوروں نے کان لگا لیے۔ آسمان سے شیاطین پر سنگباری کی گئی۔ اللہ رب العزت نے اپنی عزت وجلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس چیز پر میرا نام لیا جائے گا اس میں برکت ہوگی۔ حضرت وکیع حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس کی یہ آرزو ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کے انیس فرشتوں سے نجات دے وہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھے۔ ہر حرف کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے ڈھال عطا فرما دے گا۔ ابن عطیہ اور قرطبی نے اسے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے اس کی تائید میں ایک حدیث بھی ذکر کی ہے۔ جس میں ہے کہ میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا کہ وہ ایک آدمی کی طرف جلدی بڑھ رہے تھے جس نے کہا تھا "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْداً كَثِيراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيْهِ" اس میں بھی تیس سے اوپر حروف ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت عاصم سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابو تمیمہ رضی اللہ عنہ (جو کہ حضور ﷺ کی سواری پر سوار تھے) سے سنا کہ "حضور ﷺ کی سواری پھسلی تو میں نے کہا شیطان کا ناس ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کہو۔ اگر تم یہ کہو گے شیطان کا ستیاناس ہو تو وہ (خوشی سے) پھولتا ہے اور کہتا ہے میں نے اپنی قوت سے اسے گرایا ہے۔ اگر تم بسم اللہ کہو تو مکھی کی طرح ذلیل وخوار ہو جاتا ہے" (2)۔ حضرت امام احمد کی روایت میں اسی طرح ہے۔ نسائی نے اپنی کتاب "الیوم واللیلة" میں، ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو نقل کیا ہے اور ابوتمیمہ کا نام اسامہ بن عمیر بتایا ہے۔ صرف اس کے الفاظ میں کچھ تبدیلی ہے "فرمایا ایسے نہ کہہ۔ وہ یہ سن کر پھولتا ہے اور کمرے کی طرح ہو جاتا ہے۔ لیکن بسم اللہ کہہ تو وہ مکھی کی طرح ذلیل وخوار ہو جاتا ہے (3)۔ یہ بسم اللہ کی برکت ہے۔ لہٰذا ہر کام اور بات کے شروع میں بسم اللہ کہنا چاہئے۔ خطبہ کے شروع میں بھی بسم اللہ کہنا مستحب ہے۔ کیونکہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ جس کام کو بسم اللہ سے نہ شروع کیا جائے وہ کٹا ہوا (بے برکت) ہوتا ہے (4)۔ بیت الخلاء میں داخلے سے قبل بھی بسم اللہ پڑھ لینا چاہئے۔ حدیث شریف میں اس کا بھی ذکر آیا ہے۔ وضو کی ابتدا میں بھی تسمیہ مستحب ہے جیسا کہ مسند امام احمد اور سنن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سعید بن زید اور ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو شخص وضو میں اللہ کا نام نہ لے اس کا وضو نہیں ہوتا۔ یہ حدیث حسن ہے (5)۔ بعض فقہاء کے نزدیک تو بوقت وضو بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ بعض مطلقاً وجوب کے قائل ہیں۔ امام شافعی اور ایک جماعت کی رائے میں ذبیحہ پر وقت ذبح بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔ بعض نے یاد آ جانے کے وقت اور بعض نے مطلقاً واجب قرار دیا ہے۔ اس کا تفصیلی بیان اپنی جگہ آئے گا۔ رازی نے اپنی تفسیر میں بسم اللہ کے فضائل میں چند احادیث ذکر کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو اپنی بیوی کے پاس جائے تو بسم اللہ کہہ۔ اگر اس سے اللہ تمہیں فرزند عطا فرمائے تو اس کے اور اس کی ذریت کے سانسوں کے برابر تمہیں نیکیاں عطا کی جائیں گی۔" اس

1۔ تاریخ بغداد: 319/3 — 2۔ مسند امام احمد: 59/5 — 3۔ مسند امام احمد: 59/5
4۔ مسند امام احمد: 359/2 — 5۔ مسند امام احمد: 418/2

روایت کی کوئی اصل نہیں۔ میں نے تو اسے کتب معتبرہ یا غیر معتبرہ میں کہیں نہیں دیکھا۔ اسی طرح کھانا کھاتے وقت بھی تسمیہ کہنا مستحب ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پروردہ حضرت عمر بن ابوسلمہ سے فرمایا "بسم اللہ کہہ اور اپنے دائیں ہاتھ سے اور اپنے سامنے سے کھا" (1)۔ بعض علماء نے اس حالت میں بسم اللہ کہنا بھی واجب قرار دیا ہے۔ اسی طرح میاں بیوی کے ازدواجی خفیہ تعلقات کے وقت بھی بسم اللہ مستحب ہے جیسا کہ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی اپنی زوجہ کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو کہے "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَ جَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا" (2)۔ (اللہ کے نام سے۔ بارالہا ہمیں شیطان سے بچا اور جو کچھ (اولاد) ہمیں تو عطا فرمائے اسے بھی شیطان سے بچا)۔ اگر اس مباشرت سے حمل ٹھہر گیا اور بچہ پیدا ہوا تو اس بچے کو شیطان کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہاں یہ بھی واضح ہو گیا کہ بسم اللہ کی "باء" کو کس کے متعلق کریں گے کیا وہ اسم ہے یا فعل؟۔ نحویوں کا اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ ہر ایک کی دلیل قرآن کریم میں موجود ہے۔ جن علماء کے نزدیک یہاں اسم مقدر مانا جائے گا۔ تو عبارت یوں بنے گی "بسم اللہ ابتدائی" یعنی اللہ کے نام سے میری ابتداء ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (ہود: 41) " اور نوح نے کہا سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے"۔ بعض نے فعل محذوف مانا ہے خواہ امر ہو یا خبر (ماضی و مضارع) جیسے "اَبْدَأُ بِسْمِ اللّٰهِ اَوْ اِبْتَدَأْتُ بِسْمِ اللّٰهِ" کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ دراصل دونوں صحیح ہیں۔ اس لئے کہ فعل کے لئے بھی مصدر لازمی ہوتا ہے۔ تو جو کام شروع کیا جا رہا ہے اس کے مطابق فعل محذوف نکالا جا سکتا ہے۔ جیسے کھڑا ہونا، بیٹھنا، کھانا، پینا، پڑھنا، وضو کرنا یا نماز پڑھنا۔ یمن و برکت، اس کام کو بخیر وخوبی انجام دینے اور قبولیت کے لئے ان سب کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا نام لینا مشروع ہے واللہ اعلم۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ پہلی مرتبہ جبریل علیہ السلام جب حضور ﷺ پر نازل ہوئے تو فرمایا "اے محمد! پڑھئے "اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ"۔ پھر فرمایا پڑھئے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں گویا کہ اٹھتے، بیٹھتے، تلاوت کرتے وقت سب امور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع فرمایئے۔ یہ الفاظ ابن جریر کے ہیں۔ رہا مسئلہ اسم کا کیا نام مسمی ہے یا کچھ اور۔ اس بارے میں لوگوں کے تین اقوال ہیں۔ (اسم ہی مسمّٰی ہے۔ یہ قول ابوعبیدہ، سیبویہ کا ہے۔ باقلانی، ابن فورک نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔ رازی (محمد بن عمر) المعروف ابن خطیب الرازی اپنی تفسیر کی ابتدا میں لکھتے ہیں۔ "حشویہ کرمیہ اور اشعریہ کا قول ہے کہ اسم نفس مسمی ہے اور نفس تسمیہ کا غیر ہے۔ معتزلہ کی رائے میں اسم مسمی کا غیر اور نفس تسمیہ ہے۔ ہماری پسندیدہ رائے کے مطابق اسم مسمی کا بھی غیر ہے اور تسمیہ کا بھی۔ پھر ہم کہتے ہیں اگر اسم سے مراد وہ لفظ ہے جو آواز کے ٹکڑوں اور حروف کا مجموعہ ہے۔ تو بالبداہت یہ ثابت ہوا کہ یہ مسمی کا غیر ہے اور اگر اسم سے مراد ذات مسمی ہے تو یہ واضح کی وضاحت کرنے کے مترادف ہے جو ایک بے کار بحث ہے۔ تو ثابت ہوا کہ اس بحث میں الجھنا ہی فضول ہے۔ اس کے بعد اسم اور مسمی کے تضاد پر دلائل کو شروع کرتے ہیں کہ کبھی اسم موجود ہوتا ہے اور مسمی مفقود ہوتا ہے۔ جیسے معدوم کا لفظ۔ کبھی ایک چیز کے متعدد اسماء ہوتے ہیں۔ جیسے مترادفات۔ کبھی اسم ایک ہوتا ہے اور مسمی متعدد جیسے لفظ مشترک۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسم اور مسمی کے مابین فرق ہے۔ نیز اسم تو لفظ ہے اور یہ عرض ہے۔ اور مسمی کبھی ذات ہوتی ہے۔ (ممکن یا واجب)۔ اسی طرح لفظ آگ یا برف ہے۔ اگر اسم ہی مسمی ہوتا تو آگ کا لفظ

1۔ مسلم، کتاب الاشربہ، 1600 2۔ البخاری، کتاب بدء الخلق: 148/4

بولنے والا تپش محسوس کرتا اور برف کا لفظ بولنے والا ٹھنڈک محسوس کرتا۔ علی ھذا القیاس۔ لیکن کوئی عقل مند اور ذی شعور آدمی ایسا نہیں کہتا۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (اعراف: 180) (اور اللہ ہی کیلئے ہیں نام اچھے اچھے سو پکارو اسے انہیں ناموں سے) حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔" (ذرا خیال فرمائیے) یہ بہت سے اسماء ہیں حالانکہ مسمّیٰ ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ (وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ) میں اسماء کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسے ایک اور جگہ فرمایا: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (واقعہ۔74) " تو (اے حبیب!) تسبیح کیجئے اپنے رب عظیم کے نام کی"۔ وغیرہ دیگر آیات۔ یہ اضافت بھی مغایرت کا تقاضا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (فَادْعُوْهُ بِهَا) اَیْ فَادْعُو اللّٰهَ بِاَسْمَائِهٖ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء سے پکارو۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اسم مسمّیٰ کا غیر ہے۔ جن علماء کے نزدیک اسم عین مسمّیٰ ہے ان کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ (الرحمٰن: 78) " (اے حبیب!) بڑا بابرکت ہے آپ کے رب کا نام، بڑی عظمت والا، احسان فرمانے والا" حالانکہ خیرات وبرکات کا سرچشمہ تو خود اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ذات مقدسہ کی عظمتوں کی بنا پر اس کا نام بھی بڑائیوں والا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کہے کہ زینب یعنی اس کی بیوی کو طلاق ہے تو اسے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اگر اسم مسمّیٰ کا عین نہ ہوتا تو طلاق واقع نہ ہوتی اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نام والی عورت کو طلاق ہے۔ رازی کا قول ہے۔ جہاں تک تسمیہ کا تعلق ہے۔ یہ اسم (نام) اس ذات کے ساتھ مختص ہے۔ ظاہر ہے یہ اور چیز ہے واللہ اعلم۔ (اللہ) رب العزت جل مجدہ کا علم۔ کہا جاتا ہے کہ اسم اعظم یہی ہے کیونکہ تمام صفاتی نام اس کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۞ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۞ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (حشر: 24-22) " اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جاننے والا ہر چھپی ہوئی اور ہر ظاہر چیز کا۔ وہی بہت مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب کا بادشاہ، نہایت مقدس سلامت رکھنے والا، امان بخشنے والا، نگہبان، عزت والا، ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والا، متکبر ہے۔ پاک ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہی اللہ سب کا خالق، سب کو پیدا کرنیوالا (سب کی مناسب) صورت بنانے والا ہے۔ سارے خوبصورت نام اسی کے ہیں۔ اس کی تسبیح کر رہے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہی عزت والا حکمت والا ہے"۔ ان آیات میں باقی تمام اسماء بطور صفت لائے گئے ہیں۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (اعراف: 180) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل: 110) " آپ فرمائیے یا اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔ جس نام سے اسے پکارو اس کے سارے نام (ہی) اچھے ہیں"۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ " اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں ایک کم ایک سو۔ جس نے انہیں یاد کر لیا۔ وہ جنتی ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں ان کی تفصیل بھی آئی ہے لیکن دونوں روایت میں الفاظ کی کمی یا زیادتی کا اختلاف ہے۔ رازی نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے روایت کیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے پانچ ہزار اسماء ہیں۔ ایک ہزار قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں۔ ایک ہزار توراۃ میں، ایک ہزار انجیل میں، ایک ہزار زبور میں اور ایک ہزار لوح محفوظ میں ہیں۔ یہ وہ جلیل القدر نام ہے جس کے ساتھ رب تعالیٰ کے سوا کسی اور کو موسوم نہیں کیا گیا۔ اسی وجہ سے کلام عرب میں اس کا مادۂ اشتقاق معلوم نہیں۔ نحویوں کی ایک جماعت کی رائے میں یہ اسم جامد غیر مشتق ہے۔ قرطبی نے علماء کرام کی

ایک جماعت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ ان میں شافعی، خطابی، امام الحرمین اور غزالی وغیرہ ہیں۔ خلیل اور سیبویہ سے مروی ہے کہ اس میں الف لام لازمی ہے۔ خطابی نے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یا اللہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن یا الرحمٰن نہیں کہہ سکتے۔ اگر لفظ اللہ میں الف لام اصل کلمہ نہ ہوتا تو حرف نداء کو الف لام پر داخل کرنا جائز نہ ہوتا۔ ایک قول کے مطابق یہ اسم مشتق ہے (1)۔ وہ بطور دلیل رؤبۃ بن عجاج کا یہ شعر ذکر کرتے ہیں۔

لِلّٰه دَرُّ الغَانِيَاتِ المُدَّهِ سَبَّحْنَ وَاسْتَرْ جَعْنَ مِنْ تَاَلُّهِي

شاعر نے "مصدر اَلتَّاَلُّہُ" کا ذکر کیا ہے، اس کی گردان یوں چلتی ہے "اَلِهَ يَاْلَهُ اِلَاهَةً وَتَاَلُّهاً"۔ جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کریمہ کو یوں پڑھا: "يَذَرَكَ وَاِلٰهَتَكَ" (سورۂ اعراف: 127) (اور چھوڑے رہے موسیٰ تجھے اور تیرے خداؤں کو) اس سے مراد عبادت ہے۔ یعنی وہ سب کا معبود ہے لیکن وہ کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ مجاہد وغیرہ نے کہا ہے کہ بعض علماء نے اس کے مشتق ہونے پر ان آیات سے دلیل پکڑی ہے۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ "اور وہی اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں" (انعام: 3)۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (زخرف: 84) (اور وہی ایک آسمان میں خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے)۔ سیبویہ نے خلیل سے نقل کیا ہے کہ اصل میں "اِلَاهٌ" بروزن فعال ہے۔ پھر ہمزہ کے بدلے میں الف لام ذکر کیا گیا۔ سیبویہ کا قول ہے یہ اسی طرح ہے جیسے ناس کی اصل اناس ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ اصل میں "لَاهٌ" کہا برائے تعظیم اس پر الف لام کا اضافہ کر دیا گیا۔ سیبویہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے

لَاهِ اِبْنَ عَمِّكَ لَا اَفْضَلْتَ فِي حَسَبٍ عَنِّي وَلَا اَنْتَ دَيَّانِي فَتَخْزُوْنِي

قرطبی کا قول ہے فتخزونی ای فَتَسُوْسُنِيْ۔ کسائی اور فرا کا قول ہے کہ اس کی اصل "اَلْاِلٰهُ" ہے ہمزہ کو حذف کر کے پہلے لام کو دوسرے میں ادغام کر دیا۔ جیسے ایک دوسری آیت میں ہے (لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ) اَیْ لٰكِنْ اَنَا۔ حسن نے اسی طرح پڑھا ہے۔ قرطبی آگے لکھتے ہیں۔ کہ ایک قول میں یہ "وَلِهَ" اذا تَحَيَّرَ (حیران ہونا) اور "اَلْوَلَهُ" (عقل کا چلے جانا۔ کہا جاتا ہے رَجُلٌ وَالِهٌ وَامْرَاَةٌ وَلْهٰى وَمَوْلُوْهَةٌ۔ یہ اس وقت کہتے ہیں جب اسے جنگل میں بھیج دیا جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقت پر عقل حیران و پریشان اور سراسیمہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسے یہ نام دیا گیا۔ اس بنا پر یہ وِلَاهٌ سے مشتق ہوگا واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔ جیسے وشاح کو اشاح اور وسادۃ کو اسادۃ بھی کہتے ہیں (2)۔ رازی نے ایک قول یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ "اَلِهْتُ اِلٰى فُلَانٍ اَیْ سَكَنْتُ اِلَيْهِ" سے مشتق ہے۔ (میں نے فلاں سے تسکین وراحت حاصل کی)۔ چونکہ عقول اس کے ذکر سے راحت حاصل کرتی ہیں اور روح کی حقیقی خوشی بھی اسی کی معرفت میں ہے کیونکہ علی الاطلاق کامل وہی ذات والا صفات ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۞ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (سورۂ رعد: 28) "دھیان سے سنو! اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو ایمان بھی لائے" (ضیاء القرآن) ایک رائے کے مطابق یہ "لَاهَ يَلُوْهُ" اِذَا احْتَجَبَ (پوشیدہ ہونا) یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ "اَلِهَ الْفَصِيْلُ اِذَا اُوْلِعَ بِاُمِّهٖ" سے مشتق ہے (بچھڑے (یا ٹوڈے) کا اپنی ماں کی طرف مشتاق ہونا) مفہوم یہ ہے کہ بندے اس کے مشتاق ہیں ہر حال میں اسی کی طرف تضرع اور زاری سے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ایک رائے میں یہ اَلِهَ الرَّجُلُ يَاْلَهُ اِذَا فَزِعَ مِنْ اَمْرٍ نَزَلَ بِهٖ فَاَلَهَهٗ اَیْ اَجَارَهٗ سے نکلا ہے۔ یہ اس وقت کہتے ہیں جب آدمی اچانک کسی معاملے سے گھبرا اٹھے اور کوئی دوسرا اسے پناہ دے دے۔ چونکہ تمام مخلوقات کو ہر قسم کے مصائب

1۔ تفسیر الطبری: 54/1 2۔ تفسیر القرطبی: 102

سے نجات دلانے والی ذات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہے اسلئے اسے یہ نام دیا گیا۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے: وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (مؤمنون:88) ''اور وہ پناہ دیتا ہے (جسے چاہے) اور پناہ نہیں دی جاسکتی اس کی مرضی کے خلاف'' منعم حقیقی بھی وہی ذات ہے۔ جیسے فرمایا: وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (النحل:53) ''اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ کی دی ہوئی ہیں''۔ وہی مطعم (کھلانے والا) ہے ارشاد ہوتا ہے: وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (الانعام:14) ''اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور خود نہیں کھلایا جاتا'' وہی موجد حقیقی ہے ارشاد فرماتا ہے: قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (نساء:78) ''فرمادیجئے سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے''۔ رازی کا مختار مذہب یہی ہے کہ یہ اسم مشتق نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہی قول خلیل، سیبویہ، اکثر اصولیوں اور فقہاء کا ہے۔ پھر اس کی متعدد دلیلیں ذکر کی ہیں۔

(1) اگر یہ مشتق ہوتا تو اس کے معنی میں بہت سے افراد کی شرکت ہوتی۔ (2) پھر اس لفظ کو بطور موصوف لایا جاتا ہے اور اس کی بہت سی صفات ذکر کی جاتیں ہیں۔ جیسے آپ کہیں اَللّٰهُ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مشتق نہیں ہے۔ قرآن میں ایک جگہ جو الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ اللّٰهِ '' (یعنی) عزیز وحمید کے راستہ کی طرف۔ وہی اللہ۔'' (ابراہیم:2-1) آتا ہے وہاں یہ عطف بیان ہے۔ (3) اس کی ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ''ترجمہ: کیاتم جانتے ہو اس کا کوئی ہم مثل ہے'' (مریم: 65) لیکن ان ادلہ سے اسم جامد غیر مشتق ہونے پر استدلال قائم کرنا محل نظر ہے۔ واللہ اعلم بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اسم ''اللہ'' عبرانی لفظ ہے لیکن رازی نے اس قول کی تضعیف کی ہے اور فی الواقع اس قول کو ضعیف قرار دینا بھی چاہئے یہ قول ذکر کرنے کے بعد رازی لکھتے ہیں۔'' مخلوق کی دو قسمیں ہیں (1) وہ جو معرفت کے بحر ناپیدا کنار کے ساحل پر پہنچے اور وصل خداوندی سے فیض یاب ہیں۔ (۲) جو وصال حریم ذات سے محروم ہیں اور حیرت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں اور جہالت ولاعلمی کی وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں کھارہے ہیں۔ گویا وہ اپنی عقول وارواح کو گم کر بیٹھے ہیں جبکہ وصال حریم قدس سے شاد کام ہونے والے بھی نورانیت کی شعاعوں رحمت کے جلووں میں ششدر رہ گئے اور بارگاہ صمدیت اور دربار فردانیت میں مبہوت کھڑے رہ گئے۔ پتہ چلا کہ ساری مخلوق اس ذات والاصفات کی معرفت حقیقی سے عاجز ہے۔ خلیل بن احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے چونکہ ساری مخلوق اس کے دربار میں وارفتہ اور گم ہے اس لئے اسے یہ نام دیا گیا۔ (یالھون میں لام کے فتح اور کسرہ سے دونوں لغتیں ہیں)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ارتفاع (بلندی) سے مشتق ہے اہل عرب ہر بلند چیز کو ''لاھا'' کہتے ہیں۔ جب سورج طلوع ہوجائے تو کہتے ہیں ''لَاهَتْ'' یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اَلِهَ الرَّجُلُ اِذَا تَعَبَّدَ (عبادت کرنا) اور تَاَلَّهَ اِذَا تَنَسَّكَ (عبادت کرنا) سے مشتق ہے۔ ابن عباس نے اس آیت کو یوں پڑھا ہے (وَيَذَرَكَ وَاِلَاهَتَكَ) یہ اصل میں الہ تھا ھمزہ (فاء کلمہ) کو حذف کر دیا و لام (الف لام اور کلمہ کا لام) جمع ہوئے دونوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا۔ ایک لام مشدد بن گیا تعظیماً تفخیم کے ساتھ پڑھا۔ اور ''اللہ'' کہا گیا۔

''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں رحمۃ مصدر سے مشتق ہیں لیکن رحمٰن میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ ابن جریر کے قول سے تو معلوم ہوتا ہے گویا ان دونوں پر اتفاق ہے۔؟ بعض سلف صالحین کی تفسیر سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے جیسا کہ وہ اثر اس سے پہلے گذر چکی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا رحمٰن سے مراد دنیا وآخرت دونوں میں رحم کرنے والا اور رحیم سے مراد رحیم الآخرۃ (آخرت میں رحم کرنے والا) ہے۔ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ رحمٰن غیر مشتق ہے کیونکہ اگر یہ مشتق ہوتا تو اس کے ساتھ ''مرحوم'' کا لفظ آتا حالانکہ قرآن کریم میں ہے: وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ''اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے'' (احزاب:43)۔ ابن انباری نے مبرد سے نقل کیا ہے کہ رحمٰن عربی لفظ نہیں بلکہ یہ عبرانی ہے۔ ابواسحٰق زجاج معانی القرآن میں لکھتے ہیں۔ احمد بن یحی کا قول ہے کہ رحمٰن اور

رحیم دونوں عربی لفظ ہیں۔ اسی لئے دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ لیکن ابو اسحٰق فرماتے ہیں کہ اس قول کو دل تسلیم نہیں کرتا۔ قرطبی اس کے اشتقاق کی دلیل اس حدیث کو بناتے ہیں جس کی تخریج وتصحیح ترمذی نے کی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں رحمٰن ہوں میں نے رحم کی تخلیق کی۔ اپنے اسماء میں سے ہی اسکا نام مشتق کیا۔ جس نے صلہ رحمی کی میں بھی اس پر رحم کروں گا جس نے قطع رحمی کی میں اسے کاٹ کر رکھ دوں گا'' (1)۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ نص اشتقاق کی واضح دلیل ہے۔ اس کی مخالفت کا کوئی مقصد نہیں۔ فرماتے ہیں کہ اہل عرب کا رحمٰن کے اسم کا انکار کرنا ان کی جہالت کا کرشمہ ہے۔ قرطبی کا قول ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں جیسے ندمان اور ندیم۔ یہ قول ابوعبید کا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فعلان، فعیل کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ فعلان سے صرف مبالغہ کا صیغہ ہی آتا ہے۔ جیسے تو کہے ''رَجُلٌ غَضْبَانُ'' (وہ آدمی جو غصے سے بھرپور ہو)۔ فعیل کا صیغہ کبھی بمعنی فاعل اور کبھی بمعنی مفعول آتا ہے۔ ابوعلی فارسی کا قول ہے رحمٰن عام اسم ہے یہ رحمت کی تمام اقسام کو شامل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ رحیم یہ مؤمنوں کے اعتبار سے ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ یہ دونوں اسم رقیق ہیں اور دونوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر رقت ہے (یعنی رحمت ہے)۔ خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ اس صفت میں استشکال ہے۔ انہوں نے بھی اس کا معنی ارفق کیا ہے جیسے حدیث مبارکہ میں ہے'' اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا (ورفیق) ہے۔ ہر کام میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ نرمی اور آسانی پر وہ نعمتیں مرحمت فرماتا ہے جو سختی اور عنف پر عطا نہیں کرتا'' (2)۔ ابن مبارک کا قول ہے رحمٰن وہ ہے جب اس سے سوال کیا جائے تو عطا کرے اور رحیم وہ ہے کہ جب اس سے نہ مانگا جائے غضبناک ہو۔ یہی بات ترمذی اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے وہ ناراض ہوتا ہے (3)۔ کسی شاعر کا قول ہے۔

اَللّٰهُ يَغْضَبُ إِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ وَبِنِيُّ آدَمَ حِينَ يُسْئَلُ يَغْضَبُ

اللہ تعالیٰ سے نہ مانگو تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ اور بنی آدم دست سوال دراز کرنے سے خفا ہوتے ہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں میں نے عزرمی کو یہ ارشاد فرماتے سنا'' الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' فرمایا رحمٰن سے مراد تمام مخلوق پر رحم کرنے والا۔ اور رحیم سے مراد مؤمنین پر رحم کرنے والا ہے۔ اسی لئے فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہ:5)'' ترجمہ: وہ بے حد مہربان (کائنات کی فرمانروائی کے) تخت پر متمکن ہوا'' ایک اور جگہ فرمایا: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ (الفرقان:59)'' پھر وہ متمکن ہوا عرش پر (جیسے اس کی شان ہے)۔ وہ رحمٰن ہے'' استواء کے ساتھ رحمٰن کا لفظ ذکر کیا۔ تاکہ رحمت اس کی تمام مخلوق کو شامل ہو سکے۔ فرمایا (وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا) مؤمنین کو رحیم کے لفظ سے متصف فرمایا۔ فرماتے ہیں پس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رحمٰن میں مبالغہ رحیم کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ یہ وہ رحمت ہے جو دارین (دنیا وآخرت) میں تمام مخلوق کو شامل ہے۔ اور رحیم کی رحمت مؤمنین سے خاص ہے۔ لیکن ایک ماثور دعا کے الفاظ میں رَحْمٰنُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَرَحِيْمُهُمَا آیا ہے۔ رحمٰن یہ نام اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کسی دوسرے کو اس نام سے موسوم نہیں کیا جیسے ارشاد ہوتا ہے: اُدْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ (بنی اسرائیل:110)'' آپ فرمائیے یا اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔ جس نام سے اسے پکارو اس کے سارے نام (ہی) اچھے ہیں''۔ اور ارشاد فرمایا: وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (الزخرف:45)'' اور آپ پوچھیے ان سے جنہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے اپنے رسولوں سے کیا ہم نے بنائے ہیں خداوند

1۔ الترمذی: باب البر:9 2۔ فتح الباری: 137/8 3۔ مسند امام احمد: 442/2

رحمٰن کے علاوہ اور خدا تا کہ ان کی پوجا کی جائے۔'' جب مسیلمہ کذاب نے ناپاک جسارت کی اور اپنے آپ کو ''رحمٰن یمامہ'' کے لقب سے موسوم کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے جھوٹ کا لباس پہنا دیا۔ اس کا یہ لقب معروف ہوگیا بلکہ اس کے نام کا جز بن گیا۔ اب اسے مسیلمہ کذاب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور جھوٹ میں اس کی طرف تشبیہ دی جاتی ہے۔ شہری، دیہاتی اور بدو سب اسے پہچانتے ہیں۔

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ رحیم میں رحمٰن کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے۔ مؤکَّد (جس کی تاکید لگائی جائے) مؤکِّد (جس کے ساتھ تاکید لگائی جائے) سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تاکید ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو صفت ہے۔ اور صفات میں ان کا ذکر کردہ قاعدہ جاری ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا تقدیر کلام یوں ہوگی (اِسْمُ الَّذِیْ لَمْ یُسَمَّ بِہٖ اَحَدٌ غَیْرَہٗ) اللہ کا وہ نام جس کے ساتھ کسی دوسرے کو موسوم نہیں کیا گیا۔ پہلے صفت رحمٰن ذکر کی کہ یہ نام رکھنا بھی لوگوں کو ممنوع ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (بنی اسرائیل: 110) صرف مسیلمہ نے ہی یہ نام رکھنے کی جسارت کی تھی اس کے گمراہ ساتھیوں کے سوا کسی نے اس کی پیروی نہ کی لیکن رحیم کے وصف سے خود اللہ تعالیٰ نے بھی دوسروں کو موسوم کیا ہے۔ فرمایا: لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ......... بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (توبہ: 128) '' ترجمہ: بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے۔ گراں گزرتا ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑنا۔ بہت ہی خواہشمند ہے تمہاری بھلائی کا مومنوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے'' (یونس: 128)۔ اسی طرح اپنے بعض دیگر اسماء سے بھی دوسروں کو متصف فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْہِ فَجَعَلْنٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (الدہر: 2) '' بلاشبہ ہم نے ہی انسان کو پیدا فرمایا ایک مخلوط نطفہ سے۔ تا کہ ہم اس کو آزمائیں۔ پس (اس غرض سے) ہم نے بنادیا ہے اس کو سننے والا، دیکھنے والا''۔

(اس آیت میں انسان کو سمیع اور بصیر کہا جو کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں) خلاصہ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء ایسے ہیں جن سے دوسروں کو متصف کیا جاسکتا ہے۔ اور بعض اسماء ایسے ہیں جن کا اطلاق اس کے سوا کسی دوسرے پر نہیں ہوسکتا۔ جیسے اللہ، الرحمٰن، الخالق، الرزاق وغیرہ۔ اسی لیے پہلے اپنا نام اللہ ذکر کیا پھر اس کی صفت رحمٰن ذکر کی۔ کیونکہ یہ رحیم سے خاص اور زیادہ معروف ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ پہلے سب سے عمدہ نام سے ابتدا کی جاتی ہے۔ لہٰذا پہلے سب سے زیادہ خاص نام ذکر کیا پھر اس سے خاص۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب رحمٰن میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ موجود ہے تو پھر اسی پر اکتفا کیوں نہ کی گئی۔ ساتھ رحیم کو کیوں ذکر کیا گیا۔ اس کے جواب میں حضرت عطاء خراسانی کا قول پیش کیا جاسکتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کفار نے غیر اللہ کو بھی رحمٰن سے موسوم کرنا شروع کردیا تو رحیم کا لفظ ذکر کیا تا کہ کسی قسم کا وہم وگمان شائبہ تک نہ رہے رحمٰن ورحیم تو صرف اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو ذکر کیا ہے۔ اس کی صحیح توجیہ کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض لوگوں کا یہ قول ہے کہ عرب رحمٰن سے واقف ہی نہ تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تردید فرمائی: قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (بنی اسرائیل: 110)۔ اسی لئے صلح حدیبیہ کے دن جب رسول اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا لکھو۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ تو قریش کہنے لگے۔ ہم رحمٰن اور رحیم کو نہیں جانتے۔ رواہ البخاری۔ بعض روایت میں ہے'' ہم رحمٰن یمامہ کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِذَا قِیْلَ لَہُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۤ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَہُمْ نُفُوْرًا (الفرقان: 60) '' اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ رحمٰن (کے حضور) سجدہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں رحمٰن کون ہے۔ کیا ہم سجدہ کریں اس کو جس کے متعلق تم ہمیں حکم دیتے ہو اور وہ زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں''۔ ظاہر ہے ان کا یہ انکار جحود، سرکشی اور عناد پر مبنی تھا۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت کے عرب شعراء کے ہاں یہ

لفظ ملتا ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں جاہلیت کے کسی جاہل مطلق شاعر کا قول ہے۔

اَلَاّ ضَرَبَتْ تلكَ الفَتَاةُ هَجِيْنَهَا اَلَا قَضَبَ الرَّحْمٰنُ رَبِّیْ يَمِيْنَهَا

سلامہ بن جندب طہوی کا قول ہے۔

عَجِلْتُمْ عَلَيْنَا اِذْ عَجِلْنَا عَلَيْكُمْ وَمَا يَشَاءُ الرَّحمٰنُ يَعْقِدُ وَ يُطْلِقُ

ابن جریر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے ہیں کہ رحمٰن بروزن فعلان رحمت سے ماخوذ ہے اور کلام عرب میں سے ہے۔ اور فرمایا الرحمٰن الرحیم کا معنی ہے۔ الرفیق الرقیق مہربان، نرم دل جس پر رحم کرنا چاہے اور جس سے درشتی سے پیش آنا چاہے اس سے دور۔ اس کے سارے اسماء اسی طرح ہیں ابن جریر حضرت حسن سے نقل کرتے ہیں کہ رحمٰن کا نام دوسروں کے لئے ممنوع ہے۔ ابن ابی حاتم حضرت حسن سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ رحمٰن نام نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام ہے۔ حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قرأت ایک ایک حرف ہوتی تھی: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بعض نے اسی طرح پڑھا ہے یہ علماء کا ایک گروہ ہے۔ جبکہ ایک گروہ بِسْمِ اللّٰهِ کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ملا کر پڑھتے ہیں اور دو ساکنوں کے مل جانے کی بناء پر میم کو کسرہ دیتے ہیں۔ یہ جمہور کی رائے ہے کسائی نے بیان کیا ہے کہ کوفیوں میں سے بعض عرب میم کو زبر دے کر پڑھتے ہیں یعنی ہمزہ کی حرکت ماقبل کو دے کر یوں پڑھتے ہیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہمزہ کی حرکت ماقبل کو دے کر اسے ساکن کر دیتے ہیں۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ "الف۔ لام۔ میم اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں سوا اس کے" (سورۂ آل عمران: 1) ابن عطیہ کہتے ہیں میرے خیال میں زبر کی قرأت کسی سے مروی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"سب تعریفیں اللہ کے لئے جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کا"

قراء سَبْعَہ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے دال کو پیش سے پڑھا ہے۔ یہ مبتدا اور خبر ہے حضرت سفیان بن عیینہ اور روبۃ بن عجاج کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ "اَلْحَمْدَ لِلّٰهِ" دال کی زبر کے ساتھ ہے اس صورت میں اس سے پہلے فعل مخدوف ہوگا۔ ابن ابی عبلۃ نے "اَلْحَمْدُ لُلّٰهِ" میں دال اور لام دونوں کو پیش سے پڑھا ہے وہ لام کو دال کے تابع کرتے ہیں۔ لغت میں اس کے شواہد بھی ملتے ہیں لیکن یہ شاذ ہے۔ حضرت حسن اور زید بن علی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے کہ انہوں نے "اَلْحَمْدِ لِلّٰهِ" دال اور لام دونوں کو (پہلے کو دوسرے کے تابع کرتے ہوئے) زیر سے پڑھا ہے۔ ابو جعفر جریر لکھتے ہیں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کا معنی ہے شکر کی حقدار صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے۔ مخلوق میں سے کوئی بھی اس لائق نہیں۔ کیونکہ اس نے اپنے بندوں کو انواع واقسام کی نعمتوں سے نوازا ہے جن کا شمار کرنا بھی ممکن نہیں۔ خود اس کے سوا کوئی دوسرا ان کی تعداد کو بھی نہیں جانتا۔ اس نے اپنی اطاعت کرنے کے اسباب عطا فرمائے۔ اسی نے تمام مکلفین کو فرائض کی ادائیگی کے لئے جسمانی نعمتیں دیں۔ پھر دنیا میں انہیں وسیع روزی دی اور زندگی میں طرح طرح کے انعامات واکرامات عطا فرمائے حالانکہ بندوں کا ان پر کوئی حق نہ تھا۔ ساتھ ہی اس بات سے بھی آگاہ فرما دیا کہ ہم ابدی زندگی میں جنت کی دائمی نعمتوں کے حقدار کس طرح بن سکتے ہیں چنانچہ اول آخر تمام تعریفیں اسی رب جلیل کی ہیں ابن جریر کہتے ہیں کہ الحمد للہ یہ کلمہ ثنائیہ ہے اللہ رب العزت نے اس کے ساتھ خود اپنی ثناء کی ہے اور اس کے ضمن میں اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی کہ تعریف کریں گویا اس نے یہ فرمایا ہے کہو الحمد للہ۔ لکھتے ہیں ایک

قول یہ بھی ہے کہ کہنے والے کا الحمدللہ کہنا اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفات عالیہ کے ساتھ اس کی حمد کرنا ہے۔ اور الشکر للہ کہنا یہ اللہ کی نعمتوں اور اس کے احسانات کی ثناء کرنا ہے۔ پھر اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عربی زبان کے اسلوب کو سمجھنے والے یہ جانتے ہیں کہ حمد اور شکر کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں سلمی نے نقل کیا ہے کہ یہ مذہب امام جعفر صادق اور صوفیاء میں سے ابن عطاء کا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ الحمدللہ ہر شکر کرنے والے کا کلمہ ہے۔ قرطبی نے ابن جریر کے قول کی صحت کو ثابت کرنے کیلئے یہ دلیل بھی بیان کی ہے کہ اگر کوئی الحمدللہ شکرا کہے تو یہ جائز ہے۔ لیکن ابن جریر کا یہ دعوی محل نظر ہے۔ کیونکہ متاخرین میں سے کثیر علماء سے یہ بات معروف ہے کہ حمد سے مراد اس کی صفات (خواہ لازم ہوں یا متعدی) کی زبان سے تعریف بیان کرنا ہے۔ اور شکر صرف متعدی نعمتوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ دل، زبان اور جملہ ارکان سے ہوتا ہے جیسے ایک شاعر کا قول ہے۔

أَفَادَتْكُمُ النَّعْمَاءُ مِنِّي ثَلَاثَةٌ يَدِيْ وَ لِسَانِي وَ الضَّمِيْرَ الْمُحَجَّبَا

لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ حمد و شکر میں سے کون سا لفظ عام ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص کی نسبت ہے۔ حمد کا لفظ شکر سے زیادہ عام ہے، اس اعتبار سے کہ یہ جس پر واقع ہوں۔ اس لیے کہ یہ لازم اور متعدی دونوں پر آتا ہے۔ جیسے تو کہہ سکتا ہے (حَمَدْ تُہٗ) میں نے اس کی تعریف کی اس کی شہ سواری پر یا اس کی سخاوت پر۔ لیکن چونکہ یہ صرف زبان سے ہی ادا ہوسکتا ہے اس اعتبار سے یہ خاص ہے۔ اور شکر کا لفظ عام ہے کیونکہ وہ قول، فعل اور نیت تینوں سے ادا ہوسکتا ہے۔ (جیسے پہلے گزر چکا ہے) اور یہ خاص اس لحاظ سے ہے کہ یہ صرف متعدی صفات پر ہی آتا ہے۔ یعنی یوں نہیں کہہ سکتے (شَکَرْتُہٗ، لِفُرُوْسِیَّتِہٖ) میں نے اس کی شہ سواری پر اس کا شکر ادا کیا۔ لیکن یوں کہہ سکتے ہیں شَکَرْتُہٗ عَلٰی کَرَمِہٖ وَاِحْسَانِ اِلَیَّ۔ (میں نے اس کے حسن سلوک اور جود وسخا پر اس کا شکریہ ادا کیا)۔ بعض متاخرین کی تحریر کا یہ ماحصل ہے واللہ اعلم۔ ابو نصر اسماعیل بن حماد جوہری کا قول ہے کہ "حمد" (تعریف) ذم (مذمت) کا متضاد ہے۔ جیسے تو کہے حَمِدْتُ الرَّجُلَ اَحْمَدُہٗ حَمْدًا وَمَحْمَدَۃً فَھُوَ حَمِیْدٌ وَمَحْمُوْدٌ۔ تحمید حمد سے بھی زیادہ بلیغ ہے اور حمد شکر سے عام ہے شکر کہتے ہیں کسی محسن کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کا شکریہ ادا کرنا۔ کہتے ہیں شَکَرْتُہٗ وَشَکَرْتُ لَہٗ لیکن لام سے کہنا زیادہ فصیح ہے۔ مدح کا لفظ حمد سے بھی زیادہ عام ہے۔ کیونکہ یہ زندہ، مردہ بلکہ جمادات کے لئے بھی ہوتی ہے جیسے کھانے اور مکان وغیرہ کی مدح۔ یہ احسان سے پہلے بھی ہوسکتی ہے اور احسان کے بعد بھی۔ لازم صفتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوسکتا ہے اور متعدی پر بھی چنانچہ یہ زیادہ عام ہے۔

حمد کی تفسیر میں سلف کے اقوال

ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا تو ہمیں پتہ چل گیا لیکن یہ الحمدللہ کا کیا مطلب ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (جواباً) ارشاد فرمایا کہ یہ ایک کلمہ ہے جسے اللہ رب العزت نے اپنے لیے پسند فرمالیا ہے۔ ابو معمر کے علاوہ دیگر راویوں نے حضرت حفص سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا لا الہ الا اللہ وسبحان اللہ واللہ اکبر کو تو ہم نے پہچان لیا۔ یہ الحمدللہ سے کیا مراد ہے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ ایسا کلمہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے منتخب فرمالیا ہے اور اسے یہ پسند ہے کہ یہ کلمہ کہا جائے۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ الحمدللہ کلمہ شکر ہے جب بندہ الحمدللہ کہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا

اس کے راوی ابن ابی حاتم ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا الحمد للہ سے مراد اللہ کا شکر ادا کرنا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، اس کی نعمتوں، ہدایت اور احسانات وغیرہ کا اقرار ہے۔ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ الحمد للہ یہ اللہ کی ثناء ہے۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں الحمد للہ یہ اللہ کی چادر ہے۔ ایک حدیث مبارکہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے وغیرہ۔ حضرت ابن جریر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب تم نے الحمدُ للہ کہہ لیا تو تم نے اللہ کا شکر ادا کرلیا۔ اب اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں برکت دے گا(1)۔ حضرت امام احمد بن حنبل اپنی سند سے حضرت اسود بن سریع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ! میں نے ذات باری تعالیٰ کی حمد وثناء میں چند اشعار کہے ہیں اگر اجازت ہو تو سناؤں تو آپ ﷺ نے فرمایا ''بلاشبہ اللہ تبارک تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے''(2)۔ نسائی نے اسے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''بہترین ذکر ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' ہے۔ بہترین دعا الحمد للہ ہے''(3)۔ ترمذی کا قول ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ کوئی نعمت عطا فرمائے وہ اس پر الحمد للہ کہے تو جو نعمت اس کو مرحمت فرمائے گا وہ پہلی نعمت سے کہیں زیادہ افضل ہوگی''(4)۔ قرطبی اپنی تفسیر اور نوادر الاصول میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر اللہ تعالیٰ ساری دنیا میرے بندے کے ہاتھ میں دے دے اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل ہے(5)۔ قرطبی وغیرہ لکھتے ہیں کہ الحمد للہ کی توفیق، جتنی بڑی نعمت ہے ساری دنیا اس کے برابر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ حمد کا ثواب باقی رہے گا جبکہ ساری دنیا تو فانی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (کہف:46) ''مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب وزینت ہیں۔ اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے''۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا کہ اللہ کے ایک بندے نے ایک مرتبہ کہا ''يَا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِيْ لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَ عَظِيْمِ سُلْطَانِكَ'' فرشتے پریشان ہوگئے کہ اس کا ثواب کتنا لکھیں۔ وہ اللہ رب العزت جل مجدہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی بار الٰہا تیرے ایک بندے نے وہ کلمات کہے ہیں جن کے بارے میں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کا ثواب کتنا لکھیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے باوجود یکہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ فرمایا میرے بندے نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے یہ کلمات عرض کیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ان کلمات کو اسی طرح لکھ لو جب میرا بندہ میرے پاس آئے گا۔ میں خود اسے ان کا اجر دوں گا۔ قرطبی نے بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ بندے کا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہنا لا الٰہ الا اللّٰہ کہنے سے افضل ہے کیونکہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں حمد اور توحید دونوں ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک لا الٰہ الا اللّٰہ کہنا افضل ہے کیونکہ ایمان اور کفر کے درمیان یہی حد فاصل ہے۔ اسی کے لئے جنگ کی جاتی ہے حتیٰ کہ سب لوگ لا الٰہ الا اللّٰہ کہنا شروع کردیں۔ جیسا کہ متفق علیہ حدیث میں مذکور ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے سب سے افضل کلمہ جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام نے کہا ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ'' ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث گذر چکی ہے کہ سب سے افضل ذکر ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' ہے اور سب سے افضل دعا

1۔ تفسیر الطبری: 60/1
2۔ مسند امام احمد: 435/3
3۔ ابن ماجہ: کتاب الادب، 1249
4۔ ابن ماجہ، کتاب الادب: 1250
4۔ تفسیر القرطبی: 131/1

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہے''۔ ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ الحمد میں الف لام استغراق کے لئے ہے جو حمد کی تمام اصناف واجناس کو شامل ہے۔ جیسے حدیث مبارکہ میں ہے: ''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّهٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّهٗ وَبِیَدِکَ الْخَیْرُ کُلُّهٗ وَإِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ''الحدیث۔

''رب'' کہتے ہیں مالک اور متصرف کو۔ لغت میں اس کا اطلاق سردار اور اصلاح کنندہ پر بھی ہوتا ہے۔ یہ سب مفاہیم اللہ تبارک و تعالیٰ کے حق میں صحیح ہیں۔ رب کا لفظ غیر اللہ کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ ہاں اضافت کے ساتھ ہو تو اور بات ہے۔ جیسے رَبُّ الدَّارِ (گھر کا سربراہ) رَبُّ کَذَا (کسی چیز کا مالک) لیکن رب کا لفظ مطلقاً صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہی آتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسم اعظم یہی ہے۔ ''عالمین'' یہ عالم کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود کو عالم کہتے ہیں لفظ عالم اسم جمع ہے۔ اس کا واحد کوئی نہیں۔ عوالم سے مراد آسمانوں اور بحر و بر کی مخلوقات ہے۔ اسی طرح ہر صدی عالم ہے اور ہر نسل عالم کہلاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے مراد تمام تعریفیں ہیں اس رب کے لئے جس کی ساری مخلوق ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ خواہ ہمیں اس کا علم ہے یا نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی ایک دوسری روایت میں ہے رب العٰلمین سے مراد جن وانس کا رب ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، مجاہد اور ابن جریج سے اسی طرح مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت یہی ہے لیکن ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ اس کی سند غیر معتبر ہے قرطبی نے اس قول کی تائید میں اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (فرقان: 1) ''تاکہ وہ بن جائے سارے جہان والوں کو (غضب الٰہی سے) ڈرانے والا''۔ عالمین سے مراد یہاں جن وانس ہیں۔ فراء اور ابو عبید کا قول ہے کہ عالم سے مراد ذوی العقول ہیں اور وہ جن وانس، ملائکہ اور شیاطین ہیں انہیں عالم کہا جائے گا۔ چوپایوں کو عالم نہیں کہتے۔ حضرت زید بن سلم اور باوجیصن سے مروی ہے کہ ہر ذی روح کو عالم کہتے ہیں۔ قتادہ کا قول ہے کہ ہر صنف ایک عالم ہے۔ حافظ ابن عساکر اموی خلیفہ مروان بن محمد عرف جعدی ملقب ''حمار'' (گدھا) کے حالات میں لکھتے ہیں کہ اس نے کہا اللہ تبارک وتعالیٰ نے سترہ ہزار عالم پیدا کیے۔ اہل زمین وآسمان ایک ہیں۔ باقی کا علم خدا تعالیٰ کو ہی ہے۔ ابو جعفر رازی حضرت ابو العالیہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا انسان ایک عالم ہے، جنات ایک عالم ہیں۔ اس کے سوا چودہ ہزار یا اٹھارہ ہزار عالم ہیں۔ (راوی کو اس تعداد میں شبہ ہے) فرشتے زمین پر ہیں۔ اور زمین کے چار کونے ہیں۔ ہر کونے میں ساڑھے تین ہزار عالم ہیں۔ جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے (ابن جریر اور ابو حاتم نے اسے روایت کیا ہے) یہ کلام غریب ہے۔ اس جیسی بات کے لئے صحیح دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابن ابی حاتم سبیع حمیری سے نقل کرتے ہیں کہ عالمین سے مراد ایک ہزار امتیں ہیں چھ سو سمندر میں اور چار سو خشکی پر۔ حضرت سعید بن میتب سے ایک روایت یہی ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی اسی طرح ہے۔ جیسا کہ حافظ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ ٹڈیاں کم ہو گئیں آپ رضی اللہ عنہ کے دریافت کرنے پر بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ آپ رضی اللہ عنہ غمگین ہو گئے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے عراق، شام اور یمن کی طرف قاصد بھیجے کہ اگر کہیں سے ٹڈیاں مل سکیں تو لے آؤ۔ کہتے ہیں یمن کی طرف جانے والا قاصد کچھ ٹڈیاں لے کر آیا اور آ کر پیش کیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی نعرۂ تکبیر لگایا۔ اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہزار امتیں پیدا کی ہیں۔ چھ سو سمندر میں اور چار سو خشکی پر۔ سب سے پہلے ان میں سے جو امت ہلاک ہوگی وہ ٹڈیاں ہیں۔ ان کی ہلاکت کے بعد پے در پے سب امتیں ہلاک ہو جائیں گی جیسے تسبیح کا دھاگا ٹوٹ جائے تو اس کے سارے دانے بکھر جاتے ہیں''(1)۔ اس کے راوی محمد بن عیسیٰ ہلالی ہیں جو

1۔ مجمع الزوائد: 322/7

ضعیف ہیں۔ بغوی نے حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے ہزار عالم ہیں چھ سو سمندر میں اور چار سو روئے زمین پر۔ وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں عالم دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔ مقاتل کا قول ہے کہ اسّی ہزار عالم ہیں۔ کعب بن احبار کا قول ہے کہ عوالم کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (یہ سب روایات بغوی نے نقل کی ہیں) قرطبی نے حضرت ابوسعید خدری سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے چالیس ہزار عالم ہیں۔ عالم دنیا (مشرق سے لے کر مغرب تک) ایک عالم ہے۔ زجاج کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دنیا و آخرت میں پیدا کیا ہے وہ سب عالم ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ قول صحیح ہے اس لیے کہ یہ تمام عالمین کو شامل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (شعراء: 24-23) ''فرعون نے پوچھا: کیا حقیقت ہے رب العالمین کی؟ آپ نے فرمایا (رب العالمین وہ ہے جو) مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اگر تم ہو یقین کرنے والے''۔ عالم یہ علامت سے مشتق ہے (نشانی) اس لیے کہ یہ اپنے خالق و صانع کے وجود اور اس کی وحدانیت کی علامت ہے۔ جیسے ابن معتز کا قول ہے۔

فَيَا عَجَباً كَيْفَ يُعْصىٰ الْإِلٰهُ ۔۔۔ أَمْ كَيْفَ يَجْحَدُهُ الجَاحِدُ
وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ ۔۔۔ تَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ وَاحِدُ

یعنی تعجب ہے کہ منکر پروردگار کی کس طرح نافرمانی کرتا ہے یا اس کا انکار کس طرح کرتا ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں اس کی نشانی موجود ہے۔ جو اس کی وحدانیت پر شاہد عدل ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣﴾

''بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا''

بِسْمِ اللّٰهِ کے ضمن میں اس کی تفسیر گذر چکی ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ قرطبی لکھتے ہیں رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے وصف کے بعد اپنے آپ کو الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی صفات سے متصف کیا تاکہ ترہیب (ڈرانے) کے بعد ترغیب کا بھی ذکر ہو جائے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٤٩﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (حجر: 50-49) ''بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا، از حد رحم کرنے والا ہوں۔ اور (یہ بھی بتا دو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے''۔ ایک اور آیت میں فرمایا: اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اعراف: 167) ''بے شک آپ کا رب جلدی عذاب دینے والا ہے۔ اور بے شک وہ غفور رحیم بھی ہے''۔ فرماتے ہیں رب کے لفظ میں ترہیب ہے اور رحمٰن و رحیم میں ترغیب ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''اگر بندے کو اللہ کے عذاب کا پتہ چل جائے تو جنت کی آرزو کوئی نہ کرے اور اگر اس کی رحمت کا کسی کافر کو پتہ چل جائے تو اس کی رحمت سے مایوس کوئی نہ ہو۔''(1)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٣﴾

''مالک ہے روز جزا کا''

بعض قراء نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور بعض دیگر نے (مَلِكِ) پڑھا ہے دونوں قرأتیں صحیح اور متواتر ہیں اور سات قراتوں سے ہیں۔ (مَلْكِ) لام کی زیر یا سکون کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ملیک بھی پڑھا گیا ہے۔ اشبع اور نافع نے کاف کی زیر کے ساتھ مٰلِكِ يَوْمِ

1۔ مسلم: التوبۃ: 23

الدِّیۡنِ کر کے پڑھا ہے۔ ترجیح دینے والوں نے دونوں قرأتوں کی معنی کے اعتبار سے تصحیح کی ہے۔ دونوں قرأتیں صحیح اور مستحسن ہیں۔ زمخشری نے مَلِكِ کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ اہل حرمین کی قرأت ہے۔ نیز قرآن کریم میں بھی ایک دوسری جگہ آیا ہے۔ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ (مومن:16) ''کس کی بادشاہی ہے آج'' ایک دوسری جگہ فرمایا: قَوۡلُهُ الۡحَقُّ ؕ وَلَهُ الۡمُلۡكُ (سورۂ انعام:73) ''سی کا فرمان حق ہے۔ اور اسی کی حکومت ہوگی''۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے مَلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ فعل، فاعل اور مفعول ہے۔ لیکن یہ روایت شاذ اور بے حد غریب ہے۔ ابوبکر بن ابوداؤد نے اس بارے میں ایک غریب روایت ذکر کی ہے وہ ابن شہاب سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، ابوبکر وعمر، عثمان، امیر معاویہ اور ان کے لڑکے مَلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ پڑھتے تھے۔ ابن شہاب کا قول ہے کہ سب سے پہلے مروان نے ملک کر کے پڑھا (میں کہتا ہوں) مروان کو اپنی اس قرأت کی صحت پر اطلاع تھی جو راوی حدیث ابن شہاب کو نہ تھی۔ واللہ اعلم۔

متعدد اسناد جنہیں ابن مردویہ نے ذکر کیا ہے میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ''مَلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ'' پڑھتے تھے۔ اور مالک یہ ملک سے نکلا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَمَنۡ عَلَيۡهَا وَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ (مریم:40) ''یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری ہی طرف سب لوٹائے جائیں گے''۔ ایک اور جگہ فرمایا: قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ (سورۂ الناس) ملک یہ الملک سے ماخوذ ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ؕ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ (مومن:16) ''کس کی بادشاہی آج؟۔ (کسی کی نہیں) صرف اس اللہ کی جو واحد اور قہار ہے''۔ اور فرمایا: قَوۡلُهُ الۡحَقُّ ؕ وَلَهُ الۡمُلۡكُ (انعام:73) ایک اور جگہ فرمایا: اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذِ الۡحَقُّ لِلرَّحۡمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوۡمًا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ عَسِيۡرًا (فرقان:26) ''اس دن سچی بادشاہی (خداوند) رحمٰن کی ہوگی۔ اور وہ دن کافروں کیلئے بڑا مشکل ہوگا''۔

مَلِكِ کو يَوۡمِ الدِّيۡنِ سے خاص کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے سوا سے انکار ہے۔ اس لئے کہ اس سے پہلے وصف رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ کا ذکر ہو چکا ہے جو دنیا آخرت دونوں کو شامل ہے۔ قیامت کے دن کی طرف نسبت اس وجہ سے کی کہ اس دن کوئی کسی چیز کا دعوے دار نہ ہوگا۔ اور اس کی اجازت کے بغیر بات بھی نہیں کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا ہے: يَوۡمَ يَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (النبا:38) ''اس دن روح اور فرشتے پرے باندھ کر کھڑے ہوں گے۔ کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اذن دے اور وہ ٹھیک بات کرے''۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَخَشَعَتِ الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا هَمۡسًا (طہٰ:108) ''اور خاموش ہو جائیں گی سب آوازیں رحمٰن کے خوف سے پس تو نہ سنے گا (اس روز) مگر مدہم سی آہٹ''۔ ایک اور آیت میں فرمایا: يَوۡمَ يَاۡتِ لَا تَكَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ۚ فَمِنۡهُمۡ شَقِىٌّ وَّسَعِيۡدٌ (ہود:105) ''جب وہ دن آئے گا تو (اس کی ہیبت سے) کوئی شخص نہیں بول سکے گا بجز اس کی اجازت کے۔ بعض ان میں سے بدنصیب ہوں گے بعض خوش نصیب''۔

ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ مَلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ فرماتے ہیں کہ دن کے برعکس اس دنیا صرف اسی کی بادشاہی ہوگی۔ فرمایا يَوۡمِ الدِّيۡنِ سے مراد یوم الحساب ہے۔ جس دن مخلوق کا حساب لیا جائے گا۔ وہ قیامت کا دن ہے۔ جس دن تمام اچھے برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ ہاں جسے وہ (اپنے خصوصی فضل وکرم سے) معاف فرمادے۔ اسی طرح دیگر صحابہ، تابعین اور سلف صالحین سے بھی مروی ہے۔ ابن جریر نے ان میں سے بعض سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ قیامت کے قائم کرنے پر قادر ہے۔ پھر خود ہی ابن جریر اس قول کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ بظاہر اس قول اور سابقہ قول میں کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ ان دونوں فریقوں میں

سے ہر ایک دوسرے کے قول کی صحت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن سیاق وسباق سے پہلے معنی کی تائید ہوتی ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (فرقان:26) دوسرا قول اللہ کے اس فرمان کے مشابہ ہے: وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ (الانعام:73) ''اور جس روز وہ کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائیگا''۔ واللہ اعلم۔

حقیقی بادشاہت دراصل اللہ رب العزت جل مجدہ کی ہے۔ ایک آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ (حشر:23) (صحیحین میں ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے بدترین ہے وہ شخص جو اپنے آپ کو مَلِكُ الْاَمْلَاكِ کہلائے۔ حقیقی مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں (1)۔ صحیحین میں ہی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے تصرف میں لے لے گا۔ آسمان کو اپنے یمین قدرت میں کر لے گا اور فرمائے گا میں شہنشاہ ہوں کہاں گئے زمین کے بادشاہ، کہاں ہیں سرکش، کہاں ہیں مغرور وتکبر کرنے والے۔ قرآن عظیم میں ہے۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (مومن:16) (2)۔ واضح رہے کہ دنیا میں کسی دوسرے کو بادشاہ کہہ دینا بطریق مجاز ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (بقرہ:247) ''بے شک اللہ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر''۔ وَكَانَ وَرَاۗءَهُمْ مَّلِكٌ (الکھف:۷۹) ''ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا''۔ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَاۗءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (مائدہ:20) ''جب بنائے اس نے تم میں سے انبیاء اور بنایا تمہیں حکمران''۔ صحیحین میں ہے ''مثلُ الملوكِ على الاسرّة''

''اَلدِّيْنِ'' سے مراد جزاء اور حساب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ (النور:25) ''اس روز پورا پورا دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ جس کے وہ حقدار ہیں''۔ اور فرمایا: اِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ''کیا اس وقت ہمیں جزا دی جائے گی'' (صافات:53) حدیث شریف میں ہے ''دانا وہ ہے جو اپنے نفس سے خود بدلہ لے اور موت کے بعد نفع دینے والے اعمال کر لے'' (3)۔ جیسے حضرت عمر کا فرمان ہے: اپنے آپ کا احتساب کر و اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔ اپنے اعمال کا خود وزن کر و اس سے پہلے کہ وہ میزان میں رکھے جائیں۔ اور اس بڑی پیشی کیلئے تیار ہو جاؤ جب تم اس ذات کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جس کے سامنے تمہارا کوئی عمل بھی پوشیدہ نہیں۔ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (الحاقۃ:18) ''وہ دن جب تم پیش کیے جاؤ گے، تمہارا کوئی راز پوشیدہ نہ رہے گا''۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۵ۭ

''تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں''

قراء سبعہ اور جمہور نے اِيَّاكَ کی یاء کو مشدد پڑھا ہے۔ عمرو بن فاید نے تخفیف کے ساتھ کسرہ پڑھا ہے لیکن یہ قرأت شاذ اور مردود ہے۔ کیونکہ اِيَا کے معنی ہیں (سورج کی روشنی) بعض نے (اَيَّاكَ) ہمزہ کی زبر اور یاء کو مشدد کر کے پڑھا ہے۔ بعض (هَيَاكَ) کر کے یعنی ہمزہ کی ھاء پڑھتے ہیں۔ جیسے ایک شاعر کا قول ہے۔

فَهَيَاكَ وَالْاَمْرَ الَّذِيْ اِنْ تَرَاحَبَتْ ... مَوَارِدُهٗ ضَاقَتْ عَلَيْكَ مَصَادِرُهٗ

''نَسْتَعِيْنُ'' سب کی قرأت میں پہلے کلمہ (نون) کے زبر کے ساتھ ہے ماسوائے یحییٰ بن وثاب اور اعمش کے وہ اسے کسرہ دے کر پڑھتے ہیں۔ یہ بنو اسد، بنو ربیعہ اور بنو تمیم کی لغت ہے۔ اَلْعِبَادَةِ (عبادت) کا لغوی معنی ہے اَلذِّلَّةُ (ذلت)۔ کہا جاتا ہے طَرِيْقٌ مُّعَبَّدٌ وَبَعِيْرٌ مُّعَبَّدٌ اَیْ مُذَلَّلٌ۔ اور شریعت میں عبادت نام ہے کمال محبت اور خشوع وخضوع اور خوف کا۔ مفعول (اِيَّاكَ) کو مقدم کیا۔ اور حصر

1۔ صحیح بخاری: 56/8 2۔ فتح الباری: 367/13 3۔ مسند امام احمد: 124/4

اور اہتمام کے لئے اسے دوبارہ ذکر کیا کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں یہی کمال اطاعت ہے۔ پورے دین کا حاصل صرف یہی دو چیزیں ہیں جس طرح بعض سلف کا قول ہے سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا راز ہے اور سورۂ فاتحہ کا بھید یہ کلمہ ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پہلے حصہ میں شرک کی نفی اور دوسرے میں اپنی قوت اور طاقت کی نفی ہے اور اپنے سارے امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اس مضمون کی اور بھی آیات ہیں۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (ہود: 123) ''تو آپ بھی اس کی عبادت کیجئے اور اس پر بھروسہ رکھئے اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو تم لوگ کرتے ہو'' اور فرمایا: قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ (ملک: 29) ''فرمایئے (وہ میرا خالق) بڑا ہی مہربان ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہوا ہے''۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (مزمل: 9) ''مالک ہے مشرق و مغرب کا اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس بنائے رکھئے اسی کو اپنا کارساز''۔

اسی طرح یہ آیت کریمہ ہے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اس سے اوپر ذکر کردہ آیات میں خطاب کا صیغہ نہ تھا۔ لیکن اس آیت میں غائب سے خطاب کی طرف آئے ہیں۔ اس میں بہت مناسبت ہے کیونکہ اللہ کی حمد و ثناء کرنے کے بعد بندہ گویا قرب خداوندی میں پہنچ گیا اور بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو گیا۔ اسی لئے عرض کی اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اس آیت میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس سورت کی ابتدائی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی بہترین صفات کے ساتھ اپنی حمد و ثناء کر کے بندوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ وہ بھی اس کی حمد و ثناء انہی الفاظ کے ساتھ کریں۔ اسی لئے اس شخص کی نماز ہی صحیح نہیں ہوتی جو اس سورت کو نہ پڑھے بشرطیکہ وہ اسے پڑھنے پر قادر ہو۔ جیسے کہ صحیحین کی حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں (1)۔ اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے مابین نصف نصف تقسیم کر لیا ہے۔ ایک حصہ میرے لئے اور ایک میرے بندے کیلئے۔ میرے بندے کیلئے وہ کچھ جو وہ مانگے جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے اللہ فرماتا ہے بندے نے میری حمد بیان کی۔ جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو رب فرماتا ہے یہ میرے اور بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کیلئے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے۔ جب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ پر پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کیلئے ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو وہ طلب کرے (2)۔ حضرت ضحاک حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا معنی ہے۔ ہم تیری ہی توحید بیان کرتے ہیں۔ تجھی سے ڈرتے ہیں اور اے رب کریم تیرے سوا کسی اور سے امید نہیں رکھتے۔ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہم تیری اطاعت اور اپنے دیگر معاملات کیلئے تیری ہی نصرت کے خواہاں ہیں قتادہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ خداوند تبارک و تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم سب اسی کی مخلصانہ عبادت کرو۔ اور اپنے معاملات میں اسی کی مدد طلب کرو۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اصل مقصود عبادت ہے اور استعانت تو اس کیلئے ایک وسیلہ اور اہتمام ہے۔ احتیاط یہ ہے کہ زیادہ اہم کو مقدم کیا جائے پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ۔ واللہ اعلم۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا ہے۔ اگر یہ جمع کیلئے ہے تو کہنے والا تو ایک ہے۔ اور اگر تعظیم کیلئے ہے تو بھی اس مقام پر نامناسب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں جنس عباد کی طرف سے خبر دی جا

1۔ صحیح البخاری: 192/1 2۔ مسلم: 296/1

رہی ہے اور نمازی بھی ان ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ خصوصاً جب وہ جماعت میں کھڑا ہو یا ان کا امام ہو تو اس وقت گویا وہ اپنی اور تمام مومن بھائیوں کی طرف سے یہ اقرار کر رہا ہوتا ہے کہ وہ سب اس کی عبادت کیلئے پیدا کیے گئے ہیں۔ اور وہ انکی طرف سے بطور وساطت یہ کہہ رہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ تعظیم کیلئے ہے گویا جب بندہ عبادت میں داخل ہوتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ تو شریف ہے اور تیرا مرتبہ ہمارے سامنے بہت بلند ہے۔ پس تو کہہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اور جب تم عبادت سے باہر ہو تو جمع کا صیغہ استعمال نہ کرنا۔ اگر چہ تو لاکھوں یا کروڑوں میں سے ایک ہے۔ کیونکہ سب اللہ کے محتاج ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ تواضع اور انکساری میں اِیَّاكَ عَبَدْنَا سے زیادہ ہے کیونکہ اس میں انسانی عظمت کا پہلو پنہاں ہے گویا وہ اکیلا ہی اللہ کی عبادت کے اہل ہے حالانکہ کوئی بندہ اس کی عبادت اور ثناء کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ عبادت یہ وہ مقام عظیم ہے کہ اس کی مدد سے انسان اللہ تعالیٰ کی جناب سے اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے۔ جیسے کسی شاعر کا قول ہے۔

لَا تَدْعُنِیْ اِلَّا بِیَا عَبْدَهَا فَاِنَّهٗ اَشْرَفُ اَسْمَائِیْ

”ترجمہ: مجھے اس کا غلام کہہ کر پکارو کیونکہ یہی میرا سب سے عمدہ نام ہے“۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے افضل ترین مقامات پر رسول اکرم ﷺ کو عبدہ (اپنا بندہ) کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ جیسے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ (الکھف: 1) ایک اور جگہ فرمایا: وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ (جن: 19)، سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ (بنی اسرائیل: 1) قرآن نے انہیں اپنا بندہ قرار دیا ہے اور یہ تعلیم دی کہ جب تمہارا دل مخالفین کی بے جا مخالفت کی وجہ سے تنگ ہو تو تم اس کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ۙ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۹۸﴾ وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ (سورۃ حجر 97\99) ”اور ہم خوب جانتے ہیں۔ کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کہا کرتے ہیں۔ سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جایئے سجدہ کرنے والوں سے۔ اور عبادت کیجئے اپنے رب کی یہاں تک کہ آجائے تیرے پاس یقین“۔ رازی نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے نقل کیا ہے کہ مقام عبودیت مقام رسالت سے ارفع ہے کیونکہ عبادت کا تعلق مخلوق سے خالق کی طرف ہوتا ہے، اور رسالت کا تعلق حق سے خالق کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے بھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے کی مصالح اور امور کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور رسول اپنی امت کی مصلحتوں کا وارث ہوتا ہے۔ یہ قول خطاء ہے اور اس کی دلیل ضعیف اور لاحاصل ہے۔ رازی کے علاوہ کسی اور نے نہ تو اس کا رد کیا ہے۔ اور نہ اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

بعض صوفیاء کا قول ہے کہ عبادت یا تو حصول ثواب کیلئے ہوتی ہے یا عذاب سے بچنے کیلئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی فائدہ کی بات نہیں۔ کیونکہ اس وقت مقصود خود اپنے مقصود کا حصول ٹھہرا۔ یا بطور شرف لیکن یہ بھی ضعیف ہے۔ عبادت کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ عبادت خالص اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے ہو جو کمال کی تمام صفات سے متصف ہے۔ فرماتے ہیں اسی لیے نمازی کہتا ہے۔ میں اللہ کیلئے نماز پڑھ رہا ہوں۔ اگر ثواب کے حصول کیلئے یا عذاب سے بچنے کیلئے ہو تو نماز باطل ہے۔ دوسرا گروہ ان کی تردید کرتا ہے وہ کہتے ہیں کہ عبادت کا رضائے الٰہی کیلئے ہونا اس کے ساتھ ثواب طلب کرنا یا عذاب سے پناہ طلب کرنے کے منافی نہیں۔ جیسے اس اعرابی نے کہا تھا کہ ”میں نہ تو آپ ﷺ کی طرح پڑھنا جانتا ہوں اور نہ حضرت معاذ کی طرح میں تو اللہ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور آگ سے پناہ طلب کرتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسی لیے ہم بھی پڑھتے ہیں۔ (حَوْلَهَا نُدَنْدِنُ) (1)

1۔ مسند احمد: 474/3

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝

''چلا ہم کو سیدھے راستہ پر''

جمہور قراء نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض قراء نے ''السراط'' سین کے ساتھ اور بعض نے زا کے ساتھ پڑھا ہے فراء کا کہنا ہے کہ یہ بنو عذرہ اور بنو کلب کی زبان ہے۔ چونکہ پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ثناء گزر چکی اس لیے اب مناسب تھا کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرے جیسا کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے کہ ''اس کا نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کیلئے۔ اور میرے بندے کیلئے وہی کچھ ہے جو وہ طلب کرے۔ (خیال فرمایئے) کہ اس بات میں کس قدر لطافت ہے کہ پہلے اپنے مسئول (پروردگار عالم) کی تعریف کرے پھر اپنی اور اپنے بھائیوں کی مراد ان الفاظ سے طلب کرے'' اے اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا''۔ کیونکہ مراد کے حصول اور مقصد کو پالینے کا یہ تیر بہدف نسخہ ہے۔ اسی لیے اللہ وتبارک وتعالیٰ نے اسے پالینے کے کامل طریقے کی طرف راہنمائی فرمائی۔ کبھی سوال اس طرح بھی ہوتا ہے کہ سائل اپنی حالت اور حاجت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (قصص:24) ''میرے مالک! واقعی میں اس خیر وبرکت کا جو تو نے میری طرف اتاری ہے محتاج ہوں''۔ کبھی اس سے پہلے ممدوح کا وصف ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی دعا: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (انبیاء:87) ''کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاک ہے تو۔ بے شک میں ہی قصوروار ہوں''۔ کبھی سائل صرف تعریف کر کے خاموش ہو جاتا ہے جیسے شاعر کا قول ہے

اَاَذْكُرُ حَاجَتِیْ اَمْ قَدْ كَفَانِیْ ۔۔۔ حَیَاؤُكَ اِنَّ شِیْمَتَكَ الْحَیَاءُ

اِذَا اَثْنٰی عَلَیْكَ الْمَرْءُ یَوْمًا ۔۔۔ كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ

''ترجمہ: میں اپنی حاجت کو ذکر کروں یا تیری جود وسخا ہی میرے لیے کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ داد ودہش تیری فطرت میں داخل ہے''۔ لفظ ہدایت یہاں ارشاد اور توفیق کے معنی میں ہے۔ کبھی یہ متعدی ہوتا ہے جیسے اس آیت کریمہ میں ہے۔ یہ اَلْهِمْنَا، یا اُرْزُقْنَا، یا اَعْطِنَا کے معنی میں ہے۔ ایک دوسری آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (البلد:10) ''اور ہم نے دکھا دیں اسے دو نمایاں راہیں''۔ کبھی یہ الیٰ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (النحل:121) ''اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور انہیں ہدایت فرمائی سیدھے راستے کی طرف''۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ (صافات:23) ''پس سیدھا لے چلو انہیں جہنم کی راہ کی طرف''۔ یہاں ہدایت ارشاد اور دلالت کے معنی میں ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ:52) ''بلاشبہ آپ راہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف''۔ کبھی یہ لام سے متعدی ہوتا ہے جیسے اہل جنت کا قول: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (اعراف:43) ''ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی''۔

امام ابوجعفر جریر فرماتے ہیں صراط مستقیم سے مراد بالاتفاق تمام امت کے نزدیک واضح راستہ ہے جس میں کہیں کجی نہ ہو۔ سب اہل عرب کی لغت میں یہی ہے۔ جیسے جریر بن عطیہ خطفی کا قول ہے۔

اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ ۔۔۔ اِذَا اعْوَجَّ الْمَوَارِدُ مُسْتَقِیْمُ

کہتے ہیں اس کے شواہد بے شمار ہیں۔ پھر اہل عرب لفظ صراط کو استعارۃً ہر قول اور عمل پر استعمال کرتے ہیں جس کی صفت مستقیم (سیدھا) معوج (ٹیڑھا) آتی ہے۔ لفظ صراط کی تفسیر میں سلف وخلف مفسرین کی عبارتوں میں اختلاف ہے۔ اگرچہ ان سب کا خلاصہ

ایک ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کی پیروی کرنا ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ صراط مستقیم سے مراد کتاب اللہ ہے (1)۔ جیسے ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے۔ فضائل قرآن میں احمد اور ترمذی کی روایت پہلے گزر چکی ہے۔ حضرت علی سے مرفوعاً مروی ہے۔ کہ وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے وہ ذکر حکیم ہے اور وہی صراط مستقیم ہے حضرت علی سے یہی روایت موقوفاً بھی مروی ہے۔ واللہ اعلم۔ ثوری نے بھی یہی لکھا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد اسلام ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ جبریل نے حضور علیہ السلام سے عرض کی۔ ''اے محمد فرمایئے اے اللہ مجھے سیدھی راہ دکھا''۔ یہ اللہ کا دین ہے اور اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک دوسرا قول مروی ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور دیگر بہت سے صحابہ سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے۔ آسمانوں اور زمین کے مابین جو کچھ ہے وہ اس سے وسعت والا ہے۔ ابن حنفیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ یہ اللہ کا دین ہے جس کے سوا کوئی دین مقبول نہیں۔ عبداللہ بن زید اسلم کا قول بھی یہی ہے۔ مسند امام احمد میں ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی ایک مثال بیان کی ہے جس کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں۔ ان میں کئی دروازے کھلے ہیں ان پر پردے لٹک رہے ہیں۔ صراط مستقیم کے دروازے پر ایک آدمی یہ ندا دے رہا ہے۔ اے لوگو! سب اسی راہ پر چلتے جاؤ۔ ادھر ادھر مت ہونا۔ ایک پکارنے والا اس راستے کے اوپر ہے۔ جب کوئی شخص ان دروازوں کو کھولنا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے۔ تیرا بھلا ہو اسے نہ کھولنا۔ اگر تو نے اسے کھول دیا تو تو اس کے اندر چلا جائے گا۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے، دیواریں اللہ کی حدود اور کھلے دروازے اللہ کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ اس کے سرے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے۔ اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا وہ کھٹکا ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے (2)۔ یہی روایت ابن ابی حاتم، ابن جریر، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کی ہے۔ اس کی اسناد حسن صحیح ہے واللہ اعلم۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد حق ہے۔ ان کا یہ قول سب کو شامل ہے۔ اس میں اور سابقہ اقوال میں کوئی تضاد نہیں۔ ابن ابی حاتم اور حضرت ابوالعالیہ سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد نبی اکرم علیہ السلام اور ان کے دو (خلفاء) صاحبین ہیں۔ حضرت عاصم کہتے ہیں کہ ہم نے یہ بات حضرت حسن سے ذکر کی تو انہوں نے فرمایا ابوالعالیہ درست کہتے ہیں (3)۔ یہ سب اقوال صحیح اور ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں جس نے نبی کریم علیہ السلام اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء (ابوبکر وعمر) کی اتباع کی اس نے حق کی اتباع کی اور جو حق کا پیرو ہے وہ اسلام کا پیروکار ہے۔ جس نے اسلام کی اتباع کی وہ قرآن کا مطیع ہے۔ جو کہ اللہ کی کتاب، اس کی مضبوط رسی اور صراط مستقیم ہے۔ یہ سب اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ وللہ الحمد۔ طبرانی نے حضرت عبداللہ سے روایت کی ہے کہ صراط مستقیم وہ ہے جس پر رسول اللہ علیہ السلام نے ہمیں چھوڑا۔ اسی لئے امام ابوجعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس آیت کی سب سے بہتر تفسیر یہ ہے کہ ہمیں اس چیز کی توفیق دی جائے جو اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ جس پر چلنے سے خدا اپنے بندوں سے راضی ہوا ہو۔ اور ان پر انعام کیا ہو۔ یہی صراط مستقیم ہے کیونکہ جس شخص کو وہ توفیق دی گئی جو اللہ کے انعام یافتہ بندوں (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) کو تھی۔ تو اسے اسلام، رسولوں کی تصدیق، کتاب اللہ پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے، اللہ کے اوامر کو بجالانے، اس کے نواہی سے رک جانے، نبی اکرم علیہ السلام، آپ کے خلفاء اربعہ اور ہر نیک بندے کی راہ کی توفیق دی گئی۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ **اعتراض:** اگر یہ کہا جائے کہ مومن کو تو ہدایت پہلے ہی نصیب ہو چکی ہے۔ پھر ہر نماز میں اور نماز کے علاوہ ہدایت مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ **جواب:** اس سے مراد ہدایت پر ثابت قدمی رسوخ اور ہمیشگی کی طلب ہے۔ کیونکہ بندہ ہر

1۔ مسند احمد: 182/4 1۔ مسند احمد: 182/4 2۔ تفسیر الطبری: 75/1

گھڑی ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی ذات کا محتاج ہے۔ وہ خود اپنی جان کے نفع ونقصان کا مالک نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد، ثابت قدمی اور توفیق چاہتا رہے۔ سعادتمند انسان تو وہ ہے اللہ تعالیٰ جس کی درخواست منظور کرتے ہوئے اسے توفیق عطا فرمادے۔ بے شک وہ رب جلیل پکارنے والے کی پکار سننے کا کفیل ہے۔ بالخصوص مجبور، محتاج اور ہر آن اس کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرنے والے کی ہر پکار کو سنتا ہے اور اسے قبول کرنے کا وہ ضامن ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (نساء:136)'' اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی اس سے پہلے''۔ اس آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دیا۔ یہ تحصیل حاصل نہیں ہے کیونکہ یہاں اس سے مراد ثابت قدمی، استمرار اور اس کے حصول میں معاون اعمال پر دوام طلب کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ اللہ رب العزت نے اپنے مومن بندوں کو یہ کہنے کا حکم دیا۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (آل عمران:8)'' اے ہمارے رب! نہ ٹیڑھے کر ہمارے دل بعد اس کے کہ تو نے ہدایت دی ہمیں اور عطا فرما ہمیں اپنے پاس سے رحمت بے شک تو ہی سب کچھ بہت زیادہ دینے والا ہے''۔ حضرت صدیق اکبر اس آیت کو مغرب کی نماز کی تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سراً پڑھا کرتے تھے۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا معنی یہ ہے کہ ہمیں اس پر ثابت قدم رکھ اور اس سے نہ ہٹا۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۝

'' راستہ ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔''

وہ حدیث پہلے گذر چکی ہے جس میں ہے کہ جب بندہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ آخر تک پڑھتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ کچھ ہے جو وہ مانگے۔ یہ آیت صراط مستقیم کی تفسیر ہے۔ اور نحویوں کے نزدیک یہ بدل یا عطف بیان ہے واللہ اعلم۔ انعام یافتہ لوگوں کا بیان سورۂ نساء میں آچکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِیْقًا ؕ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِیْمًا (نساء:69\70)'' اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ کی اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔ یہ (محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کا اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا''۔ حضرت ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے فرشتوں، انبیاء، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کی راہ پر چلا جن پر اپنی اطاعت اور عبادت کی وجہ سے تو نے انعام فرمایا۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا (نساء:80) حضرت ابوجعفر حضرت ربیع بن انس سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد انبیاء ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد کے نزدیک اس سے مراد مومنین ہیں۔ وکیع کے نزدیک اس سے مراد مسلمان ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ ہیں۔ ابن عباس کا مذکورہ بیان زیادہ عمومیت اور شمولیت والا ہے۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ جمہور کی قرأت میں غَیْرِ راء کی زیر کے ساتھ ہے اور صفت ہے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اسے حال کے طور پر زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عمر بن خطاب کی قرأت یہی ہے۔ ابن کثیر سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ علیہم میں ضمیر

ذوالحال ہے۔ اَنْعَمْتَ اس کا عامل ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ خدایا تو ہمیں سیدھی راہ دکھا ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا جو ہدایت اور استقامت والے تھے خدا اور اس کے رسول کے اطاعت گذار، اس کے اوامر کو بجالانے والے اس کے منع کردہ امور سے رکنے والے۔ نہ کہ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا غضب ہوا جن کے ارادے فاسد ہو گئے۔ حق کو سمجھنے کے باوجود انہوں نے اس سے اعراض کر لیا۔ اور نہ گمراہ لوگوں کا جو علم نہیں رکھتے حق کی طرف ان کا رہنمائی نہیں کی جاتی اور وہ گمراہی میں سرگرداں ہیں۔ کلام میں لا سے تاکید پیدا کی تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہاں دو راستے ہیں۔ ایک یہود کا دوسرا نصاریٰ کا۔ بعض نحویوں کا خیال ہے کہ غیر کا لفظ یہاں استثناء کے لئے ہے۔ تو یہ استثناء منقطع بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انعام یافتہ لوگوں میں داخل ہی نہ تھے۔ لیکن ہماری ذکر کردہ تفسیر زیادہ بہتر ہے۔ ایک شاعر کا قول ہے۔

فِیْ بِئْرٍ لَا حَوَرٍ سَعٰی وَمَا شَعَرْ

ای فی بئر حور۔ صحیح وہی ہے جس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام اپنی کتاب فضائل قرآن میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھا کرتے تھے۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔ ابی بن کعب سے بھی یہی منقول ہے۔ لیکن اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ انہوں نے اسے بطور تفسیر اس طرح پڑھا ہے۔ اس سے بھی ہمارے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ لا نفی کی تاکید کے لئے ہے۔ تا کہ یہ وہم ہی نہ ہو کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ پر عطف ہے۔ اس لئے بھی کہ دونوں راہوں کا فرق معلوم ہو جائے۔ تا کہ ہر شخص ان سے بچتا رہے۔ اہل ایمان کا طریقہ تو یہ ہے کہ حق کا علم بھی ہو اور اس پر عمل بھی ہو۔ یہود کے ہاں عمل نہیں اور نصاریٰ کے ہاں علم نہیں۔ اسی لئے یہودیوں پر غضب ہوا اور نصرانیوں کے حصے میں گمراہی آئی۔ اس لئے کہ علم کے باوجود عمل کو چھوڑنا غضب کا باعث ہے۔ نصاریٰ گو ایک چیز کا قصد تو کرتے ہیں لیکن اس کی راہ نہیں پا سکتے کیونکہ ان کا طریق کار غلط ہے۔ وہ اتباع حق ہے۔ جس سے ہٹنے کے سبب وہ گمراہ ہو گئے۔ یوں تو غضب اور گمراہی میں دونوں گروہ برابر ہیں لیکن یہودی غضب کے حصہ میں پیش پیش ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا: مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ (مائدہ:60) ''وہ لوگ (برے ہیں) جن پر لعنت کی اللہ نے اور غضب فرمایا ان پر''۔ نصرانیوں کی بڑی خصوصیت گمراہی ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا: قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ (مائدہ:77) ''جو گمراہ ہو چکے ہیں پہلے سے اور گمراہ کر چکے ہیں بہت سے لوگوں کو اور بھٹک چکے ہیں راہ راست سے''۔ اس کی تائید میں بہت سی احادیث اور آثار بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مسند امام احمد میں حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا لشکر آیا اور میری پھوپھی اور کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا۔ جب ان کا تعارف کرایا گیا تو میری پھوپھی نے عرض کی یا رسول اللہ! میری خبر گیری کرنے والا دور ہے، میرا بیٹا کوئی نہیں میں عمر رسیدہ ہوں کسی خدمت کے لائق نہیں۔ مجھ پر احسان کر کے مجھے رہا فرما دیجئے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تیری خبر لینے والا کون ہے۔ اس نے عرض کی عدی بن حاتم۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہی جو اللہ اور اس کے رسول سے بھاگتا پھرتا ہے۔ فرماتی ہیں کہ پھر حضور ﷺ نے انہیں آزاد فرمایا تھا جب آپ ﷺ لوٹ کر جانے لگے تو آپ کے ساتھ ایک آدمی تھا غالباً وہ حضرت علی تھے۔ انہوں نے فرمایا آپ سے سواری مانگ لو۔ میری پھوپھی نے درخواست کی جو منظور ہوئی۔ وہ میرے پاس آئیں۔ اور کہنے لگیں کہ حضور کی سخاوت نے تو تیرے باپ حاتم کی سخاوت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ آپ کے پاس جو آتا ہے وہ خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ یہ سن کر میں بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ بچے اور عورتیں آپ کے پاس آتے جاتے ہیں اور آپ ﷺ ان سے بے تکلفانہ باتیں کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ آپ ﷺ قیصر و کسریٰ کی طرح کے بادشاہ نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا اے عدی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے کیوں بھاگتے ہو؟ کیا خدا کے سوا کوئی معبود

ہے؟۔ اللہ اکبر کہنے سے کیوں منہ موڑتے ہو۔ کیا اللہ عزوجل سے بڑی ذات بھی کوئی ہے؟۔ فرماتے ہیں میں نے اسلام قبول کرلیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی سے سرشار تھا۔ آپ نے فرمایا یہود مَغۡضُوۡبٌ عَلَيۡهِمۡ ہیں اور نصاریٰ ضَآلِّيۡنَ (گمراہ) ہیں الحدیث۔ ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے(1)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا اس سے مراد یہود ہیں۔ اور وَلَا الضَّآلِّيۡنَ کے بارے میں فرمایا وہ نصاریٰ ہیں۔ سفیان بن عیینہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ یہ حدیث متعدد سندوں سے مروی ہے۔ ان کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ ان سب کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ عبدالرزاق نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وادی القریٰ میں گھوڑے پر سوار تھے کہ بنوقین کے ایک آدمی نے آپ سے یہی سوال کیا۔ تو آپ ﷺ نے یہی جواب ارشاد فرمایا۔ بعض روایت میں اس کا نام عبداللہ بن عمرو ہے واللہ اعلم۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوذر سے یہی روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور دیگر بہت سے صحابہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ ربیع بن انس اور عبدالرحمٰن بن زید وغیرہ کا قول بھی یہی ہے بلکہ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان جلیل القدر ائمہ کے قول کی تائید سابقہ حدیث سے بھی ہوتی ہے سورۂ بقرہ کی آیت میں بنواسرائیل کو اسی طرح خطاب کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بِئۡسَمَا اشۡتَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بَغۡيًا اَنۡ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ (بقرہ:90) ''بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا۔ وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس کتاب کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے۔ اپنے بندوں سے سو وہ حقدار ہوگئے ناراضگی کے اور کافروں کے لئے ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب ہے''۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا: قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ (مائدہ:60) ''آپ (انہیں) فرمایئے کیا میں آگاہ کروں تمہیں کہ کون برا ہے ان سے باعتبار جزاء کے اللہ کے نزدیک وہ لوگ (برے ہیں) جن پر لعنت کی اللہ نے اور غضب فرمایا ان پر اور بنایا ان میں سے بعض کو بندر اور بعض کو سُور اور (وہ برے ہیں) جنہوں نے پوجا کی شیطان کی وہی لوگ بدترین ہیں بلحاظ درجہ کے اور دوسروں سے زیادہ بھٹکنے والے ہیں راہ راست سے''۔ ایک اور جگہ فرمایا: لُعِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۞ كَانُوۡا لَا يَتَنَاهَوۡنَ عَنۡ مُّنۡكَرٍ فَعَلُوۡهُ ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ (مائدہ:79-78) (لعنت کیے گئے وہ جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل سے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ پسر مریم کی زبان پر یہ بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے اور زیادتیاں کیا کرتے تھے۔ نہیں منع کیا کرتے تھے ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ بہت برا تھا جو وہ کیا کرتے تھے''۔ سیرت میں زید بن عمرو بن نفیل سے مروی ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ دین حنیف کی تلاش میں شام کی طرف نکلے۔ یہود نے کہا کہ آپ ہمارے دین میں داخل نہیں ہوسکتے جب تک کہ غضب خداوندی کا حصہ نہ لے لیں۔ انہوں نے کہا کہ میں تو اللہ کے غضب سے فرار چاہتا ہوں پھر وہ نصرانیوں سے ملے۔ انہوں نے کہا آپ اس وقت تک ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوسکتے جب تک اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں حصہ دار نہ بنیں۔ وہ کہتے ہیں میں نے کہا ہم یہ بھی نہیں کرسکتے۔ چنانچہ وہ اپنی فطرت پر رہے بتوں کی عبادت اور مشرکین کے دین سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اور یہود و نصاریٰ میں سے کسی کا دین قبول نہ کیا۔ تاہم زید کے ساتھیوں نے نصرانیت کو اختیار کرلیا۔ اس لیے کہ یہ یہود کے

1۔ مسند امام احمد: 378/4

مذہب سے ملتا جلتا تھا۔ انہی میں سے ورقہ بن نوفل بھی تھے۔ انہیں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا زمانہ ملا۔ اللہ نے انہیں ہدایت عطا فرمائی آپ پر ایمان لائے اور جو وحی اس وقت تک اتری تھی اس کی تصدیق کی۔

(مسئلہ) ضاد اور ظاء کی قرأت میں بہت دقیق فرق ہے۔ کیونکہ یہ دونوں قریب المخرج ہیں۔ اس لیے علماء کرام کا صحیح مذہب یہی ہے کہ یہ فرق معاف ہے۔ ضاد کا صحیح مخرج تو زبان کا اول کنارہ اور اس کے ساتھ والی ڈاڑھیں ہیں اور ظاء کا صحیح مخرج زبان کی ایک طرف اور سامنے والے اوپر کے دو دانتوں کے کنارے۔ یہ دونوں حرف حروف مجہورہ، رخوہ اور مطبقہ سے ہیں۔ اس لیے جو شخص ان میں تمیز نہ کر سکتا ہو وہ ایک کی جگہ دوسرا حرف پڑھ لے تو یہ اسے معاف ہے۔ واللہ اعلم۔ وہ حدیث جس میں ہے کہ میں ضاد کو سب سے صحیح پڑھنے والا ہوں بے اصل ہے۔ واللہ اعلم

(فصل) یہ مبارک سورت سات آیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و بزرگی اس کی ثناء اور صفات عالیہ پر مشتمل اس کے اسماء حسنیٰ کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی قیامت کا ذکر ہے۔ اور بندوں کو یہ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ اسی سے سوال کریں۔ اسی کے سامنے تضرع وزاری کریں۔ اپنی عاجزی و بے کسی کا اظہار کریں۔ خلوص کے ساتھ اس کی عبادت کریں۔ اس کی الوہیت و وحدانیت کا اقرار کریں، اسے شریک، نظیر اور مثل سے مبرا سمجھیں۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت اور اس پر ثابت قدمی کی دعا کریں۔ حتیٰ کہ یہی ہدایت انہیں قیامت کے دن پل صراط سے پار لگا دے۔ اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے جوار میں جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ ساتھ ہی اس سورت میں نیک اعمال کی ترغیب ہے۔ تا کہ قیامت کے دن نیکوکاروں کی معیت نصیب ہو اور باطل راہوں پر چلنے سے تنبیہ ہے تا کہ قیامت کے دن حشر ان کے ساتھ نہ ہو کیونکہ وہ تو مَغۡضُوۡبٌ عَلَيۡهِمۡ اور گمراہ ہیں۔ انعام کی اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا کتنا عمدہ ہے۔ ارشاد فرمایا: صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ غضب کے فاعل کو حذف کر دیا۔ اگرچہ وہی حقیقت میں اس کا فاعل ہے۔ جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا قَوۡمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ الآیۃ '' کیا تم نے نہیں دیکھا ان (نادانوں) کی طرف جنہوں نے دوست بنا لیا ایسی قوم کو جن پر خدا کا غضب ہوا'' (مجادلہ: 14) اسی طرح ضلالت کی نسبت ان کی طرف کی گئی جو گمراہ ہیں۔ حالانکہ انجام کار ان کی تقدیر کے سبب اللہ نے ہی ان کی گمراہی پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے۔ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا (کہف: 17) '' (حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو تو نہیں پائے گا اس کے لیے کوئی مددگار (اور) راہنما''۔ ایک اور جگہ فرمایا: مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ (اعراف: 186) '' جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے۔ وہ رہنے دیتا ہے انہیں کہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں''۔

اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ قدریہ فرقہ اور ان کے پیروکار یہ کہتے ہیں کہ بندے خود مختار ہیں اور بطور استشہاد قرآن کریم کی متشابہ آیات کو لاتے ہیں۔ جن آیات میں ان کا رد، انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کا یہ موقف غلط ہے۔ باطل پرست فرقوں کا یہی طریق کار رہتا ہے۔ حالانکہ صحیح حدیث میں ہے کہ '' جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیات کے پیچھے لگے ہیں تو سمجھ لو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہی کا نام لیا ہے۔ پس تم ان سے محتاط رہو''(1)۔ اس حدیث میں حضور ﷺ کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے: فَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَيۡغٌ فَيَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِيۡلِهٖ (آل عمران: 7) '' پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے۔ سو وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے (ان کا

1۔ صحیح مسلم: 1

مقصد) فتنہ انگیزی اور (غلط) معنی کی تلاش ہے''۔ پس الحمدللہ اہل بدعت کے لئے قرآن کریم میں کوئی صحیح دلیل نہیں۔ کیونکہ قرآن تو حق و باطل اور ہدایت اور گمراہی میں فرق کرنے کے لئے ہی آیا ہے۔ اس میں کسی قسم کا تناقض اور اختلاف نہیں کیونکہ یہ تو اُتاری ہوئی ہے بڑے حکمت والے، سب خوبیاں سراہے کی طرف سے۔

(فصل) سورۂ فاتحہ کو ختم کر کے آمین کہنا مستحب ہے۔ آمین یہ یاسین کی طرح ہے۔ بعض نے اٰمین کر کے پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے اے اللہ قبول فرما۔ آمین کے استحباب کی دلیل وہ حدیث مبارکہ ہے جسے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جائے اس کے تمام اگلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہی حدیث مسلم میں دیگر الفاظ سے بھی آئی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق اور ہلال بن یساف فرماتے ہیں کہ آمین اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک نام ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ مقتدی بلند آواز سے آمین نہیں کہیں گے۔ کیونکہ نماز کے دیگر افعال آہستہ آواز میں ادا کیے جاتے ہیں۔ (صحیح مذہب یہی ہے۔ مترجم)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آمین کا لفظ رب العالمین کی طرف سے اپنے بندوں پر مہر ہے۔ (اس بحث کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ مترجم)

سورۂ بقرہ

یہ سورت مدنی ہے۔اس کی آیات کی تعداد 286 ہے۔

اس سورت کے فضائل: حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ قرآن کی کوہان اور اس کی بلندی ہے اس کی ایک ایک آیت کے ساتھ اسی فرشتے نازل ہوتے تھے۔ بالخصوص آیت الکرسی تو خاص عرش تلے سے نازل ہوئی۔ اور اس سورت کے ساتھ ملائی گئی۔ سورۂ یٰسٓ قرآن کا دل ہے۔ جو شخص اسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور دار آخرت کی کامیابی کے لئے پڑھے۔ اسے بخش دیا جاتا ہے۔ اسے مرنے والوں پر پڑھا کرو(1)۔ یہ حدیث اسی طرح ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ ترمذی نے ایک ضعیف سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کی بلندی ہوتی ہے۔ اور قرآن کی بلندی سورۂ بقرہ ہے(2)۔ اس میں ایک آیت ہے، جو تمام آیات کی سردار ہے۔ اور وہ آیت الکرسی ہے۔ مسند امام احمد، مسلم، ترمذی اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ۔ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے اس میں شیطان داخل نہیں ہوتا(3)۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ ابوعبید قاسم بن سلام کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے'' (4)۔ اس حدیث کے ایک راوی کو ابن حصین نے تو ثقہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کی حدیث کو امام احمد بن حنبل نے منکر سمجھا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک قول اسی طرح منقول ہے۔ نسائی نے اسے الیوم و اللیلۃ میں، حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ ابن مردویہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ پیر پر پیر چڑھائے پڑھتا چلا جائے۔ اور سورۂ بقرہ کو چھوڑ دے۔ بے شک جس گھر میں یہ سورت پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سب گھروں سے چھوٹا خالی وہ گھر ہے جس میں کتاب اللہ کی تلاوت نہ ہو(5)۔ نسائی نے الیوم و اللیلۃ میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ دارمی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جا رہی ہو شیطان وہاں سے بآواز بلند پادتا ہوا بھاگتا ہے۔ ہر چیز کی شان وشوکت ہے قرآن کی شان وشوکت سورۂ بقرہ ہے، ہر چیز کا مغز ہوتا ہے قرآن کا مغز مفصل سورتیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی دس آیات (پہلی چار آیتیں، آیت الکرسی، اس کے بعد کی دو آیات اور آخری تین آیات) کسی رات پڑھ لے تو شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوتا۔ ایک روایت میں ہے وہ اس روز اس گھر اور اہل خانہ کے قریب نہیں جا سکتا۔ اور کوئی چیز انہیں نہیں ستا سکتی۔ اگر یہ آیات مجنون پر پڑھی جائیں تو اسے افاقہ ہو جائے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کی شان ہے اور قرآن کی شان سورۂ بقرہ ہے جس نے اسے رات کو گھر میں پڑھا اس گھر میں تین رات شیطان داخل نہیں ہوتا۔ اور جس نے اسے دن کو پڑھا شیطان تین دن تک اس گھر میں داخل نہیں ہوتا(6)۔ اس روایت کو ابوالقاسم طبرانی، ابوحاتم، ابن حبان اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا سا

1۔ مسند احمد: 26/5 2۔ الترمذی: 2878 3۔ مجمع الزوائد: 311/6
4۔ مجمع الزوائد: 311/6 5۔ صحیح مسلم: 2/2 6۔ الدر المنثور: 19/1

لشکر بھیجا۔ آپ ﷺ ہر شخص سے باری باری قرآن کریم میں سے جو کچھ اسے یاد ہوتا سنتے جاتے۔ ایک کم سن شخص کو پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہیں قرآن کریم سے کچھ یاد ہے اس نے عرض کی سورۂ بقرہ اور فلاں فلاں سورت۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں سورۂ بقرہ یاد ہے۔ اس نے عرض کی جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ تم ان کے سردار ہو۔ اس وقت ان میں سے ایک معزز آدمی نے کہا میں نے اس خدشہ سے یہ سورت یاد نہیں کی کہ میں اس پر عمل نہیں کرسکوں گا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا" قرآن سیکھو اسے پڑھو۔ جس نے قرآن سیکھا اسے پڑھا اور اس پر عمل کیا اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کستوری سے بھرا ہوا برتن جس کی خوشبو ہر طرف مہک رہی ہے۔ اور اسے سیکھ کر سو جانے والے کی مثال اس طرح ہے جیسے کستوری والی مشک جس کا منہ بند کر دیا گیا ہے"(1)۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ ترمذی کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے۔ ترمذی نے اسے مرسل بھی روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم

امام بخاری حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے ایک رات سورۂ بقرہ کی تلاوت شروع کی۔ ان کا گھوڑا پاس بندھا ہوا تھا۔ اس نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ آپ خاموش ہو گئے تو گھوڑا بھی پرسکون ہو گیا۔ آپ نے پھر پڑھنا شروع کیا۔ گھوڑا پھر بدکنے لگا۔ وہ خاموش ہوئے تو گھوڑا بھی خاموش ہو گیا۔ وہ پھر پڑھنے لگے تو گھوڑا پھر بدکنے لگا۔ ان کے صاحبزادے یحییٰ گھوڑے کے پاس ہی لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اٹھے اور بچے کو اس خدشے سے اٹھا لیا کہ اسے چوٹ نہ آ جائے۔ جب انہوں نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو اسے نہ دیکھا۔ صبح اٹھ کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا تم اسے پڑھتے چلے جاتے۔ تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے یحییٰ کے بارے میں خدشہ ہوا تو میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ پھر میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی چیز چھتری کی طرح ہے اس میں چراغوں کی روشنی ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ روشنی غائب ہو گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہیں معلوم ہے وہ روشنی کیا تھی۔ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا یہ فرشتے تھے جو تمہاری آواز سن کر قریب آ گئے تھے۔ اگر تم پڑھتے رہتے تو وہ صبح تک یونہی رہتے حتیٰ کہ لوگ انہیں دیکھ لیتے اور وہ کسی سے نہ چھپتے(2)۔ امام ابوعبید قاسم بن سلام نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی اسی طرح کا واقعہ مذکور ہے ایک مرتبہ لوگوں نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ گذشتہ رات ہم نے دیکھا کہ حضرت قیس کا گھر ساری رات بقعۂ نور بنا رہا، اور چراغوں سے جگ مگ کرتا رہا آپ ﷺ نے فرمایا شاید انہوں نے رات کو سورۂ بقرہ پڑھی ہو گی۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا(3)۔ اس کی اسناد تو بہت عمدہ ہے مگر اس میں ابہام ہے اور یہ مرسل بھی ہے۔ واللہ اعلم

سورۂ بقرہ اور آل عمران کی فضیلت

حضرت امام احمد ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ سورۂ بقرہ سیکھو اس کا سیکھنا برکت اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے۔ جادوگر اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران سیکھو۔ قیامت کے دن یہ دونوں نورانی سورتیں اپنے پڑھنے والے پر بادل، سائبان یا پرندوں کے جھنڈ کی طرح سایہ کریں گی۔ قیامت کے دن جب آدمی قبر سے باہر آئے گا تو قرآن اسے نوجوان شخص کی طرح ملے گا۔ وہ اسے کہے گا کیا تم مجھے پہچانتے ہو۔ وہ شخص کہے گا نہیں۔ تو وہ شخص کہے گا میں تیرا ساتھی قرآن ہوں جس نے دنوں کو تجھے بھوکا پیاسا رکھا اور راتوں کو بیدار رکھا ہر تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہے اور آج ساری تجارتیں تیرے پیچھے ہیں اسے دائیں ہاتھ میں ملک اور بائیں

1۔ الترمذی: ابواب القرآن 2۔ البخاری 32/6 3۔ فتح الباری 57/9

ہاتھ جنت خلد عطا کی جائے گی اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا۔ اس کے والدین کو دو ایسے حلے پہنائے جائیں گے کہ ساری دنیا کی قیمت بھی ان کے سامنے ہیچ ہو۔ وہ پوچھیں گے کہ اس انعام واکرام کی کیا وجہ ہے۔ کہا جائے گا کہ تمہارے بچے کی قرآن خوانی وجہ سے پھر کہا جائے گا پڑھ اور جنت کی سیڑھیوں اور بالا خانوں پر چڑھتا جا۔ وہ درجے بلند ہوتا رہے گا۔ خواہ ترتیل سے پڑھے۔ یا بغیر ترتیل کے (1)۔ ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کا بعض حصہ روایت کیا ہے۔ اس کی سند حسن ہے اور شرط مسلم پر ہے۔ اس کے راوی بشر سے امام مسلم نے بھی روایات کی ہیں ابن معین نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ نسائی کا قول ہے کہ ان میں کوئی حرج نہیں۔ مگر امام احمد انہیں منکر الحدیث قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں میں نے تلاش کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ حدیث میں عجیب باتوں کا ذکر کرتا ہے۔ بخاری کہتے ہیں کہ ان کی بعض حدیثوں میں اختلاف کیا جاتا ہے۔ ابوحاتم رازی کے نزدیک ان کی حدیث لکھی جاتی ہے لیکن اس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ ابن عدی کا قول ہے کہ ان کی ایسی مرویات بھی ہیں جن کی متابعت نہیں کی جاتی۔ دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ قوی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کی روایات کے شواہد بھی ہیں جیسے ابوامامہ باہلی کی روایت جسے امام احمد نے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا قرآن پڑھا کرو یہ اپنے پڑھنے والوں کی قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔ دونوں سورتیں بقرہ اور آل عمران (زھراوان) پڑھا کرو۔ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح آئیں گی جیسے دو بادل یا دو سائبان یا صف باندھے ہوئے پرندوں کے دو گروہ۔ یہ اپنے قاری کی خدا تعالیٰ سے سفارش کریں گی۔ ان کا پڑھنا برکت اور ترک کرنا باعث حسرت ہے۔ جادوگر اس کی طاقت نہیں رکھتے (2)۔ مسلم نے اسے کتاب الصلاۃ میں روایت کیا ہے۔ الزاھران، نورانی۔ الغیایۃ: جو چیز اوپر سے سایہ کرے۔ الفرق: گروہ، جھنڈ۔ الصواف: پر سے پر ملائے صف باندھے ہوئے۔ البطلۃ: جادوگر۔ لا تستطیعھا: کا معنی ہے کہ جادوگر انہیں حفظ نہیں کر سکتے۔ یا اس کے قاری پر ان کا اثر و نفوذ نہیں ہو سکتا۔

مسند امام احمد میں حضرت نواس بن سمعان کلابی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ قیامت کے دن قرآن اور اہل قرآن کو لایا جائے گا۔ جو اس پر عمل پیرا تھے۔ ان کے آگے سورۂ بقرہ اور آل عمران ہوں گی۔ حضور ﷺ نے ان کی تین مثالیں دیں جو مجھے ابھی تک نہیں بھولیں۔ فرمایا گویا یہ دو بادلوں یا دو سایوں جن کے درمیان دھوپ ہوگی کی طرح ہوں گی یا پر کھولے پرندوں کے جھرمٹ کی طرح اپنے قاری کی سفارش کریں گی (3)۔ مسلم اور ترمذی میں یہی روایت ہے۔ ترمذی نے اسے حسن غریب قرار دیا ہے۔ ابوعبید لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے سورۂ بقرہ اور آل عمران کی تلاوت کی جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو حضرت کعب نے اس سے کہا کیا تو نے بقرہ اور آل عمران پڑھی ہے۔ اس شخص نے کہا ہاں فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس میں خدا کا وہ اسم ہے جب اسے پڑھ کر دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے اس آدمی نے عرض کی مجھے وہ اسم بتائیے تو حضرت کعب نے انکار فرمادیا اور فرمایا اگر میں تمہیں بتا دوں تو مجھے خوف ہے کہ اس کے بدلے تو ایسی دعا نہ مانگ لے جس سے میں اور تو دونوں ہلاک ہو جائیں۔ حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں۔ تمہارے بھائی کو خواب میں دکھایا گیا کہ لوگ ایک دشوار گذار بلند و بالا پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر دو درخت ہیں جو یہ پکار رہے ہیں کیا تم میں کوئی سورۃ بقرہ کا قاری ہے؟ کیا تم میں کوئی سورۂ آل عمران کا قاری ہے؟ اچانک ایک آدمی نے کہا ہاں۔ تو وہ دونوں درخت اپنے پھلوں کے خوشوں سمیت اس کی طرف جھک آتے ہیں۔ وہ شخص اس کی شاخوں پر بیٹھ جاتا ہے اور وہ اسے پہاڑ پر لے جاتے ہیں۔ حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک قرآن پڑھے ہوئے شخص نے اپنے پڑوسی کو مار ڈالا۔ قصاص

1۔ احمد 352/5 2۔ احمد 183/4 3۔ احمد 349/5

میں وہ بھی مارا گیا۔ قرآن کریم ایک ایک سورۃ کر کے اس سے الگ ہونا شروع ہوا حتیٰ کہ اس کے پاس صرف سورۂ بقرہ اور آل عمران رہ گئی۔ اگلے جمعہ آل عمران بھی چلی گئی اور سورۂ بقرہ باقی رہ گئی۔ اگلے جمعہ آواز آئی۔ میری باتیں بدلا نہیں کرتیں اور میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ سورت بھی اس سے الگ ہوگئی گویا بہت بڑا بادل ہے۔ ابوعبید کہتے ہیں کہ یہ دونوں سورتیں قبر میں اس کا دفاع کرتی رہیں اور اس کی دلجوئی کرتی رہیں اور اس کے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے اس سے الگ ہوگئیں۔ یزید ابن اسود جرشی کہتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کو دن میں پڑھنے والا شام تک نفاق سے بری رہتا ہے۔ اور رات کو پڑھنے والا صبح تک نفاق سے بری رہتا ہے۔ دیگر وظائف کے علاوہ وہ صبح شام انہیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص رات کو یہ دونوں سورتیں پڑھتا رہے گا۔ اللہ کے ہاں فرمانبرداروں میں اس کا شمار ہوگا۔ اس کی سند میں انقطاع ہے لیکن صحیحین میں یہ ثابت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان دونوں سورتوں کو ایک رکعت میں پڑھا۔

سات طویل سورتوں کے فضائل

حضرت ابوعبید حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تورات کی جگہ سات لمبی سورتیں اور انجیل کی جگہ سو آیات والی سورتیں اور زبور کی جگہ بار بار پڑھی جانے والی آیات عطا کی گئیں۔ اور سور مفصل (ق سے لے کر آخر تک) کے ساتھ مجھے فضیلت دی گئی۔ یہ حدیث غریب ہے۔ اس کے راوی سعید بن بشیر میں کچھ کلام ہے۔ ابوعبید نے اسے ایک دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ سے بیان کرتی ہیں کہ جس شخص نے ان سورتوں کو حاصل کر لیا وہ بہت بڑا عالم ہے(1)۔ یہ روایت بھی غریب ہے ابو حاتم رازی نے اس روایت پر کوئی جرح نہیں کی۔ مسند امام احمد میں بھی یہی روایت مختلف سندوں سے آئی ہے۔ ترمذی نے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ ایک لشکر بھیجا اور اس کا امیر ایک نوجوان کو اس لیے بنایا کہ اسے سورۂ بقرہ یاد تھی۔ ترمذی نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ (وَلَقَدۡ اٰتَيۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِىۡ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد سات طویل سورتیں (بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور یونس) ہیں حضرت مجاہد، مکحول، عطیہ بن قیس، ابومحمد فارسی، شداد بن اوس اور یحییٰ بن حارث ذماری سے بھی یہی مروی ہے۔ سورۂ یونس یہ ساتویں سورت ہے۔

(فصل) سورۂ بقرہ بالاتفاق ساری کی ساری مدینہ شریف میں نازل ہوئی شروع شروع میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں ایک یہ بھی ہے ماسوائے آیت (وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ) کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کریم کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ ساری سورت کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اسی طرح حرمت سود کی آیتیں سب سے آخر میں نازل ہوئیں۔ خالد بن معدان سورۂ بقرہ کو فسطاط القرآن (قرآن کا خیمہ) کہا کرتے تھے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ ایک ہزار خبروں، ایک ہزار اوامر ایک ہزار نواہی پر مشتمل ہے اس کی آیات دوسو ستاسی اور کلمات کی تعداد چھ ہزار دوسو اکیس ہے اس کے حروف اکیس ہزار پانچ سو ہیں۔ واللہ اعلم

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۂ بقرہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے سورۂ بقرہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ واقدی نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ اور بہت سے ائمہ علماء اور مفسرین سے بھی بالاتفاق یہی مروی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورت بقرہ، سورت آل عمران، سورت نساء نہ کہا کرو اسی طرح پورا قرآن بلکہ یوں کہو وہ سورت جس میں بقرہ کا ذکر ہے۔ اور وہ

1۔ شرح السنہ:468/4

سورت جس میں آل عمران کا ذکر ہے اسی طرح پورا قرآن(1)۔ یہ حدیث غریب ہے اس کو مرفوع قرار دینا صحیح نہیں۔ اس کے راوی عیسیٰ بن میمون ابوخواص ہیں وہ ضعیف الروایت ہیں ان کی روایت سے حجت نہیں لی جا سکتی۔ اس کے برعکس صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بطن وادی سے شیطان پر کنکر پھینکے۔ بیت اللہ شریف ان کے دائیں اور منی بائیں طرف تھا۔ پھر فرمایا یہ وہ جگہ ہے جہاں سورۂ بقرہ نازل ہوئی۔ ابن مردویہ نے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جب اپنے اصحاب میں کچھ سستی دیکھی تو فرمایا، اے اصحاب سورۂ بقرہ، (یا اصحاب سورۃ البقرۃ)(2)۔ غالباً یہ غزوۂ حنین کا واقعہ ہے جب اسلامی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ تو حضور ﷺ کے حکم سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں پکارا (یا اصحاب الشجرۃ) اے بیعت رضوان کرنے والو۔ ایک روایت میں اے سورۂ بقرہ والو! کے الفاظ سے پکارا تاکہ ان میں دلیری پیدا ہو۔ چنانچہ اس آواز کے ساتھ ہی وہ ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ اسی طرح جنگ یمامہ کے دن مسیلمہ کذاب کے لشکر بنوحنیفہ کی کثرت دیکھ کر لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے تو مہاجرین و انصار نے ان الفاظ کے ساتھ ندا دی۔ اے اصحاب سورۂ بقرہ۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی رضی اللہ عن اصحاب رسول اللہ اجمعین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔''

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾

''الف لام میم''

حروف مقطعات جو کہ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ان کے بارے میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ان کے معانی صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں۔ اس لیے وہ ان کی تفسیر نہیں کرتے۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہی نقل کیا ہے۔ عامر شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خیثم رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ ابوحاتم بن حبان نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ بعض مفسرین ان کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی اختلاف موجود ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے نزدیک یہ سورتوں کے اسماء ہیں۔ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کا اتفاق اسی پر ہے سیبویہ سے بھی یہی منقول ہے۔ اس کی تائید صحیحین کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن الٓمّٓ سَجۡدَہ اور ھَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ صبح کی نماز میں پڑھا کرتے تھے(3)۔ سفیان ثوری حضرت مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ الم، حم، المص، ص یہ سب سورتوں کی ابتدا ہے جن سے اللہ نے قرآن کریم کا آغاز فرمایا۔ انہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ الم قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے وھکذا۔ قتادہ اور زید بن اسلم کا قول بھی یہی ہے۔ شاید اس قول کا مطلب بھی یہی ہے جو عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں یہ سورتوں کے اسماء میں سے ایک نام ہے اس لیے کہ ہر سورت کو قرآن کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ بات بعید ہے کہ المص سارے قرآن کا نام ہو۔ کیونکہ جب کوئی شخص کہے میں نے المص سورت پڑھی تو اس سے ظاہراً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے سورۂ اعراف پڑھی نہ کہ پورا قرآن۔ واللہ اعلم

بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ سورتوں کے آغاز میں یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔ حضرت سالم بن عبداللہ، اسماعیل بن عبدالرحمٰن سدی کبیر سے بھی یہی مروی ہے۔ شعبہ کہتے ہیں کہ مجھے خبر ملی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ الم اسم اعظم ہے۔ ایک اور

1۔ فتح الباری:88/9 2۔ مجمع الزوائد:180/6 3۔ البخاری:5/2

روایت میں ہے حم، طس اور الم یہ سب اسمائے اعظم ہیں۔ حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ قسم بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے۔ حضرت عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ اس کا معنی ہے (انا اللہ اعلم) یعنی میں سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ حضرت سعید بن جبیر سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ الم، یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے حروف ہیں۔ حضرت ابو العالیہ سے مروی ہے کہ الم یہ تین حروف انتیس حروف میں سے ہیں جو تمام زبانوں میں آتے ہیں۔ ان میں سے ہر اسم اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی نام کا آغاز ہے۔ ان کا ہر حرف اللہ کی نعمتوں اور اس کی بلاء کا ہے۔ اور ہر اسم میں قوموں کی مدت اور ان کی اجل کا بیان ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے تعجب ہے لوگ اس کے اسماء پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی کا دیا ہوا رزق کھاتے ہیں۔ پھر کیسے کفر کرتے ہیں۔ الف سے مراد اللہ، لام سے لطیف اور میم سے مراد مجید ہے۔ پس الف کا مطلب اللہ کی نعمتیں، لام کا مطلب اس کا لطف و کرم، میم سے مراد اللہ تعالیٰ کی بزرگی ہے۔ الف ایک سال لام تیس سال اور میم چالیس سال ہے۔ یہ الفاظ ابو حاتم کے ہیں۔ ابن جریر نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ پھر ان سب میں تطبیق کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں ایسا اختلاف نہیں اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ یہ سورتوں کے اسماء بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کے اسماء بھی اور سورتوں کے شروع کے الفاظ بھی۔ ان میں سے ہر حرف اس کے اسماء میں سے کسی اسم یا صفات میں سے کسی صفت کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ جس طرح بہت سی سورتوں کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح اور بزرگی کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک ہی حرف اس کے اسماء میں سے کسی اسم یا صفات میں سے کسی صفت اور مدت وغیرہ پر دلالت کر رہا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابو العالیہ سے مروی ہے کیونکہ ایک ہی کلمہ کئی کئی معانی کے لئے آتا رہتا ہے جیسے لفظ (اُمَّۃٌ) اس کا اطلاق دین پر بھی ہوتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ (زخرف:22) ''ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر''۔ اس سے مراد خدا کا اطاعت گذار بندہ لیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (نحل:120) ''ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے''۔ اس کا ایک معنی جماعت بھی ہوتا ہے۔ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ (قصص:23) ''تو دیکھا کہ وہاں پر لوگوں کا ایک انبوہ ہے جو (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہا ہے'' ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (نحل:36) ''اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول'' بعض اوقات اس سے مراد وقت بھی لیا جاتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف:45) ''اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور اب اسے یاد آئی (یوسف کی) ایک عرصہ کے بعد''۔ (اَیْ بَعْدَ حِیْنٍ عَلٰی اَصَحِّ الْقَوْلَیْنِ) یہ اس کلام کا خلاصہ ہے۔ لیکن یہ اس طرح نہیں جیسے ابو العالیہ سے مذکور ہے ان کا خیال ہے کہ ایک لفظ بیک وقت متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لفظ امت اور اس طرح کے دیگر الفاظ کو اصطلاح میں الفاظ مشترکہ کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہر جگہ ان کے معنی ایک ہی ہوتے ہیں۔ جو عبارت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ہی جگہ تمام معانی مراد لینے کے بارے میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر لفظ امت سیاق کلام میں تمام معانی پر وضع کے اعتبار سے دلالت کرتا ہے۔ لیکن ایک حرف کی دلالت ایک ایسے نام پر ممکن ہے کہ وہ دوسرے ایسے نام پر بھی دلالت کرتا ہو۔ اور ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہ ہو نہ تو مقدر ماننے سے، نہ وضع کے اعتبار سے اور نہ ہی کسی دوسرے لحاظ سے یہ بات علمی طور پر نہیں سمجھی جا سکتی۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اس میں کوئی اجماع نہیں کہ اس کے بموجب فیصلہ دیا جائے۔

اب عرب شعراء کے بعض اشعار جو بطور دلیل پیش کیے جاتے ہیں کہ کلمہ کو بیان کرنے کیلئے صرف اس کا پہلا حرف بول دیتے ہیں یہ ٹھیک ہے۔لیکن ان اشعار میں خود ایسی عبارت ہوتی ہے۔ جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایک حرف کے بولتے ہی پورا کلمہ سمجھ میں آجاتا ہے لیکن یہ صورت اس کے برعکس ہے۔جیسے ایک شاعر کا قول ہے۔

قُلْنَا قِفِی لَنَا قَالَتْ قَافْ لَا تَحْسَبِی اَنَّا نَسِیْنَا الاِ یْجَافْ

قاف یعنی وقفت۔ایک دوسرے شاعر کا قول ہے۔

مَالِلظَّلِیْمِ عَالَ کَیْفَ لَایَا یَنْقَدُّ عَنْهُ جِلْدُهٗ إِذَا یَا

ابن جریر کا قول ہے کہ گویا اس کی مراد ہے إِذَا یَفْعَلُ کَذَا وَ کَذَا تو اس نے یَفْعَلُ کی صرف یاء پر اکتفاء کرلیا۔ ایک دوسرے شاعر کا قول ہے۔

بِالْخَیْرِ خَیْرَاتٍ وَإِنْ شَرًّافَا وَلَا اُرِیْدُ الشَّرَّ إِلَّا أَنْ تَا (1)

وہ یہ کہنا چاہتا ہے اِنْ شَرًّافَشَرٌّ وَلَا اُرِیْدُ الشَّرَّ اِلَّا اَنْ تَشَآءُ اس نے دونوں کلموں کی جگہ فاء اور تاء پر اکتفاء کرلیا۔لیکن یہ بات سیاق کلام سے بھی ظاہر ہے واللہ اعلم۔قرطبی لکھتے ہیں ایک حدیث میں ہے "مَنْ اَعَانَ عَلٰی قَتْلِ مُسْلِمٍ بِشَطْرِ کَلِمَةٍ" (2) جو شخص مسلمان کے قتل میں مدد کرے اگرچہ آدھے کلمہ کے ساتھ ہو۔حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ اُقْتُلْ کی جگہ صرف "اُق" کہہ دے۔مجاہد کہتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں جو یہ حروف ہیں (قٓ، صٓ، حٰمٓ، طٰسٓمٓ، الٓرٰ) یہ سب حروف تہجی ہیں۔بعض عربی دان کہتے ہیں یہ تمام اٹھائیس حروف تہجی سے ہیں بعض کا ذکر کر کے بعض کو چھوڑ دیا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے۔کہ میرا بیٹا اب ت ث لکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمام اٹھائیس حروف لکھتا ہے۔لیکن ابتدائی چند حروف کو ذکر کر کے باقی کو چھوڑ دیا۔یہ ابن جریر نے بیان کیا ہے۔(میری رائے) مکرر کو حذف کرنے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ سورتوں کے شروع میں کل چودہ حروف آئے ہیں۔اور وہ یہ ہیں (ال م ص ر ک ہ ی ع ط س ح ق ن) یہ سب اس کلمے میں جمع ہیں۔(نص حکیم قاطع له سر) تعداد کے لحاظ سے یہ چودہ حروف ہیں اور جملہ حروف چونکہ اٹھائیس بنتے ہیں اس لیے یہ نصف ہوئے۔جو حروف بیان کیے گئے ہیں وہ ان حروف سے افضل ہیں جو بیان نہیں کیے گئے۔یہ صنعت تصریف ہے۔

زمخشری کا قول ہے کہ یہ چودہ حروف حروف کی درج ذیل اصناف پر مشتمل ہیں۔ مهموسة، مجهورة، رخوة، شديدة، مطبقة، مفتوحة، مستعلية، منخفضة اور حروف قلقلة(3)۔ان سب کو بالتفصیل ذکر کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں پاک ہے وہ ذات کہ ہر چیز میں اس کی حکمت پنہاں ہے۔حروف کی اکثر اجناس کا اس میں ذکر آ گیا ہے اور آپ کے علم میں ہے کہ اکثر شے کل کے قائم مقام ہوتی ہے۔بعض مفسرین نے یہاں لکھا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حروف اللہ تبارک وتعالیٰ نے بے فائدہ اور بلا معنی ذکر نہیں کیے بعض جاہل لوگ کہتے ہیں کہ سرے سے ان حروف کا کوئی معنی ہی نہیں وہ بالکل خطا پر ہیں۔یہ واضح ہو چکا ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی مفہوم ضرور ہے اگر ہمیں حدیث شریف میں اس کی طرف کوئی اشارہ مل جائے تو ٹھیک وگرنہ ہم توقف کریں گے اور کہیں گے۔ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ (آل عمران:7) "ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے"۔ علماء کا اس میں کافی اختلاف ہے۔ جسے کسی قول کی دلیل مل جائے اس پر اس کی اتباع لازم ہے۔وگرنہ توقف کریں گے یہاں تک کہ بات واضح ہو جائے۔ان کے معانی سے قطع نظر ان حروف کے سورتوں کے اوائل میں لانے کی حکمت کیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ یہ اس لیے لائے گئے ہیں تاکہ ان کے ساتھ

1۔شواہد الکتاب للقیم بن اوس:62/2 2۔تفسیر القرطبی:156/1 3۔زمخشری:24/1

سورتوں کے اوائل کا علم ہو جائے۔ ابن جریر نے یہی ذکر کیا ہے لیکن یہ توجیہہ ضعیف ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر بھی سورتوں کی علیحدگی کا علم ہو جاتا ہے۔ جن سورتوں کے شروع میں یہ حروف نہیں کیا ان کے فاصلوں کا علم نہیں پھر جب سورتوں کے شروع میں بسم اللہ لکھی اور پڑھی جاتی ہے تو سورت کا خاتمہ یا آغاز معلوم ہو جاتا ہے۔ ابن جریر نے اس کی ایک حکمت یہ بیان کی ہے کہ یہ حروف سورتوں کے شروع میں مشرکین کو سنانے کے لئے لائے گئے ہیں۔ چونکہ وہ اس سے اعراض کرتے تھے لہٰذا یہ حروف اس لئے لائے گئے تاکہ جب وہ متوجہ ہو جائیں تو پھر تلاوت کا آغاز ہو۔ یہ بھی ضعیف ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ تمام سورتوں کے شروع میں آتے حالانکہ ایسا نہیں۔ پھر جب کبھی مشرکین سے کلام شروع ہوتو یہی حروف ہونے چاہئیں تھے نہ کہ صرف سورتوں کے شروع میں یہ الفاظ ہوں، پھر یہ سورت اور اس کے بعد والی سورت (بقرہ اور آل عمران) مدنی ہیں۔ اس میں مشرکین کو خطاب ہے ہی نہیں۔ اس لیے یہ توجیہہ بھی ضعیف قرار پائی۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ سورتوں کے شروع میں ان حروف کا لانا اعجاز قرآنی کی ایک صورت ہے اس کا مقابلہ کرنے سے تمام مخلوق عاجز ہے۔ باوجودیکہ یہ حروف بھی روزمرہ کے استعمال کے حروف سے ترتیب دیئے گئے ہیں رازی نے اپنی تفسیر میں مبرد اور محققین کی ایک جماعت کی یہی رائے نقل کی ہے۔ قرطبی نے فراء اور قطرب سے یہی نقل کیا ہے۔ زمخشری نے کشاف میں ذکر کیا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔ ابن تیمیہ اور حافظ مزی کی یہی رائے ہے۔ زمخشری کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام حروف اکٹھے قرآن کی ابتدا میں نہیں آئے ان حروف کو بار بار لانے کی وجہ مشرکین کو بار بار چیلنج دینا اور انہیں خاموش کرانا ہے جس طرح بہت سے قصص و واقعات میں ہوا ہے۔ بعض مقامات پر واضح الفاظ میں ان کو چیلنج دیا گیا ہے۔ کبھی صرف ایک حرف ذکر کر کے جیسے (صٓ، نٓ، قٓ) کبھی دو حرف ذکر کر کے جیسے (حٰمٓ) اور کبھی تین حروف کے ساتھ جیسے (الٓمّٓ) کبھی چار سے (الٓمّٓرٰ، الٓمّٓصٓ) اور کبھی پانچ سے جیسے (کٓھٰیٰعٓصٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ) کیونکہ کلام عرب کا بھی یہی اسلوب ہے اس کے کلمات ایک، دو، تین، چار یا پانچ کلمات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس سے زائد حروف کے کلمات نہیں (میری رائے) اس لیے ہر سورت کو حروف سے شروع کیا پس لازمی ہے کہ جہاں بھی ان کا ذکر ہو قرآن کریم کے اعجاز اور عظمت کا ذکر بھی ساتھ ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہے۔

اور یہ انتیس سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ" (الٓمّٓ ۙ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (آل عمران:3-1)، الٓمّٓصٓ ۚ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ (اعراف:2-1)، الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ (ابراہیم:2-1)، الٓمّٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سجدہ:2-1)، حٰمٓ ۚ عٓسٓقٓ ۝ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (الشوریٰ:3-1)۔ وغیرہ آیات اس رائے کی تائید کرتی ہیں۔ واللہ اعلم

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مدت جاننے کے لئے دلیل ہیں اور ان کے ساتھ واقعات، فتنوں اور لڑائیوں کے اوقات دریافت کیے جاتے ہیں۔ یہ دعویٰ ایسا ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی تائید میں ایک ضعیف حدیث بھی ذکر کی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اس مسلک کی تائید کی بجائے اس کے بطلان کی واضح دلیل ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ ابو یاسر بن اخطب یہود کے چند آدمیوں کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس وقت حضور ﷺ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیت الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ تلاوت فرما رہے تھے۔ یہ سن کر وہ اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس آیا اور کہنے لگا میں نے محمد (ﷺ) کو اس آیت کی تلاوت کرتے سنا ہے۔ اس نے پوچھا کیا تم نے خود سنا اس نے کہا ہاں یہ سن کر حیی بن اخطب ان سب یہودیوں کو لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں آتا ہے۔ اور کہتا ہے کیا یہ سچ ہے کہ آپ اس آیت کو پڑھ کر سنا رہے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں یہ سچ ہے۔ انہوں نے کہا کیا جبریل یہ آیات لے کر آپ کے

پاس آئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا بات اسی طرح ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ سے پہلے جتنے نبی بھی آئے ان کو یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کا ملک کب تک رہے گا۔ اور ان کی امت کس وقت تک باقی رہے گی۔ حیی بن اخطب یہ سن کر اٹھا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا الف سے مراد ایک لام سے مراد تیس اور میم چالیس ہے یہ کل اکہتر سال بنتے ہیں کیا تم ایسے نبی کی غلامی اختیار کرنا پسند کرتے ہو جس کے دین کی مدت صرف اکہتر سال ہے پھر وہ حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کیا کوئی اور آیت بھی ایسی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں الٓمّٓصٓ وہ کہنے لگا یہ بڑی بھاری اور لمبی ہے۔ الف سے مراد ایک لام تیس اور میم چالیس اور صاد نوے ہے یہ کل ایک سو اکتیس سال بنے کہنے لگا اے محمد (ﷺ) کیا اس کے علاوہ کوئی اور آیت بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کہنے لگا وہ کیا آپ نے فرمایا الٓر وہ کہنے لگا یہ بھی بہت بھاری اور لمبی ہے الف سے مراد ایک لام سے تیس اور راء سے مراد دو سو ہیں یہ کل دو سو اکتیس سال بنے۔ اے محمد کیا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں وہ پوچھنے لگا کون سی آیت آپ ﷺ نے فرمایا الٓمّٓر وہ کہنے لگا یہ تو اس سے بھی لمبی ہے الف ایک لام تیس میم چالیس اور راء دو سو یہ کل دو سو اکہتر سال بنے پھر کہنے لگا اے محمد آپ (ﷺ) کا معاملہ ہم پر مخفی ہو گیا ہے ہمیں یہ علم نہیں آپ کو زیادہ عطا کیا گیا ہے یا کم۔ پھر کہنے لگا لوگو اٹھو چلیں۔ ابو یاسر نے اپنے بھائی اور دوسرے یہودی علماء سے کہا کیا عجب کہ محمد (ﷺ) کو یہ ساری مدت عطا کی گئی ہو اکہتر سال، ایک سو اکتیس، دو سو اکتیس اور دو سو اکہتر یہ کل سات سو چار سال بنتے ہیں۔ وہ کہنے لگے اس کا معاملہ ہم پر مخفی ہو گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیتیں انہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئیں۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (آل عمران: 7) ”وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب۔ اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں“۔ اس حدیث کے راوی صاحب مغازی محمد بن اسحٰق ہیں اور اس کا مدار محمد بن سائب کلبی پر ہے۔ وہ جس روایت کو اکیلے بیان کریں قابل قبول نہیں۔ پھر اگر اس مذہب کو صحیح مان لیا جائے اور ہر ایسے حرف کے عدد نکالے جائیں تو جن چودہ حروف کو ہم نے بیان کیا شمار کیا جائے تو یہ بہت بڑی مدت بن جائے گی اور اگر مکرر حروف کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو یہ مدت اس سے کہیں بڑھ جائے گی۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

”یہ ذی شان کتاب ذرا شک نہیں اس میں یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔“

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہاں ذٰلِكَ هٰذَا کے معنی میں ہے یعنی هٰذَا الْكِتَابُ۔ مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، سدی، مقاتل بن حیان، زید بن اسلم اور ابن جریج کا قول یہی ہے۔ یہ دونوں اسمائے اشارہ ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں۔ یہ اسلوب عربی زبان میں معروف ہے۔ بخاری نے بھی یہی بیان کیا ہے۔ زمخشری کا قول ہے کہ اس سے الٓمّٓ کی طرف اشارہ ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ (بقرہ: 68) ”جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو“۔ ایک اور جگہ فرمایا: ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ (الممتحنہ: 10) ”یہ اللہ کا فیصلہ ہے وہ تمہارے درمیان فیصلہ فرماتا ہے“۔ اور فرمایا (ذٰلِكُمُ اللّٰهُ) اس کی مثل آیات جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ واللہ اعلم

بعض مفسرین نے کہا ہے (جیسا کہ قرطبی وغیرہ نے بیان کیا ہے) کہ اس کا اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے جس کے اتارنے کا وعدہ رسول اللہ ﷺ سے کیا گیا تھا۔ یا تورات، انجیل وغیرہ کی طرف اشارہ ہے اور اس بارے میں دس اقوال ہیں (1)۔ اس مذہب کو اکثر

1۔ تفسیر القرطبی: 157/1

مفسرین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ جن لوگوں کا قول ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مراد تورات یا انجیل ہے جیسا کہ ابن جریر وغیرہ نے بیان کیا ہے تو انہوں نے بڑی بعید بات کی بلا وجہ تکلیف اٹھائی اور خواہ مخواہ وہ بات کی جس کا انہیں علم نہ تھا۔ رَيْبَ شک کو کہتے ہیں۔ ابن عباس، ابن مسعود اور کئی دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ ابو درداء، ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، ابو مالک، نافع مولی ابن عمر، عطاء، ابو العالیہ، ربیع بن انس، مقاتل بن حیان، سدی، قتادہ، اسماعیل بن ابو خالد کا قول یہی ہے ابن ابی حاتم کہتے ہیں مفسرین میں اس کے بارے میں اختلاف نہیں۔ ریب کا لفظ تہمت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جمیل کا قول ہے۔

بُثَيْنَةُ قَالَتْ يَا جَمِيْلُ أَرَبْتَنِي فَقُلْتُ كِلَانَا يَا بُثَيْنُ مُرِيْبُ

یہ لفظ حاجت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے کسی شاعر کا قول ہے۔

قَضَيْنَا مِنْ تِهَامَةَ كُلَّ رَيْبٍ وَخَيْبَرَ ثم أَجْمَعْنَا السُّيُوْفَا (1)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں اور یہ مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰهِ ہے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ سجدہ میں ارشاد فرمایا: الٓمّٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ''اس کتاب کا نزول، اس میں ذرا شک نہیں، سب جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے''۔ (السجدہ:2) بعض نے کہا ہے گو یہ خبر ہے مگر یہ نہی کے معنی میں ہے یعنی اس میں شک نہ کرو۔ بعض قاری لَا رَيْبَ پر وقف کرتے ہیں اور فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کو الگ جملہ پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر مذکورہ بالا آیت کو پیش نظر رکھا جائے تو لَا رَيْبَ فِيْهِ پر وقف کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اس طرح (هُدًى) قرآن کی صفت بن جائے گا۔ اور اس میں فِيْهِ هُدًى کی بہ نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ هُدًى نحوی اعتبار سے صفت کے طور پر مرفوع ہوسکتا ہے یا حال کے طور پر منصوب اس جگہ ہدایت کو متقین کے ساتھ خاص کیا۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ (حٰمٓ السجدہ:44) ''آپ فرمائیے! یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے تو ہدایت اور شفاء ہے اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے انہیں گویا بلایا جاتا ہے دور کی جگہ سے''۔ اور فرمایا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (بنی اسرائیل:82) ''اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کیلئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ کو''۔ وغیرہ آیات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ صرف مومنین سے نفع ہوگا۔ گو قرآن کریم فی نفسہ ہدایت ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے والے صرف نیک لوگ ہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یونس:57) ''اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور (آگئی ہے) شفا ان روگوں کے لئے جو سینوں میں ہیں اور (آگئی ہے) ہدایت اور رحمت اہل ایمان کے لئے''۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سے مراد نور ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ متقین سے مراد مومنین ہیں جو میرے ساتھ شریک ٹھہرانے سے بچتے ہیں اور میری اطاعت کرتے ہیں۔ ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر ہدایت نہیں چھوڑتے اور اس کی رحمت کے امیدوار رہ کر اس کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں متقی وہ ہے جو حرام سے بچے اور فرائض کو بجا لائے۔ ابو بکر بن عیاش کا قول ہے کہ میں نے اعمش

1۔ دیوان کعب بن مالک: 334

سے متقین کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے مجھے جواب دیا اور کہا ذرا کلبی سے اس کے بارے میں سوال کرو۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ میں اعمش کے پاس آیا اور یہ بتایا کہ ان کی یہ رائے ہے تو انہوں نے اس کا انکار نہ کیا۔ قتادہ کا قول ہے کہ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی توصیف اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمائی ہے: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یہ آیت کریمہ اور اس کے بعد والی آیت۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ آیت سب کے عموم کے لئے ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اس وقت تک متقین کے درجے میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں حرج نہیں اس خدشہ سے کہ کہیں وہ حرج میں مبتلا نہ ہو جائے (1)۔ ترمذی نے اسے حسن غریب قرار دیا ہے۔ ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے۔ ابو حمزہ میمون فرماتے ہیں میں ابووائل کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ہمارے پاس ایک آدمی آیا ان کو ابو عفیف کہتے تھے یہ اصحابِ حضرت معاذ میں سے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے سنا قیامت کے دن لوگوں کو ایک میدان میں روک لیا جائے گا۔ اور ندا دی جائے گی متقی لوگ کہاں ہیں۔ اس آواز پر وہ کھڑے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنے سایہ رحمت میں لے لے گا اور بلا حجاب اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔ میں نے دریافت کیا متقی لوگ کون ہیں فرمایا وہ لوگ جو شرک اور بتوں کی عبادت سے بچتے رہے۔ اور خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے وہ اسی طرح جنت میں لے جائے جائیں گے۔

ہدایت سے مراد کبھی تو وہ چیز ہوتی ہے جو ایمان کی وجہ سے دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اور یہ چیز بندوں کے دلوں میں صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی پیدا فرما سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص:56) ''بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں'' اور فرمایا: لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ (بقرہ:272) ''نہیں آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا'' اور فرمایا: مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ (اعراف:186) ''جسے گمراہ کردے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے'' اور فرمایا: مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا (الکہف:17) ''حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائے گا اس کے لئے کوئی مددگار (اور) رہنما''۔ وغیرہ بہت سی آیات۔ ہدایت کے لفظ سے مقصود کبھی حق کے بیان، اسے واضح کرنے، اس کی طرف اشارہ کرنے اور راہنمائی کرنے کے معانی لیے جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ:52) ''وربلاشبہ آپ راہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف''۔ اور فرمایا: اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد:7) ''آپ تو (کج روی کے انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں''۔ اور فرمایا: وَ اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حٰمٓ السجدہ:17) ''باقی رہے ثمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھائی انہوں نے پسند کیا اندھے پن کو ہدایت پر'' اور فرمایا: وَ هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (بلد:10) ''اور ہم نے دکھا دیں اسے دو نمایاں راہیں'' ان لوگوں کی تفسیر کے مطابق جنہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد خیر و شر دونوں راستے ہیں اور یہی راجح ہے۔ واللہ اعلم۔ تقویٰ کی اصل ناپسندیدہ چیزوں سے بچنا ہے یہ اصل میں وقوی ہے ''وقایۃ'' مصدر سے مشتق ہے نابغہ شاعر کہتا ہے۔

سَقَطَ النَّصِیْفُ وَلَمْ تُرِدْ إِسْقَاطَهٗ فَتَنَا وَلَتْهُ وَاتَّقَتْنَا بِالْیَدِ (2)

ایک اور شاعر کا قول ہے۔

فَأَلْقَتْ قِنَاعًا دُوْنَهُ الشَّمْسُ وَاتَّقَتْ بِأَحْسَنَ مَوْصُوْلَیْنِ كَفٍّ وَ مِعْصَمٍ (3)

1۔ابن ماجہ، کتاب الزہد:1409 2۔البیت فی تفسیر القرطبی:161/1 3۔ایضاً

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔ تقویٰ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا کبھی کانٹے دار راستے پر چلے ہو۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں کیوں نہیں۔ فرمایا آپ وہاں کیا کرتے ہیں فرمایا کپڑوں کو سمیٹ لیتا ہوں اور جسم کو بچاتا ہوں آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہی تقویٰ ہے۔

ابن المعتز نے بھی یہی معنی لیا ہے۔ اس کا قول ہے۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَ كَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

یعنی چھوٹے بڑے سب گناہوں کو ترک کردے یہی تقویٰ ہے۔ ایسے رہو جیسے کانٹے دار زمین پر چلنے والا آدمی۔ چھوٹے گناہوں کو بھی حقیر نہ جانو بے شک پہاڑ کنکریوں سے ہی بنتے ہیں۔ حضرت ابو درداء نے ایک دن یہ اشعار پڑھے۔

يُرِيْدُ الْمَرْءُ اَنْ يُؤْتٰى مُنَاهُ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّا مَا اَرَادَا
يَقُوْلُ الْمَرْءُ فَائِدَتِيْ وَمَالِيْ وَ تَقْوَى اللّٰهِ اَفْضَلُ مَا اسْتَفَادَا

''ترجمہ: انسان چاہتا ہے کہ اس کی آرزوئیں پوری ہوں۔ اور اللہ رب العزت کچھ اور ارادہ فرماتا ہے۔ انسان کہتا ہے میرا فائدہ اور میرا مال حالانکہ تقویٰ اس سے افضل ہے جو اس نے حاصل کیا۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' آدمی اللہ تعالیٰ کے تقویٰ سے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ بہتر ہے نیک بیوی سے اگر اسے دیکھے تو خوش ہو، جو حکم اسے دے بجالائے۔ اگر وہ قسم اٹھائے تو اسے پورا کردے۔ اگر وہ موجود نہ ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔''(1)

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

''وہ جو ایمان لائے ہیں غیب پر۔''

حضرت ابو جعفر رازی حضرت عبد اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ایمان تصدیق کا نام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں حضرت زھری کا قول ہے اَلْاِيْمَانُ اَلْعَمَلُ۔ ایمان عمل کا نام ہے ربیع بن انس فرماتے ہیں یہاں ایمان لانے سے مراد ڈر رکھنا ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں اولیٰ یہ ہے کہ وہ قولاً عملاً اور اعتقاداً ایمان سے متصف ہوں۔ خشیت الٰہی ایمان کے اس مفہوم میں شامل ہو سکتی جو قول سے عمل کی تصدیق کا نام ہے۔ ایمان کا لفظ اللہ پر ایمان لانے اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے اور اقرار بالفعل سے تصدیق کرنے کو شامل ہے۔ (میری رائے) ایمان لغوی طور پر محض تصدیق کا نام ہے۔ قرآن میں بھی یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (توبہ:61) ''یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مومنوں کی بات پر'' یا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد سے کہا تھا۔ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (یوسف:17) ''اور آپ نہیں مانیں گے ہماری بات اگرچہ ہم سچے ہیں''۔ اسی طرح جب اعمال کے ساتھ مل کر اس کا ذکر ہو۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (شعراء:227) ''بجز ان کے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے''۔ جب یہ لفظ مطلق استعمال ہو رہا ہو تو ایمان شرعی جو خدا کو مطلوب ہے وہ اعتقاد، قول اور عمل کے مجموعے کا نام ہے۔ اکثر ائمہ کی یہی رائے ہے بلکہ شافعی، احمد بن حنبل اور ابو

1۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح: 596

عبیدہ وغیرہ نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے اور یہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس بارے میں بہت سی احادیث اور آثار مذکور ہیں جو ہم نے شرح بخاری کی ابتدا میں نقل کر دی ہیں وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ الْمِنَّة۔

بعض نے اسے خشیت (خوف) کے معنی میں لیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (ملک: 12) ''بے شک جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں''۔ اور فرمایا: مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (ق: 33) ''جو ڈرتا تھا رحمٰن سے بن دیکھے اور ایسا دل لیے ہوئے آیا جو یادِ الٰہی کی طرف متوجہ تھا''۔ اور خشیت ہی ایمان و علم کا خلاصہ ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: 28) ''اللہ کے بندوں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں''۔

بعض کا قول ہے کہ وہ غیب پر بھی ایسے ہی ایمان رکھتے ہیں جیسے ظاہر پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور منافقین کی طرح نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (بقرہ: 14) اور فرمایا: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (منافقون: 1) ''اے (نبی مکرم) جب منافق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہے کہ آپ بلاشبہ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں''۔ اس معنی کے اعتبار سے ایمان بالغیب حال ٹھہرے گا۔ یعنی وہ ایمان لاتے ہیں در آں حالیکہ وہ لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ غیب کے لفظ کے بارے میں بھی سلف کے مختلف اقوال ہیں وہ سب صحیح ہیں اور ان میں تطبیق ہو سکتی ہے۔ حضرت ابو العالیہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کی تفسیر میں فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسولوں، یوم آخرت، جنت و دوزخ، اس کی ملاقات، حیات بعد الموت اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں امور غیبیہ سے ہیں۔ قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عباس ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قول ہے کہ غیب سے مراد وہ پوشیدہ چیزیں ہیں جو ہم سے غیب ہیں جیسے جنت و دوزخ اور قرآن کریم میں ذکر کردہ اشیاء۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو آیا ہے وہ سب غیب میں داخل ہے۔ حضرت زر کا قول ہے کہ غیب سے مراد قرآن ہے اور عطاء بن ابی رباح کا قول ہے جو اللہ پر ایمان لائے اس کا ایمان غیب پر ہے۔ اسماعیل بن ابو خالد کا قول ہے غیب سے مراد اسلام کی پوشیدہ چیزیں ہیں۔ زید بن اسلم کہتے ہیں اس سے مراد تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ یہ سب اقوال معنی کی رو سے قریب قریب ہیں کیونکہ مذکورہ بالا سب چیزیں پوشیدہ ہیں اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن یزید کہتے ہیں ہم ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ صحابہ کرام کے فضائل کا تذکرہ چھڑ گیا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ کے دیکھنے والوں پر تو آپ پر ایمان لانا واجب تھا اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ لوگ افضل ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر یہ آیت کریمہ تلاوت کی: الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ...... اِلٰى قوله ...... الْمُفْلِحُوْنَ۔

ابن ابی حاتم، ابن مردویہ سے یہی مروی ہے حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں اسی طرح لکھا ہے۔ حاکم لکھتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین کی شرائط پر صحیح ہے۔ لیکن شیخین نے اس روایت کو بیان نہیں کیا۔ مسند امام احمد میں بھی اسی مضمون کی ایک حدیث ہے۔ ابن محیریز نے ابو جمعہ صحابیؓ سے کہا۔ کوئی ایسی حدیث سناؤ جو تم نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو۔ انہوں نے فرمایا اچھا میں تمہیں بہت ہی عمدہ حدیث سناؤں گا۔ ہم نے ایک مرتبہ حضور ﷺ کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ہمارے ساتھ ابو عبیدہ بن جراح تھے۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا ہم سے بہتر بھی

کوئی اور ہے۔ہم آپ کے ساتھ اسلام لائے اور جہاد کیا۔آپ ﷺ نے فرمایا''ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے اور مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائیں گے''(1)۔ایک دوسری سند میں ابوبکر بن مردویہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔صالح بن جبیر کہتے ہیں کہ ابو جمعہ انصاریؓ بیت المقدس میں ہمارے پاس آئے۔رجاء بن حیوۃؓ بھی ہمارے پاس تھے جب وہ واپس جانے لگے تو ہم انہیں الوداع کہنے کے لئے ان کے ساتھ چلے جب وہ جدا ہونے لگے تو فرمایا تمہاری نوازشات کا بدلہ اور حق مجھے ادا کرنا چاہئے میں تمہیں وہ حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنی تھی ہم نے کہا اللہ تم پر رحم فرمائے ضرور سناؤ۔انہوں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔معاذ بن جبل بھی ہمراہ تھے ہم دس آدمی تھے۔ہم نے عرض کی یا رسول اللہ کیا کوئی قوم ہم سے زیادہ اجر کی مستحق بھی ہوگی ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ کی اتباع کی۔آپ ﷺ نے فرمایا۔تم ایسا کیوں نہ کرتے خدا کا رسول تم میں موجود ہے۔اس پر آسمان سے وحی آتی ہے۔ بلکہ ایک قوم تمہارے بعد ہوگی جو کتاب اللہ کو دو گتوں کے درمیان پائیں گے اس پر ایمان لائیں گے اور اس میں جو کچھ ہے اس پر عمل پیرا ہوں گے وہ اجر کے اعتبار سے تم سے دوگنا بڑھ کر ہوں گے۔اس حدیث میں عمل بالوجادہ (جو چیز ملے اس پر عمل کرنا) کی دلیل ہے جس کے بارے میں محدثین میں اختلاف ہے جیسا کہ میں نے شرح بخاری کے شروع میں بیان کیا ہے۔کیونکہ اس نے ان کی تعریف اسی پر کی ہے۔اور اسی حیثیت سے وہ اجر کے اعتبار سے زیادہ ہیں نہ کہ مطلقاً۔اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے نزدیک کس کا ایمان عمدہ ہے۔صحابہ نے عرض کی ملائکہ کا۔آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایمان کیوں نہ لاتے وہ تو اپنے رب کے پاس ہیں۔ صحابہ نے عرض کی پھر انبیاء کا۔آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایمان کیوں نہ لائیں۔جبکہ ان پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔صحابہ نے عرض کی پھر ہمارا ایمان افضل ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا تم ایمان کیوں قبول نہ کرتے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔سنو میرے نزدیک سب سے افضل ایمان والے وہ لوگ ہوں گے جو صحیفوں میں قرآن کریم لکھا پائیں گے۔اور اس پر ایمان رکھیں گے(2)۔ابو حاتم رازی کا قول ہے کہ اس کی سند میں مغیرہ بن قیس بصری منکر الحدیث ہے۔لیکن ابو یعلی نے اپنی مسند میں اور ابن مردویہ نے اپنی حدیث میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں اس کے مثل ایک اور حدیث ضعیف سند سے نقل کی ہے۔اس کے راوی محمد بن حمید میں ضعف ہے۔حاکم نے اسے صحیح الاسناد قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ شیخین نے اس حدیث کو ذکر نہیں کیا۔اسی کے مثل حضرت انس بن مالک سے مرفوعاً مروی ہے واللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ حضرت بدیلہ بنت اسلم فرماتی ہیں کہ بنو حارثہ کی مسجد میں ہم نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھی بیت المقدس کی طرف ہمارا منہ تھا ہم دو رکعتیں ادا کر چکے تھے کہ کسی شخص نے آ کر خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے بیت الحرام کی طرف منہ کر لیا۔تو عورتیں مردوں کی جگہ چلی گئیں اور مرد عورتوں کی جگہ آ گئے۔چنانچہ اس طرح ہم نے بقایا دو رکعتیں ادا کیں۔اس وقت ہمارا رخ بیت اللہ شریف کی طرف تھا۔حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ مجھے بنی حارثہ کے بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔یہ حدیث اس اسناد سے غریب ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

''اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں''۔

ابن عباس فرماتے ہیں نماز کو اپنے فرائض سمیت ادا کرتے ہیں ایک دوسری روایت میں آپ سے مروی ہے نماز قائم کرنے سے مراد رکوع و سجود کو مکمل کرنا، تلاوت کرنا، خشوع و خضوع کا لحاظ رکھنا اور اپنی توجہ کو قائم رکھنا ہے۔قتادہ کہتے ہیں کہ نماز قائم کرنے سے مراد اس

1۔مسند امام احمد:4/106 2۔المستدرک، ذکر فضائل الامۃ بعد الصحابۃ والتابعین:5/86,85

کے اوقات، وضو اور رکوع وسجود کا خیال رکھنا ہے۔ مقاتل بن حیان کہتے ہیں اس کو قائم کرنے سے مراد اس کے اوقات کا لحاظ رکھنا مکمل وضو کرنا، تشہد اور نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھنا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ سے مراد مال کی زکوٰۃ دینا ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو نان ونفقہ دینا ہے اور یہ زکاۃ کی فرضیت سے پہلے کی بات ہے۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ لوگ اپنی استطاعت کے بموجب نان ونفقہ دے کر تقرب الٰہی حاصل کیا کرتے تھے کہ فرائض صدقات کے بارے میں سورۂ توبہ کی سات آیات نازل ہوئیں۔ یہ ناسخ ہیں (1)۔ قتادہ کا قول ہے اللہ نے جو کچھ تمہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ یہ مال تمہارے پاس اللہ کی طرف سے امانت اور ودیعت ہے اے ابن آدم قریب ہے کہ یہ مال تم سے جدا ہو جائے قتادہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے زکاۃ اور اہل وعیال وغیرہ کے نفقہ کو شامل ہے۔ میں کہتا ہوں قرآن کریم میں اکثر جگہ نماز اور مال خرچ کرنے کا ذکر اکٹھا آتا ہے۔ بے شک نماز اس کا حق اور اس کی عبادت ہے یہ اس کی توحید، اس کی ثناء، اس کی بزرگی، اس کی طرف جھکنے اور دعا کرنے، اسی پر توکل کرنے اور خرچ کرنا مخلوق پر احسان کرنا ہے جس سے انہیں نفع پہنچے۔ لوگوں میں اس کے زیادہ حقدار اہل وعیال، اقرباء اور غلام ہیں۔ پھر اجنبی حضرات ہیں۔ واجب نفقات اور فرض زکوٰۃ اس آیت میں داخل ہیں۔ صحیحین میں حضرت عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ توحید ورسالت کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا۔ زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ شریف کا حج کرنا'' (2) اس بارے میں اور بہت سی حدیثیں ہیں۔ عربی زبان میں لفظ ''صلوٰۃ'' کا معنی ''دعا'' ہے اعشیٰ کا قول ہے۔

لَهَا حَارِسٌ لَا يَبْرَحُ الدَّهْرَ بَيْتَهَا وَإِنْ ذُبِحَتْ صَلّٰى عَلَيْهَا وَزَمْزَمَا

وہ ایک شعر میں کہتا ہے۔

وَقَابَلَهَا الرِّيْحُ فِيْ دَنِّهَا وَصَلّٰى عَلٰى دَنِّهَا وَارْتَسَمْ

ابن جریر نے ان اشعار کا بطور استشہاد ذکر کیا ہے۔ اعشیٰ ایک دوسری جگہ کہتا ہے۔

تَقُوْلُ بِنْتِيْ وَقَدْ قَرَبْتُ مُرْتَحِلًا يَارَبِّ جَنِّبْ اَبِي الْاَوْصَابَ وَالْوَجَعَا
عَلَيْكِ مِثْلُ الَّذِيْ صَلَّيْتِ فَاغْتَبِطِيْ نَوْمًا فَاِنَّ لِجَنْبِ الْمَرْءِ مُضْطَجَعَا

وہ کہتا ہے تیرے لئے اسی طرح جس طرح تو نے میرے لئے دعا کی۔ اور اس کا مفہوم ظاہر ہے۔ پھر اصطلاح شریعت لفظ صلوٰۃ سے مراد رکوع وسجود اور مخصوص افعال کا نام ہے جسے خاص اوقات میں جملہ شرائط اور صفات واقسام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ نماز کو صلوٰۃ کا نام اس لئے دیا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ نمازی اپنے رب سے اپنے عمل کا ثواب طلب کرتا ہے۔ اور اپنی حاجات کا سوال کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صلوین سے مشتق ہے۔ یہ دو رگیں ہوتی ہیں جو پیٹھ سے لے کر ریڑھ کی ہڈی کی دونوں طرف آتی ہیں۔ اسی سے ہے ''المصلی'' یعنی وہ شخص جو گھوڑ دوڑ میں دوسرے نمبر پر آتا ہے لیکن یہ قول محل نظر ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ ''صلی'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں چپک جانا، لازم ہو جانا۔ جیسے قرآن کریم میں ہے ''لَا يَصْلٰهَا'' یعنی جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ ''اِلَّا الْاَشْقٰى'' مگر بدبخت۔ بعض کے نزدیک یہ تَصْلِيَةٌ سے مشتق ہے اس کا معنی ہے لکڑی کو سیدھا کرنے کے لئے آگ پر گرم کرنا۔ چونکہ نمازی بھی اپنے نفس کی کجی کو نماز سے دور کرتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ

1۔ تفسیر الطبری: 105/1 2۔ البخاری: 9/1

''بے شک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور گناہ سے اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے'' (عنکبوت:45) لیکن اس کا دعا سے مشتق ہونا ہی زیادہ صحیح اور مشہور ہے۔ واللہ اعلم۔ لفظ زکوۃ کی بحث ان شاء اللہ اپنی جگہ آئے گی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

''اور وہ جو ایمان لائے ہیں اس پر (اے حبیب (ﷺ !)) جو اتارا گیا ہے آپ (ﷺ) پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں۔''

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے لایا اور جو تم سے پہلے مرسلین لائے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کے مابین تفریق نہیں کرتے اور جو وہ اپنے رب کی طرف سے ان کے پاس لائے اس کا انکار نہیں کرتے۔ آخرت یعنی جی اٹھنے، قیامت، جنت، دوزخ، حساب اور میزان پر یقین رکھتے ہیں۔ آخرت کو یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا کے بعد ہے۔ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون لوگ ہیں۔ کیا یہ انہی لوگوں کی صفت ہے جن کا ذکر پہلے اس آیت میں گذر چکا ہے: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اور اس آیت سے مراد کون لوگ ہیں۔ اس بارے میں تین اقوال ہیں۔ جنہیں ابن جریر نے بیان کیا ہے۔

(1) اس آیت کے مصداق وہی لوگ ہیں جن کا سابقہ آیت میں تذکرہ ہو چکا ہے یعنی مومنین (عرب، اہل کتاب وغیرہ) مجاہد، قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع بن انس کا قول یہی ہے۔

(2) دونوں کا مصداق مومن اہل کتاب ہیں۔ اس صورت میں واؤ عاطفہ ہوگی۔ اور صفات کا صفات پر عطف ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى .... فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى (اعلیٰ آیات:1 تا 5)

یا جیسے ایک شاعر کا قول ہے۔

اِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَابْنِ الْهُمَامِ وَلَيْثِ الْكَتِيْبَةِ فِي الْمُزْدَحَمْ

یہاں سب صفات کا ایک دوسری پر عطف کیا گیا ہے حالانکہ موصوف ایک ہے۔

(3) تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی صفات تو مومنین کی ہیں اور الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ...... الآیۃ، سے آگے اہل کتاب میں سے مومنین کی صفات ہیں یہ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کی رائے ہے۔ ابن جریر نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ اور بطور استشہاد یہ آیت کریمہ پیش کی ہے۔ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ''اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی (اور نیازمندی) کرنے والے ہیں اللہ کے لئے'' (آل عمران:199) اور اس آیت کریمہ سے اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ - وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (قصص:52 تا 54) اور صحیحین کی حدیث سے جس کے راوی ابو موسیٰ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین آدمیوں کو دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اہل کتاب کا وہ شخص جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور مجھ پر بھی۔ دوسرا وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی۔ تیسرا وہ شخص جس نے اپنی لونڈی کو اچھا ادب سکھایا۔ پھر اسے آزاد کر دیا اور اس سے نکاح

کرلیا'' (1) ۔ابن جریر نے ان دلائل کو کسی خاص مناسبت کی وجہ سے ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے مومنین اور کفار دونوں کا ذکر فرمایا۔جس طرح اس نے کفار کو دو صنفوں میں تقسیم کیا (کافر اور منافق) اسی طرح مومنین کو بھی دو قسموں میں تقسیم کیا۔ (1) عرب اور (2) اہل کتاب۔ (میں کہتا ہوں) ظاہراً مجاہد کا یہ قول صحیح ہے کہ سورۂ بقرہ کی ابتدائی چار آیتیں مومنین کے اوصاف کے بیان میں ہیں اور دو آیتیں کفار کے اوصاف کے بیان میں ہیں۔اور تیرہ منافقین کے بیان میں۔یہ چار آیات ہر مومن کے حق میں عام ہیں جوان سے متصف ہو خواہ وہ عربی ہو یا عجمی یا کتابی ہو، انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے۔ایک وصف دوسرے کو لازم بلکہ شرط ہے ایک دوسری کے بغیر صحیح نہیں۔لہٰذا ایمان بالغیب، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا درست نہیں جب تک رسول اللہ ﷺ پر اور سابقہ انبیاء اور انکی کتابوں پر ایمان نہ ہو اور آخرت کے بارے میں یقین کامل نہ ہو۔جس طرح پچھلی تینوں کے بغیر پہلی تین چیزیں غیر معتبر ہیں اسی طرح پہلی تین چیزیں پچھلی تین کے بغیر درست نہیں اسی لیے اللہ نے مومنین کو حکم دیا: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (نساء:136) '' اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی اس سے پہلے'' اور فرمایا: وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۖ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ '' اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقے سے مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے اور تم کہو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور اتارا گیا تھا تمہاری طرف اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے'' (عنکبوت:46) اور فرمایا: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ (نساء:47) '' اے وہ لوگو جنہیں دی گئی کتاب ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہم نے تاکہ تصدیق کرے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے''۔ اور فرمایا: يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (مائدہ:68) '' آپ فرمایئے اے اہل کتاب! نہیں ہو تم کسی چیز پر (ہدایت سے) یہاں تک کہ (عمل سے) قائم کرو تورات اور انجیل کو۔اور جو اتارا گیا تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے'' اور تمام مؤمنین کی طرف سے خبر دیتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ (البقرۃ:285) '' ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور ایمان لائے مؤمن۔یہ سب دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے'' اور فرمایا: وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ (نساء:152) '' اور جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام رسولوں کے ساتھ اور نہیں فرق کیا انہوں نے کسی میں ان سے'' اور اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں جن میں تمام مومنین کو اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا۔لیکن مومن اہل کتاب کی ایک خصوصیت ہے۔وہ یہ کہ وہ اپنی کتابوں پر تفصیل کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اسلام قبول کر لینے اور اس پر بالتفصیل ایمان لانے کے بعد ان کو دوہرا اجر ملے گا۔جبکہ دیگر لوگوں کا ایمان سابقہ کتابوں پر اجمالی طور پر ہوتا ہے۔جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے'' جب اہل کتاب تم سے کوئی بات کریں تو انکی تکذیب یا تصدیق نہ کرو۔بلکہ یوں کہا کرو ہم ایمان لائے اس پر جو کچھ اتارا گیا ہماری طرف اور تمہاری طرف''۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سے اہل عرب جو حضور ﷺ کی بعثت پر ایمان لائے

1۔مسلم، کتاب الایمان:135

ان کا ایمان اہل کتاب کی نسبت اتم، زیادہ مکمل اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اہل کتاب کو اس حیثیت سے دوہرا اجر ملے لیکن اپنے کمال کے سبب دوسروں کا اجر اس سے بھی کہیں بڑھ جائے۔ واللہ اعلم

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

''وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے اور وہی دونوں جہان میں کامیاب ہیں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ لوگ یعنی جن کے اوصاف کا اوپر ذکر ہو چکا ہے مثلاً غیب پر ایمان لانا، نماز قائم کرنا، اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے خرچ کرنا، حضور ﷺ پر جو اترا ہے اس پر ایمان لانا۔ سابقہ رسولوں پر ایمان، دار آخرت کا اعتقاد وایقان اور وہاں کام آنے والے نیک اعمال کرنا اور محرمات سے بچنا۔ (عَلَىٰ هُدًى) جنہیں اللہ کی طرف سے نور، بیان اور بصیرت حاصل ہوئی ہے۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وہی دنیا وآخرت میں کامیاب ہیں۔ حضرت ابن عباس نے ہدایت کی تفسیر نور اور استقامت سے کی ہے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے جو طلب کیا انہیں مل گیا۔ جس سے بچتے رہے اس کے شر سے نجات پالی۔ ابن جریر کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ کا معنی ہے وہ اپنے رب کی طرف سے نور، برہان، استقامت، صراط مستقیم اور توفیق حق پر ہیں۔ اور أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں جنہوں نے اپنے اعمال، ایمان باللہ، کتابوں اور رسولوں پر ایمان سے ثواب میں کامیابی، حاصل کی۔ جنت میں ہیشگی اور اللہ کے تیار کردہ عذاب سے نجات پائی (1)۔ ابن جریر یہ بھی لکھتے ہیں کہ دوسرے اولٰئک کا اشارہ اہل کتاب کی طرف ہے جن کی صفت اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ الآیۃ اس صورت میں وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ ماقبل سے منقطع ہوگا اور مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع ہوگا۔ اس کی خبر أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ہے لیکن ان کا پسندیدہ قول یہی ہے کہ اس کا اشارہ سابقہ اوصاف والوں کی طرف ہے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مومن عرب۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہی مروی ہے۔ غیب پر ایمان لانے والے اہل عرب ہیں۔ اور وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ سے مومن اہل کتاب پھر دونوں فریقوں کو جمع کرتے ہوئے فرمایا وہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔ اس بات کو پہلے راجح قرار دیا جا چکا ہے کہ یہ عام مومنین کی صفت ہے اور اشارہ بھی ان کی طرف لوٹ رہا ہے واللہ اعلم۔ مجاہد، ابوالعالیہ، ربیع بن انس اور قتادہ سے یہی مروی ہے۔ ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ ہم قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری امید بندھ جاتی ہے۔ اور بعض آیتیں ہمیں تقریباً مایوس کر دیتی ہیں تو سرکار رسالتمآب ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں اہل جنت اور اہل جہنم کے بارے میں خبر نہ دوں؟۔ انہوں نے عرض کی کیوں نہیں یارسول اللہ! پھر آپ ﷺ نے الٓمّٓ سے لے کر مُفْلِحُونَ تک تمام آیات کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا یہ جنتی لوگ ہیں۔ صحابہ نے عرض کی ہمیں امید ہے کہ ہم انہی سے ہوں گے۔ پھر آپ ﷺ نے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سے عَظِيمٌ تک تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا یہ جہنمی ہیں۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! ہم ایسے نہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

''بے شک جنہوں نے کفر اختیار کرلیا ہے یکساں ہے ان کے لیے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے ''إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا'' یعنی جو لوگ حق کو چھپا لینے اور پوشیدہ کرنے کے عادی ہیں اللہ نے ان کی قسمت

1۔ تفسیر الطبری، 1/107

میں لکھ دیا ہے وہ آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ آپ کا انہیں ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ جیسے ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ...... یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ (یونس:97-96) ''بے شک وہ لوگ کہ ثابت ہو چکی جن پر آپ کے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے اگر چہ آ جائیں ان کے پاس ساری نشانیاں جب تک کہ وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب''۔ ایسے ہی سرکش اہل کتاب کی نسبت فرمایا: وَلَىِٕنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ (بقرہ:145) ''اور اگر چہ آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی'' یعنی اللہ تعالیٰ جس کی قسمت میں بدبختی لکھ دے وہ سعادت مند نہیں ہو سکتا اور وہ جسے گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ لہٰذا آپ (ﷺ) ان پر افسوس کرتے ہوئے اپنی جان نہ گھلائیں۔ آپ پیغام رسالت ان تک پہنچا دیجئے جو اس دعوت کو قبول کر لے اسے حظ وافر نصیب ہوگا۔ اور جو پیٹھ پھیر لے تو آپ (ﷺ) اس پر غمگین نہ ہوں۔ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ۔ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ (رعد:40: ہود:12) ''سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے اور یہ ہمارے ذمہ ہے کہ (ان سے) حساب لیں، آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے'' حضرت ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوات والتسلیمات کی بڑی خواہش تھی کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں۔ اور ہدایت پر آپ کی اتباع کریں۔ لیکن پروردگار نے فرمایا کہ ایمان نہیں لائے گا مگر پہلے جس کے حق میں اللہ کی طرف سے یہ سعادت لکھی جا چکی ہو۔ اور گمراہ نہیں ہوگا مگر پہلے ہی اللہ کی طرف سے جس کے نصیب میں گمراہی لکھی جا چکی ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک روایت میں ہے جنہوں نے اس چیز کا انکار کیا جو آپ کی طرف اتاری گئی تھی اگر چہ انہوں نے یہ کہا کہ آپ سے پہلے جو کچھ اتر چکا ہے ہم اس ایمان رکھتے ہیں: سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ یعنی ان کے پاس آپ کا جو ذکر ہے اس کا انکار کر دیا اور میثاق کو تسلیم نہ کیا۔ آپ پر جو کچھ اترا ہے اور آپ سے پہلے لوگوں پر جو اترا تھا اس کا کفر کیا تو وہ آپ کی تحذیر کو کیسے سنیں گے۔ اور ان کے پاس آپ کا جو علم ہے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت ابوالعالیہ کا قول ہے کہ یہ دونوں آیات غزوۂ احزاب کے قائدین کے حق میں نازل ہوئیں جن کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا (ابراہیم:29-28) '' ترجمہ: کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں (یعنی) دوزخ میں جھونکے جائیں گے''۔ لیکن جو معانی ہم نے پہلے بیان کیے ہیں وہ زیادہ ظاہر اور واضح ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالے سے ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم قرآن پڑھتے ہیں تو امید بندھ جاتی ہے۔...... الحدیث۔ (لَا یُؤْمِنُوْنَ) کا اعراب یہ ہے کہ یہ سابقہ جملے کی تاکید ہے اور وہ جملہ یہ ہے سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ یعنی وہ دونوں حالتوں میں کفار ہیں۔ اسی لیے اس کی تاکید لَا یُؤْمِنُوْنَ ذکر فرمائی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ لَا یُؤْمِنُوْنَ خبر ہو کیونکہ تقدیر کلام اس طرح ہے اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ اس صورت میں سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ جملہ معترضہ ہوگا واللہ اعلم۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ٘ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

''مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے''۔

سدی فرماتے ہیں ختم اللہ، سے مراد ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ قتادہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں شیطان ان پر غالب آ گیا اور وہ اس کی اطاعت کرنے لگے تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ چنانچہ وہ

ہدایت کو نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ گناہ دلوں پر چڑھتے جاتے ہیں حتیٰ کہ اسے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ یہی مہر لگانا ہے۔ ابن جریج کا قول ہے کہ مہر دل اور کانوں کے لئے ہوتی ہے قرآن میں اس کی کیفیت کے لئے تین لفظ ران، طبع اور اقفال آئے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں ران کا لفظ طبع سے کم ہے اور طبع اقفال سے کم ہے اور اقفال ان سب سے شدید ہے۔ اعمش کا قول ہے کہ مجاہد نے ہمیں اپنا ہاتھ دکھایا۔ اور فرمایا لوگ سمجھتے تھے کہ دل ہتھیلی کی طرح ہے۔ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس سے مل جاتا ہے۔ اور وہ بند ہو جاتا ہے انہوں نے اپنی چھوٹی انگلی کو بند کر کے دکھایا کہ اس طرح پھر جب دوبارہ گناہ کرتا ہے تو وہ بند ہو جاتا ہے پھر ایک اور انگلی کو بند کر لیا۔ پھر جب مزید گناہ کرتا ہے تو وہ اور سمٹ جاتا ہے مجاہد نے ایک اور انگلی کے ساتھ اشارہ کیا۔ حتیٰ کہ ساری انگلیوں کو بند کر لیا۔ پھر فرمایا اس طرح اس پر مہر لگ جاتی ہے۔ مجاہد کہتے ہیں اسے رین بھی کہتے ہیں۔ ابن جریر نے بھی مجاہد سے یہی روایت کیا ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں بعض مفسرین کا قول ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ سے مراد اللہ کی طرف سے ان کے تکبر کی خبر دینا اور دعوت کو سننے سے ان کے اعراض کی طرف ہے، جیسے کہا جاتا ہے اِنَّ فُلَانًا اَصَمُّ عَنْ هٰذَا الْكَلَامِ۔ فلاں شخص اس بات کے سننے سے بہرا بن گیا۔ ابن جریر فرماتے ہیں لیکن یہ مطلب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہاں تو اللہ تعالیٰ خبر دے رہے ہیں کہ خود اس نے ہی ان کے کانوں اور دلوں پر مہر ثبت کر دی ہے۔ (میں کہتا ہوں) زمخشری نے ابن جریر کی تردید میں کافی وضاحت سے کام لیا ہے اور پانچ تاویلیں ذکر کی ہیں لیکن یہ سب ضعیف ہیں۔ اپنے معتزلی ہونے کی وجہ سے اسے یہ سب تکلفات کرنا پڑے۔ کیونکہ دلوں پر مہر لگا دینا اور حق کو اس تک پہنچنے سے روک دینا ان کے نزدیک قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں۔ اگر وہ آگے آنے والی آیات کو سمجھ لیتا (فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ) ”اور ہم پھیر دیں گے ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ اور ہم چھوڑ دیں گے انہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں“۔ اور اس طرح کی دیگر آیات جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے۔ ہدایت کو ان سے دور کر دیا ہے۔ ان کے حق کو ترک کرنے اور باطل پر اڑے رہنے کی وجہ سے۔ اور یہ تو سراسر عدل ہے جو کہ حسین ہے نہ کہ قبیح اگر وہ ان آیات کا بغور مطالعہ کر لیتا تو اسے یہ بات کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی واللہ اعلم۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہر لگانے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ جو کہ ان کے کفر کی جزاء ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء:155) ”بلکہ مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر بوجہ ان کے کفر کے“۔ حدیث شریف میں ہے ”يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ“(1) ترجمہ اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت رکھنا۔ اور صحیح میں حضرت حذیفہ والی روایت کہ آپ ﷺ نے فرمایا” فتنے دلوں پر اس طرح پیش کیے جاتے ہیں۔ جیسے چٹائی کا ایک ایک تنکا۔ جو دل انہیں قبول کر لیتا ہے اس پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے۔ جو دل انہیں قبول نہیں کرتا اس میں ایک سفید نکتہ لگا دیا جاتا ہے یہ نکتہ بڑھتے بڑھتے دلوں کو گھیر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ دل سفید ہو جاتا ہے۔ اور زمین و آسمان کا کوئی فتنہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اب دوسرا سیاہ دل الٹے کوزے کی طرح ہوتا ہے۔ نہ اچھی بات اسے اچھی لگتی ہے اور نہ بری بات اسے بری لگتی ہے(2)۔ ابن جریر لکھتے ہیں میرے نزدیک حقیقت وہی حدیث ہے جسے حضرت ابوہریرہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا” بندہ جب گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نکتہ اس کے دل پر لگا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے اور باز آ جائے تو یہ نکتہ حذف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جائے تو یہ سیاہی پھیل کر اس کے سارے دل کو گھیر لیتی ہے یہی وہ ” رَانَ “ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا ہے۔ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ

1۔ مسند امام احمد:386/5 2۔ مسلم، کتاب الایمان، باب65

عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (مطففین :14) ''نہیں در حقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے''۔ اس حدیث کو اس سند سے ترمذی نے روایت کیا ہے اور نسائی نے قتیبہ اور لیث بن سعد سے ابن ماجہ نے محمد بن عجلان سے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ پھر ابن جریر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں خبر دی کہ گناہوں کا تسلسل دل کو بند کر دیتا ہے۔ جب اس پر غلاف آ جاتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس وقت مہر لگا دی جاتی ہے۔ اب اس دل میں ایمان کے داخلے اور کفر سے چھٹکارے کی کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی مہر کا ذکر اس آیت کریمہ خَتَمَ اللّٰهُ...... میں کیا گیا ہے۔ اس کی نظیر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے کہ جب کسی برتن یا مشک وغیرہ کے منہ پر مہر لگا دی جاتی ہے تو اسے توڑ کر کھولے بغیر اس میں سے کچھ بھی نکالا نہیں جا سکتا یہی حال ان دلوں کا ہے جن پر اللہ نے مہر لگانے کا ذکر فرمایا ہے مہر توڑنے اور پردہ ہٹانے کے بغیر ایمان ان میں حلول نہیں کر سکتا۔ واضح رہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ پر وقف تام ہے اور عَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ الگ مکمل جملہ ہے۔ مہر دل اور کانوں پر ہوتی ہے۔ اور پردہ ''غِشَاوَةٌ'' آنکھوں پر ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر علماء صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہی مروی ہے۔ ابن جریر نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ ابن جریج کا قول ہے کہ مہر دل اور کانوں پر ہوتی ہے اور پردہ آنکھوں پر ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِكَ (شوریٰ :24) ''پس اگر اللہ چاہتا تو مہر لگا دیتا آپ کے دل پر''۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا: وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (جاثیہ :23) ''اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر۔ اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ'' ابن جریر لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ میں غِشَاوَةٌ کو نصب دیا ہے ممکن ہے ان کے نزدیک جعل فعل یہاں مقدر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں نصب محل کی اتباع سے ہو جیسے (وحور عین) میں۔ ایک شاعر کا قول ہے ؎

عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَمَآءً بَارِدًا حَتّٰى شَتَتْ هَمَّالَةً عَيْنَا هَا

ایک اور شاعر کا قول ہے۔ ؎

وَرَاَيْتُ زَوْجَكِ فِي الْوَغٰى مُتَقَلِّدًا سَيْفًا وَرُمْحًا

یہ اصل میں سَقَيْتُهَا مَاءً بَارِدًا اور مُعْتَقِلًا رُمْحًا تھے(1)۔ سورت کی ابتدائی چار آیات میں مومنین کی صفت بیان کی۔ پھر ان دو آیتوں میں کفار کا حال بیان ہوا۔ اب منافقین کا ذکر ہوتا ہے جو بظاہر ایماندار بنتے ہیں لیکن ان کے باطن کفر سے لبریز ہیں۔ چونکہ ان کا حال عام لوگوں سے اکثر مخفی ہوتا ہے۔ اس لیے تفصیل سے ان کی نشانیاں بتائیں جن میں سے ہر ایک علامتِ نفاق ہے۔ سورۂ برأت (توبہ) اور سورۂ منافقین انہی کے بارے میں اتری۔ سورۂ نور اور بعض دیگر سورتوں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ لوگ ان سے بچیں اور ان مذموم خصائل سے بھی کنارہ کش رہیں۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

''اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر حالانکہ وہ مومن نہیں فریب دیا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو (اور اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے''۔

1۔ الخصائص 431/6

نفاق دراصل بھلائی کو ظاہر کرنے اور شر کو پوشیدہ رکھنے کا نام ہے۔ اس کی چند اقسام ہیں (1) اعتقادی: یہ منافق ابدی جہنمی ہے (2) عملی: یہ کبیرہ گناہ ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ابن جریج فرماتے ہیں منافق وہ ہے جس کا قول اس کے فعل، باطن اس کے ظاہر کے خلاف ہو۔ اندر ادر ہو اور گھر سے باہر اس کے خلاف ہو۔ اجتماع میں انفرادی صورت حال کے برعکس ہو منافقین کی صفات کا ذکر مدنی سورتوں میں ہے کیونکہ مکہ میں منافقین نہ تھے بلکہ اس کے برعکس لوگ مجبوراً کفر کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ باطنی طور پر وہ مسلمان تھے جب رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں جلوہ افروز ہوئے تو یہاں انصار کے دو قبائل اوس اور خزرج تھے جو مشرکین عرب کی طرح جاہلیت میں بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ یہود اہل کتاب اپنے اسلاف کے طریقہ پر تھے ان کے تین قبائل تھے (1) بنو قینقاع یہ خزرج کے حلیف تھے (2) بنو نضیر اور (3) بنو قریظہ یہ اوس کے حلیف تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے قدم رنجہ فرمایا انصار کے دونوں قبائل (اوس وخزرج) مسلمان ہو گئے۔ یہود میں سے بہت کم لوگ مسلمان ہوئے ماسوائے عبداللہ بن سلام کے۔ ابھی تک نفاق کا وجود نہیں تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کو ابھی سیاسی دبدبہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہود اور مدینہ کے آس پاس مقیم عرب کے بہت سے قبائل کے ساتھ صلح کے معاہدے کر لیے تھے۔

جب غزوۂ بدر العظمیٰ کا واقعہ پیش آیا اس میں اللہ کا کلمہ غالب ہوا۔ اسلام اور اہل اسلام کو عزت ملی۔ عبداللہ بن اُبی بن سلول جو مدینے کا رئیس تھا اور بنو خزرج سے تھا۔ زمانہ جاہلیت میں دونوں قبائل اسے اپنا سردار تسلیم کرتے تھے بلکہ اس کے بادشاہ بنانے کا اعلان بھی ہو چکا تھا کہ بھلائی آ پہنچی اور لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور اسے بھول گئے۔ اس وجہ سے اسلام اور اہل اسلام اس کے دل میں کھٹکنے لگے۔ جب بدر کا واقعہ ہوا تو وہ کہنے لگا کہ یہ امر تو اب غالب آتا جا رہا ہے چنانچہ اس نے بظاہر اسلام قبول کیا۔ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کے پیروکاروں کی ایک جماعت نے بھی یہ کیا۔ بعض اہل کتاب بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس طرح مدینہ اور اس کے اردگرد نفاق قائم ہو گیا۔ مہاجرین میں سے کسی نے بھی بزور شمشیر ہجرت نہ کی تھی بلکہ وہ تو رضائے الٰہی کی خاطر اپنا مال، اولاد اور وطن چھوڑ کر آئے تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ یعنی منافقین جن کا تعلق اوس اور خزرج سے تھا اور جو یہود ان کے پیروکار تھے۔ اس کی یہی تفسیر ابوالعالیہ، حسن، قتادہ اور سدی نے بیان فرمائی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے منافقوں کی خصلتوں سے آگاہ فرمایا تا کہ عام مسلمان ان کے مسئلے پر دھوکہ نہ کھائیں۔ اور انہیں مسلمان تصور کرتے ہوئے اپنا نہ سمجھ لیں جس کی وجہ سے کوئی بڑا فساد پھیل جائے۔ چنانچہ تعالیٰ اللہ نے فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ...... یعنی وہ صرف زبانی اقرار کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ (منافقون: 1) ''منافق آپ کے پاس آکر کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں''۔ یعنی آپ کے پاس آکر کہتے ہیں چونکہ وہ سچ نہیں کہہ رہے اس لئے اِنَّ اور لام تاکید کے ساتھ اپنی گواہی کو پختہ کرتے ہیں۔ انہوں نے مزید تاکید کرتے ہوئے یہ کہا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ہم اللہ رب العزت اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ حالانکہ بات اس طرح نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی گواہی اور خبر کو جھٹلاتے ہوئے بتایا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (منافقون: 1) ''ترجمہ: اللہ گواہی دیتا ہے بلاشبہ منافقین جھوٹے ہیں''۔ اور فرمایا: وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ''ترجمہ: اور وہ مومن نہیں ہیں۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ یعنی ایمان کو ظاہر کر کے اور کفر کو چھپا کر وہ اپنی جہالت کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اور یہ چیز ان کو نفع دے گی۔ اور ان کا مکر (معاذ اللہ) اللہ تبارک وتعالیٰ پر بھی چل جائے گا جس طرح بعض مؤمنین پر چل جاتا ہے جیسے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (مجادلہ:18) ''جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کے سامنے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور خیال کریں گے کہ وہ کسی مفید چیز پر تکیہ کیے ہیں۔ خبردار! یہی وہ جھوٹے لوگ ہیں''۔ اس سے آگے ان کے عقیدے کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ '' ترجمہ: اور (حقیقت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو اور اس حقیقت کو نہیں سمجھتے''۔ ایک اور جگہ فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ (نساء:142)'' بے شک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں'' بعض قاریوں نے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ کر کے پڑھا ہے۔ دونوں قرأتوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ منافق اللہ اور مؤمنین کو کیسے دھوکہ دے سکتا ہے؟۔ وہ تو بطور تقیہ اپنے اعتقاد کے برعکس بات کو اپنی زبان پر لاتا ہے۔ تو جواباً کہا جائے گا کہ اس شخص کو جو تقیہ کرتے ہوئے اپنی زبان پر ضمیر کی بات کے برعکس کوئی بات لائے تا کہ جس چیز سے وہ خدشہ محسوس کر رہا ہے نجات پالے اہل عرب اسے بھی مخادع کہتے ہیں۔ اسی مفہوم کے پیش نظر منافق کو اللہ اور مومنین کو دھوکہ دینے والا کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بطور تقیہ اپنی زبان سے ایسا عقیدہ ظاہر کرتا ہے جس سے وہ قتل، گرفتاری اور دنیوی عذاب سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ حالانکہ باطن میں اس کا عقیدہ اور ہوتا ہے اپنے اس فعل سے اگرچہ وہ دنیا میں مومنین کو دھوکہ دے رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کو بھی دھوکہ دے رہا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے لئے ظاہر کرتا ہے کہ اپنے فعل سے وہ اس کی آرزو کو پورا کر رہا ہے۔ اور اسے سرور کا جام پلا رہا ہے حالانکہ وہ اسے ہلاکت کے گھاٹ پر لے آیا ہے۔ اور عذاب کا جام اسے نوش کرا رہا ہے۔ اور اسے اللہ کے غیظ وغضب اور ایسے عذاب کا حقدار بنا رہا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے کیونکہ وہ آخرت کے عبرتناک انجام سے دوچار ہے حالانکہ وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ اس کا موقف درست ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے مومن بندوں کو یہ خبر دے رہے ہیں کہ منافقین اپنے کفر وشرک اور تکذیب کے ساتھ اپنے رب کو ناراض کرتے ہوئے اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں حالانکہ انہیں اس بات کا احساس اور ادراک تک نہیں۔ وہ اپنے انجام سے بے بہرہ ہیں۔ ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ ابن جریج اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اظہار کر کے وہ اپنی جان ومال کو بچانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے حضرت قتادہ فرماتے ہیں۔ منافقوں کی صفات اکثر یہ ہیں۔ بداخلاق، زبان سے تصدیق کرتا ہے لیکن دل سے انکار کرتا ہے۔ اس کا عمل اس کے خلاف ہے۔ صبح کو ایک حالت پر ہوتا ہے شام کو اس کے برعکس، شام کو کچھ اور، صبح کچھ اور۔ کشتی کی طرح جو ہوا کے رحم وکرم پر ہے کبھی ادھر کبھی ادھر۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩

''ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھا دی اللہ نے انکی بیماری اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے''۔

حضرات ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کرام کی رائے یہ ہے کہ مرض یعنی بیماری سے مراد یہاں شک وشبہ ہے۔ مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، ابوالعالیہ، ربیع بن انس اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ عکرمہ اور طاؤس نے مرض کی تفسیر ریا سے کی ہے یعنی ان کے دلوں میں ریاکاری ہے۔ ایک روایت کے مطابق ابن عباس نے مرض سے مراد نفاق لیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں یہاں دینی

بیماری مراد ہے نہ کہ جسمانی وہ منافقین ہیں اور یہ بیماری شک کی ہے جو انہیں اسلام کے بارے میں ہے۔ آگے دوسرے مرضًا، کی تفسیر رِجْسٌ (ناپاکی) سے کی اور یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (توبہ:124-125) ''تو وہ (سن لیں) ایمان والوں کے ایمان میں اس سورت نے اضافہ کر دیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔ اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو بڑھا دی اس سورت نے ان میں اور پلیدی ان کی (سابقہ) پلیدی پر'' فرمایا: اَیْ شَرًّا اِلٰی شَرِّهِمْ وَ ضَلَالَةً اِلٰی ضَلَالَتِهِمْ یعنی شر پر شر اور گمراہی پر گمراہی۔ عبدالرحمٰن کی ذکر کردہ یہ تفسیر عمدہ ہے ان کے عمل کی یہی مناسب جزاء ہے۔ سابق مفسرین نے بھی یہی کہا ہے۔ اور اس کے مشابہ یہ آیت بھی ہے: وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ (محمد:17) ''اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو اور انہیں تقویٰ کی توفیق بخشا ہے'' بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ اسے یُكَذِّبُوْنَ کر کے بھی پڑھا گیا ہے۔ وہ ان دونوں رذیل عادتوں سے متصف تھے۔ وہ جھوٹے بھی تھے اور جھٹلاتے بھی تھے۔ دونوں بری صفات ان میں مجتمع تھیں۔ قرطبی وغیرہ مفسرین سے پوچھا گیا کہ بعض منافقین کا نفاق ظاہر ہو جانے کے باوجود رسول خدا ﷺ نے انہیں قتل کرنے کا حکم کیوں صادر نہیں فرمایا انہوں نے اس کے چند جوابات ارشاد فرمائے ہیں۔

(1) صحیحین یعنی بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر سے ارشاد فرمایا'' میں یہ بات ناپسند کرتا ہوں کہ اہل عرب یہ کہیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں''۔

(2) اس میں یہ خدشہ تھا کہ قرب و جوار کے بہت سے عرب دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے گریزاں رہیں گے۔ کیونکہ انہیں یہ تو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ انہیں ان کے نفاق اور کفر کی بنا پر قتل کیا گیا ہے۔ وہ صرف ظاہری صورت حال کو ہی دیکھ کر یہ کہنے لگیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ قرطبی لکھتے ہیں'' ہمارا اور ہمارے علماء کا قول یہی ہے۔ جیسا کہ آقائے دو عالم ﷺ مُؤَلَّفَةِ قلوب کو انکی بداعتقادی کے باوجود عطا فرماتے تھے۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ امام مالک کے اصحاب کا یہی طریقہ ہے۔ محمد بن جہم، قاضی اسماعیل، ابہری اور ابن ماجشون (1) نے اسی پر نص قائم کی ہے۔

(3) حضرت امام مالک کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ منافقین کے قتل سے اس لیے گریزاں رہے تاکہ آپ ﷺ کی امت کو یہ علم ہو جائے کہ حاکم اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ قرطبی کا قول ہے کہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر قتل نہیں کر سکتا۔ گو دیگر مسائل میں اختلاف ہے۔

قرطبی لکھتے ہیں کہ اس کی ایک توجیہ وہ ہے جو امام شافعی نے ذکر فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ منافقین کے قتل سے اس لیے رکے رہے کہ وہ اسلام ظاہر کرتے تھے۔ حالانکہ آپ ﷺ کو ان کے نفاق کا علم تھا کیونکہ اسلام کا اظہار سابقہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اس کی تائید صحیحین وغیرہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کی صحت پر سب کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا '' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں۔ جب انہوں نے یہ کلمہ کہہ دیا تو اپنی جانوں اور مال کو مجھ سے بچا لیا مگر حق کے ساتھ اور انکا حساب اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذمے ہے''۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ کہہ دینے سے ظاہراً آدمی پر اسلام کے احکام لاگو ہو جاتے ہیں اگر وہ اس کا اعتقاد بھی رکھتا ہو تو دار آخرت میں اس کو ثواب ملے گا۔ لیکن اگر وہ اس کی حقانیت کا عقیدہ نہیں رکھتا تو دینی احکام کا اس پر جاری ہونا اور اہل ایمان کے ساتھ میل جول اسے کوئی نفع نہیں دے گا۔ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا

1۔ تفسیر القرطبی:1/199

بَلٰی وَ لٰکِنَّکُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَکُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْکُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ...... (حدید:14)'' منافق پکاریں گے اہل ایمان کو کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے کہیں گے بے شک! لیکن تم نے اپنے آپ کو خود فتنوں میں ڈال دیا اور ہماری تباہی کا انتظار کرتے رہے اور شک میں مبتلا رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں جھوٹی امیدوں نے یہاں تک کہ اللہ کا فرمان آپہنچا) وہ محشر میں بھی مسلمانوں کے ساتھ چمٹے رہیں گے۔ جب حق واضح ہو جائے گا۔ وہ ان سے نمایاں ہو جائیں گے اور پیچھے رہ جائیں گے''۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ حِیْلَ بَیْنَهُمْ وَ بَیْنَ مَا یَشْتَهُوْنَ (سبا:54)'' اور رکاوٹ کھڑی کر دی جائے گی ان کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جو وہ دل سے چاہتے ہوں گے۔ اور وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر سجدہ نہ کر سکیں گے''۔ جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔

(4) اس کی چوتھی وجہ یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ سرکار دو عالم ﷺ نے اس لیے انہیں قتل نہ کیا کہ آپ ﷺ کو ان کے شر کا اندیشہ تھا۔ باوجودیکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے درمیان موجود تھے ان پر قرآن کریم کی آیات بینات کی تلاوت فرماتے تھے لیکن آپ کے بعد اگر وہ نفاق ظاہر کرتے اور مسلمانوں کو اس کا علم ہو جاتا تو ان کی سزا قتل تھی۔ حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے کے منافق آج کے زندیق ہیں۔ (میں کہتا ہوں) زندیق کے قتل کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے کہ جب وہ کفر ظاہر کرے تو اس سے توبہ کروائی جائے گی یا نہیں۔ یا وہ زندیق جو اپنے عقیدہ کی طرف دعوت دیتا ہو اور وہ جو دعوت نہ دیتا ہو کے مابین فرق کیا جائے گا یا نہیں۔ یا وہ شخص جس سے ارتداد کئی مرتبہ ظاہر ہوا ہو یا اس نے ایک ہی مرتبہ یہ جرم کیا ہو دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا یا نہیں؟۔ اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ اسلام قبول کرنا اور اس کی طرف رجوع کرنا خود اس کی اپنی طرف سے ہو یا اس پر غلبہ پالینے کے بعد دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے یا نہیں۔ اس بارے میں علماء کرام کے متعدد اقوال ہیں جنہیں شرح وبسط کے ساتھ احکام کی کتب میں بیان کیا جا چکا ہے۔

تنبیہ: یہ قول کہ بعض منافقین کے نفاق کا آپ ﷺ کو علم تھا اس کی بنیاد حدیث حذیفہ بن یمان پر ہے۔ اس میں چودہ منافقین کے اسماء گنوائے گئے ہیں جنہوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر رات کے اندھیرے میں کسی گھاٹی کے پاس رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) شہید کرنے کا (ناپاک) منصوبہ بنایا۔ ان کی مکروہ سازش یہ تھی کہ آپ ﷺ کی اونٹنی کو بدکا دیں گے تاکہ آپ ﷺ زمین پر آ رہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ ﷺ کو اس بات کی خبر کر دی۔ آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ کو بلا کر اس سازش سے باخبر کر دیا۔ شاید ان کے قتل نہ کرنے کی وجہ مذکورہ بالا وجوہات میں سے کوئی وجہ تھی یا کوئی اور بات تھی۔ واللہ اعلم لیکن ان کے علاوہ دیگر منافقین کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ؔۛ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ (توبہ:101)'' اور تمہارے آس پاس بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں اور کچھ مدینے کے رہنے والے پکے ہو گئے ہیں نفاق میں۔ تم نہیں جانتے ان کو ہم جانتے ہیں انہیں''۔ اور فرمایا: (لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ ...... وَ قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا)'' ترجمہ: اور اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے، تو ہم آپ کو مسلط کر دینگے ان پر پھر وہ نہ ٹھہر سکیں گے آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں مگر چند روز۔ وہ بھی اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور جان سے مار ڈالے جائیں گے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک آپ ﷺ کو بھی ان کا مکمل علم نہیں دیا گیا تھا صرف ان کی صفات ذکر کی گئی تھیں جن کی بنا پر آپ ﷺ ان کو پہچانتے تھے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ؕ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد:30)'' اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو دکھا دیں یہ لوگ سو آپ پہچان تو چکے ہیں ان کو ان کے چہرہ سے اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے'' ان منافقین میں سب سے مشہور عبد اللہ بن ابی بن سلول تھا۔

حضرت زید بن ارقم نے اس کی منافقانہ خصلتوں کے سبب اس کے خلاف گواہی بھی دی تھی۔ اس کے باوجود جب اس کا انتقال ہوا تو حضور ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کی تدفین میں شرکت فرمائی۔ جس طرح کہ آپ ﷺ کا معمول تھا۔ حضرت عمر نے جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا میں ناپسند کرتا ہوں کہ عرب یہ کہیں کہ محمد اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں۔ اور صحیح کی روایت میں ہے ''مجھے اختیار دیا گیا تو میں نے اختیار کرلیا''۔ اور ایک روایت میں ہے ''اگر مجھے علم ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی بخشش ہو جائے گی تو یقیناً میں زیادہ کرتا''۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ⑫

''اور جب کہا جائے انہیں کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں۔ ہوشیار! وہی فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں''۔

سدی حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کرام کے حوالے سے لکھتے کہ اس آیت کا مصداق بھی منافقین ہی ہیں۔ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ فساد سے مراد کفر اور معصیت خداوندی ہے۔ حضرت ابو العالیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں زمین میں نافرمانی نہ کرو ان کا فساد اللہ کی معصیت و نافرمانی تھی۔ کیونکہ جس نے زمین میں اللہ کی نافرمانی کی یا نافرمانی کا حکم دیا اس نے زمین میں فساد کیا کیونکہ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت گزاری میں ہے۔ ربیع بن انس اور قتادہ کا قول یہی ہے۔ حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ جب وہ اللہ کی نافرمانی پر کمر کس لیتے ہیں تو ان سے کہا جاتا ہے ایسے نہ کرو تو وہ کہتے ہیں ہم ہدایت پر ہیں اور اصلاح کرنے والے ہیں۔ حضرت سلمان فارسی سے مروی ہے کہ یہ لوگ ابھی نہیں آئے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اس صفت سے متصف ہوں گے وہ ان لوگوں سے بھی زیادہ فسادی ہوں گے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ اقدس میں تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس صفت کا حامل ابھی تک کوئی نہیں گزرا۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ اہل نفاق اپنے رب کی نافرمانی کر کے زمین میں فساد بپا کرتے تھے۔ جس کام سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا تھا اسے کرتے تھے۔ اپنے فرائض کو ضائع کرتے تھے۔ دین میں شک کرتے تھے حالانکہ اس کی تصدیق اور حقانیت کے ایقان کے بغیر کوئی عمل بھی قبول نہیں۔ مومنوں کے پاس آکر اپنے ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے۔ دائمی شک اور وسواس میں مبتلا تھے۔ جب بھی موقع ملتا اہل اللہ کے مقابلے دشمنان خدا اور رسول کی اعانت کرتے۔ یہ ان کی طرف سے زمین میں فساد بپا کرنا تھا۔ حالانکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اپنے افعال کے ساتھ وہ زمین میں اصلاح کرنے والے ہیں۔ یہ ہی حضرت حسن کا قول ہے۔ زمین میں فساد کی ایک صورت مومنین کا کفار سے رشتہ دوستی اور موالات قائم کرنا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِیْرٌ (انفال:73) ''وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اگر تم (ان حکموں پر) عمل نہیں کرو گے تو برپا ہو جائے گا فتنہ ملک میں اور پھیل جائے گا بڑا فساد'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار اور مسلمانوں کے باہمی دوستانہ تعلقات ختم کر دیئے۔ پھر ایک جگہ ارشاد فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا پھر فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا (النساء:144-145) ''اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر۔ کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ بنادو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے خلاف واضح دلیل۔ بے شک منافق

سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے اور ہرگز نہ پائے گا تو ان کا کوئی مددگار" منافق چونکہ ظاہری طور پر ایمان قبول کیے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا معاملہ مؤمنین پر مشتبہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا فساد منافقین کی طرف سے ہے کیونکہ اس نے ہی تو مومنین کو دھوکہ دیا اپنی اس بات کے ساتھ جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور مؤمنین کو چھوڑ کر کفار سے رشتہ موالات باندھا اگر وہ اپنی پہلی حالت (کفر) پر رہتا تو اس کا شر کم ہوتا۔ اگر اس کے عمل میں اخلاص ہوتا اور قول وفعل میں تضاد نہ ہوتا تو وہ کامیاب وکامران ہوتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِۙ قَالُوۡاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ہم دونوں فریقوں (مؤمنین اور کفار) کے ساتھ تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں حضرت ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم فریقین (مؤمنین اور اہل کتاب) کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰـكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ وہ چیز جس پر انکا اعتماد ہے اور یہ گمان ہے کہ یہ اصلاح ہے وہ عین فساد ہے لیکن بوجہ جہالت کے انہیں اس کا شعور تک نہیں۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡٓا اَنُؤۡمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾

"اور جب جب کہا جائے انہیں ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے (اور) لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف۔ خبردار! بے شک وہی احمق ہیں مگر وہ جانتے نہیں"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ان منافقوں سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ لوگوں (صحابہ) کی طرح اللہ، فرشتوں، کتابوں، رسل کرام، موت کے بعد جی اٹھنے اور جنت و دوزخ پر ایمان لاؤ اور اوامر کو بجالانے اور نواہی سے رکنے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں اس طرح جیسے ایمان لائے وہ بیوقوف اور...... ان پر اللہ کی لعنت ہو۔ مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین لیتے ہیں۔ ابو العالیہ اور سدی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور بہت سے صحابہ کرام سے یہی نقل کیا ہے ربیع بن انس کا بھی یہی قول ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کیا ہم اور وہ برابر اور ایک طریقہ پر ہیں حالانکہ وہ سُفَهَآءَ ہیں سُفَهَآءَ یہ سَفِيۡهٌ کی جمع ہے جیسے حکماء حکیم کی اور حلماء حلیم کی۔ جاہل، ضعیف رائے والے اور نفع نقصان کے بارے میں کم معلومات رکھنے والے کو سفیہ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں عورتوں اور بچوں کو سفہاء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَـكُمُ الَّتِىۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَـكُمۡ قِيٰمًا (نساء:5) "اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال جنھیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی) کے لیے سہارا"۔ عام مفسرین کا یہ قول ہے کہ اس آیت میں سفہاء سے مراد عورتیں اور بچے ہیں خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سب مقامات پر ان کو جواب دینے کی ذمہ داری لی۔ اور فرمایا: اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ تاکیداً حصر کے ساتھ فرمایا بیوقوف تو یہی ہیں۔ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ لیکن انہیں اس بات کا پتہ ہی نہیں۔ یعنی اپنی جہالت اور گمراہی کو نہیں جان سکتے۔ یہ چیز ان کے کمال اندھے پن اور ہدایت سے دوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا مَعَكُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَيَمُدُّهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۵﴾

"اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے

پاس تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اللہ سزا دے رہا ہے انہیں اس مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انہیں تا کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ جب یہ منافق مومنین سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کے سامنے ایمان ظاہر کر کے مومنین کو دھوکہ دینے کے لیے دوستی اور خیر خواہی ظاہر کرتے ہیں۔ اور نفاق، تصنع اور تقیہ سے کام لیتے ہیں۔ تا کہ مسلمانوں کے ساتھ بھلائی اور مال غنیمت میں شریک ہو جائیں۔ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ خَلَوْا کا معنی اِنْصَرَفُوْا، ذَهَبُوْا اور خَلَصُوْا ہے خَلَوْا اِلٰى کی طرف متعدی ہونے کی وجہ سے اپنے ضمن میں اِنْصَرَفُوْا کا معنی لئے ہوئے ہے تا کہ فعل مضمر (پوشیدہ) اور ملفوظ (لفظوں میں ظاہر) دونوں پر دلالت کرے۔ بعض کہتے ہیں کہ الی یہاں مع کے معنی میں ہے۔ مگر پہلی رائے زیادہ بہتر ہے اور ابن جریر کے کلام کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ سدی نے ابو مالک سے ''خَلَوْا'' کا معنی ''مَضَوْا'' کیا ہے۔ اور شیاطین سے مراد ان کے سردار بڑے لوگ، یہود کے رؤساء اور مشرکین ومنافقین کے سردار ہیں۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کرام کے نزدیک شیاطین سے مراد کفر کے سردار ہیں۔ یعنی جب یہ اپنے شیاطین کی طرف جاتے ہیں اور یہ ان کے ساتھی ہیں ایک دوسری روایت میں ابن عباس کے نزدیک شیاطین سے مراد وہ یہودی ہیں جو انہیں تکذیب کرنے اور قرآن کی مخالفت کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کے وہ ساتھی ہیں جو مشرک یا منافق تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد شرک اور شر میں ان کے قائدین اور سردار ہیں ابو مالک، ابو العالیہ، سدی، اور ربیع بن انس سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ ہر چیز میں سرکشی کرنے والے کو شیطان کہتے ہیں۔ یہ جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں سے بھی جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام:112) ''اور اسی طرح بنا دیئے ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن (یعنی) سرکش انسان اور جن جو چپکے چپکے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوشنما باتیں (لوگوں کو) دھوکہ دینے کے لیے''۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' ہم جن وانس کے شیاطین سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔'' میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا انسانوں میں بھی شیاطین ہوتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں(1)۔ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اس کی تفسیر میں ابن عباس فرماتے ہیں کہ ہم تمہاری مثل ہیں جیسے تم ہو ویسے ہی ہم ہیں۔ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ہم تو قوم کے ساتھ ٹھٹھا کر رہے ہیں اور ان سے کھیل رہے ہیں۔ ابن عباس اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں ہم تو محمد (ﷺ) کے اصحاب کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ ربیع بن انس اور قتادہ کا قول بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتے ہوئے اور ان کے تصنع کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یوم قیامت میں ان کے ساتھ ایسا کرے گا جس کا بیان اس آیت کریمہ میں آیا ہے۔ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (حدید:13) '' اس روز کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے (اے نیک بختو!) ذرا ہماری بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کر لیں تمہارے نور سے۔ (انہیں) کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور (وہاں) نور تلاش کرو۔ پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا اس کے باطن میں رحمت اور اس کے ظاہر کی جانب عذاب ہوگا'' ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ...... (آل عمران

1۔ المسند: 178/5

:178)''اور نہ خیال کریں جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے۔ صرف اس لئے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ کر لیں گناہ'' یہ اور اس طرح کی دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے منافقین اور اہل شرک کے ساتھ استہزاء، مذاق، مکر کا ذکر ہے۔ ایک فریق نے یہ تاویل کی ہے۔ بعض دیگر علماء کرام کی رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے استہزاء سے مراد ان کو جھڑکنا، اور کفر وعصیان پر ملامت کرنا ہے۔ ایک تیسرے فریق کی رائے یہ ہے کہ یہ اور اس طرح کے دیگر الفاظ بطور جواب لائے گئے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی اپنے ساتھ فریب کرنے والے کے فریب سے جب بچ نکلتا ہے تو یہ کہہ دے کہ میں نے ہی تمہیں دھوکہ دیا تھا۔ حالانکہ فریب اس کی طرف سے نہیں ہوتا لیکن جب وہ غالب آ گیا تو اس نے یہ کہہ دیا۔ وہ فرماتے ہیں اسی طرح آیت کریمہ: وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ (آل عمران:54)'' ترجمہ: اور یہودیوں نے بھی (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر (اور مؤثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے''۔ اور آیت کریمہ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ بطور جواب وارد ہوئی ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات مکر اور مذاق سے پاک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مکر اور استہزاء انہیں گھیر لیتے ہیں۔ ایک فریق کی رائے ہے کہ آیات کریمہ: اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۝ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ، یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ، فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ (توبہ:79)، نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ (توبہ:67) وغیرہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اللہ ان کو ان کے استہزاء اور دھوکے کی سزا دے گا۔ تو ان کو جزا دینے کو ان کے فعل سے ہی تعبیر کیا جس کے سبب وہ عذاب کے مستحق قرار پائے۔ اگرچہ دونوں کا مفہوم مختلف ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے۔ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (شوریٰ:40)'' اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پس جو معاف کر دے اور اصلاح کر دے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے'' اور دوسری آیت کریمہ میں فرمایا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ (بقرہ:194)'' ترجمہ: تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو (لیکن) اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو''۔ پہلا ظلم ہے اور دوسرا عدل دونوں کے الفاظ اگرچہ ایک ہیں لیکن مفہوم میں فرق ہے۔ کلام اللہ میں جہاں جہاں بھی اس طرح کی آیتیں ہیں ان کا یہی مفہوم ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں منافقین کے بارے میں خبر دی ہے کہ جب وہ اپنے سرکش سرداروں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے دین پر ہیں۔ محمد (ﷺ) اور ان کی وحی کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور ہم جو کچھ ان کے لئے ظاہر کرتے ہیں ہم اس میں ان کے ساتھ مذاق کرتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ بھی ان سے استہزاء فرما رہا ہے۔ دنیا میں تو ان کے جان و مال کے محفوظ ہونے کا حکم دیا جبکہ آخرت میں عین اس کے برعکس ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ پھر ابن جریر اس قول کی تائید اور ترجیح شروع کرتے ہیں کیونکہ مکر و خداع اور تمسخر جو علی وجہ العبث (بلا وجہ) ہو بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی ذات سے منتفی ہے۔ ہاں انتقام، عدل و انصاف اور بدلے کے طور پر ہو تو یہ ممنوع نہیں۔ وہ لکھتے ہیں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کی تائید حضرت ابن عباس کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ آپ سے مروی ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ بطور انتقام ان سے استہزاء فرماتا ہے۔ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ یَمُدُّهُمْ: یُمْلِیْ لَهُمْ یعنی انہیں مہلت دیتا ہے۔ مجاہد کہتے ہیں انہیں زیادہ کر دیتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (المؤمنون:55-56)'' کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد (کی کثرت) سے تو ہم جلدی کر رہے ہیں انہیں بھلائیاں پہنچانے میں (یوں نہیں) بلکہ (حقیقت حال سے) بے خبر ہیں''۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (اعراف:182)'' تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا''۔

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ وہ جب بھی کوئی گناہ کرتے ہیں اس کے بدلے ان کو کوئی اور نعمت عطا کر دی جاتی ہے یہ فی الحقیقت ان سے انتقام ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ ...... وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ترجمہ: جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوشیاں منانے لگے اس پر جو انہیں دیا گیا تھا تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک۔ اب وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔ تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہان والوں کا"۔ ابن جریر فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ ہم انہیں ڈھیل دینے اور اپنی سرکشی اور بغاوت پر ترک کر کے زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (الانعام: 110) "اور ہم پھیر دیں گے ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو جس طرح وہ نہیں ایمان لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ اور ہم چھوڑ دیں گے انہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں"۔ طغیان کا معنی ہے کسی چیز میں بڑھ جانا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِيَةِ (الحاقہ: 11) "ہم نے جب سیلاب حد سے گزر گیا تو تمہیں کشتیوں میں سوار کر دیا"۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ اپنے کفر میں گرے جاتے ہیں۔ سدی نے اسی طرح صحابہ سے نقل کیا ہے، ابوالعالیہ، قتادہ، ربیع بن انس، مجاہد، ابو مالک اور عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے۔ فِیْ كُفْرِهِمْ وَضَلَالِهِمْ اپنے کفر اور گمراہی میں۔ ابن جریر فرماتے ہیں اَلْعَمَهُ: اَلضَّلَالُ: گمراہی۔ کہا جاتا ہے عَمِهَ فُلَانٌ يَعْمَهُ عَمَهًا وَعُمُوْهًا اِذَا ضَلَّ۔ (جب کوئی گمراہ ہو جائے تو یوں کہتے ہیں) فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ کا مطلب ہے اپنی گمراہی اور کفر میں جس کی ناپاکی ان پر چھا گئی ہے اور اس کی پلیدی ان پر غالب آ گئی ہے۔ وہ گمراہی میں حیران و پریشان اور متردد ہیں اور اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے کیونکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، ان کی آنکھوں کو ہدایت قبول کرنے سے نابینا کر دیا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ چنانچہ وہ ہدایت کو دیکھ نہیں سکتے اور اس کی طرف کوئی راہ نہیں پاتے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ عمی کا تعلق آنکھ سے ہے اور عمہ کا لفظ دل کے لئے آتا ہے۔ لیکن کبھی دل کے اندھے پن کے لئے بھی عمی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (الحج: 46) "کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں" اہل عرب کہتے ہیں۔ عَمِهَ الرَّجُلُ يَعْمَهُ عُمُوْهًا فَهُوَ عَمِهٌ وَعَامِهٌ وَجَمْعُهُ عُمَّهٌ (اس کی جمع عُمَّہ آتی ہے) اور کہتے ہیں ذَهَبَتْ اِبِلُهُ الْعَمْهَآءَ (یہ اس وقت کہتے ہیں جب انہیں جانے کی راہ معلوم نہ ہو)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

"(یہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے۔ مگر نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت اور وہ صحیح راہ نہ جانتے تھے"۔

سدی، ابو مالک، ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں انہوں نے گمراہی کو اختیار کر لیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابن عباس سے ایک دوسری روایت میں ہے انہوں نے ایمان کے بدلے کفر خرید لیا۔ مجاہد کہتے ہیں وہ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ قتادہ کا یہ قول معنی میں قوم ثمود کے بارے اس آیت کے مشابہ ہے: وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حٰمٓ السجدۃ: 17) "باقی رہے ثمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھائی۔ انہوں نے پسند کیا اندھے پن کو ہدایت پر) مفسرین کے

سابقہ اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین نے ہدایت سے گمراہی کی طرف اعراض کر لیا اور ہدایت کے عوض میں گمراہی لے لی۔ اس آیت کریمہ کا مفہوم یہی ہے کہ انہوں نے ہدایت بیچ کر گمراہی خرید لی۔ خواہ ایمان لا کر کفر کی طرف لوٹے ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (منافقون:3) ”(ان کا) یہ (طریق کار) اس لیے ہے کہ وہ (پہلے) ایمان لائے پھر وہ کافر بن گئے پس مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر“۔ یا انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو پسند کر لیا جیسے ان میں سے دوسرے فریق کا حال ہے پس ان کی چند اقسام ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ یعنی اس سودے میں انہیں نفع نہیں ہوا اور نہ ہی وہ ہدایت پر ہیں۔ حضرت قتادہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: بخدا تم نے انہیں دیکھ لیا کہ وہ ہدایت سے گمراہی کی طرف نکل گئے۔ اور جماعت سے علیحدگی کی طرف، امن سے خوف کی طرف، سنت سے بدعت کی طرف اور اس طرح۔ ابن ابی حاتم نے اسے روایت کیا ہے)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

”ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی۔ پھر جب جگمگا اٹھا اس کا آس پاس تو لے گیا اللہ ان کا نور اور چھوڑ دیا انہیں گھپ اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو وہ نہیں پھریں گے“۔

مثل کو مثل اور مثیل بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع امثال آتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (عنکبوت:43)“ ترجمہ: اور یہ مثالیں ہیں ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے۔ اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم“۔ اس تمثیل کی صورت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو تشبیہ دی ہے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے میں اور بصیرت کے بعد اندھا ہو جانے میں اس شخص کے ساتھ جس نے آگ جلائی۔ جب اس نے اردگرد کو روشن کر دیا اور اس نے اس سے نفع اٹھا لیا اور دائیں بائیں دیکھ لیا اور اس سے مانوس ہو گیا وہ اس حال میں تھا کہ یکایک اس کی آگ بجھ گئی۔ اور شدید اندھیرا چھا گیا۔ نہ تو نگاہ کام کرتی ہے اور نہ راستہ سجھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرا ہو سن نہ سکتا ہو گونگا ہو بول نہ سکتا ہو۔ روشنی میں اسے کچھ نظر نہ آتا ہو۔ یہی حال ان منافقین کا ہے جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی لی اور رشد پر ضلال کو ترجیح دی۔ اس مثال میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر کفر کیا جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت کسی دوسری جگہ کر دی ہے واللہ اعلم۔ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا رازی نے اپنی تفسیر میں سدی سے یہی نقل کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ تشبیہ بہت درست اور صحیح ہے کیونکہ پہلے انہوں نے ایمان کے بدلے نور حاصل کیا پھر اپنے نفاق سے اسے گم کر بیٹھے اور حیرت میں پڑ گئے۔ اور دین کی حیرت سے بڑی حیرت اور کیا ہو گی۔ ابن جریر کا قول ہے کہ جن کی اوپر مثال بیان کی گئی ہے وہ کسی وقت بھی ایمان نہیں لائے۔ اور بطور استدلال یہ آیت کریمہ پیش کی ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں ان کے کفر و نفاق کی خبر دی جا رہی ہے۔ اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ انہیں اس سے پہلے ایمان بھی حاصل ہوا تھا پھر یہ نعمت ان سے سلب کر لی گئی۔ اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ آئندہ آنے والی آیت کریمہ شاید ابن جریر کے ذہن میں نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (منافقون:3) اسی وجہ سے یہ مثال دی کہ ایمان قبول کرنے کی بنا پر ان کے لئے دنیا میں روشنی ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد قیامت کے دن تاریکی ہی تاریکی

ہے۔ کہتے ہیں کہ جماعت کی مثال ایک شخص سے دینا صحیح ہے جیسے فرمایا: رَاَیْتَہُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ تَدُوْرُ اَعْیُنُہُمْ کَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ (احزاب:19) ''تو آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ انکی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو''۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے ''مَاخَلْقُکُمْ وَلَا بَعْثُکُمْ اِلَّا کَنَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ'' (لقمان:28) ''نہیں ہے تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا (اللہ کے نزدیک) مگر ایک نفس کی مانند'' اور فرمایا: مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (جمعہ:5) ''ان کی مثال جنہیں تورات کا حامل بنایا گیا تھا پھر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا اس گدھے کی سی ہے جس نے بھاری کتابیں اٹھا رکھی ہوں''۔ بعض علماء کے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے ''مَثَلُ قِصَّتِهِمْ كَقِصَّةِ الَّذِیْنَ اسْتَوْقَدُوْا نَارًا''۔ یعنی ان کے واقعہ کی مثال اس قصہ والوں کی طرح ہے جنہوں نے آگ جلائی) بعض کہتے ہیں کہ آگ جلانے والا تو ایک ہے لیکن جلاتا ایک جماعت کے لئے ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اَلَّذِیْ یہاں الَّذِیْنَ کے معنی میں ہے جیسے ایک شاعر کا قول ہے ۔

وَاِنَّ الَّذِیْ حَانَتْ بِفَلْجٍ دِمَاؤُهُمْ هُمُ الْقَوْمُ کُلُّ الْقَوْمِ یَا اُمَّ خَالِدٍ

(میں کہتا ہوں) اس آیت میں مثال دیتے وقت واحد سے جمع کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ یہ کلام کے اعتبار سے فصیح اور اسلوب کے لحاظ سے بلیغ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ کا معنی ہے ان سے نفع مند چیز کو ختم کر دیا ہے اور وہ نور ہے اور نقصان دہ چیز کو ان کے لئے باقی رکھا ہے اور وہ دھواں اور آگ میں جلنا ہے۔ وَتَرَکَھُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ اس سے مراد شک، کفر اور نفاق ہیں جس میں وہ مبتلا ہیں۔ (لَّا یُبْصِرُوْنَ) ہدایت نہیں پاتے بھلائی کی راہ کی طرف اور نہ اسے پہچانتے ہیں۔ اور وہ اس کے ساتھ ساتھ ''صُمٌّ'' بہرے ہیں بھلائی کی بات نہیں سن پاتے ''بُکْمٌ'' نفع آور بات نہیں کرتے۔ ''عُمْیٌ'' گمراہی اور بصیرت سے محرومی میں ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (الحج:46) لہٰذا اس ہدایت کی طرف نہیں لوٹ سکتے جسے انہوں نے گمراہی کے بدلے بیچ دیا ہے۔

اسلاف مفسرین کے اقوال سے ہماری تائید

حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کرام سے مروی ہے: فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَہٗ کچھ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے پھر انہوں نے نفاق اختیار کر لیا۔ ان کی مثال اسی آدمی جیسی ہے جو اندھیرے میں تھا اس نے آگ جلائی۔ جب اردگرد کی ہر چیز روشن ہو گئی حتیٰ کہ اس نے دیکھ لیا کہ کس چیز سے بچنا ہے وہ اسی حال میں تھا کہ اس کی آگ بجھ گئی اب اسے معلوم نہیں کہ کس آلودگی سے بچنا چاہئے۔ یہ منافق ہے جو شرک کی تاریکیوں میں تھا پھر اسلام قبول کیا۔ حلال و حرام اور خیر و شر کو پہچان لیا۔ اسی دوران اس نے پھر کفر اختیار کر لیا نہ تو حلال و حرام میں تمیز کر سکتا ہے اور نہ خیر و شر میں۔ عوفی حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ نور سے مراد ان کا ایمان ہے۔ جس کا وہ ذکر کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت پر تھے پھر اسے ترک کر دیا۔ اور سرکشی اختیار کر لی۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ آگ روشن کرنے سے مراد ان کا مؤمنین اور ہدایت کی طرف توجہ کرنا ہے۔ عطاء خراسانی آیت کریمہ مَثَلُھُمْ کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا کی تفسیر میں فرماتے ہیں یہ منافق کی مثال ہے جو بعض اوقات پہچان لیتا ہے۔ اور دیکھ لیتا ہے پھر اس کا دل نابینا ہو جاتا ہے۔ ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ عکرمہ، حسن، السدی، الربیع بن انس کا قول

بھی عطاء خراسانی کی طرح ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں یہ منافقین کی صفات ہیں جو ایمان لائے حتیٰ کہ جب ایمان نے ان کے دلوں کو روشن کر دیا تھا پھر انہوں نے کفر کیا تو لے گیا اللہ ان کا نور اور اسے چھین لیا جس طرح اس آگ کی روشنی ختم ہوگئی تھی اور انہیں تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ ابن جریر کا قول حضرت ابن عباس کی اس روایت کے مشابہ ہے جسے علی بن ابوطلحہ نے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں یہ مثال ہے جو اللہ نے منافقین کے لئے بیان کی ہے کہ وہ اسلام سے عزت حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمان ان سے نکاح کرتے۔ ان کی میراث میں حصہ دار ہوتے اور مال فئی میں سے انہیں حصہ ملتا۔ جب وہ مر گئے تو اللہ نے ان کی اس عزت کو سلب کر لیا۔ جس طرح اس آگ والے کی روشنی ختم ہوگئی تھی حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ آگ کی روشنی اس کے بجھنے تک باقی رہتی ہے۔ اسی طرح منافق جب کلمہ اخلاص لا الہ الا اللہ پڑھتا ہے تو ارد گرد اس کے لئے روشن ہو جاتا ہے۔ جب شک میں مبتلا ہوتا ہے تو اندھیرے میں پڑ جاتا ہے ضحاک فرماتے ہیں: ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کہ نور سے مراد ان کا وہ ایمان تھا جو ان کی زبانوں پر تھا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ کلمۂ لا الہ الا اللہ ان کے لئے روشنی کر دیتا تھا۔ وہ کھاتے پیتے دنیا میں ایمان لاتے، نکاح کرتے اور اپنی جانوں کو محفوظ بنا لیتے حتیٰ کہ جب وہ مر گئے تو اللہ نے ان کے نور کو ختم کر دیا اور انہیں تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ حضرت قتادہ سے ہی ایک دوسری روایت ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ منافق نے جب لا الہ الا اللہ کہا تو اس نے دنیا اس کے لئے روشن کر دی اس کے ساتھ اس نے مسلمانوں سے نکاح کیے۔ ان کے ساتھ غزوات میں شریک رہا، میراث میں حصہ پایا۔ اور اسی کے سبب اپنی جان و مال کو محفوظ کیا۔ موت کے وقت منافق سے یہ نور سلب کر لیا گیا کیونکہ اس کے دل میں اس کی اصل نہ تھی اور نہ ہی اس کے عمل میں اس کی حقیقت تھی۔ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ابن عباس فرماتے ہیں تاریکیوں سے مراد یہاں عذاب ہے جو موت کے بعد ہوتا ہے۔ یہ لوگ حق کو دیکھتے ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب کفر کی تاریکی سے نکل جاتے ہیں تو پھر اپنے کفر و نفاق کے سبب اسے بجھا دیتے ہیں وہ نور حق انہیں کفر کی تاریکیوں میں چھوڑ دیتا ہے اور وہ ہدایت کو نہیں دیکھ پاتے۔ اور راہ حق پر گامزن نہیں رہ سکتے۔ سدی اپنی سند کے ساتھ اس آیت کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ تاریکی ان کا نفاق ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں یہ موت کے وقت کی طرف اشارہ ہے منافق کی بداعمالیاں اس وقت اس پر تاریکی کی طرح چھا جاتی ہیں۔ اس کے پاس کوئی ایسا نیک عمل نہیں بچتا جس کے ساتھ اس کے قول لا الہ الا اللہ کی تصدیق ہو۔ ''صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ'' سدی اپنی سند کے ساتھ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں وہ گونگے اور اندھے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں وہ ہدایت کو سنتے اور سمجھتے نہیں۔ ابوالعالیہ، قتادہ بن دعامہ کا قول بھی یہی ہے۔ ''فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ'' حضرت ابن عباس فرماتے ہیں ہدایت کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ ربیع بن انس نے بھی یہی کہا ہے۔ سدی فرماتے ہیں وہ اسلام کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

''یا پھر جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو بادل سے جس میں اندھیرے ہوں اور گرج اور چمک ہو ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے

کانوں میں کڑک کے باعث موت کے ڈر سے اور اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو قریب ہے کہ بجلی اچک لے جائے ان کی بینائی۔ جب چمکتی ہے ان کے لیے تو چلنے لگتے ہیں اس (کی روشنی) میں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے سننے کی قوت اور ان کی بینائی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے منافقین کی ایک دوسری قسم کے لئے یہ مثال بیان فرمائی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی حق کر ظاہر کرتے ہیں اور کبھی پھر شک میں پڑ جاتے ہیں ان کے دل ہر وقت شک، کفر اور تردد میں ہیں۔ "کَصَیِّبٍ" اَلصَّیِّبُ: اَلْمَطَرُ: بارش۔ ابن مسعود، ابن عباس، چند صحابہ کرامؓ۔ ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عطاء حسن بصری، قتادہ، عطیہ العوفی، عطاء خراسانی، سدی، ربیع بن انس کا یہی قول ہے۔ (رحمھم اللہ تعالیٰ) ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد بادل ہے لیکن زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ بارش ہے جو اندھیرے کی حالت میں آسمان سے اترتی ہے۔ یہ شک، کفر اور نفاق ہیں۔ اور "رعد" گرج ہے جو خوف سے دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ یہی حال منافق کا ہے وہ ہر وقت شدید خوف اور گھبراہٹ میں مبتلا رہتے ہیں جیسے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۞ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (توبہ:56-57) "اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر مل جائے کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو (دیکھئے گا) وہ منہ پھیر لیں گے اس طرف منہ زوری کرتے ہوئے"۔ (البرق) اس سے مراد وہ نور ایمان ہے جو بعض اوقات اس قسم کے منافقین کے دل میں چمک اٹھتا ہے۔ اسی لیے فرمایا: يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ "یعنی ان کی ہدایت انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ اس کی مشیت اور ارادہ کے تابع ہیں"۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۞ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ۞ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۞ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۞ (البروج:17 تا20) "کیا پہنچی ہے آپ کے پاس لشکروں کی خبر (یعنی) فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی بلکہ یہ کفار جھٹلانے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے) پھر فرمایا: يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے یہ اس کی شدت اور قوت اور ان کی بصارتوں کی کمزوری اور ایمان پر عدم ثبات کی وجہ سے ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں قریب ہے کہ قرآن کریم کی محکم آیتیں آ کر ان کی قلعی کھول دیں۔ آپ سے ہی ایک دوسری روایت میں ہے کہ نور حق کی شدت کی وجہ سے بھی ان کے لئے روشنی ہو جاتی ہے وہ اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب بھی ایمان میں سے کوئی چیز ان کے لئے ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ لیکن کبھی انہیں شک پڑتا ہے تو ان کے دلوں میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ وہ حیران و پریشان ٹھہر جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے: كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ جب کبھی اسلام کو عزت اور غلبہ ملے مطمئن ہو جاتے ہیں اور جب اسلام پر کوئی آزمائش آتی ہے تو وہ الٹے پاؤں کفر کی طرف لوٹنے لگتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ (حج:11) "اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اس سے"۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمہ پڑھنا ہے۔ اپنے اس قول میں وہ استقامت پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ الٹے پاؤں جب وہ کفر کی طرف لوٹتے ہیں تو حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔

ابو العالیہ، حسن بصری، قتادہ، ربیع بن انس کا یہی قول ہے سدی نے اپنی سند کے ساتھ صحابہ سے یہی نقل کیا ہے۔ واضح اور ظاہر قول بھی یہی ہے واللہ اعلم۔ روز قیامت بھی ان کا یہی حال ہوگا۔ جب لوگوں کو ان کے حسب ایمان نور عطا کیا جائے گا تو اس نور کے ساتھ کسی کے لئے چند فرسخ تک روشنی ہو جائے گی۔ کسی کے لیے زیادہ اور کسی کے لئے کم۔ کسی کا نور کبھی روشن ہوگا اور کبھی بجھ جائے گا۔ پل صراط پر کچھ دیر کے لئے چلیں گے اور پھر رک جائیں گے۔ بعض کا نور مکمل طور پر بجھ جائے گا یہ خالص منافقین ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (حدید:13) ''اس روز کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے (اے نیک بختو!) ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کر لیں تمہارے نور سے۔ (انہیں) کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور (وہاں) نور تلاش کرو''۔ اور مومنین کے بارے میں ارشاد فرمایا: يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ...... (حدید:12) ''(جس روز آپ دیکھیں گے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو کہ ضوفشانی کر رہا ہوگا ان کا نور ان کے آگے بھی اور ان کی دائیں جانب بھی۔ (مومنو!) تمہیں مژدہ ہو آج ان باغوں کا بہہ رہی ہیں جن کے نیچے نہریں'' اور فرمایا: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تحریم:8) ''اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے) (اس روز ان کا نور ایمان دوڑتا ہوگا ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب، وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! مکمل فرما دے ہمارے لئے ہمارا نور اور بخش دے ہمیں۔ بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔

اس مضمون کی تائید میں وارد شدہ احادیث کا بیان

حضرت قتادہ آیت کریمہ: يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ...... (الحدید:12) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہمارے سامنے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے مؤمنین میں سے بعض کا نور مدینہ سے لے کر عدن تک ہوگا۔...... بعض کا اس سے کم حتیٰ کہ بعض کے صرف پاؤں رکھنے کی جگہ ہی روشن ہوگی۔ اس حدیث کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ مومنین کو ان کے اعمال کے بقدر نور عطا کیا جائے گا۔ بعض کو کھجور کے درخت کے برابر نور ملے گا۔ بعض کو قد آدم کے برابر سب سے کم نور اس کا ہوگا جسے انگوٹھے میں عطا ہوگا جو کبھی روشن ہوگا کبھی بجھ جائے گا ابن جریر نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم عبداللہ بن مسعود سے نقل کرتے ہیں کہ اپنے اعمال کے برابر وہ پل صراط سے گذریں گے۔ بعض کا نور پہاڑ کی طرح ہوگا۔ بعض کا کھجور کے برابر، اور سب سے کم نور اس شخص کا ہوگا جس کے انگوٹھے میں ہوگا۔ کبھی چمکنے لگے گا کبھی بجھ جائے گا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ قیامت کے دن موحدین میں سے ہر ایک کو نور عطا کیا جائے گا۔ رہے منافق تو ان کا نور بجھ جائے گا۔ تو مومن ڈر کر کہیں گے مولیٰ ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ (ابن ابی حاتم) ضحاک بن مزاحم کا قول ہے کہ قیامت کے دن ہر ایمان ظاہر کرنے والے کو نور ملے گا۔ جب وہ پل صراط پر پہنچیں گے تو منافقین کا نور بجھ جائے گا۔ جب مومنین یہ صورت حال دیکھیں گے تو ڈر کر کہیں گے۔ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (التحریم:8) ''اے رب مکمل فرما دے ہمارے لئے ہمارا نور''۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کئی قسم کے لوگ ہوں گے۔ (۱) مومن مخلص یہ وہ لوگ ہیں جن کی صفات سورۂ بقرہ کے آغاز میں چار آیات میں بیان ہوئی ہیں۔ (۲) کفار خاص:۔ (خالص کفار) جن کا ذکر

اس کے بعد والی دو آیتوں میں ہے۔ (۳) منافقین: ان کی دو قسمیں ہیں۔ (ا) خالص منافق:۔ جن کی مثال آگ کی روشنی سے دی گئی ہے۔ (ب) مذبذب منافق:۔ جو تردد میں ہیں کبھی ایمان کی روشنی ان کے لئے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی بجھ جاتی ہے۔ ان کی مثال بارش والوں سے دی گئی ہے یہ پہلی حالت والوں سے ہلکے ہوتے ہیں۔ یہ تشبیہ بعض صورتوں میں اس تشبیہ کے مشابہ ہے جس کا ذکر سورۂ نور میں آیا ہے۔ جس میں مومن اور اس کے دل میں اللہ نے جو نور اور ہدایت ودیعت فرمائی ہے کو شیشے میں چراغ سے۔ وہ شیشہ (فانوس) گویا ایک ستارہ ہے جو موتی کی طرح چمک رہا ہے۔ یہ بندۂ مومن کا دل ہے جو ایمان کی فطرت پر ہے اور شریعت کے چشمہ ہدایت سے فیض یاب ہو رہا ہے (اس کا تفصیلی بیان اپنی جگہ آئے گا ان شاء اللہ) پھر کافر بندوں کی مثال دی جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ کچھ ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں۔ وہ تو جہل مرکب ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا (نور:39) ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہو کسی چٹیل میدان میں خیال کرتا ہے اسے پیاسا کہ وہ پانی ہے حتیٰ کہ جب (پینے کے لئے) اس کے قریب آتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا''۔ پھر ان کفار کی مثال دی جو جہل بسیط میں گرفتار ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (النور:40) ''یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں چھا رہی ہوتی ہے اس پر موج، اس کے اوپر ایک اور موج (اور) اس کے اوپر بادل۔ (تہ در تہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۔ جب وہ نکالتا ہے اپنا ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے۔ اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لئے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے تو اس کے لئے کہیں نور نہیں''۔ پھر کفار کو دو اقسام میں تقسیم کیا۔ (1) **داعیۃ** (کفر کی طرف بلانے والے (2) **مقلد** (تقلید کرنے والے)۔ جس طرح سورۂ حج کی ابتدا میں ان کا ذکر آیا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِـعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ (حج:3) ''اور بعض لوگ ایسے ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم کے بغیر اور پیروی کرتے ہیں ہر سرکش شیطان کی''۔ اور فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (حج:8) ''اور انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر علم اور بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے''۔

سورۂ واقعہ کی ابتدا اور آخر میں اور سورۂ انسان (دہر) میں مومنین کی دو قسمیں بیان فرمائیں۔

(1) سابقون اور یہ مقربین ہیں۔ (2) اصحاب یمین: یہ نیک لوگ ہیں۔

ان آیات میں مجموعی طور پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مومنین کی دو قسمیں ہیں۔ (1) مقربین۔ (2) ابرار (نیک لوگ) اور کفار کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (1) دُعاۃ (کفر کی طرف دعوت دینے والے) (2) مقلدین۔ اور منافقین کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (1) خالص منافق (2) جس میں نفاق کا اثر ہو۔ جیسے صحیحین کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس میں تین علامات پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان تین میں سے کوئی ایک ہو اس میں نفاق کی خصلت موجود ہے حتیٰ کہ اسے چھوڑ دے۔ جو شخص جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔ اور جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے'' (1)۔ اس حدیث سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ بعض اوقات انسان میں ایمان کا کوئی شعبہ ہوتا ہے یا نفاق کا کوئی حصہ ہوتا ہے۔ خواہ عملی ہو (جیسے اس حدیث میں ہے) یا اعتقادی۔ جیسے آیت کریمہ میں ہے۔ سلف کی ایک جماعت اور علماء کرام کے ایک گروہ

1۔ شرح السنۃ: 73/1

کا مذہب یہی ہے۔ (اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ)

حضرت امام احمد حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''دل چار ہیں۔ (1) صاف دل جس میں چراغ چمک رہا ہو۔ (2) وہ دل جس پر غلاف چڑھا ہوا ہو۔ (3) وہ دل جو الٹا ہو۔ (4) وہ دل جو دوغلا (مخلوط) ہو۔ صاف دل مومن کا ہے۔ اس کا چراغ اس کا نور ہے۔ غلاف والا دل کافر کا ہے۔ الٹا دل خالص منافق کا ہے۔ جس نے پہچان لینے کے بعد انکار کر دیا۔ مخلوط دل منافق کا ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں ہیں۔ ایمان کی مثال اس سبزہ کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہو۔ اور نفاق کی مثال اس زخم کی طرح ہے جس سے خون اور پیپ بہہ رہی ہو۔ اب جو مادہ بڑھ جائے دوسرے پر غالب آ جاتا ہے۔'' (اس کی اسناد بہت عمدہ ہے)(1)۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جب انہوں نے حق کو پہچان لینے کے بعد اسے چھوڑ دیا تو اگر اللہ چاہے تو ان کی آنکھوں اور کانوں کو ختم کر دے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے انتقام لینا چاہے یا معاف کرنا چاہے قادر ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اپنے آپ کو ہر چیز پر قادر ہونے سے متصف فرمایا ہے کیونکہ اس نے منافقین کو اپنی شوکت اور سطوت سے خبردار کیا ہے۔ (اور انہیں آگاہ کیا ہے) کہ وہ انہیں محیط ہے۔ اور ان کے کانوں اور آنکھوں کو ختم کر دینے پر قادر ہے۔ قدیر کا معنی قادر ہے۔ جیسے علیم کا معنی عالم ہے۔ ابن جریر اور ان کی اتباع میں دوسرے بہت سے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ دونوں مثالیں منافقین کی ایک ہی قسم کی ہیں۔ اور کلمہ (اَوْ) آیت کریمہ: اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ میں واؤ کے معنی میں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ (الدہر:24) ''اور نہ کہنا مانئے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا'' یا لفظ او تخییر (اختیار دینا) کے لئے ہے یعنی اِضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا بِهٰذَا وَ اِنْ شِئْتَ بِهٰذَا ان دونوں مثالوں میں سے جو چاہو ان کے لئے بیان کرو۔ قرطبی کا قول ہے کہ اَوْ یہاں تساوی (مساوات ظاہر کرنے) کے لئے ہے۔ جیسے کہتے ہیں (جَالِسِ الْحَسَنَ اَوِ ابْنَ سِیْرِیْنَ) اس کی توجیہ کرتے ہوئے زمخشری لکھتے ہیں کہ حسن اور ابن سیرین علمی مقام، مرتبہ میں برابر ہیں تم دونوں میں سے کسی کے پاس بھی زانوئے تلمذ طے کر سکتے ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم ان کے لئے یہ مثال بیان کر دیا وہ دونوں ان کے حال کے مطابق ہیں۔ (میں کہتا ہوں) یہ منافقین کی جنس کے اعتبار سے ہے۔ ان کی چند اصناف ہیں اور پھر ان کے احوال وصفات ہیں جس طرح کہ اللہ نے سورۂ براءت (توبہ) میں ومنهم، ومنهم اور ومنهم کر کے ان کی صفات واحوال اور اقوال وافعال بیان کیے ہیں۔ تو یہ دو مثالیں دو اقسام کی ہیں جن کے احوال وصفات میں شدید مطابقت ہے۔ واللہ اعلم جیسے سورۂ نور میں کفار کی دو صنفوں (داعی اور مقلد) کی مثال دی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یہاں تک کہ فرمایا: اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ...... (نور:39-40) پہلی مثال کفر کی طرف بلانے والوں کی ہے جو جہل مرکب میں ہیں۔ اور دوسری مثال جہل بسیط والوں کی ہے جو ان کے پیروکار ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

1۔ مسند امام احمد: جلد 3، صفحہ 17

''اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ وہ جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لیے پس نہ ٹھیراؤ اللہ کے لئے مدمقابل۔ اور تم جانتے ہو''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے توحید الوہیت پر استدلال قائم فرمایا کہ وہی ذات وحدہ لاشریک ہے جس نے اپنے بندوں پر احسان کرتے ہوئے انہیں عدم سے وجود بخشا اور ان پر ظاہری و باطنی نعمتوں کی فراوانی فرمائی۔ زمین کو ان کے لئے بچھونا بنایا۔ اس میں بلند و بالا پہاڑ نصب فرمائے آسمان کو چھت بنایا جیسے ایک اور آیت کریمہ میں ہے: وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّ هُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (انبیاء: 32) ''اور بنایا ہم نے آسمان کو ایک چھت جو (شکست و ریخت سے) محفوظ ہے۔ اور وہ لوگ (اب بھی) اس کی نشانیوں سے روگردانی کیے ہوئے ہیں''۔ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً یہاں اس سے مراد بادل ہے۔ اس وقت بھیجا جب لوگوں کو اس کی شدید ضرورت تھی۔ اس سے انواع واقسام کی کھیتیاں اور پھل پیدا فرمائے جو ان کی اور ان کے جانوروں کی خوراک ہے۔ جس طرح کہ قرآن کریم میں کسی دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے اس آیت کے مشابہ ترین یہ آیت ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (مومن: 64) ''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے زمین کو قیام کی جگہ اور آسمان کو چھت (کی مانند) اور تمہاری صورت گری کی اور حسین بنادیا تمہاری صورتوں کو اور کھانے کے لیے تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں ایسی خوبیوں والا تمہارا پروردگار ہے۔ پس بڑی ہی برکتوں والا ہے اللہ تعالیٰ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے''۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ وہی خالق و رازق ہے وہی دنیا و مافیھا کا مالک اور روزی رساں ہے۔ چنانچہ وہی اس بات کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ اسی لیے فرمایا: فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مدمقابل اور تم جانتے ہو۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں نے عرض کی یارسول اللہ! اللہ کے نزدیک کون سا گناہ سب سے بڑا ہے۔ فرمایا کہ تو اللہ کے لئے بنائے مدمقابل حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔...... الحدیث(1)۔ اسی طرح حدیث معاذ میں ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ یہ کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں(2)...... الحدیث۔ ایک اور حدیث میں ہے ''تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے بلکہ یوں کہے جو اللہ چاہے پھر جو فلاں چاہے''(3)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوتیلے بھائی طفیل بن سنجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے خواب دیکھا کہ میرے پاس چند یہودی آئے۔ میں نے پوچھا تم کون ہو؟ وہ کہنے لگے ہم یہود ہیں۔ میں نے کہا کاش تمہاری قوم حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا نہ کہتی۔ وہ کہنے لگے کاش تم یہ نہ کہتے جو اللہ چاہے اور محمد (ﷺ) چاہیں۔ کہتے ہیں پھر میں نصاریٰ کے ایک گروہ کے پاس سے گذرا۔ میں نے پوچھا تم کون ہو؟ وہ کہنے لگے ہم نصرانی ہیں۔ میں نے کہا افسوس تم نہ کہتے مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ انہوں نے کہا تم ایک قوم ہو۔ کاش تم یہ نہ کہتے ''مَاشَآءَ اللّٰهُ وَ شَآءَ مُحَمَّدٌ'' میں نے صبح اس خواب کا ذکر چند لوگوں سے کیا پھر بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر سارا خواب عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے کسی اور کو یہ خواب سنایا ہے۔ میں نے عرض کیا ہاں۔ آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اللہ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا امابعد، طفیل نے ایک خواب دیکھا ہے اور تم میں سے بعض کو بیان بھی کیا ہے میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس کلمہ کے کہنے سے روک دوں

1۔ البخاری: 186/5　2۔ البخاری: 130/8　3۔ الشفاء: 64/1

لیکن فلاں فلاں مصروفیت کی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔ اب ایسے نہ کہا کرو (مَاشَآءَ اللّٰہُ وَ مُحَمَّدٌ) جو اللہ چاہے اور اس کا رسول۔ بلکہ صرف یوں کہا کرو ''ماشاء اللہ'' جو اللہ چاہے''(1)۔ ابن مردویہ نے اس حدیث کو اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں اور ابن ماجہ نے ایک دوسری سند سے بیان کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یوں کہا۔ مَاشَآءَ اللّٰہُ وَ مَاشِئْتَ جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے مجھے اللہ کا مدمقابل بنا دیا ہے؟ یوں کہہ ''ماشاء اللہ'' ابن مردویہ نے اسے روایت کیا ہے۔ نسائی اور ابن ماجہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ یہ سب کچھ توحید کی حفاظت اور رعائت کے لئے کیا گیا ہے واللہ اعلم۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ دونوں فریق کفار اور منافقین کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ اپنے رب کی توحید بیان کرو جسنے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں فَلَا تَجْعَلُوْا: یعنی اللہ کے ساتھ کوئی دوسرے مدمقابل شریک نہ ٹھہراؤ جو نفع و نقصان پر قادر نہیں حالانکہ تم جانتے ہو کہ اس رب کے علاوہ کوئی تمہیں روزی دینے والا نہیں۔ اور وہ توحید جس کی طرف رسول کریم ﷺ تمہیں بلاتے ہیں وہ حق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ قتادہ کا قول بھی یہی ہے۔ ابن ابی حاتم اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں انداد سے مراد وہ شرک ہے جو تاریک رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کہے قسم ہے اللہ کی اور اے فلاں تیری زندگی کی۔ اور کہے اگر یہ کتیا نہ ہوتی تو گذشتہ رات چور ہمارے گھر گھس آتے۔ اگر بطخ گھر میں نہ ہوتی تو چور ضرور آتے اور آدمی کا اپنے ساتھی کو یہ کہنا جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔ اور آدمی کا یہ کہنا ''اگر اللہ نہ ہوتا اور فلاں۔'' ان سب کے ساتھ کلمہ فلاں کو شامل نہ کرو۔ یہ سب شرک ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کو عرض کی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا ایک اور حدیث میں ہے تم کتنی اچھی قوم ہو اگر تم شریک نہ ٹھہراتے ہو۔ اور یہ نہ کہتے ہو (مَاشاء اللہ وشآء فلان) ابو العالیہ کا قول ہے انداد کا معنی ہے۔ برابر اور شریک۔ ربیع بن انس، قتادہ، سدی، ابو مالک، اسماعیل بن ابی خالد نے یہی کہا ہے۔ مجاہد کا قول ہے: وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اور تم جانتے ہو کہ وہ ایک ہی معبود ہے تورات اور انجیل میں۔

آیت کریمہ کے مفہوم کی تائید حدیث مبارکہ سے

حضرت امام احمد لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔'' اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو حکم دیا کہ پانچ کلمات پر عمل کریں اور بنو اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیں۔ قریب تھا کہ وہ اس میں تساہل سے کام لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا آپ کو پانچ کلمات پر عمل کرنے اور انہیں بنو اسرائیل کو سکھانے کا حکم دیا گیا تھا۔ پس یا تو آپ خود پہنچا دیں یا میں پہنچا دوں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا اے بھائی مجھے خدشہ ہے کہ اگر تم مجھ سے سبقت لے گئے تو مجھ پر عذاب نازل ہو یا مجھے زمین میں دھنسا دیا جائے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام نے بنو اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا۔ جب مسجد بھر گئی تو بلند جگہ (منبر پر) بیٹھ گئے اللہ کی حمد وثناء کی اور فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ پانچ کلمات پر کاربند رہوں اور تمہیں ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دوں۔ ان میں پہلا کلمہ یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ بے شک اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنے خالص مال خواہ سونا ہو یا چاندی سے کوئی غلام خریدے وہ غلام مزدوری کرنا شروع کر دے اور آمدنی آقا کے علاوہ کسی اور کو دے دے۔ تم میں سے کسے یہ پسند ہے کہ اس کا غلام اس طرح ہو۔ بے شک اللہ نے تمہیں پیدا کیا۔ اور تمہیں رزق دیا۔ پس اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو

1۔ ابن ماجہ: 2117

شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور تمہیں نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ کا منہ بندے کی طرف ہوتا ہے جب تک ادھر ادھر التفات نہ کرے۔ پس جب تم نماز پڑھو تو ادھر ادھر نہ دیکھو اور تمہیں روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جس کے پاس کستوری سے بھری تھیلی ہو جس سے اس کے ساتھیوں کے دماغ معطر رہیں۔ بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے ہاں کستوری سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔ اور تمہیں صدقہ دینے کا حکم دیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دشمن گرفتار کرلیں۔ اس کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ دیں۔ اور قتل کرنے کے لئے لے چلیں تو وہ انہیں یہ کہے کہ تم میری جگہ فدیہ لے لو۔ چنانچہ اپنی طرف سے فدیہ وے کر خواہ کم ہو یا زیادہ اس نے اپنی جان چھڑالی۔ پانچواں کلمہ یہ ہے کہ اس نے تمہیں بکثرت اللہ کا ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی مثال اس طرح کہ دشمن تیزی سے کسی شخص کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ ایک مضبوط قلعہ میں داخل ہو کر قلعہ بند ہو جاتا ہے۔ بندہ جب اللہ کے ذکر میں ہوتو شیطان سے اس شخص سے بھی زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں بھی تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں اللہ نے جن کا مجھے حکم دیا ہے۔ مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا۔ سمع وطاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ۔ جو جماعت سے ایک بالشت برابر بھی ادھر ادھر ہوا اس نے اسلام کا پٹا اپنے گلے سے اتار اپھینکا مگر جب وہ رجوع کرلے۔ جو جاہلیت کا دعوی کرے وہ جہنم کا ایندھن ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! اگرچہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور یہ گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ مسلمانوں کو انہیں ناموں سے پکارو جو خود اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں۔ مسلمین، عباد اللہ مومنین' (1)۔ یہ حدیث حسن ہے اس آیت میں اس کا شاہد یہ حصہ ہے "وَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ فَاعْبُدُوْهُ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا"۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ صرف خدا تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہے جو ہر لحاظ سے وحدہ لاشریک ہے۔

بہت سے مفسرین مثلاً امام رازی وغیرہ نے اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے وجود پر استدلال قائم کیا ہے۔ فی الواقع یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ جو ان سفلی وعلوی موجودات، اشکال، رنگوں، طبیعتوں کے اختلاف، ان کے منافع اور ان کے باعث نفع ہونے پر غور وفکر کرتا ہے وہ اس خالق کی قدرت، حکمت، علم واتقان اور عظیم سطوت کو بخوبی جان لیتا ہے۔ جیسے کسی اعرابی سے جب اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلیل پوچھی گئی تو اس نے کہا سبحان اللہ! مینگنی اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ پاؤں کے نشانات کسی کے وہاں سے گذرنے پر دلیل ہوتے ہیں تو برجوں والا آسمان، راستوں والی زمین اور موجوں والے سمندر اس لطیف وخبیر کے وجود پر دلیل نہ ہوں گے۔ رازی نے امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ آپ سے اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں پوچھا۔ تو آپ نے زبانوں اور لہجات کے مختلف ہونے سے وجود باری تعالیٰ پر استدلال قائم کیا۔ بعض زنادقہ نے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے خدا تعالیٰ کے وجود کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا ٹھہرو میں اس وقت ایک معاملے کے بارے میں غور وفکر کر رہا ہوں لوگوں نے مجھے کہا ہے کہ سمندر میں ایک بہت بڑی کشتی ہے اس میں انواع واقسام کی تجارتی چیزیں ہیں۔ نہ کوئی اس کا محافظ ہے اور نہ کوئی ملاح۔ اس کے باوجود وہ خود بخود آجا رہی ہے وہ بڑی بڑی موجوں کو چیرتی ہوئی گذر جاتی ہے اور جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے کوئی اسے چلانے والا نہیں۔ وہ دہریئے جو سوال کرنے آئے تھے کہنے لگے کوئی عقلمند ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ امام صاحب نے فرمایا تو یہ کارخانہ حیات جس میں عالم علوی اور سفلی اور اس میں بے شمار اشیاء ہیں کیا اس کا کوئی صانع نہ ہوگا۔ یہ سننا تھا کہ وہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔ حق کی طرف لوٹ آئے اور آپ کے دست مبارک پر مسلمان ہو گئے۔ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے خالق کائنات کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ توت کے درخت کے پتے

1۔ مسند احمد: 130/4

ایک ہی ہیں۔ کیڑے انہیں کھاتے ہیں تو ان سے ریشم بنتا ہے۔ شہد کی مکھی اسے کھا کر شہد تیار کرتی ہے، بکری، گائے اور دیگر جانور گوبر کرتے ہیں۔ ہرن کھاتے ہیں تو اس سے کستوری بنتی ہے۔ حالانکہ وہ درخت ایک ہی ہے (جو ان سب کی خوراک ہے) حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ سے یہی سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ایک بہت مضبوط چکنا قلعہ ہے جس کا کوئی دروازہ یا راستہ نہیں اس کا ظاہر سفید چاندی کی طرح اور باطن خالص سونے کی طرح ہے۔ وہ اسی حالت میں ہے کہ ایک دیوار گرتی ہے اس میں سے ایک حسین وجمیل خوشنما آواز والا سننے اور دیکھنے والا جانور باہر نکل آتا ہے۔ اس سے آپ کی مراد انڈہ تھی جب اس میں سے چوزہ نکلے۔ (آپ کا مطلب یہ تھا کہ انڈہ جو کہ چاروں طرف سے بند ہے پھر بھی اس میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے یہ لازماً کسی صانع کی کاریگری ہے) ابونواس سے یہ سوال کیا گیا تو اس نے کہا۔

تَاَمَّلْ فِیْ نَبَاتِ الْاَرْضِ وَ انْظُرْ ۔۔۔ اِلٰی آثَارِ مَا صَنَعَ الْمَلِیْکُ
عُیُوْنٌ مِنْ لُجَیْنٍ شَاخِصَاتٌ ۔۔۔ بِاَحْدَاقٍ هِیَ الذَّهَبُ السَّبِیْکُ
عَلٰی قُضُبِ الزَّبَرْجَدِ شَاهِدَاتٌ ۔۔۔ بِاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ لَهٗ شَرِیْکُ

ابن المعتز کا قطعہ ہے۔

فَیَا عَجَبًا کَیْفَ یُعْصٰی الْاِلٰهُ ۔۔۔ اَمْ کَیْفَ یَجْحَدُهُ الْجَاحِدُ
وَ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ آیَةٌ ۔۔۔ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدُ

"تعجب ہے آدمی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کس طرح کرتا ہے یا منکر اس کا انکار کیسے کرتا ہے۔ حالانکہ ہر چیز اس کے وحدہ لاشریک ہونے پر گواہ ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جو شخص آسمانوں کی بلندی اور وسعت میں غور کرتا ہے اور اس میں بڑے بڑے ستارے اور چھوٹے چھوٹے روشن سیارے دیکھتا ہے وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ کس طرح سب ایک بڑے مدار میں رات دن میں ایک چکر لگا رہے ہیں حالانکہ خود ان کی اپنی حرکت بھی ہے۔ اور وہ سمندر جو زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور وہ پہاڑ جو زمین میں گڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کے باشندے واشکال والوان کے اختلاف کے باوجود اس میں رہائش پذیر ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِیْبُ سُوْدٌ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:28-27)" اور پہاڑوں سے بھی رنگ رنگ کے ٹکڑے ہیں۔ کوئی سفید، کوئی سرخ مختلف رنگوں میں (کوئی شوخ، کوئی مدھم) اور بعض حصے سخت سیاہ اور انسانوں، چارپایوں اور جانوروں کے رنگ بھی اسی طرح جدا جدا ہیں۔ اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی پوری طرح اس سے ڈرتے ہیں"۔ اسی طرح یہ دریا جو ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف بہتے ہیں۔ جو باعث منفعت ہیں۔ اور زمین پر طرح طرح کے حیوانات اور مختلف ذائقوں، خوشبوؤں، شکلوں اور رنگوں والی نباتات حالانکہ وہ ایک ہی مٹی اور پانی سے پیدا ہوئے ہیں یہ سب کسی صانع ہستی کے وجود اور اس کی عظیم قدرت وحکمت کی دلیل ہیں۔ اس کا اپنی مخلوق پر رحم کرنا، ان پر بے پایاں الطاف اور لامحدود نوازشات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود اور رب نہیں۔ اسی پر میں توکل کرتا ہوں اور اسی کی طرف لوٹتا ہوں۔ اس موضوع کی تائید میں بے شمار آیات کریمہ موجود ہیں۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

''اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا اپنے برگزیدہ بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی اور بلا لو اپنے حمائتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔''

اپنی الوہیت و وحدانیت پر دلیل قائم کرنے کے لیے حضور علیہ السلام کی نبوت (و رسالت) کی دلیل شروع کی۔ کفار کو مخاطب کر کے فرمایا اگر تمہیں اس کلام معجز بیان میں جو ہم نے اپنے بندے محمد علیہ السلام پر نازل کیا ہے کچھ شبہ ہے تو اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ۔ اگر تم یہ گمان کرتے ہو کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں تو اس جیسا کلام بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے حامیوں میں سے جس سے چاہو مدد لے لو۔ تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں شہداء کم سے مراد تمہارے اعوان و انصار ہیں۔ ابو مالک کا قول ہے شرکاءکم سے مراد کوئی دوسری قوم جو اس پر تمہاری معاونت کریں یعنی اپنے (جھوٹے) معبودوں سے مدد و نصرت طلب کرو۔ مجاہد فرماتے ہیں (وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ) کہ تم اپنے فصیح و بلیغ حکام سے بھی مدد لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک سے زائد جگہ پر انہیں یہ چیلنج دیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے: قُلۡ فَاۡتُوۡا بِكِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ هُوَ اَهۡدٰى مِنۡهُمَاۤ اَتَّبِعۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (قصص: 49) ''آپ فرمائیے تم لے آؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو زیادہ ہدایت بخش ہو ان دونوں (قرآن و تورات) سے تو میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو''۔ سورۂ سجان (بنی اسرائیل) میں ہے۔ قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا (بنی اسرائیل: 88) ''(بطور چیلنج) کہہ دو کہ اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو ہرگز نہیں لا سکیں گے اس کی مثل اگرچہ وہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار'' اور سورۂ ہود میں فرمایا: اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (ہود: 13) ''کیا کفار کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن خود) گھڑ لیا ہے۔ آپ فرمائیے (اگر ایسا ہے) تو تم بھی لے آؤ دس سورتیں اس جیسی گھڑی ہوئی اور بلا لو (اپنی مدد کے لئے) جس کو بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم (اس الزام تراشی میں) سچے ہو''۔ سورۂ یونس میں فرمایا: وَمَا كَانَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ اَنۡ يُّفۡتَرٰى مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰـكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَتَفۡصِيۡلَ الۡكِتٰبِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۳۷﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (یونس: 37-38) ''اور نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑ لیا گیا ہو اللہ تعالیٰ (کی وحی کے آئے بغیر) بلکہ یہ تو تصدیق کرنے والا ہے اس وحی کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اور کتاب کی تفصیل ہے ذرا شک نہیں اس میں کہ رب العالمین کی طرف سے (اتری) ہے۔ کیا یہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے اسے۔ آپ فرمائیے پھر تم بھی لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور (امداد کے لئے) بلا لو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو''۔ یہ سب آیات مکی ہیں پھر مدینہ منورہ میں بھی ان کو چیلنج دیا اور یہ آیت نازل ہوئی: وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ اگر تم شک میں ہو مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا جو ہم نے اپنے بندے محمد (علیہ السلام) پر اتارا ہے: فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ تو قرآن کی مثل ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ۔ مجاہد اور قتادہ نے یہی کہا ہے۔ ابن جریر طبری، زمخشری اور رازی نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ حضرات عمر، ابن مسعود، ابن عباس، حسن بصری اور اکثر محققین سے بھی رازی نے

یہی نقل کیا ہے اور چند وجوہات کی بنا پر اسے ترجیح دی ہے۔ ان میں سب سے بہترین توجیہ یہ ہے کہ اس نے ان سب کو چیلنج دیا ہے علیحدہ علیحدہ بھی اور مشترکہ طور پر بھی۔ امی اور کتابی (ان پڑھ اور پڑھے لکھے) اس میں برابر ہیں یہ چیلنج کی سب سے اکمل صورت ہے بجائے اس کے کہ کسی ان پڑھ (امی) کو جو لکھ نہیں سکتا اور علوم معارف سے بھی اسے کوئی واقفیت نہیں چیلنج دیا جاتا۔ (تو یہ کوئی قابل فخر بات نہ ہوتی) اس کی دلیل قرآن کی مذکورہ بالا آیات کے یہ صیغے ہیں (فَأْتُوْا ، وَلَا يَأْتُوْنَ) چونکہ یہ جمع ہیں اس لیے یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ چیلنج سب کو ہے کسی ایک فرد کو نہیں۔ بعض علماء نے مثل سے مراد حضور ﷺ کی ذات لی ہے یعنی محمد ﷺ جیسے آدمی سے۔ لیکن صحیح قول پہلا ہے۔ کیونکہ چیلنج (جیسا کہ اوپر گزرا) سب کو ہے کسی مخصوص فرد کو نہیں باوجود یکہ وہ فصاحت و بلاغت میں تمام امتوں کے سردار تھے۔ اور قرآن کریم نے مکہ اور پھر مدینہ میں انہیں بار بار اس کی نظیر لانے کا چیلنج دیا تھا۔ حضرت محمد ﷺ سے اپنی شدید عداوت، دین اسلام سے شدید بغض کے باوجود وہ اس کی مثل کلام لانے سے عاجز رہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک فرمادیا: فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا'' ترجمہ: پھر اگر ایسا نہ کرسکو اور ہرگز ایسا نہ کرسکو گے''۔ لن یہ مستقبل میں نفی کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ یعنی تم ہمیشہ ایسا نہ کرسکو گے یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قطعی پیشین گوئی فرمادی کہ اس قرآن کا مثل ابد الآباد تک نہیں لایا جاسکتا۔ فی الواقع ایسا ہی ہوا آج تک کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ ایسا کوئی کر بھی کیسے سکتا ہے جبکہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے جو ہر چیز کا خالق ہے۔ مخلوق کی کلام خالق کی کلام کے مشابہ کیسے ہوسکتی ہے۔ جو بھی قرآن کریم میں غور وتدبر کرتا ہے اعجاز کی کوئی وجہ ضرور پاتا ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی، لفظی ہو یا معنوی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (الف۔ لام۔ را۔ یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنادی گئی ہیں جس کی آیتیں پھر ان کی وضاحت کردی گئی ہے۔ بڑے دانا اور ہر چیز سے باخبر (خدا) کی طرف سے'' (ہود:1)۔ اس کے الفاظ پختہ ومحکم ہیں، معانی مفصل ہیں یا اس کے برعکس (الفاظ مفصل اور معانی محکم) اس کا ہر لفظ اور معنی فصیح ہے نہ اسے چیلنج کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے بدلا جاسکتا ہے۔ زمانہء ماضی کے واقعات کی ہو بہو خبر دی ہے۔ ہر خیر کا حکم دیا ہے اور شر سے روکا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (انعام:115)'' اور مکمل ہوگئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے''۔ یعنی سچائی خبروں میں اور عدل احکام میں۔ وہ کلام سارے کا سارا حق وصداقت اور عدل وہدایت کا مجموعہ ہے نہ تو اس میں اٹکل پچو اور تخمینے سے کہی گئی باتیں ہیں اور نہ جھوٹ اور افتراء۔ جیسے شعراء عرب وغیرہ کے کلام جھوٹ اور تصنع آمیز باتوں سے پر ہوتے بلکہ اس (نمک مرچ) کے بغیر تو شعر میں حسن ہی نہیں آتا۔ جیسے کسی نے شعر کے بارے میں کہا ہے کہ سب سے جھوٹا شعر سب سے زیادہ مزے دار ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے ایک طویل ترین قصیدے کا اکثر حصہ عورتوں یا گھوڑ سواروں یا شراب یا کسی معین شخص کی مدح میں ہوتا ہے۔ یا گھوڑے یا اونٹنی یا جنگ یا کسی حادثہ یا خوف یا درندہ یا معین مشاہدات کی توصیف پر مشتمل ہوگا جن کا کوئی فائدہ نہیں مگر کسی مخفی چیز کو ظاہر کرنے یا واضح چیز کی تصویر کشی میں متکلم کی قدرت اور زباندانی ظاہر ہوتی ہے۔ پھر نفس مضمون سے متعلقہ (حاصل کلام) شعر پورے قصیدے میں بمشکل ایک دو ہوتے ہیں۔ باقی سب لایعنی اور فضول ہوتے ہیں لیکن قرآن سارے کا سارا فصاحت وبلاغت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ لغت عرب کی باریکیوں سے آگاہی رکھنے والے اس کا اقرار کرتے ہیں۔ اگر آپ اس کی اخبار میں غور وفکر کریں تو ان میں انتہا درجے کی سلاست پائیں گے۔ خواہ وہ واقعات مختصر ہوں یا مفصل۔ خواہ انہیں مکرر ذکر کیا جارہا ہو۔ بلکہ اس کا کسی چیز کو دہرانا تو قند مکرر کا مزہ دیتا ہے۔ بار بار پڑھنا آدمی کو تھکاتا نہیں۔ علماء اس سے اکتاتے نہیں۔ اگر وعید اور تہدید (ڈرانا) کا ذکر آئے تو مضبوط پہاڑ بھی کانپنے لگتے ہیں۔ تو سمجھنے والے دلوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ (کیا وہ اثر قبول نہ کریں گے)۔ اگر کوئی وعدہ کرے تو ایسا انداز

اپنا تا ہے جو دلوں اور کانوں کو کھول دے۔ جنت اور رحمٰن کے عرش کا شوق دلائے۔ جیسے ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سجدہ:17) ''پس نہیں جانتا کوئی شخص جو (نعمتیں) چھپا کر رکھی گئی ہیں ان کے لئے جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، یہ صلہ ہے ان (اعمال حسنہ) کا جو وہ کیا کرتے تھے''۔ اور فرمایا: وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۚ (زخرف:71) ''اور وہاں ہر چیز موجود ہوگی جسے دل پسند کریں اور آنکھوں کو لذت ملے۔ (مزید برآں) تم وہاں ہمیشہ رہو گے''۔ اور ترہیب کے بارے میں فرمایا: اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ (بنی اسرائیل:68) الآیہ'' کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے کہ اللہ دھنسا دے تمہارے ساتھ خشکی کے کنارا کو''۔ اور فرمایا: ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۙ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۭ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ (الملک:16، 17) '' کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں غرق کر دے اور وہ زمین تھر تھر کانپنے لگے۔ کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ بھیج دے تم پر پتھر برسانے والی ہوا۔ تب تمہیں پتہ چلے گا کہ میرا ڈرانا کیسا ہوتا ہے''۔ زجر وتوبیخ کرتے ہوئے فرمایا: فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ (عنکبوت:40) ''پس ہر (سرکش) کو ہم نے پکڑا اس کے گناہ کے باعث'' وعظ ونصیحت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۙ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۙ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ (شعراء:207/205) '' کیا تم نے کچھ غور کیا اگر ہم لطف اندوز ہونے دیں انہیں چند سال۔ پھر (یہ عرصہ گزرنے کے بعد) آئے ان پر وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا۔ تو کیا نفع دیں گے انہیں اس وقت وہ (سازوسامان) جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہتے تھے''۔ اسکے علاوہ فصاحت وبلاغت اور سلاست کی بے شمار اقسام ہیں۔ وہ آیات جو احکام اور اوامر ونواھی کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ ہر اچھی، عمدہ نافع، پاکیزہ اور محبوب چیز کا حکم دیا ہے۔ اور ہر قبیح، رذیل اور گھٹیا چیز سے منع کیا ہے۔ جیسے حضرت ابن مسعود وغیرہ سلف صالحین کا قول ہے کہ جب قرآن کریم میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سنو تو کان لگا دو اس میں کسی خیر (بھلائی کی بات) کا حکم ہوگا یا کسی شر سے منع کیا گیا ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف:157) الآیۃ ''وہ نبی حکم دیتا ہے انہیں نیکی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان سے انکا بوجھ اور (کاٹتا ہے) وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے ہیں انہیں''۔ اگر چہ بعض آیات آخرت اور اس میں پیش آنے والے ہولناک واقعات اور جنت ودوزخ کے بارے میں ہیں اور ان میں اللہ رب العزت نے اپنے اولیاء اور اعداء کے لئے جو نعمتیں اور آگ، اور ثواب وعذاب تیار کو رکھا ہے کا ذکر ہے۔ وہ بشارت بھی دیتی ہے ڈراتی بھی ہیں۔ بھلائی کی طرف بلاتی ہیں اور منکرات سے اجتناب کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ دنیا سے کنارہ کشی اور آخرت کی طرف رغبت کرنے کا اعلان کرتی ہیں مثالی طریقہ پر ثابت قدم رکھتی ہیں اور صراط مستقیم اور اللہ کی شریعت کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ دلوں سے ملعون شیطان کی آلودگی کو دور کرتی ہیں۔ اسی لئے صحیحین کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی کو ایسے معجزات عطا فرمائے گئے جنہیں دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے اور مجھے اللہ کی طرف سے وحی عطا کی گئی ہے مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے پیروکار ان سے زیادہ ہوں گے (1)۔ اور حضور ﷺ کا یہ فرمان کہ مجھے وحی دی گئی ہے۔ اس سے مراد وہ وحی ہے جو آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور وہ قرآن ہے جس نے تمام انسانوں کو اس کی مثل لانے سے عاجز کر دیا۔ بخلاف دیگر کتب سماویہ کے۔ بہت سے علماء کے نزدیک وہ معجزہ نہیں

1۔ صحیح بخاری، جلد 6، صفحہ 224

ہیں واللہ اعلم ۔ اور حضور سرور دو عالم ﷺ کی نبوت و صداقت کی بے شمار نشانیاں ہیں جن کا شمار ممکن نہیں (وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ) متکلمین میں سے کسی نے قرآنی اعجاز کو اس طرح بیان کیا ہے جو اہل سنت اور معتزلہ دونوں کے قول کو شامل ہے ۔ وہ فرماتے ہیں یہ قرآن فی نفسہ معجزہ ہے کوئی بشر اس کی مثل لانے کی طاقت نہیں رکھتا ۔ بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کی ان میں ہمت ہی نہیں ۔ تو مدعا حاصل ہو گیا اور یہی مقصود تھا ۔ اور اگر اس کا مثل لانا ان کے لئے ممکن ہو اور شدید عداوت کے باوجود بھی وہ ایسا نہیں کرتے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہوگا کہ یہ اللہ کا کلام ہے ۔ جس نے انہیں اس کی نظیر لانے پر قدرت کے باوجود اس کا مقابلہ کرنے سے روک دیا ہے ۔ یہ طریقہ اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم تو بذاتہ معجز بیان ہے کوئی بشر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے مگر بطریق تنزل، مناظرے اور دفاع عن الحق کی خاطر ہو تو جائز ہے ۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں چھوٹی سورتوں مثلاً عصر اور کوثر کے جواب میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے ۔

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (بقرہ:24) ۔ وقود یہ واؤ کی زبر (فتح) کے ساتھ ہے ۔ اس سے مراد وہ چیز ہے جو آگ کو جلانے کیلئے اس میں ڈالی جاتی ہے ۔ جیسے لکڑی وغیرہ ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (الجن:15) ''اور جو حق سے منحرف ہوتے ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں'' ۔ اور فرمایا: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ؀ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (انبیاء:98-99) ''(اے مشرکو!) تم اور جن بتوں کی تم عبادت کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سب جہنم کا ایندھن ہوں گے ۔ تم اس میں داخل ہونے والے ہو ۔ (سوچو) اگر یہ خدا ہوتے تو نہ داخل ہوتے جہنم میں ۔ اور (جھوٹے خدا اور ان کے پجاری) سب اس میں رہیں گے'' ۔ پتھر سے مراد یہاں گندھک کا بڑا، سیاہ، سخت، بدبودار پتھر ہے ۔ یہ جب گرم ہو جائے تو سب پتھروں سے زیادہ گرم ہو جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ میں رکھے ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے ۔ گندھک کے ان پتھروں کو زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت ہی آسمان دنیا پر کفار کے لئے پیدا کیا گیا ہے ۔ اس کے راوی ابن جریر ہیں یہ الفاظ انہی کے ہیں ۔ ابن ابی حاتم اور حاکم نے اپنی مستدرک میں اسے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر ہے ۔ سدی نے اپنی تفسیر میں ابو مالک، ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ سے روایت کیا ہے کہ جہنم میں یہ سیاہ گندھک کے پتھر ہیں جن کے ساتھ آگ کا عذاب دیا جائے گا ۔ مجاہد کا قول ہے کہ گندھک کا یہ پتھر مردار سے بھی زیادہ بدبودار ہے ۔ ابو جعفر محمد بن علی کہتے ہیں یہ گندھک کا پتھر ہے ۔ ابن جریج کہتے ہیں یہ دوزخ میں سیاہ گندھک کا پتھر ہے ۔ عمرو بن دینار نے مجھے فرمایا یہ پتھر سے سخت اور بڑا ہے ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں اس سے مراد بت اور مد مقابل (معبود) ہیں جن کی اللہ کے سوا پرستش کی جاتی تھی ۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ...... (انبیاء:98) قرطبی اور رازی نے اسے بیان کیا ہے اور پہلے پر ترجیح دی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ گندھک کے پتھر کو آگ لگنا کوئی عجیب بات نہیں لہٰذا اس سے مراد یہ پتھر (بت) لینا زیادہ اولیٰ ہے ۔ انکا یہ قول قوی نہیں ہے ۔ کیونکہ آگ کو جب گندھک سے بھڑکایا جائے تو اس کی حرارت زیادہ ہوگی اور اس کے شعلے قوی ہوں گے ۔ خصوصاً جب سلف سے یہ بات منقول ہے کہ یہ پتھر بالخصوص اسی مقصد کے لئے تیار کیے گئے ہیں ۔ پھر ان پتھروں سے آگ لگنا مشاہدے میں آنے والی بات ہے ۔ یہ چونا پتھر ہو گا اس میں آگ سلگائی جائے گی تو اس طرح ہو جائے گا اسی طرح تمام پتھروں پر آگ فخر کرے گی اور انہیں جلائے گی ۔ یہ اسلوب اس آگ کی گرمی، جلانے کی شدت اور شعلوں کی قوت کا اظہار کرنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (بنی اسرائیل:97) ''جب بھی سرد ہونے لگے گی (جہنم کی آگ) تو ہم ان کے لیے اس کی آنچ بڑھا دیں گے'' قرطبی نے اسی بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہیں جن کے ساتھ جہنم کی آگ کو آنچ دی جائے گی تاکہ وہ سرخ ہو

جائے اور اس کا شعلہ بڑھ جائے۔ تا کہ اہل عذاب کے لئے اس میں شدت ہو۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' ہر موذی آگ میں ہے'' (1)۔ یہ حدیث نہ محفوظ ہے اور نہ معروف پھر قرطبی کہتے ہیں اس کی تفسیر دو اعتبار سے کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ ہر وہ شخص جس نے لوگوں کو تکلیف دی آگ میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایذا دہندہ چیز جہنم میں ہوگی۔ اہل جہنم کو تکالیف دینے کے لئے درندے، کیڑے مکوڑے وغیرہ (اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ) زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ اُعِدَّتۡ کی ضمیر آگ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ پتھروں (حجارۃ) کی طرف لوٹ رہی ہو۔ جیسا کہ ابن مسعود کا قول ہے اور معنی کے اعتبار سے دونوں اقوال میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو لازم ملزوم ہیں۔ اُعِدَّتۡ اَیۡ اُرۡصِدَتۡ وَحُصِّلَتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے ہر وہ شخص جو کفر پر ہو اس کے لئے آگ تیار ہے۔ بہت سے ائمہ اہل سنت نے اس آیت کریمہ سے جہنم کے اس وقت موجود ہونے پر استدلال قائم کیا ہے۔ کیونکہ اُعِدَّتۡ کا معنی ہے اُرۡصِدَتۡ وَهُيِّئَتۡ : تیار کی گئی ہے۔ اس بارے میں بہت سی احادیث بھی وارد ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث کے الفاظ ہیں'' جنت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا'' ایک دوسری حدیث میں ہے'' آگ نے اپنے رب سے اجازت طلب کی اے رب میرا بعض حصہ بعض کو کھا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس لینے کی اجازت دے دی ایک موسم سرما میں اور دوسرا موسم گرما میں۔'' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ہم نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی تو ہم نے عرض کی یارسول اللہ! یہ کون سی آواز تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔'' یہ ایک پتھر ہے جسے ستر سال پیشتر جہنم میں پھینکا گیا تھا۔ اب وہ تہہ تک پہنچ گیا ہے۔ (یہ روایت مسلم میں ہے) حدیث نماز کسوف (سورج گرہن کی نماز) اور حدیث معراج وغیرہ متواتر احادیث اسی مفہوم میں ہیں۔ معتزلہ نے اپنی جہالت کی وجہ سے اس کی مخالفت کی ہے اندلس کے قاضی، قاضی منذر بن سعید بلوطی نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔

تنبیہ

اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ اور سورۂ یونس میں'' بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ'' یہ قرآن کی ہر سورت کو شامل ہے خواہ طویل ہو یا مختصر۔ کیونکہ نکرہ شرط کے سیاق میں ہو تو عموم کا فائدہ دیتا ہے جس طرح نفی کے سیاق میں ہو تو عمومیت کا فائدہ دیتا ہے۔ اور یہ بات محققین علماء اصول کے نزدیک طے شدہ ہے۔ اس کی وضاحت اپنی جگہ پر کردی گئی ہے۔ اعجاز لمبی سورتوں میں بھی ہے اور چھوٹی سورتوں میں بھی۔ سلف وخلف کے مابین اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ سورۂ کوثر، سورۂ عصر اور سورۂ کافرون کو شامل ہے۔ اور ہم بالضرورت یہ جانتے ہیں کہ اس کے مثل لانا یا اس کے قریب قریب کسی سورت کا بنالینا ممکن ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ اس طرح کی سورت کا بنالینا بشر کی طاقت سے خارج ہے۔ تو یہ زیادتی ہے...... (قُلۡنَا) ہم نے کہا کہ اسی سبب سے تو ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ اگر یہ سورت فصاحت و بلاغت میں اعجاز کی حد تک پہنچ چکی ہے تو مقصود حاصل ہوگیا۔ اور اگر ایسا نہیں تو آپ ﷺ کی دعوت حق کے خلاف شدید جذبات کے باوجود اس کی مثل لانے سے ان کار کے رہنا بھی معجزہ ہے۔ دونوں اعتبار سے اعجاز حاصل ہو جاتا ہے۔...... صحیح یہ ہے کہ قرآن کی ہر سورت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی بشر اس کی مثل لانے سے عاجز ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اگر لوگ اس سورت میں تدبر کرتے تو ان کے لئے یہ کافی تھی۔ وَالۡعَصۡرِ ۙ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ ...... وَ

1۔ تاریخ بغداد: 299/11۔ 1۔ تفسیر القرطبی: 236/1

تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ وفد لے کر مسیلمہ کذاب سے ملنے گئے۔ یہ ان کے مسلمان ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ مسیلمہ نے آپ سے پوچھا اس وقت مکہ میں تمہارے ساتھی پر کیا اترا ہے۔ عمرو نے کہا کہ اس پر ایک بلیغ مختصر سی سورت اتری ہے۔ اس نے پوچھا کون سی سورت آپ نے فرمایا: وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ ...... اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر سر اٹھایا اور کہا اس کی مثل مجھ پر بھی اترا ہے حضرت عمرو نے پوچھا وہ کیا وہ کہنے لگا (یا وبر یا وبر انما انت اذنان و صدر وسائرك حقر فقر) اے جنگلی چوہے۔ اے جنگلی چوہے تیرے دو کان اور سینہ ہے اور تیرا سارا وجود بالکل حقیر ہے۔ پھر وہ کہنے لگا اے عمرو! تمہاری کیا رائے ہے؟ عمرو کہنے لگے اللہ کی قسم تو جانتا ہے اور مجھے بھی پتہ ہے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

"اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لیے باغات ہیں، بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں۔ جب کھلایا جائے گا انہیں ان باغوں سے کوئی پھل (تو صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے کھلایا گیا تھا اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا اور ان کیلئے جنت میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسولوں کے بدبخت دشمنوں کے لئے جو عذاب تیار کر رکھا ہے اس کے ذکر کے بعد، اس کی ذات پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والے سعادت مند مومنین جنہوں نے عمل صالح کے ساتھ اپنے ایمان کی تصدیق کی کے تذکرہ کا عطف کیا۔ صحیح ترین قول کے مطابق قرآن کو مثانی نام دینے کے ایک یہی معنی ہیں۔ جس کی ہم اپنی جگہ پر وضاحت کریں گے۔ وہ یہ کہ ایمان کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کفر کا ذکر ہوتا ہے یا اس کے برعکس۔ یا نیک بخت لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد بدبختوں کا ذکر آتا ہے یا اس کے برعکس۔ خلاصہ یہ کہ جس چیز کا ذکر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مقابلہ کی چیز کا بھی ذکر ہو جاتا ہے۔ کسی چیز اور اس کی نظیر کا ذکر کرنا یہ "تشابہ" ہے جس کی ہم آئندہ وضاحت کریں گے ان شاء اللہ۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ بتایا کہ اس کے درختوں اور بالا خانوں کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں گی حدیث شریف میں ہے کہ نہریں بہتی ہیں لیکن ان کا گڑھا نہیں ہے۔ حوض کوثر کے بارے میں ہے کہ اس کے دونوں کنارے سچے موتیوں کے قبے ہیں۔ اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اس کی مٹی خالص کستوری کی ہے۔ اس کے سنگریزے موتی اور جواہرات ہیں(1)۔ ہم اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرتے ہیں اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ۔ (وہ احسان کرنے والا بڑا رحیم ہے)۔ ابن ابی حاتم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کی نہریں ٹیلوں یا کستوری کے پہاڑوں کے نیچے سے بہہ رہی ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے(2)۔ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ سدی اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور چند دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ انہیں جنت میں کوئی پھل ملے گا تو وہ اسے دیکھ کر کہیں گے یہ تو وہی ہے جو دنیا میں ہمیں ملا تھا۔ قتادہ اور عبدالرحمٰن بن زید نے یہی کہا ہے اور ابن جریر نے اس کی تائید کی ہے۔ عکرمہ کا

1۔ تفسیر الطبری،1:17/1 2۔ الترغیب 517/4

قول ہے: قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ اس کا معنی ہے ہمیں کل بھی یہی دیئے گئے تھے۔ ربیع بن انس نے بھی یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے وہ کہیں گے یہ تو اس سے کتنا مشابہ ہے۔ ابن جریر اور دوسروں نے کہا ہے کہ پھلوں کی ایک دوسرے کے ساتھ حیرت انگیز حد تک مشابہت کی وجہ سے وہ یہ کہیں گے کہ جنت کے پھلوں میں سے یہ پہلے ہمیں دیئے جا چکے ہیں۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا۔ حضرت یحییٰ بن ابی کثیر سے مروی ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس پلیٹ میں کوئی چیز لائی جائے گی۔ وہ اس میں سے کھائے گا۔ پھر کوئی دوسرا پھل لایا جائے گا وہ کہے گا یہ تو پہلے مجھے دیا جا چکا ہے فرشتے کہیں گے کھائیے رنگ ایک ہے لیکن ذائقہ مختلف۔ ابن ابی حاتم حضرت یحییٰ بن ابی کثیر سے ہی لکھتے ہیں۔ جنت کی گھاس زعفران اس کے ٹیلے کستوری کے ہیں۔ غلمان ان کے پاس پھل لا رہے ہوں گے۔ وہ انہیں کھائیں گے۔ پھر اس جیسے پھل لائے جائیں گے۔ اہل جنت کہیں گے یہ تو ابھی ابھی ہمیں دیئے گئے ہیں۔ غلمان کہیں گے کھاؤ رنگ تو ایک ہے لیکن ذائقہ مختلف ہے۔ یہی اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد کا مفہوم ہے: وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے لیکن ذائقے میں مختلف۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ مجاہد، ربیع بن انس اور سدی سے اسی طرح مروی ہے۔ ابن جریر اپنی سند سے سدی کی تفسیر کے حوالے سے ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام سے نقل کرتے ہیں وہ رنگ اور شکل وصورت میں ایک جیسے ہوں گے لیکن ذائقہ ایک جیسا نہیں ہوگا۔ ابن جریر نے یہی اختیار کیا ہے۔

عکرمہ کا قول ہے کہ یہ دنیوی میوہ جات سے مشابہ ہوں گے مگر جنت کے پھل زیادہ عمدہ ہیں۔ حضرت سفیان ثوری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں جنت کے میووں اور دنیا کے پھلوں میں صرف اسماء کی مشابہت ہے۔ اور ایک روایت میں ہے دنیا میں نہیں ہے جو کچھ جنت میں ہے مگر صرف اسماء۔ ابن جریر نے اسے ثوری اور ابن ابی حاتم سے روایت کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کی تفسیر میں لکھتے ہیں وہ ان کے دنیوی ناموں سے پھلوں کو پہچانیں گے جیسے سیب کو سیب اور انار کو انار کہیں گے اور جنت میں کہیں گے کہ یہ تو دنیا میں ہمیں مل چکا۔ حالانکہ انہیں اس طرح کا پھل دیا جائے گا جس کی صورت کو وہ پہچانتے ہوں گے لیکن وہ ذائقہ میں اس کی طرح نہ ہوگا۔ قولہ تعالیٰ: وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ حضرت ابن عباس اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں وہ گندگی اور غلاظت سے پاک ہوں گی۔ مجاہد کا قول ہے وہ حیض، پیشاب، پاخانے، ناک کی رینٹ، تھوک، منی اور بچے سے پاک ہوں گی۔ قتادہ کا قول ہے گندگی اور گناہ سے پاک۔ اور ایک روایت میں ہے نہ حیض اور نہ ہی کوئی تکلیف دہ چیز۔ حضرات عطاء، حسن، ضحاک، ابوصالح، عطیہ، اور السدی وغیرہ سے یہی مروی ہے۔ ابن جریر عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول نقل کرتے ہیں کہ مطہرۃ سے مراد وہ ہے جسے حیض نہیں آتا۔ کہتے ہیں کہ اسی طرح حضرت حواء علیہا السلام بھی ابتدا میں حیض سے پاک تھیں۔ لیکن جب ان سے لغزش ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تجھے پاک صاف پیدا کیا تھا۔ اب میں تمہارا خون اسی طرح بہاؤں گا جیسے تو نے اس درخت کا بہایا ہے۔ لیکن یہ روایت سنداً غریب ہے۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ اپنی اسناد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ حیض، پاخانہ، ناک کی رینٹ اور تھوک سے پاک ہوں گی یہ حدیث بھی غریب ہے۔ حاکم نے اسے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ شیخین کی شرائط پر یہ صحیح ہے لیکن یہ دعویٰ محل نظر ہے۔ عبدالرزاق بن عمر البزیعی کے بارے میں ابوحاتم بن حبان البستی کہتے ہیں۔ اس سے استدلال کرنا جائز نہیں۔ (میں کہتا ہوں) ظاہراً یہ لگتا ہے کہ یہ قتادہ کا کلام ہے حدیث مرفوع نہیں۔ جیسے پہلے گذرا۔ واللہ اعلم۔ قولہ تعالیٰ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ یہاں پر سعادتمندی اور خوش بختی کی انتہا ہو رہی ہے۔ وہ ان نعمتوں سے اس طرح لطف اندوز ہو رہے ہوں گے کہ نہ تو موت آئے گی اور نہ یہ نوازشات کبھی ختم ہوں گی نہ خاتمہ ہے نہ آخر بلکہ وہ ان سرمدی نعمتوں سے ابدالآباد تک لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

''بے شک اللہ حیانہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی۔ تو جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے اتری ہے اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو۔ وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعد اور کاٹتے رہتے ہیں اسے حکم فرمایا اللہ نے جس کے جوڑنے کا اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں۔ وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہوں گے''۔

سدی اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کرام سے نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب منافقین کے لئے دو مثالیں یعنی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا اور اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ الآیات (تین آیتیں) بیان فرمائیں تو وہ (منافق) کہنے لگے اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی چھوٹی چھوٹی مثالیں بیان کرنے سے ارفع واعلیٰ ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت ''هُمُ الْخٰسِرُوْنَ'' تک نازل فرمائی۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مکڑی اور مکھی کی مثال دی تو مشرکین کہنے لگے مکڑی اور مکھی جیسی (حقیر) چیزوں کے بیان کی کیا ضرورت تھی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا ...... حضرت سعید، حضرت قتادہ سے روایت کرتے ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں فرماتا کہ وہ ایسی چیز کا ذکر کرے جو چھوٹی ہو یا بڑی۔ اور اللہ نے جب اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر فرمایا تو گمراہ لوگ کہنے لگے اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ذکر سے کیا مراد لی ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ ...... نازل فرمائی۔ (میں کہتا ہوں) حضرت قتادہ کی پہلی عبارت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے حالانکہ ایسا نہیں اور حضرت سعید والی روایت زیادہ قریب ہے واللہ اعلم۔ ابن جریج نے دوسری روایت کی مثل حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ حسن اور اسماعیل بن ابی خالد سے بھی قتادہ اور سدی کی طرح مروی ہے۔ ابوجعفر رازی ربیع بن انس سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ اللہ نے یہ مثال دنیا کے لئے بیان کی ہے کہ مچھر اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک بھوکا ہو۔ موٹا تازہ ہو جانے کے بعد مر جاتا ہے قوم جن کے لئے یہ قرآنی مثال بیان کی گئی ہے جب دنیا کی نعمتوں سے پوری طرح سیر ہو جائیں گے تو اس وقت اللہ کی پکڑ آ جائے گی پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (انعام: 44) ''پھر جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے''۔ ابن جریر نے اسی طرح بیان کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سبب نزول کے بارے میں ان کے اختلاف کو بہتر جانتا ہے۔ ابن جریر نے تو وہ اختیار کیا ہے جسے سدی نے بیان کیا ہے کیونکہ وہی صورت کے مطابق اور مناسب ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں خبر دے رہے ہیں کہ وہ کسی چیز کی مثال دینے سے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی حیا نہیں فرماتا یعنی نہ تو عار محسوس فرماتا ہے اور

نہ ڈرتا ہے۔ کلمہ، مَا یہاں پر تقلیل کے لئے ہے۔ لفظ بعوضۃً یا تو بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے جیسے تو کہے "لَاَ ضَرِبَنَّ ضَرْبًا مَّا" تو وہ ادنیٰ چیز پر صادق آ سکتا ہے۔ یا ما کی صفت ہے۔ ابن جریر نے یہ اختیار کیا ہے کہ ما موصولہ ہے اور بعوضۃٌ معرب ہے اس کے اعراب سے۔ اور یہ بات کلام عرب میں معروف ہے کہ وہ "ما" اور "من" کے صلہ کو ان دونوں کا اعراب دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں کبھی معرفہ ہوتے ہیں اور کبھی نکرہ جیسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ شعر ۔

یَکْفِیْ بِنَا فَضْلًا عَلٰی مَنْ غَیْرُنَا　　حُبُّ النَّبِیِّ مُحَمَّدٍ اِیَّانَا

(ترجمہ) ہمیں غیروں پر صرف یہی فضیلت کافی ہے کہ محمد (ﷺ) ہم سے محبت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں یہ بھی جائز ہے کہ بعوضۃ حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہو۔ اس صورت میں تقدیر کلام یوں ہوگی: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَیْنَ بَعُوْضَۃٍ اِلٰی مَا فَوْقَھَا۔ کسائی اور فراء اسی کو پسند کرتے ہیں۔ ضحاک اور ابراہیم بن عبلہ نے بعوضۃ کو رفع (پیش) کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی کا قول ہے کہ یہ ما کا صلہ ہوگا اور ضمیر عائد محذوف مانی جائے گی۔ جیسے اس آیت کریمہ میں ہے۔ (تَمَامًا عَلَی الَّذِیْٓ اَحْسَنَ) اَیْ عَلَی الَّذِیْ ھُوَ اَحْسَنُ۔ (انعام: 154) سیبویہ کا قول ہے: "مَا اَنَا بِالَّذِیْ قَائِلٌ لَّکَ شَیْئًا" اَیْ بِالَّذِیْ ھُوَ قَائِلٌ لَّکَ شَیْئًا۔ اور قولہ تعالیٰ (فَمَا فَوْقَھَا) اس کے بارے میں دو قول ہیں۔ (1) ایک تو یہ کہ اس سے بھی چھوٹی اور حقیر چیز (فَمَا دُوْنَھَا فِی الصِّغْرِ وَ الْحَقَارَۃِ) جیسے کوئی شخص تیرے سامنے کسی کو بخل اور کمینگی سے متصف کرے تو سامع یہ کہے ہاں وہ تو اس سے بھی زیادہ ہے (نَعَمْ وَ ھُوَ فَوْقَ ذٰلِکَ) یعنی جو آپ نے اس کا وصف بیان کیا ہے۔ یہ کسائی اور ابو عبید کا قول ہے۔ امام رازی اور اکثر محققین نے یہی کہا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے "اگر دنیا کی قدر اللہ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اس سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔" دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے بڑی چیز کیونکہ مچھر سے حقیر اور چھوٹی چیز بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟۔ (فَمَا فَوْقَھَا لِمَا ھُوَ اَکْبَرُ مِنْھَا)۔ یہ قتادہ، ابن دعامۃ کا قول ہے ابن جریر نے اسے اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید مسلم شریف کی اس روایت سے ہوتی ہے سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "کسی مسلمان کو کانٹا بھی چبھے یا اس سے زیادہ مگر اس کے درجات بڑھتے ہیں اور گناہ معاف ہوتے ہیں(1)۔" اللہ تبارک وتعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ کسی چیز کو حقیر نہیں سمجھتا بطور مثال بیان کرنے کیلئے اگرچہ وہ حقارت اور صغر میں مچھر کی طرح ہو۔ جس طرح انہیں تخلیق کرنے سے عار محسوس نہیں فرماتا اسی طرح اس کی مثال دینے سے حیا نہیں فرماتا جس طرح اس نے مکھی اور مکڑی کی مثال بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ؕ وَ اِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ (حج: 73) "اے لوگو! ایک مثال بیان کی جارہی ہے پس غور سے سنو اسے! بے شک جن معبودوں کو تم پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر یہ تو مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سب جمع ہو جائیں اس (معمولی سے) کام کے لئے اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس مکھی سے۔ (آہ!) کتنا بے بس ہے ایسا طالب اور کتنا بے بس ہے ایسا مطلوب"۔ ایک اور جگہ فرمایا: مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (عنکبوت: 41) "ان نادانوں کی مثال جنہوں نے بنا لیے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دوست، مکڑی کی سی ہے اس نے (جالے کا) گھر بنایا۔ اور (تم سب جانتے ہو) کہ تمام گھروں سے کمزور ترین مکڑی کا گھر ہوا کرتا ہے۔ کاش! وہ بھی اس (حقیقت) کو جانتے"۔ ایک اور جگہ فرمایا: اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ۙ

1۔ مسلم: کتاب البر والصلۃ والآداب: 1991

تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَهَا کُلَّ حِیۡنٍۭ بِاِذۡنِ رَبِّهَا ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ کَلِمَةٍ خَبِیۡثَةٍ کَشَجَرَةٍ خَبِیۡثَةِ اجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَا لَهَا مِنۡ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَةِ ۚ وَ یُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیۡنَ ۟ۙ وَ یَفۡعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ (ابراہیم:27-24)'' یا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے۔ جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر وقت اپنے رب کے حکم سے۔ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ (انہیں) خوب ذہن نشین کرلیں۔ اور مثال ناپاک کلمہ کی ایسے ہے جیسے ناپاک درخت ہو۔ جسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے (اور) اسے کچھ بھی قرار نہ ہو ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس پختہ قول (کی برکت) سے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور بھٹکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو۔ اور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے''۔ ایک اور جگہ فرمایا: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡکًا لَّا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ ..... (نحل:75) '' بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال (وہ یہ کہ) ایک بندہ ہے جو مملوک ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا''۔ پھر تھوڑا آگے چل کر فرمایا: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَیۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡکَمُ لَا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ وَّ هُوَ کَلٌّ عَلٰی مَوۡلٰىهُ ۙ اَیۡنَمَا یُوَجِّهۡهُّ لَا یَاۡتِ بِخَیۡرٍ ؕ هَلۡ یَسۡتَوِیۡ هُوَ ۙ وَ مَنۡ یَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ (نحل:76)'' اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال، دو آدمی ہیں ان میں سے ایک تو گونگا ہے کسی چیز کی قدرت نہیں رکھتا اور وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر جہاں کہیں وہ اس (نکمے) کو بھیجتا ہے تو وہ واپس نہیں آتا کسی بھلائی کے ساتھ۔ کیا برابر ہو سکتا ہے یہ (نکما) اور وہ شخص جو حکم دیتا ہے عدل کے ساتھ''۔ جیسے ایک اور مقام پر فرمایا: ضَرَبَ لَکُمۡ مَّثَلًا مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ هَلۡ لَّکُمۡ مِّنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ شُرَکَآءَ فِیۡ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ ..... (روم:28)'' اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے ایک مثال تمہارے ہی حالات میں سے۔ (یہ بتاؤ) کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے''۔ اور فرمایا: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیۡهِ شُرَکَآءُ مُتَشٰکِسُوۡنَ ..... (زمر:29)'' بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال، ایک غلام ہے جس میں کئی حصہ دار ہیں جو سخت بدخو ہیں''۔ اور فرمایا: وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا یَعۡقِلُهَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ (عنکبوت:43)'' ترجمہ: اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لئے اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم''۔ قرآن کریم میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے جب میں قرآن کریم میں کوئی مثال سنوں اور مجھے سمجھ نہ آئے تو مجھے اپنے آپ پر رونا آتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا یَعۡقِلُهَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ (عنکبوت:43) اور نہیں سمجھ سکتے انہیں مگر اہل علم۔ مجاہد فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا ...... مثالیں خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی، مومنین ان پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہیں ان کے رب کی طرف سے اور وہ (اللہ تعالیٰ) انہیں ان کے ساتھ ہدایت دیتا ہے۔ قتادہ کا قول ہے: فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رحمٰن کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے ہے۔ مجاہد، حسن اور ربیع بن انس سے اسی طرح مروی ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ انہ کی ضمیر کا مرجع مثال ہے۔ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا یعنی جو کفار ہیں یہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ تعالیٰ نے کیا ارادہ فرمایا ہے۔ جیسے سورۂ مدثر میں ہے: وَ مَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَةً ۪ وَّ مَا جَعَلۡنَا عِدَّتَهُمۡ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۙ لِیَسۡتَیۡقِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَ یَزۡدَادَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِیۡمَانًا وَّ لَا یَرۡتَابَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ وَ لِیَقُوۡلَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡکٰفِرُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَا یَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ (مدثر:31)'' اور نہیں ہم نے مقرر کیے آگ کے داروغے مگر فرشتے۔ اور نہیں بنایا ہم نے ان کی تعداد کو مگر آزمائش ان لوگوں کے

لئے جنہوں نے کفر کیا تا کہ یقین کر لیں اہل کتاب اور مومن اور تا کہ کہنے لگیں جن کے دلوں میں روگ ہے اور کفار کیا ارادہ کیا ہے اللہ نے اس بیان سے یونہی اللہ تعالیٰ (ایک ہی بات سے) گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو بغیر اس کے"۔ اسی طرح یہاں فرمایا: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ سدی اس کی تفسیر میں ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ سے نقل فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منافق ہیں یعنی منافق گمراہ ہوتے اور مومن ہدایت پاتے ہیں اور ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا ہے جسے انہوں نے اللہ کی بیان کردہ مثال سے واضح طور پر سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ مثال بھی ان کے لئے بیان کی گئی تھی۔ تو جب مثال ان کے موافق ہے تو یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں گمراہ کرنا ہے۔ "وَّيَهْدِيْ بِهٖ" اور ہدایت اس (مثال) کے ساتھ "كَثِيْرًا" بہت سے اہل ایمان وتصدیق کو۔ لہٰذا اس ہدایت کے سبب ان کی ہدایت میں اور تصدیق کے سبب ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انہوں نے اس چیز کی تصدیق کی ہے جس کے بارے میں انہیں بالیقین یہ علم ہو گیا ہے کہ یہ حق ہے اور جس کے لیے اللہ نے مثال بیان کی ہے اس کے موافق ہے اور وہ اس کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ یہی اللہ کی طرف سے ان کے لئے ہدایت ہے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ فرماتے ہیں اس سے مراد منافقین ہیں۔ ابوالعالیہ اور ربیع بن انس نے بھی یہی لکھا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کافر اسے پہچان لیتے ہیں اس کے باوجود اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ قتادہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں انہوں نے فسق کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے فسق کے سبب انہیں گمراہ کر دیا۔ ابن ابی حاتم اپنی سند سے حضرت سعد سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد خوارج ہیں۔ شعبہ نے مصعب بن سعد سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے والد محترم سے آیت کریمہ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ...... کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا یہ حروریہ (خوارج کا ایک فرقہ) ہیں۔ یہ اسناد اگرچہ حضرت سعد بن ابی وقاص تک صحیح ہے لیکن یہ تفسیر معنوی ہوگی۔ نہ یہ کہ آیت میں خوارج پر نص قائم کی گئی ہے جنہوں نے نہروان کے مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا۔ کیونکہ نزول آیت کے وقت تو یہ فرقہ موجود ہی نہ تھا۔ لیکن اپنے وصف کے سبب وہ بھی دوسروں کے ساتھ اس آیت کے زمرے میں داخل ہیں کیونکہ انہیں خوارج کا نام اس لیے دیا گیا کہ انہوں نے امام کی اطاعت سے خروج کیا اور شریعت اسلامیہ کی پابندی سے آزاد ہو گئے۔ فاسق لغت میں اطاعت وفرمانبرداری سے نکل جانے والے کو کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں فَسَقَتِ الرَّطْبَةُ اِذَا خَرَجَتْ مِنْ قِشْرَتِهَا (کھجور جب چھلکے سے نکل آئے) اسی طرح چوہیا کو بھی "فُوَيْسِقَةٌ" کہتے ہیں کیونکہ وہ فساد کی خاطر اپنے بل سے باہر آتی ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "پانچ جانور فاسق ہیں۔ حرم سے باہر ہوں یا حرم کی حدود میں انہیں قتل کیا جائے گا۔ کوا، چیل، بچھو، چوہا اور باؤلا کتا"۔ فاسق کافر اور عاصی دونوں کو شامل ہے لیکن کافر کا فسق زیادہ شدید ہے۔ آیت کریمہ سے مراد بھی فاسق کافر ہے۔ واللہ اعلم۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ: الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ...... میں ان کا ذکر کیا ہے اور یہ صفات کافروں کی ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ رعد میں فرمایا: اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ (رعد:19\21) الآیات" تو کیا وہ شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو اندھا ہے۔ نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں۔ وہ جو پورا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو اور نہیں توڑتے پختہ وعدہ کو۔ اور جو لوگ جوڑتے ہیں اسے جس کے متعلق حکم دیا اللہ تعالیٰ نے کہ جوڑا جائے اور ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے خائف رہتے ہیں سخت حساب سے"۔ اس کے بعد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ

مِیۡثَاقِهٖ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ (رعد:25) ''اور وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ (سے کیے ہوئے) وعدہ کو اسے پختہ کرنے کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ انہیں جوڑا جائے اور (فتنہ و) فساد برپا کرتے ہیں زمین میں۔ یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لئے برا گھر ہے'' اہل تفسیر کے مابین لفظ عہد کے معنی میں اختلاف ہے جس کے توڑنے سے فاسقوں کو متصف کیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وہ وصیت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کو کی تھی اور اپنی کتابوں اور رسولوں کی زبان سے اپنی اطاعت بجالانے اور اس کی معصیت سے رک جانے کا جو حکم دیا ہے اس کا توڑ دینا اس پر عمل نہ کرنا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب کے کافر اور منافقین ہیں۔ اور اللہ کا عہد جو انہوں نے توڑا تھا وہ وعدہ تھا جو تورات میں ان سے لیا تھا کہ اس کی تعلیمات پر عمل کریں اور محمد ﷺ اگر مبعوث ہوں تو آپ ﷺ کی اتباع کریں اور آپ کی اور جو کچھ آپ خدا کی طرف سے لائیں اس کی تصدیق کریں۔ اس کا توڑنا یہ تھا کہ انہوں نے حقیقت جان لینے کے باوجود آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اور اس کا علم لوگوں سے چھپایا حالانکہ اللہ نے ان سے میثاق لیا تھا کہ وہ اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ اور اسے نہیں چھپائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور حاصل کر لئے اس کے بدلے تھوڑے سے وام۔ ابن جریر نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور مقاتل بن حیان کا قول بھی یہی ہے بعض دوسرے مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیت سے مراد تمام اہل کفر و شرک ونفاق ہیں۔ اور سب کے ساتھ عہد سے مراد اس کی توحید کا اقرار ہے ان دلائل کے سبب جو اس کی ربوبیت پر دال ہیں۔ اور ان کے ساتھ عہد سے مراد امر و نہی کو بجالانا اور معجزات کو تسلیم کرنا جو اپنے رسولوں کو بطور حجت عطا فرمائے جن کی مثل لانے سے سب عاجز ہیں جو ان کی صداقت پر شاہد عدل ہیں۔ نقض عہد سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کی حقانیت دلائل سے واضح ہو چکی ہے کا اقرار نہ کرنا۔ رسل کرام اور کتابوں کو جھٹلانا اس بات کا یقین ہونے کے باوجود کہ جو کچھ وہ لائے ہیں حق ہے۔ مقاتل بن حیان سے اسی طرح مروی ہے۔ یہی مستحسن ہے زمخشری کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں (اگر تو یہ کہے) اللہ کے عہد سے کیا مراد ہے؟ تو میں کہوں گا کہ توحید کے وہ دلائل جو ان کی عقلوں میں مرتکز ہیں گویا یہ امر ہے جس کی انہیں وصیت کی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی (اعراف:172) ''اور گواہ بنا دیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا بے شک تو ہی ہمارا رب ہے) جو کتابیں ان پر اتاری گئیں ان میں بھی ان سے میثاق لیا''۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ (بقرہ:40) ''اور پورا کرو تم میرے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے ساتھ (کئے ہوئے) وعدہ کو''۔ ایک دوسرے فریق کی رائے ہے کہ وہ عہد جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے یہ وہ عہد ہے جو ان سے اس وقت لیا تھا جب انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا تھا۔ جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں آیا ہے: وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَهِدۡنَا (اعراف:172) ''اور (اے محبوب) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنا دیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا بے شک تو ہی ہمارا رب ہے ہم نے گواہی دی''۔ سے توڑنے سے مراد وفائے عہد نہ کرنا ہے۔ مقاتل بن حیان سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن جریر نے ان اقوال کو اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ ابو العالیہ: الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ...... کی تفسیر میں فرماتے ہیں منافقین کی چھ خصلتیں ہیں جب انہیں لوگوں پر غلبہ ہو تو یہ صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ (1) بات کرنے میں جھوٹ بولنا (2) وعدہ خلافی کرنا (3) امانت میں خیانت کرنا (4) اللہ کے عہد کو اس کے ساتھ میثاق کے بعد توڑ دینا (5) جس چیز کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے اسے قطع کرنا (6) زمین میں فساد انگیزی کرنا۔ اور جب یہ مغلوب ہو تو تین

خصلتیں ظاہر ہوتی ہیں (1) گفتگو میں کذب بیانی سے کام لینا (2) وعدہ وفائی نہ کرنا (3) اور امانت میں خیانت کرنا۔ ربیع بن انس کا بھی یہی قول ہے۔ سدی اپنی تفسیر میں اپنی اسناد کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہ وہ عہد ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں ان سے لیا۔ انہوں نے اس کا اقرار کیا پھر اس کا انکار کر دیا اس طرح وہ اسے توڑنے کے مرتکب قرار پائے۔ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ اس سے مراد صلہ رحمی اور قریبی رشتہ داروں کا خیال رکھنا ہے جیسے قتادہ نے اس کی تفسیر کی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (محمد:22) الآیۃ ''پھر تم سے یہی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم فساد برپا کرو گے زمین میں اور قطع کر دو گے اپنی قرابتوں کو''۔ ابن جریر نے اسے ہی ترجیح دی ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت کا حکم عام ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا تھا انہوں نے اسے توڑا۔ مقاتل بن حیان (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ) کے تحت لکھتے ہیں آخرت میں نقصان اٹھانے والے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (رعد:25) ''یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے''۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ہر وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے سوا کسی دوسرے کی طرف خسران کی نسبت کی ہے اس سے مراد کفر ہے۔ اور اہل اسلام کے لئے جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس سے مراد ذنب ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں ''خَاسِرُوْنَ'' یہ ''خَاسِرٌ'' کی جمع ہے چونکہ انہوں نے بذات خود اللہ کی معصیت میں پڑ کر رحمت خداوندی میں اپنے لیے کمی کر دی تھی اس لیے انہیں نقصان یافتہ کہا گیا جیسے آدمی کو تجارت میں خسارہ ہوتا ہے کہ اس کا اصل سرمایہ کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن جب رحمت الٰہیہ کی ازحد احتیاج ہوگی کافر اور منافق محروم رہ جائیں گے۔ کہا جاتا ہے، خَسَرَ الرَّجُلُ يَخْسِرُ خُسْرًا وَخُسْرَانًا وَخَسَارًا جیسے جریر بن عطیہ کا قول ہے

اِنَّ سَلِيْطًا فِي الْخَسَارِ اَنَّهٗ اَوْلَادُ قَوْمٍ خُلِقُوْا اَقِنَّهٗ

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

''کیونکر تم انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے''۔

اس بات پر دلیل قائم کرتے ہوئے کہ وہ موجود ہے، وہی قدرتوں والا ہے۔ اپنے بندوں کو پیدا کرنے والا اور ان میں تصرف کرنے والا وہی ہے ارشاد فرمایا: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ تم کس طرح اس کے وجود کا انکار کرتے ہو یا اس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت کرتے ہو۔ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ حالانکہ تم عدم میں تھے وہ تمہیں حیز وجود میں لایا۔ جیسے ارشاد فرمایا: اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (طور:35/36) ''کیا وہ پیدا ہو گئے ہیں بغیر کسی (خالق) کے یا وہ خود ہی (اپنے) خالق ہیں؟ کیا انہوں نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو؟ (ہرگز نہیں) بلکہ وہ یقین سے محروم ہیں''۔ اور ارشاد فرمایا: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ..... لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا'' ترجمہ: بے شک گزرا ہے انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت جبکہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا''۔ (الدہر:1) اور اسی طرح کی بے شمار آیات ہیں۔ سفیان ثوری حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں: قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا (مومن:11) ''وہ کہیں گے اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ کیا، پس اب ہم اعتراف

کرتے ہیں اپنے گناہوں کا''۔ اس آیت سے مراد وہی ہے جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے: وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ حضرت ابن عباس سے مروی ہے تم اپنے باپوں کی پشت میں مردہ تھے یعنی کچھ بھی نہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا اور تمہیں یہ زندگی عطا فرمائی پھر وہ تمہیں موت دے گا سچی موت پھر تمہیں قبروں سے اٹھائے گا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ اموات سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے آباء کی پشتوں میں تھے۔ تم کچھ بھی نہ تھے اس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں سچی موت دے گا اس کے بعد حشر کے دن تمہیں دوبارہ اٹھائے گا۔ پھر فرماتے ہیں یہ اس آیت کی طرح ہے: رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ...... کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے ہی مروی ہے کہ تخلیق سے قبل تم مٹی تھے جو کہ مردہ ہے پھر تمہیں پیدا کیا تو یہ حیات ہے اب وہ تمہیں مارے گا تو تم قبروں کی طرف جاؤ گے یہ دوسری موت ہے پھر حشر کے دن تمہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا اور یہ دوسری زندگی ہے۔ تو یہ دو زندگیاں اور دو موتیں ہیں جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں آیا ہے۔ حضرات ابن عباس، ابن مسعود، بعض دیگر صحابہ کرام۔ ابو العالیہ، حسن، مجاہد، قتادہ، ابو صالح، ضحاک اور عطاء خراسانی سے اسی طرح مروی ہے۔ سورۂ بقرہ کی یہ آیت بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ...... ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ''فرمایا تمہیں قبر میں زندہ کرے گا پھر موت دے دے گا''۔ ابن جریر نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے نقل کیا ہے انہیں پیدا کیا آدم علیہ السلام کی پشت میں پھر ان سے عہد و پیمان لینے کے بعد مردہ کر دیا پھر ماں کے رحم میں انہیں پیدا کیا۔ پھر انہیں موت عطا فرمائی۔ اب قیامت کے دن دوبارہ انہیں زندہ کرے گا۔ لیکن یہ اور اس سے پہلا قول غریب ہے۔ صحیح وہی ہے جو ابن مسعود، ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ...... (جاثیہ:26) ''فرمائیے اللہ نے زندہ فرمایا ہے تمہیں پھر وہی مارے گا تمہیں پھر جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن جس میں ذرا شک نہیں''۔ جیسے اللہ رب العزت نے بتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (نحل:21) ''وہ مردہ ہیں وہ زندہ ہیں۔ اور وہ نہیں سمجھتے''۔ اور فرمایا: وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (یٰسین:33) ''اور ایک نشانی ان کے لئے یہ مردہ زمین ہے۔ ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے نکالا اس سے غلہ پس وہ اس سے کھاتے ہیں''۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

''وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔ پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف تو ٹھیک ٹھیک بنا دیا انہیں سات آسمان اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے''۔

انسانوں کی تخلیق اور اپنی ذات میں جن چیزوں کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں ذکر کرنے کے بعد اللہ تبارک تعالیٰ نے ایک اور دلیل ذکر فرمائی جس کا وہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ فرمایا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ ...... استواء کا لفظ یہاں دو معنے میں ہے قصد کرنا اور متوجہ ہونا۔ کیونکہ یہ الی سے متعدی ہے، فَسَوّٰىهُنَّ سے مراد ہے کہ ساتوں آسمان بنائے ''السَّمَآءِ'' یہاں پر اسم جنس ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کا علم تمام مخلوق کو محیط ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (ملک:14) ''ترجمہ: (نادانو) کیا وہ نہیں جانتا (بندوں کے احوال کو) جس نے انہیں پیدا کیا ہے''۔ اس آیت کی تفصیل سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ...... ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (حٰمٓ سجدہ:9 تا 12) اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ رب العزت نے پہلے زمین

کو پیدا فرمایا۔ پھر سات آسمان بنائے۔ ہر عمارت کی تعمیر کا یہی قاعدہ اور اصول ہے کہ پہلے عمارت کا نچلا حصہ بنایا جاتا ہے اس کے بعد اوپر والا حصہ مفسرین کرام نے بھی اس کی تصریح کی ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ جہاں تک اس آیت کریمہ کا تعلق ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا...... وَلِاَنْعَامِكُمْ (النازعات:27-33) اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ زیر بحث آیت میں ثم کا لفظ خبر کے خبر پر عطف کے لئے ہے نہ کہ فعل کے فعل پر عطف کے لئے جیسے کسی شاعر کا قول ہے۔

قُلْ لِمَنْ سَادَ ثُمَّ سَادَ اَبُوْهُ ثُمَّ قَدْ سَادَ قَبْلَ ذٰلِكَ جَدُّهٗ

بعض علماء کا قول ہے کہ زمین کا پھیلانا یا بچھانا آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بعد تھا۔ یہی قول ابن عباس سے مروی ہے۔ ابن مسعود، ابن عباس اور دیگر صحابہ کرام سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ اور کسی چیز کو پیدا نہیں فرمایا تھا۔ جب کائنات کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو پانی سے دھواں سا اٹھا اور پانی پر چھا گیا اسے آسمان کا نام دیا پھر پانی کو خشک کر کے ایک زمین بنائی پھر اسے توڑ کر دو دنوں (اتوار اور پیر) میں سات زمینیں بنائیں۔ زمین کو مچھلی پر پیدا کیا۔ یہ وہی مچھلی ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے (نٓ۔القلم) مچھلی پانی میں ہے اور پانی ایک پتھر پر پتھر فرشتے کی پیٹھ پر ہے فرشتہ ایک چٹان پر ہے اور چٹان ہوا میں ہے۔ یہ وہی چٹان ہے جس کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ مچھلی کی حرکت سے زمین کانپنے لگی تو اللہ نے اس میں پہاڑ گاڑ دیئے۔ تو وہ سکون پذیر ہوگئی۔ چنانچہ پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں۔ یہی معنی اس آیت کریمہ میں بیان ہوئے ہیں: وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ..... (انبیاء:31) ''اور ہم نے بنا دیئے زمین میں بڑے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے) اس میں پہاڑ پیدا فرمائے اور اس کے باشندوں کی خوراک اور درخت وغیرہ دو دنوں منگل اور بدھ کو پیدا کیے۔ اسی کا بیان قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ (حم السجدہ:12) والی آیت میں ہے۔ پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی جو دھواں تھا جو کہ پانی سے بنا تھا۔ اس سے ایک آسمان بنایا ازاں بعد اسے تقسیم کر کے جمعرات اور جمعہ کے دو دنوں میں سات آسمان پیدا فرمائے۔ اسے جمعہ کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں زمین وآسمان کی پیدائش جمع ہوگئی۔ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حم السجدہ:12) ہر آسمان میں فرشتوں کو پیدا کیا اور پہاڑ، ٹھنڈے سمندر اور ان چیزوں کو پیدا کیا جس کا اس کے سوا کسی کو علم نہیں۔ پھر آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین کیا۔ اور انہیں شیاطین سے حفاظت کا سبب بنایا۔ تمام چیزوں کی تخلیق کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ عرش عظیم پر جلوہ افروز ہوا۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (حدید:4) اور فرمایا: كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ...... (انبیاء:30)۔ ابن جریر حضرت عبداللہ بن سلام کا قول نقل کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے تخلیق کو اتوار کے دن شروع فرمایا اتوار اور پیر کو زمینیں پیدا فرمائیں۔ پہاڑ اور غذا وغیرہ کی پیدائش منگل اور بدھ کو ہوئی آسمانوں کی تخلیق جمعرات اور جمعہ کو فرمائی۔ جمعہ کے دن آخری ساعت میں فراغت کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اسی دن قیامت قائم ہوگی۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں اللہ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا فرمایا پھر اس سے دھواں اٹھا۔ اس سے ایک دوسرے کے اوپر سات آسمان پیدا فرمائے۔ اور سات زمینیں ایک دوسرے کے اوپر۔ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آسمان سے قبل زمین کو پیدا کیا گیا۔ جیسے سورۂ حم سجدہ کی اس آیت میں ہے: قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ ...... ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (حم السجدہ، فصلت:9-12) یہ دونوں آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ زمین کی پیدائش آسمان سے قبل ہوئی۔ میرے خیال میں اس موضوع پر علماء میں کوئی اختلاف نہیں۔ ماسوائے اس قول کے جو ابن جریر نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ آسمان زمین سے قبل پیدا ہوئے۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس پر توقف کیا ہے۔ سورۂ النازعات کی آیت:27 اور مابعد آیات کے سبب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں آسمان کی پیدائش کا ذکر زمین سے

پہلے ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباس سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا زمین پیدا تو آسمان سے پہلے ہوئی لیکن اسے پھیلایا آسمان کی تخلیق کے بعد گیا۔ قدیم وجدید بہت سے مفسرین کا یہی قول ہے ہم نے سورۂ والنازعات میں اس کو بیان کیا ہے۔ دحیٰ کی تفسیر بھی اسی میں بیان کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں اس کے شکم میں بالقوۃ پنہاں تھیں انہیں بالفعل پیدا فرمایا۔ سب سے پہلے پانی نکالا پھر اس سے رنگ رنگیلی نباتات پیدا فرمائیں۔ اسی طرح آسمانوں میں حرکت ہوئی تو ان میں موجود سیارے اور ستارے چلنے لگے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ابن ابی حاتم اور مردویہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں صحیح مسلم اور نسائی کی وہ روایت ذکر فرمائی ہے۔ جو حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا "اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتے کے دن پیدا فرمایا۔ پہاڑ اتوار کو اور درخت پیر کو، برائیاں منگل کو۔ روشنی بدھ کو اور جانور جمعرات کو پیدا فرمائے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد سے لے کر جمعہ کی آخری ساعت تک پیدا فرمایا" (1)۔ یہ حدیث مسلم کی غرائب میں سے ہے۔ امام ابن مدینی، بخاری اور دیگر بہت سے حفاظ نے اس حدیث کو کعب کا کلام قرار دیا ہے ابو ہریرہ نے یہ بات حضرت کعب احبار سے سنی ہے لیکن بعض راویوں نے غلطی سے اسے مرفوع قرار دیا ہے۔ بیہقی نے یہی لکھا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

"اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب کہنے لگے کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لیے۔ فرمایا بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے عظیم الشان نبی، خلیفہ کا ذکر فرما رہے ہیں کہ بنو آدم کی تخلیق سے قبل فرشتوں کے سامنے ان کا تذکرہ فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اے نبی تم یاد کرو اور اپنی قوم کو یہ بتادو۔ ابن جریر نے ابوعبیدہ سے یہ نقل کیا ہے کہ اذ یہاں زائدہ ہے (2)۔ ابن جریر نے اس کی تردید کی ہے (3)۔ قرطبی کا قول ہے کہ تمام مفسرین نے اس کی تردید کی ہے بلکہ زجاج نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ابوعبیدہ نے بہت بڑی جسارت کی ہے (4)۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً یعنی ان کے جانشین ہوں گے یکے بعد دیگرے ایک قرن کے بعد دوسری اور ایک نسل کے بعد دوسری جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام:165) اور فرمایا: وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (نمل:62) اور فرمایا: وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا ...... یَخْلُفُوْنَ (زخرف:60) اور فرمایا: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (اعراف:169) ایک شاذ قرأت میں "خَلِیْقَةً" بھی ہے۔ زمخشری وغیرہ نے اسے ذکر کیا ہے قرطبی نے زید بن علی سے نقل کیا ہے کہ خلیفہ سے مراد یہاں صرف آدم علیہ السلام نہیں ہیں جیسا کہ مفسرین کے ایک گروہ کا قول ہے۔ قرطبی نے اسے ابن عباس، ابن مسعود اور دیگر مفسرین کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے اور اس میں بہت اختلاف ہے جسے رازی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس

1۔ مسلم: حدیث نمبر 2049

سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام کی ذات مراد نہیں کیونکہ اس طرح فرشتوں کے اس قول کا معنی مستحسن نہیں رہتا۔ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ ان کی مراد یہ تھی کہ بنی آدم یہ دنگا فساد کریں گے۔ انہوں نے اپنے خصوصی علم سے یہ بات نوٹ کی یا بشری طبیعت کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خبر دی تھی کہ اس کی آفرینش کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ہوگی جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی۔ یا خلیفہ کے لفظ سے انہوں نے سمجھا کہ وہ لوگوں کے مابین تنازعات کا فیصلہ کرے گا۔ اور انہیں محارم اور گناہ کی باتوں سے روکنے والا ہوگا۔ قرطبی کا یہی قول ہے یا پھر انہوں نے اسے زمین پر رہنے والی سابقہ مخلوق پر قیاس کیا جیسا کہ ہم اس کے بارے میں مفسرین کے اقوال ذکر کریں گے۔ ملائکہ کا یہ قول اللہ رب العزت کی ذات پر (معاذ اللہ) بطور اعتراض یا بنو آدم کے ساتھ بوجہ حسد نہ تھا جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرشتوں کی شان میں فرماتا ہے (لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ) (انبیاء:27) کہ وہ بلا اجازت اس سے کسی بات کا سوال نہیں کرتے۔ چنانچہ یہاں اللہ وحدہ لاشریک انہیں خبر دی کہ وہ زمین میں ایک مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ انہیں پیشگی یہ علم تھا کہ وہ زمین میں فساد کریں گے۔ تو فرشتوں نے عرض کی: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ...... ان کا یہ سوال اس راز کو معلوم کرنے اور اس حکمت سے آگاہ ہونے کے لئے تھا جس کے لئے بنو آدم کو پیدا کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرض کی بار الہا! ان کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے حالانکہ ان میں فسادی لوگ بھی ہوں گے اور خون بہانے والے بھی اگر مقصود صرف عبادت ہے تو ہم ہر وقت تیری حمد و تقدیس کے ترانے گاتے ہیں (جیسے آگے آ رہا ہے) اور پھر ہم سے کوئی چیز بھی صادر نہیں ہوتی تو ہم پر ہی اقتصار کیوں نہیں کر لیا جاتا۔ اللہ رب العزت نے ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ اس کے فسادی ہونے کے باوجود جس مصلحت کی بنا پر میں اسے پیدا کر رہا ہوں اس کا علم صرف مجھے ہے تم اسے نہیں جانتے۔ میں ان میں انبیاء اور رسول مبعوث کروں گا۔ ان میں صدیق، شہداء، عابد، زاہد، اولیاء، ابرار، مقربین باعمل علماء، صالحین، متقی اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے رسولوں سے محبت کرنے والے لوگ بھی ہوں گے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ ملائکہ جب بندوں کے اعمال لے کر خداوند قدوس کی بارگاہ عالی میں حاضر ہوتے ہیں تو وہ رحیم و کریم ہر چیز کا علم رکھنے کے باوجود ان سے دریافت فرماتا ہے۔ تم نے میرے بندوں کو کس حال پر چھوڑا؟ وہ بصد عجز و نیاز عرض کرتے ہیں کہ جب ہم ان کے پاس گئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم نے انہیں چھوڑا تو اس وقت بھی وہ نماز ادا کر رہے تھے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک گروہ صبح کی نماز کے وقت آتا ہے جبکہ دوسرا عصر کی نماز کے وقت۔ اس وقت پہلا فریق واپس چلا جاتا ہے۔ اور اپنے ساتھ لوگوں کے اعمال بھی لے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رات کا عمل دن سے پہلے اور دن کا اعمال نامہ رات ہونے سے قبل اس کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں جب ہم آئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز میں تھے۔ ایک قول کے مطابق تفصیلی حکمت جو تخلیق انسان میں تھی اس کے بارے میں فرمایا کہ یہ میرے مخصوص علم میں ہے اور تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کے اس قول کا جواب ہے جو وہ یہ کہتے تھے کہ ہم تیری حمد و ثنا اور تقدیس کے ترانے گاتے ہیں۔ تو انہیں بتایا گیا کہ اس کا علم تو صرف مجھے ہے۔ تم میں ایک ابلیس بھی ہے۔ اور یہ ایسا نہیں ہوگا جیسا کہ تم نے ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ انہیں زمین میں آباد کیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ میں جانتا ہوں تمہارا آسمان پر ہی رہنا تمہارے لیے زیادہ مناسب ہے اور تمہارے لائق یہی جگہ ہے۔ امام رازی نے اسے دیگر جوابات کے ساتھ ذکر فرمایا ہے واللہ اعلم۔

مفسرین کے اقوال کا تفصیلی بیان

(1) ابن جریر کا قول ہے حضرت حسن اور قتادہ سے مروی ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو خبر دی سدی کہتے ہیں کہ ملائکہ سے مشورہ کرنا مراد ہے۔'' اسے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ قتادہ سے بھی ایک روایت ہے۔ یہ عبارت اگرچہ خبر کا معنی دے رہی ہے لیکن اس میں تساہل ہے ابن جریر کی حسن اور قتادہ سے بیان کردہ روایت زیادہ بہتر ہے واللہ اعلم ''فِي الْأَرْضِ''. ابن ابی حاتم حضرت عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زمین کو ابتداء مکہ سے پھیلایا گیا۔ سب سے پہلے فرشتوں نے بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا میں زمین (یعنی مکہ) میں خلیفہ بنانے والا ہوں (1)۔ یہ مرسل ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔ اور اس میں ادراج ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام سے مروی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے عرض کی اے ہمارے پروردگار وہ خلیفہ کون ہوگا؟ فرمایا اس کی اولاد ہوگی جو زمین میں فساد پھیلائیں گے آپس میں حسد کرتے ہوں گے اور ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ ابن جریر لکھتے ہیں کہ اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں جو میری نیابت میں مخلوق کے مابین عدل و انصاف کرے گا۔ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور وہ لوگ ہیں جو اطاعت الٰہی اور عدل و انصاف میں ان کے قائم مقام ہیں۔ لیکن فسادی اور خون بہانے والے ان کے خلیفہ نہیں۔

(2) ابن جریر لکھتے ہیں کہ خلافت جس کا اللہ نے ذکر کیا ہے کا معنی ہے ایک صدی کے بعد دوسری صدی والوں کا آنا۔ خلیفہ یہ فعیلۃ کے وزن پر ہے جب کوئی دوسرے کے قائم مقام ہو تو عرب کہتے ہیں ''خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا فِي هٰذَا الْاَمْرِ''۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس: 14)'' پھر ہم نے بنایا تمہیں جانشین زمین میں ان کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔ اسی بنا پر سلطان اعظم کو بھی خلیفہ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے پیش رو کا نائب ہوتا ہے۔ محمد ابن اسحٰق اس آیت کی تفسیر میں فرماتے تھے اس کا معنی ہے کہ زمین میں سکونت اختیار کرنے اور اسے آباد کرنے والا نائب۔ جو تم میں سے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جنات سب سے پہلے زمین میں بستے تھے لیکن انہوں نے اس میں فساد کیا اور خون بہایا اور ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابلیس کو ان کی طرف بھیجا ابلیس اور اس کے ساتھیوں نے ان سے جنگ کی حتیٰ کہ انہیں مار مار کر سمندری جزائر اور پہاڑوں کی اطراف میں بھیج دیا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرما کر وہاں آباد کیا گیا۔ تو گویا آپ ان کے خلیفہ ہوئے۔

(3) حضرت سفیان ثوری کا قول ہے کہ فرشتوں کے نزدیک اس سے مراد بنو آدم ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ایک مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اور زمین میں اپنا نائب لانا چاہتا ہوں۔ اس وقت فرشتوں اور زمین کے سوا کوئی مخلوق نہ تھی۔ تو انہوں نے عرض کی کیا آپ اسے پیدا کرنا چاہتے ہیں جو فساد کرے گا۔ اس سے پیشتر ابن عباس، ابن مسعود وغیرہ صحابہ کرام کا یہ قول گذر چکا ہے کہ بنو آدم جو کچھ کریں گے اللہ نے فرشتوں کو پہلے ہی اس سے آگاہ کر دیا تھا۔ تو جواباً فرشتوں نے یہ بات عرض کی۔ ابھی ابھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی پہلے گذر چکی ہے کہ جنوں نے بنو آدم کی آمد سے قبل زمین میں

1۔ تفسیر طبری: 201,200/1

چونکہ فساد پھیلایا تھا اس لیے فرشتوں نے بنو آدم کو بھی جنات پر قیاس کیا۔ ابن ابی حاتم اپنی سند سے حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ جنات حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل زمین میں آباد تھے۔ انہوں نے زمین میں فساد انگیزی کی اور خون بہایا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا لشکر بھیجا۔ انہوں نے انہیں مار مار کر سمندری جزائر کی طرف بھگا دیا۔ تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو مذکورہ بالا سوال وجواب اس وقت ہوا۔

حضرت ابو العالیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ کو بدھ کے دن، جنات کو جمعرات اور بنو آدم کو جمعہ کے دن پیدا کیا۔ جنات نافرمانی کرتے تو فرشتے زمین پر اتر کر انہیں ان کی بغاوت کی سزا دیتے اور فتنہ وفساد کو فرو کرتے اسی بنا پر فرشتوں نے یہ بات عرض کی کہ انسان بھی جنات کی طرح فتنہ انگیزی کا سبب ہوگا۔ حضرت حسن کا قول ہے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں یہ کام کرنے والا ہوں۔ وہ اپنے رب پر ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ علم سکھایا اور کچھ مخفی رکھا جس کا انہیں پتہ نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے بارگاہ الٰہی سے عطا کردہ علم کے مطابق جواب دیا کہ وہ تو فساد کرے گا اللہ رب العزت نے فرمایا جو بات میں جانتا ہوں تم نہیں سمجھتے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی تھی کہ ابن آدم ایسا کریں گے تو اس بنا پر انہوں نے سوال کیا تھا۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آگاہ فرمایا تھا کہ زمین پر جو مخلوق بھی ہوگی فساد کرے گی اور خونریزی کرے گی۔ ابو جعفر محمد بن علی فرماتے ہیں سجل نامی ایک فرشتہ ھاروت ماروت اس کے اعوان وانصار تھے اسے دن میں تین مرتبہ لوح محفوظ (ام الکتاب) پر نظر ڈالنے کی اجازت تھی۔ ایک دفعہ اس نے آدم علیہ السلام کی پیدائش وغیرہ امور کا مطالعہ کیا تو اپنے دونوں ساتھیوں (ہاروت وماروت) کو بھی اس راز سے آگاہ کر دیا اب جس وقت اللہ نے اپنا ارادہ ظاہر فرمایا تو انہوں نے یہ سوال کر دیا۔ لیکن یہ روایت غریب ہے اسے ابو جعفر محمد علی بن حسین الباقر تک صحیح مان بھی لیا جائے تو یہ امکان ہے کہ انہوں نے اسے اہل کتاب سے لیا ہو۔ بہر حال اس کا منکر ہونا اس کے رد کرنے کو واجب کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ایسا کہنے والے فرشتے صرف دو تھے۔ لیکن ابن ابی حاتم نے عبد اللہ بن یحییٰ بن کثیر سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے باپ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جن ملائکہ نے یہ کہا تھا: اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا...... ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ اللہ کی طرف سے ایک آگ نکلی اس نے انہیں جلا کر رکھ دیا۔ یہ روایت بھی سابقہ روایت کی طرح اسرائیلیات میں سے ہے اور ناقابل اعتبار ہے۔ ابن جریج کا قول ہے کہ انہوں نے اللہ کے دیئے ہوئے علم سے یہ بات کہی۔ ابن جریر کا قول ہے کہ فرشتوں نے یہ اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تخلیق آدم کے بارے میں آگاہ کرنے کے بعد سوال کرنے کی اجازت دی تھی۔ تو فرشتوں نے از راہ تعجب یہ کہا بار الہا! وہ تیری نافرمانی کیسے کریں گے حالانکہ تو تو ان کا خالق ہے۔ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ بعض فرشتوں نے از راہ استفسار یہ بات کہی تھی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ اس پر معترض تھے۔ ابن جریر نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگے کہ وہ تو فساد کرے گا اور خون کی ندیاں بہا دے گا کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ کے نزدیک ان دونوں باتوں سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ حمد وثنا اور تسبیح کے لئے تو فرشتے پہلے ہی موجود تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔ کیونکہ یہ بات علم الٰہی میں موجود تھی کہ اس خلیفہ کی نسل سے انبیائے مرسلین، صالحین اور جنتی لوگ بھی ہوں گے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہمیں فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو فرشتے یہ کہنے لگے کہ اللہ کی یہ مخلوق ہم سے زیادہ معزز یا عالم نہیں ہوگی، تو انہیں تخلیق آدم کے ساتھ آزمایا گیا۔ ہر مخلوق کی آزمائش کی جاتی ہے جس طرح آسمان وزمین کو

اطاعت کے ساتھ آزمایا گیا: اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۗ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ (حم السجدہ:11)، وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ تسبیح وتقدیس سے مراد نماز ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض صحابہ کرام سے یہی مروی ہے۔ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ تسبیح وتقدیس سے مراد عظمت ظاہر کرنا اور بڑائی بیان کرنا ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ تقدیس سے مراد تطہیر ہے۔ محمد بن اسحٰق کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم تیری نافرمانی نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی ایسا کام کرتے ہیں جسے تو ناپسند فرمائے۔ ابن جریر کا قول ہے تقدیس سے مراد تعظیم اور تطہیر ہے۔ فرشتوں کے قول سبوح قدوس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں سبوح سے مراد اس کی تنزیہ اور قدوس سے مراد طہارت اور تعظیم ہے۔ اسی طرح اہل عرب کہتے ہیں ''ارض مقدسة'' اور اس سے مراد مطہرۃ (پاک) ہوتا ہے۔ اس صورت میں نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ کا معنی یوں ہوگا۔ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور اہل شرک جن چیزوں کی نسبت آپ کی طرف کرتے ہیں ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور تقدیس کا معنی ہوگا کہ تجھے تمام پاکیزہ صفات سے متصف کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا'' کون سی کلام افضل ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا'' جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کیلئے پسند فرمایا ہے یعنی سُبْحَانَ اللهِ وَ بِحَمْدِهٖ (1)۔ بیہقی نے عبد الرحمٰن بن قرط رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ معراج کی رات حضور ﷺ نے آسمانوں میں ایک تسبیح سماعت فرمائی'' سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْاَعْلٰى سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى ''

قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ قتادہ کا قول ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم مبارک میں یہ بات تھی کہ اس خلیفہ میں انبیاء، رسول، صالحین اور اہل جنت ہوں گے۔ ابن مسعود، ابن عباس، بہت سے صحابہ کرام اور تابعین سے اس آیت کی تفسیر میں متعدد اقوال مذکور ہیں۔ قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خلیفہ کا وجود لازمی ہے تاکہ لوگوں کے مابین تنازعات اور مقدمات کا فیصلہ کر سکے۔ مظلوم کو ظالم سے اس کا حق دلائے۔ حدود قائم کرے فواحش ومنکرات سے روکے۔ اسی طرح کے دیگر امور جن کو حاکم وقت کے بغیر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ فقہی قاعدہ ہے کہ جس چیز کے بغیر واجب ادا نہ ہو سکے وہ بھی واجب ہے امامت یا تو اس پر خدا اور رسول کی طرف سے نص قائم کرنے سے حاصل ہوتی ہے جیسے اہل سنت کا گروہ کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت یا اس کی طرف اشارہ کر دینے سے جیسے بعض دوسرے فرقوں کا خیال ہے یا پھر کسی خلیفہ کے دوسرے کو اپنا نائب مقرر کر دینے سے جیسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متعین فرمایا یا صلحاء کی جماعت پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کرنے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا نائب مقرر کرنے کی بجائے چند افراد پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ قائم فرما دی۔ یا پھر ارباب حل وعقد اجتماعی طور پر کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں یا ان میں سے کوئی ایک اس کی خلافت کا اعلان کر دے۔ جمہور علماء کرام کی یہی رائے ہے۔ امام الحرمین نے تو اس پر اجماع نقل فرمایا ہے واللہ اعلم یا لوگوں میں سے کوئی شخص زور پکڑ لے اور سب کو اپنی اطاعت پر مجبور کرے تو اس کی اطاعت بھی لازمی ہے تاکہ باہمی ناچاقی اور اختلاف پیدا نہ ہو۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے تو اس پر نص قائم فرمائی ہے۔ کیا امامت کے انعقاد پر گواہی شرط ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک شرط نہیں ہے۔ ایک دوسرے قول کے مطابق گواہی تو شرط ہے لیکن اس کے لئے صرف دو گواہ کافی ہیں۔ جبائی کا قول ہے کہ عاقد اور معقود لہ (جس کی بیعت لی جا رہی ہے) کے ساتھ چار گواہوں کا ہونا لازمی ہے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاملہ چھ افراد پر مشتمل شوریٰ کے حوالے کر دیا تھا۔ بالآخر بات عاقد (بیعت کرنے والا) عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور معقود لہ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہما پر آ کر رک گئی تھی اور چار گواہوں کا وجوب اس نے شوریٰ کے بقیہ افراد سے ثابت کیا ہے۔ لیکن یہ

1۔ مسلم: حدیث نمبر 2093

بات محل نظر ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ بھی لازمی ہے کہ وہ شخص مرد آزاد، بالغ، عاقل، مسلمان، عادل، مجتہد، صاحب بصیرت، تمام آفات سے مبرا، فنون حرب اور آراء سے آگاہ ہونا چاہئے۔ مزید برآں صحیح روایت کے مطابق وہ شخص خاندان قریش سے ہو۔ ہاشمی یا معصوم عن الخطاء ہونا لازمی نہیں جیسا کہ بعض غالی روافض کی رائے ہے۔ اگر امام سے فسق کا صدور ہو تو کیا وہ اپنے منصب سے خود بخود معزول ہو جاتا ہے یا نہیں؟۔ اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ خود بخود معزول نہیں ہوتا کیونکہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے۔ ''جب تک تم اس میں کفر کی واضح علامت نہ دیکھ لو جس کے کفر ہونے پر اللہ کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل موجود ہو''(1)۔ کیا وہ اپنے آپ کو معزول بھی کر سکتا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ خود مستعفی ہو گئے تھے اور زمام اقتدار امیر معاویہ کے حوالے کر دی۔ لیکن یہ بوجہ عذر تھا جس پر آپ رضی اللہ عنہ کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن ایک ہی سرزمین میں دو یا دو سے زائد حاکم وقت نہیں ہو سکتے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ ''جب تم متحد ہو اور کوئی شخص آ کر تم میں جدائی ڈالنا چاہے تو اسے قتل کر دو خواہ کوئی بھی ہو''۔ یہ جمہور کا قول ہے۔ بہت سے علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے ان میں امام الحرمین بھی ہیں۔ کرامیہ (شیعہ) کا قول ہے کہ ایک وقت میں دو یا دو سے زائد ائمہ کا تقرر جائز ہے۔ جیسے حضرات سیدنا علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما ایک ہی وقت میں دونوں واجب الاطاعت تھے ان کا استدلال ہے کہ جب ایک وقت میں دو یا دو سے زائد نبی ہو سکتے ہیں تو امام کیوں نہیں ہو سکتے؟۔ کیونکہ نبوت بلا اختلاف امامت سے اعلیٰ ہے۔ امام الحرمین نے استاد ابو اسحٰق کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اگر اسلامی سلطنت بہت وسیع ہو اور ان کے درمیان مختلف ممالک ہوں تو دو اماموں کا تقرر جائز ہے۔ لیکن امام الحرمین اس میں متردد ہیں۔ (میں کہتا ہوں) یہ صورت حال اس وقت تھی جب خلفاء بنی عباس عراق میں، فاطمی حضرات مصر میں اور اموی مغرب میں حکمران تھے۔ ہم اس مسئلے کو شرح و بسط کے ساتھ کتاب الاحکام میں کسی مناسب جگہ ذکر کریں گے ان شاء اللہ العزیز۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اور اللہ نے سکھا دیئے آدم (علیہ السلام) کو تمام اشیاء کے نام پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے اور فرمایا بتاؤ تو مجھے نام ان چیزوں کے اگر تم (اپنے اس خیال میں) سچے ہو۔ عرض کرنے لگے ہر عیب سے پاک تو ہی ہے کچھ علم نہیں ہمیں، مگر جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا۔ بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔ فرمایا اے آدم! بتا دو انہیں ان چیزوں کے نام پھر جب آدم (علیہ السلام) نے بتا دیئے فرشتوں کو ان کے نام۔ تو اللہ نے فرمایا کیا نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو''۔

اس مقام پر اس بات کا بیان ہو رہا ہے کہ ایک خاص علم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر شرف اور فضیلت عطا

1۔ مسلم، الجہاد: 42

فرمائی۔ یہ واقعہ فرشتوں کے سجدہ کرنے کے بعد کا ہے۔ وہ حکمت خداوندی جو آپ کے پیدا کرنے میں تھی جس کا علم فرشتوں کو نہ تھا۔ اور جس کا اجمالی بیان اوپر گذر چکا ہے۔ اس کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے اس واقعہ کو مقدم فرمایا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بتایا کہ جو کچھ وہ جانتا ہے فرشتے اس کی حکمت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اس مقام پر اس واقعہ کو ذکر فرمایا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر جو شرف اور مقام ومرتبہ عطا ہوا ہے وہ اس علم کی بنا پر ہے جو فرشتوں کو حاصل نہیں۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہیں اپنی تمام اولاد کے اسماء ایک ایک کر کے سکھائے۔ اسی طرح تمام جانوروں کے حتیٰ کہ یہ بھی بتایا گیا کہ یہ گدھا ہے۔ یہ اونٹ ہے اور یہ گھوڑا۔ اسی طرح آسمان، زمین، میدان، سمندر وغیرہ تمام اشیاء کے ناموں سے آگاہ کیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی ایک دوسری روایت میں ہے کہ پلیٹ اور ہنڈیا حتیٰ کہ ہوا کے اسماء بھی سکھائے۔ مجاہد کا قول ہے کہ ہر جانور، پرندے بلکہ ہر چیز کے اسماء سکھائے۔ حضرت سعید بن جبیر، قتادہ وغیرہ سلف صالحین کا یہی قول ہے۔ ربیع کی روایت میں ملائکہ کے اسماء آیا ہے حمید شامی نے اسماء النجوم ذکر کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید کے نزدیک تمام ذریت آدم کے اسماء ہیں۔ ابن جریر کا قول ہے کہ تمام ملائکہ اور اولاد آدم کے اسماء ہیں۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ یہ لفظ ذی شعور لوگوں کے لیے آتا ہے۔ انہوں نے اس قول کو ترجیح تو دی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے ساتھ دوسرے شامل نہ ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہوں پھر غلبہ کی وجہ سے سب کو ذوی العقول کے صیغہ سے تعبیر کر دیا ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (نور: 45) ''اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے تو ان میں سے کچھ تو رینگتے ہیں پیٹ کے بل اور ان میں سے بعض چلتے ہیں دو ٹانگوں پر اور ان میں سے بعض چلتے ہیں چار ٹانگوں پر پیدا فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ثُمَّ عَرَضَهُنَّ کر کے پڑھا ہے۔ اور ابی بن کعب نے ثُمَّ عَرَضَهَا پڑھا ہے یعنی آسمان۔ صحیح یہ ہے کہ تمام اشیاء کے ذرات، صفات اور افعال کے نام سکھائے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ گوز (پیٹ سے خارج ہونے والی ہوا) کا نام بھی سکھایا صحیح بخاری کتاب التفسیر میں اس آیت کی تفسیر کے بارے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومنین قیامت کے دن جمع ہوں گے اور کہیں گے کیا ہی اچھا ہوتا ہم کسی کو اپنا سفارشی بنا کر بارگاہ الٰہی میں بھیجتے۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے آپ ابوالبشر ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دست اقدس سے پیدا فرمایا۔ ملائکہ سے سجدہ کروایا اور ہر چیز کے اسماء سکھلائے آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری سفارش لے کر جائیں کہ ہمیں راحت عطا فرمائے آپ فرمائیں گے میں اس قابل نہیں ہوں اور اپنی لغزش یاد کریں گے۔ آپ فرمائیں گے نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول ہیں۔ تمام لوگ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ وہ بھی یہی جواب ارشاد فرمائیں گے۔ اور خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف دعا مانگنا یاد کریں گے۔ اور فرمائیں گے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جاؤ۔ وہ سب آپ کے پاس آئیں گے لیکن آپ کی طرف سے بھی یہی جواب ملے گا آپ فرمائیں گے موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ کلیم اللہ ہیں آپ کو تورات عطا فرمائی گئی تھی تمام لوگ آپ کے پاس حاضر ہو کر عرض کریں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب پائیں گے آپ کو ایک شخص کو بلاوجہ مار ڈالنے کا واقعہ یاد آجائے گا۔ آپ علیہ السلام فرمائیں گے عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ اللہ کے بندے، رسول، کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ سب لوگ آپ کے پاس آئیں گے۔ تو آپ بھی فرمائیں گے میں اس قابل نہیں تم حضرت

محمد ﷺ کے پاس جاؤ کیونکہ اللہ نے آپ کے تمام الزامات دور کر دیئے ہیں جو آپ ﷺ پر لگائے گئے تھے۔ چنانچہ وہ میرے پاس آئیں گے میں بارگاہ ربانی میں حاضر ہو کر اجازت طلب کروں گا۔ جب مجھے اجازت ملے گی۔ میں اپنے رب کریم کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جاؤں گا۔ جب تک خدا کو منظور ہوگا سجدہ ریز رہوں گا۔ پھر آواز آئے گی سر اٹھایئے اور سوال کیجئے پورا کیا جائے گا۔ ارشاد فرمایئے سنا جائے گا۔ شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت مقبول ہے۔ میں اپنا سر اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی وہ تعریفات بیان کروں گا جو وہ مجھے سکھائے گا۔ پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی میں انہیں جنت میں پہنچا کر پھر آؤں گا۔ اپنے رب کو دیکھ کر سر سجدے میں رکھ دوں گا۔ پھر دوبارہ میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی میں انہیں جنت میں داخل کر کے تیسری مرتبہ آؤں گا۔ پھر اسی طرح چوتھی دفعہ حاضر خدمت ہوں گا حتیٰ کہ جہنم میں صرف وہی لوگ باقی رہ جائیں گے جنھیں قرآن نے روک رکھا ہو۔ اور جن کے لئے ابدی جہنم واجب ہو چکی ہو" (1)۔ امام بخاری نے یہ روایت اسی طرح ذکر فرمائی ہے۔ صحیح مسلم، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی یہی روایت ہے۔ اس روایت کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک جملہ ہے (...... وَ عَلَّمَكَ اَسْمَآءَ كُلِّ شَيْءٍ) یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے اسماء سکھلائے گئے تھے۔ پھر ان اشیاء کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا (جیسا کہ حضرت قتادہ نے ذکر کیا ہے) گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو۔ ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام سے یہی روایت ہے۔ حضرت مجاہد کا قول بھی یہی ہے۔ ابن جریر نے حضرت حسن اور قتادہ سے نقل کیا ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کے بارے میں سکھایا حتیٰ کہ آپ ہر چیز کو اس کے اسماء سے پکارنے لگے۔ ہر قوم باری باری پیش کی گئی۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ حضرت حسن اور قتادہ فرماتے ہیں میں نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں فرمائی مگر تم اس سے زیادہ علم رکھتے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو ان اسماء کے بارے میں آگاہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں نے زمین میں کوئی خلیفہ نہیں بنایا۔ سدی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور کچھ صحابہ کرام سے مروی ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوی میں سچے ہو کہ بنو آدم زمین میں فساد پھیلائیں گے اور خون ریزی کریں گے۔ ابن جریر کا قول ہے کہ ان سب اقوال میں اولیٰ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے حامیوں کا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جن چیزوں کو آپ پر پیش کیا گیا ہے اے فرشتو! جن کا یہ قول ہے کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ...... کہ تمہی خلافت ارضی کے لائق ہو انسان نہیں اور صرف تم ہی میرے تسبیح خواں اور اطاعت گذار ہو۔ اگر میں نے تمہارے سوا کسی دوسرے کو خلیفہ بنایا تو وہ اور اس کی اولاد میری نافرمانی کرے گی اور خون بہائے گی اور اگر خلافت کا تاج تمہارے سر پر سجایا تو تم میری اطاعت کرو گے اور تعظیم و تقدیس کے ساتھ میری اتباع کرو گے۔ تو اگر تم ان اشیاء جو تمہارے سامنے پیش کی گئیں ہیں کے اسماء کا علم نہیں رکھتے حالانکہ وہ تمہارے سامنے موجود ہیں تو کائنات میں آئندہ درپیش آنے والے امور سے تم بدرجہ اولی لاعلم ہو گے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ...... یہاں سے فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی تقدیس بیان کرنا شروع کر دی اور اس بات کی وضاحت کی کہ ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا مگر جسے وہ خود چاہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے سوا وہ کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ اسی لیے انہوں نے کہا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ ...... یعنی تو ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ تیرا پیدا کرنا، کسی کو کچھ سکھانے یا نہ سکھانے میں کوئی نہ کوئی حکمت موجود ہے۔ تو حکمتوں اور مکمل عدل والا ہے۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا سبحان اللہ کا معنی اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی ہے کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دیگر صحابہ کرام کی موجودگی میں فرمایا: لَا

1۔ کتاب البخاری، کتاب التفسیر 22،21/6

اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا معنی تو ہم نے جان لیا۔ لیکن سبحان اللہ کا کیا معنی ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ایسا کلمہ ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے پسند کر لیا ہے۔ وہ اس سے خوش ہوتا ہے اور اس کا پڑھنا اسے محبوب ہے۔ ایک آدمی نے حضرت میمون بن مہران سے سبحان اللہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: کہ اس اسم میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور تمام برائیوں سے پاکیزگی کا بیان ہے۔

یٰاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ...... وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ زید بن اسلم کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ان کے اسماء بتا دیئے کہ تمہارا نام جبرائیل ہے، تمہارا نام میکائیل ہے تمہارا نام اسرافیل ہے اسی طرح تمام اسماء بلکہ کوے تک کا نام بتا دیا۔ مجاہد کہتے ہیں کبوتری، کوے اور ہر چیز کے اسماء۔ حضرات سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے۔ جب فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی یہ فضیلت معلوم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کیا میں نے پہلے تمہیں نہ بتایا تھا کہ میں ظاہر و پوشیدہ ہر غیب کا جاننے والا ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ يَعۡلَمُ السِّرَّ وَاَخۡفٰى (طٰہٰ: 07) (ور اگر تو بلند آواز سے بات کرے (تو تیری مرضی) وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور دل کے بھیدوں کو بھی) یا جیسے ہد ہد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکالمے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اَلَّا يَسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ الَّذِىۡ يُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَيَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ۞ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ (نمل: 25-26) ''وہ کیوں نہ سجدہ کریں اللہ تعالیٰ کو جو نکالتا ہے پوشیدہ چیزوں کو آسمانوں اور زمین سے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے وہ مالک ہے عرش عظیم کا''۔

وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ میں باطن کو اس طرح جانتا ہوں جیسے ظاہر کو یعنی ابلیس کے دل میں جو غرور اور تکبر تھا میں اسے جانتا تھا۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود، بعض دیگر صحابہ کرام کے حوالے سے سدی لکھتے ہیں کہ فرشتوں کا قول کہ زمین میں اسے پیدا کر رہا ہے جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا الآیۃ تو یہ وہ قول تھا جسے انہوں نے ظاہر کیا تھا۔ اور جو چھپایا تھا وہ غرور اور تکبر تھا جسے ابلیس نے اپنے دل میں چھپایا تھا۔ سعید بن جبیر، مجاہد، سدی، ضحاک اور ثوری کا یہی قول ہے۔ ابن جریر نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ ابوالعالیہ ربیع بن انس، حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ ان کی پوشیدہ بات سے مراد ان کا یہ قول تھا کہ جس مخلوق کو بھی خدا پیدا کرے گا۔ ہم اس سے زیادہ عالم اور معزز ہوں گے۔ تو انہوں نے جان لیا کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو علم و تکریم میں ان پر فوقیت دی ہے۔ ابن جریر نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے فرشتوں اور آدم علیہ السلام کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا جس طرح تم ان کے اسماء نہیں جان سکے اسی طرح تمہیں یہ بھی علم نہیں کہ میں نے انہیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اس میں فساد کریں اور مجھے اس کا علم ہے۔ اسی طرح میں نے یہ بات بھی تم سے مخفی رکھی ہے کہ ان میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہوں گے۔ لکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی طے شدہ ہے: لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ '' میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے'' (السجدہ: 13) فرشتوں کو اس بات کا ادراک اور علم نہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ علم عطا فرمایا ہے تو انہوں نے ان کی فضیلت کا اقرار کر لیا۔ ابن جریر کا قول ہے کہ اس میں سب سے بہتر قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ آسمان و زمین کے غیب کا علم، تمہارے ظاہر و باطن کا علم مجھے ہے۔ کوئی چیز مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ سب کچھ مجھ پر عیاں ہے۔ ان کا ظاہری قول تو یہ تھا: اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا ...... اور جو بات وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے وہ ابلیس کا اللہ تعالیٰ کے اوامر کی خلاف ورزی اس کی اطاعت سے سرکشی کرنا ہے۔ صیغہ جمع کا لایا گیا ہے اور یہ صحیح ہے۔ جیسے اہل عرب کہتے ہیں قُتِلَ الۡجَيۡشُ وَهُزِمُوۡا۔ لشکر مار

ڈالا گیا یا انہیں شکست ہوگئی حالانکہ ایک فرد ہی قتل ہوتا ہے یا بعض کو شکست ہوتی ہے لیکن صیغہ جمع کا لاتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ (حجرات: 4) "بے شک جو لوگ پکارتے ہیں آپ کو حجروں کے باہر سے"۔ مذکور ہے کہ بلانے والا بنو تمیم کا صرف ایک شخص تھا۔ حالانکہ صیغہ جمع کا لایا گیا اسی طرح آیت کریمہ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ میں بھی اپنے دل میں چھپانے والا صرف ایک ابلیس ہی تھا لیکن صیغہ جمع کا لایا گیا۔ اہل عرب کا عمومی اسلوب یہی ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾

"اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سواء ابلیس کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور (داخل) ہوگیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں"۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ جس کے ساتھ اولاد آدم پر احسان جتلایا جا رہا ہے۔ اور خبر دی جا رہی ہے کہ ہم نے فرشتوں کو یہ حکم دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ اس کی تائید بہت سی احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک تو حدیث شفاعت ہے جس کا ابھی ابھی اوپر ذکر ہوا ہے۔ دوسری حدیث موسیٰ ہے جس میں آپ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں یہ درخواست پیش کی اے رب! مجھے آدم علیہ السلام کی زیارت نصیب ہو جو ہمیں اور اپنے آپ کو جنت سے نکالنے کا سبب بنے تھے۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا آپ وہ آدم ہیں جن کا جسد اطہر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا پھر اس میں روح پھونکی اور ملائکہ سے سجدہ کروایا (آخر تک) (اس حدیث کی تفصیلات آگے ذکر کی جائیں گی)۔ ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں کے ایک قبیلہ سے تھا۔ جنہیں جنات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش ایسی آگ سے ہوئی ہے جس میں دھواں نہیں۔ اس کا نام حارث تھا اور یہ جنت کا خازن تھا۔ دیگر تمام فرشتے نور سے پیدا ہوئے۔ وہ جنات جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے آگ کے شعلوں سے پیدا ہوئے تھے جبکہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ سب سے پہلے جنات زمین میں آباد ہوئے۔ دنگا فساد اور خون ریزی اور باہم جنگ وجدل کرتے رہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابلیس کی قیادت میں فرشتوں کی اس نسل (جنات) کا ایک لشکر بھیجا۔ ابلیس نے اپنے ہمراہیوں سمیت ان پر حملہ کیا اور انہیں مار مار کر سمندری جزیروں اور پہاڑوں کی طرف بھگا دیا۔ یہ کارنامہ انجام دینے سے ابلیس کے دل میں فخر پیدا ہوا۔ وہ کہنے لگا میں نے وہ کام کیا ہے جسے ابھی تک کسی نے نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کی یہ بات جان لی لیکن فرشتے اس بات سے لاعلم تھے حالانکہ وہ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چنانچہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان فرشتوں کو بتایا کہ میں زمین میں اپنا نائب پیدا کرنے والا ہوں تو وہ جواباً کہنے لگے کیا تو ایسے شخص کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو جنوں کی طرح اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ تو نے ہمیں بھی تو اسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی مجھے ابلیس کے دل کے غرور کا پتہ ہے حالانکہ تم نہیں جانتے۔ پھر آدم علیہ السلام کا خمیر اٹھایا گیا جو کہ ابتداء پاک لیس دار کیچڑ تھا۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا۔ آپ کا جسد خاکی چالیس روز اسی طرح پڑا رہا ابلیس آتا تھا اور اپنے پاؤں سے اس پر ٹھوکر لگاتا تو وہ بجنے لگتی اور اس میں آواز پیدا ہوتی۔ اسی کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا۔ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (رحمٰن: 14) "بجنے والی مٹی سے ٹھیکری کی مانند"۔ یعنی جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو۔ وہ منہ سے داخل ہوتا اور

پیچھے کے سوراخ سے نکل جاتا۔ پیچھے سے داخل ہوتا (اور منہ کے راستے نکل جاتا۔ پھر کہتا کہ درحقیقت تیری کوئی حیثیت نہیں۔ اگر مجھے تم پر مسلط کیا گیا تو تمہیں ضرور ہلاک کردوں گا اور اگر تمہیں مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں لازماً تیری حکم عدولی کروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکی وہ سر کی طرف سے نیچے کو آئی جسم کے جس حصے تک پہنچتی رہی گوشت اور خون بنتا گیا جب ناف تک پہنچی تو آپ اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ فوراً اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہ سکے اسی کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیاء: 37) ''انسان کی سرشت میں ہی جلد بازی ہے'' بطور تنبیہ فرمایا کہ اسے رنج وخوشی کسی حالت میں بھی قرار نہیں۔ جب روح سارے جسم میں سرایت کر گئی تو آدم علیہ السلام کو چھینک آئی اور آپ علیہ السلام نے اللہ کے الہام سے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''یَرْحَمُكَ اللّٰهُ یٰاٰدَمُ'' (اے آدم اللہ تم پر رحم فرمائے) پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابلیس کے ساتھی فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ آسمانوں کے فرشتوں کو یہ حکم نہ تھا۔ تو ان سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ماسوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور تکبر کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اسے سجدہ نہیں کروں گا۔ میں تو اس سے بہتر، عمر رسیدہ اور تخلیق کے اعتبار سے قوی اور مضبوط ہوں۔ مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔ آگ مٹی سے زیادہ طاقتور ہے۔ سجدہ سے انکار کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ہر قسم کی خیر و برکت سے مایوس کر دیا (اسی بنا پر اسے ابلیس کہا جاتا ہے) اور اس کی نافرمانی کی سزا کے طور پر اسے شیطان مردود اور راندۂ بارگاہ بنا دیا۔ پھر آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھائے۔ یہ وہ اسماء تھے جو اب لوگوں میں عام معروف ہیں۔ جیسے انسان، چوپائے، زمین، میدان، سمندر، پہاڑ، گدھا وغیرہ۔ پھر انہی اسماء کو ان فرشتوں کے سامنے پیش کیا جو ابلیس کے ساتھ تھے جنہیں آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ یعنی مجھے ان اشیاء کے اسماء سے آگاہ کرو اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں نے زمین میں خلیفہ نہیں بنایا۔ جب فرشتوں کو اپنی سابقہ بات پر اللہ تعالیٰ کی خفگی کا علم ہوا تو وہ کہنے لگے کہ خدایا تو پاک ہے تیرے سوا غیب کوئی نہیں جان سکتا۔ ہم توبہ کرتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ ہم غیب دان نہیں۔ ہم صرف وہی جان سکتے ہیں جو تو ہمیں بتائے جیسے تو نے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم انہیں ان تمام چیزوں کے نام بتا دو۔ چنانچہ انہوں نے بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے فرشتو! کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ آسمان وزمین کے غیب کا جاننے والا صرف میں ہی ہوں اور کوئی نہیں میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپائے ہوئے ہو۔ یعنی ابلیس نے اپنے دل میں جو کبر اور غرور چھپا رکھا تھا میں اس سے بھی باخبر تھا۔ لیکن یہ قول بھی غریب ہے اور اس میں ایسی باتیں ہیں جن میں نظر ہے ان کو اگر تفصیل سے بیان کیا جائے تو مضمون طویل ہو جائے گا۔ اس کی سند حضرت ابن عباس تک وہی ہے جس سے ان کی مشہور تفسیر مروی ہے۔ سدی نے ابن عباس، ابن مسعود اور چند صحابہ کرام کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مخلوق کی پیدائش سے فارغ ہوئے تو عرش بریں پر جلوہ فرمایا۔ ابلیس کو آسمان دنیا کا بادشاہ بنایا۔ یہ ان فرشتوں کے قبیلہ سے تھا جنہیں جن کہا جاتا ہے ان کو جنات اس لیے کہتے تھے کہ یہ جنت کے خازن تھے ابلیس بھی اپنی حکومت کے ساتھ ساتھ جنت کا خازن تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال گذرا کہ اللہ نے مجھے ہرگز یہ عطا نہیں فرمایا مگر اس لیے کہ مجھے ملائکہ پر امتیاز حاصل ہے۔ جب اس کے دل میں تکبر جاگزیں ہوا تو اللہ تعالیٰ اس پر آگاہ ہو گیا۔ چنانچہ فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی اے باری تعالیٰ! وہ خلیفہ کون ہوگا۔ فرمایا زمین میں اس کی اولاد ہوگی۔ ایک دوسرے پر حسد کریں گے اور آپس میں قتل وغارت کریں گے۔ تو انہوں نے عرض کی اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا...... فرمایا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی ابلیس کے بارے میں مجھے علم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو مٹی لانے کیلئے زمین کی طرف بھیجا۔ تو زمین نے کہا میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ سے کچھ گھٹائے یا مجھے عیب دار کرے۔

چنانچہ وہ مٹی لیے بغیر واپس چلے گئے۔ اور عرض کی اے رب اس نے تیری پناہ طلب کی تو میں نے اسے پناہ دے دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میکائیل علیہ السلام کو بھیجا زمین نے ان سے بھی پناہ طلب کی تو انہوں نے پناہ دے دی۔ وہ بھی واپس چلے گئے اور بارگاہ الٰہی میں حضرت جبریل والی بات دہرادی۔ پھر ملک الموت کو بھیجا۔ اس نے ان سے بھی پناہ طلب کی۔ لیکن انہوں نے کہا میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ واپس چلا جاؤں اور اس کے امر کو بجا نہ لاؤں۔ چنانچہ انہوں نے تمام روئے زمین سے سرخ، سفید اور سیاہ مٹی لے کر اسے ملا دیا۔ اسی وجہ سے بنو آدم کی رنگت مختلف ہوتی ہے۔ وہ خالص مٹی لے کر گئے تھے پھر اس میں چکنا پن پیدا ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا (اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ...... "میں کیچڑ سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے"۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تاکہ ابلیس تکبر نہ کرے۔ آپ کا جسد مبارک چالیس سال تک مٹی کی حالت میں رہا۔ فرشتے اس کے پاس سے گذرتے اور اسے دیکھ کر مرعوب ہو جاتے۔ ابلیس سب سے زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے ٹھوکر مارتا۔ تو اس میں اس طرح کی آواز پیدا ہوتی جیسے مٹی کے برتن میں ہوتی ہے۔ وہ کہتا تجھے کسی کام کے لئے بھی نہیں پیدا کیا گیا۔ اس کے منہ سے داخل ہو کر سرین کے راستے نکل جاتا اور فرشتوں سے کہتا اس سے مت ڈرو۔ تمہارا رب بے نیاز ہے اور یہ کھوکھلا ہے۔ اگر مجھے اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ جب اس میں روح پھونکنے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ جب میں اس میں روح پھونکوں تو اسے سجدہ کرنا۔ جب اس میں روح پھونکی تو وہ سر کی جانب سے داخل ہوئی حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آئی۔ ملائکہ نے کہا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہو۔ آدم علیہ السلام نے یہی فرمایا پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جواباً فرمایا "يَرْحَمُكَ اللّٰهُ" جب روح آنکھوں تک پہنچی تو جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا۔ پھر جب پیٹ تک پہنچی تو کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ روح کے پاؤں تک پہنچنے سے پہلے ہی اٹھنا چاہا اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیاء:37) "انسان کی سرشت میں ہی جلد بازی ہے"۔ ابلیس کے سوا تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور زمرۂ کفار میں شامل ہو گیا۔ اللہ نے اسے فرمایا کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے۔ وہ (گستاخ) بولا میں اس سے بہتر ہوں میں مٹی سے پیدا ہونے والے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا۔ اس سے نکل جاؤ تمہیں تکبر نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم نکل جاؤ تم ذلیل ہو۔ "صِغَارٌ" کا معنی رسوائی اور ذلت ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ...... (اعراف:13۔ ص75) یہ اسناد سدی کی تفسیر میں صحابہ کرام تک مشہور ہے۔ اس میں بہت سی اسرائیلیات ہیں۔ بعض مدرج ہیں صحابہ کرام کا کلام نہیں یا انہوں نے متقدمین کی کتب سے اخذ کیا ہو گا۔ واللہ اعلم۔ حاکم نے اپنی مستدرک میں بعینہٖ اسی سند کے ساتھ بہت سی اشیاء ذکر کی ہیں اور کہتے ہیں یہ بخاری کی شرط پر ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ ابلیس اس خطاب میں داخل تھا۔ کیونکہ اگرچہ وہ ان کی جنس سے نہ تھا لیکن انہی جیسا اور ان جیسے افعال کرنے والا تھا۔ اس لیے ان کے خطاب میں شامل تھا۔ اور حکم الٰہی کی مخالفت کی بنا پر مذمت کا حقدار ٹھہرا۔ اس مسئلہ کی تفصیل ان شاء اللہ العزیز آگے آئے گی۔

"اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ" محمد بن اسحٰق ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں کہ نافرمانی اور حکم عدولی سے قبل وہ فرشتوں سے تھا اس کا نام عزازیل تھا۔ یہ زمین کا باشندہ تھا۔ اجتہاد اور علم میں تمام فرشتوں سے بڑھ کر تھا۔ یہی چیز اس کے غرور وتکبر کا باعث بنی۔ اس کا تعلق جنوں سے تھا۔ ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں کہ ابلیس کا نام

عزازیل تھا۔ یہ چار پروں والے اشراف فرشتوں سے تھا۔ پھر مایوسی کی بنا پر ابلیس بنا۔ حضرت ابن جریج کی روایت میں ہے کہ یہ اشراف ملائکہ کے قبیلہ سے، جنت کا خازن، آسمان دنیا اور زمین کا سلطان تھا۔ حضرت ضحاک کی روایت میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت صالح کی روایت میں ہے کہ ملائکہ کا ایک قبیلہ جن کہلاتا ہے۔ ابلیس انہی سے تھا۔ قتادہ نے حضرت سعید بن مسیّب سے نقل کیا ہے کہ ابلیس آسمان دنیا کے فرشتوں کا سردار تھا۔ ابن جریر لکھتے ہیں کہ حضرت حسن کا قول ہے کہ ابلیس جنوں سے نہ تھا وہ جنوں کی اصل ہے جس طرح آدم علیہ السلام تمام انسانوں کی اصل ہیں۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا یہی قول ہے۔ حضرت شہر بن حوشب سے مروی ہے کہ ابلیس ان جنات سے تھا جنہیں فرشتوں نے مار بھگایا تھا۔ فرشتے اسے گرفتار کر کے آسمان پر لے گئے (رواہ ابن جریر)۔ حضرت سعد بن مسعود کہتے ہیں فرشتے جنوں سے لڑائی کرتے تھے۔ ابلیس گرفتار ہو گیا۔ وہ کم سن تھا۔ ملائکہ کے ساتھ مل کر عبادت کرتا تھا۔ جب انہیں آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا۔ انہوں نے تو سجدہ کر لیا لیکن ابلیس نے انکار کر دیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ) ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک مخلوق کو پیدا فرمایا اور انہیں آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے انکار کر دیا اللہ تعالیٰ نے ایک آگ بھیجی۔ اس نے انہیں جلا دیا۔ پھر ایک دوسری مخلوق کو پیدا کیا اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ ان کے انکار وہ بھی جلا دیئے گئے۔ پھر تیسری مخلوق پیدا کی انہوں نے حکم الٰہی کی تعمیل کی۔ ابلیس سجدہ سے انکار کرنے والوں میں سے تھا۔ لیکن یہ اثر غریب ہے۔ اس کی اسناد بھی تقریباً غیر صحیح ہے۔ اس کا ایک راوی مبہم ہے اس وجہ سے یہ روایت قابل حجت نہیں۔ واللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ کافرین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے انکار کیا تو آگ نے انہیں جلا دیا۔ حضرت ابوالعالیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد نافرمان ہیں۔ سدی لکھتے ہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی اور وہ بعد میں ہوں گے۔ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے کہ ابلیس کی آفرینش کفر وضلالت پر تھی۔ اس نے ملائکہ کے کام کیے لیکن انجام کار وہ اپنی اصلیت (کفر) پر واپس آ گیا۔ تو اللہ نے فرمایا: وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ، وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت تھی۔ اللہ رب العزت نے آدم علیہ السلام کو یہ اعزاز بخشا کہ فرشتوں نے بھی انہیں سجدہ کیا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ سجدہ تحیۃ، سلام اور عزت وتکریم تھی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا.......... قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا (یوسف:100) ''اور (جب شاہی دربار میں پہنچے تو) آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے اور (یہ منظر دیکھ کر) یوسف نے کہا اے میرے پدر بزرگوار! یہ تعبیر ہے میرے خواب کی جو عرصہ ہوا میں نے دیکھا تھا میرے رب نے اسے سچا کر دکھایا''۔ سابقہ امتوں کیلئے سجدہ کرنا جائز تھا۔ لیکن ہمارے لئے یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قول ہے میں شام گیا تو وہاں کے لوگوں کو اپنے اساقفہ اور علماء کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! (ﷺ) آپ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ (ﷺ) کو سجدہ کیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں کسی انسان کو انسان کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت دینے والا ہوتا تو عورت کو اپنے خاوند کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا کیونکہ اس کا بہت بڑا حق ہے۔ امام رازی نے اسے ہی ترجیح دی ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہی تھا۔ اور آدم علیہ السلام بطور قبلہ تھے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل:78) ''نماز ادا کریں سورج ڈھلنے کے بعد'' لیکن یہ بات محل نظر ہے۔ پہلے قول کا اولیٰ ہونا ہی زیادہ ظاہر معلوم ہوتا ہے۔ یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے تکریم، عظمت، احترام اور سلام تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت تھی۔ کیونکہ درحقیقت اس کے حکم کی بجا آوری تھی۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں اسی

قول کو قوی قرار دیا ہے اور دیگر دونوں قولوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان میں سے ایک قول آدم علیہ السلام کا بطور قبلہ ہونا کیونکہ اس میں کوئی شرف نہیں دوسرا قول یہ ہے کہ سجدے سے مراد عاجزی ہے نہ کہ جھکنا اور پیشانی کو زمین پر رکھنا اور یہ ضعیف ہے۔ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ اللہ کے دشمن ابلیس نے آدم علیہ السلام کے مرتبہ کو دیکھ کر حسد کیا۔ اور کہنے لگا میں آگ سے ہوں اور یہ مٹی سے سب سے پہلا گناہ یہی تکبر ہے جو عدو الٰہی ابلیس سے سرزد ہوا۔ (میں کہتا ہوں) صحیح حدیث میں ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ابلیس کے دل میں کبر (کفر) اور عناد تھا جو اس کے جناب رحمت اور حضرت قدس سے دھتکارے جانے کا سبب بنا۔ بعض کے نزدیک یہاں کان صار کے معنی میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ''پس وہ ہو گیا ڈوبنے والوں سے'' (ہود:43)۔ اور فرمایا فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، '' ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے'' (بقرہ:34)۔ ایک شاعر کا قول ہے۔

بِتَيْهَاءَ قَفْرٍ وَ الْمَطِيُّ كَاَنَّهَا قَطَا الْحَزْنِ قَدْ كَانَتْ فِرَاخًا بُيُوْضُهَا

اس شعر میں ''کانت'' صارت کے معنی میں ہے۔ ابن فورک کے نزدیک یہاں تقدیر کلام یوں ہے ''وَقَدْ كَانَ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ'' قرطبی نے اسے ہی ترجیح دی ہے۔ اور یہاں ایک مسئلہ ذکر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں'' ہمارے علماء کا قول ہے کہ کسی غیر نبی سے اگر کچھ کرامات یا خوارق للعادت باتیں ظاہر ہوں تو یہ چیز اس کی ولایت کی دلیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض صوفیاء اور رافضی اس کے قائل ہیں۔ یہ قرطبی کے الفاظ ہیں پھر اپنے موقف کی تائید میں استدلال قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہم وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شخص جس سے خلاف عادت بات ظاہر ہوئی ہے ایمان کی حالت میں اللہ سے جا ملے۔ میں کہتا ہوں بعض علماء نے یہ دلیل دی ہے کہ خلاف عادت بات بعض اوقات غیر ولی بلکہ فاجر اور کافر سے بھی صادر ہو جاتی ہے۔ جس طرح کہ حضور ﷺ نے اپنے دل میں آیت کریمہ: فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (دخان:10) چھپا کر ابن صیاد کافر سے پوچھا کہ میرے دل میں کیا ہے تو وہ کہنے لگا ''دخ'' یعنی دھواں۔ بعض روایات میں ہے کہ غصہ کے وقت وہ اتنا پھول جاتا تھا کہ اس کے جسم سے تمام راستہ بھر جاتا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اسے قتل کیا۔ اسی طرح احادیث میں یہ بات مذکور ہے کہ دجال لعین سے بہت سی عجیب دغریب باتیں ظاہر ہوں گی مثلاً آسمان سے بارش برسانا، زمین سے فصل اگانا، زمین کے خزانوں کا اس کے پیچھے چلنا، نوجوان کو قتل کر کے پھر اسے زندہ کرنا وغیرہ ہولناک باتیں جو اس سے سرزد ہوں گی۔ حضرت امام شافعی کا قول ہے کہ حضرت لیث بن سعد فرمایا کرتے تھے۔'' جب تم آدمی کو پانی پر چلتے ہوئے یا ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھو تو دھوکہ میں نہ پڑو۔ جب تک اس کے معاملہ کو کتاب وسنت پر پیش نہ کرلو۔'' امام رازی اور دیگر علماء نے مفسرین کے ان دو اقوال کو ذکر کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا یہ حکم صرف زمین کے فرشتوں کو تھا یا آسمانوں اور زمین کے سب فرشتوں کیلئے تھا۔ دونوں اقوال کو ایک گروہ نے ترجیح دی ہے۔ آیت کریمہ کا ظاہر بھی اس حکم کے عموم کا متقاضی ہے۔ ان چار وجوہات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم عام تھا۔ واللہ اعلم۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶

'' اور ہم نے فرمایا اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں اور دونوں کھاؤ اس سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو اور مت

نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے۔ پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے اس درخت کے باعث اور نکلوا دیا ان دونوں کو وہاں سے جہاں وہ تھے اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے وقت مقرر تک''۔

آدم علیہ السلام پر انعام واکرام کا بیان بدستور جاری ہے بتایا جا رہا ہے کہ فرشتوں کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا ماسوائے ابلیس کے سبھی نے سجدہ کیا۔ انہیں کہا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں۔ اور جو چاہیں تناول کریں۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ! کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا'' ہاں نبی اور رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ بالمشافہ ان سے ہم کلام ہوتے تھے۔

اُسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ اس جنت کے بارے میں جہاں حضرت آدم علیہ السلام قیام پذیر رہے تھے علماء کا اختلاف ہے کیا یہ آسمان میں ہے یا زمین میں۔ اکثر علماء کا قول پہلا ہے۔ قرطبی نے معتزلہ اور قدریہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ زمین میں ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔ آیت کریمہ کے سیاق وسباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حوا کی پیدائش حضرت آدم علیہ السلام کے جنت کے داخلے سے قبل ہو چکی تھی۔ اس کی تصریح محمد بن اسحٰق نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں جب اللہ تعالیٰ ابلیس کو عتاب کرنے سے فارغ ہوئے تو آدم علیہ السلام کی طرف توجہ فرمائی اور انہیں تمام اشیاء کے اسماء سکھا دیئے۔ اور فرمایا: یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْھُمْ سے لے کر (اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ) فرماتے ہیں پھر آدم علیہ السلام پر اونگھ طاری کی گئی۔ جیسا کہ اہل کتاب یہود وغیرہ علماء سے بروایت ابن عباس وغیرہ مروی ہے۔ اور آپ علیہ السلام کے بائیں پہلو سے ایک پسلی لی گئی اس کی جگہ گوشت بھر دیا گیا۔ اس دوران آدم علیہ السلام سوئے رہے حتیٰ کہ آپ کی اس پسلی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی زوجہ حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔ انہیں عورت بنایا تاکہ آپ آدم علیہ السلام کے لئے باعث تسکین ہوں۔ جب آپ کی اونگھ ختم ہوئی اور بیدار ہوئے تو انہیں اپنے پہلو میں پایا۔ اور بقول بعض فرمایا (واللہ اعلم) ''میرا گوشت، میرا خون اور میری بیوی ہے''۔ چنانچہ انہیں دیکھ کر آپ علیہ السلام خوش ہوئے اور آپ کے دل میں محبت پیدا ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے آپ کا نکاح فرما دیا اور انہیں آپ علیہ السلام کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنایا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں جنت میں داخلے کا حکم عطا فرمایا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت حوا علیہا اسلام کی پیدائش آدم علیہ السلام کے جنت میں داخلے کے بعد ہوئی۔ جیسا کہ سدی نے ایک روایت میں ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام سے نقل فرمایا ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالا گیا اور آدم علیہ السلام کو اس میں بسایا گیا۔ آپ علیہ السلام تن تنہا اس میں گھومتے پھرتے تھے۔ آپ کا کوئی ساتھی نہ تھا جو آپ کا مونس وغم خوار ہوتا۔ تا آنکہ آپ علیہ السلام سو گئے۔ جب آنکھ کھلی تو آپ کے سر کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا تو کون ہے؟۔ حضرت حوا علیہا السلام نے فرمایا میں ایک عورت ہوں۔ آپ نے فرمایا تمہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ حضرت حوا نے جواب دیا۔ تاکہ آپ مجھ سے تسکین حاصل کریں۔ فرشتے دیکھ رہے تھے انہوں نے پوچھا اے آدم ان کا نام کیا ہے؟ حضرت آدم نے فرمایا ''حَوَّا'' انہوں نے پوچھا اس نام کی کیا وجہ ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا کیونکہ یہ ایک زندہ چیز سے پیدا کی گئی ہیں۔ اس وقت آواز آئی یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ ...... وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ۔ یہ اللہ کی طرف سے خبر اور آدم علیہ السلام کا امتحان تھا۔ اس درخت کی ماہیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ (1) سدی اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ وہ درخت جس سے حضرت آدم علیہ السلام کو روکا گیا تھا، انگور کی بیل تھی۔ سعید بن جبیر، سدی، شعبی، جعدۃ بن ہبیرہ، محمد بن قیس کی یہی رائے ہے سدی نے ابن عباس،

ابن مسعود اور بعض صحابہ کرام سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ یہود کا خیال ہے کہ یہ گندم کا پودا تھا۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ سنبلہ (خوشبودار گھاس) کا پودا تھا۔(2) عبدالرزاق نے بھی حضرت ابن عباس سے یہی روایت فرمایا ہے محمد بن اسحٰق نے بھی یہی روایت کیا ہے۔ابن جریر لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابوالجلد کی طرف لکھا کہ وہ درخت کون سا ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام نے تناول فرمایا تھا۔ اسی طرح وہ درخت کون سا ہے جس کے پاس حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ فرمائی تھی۔ انہوں نے جواباً لکھا کہ وہ درخت جس کے کھانے سے آپ کو منع فرمایا گیا تھا سنبل کا تھا اور جس کے پاس آپ علیہ السلام نے توبہ فرمائی تھی زیتون کا تھا۔ حضرات حسن بصری، وھب بن منبہ، عطیہ عوفی، ابو مالک، محارب بن دثار اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا یہی قول ہے۔ محمد بن اسحٰق نے بعض اہل یمن کے حوالے سے حضرت وھب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ یہ گندم کا پودا تھا لیکن جنت میں اس کا دانہ...... جھاگ سے نرم اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ سفیان ثوری نے روایت کیا ہے کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ ابن جریر نے حضرت مجاہد سے نقل فرمایا ہے کہ یہ انجیر کا درخت ہے۔ قتادہ اور ابن جریج کا بھی یہی قول ہے۔ ابوجعفر رازی نے حضرت ابوالعالیہ سے نقل فرمایا ہے کہ وہ درخت جس کے کھانے سے روکا گیا تھا حدث (انسانی ضرورت) کا باعث ہوتا تھا اور جنت میں حدث کا وجود نہیں۔ حضرت عبدالرزاق اپنی سند میں روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت وہب بن منبہ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی زوجہ محترمہ کو جنت میں آباد فرمایا اور اس درخت کے قریب جانے سے روکا۔ اس درخت کی شاخیں ایک دوسرے سے جھنڈ بنائے ہوئے تھیں۔ اس کا پھل فرشتے کھاتے تھے تاکہ ہمیشہ رہیں۔ اور اس کے کھانے سے آدم علیہ السلام اور آپ کی زوجہ کو منع کیا گیا تھا۔ اس درخت کی تفسیر میں یہ چھ اقوال ہیں۔ علامہ امام ابوجعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "صحیح یہ ہے کہ اللہ رب العزت جل مجدہ نے جنت کے کسی مخصوص درخت کے قریب جانے سے حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اہلیہ کو منع فرمایا تھا۔ کیونکہ اللہ جل جلالہ نے قرآن اور سنت صحیحہ میں اس کی طرف اشارہ نہیں فرمایا۔ ایک قول یہ ہے کہ گندم کا پودا تھا۔ دوسرا قول ہے کہ انگور کی بیل تھی ایک تیسرا قول یہ ہے کہ یہ انجیر کا درخت تھا۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہی کوئی ایک درخت ہو۔ لیکن اس کا علم ہو جانے سے کوئی اہم فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور اس کی تعیین نہ کر سکنے کی صورت میں کوئی نقصان بھی نہیں۔ واللہ اعلم (1) امام رازی وغیرہ نے بھی اسے ہی ترجیح دی ہے اور یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے (2) فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا یہ بھی ممکن ہے کہ عنہا کی ضمیر جنت کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اس صورت میں کلام کا معنی ہوگا فَاَزَالَهُمَا یعنی ان دونوں کو جنت سے علیحدہ کر دیا۔ عاصم کی قرأت یہی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا مرجع قریب ترین چیز ہو اور وہ درخت ہے۔ اس صورت میں کلام کا مفہوم اس طرح ہوگا جیسے حسن اور قتادہ کا قول ہے۔ فَاَزَلَّهُمَا مِنْ قِبَلِ الزَّلَلِ یعنی اسی درخت کے سبب شیطان نے ان کو بہلا پھسلا لیا۔ لفظ عن سبب کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد "يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ" (الذاریات:9) "منہ پھیرے ہے اس قرآن سے جس کا منہ ازل سے پھیر دیا گیا ہے"۔ (اَیْ يَصْرِفُ بِسَبَبِهٖ مَنْ هُوَ مَاْفُوْكٌ) اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ یعنی لباس، کشادہ جگہ، نفیس رزق اور راحت و آرام سب کچھ چھن گئے۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا ...... مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ یعنی یہاں رہنا، روزی حاصل کرنا وغیرہ ایک خاص وقت اور معین مقدار تک ہے۔ اس کے بعد قیامت آجائے گی۔ مفسرین سدی، ابوالعالیہ، وہب بن منبہ وغیرہ نے یہاں اسرائیلی روایات ذکر فرمائی ہیں۔ جیسے سانپ اور ابلیس کا قصہ۔ ابلیس کیسے جنت میں داخل ہوا اور آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ ہم اس واقعہ کو بالتفصیل سورۂ اعراف میں بیان کریں گے۔ وہاں اس واقعہ کا کسی قدر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ واللہ الموفق۔

ابن ابی حاتم نے یہاں ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو طویل القامت پیدا فرمایا۔ آپ کے سر پر کھجور کی طرح گھنے بال تھے۔ جب آپ نے اس درخت کو چکھا تو آپ کا لباس اتر گیا۔ جب ستر باقی نہ رہا تو جنت میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ایک درخت میں آپ کے بال اٹک گئے۔ اور آپ اس کے ساتھ الجھ کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی اے آدم کیا مجھ سے بھاگتے ہو؟ عرض کیا نہیں۔ بار الہا! میں تو شرم اور استحیاء کی وجہ سے منہ چھپائے ہوئے ہوں۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! میرے جوار قدس سے چلے جاؤ میری عزت کی قسم، اس میں میرے نافرمان نہیں رہ سکتے۔ اگر میں زمین بھر مخلوق پیدا کروں اور وہ میری نافرمانی کریں تو یقیناً میں انہیں نافرمانوں کے گھر پہنچا دوں گا۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس میں قتادہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے مابین انقطاع بلکہ اعضال ہے۔ حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام عصر سے مغرب تک کا وقت جنت میں رہے۔ پھر لکھتے ہیں یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے لیکن انہوں نے اسے بیان نہیں کیا۔ عبد بن حمید اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں دن کی ایک ساعت بھر رہے یہ ساعت دنیا کے حساب سے ایک سو تیس سال کے برابر تھی۔ ابوجعفر رازی نے ربیع بن انس سے نقل کیا ہے کہ نویں یا دسویں ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج ہوا۔ آپ اپنے ساتھ جنت کے درخت کی ایک ٹہنی لائے۔ جنت کے پتوں کا ایک تاج تھا۔

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا سدی کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہند میں اترے۔ آپ کے پاس حجر اسود اور مٹھی بھر جنت کے پتے تھے۔ وہ سب ہندوستان میں پھیلا دیئے۔ اس سے خوشبو کا درخت پیدا ہوا ہندوستان سے درآمد شدہ خوشبو کی اصل وہی درخت تھے جو جنت کے پتوں سے پیدا ہوئے۔ جنت سے نکلتے وقت از راہ حسرت اپنے ساتھ مٹھی بھر پتے لے لیے تھے۔ عمران بن عُیینہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم ہند کے مقام دحنا میں اترے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو مکہ اور طائف کے درمیان دحنا کے مقام پر اتارا گیا۔ حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ حضرت آدم کو ہند میں اور حضرت حوا کو جدہ میں ابلیس کو بصرہ سے چند میل کے فاصلہ پر دستمیسان میں اور سانپ کو اصفہان میں اتارا گیا۔ (بروایت ابن ابی حاتم) ایک دوسری روایت ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم کو صفا پر حضرت حواء کو مروہ پر اتارا گیا۔ رجاء بن سلمہ کا قول ہے کہ اترتے وقت آدم علیہ السلام کے ہاتھ گھٹنوں پر تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ ابلیس انگلیوں میں انگلیاں ڈالے آسمان کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے تھا۔ حافظ عبدالرزاق نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا تو ہر چیز سکھائی۔ اور جنت کے کچھ پھل دیئے تمہارے یہ پھل جنت کے پھلوں سے مشابہ ہیں مگر یہ تبدیل ہو جاتے ہیں اور وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ زہری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین دن جمعہ کا ہے۔ اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اسی دن جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن جنت سے نکالے گئے (1)۔ (بروایت مسلم ونسائی) امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کئی اعتبار سے ہر قسم کے گناہوں پر شدید وعید ہے۔ ذرا خیال فرمائیے معمولی سی لغزش پر آدم علیہ السلام کو کس قدر سزا ہوئی۔ حالانکہ آپ گناہوں سے شدید ڈرتے تھے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

يَا نَاظِرًا يَرْنُوْ بِعَيْنَيْ رَاقِدٍ ۔۔۔ وَ مُشَاهِدًا لِلْاَمْرِ غَيْرِ مُشَاهِدٍ

1۔ مسلم: 585 (کتاب الجمعہ)

تَصِلُ الذُّنُوْبَ اِلَى الذُّنُوْبِ وَ تَرْتَجِیْ دَرَجَ الْجِنَانِ وَ نَیْلَ فَوْزِ الْعَابِدِ
اَنَسِیْتَ رَبَّكَ حِیْنَ اَخْرَجَ اٰدَمًا مِنْهَا اِلَى الدُّنْیَا بِذَنْبٍ وَاحِدِ

''اے ناظر! تم گناہوں پر گناہ کیے جاتے ہو اور جنت کی امید اور عابد و زاہد کا مقام حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ آدم علیہ السلام کو محض ایک گناہ کے سبب جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ ابن قاسم کا قول ہے۔''

وَلٰكِنَّنَا سَبْیُ الْعَدُوِّ فَهَلْ تَرٰى نَعُوْدُ اِلٰى اَوْطَانِنَا وَ نُسَلِّمُ

ہم تو یہاں دشمن کی قید میں ہیں۔ دیکھئے کب سلامتی کے ساتھ اپنے وطن پہنچیں۔ رازی نے فتح موصلی سے روایت کیا ہے کہ ہم جنتی تھے ابلیس کی قید میں دنیا میں آپڑے اب ہمارے لیے سوائے رنج و غم کے کچھ نہیں یہاں تک کہ ہم اپنے اصلی گھر پہنچ جائیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آدم کی جنت آسمان میں تھی۔ جیسے جمہور علماء کا قول ہے۔ تو ابلیس کا داخلہ اس میں کس طرح ممکن ہوا حالانکہ وہ تو وہاں سے دھتکارا جا چکا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ علماء جو اس بات کے قائل ہیں کہ وہ جنت جس میں آدم علیہ السلام رہتے تھے زمین میں تھی نہ کہ آسمان میں، انہوں نے بعینہ یہی استدلال ذکر کیا ہے۔ اس کی وضاحت ہم نے اپنی کتاب البدایۃ والنھایۃ کے شروع میں کر دی ہے۔ جمہور نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ بطور تکریم جنت میں اس کا داخلہ بند تھا چوری چھپے اور اہانت کے ساتھ ممتنع نہیں تھا۔ اسی لیے بعض علماء نے ذکر کیا ہے جیسے تورات میں آیا ہے کہ وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے جنت کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر وسوسہ ڈالا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس نے زمین سے ہی ان کے دل میں وسوسہ ڈالا حالانکہ وہ آسمان میں تھے۔ زمخشری وغیرہ نے یہی ذکر کیا ہے۔ قرطبی نے یہاں سانپ کے بارے اور اسے قتل کر دینے کے حکم کے بارے میں احادیث ذکر فرمائی ہیں۔ جو برموقع بہت ہی مفید ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷

''پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا''۔

کہا جاتا ہے کہ ان کلمات کا ذکر خود قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اعراف:23) '' دونوں نے عرض کی اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لیے اور نہ رحم فرمائے ہم پر تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے''۔ حضرات مجاہد، سعید بن جبیر، ابو العالیہ، ربیع بن انس، حسن، قتادہ، محمد بن کعب قرظی، خالد بن معدان، عطاء خراسانی اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے یہی مروی ہے ابو اسحٰق سبیعی نے بنو تمیم کے ایک آدمی سے روایت کیا ہے کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور ان کلمات کے بارے میں پوچھا جو حضرت آدم کو سکھائے گئے تھے تو آپ نے فرمایا اس سے مراد احکام حج کا سیکھنا ہے۔ حضرت سفیان ثوری نے عبید بن عمیر سے نقل فرمایا ہے۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا اے رب جو خطا میں نے کی تھی میری پیدائش سے قبل میری تقدیر میں لکھ دی گئی تھی یا از خود میں نے یہ غلطی کی۔ جواب ملا کہ ایجاد نہیں کی بلکہ پہلے سے ہی قسمت میں لکھ لی گئی تھی۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا اے رب! جس طرح تو نے میرے حق میں یہ بات لکھ دی تھی۔ اسی طرح مجھے معاف بھی فرما دے۔ اور کلمات سے مراد یہی ہے۔ سدی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے

کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی اے رب کیا تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا نہیں کیا؟ فرمایا کیوں نہیں۔ عرض کی کیا تو نے مجھ میں اپنی روح نہیں پھونکی فرمایا۔ بالکل اسی طرح ہے۔ عرض کی اگر میں توبہ کرلوں تو مجھے دوبارہ جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ فرمایا ہاں۔ عوفی، سعید بن جبیر اور سعید بن معبد نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ سدی، عطیہ عوفی نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے اس کے مشابہ حدیث ذکر فرمائی ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے' حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی خدایا! اگر میں توبہ کرلوں تو مجھے جنت مل سکتی ہے یا نہیں فرمایا ہاں۔ اور فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ سے مراد یہی ہے۔ اس سند سے یہ حدیث غریب ہے اور اس میں انقطاع ہے۔ ابو جعفر رازی نے حضرت ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو آپ نے عرض کی اے رب اگر میں توبہ کروں اور اصلاح کرلوں تو؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' تب تو تمہیں جنت ملے گی'' یہی وہ کلمات ہیں (رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا......) بھی ان کلمات سے ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے تھے وہ کلمات یہ ہیں۔

(اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ ، اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ ، اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّاحِيْمُ)

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ جو شخص توبہ کرے اور اس کی طرف رجوع کرے وہ اس کی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ '' کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ (تعالیٰ) ہی توبہ قبول فرماتا ہے اپنے بندوں سے''۔ (توبہ: 104) ایک اور جگہ فرمایا: وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ...... (نساء: 110) '' اور جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم کرے اپنے آپ پر''۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا (الفرقان: 71) '' اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے''۔ وغیرہ آیات جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے، توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ یہ اس کا اپنے بندوں پر خصوصی فضل وکرم اور مخلوق پر عموی لطف واحسان ہے (لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ)۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

'' ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام) ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو (تو) وہ دوزخی ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

جنت سے نکالتے ہوئے حضرت آدم، آپ کی زوجہ اور ابلیس کو جو تنبیہ کی گئی تھی اس کا بیان ہو رہا ہے۔ اس سے مراد ذریت آدم ہے کہ ان پر کتابیں نازل ہوں گی، انبیاء اور رسول مبعوث ہوں گے۔ ابو العالیہ کا قول ہے ''هُدًى'' سے مراد انبیاء، مرسلین، معجزات اور دلائل ہیں۔ مقاتل بن حیان کا قول ہے کہ ھدی سے مراد سرکار رسالت مآب ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔ حسن کا قول ہے ھدی سے مراد قرآن

ہے۔ یہ دونوں قول صحیح ہیں ابوالعالیہ کا قول عام ہے۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ یعنی جو میری نازل کردہ کتابوں اور رسولوں پر ایمان لایا۔ (فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ) آخرت میں انہیں کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ (وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ) دنیا کے سابقہ معاملات پر غم زدہ نہ ہوں گے۔ جیسے سورۃ طٰہ میں فرمایا: قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی (طٰہٰ:123) ''حکم ملا دونوں اتر جاؤ یہاں سے اکٹھے، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو وہ نہ بھٹکے گا اور نہ بدنصیب ہوگا''۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ دنیا میں گمراہ نہ ہوں گے اور آخرت میں بدنصیب اور بدبخت نہیں ہوں گے۔ ارشاد فرمایا: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ''اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لئے زندگی (کے جامہ) کو تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے'' (طٰہٰ:124)۔ اسی طرح یہاں ارشاد فرمایا: وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ ...... یعنی وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے نہ تو اس سے نکل سکیں گے نہ ہی کوئی اور پناہ لے سکیں گے۔ ابن جریر نے یہاں دو سندوں سے ایک حدیث ذکر فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''حقیقی دوزخی لوگوں کو نہ موت آئے گی اور نہ وہ (آرام کی) زندگی گذاریں گے۔ لیکن وہ اقوام جو اپنے گناہوں کے سبب دخول فی النار کے مستحق ہو جائیں گی وہ آگ میں جل کر کوئلہ ہو جائیں گی۔ پھر شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔ (مسلم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے)۔ دوسری مرتبہ جو جنت سے نکالے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے معنی کے برعکس اس کا تعلق مابعد کے ساتھ ہے یہ اس لیے کہ یہاں دوسرے احکام بیان کرنا تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لئے ہے جیسے کہتے ہیں (قُمْ قُمْ)۔ بعض دوسرے علماء کا قول ہے کہ پہلی مرتبہ جنت سے آسمان دنیا پر اور دوسری مرتبہ آسمان دنیا سے زمین پر اتارا گیا۔ لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ واللہ اعلم

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۡ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

''اے اولاد یعقوب! یاد کرو میرا وہ احسان جو کیا میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو اور صرف مجھی سے ڈرا کرو اور ایمان لاؤ اس (کتاب) پر جو نازل کی ہے میں نے یہ سچا ثابت کرنیوالی ہے اس کو جو تمہارے پاس ہے اور نہ بن جاؤ تم سب سے پہلے انکار کرنیوالے اسکے۔ اور نہ خریدو تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت اور صرف مجھی سے ڈرا کرو''۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ بنو اسرائیل کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے اور حضور نبی کریم علیہ افضل الصلاۃ واتم التسلیم کی اتباع کرنے کا حکم ارشاد فرما رہا ہے اور ان کے جد امجد اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے انہیں سمجھا رہا ہے۔ اسرائیل ان کا نام تھا۔ کلام کا مفہوم اس طرح ہو سکتا ہے اے اللہ کے فرمانبردار صالح بندے کی اولاد اپنے باپ کی طرح حق کی اتباع کرو۔ یہ اسلوب عام ہے جیسے اہل عرب کہتے ہیں ''اے سخی کے فرزند ایسے کرو۔ یا اے بہادر کے بیٹے بہادروں کا سامنا کرو۔ اور داد شجاعت دو۔ یا اے عالم دین کے بیٹے علم میں کمال پیدا کرو۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔ دوسری جگہ اس طرز کلام کو یوں ادا کیا گیا ہے: ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ

نُوۡحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا (بنی اسرائیل:3) ''اے ان لوگوں کی اولاد! جنہیں ہم نے (کشتی میں) سوار کرایا نوح کے ساتھ'' اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب ہیں جیسے کہ ابوداؤد طیالسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہود کی ایک جماعت سے حضور ﷺ نے دریافت کیا۔ کیا تم جانتے ہو کہ اسرائیل حضرت یعقوب کا نام تھا۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے اللہ گواہ رہنا۔ رجاء بن عمیر مولی ابن عباس کی روایت میں ہے اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ ہیں۔ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ مجاہد کا قول ہے نعمت سے مراد وہ انعامات ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے نیز اس کے علاوہ دیگر نعمتیں جیسے پتھر سے پانی کا چشمہ جاری ہونا، من وسلویٰ کا اترنا، آل فرعون کی غلامی سے نجات وغیرہ جن کا ذکر اس آیت میں نہیں ہے۔ حضرت ابوالعالیہ کا قول ہے کہ 'نعمۃ' سے مراد یہ ہے کہ ان میں انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے یا ان پر کتابیں نازل فرمائیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے ارشاد فرمایا: يٰقَوۡمِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِيۡكُمۡ اَنۡۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ۖۗ وَّاٰتٰٮكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ (مائدہ:20) ''اے میری قوم! یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہوا جب بنائے اس نے تم میں سے انبیاء اور بنایا تمہیں حکمران اور عطا فرمایا تمہیں جو نہیں عطا فرمایا تھا کسی کو سارے جہانوں میں''، یعنی ان کے زمانے میں۔ محمد بن اسحٰق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نعمت سے مراد ابتلاء و آزمائش ہے یعنی قوم فرعون کے ظلم و استبداد سے انہیں نجات بخشی۔

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ وہ وعدہ جو میں نے حضور ﷺ کے بارے میں تم سے لیا تھا کہ جب وہ آئیں تو ان کی تصدیق کرنا تم اپنا وعدہ پورا کرو میں تمہارے گناہوں کو معاف کرنے کا وعدہ پورا کروں گا۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ اس عہد کا ذکر اس آیت کریمہ میں آیا ہے: وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مَعَكُمۡ ؕ لَئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيۡتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِىۡ وَعَزَّرۡتُمُوۡهُمۡ وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَلَاُدۡخِلَـنَّكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ...... (مائدہ:12) ''اور یقیناً لیا تھا اللہ نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار اور فرمایا تھا اللہ تعالیٰ نے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوٰۃ اور ایمان لائے میرے رسولوں پر اور مدد کرتے رہے ان کی اور قرض دیتے رہے اللہ کو قرض حسن تو میں ضرور دور کر دوں گا تم سے تمہارے گناہ اور میں داخل کروں گا تمہیں باغات میں'' بعض دیگر علماء کا قول ہے کہ یہ وہ عہد ہے جس کا ذکر تورات میں ہے کہ بنو اسماعیل میں ایک عظیم الشان نبی مبعوث ہوگا تمام دنیا اس کا دم بھرے گی۔ اور اس سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ جو آپ کی اتباع کرے گا۔ اللہ اس کے گناہ معاف فرمادے گا اور اسے جنت میں داخلہ دیا جائے گا۔ اور دوہرا اجر ملے گا۔ رازی نے بہت سی بشارتوں کا ذکر فرمایا ہے جو سابقہ انبیاء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے بارے میں فرمائی تھیں۔ حضرت ابو العالیہ کا قول ہے کہ بندوں سے عہد سے مراد دین اسلام اور اس کی اتباع ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عہد پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ میں تم سے راضی ہو جاؤں گا اور تمہارے لیے جنت ہے۔ سدی، ضحاک، ابوالعالیہ اور ربیع بن انس کا یہی قول ہے۔

وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ مجھ سے ڈرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کی طرح تم پر بھی میرا سخت عذاب آجائے تمہاری شکلیں بگاڑ دی جائیں اور دیگر طرح طرح کی سزائیں جو ان پر نازل کی گئی تھیں جنھیں تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یہاں ترغیب سے ترہیب کی طرف آرہے ہیں۔ ترغیب وترہیب دونوں طریقوں سے انہیں دعوت دی۔ شاید وہ حق کو قبول کرلیں۔ رسول اکرم ﷺ کی اتباع کریں۔ قرآن کریم سے نصیحت حاصل کریں۔ اس کے اوامر ونواہی کو بجالائیں اور اس میں بیان کردہ واقعات کی تصدیق کریں (وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ

اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ) (ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہے)۔(وَاٰمِنُوْا ......) اسی لیے فرمایا کہ تم سچی کتاب قرآن کریم پر ایمان لاؤ جو محمد ﷺ پر اترا ہے۔ آپ ﷺ امی نبی ہیں۔ عربی النسل ہیں۔ بشیر و نذیر ہیں، سراج منیر کا تاج آپ ﷺ کے سر پر سجایا گیا ہے۔ آپ ﷺ تورات اور انجیل کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ حضرت ابو العالیہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ اے گروہ اہل کتاب! میری نازل کردہ کتاب ہدایت پر ایمان لاؤ۔ چونکہ سابقہ کتب سماویہ تورات اور انجیل میں حضور ﷺ کا ذکر مبارک موجود ہے۔ یہی ان کی تصدیق ہے۔ مجاہد، ربیع بن انس اور قتادہ سے یہی مروی ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ بعض علماء کا قول ہے کہ تم اس کا انکار کرنے والا پہلا فریق نہ بنو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے باوجودیکہ تمہیں علم ہے پھر تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو۔ حضرت ابو العالیہ کا قول ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا علم ہونے کے بعد سب سے پہلے تم ہی اس کا انکار نہ کرو۔ حسن، سدی اور ربیع بن انس کا یہی قول ہے۔ ابن جریر نے پسند کیا ہے کہ "بِهٖ" کی ضمیر کا مرجع قرآن کریم ہے کیونکہ بِمَآ اَنْزَلْتُ میں پہلے اس کا ذکر آچکا ہے۔ دونوں قول صحیح ہیں اور ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں۔

اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ سے مراد بنی اسرائیل میں پہلے انکار کرنے والے ہیں۔ کیونکہ کفار قریش اور دیگر بہت سے عرب اس سے پہلے آپ کا انکار کر چکے تھے۔ بنی اسرائیل میں ان کے پہلا کافر ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہود مدینہ کو ہی سب سے پہلے قرآن کریم نے مخاطب فرمایا تو اب ان کا انکار بنی اسرائیل (اہل کتاب) کی پہلی جماعت کا انکار تھا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ...... فرمایا میری آیات پر ایمان لانے اور میرے رسول کی تصدیق کے بدلے دنیا کا سودا نہ کرو۔ بلاشبہ یہ معاوضہ انتہائی قلیل اور فانی ہے۔ جیسے عبد اللہ بن مبارک نے حضرت حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ قلیل قیمت سے مراد ساری دنیا ہے۔ ابن لہیعہ کا قول ہے کہ آیات سے مراد قرآن کریم اور ثمن قلیل سے مراد دنیا اور اس کی شہوات و خواہشات ہیں۔ سدی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں تھوڑا لالچ نہ کرو اور اللہ کے نام کو نہ چھپاؤ۔ یہ طمع (لالچ) ہی ثمن ہے۔ حضرت ابو العالیہ سے مروی ہے کہ اس پر اجر نہ لو۔ ان کی کتاب میں یہ لکھا ہوا کہ اے ابن آدم بلا معاوضہ علم سکھاؤ جیسے تمہیں مفت میں علم کی دولت عطا کی گئی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تم علم کے خزانوں پر سانپ بن کر نہ بیٹھ جاؤ اور اس کی نشر و اشاعت سے کنارہ کشی نہ کرو اس غرض سے کہ اس پُر فریب حقیر اور عارضی دنیا میں تمہاری علمی سیادت کا سکہ جما رہے۔ سنن ابو داؤد میں حضرت بوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔" جو شخص اس علم کو سیکھے جس سے خدا کی رضامندی حاصل ہوتی ہے اور وہ اسے حصول دنیا کے لئے سیکھتا ہے۔ تو وہ قیامت کے دن جنت کی ہوا بھی نہ سونگھ سکے گا"(1)۔ اجرت پیشگی متعین کر کے لینا جائز نہیں۔ لیکن بیت المال سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے مطابق لینا جائز ہے۔ اگر بیت المال سے کچھ نہ ملتا ہو اور تعلیم تدریس میں مشغول ہونے کے سبب کوئی کاروبار نہ کر سکتا ہو تو پھر اجرت مقرر کر کے بھی لینا جائز ہے۔ امام مالک، شافعی، احمد اور جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ جیسے کہ صحیح بخاری میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے سانپ کے ڈسے ہوئے شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ انہوں نے دم کر کے اجرت لی۔ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی گئی۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جن چیزوں پر تم اجرت لو ان میں سب سے زیادہ حق دار کتاب اللہ ہے"(2)۔ قصہ مخطوبہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے اسے تیری زوجیت میں دیا (اس مہر کے بدلے) کہ جو قرآن تجھے یاد ہے(3) (تو اسے سکھا دے) لیکن حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اہل صفہ میں سے کسی صحابی کو قرآن سکھایا۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو ایک کمان بطور ہدیہ دی۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم 323/3 2۔ فتح الباری، کتاب الاجارۃ 452/4 3۔ فتح الباری، کتاب فضائل القرآن 74/9

مسئلہ پوچھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تجھے یہ پسند ہے کہ تجھے آگ کی کمان کا طوق پہنایا جائے تو اسے قبول کر لے۔" چنانچہ انہوں نے وہ واپس کر دی(1) (بروایت ابوداؤد) اسی کے مثل حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ اگر اس کی سند صحیح تسلیم کر لی جائے تو بہت سے علماء (ابوعمر بن عبدالبر ان میں شامل ہیں) نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ جب اس نے خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے سکھایا تھا تو پھر ہدیہ لے کر اپنے ثواب کو کھونے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اگر ابتداءً ہی اجرت پر پڑھایا تھا تو جائز ہے جیسے سانپ کے کاٹے والے شخص اور حضرت سہل والی دونوں روایات میں بیان ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ابن ابی حاتم نے حضرت طلق بن حبیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ کہ تو اللہ کے نور سے اس کی اطاعت کا دم بھرتا رہے اور رحمت کا امیدوار رہے اور اللہ کے نور سے معصیت کو ترک کر دے اور عذاب الٰہی سے ڈرتا رہے۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ اس بات پر وعید فرما رہے ہیں کہ کہیں وہ دانستہ حق کو چھپا نہ لیں اس کے برعکس اعلان کریں اور رسول کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی مخالفت نہ کرتے رہیں۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

"اور مت ملایا کرو حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم (اسے) جانتے ہو اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ"۔

یہود کی اس بدخصلت سے جو وہ حق کو باطل کے ساتھ ملا دیا کرتے تھے منع کیا جا رہا ہے۔ وہ کبھی تو حق کو چھپاتے کبھی اس میں تاویلیں کرتے اور کبھی باطل کو ظاہر کرتے تھے۔ اس لیے حضرت ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو۔ اور امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف صلوات وتسلیمات کے افراد سے خیر خواہی کرو۔ سعید بن جبیر اور ربیع بن انس سے یہی مروی ہے۔ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ نہ ملاؤ حالانکہ تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام بلاشبہ اللہ کا دین ہے۔ یہودیت اور عیسائیت دین اللہ نہیں بلکہ بدعت ہیں۔ حضرت حسن بصری سے بھی اسی طرح مروی ہے حضرت محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ "میرے رسول ﷺ اور آپ کی کتاب کے متعلق جو معلومات تمہارے پاس ہیں کو چھپانے کی کوشش نہ کرو حالانکہ تمہاری کتابوں کے صفحات ان کے ذکر سے مزین ہیں۔ حضرت ابوالعالیہ سے ایک یہ روایت بھی منقول ہے۔ مجاہد، قتادہ، سدی اور ربیع بن انس کے نزدیک اس سے مراد سرکار رسالت مآب ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔ صیغہ "تَكْتُمُوا" مجزوم بھی ہو سکتا ہے اور منصوب بھی یعنی تم ان دونوں اشیاء (حق و باطل) کی آمیزش نہ کرو۔ اسی طرح اہل عرب کا ایک محاورہ ہے "لَا تَاْكُلِ السَّمَكَ وَ تَشْرَبَ اللَّبَنَ" مچھلی اور دودھ کو جمع نہ کرو۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نسخہ میں "تَكْتُمُوا الْحَقَّ" کو حال قرار دیا ہے۔ اور "وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" بھی حال ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ حق کو جانتے ہوئے ایسی حرکت نہ کرو۔ یا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ جو باطل کو حق کے ساتھ خلط ملط کرنے کے راستے پر چل پڑے ہو تمہیں علم ہے کہ یہ چیز لوگوں کو گمراہ کر دے گی اور نتیجۃً وہ عذاب جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔ بیان کا معنی واضح کرنا اور اس کے برعکس کتمان (پوشیدہ رکھنا) اور حق کو باطل کے ساتھ ملا دینا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ...... مقاتل کہتے ہیں کہ اہل کتاب کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔ اور آپ ﷺ کو

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاجارۃ 264/3

اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرو۔ اور امت محمدیہ کے ساتھ رکوع وسجود میں شامل رہا کرو اور انہی سے ہو جاؤ۔ حضرت علی بن طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ لفظ زکوٰۃ سے مراد یہاں طاعت الٰہی اور اخلاص ہے۔ حضرت وکیع نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جو چیز نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے اس کی زکوٰۃ ادا کرو یعنی دوسو درہم یا اس سے زیادہ۔ حضرت حسن کا قول ہے کہ زکوٰۃ اور نماز فرض ہیں۔ ان کے بغیر اعمال بے کار ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حارث العکلی سے روایت کیا ہے کہ زکوٰۃ سے مراد یہاں صدقہ فطر (فطرانہ) ہے۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ مراد یہ کہ حسن عمل میں مومنین کے ساتھ شریک ہو جاؤ بالخصوص ان میں اکمل چیز یعنی نماز میں۔ اس آیت سے بہت سے علماء نے نماز با جماعت ادا کرنے کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ کتاب الاحکام الکبیر میں اس کا تفصیلی بیان ہے۔ قرطبی نے مسائل جماعت اور امامت کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

''کیا تم حکم کرتے ہو (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب۔ کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اے گروہ اہل کتاب! تمہارے لیے یہ کس طرح زیبا ہے کہ تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرو اور اپنے آپ کو بھلا دو۔ تم لوگوں کو تو ہر فرمان الٰہی کی تعمیل کا حکم دیتے ہو لیکن خود انہیں پس پشت ڈال دیتے ہو حالانکہ تم تورات کی تلاوت کرتے ہو اور تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اوامر الٰہیہ میں کوتاہی کا انجام کیا ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ تم اپنے ساتھ کیا زیادتی کر رہے ہو۔ خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور اپنی آنکھوں سے جہالت کی پٹی اتار دو۔ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ بنو اسرائیل لوگوں کو تو اطاعت الٰہی، تقویٰ اور نیکی کی تلقین کرتے لیکن خود اس کے خلاف پر عمل پیرا تھے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں انہیں ان کی اس دوغلی پالیسی پر عار دلائی ہے۔ ابن جریج کا قول ہے کہ اہل کتاب اور منافقین لوگوں کو تو نماز اور روزے کا حکم دیتے لیکن خود اپنی یہ حالت تھی کہ ان احکام سے اغماض برتتے تھے اللہ نے قول وفعل میں ان کے تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں اس آیت میں شرم دلائی ہے۔ پس جو شخص بھلائی کا حکم دیتا ہے اسے خود بھی اس پر سختی سے عمل پیرا ہونا چاہئے۔ محمد بن اسحٰق نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ یعنی لوگوں کو تو تعلیمات نبوت اور تورات کے سبب کفر سے روکتے ہو۔ اور اس میں میرے رسول کی بیان کردہ علامات کا صریح انکار کر دیتے ہو۔ میرے ساتھ کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اور باوجود یقین ہو جانے کے اسے تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت ضحاک کی روایت میں ہے کہ تم لوگوں کو تو دین محمدی میں شامل ہونے اس کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ ابن جریر نے حضرت ابو قلابہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان اس وقت تک پورا سمجھدار نہیں بن سکتا جب تک لوگوں کو خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے دیکھ کر ان سے نفرت نہ کرے حتیٰ کہ اپنے نفس کا اس سے بھی زیادہ دشمن ہو۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ ان یہودیوں کے پاس جب کوئی آدمی آتا اور ایسی چیز کے بارے میں دریافت کرتا جس میں حق اور رشوت نہ ہوتی تو اسے حق بتا دیتے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل شنیع کی مذمت فرمائی ہے اور ان کی غلطی پر انہیں متنبہ فرمایا ہے کیونکہ وہ بھلائی کا حکم تو دیتے تھے لیکن اس پر عمل پیرا نہ تھے۔ واضح رہے کہ نیکی کی تبلیغ پر ان کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ خود عمل نہ کرنے پر انہیں زجر دتوبیخ کی جا رہی ہے۔ کیونکہ نیکی کا حکم دینا بھی نیکی ہے اور امر بالمعروف ہر عالم پر واجب ہے۔ لیکن ایک عالم دین کے لئے اولی بلکہ واجب ہے کہ وہ اس کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس کو بجالائے اور کوتاہی نہ کرے۔ جس طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ وَمَآ اُرِيْدُ

اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ (ہود:88) ''میں بھی نہیں چاہتا کہ خود تمہارے خلاف کرنے لگوں اس امر میں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں۔ (نیز) میں نہیں چاہتا ہوں مگر (تمہاری) اصلاح (اور درستی) جہاں تک میرا بس ہے۔ اور نہیں میرا راہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''۔ چنانچہ امر بالمعروف اور خود اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ علماء سلف وخلف کے اصح قول کے مطابق ایک کے ترک کرنے سے دوسرا ساقط نہیں ہوتا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ خود معاصی کا ارتکاب کرنے والے کو دوسروں کو ان سے منع نہیں کرنا چاہئے لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ اور اس سے بھی کمزور دلیل اس آیت سے استدلال کرنا ہے۔ یہ آیت ان کے موقف کی دلیل نہیں بن سکتی صحیح یہ ہے کہ عالم دین کو امر بالمعروف کا فریضہ انجام دینا چاہئے اگرچہ اسے خود نہ بھی بجالائے۔ اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کرے اگرچہ وہ خود اس کا مرتکب بھی ہو۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول ہے اگر ہر شخص اس خدشہ سے نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے نہ روکے کہ وہ خود اس چیز پر عمل نہ کر سکے گا یا اس کا ارتکاب کر بیٹھے گا تو اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کا فریضہ انجام دینے والا کوئی نہ رہے گا۔

(میں کہتا ہوں) اطاعت کو ترک کرنا اور معلوم ہونے کے باوجود معصیت کا ارتکاب کرنا قابل مذمت ہے۔ جاننے والا اور لاعلم برابر نہیں ہو سکتے۔ اس کی وعید بے شمار احادیث میں آئی ہے جیسے (1) امام ابو القاسم طبرانی نے معجم الکبیر میں حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ عالم جو لوگوں کو تو بھلائی کی تلقین کرتا ہے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتا اس کی مثال اس چراغ کی طرح ہے جو لوگوں کو تو روشنی دیتا ہے لیکن اپنے آپ کو جلا رہا ہے۔'' اس سند سے یہ حدیث غریب ہے۔(1)

(2) ایک دوسری حدیث:۔ حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''معراج کی رات میرا گذر ایسی قوم پر ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ تو بتایا گیا یہ آپ ﷺ کی امت میں سے دنیا کے خطیب ہیں۔ جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیا کرتے تھے لیکن اپنے آپ کو بھلائے رکھتے۔ حالانکہ وہ کتاب کی تلاوت بھی کرتے۔ وہ کیوں نہیں سمجھتے'' (2)۔ عبد بن حمید نے اپنی مسند میں، ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور ابن ابی حاتم نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(3) تیسری حدیث:۔ حضرت امام احمد نے حضرت ابووائل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں حضرت اسامہ کے پیچھے سواری پر تھا۔ آپ سے عرض کی گئی آپ حضرت عثمان سے بات کیوں نہیں کرتے۔ تو انہوں نے فرمایا تم دیکھ رہے ہو میں ان سے بات نہیں کرتا میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ میں علیحدگی میں ان سے بات کروں گا لیکن میں ایک معاملے کو کھولنا نہیں چاہتا۔ بخدا میں کسی شخص کو یہ نہیں کہوں گا کہ تو لوگوں سے بہتر ہے اگرچہ وہ میرا امیر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے۔ عرض کی گئی۔ آپ نے کیا سنا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ''ایک آدمی کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کی آنتیں باہر ابل پڑیں گی۔ وہ آگ میں ان کے گرد اس طرح چکر لگائے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد گھومتا ہے۔ دوزخی اس کے پاس سے گذریں گے اور پکار کر کہیں گے اے فلاں! تمہیں کیا ہوا؟ تم تو ہمیں نیکی کا حکم دیتے تھے اور برائی سے روکتے تھے؟ وہ جواب دیگا میں تمہیں کہتا تھا لیکن خود نہیں کرتا تھا۔ تمہیں تو روکتا تھا لیکن خود اس کا ارتکاب کرتا تھا'' (3)۔ بخاری و مسلم نے بھی حدیث سلیمان بن مہران میں اسی طرح روایت فرمایا ہے۔ حضرت امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت

1۔ المعجم الکبیر 178/2 2۔ مسند احمد 120/3 3۔ مسند احمد 205/5

فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان پڑھ لوگوں سے اتنا درگذر کرے گا کہ اس قدر علماء سے نہیں کرے گا۔ بعض آثار میں ہے کہ جاہل کے ستر گناہ معاف کردیئے جائیں گے جبکہ عالم کا ایک گناہ معاف ہوگا۔ جاہل اور عالم یکساں نہیں ہوسکتے'' (1)۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ (الزمر:9) ''آپ پوچھئے کیا کبھی برابر ہوسکتے ہیں علم والے اور جاہل۔ البتہ صرف عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں''۔ ابن عسا کر نے ولید بن ولید بن عقبہ کے حالات میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جنتی لوگ دوزخیوں کی طرف جھانک کر پوچھیں گے تم آگ میں کیسے داخل ہوئے؟ بخدا ہم تو تم سے سیکھ کر جنت میں داخل ہوئے۔ وہ کہیں گے ہم جو کہتے تھے وہ کرتے نہ تھے''۔ ابن جریر طبری نے بھی اسے ولید بن عقبہ سے روایت کیا ہے ضحاک فرماتے ہیں کہ ایک آدمی آیا اور عرض کی اے ابن عباس! میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا اس مقام تک پہنچ گئے ہو؟۔ اس نے کہا میرا تو یہی خیال ہے۔ فرمایا اگر تمہیں ان تین آیات سے فضیحت کا ڈر نہیں تو بے دھڑک ایسا کرو۔ اس نے دریافت کیا وہ کون سی تین آیات ہیں۔ آپ نے فرمایا ایک تو اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ (بقرہ:44) ''کیا تم حکم کرتے ہو دوسرے لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو'' کیا تم نے اسے پختہ کرلیا ہے۔ وہ کہنے لگا نہیں۔ آپ نے فرمایا دوسری آیت: لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ...... مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ (الصف:3-2) ''تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو'' کیا تم اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو اس نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تیسری آیت حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ قول ہے۔ وَمَاۤ اُرِيۡدُ اَنۡ اُخَالِفَكُمۡ اِلٰى مَاۤ اَنۡهٰكُمۡ عَنۡهُ ؕ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ (ہود:88) کیا تم اس آیت سے بے خوف ہو؟ وہ کہنے لگا نہیں آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو پھر پہلے اپنے نفس سے شروع کرو۔ ابن مردویہ نے اسے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جس نے لوگوں کو کسی بات یا عمل کی طرف بلایا اور خود وہ کام نہ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب میں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود اس سے رک جائے یا وہ عمل کرنے لگے جس کی طرف اس نے لوگوں کو بلایا تھا'' (2)۔ اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ میں ان تین آیات کی وجہ سے قصہ گوئی کو پسند نہیں کرتا۔ (اس سے مراد وہی تین آیات ہیں جن کا ذکر حضرت ابن عباس والی روایت میں ہو چکا ہے۔

وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾

''اور مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر (بھاری نہیں) جو یقین کرتے ہیں کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو دنیا و آخرت کی بھلائی چاہتے ہیں صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ مقاتل بن حیان اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں فرائض و نماز پر صبر کے ساتھ آخرت کو طلب کرنے کے لئے مدد حاصل کرو۔ مجاہد کا قول ہے کہ صبر سے مراد روزے ہیں۔ قرطبی وغیرہ کا قول ہے ماہ رمضان کو اسی وجہ سے ماہ صبر کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ سفیان ثوری نے بنی سلیم کے ایک آدمی کے حوالے سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے'' روزہ نصف صبر ہے'' (3) کہتے ہیں کہ صبر سے مراد گناہوں اور معاصی سے رکنا ہے۔ اسی لیے اسے ادائیگی عبادات کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے عبادت کی اعلیٰ ترین قسم نماز ہے۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

1۔ کنز العمال 28984 2۔ مجمع الزوائد 276/7 3۔ الاحیاء 231/1

نے ارشاد فرمایا صبر دو طرح کے ہیں۔ بوقت مصیبت صبر کرنا مستحسن ہے لیکن اس سے بھی بہتر اللہ کے محارم سے صبر کرنا ہے۔ حضرت حسن بصری سے بھی ایک روایت یہی ہے حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ صبر سے مراد انسان کا ہر چیز کو اللہ کی طرف سے سمجھنا اور اجر و ثواب کی امید رکھنا ہے۔ بعض اوقات آدمی جزع فزع کرتا ہے اسے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ حضرت ابو العالیہ کا قول ہے کہ صبر سے مراد اللہ کی رضا ہے۔ بلاشبہ یہی اطاعت الٰہی ہے۔ اور نماز ثابت قدمی کے لئے سب سے زیادہ معاون ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ...... (عنکبوت: 45) ''آپ تلاوت کیجئے اس کتاب کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف اور نماز صحیح صحیح ادا کیجئے۔ بے شک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور گناہ سے۔ اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے''۔ حضرت امام احمد نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ''جب رسول کریم ﷺ پر کوئی مشکل وقت آتا تو آپ نماز پڑھتے تھے''(1)۔ ابوداؤد شریف میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ ابن جریر نے بھی اسے ذکر کیا ہے۔ محمد بن نصر مروزی کتاب الصلاۃ میں لکھتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا میں جنگ خندق کی رات حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ ایک بڑی چادر میں لپٹے نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کوئی پریشانی ہوتی نماز پڑھا کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بدر کی رات میں نے دیکھا کہ سب سو گئے تھے سوائے رسول اللہ ﷺ کے۔ آپ ﷺ ساری رات نماز ادا فرماتے اور دعا گو رہے حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ سرکار رسالت مآب ﷺ کا گذر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا۔ وہ بھوک سے نڈھال تھے آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ''کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے؟ (شکم درد) انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اٹھ کر نماز پڑھو اس میں شفاء ہے''(2)۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سفر میں تھے کہ آپ کو اپنے بھائی قثم کے انتقال کی خبر ملی۔ آپ رضی اللہ عنہما نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ پڑھا راستے کے ایک طرف اونٹ کو بٹھا کر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ اس میں طویل التحیات بیٹھے پھر اٹھ کر اپنی سواری کی طرف چلے یہ آیت کریمہ آپ کی زبان پر تھی۔ وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ ...... ابن جریج کا قول ہے صبر اور نماز سے اللہ کی رحمت ملتی ہے انہا میں ضمیر ''الصلاۃ'' کی طرف لوٹ رہی ہے مجاہد کا یہی خیال ہے۔ ابن جریر نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ مدلول کلام یعنی وصیت اس کا مرجع ہے۔ جس طرح قصہ قارون میں وَلَا یُلَقّٰہَا کی ضمیر ہے۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَیۡلَکُمۡ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّمَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ وَ لَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوۡنَ (قصص: 80) ''اور کہا ان لوگوں نے جنہیں (دنیا کی بے ثباتی کا) علم دیا گیا تھا حیف ہے تمہاری عقل پر۔ اللہ کا ثواب بہتر ہے اس کے لئے جو ایمان لے آیا۔ اور نیک عمل کیے اور نہیں مرحمت کی جاتی یہ نعمت بجز صبر کرنے والوں کے'' اور آئندہ آنے والی آیت میں وَلَا یُلَقّٰہَا کی ضمیر۔ وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَ مَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَ مَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ (حم السجدہ: 35-34) ''نہیں یکساں ہوتی نیکی اور برائی۔ برائی کا تدارک اس (نیکی) سے کرو جو بہتر ہے پس ناگہاں وہ شخص، تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے یوں بن جائے گا گویا تمہارا جانی دوست ہے اور نہیں توفیق دی جاتی ان (خصائل حمیدہ) کی بجز ان کے جو صبر کرتے ہیں۔ اور نہیں توفیق دی جاتی ان کی مگر بڑے خوش نصیب کو''۔ (اَیۡ وَمَا یُلَقّٰی ھٰذِہِ الۡوَصِیَّۃُ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَ مَا یُلَقّٰہَا اَیۡ یُؤۡتَاھَا وَ یُلۡھَمُھَا اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ) بہرحال دونوں صورتوں میں معنی یہ ہوگا کہ بے شک نماز بھاری مشقت ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر (بھاری نہیں) حضرت ابن عباس نے خاشعین کا معنی ''اللہ کی کتاب کی

1۔ مسند احمد 388/5
2۔ الدر المنثور 67/1:

تصدیق کرنے والے'' کیا ہے۔ حضرت مجاہد کے نزدیک ''سچے مومن''۔ ابوالعالیہ کے نزدیک خائفین (ڈرنے والے) مقاتل بن حیان کے نزدیک ''متواضع'' ہے۔ ضحاک نے اس آیت کا معنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بے شک یہ نماز بھاری ہے مگر اس کی اطاعت میں سر جھکانے والوں، اس کی سطوت سے ڈرنے والوں اور اس کے وعدہ وعید کو سچا سمجھنے والوں کے لئے۔ اسی کے مشابہ ایک حدیث شریف میں ہے ''تو نے بہت بڑی چیز کا سوال کیا لیکن جس پر خدا کی مہربانی ہو اس کے لئے آسان ہے۔ ابن جریر نے اس آیت کا یوں ترجمہ کیا ہے۔ اے اہل کتاب کے علماء! اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت اور فواحش و منکرات سے روکنے والی اور رضاء الٰہی کے قریب کرنے والی نماز کی عادت اختیار کرو۔ ''اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ'' یعنی اس کی اطاعت میں تواضع اور عاجزی کرنے والے، اس کے خوف کے سامنے تضرع اور زاری کرنے والے۔ اس آیت کریمہ سے بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ خطاب بنو اسرائیل کو ہے لیکن یہ حکم صرف ان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ یہ حکم عام ہے جو ان سمیت سب کو شامل ہے واللہ اعلم۔ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ سابقہ کلام کی تکمیل کی جا رہی ہے کہ نماز یا وصیت بوجھل چیز ہے مگر عاجزی کرنے والوں کے لئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ کل قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے۔ ان کے سارے امور اسی کی مشیت کے تابع ہیں اپنے عدل کے ساتھ جو چاہے فیصلہ فرماتا ہے۔ اسی لیے جب انہیں روز قیامت اور حساب و کتاب کا یقین ہے، نیک اعمال کرنا اور منکرات کو ترک کرنا ان کے لئے آسان ہے۔ جہاں تک لفظ ظن کا تعلق ہے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اہل عرب لفظ ظن کو دو مختلف اور متضاد معانی میں استعمال کرتے ہیں ان کے نزدیک ظن کا معنی ''یقین'' بھی ہے اور ''شک'' بھی۔ اسی طرح لفظ ''سدفۃ'' کو تاریکی اور روشنی دونوں معانی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور مغیث کا معنی فریاد کرنے والے کو بھی اور مدد کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ وغیرہ اسماء جو اضداد کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی ایسی اشیاء کے لئے جو باہم مختلف اور متضاد ہوں۔ درید بن الصمۃ کہتا ہے۔

فَقُلْتُ لَهُمْ ظُنُّوْا بِاَلْفَىْ مُدَجَّجٍ سَرَاتُهُمْ فِى الْفَارِسِيِّ الْمُسَرَّدِ

''یعنی تم یقین رکھو کہ دو ہزار مسلح فوجی تمہاری مدد کو آ رہے ہیں۔'' عمیر بن طارق کہتا ہے۔

فَاِنْ يَعْبُرُوْا قَوْمِىْ وَ اَقْعُدْ فِيْكُمْ وَاَجْعَلُ مِنِّىْ الظَّنَّ غَيْبًا مُرَجَّمًا

یعنی وَاَجْعَلُ مِنَ الْيَقِيْنِ غَيْبًا مُرَجَّمًا۔ لکھتے ہیں اہل عرب کے کلام اور اشعار کی مثالوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ظن کا لفظ بکثرت یقین کے معنی میں آتا ہے۔ صاحب عقل و فہم کے لئے اتنی مثالیں کافی ہیں۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے: وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (کہف: 53) ''اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں''۔ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ ظن کا لفظ قرآن کریم میں ہر جگہ علم اور یقین کے معنی میں آیا ہے (خواہ کوئی صیغہ ہو) اور اس کی سند صحیح ہے۔ ابوالعالیہ، ربیع بن انس، سدی اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریج کا قول ہے کہ یہ آیت معنی میں اس آیت کے موافق ہے اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ (الحاقۃ: 20) اَىْ عَلِمْتُ (مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا)۔ ابن جریج نے ظن کا ترجمہ علم کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا یہی قول ہے۔ (میں کہتا ہوں) صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے فرمائے گا۔ کیا میں نے تیرا نکاح نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے تجھے اعزاز و اکرام سے نہیں نوازا تھا؟ کیا میں نے گھوڑے اور اونٹ تیرے لیے مسخر نہیں کیے تھے؟ کیا تجھے راحت و آرام اور عیش و عشرت نہیں دیا تھا؟۔ وہ کہے گا ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے یقین تھا کہ تو ایک دن میرے سامنے ہوگا؟ وہ کہے گا ہاں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس طرح تو نے مجھے بھلا دیا تھا اسی طرح آج میں تجھے بھلا دوں گا۔

یہ حدیث بالتفصیل آیت: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ:67) کے تحت ذکر کی جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

يٰبَنِیٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اے اولاد یعقوب! یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور (یہ کہ) میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر''۔

اللہ تعالیٰ بنو اسرائیل کو ان کے اسلاف اور آباؤ اجداد پر کی جانے والی نعمتوں اور طویل احسانات یاد دلا رہے ہیں کہ انہیں برگزیدہ قوم بنایا۔ ان میں رسول مبعوث فرمائے، کتابیں نازل فرمائیں۔ ان کے زمانے کی تمام اقوام پر انہیں فضیلت دی۔ اس کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے: وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ (دخان:32) ''اور ہم نے چنا تھا بنی اسرائیل کو جان بوجھ کر جہان والوں پر''۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (مائدہ:20) ''اور جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے اے میری قوم! یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہوا۔ جب بنائے اس نے تم میں سے انبیاء اور بنایا تمہیں حکمران اور عطا فرمایا تمہیں جو نہیں عطا فرمایا تھا کسی کو سارے جہانوں میں''۔ حضرت ابو العالیہ کا قول ہے جو انہیں بادشاہ، مرسلین اور کتابیں عطا کی گئی تھیں۔ تمام لوگوں پر فضیلت ملنے سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں۔ مجاہد، ربیع، بن انس، قتادہ اور اسماعیل بن ابو خالد سے یہی مروی ہے۔ آیت کریمہ کو اس پر محمول کرنا بھی لازمی ہے کیونکہ امت محمدیہ تو ان سے بھی افضل ہے۔ یہ آیت اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ (آل عمران:110) مسانید اور سنن میں حضرت معاویہ بن حیدہ قشیری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تم سترویں امت ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے بہتر اور معزز ہو۔ اس موضوع کی تائید میں بے شمار احادیث ہیں جو آیہ کریمہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ...... کے تحت بیان کی جائیں گی۔ ایک قول یہ ہے کہ تمام لوگوں پر ایک خاص قسم کی فضیلت مراد ہے۔ اس سے ہر قسم کی فضیلت مراد نہیں ہے۔ رازی نے اسے بیان کیا ہے لیکن اس میں نظر ہے۔ کیونکہ عالمین کا لفظ عام ہے۔ یہ سابقہ اور آئندہ سب انبیاء کو شامل ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ان سے پہلے تھے وہ تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ حضرت محمد ﷺ ان کے بعد تھے وہ تمام خلائق سے افضل اور دنیا و آخرت میں اولاد آدم کے سردار ہیں۔ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَ سَلَامُهٗ عَلَيْهِ۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْــــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور ڈرو اس دن سے جب نہ بدلہ دے سکے گا کوئی شخص کسی کا کچھ بھی اور نہ قبول کی جائے گی اس کے لیے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ اور نہ وہ مدد کیے جائیںگے''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے انعامات کا ذکر فرمایا اس کے بعد روز قیامت کے شدید ترین انتقام سے ڈرایا۔ یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ کوئی شخص کسی کو نفع نہیں دے سکے گا۔ ایک اور مقام پر فرمایا: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ''اور نہیں بوجھ اٹھائے گا کوئی گناہ گار کسی دوسرے کا بوجھ'' (فاطر:18)۔ ایک اور مقام پر فرمایا: لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ''ہر شخص کو ان میں سے اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے (سب سے) بے پرواہ کر دے گی'' (عبس:37)۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا

يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ''اے لوگو! ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ نہ بدلہ دے سکے گا کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے اور نہ ہی بیٹا بدلہ دے سکے گا اپنے باپ کی جانب سے کچھ بھی (لقمان:33)۔ یہ بلیغ ترین مثال ہے کہ باپ بیٹا بھی ایک دوسرے کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیں گے۔ وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ سے مراد ہے کہ کفار کی سفارش قبول نہیں ہوگی۔ (وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ) یعنی فدیہ بھی قبول نہیں ہوگا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ (آل عمران:91) ''جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگر چہ وہ (اپنی نجات کے لئے) عوضانہ دے اتنا سونا''۔ ایک اور مقام پر فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (مائدہ:36) ''بے شک وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اگر انہی کی ملکیت میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تا کہ بطور فدیہ دیں اسے (اور نجات پائیں) عذاب سے روز قیامت نہ قبول کیا جائے گا ان سے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا'' پھر فرمایا: وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ''اور اگر وہ معاوضہ میں دے ہر بدلہ تو نہ قبول کیا جائے گا اس سے'' (انعام:70)۔ ایک اور جگہ فرمایا: فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ...... ''پس آج نہ تم سے فدیہ قبول کیا جائے گا، اور نہ کفار سے تمہارا (سب کا) ٹھکانہ آتش جہنم ہے۔ وہ تمہاری رفیق ہے'' (حدید:15)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں آگاہ فرما رہے ہیں کہ اگر انہوں نے میرے پیارے رسول کی اتباع نہ کی اور اس پر ایمان نہ لائے اور اسی حالت میں روز قیامت جب پیش ہوں گے تو کسی رشتہ دار کی رشتہ داری یا کسی صاحب منصب کی سفارش سودمند نہ ہوگی۔ اور نہ ہی اس روز ان سے فدیہ قبول کیا جائے گا اگر چہ زمین بھر سونا ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے ارشاد فرمایا: مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ''اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن جس میں نہ تو خرید وفروخت ہوگی اور نہ (کفار کیلئے) دوستی ہوگی اور نہ ان کے لئے شفاعت'' (البقرۃ:254)۔ ایک اور جگہ فرمایا: لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ (ابراہیم:31) ''جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی اور نہ دوستی''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ عدل کے معنی یہاں بدل ہیں اور فدیہ اور بدل ایک ہی چیز ہیں۔ ابو العالیہ، ابو مالک، حسن، سعید بن جبیر، قتادہ اور ربیع بن انس کا یہی قول ہے۔ عبد الرزاق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں شفاعت کا معنی نفل اور عدل کا معنی فرض روایت کیا ہے۔ عمیر بن ہانی سے بھی یہی مروی ہے لیکن یہ قول غریب ہے اس آیت کی تفسیر میں صحیح قول پہلا ہی ہے۔ ایک اور حدیث سے اس کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ جسے ابن جریر نے ذکر کیا ہے۔ ''رسول کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کی گئی ہے عدل سے کیا مراد؟ آپ نے فرمایا فدیہ۔

وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ یعنی کوئی آدمی غیرت کھا کر ان کی مدد نہ کرے گا اور نہ ہی انہیں اللہ کے عذاب سے نجات دلا سکے گا۔ یعنی کوئی رشتہ دار یا صاحب جاہ وحشمت ان سے نرمی نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ ہی ان کا کوئی مددگار ہوگا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (طارق:10) ''پس نہ خود اس میں زور ہوگا اور نہ کوئی دوسرا مددگار ہوگا''۔ یعنی اللہ تعالیٰ نہ تو کافر کا فدیہ قبول کرے گا اور نہ سفارش۔ اس کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ کسی کو اس سے چھٹکارا نہیں۔ کوئی اس سے پناہ نہیں دے سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (مومنون:88) ''اور وہ پناہ دیتا ہے (جسے چاہے) اور پناہ نہیں دی جا سکتی اس کی مرضی کے خلاف''۔ ایک اور جگہ فرمایا: فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ۝ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ''پس اس دن اللہ کے عذاب کی طرح نہ کوئی عذاب دے سکے گا۔ اور نہ اس کے باندھنے کی طرح کوئی باندھ سکے گا'' (فجر:26-25)۔ اور فرمایا: مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۝ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ

مُسْتَسْلِمُوْنَ (صافات:26-25) ”تمہیں کیا ہو گیا ہے تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ بلکہ آج تو وہ سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں“۔ پھر فرمایا: فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ...... (الاحقاف:28) ”پس کیوں مدد نہ کی ان کی ان معبودوں نے جنہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب کے لیے اپنا خدا بنا رکھا تھا۔ بلکہ وہ تو ان سے روپوش ہو گئے“۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ (الصافات:25) کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ تمہیں آج کیا ہے تم ہم سے جھگڑا کیوں نہیں کرتے۔ آج یہ بات تم سے بہت بعید ہے۔ ابن جریر کا قول ہے کہ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ کی تاویل یہ ہے کہ آج نہ ان کا کوئی مددگار ہے نہ کوئی سفارش کرنے والا، معاوضہ اور تاوان بھی قبول نہیں۔ طرفداری کا تصور ختم ہو چکا۔ رشوت اور سفارشیں معدوم ہو گئیں۔ قوم کی تصدیق اور تعاون باقی نہ رہا۔ اب معاملہ اس عادل و جبار حاکم کی عدالت میں ہے جس کے پاس سفارشی اور مددگار کام نہیں آتے۔ برائی کا بدلہ برائی سے اور نیکی کا اجر کئی گنا دیا جائے گا۔ یہ آیت اس آیت کے ساتھ مفہوم میں مطابقت رکھتی ہے: وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْیَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ (صافات:26-24)۔

وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

”اور یاد کرو جب نجات بخشی ہم نے تمہیں فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب (یعنی) ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے۔ اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھر ہم نے بچا لیا تم کو اور ڈبو دیا فرعونیوں کو اور تم (کنارے پر کھڑے) دیکھ رہے تھے“۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں اے بنی اسرائیل وہ وقت یاد کرو جب میں نے تمہیں آل فرعون کے عذاب سے چھٹکارا دلایا تھا۔ اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھوں تمہیں ان کے شہر سے نجات بخشی تھی۔ حالانکہ وہ تمہیں طرح طرح کی تکالیف دیتے تھے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون (لَعَنَهُ اللّٰهُ) نے ایک خواب دیکھا جس نے اسے وحشت میں مبتلا کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے اور مصر کے ہر قبطی کے گھر میں گھس گئی ہے۔ جبکہ بنو اسرائیل کے مکانات محفوظ رہے۔ اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ اس کی سلطنت کا زوال بنو اسرائیل کے ایک آدمی کے ہاتھوں ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ بنو اسرائیل ایک ایسے مسیحا کا انتظار کر رہے ہیں جس کی آمد پر انہیں حکومت اور شان و شوکت حاصل ہو گی۔ حدیث فتون میں اسی طرح ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ان شاء اللہ تعالیٰ یہ حدیث مفصل ذکر کی جائے گی۔ چنانچہ فرعون نے یہ حکم دیا کہ بنو اسرائیل کے ہاں جو بچہ بھی پیدا ہو قتل کر دیا جائے۔ اور لڑکیاں زندہ چھوڑ دی جائیں۔ اور بنو اسرائیل کو مشقت آمیز اور رذیل ترین کاموں پر لگانے کا حکم دیا۔ یہاں عذاب کی تفسیر ذبح ابناء (لڑکوں کا ذبح کرنا) سے کی گئی ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ایک کا دوسرے پر عطف کیا گیا ہے: یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ (ابراہیم:6) ”جو پہنچاتے تمہیں سخت عذاب اور ذبح کرتے تھے تمہارے فرزندوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو“۔ سورۂ قصص کی ابتداء میں اس کی تفسیر ذکر کی جائے گی۔ وَبِهِ الثِّقَةُ وَالْمَعُوْنَةُ وَالتَّاْیِیْدُ اللہ کی ذات سے ہی بھروسہ، نصرت اور تائید کی امید ہے۔

یَسُوْمُوْنَکُمْ کا معنی ہے تمہیں ذلیل وخوار کرتے تھے۔ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ جیسے کہتے ہیں (سَامَهٗ خَطَّةَ خَسْفٍ اِذَا اَوْلَاهُ اِيَّاهُ) جیسے عمرو بن کلثوم کہتا ہے۔

اِذَا مَا الْمَلْكُ سَامَ النَّاسَ خَسْفًا اَبَيْنَا اَنْ نُقِرَّ الْخَسْفَ فِيْنَا

جب بادشاہ ہمیں ذلیل ورسوا کرنا چاہے تو ہم ذلت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں' ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے یَدِیْمُوْنَ عَذَابَکُمْ (وہ ہمیشہ تمہیں مشقت میں مبتلا رکھتے) جیسے وہ بکریاں (یا جانور) جو سال کا اکثر چر کر گزارہ کریں انہیں سائمہ کہا جاتا ہے۔ قرطبی نے یہاں پر یہی نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ...... کے ساتھ اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ بلکہ یہ پوری آیت سابقہ آیت کی تفسیر ہے۔ سورۂ ابراہیم میں جب ذکر فرمایا: وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (ابراہیم :5) یعنی اللہ کے احسانات اور نعمتوں کے بارے میں انہیں یاد دلاؤ۔ تو یہی مناسب تھا کہ وہاں کہا جاتا۔ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ یہاں ذبح کا عطف عذاب پر کیا تا کہ بنو اسرائیل پر کیے گئے متعدد احسانات اور نعمتوں کی طرف اشارہ ہو جائے۔ خاندان عمالقہ سے تعلق رکھنے والے ہر مصری کافر شہنشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔ جیسے بلاد روم وشام کے ہر کافر بادشاہ کو قیصر، ایران کے بادشاہ کو کسریٰ، یمن کے حکمران کو تبع، حبشہ کے شہنشاہ کو نجاشی اور ہندوستان کے کافر بادشاہ کو بطلیموس کا لقب دیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو فرعون تھا اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان یا ایک قول کے مطابق مصعب بن ریان تھا۔ یہ عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح کی اولاد سے تھا اس کی کنیت ابومرہ تھی یہ اصل میں اصطخر کا فارسی النسل تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس پر اللہ کی لعنت ہو: وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ابن جریر کا قول ہے تمہارے آباؤ اجداد کو آل فرعون کی سختیوں سے نجات دینا گویا ہماری طرف سے ایک عظیم نعمت تھی۔ ابن عباس، مجاہد، ابو العالیہ، ابو مالک اور سدی وغیرہ نے بلاء کے لفظ کا معنی نعمت کیا ہے۔ بلاء کا لفظ اصل میں آزمائش کے معنی میں آتا ہے۔ جو خیر کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے اور مشقت کے ساتھ بھی۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء: 3/) "اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الاعراف: 168) "اور ہم نے آزمایا انہیں نعمتوں اور تکلیفوں کے ساتھ تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں"۔ ابن جریر کا قول ہے کہ شر کے لیے کہا جاتا ہے بَلَوْتُهٗ اَبْلُوْهُ بَلَآءً اور خیر کے لئے کہتے ہیں اَبْلِيْهِ اِبْلَآءً وَبَلَآءً۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا قول ہے۔

جَزَى اللّٰهُ بِالْاِحْسَانِ مَا فَعَلَابِكُمْ وَاَبْلَا هُمَا خَيْرَ الْبَلَآءِ الَّذِيْ يَبْلُوْ

دونوں نعمتوں کو جمع کیا کیونکہ اس سے مراد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں وہ بہترین نعمت عطا فرمائی تھی جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں کا امتحان لیا کرتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بلاء کے لفظ کا اشارہ اس رسوا کن عذاب کی طرف ہے جس سے وہ دوچار تھے یعنی ان کے بچے قتل کر دیئے جاتے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ جمہور کا قول ہے: وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ...... اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات بخشی اور تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ فرعون تمہارے تعاقب میں نکلا تو ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا۔ جس طرح کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تفصیل سے اس واقعہ کو اپنی لاریب کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔ جس کا تذکرہ مختلف جگہوں پر آئے گا۔ اس کی مفصل بحث ان شاء اللہ سورۂ شعراء میں آئے گی۔ "فَاَنْجَيْنٰكُمْ" تو ہم نے تمہیں خلاصی دلائی۔ تمہارے اور ان کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی فرعونیوں کو ڈبو دیا تم یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ تا کہ یہ چیز تمہارے دلوں کے لیے شفا اور تمہارے دشمن کے لیے اہانت کا باعث ہو۔ محدث عبدالرزاق لکھتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل کو لے کر روانہ ہوئے۔

فرعون کو یہ اطلاع دے دی گئی۔ اس نے کہا ان کا تعاقب نہ کرو حتی کہ صبح کا مرغ بانگ دے۔ فرماتے ہیں اللہ کی قسم قدرت خداوندی سے اس رات کسی مرغ نے بانگ نہ دی حتی کہ صبح ہوگئی۔ صبح اس نے ایک بکری منگوا کر ذبح کی اور کہا میرے کلیجی کھانے سے فارغ ہونے تک چھ لاکھ قبطیوں کا لشکر جرار تیار ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس کے فارغ ہونے سے پہلے لشکر تیار ہوگیا حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ساحل سمندر پر پہنچے تو آپ کے ایک ساتھی جس کا اسم گرامی یوشع بن نون تھا۔ پوچھا آپ کے رب کا امر کدھر کو ہے؟ آپ نے فرمایا تمہارے سامنے ہے۔ اور سمندر کی طرف اشارہ فرمایا۔ یہ سن کر یوشع نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور گہرے پانی تک جا پہنچے جب غوطے کھانے لگے تو واپس لوٹ آئے۔ اور عرض کی اے موسیٰ آپ کے رب کا حکم کس طرف ہے؟ اللہ کی قسم نے آپ نے جھوٹ بولا نہ آپ سے جھوٹ بولا گیا۔ چنانچہ انہوں نے تین بار ایسا ہی کیا۔ پھر اللہ جل جلالہ نے حضرت موسیٰ کی طرف وحی فرمائی کہ اپنا عصا سمندر پر مارو۔ انہوں نے اپنے عصا سے ضرب لگائی تو سمندر پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی مانند ہوگیا۔ درمیان میں ایک راستہ نمودار ہوگیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے پیروکار بخیریت دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ فرعون نے بھی ان کا پیچھا کیا۔ جب سب اس سمندری راستے میں اتر چکے تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پہلی حالت پر کر دیا (چشم زدن میں سارا لشکر غرقاب ہوگیا) بنی اسرائیل یہ عبرتناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ سلف صالحین میں سے بہت سے علماء نے یہی کہا ہے۔ اس کی وضاحت اپنی جگہ آئے گی۔ روایت میں آیا ہے کہ یہ عاشوراء کا دن تھا۔ جیسا کہ حضرت امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہود دسویں محرم (یوم عاشوراء) کو روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگے۔ یہ مبارک دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دلائی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''تم سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حقدار میں ہوں۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی ارشاد فرمایا (1)۔ یہ حدیث بخاری، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے مختلف سندوں سے اسی طرح روایت فرمائی ہے۔ ابو یعلی موصلی نے حضرت انسؓ سے روایت فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے دسویں محرم کے دن بنی اسرائیل کے لئے سمندر کو پھاڑ دیا تھا'' (2)۔ لیکن اس سند سے یہ ضعیف ہے۔ کیونکہ زید العمی ضعیف ہے اور اس کے شیخ یزید الرقاشی اس سے بھی ضعیف ہیں۔

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ فرمایا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر بنا لیا تم نے بچھڑے کو (معبود) ان کے بعد اور تم سخت ظالم تھے۔ پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے اس (ظلم عظیم) کے بعد شاید کہ تم شکرگزار بن جاؤ۔ اور جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں تمیز کی قوت تاکہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو''۔

(اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں احسانات یاد دلا رہے ہیں) ارشاد ہوتا ہے وہ وقت یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حسب وعدہ چلہ کشی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ تم ان کی غیر حاضری میں ایک بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔ لیکن (اس شرک جلی

1۔ مسند احمد: 292/1　2۔ مجمع الزوائد: 188/3

کے باوجود) ہم نے تم سے عفوودرگزر فرمایا اس وعدے کا ذکر سورۂ اعراف کی ان آیات میں آیا ہے: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ (اعراف:142) ''اور ہم نے وعدہ کیا حضرت موسیٰ سے تیس رات کا اور مکمل کیا اسے دس مزید راتوں سے'' ایک قول کے مطابق یہ ذیقعدہ کا پورا مہینہ اور ذوالحج کے دس دن تھے یہ فرعونیوں سے رہائی پانے اور سمندر سے نجات پانے کے بعد کا واقعہ ہے۔قولہ وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ کتاب سے مراد تورات اور فرقان سے مراد حق و باطل کے اور ہدایت وگمراہی کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہے۔ قولہ تعالیٰ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ سورۂ اعراف کے سیاق کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب سمندر سے نکلنے کے بعد ملی۔ایک دوسری آیت سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (القصص:43) ''اور ہم نے دی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اس کے بعد کہ ہم نے ہلاک کر دیا تھا پہلی (نافرمان) قوموں کو (یہ کتاب) لوگوں کے لئے بصیرت افروز اور سراپا ہدایت ورحمت تھی تا کہ وہ نصیحت قبول کریں''۔ کہا گیا ہے کہ واؤ یہاں زائدہ ہے۔اور فرقان سے مراد کتاب ہے۔لیکن یہ غریب ہے۔بعض نے کہا ہے کہ کتاب پر فرقان کا عطف ہے۔یعنی کتاب بھی عطا فرمائی اور معجزہ بھی۔اگر چہ معنی ایک ہے۔کسی شاعر کا قول ہے۔

وَقَدَّمَت الاَدِيْمَ لِرَاقِشَيْهِ فَاَلْفٰى قَوْلَهَا كَذِبًا وَمَيْنًا

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے۔

اَلَا حَبَّذَا هِنْدٌ وَاَرْضٌ بِهَاهِنْدٌ وَهِنْدٌ اَتٰى مِنْ دُوْنِهَا النَّأْىُ وَالْبُعْدُ

کذب اور مین ہم معنی ہیں۔اسی طرح النأی سے مراد البعد ہی ہے۔عنترہ کا قول ہے۔

حُيِّيْتَ مِنْ طَلَلٍ تَقَادَمَ عَهْدُهٗ اَقْوٰى وَ اَقْفَرَ بَعْدَ اُمِّ الْهَيْثَمِ

اقفار کا عطف اقواء پر کیا ہے حالانکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے اے میری قوم! بے شک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو (خدا) بنا کر پس چاہیے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنوں کو (جنھوں نے شرک کیا) یہ بہتر ہے تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک۔پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنیوالا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

یہاں سے بچھڑے کی پوجا پر توبہ کا طریقہ بیان ہو رہا ہے۔حضرت حسن بصری فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اس وقت فرمایا جب پجاریوں کو احساس ندامت ستانے لگا۔اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ہی ایک دوسری جگہ فرمایا: وَلَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا...... (اعراف:149) ''اور جب وہ سخت پشیمان ہوئے اور انہیں نظر آ گیا کہ وہ (راہ راست سے) بھٹک گئے (تو کہنے لگے کہ اگر نہ رحم فرماتا ہم پر ہمارا رب اور نہ بخش دیتا ہمیں''۔ ابو العالیہ، سعید بن جبیر اور ربیع بن انس کا قول ہے کہ باری سے مراد خالق ہے۔(میں کہتا ہوں) ''اِلٰى بَارِىِٕكُمْ'' کے لفظ میں ان کے سنگین جرم پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اپنے

خالق کریم کی بارگاہ میں توبہ کرو کیونکہ تم نے اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے حالانکہ وہ تو وحدہ لاشریک ہے۔نسائی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص دوسرے کو تہہ تیغ کرے خواہ اس کی تلوار کی زد میں اس کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اس جگہ کسی کے قتل کی پرواہ نہ کی جائے۔ اس طرح انہوں نے توبہ کی۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کیا، اللہ کے حکم کو بجالائے تو اللہ تعالیٰ نے قاتل اور مقتول دونوں کو بخش دیا۔ یہ حدیث فتون کا ایک جز ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں اس کا مکمل ذکر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے موجب انہیں اپنوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ بچھڑے کے پجاریوں کو بتایا گیا وہ ایک جگہ بیٹھ گئے اور جنہوں نے شرک نہیں کیا تھا وہ خنجر لے کر کھڑے ہو گئے۔ اس دوران شدید اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ جب تاریکی دور ہوئی تو شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ ستر ہزار آدمی مارے جا چکے ہیں۔ جو مقتول تھے ان کی توبہ قبول ہوئی اور جو بچ گئے تھے ان کی بھی مغفرت ہو گئی۔ مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایت میں ہے کہ وہ بلا امتیاز اپنے رشتے داروں اور دوسروں کو قتل کرتے رہے۔ حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے سے اشارہ کیا تو انہوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔ اس وقت تک ستر ہزار آدمی کیفر کردار کو پہنچ چکے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اب اس جرم شنیع کی سزا کافی ہو گئی ہے اس کے بعد آپ علیہ السلام نے کپڑے سے اشارہ فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی یہی ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ بنو اسرائیل کو سخت ترین حکم دیا گیا۔ وہ ایک دوسرے پر تلوار چلانے لگے حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ کا انتقام پورا ہو گیا تو تلواریں ان کے ہاتھ سے گر پڑیں۔ قتل کا حکم اٹھا لیا گیا۔ جو زندہ رہ گئے تھے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ مقتولین کو شہادت کا مقام عطا کیا گیا۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ گھٹاٹوپ تاریکی چھا گئی وہ اپنوں کو قتل کرتے رہے۔ تاریکی کا چھٹ جانا ہی قبول توبہ کی دلیل تھی۔ سدی کا قول ہے کہ بچھڑے کی پوجا کرنے والے اور اس سے کنارہ کش رہنے والے باہم تلواریں چلاتے رہے فریقین میں سے جو مقتول ہوئے شہید قرار پائے۔ ایک کثیر تعداد قتل ہو گئی۔ ستر ہزار آدمی مارے جا چکے تھے قریب تھا کہ ان کی نسل ہی ناپید ہو کر رہ جائے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے دعا کی اے رب! بنی اسرائیل کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ بارالٰہا! انہیں باقی رکھنا۔ اس وقت اللہ جل جلالہ نے اسلحہ پھینک دینے کا حکم دیا۔ ان کی توبہ قبول فرمائی۔ فریقین میں سے جو مقتول ہوئے شہداء قرار پائے اور زندہ بچ جانے والوں کے لئے یہ کفارہ قرار پایا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ زہری کا قول ہے کہ جب بنو اسرائیل کو اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم ملا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں وہ سب باہر آئے۔ تلواریں باہم ٹکرائیں، خنجر چلے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ بعض نے آپ سے اللہ کی بارگاہ میں دعا کرنے کی درخواست کی۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ ان کے ہاتھ رک گئے۔ انہوں نے اسلحہ رکھ دیا۔ حضرت موسیٰ اور بنو اسرائیل مقتولوں کی کثیر تعداد پر پریشان تھے۔ اللہ جل شانہٗ نے آپ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی۔ آپ کیوں پریشان ہیں۔ قتل ہونے والے میرے پاس زندہ ہیں رزق دیئے جاتے ہیں۔ جو باقی بچ گئے ان کی توبہ مقبول ہے۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم خوش ہو گئی۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائے تو بچھڑے کو جلا کر راکھ پانی میں بہا دی۔ اپنے ساتھ قوم کے منتخب افراد کو لے کر چلے۔ بجلی کی کڑک نے انہیں ہلاک کر دیا۔ پھر دوبارہ زندہ ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے بنو اسرائیل کے لئے توبہ کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس وقت تک نہیں

جب تک وہ اپنے آپ کو قتل نہ کریں۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی ہم امرِ الٰہی پر صبر کریں گے۔ آپ نے حکم دیا کہ جنہوں نے بچھڑے کی پرستش نہیں کی وہ شرک کرنے والوں کو قتل کریں۔ وہ میدان میں بیٹھ گئے قوم نے ان پر تلواریں سونت لیں۔ اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دل پسیج گیا۔ عورتیں اور بچے رو رو کر ان کی طرف سے معافی مانگ رہے تھے۔ اللہ رب العزت نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ انہیں معاف فرما دیا۔ حضرت موسیٰ کو تلواریں ہٹانے کا حکم دیا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے پاس واپس آئے۔ ستر آدمی حضرت ہارون کے ساتھ تھے جنھوں نے بچھڑے کی پوجا نہ کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنے رب کے وعدہ کی طرف چلو۔ انہوں نے عرض کی اے موسیٰ! کیا توبہ ممکن نہیں۔؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ اپنے آپ کو قتل کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے...... الخ۔ انہوں نے تلواریں خنجر اور چھریاں سونت لیں، اللہ نے ان پر دھند بھیجی۔ وہ ہاتھ لگا کر چھوتے اور دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ حتیٰ کہ آدمی نے لاعلمی میں اپنے باپ اور بھائی کو بھی قتل کر دیا وہ آواز دیتے تھے اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے صبر کیا حتیٰ کہ اللہ کی رضا کو پالیا۔ قتل ہونے والے شہادت کے مقام پر فائز ہوئے اور زندہ رہنے والوں کی توبہ قبول کر لی گئی۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس (اس گستاخی پر) آلیا تم کو بجلی کی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے جلا اٹھایا تمہیں تمہارے مر جانے کے بعد کہ کہیں تم شکر گزار بنو''۔

ارشاد ہوتا ہے میری اس نعمت کو یاد کرو جب میں نے تمہیں دوبارہ زندہ کیا تھا۔ اس وقت جب تم نے ظاہراً اللہ کو دیکھنے کا مطالبہ کیا تھا جو تمہارے اور تمہارے جیسے لوگوں کے لئے ممکن نہیں تھا تو تمہیں بجلی کی ایک کڑک نے ہلاک کر دیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جھرۃً کا معنی علانیہ کیا ہے۔ قتادہ اور ربیع بن انس کا قول ہے عیاناً (ظاہراً) حتیٰ کہ ہم اسے دیکھ لیں۔ ربیع بن انس سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمی منتخب کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ انہوں نے کلام الٰہی کو سنا لیکن وہ مطالبہ کرنے لگے ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم اللہ کو ظاہراً دیکھ نہ لیں۔ انہوں نے ایک خوفناک کڑک کی آواز سنی۔ جس سے وہ سب ہلاک ہو گئے۔ مروان بن حکم نے مکہ مکرمہ میں منبر پر خطبہ دیتے ہوئے کہا صاعقہ آسمانی کڑک کو کہتے ہیں۔ سدی کا قول ہے صاعقہ کا معنی آگ ہے۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ عروہ بن رویم کا قول ہے کہ بعض ہلاک ہو گئے اور بعض انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ زندہ ہوئے اور دوسرے مر گئے۔ سدی کا قول ہے کہ جب وہ مر گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام گریہ وزاری فرمانے لگے۔ اور یہ دعا فرمانے لگے اے رب میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دوں گا تو نے ان کے سرداروں کو ہلاک فرما دیا: لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ (اعراف:155) ''(اے رب) اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں اس سے پہلے اور مجھے بھی۔ کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں بوجہ اس (غلطی) کے جو کی چند احمقوں نے ہم سے''۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ یہ ستر، بچھڑے کے پجاریوں میں سے تھے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں زندہ فرمایا۔ وہ ایک ایک کر کے اٹھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ کیسے زندہ

ہوتے ہیں۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ...... میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ قتادہ اور ربیع بن انس کا قول ہے کہ ان کی یہ موت بطور سزا تھی اپنی طبعی عمر پورا کرنے کے لئے انہیں دوبارہ زندہ کیا گیا۔ محمد بن اسحٰق کا قول ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔ حضرت ہارون اور سامری سے آپ کی بحث وتکرار ہوئی۔ بچھڑے کو جلا کر راکھ سمندر میں بہادی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر چیدہ چیدہ آدمی منتخب فرمائے۔ انہیں حکم دیا کہ اللہ کی طرف چلو اور اپنے اور اپنی قوم کی طرف سے توبہ کرو۔ روزہ رکھو۔ غسل کر کے صاف کپڑے پہنو۔ اللہ کے دیے ہوئے وعدہ کے مطابق آپ علیہ السلام انہیں لے کر طور سینا کی طرف آئے۔ بارگاہ الٰہی سے اجازت کے بغیر آپ تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ چنانچہ تیار ہو کر وہ ستر آدمی نکلے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کرنے لگے کہ ہم کلام الٰہی کو اپنے کانوں سے سننا چاہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے قریب پہنچے تو ایک بادل آیا اور سارے پہاڑ پر چھا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قریب ہوئے اور اس میں داخل ہو گئے۔ آپ نے اپنی قوم کو بھی آگے آنے کا اشارہ کیا۔ بارگاہ الٰہی سے مکالمہ کے وقت آپ کی پیشانی نور سے چمکنے لگتی۔ کوئی آدمی اس وقت آپ کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکتا۔ درمیان میں پردہ کیا گیا۔ وہ جب اندھیرے میں داخل ہوئے تو فوراً سجدے میں گر پڑے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کے اوامر ونواہی سنے۔ جب وہ سلسلہ کلام ختم ہوا تو بادل چھٹ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے انہوں نے فوراً رویت باری تعالیٰ کا مطالبہ کر دیا۔ ایک گرج دار آواز نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بارگاہ ربانی میں تضرع اور زاری کرنے لگے۔ اے مولیٰ اگر تو چاہتا تو آج سے پہلے بھی مجھے اور انہیں ہلاک کر سکتا تھا۔ انہوں نے حماقت کی ہے۔ کیا ان کی چند بیوقوفیوں کے سبب تو بنو اسرائیل کو ہلاک فرمائے گا۔ یعنی اس میں ان کے لئے ہلاکت ہے میں نے ان میں سے ستر افراد منتخب کیے تھے۔ اب ان میں سے ایک بھی میرے ساتھ نہیں رہا۔ اس کے بعد وہ کیسے میری تصدیق کریں گے اور مجھ پر ایمان لائیں گے۔؟ ''اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ'' (اعراف:156) ''بے شک ہم نے رجوع کیا ہے تیری طرف'' موسیٰ علیہ السلام یونہی فریاد کناں رہے۔ خشوع وخضوع سے مطالبہ کرتے رہے تا آنکہ اللہ رب العزت نے ان کی ارواح کو لوٹا دیا اور بچھڑے کی عبادت کے جرم عظیم پر بنی اسرائیل کی طرف سے توبہ منظور کرنے کی درخواست پر فرمایا ان کی توبہ اس وقت قبول ہو گی جب یہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔ (یہ محمد بن اسحٰق کی کلام ہے)۔ اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی الکبیر کا قول ہے۔ جب بچھڑے کی پرستش سے بنی اسرائیل نے توبہ کی اور حکم خداوندی کے مطابق ایک دوسرے کو قتل کیا تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنو اسرائیل کے کچھ لوگ میری بارگاہ میں آکر معذرت کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمی اپنے ساتھ منتخب کر کے لے گئے۔......

اس کلام کے سیاق وسباق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خطاب بظاہر تمام بنو اسرائیل کو ہے لیکن فی الحقیقت مراد صرف وہی ستر شخص ہیں بہت سے مفسرین نے اس کے سوا کچھ بیان نہیں کیا۔ رازی نے اس جگہ ایک عجیب بات نقل فرمائی ہے کہ ان ستر افراد نے جی اٹھنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی۔ آپ مستجاب الدعوات ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں ہمیں نبوت عطا فرمادے تو آپ علیہ السلام نے دعا کی اور اللہ نے آپ کی دعا کو منظور فرمالیا۔ لیکن یہ روایت بہت ہی غریب ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت ہارون علیہ السلام کے سوا کوئی نبی نہیں ہوا۔ پھر حضرت یوشع بن نون نبوت سے سرفراز فرمائے گئے۔ اہل کتاب بھی یہاں ایک غلط دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ ان افراد کو دیدار باری تعالیٰ کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی ذات کے لئے زیارت کی آرزو کی تو آپ علیہ السلام کو روک دیا گیا۔ پھر بھلا یہ ستر افراد اسے کیسے پا سکتے تھے۔

دوسرا قول: اس آیت کی تفسیر میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے تورات پر

مشتمل تختیاں لے کر ان کے پاس آئے تو انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے پایا۔ پس انہیں اپنوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ اور فرمایا ان تختیوں پر اللہ کی کتاب لکھی ہوئی ہے۔ اس میں اوامر ونواھی کا بیان ہے۔ وہ کہنے لگے آپ کی بات پر کون یقین کرے؟ ہم اس وقت تک ہرگز نہیں مانیں گے جب تک ہم اللہ کو ظاہراً دیکھ نہ لیں۔ وہ ہمیں آگاہ فرمائے کہ یہ میری کتاب ہے۔ اس پر عمل کرو کیا وجہ ہے کہ اے موسیٰ وہ آپ سے تو ہم کلام ہو لیکن ہم سے بات نہ کرے۔ اس کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ ...... چنانچہ اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا اور توبہ کے بعد وہ ایک زوردار آواز سے ہلاک کر دیئے گئے۔ فرماتے ہیں پھر اللہ نے انہیں زندہ فرمایا۔ (اس کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی) ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ ...... پھر زندہ کیے گئے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کتاب اللہ پر عمل کرو۔ انہوں نے پھر انکار کر دیا۔ آپ علیہ السلام نے پوچھا تمہیں کیا ہے وہ کہنے لگے ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کتاب (تورات) کو تھام لو۔ انہوں نے انکار کر دیا تو اللہ نے فرشتوں کو بھیجا انہوں نے پہاڑ اٹھا کر ان پر معلق کر دیا۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہونے کے بعد مکلّف کیے گئے ماوردی نے یہاں دو اقوال ذکر کیے ہیں۔ ایک فریق کہتا ہے جب انہوں نے معاملے کو واضح طور پر دیکھ لیا تو ان سے تکلیف ہٹ گئی۔ کیونکہ وہ یہ سب کچھ ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دوسرے فریق کا خیال ہے کہ اس کے باوجود وہ مکلّف رہے کیونکہ کوئی عاقل (ذی شعور) بھی تکلیف سے خالی نہیں۔ (تکلیف کا لغوی معنی مشکل کام حکم دینا ہے اور یہاں اس سے مراد کسی شخص پر شرعی احکام کا نافذ کرنا ہے مترجم)۔ قرطبی کا قول ہے کہ یہی صحیح ہے کیونکہ ہولناک امور دیکھ لینا تکلیف کے مانع نہیں۔ بلکہ بنو اسرائیل نے تو بے شمار خلاف عادت امور (خوارق) کا مشاہدہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مکلّف ہی رہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اور ہم نے سایہ کر دیا تم پر بادل کا اور اتارا تم پر من وسلویٰ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے تھے''۔

اللہ جل جلالہ نے بنو اسرائیل سے جن عذابوں کو دور فرمایا تھا ان کا تذکرہ کرنے کے بعد اس بات کا بیان ہو رہا ہے کہ ہم نے تمہیں فلاں فلاں نعمتیں دے رکھی تھیں۔ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ فرمایا ہم نے تم پر بادل کا سایہ کر دیا تھا۔ غمام یہ غمامۃ کی جمع ہے اسے یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ آسمان کو ہر طرف سے ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ ایک سفید بادل تھا جو تیہ کے ریگستانوں میں ان پر سایہ کیے رہا اور دھوپ سے بچاتا رہا۔ جیسے کہ نسائی وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فتون والی حدیث میں نقل کیا ہے۔ فرمایا ہم نے تیہ میں تم پر بادل کا سائبان تان دیا تھا۔ ابن ابی حاتم لکھتے ہیں ابن عمر، ربیع بن انس، ابومجلز، ضحاک اور سدی کی رائے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح ہے۔ حسن اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر نے بعض دیگر مفسرین کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ بادل زیادہ ٹھنڈا اور عمدہ تھا۔ ثوری اور ابن ابی حاتم نے حضرت مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ بادل وہی تھا جس میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جلوہ فرمائے گا۔ یہ بادل صرف انہی پر سایہ فگن ہوتا۔ ابن جریر نے ابوحذیفہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ گویا ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بادل ان بادلوں سے زیادہ خوبصورت، عمدہ اور پر رونق تھا۔ جیسا کہ سنید نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کہ یہ بادل ٹھنڈا اور عمدہ تھا اسی میں اللہ

تعالیٰ قیامت کے دن تشریف لائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ (البقرہ: 210) ''کیا وہ اس بات کا انتظار کررہے ہیں کہ آئے ان کے پاس (اللہ کا عذاب) چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں اور فرشتے'' اسی بادل میں فرشتے بدر کے دن اترے تھے۔ یہ واقعہ تیہ کے صحرا کا ہے۔ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ۔ مَنَّ سے کیا مراد ہے اس بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ علی بن طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کہ یہ چیز بوٹیوں پر رات کو گر کر جم جاتی تھی۔ وہ صبح اٹھ کر اسے جمع کر لیتے اور بطور غذا استعمال میں لاتے مجاہد کا قول ہے کہ مَنّ سے مراد گوند ہے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ یہ شکر تھی جو سائے کی نعمت کی طرح انہیں عطا کی گئی تھی۔ سدی کا قول ہے انہوں نے عرض کی اے موسیٰ! یہاں ہمیں کھانا کہاں سے میسر آئے گا؟ تو اللہ نے ان پر مَنّ نازل فرمایا۔ جو زنجبیل کے پودے پر اترا کرتا تھا حضرت قتادہ کا قول ہے کہ یہ ان کے گھروں میں برف کی طرح گرتا تھا۔ اس کی رنگت دودھ سے زیادہ سفید تھی اور ذائقہ شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک اترتا رہتا۔ ہر آدمی اپنی دن بھر کی ضرورت کے مطابق اٹھالیتا۔ اگر کوئی زیادہ لے لیتا تو یہ خراب ہو جاتا۔ حتیٰ کہ جب چھٹا دن (جمعہ) آتا تو وہ دو دن (جمعہ اور ہفتہ) کے لئے لے لیتے۔ کیونکہ ہفتہ ان کیلئے عید کا دن تھا۔ کوئی شخص اس دن امور معیشت میں مشغول نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سب نعمتیں صحرا میں میسر تھیں۔ ربیع بن انس کا قول ہے کہ من شہد کی طرح کا ایک مشروب تھا جسے پانی میں ملا کر پیتے تھے۔ وہب بن منبہ سے من کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا یہ پتلی روٹی (پراٹھا) تھی۔ ابن جریر نے عامر شعبی سے روایت کیا ہے کہ تمہارا یہ شہد اس من کا سترہواں حصہ تھا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے بھی اس کا معنی شہد ہی کیا ہے۔ امیہ بن ابی الصّلت کہتا ہے۔

فَرَاٰى اللّٰهُ اَنَّهُمْ بِمَضِيْعٍ لَا بِذِيْ مَزْرَعٍ وَلَا مَثْمُوْرَا
فَسَنَاهَا عَلَيْهِمْ غَادِيَاتٍ وَ يَرٰى مُزْنُهُمْ خَلَايَا وَخُوْرَا
عَسَلًا نَاطِفًا وَ مَآءً فُرَاتًا وَ حَلِيْبًا ذَا بَهْجَةٍ مَزْمُوْرًا

ناطف سے مراد بہنے والا اور الحلیب المزمور سے مراد صاف شفاف دودھ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ من کی تفسیر میں مفسرین کی عبارتیں قریب قریب ہیں۔ بعض نے اس سے مراد کھانا اور بعض نے مشروب لیا ہے۔ حقیقت کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن بظاہر من سے مراد ہر وہ چیز تھی جو خواہ کھانا ہو یا مشروب یا کوئی اور چیز جس کے حصول میں کسی قسم کی مشقت یا تکلیف نہیں اٹھانا پڑتی تھی۔ اگر صرف اسے کھایا جائے تو خوراک تھی۔ اور پانی کے ساتھ ملانے سے عمدہ مشروب کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور اگر کسی اور چیز سے ملاتے تو کوئی اور چیز بن جاتی تھی۔ یہاں آیت میں من سے مراد صرف یہی مشہور چیز نہیں ہے۔ اس کی دلیل صحیح بخاری کی حدیث شریف ہے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کھمبی یہ بھی من ہے اور آنکھ کے لئے باعث شفا ہے'' (1)۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اور جماعت نے بھی اپنی کتب میں ماسوائے ابوداؤد کے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ بخاری و مسلم نے اسے حسن عرنی کی روایت سے بیان کیا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''عجوہ (مدینہ کی کھجور کی مشہور قسم) جنتی چیز ہے اس میں زہر کا تریاق ہے۔ کھمبی یہ من ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے'' (2)۔ یہ حدیث صرف ترمذی نے روایت کی ہے اور فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے اور صرف ان دو سندوں سے ہم تک پہنچی ہے۔ آگے لکھتے ہیں اور یہی روایت اسی طرح سعید بن زید، ابوسعید اور جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے اپنی تفسیر میں یہی حدیث

1۔ البخاری: کتاب التفسیر: 22/6
2۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب الطب: 233/6

ایک دوسری سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ لیکن اس سند سے یہ حدیث غریب ہے۔ اس کی سند میں طلحہ بن عبدالرحمٰن سلمی واسطی ہے جس کی کنیت ابوسلیمان مؤدب یا ابومحمد ہے۔ اس کے بارے میں حافظ ابو احمد بن عدی کا قول ہے کہ یہ قتادہ سے بعض اشیاء روایت کرتا ہے جن کی اتباع نہ کی جائے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض کا کہنا تھا کہ ''کھمبی زمین کی چیچک ہے۔'' تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کھمبی من ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔ عجوہ جنت سے ہے اور زہر سے شفا ہے۔ نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو مختلف سندوں سے روایت کیا ہے اسی طرح احمد نے جابر بن عبد اور ابوسعید خدری سے۔ ان سب روایات کے الفاظ میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن یہ سب اسناد عمدہ ہیں کذب کا احتمال نہیں رکھتیں اور حدیث کی اصل رسالت مآب ﷺ تک محفوظ ہے جیسا کہ سعید بن زید کی روایت ہے (اختصار کے پیش نظر تمام اسناد اور اختلاف الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ وضاحت کے لئے عربی متن کی طرف رجوع کریں، مترجم)۔

سلوٰی: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ بٹیر کی طرح کا ایک پرندہ ہے۔ جسے وہ کھاتے تھے۔ سدی نے بھی ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ کرام سے یہی روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے بھی ابن عباس سے یہی نقل کیا ہے۔ مجاہد، شعبی، ضحاک، حسن، عکرمہ اور ربیع بن انس کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عکرمہ سے ایک روایت ہے کہ یہ جنت کے پرندوں سے مشابہ ایک پرندہ ہے۔ یہ چڑیا جیسا یا اس سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ اس کا رنگ سرخ ہوتا تھا۔ دکھنی ہوا انہیں کھینچ لاتی تھی۔ ہر آدمی اپنی دن بھر کی ضروریات کے مطابق انہیں ذبح کر لیتا۔ اس سے زیادہ خراب ہو جاتا۔ اور باقی نہ رہتا لیکن جمعہ کے دن دو دن کے لئے جمع کر لیتے کیونکہ ہفتہ (ساتواں دن) عبادت وریاضت کے لئے مخصوص تھا۔ وہب بن منبہ کا قول ہے کہ سلوی کبوتر کی جسامت کا پرندہ تھا جو ان کے پاس آتا اور وہ ایک ہفتے کے لئے ذخیرہ کر لیتے۔ حضرت وہب کی روایت میں ہے کہ بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گوشت کا سوال کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں انہیں وہ گوشت کھلاؤں گا جس کا زمین میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ اللہ نے ان پر ایک ہوا بھیجی جس نے ان کے گھروں کے قریب سلوی (بٹیر) بکھیر دیئے ایک مربع میل میں نیزے کی بلندی کے برابر اونچا ڈھیر لگ گیا۔ انہوں نے اگلے دن کے لئے بھی چھپا لیا تو وہ گوشت بدبودار ہو گیا۔ اور کھانے کے قابل ہی نہ رہا۔ سدی کا قول ہے کہ جب بنو اسرائیل صحرائے تیہ میں گرفتار ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کرنے لگے یہاں ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کیسے ہوگا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر من اتارا۔ یہ **زنجبیل** کے درخت پر اتر تا تھا۔ سلوی، یہ بٹیر کے مشابہ لیکن جسامت میں اس سے بڑا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی کے پاس آتا اور وہ اسے موٹا تازہ دیکھتا تو شکار کر لیتا وگرنہ چھوڑ دیتا اور وہ موٹا ہو کر ان کے پاس آ جاتا تھا۔ وہ کہنے لگے یہ تو کھانا ہے پانی کہاں سے آئے گا؟ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر اپنا عصا مارا اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر قبیلے نے ایک ایک چشمہ منتخب کر لیا۔ وہ کہنے لگے پانی تو مل گیا اب سایہ کے بغیر گذارا مشکل ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بادل کا سائبان تن دیا۔ پھر وہ لباس کا مطالبہ کرنے لگے۔ چنانچہ ان کے لباس (قدرت الٰہیہ سے) خود بخود قد کے ساتھ بڑھتے رہتے جیسے بچے بڑھتے ہیں اور ان کا کپڑا بوسیدہ ہو کر پھٹتا نہیں تھا۔ ان تمام نعمتوں کی طرف ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات کریمہ میں اشارہ فرمایا ہے: وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ...... اور فرمایا: وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ...... وہب بن منبہ اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول بھی اسی طرح ہے۔ ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کے کپڑے نہ بوسیدہ ہوتے اور نہ انہیں دھونے کی ضرورت پیش آتی۔ اس سے آگے ابن جریج لکھتے ہیں کہ اگر وہ زائد از ضرورت من وسلوٰی کا ذخیرہ کر لیتے تو یہ خراب ہو جاتا لیکن اگر جمعہ کو دو دن کے لئے لے لیتے تو خراب نہ ہوتا۔

ابن عطیہ کا قول ہے کہ باتفاق مفسرین سلوی ایک پرندہ ہے۔ ہذلی شاعر نے غلطی سے اسے شہد قرار دیا ہے اور بطور استشہاد وہ کہتا ہے۔

وَقَا سَمَهَا بِاللّٰهِ جُهْدًا لَا نْتُمْ اَلَذُّ مِنَ السَّلْوٰى اِذَا مَا نَشُوْرُهَا

سلویٰ کو شہد گمان کیا۔ قرطبی کا قول ہے کہ اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ مؤرج جن کا شمار علماء لغت وتفسیر میں ہوتا ہے کا قول ہے کہ یہ شہد ہے۔ اور ہذلی کے اس شعر سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بنوکنانہ کی لغت بھی یہی ہے۔ کیونکہ اس سے شگفتگی اور فرحت وتازگی حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے ہے عین سلوان۔ جوھری نے بھی سلوی کا معنی شہد لیا ہے۔ اور ہذلی کے مذکورہ شعر سے استدلال کیا ہے۔ ''السلوانۃ'' ایک نگینہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اس سے پڑنے والے بارش کے پانی کو عاشق زار پی لے تو اسے آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

شَرِبْتُ عَلٰى سَلْوَانَةٍ مَاءَ مُزْنَةٍ فَلَا وَجَدِيْدِ الْعَيْشِ يَا مَيّ مَا اَسْلُوْ

اس پانی کا نام سلوان ہے۔ بعض کا قول ہے کہ سلوانا یک دوائی ہے جس کے پینے سے کبیدہ خاطر شخص کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اطباء وحکماء اسے ''مفرح'' کہتے ہیں۔ کہتے کہ سلوی اسم جمع ہے جیسے ''سمانی'' مفرد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے اسی طرح ''دفلی'' ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ اس کا واحد ''سلواۃ'' آتا ہے اور یہ شعر کہا ہے۔

وَاِنِّيْ لَتَعْرُوْنِيْ لِذِكْرَاكِ هَزَّةٌ كَمَا انْتَفَضَ السَّلْوَاةُ مِنْ بَلَلِ الْقَطْرِ

کسائی کا قول ہے کہ یہ واحد اور اس کی جمع سلاوی آتی ہے یہ سب قرطبی نے نقل کیا ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (بقرہ:57) کھاؤ امر کا صیغہ اباحت، ارشاد اور اظہار احسان کے لئے ہے۔ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ یعنی ہم نے انہیں حکم دیا کہ ہماری عطا کردہ پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ۔ اور عبادت کرو۔ جیسے ایک جگہ فرمایا: كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (سبا:15) ''کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو'' لیکن بجائے اس کی بے پایاں رحمتوں اور لاتعداد نعمتوں پر شکریہ ادا کرنے کے انہوں نے مخالفت اور ناشکری کی۔ واضح نشانیوں اور قطعی معجزات اور خلاف عادت واقعات کا انکار کر کے اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ یہاں سے حضور نبی کریم ﷺ کے جلیل القدر صحابہ کرام کی فضیلت دیگر تمام انبیاء کے اصحاب پر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ صبر وثبات اور عجز وانکسار کا بے مثال مرقع تھے۔ تمام بیرونی دوروں اور غزوات میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہے۔ حتیٰ کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر شدید گرم موسم میں دھوپ کی تمازت اور بے پناہ مشکلات کا بخوشی سامنا کیا اور کسی قسم کے معجزے اور خلاف فطرت بات کا مطالبہ نہ کیا۔ باوجودیکہ تمام امور نبی کریم ﷺ کے لئے ازحد آسان تھے۔ (ہاں جنگ تبوک کے موقع پر) جب بھوک سے نڈھال ہو گئے۔ تو کھانے میں برکت کی درخواست کی۔ جو کچھ بچا کھچا تھا جمع کیا۔ وہ سب کچھ اس قدر جگہ بھی نہ گھیر سکا جس پر بکری بیٹھتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور سب کو اپنے توشہ دان بھر لینے کا حکم دیا۔ اسی طرح سخت پیاس کے وقت جب پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا فرمائی ایک بادل آیا۔ خوب کھل کر برسا۔ سب نے پیا۔ جانوروں کو پلایا اور اپنے مشکیزے اور مشکیں بھر لیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ بارش تو صرف لشکر کے پڑاؤ پر ہی ہوئی تھی۔ متابعت اور اطاعت کی یہ اعلیٰ ترین مثال ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿58﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ

الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۵۹﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا داخل ہو جاؤ اس بستی میں پھر کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو اور جتنا چاہو اور داخل ہونا دروازہ سے سر جھکائے ہوئے اور کہتے جانا بخش دے (ہمیں) ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں اور ہم زیادہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو پس بدل ڈالا ان ظالموں نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں تو ہم نے اتارا ان ستم پیشہ لوگوں پر عذاب آسمان سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے''۔

جہاد سے منہ موڑنے اور ارض مقدس میں داخلے سے انکار پر اللہ تعالیٰ انہیں ملامت فرما رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے جب وہ بلاد مصر سے ہجرت کر کے چلے آئے تو انہیں اپنی آبائی میراث ارض مقدس میں آباد ہونے اور کفار عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ملا۔ (کیونکہ یہود کی عدم موجودگی میں انہوں نے بنی اسرائیل کے اصلی وطن شام پر قبضہ جمالیا تھا) لیکن انہوں نے لڑائی سے صاف انکار کر دیا۔ کمزوری اور بے سروسامانی کا بہانہ کیا۔ چنانچہ اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں تیہ کے ریگستان میں ڈال دیا۔ اس کا ذکر سورۂ مائدہ میں آیا ہے۔ اصح قول کے مطابق یہاں قریہ کے لفظ سے مراد بیت المقدس ہے۔ جیسا کہ سدی، ربیع بن انس، قتادہ، ابو مسلم اصفہانی وغیرہ نے تصریح کی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کی حکایت کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَلَا تَرۡتَدُّوۡا...... (مائدہ:21) ''اے میری قوم! داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اور نہ پیچھے ہٹو'' بعض دیگر علماء کا قول ہے کہ یہ اریحاء ہے۔ لیکن ابن عباس اور عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے کہ یہ بات بعید ہے کیونکہ یہ شہر ان کے راستے میں نہیں آتا اور دوسری بات یہ کہ وہ بیت المقدس جانا چاہ رہے تھے نہ کہ اریحاء کی طرف۔ اس سے بعید از قیاس بات ان لوگوں کی جنہوں نے اس سے مراد مصر لیا ہے۔ رازی نے اسے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے لیکن صحیح قول پہلا ہے کہ اس سے مراد بیت المقدس ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چالیس سال تک تیہ کے صحراء کی خاک چھاننے کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے ہمراہ اس خطہ بے آب و گیاہ سے نکلے جہاد کیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے جمعہ کی شام انہیں فتح نصیب فرمائی اور وہ اس مقدس سر زمین کے مالک بنے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورج کو تھوڑی دیر کے لئے روک دیا تھا تاکہ ان کے لئے فتح ممکن ہو جائے (واضح رہے کہ ہفتہ کے دن ان کے لئے لڑائی کرنا حرام تھا) جب وہ اسے فتح کر چکے تو حکم ہوا کہ شہر کے دراوزے سے سر جھکائے ہوئے داخل ہوں۔ یہ تضرع اور تذلل اللہ کی طرف سے فتح ونصرت، اپنے ملک کی آزادی، صحرائے تیہ اور گمراہی سے نجات جیسی نعمتوں پر اظہار تشکر وسپاس کی خاطر تھا۔ عوفی کی تفسیر یہی ہے کہ ابن عباس نے ''سُجَّدًا'' کا معنی ''رُکَّعًا'' کیا ہے۔ ابن جریر نے سعید بن جبیر کے حوالے سے ابن عباس سے یہی روایت کیا ہے کہ چھوٹے دروازے سے رکوع کی حالت میں داخل ہوں۔ حاکم اور ابن ابی حاتم نے سفیان ثوری کی حدیث میں یہی نقل کیا ہے لیکن اس پر یہ اضافہ ہے کہ وہ اپنی پشتوں کے بل داخل ہوئے۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ وہ داخلے سے قبل اپنے چہروں کے بل سجدہ کریں (یعنی ان کے نزدیک یہاں سجدہ کا شرعی معنی مراد ہے۔ مترجم) لیکن رازی نے اسے بعید از قیاس خیال کیا ہے۔ بعض مفسرین سے مروی ہے کہ یہاں سجدہ کا لغوی معنی تذلل اور انکسار مراد ہے کیونکہ حقیقی معنی یہاں مراد لینا ناممکن ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ دروازہ قبلہ سے پہلے تھا۔ ابن عباس، مجاہد، سدی، قتادہ اور ضحاک اور کا قول ہے کہ یہ باب الحطۃ ہے جو کہ بیت المقدس کا ایک دروازہ ہے۔ رازی نے بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ باب سے مراد جہت قبلہ ہے۔ خصیف اور

عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ پہلو کے بل داخل ہوئے۔ سدی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہیں خشوع وخضوع سے سر جھکا کر اندر داخل ہونے کا حکم تھا لیکن وہ خلاف ورزی کرتے ہوئے سر اٹھائے ہوئے داخل ہوئے۔ (وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ) ثوری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حطۃ سے مراد طلب مغفرت ہے۔ عطاء، حسن، قتادہ اور ربیع بن انس کا یہی قول ہے۔ ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یوں کہو ''یہ امر حق ہے۔'' جیسے تمہیں کہا گیا ہے۔ عکرمہ کا قول ہے کہو لا الہ الا اللہ اوزاعی کا قول ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کی طرف لکھا۔ (جس کا انہوں نے تو نام بھی بیان کیا تھا) اور اس سے حطۃ کا معنی پوچھا جواباً اس نے لکھا ''گناہ کا اعتراف کرو۔'' حسن اور قتادہ کا قول ہے ہماری لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کر دے۔ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ یہ جواب امر ہے یعنی اگر تم نے ہمارے دیئے ہوئے حکم پر عمل کیا تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکیاں بڑھا دیں گے۔

خلاصہ بحث: یہ فتح کے وقت انہیں قولاً فعلاً بارگاہ الٰہی میں جھکنے، اعتراف گناہ، اس پر استغفار کرنے اور احسان پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ نصرت خداوندی پر تشکر وامتنان اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے ارشاد ہوتا ہے۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ......... اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا'' ترجمہ: جب اللہ کی مدد آپہنچے اور فتح (نصیب ہو جائے) اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج۔ تو (اس وقت) اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کیجئے اور (اپنی امت کے لئے) اس سے مغفرت طلب کیجئے بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے'' (سورۂ نصر: 3-1)۔ بعض صحابہ نے اس کی تفسیر فتح ونصرت کے وقت کثرت ذکر اور استغفار سے کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اس میں سرکار دوعالم ﷺ کو اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ آپ (ﷺ) کا آخری وقت قریب آپہنچا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کی تصدیق فرمائی۔ اور اس میں کوئی تضاد نہیں کہ اس میں استغفار کا حکم بھی ہوا اور آپ ﷺ کی مبارک روح کو وقت رحیل کی خبر بھی۔ اسی لیے سرکار دوعالم ﷺ فتح کے وقت از حد تواضع اور انکسار ظاہر فرماتے تھے۔ مروی ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ ﷺ ثنیہ علیا (بالائی گھاٹی) کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے تھے اس طرح کہ قریب تھا کہ آپ ﷺ کی ٹھوڑی مبارک پالان کو چھو جائے۔ شہر میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں یہ چاشت کا وقت تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے چاشت کے نوافل ادا فرمائے بعض کے نزدیک یہ فتح ونصرت پر شکرانے کے نوافل تھے۔ چنانچہ ان کی رائے میں حاکم یا امیر جب فاتحانہ طور پر کسی شہر میں داخل ہو تو سب سے پہلے آٹھ رکعات پڑھنا اس کے لئے مستحب ہے۔ جیسے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے ایوان کسریٰ میں داخلے کے وقت آٹھ رکعتیں ادا فرمائی تھیں۔ صحیح یہ ہے کہ وہ ہر دو رکعتوں کے مابین سلام کا فاصلہ کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک سلام سے ایک ساتھ ہی ساری نماز پڑھے گا۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ (شہر کے) دروازے سے سر جھکائے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا بخش دے لیکن وہ سرین کے بل داخل ہوئے اور تحریف کر کے بجائے حطۃ کے ''حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ'' کہتے ہوئے گئے۔ ابو داؤد ونسائی، عبد الرزاق، ترمذی نے اسے روایت کیا ہے ترمذی کا قول ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ محمد بن اسحٰق نے ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حِنْطَةٌ فِيْ شَعِيْرَةٍ (1) (جو میں گندم) کہا ابن مردویہ کا قول ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم ایک رات حضور

1۔ تفسیر طبری: 303/1

ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔رات کے آخری حصہ میں ہم ایک گھاٹی سے گذرے جسے ذات حنظل کہا جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس گھاٹی کی مثال آج رات اس دروازے کی طرح ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل سے فرمایا تھا (اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ...... الخ)(1)۔سفیان ثوری نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔کہ یہود کو جب اس دروازے میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تو پشت کے بل داخل ہوئے۔اور کہہ رہے تھے "حِنْطَةٌ حَمْرَآءُ فِیْ شَعِیْرَةٍ" (جو میں سرخ گندم) اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے: فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ...... ثوری حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حِطَّةٌ کی جگہ "حِنْطَةٌ حَبَّةٌ حَمْرَآءُ فِیْهَا شَعِیْرَةٌ" کہہ دیا۔تو اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ...... اسباط نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا "هطا سمعانا ازبة مزبا" اس کا عربی ترجمہ (حَبَّةُ حِنْطَةٍ فِیْ حَمْرَآءَ مَثْقُوْبَةٌ فِیْهَا شَعْرَةٌ سَوْدَآءُ) بنتا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا۔ثوری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ اللہ نے انہیں فرمایا چھوٹے دروازے سے جھکتے ہوئے داخل ہو۔تو وہ پیٹھ کے بل داخل ہوئے اور حنطۃ کہنے لگے۔حضرات مجاہد، عطاء، عکرمہ، ضحاک، حسن، قتادہ، ربیع بن انس اور یحییٰ بن رافع کا یہی قول ہے۔مفسرین کے اقوال کا خلاصہ اور کلام کا سیاق وسباق اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انہوں نے قولاً فعلاً حکم خداوندی کی نافرمانی کی تھی اور اس کا مذاق اڑایا۔یہ مخالفت اور عناد کی انتہاء ہے۔قولہ تعالیٰ فَاَنْزَلْنَا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کتاب اللہ میں جہاں بھی رجز کا لفظ آیا ہے اس سے مراد عذاب الٰہی ہے۔مجاہد ابو مالک، السدی، الحسن اور قتادہ کا قول ہے کہ اس سے مراد عذاب ہے۔ابو العالیہ نے رجز کا معنی غضب کیا ہے۔شعبی کا قول ہے کہ رجز سے مراد طاعون یا سردی ہے۔سعید بن جبیر کا قول ہے کہ یہ طاعون ہے ابن ابی حاتم نے سعد بن مالک، اسامہ بن زید اور خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔"طاعون عذاب (رجز) ہے تم سے پہلے لوگوں کو یہی عذاب دیا گیا"(2)۔نسائی نے سفیان ثوری کی روایت میں اسی طرح ذکر کیا ہے اس حدیث کی اصل صحیحین میں موجود ہے۔اس کے راوی حبیب بن ابی ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "جب تمہیں خبر ملے کہ فلاں سرزمین میں طاعون ہے تو وہاں نہ جاؤ" الحدیث(3)۔ابن جریر نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ تکلیف اور بیماری رجز ہے۔"تم سے پہلی امتوں کو یہی عذاب دیا گیا تھا۔اس حدیث کی اصل بھی صحیحین میں موجود ہے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۶۰﴾

"اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے تو ہم نے فرمایا مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر تو فوراً بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے۔پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے"۔

ارشاد ہوتا ہے کہ میری اس نعمت کو یاد کرو جب میں نے تمہارے نبی موسیٰ علیہ السلام کی دعاء استسقاء قبول فرمالی تھی اور تمہیں پانی عطا

1۔الدرالمنثور:71/1 2۔البخاری:213/4 3۔البخاری:168/7

فرمایا اس طرح کہ پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر قبیلے نے اپنا چشمہ پہچان لیا۔ اور ہم نے کہہ دیا من وسلوی سے کھاؤ یہ پانی جو تمہیں بغیر کسی کاوش کے دستیاب ہے نوش کرو۔ اور اس وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو جس نے تمہارے لیے یہ چیزیں مسخر فرمائیں۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ کفرانِ نعمت نہ کرو ورنہ یہ نعمتیں چھین لی جائیں گی۔ مفسرین کرام نے یہاں کافی وضاحت فرمائی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے ایک مربع چٹان پر اپنا عصا مارا تو ہر طرف سے تین چشمے ابلنے لگے۔ ہر قبیلہ اپنے چشمے سے پانی پیتا۔ جب وہ کوچ کرتے تو جس جگہ بھی پڑاؤ کرتے وہ پتھر وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔ حدیث کا یہ حصہ نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے یہ حدیث الفتون (فتنوں والی) کے نام سے معروف ہے۔ عطیہ عوفی کا قول ہے کہ یہ پتھر بیل کے سر کی طرح تھا۔ جب سفر کرتے تو اسے بیل پر لاد دیا جاتا۔ جب کسی جگہ پڑاؤ ہوتا اسے رکھ دیتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا مارتے تو بارہ چشمے جاری ہو جاتے۔ جب کوچ کرتے اسے بیل پر لادتے تو پانی رک جاتا۔ (نوٹ: بارہ چشموں کی وجہ یہ تھی کہ بنو اسرائیل کا ہر قبیلہ دوسرے سے پرخاش رکھتا تھا۔ چونکہ ان قبائل کی تعداد بارہ تھی اس لیے بارہ چشمے جاری ہوئے ہر قبیلے نے ایک چشمہ منتخب کر لیا۔ مترجم) عثمان بن عطاء خراسانی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بنو اسرائیل کا ایک پتھر تھا۔ حضرت ھارون علیہ السلام اسے رکھتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر ضرب لگاتے تھے۔ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ یہ پتھر طور پہاڑ کا تھا۔ اسے ہر وقت اٹھائے پھرتے۔ جب قافلہ قیام کرتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر عصا سے ضرب لگاتے تھے۔ زمخشری کا قول ہے کہ یہ ایک مربع ذراع مساحت کا سنگ مرمر کا تھا۔ ایک قول ہے کہ یہ انسان کے سر کی طرح تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ جنت سے لایا گیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد مبارک کے برابر اس کا طول دس ہاتھ تھا۔ اس میں دو دراڑیں تھیں جو اندھیرے میں چمکتی رہتی تھیں۔ اسے گدھے پر لادا جاتا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اسے جنت سے لائے تھے۔ ورثہ در ورثہ چلتا ہوا یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچا۔ انہوں نے عصا اور یہ پتھر دونوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ وہی پتھر تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بوقت غسل اپنے کپڑے رکھے تھے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اسے اٹھا لیجئے اس میں قدرت ہے اور اس پر آپ علیہ السلام کے دست مبارک سے معجزہ ظاہر ہوگا۔ تو آپ علیہ السلام نے اسے توبرے میں اٹھا لیا تھا۔ (نوٹ: بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پتھر پر اپنے کپڑے رکھ کر نہا رہے تھے۔ قدرت خداوندی سے وہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مترجم) زمخشری کا قول ہے کہ یہ الحجر پر لام یہاں جنس کے لئے ہے عہد کے لئے نہیں۔ یعنی اِضْرِبِ الشَّيْءَ الَّذِيْ يُقَالُ لَهُ الْحَجَرُ۔ (وہ چیز جسے پتھر کہا جاتا ہے اس پر عصا مارو) حضرت حسن کا فرمان ہے کہ کسی مخصوص پتھر پر مارنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ فرماتے ہیں اور یہی معجزے کا اظہار اور قدرت کا کمال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پتھر پر اپنا عصا مارتے تو فوراً اس میں سے بارہ چشمے بہہ نکلتے۔ پھر ضرب لگاتے تو وہ خشک ہو جاتے وہ کہنے لگے اگر یہ پتھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گم ہو گیا تو ہم تو پیاسے مر جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ آئندہ پتھر کو حکم دیا کریں تو اس سے چشمے بہنا شروع ہو جائیں گے۔ اب عصا نہ ماریں شاید انہیں یقین آ جائے واللہ اعلم۔ یحییٰ بن نضر کا قول ہے کہ میں نے جو یبر سے پوچھا ہر گروہ نے اپنا اپنا چشمہ کس طرح پہچانا تھا؟ انہوں نے کہا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پتھر پر اپنا عصا مارنے لگتے ہر قبیلے کا آدمی پاس کھڑا ہوتا۔ ضرب لگتے ہی فوراً اس میں چشمے جاری ہو جاتے۔ ہر چشمہ ایک شخص کی طرف بہنے لگتا۔ وہ شخص اپنے قبیلے کو بلا کر یہ کہہ دیتا کہ یہ چشمہ تمہارا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب بنو اسرائیل تیہ کے ریگستان میں مارے مارے پھرتے تھے یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ (قدرت نے) ان کے لئے

پتھر سے پانی کی نہریں جاری کر دیں۔ عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے یہی مروی ہے یہ واقعہ اس واقعہ کے مشابہ ہے جو سورۂ اعراف میں ہے لیکن چونکہ وہ مکی سورت ہے۔ اس لئے وہاں اس کا بیان غائب کی ضمیر سے کیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ان کے حالات سے آگاہ فرما رہے ہیں۔ لیکن یہ سورت (بقرہ) مدنی سورت ہے۔ اس لیے خطاب ان کو ہے۔ سورۂ اعراف میں فانبجست کہا۔ کیونکہ وہ ابتدائے انفجار ہے۔ اور یہاں آخری حالت کی خبر دی جا رہی ہے۔ لہٰذا انفجار کا ذکر یہاں مناسب تھا۔ وہ لفظ وہاں مناسب تھا۔ واللہ اعلم۔ دونوں جگہ کی کلام میں دس جگہ فرق ہے لفظی بھی اور معنوی بھی۔ زمخشری نے انہیں اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اور ان کے جوابات بھی دیئے ہیں اور یہ حقیقت کے قریب ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ

''اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم صبر نہیں کر سکتے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو آپ دعا کیجئے ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہ نکالے ہمارے لیے وہ جن کو زمین اگاتی ہے (مثلاً) ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو عمدہ ہے۔ (اچھا) جا رہو کسی شہر میں تمہیں مل جائے گا جو تم نے مانگا''۔

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور فضل و احسان کا بیان جاری ہے ارشاد ہوتا ہے میری اس نعمت کو یاد کرو جب میں نے من و سلویٰ جیسا عمدہ، نفع بخش، خوشگوار کھانا بلا مشقت عطا فرمایا۔ لیکن تم الٹے پاؤں پھر گئے اور میرے عطا کردہ رزق پر اکتاہٹ کا اظہار کیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گھٹیا قسم کی اشیاء کا مطالبہ کرنے لگے۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ وہ (زیادہ نعمتیں) کھا کھا کر بگڑ گئے اور اترانے لگے۔ ان سے صبر نہ ہو سکا اور گذشتہ طرز زندگی کو یاد کرنے لگے۔ یہ قوم مسور، پیاز، ساگ اور گندم کھانے کی عادی تھی۔ چنانچہ انہوں نے انہی اشیاء کا پرزور مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے طعام واحد (ایک کھانے) کا لفظ استعمال کیا تھا حالانکہ وہ دو چیزیں من و سلویٰ کھاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح و شام چونکہ ان کا ایک ہی قسم کا کھانا ہوتا تھا۔ روزانہ ڈش کے تبدیل نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا۔ بقل (ساگ پات)، قثاء (ککڑی)، عدس (مسور) اور بصل (پیاز) تو معروف سبزیاں ہیں۔ لیکن فُوم کی تفسیر میں سلف صالحین کا اختلاف ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں یہ لفظ ثومھا ثاء کے ساتھ آیا ہے۔ لیث بن ابی سلیم کی روایت مجاہد سے بھی اسی طرح ہے۔ ربیع بن انس اور سعید بن جبیر جیسے بھی یہی مروی ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت حسن سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس کا معنی ثوم (لہسن) کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ لغت کی قدیم کتابوں میں ''فَوِّمُوْا لنا'' (اِخْتبِزُوا) کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی ہمارے لیے روٹی پکاؤ۔ ابن جریر کا قول ہے۔ اگر یہ معنی صحیح ہے تو یہ حروف مبدلہ میں سے ہے۔ جیسے اہل عرب کہتے ہیں (وَقَعُوْا فِیْ عَاشُوْرُ شَرٌ، عَافُوْرَ شَرٌ) یا (اَثَافِیْ اور اَثَاثِیْ) یا (مَغَافِیْر اور مَغَاثِیْر) وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ان میں فاء کو ثاء سے اور ثاء کو فاء سے بدلا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء کا قول ہے کہ فوم کا معنی گندم ہے۔ جس سے روٹی پکتی ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس لفظ کا معنی پوچھا گیا تو

آپ رضی اللہ عنہ نے گیہوں بتایا۔اور سائل سے فرمایا کیا تو نے احیحہ بن جلاح کا یہ شعر نہیں سنا۔

قَدْ كُنْتُ اَغْنَى النَّاسِ شَخْصًا وَاحِدًا وَرَدَ الْمَدِيْنَةَ عَنْ زِرَاعَةِ فُوْمٍ

گندم کی کاشت کے سبب میں شہر کا متمول ترین شخص تھا۔ابن جریر نے کریب کی روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ بنو ہاشم کی زبان میں فوم گیہوں کو کہتے ہیں۔علی بن ابی طلحہ،ضحاک اور عکرمہ نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا ہے۔ سفیان ثوری نے مجاہد اور عطاء سے اس کا معنی خُبْزٌ (روٹی) کیا ہے۔ابو مالک،سدی،عکرمہ،حسن بصری،قتادہ اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ نے بھی اس کا معنی گیہوں ہی نقل کیا ہے۔واللہ اعلم جوہری نے گندم،ابن درید نے سنبلۃ بتایا ہے۔قرطبی نے عطاء اور قتادہ کا قول لکھا ہے کہ ''فوم سے مراد ہر وہ دانہ ہے جو پکایا جاتا ہے۔'' علماء تفسیر کے نزدیک یہ حمص (چنا) ہے۔شامی لغت یہی ہے۔اس لیے اس کے بیچنے والے کو فامی کہتے ہیں۔امام بخاری لکھتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک بطور خوراک استعمال ہونے والے سب دانے فوم کے زمرے میں آتے ہیں۔قولہ تعالیٰ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ آسودہ زندگی،خوشگوار پاکیزہ عمدہ کھانوں کی جگہ یہ گھٹیا کھانے مانگنے پر انہیں زجر وتوبیخ کی جارہی ہے۔''اِهْبِطُوْا مِصْرًا'' مصحف امام میں اسی طرح تنوین کے ساتھ منصرف لکھا ہوا ہے۔جمہور کی قرأت میں یہ منصرف ہے۔ابن جریر کا فرمان ہے کہ اگر حضرت عثمان کے مرتب کردہ جامع مصاحف کا اس پر اتفاق نہ ہوتا تو میں اس قرأت کو ہرگز جائز نہ قرار دیتا۔ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے کوئی سا شہر مراد لیا ہے۔جس طرح کہ ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے۔ سدی،قتادہ اور ربیع بن انس کا یہی قول ہے۔ابن جریر نے ہی لکھا ہے کہ ابی بن کعب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے (مِصْرَ) کی قرأت یعنی غیر منصرف بھی منقول ہے۔ابو العالیہ اور ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس سے مراد شہر فرعون لیا ہے۔ابن حاتم نے ان دونوں حضرات کے علاوہ اعمش سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ابن جریر کا قول ہے کہ ہوسکتا ہے اس سے مراد فرعون کا شہر ہی ہو۔لیکن الف کا اضافہ مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط کی اتباع میں ہے۔جیسے اس آیت کریمہ میں ہے (قواریرا قواریرا) پھر اس کی مراد میں توقف کیا ہے کہ فرعون کا شہر ہے یا کوئی غیر معین شہر لیکن ان کی یہ بات محل نظر ہے۔فی الحقیقت اس سے مراد کوئی سا شہر ہے جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ جس چیز کا تم نے مطالبہ کیا ہے یہ کوئی بڑی چیز نہیں جو جنس نایاب ہو بلکہ کسی بھی شہر میں چلے جاؤ تمہیں یہ چیزیں مل جائیں گی۔اپنے کم تر درجہ اور کثرت کی وجہ سے ان کے لئے دعا کی ضرورت نہیں۔چونکہ ان کا یہ سوال تکبر اور سرکشی کی بنا پر تھا۔اور ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔اس لیے انہیں کوئی جواب نہ دیا گیا۔واللہ اعلم۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

''اور مسلط کردی گئی ان پر ذلت اور غربت اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق۔یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے''۔

قولہ تعالیٰ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ شرعاً وقدراً ذلت اور غربت ان پر مسلط کردی گئی ہے یعنی وہ ہمیشہ ذلیل رہیں گے۔جو بھی انہیں پائے گا انہیں رسوا کرے گا،ان سے اہانت آمیز سلوک روا رکھے گا۔پستی ان پر لازم کردی گئی ہے۔بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ

خود بھی ذلیل ورسوا اور تنگدست ہیں۔ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد ان پر جزیہ لازم کرنا ہے۔عبد الرزاق نے حسن اور قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیتے ہیں اس حال میں کہ وہ مغلوب ہیں۔ضحاک کا قول ہے کہ ذلت سے مراد رسوائی ہے۔حسن کا قول ہے اللہ نے انہیں رسوا کر کے مسلمانوں کے قدموں تلے ڈال دیا ہے۔اب انہیں کوئی شان وشوکت حاصل نہیں۔حالانکہ اس امت سے پہلے مجوسی انہیں جزیہ دیتے تھے۔ابو العالیہ، ربیع بن انس اور سدی کا قول ہے کہ "مسکنة" سے مراد فقر و تنگدستی ہے۔عطیہ عوفی نے اس کا معنی خراج اور ضحاک نے جزیہ کیا ہے۔وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ضحاک نے باءُ و کا معنی مستحق ہو گئے کیا ہے۔ربیع بن انس نے کہا ہے کہ ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔سعید بن جبیر نے لکھا ہے کہ ناراضگی کو انہوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا۔ابن جریر نے اس کا معنی اِنْصَرَفُوْا وَ رَجَعُوْا کیا ہے۔بَآءَ فعل یا تو بھلائی کے ساتھ آتا ہے یا برائی کے ساتھ۔کہا جاتا ہے بَآءَ فُلَانٌ بِذَنْبِهٖ۔ بُوْءَ بِهٖ بُوْءً اَوْ بُوَاءً اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا: اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ (مائدہ:29) "میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو اٹھا لے میرا گناہ اور اپنا گناہ" یہاں باء برائی کے ساتھ ہے۔کلام کا مفہوم یہ ہے کہ جب وہ منہ پھیر کر لوٹے اللہ کا غضب اٹھائے ہوئے تو ان پر اللہ کا غضب ہوا اور اللہ کی ناراضگی واجب ہو گئی قولہ تعالیٰ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم نے انہیں ذلت، تنگدستی اور غضب الٰہی کی سزا دی ہے یہ بلا وجہ نہیں بلکہ خود ان کی سرکشی، آیات خداوندی کا انکار حاملین شریعت یعنی انبیاء اور ان کے پیروکاروں کی اہانت کی وجہ سے ہے۔انہوں نے ان کی تنقیص کی ہے بلکہ بعض اوقات انہیں شہید کرنے سے بھی باز نہ آئے۔اس سے بڑا اور گناہ کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا۔اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے رہے۔اسی لیے متفقہ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تکبر، سرکشی کرتے ہوئے قبول حق سے انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔امام احمد کا قول ہے (اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ)۔ امام احمد روایت کرتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں راز کی باتوں میں شامل ہوتا تھا ایک دفعہ میں بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوا۔مالک بن مرارہ رہاوی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔میں نے ان کی آخری یہ بات سنی وہ کہہ رہے تھے یا رسول اللہ (ﷺ) اللہ نے جو حسن و جمال مجھے عطا فرمایا وہ آپ کے سامنے ہے۔میرا جی نہیں چاہتا کہ کسی کی جوتی کا ایک تسمہ بھی مجھ سے اچھا ہو تو کیا یہ خلاف حق نہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "یہ حق سے بغاوت نہیں(1)۔لیکن بغاوت تو حق کو مسترد کر دینا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔" اسی لیے جب بنو اسرائیل نے آیات خداوندی کے انکار اور انبیاء کو قتل کرنے کے ناپاک جرائم کا ارتکاب کیا تو اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا اور دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی کی چادر انہیں اوڑھا دی گئی۔یہ ان کے گناہوں کی پوری سزا تھی۔ابو داؤد طیالسی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بنو اسرائیل ایک دن میں تین سو نبیوں کو قتل کر دیتے۔پھر دن کے آخر میں سبزی فروخت کرنے کا بازار لگاتے۔امام احمد نے بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔" قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں وہ شخص ہو گا جس کو نبی نے قتل کیا ہو یا اس نے نبی کو قتل کیا ہو یا گمراہی کا امام اور تصویریں بنانے والا(2)۔قولہ تعالیٰ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ اتنی شدید سزا کی ایک اور علت بیان کی جا رہی ہے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے۔عصیان کا معنی فعل المناہی (ممنوع کام کرنا) اور اعتداء کا معنی مقرر کردہ حد اور حکم سے تجاوز کر جانا ہے۔واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

1۔مسند امام احمد:385/1 2۔مسند امام احمد:385/1

عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

''یقین کرو اسلام کے پیروکار ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لیے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کے اوامر کی خلاف ورزی کی تھی، ممنوعات کا ارتکاب کیا، حد سے تجاوز کیا اور محارم کا ارتکاب کیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر جو عذاب مسلط فرمایا تھا اس کا ذکر کرنے کے بعد اب یہ خوشخبری دی جارہی ہے کہ سابقہ امتوں کے جس شخص نے نیک عمل کئے تھے اس کے لیے اچھا بدلہ ہے۔ اسی طرح تا قیامت جو شخص اس نبی امی کی اتباع کرے گا اس کے لئے ابدی سعادت ہے اور اسے آئندہ کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ہی جو چیز وہ چھوڑ کر جارہے ہیں اس کے بارے میں غمگین ہوں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس:62) ''سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے'' یا ملائکہ بوقت مرگ مومنین سے کہتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حٰمٓ السجدہ:30) ''بے شک وہ (سعادت مند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول پر پختگی سے قائم رہے اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا''۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ سے سابقہ دین (جس کا قبل از اسلام میں پیروکار تھا) کے بارے میں دریافت کیا اور ان کی نمازوں اور عبادات کا ذکر کیا۔ تو یہ آیت اتری: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى ...... سدی کا قول ہے کہ یہ آیت اصحاب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ایک دفعہ وہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں باتیں کررہے تھے کہ ان کے پرانے ساتھیوں کا تذکرہ چھڑ گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو بتایا کہ وہ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے، آپ ﷺ پر (غائبانہ) ایمان رکھتے تھے اور گواہی دیتے تھے کہ آپ ﷺ عنقریب مبعوث ہوں گے۔ جب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ان کی تعریف وتوصیف سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ تو جہنمی ہیں۔ یہ سن کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو بڑا رنج ہوا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یہود کا ایمان یہ تھا کہ جو تورات کو مانتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل پیرا بھی ہو۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئیں لیکن وہ تورات اور سنت موسیٰ علیہ السلام پر ہی جما رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع نہ کرے تو وہ ہلاک ہوگیا۔ نصاریٰ کا ایمان یہ تھا کہ جو شخص انجیل اور شریعت عیسیٰ علیہ السلام پر عمل پیرا ہو اس کا ایمان مقبول ہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت محمد ﷺ تشریف لے آئیں تو جو شخص ان میں سے حضور ﷺ کی اتباع نہ کرے۔ انجیل اور سنت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ چھوڑے وہ بھی ہلاکت میں ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (میں کہتا ہوں) کہ یہ روایت علی بن ابی طلحہ کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کے منافی نہیں یہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى ...... پہلے نازل ہوئی اس کے بعد یہ آیت اتری: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران:85) ''اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے اور وہ قیامت کو زیاں کاروں میں سے ہوگا''۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس فرمان میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد کسی کا کوئی عمل یا طریقہ قابل قبول نہیں جب تک وہ شریعت محمدیہ کے موافق نہ ہو۔ ہاں آپ ﷺ کی بعثت سے قبل جس نے اپنے زمانے کے نبی کی اتباع کی تو وہ ہدایت اور راہ نجات پر ہے۔ یہود سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں جو اپنے زمانے میں تورات کے بموجب عمل کرتے تھے۔ یہود یہ صیغہ

''ھوادۃ'' سے نکلا ہے اس کا معنی الفت ومودت ہے یا یہ تہود سے ماخوذ ہے اس کا معنی توبہ ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرمان (اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ) یعنی ہم تیری بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں۔ پس مذکورہ بالا دونوں صورتوں (توبہ اور مودت) میں سے کسی ایک اصل کی وجہ سے انہیں یہ نام دیا گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے فرزند یہودا کی اولاد میں سے ہیں۔ ابو عمرو بن علاء کا قول ہے چونکہ وہ تورات کی قرأت کے وقت حرکت کرتے تھے اس لیے انہیں یہ نام دیا گیا۔ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد بنواسرائیل پر آپ کی اطاعت واتباع لازمی ہے۔ آپ علیہ السلام کے اصحاب اور اہل دین نصاریٰ کہلاتے ہیں۔ لفظ نصرانی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ باہم ایک دوسرے کی نصرت اور معاونت کے سبب ان کا یہ نام پڑا۔ انہیں انصار بھی کہتے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان قرآن کریم میں بیان ہوا ہے: مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ (آل عمران:52) ''کون ہیں میرے مددگار اللہ کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی''۔ ایک قول ہے کہ انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا کہ یہ جس سرزمین میں اترے تھے اس کا نام ناصرہ تھا۔ قتادہ اور ابن جریج کا یہی قول ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ واللہ اعلم۔ نصاریٰ یہ نصران کی جمع ہے جیسے نشاوی، نشوان کی اور سکاریٰ، سکران کی جمع ہے۔ عورت کو نصرانہ کہتے ہیں۔ جیسے ایک شاعر کا قول ہے۔

نَصْرَانَةٌ لَمْ تَحَنَّفِ

جب اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو خاتم النبیین اور علی الاطلاق تمام بنی نوع انسان کی طرف نبی بنا کر مبعوث فرمایا تو ان پر آپ ﷺ کی تصدیق کرنا، آپ کے اوامر کو بجالانا اور منہیات سے رکنا واجب ہے۔ یہی سچے مومنین ہیں۔ امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوت و تسلیمات کو مومنین کا لقب ان کے ایمان کی صلابت، ایقان کی شدت کی وجہ سے پڑا نیز اس لئے بھی کہ یہ تمام سابقہ انبیاء ومرسلین پر ایمان رکھتے ہیں اور آئندہ آنے والی باتوں پر بھی۔ صابی کے لفظ میں اختلاف ہے۔ سفیان ثوری نے حضرت مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ مجوسیوں اور یہود ونصاریٰ کے مابین ایک قوم تھی جن کا کوئی دین نہ تھا۔ ابن ابی نجیح نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ عطاء اور سعید بن جبیر سے بھی یہی مروی ہے۔ ابو العالیہ، ربیع بن انس، سدی، ابوشعثاء، جابر بن زید، ضحاک اور اسحٰق بن راہویہ کا قول ہے کہ صابی یہ اہل کتاب کا ہی ایک فرقہ ہے یہ زبور پڑھتے ہیں اسی لیے ابوحنیفہ اور اسحٰق نے فتویٰ دیا تھا کہ ان کا ذبیحہ کھانا اور ان سے نکاح جائز ہے۔ حضرت حسن بصری فرمایا کرتے تھے کہ صابی مجوسیوں کی طرح ہیں یہ روایت ہیثم نے مطرف سے بیان کی ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کی روایت میں ہے کہ میں نے حسن کو فرماتے سنا کہ صابی وہ قوم ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ابن جریر نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ زیاد کو بتایا گیا کہ صابی قبلہ کی طرف رخ کرکے پانچ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ان کو جزیہ معاف کر دینے کا ارادہ کیا۔ پھر پتہ چلا کہ وہ فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ابوجعفر رازی کا قول ہے کہ میری اطلاع کے مطابق صابی قوم فرشتوں کی پوجا کرتی ہے وہ زبور پڑھتے ہیں اور قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں سعید بن ابوعروبہ نے قتادہ سے یہی روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے ابوالزناد نے فرمایا صابی لوگ عراقی ہیں کوثی کے مقام پر رہنے والے ہیں۔ تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہر سال تیس روزے رکھتے ہیں۔ یمن کی طرف منہ کرکے روزانہ پانچ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ وہب بن منبہ سے صابیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن وہ کسی شریعت پر عمل پیرا نہیں۔ اور اس سے کفر بھی سرزد نہیں ہوا۔ عبداللہ بن وھب نے عبدالرحمٰن بن زید سے نقل کیا ہے کہ یہ بھی ایک دین ہے یہ لوگ جزیرۂ موصل میں سکونت پذیر تھے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، کا اقرار کرتے۔ اس قول کے علاوہ ان کے پاس

کوئی عمل، کتاب یا نبی نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ کسی رسول پر ایمان لائے۔ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے کی وجہ سے مشرکین نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو بھی صابی کہا کرتے تھے۔ خلیل کا قول ہے۔ یہ وہ قوم ہے جن کا دین نصاریٰ سے مشابہ ہے لیکن ان کا قبلہ جنوب کی طرف ہے۔ وہ اپنے آپ کو حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر سمجھتے ہیں قرطبی نے مجاہد، حسن، ابن ابی نجیح سے روایت کیا ہے کہ اس قوم کا مذہب یہودیت اور مجوسیوت کا مرکب ہے۔ ان کا ذبیحہ حلال نہیں اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ اس سے آگے قرطبی لکھتے ہیں ان کے مذہب کے بارے میں علماء کے ذکر کردہ اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ توحید کے قائل، ستاروں کی تاثیر اور فاعلیت کے معتقد تھے۔ اسی لیے ابوسعید اصطخری نے ان کی تکفیر کا فتویٰ دیا تھا۔ امام رازی نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ صابی قوم ستاروں کی پجاری ہے یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے انہیں (ستاروں کو) دعاء اور عبادت کا قبلہ بنایا ہے۔ یا اللہ رب العزت نے اس عالم کائنات کی تدبیر امور ان کے سپرد فرمائی ہے۔ رازی فرماتے ہیں کہ یہ قول کشرانیوں کی طرف منسوب ہے۔ جن کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے تھے۔ واضح تر قول کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ مجاہد، ان کے پیروکاروں اور وہب بن منبہ کا ہے کہ یہ لوگ یہودی، عیسائی، مجوسی یا مشرک نہ تھے بلکہ یہ لوگ فطرت سلیمہ پر تھے۔ ان کا کوئی دین نہ تھا جس کی اتباع کرتے۔ اسی لیے مشرکین بھی دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو صابی کے لقب سے پکارتے تھے یعنی یہ لوگ کرہ ارض پر اس وقت موجود تمام ادیان سے نکل گئے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ صابی وہ لوگ ہیں جن تک کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾

”اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تم پر طور کو (اور حکم دیا) پکڑ لو جو ہم نے تم کو دیا مضبوطی سے اور یاد رکھنا وہ (احکام) جو اس میں درج ہیں شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ پھر منہ موڑ لیا تم نے پختہ وعدہ کرنے کے بعد۔ تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں“۔

اللہ تبارک وتعالیٰ بنو اسرائیل کو ان سے لیے گئے عہد و پیمان یاد دلا رہے ہیں (تم نے تو وعدہ کیا تھا) کہ میری توحید کا اقرار اور میرے رسولوں کی اتباع کرو گے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ان کے سروں پر پہاڑ کو بلند کر دیا گیا تھا تاکہ وہ پختگی سے وعدہ کا اقرار کریں اور اسے بجا لانے کا عزم مصمم کر لیں۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اعراف:171) ”اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ ان کے اوپر۔ اس طرح گویا وہ سائبان ہے اور خیال کرنے لگے کہ وہ ضرور گر پڑے گا ان پر (ہم نے کہا) پکڑ لو جو ہم نے دیا ہے تمہیں (پوری) قوت سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ“۔ طور پہاڑ کی تفسیر سورہ اعراف میں آئے گی۔ ابن عباس، مجاہد، عطاء، عکرمہ، حسن، ضحاک، ربیع بن انس وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ اور یہی بظاہر مناسب ہے ایک دوسری روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے طور وہ پہاڑ ہے جس پر روئیدگی ہوتی ہو۔ اور جس پر کچھ نہ اگتا ہو وہ طور نہیں ہے۔ فتنوں والی حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب وہ اطاعت سے کنارہ کش ہو گئے تو ان پر پہاڑ کو بلند کیا گیا تاکہ وہ سر تسلیم خم کر دیں۔ سدی کا قول ہے کہ جب انہوں نے سجدہ کرنے سے

انکار کر دیا تو اللہ نے پہاڑ کو ارشاد فرمایا وہ ان کے سروں پر آ گیا۔ جب انہوں نے اسے عین اوپر دیکھا تو فوراً پہلو کے بل سجدے میں گر گئے لیکن مارے ڈر کے دوسرے پہلو سے اوپر دیکھ لیتے کہ کہیں وہ ان پر گر نہ جائے۔ تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر رحم فرماتے ہوئے اسے ہٹا لیا۔ وہ کہنے لگے کہ اللہ کے نزدیک اس سجدہ سے زیادہ پسندیدہ کوئی سجدہ نہیں جس کے سبب ان سے عذاب دور ہوا۔ وہ اسی کیفیت پر سجدہ کرتے ہیں۔ حسن کا قول ہے کہ پکڑ لو جو ہم نے دیا مضبوطی سے خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ'' سے مراد تورات ہے۔ ابو العالیہ، ربیع بن انس نے قوت سے مراد اطاعت لیا ہے۔ مجاہد نے اس کی تفسیر قوت عمل سے کی ہے۔ قتادہ نے کہا ہے سنجیدگی سے پکڑ لو وگرنہ یہ تم پر گرا دوں گا۔ وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ۔ قتادہ، ربیع بن انس اور ابو العالیہ نے اس کا معنی اقرءُوْ (پڑھو) اور ''عمل کرو'' کیا ہے۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ اتنے پختہ وعدہ کے بعد بھی تم نے وعدہ خلافی کی اور منہ موڑ لیا۔ اب اگر اللہ اپنے فضل وکرم سے تمہاری توبہ کو قبول نہ فرماتا اور تم میں نبی اور رسول مبعوث نہ فرماتا تو تم نقض عہد و وعدہ شکنی کی وجہ سے دنیا اور آخرت دونوں میں ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

''اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی تو ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر پھٹکارے ہوئے پس ہم نے بنا دیا اس سزا کو عبرت ان کے لیے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے اور (اسے) نصیحت بنا دیا پرہیزگاروں کے لیے''۔

اللہ رب العزت جل مجدہ ارشاد فرماتے ہیں اے گروہ یہود تمہیں علم ہے کہ اہل قریہ جنہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی تھی اس کے عہد و پیمان کو توڑا تھا۔ ان پر کیا عذاب نازل ہوا تھا۔ ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ سنیچر کے دن کی تعظیم کریں گے اور اللہ کے احکام کو بجا لائیں گے (نوٹ:۔ واضح رہے کہ سنیچر کا روز بنو اسرائیل کے لئے عبادت کے لئے مخصوص تھا۔ اس روز کھیتی باڑی، شکار وغیرہ سب کام ممنوع تھے) لیکن انہوں نے سنیچر کے دن مچھلی کے شکار کے لئے حیلے بہانے تلاش کرنا شروع کر دیے وہ ہفتے سے ایک روز قبل کانٹے، جال، پھندے لگا لیتے یا دریا کے کنارے گڑھے کھود لیتے۔ سنیچر کے روز حسب عادت مچھلیاں جب بکثرت سطح آب پر نمودار ہوتیں تو ان کانٹوں، رسیوں وغیرہ میں پھنس جاتیں سنیچر کا روز گذرنے کے بعد رات کو وہ انہیں پکڑ لیتے۔ جب انہوں نے اس طرح کی مکاریوں سے کام لینا شروع کر دیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی شکلوں کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ یعنی بظاہر ان کی شکلیں تو انسانوں کی سی رہیں لیکن فی الحقیقت وہ انسان نہ تھے (یعنی ان میں بندروں کی سی رذیل عادتیں پیدا ہو گئیں) تو ان لوگوں کے اعمال بھی چونکہ بظاہر حق سے مشابہ اور باطن میں اس کے برعکس ہیں تو ان کو بھی یہی سزا ملے گی۔ یہ واقعہ بالتفصیل سورۂ اعراف میں مذکور ہے۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے: وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (اعراف:163) ''اور پوچھو ان سے حال اس بستی کا جو آباد تھی ساحل سمندر پر جبکہ وہ حد سے بڑھنے لگے ہفتہ (کے حکم کے بارے) میں۔ جب آیا کرتیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتہ کے دن پانی پر تیرتی ہوئی اور جو دن ہفتہ کا نہ ہوتا تو وہ نہ آتیں ان کے پاس (اس طرح بے دھڑک) ہم نے آزمائش میں ڈالا انہیں بہ سبب اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے''۔ سدیؒ کا قول ہے کہ وہ بستی ''ایلہ'' تھی۔ قتادہ نے بھی یہی کہا ہے۔ مفسرین کے اقوال کو وہاں ہم تفصیل سے بیان کریں گے ان شاء اللہ وبہ الثقة۔ ابن ابی حاتم نے

مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ مسخ معنوی تھا۔ یعنی ان کی شکلیں تو انسانوں کی سی رہیں لیکن دل مسخ ہو گئے۔ اس کی مثال اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (جمعہ:5) ''(ان کی مثال) اس گدھے کی سی ہے جس نے بھاری کتابیں اٹھا رکھی ہوں''۔ ابن جریر نے بھی مجاہد سے یہی روایت کیا ہے۔ مجاہد تک اس کی سند عمدہ ہے لیکن یہ قول غریب ہے اور اس جگہ سیاق کلام کے خلاف ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ..... (مائدہ:60) '' آپ (انہیں) فرمائیے کیا میں آگاہ کر دوں تمہیں کہ کون برا ہے ان سے باعتبار جزاء کے اللہ کے نزدیک وہ لوگ (برے ہیں) جن پر لعنت کی اللہ نے اور غضب فرمایا ان پر اور بنایا ان میں سے بعض کو بندر اور بعض کو سور اور (وہ برے ہیں) جنہوں نے پوجا کی شیطان کی''۔ عوفی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اللہ نے ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا تھا۔ یعنی جوان بندر بن گئے اور بوڑھے خنزیر۔ شیبان نحوی نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ مرد عورتیں پوری قوم شور کرنے والے بندر بن گئی۔ ان کی دُمیں اگ آئیں۔ عطاء خراسانی کا قول ہے آواز آئی اے بستی والو! بندر بن جاؤ۔ چنانچہ جنہوں نے منع کیا تھا ان کے پاس آتے وہ کہتے اے فلاں کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا؟ وہ سر ہلا کر جواب دیتے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان نقل کیا ہے کہ سنیچر کے روز حد سے تجاوز کرنے والے کچھ دیر کے لئے بندر بن گئے پھر ہلاک ہو گئے۔ ان کی نسل نہیں چلی۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان کی معصیت کے سبب اللہ نے انہیں بندر بنا دیا یہ کہتے ہوئے کہ روئے زمین پر تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہو گے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ کوئی مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔ بغیر کھائے پیے یا توالد و تناسل کے ہلاک ہو جاتی ہے۔ اللہ رب العزت نے بندر، سور اور دیگر تمام مخلوقات کو چھ ایام میں پیدا فرمایا تھا جس طرح کہ اس نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا پس وہ لوگ بندر بن گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ جسے چاہے جو عذاب دے۔ اور جس طرح چاہے مسخ کر دے ابو العالیہ کا قول ہے کہ خاسئین کا معنی ذلیل اور حقیر ہے۔ مجاہد، قتادہ ربیع اور ابو مالک سے بھی اسی طرح مروی۔ حضرت عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر وہی دن فرض کیا تھا جو تم پر فرض کیا ہے یعنی جمعہ کا دن۔ انہوں نے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سبت (ہفتہ) کی تعظیم کی اور حکم الٰہی کا انکار کر دیا۔ جب وہ سنیچر کے دن پر ہی اڑے رہے تو اللہ نے انہیں آزمائش میں مبتلا کیا۔ جو چیز دیگر ایام میں حلال تھی اس دن ان پر حرام کر دی گئی۔ وہ ایلہ اور طور کے درمیان ایک بستی کے باشندے تھے جسے مدین کہتے تھے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار اور اسے تناول کرنا ان پر حرام کر دیا۔ جب ہفتہ کا دن آتا تو مچھلیاں بکثرت سطح آب پر تیرتی ہوئی ساحل کے پاس آتیں۔ جب ہفتے کا روز گذر جاتا تو وہ بھی چلی جاتیں حتیٰ کہ چھوٹی، بڑی کوئی مچھلی نظر نہ آتی۔ پھر جب سبت کا دن آتا۔ حسب معمول وہ اچھلتی کودتی نمودار ہوتیں۔ ایک طویل عرصہ تک یہی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ مچھلی کھانے کو ترس گئے۔ ایک دفعہ ایک اسرائیلی نے حیلہ سازی سے کام لیا۔ اس نے چپکے سے سنیچر کے روز ایک مچھلی پکڑی۔ اسے ایک دھاگے سے باندھ کر پانی میں چھوڑ دیا۔ ساحل سمندر پر ایک میخ گاڑ کر دھاگے کا دوسرا سرا اس میخ کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ اگلے دن آ کر وہ مچھلی لے لی یہ عذر تراشتے ہوئے کہ میں نے اسے ہفتہ کے روز تو نہیں پکڑا وہ اسے گھر لے گیا اور پکا کر کھایا۔ اگلے سنیچر کو اس نے پھر یہی حیلہ کیا لوگوں نے مچھلی کی بو محسوس کی۔ تلاش کرتے کرتے انہوں نے اس آدمی کے بھید سے آگاہی حاصل کر لی۔ انہیں یہ طریقہ پسند آیا۔ ایک طویل عرصہ تک خفیہ طور پر وہ اسی طرح شکار کرتے رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کوئی سزا نہ دی۔ آخر کار وہ علانیہ شکار کرنے اور اسے بازاروں میں بیچنے لگے۔ تو ان کے دو گروہ ہو گئے ایک فریق (زیرک لوگ جنہوں نے خود یہ کام نہیں کیا تھا) انہیں کہتا تمہارا ناس ہو اللہ سے ڈرو۔ اور انہیں اس مکر و فریب سے

منع کرتے رہے۔ دوسرا فریق وہ مچھلی کھانے میں تو شریک نہ تھے لیکن وہ دوسرے لوگوں کو اس گناہ سے منع بھی نہیں کرتے تھے پہلے فریق سے کہنے لگے تم کیوں اس قوم کو نصیحت کرتے ہو جسے اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔ انہوں نے کہا تا کہ معذرت پیش کر سکیں تمہارے رب کے دربار میں کہ ان کے اعمال کے سبب اس کا غیظ و غضب ہم پر نازل نہ ہو جائے۔ نیز اس امید پر کہ شاید وہ ڈرنے لگیں۔ ابن عباس کا قول ہے کہ یہی صورت حال جاری رہی اور وہ باز نہ آئے۔ ان کے زیرک لوگوں اور دانشوروں نے کون سی رات گذاری۔ صبح دن چڑھے تک انہیں نہ دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ دیکھو کیا مسئلہ ہے۔ وہ جب گئے تو کیا دیکھا کہ ان کے گھروں کے دروازے بند تھے۔ وہ رات کو حسب معمول عام لوگوں کی طرح دروازے بند کر کے سوئے تھے۔ صبح ان کی شکلیں بندروں کی سی بن چکی تھیں۔ مرد، عورتیں، بچے اب بھی اپنی شکلوں سے پہچانے جا رہے تھے کہ یہ فلاں مرد ہے۔ یہ فلاں عورت ہے۔ یہ فلاں بچہ ہے۔ لیکن اب وہ بندر بن چکے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اگر اللہ نے پہلے سے فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ وہ برائی سے روکنے والوں پر عذاب نازل نہیں کرے گا تو وہ سب ہلاک ہو جاتے۔ فرماتے ہیں اسی قریہ (بستی) کے بارے میں اللہ جل شانہٗ نے اپنے پیارے نبی محمد ﷺ کو فرمایا: وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ...... (اعراف:163) ''اور پوچھو ان سے حال اس بستی کا جو آباد تھی ساحل سمندر پر''۔ ضحاک نے بھی ابن عباس سے یہی روایت کیا ہے۔ سدی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ ایلہ کی بستی تھی جو سمندر کے کنارے ہے۔ مچھلیاں ہفتہ (سبت) کے روز ان کے پاس آتیں (اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہفتہ کے روز کوئی کام کرنا بھی یہود کے لئے حرام قرار دے دیا تھا)۔ چنانچہ اس روز سمندر کی تمام مچھلیاں باہر آ جاتیں حتیٰ کہ اپنے نتھنے پانی سے باہر نکال دیتیں۔ اتوار کو وہ نیچے سمندر کی تہہ میں چلی جاتیں۔ اگلے سنیچر تک کوئی مچھلی نظر نہ آتی۔ اسی کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ (اعراف: 163) ان میں سے کسی کو مچھلی کھانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے ساحل سمندر پر ایک گڑھا کھودا اور سمندر تک اس کی نالی بنا دی سنیچر کے روز نالی کا دہانہ کھول دیا۔ سمندر کی موجوں نے مچھلی کو اس گڑھے میں لا پھینکا۔ وہ واپس سمندر کی طرف نکلنا چاہتی تھی لیکن پانی کی قلت کی وجہ سے پھنس کر رہ گئی۔ اتوار کے دن وہ آدمی آیا اور مچھلی لے گیا۔ اسے بھونا۔ خوشبو ہمسائے تک جا پہنچی اس نے پوچھا تو اس آدمی نے یہ حیلہ بتا دیا۔ چنانچہ وہ پڑوسی بھی آئندہ اسی طرح مچھلیاں پکڑنے لگا۔ آہستہ آہستہ مچھلی کا شکار عام ہو گیا۔ ان کے علماء نے انہیں منع کرتے ہوئے کہا۔ تمہارا بیڑہ غرق۔ سنیچر کو تو تمہارے لیے شکار کرنا ہی جائز نہیں۔ وہ کہنے لگے ہم نے تو انہیں اتوار کو شکار کیا ہے۔ کیونکہ اتوار کو ہم انہیں پکڑ لاتے ہیں۔ فقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ شکار اس روز بنتا ہے جس دن تم نے نالی کا منہ کھولا اور پانی اندر داخل ہوا۔ کہتے ہیں وہ باز نہ آئے۔ بعض لوگ جنہوں نے منع کیا تھا انہیں کہنے لگے: لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ...... (اعراف:164) یعنی تم انہیں نصیحت کیوں کرتے ہو جب وہ تمہاری بات ماننے کو تیار ہی نہیں۔ وہ کہنے لگے۔ مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تا کہ اپنے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کر سکیں (کہ ہم نے تو یہ فرض ادا کر دیا) اور شاید وہ ڈرنے لگیں۔ چنانچہ جب انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو مسلمان (یعنی وہ لوگ جو ابھی تک احکام الٰہیہ پر مکمل طور پر عمل پیرا تھے) کہنے لگے اللہ کی قسم! ہم لوگ ایک بستی میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ انہوں نے درمیان میں دیوار بنا کر بستی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دروازہ انہوں نے اپنے لیے بنا لیا۔ دوسری طرف حد سے بڑھنے والے فریق نے بھی ایک دروازہ لگا لیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت کی۔ مسلمان اپنے دروازے سے نکلتے اور کفار اپنے دروازے سے۔ ایک صبح مسلمان باہر نکلے لیکن کفار کا دروازہ نہ کھلا جب کچھ دیر ہو گئی تو مسلمان دیوار پر چڑھے کیا دیکھتے ہیں وہ تو بندر بن

چکے تھے اور ادھر ادھر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھول دیا تو وہ ادھر ادھر بکھر گئے۔ اس کی طرف یہ آیت کریمہ اشارہ کرتی ہے: فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ..... (اعراف: 166) "پھر جب انہوں نے سرکشی کی جس سے وہ روکے گئے تھے۔ ہم نے حکم دیا انہیں کہ بندر بن جاؤ راندے ہوئے"۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ..... (مائدہ: 78) "لعنت کیے گئے وہ جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل سے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ بن مریم کی زبان پر" اس سے مراد بندر ہی ہیں۔ (میں کہتا ہوں) ائمہ کرام کے ان اقتباسات کو ذکر کرنے کا مقصد اس رائے کی تردید ہے جو مجاہد سے منقول ہے کہ مسخ معنوی تھا صوری نہ تھا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ معنوی بھی ہے صورت بھی یعنی شکلیں بھی بگڑیں اور فکر بھی مسخ ہوگئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ تعالیٰ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا بعض نے کہا ہے کہ جَعَلْنَاهَا میں ھا ضمیر کا مرجع قِردۃً ہے۔ یا اس کا مرجع حیتان ہے یا عقوبۃ۔ ایک قول ہے کہ اس کا مرجع قریہ ہے۔ اسے ابن جریر نے ذکر کیا ہے۔ صحیح یہی ہے کہ ضمیر کا مرجع قریۃ ہے۔ اور مراد اہل قریہ ہیں۔ یعنی سبت کے روز اس قریہ والوں کو اعتداء کے سبب ہم نے انہیں عبرت بنا دیا۔ (نکالًا) یعنی ہم نے انہیں عبرتناک سزا دی۔ جیسے فرعون کے بارے میں آتا ہے: فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى..... (النازعات: 25) "آخر کار مبتلا کر دیا اسے اللہ نے آخرت اور دنیا کے (دوہرے) عذاب میں"

قولہ تعالیٰ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا ابن عباس کا قول ہے کہ اردگرد کی بستیوں کے لئے ہم نے ان کی سزا کو عبرت بنا دیا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (احقاف: 27) "اور ہم نے برباد کر دیئے وہ گاؤں جو تمہارے اردگرد (آباد) تھے اور ہم نے مختلف انداز میں اپنی نشانیاں پیش کیں شاید وہ (حق کی طرف) لوٹ آئیں"۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا..... (الرعد: 41) "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم (ان کے مقبوضہ) علاقہ کو ہر طرف سے کم کر رہے ہیں"۔ یعنی بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا سے مراد مکان ہے۔ جیسے محمد بن اسحٰق نے عکرمہ کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ سعید بن جبیر کا قول ہے زمانے میں جو لوگ موجود تھے۔ اسماعیل بن ابی خالد، قتادہ، عطیہ عوفی، ابوالعالیہ، ربیع اور عطیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد زمانہ ہے۔ وَمَا خَلْفَهَا یعنی بعد میں آنے والے بنی اسرائیل کے لئے کہ وہ بھی ایسا نہ کریں۔ زمانہ مراد لینا زیادہ مناسب ہے کہ یہ واقعہ ان لوگوں کے لئے جو بعد میں آئیں گے باعث عبرت ہو۔ لیکن سلف کے لئے یہ واقعہ عبرت نہیں ہو سکتا۔ آیت کی یہ تفسیر کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ زمانہ گذشتہ کے لوگوں کیلئے عبرت ہو۔ یہ خیال کرنے کے بعد شاید ایسا کہنے والا کوئی بھی نہ ہو واضح ہو کہ مکان سے مراد اردگرد کی بستیاں ہیں۔ جیسے ابن عباس اور سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ واللہ اعلم۔ ابوالعالیہ کا قول ہے کہ ان کے سابقہ گناہوں کے لئے بھی اسی سزا کو ہم نے عبرت بنا دیا۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ، مجاہد، سدی، فراء اور ابن عطیہ سے روایت کیا ہے "کہ ان کے اگلے گناہوں کے لئے اور ان کے بعد آنے والوں کے گناہوں کے لئے۔" رازی نے یہاں تین اقوال ذکر کئے ہیں۔

(1) مَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا سے مراد سابقہ و آئندہ آنے والی بستیاں ہیں کیونکہ ان کے پاس قدیم کتابوں کا علم موجود تھا۔

(2) اس دور میں جو قومیں اور بستیاں موجود تھیں وہ مراد ہیں۔

(3) جتنے لوگوں نے بھی گناہ کا ارتکاب کیا تھا خواہ اس سے پہلے یا بعد۔ ہم نے انہیں سب کے لئے نشان عبرت بنا دیا۔ یہ حسن کا قول ہے۔ (میری رائے) اس آیت کی تفسیر میں ارجح قول کے مطابق آس پاس کی بستیاں جنھیں ان کی خبر ملی مراد ہیں۔ جس طرح اللہ نے ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى..... (احقاف: 27)۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ..... (الرعد: 31) "اور کفار اس حالت میں رہیں گے کہ پہنچتا رہے گا انہیں (آئے دن) اپنے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی

صدمہ" اس سے آگے فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا...... (الرعد: 41) پس انہیں اس زمانہ کے لوگوں کے لئے اور بعد کے زمانوں میں تواتر کے ساتھ یہ خبر جن لوگوں تک پہنچتی رہے گی۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کے بعد قیامت تک کے پرہیزگاروں کے لئے نصیحت بنا دیا۔ حسن اور قتادہ کا قول ہے "بعد کے لوگوں کے لئے نصیحت بنا دیا تا کہ وہ اللہ کے انتقام سے ڈرتے رہیں۔ سدی اور عطیہ عوفی کے نزدیک متقین سے مراد امت محمد ﷺ ہے۔ (میں کہتا ہوں) موعظة سے مراد یہاں دوسروں کو برائی سے روکنا ہے۔ یعنی محارم اللہ کا ارتکاب کرنے اور حیلوں اور مکاریوں سے شریعت خداوندی کے احکام کو بے اثر بنانے کے جرم میں ہم نے ان پر جو عذاب نازل فرمایا تھا اور انہیں مقام عبرت بنا دیا تھا۔ متقی لوگوں کو اس طرح کی حیلہ سازیوں سے رکنا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر بھی وہی عذاب نازل ہو جائے۔ جیسے امام ابو عبد اللہ بن بطہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "یہود کی طرح نہ کرنا کہ کمزور حیلے بہانوں سے اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال جاننے لگو(1)۔" اس حدیث کی سند صحیح ہے راوی احمد بن محمد بن مسلم کی توثیق حافظ ابو بکر خطیب بغدادی نے فرمائی۔ باقی راوی بھی صحیحین کی شرط کے مطابق اور مشہور ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

"اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے تمہیں کہ تم ذبح کرو ایک گائے۔ وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں"۔

بنی اسرائیل کو اس احسان کی یاد دلائی جا رہی ہے جس میں گائے کا ذکر ہے اور قاتل کا بیان اور مقتول کے دوبارہ زندہ ہونے کا واقعہ ہے۔

تفصیلی قصہ

ابن ابی حاتم نے عبیدہ سلمانی سے روایت کیا ہے کہ بنو اسرائیل کا ایک آدمی بے اولاد تھا اس کے پاس بے پناہ مال و دولت تھی۔ جس کا وارث اس کا بھتیجا تھا۔ اس نے اپنے چچا کو قتل کر ڈالا۔ رات کو اس کی نعش اٹھا کر ایک شخص کے گھر کے دروازے کے سامنے ڈال دی۔ صبح ان کے خلاف دعویٰ کر دیا بلکہ مسلح ہو کر لڑائی پر تل گئے۔ ارباب دانش و بینش نے کہا: تم کیوں ایک دوسرے کی گردنیں اڑاتے ہو۔ جب اللہ کا رسول تم میں موجود ہے۔ پس وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے۔ سارا واقعہ گوش گزار کیا۔ تو آپ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے انہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ لیکن وہ کہنے لگے۔ آپ ہمارا مذاق تو نہیں اڑاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں۔ فرماتے ہیں اگر وہ تعرض نہ کرتے تو کوئی سی گائے ذبح کرنا جائز ہو جاتا۔ لیکن وہ حجت بازی پر اتر آئے تو اللہ نے بھی ان پر سختی فرمائی۔ بالآخر وہ اس گائے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے ذبح کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ یہ گائے جس شخص کی ملکیت تھی اس کے پاس صرف ایک گائے تھی۔ اس نے اس کی کھال بھر جانے کے برابر سونا طلب کیا۔ انہوں نے مطلوبہ رقم دے کر وہ گائے لے لی۔ اس کو ذبح کر کے اس کے گوشت کا کچھ حصہ مقتول کے جسم پر مارا تو وہ زندہ ہو

1۔ إرواء الغليل: 375/5

گیا۔ انہوں نے اس سے پوچھا تمہارا قاتل کون؟ اس نے کہا میرا بھتیجا۔ اس کے بعد وہ شخص دوبارہ فوت ہو گیا۔ اور اپنے مال کی کسی کے حق میں وصیت نہ کی۔ بعد میں قاتل کو بھی کچھ نہ دیا گیا۔ ابن جریر نے بھی اپنی سند سے عبیدہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

عبد بن حمید اور آدم بن ابی ایاس نے اپنی اپنی تفسیروں میں لکھا ہے "ابوالعالیہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ...... کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔" بنی اسرائیل کا ایک متمول شخص تھا جس کی کوئی اولاد نہ تھی ایک قریبی رشتہ دار اس کا وارث تھا۔ اس نے میراث کی خاطر اسے قتل کر ڈالا۔ اور راستے میں ڈال دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی میرا فلاں قریبی رشتے دار قتل ہو گیا ہے۔ میرے لئے یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ اے اللہ کے نبی! آپ کے سوا کوئی مجھے اس کے قاتل کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عام منادی کی کہ اگر کسی کو قاتل کے بارے میں علم ہو تو ہمیں آگاہ کرے۔ لیکن کسی کو اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ قاتل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کی اپنے رب سے قاتل کے بارے میں دریافت کیجئے۔ آپ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی تو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم ملا وہ حیران ہو کر کہنے لگے آپ ہم سے مذاق تو نہیں کر رہے؟ آپ نے فرمایا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤں۔ وہ کہنے لگے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمارے لیے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی گائے ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ فرماتا ہے۔ کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی۔ اور درمیانی عمر کی ہو۔ وہ کہنے لگے دعا کرو ہمارے لیے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا ہو رنگ اس کا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو۔ جو دیکھنے والوں کو فرحت بخشے۔ وہ کہنے لگے پوچھو ہمارے لیے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لیے کہ گائے کیسی ہو بے شک گائے مشتبہ ہو گئی ہے ہم پر۔ اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام بولے اللہ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو۔ بے عیب، بے داغ (عاجز ہو کر کہنے لگے) اب آپ لائے صحیح پتہ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب اس قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم ملا وہ کوئی سی گائے لا کر ذبح کر دیتے تو کافی تھا۔ لیکن انہوں نے خود اپنے او پر سختی کی تو اللہ نے بھی ان کو مصیبت میں ڈال دیا۔ اور اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو اسے کبھی نہ پا سکتے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ انہیں مطلوبہ گائے ایک بڑھیا کے پاس ملی۔ اس کے یتیم بچے تھے جن کی وہ کفالت کرتی تھی۔ جب اسے ان کی مجبوری کا پتہ چلا تو اس نے قیمت دوگنا بڑھا دی۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ ان اوصاف کی حامل گائے تو صرف فلاں بڑھیا کے پاس ہے اور وہ اس کی دگنی قیمت کا تقاضا کر رہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ نے تمہیں مطلق حق دیا تھا جو تخفیف پر مبنی تھا لیکن تم نے خود اپنے آپ پر سختی کی۔ اب اس کی رضا اور اس کے حکم پر عمل کرو۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا اور وہ گائے خرید لائے۔ اور اسے ذبح کر دیا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ارشاد فرمایا کہ اس کی ہڈی لے کر مقتول پر مارو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو وہ مقتول زندہ ہو گیا۔ اپنے قاتل کا نام بتا کر دوبارہ پہلے کی طرح موت کی نیند سو گیا۔ اس کے قاتل کو گرفتار کر لیا گیا یہ وہی شخص تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی تھی۔ اس کے سوء کردار کے سبب اس کو بھی قتل کر دیا گیا۔" محمد ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی واقعہ بایں الفاظ نقل کیا ہے۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنو اسرائیل کا ایک صاحب ثروت بوڑھا تھا۔ اس کے بھتیجے تنگدست تھے جب کہ بوڑھے کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کے بھتیجے ہی اس کے وارث تھے۔ وہ کہنے لگے کاش ہمارا چچا مر جائے اور اس کا مال ہمیں مل جائے۔ ایک طویل مدت تک جب ان کے چچا کی وفات نہ ہوئی تو شیطان ان کے پاس آ کر کہنے لگا۔ تم اپنے چچا کو قتل کر کے اس کے ورثہ کو حاصل کر لو اور مقتول کی موت دوسرے شہر والوں پر ڈال دو۔ وہاں دو شہر متصلاً آباد تھے۔ وہ ایک شہر کے

باشندے تھے۔ جب دونوں شہروں کے مابین کوئی مقتول پایا جاتا تو دونوں بستیوں کا فاصلہ ناپا جاتا۔ جو شہر زیادہ قریب ہوتا اس پر دیت ڈال دی جاتی شیطان نے انہیں بہلایا پھسلایا کہ آپ کے چچا کی ابھی کافی عمر باقی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے قصداً قتل کر کے دوسرے شہر کے دروازے پر ڈال دیا۔ صبح اس کے بھتیجے اس شہر میں آئے اور کہنے لگے چونکہ ہمارا چچا تمہارے شہر کے دروازے پر مردہ پایا گیا ہے۔ اس کی دیت تم ادا کرو گے۔ اہل شہر نے قسم اٹھائی کہ ہم نے نہ تو اسے قتل کیا ہے اور نہ ہی اس کے قاتل کا ہمیں کوئی علم ہے اور شام کے وقت دروازہ بند کرنے کے بعد ہم نے صبح تک اسے کھولا بھی نہیں۔ مقدمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ تک پہنچا۔ بھتیجے یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ ہمارا چچا ان کے شہر کے دروازے پر مقتول پایا گیا ہے۔ اہل شہر یہ قسم اٹھا رہے تھے کہ ہم نے نہ تو اسے قتل کیا ہے اور نہ ہی رات کو شہر کا دروازہ کھولا ہے۔ اس دوران حضرت جبریل علیہ السلام اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم لے کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ اس کا کوئی عضو مقتول پر مارو۔ سدی نے یہ واقعہ اس طرح نقل فرمایا ہے ''بنی اسرائیل میں ایک دولت مند شخص تھا۔ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کا بھتیجا تنگدست تھا اس نے اپنی بیٹی کی منگنی بھتیجے سے کی لیکن پھر نکاح سے انکار کر دیا۔ وہ نوجوان غصے میں آ کر کہنے لگا میں ضرور اپنے چچا کو قتل کروں گا اس کے مال پر قبضہ کر کے اس کی بیٹی سے نکاح کروں گا اور اس کی دیت کھاؤں گا۔ ان دنوں بنو اسرائیل کے کسی قبیلے کے ہاں کچھ تاجر آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے چچا کے پاس جا کر کہنے لگا۔ اے چچا! میرے ساتھ چل کر مجھے ان تاجروں سے کچھ سامان لے کر دیں۔ شاید اس کے نفع سے میری بگڑی سنور جائے۔ اگر آپ ساتھ ہوں گے تو وہ مجھے کچھ سامان دے دیں گے۔ چچا بھتیجا رات کو نکلے۔ جب اس قبیلہ کے پاس پہنچے تو نوجوان نے بوڑھے کو قتل کر دیا۔ اور گھر چلا۔ صبح کو بظاہر اپنے چچا کی تلاش میں نکلا۔ گویا اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ کدھر ہے؟ جب وہ ادھر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اہل قبیلہ لاش کے پاس جمع ہیں۔ اس نے ان پر الزام لگا دیا کہ تم نے میرے چچا کو قتل کیا ہے اب اس کی دیت ادا کرو۔ رونے پیٹنے اور سر پر مٹی ڈالنے لگا۔ اور ہائے چچا! کے ساتھ ٹسوے بہانے لگا۔ معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا آپ علیہ السلام نے ان کے خلاف دیت کا فتویٰ دیا۔ وہ عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! اللہ سے دعا فرمائیے کہ اس کے قاتل کے بارے میں ہمیں آگاہ کرے۔ تاکہ وہ پکڑا جائے۔ بخدا اس کی دیت دینا ہمارے لیے آسان ہے۔ لیکن ہمیں لوگوں کے عار دلانے سے حیاء آتی ہے۔ اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے: وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (بقرہ:72) ''اور یاد کرو جب قتل کر ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے''۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ وہ کہنے لگے ہم مقتول اور قاتل کا پوچھتے ہیں اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ کہیں آپ ہمارا مذاق تو نہیں اڑا رہے۔ آپ نے اللہ کی پناہ طلب کی۔ ابن عباس کا قول ہے کہ وہ اگر کوئی سی گائے لا کر ذبح کر دیتے تو کافی ہوتا۔ لیکن انہوں نے شدت سے کام لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سرکشی کی تو اللہ نے بھی ان سے سختی کا برتاؤ کیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ ...... فارض سے مراد بوڑھی جو بچہ نہ جنتی ہو۔ بکر سے مراد جس نے صرف ایک مرتبہ بچہ جنا ہو۔ ''عوان'' جو اس کے درمیان ہو یعنی اس کی بچی نے بھی آگے بچہ دے دیا ہو۔ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا: جس کا رنگ صاف ہو۔ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ (بقرہ:71) انہوں نے اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ نہ ملی۔ بنو اسرائیل کا ایک لڑکا اپنے والد کا فرمانبردار تھا۔ ایک آدمی کا پاس سے گذر ا ہوا وہ ایک ہیرا بیچنا چاہتا تھا۔ اس کا باپ چابی سرہانے رکھے سو رہا تھا۔ وہ تاجر کہنے لگا یہ ہیرا ستر ہزار میں خریدتے ہو۔؟ وہ نوجوان کہنے لگا۔ ٹھہر جاؤ میرا باپ جب بیدار ہوگا تو میں اسی ہزار میں خرید لوں گا۔ وہ تاجر کہنے لگا اگر تم باپ کو ابھی جگا دو تو ساٹھ ہزار میں تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ تاجر کم کرتا رہا حتیٰ کہ تیس ہزار قیمت لگا دی۔ لڑکا باپ کی آمد کے انتظار میں بڑھاتا رہا۔ حتیٰ کہ اس

کی بولی ایک لاکھ تک پہنچی۔اس لڑکے نے ہیرا خریدنے اور اپنے باپ کو جگانے سے انکار کر دیا۔اس کے عوض میں اللہ نے اسے یہ گائے عطا فرما دی۔ بنو اسرائیل گائے کی تلاش میں اس کے پاس پہنچے گائے دیکھ کر اسے کہا کہ گائے کے بدلے گائے لے لو اس نے انکار کر دیا۔ انہوں نے دو گائیں قیمت پیش کی اس نے قبول نہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے دس گائیں دینے کا وعدہ کیا لیکن وہ لڑکا نہ مانا تو وہ کہنے لگے ہم گائے ضرور حاصل کریں گے۔ وہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے گئے۔اور عرض کی اے موسیٰ گائے اس کے پاس ہے لیکن یہ قیمت دینے پر بھی راضی نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنی گائے دے دو۔ وہ کہنے لگا اے اللہ کے رسول! میں اپنے مال کا زیادہ حقدار ہوں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا ٹھیک کہتے ہو۔ اور قوم سے کہنے لگے۔اس شخص کو اس کے وزن کے برابر سونا دے کر راضی کرو۔ لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ دو گنا کیا لیکن اس نے قبول نہ کیا بالآخر دس گنا سونا لے کر وہ راضی ہوا۔ گائے انہیں دے کر قیمت لے لی۔ انہوں نے وہ گائے ذبح کی۔ حکم ہوا اس کا کوئی عضو مقتول کو مارو۔ انہوں نے دو شانوں کے درمیان کا گوشت لے کر ضرب لگائی تو وہ زندہ ہو گیا۔ اس سے دریافت کیا گیا تمہیں کس نے قتل کیا ہے۔ وہ کہنے لگا میرے بھتیجے نے۔ اس نے کہا تھا میں اسے قتل کر کے اس کا مال لے لوں گا اور اس کی بیٹی سے نکاح کر لوں گا۔ چنانچہ اس کے بدلے اس غلام کو قتل کر دیا گیا۔ مجاہد، محمد بن کعب قرظی اور محمد بن قیس کی روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ بنو اسرائیل کے ایک قبیلہ نے لوگوں کے شر سے بچنے کے لئے الگ شہر آباد کیا۔ مجرموں اور بدفطرت لوگوں کو اپنے ہاں سے نکال دیا۔ جب شام ہوتی سب کو اندر داخل کر لیتے۔ صبح کے وقت ان کا سردار اٹھتا معائنہ کرتا اگر کوئی چیز نہ ہوتی تو دروازہ کھول دیتا۔ تو وہ شام تک عام لوگوں کے ساتھ مل کر کاروبار کرتے۔ بنی اسرائیل کے ایک غنی شخص کا وارث اس کے بھائی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے کافی لمبی عمر پائی۔ اس کے بھائی نے میراث کے لالچ میں اسے قتل کر دیا اور میت کو شہر کے دروازے پر ڈال دیا۔ پھر وہ اور اس کے ساتھی کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ صبح حاکم شہر نے دروازے سے جھانکا کوئی چیز نظر نہ آئی تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ جب دروازہ کھلا سامنے مقتول پڑا تھا۔ اس نے دوبارہ دروازہ بند کرنا چاہا۔ تو مقتول اور اس کے ساتھیوں نے آواز دی رک جاؤ اسے قتل کر کے دروازہ بند کرتے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل میں بکثرت قتل کی وارداتیں دیکھیں۔ تو آپ جس قوم میں مقتول کو پاتے انہیں پکڑ لیتے تھے۔ اب یہاں قریب تھا کہ مقتول کے بھائی اور اہل مدینہ کے مابین لڑائی چھڑ جائے۔ فریقین نے اسلحہ تان لیا۔ پھر (بعض کے سمجھانے سے) وہ لڑائی سے باز رہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور سارا واقعہ عرض کیا۔ مقتول کا بھائی کہتا تھا انہوں نے آدمی کو قتل کر کے دروازہ بند کر لیا۔ اہل مدین کہتے تھے۔ اے اللہ کے رسول آپ جانتے ہیں ہم شریر لوگوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں اور ہم نے الگ شہر آباد کیا ہے۔ بخدا نہ ہم نے قتل کیا ہے اور نہ ہمیں اس کے قاتل کا علم ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ ایک گائے ذبح کرو۔ (نوٹ: مردے کو زندہ کرنے کا مقصد لڑائی کے فتنے کو فرو کرنا تھا۔ مترجم) یہ سب اقتباسات عبیدہ سلمانی، ابوالعالیہ، سدی وغیرہ سے منقول ہیں بظاہر اس واقعہ میں اختلاف ہے کیونکہ یہ بنو اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے جن سے نقل کرنا جائز ہے لیکن ہم نہ تو اس کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب کرتے ہیں اس لیے ہمارے نزدیک ان پر اعتماد نہیں کیا جائے گا ہاں مگر جو چیز حق کے موافق ہو واللہ اعلم۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ

لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۝ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۝

''بولے دعا کیجئے ہمارے لیے اپنے رب سے کہ وہ بتائے ہمیں کہ کیسی ہے وہ گائے۔موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو۔تو بجالاؤ جو تمہیں حکم دیا جارہا ہے کہنے لگے دعا کرو ہمارے لیے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا رنگ ہو اس کا۔موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو۔جو فرحت بخشے دیکھنے والوں کو۔کہنے لگے پوچھو ہمارے لیے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لیے کہ گائے کیسی ہو بیشک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کرلیں گے موسیٰ (علیہ السلام) بولے اللہ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو بے عیب بے داغ۔(عاجز ہوکر) کہنے لگے اب آپ لائے صحیح پتہ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے''۔

اللہ تبارک و تعالیٰ بنو اسرائیل کی سرکشی اور اپنے رسول سے کثیر سوالات کرنے کے بارے میں خبر دے رہے ہیں۔چنانچہ جب انہوں نے اپنے آپ پر تنگی کی تو اللہ نے بھی ان پر تنگی کی۔اگر وہ کوئی بھی گائے لاکر ذبح کردیتے تو ان کیلئے کافی تھا جیسے ابن عباس،عبیدہ وغیرہ کا قول ہے۔لیکن وہ سختی کی راہ پر چل پڑے تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔وہ کہنے لگے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ یعنی یہ گائے کون سی ہے؟ اور اس کی کیا خصوصیت ہے؟ ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اگر وہ کوئی کم تر گائے بھی ذبح کردیتے تو ان کے لئے کافی تھا......اس کی اسناد صحیح ہے اور متعدد راویوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔عبیدہ،سدی،مجاہد،عکرمہ اور ابو العالیہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ابن جریج فرماتے ہیں کہ مجھے عطا نے بھی یہی بتایا ہے۔ابن جریج کا قول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا''انہیں صرف گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن ان کے سختی اختیار کرنے پر اللہ نے بھی ان پر سختی فرمائی۔اللہ کی قسم اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو اسے تاابد کبھی نہ پاسکتے۔ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ۚ یعنی نہ کبیر السن ہو اور نہ اتنی چھوٹی کہ اسے نر نے چھوا تک نہ ہو۔جیسے ابو العالیہ،سدی،مجاہد،عکرمہ،عطیہ عوفی عطاء خراسانی،وہب بن منبہ،ضحاک،حسن،قتادہ نے لکھا ہے اور ابن عباس کا قول ہے۔ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے درمیانی عمر کی ہو۔کیونکہ اس عمر کا جانور طاقتور اور خوبصورت ہوتا ہے۔عکرمہ،مجاہد،ابو العالیہ،ربیع بن انس،عطاء خراسانی اور ضحاک سے یہی مروی ہے۔سدی کا قول ہے عوان سے مراد ہے کہ وہ ایک بچہ جننے والی اور دو بچے جننے والی کے درمیان ہو۔حسن کا قول ہے کہ یہ وحشی گائے (نیل گائے) تھی۔ابن جریج نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے جس نے زرد جوتا پہنا وہ جب تک اسے پہنے رہے خوش رہے گا۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَسُرُّ النَّاظِرِينَ مجاہد اور وہب بن منبہ کا قول ہے کہ اس کا رنگ زرد تھا۔ابن عمر کا قول ہے کہ اس کے کھر زرد تھے سعید بن جبیر کا قول ہے کہ اس کے سینگ اور کھر زرد رنگ کے تھے۔ بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا ابن ابی حاتم نے حسن سے روایت کیا ہے کہ اس کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔لیکن یہ قول غریب ہے صحیح رائے پہلی ہے۔اسی لیے صفراء کی تاکید ذکر کی فَاقِعٌ لَّوْنُهَا عطیہ عوفی کا قول ہے اس کی زردی کچھ سیاہی مائل ہو۔سعید بن

جبیر کا قول ہے کہ اس رنگ صاف ہو۔ یہی رائے ابوالعالیہ، ربیع بن انس، سدی، حسن، قتادہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ عوفی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے گہرے زرد رنگ کی ہو۔ اس کی زردی میں سفیدی کی جھلک دکھائی دے۔ تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ دیکھنے والوں کو محبوب ہو۔ ابوالعالیہ، قتادہ، ربیع بن انس سے اسی طرح منقول ہے۔ وھب بن منبہ کا قول ہے کہ جب اس کی جلد کی طرف دیکھیں تو محسوس ہو کہ اس میں سے سورج کی شعاع نکل رہی ہے۔ تورات میں ہے کہ اس کا رنگ سرخ تھا۔ شاید یہ عربی ترجمہ کرنے والوں کی غلطی ہو۔ یا جس طرح پہلا قول گزرا کہ وہ شدید زرد رنگ کی تھی جو سرخی و سیاہی مائل تھا۔ واللہ اعلم قولہ تعالیٰ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ۙ یعنی گائیں بہت سی ہیں آپ اس کا کوئی امتیازی وصف بتائیے۔ وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر بنو اسرائیل یہ جملہ وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ نہ کہتے تو اس گائے کو کبھی نہ پاسکتے۔ لیکن انہوں نے استثناء کی۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے اپنی تفسیر میں ایک دوسری سند سے یہی حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے(1)۔ لیکن اس طریق سے یہ روایت غریب ہے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اپنی کلام ہو۔ جس طرح اس سے پہلے سدی کے حوالے سے بیان ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ یعنی اس ہل چلانے کے لئے نہیں جوتا گیا اور نہ ہی کھیتی کو سیراب کرنے کے لئے اس نے رہٹ سے پانی کھینچا ہو "مُسَلَّمَةٌ" بلکہ یہ تندرست، دیدہ زیب، بے داغ اور ہر قسم کے عیب سے پاک ہو۔ "لَّا شِیَةَ فِیْهَا ۭ" اس میں کوئی دوسرا رنگ نہیں۔ سارے بدن میں ایک ہی رنگ ہے۔ قتادہ نے مسلمۃ کا معنی بے عیب بتایا ہے۔ یہی قول ابوالعالیہ، ربیع بن انس کا ہے مجاہد نے بے داغ، عطاء خراسانی نے قدرتی عیوب سے پاک کہا ہے۔ مجاہد کا قول ہے نہ سفید نہ سیاہ داغ ہو۔ ابوالعالیہ، ربیع بن انس اور قتادہ کا قول ہے۔ اس میں سفیدی نہ ہو۔ عطاء خراسانی کا قول ہے اس کا رنگ ایک اور سیاہ ہو۔ عطیہ عوفی وھب بن منبہ اور اسماعیل بن ابی خالد سے یہی مروی ہے۔ سدی کا قول ہے۔ اس میں سفید، سیاہ یا سرخ کسی قسم کا داغ نہ ہو۔ یہ سب اقوال قریب المعنی ہیں۔ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ کی تفسیر میں بعض علماء کا قول ہے کہ وہ کام نہیں کرتی پھر "تُثِیْرُ الْاَرْضَ" میں کہتے ہیں کہ وہ کھیتی کا کام تو کرتی ہے لیکن پانی نہیں پلاتی۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ اس میں ذلول کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ وہ ہل نہیں چلاتی اور نہ پانی پلاتی ہے۔ جیسے قرطبی وغیرہ نے قرار دیا ہے۔ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ قتادہ کا قول ہے کہ اب تم نے بات کو واضح کیا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے لکھا ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَاللّٰهُ جَآءَ هُمْ بِالْحَقِّ۔ (اللہ نے بات کو واضح فرمادیا)۔ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ ذبح کرنے والے نہ تھے۔ طرح طرح کے سوالات سے بھی ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اتنی ردوکد کے بعد آخر کار وہ ذبح کرنے پر راضی ہوئے۔ اس میں ان کی ندامت کا پہلو ہے کہ ان کا مقصد صرف سرکشی اور ٹال مٹول تھا اس لیے وہ ذبح کرنے کے قریب نہ تھے۔ محمد بن کعب اور محمد بن قیس کا قول ہے کہ قیمت زیادہ ہونے کے سبب وہ ذبح کرنے کے قریب نہیں جارہے تھے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اس کا ماخذ اسرائیلی روایات ہیں۔ جیسے اس سے پہلے ابوالعالیہ اور عوفی کی روایت میں بیان ہو چکا ہے۔ اور عوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ عبیدہ، مجاہد، وھب بن منبہ، ابوالعالیہ اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ کثیر مال دے کر انہوں نے اسے خریدا تھا۔ اور اس میں اختلاف ہے۔ اس کی قیمت کے بارے میں چند اور روایات ہیں۔ عبدالرزاق نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ اس کی قیمت صرف تین دینار تھی۔ حضرت عکرمہ تک اس کی سند عمدہ ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے بھی اسے اہل کتاب

1۔ الدر المنثور، 1/77

سے نقل کیا ہے۔ ابن جریر اور دیگر مفسرین کا قول ہے کہ رسوائی کے ڈر سے وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مقتول کے قاتل سے آگاہ فرمادے جس کے بارے میں وہ جھگڑا کر رہے تھے۔ لیکن اس قول کو کسی کی طرف منسوب نہیں۔ پھر قول اختیار کیا ہے کہ وہ قیمت کی زیادتی اور بدنامی کی وجہ سے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی قابل تسلیم نہیں صحیح وہی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ جسے ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے جس کی توجیہ ہم نے بیان کی ہے واللہ اعلم۔

(مسئلہ) اس آیت میں گائے کی صفات کا بیان ہے اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ بیع سلم جائز ہے۔ امام مالک، اوزاعی، لیث، شافعی، احمد اور سلف وخلف جمہور علماء کا قول یہی ہے۔ ان کی دلیل صحیحین کی یہ روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی عورت اپنے خاوند کے سامنے دوسری عورت کے اوصاف اس طرح بیان نہ کرے گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے(1)۔'' جس طرح نبی کریم ﷺ نے قتل خطاء اور قتل شبہ عمد کی دیت کے اونٹوں کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ یعنی وصف کو دیکھنے کے برابر قرار دیا۔ (مترجم) ابوحنیفہ، ثوری اور کوفیوں کا قول ہے کہ حیوان میں بیع سلم جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اوصاف سے اس کی حقیقت کا علم نہیں ہوسکتا۔ ابن مسعود، حذیفہ بن یمامی اور عبدالرحمٰن بن سمرہ وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

''اور یاد کرو جب قتل کر ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے۔ اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے۔ تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے سے (دیکھا) یوں زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی (قدرت) کی نشانیاں شاید تم سمجھ جاؤ''۔

فَادّٰرَءْتُمْ کا معنی اِخْتَلَفْتُمْ (تم نے اختلاف کیا) جیسے ابن ابی حاتم نے مجاہد سے یہی روایت کیا ہے۔ عطاء خراسانی اور ضحاک کا قول ہے اِخْتَصَمْتُمْ فِیْهَا (تم اس میں جھگڑنے لگے)۔ ابن جریج نے لکھا ہے کہ بعض کہنے لگے ''تم نے اسے قتل کیا ہے دوسروں نے کہا نہیں بلکہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے اسی طرح مروی ہے: وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ مجاہد کا قول کا ہے کہ جو تم چھپا رہے تھے۔ ابن ابی حاتم نے مسبب بن رافع کا قول نقل کیا ہے کہ آدمی جو نیک عمل سات گھروں کے اندر بھی کرے اللہ اسے ظاہر کر دیتا ہے اور کوئی برا عمل سات گھروں میں بھی کرے اللہ اسے ظاہر فرمادیتا ہے۔ اور اس کی تصدیق اس آیت کریمہ سے ہو رہی ہے ''وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ ...... فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کہ اس کے جسم کا کوئی سا ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم پر لگاؤ۔ تو معجزے کا ظہور ہوگا اور خلاف عادت بات سامنے آئے گی۔ فی الواقع وہ کوئی خاص عضو ہی تھا۔ لیکن اس کی تعیین میں ہمارا دینی یا دنیوی فائدہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے ہمارے لیے بیان فرمادیتا۔ لیکن قرآن نے اسے مبہم رکھا اور کسی صحیح روایت میں بھی اس کی وضاحت نہیں آئی۔ چنانچہ ہم بھی اسے چھوڑتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے بروایت سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ بنو اسرائیل کے وہ لوگ چالیس سال تک اس گائے کو تلاش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اسے ایک آدمی کے پاس گائیوں کے گلے میں دیکھا۔ یہ گائے اسے بہت پسند تھی۔ وہ اس کے بدلے قیمت میں اضافہ کرتے رہے حتیٰ کہ اس کی کھال بھر دینارا سے دے کر خرید لیا۔ اسے ذبح کر کے کسی عضو کو مقتول کے جسم پر لگایا تو وہ کھڑا ہوگیا۔ اس کی رگوں سے ابھی خون بہہ رہا تھا۔ دریافت کیا تمہیں کس نے قتل کیا ہے۔

1۔ البخاری: 49/7

اس نے بتایا کہ فلاں نے۔ حسن اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اسی طرح بیان کیا ہے کہ اس کا کوئی عضو میت پر مارا گیا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ یہ غضروف کے ساتھ والی ہڈی تھی۔ حافظ عبدالرزاق نے عبیدہ سے روایت کیا ہے کہ اس کا گوشت مقتول پر مارو۔ قتادہ کا قول ہے کہ انہوں نے ران کا گوشت اسے مارا تو وہ زندہ ہو گیا اور بتایا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔ وکیع بن جراح نے اپنی تفسیر میں حضرت عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد ران ہے جس کے مارنے سے وہ زندہ ہو گیا تھا۔ ابن ابی حاتم لکھتے ہیں مجاہد، قتادہ، عکرمہ سے بھی مروی ہے۔ سدی نے لکھا ہے کہ انہوں نے وہ ٹکڑا مارا جو دو شانوں کے درمیان ہے۔ تو زندہ ہو کر اس نے بتایا کہ میرا قاتل تو میرا بھتیجا ہے۔ ابوالعالیہ کا قول ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم دیا کہ اس کی کوئی ہڈی لے کر مقتول کو مارو انہوں نے ایسا ہی کیا تو اس کی روح لوٹ آئی۔ وہ اپنے قاتل کا نام بتا کر دوبارہ فوت ہو گیا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ انہوں نے شہادت کی انگلی کے ساتھ والا گوشت یا زبان یا دم کی جڑ کی طرف والا حصہ مارا۔ قولہ تعالیٰ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى یعنی جب انہوں نے اس کے جسم پر وہ گوشت یا ہڈی ماری تو وہ زندہ ہو گیا۔ اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے انہیں آگاہ فرمایا اور مردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کروایا۔ اس واقعہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قیامت کے دن دوبارہ جی اٹھنے کی دلیل بھی بنایا اور ان کے مابین لڑائی کا جو فتنہ سر اٹھا رہا تھا کے خاتمے کا ذریعہ بھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں پانچ جگہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ "ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ" (1) یہ قصہ جس کا بیان ابھی اوپر گذرا ہے۔ (2) یہ قصہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے گھروں سے نکلے تھے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ موت کے ڈر سے۔" (سورۂ بقرہ: 243) (3) اس (پیغمبر) کا واقعہ جو گذر رہا تھا ایک بستی پر در آنحالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔" (آیت نمبر 259) (4) حضرت ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کا واقعہ۔" (دیکھئے آیت نمبر 260) (5) اللہ تعالیٰ نے زمین کے مردہ ہونے کے بعد دوبارہ احیاء سے اجسام کے بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ لوٹائے جانے پر دلیل بنایا ہے۔ جیسے ابوداؤد طیالسی نے ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اللہ تبارک وتعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم کبھی بنجر زمین کے پاس سے نہیں گذرے پھر جب دوبارہ تمہارا گذر ہوا تو وہ سرسبز ہو چکی تھی۔؟ فرماتے ہیں میں نے عرض کی۔ کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح موت کے بعد دوبارہ حیات ہے (1)۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے۔ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (یٰسین: 34,35) "اور ایک نشانی ان کے لئے یہ مردہ زمین ہے۔ ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے نکالا اس سے غلہ پس وہ اس سے کھاتے ہیں اور ہم نے اگائے اس میں باغات، کھجور اور انگوروں کے اور جاری کر دیئے اس میں چشمے۔ تاکہ کھائیں وہ اس کے پھلوں سے اور نہیں بنایا ہے اس کو ان کے ہاتھوں نے کیا وہ (ان نعمتوں پر) شکر ادا نہیں کرتے"۔ (مسئلہ) اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام مالک کے مذہب میں کہا گیا ہے کہ زخمی اگر کہہ دے کہ فلاں نے مجھے قتل کیا ہے تو اس کا یہ قول لوث (ثبوت) سمجھا جائے گا کیونکہ مقتول جب زندہ ہوا اس کے قاتل کے بارے میں اسی سے دریافت کیا گیا تو وہ کہنے لگا فلاں نے مجھے قتل کیا ہے۔ تو اس کی یہ بات قابل قبول قرار پائی کیونکہ آدمی صرف سچ ہی بولتا ہے اس سے جھوٹ کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ اس کی تائید میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ذکر کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے زیورات کی خاطر ایک لونڈی کو قتل کیا اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل ڈالا۔ اس سے پوچھا گیا کس نے تمہارے ساتھ یہ واردات کی ہے؟ کیا فلاں تھا؟

1۔ مسند امام احمد: 11/4

یا فلاں نے تجھے مارا؟ حتیٰ کہ جب یہودی کا نام لیا گیا تو اس نے سر سے اشارہ کیا۔ یہودی کو پکڑ لیا گیا تا آنکہ اس نے اعتراف کر لیا۔ تو سرکار دو عالم ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا۔ اس کا سر بھی اسی طرح دو پتھروں کے مابین رکھ کر کچل دیا جائے۔ امام مالک اس صورت کو لوث قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مقتول کے وارثوں کو قسم دلائی جائے گی۔ لیکن جمہور فقہاء اس کے خلاف ہیں وہ مقتول کی بات کو لوث (ثبوت) نہیں سمجھتے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ؀

”پھر سخت ہو گئے تمہارے دل یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی وہ تو پتھر کی طرح (سخت) ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ (کیونکہ) کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے بہ نکلتی ہیں نہریں۔ اور کئی ایسے بھی ہیں کہ جو پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے۔ اور کئی ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو“۔

بنو اسرائیل کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے اللہ رب العزت ارشاد فرما رہے ہیں کہ اللہ کی نشانیاں اور مردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ان کے دل سارے کے سارے سخت پتھر کی طرح ہو چکے ہیں۔ ان میں نرمی نہیں آ سکتی۔ اس لیے مومنین کو ان کی اس حالت جیسا بننے سے خبردار کیا۔ اور فرمایا: اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ........وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (الحدید:16) ”ترجمہ: کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں ان کے دل یاد الٰہی کے لئے اور اس سچے کلام کے لئے جو اترا ہے۔ اور نہ بن جائیں ان لوگوں کی طرح جنہیں کتاب دی گئی اس سے پہلے۔ پس لمبی مدت گزر گئی ان پر تو سخت ہو گئے ان کے دل اور ایک کثیر تعداد ان میں سے نافرمان بن گئی“۔ عوفی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مقتول کو جب گائے کا کوئی عضو مارا تو وہ زندہ ہو کر بیٹھ گیا۔ پوچھا گیا تمہیں کس نے قتل کیا۔ اس نے بتایا میرے بھتیجوں نے مجھے قتل کیا ہے۔ پھر اس کی روح دوبارہ پرواز کر گئی تو اس کے بھتیجے کہنے لگے بخدا ہم نے تو اسے قتل نہیں کیا۔ حق کو واضح طور پر دیکھ لینے کے باوجود انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ تو اللہ نے فرمایا: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی اس بوڑھے کے بھتیجوں کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اسی طرح مدت مدید گزرنے کے ساتھ ساتھ بنو اسرائیل کے دل بھی سخت اور آیات و معجزات دیکھ لینے کے باوجود نصیحت قبول کرنے سے عاری ہو چکے ہیں پس یہ اپنی سختی میں پتھر کی طرح ہو چکے ہیں۔ اب ان کو نرم کرنے کا کوئی علاج نہیں۔ بلکہ یہ تو اس سے بھی زیادہ سخت ہو چکے ہیں کیونکہ کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے چشمے جاری ہوتے ہیں اور دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور کئی پتھر ایسے بھی ہیں کہ جو پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ بہتا نہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو پہاڑ کی چوٹی سے خوف الٰہی کی وجہ سے گر پڑتے ہیں۔ اور ان میں ادراک اور فہم کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (بنی اسرائیل:44) ”پاکی بیان کرتے ہیں اسی کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز ان میں موجود ہے اور اس (کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔ بے شک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والا ہے“۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے ہر وہ پتھر جس سے پانی نکلتا ہے یا وہ

پانی سے پھٹ جاتا ہے یا پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر پڑتا ہے وہ اللہ کے ڈر کی وجہ سے ہے۔ اس کی گواہی قرآن نے دی ہے۔ محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ...... بعض پتھر تمہارے دلوں سے بھی نرم ہوتے ہیں اس حق کے لئے جس کی طرف تمہیں بلایا جاتا ہے۔ متکلم ابو علی الجبائی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "ھبوط" یعنی گرنے سے مراد یہاں اولوں کا برسنا ہے۔ قاضی باقلانی نے لکھا ہے کہ یہ تاویل بعید ہے۔ ان کی اتباع میں رازی نے بھی یہی کہا ہے بات اسی طرح ہے کیونکہ یہ بلا دلیل لفظ سے دور نکل جانا ہے واللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم نے پتھر سے نہریں پھوٹنے سے مراد کثرت سے رونا اور پانی نکلنے سے مراد تھوڑا رونا لیا ہے۔ اور خوف سے گر پڑنے سے مراد آنکھ سے آنسو بہے بغیر دل کا رونا لیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ مجازی طور پر ہے یعنی خشوع کی نسبت پتھر کی طرف مجازاً ہے جیسے گر پڑنے کی نسبت اس آیت میں کی گئی ہے (یُرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ) جو گرنے کے قریب تھی۔ رازی، قرطبی وغیرہ ائمہ نے نقل کیا ہے کہ اس قسم کی تاویلات کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت سے ان میں یہ صفت پیدا فرما دیتا ہے۔ جیسے ان ارشادات عالیہ میں بیان ہوا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا (احزاب:72) "ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے"۔ دوسری آیت میں ہے: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ...... (بنی اسرائیل:44) "پاکی بیان کرتے ہیں اسی کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز ان میں موجود ہے"۔ ایک اور مقام پر فرمایا: وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ (الرحمٰن:6) "اور (آسمان کے) تارے اور زمین کے درخت اسی کو سجدہ کناں ہیں"۔ ایک اور جگہ فرمایا: اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ...... (النحل:48) "کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ نے پیدا فرمایا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے"۔ ایک اور آیت میں ہے: قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ (حم السجدہ:11) "دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں"۔ ایک اور جگہ آتا ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ...... (حشر:21) "اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر" پھر فرمایا: وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ...... (حم السجدہ:21) "وہ کہیں گے اپنی کھالوں سے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی وہ کہیں گے (ہم بے بس ہیں) ہمیں تو گویا کر دیا ہے اللہ نے"۔ ایک صحیح حدیث میں ہے "یہ پہاڑ (احد) ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔" یا کھجور کے مڈھ (تنے) کے رونے کی بات حدیث متواتر میں ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے "میں مکہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت سے قبل مجھے سلام کرتا تھا۔ میں اب بھی اسے جانتا ہوں"(1)۔ یا حجر اسود کے بارے میں روایات میں ہے کہ جس نے حق کے ساتھ اسے استلام کیا ہوگا۔ قیامت کے دن اس کے بارے میں گواہی دے گا۔ اس مفہوم والی متعدد آیات و روایات ہیں۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ اَوْ یہاں تخییر کے لئے ہے اَیْ مَثَلًا لِهٰذَا وَ هٰذَا وَ هٰذَا یعنی انہیں اس کی مثل سمجھ لو یا اس کی یا اس کی۔ یا جیسے مقولہ ہے "جَالِسِ الْحَسَنَ اَوِ ابْنَ سِیْرِیْنَ" حسن کے پاس علم سیکھو یا ابن سیرین کے پاس۔ رازی نے اپنی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے اور اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ مخاطب کے لئے نسبتاً ابہام ہے۔ جیسے کہنے والا یہ کہے۔ اَكَلْتُ خُبْزًا اَوْ تَمْرًا میں نے روٹی یا کھجور کھائی۔ حالانکہ اسے علم ہے کہ اس نے ان دونوں میں سے کون سی چیز کھائی ہے (یعنی مخاطب کے سامنے دو چیزیں بطور ابہام پیش کی جاتی ہیں)۔ ایک دوسرا قول ہے کہ یہ اس طرح ہے جیسے کوئی کہے كُلْ حُلْوًا اَوْ حَامِضًا (میٹھا کھاؤ یا کھٹا) یعنی ان دونوں کے علاوہ تیسری چیز نہیں ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یوں بنے گا۔ تمہارے دل پتھر جیسے سخت ہو چکے ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت

1۔ فتح الباری: 89/2

یعنی دونوں میں سے ایک چیز ہے۔ یعنی ان دونوں صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہے۔ واللہ اعلم۔ نوٹ: آیت کریمہ: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً کے بارے میں علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ (او) شک کے لئے نہیں۔ اس سے آگے اختلاف ہے بعض کی رائے ہے کہ او یہاں واؤ کے معنی میں ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا (دہر:24) یا فرمایا: عُذْرًا أَوْ نُذْرًا (مرسلات:6) (عُذْرًا اَوْنُذْرًا) یا جیسے نابغہ ذبیانی کا قول ہے۔

قَالَتْ اَلَا لَيْتَمَا هٰذَا الْحَمَامُ لَنَا اِلٰى حَمَامَتِنَا اَوْ نِصْفُهُ فَقَدِ

(اَیْ وَ نِصْفُهٗ) وَ نِصْفُهٗ مراد ہے۔ ابن جریر نے یہی لکھا ہے۔ جریر بن عطیہ کا قول ہے۔

نَالَ الْخِلَافَةَ اَوْ كَانَتْ لَهٗ قَدْرًا كَمَا اَتٰى رَبَّهٗ مُوْسٰى عَلٰى قَدَرِ

ابن جریر کا قول ہے نَالَ الْخِلَافَةَ اَوْ كَانَتْ لَهٗ قَدْرًا بعض دوسرے علماء کا قول ہے کہ او یہاں بل کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں عبارت یوں مقدر ہوگی۔ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ بَلْ أَشَدُّ قَسْوَةً اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً (نساء:77) یا فرمایا: وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ (صافات:147)۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى (النجم:9)۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ وہ پتھر کی طرح ہیں یا اس سے بھی سخت تمہارے نزدیک ابن جریر نے اسے نقل کیا ہے۔ بعض دوسرے علماء کی رائے میں مخاطب کو ابہام میں ڈالنا مقصود ہے۔ جیسے ابوالاسود کا قول ہے۔

اُحِبُّ مُحَمَّدًا حُبًّا شَدِيْدًا وَ عَبَّاسًا وَ حَمْزَةَ وَ الْوَصِيَّا

فَاِنْ يَّكُ حُبُّهُمْ رُشْدًا اُصِبْهُ وَ لَسْتُ بِمُخْطِئٍ اِنْ كَانَ غَيًّا

ابن جریر کا قول ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ابوالاسود کو ان حضرات کی محبت کے رشد و ہدایت ہونے کا یقین تھا لیکن اس نے اپنے مخاطب کو ابہام میں رکھنا چاہا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوالاسود نے جب یہ اشعار کہے تو اس سے پوچھا گیا کیا تمہیں کوئی شبہ تھا۔ وہ کہنے لگا اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں۔ پھر بطور مثال یہ آیت کریمہ پڑھنے لگا: وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (سبا:24) ''اور ہم یا تم (دونوں میں سے ایک) ہدایت پر ہے۔ اور (دوسرا) کھلی گمراہی میں ہے''۔ وہ کہنے لگا (جس علیم وخبیر) نے یہ فرمایا ہے کیا اسے شک تھا کہ ہدایت پر کون ہے اور گمراہ کون ہے؟ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے دل ان دو مثالوں سے باہر نہیں یا تو سختی میں پتھر کی طرح ہیں یا پھر پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ابن جریر نے دوسری توجیہات ذکر کرنے کے ساتھ ترجیح دی ہے۔ (میرا خیال ہے) آخری قول کے مشابہ یہ آیات کریمہ بھی ہیں: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (بقرہ:18) ''ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی'' ساتھ ہی فرمایا: أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ یا جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ ''جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہو کسی چٹیل میدان میں''۔ ساتھ ہی فرمایا: أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ...... ''ترجمہ: یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں'' (نور:39,40)۔ واللہ اعلم۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے بروایت عبداللہ بن دینار حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ باتیں نہ کیا کرو کیونکہ ذکر الٰہی کے علاوہ دوسری گفتگو دل کی سختی کا باعث ہے۔ اور لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے دور سخت دل ہے''(1)۔ ترمذی نے اسے کتاب الزہد میں مختلف سندوں سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے محمد بن ابراہیم کی

1۔ الترمذی:2411

روایت کے علاوہ ہم اسے نہیں جانتے۔ بزار نے اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے "چار اشیاء بدبختی کی علامات ہیں آنکھ کا خشک ہونا، دل کی سختی، طویل آرزو اور دنیا کی حرص۔"

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا لَـكُمۡ وَقَدۡ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡاۤ اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ قَالُوۡاۤ اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمۡ لِيُحَآجُّوۡكُمۡ بِهٖ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾

"(اے مسلمانو!) کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ (یہ یہودی) ایمان لائیں گے تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں ایسا تھا جو سنتا تھا کلام الٰہی کو پھر بدل دیتے تھے اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں (ارے) کیا بیان کرتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر یوں تو وہ دلیل قائم کرینگے تم پر ان باتوں سے تمہارے رب کے سامنے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "اَفَتَطۡمَعُوۡنَ" اے مومنین! کیا تم یہ امید رکھتے ہو۔ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا لَـكُمۡ کہ یہود کا یہ گمراہ فرقہ تمہاری اطاعت کرے گا واضح معجزات دیکھنے کے باوجود جن کے آباؤ اجداد کے دل سخت ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک فریق کلام الٰہی کو سن کر اس میں غلط تاویلیں کرنے لگتا تھا۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ اس کے بعد کہ وہ اسے واضح طور پر سمجھ لینے کے باوجود اس کی بلا وجہ مخالفت کرتے۔ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ تحریف وتاویلات کا چکر چلا کر وہ غلطی کر رہے ہیں۔ یہ مقام اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مشابہ ہے فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوۡنَ الۡـكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ (مائدہ:13) "تو بوجہ ان کی عہد شکنی کے ہم نے اپنی رحمت سے انہیں دور کردیا اور کردیا ان کے دلوں کو سخت۔ وہ بدل دیتے ہیں (اللہ کے) کلام کو اپنی جگہوں سے"۔ محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ حضور ﷺ اور مومنین کی ان سے امیدوں کو ختم کرنے کے لئے نازل فرمائی ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رؤیت باری تعالیٰ کا سوال کیا۔ تو اچانک انہیں کڑک نے آلیا۔ محمد بن اسحٰق نے بعض اہل علم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کی اے موسیٰ ہمیں رؤیت سے تو محروم کردیا گیا ہے۔ اب ہمیں اللہ کا کلام تو سنوائیے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کی تو اللہ نے آپ کی دعا کو منظور فرمالیا۔ فرمایا انہیں کہیں کہ وہ غسل کرکے پاک صاف کپڑے پہنیں اور روزہ رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ جب ہر طرف بادل چھا گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ سب سجدے میں گر گئے۔ رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو فرمائی اور وہ سن رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں حکم دے رہا ہے اور بعض چیزوں سے منع کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے جو کچھ سنا تھا سمجھ لیا پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر بنی اسرائیل کے پاس آئے تو ایک فریق نے اللہ کے اوامر میں تحریف شروع کردی۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بتایا کہ اللہ نے تمہیں یہ حکم دیا ہے تو ایک فریق (جس کا اللہ نے اپنی لاریب کتاب میں ذکر فرمایا ہے) نے اس کے برعکس بات کا اعلان

کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اسی فریق کی طرف قرآن نے اشارہ کیا۔ سدی کا قول ہے کہ ثم یحرفونہ سے مراد تورات ہے جس میں وہ تحریف کرتے تھے۔ سدی کے ذکر کردہ قول میں ابن عباس اور ابن اسحاق کی نسبت عموم ہے۔ اگرچہ ابن جریر نے اسے ظاہر کلام کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ کلام الٰہی کے سننے سے مراد اس طرح نہیں جیسے کلیم اللہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ الصلوٰۃ والسلام سنتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ (توبہ:6) ''ترجمہ: اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے تو پناہ دیجئے اسے تاکہ وہ سنے اللہ کا کلام۔'' تو یہاں مراد یہ نہیں کہ اللہ کا کلام سنے بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن اس تک پہنچ جائے اسی لیے قتادہ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ...... کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ یہ یہود ہیں جو اللہ کی کلام کو سن کر اسے سمجھ لینے اور یاد کرنے کے بعد اس میں تحریف کر دیتے تھے۔ مجاہد کا قول ہے تحریف کرنے والے اور چھپانے والے ان کے علماء تھے۔ ابو العالیہ کا قول ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعریف وتوصیف کے بارے میں ان کی کتابوں میں جو کچھ موجود تھا اس میں تاویل کر کے اس کے اصل مطلب سے دور کر دیتے تھے۔ سدی نے لکھا ہے ''وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ'' یعنی وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ ابن وہب نے لکھا ہے کہ ابن زید کا قول ہے: یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ سے مراد تورات ہے جو اللہ نے ان پر نازل فرمائی تھی وہ اس میں تحریف کر کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال اور حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دیتے تھے۔ جب حقدار رشوت پیش کرتا تو کتاب اللہ سے بتا دیتے اور جب غیر مستحق رشوت پیش کرتا تو کتاب اللہ سے اسے بھی حقدار ثابت کر دیتے اور کبھی کوئی مسئلہ پوچھنے آتا جس میں حق نہ ہوتا یا رشوت یا اور کوئی چیز نہ ہوتی تو وہ اسے حق بات بتا دیا کرتے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں فرمایا: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ''کیا تم حکم کرتے ہو (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے'' (بقرہ:44)۔ قولہ تعالیٰ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ......

محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ تمہارے ساتھی اللہ کے رسول ہیں۔ اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں عربوں سے اس بارے میں بات نہ کرنا کہ تم اس سے پہلے محمد ﷺ کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے کیونکہ وہ تو انہی میں سے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ...... لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ یعنی تم اقرار کرتے ہو کہ وہ نبی ہیں۔ حالانکہ تمہیں یہ بھی علم ہے کہ اس کے بارے میں ہی روز میثاق تم سے عہد لیا گیا تھا کہ اس کی اتباع کرو گے خبردار کہیں انہیں آگاہ نہ کر دو کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ہم انتظار کرتے تھے۔ سرے سے انکار کر دو اور ان کی نبوت کو تسلیم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَوَ لَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہود کے منافقین جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ملتے تو کہتے ہم بھی ایمان دار ہیں۔ سدی کہتے ہیں کہ یہ یہود کے وہ لوگ تھے جو ایمان لائے تھے لیکن پھر منافق ہو گئے۔ ربیع بن انس، قتادہ اور سلف وخلف کے بہت سے علماء کا یہی قول ہے حتیٰ کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے بھی ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے قصبہ مدینہ میں داخل نہیں ہو گا مگر مومن (1)۔ تو اہل کفر ونفاق کے رؤسا انہیں کہنے لگے جاؤ اور کہو ہم مومن ہیں اور جب ہمارے پاس واپس آؤ تو کفر کرنے لگو۔ وہ صبح سویرے مدینہ آتے اور عصر کے بعد واپس چلے جاتے اور یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: وَ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ

1۔ الدرالمنثور: 81/1

عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران:72)'' اور کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت اور انکار کر دو اس کا سر شام شاید (اس طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں''۔ وہ جب مدینہ آتے تو کہتے ہم مسلمان ہیں مقصد یہ ہوتا کہ وہ رسول کریم ﷺ کے رازوں سے آگاہ ہوسکیں۔ جب واپس جاتے تو کفر کی طرف لوٹ جاتے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے رسول ﷺ کو خبر کر دی تو ان کا آنا موقوف ہو گیا۔ مسلمان انہیں مومن سمجھ کر ان سے پوچھتے کیا تمہاری کتابوں میں یہ یہ بشارتیں (جو حضور ﷺ کے بارے میں) ہیں یا نہیں۔ تو وہ کہتے کیوں نہیں۔ جب وہ واپس اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو وہ کہتے کیا تم بیان کرتے ہو ان سے جو راز کھولا ہے اللہ نے تمہارے لیے۔ ابو العالیہ کا قول ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہاری کتابوں میں حضور ﷺ کے بارے میں نازل فرمایا ہے حضرت قتادہ کا قول ہے کہ وہ ایسے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی آئے گا۔ تو انہوں نے آپس میں یہ طے کیا۔ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ کی ایک تفسیر ابن جریج نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ غزوۂ بنی قریظہ کے دن حضور ﷺ ان کے قلعوں کے نیچے کھڑے ہوئے اور یوں ندا فرمائی اے بندروں اور خنزیروں کے بھائیو! اے طاغوت کے پجاریو! وہ آپس میں کہنے لگے ان امور سے محمد (ﷺ) کو کس نے آگاہ کیا ہے یہ بات تمہارے سوا کسی اور کے منہ سے نہیں نکلی۔ کیا ان کو ایسی بات بتاتے ہو جو کل قیامت کے دن تمہارے خلاف حجت ہو گی۔ ایک دوسری روایت میں ابن جریج نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس وقت کہا تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس بھیجا گیا۔ تو انہوں نے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی۔ سدی کا قول ہے، کیا تم انہیں بتاتے ہو اس عذاب کے بارے میں جو اللہ نے تم پر نازل فرمایا تھا تاکہ کل کلاں تمہارے خلاف حجت بن جائے۔ یہ یہود کا ایک گروہ تھا جو مسلمان ہونے کے بعد منافق ہو گیا۔ وہ عرب مسلمانوں کو اپنے آباؤ اجداد پر نازل ہونے والے عذاب کی کہانیاں سناتے تھے۔ بعد میں انہوں نے طے کیا کہ انہیں ایسی باتیں نہ بتایا کرو۔ کہیں وہ یہ نہ کہیں کہ ہم تو اللہ کے ہاں تم سے زیادہ معزز اور محترم قوم ہیں۔ عطاء خراسانی کا قول ہے بِمَا قُضِيَ لَكُمْ وَ عَلَيْكُمْ (جو نعمتیں اور مصائب نازل تم پر ہوئے)۔ حسن بصری کا قول ہے کہ یہ یہودی جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم بھی مسلمان ہیں اور جب علیحدگی میں ایک دوسرے سے ملتے تو کہتے محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کو ایسی باتیں نہ بتایا کرو جو اللہ نے تمہاری کتاب میں ذکر فرمائی ہیں۔ تاکہ وہ تمہارے خلاف دلیل نہ بن جائیں۔ اور مسلمان اسے تمہارے خلاف رب کے ہاں جھگڑنے کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال نہ کریں (قَوْلُهٗ تَعَالٰى۔ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (بقرہ:77) قتادہ اور ابو العالیہ کا قول ہے کہ جو وہ حضور ﷺ کا انکار اور آپ کی تکذیب کرتے تھے۔ حالانکہ آپ ﷺ کی صداقت کی علامات سے ان کی کتابیں بھری پڑی تھیں۔ حسن کا قول ہے کہ وہ مسلمانوں کے پاس سے جب اٹھ کر جاتے تو خلوت میں آپس میں یہ طے کرتے کہ اپنی راز کی باتیں جو ان کی کتابوں میں موجود تھیں محمد ﷺ کے سامنے افشاء نہ کیا کرو کہ تمہاری انہی باتوں سے وہ تمہاری تردید کریں گے۔ لیکن جو چیز وہ چھپا رہے تھے اللہ تعالیٰ تو اس سے آگاہ ہے۔ اور اس سے بھی جو وہ ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ابو العالیہ، ربیع بن انس اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

''اوران میں کچھ ان پڑھ ہیں جونہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی امیدوں کے اور وہ تو محض وہم وگمان ہی کرتے رہتے ہیں۔
پس ہلاکت ہو ان کے لیے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کر
لیں اس کے عوض تھوڑے سے دام سو ہلاکت ہو ان کے لیے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے
لیے بوجہ اس مال کے جو وہ یوں کماتے ہیں''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ اہل کتاب میں سے ان پڑھ لوگ یہ مجاہد کا قول ہے۔ اُمِّيُّوْنَ یہ امی کی جمع ہے۔ وہ شخص جو لکھ نہ سکتا ہو۔ ابو العالیہ ربیع، قتادہ اور ابراہیم نخعی وغیرہ سے یہی مروی ہے۔ آیت کے اگلے حصے لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ سے بھی یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ مخاطب اہل کتاب ہیں (جونہیں جانتے کتاب میں جو کچھ مذکور ہے) اسی طرح حضور ﷺ کی صفات مبارکہ میں سے ایک صفت امی بھی ہے کیونکہ آپ ﷺ بھی اچھی طرح لکھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی کی طرف قرآن کریم نے بایں الفاظ اشارہ کیا ہے: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت:48) ''اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے (اگر آپ لکھ پڑھ سکتے) تو ضرور شک کرتے اہل باطل''۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا ''ہم امی قوم ہیں لکھنا اور حساب نہیں جانتے۔ مہینہ کبھی اتنا ہوتا ہے، کبھی اتنا اور کبھی اتنا، الحدیث''(1) یعنی ہم اپنی عبادات کی ادائیگی اور ان کے اوقات حساب وکتاب پر موقوف نہیں رکھتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (جمعہ: 2) ''ترجمہ: وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے۔ ابن جریر کا قول ہے کہ اہل عرب جو شخص لکھنا نہ جانتا ہو اسے اس کی ماں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے برعکس ایک اور قول بھی مروی ہے جس کے راوی ضحاک ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا امی سے مراد وہ قوم ہیں جنہوں نے نہ تو کسی رسول کی تصدیق کی اور نہ کسی کتاب کو مانا تھا۔ اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتاب کو ایک جاہل قوم کے سامنے پیش کر کے اسے کتاب اللہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں۔ اللہ کی کتابوں اور رسولوں کے انکار کی وجہ سے انہیں امی کا لقب دیا۔ ابن جریر لکھتے ہیں کہ اول تو یہ تفسیر عربوں کے محاورات کے خلاف ہے کیونکہ امی کا اطلاق عربوں کے نزدیک اس پر ہوتا ہے جو لکھتا نہ ہو۔ دوسرے ابن عباس تک اس کی سند بھی محل نظر ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے۔ واللہ اعلم۔ قولہ تعالیٰ ''اِلَّآ اَمَانِيَّ'' ابن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ امانی سے مراد یہاں باتیں ہیں۔ ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جھوٹے اقوال جو ان کی زبان سے صادر ہوتے ہیں۔ مجاہد نے امانی کا معنی کذب (جھوٹ) کیا ہے۔ ابن جریج نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ بعض یہودی اپنی کتاب کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اور اپنے گمان سے وہ بات کہہ دیتے تھے جو سرے سے کتاب میں موجود نہیں۔ لیکن دعوی یہ کرتے کہ یہ کتاب سے ہے اور اللہ کی کلام ہے اَمَانِيَّ: آرزوئیں اور خواہشات جو ان کی کل متاع تھی۔ حسن بصری سے یہی مروی ہے ابو العالیہ، ربیع اور قتادہ کا قول ہے اِلَّآ اَمَانِيَّ: مگر وہ آرزوئیں جو وہ اللہ سے ناحق لگائے بیٹھے تھے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے انہوں نے یہ خیال کیا کہ وہ اہل کتاب سے ہیں حالانکہ ان کا اہل کتاب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ابن جریر فرماتے ہیں قرین صواب روایت وہ ہے جسے ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ امی لوگ جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب (تورات) میں سے کچھ بھی نہیں سمجھتے لیکن جھوٹے اندازے لگاتے ہیں۔ اور بہتان باندھتے ہیں۔ تمنی

1۔ فتح الباری: 126/4

سے مراد یہاں جھوٹ بولنا اور بہتان باندھنا ہے۔ اسی سے وہ خبر (روایت) ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "مَا تَغَنَّيْتُ وَلَا تَخَرَّصْتُ۔" یعنی مَا تَخَرَّصْتُ الْبَاطِلَ وَلَا اخْتَلَقْتُ الْكَذِبَ میں نے دانستہ جھوٹ نہیں بولا۔ ایک قول یہ ہے کہ اَمَانِيَّ (خواہ مشدد پڑھیں یا مخفف) سے مراد تلاوت کرنا ہے۔ اس صورت میں یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ اور بطور دلیل یہ آیت ذکر کی ہے: اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ...... (حج: 52) "ترجمہ: مگر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیئے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوک)"۔ کعب بن مالک کا قول ہے۔

؎ تَمَنّٰى كِتَابَ اللّٰهِ اَوَّلَ لَيْلِهٖ وَ آخِرِهٖ لَا قٰى حِمَامَ الْمَقَادِرِ

ایک دوسرے شاعر کا قول ہے۔

؎ تَمَنّٰى كِتَابَ اللّٰهِ آخِرَ لَيْلَهٖ تَمَنِّيَ دَاوٗدَ الْكِتَابَ عَلٰى رِسْلٍ

محمد بن اسحٰق نے بروایت عکرمہ یا سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ ...... یعنی جو کچھ ہے اسے نہیں جانتے۔ وہ آپ کی نبوت کی حقانیت کا گمان رکھتے ہیں۔ مجاہد نے یظنون کا معنی جھوٹ بولتے ہیں کیا ہے۔ قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع کا قول ہے۔ وہ اللہ کے بارے میں بے بنیاد خیالات اور وہم و گمان رکھتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ...... یہود کی ایک اور صنف علماء کا بیان ہو رہا ہے۔ جو اللہ کی ذات پر کذب بیانی فراڈ سے گمراہی کی طرف بلاتے اور ناجائز طور پر لوگوں کا مال کھاتے تھے۔ اَلْوَيْلُ: اَلْهَلَاكُ وَالدَّمَارُ۔ ہلاکت اور تباہی۔ لغت عربی میں یہ کلمہ مشہور ہے سفیان ثوری نے زیاد بن عیاض سے روایت کیا ہے میں نے ابوعیاض کو ارشاد فرماتے سنا۔ ویل جہنم کی تہہ میں پیپ ہے۔ عطاء بن یسار کا قول ہے۔ ویل جہنم کی ایک وادی ہے اگر پہاڑ بھی اس میں جلائے جائیں تو پگھل جائیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ویل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں کافر ڈالے جائیں گے چالیس خریف (چالیس سال) کے بعد نیچے تہہ میں پہنچے گا" (1)۔ ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے ہم اسے صرف ابن لہیعۃ کی روایت سے جانتے ہیں۔ (میں کہتا ہوں) اسے صرف ابن لہیعۃ نے ہی بیان نہیں کیا جیسے آپ کی رائے ہے لیکن مصیبت ان کے بعد ہے۔ یہ حدیث اس سند کے ساتھ مرفوع منکر ہے واللہ اعلم۔ ابن جریر نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے کہ "ویل دوزخ کا ایک پہاڑ ہے" (2)۔ وہی یہود پر اتارا جائے گا کیونکہ انہوں نے تورات میں تحریف کرتے ہوئے جو چاہا زیادہ کر دیا اور جو نا پسند کیا مٹا دیا۔ اور حضور ﷺ کا اسم گرامی بھی تورات سے حذف کر دیا اسی لیے اللہ کا ان پر غضب ہوا اور بعض تورات اٹھالی گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ لیکن یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ویل سے مراد عذاب کی مشقت ہے۔ خلیل بن احمد کا قول ہے۔ ویل سے مراد شر کی شدت ہے۔ سیبویہ کا قول ہے "ویل اس کے لئے آتا ہے جو ہلاکت میں پڑ چکا ہو۔ اور ویح اس کے لئے جو تباہی کے کنارے پر ہو۔ اصمعی کا قول ہے ویل کا معنی دردمند ہونا۔ رحم طلب کرنا کسی دوسرے سے لغوی کا قول ہے ویل سے مراد غم ہے۔ خلیل کہتا ہے ویل، ویح، ویش، ویہ، ویک اور ویب ہم معنی ہیں لیکن بعض علماء نے ان کے معانی الگ الگ بھی بیان کیے ہیں۔ بعض نحویوں کے نزدیک نکرہ ہونے کے باوجود اسے مبتدا بنانا جائز ہے کیونکہ یہ بددعا کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس پر نصب کو جائز قرار دیا ہے بمعنی (اَلْزَمَهُمْ وَيْلًا)۔ (میں کہتا ہوں) لیکن یہ قرأت کسی سے مروی نہیں ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن

1۔ فتح الباری: 266/1، الترمذی: 3164 2۔ الدر المنثور: 82/1

عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کے مخاطب احبار(یہود کے علماء) ہیں۔اسی طرح قتادہ نے بھی اس سے مراد یہود ہی لیے ہیں۔سفیان ثوری عبدالرحمٰن بن علقمہ سے روایت کرتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ مشرکین اور اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی۔سدی کا قول ہے کہ بعض یہودی اپنی طرف سے ایک کتاب لکھ کر عربوں کو بیچتے تھے اور انہیں یہ بتاتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔اس کے بدلے تھوڑی بہت قیمت وصول کر لیتے۔زھری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اے مسلمانو! کی جماعت! تم اہل کتاب سے کسی چیز کے بارے میں کیوں دریافت کرتے ہو تمہارے نبی کریم ﷺ پر جو اللہ کی کتاب اتری ہے اس میں تم اللہ کی بیان کردہ تازہ ترین باتیں پڑھتے ہو۔حالانکہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی تمہیں خبر دی ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب میں تحریف کی، اسے بدل دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر کہنے لگے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ چند کوڑیاں وصول کر سکیں۔کیا تمہارے پاس جو علم آیا ہے اس نے تمہیں اہل کتاب سے مسائل پوچھنے سے منع نہیں کیا، اور اللہ کی قسم ہم نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ تمہاری کتاب کے بارے میں اس نے کبھی سوال کیا ہو۔بخاری نے اسے متعدد سندوں سے زہری سے روایت کیا ہے۔حسن بن ابوالحسن بصری کا قول ہے۔ساری دنیا ثمن قلیل کے زمرے میں آتی ہے۔

وقولہ تعالیٰ فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ...... ہلاکت ہے ان پر جو کذب و بہتان اور افتراء انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے۔اور ہلاکت ہو ان پر حرام خوری کی وجہ سے جیسے ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔وَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ان پر عذاب اس جھوٹ کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے۔ہلاکت ہے جو حرام وہ کھا رہے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

''اور انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ بجز گنتی کے چند دن۔آپ فرمایئے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ، تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان آیات میں یہودیوں کے اس دعویٰ کی خبر دے رہے ہیں جو وہ کہا کرتے تھے کہ جہنم کی آگ انہیں نہیں چھوئے گی مگر صرف چند روز تک پھر وہ نجات پا جائیں گے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کیا تم نے لے رکھا ہے اللہ سے کوئی وعدہ۔اگر کوئی ایسی بات ہے تو پھر تو وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں فرمائے گا۔لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔اسی لیے بَلٰی کا ہم معنی اَمْ ذکر فرمایا معنی یوں ہوگا۔بلکہ تم تو یونہی اللہ پر کذب اور افتراء باندھے جا رہے ہو۔محمد بن اسحٰق نے مجاہد کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہود کہا کرتے تھے کہ اس دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے۔ہمیں ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن جہنم میں رہنا پڑے گا۔اس طرح یہ گنتی کے سات روز بنتے ہیں۔تو اللہ رب العزت نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ سے خٰلِدُوْنَ تک'' سعید اور عکرمہ کی روایت میں بھی یہی ہے عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ یہودی کہنے لگے کہ آگ ہمیں ہرگز نہیں چھوئے گی مگر چالیس رات تک۔(بعض روایات میں اس پر یہ اضافہ ہے) کہ انہوں نے چالیس روز تک بچھڑے کی پوجا کی تھی۔قرطبی نے ابن عباس اور قتادہ سے یہی نقل کیا ہے۔ضحاک نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہود کا خیال تھا کہ انہوں نے تورات میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ جہنم کے دونوں کناروں کے مابین چالیس سال کا فاصلہ

ہے۔ یہاں تک کہ زقوم کے درخت تک پہنچ جاتے ہیں جو جہنم کی تہہ سے اگتا ہے۔ وہ اعداء اللہ کہنے لگے کہ ہمیں اس وقت تک عذاب ہوگا کہ ہم زقوم کے درخت تک پہنچ جائیں اس کے بعد دوزخ فنا ہو جائے گی۔ اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ محدث عبد الرزاق نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ گنتی کے چند روز اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً سے مراد وہ ایام جن میں ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ عکرمہ کا قول ہے کہ یہود حضور ﷺ سے جھگڑ پڑے کہ ہم دوزخ میں چالیس رات سے زیادہ ہرگز نہیں رہیں گے۔ اس کے بعد ہمارے پیچھے ایک اور امت آ جائے گی۔ ان کی مراد امت محمدیہ تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنا دست مبارک ان کے سروں پر رکھ کر فرمایا ''بلکہ تم ہی اس میں ہمیشہ رہو گے۔ تمہارا جانشین کوئی نہیں ہوگا'' (1)۔ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ...... حافظ ابوبکر بن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: ''جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ کو ایک زہر آلود بکری پیش کی گئی۔ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ''جو یہودی اس وقت یہاں موجود ہیں۔ انہیں جمع کرو۔ پھر آپ ﷺ نے ان سے پوچھا تمہارا باپ کون ہے؟۔ انہوں نے کہا فلاں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم نے جھوٹ کہا ہے تمہارا باپ تو فلاں ہے''۔ وہ کہنے لگے آپ نے بالکل بجا ارشاد فرمایا ہے پھر آپ ﷺ نے انہیں فرمایا ''اگر میں تم سے کسی بات کے بارے میں دریافت کروں تو سچ بتاؤ گے؟'' وہ کہنے لگے ہاں اے ابو القاسم اگر ہم نے آپ (ﷺ) سے جھوٹ بولا تو آپ ہمارا جھوٹ پکڑ لیں گے۔ جس طرح ہمارے باپ کے بارے میں جھوٹ آپ کے سامنے نہ چل سکا۔ رسول ﷺ نے پوچھا دوزخی کون ہیں؟ وہ کہنے لگے کچھ عرصہ ہم رہیں گے۔ ہمارے بعد تم ہو گے تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''دھتکارے جاؤ اللہ کی قسم ہم کبھی تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ پھر رسالت مآب ﷺ نے دوبارہ فرمایا ''اگر میں کسی چیز کے بارے میں پوچھوں تو سچ بولو گے؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں اے ابو القاسم آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا ہے۔؟ انہوں نے عرض کی ہاں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تمہیں اس پر کس چیز نے ابھارا''۔ وہ کہنے لگے ہم نے سوچا اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہم آپ سے نجات پا جائیں گے۔ اور اگر آپ (ﷺ) نبی ہیں تو آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا (1) (احمد، بخاری، نسائی)۔

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨١﴾
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾

''ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطانے تو وہی دوزخی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہی جنتی ہیں۔ وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرمارہے ہیں بات اس طرح نہیں ہوگی جیسے تم آرزو کرتے ہو۔ یا جیسے تمہاری خواہش ہے۔ بلکہ (ہمارا قانون تو یہ ہے کہ) جس نے برے اعمال کا ارتکاب کیا۔ اور اس کی برائیوں نے اسے گھیر لیا۔ اور قیامت کے دن وہ اس حال میں آیا کہ اس کے پاس کوئی نیکی نہ تھی بلکہ اس کا اعمال نامہ افعال شنیعہ سے بھرا ہوا تھا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے اور شریعت کے تعلیمات کے موافق اعمال صالحہ کا ذخیرہ جمع کرتے رہے تو جنت انہی کا مقدر ہے۔ یہ مقام اس آیت کریمہ کے موافق ہے: لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْکِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ

1۔ الطبری: 302/1 2۔ شرح السنۃ: 23/14

يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ نَقِيۡرًا(النساء:123,124)'' (نجات کا انحصار) نہ تمہاری جھوٹی امیدوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی جھوٹی امیدوں پر (بلکہ) جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی اس کی۔ اور نہ پائے گا اپنے لیے اللہ کے بغیر کوئی دوست اور نہ مددگار۔ اور جس نے عمل کیے اچھے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو سنو وہی لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور نہ ظلم کیے جائیں گے تل بھر''۔ محمد بن اسحٰق نے سعید یا عکرمہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً یعنی جس نے تمہارے جیسے اعمال کیے اور تمہاری طرح کفر کیا حتیٰ کہ اس کے کفر نے اسے گھیر لیا۔ تو اس کے لئے کوئی نیکی نہ ہوگی۔ ایک دوسری روایت میں ابن عباس نے سَيِّئَةً کا معنی شرک کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ وائل، ابوالعالیہ، مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ اور ربیع بن انس سے یہی مروی ہے حسن (ایک روایت کے مطابق) اور سدی کا قول ہے کہ اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے وَّ اَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓئَتُهٗ ابن جریج نے مجاہد سے روایت کیا کہ ''بہ'' سے مراد اس کے دل کو گھیر لینا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابو وائل، عطا اور حسن نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ''اس کے شرک نے اسے گھیر لیا۔ اعمش نے ربیع بن خثیم سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو خطا کار ہو اور توبہ سے قبل اس کی موت آ جائے۔ سدی اور ابورزین سے بھی یہی منقول ہے۔ ابوالعالیہ، مجاہد، حسن (ایک روایت کے مطابق)، قتادہ اور ربیع بن انس نے اس کا معنی گناہ کبیرہ لیا ہے۔ یہ سب اقوال قریب المعنی ہیں۔ واللہ اعلم۔ یہاں ایک حدیث شریف ذکر کی جاتی ہے۔ امام احمد نے اسے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''صغیرہ گناہوں سے بچو۔ بلاشبہ یہ جمع ہو کر آدمی کی ہلاکت کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اور رسول کریم ﷺ نے ان کے سامنے ایک مثال ذکر فرمائی کہ جیسے ایک قوم ہے۔ وہ صحرا میں اترے۔ کھانے کا وقت تھا۔ ہر آدمی ایک ایک لکڑی اٹھا لایا۔ اس طرح لکڑیوں کا ایک گٹھا جمع ہو گیا پھر انہوں نے آگ جلائی اور (گوشت وغیرہ) جو کچھ اس میں ڈالا تھا پکالیا۔(1)''

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ...... محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جو اس چیز پر ایمان لایا جس کا تم نے انکار کیا۔ اور اللہ کے دین سے وہ عمل کیا جسے تم چھوڑ چکے تھے۔ ان کے لئے ابدی جنت ہے۔ یہاں اس بات کی خبر دی جا رہی ہے کہ نیک یا برے اعمال کی جزا ان کے مرتکبوں کو ہمیشہ ملتی رہے گی۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَ بَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾

''اور یاد کرو جب لیا تھا ہم نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے (اس بات کا) کہ نہ عبادت کرنا بجز اللہ کے اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا نیز رشتہ داروں یتیموں اور مسکینوں سے بھی (مہربانی کرنا) اور کہنا لوگوں سے اچھی باتیں اور صحیح ادا کرنا نماز اور دیتے رہنا زکوٰۃ پھر منہ موڑ لیا تم نے مگر چند آدمی تم سے (ثابت قدم رہے) اور تم روگردانی کرنے والے ہو''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنو اسرائیل پر جو احکام نافذ فرمائے تھے اور عہد لیا اس کا ذکر ہو رہا ہے کہ تم نے اس سے کلیۃً منہ موڑ لیا۔ اور دانستہ اعراض کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنی تمام مخلوق کو اس کا یہی حکم ہے۔ بلکہ

1۔ شرح السنۃ: 299/14

اسی مقصد کے لئے نوع انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء:25) "اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی بھیجی اس کی طرف کہ بلاشبہ نہیں ہے کوئی خدا بجز میرے پس میری عبادت کیا کرو"۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:36) "اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول (جو انہیں یہ تعلیم دے) کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور دور رہو طاغوت سے" یہ حق کی اعلیٰ ترین قسم ہے کہ اس وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ اس کے بعد مخلوق کے حقوق کی باری آتی ہے ان میں سب سے زیادہ موکد اور اولیٰ والدین کا حق ہے۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اور والدین کے حقوق کو اس آیت میں ملا کر ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ "اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (آخر کار) میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے" (لقمان: 14) اور فرمایا: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بنی اسرائیل:23) "اور حکم فرمایا آپ کے رب نے کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو" تا آنکہ ارشاد فرمایا: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ "ترجمہ: اور دیا کرو رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو بھی" (بنی اسرائیل:26)۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں نے عرض کی: "یارسول اللہ! کون سا عمل افضل ہے؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا"۔ میں نے (دوبارہ) عرض کی اس کے بعد فرمایا "والدین سے حسن سلوک"۔ میں نے عرض کی اس کے بعد (کون سا عمل افضل ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "الجهَادُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ۔"(1)۔ اسی طرح ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ایک آدمی (بارگاہ رسالت ﷺ میں) حاضر ہوا۔ عرض کی یارسول اللہ! حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ ارشاد فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ پوچھا" اس کے بعد کون؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تیرا باپ" پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ قریبی رشتہ دار کے ساتھ (2)۔ قولہ تعالیٰ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ زمخشری کا قول ہے گویہ خبر ہے مگر اس میں طلب کا مفہوم زیادہ ہے۔ اور اس میں زیادہ تاکید ہے۔ یہ اصل میں اَنْ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ تھا۔ جیسے اسے سلف صالحین میں سے کسی نے پڑھا ہے۔ اَن کو حذف کر دیا تو صیغہ حالت رفعی میں آ گیا "لَا تَعْبُدُوْنَ" ابی بن کعب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اس آیت کو یوں پڑھا ہے "لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ"، قرطبی نے اپنی تفسیر میں یہی توجیہ سیبویہ سے نقل کی ہے۔ کسائی اور فراء نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ قولہ تعالیٰ وَالْيَتٰمٰى چھوٹے بچے جن کے آباء میں سے ان کا کوئی کمانے والا نہ ہو۔ "وَالْمَسٰكِيْنِ" جن کے پاس اپنے اور اہل خانہ کے نان ونفقہ کے لئے کچھ نہ ہو۔ ان اقسام کے بارے میں تفصیلی وضاحت سورۂ نساء میں آئے گی۔ **قولہ تعالیٰ** وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا یعنی ان سے اچھی بات کہو اور نرمی کا برتاؤ کیا کرو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اسی کے زمرے میں آتا ہے جیسا کہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔ حسن مقال یہ ہے کہ نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرے، بردباری، عفو ودرگذر سے کام لے اور حکم الٰہی کے مطابق لوگوں سے اچھی باتیں کہے۔ یہ ساری باتیں اخلاق حسنہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ امام احمد نے اپنی سند سے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نیکی میں سے کسی چیز کو حقیر مت جان اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملا کر"، مسلم نے اسے اپنی صحیح میں اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے۔ مناسب یہی تھا کہ جب دوسروں سے حسن سلوک کرنے کا حکم دیا جائے تو ساتھ ہی زبان سے اچھی باتیں کہنے کا حکم بھی دے دیا جائے تا کہ احسان کی دونوں اقسام (قولی اور فعلی) جمع ہو جائیں اور پھر اپنی عبادت یعنی نماز اور زکاۃ کے حکم کو لوگوں کے

1۔ البخاری: 140/1 2۔ البخاری: 2/8:2

ساتھ حسن سلوک کرنے کے ساتھ ملا کر مزید تاکید پیدا کر دی اور فرمایا: وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ انہوں نے ان سب احکام سے منہ موڑ لیا اور دیدہ دانستہ پس پشت ڈال دیا ماسوائے ایک قلیل تعداد کے جو راہ ہدایت پر گامزن رہے۔ اسی کے مثل اللہ جل مجدہ وعز شانہ نے امت محمدیہ کو بھی سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا: وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿۳۶﴾ (نساء:36) ''اور عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی کو اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ نیز رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پڑوسی جو رشتہ دار ہے اور پڑوسی جو رشتہ دار نہیں اور ہم مجلس اور مسافر اور جو (لونڈی غلام) تمہارے قبضہ میں ہیں (ان سب سے حسن سلوک کرو) بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کو جو مغرور ہو فخر کرنے والا ہو''۔ یہ امت سابقہ امتوں کی نسبت ان احکام کو زیادہ احسن طریقے سے بجالائی ہے۔ سب تعریفیں اور احسانات اللہ تعالیٰ کیلئے ہی ہیں (وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ الْمِنَّةُ) بعض نا قابل اعتماد مراجع کے حوالے سے ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں اسد بن وداعۃ سے نقل کیا ہے کہ وہ جب اپنے گھر سے نکلتے تو راستے میں جو یہودی یا نصرانی ملتا اسے سلام کرتے۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حکم ارشاد فرمایا: قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اور اس سے مراد سلام ہی ہے لکھتے ہیں۔ عطاء خراسانی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ (میں کہتا ہوں) حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ ان لوگوں کو السلام علیکم نہیں کہنا چاہیے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

''اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے پختہ وعدہ کہ تم اپنوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے (اس وعدہ پر ثابت رہنے کا) اقرار بھی کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو۔ پھر تم وہی ہو نا (جنہوں نے یہ وعدے کیے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے (نیز) مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے۔ اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بنکر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو حالانکہ حرام کیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں سے نکالنا۔ تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا رہے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا

کی زندگی آخرت کے عوض تو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عہد نبوی کے یہودیوں کے طرز عمل پر ناراضگی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ مدینہ کے یہودی اوس وخزرج کی باہمی لڑائیوں میں ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ اوس وخزرج کے انصاری قبائل جاہلیت میں (عام اہل عرب کی طرح) بت پرست تھے۔ ہر وقت برسر پیکار رہتے۔ ان کے درمیان بے شمار جنگیں ہو چکی تھیں۔ مدینہ کے یہودیوں کے تین قبائل تھے۔ بنوقینقاع اور بنونضیر خزرج کے حلیف بن جاتے اور بنوقریظہ اوس کے طرفدار تھے۔ جب لڑائی ٹھن جاتی تو ہر فریق اپنے حلیف قبیلہ کی طرف سے مل کر جنگ میں شریک ہوتا۔ یہودی اپنے دشمنوں کو قتل کرتا۔ اس دوران بعض اوقات اگر یہودی بھی آمنے سامنے آ جاتے تو بے دریغ ایک دوسرے کا گلا کاٹ دیتے۔ حالانکہ یہ چیز ان کے دین اور نص تورات کی رو سے حرام تھی۔ انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے اور گھر کا اثاثہ، مال اسباب سب کچھ لوٹ لیتے۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد تورات کے حکم پر عمل کرتے ہوئے شکست خوردہ فریق کے قیدیوں کو رہا کراتے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ؟ اسی لیے فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ یعنی وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم باہم لڑائی نہیں کرو گے اور ایک دوسرے کو مغلوب کر کے اس کے گھر سے جلاوطن نہیں کرو گے۔ جیسے اس سے پہلے ارشاد فرمایا تھا: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ (بقرہ:54) ''پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنوں کو (جنھوں نے شرک کیا) یہ بہتر ہے تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملت واحدہ ایک جان کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے: ''مومنین کی مثال باہمی محبت، رحم دلی اور ایک دوسرے سے صلہ رحمی کرنے میں ایک جسم کی طرح ہے۔ جب اس کے کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم بخار اور نیند کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ قولہ تعالیٰ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ پھر تم نے اس میثاق کے بارے میں علم ہونے اور اس کی صحت کا اقرار کیا اور تم خود ہی اس کے گواہ ہو۔ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ...... محمد بن اسحٰق نے سعید بن جبیر یا عکرمہ کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اللہ نے انہیں ان کے اس فعل شنیع کی خبر دی ہے۔ حالانکہ تورات میں واضح طور پر قتل وغارت اور خون ریزی کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اسیران جنگ کا فدیہ لازم کیا گیا ہے۔ وہ دو فریق تھے بنوقینقاع اور نضیر یہ خزرج کے حلیف تھے۔ اور قریظہ بنو اوس کے حلفاء تھے۔ اوس و خزرج کے درمیان جب لڑائی شروع ہوتی تو دونوں فریق اپنے حامیوں کے ساتھ میدان میں اتر آتے۔ اور تورات ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں مزید قتل وغارت پر ابھارتے۔ اوس وخزرج یہ مشرک قبائل تھے بتوں کی پوجا کرتے۔ انہیں جنت، دوزخ، قبروں سے اٹھنے، قیامت، کتاب اللہ یا حلال وحرام کا کوئی علم نہ تھا۔ جب لڑائی بند ہو جاتی تو تورات کے حکم پر عمل کرتے ہوئے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرتے، بنو قریظہ اوس کی طرف سے اور قینقاع خزرج کی طرف سے فدیہ ادا کرتے۔ اور مقتولوں کا خون بہا لیا جاتا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ تم کتاب کے کچھ حصہ پر عمل کرتے ہو کچھ کا انکار کر دیتے ہو یعنی تم ان کا تاوان تورات کے حکم کی رو سے وصول کر لیتے ہو۔ اور انہیں قتل کرتے ہو حالانکہ تورات کسی کو قتل کرنے، جلاوطن یا اس کو مغلوب کرنے سے منع کرتی ہے ماسوائے ان لوگوں کے جو مشرک ہیں اور معبودان باطلہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یعنی تورات کا جو حصہ مفادات کے مطابق ہو اس پر تو عمل کر لیا اور جس میں نقصان ہو اسے چھوڑ دیا۔ اور دنیا کے چند ٹکوں کے عوض دین کو پس پشت ڈال دیا۔ میرے خیال میں اوس وخزرج کے ساتھ یہود کے اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

اسباط نے سدی سے نقل کیا ہے کہ قریظہ اوس کے حلیف تھے اور نضیر خزرج کے باہمی لڑائی میں بنوقریظہ اپنے حلفاء کے ساتھ اور نضیر اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر شامل ہوتے۔ نضیر قریظہ اور ان کے خلفاء کو قتل کرتے، انہیں مغلوب کر کے ان کے گھروں سے انہیں نکال کر گھر برباد کر دیتے۔ جب کوئی آدمی گرفتار ہو جاتا تو سب رقم جمع کر کے اس کا فدیہ ادا کرتے۔ عرب انہیں عار دلا کر کہتے اگر تم نے ان کا فدیہ دینا ہوتا ہے تو پھر ان سے لڑتے کیوں ہو؟ وہ کہتے ہمیں ان کا فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور انہیں قتل کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ وہ کہتے تو پھر ان سے لڑائی کیوں کرتے ہو؟ وہ کہتے ہمیں شرم آتی ہے کہ ہمارے حلیف رسوا ہو رہے ہوں۔ اور ہم گھر بیٹھے رہیں۔ اسی کی طرف آیت کے اس حصے ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ ...... میں اشارہ کیا گیا ہے۔ شعبی کا قول ہے کہ یہ آیت قیس بن حطیم کے بارے میں نازل ہوئی۔ سدی نے عبد خیر کا قول نقل کیا ہے۔ ہم نے سلمان بن ربیعہ باہلی کی قیادت میں بلنجر پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ہم نے شہر فتح کر لیا۔ کچھ قیدی ہاتھ لگے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے ایک یہودی عورت سات سو درہم کے بدلے میں خرید لی۔ جب راس الجالوت کے پاس سے ان کا گذر ہوا۔ اترے اور اسے کہنے لگے یہ لونڈی تیری ہم مذہب ہے کیا تم اسے خریدتے ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا میں نے اسے سات سو میں خریدا ہے وہ کہنے لگا میں اسے چودہ سو میں خریدتا ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ چار ہزار سے کم نہ لوں گا۔ اس نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا اللہ کی قسم! تم اسے مجھ سے ضرور خریدو گے یا پھر اپنے دین سے مرتد ہو جاؤ گے۔؟ اسے کہا میرے قریب آؤ وہ جب قریب آیا تو تورات کا یہ حصہ اس کے کان میں پڑھا۔ تم بنی اسرائیل کا کوئی غلام نہیں پاؤ گے مگر اسے خرید کر آزاد کرو گے اسی کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا: وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ وہ کہنے لگا تم عبداللہ بن سلام ہو؟۔ آپ نے فرمایا: ہاں۔ وہ چار ہزار درہم لے آیا۔ آپ نے دو ہزار لے لیے اور باقی واپس کر دیئے۔ آدم بن ایاس اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ ابو العالیہ سے ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ عبداللہ بن سلام کوفہ میں راس الجالوت کے پاس سے گذرے۔ وہ ان عورتوں کا فدیہ دیتا تھا جو عربوں کے پاس نہ ہوں۔ اور جو عربوں کے پاس ہوں ان کا فدیہ نہیں دیتا تھا۔ عبداللہ بن سلام نے اسے فرمایا کیا تمہاری کتاب میں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ تم ان سب کا فدیہ ادا کرو گے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کی مذمت کی جا رہی ہے کہ وہ تورات کے ان احکام پر عمل کرتے تھے جن کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ اور بعض اوقات جان بوجھ کر اس کے احکام سے صرف نظر کر لیتے۔ حالانکہ وہ ان کے چشم دید گواہ تھے۔ وہ انہیں تسلیم بھی نہ کرتے اور نہ انہیں نقل کرتے۔ اسی طرح سابقہ انبیاء سے حضور ﷺ کے اوصاف حمیدہ، جائے پیدائش، بعثت، مقام ہجرت وغیرہ امور کے بارے میں جو ارشادات منقول تھے انہیں چھپا دیتے اور ان کی حقانیت کا اقرار نہ کرتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ شریعت خداوندی کے اوامر کی صریح مخالفت کی وجہ سے وہ اس سزا کے حقدار ٹھہرے۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ ان کے لیے جو کتاب اتاری گئی تھی اس کی خلاف ورزی پر روز قیامت انہیں شدید عذاب ہو گا۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تمہارے (کرتوتوں) سے بے خبر نہیں ہے۔ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ خریدنا سے مراد پسند کر لینا ہے۔ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ پس (ایک لحظہ کے لئے بھی) ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی۔ وَلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ اس دائمی عذاب سے چھٹکارا دلانے میں کوئی ان کی مدد نہیں کر سکے گا اور نہ انہیں پناہ دے سکے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ؀

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اور ہم نے پے در پے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں اور ہم نے تقویت دی انہیں جبریل (علیہ السلام) سے تو کیا جب کبھی لے آیا تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارے نفس پسند نہ کرتے تو تم اکڑ گئے بعض کو تم نے جھٹلایا۔ اور بعض کو قتل کرنے لگے''۔

اللہ تعالیٰ بنو اسرائیل کی سرکشی، عناد، مخالفت حق، انبیاء کے سامنے غرور و تکبر کے ساتھ ساتھ بیان فرما رہے ہیں کہ وہ حرص و ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) عطا فرمائی لیکن ان لوگوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا۔ اس کے اوامر کی مخالفت اور تاویل کرتے رہے۔ آپ علیہ السلام کے بعد پے در پے متعدد رسول مبعوث فرمائے جو آپ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق چلتے رہے۔ ارشاد باری ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَاۗءَ...... (مائدہ: 44) ''بے شک اتاری ہم نے تورات۔ اس میں ہدایت اور نور ہے۔ حکم دیتے رہے اس کے مطابق انبیاء جو (ہمارے) فرمانبردار تھے یہودیوں کو اور (اسی کے مطابق حکم دیتے رہے''۔ اللہ والے اور علماء اس واسطے کہ محافظ ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب کے اور وہ تھے اس پر گواہ) وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ابو مالک نے اس کا معنی ''اِتَّبَعْنَا'' ہم نے آپ کے پیچھے بھیجے کیا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا ہے ''اَرْدَفْنَا'' دونوں مفہوم قریب قریب ہیں۔ جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (المومنون: 44) ''پھر ہم بھیجتے رہے اپنے رسول یکے بعد دیگرے'' حتیٰ کہ بنو اسرائیل کی نبوت حضرت عیسیٰ بن مریم پر ختم ہو گئی۔ اس وقت تورات کے بعض احکام میں تبدیلی کر دی گئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو چند معجزات بھی عطا فرمائے۔ ابن عباس کے قول کے مطابق یہ معجزات، مردوں کو زندہ کرنا، مٹی کے پرندے بنا کر ان میں روح پھونکنا تو وہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جاتے، بیماروں کو شفایاب کرنا۔ اور روح القدس (جبریل) کی تائید عطا فرمایا جانا۔ یہ سب چیزیں آپ کی تصدیق کے لئے تھیں۔ لیکن تورات کے بعض احکام کی مخالفت کی وجہ سے بنو اسرائیل نے آپ علیہ السلام کی تکذیب کی اور حسد و عناد میں تیزی آ گئی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوات والتسلیمات...... کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے: وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ...... (آل عمران: 50) ''اور تاکہ میں حلال کر دوں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے''۔ بنو اسرائیل انبیاء سے ازحد برا سلوک کرتے تھے۔ ایک فریق ان کی تکذیب کرتا، دوسرا انہیں قتل کر دیتا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہوتی کہ یہ انبیاء انہیں ان کی آراء اور خواہشات کے مخالف امور کا حکم دیتے تھے اور تورات کے احکام پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے تورات میں تبدیلیاں کر دی تھیں۔ اس لیے انہیں یہ بات ناگوار گذرتی۔ چنانچہ انہوں نے ان کی تکذیب کی اور بسا اوقات بعض کو قتل بھی کر دیا۔ اس بات کی طرف آیت کے اگلے حصے میں اشارہ کیا جا رہا ہے: اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ...... اس بات کی دلیل کہ روح الْقُدُسِ سے مراد جبریل ہی ہے۔ جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اور ابن عباس، محمد بن کعب، اسماعیل بن خالد، سدی، ربیع بن انس، عطیہ عوفی اور قتادہ نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَزَلَ بِهِ

الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ۙ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلۡبِکَ لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ (الشعراء: 193,194) ''اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل)۔ آپ کے قلب (منیر) پر تاکہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے''۔ اسی طرح بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے مسجد میں منبر رکھوایا۔ وہ آپ ﷺ کی طرف سے کفار کی ہجو کا جواب دیا کرتے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! روح القدس کے ساتھ حسان کی تائید فرما جس طرح اس نے تیرے نبی (ﷺ) کا دفاع کیا ہے(1)۔ یہ بخاری کی تعلیقات میں سے ہے۔ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی کا قول ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے (یہ روایت ابوالزناد سے ہے)۔ صحیح میں ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذرے وہ مسجد میں شعر پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے انہیں گوشہ چشم سے دیکھا تو وہ کہنے گے۔ میں یہاں اس وقت بھی اشعار پڑھا کرتا تھا جب وہ ہستی جو تم سے بہتر تھی موجود تھی۔ (یعنی حضور ﷺ) پھر وہ حضرت ابوہریرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کیا تو نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے نہیں سنا ''میری طرف سے جواب دے اے اللہ روح القدس سے اس کی مدد فرما'' (2)۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا ہاں، بات اسی طرح ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسان سے فرمایا ''ان کی ہجو کر۔ جبریل تیرے ساتھ ہے''۔ ایک شعر میں حضرت حسان فرماتے ہیں۔

وَجِبۡرِیۡلُ رَسُوۡلُ اللّٰہِ فِیۡنَا وَرُوۡحُ الۡقُدُسِ لَیۡسَ بِہٖ خَفَآءُ

اس شعر میں بھی جبریل کو روح القدس کہا گیا ہے۔ محمد بن اسحٰق نے شہر بن حوشب اشعری سے نقل کیا ہے کہ یہود کے ایک گروہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہمیں روح القدس کے بارے میں بتایئے وہ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اللہ اور بنو اسرائیل پر اس کی نعمتوں کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم جانتے نہیں ہو وہ جبریل ہے اور وہی میرے پاس آتا ہے وہ کہنے لگے جی ہاں (3)۔ صحیح ابن حبان میں حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''جبریل نے میرے دل میں یہ سرگوشی کی کہ کسی شخص کو اس وقت تک ہرگز موت نہیں آئے گی یہاں تک کہ وہ اپنا رزق اور زندگی پوری کر لے۔ پس اللہ سے ڈرو اور آرزو (دنیا طلب کرنا) میں اختصار سے کام لو''۔ (4)

چند دیگر اقوال

ابن ابی حاتم نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباس سے کہ روح القدس سے مراد اسم اعظم ہے جس کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ ابن جریر نے بھی یہی روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے۔ اور قرطبی نے عبید بن عمیر سے یہی بیان کیا ہے کہ اس سے مراد اسم اعظم ہے۔ ابن ابی نجیح کا قول ہے کہ وہ فرشتوں کے محافظ ہیں۔ ابوجعفر رازی نے ربیع بن انس کا قول نقل کیا ہے کہ قدس سے مراد رب کریم ہے۔ کعب کا یہی قول ہے قرطبی نے مجاہد اور حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ قدس سے مراد اللہ تعالیٰ اور روح سے مراد جبریل ہے۔ اس طرح یہ اور پہلا قول ایک ہی ہے۔ سدی کا قول ہے قدس سے مراد برکت ہے۔ عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قدس سے مراد پاکیزگی ہے۔ ابن جریر نے ابن زید کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید فرمائی یعنی انجیل روح ہے جس طرح قرآن کو روح قرار دیا گیا ہے۔ دونوں روح اللہ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا (الشوریٰ: 52) ''اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجا آپ کی طرف ایک جانفزا کلام اپنے

1۔ البخاری: کتاب الصلوٰۃ باب: 68 2۔ البخاری: 136/4 3۔ الطبری: 320/1 5۔ شرح السنۃ، 304/14

حکم سے''۔ ابن جریر کا قول ہے کہ ان تمام تاویلات میں سے زیادہ قرین صواب قول یہی ہے کہ روح سے مراد یہاں جبریل امین ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خبر دی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید ونصرت کی۔ ارشاد ہوتا ہے: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ.....(مائدۃ:110)'' جب فرمائے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰ بن مریم! یاد کرو میرا انعام اپنے پر اور اپنی والدہ پر جب میں نے مدد فرمائی تمہاری روح القدس سے۔ باتیں کرتا تھا تو لوگوں سے (جبکہ تو ابھی) پنگھوڑے میں تھا۔ اور جب پکی عمر کو پہنچا اور جب سکھائی میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل''۔ اس آیت میں ذکر فرمایا کہ روح القدس سے ان کی مدد کی گئی۔ اگر روح سے مراد انجیل ہو تو اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (مائدہ:110) اور وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (مائدہ:110) میں تکرار آ جاتا ہے۔ جس کا کوئی مقصد نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات والاشان اس سے پاک ہے کہ اپنے بندوں کو بے فائدہ حکم دے۔ (میں کہتا ہوں) اس بات کی دلیل کہ اس سے مراد جبریل امین ہے۔ آیت کا سیاق وسباق بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ وللہ الحمد۔ زمخشری کا قول ہے کہ روح سے مراد عیسیٰ کی مقدس روح ہے جیسے اہل عرب کا مقولہ ہے (حاتم الجود، رجل صدق) اسی طرح اللہ کا ارشاد ہے (وروح منہ) اختصاص اور قرب کے لئے بطور تکریم ان کا ذکر فرمایا ہے نیز اس کے لیے کہ آپ کی روح انسانی پشت اور آلودہ رحموں سے منزہ تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ جبریل ہیں۔ دوسرے قول کے مطابق یہ انجیل ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے (رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا)'' ترجمہ: ایک جانفزا کلام اپنے حکم سے'' (شوریٰ:52)۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد اسم اعظم ہے جس کے ساتھ وہ مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے ان کی یہ کلام اپنے ضمن میں ایک دوسرے قول کو لئے ہوئے ہے وہ یہ کہ اس سے مراد خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مقدس پاک روح ہے فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ زمخشری کا قول ہے کہ یہ نہیں فرمایا: وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ یعنی ماضی کا صیغہ ذکر نہیں کیا۔ تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ مستقبل میں بھی ان کی یہی حالت رہے گی۔ کیونکہ انہوں نے جادو اور زہر کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو (معاذ اللہ) شہید کرنے کی ناپاک کوششیں کیں۔ چنانچہ سرکار دوعالم ﷺ نے مرض الموت میں ارشاد فرمایا'' خیبر کے (زہر آلود) لقمے کا اثر برابر مجھ پر رہا ہے۔ اب میری شہ رگ کٹنے کا وقت قریب آ پہنچا ہے''(1)۔ (میں کہتا ہوں) یہ حدیث شریف صحیح بخاری وغیرہ میں ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

'' اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہیں۔ نہیں بلکہ پھٹکار دیا ہے انہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں''۔

محمد بن اسحق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کے حوالے سے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ غُلْفٌ کا معنی اَكِنَّةٌ: غلاف۔ علی بن ابی طلحہ نے اس کا معنی ابن عباس سے ہی ''لَا تَفْقَهُ'' سمجھتے نہیں، لیا ہے۔ عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان پر مہر لگی ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ ان پر مہر ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا ہے لاتفقہ (یہ سمجھتے نہیں) سدی کا قول ہے ان پر غلاف چڑھا ہوا ہے۔ قتادہ اور مجاہد کا قول ہے کہ یہ یاد بھی نہیں رکھ سکتے اور ان میں سمجھ بھی نہیں۔ ابن عباس نے غُلُفٌ (لام کی پیش سے) پڑھا ہے۔ یہ غلاف کی جمع یعنی ہمارے قلوب ہر علم کا منبع ہیں۔ ہمیں آپ کے علم کی کوئی ضرورت نہیں یہ عطاء اور ابن عباس سے مروی ہے۔ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ'' ترجمہ: یعنی اللہ نے انہیں دھتکار دیا ہے اور ہر بھلائی سے دور کر دیا ہے'' فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ'' قتادہ کا قول ہے کہ نہیں ایمان لائیں گے ان میں سے مگر قلیل تعداد''۔ وَقَالُوْا

1۔ الشفاء: 909/1، القرطبی 163/5، البخاری: کتاب المغازی 11/6

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کے مشابہ یہ آیت کریمہ ہے: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ (حم السجدہ:5) ''اور ان (ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں''۔ عبدالرحمٰن بن اسلم نے ''غُلْفٌ'' کے تحت فرمایا وہ کہتے تھے کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے۔ جو کچھ آپ فرماتے ہیں اس میں سرایت نہیں کرتا۔ اور یہ آیت کریمہ تلاوت کی: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّةٍ...... ابن جریر نے بھی اسے ہی ترجیح دی ہے اور بطور استشہاد حضرت حذیفہ والی روایت پیش کی ہے۔ ''دل چار ہیں''۔ ان میں ایک دل وہ ذکر کیا جس پر غلاف چڑھا ہو۔ اس پر اللہ کا غضب ہے۔ یہ کافر کا دل ہے''۔ ابن ابی حاتم نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے۔ ''ہمارے دلوں کو فریب نہیں دیا جا سکتا'' اس قول کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے کہ ان کے دل پاک نہیں ہیں اور ہر خیر سے دور ہیں۔

ایک اور قول: ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے تھے ہمارے دل پہلے ہی بھرے ہوئے ہیں محمد (ﷺ) یا کسی دوسرے کی علم کی کوئی گنجائش نہیں۔ عطیہ عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس کا معنی برتن ہے۔ اسی مفہوم کے مطابق کسی انصاری نے پڑھا ہے جسے ابن جریر نے بیان کیا ہے۔ زمخشری نے بھی یہی نقل کیا ہے کہ ان کا کہنا تھا ہمارے دل تو علم سے پُر ہیں کسی دوسرے علم کی ان میں گنجائش ہی نہیں جیسے وہ تورات کے علم کے بموجب فتویٰ دیتے تھے۔ اسی لیے اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ''بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ...... یعنی معاملہ اس طرح نہیں جیسے انہوں نے دعویٰ کیا ہے بلکہ ان کے دلوں پر لعنت اور مہر لگی ہے۔ جیسے سورۂ نساء میں فرمایا: وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِکُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (نساء:155) ''اور انہوں نے یہ (گستاخانہ) بات کہی کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں۔ (یوں نہیں) بلکہ مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر بوجہ ان کے کفر کے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ مگر تھوڑی سی تعداد''۔ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ اور فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ بہت کم لوگ ان میں سے ایمان لائیں گے۔ ایک قول ہے کہ ان کا ایمان قلیل ہے یعنی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن ان کا یہ ایمان انہیں نفع نہیں دے گا۔ کیونکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی دعوت کے انکار سے بھرا ہوا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ وہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے تھے فرمایا: فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ'' حالانکہ وہ تو سارے کے سارے منکر تھے جیسے اہل عرب کہتے ہے'' (قَلَّمَا رَاَیْتُ مِثْلَ هٰذَا قَطُّ) ''یعنی میں نے اس جیسا بہت ہی کم دیکھا۔ حالانکہ مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ سرے سے دیکھا ہی نہیں''۔ کسائی کا قول ہے عرب کہتے ہیں جس نے زمین سے بدکاری کی۔ اس کی جگہ کم ہی کوئی چیز اگتی ہے یعنی سرے سے اگتی ہی نہیں۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ کِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْکٰفِرِیْنَ ﴿۸۹﴾

''اور جب آئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی اس (کتاب) کی جو ان کے پاس تھی اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اس نبی کے وسیلہ سے) تو جب تشریف فرما ہوا ان کے پاس وہ نبی، جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اسکے ماننے سے سو پھٹکار ہو اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر''۔

ارشاد ہوتا ہے جب یہود کے پاس اللہ کی کتاب یعنی قرآن کریم آ گیا۔ جو حضرت محمد ﷺ پر اتارا گیا ہے جو ان کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرتا ہے۔ وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ یعنی کتاب کے ساتھ اس کے رسول محتشم کی آمد سے قبل وہ جنگ کے دوران اس کے وسیلہ سے کفار و مشرکین پر فتح و نصرت کی دعا کرتے تھے۔ وہ مشرکین سے کہتے عنقریب میں وہ آخر الزمان (ﷺ) تشریف لائے گا تو

اس کے ساتھ مل کر ہم تمہیں ملیامیٹ کر دیں گے۔ یہ واقعہ محمد بن اسحٰق نے قتادہ انصاری کے حوالہ سے بعض مشائخ انصار سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے تھے اللہ کی قسم! (ہمارے) انصار اور ان کے پڑوسی یہودیوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ فرماتے تھے ہم جاہلیت میں ان کو شکست دے دیتے تھے۔ ہم مشرک تھے اور یہ اہل کتاب۔ وہ ہمیں کہتے، عنقریب ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ اس کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ ہم اس کی قیادت میں تم سے جنگ کریں گے اور تمہارا نام ونشان تک مٹا دیں گے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنے قریشی رسول کو مبعوث فرمایا تو ہم نے آپ ﷺ کی اتباع کی اور انہوں نے انکار کر دیا۔ ارشاد ہوتا ہے: فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا...... ضحاک نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہم ان کے خلاف محمد ﷺ کی مدد کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں بلکہ وہ جھوٹے ہیں۔ محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل یہود آپ کے توسل سے اوس وخزرج پر فتح کی دعا کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو عربوں میں مبعوث فرمایا تو انہوں آپ کا انکار کیا اور جو وہ پہلے کہا کرتے تھے ان سب باتوں سے مکر گئے۔ تو معاذ بن جبل، بشر بن براء بن معرور اور داؤد بن سلمہ نے انہیں فرمایا: اے یہودیو! اللہ سے ڈرو اور اب محمد ﷺ پر ایمان لاؤ۔ تم تو ان کے اسم گرامی کی برکت سے ہم پر فتح یاب ہونا چاہتے تھے۔ ہم تو مشرک تھے تم ہی بتایا کرتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں۔ اور ان کی صفات ہمارے سامنے بیان کرتے تھے۔ یہ سن کر سلام بن مشکم کہنے لگا۔ یہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں لائے جسے ہم جانتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جن کا ہم تم سے ذکر کیا کرتے تھے۔ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ ...... عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اہل کتاب حضور ﷺ کے ظہور کے ساتھ مشرکین عرب پر فتح مانگتے تھے۔ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ یہ بنی اسرائیل سے نہیں تو آپ کا انکار کیا اور آپ سے حسد کرنے لگے۔ ابو العالیہ کا قول ہے کہ وہ یہ دعا مانگتے: بار الہا! اس نبی کو مبعوث فرما جن کا تذکرہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تاکہ ہم مشرکین کو سزا دیں اور انہیں قتل کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ تو بنی اسماعیل سے ہیں۔ تو عربوں سے بغض وحسد کی وجہ سے انہوں نے آپ ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ واضح طور پر جانتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا...... قتادہ کا قول ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل وہ یہ پیشین گوئی کرتے تھے کہ ایک مبارک نبی کا وقت قریب ہے۔ لیکن اعلان نبوت کے بعد آپ ﷺ کے بارے فوراً مکر گئے۔ مجاہد کا قول ہے کہ اس آیت کے مصداق ومخاطب یہود ہیں۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

''بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس (کتاب) کے ساتھ جو اللہ نے نازل کی، حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے سو وہ حقدار ہو گئے مسلسل ناراضگی کے۔ اور کافروں کے لیے ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب ہے''۔

مجاہد کا قول ہے: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ یہود نے حق کے بدلے باطل اور حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنے کی بجائے اسے پردۂ کتمان میں رکھنے کا برا سودا چکایا۔ سدی کا قول ہے اس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر دیا۔ فرماتے ہیں کتنے گھٹیا اور ارزاں عوض پر انہوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا۔ اس پر راضی ہو گئے۔ اور حضرت محمد ﷺ کی تصدیق اور تائید ونصرت کی

بجائے آپ ﷺ کے انکار کی طرف پھر گئے۔اس کا سبب صرف سرکشی، حسد اور نفرت (کی آگ) تھی۔(جس میں وہ جل رہے تھے کہ نبی اولاد اسماعیل علیہ السلام سے کیوں بھیجا گیا۔) حالانکہ اللہ تعالیٰ جس پر چاہے اپنا فضل فرما دے۔اس سے بڑا حسد اور کیا ہو سکتا ہے۔محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس سے یہی بیان کیا ہے۔ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔تورات کے احکام سے روگردانی کرنے کے سبب وہ غضب کے حقدار ہو گئے۔اور اس آخری نبی ﷺ پر ایمان نہ لانے کی بنا پر ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔(میں کہتا ہوں)"بَآءُ وْا" کا معنی ہے اِسْتَوْجَبُوْا (لازم کرلیا) وَاسْتَحَقُّوْا (حق دار ہو گئے) اِسْتَقَرُّوْا (پختہ ہو گئے) ابوالعالیہ کا قول ہے: انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے سبب ان پر اللہ کا غضب ہوا پھر حضور ﷺ کی نبوت اور قرآن کے قبول نہ کرنے کی بنا پر غضب الٰہی کا نشانہ بنے۔عکرمہ اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے۔سدی کا قول ہے (پہلا غضب) بچھڑے کی پوجا کرنے کے ظلم عظیم کے سبب تھا۔اور (دوسرا غضب) حضرت محمد ﷺ کی مخالفت کی بنا پر۔ابن عباس سے یہی مروی ہے۔قولہ تعالیٰ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ "جب ان کا کفر سرکشی اور حسد کی وجہ سے تھا اور اس کی بنیاد تکبر پر تھی"۔انہیں دنیا و آخرت میں ذلت اور پستی میں مبتلا کیا گیا۔جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (مومن:60) "اور بے شک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل وخوار ہو کر" دَاخِرِيْنَ اَیْ صَاغِرِيْنَ حَقِيْرِيْنَ ذَلِيْلِيْنَ رَاغِمِيْنَ۔ذلیل و رسوا۔امام احمد نے عمرو بن شعیب کے دادا سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کا حشر انسانی صورت میں چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں (کرمک صغیر) کی طرح ہوگا۔ہر چیز ان کو روندتے ہوئے ان کے اوپر سے گزرے گی۔اور بولس نامی جہنم کے قید خانے میں قید کر دیئے جائیں گے۔اور دوزخیوں کی بدبودار پیپ انہیں پلائی جائے گی۔(1)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کیساتھ حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو انکے پاس ہے۔آپ فرمایئے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے اور بیشک آئے تمہارے پاس موسیٰ (علیہ السلام) روشن دلیلیں لے کر، پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد اور تم جفا کار ہو"۔

ارشاد ہوتا ہے جب یہود وغیرہ دیگر اہل کتاب سے یہ کہا جاتا ہے کہ محمد ﷺ پر اللہ نے جو کچھ اتارا ہے اس کی تصدیق اور اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تورات و انجیل پر ایمان ہی کافی ہے۔ہم ان کے علاوہ کسی اور چیز کو تسلیم نہیں کرتے۔اور اس کے علاوہ دیگر کتب سماویہ کا انکار کرتے ہیں۔حالانکہ وہ یہ بات جانتے ہیں حضرت محمد ﷺ پر جو کچھ اتارا گیا ہے وہ حق ہے اور تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان

1۔مسند امام احمد 178/2

کے پاس ہے۔ مصدقا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اسی طرح ان پر حجت قائم ہوگئی جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (بقرہ:146) ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو'' قولہ تعالیٰ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ...... ''یعنی اگر تم اپنے دعوئی ایمانی میں سچے ہوتو پھر تم نے اپنے ہاتھوں سے ان انبیاء کو شہید کیوں کیا جو تورات کی تصدیق کرنے، اس کے مطابق فیصلے کرنے اور اس کو منسوخ نہ کرنے کے لئے تشریف لائے تھے حالانکہ تمہیں ان کی صداقت کا مکمل یقین تھا؟۔تم نے انہیں محض سرکشی، عناد اور اللہ کے رسولوں پر تکبر کرتے ہوئے قتل کیا۔ پس تم تو اپنی خواہشات کے غلام اور اپنے نفس کے بندے ہو''۔ جیسے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ...... (نوٹ اس آیت کے ترجمہ کے لئے دیکھیں آیت نمبر 87۔ یہی سورت۔ مترجم)

سدی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں عار دلا رہے ہیں۔ ابوجعفر ابن جریر فرماتے ہیں اے محمد (ﷺ) بنی اسرائیل کے یہودیوں کو فرمادیجئے۔ جب میں نے انہیں کہا کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ تو وہ کہنے لگے ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائیں ہیں جو نازل کی گئی ہم پر۔ اے گروہ یہودیو! اگر تمہارا اللہ کی نازل کردہ کتاب پر اتنا ہی پختہ ایمان تھا۔ تو تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ کے انبیاء کو۔ حالانکہ اس نے تم پر اتاری گئی کتاب میں ان کا قتل کرنا واضح طور پر حرام قرار دیا تھا۔ اور تمہیں ان کی اتباع، اطاعت اور تصدیق کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے جو ایمان لانے کا دعویٰ کیا تھا اس کی تکذیب کرتے ہوئے انہیں شرم دلائی جارہی ہے۔ قولہ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس واضح نشانیاں (معجزات) اور قطعی دلائل و براہین لے کر آئے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں''۔ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ واضح نشانیوں سے مراد طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک، خون، عصا، ید بیضا، سمندر کا سینہ چیر دینا، ابر کا سایہ، من وسلوی اور پتھر (سے پانی کا چشمہ جاری ہونا) وغیرہ معجزات جن کے دیکھنے کے باوجود حضرت موسیٰ کے وقت میں ہی انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کو معبود بنالیا۔ ''مِنْۢ بَعْدِهٖ'' سے مراد ہے کوہ طور پر چلے جانے کے بعد۔ آپ (عَلَیْهِ وَعَلٰی نَبِیِّنَا الصَّلٰوةُ وَالتَّسْلِیْمَاتُ) بارگاہ الٰہی میں مناجات کے لئے طور پر جایا کرتے تھے۔ اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے: وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (اعراف:148) ''اور بنالیا قوم موسیٰ نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا جو محض ڈھانچہ تھا۔ اس سے گائے کی آواز آتی تھی'' وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ یعنی گئو سالہ پرستی کے جس جرم عظیم کا تم نے ارتکاب کیا تھا۔ تم اس میں جفا کار ہو۔ کیونکہ تم یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (اعراف:149) ''اور جب وہ سخت پشیمان ہوئے اور انہیں نظر آگیا کہ وہ (راہ راست سے) بھٹک گئے (تو) وہ کہنے لگے کہ اگر نہ رحم فرماتا ہم پر ہمارا رب اور نہ بخش دیتا تو ہم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں سے''۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں

دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو۔ انہوں نے (زبان سے) کہا ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) نہیں مانا۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے' یہ ان کے پیہم انکار کی نحوست تھی۔ فرمایئے بہت برا ہے جس کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب و غریب) ایمان اگر تم ایمان دار ہو"۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی غلطیوں، میثاق کی مخالفت، سرکشی، حق سے روگردانی کا بیان فرما رہا ہے حتیٰ کہ کوہ طور کو ان کے سروں پر بلند کر دیا گیا تو انہوں نے اس کو تسلیم کر لیا۔ لیکن اس کے ہٹا لیے جانے کے بعد الٹے پاؤں واپس پھر گئے۔ اسی لیے کہنے لگے: سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ محدث عبدالرزاق نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ اس کی محبت سے ان کے دل سیراب ہو چکے تھے بلکہ یہ حب ان کے دلوں میں رچ بس چکی تھی۔ ابوالعالیہ اور ربیع بن انس نے یہی کہا ہے۔ امام احمد نے حضرت ابو درداء سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تیری کسی چیز سے محبت اندھا بہرا بنا دیتی ہے" (1)۔ ابوداؤد نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ سدی کا قول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو پکڑا۔ ریتی سے اس کو رگڑا پھر برادہ سمندر میں بہا دیا۔ اس وقت بہنے والے تمام سمندر میں اس کی تاثیر پہنچ گئی۔ پھر بنو اسرائیل کو اس میں سے پینے کا حکم دیا۔ انہوں نے اس پانی کو پیا تو جو شخص بچھڑے سے محبت رکھتا تھا سونا اس کے ہونٹوں پر لگ گیا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بچھڑے کی طرف متوجہ ہوئے اسے توڑ کر دریا میں بہا دیا۔ بچھڑے کے پجاریوں میں سے جس نے بھی وہ پانی پیا اس کا چہرہ سونے کی طرح زرد ہو گیا۔ سعید بن جبیر کا قول ہے۔ جب بچھڑے کو جلایا گیا تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا...... اسے سمندر میں بہا دیا گیا۔ انہوں نے پانی کا گھونٹ بھرا تو ان کے چہرے زعفران کی طرح ہو گئے۔ قرطبی نے قشیری کی کتاب سے نقل کیا ہے کہ بچھڑے کی پرستش کرنے والوں میں سے جس نے بھی پانی پیا اسے جنون لاحق ہو گیا۔

پھر قرطبی لکھتے ہیں کہ بات اس طرح نہیں جیسے یہ تفسیر اوپر بیان ہوئی کیونکہ سیاق کلام سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تاثیر ان کے ہونٹوں اور چہروں پر ظاہر ہو گئی تھی لیکن یہاں مذکور ہے کہ ان کے دل اس کی محبت کے اسیر ہو چکے تھے یعنی دوران عبادت۔ پھر نابغہ کے یہ اشعار نقل کیے ہیں جو اس نے اپنی بیوی کی شان میں کہے ہیں ؎

تَغَلْغَلَ حُبُّ عَثْمَةَ فِيْ فُؤَادِيْ   فَبَادِيْهِ مَعَ الْخَافِيْ يَسِيْرُ
تَغَلْغَلَ حَيْثُ لَمْ يَبْلُغْ شَرَابُ   وَلَا حُزْنٌ وَلَمْ يَبْلُغْ سُرُوْرُ
اَكَادُ اِذَا ذَكَرْتُ الْعَهْدَ مِنْهَا   اَطِيْرُ لَوْ اَنَّ اِنْسَانًا يَطِيْرُ

(نوٹ یہ اشعار دونوں نابغوں (نابغہ جعدی یا نابغہ ذبیانی) میں سے کسی ایک کے ہیں۔ اسے اپنی بیوی عثمۃ سے شدید محبت تھی۔ لیکن کسی بات پر خفا ہو کر اسے طلاق دے دی۔ ان ابیات میں وہ اپنی اس محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی محبت میرے باطن میں اس مقام تک سرایت کر چکی تھی جہاں پانی اور رنج و غم بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مترجم) قولہ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی تم ماضی اور حال دونوں زمانوں میں بہت بری بات پر تکیہ کیے ہوئے ہو۔ پہلے زمانہ میں تم نے معجزات خداوندی کا انکار کیا۔ انبیاء کی مخالفت کی۔ اور اب حضور ﷺ پر ایمان نہ لانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ یہ تمہارا اعظیم گناہ اور بہت بڑی جسارت ہے۔ جب تم خاتم الرسل، سید الانبیاء والمرسلین (ﷺ) جنہیں تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے پر ایمان نہیں لا رہے اور اس سے قبل تم نقض عہد،

1۔ ابوداؤد: باب الادب 126

معجزات کے انکار، اور بچھڑے کی پرستش جیسے قبیح جرائم کا ارتکاب کر چکے ہو۔ پھر تم اپنے لیے ایمان کا دعویٰ کیسے کرتے ہو۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''آپ فرمائیے اگر تمہارے لیے ہی دار آخرت (کی راحتیں) اللہ کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو۔ اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کرینگے اپنی کارستانیوں کے خوف سے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ اور آپ یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے زندگی کی۔ حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی (زیادہ جینے پر حریص ہیں) چاہتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال اور نہیں بچا سکتا اس کو عذاب سے (اتنی مدت) جیتے رہنا اور اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں''۔

محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کے حوالے سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ جل جلالہ اپنے (پیارے) نبی محمد ﷺ کو ارشاد فرما رہے ہیں انہیں فرما دیجئے کہ اگر تمہارے لیے ہی دار آخرت (کی کامیابی) ہے اور کسی کے لیے نہیں تو آؤ مل کر یہ بددعا کریں کہ ہم میں سے جو کوئی فریق جھوٹا ہے اسے موت آ جائے۔ (سچ جھوٹ کا پتہ چل جائے گا)۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ اور اللہ تعالیٰ ان کے پاس جو علم بلکہ کفر ہے اسے خوب جانتا ہے۔ اگر وہ اس روز موت کی تمنا کرتے تو روئے زمین کے سب یہودی مر جاتے۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے تَمَنَّوُا کا معنی ہے سوال کرو۔ محدث عبدالرزاق نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ ابن عباس کا قول ہے ''اگر موت کی آرزو کرتے تو ان کا نام ونشان مٹ جاتا''۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اگر اس روز وہ موت کی خواہش کرتے تو تھوک (منہ کا لعاب) سے گلا گھٹ کر مر جاتے۔ ابن عباس تک یہ اسناد صحیح ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا اگر یہود اس روز موت کی خواہش کرتے تو ضرور ان کی موت واقع ہو جاتی اور جہنم میں اپنے ٹھکانے دیکھ لیتے۔ اور اگر کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ سے مباہلہ کرنے کے لئے نکلتے تو واپسی پر ان کے اہل و عیال اور مال و دولت کا نشان تک نہ ہوتا(1)۔ ہمیں یہ روایت عکرمہ کی وساطت سے ابن عباس سے پہنچی ہے۔ امام احمد نے بھی اسے بیان کیا ہے ابن ابی حاتم نے حسن کا قول نقل کیا ہے اللہ کا فرمان ہے کہ اپنی کارستانیوں کے سبب وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کرتے۔ میں نے عرض کی جب انہیں چیلنج دیا گیا تھا اگر وہ موت کی آرزو کر لیتے تو آپ کی کیا رائے ہے وہ مر جاتے۔ فرمایا: نہیں اللہ کی قسم وہ نہ مرتے اگر چہ وہ موت کی تمنا بھی کرتے۔ اور وہ موت کی تمنا کرنے والے بھی نہ تھے تم نے اللہ کا یہ فرمان سن لیا ہے: وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ...... لیکن یہ روایت حسن سے غریب ہے۔ پھر ابن عباس سے اس آیت کی جو تفسیر منقول ہے۔ اس کے مطابق یہ فریقین میں سے جھوٹے کے لے بد دعا کرنا تھا۔ یا مسلمانوں کی طرف سے مباہلہ کا چیلنج۔ ابن جریر نے قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہم سے یہی نقل کیا ہے۔ اس آیت کی نظیر سورۂ جمعہ کی یہ آیت ہے: قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ

1۔ الطبری 336/1:1

صٰدِقِیْنَ ○ وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجمعۃ :6 تا8) ''آپ فرمائیے اے یہودیو! اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ صرف تم ہی اللہ کے دوست ہو اور لوگ (دوست) نہیں ہیں تو ذرا مرنے کی آرزو تو کرو۔ اگر تم سچے ہو اور (اے حبیب!) وہ اس کی تمنا کبھی نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو وہ اپنے ہاتھوں پہلے بھیج چکے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ آپ (انہیں) فرمائیے یقیناً وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تمہیں مل کر رہے گی۔ پھر لوٹا دیا جائے گا تمہیں اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر چھپے اور ظاہر کو پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان (اعمال) سے جو تم کیا کرتے تھے''۔ ان پر اللہ کی لعنتیں ہوں جب انہوں نے یہ خیال کیا کہ وہ اللہ کے فرزند اور اس کے لاڈلے ہیں۔ اور یہ دعویٰ کرنے لگے کہ یہود و نصاریٰ کے علاوہ اور کوئی جنت میں نہیں جا سکتا تو انہیں مباہلہ اور فریقین میں سے جھوٹے کے خلاف بددعا کرنے کی دعوت دی گئی۔ جب انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو سب کو پتہ چل گیا کہ وہ ظالم ہیں کیونکہ اگر انہیں اپنی بات کی صداقت کا یقین ہوتا تو وہ ضرور ایسا کر گزرتے۔ لیکن ان کی ٹال مٹول سے ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عیسائی وفد کو مباہلہ کی دعوت دی تھی۔ جب وہ بحث و مباحثہ اور مناظرہ میں شکست کھانے کے باوجود اپنی سرکشی اور عناد پر اڑے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۫ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ (آل عمران :61) ''پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اِس بارے میں اس کے بعد کہ آ گیا آپ کے پاس (یقینی) علم۔ تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی۔ پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں۔ پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر'' جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیلنج سنا تو ایک دوسرے کو کہنے لگے اللہ کی قسم! اگر تم نے اس نبی سے مباہلہ کیا تو تمہارا کوئی فرد زندہ نہ بچے گا چنانچہ وہ صلح کی طرف مائل ہوئے۔ اور اپنے ہاتھ سے جزیہ دینا قبول کر لیا۔ اس حال میں کہ وہ رسوا ہو چکے تھے۔ آپ ﷺ نے ان پر جزیہ نافذ فرمایا اور ابوعبیدہ بن جراح کو ساتھ امین بنا کر بھیجا۔ مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کے ہم معنی یا قریب المعنی وہ آیت کریمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ کو فرما رہے ہیں کہ اس بات کا مشرکین میں اعلان کر دیں: قُلْ مَنْ كَانَ فِی الضَّلٰلَةِ فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ (مریم :75) ''آپ فرمائیے جو گمراہی میں (مگن) ہو تو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اسے رحمٰن لمبی ڈھیل'' یعنی ہم میں سے اور تم میں سے جو گمراہی میں ہو اللہ اس چیز میں اضافہ فرمائے جس میں وہ ہے۔ (اس کی وضاحت اپنی جگہ آئے گی (ان شاء اللہ)۔ اور جن علماء نے آیت (اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ) کا معنی یہ کیا ہے کہ اگر تم اپنے دعوٰی میں سچے ہو تو اب موت کی تمنا کرو۔ تو وہ مباہلہ کے لئے سامنے نہ آئے۔ جیسا کہ متکلمین وغیرہ کے ایک گروہ نے بیان کیا ہے۔ اور پہلے قول کی طرف رجحان ظاہر کرنے کے بعد ابن جریر نے بھی اسی کی طرف میلان ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں آیت کریمہ: قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ...... سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے ان یہود کے خلاف استدلال قائم کیا ہے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے۔ اور ان علماء و احبار کی قلعی کھولی ہے۔ وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ یہود کو باہمی اختلاف کے منصفانہ حل کی طرف دعوت دیں۔ اسی طرح دوسرے فریق (نصاریٰ) نے جب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے بارے میں آپ ﷺ کی مخالفت کی اور آپ ﷺ سے مناظرہ کیا تو آپ ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ انہیں مباہلہ کی دعوت دیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہودی فریق کو فرمایا اگر تم حق پر ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھاؤ اگر تم اپنے ایمان اور قرب الٰہی کے دعوٰی میں سچے ہوئے تو یہ چیز تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گی۔ بلکہ تمہاری موت طلب کرنے کی یہ آرزو تمہیں اس دنیا کی مشکلات

ومصائب اور زندگی کی کدورتوں سے نکال کر اللہ کے جوار میں جنت کی (ابدی) راحتوں میں پہنچا دے گی۔ کیونکہ تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ دار آخرت کی سرمدی نعمتیں صرف تمہارے لیے ہیں (اور تمہاری کامیابی یقینی ہے) اور اگر تم نصیحت قبول نہ کرو تو لوگ یہ جان لیں گے کہ تم جھوٹے ہو اور ہم راہ راست پر ہیں۔ ہمارا اور تمہارا معاملہ واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہود اس چیلنج کا جواب دینے کی جرات نہ کر سکے۔ کیونکہ انہیں یہ یقین تھا اگر انہوں نے موت کی تمنا کی تو ان کی زندگی کا چراغ اسی لمحے گل ہو جائے گا۔ اور آخرت کے ابدی رسوا کن عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اسی طرح نصاریٰ کا فریق جو نبی کریم ﷺ سے مناظرے کے لئے آئے تھے انہیں مباہلے کی دعوت دی گئی تو میدان میں نکلنے سے باز رہے۔ یہ بات بظاہر مستحسن نظر آتی ہے۔ لیکن اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس تاویل کے مطابق ان پر حجت تمام نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے یہ اعتقاد رکھنے سے کہ وہ اپنے دعوی میں سچے ہیں لازم نہیں آتا کہ وہ موت کی تمنا بھی کریں گے۔ کیونکہ صالح ہونا اور موت کی تمنا کرنا آپس میں لازم و ملزوم نہیں کیونکہ بہت سے متقی وصلحاء ایسے ہیں جو موت کی آرزو نہیں کرتے بلکہ درازی عمر کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ ان کی نیکیاں زیادہ ہوں اور جنت میں ان کا درجہ بلند ہو۔ جیسے ایک حدیث شریف میں ہے۔ ''تم میں سے بہترین وہ ہے جس کی عمر لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں'' (1) اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اے مسلمانو! جب تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم جنتی ہو تو تم حالت صحت میں موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے۔ جو چیز تمہیں پسند نہیں ہم پر لازم کیوں کرتے ہو؟۔ یہ اعتراض آیت کی تفسیر اس طرح کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن حضرت ابن عباس کی تفسیر پر کوئی استحالہ لازم نہیں آتا۔ بلکہ انہیں صرف یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم اللہ کے دوست ہو۔ تم ابناء اللہ اور اللہ کے لاڈلے ہو۔ جنت صرف تمہارے لیے ہے دیگر تمام لوگ دوزخی ہیں تو اس پر مباہلہ کر لو۔ آؤ دعا کریں کہ جھوٹے فریق پر اللہ کی لعنت ہو۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مباہلہ سے لامحالہ طور پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجائے گا۔ چونکہ انہیں اس بات کا کلی یقین تھا اور حضور ﷺ کی نبوت کی صداقت کا بھی عرفان کامل تھا۔ انہوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں اپنے کذب وافترا پردازی اور حضور سرور دو عالم کی تمام صفات کا علم تھا۔ وہ انہیں اسی طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔ انہیں اپنے بطلان، رسوائی، گمراہی اور عناد کا علم تھا۔ قیامت تک ان پر لگاتار اللہ تعالیٰ کی لعنتیں ہوں۔ اس مباہلہ کو یہاں تمنی کا نام دیا گیا۔ کیونکہ سچا فریق آرزو کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مقابل باطل پرست مناظر کو ہلاک فرمادے۔ خصوصاً جب اس کے پاس سچائی کی دلیل بھی موجود ہو۔ مباہلہ میں موت کا چیلنج دیا گیا کیونکہ زندگی انہیں عزیز تر ہے۔ وہ اس لیے کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ موت کے بعد ان کا انجام بہت برا ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے۔ اپنی کارستانیوں کے خوف سے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اور آپ (ﷺ) یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے زندگی کی۔ وہ درازی عمر کی خواہش اس لیے رکھتے تھے کہ انہیں معلوم تھا کہ ان کا انجام برا ہے۔ اور اللہ کے ہاں وہ آخرت میں خسارہ میں ہوں گے۔ کیونکہ دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔ چنانچہ جس قدر ممکن ہو وہ مقام آخرت سے بچے رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن جس چیز سے وہ بظاہر محتاط نظر آتے ہیں لامحالہ طور پر ان پر واقع ہو کر رہے گی۔ مشرکین جن کے پاس کوئی کتاب نہیں وہ تو ان سے بھی زیادہ زندگی کے حریص ہیں۔ یہاں خاص کا عطف عام پر کیا جارہا ہے۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اَشْرَكُوْا سے مراد عجمی لوگ ہیں۔ حاکم نے مستدرک میں ثوری کی حدیث میں اسی طرح بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اگرچہ صحیحین کی شرط پر پوری اترتی ہے لیکن انہوں نے اسے روایت نہیں کیا۔ لکھتے ہیں کہ صحابی کی تفسیر کے سند

1۔ کشف الخفاء:1/461

ہونے پر شیخین متفق ہیں۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ منافق عام لوگوں اور مشرک سے بھی زیادہ زندگی کا حریص ہوتا ہے۔ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ یعنی یہودیوں میں سے ہر ایک چاہتا ہے۔ سیاق کے کلام کا اشارہ اسی طرف ہے کہ ''ھم'' کی ضمیر سے مراد یہودی ہیں۔ ابوالعالیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد مجوسی ہیں۔ یعنی ہر مجوسی یہ چاہتا ہے کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال۔ اعمش نے بروایت سعید بن جبیر ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ اسی طرح ہے جیسے ایرانی کہے'' دَہ ہزار سال'' یعنی دس ہزار سال۔ خود سعید بن جبیر کا قول بھی یہی ہے۔ ابن جریر نے مجاہد کی روایت سے ابن عباس کا قول بیان کیا ہے اس سے مراد عجمی ہیں۔ ہزار سال نوروز اور مہرجان کے حساب سے۔ مجاہد اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں عمر بھر گناہ کرنا ان کے نزدیک پسندیدہ ہے: وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ ابن اسحٰق نے سعید یا عکرمہ کی روایت سے ابن عباس کا فرمان نقل کیا ہے کہ لمبی مدت تک جیتے رہنا بھی انہیں عذاب سے نجات نہیں دے سکتا۔ دراصل مشرک تو اس لیے طوالت عمر کا خواہش مند ہوتا ہے کہ وہ حیات مابعد الموت پر یقین نہیں رکھتا اور یہودی کو اگر آخرت میں اپنے دردناک انجام کا پتہ چل جائے تو وہ فوراً راہ راست پر آ جائے۔ عوفی نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے جبریل سے دشمنی کی ابوالعالیہ اور ابن عمر کا قول ہے کہ اسے عذاب سے بچانے میں یہ چیز بھی معاون نہیں ہوگی۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہود ان سب سے زیادہ لمبی عمر کے خواہاں ہیں۔ اور ہزار سالہ زندگی چاہتے ہیں لیکن یہ طویل مدت بھی انہیں عذاب سے نجات دینے والی نہیں جس طرح ابلیس کی لمبی زندگی نے اسے کوئی فائدہ نہیں دیا کیونکہ وہ کافر ہو گیا ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اس کے بندے کیا اعمال خیر و شر انجام دیتے ہیں۔ اور عنقریب ہر ایک کو اس کے عمل کی جزاء عطا فرمائے گا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَ هُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۹۸﴾

'' آپ فرمائیے جو دشمن ہو جبریل (علیہ السلام) کا (اسے معلوم ہونا چاہیے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے (یہ) تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اسکے رسولوں اور جبریل (علیہ السلام) و میکائیل (علیہ السلام) کا تو اللہ بھی دشمن ہے (ان) کافروں کا''۔

امام ابوجعفر و جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمام مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت یہود بنی اسرائیل کے جواب میں نازل ہوئی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جبریل ان کا دشمن ہے۔ اور میکائیل ان کا دوست ہے۔ پھر اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا تھا۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ان کے اس قول کا سبب وہ مناظرہ تھا جو نبوت کے مسئلے پر ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ہوا۔

اس رائے کے حامیوں کا بیان: شہر بن حوشب نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہود کا ایک گروہ حضور ﷺ کی خدمت حاضر ہوا وہ عرض کرنے لگے اے ابوالقاسم! ہمیں چند چیزوں کے بارے میں بتائیے جنہیں ماسوائے نبی کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو چاہو پوچھو لیکن مجھے وہی ضمانت دو جو ضمانت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے لی تھی کہ

اگر میں نے تمہیں کسی چیز کے بارے میں بتایا اور تم نے اسے درست پایا تو اسلام قبول کر کے میری اتباع کرو گے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اب جو چاہو سوال کرو۔ وہ کہنے لگے چار چیزیں بتائیے وہ کون سا کھانا تھا جسے اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے تورات کے نزول سے قبل اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا؟۔ اور ہمیں بتائیے کہ مرد اور عورت کے مادۂ منویہ کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ پھر اس سے لڑکا اور لڑکی کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟۔ اور اس نبی کے بارے میں بتائیے جن کا ذکر تورات میں ہے۔ اور فرشتوں میں سے کون ان کا دوست ہے؟۔ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا تمہیں اللہ کی قسم ہے اگر میں تمہیں بتادوں تو تم میری اتباع کرو گے؟۔ انہوں نے عہد و پیمان کیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس رب قدوس کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی۔ کیا تمہیں علم ہے کہ حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام شدید بیمار ہو گئے تھے۔ جب بیماری نے طول پکڑا تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے مجھے شفایاب فرمایا تو میں سب سے زیادہ پسندیدہ کھانا اور مشروب (پینے کی چیز) اپنے اوپر حرام کرلوں گا۔ اونٹ کا گوشت انہیں بہت مرغوب تھا اور اونٹنی کا دودھ انہیں بہت پسند تھا۔ تو وہ کہنے لگے ہاں۔ اے خدایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! گواہ رہنا۔ اور میں تمہیں اس ذات کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جو وحدہ لاشریک ہے۔ اسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تھی۔ کیا تم جانتے ہو کہ مرد کا پانی (نطفہ) گاڑھا سفید اور عورت کا پتلا زرد ہوتا ہے۔ دونوں میں سے جو غالب آجائے تو باذن الٰہی اسی کے مطابق اولاد اور اس کی شکل ہوتی ہے۔ اگر آدمی کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجائے تو اللہ کے حکم سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجائے تو اللہ عزوجل کے اذن سے بچی پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہنے لگے ہاں اے خدایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے اللہ گواہ رہنا۔ اور میں تمہیں قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی کیا تم جانتے ہو کہ اس امی نبی کی آنکھیں سوتی ہیں مگر دل بیدار رہتا ہے۔ وہ کہنے لگے ہاں اے خدایا آپ ﷺ نے فرمایا اے اللہ گواہ رہنا۔ وہ کہنے لگے اچھا اب آپ (ﷺ) ہمیں یہ بتائیے کہ کون سا فرشتہ آپ کے پاس (وحی لے کر) آتا ہے۔ اس جواب کے ساتھ ہی ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے یا آپ سے جدا ہو جائیں گے۔ (یعنی اس پر بحث کا خاتمہ ہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا میرا دوست جبریل ہے۔ اور اللہ نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا مگر وہ اس کا دوست ہے۔ وہ کہنے لگے پھر ہمارا اور آپ کا راستہ الگ ہے۔ اگر کوئی دوسرا فرشتہ آپ کے پاس آتا تو ہم آپ پر ایمان لے آتے اور آپ کی اتباع کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں اس کی تصدیق کرنے سے کون سی چیز مانع ہے۔ وہ کہنے لگے وہ تو ہمارا (پرانا) دشمن ہے[1]۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ...... تا ...... لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اس وقت وہ مسلسل ناراضگی کے حقدار ہو گئے۔ اس حدیث کو عبدالرحمٰن بن حمید نے اپنی تفسیر میں اور امام احمد نے دو سندوں سے بیان کیا ہے۔ محمد بن اسحٰق بن یسار نے اسے مرسل ذکر کیا ہے۔ انکی روایت میں یہ اضافہ ہے انہوں نے عرض کی ہمیں روح کے بارے میں بتائیے آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور بنو اسرائیل پر اس کی نعمتوں کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں پتہ نہیں کہ وہ جبریل ہے وہی میرے پاس آتا ہے وہ کہنے لگے ہاں اے خدایا! لیکن وہ ہمارا دشمن ہے وہ ہمیشہ سختی اور خون ریزی لاتا رہا ہے۔ اگر کوئی اور فرشتہ ہوتا تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ...... امام احمد نے سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہودی بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں آئے اور کہنے لگے اے ابوالقاسم! ہمیں پانچ اشیاء کے بارے میں بتائیے اگر آپ نے بتادیا تو ہم سمجھ جائیں گے کہ آپ نبی ہیں اور آپ کی اتباع کریں گے۔ تو آپ ﷺ نے ان سے وہی عہد لیا جو حضرت اسرائیل نے

1۔ الطبری 342/1:

اپنے بیٹوں سے لیتے ہوئے فرمایا تھا: قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ (یوسف:66) '' اللہ تعالیٰ جو ہم گفتگو کر رہے ہیں اس پر گواہ ہے'' آپ علیہ السلام نے فرمایا پوچھو۔ وہ کہنے لگے ہمیں نبی کی علامات بتایئے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا اس کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔ وہ کہنے لگے اچھا یہ بتایئے کہ عورت بچی یا بچہ کیسے جنتی ہے؟۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا جب دونوں پانی ملتے ہیں اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب عورت کا پانی مرد کے نطفے پر غالب آجائے تو بچی پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہنے لگے اچھا ہمیں اس کھانے کے بارے میں بتایئے جسے اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا؟۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: انہیں عرق النساء کی بیماری تھی۔ انہیں کوئی چیز موافق نہ تھی کسی جانور کا دودھ۔ احمد کا قول ہے کہ بعض علماء کے نزدیک اونٹ تھا۔ چنانچہ اس کے گوشت کو آپ نے اپنے اوپر حرام کرلیا۔ وہ کہنے لگے آپ (علیہ السلام) نے سچ فرمایا۔ وہ کہنے لگے ہمیں بتایئے کہ یہ رعد (چمک) کیا ہے؟۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ جس کی ڈیوٹی بادلوں کو چلانا ہے اور جس طرف اللہ تعالیٰ کا حکم ہو لے جاتا ہے۔ وہ کہنے لگے پھر یہ آواز کیسی ہوتی ہے جو ہمیں سنائی دیتی ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا یہ اس کی آواز (گرج) ہے۔ وہ کہنے لگے آپ (علیہ السلام) نے سچ بیان فرمایا ہے وہ کہنے لگے ایک سوال باقی ہے اگر آپ علیہ السلام نے اس کا جواب بھی دے دیا تو ہم آپ کی اتباع کریں گے۔ وہ یہ کہ کوئی نبی ایسا نہیں مگر فرشتہ اس کے پاس وحی لے کر آتا ہے۔ ہمیں بتایئے آپ کے پاس کون آتا ہے؟۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا'' جبریل (علیہ السلام)'' وہ کہنے لگے یہ وہی جبریل ہے جو جنگ وجدال اور عذاب لے کر آتا ہے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔ اگر آپ نے میکائیل کا نام لیا ہوتا جو رحمت، بارش اور فصلیں لے کر آتا ہے تو ہم آپ کی پیروی کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ...... ترمذی اور نسائی نے اس حدیث کو عبداللہ بن ولید سے روایت کیا ہے۔ ترمذی کا قول ہے کہ حسن غریب ہے۔ سنید اپنی تفسیر میں قاسم بن ابی بزہ سے نقل کرتے ہیں کہ یہود نے نبی اکرم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کون سا فرشتہ آپ کے پاس وحی لے کر آتا ہے۔ آپ نے فرمایا جبریل۔ وہ کہنے لگے وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ جنگ، شدت اور باہمی دشمنی لے کر آتا ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے یہود نے عرض کی اے محمد! جبریل ہمیشہ غضب اور جنگ وجدال لے کر آتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی امام بخاری اس آیت کی تفسیر میں نقل فرماتے ہیں عکرمہ کا قول ہے جبر، میکا اور اسراف مترادفات ہیں ان کا معنی عبد (بندہ) ہے۔ اِیل کا معنی ہے: اللہ۔ انس بن مالک ؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن سلام کو حضور علیہ السلام کی تشریف آوری کی خبر ملی ان دنوں وہ اپنی زمینوں پر قیام پذیر تھے۔ وہ آپ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور کہنے لگے میں آپ (علیہ السلام) سے تین چیزوں کے بارے میں دریافت کروں گا جنہیں نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ (فرمایئے) قیامت کی پہلی شرط کیا ہے؟۔ اور اہل جنت کا پہلا کھانا کیا ہے؟۔ بچے کی صورت کو ماں باپ کے مشابہ کیا چیز بناتی ہے؟۔ (یہ سن کر) آپ علیہ السلام نے فرمایا۔ ابھی جبرائیل نے مجھے ان باتوں کی خبر دی ہے۔ عبداللہ بن سلام کہنے لگا جبرائیل؟۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں۔ وہ کہنے لگے فرشتوں میں سے وہ تو یہود کا دشمن ہے۔ تو حضور انور علیہ السلام نے جواباً یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی (پھر فرمایا) قیامت کی پہلی نشانی آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔ جنتیوں کی پہلی خوراک مچھلی کی کلیجی کی زیادتی ہوگی۔ اور جب آدمی کا پانی عورت سے سبقت لے جائے تو بچہ اس کے مشابہ ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی سبقت لے جائے تو اس کے مشابہ ہوتا ہے۔ (یہ سن کر) عبداللہ بن سلام کہنے لگے۔ (اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ (علیہ السلام) اللہ کے رسول ہیں (اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے)۔ پھر عرض کرنے لگے یارسول اللہ! یہودی جھوٹے لوگ ہیں۔ اگر ان سے پوچھنے سے قبل انہیں میرے اسلام لانے کا علم ہو گیا تو مجھ پر بہتان لگانا شروع کردیں گے۔ یہودی آئے تو سرکار دو

عالم ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: عبداللہ بن سلام تم میں سے کیسے شخص ہیں؟۔ وہ کہنے لگے ہم سے بہترین، بہترین شخص کے فرزند اور ہمارے سردار اور ہمارے سردار کی اولاد ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو؟ وہ کہنے لگے اللہ انہیں اس سے بچائے۔ اتنے میں عبداللہ بن سلام باہر آئے اور زور سے پڑھنے لگے (اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ) (یہ سن کر) وہ کہنے لگے یہ ہم میں سے شریر ترین ہیں اور بدترین شخص کی اولاد ہے۔ اور آپ کی تنقیص کرنے لگے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن سلام نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! اسی بات کا مجھے اندیشہ تھا(1)۔ بخاری اس سند سے یہ حدیث بیان کرنے میں منفرد ہیں۔ انہوں نے ہی ایک دوسری سند سے یہی حدیث حضرت انس سے روایت کی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان مولیٰ رسول اللہ ﷺ کی کلام بھی اس کے قریب ہے۔ جس کی وضاحت اپنی جگہ آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بخاری میں (جس طرح پہلے گزر چکا ہے) حضرت عکرمہ کی مشہور روایت یہ ہے کہ ''اِیْلُ'' بمعنی اللہ ہے۔ سفیان ثوری، عبد بن حمید اور ابن جریر نے بھی عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ جبریل اور میکائیل کا معنی عبداللہ ہے ایل بمعنی اللہ ہے۔ یزید نحوی نے بھی حضرت عکرمہ اور ابن عباس سے یہی روایت کیا ہے۔ سلف صالحین میں سے متعدد کا قول ہے کہ ایل بمعنی عبد ہے اور دوسرا کلمہ بمعنی اللہ ہے کیونکہ یہ کلمہ سب اسماء میں ایک ہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس کے ہم وزن کلمات عبداللہ، عبدالرحمٰن، عبدالمالک، عبدالقدوس، عبدالسلام، عبدالکافی اور عبدالجلیل ہیں۔ ان سب میں کلمہ عبد موجود ہے لیکن جن اسماء کی طرف یہ مضاف ہو رہا ہے وہ بدل گئے ہیں۔ اسی طرح جبرائیل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل وغیرہ ہیں غیر عربی زبانوں میں مضاف الیہ کو مضاف پر مقدم کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ ابن جریر لکھتے ہیں کہ بعض دوسرے علماء کا قول ہے ان کی اس گفتگو کا سبب وہ مناظرہ تھا جو ان کے اور حضرت عمر بن خطاب کے مابین حضور ﷺ کے بارے میں ہوا۔

واقعہ کا تفصیلی بیان: شعبی کا بیان ہے کہ حضرت عمر روحاء کے مقام پر اترے۔ آپ نے دیکھا کہ بعض لوگ جلدی سے کچھ پتھروں کی طرف جا رہے ہیں اور وہاں نماز ادا کرتے ہیں۔ آپ نے وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ ان کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں نماز ادا فرمائی ہے آپ نے اس بات پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی وادی میں جس جگہ بھی نماز کا وقت آ جاتا تھا وہی نماز ادا فرماتے اور آگے کوچ فرما دیتے۔ پھر آپ ان سے باتیں کرنے لگے۔ اور فرمایا میں یہود کے مجمع میں تورات پڑھنے کے دن شریک ہوا کرتا تھا۔ اور متعجب ہوتا کہ تورات کس طرح قرآن کی تصدیق کرتی ہے اور قرآن کس طرح تورات کی تصدیق کرتا ہے۔ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ وہ کہنے لگے اے ابن خطاب! تمہارے ساتھیوں میں تم سے زیادہ ہمیں کوئی محبوب نہیں۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگے کیونکہ تم صبح و شام ہمارے پاس آتے ہو۔ میں نے کہا میں تو یہ دیکھ کر متعجب ہوتا ہوں کہ کس طرح قرآن تورات کی اور تورات قرآن کی تصدیق کرتی ہے۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ کہنے لگے اے ابن خطاب! وہ تمہارے ساتھی (نبی) جا رہے ہیں ان سے جا ملو۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور جو اس نے تمہیں حق کی حفاظت کے لئے حکم دیا ہے اور جو اس نے اپنی کتاب تمہیں عطا فرمائی ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ وہ اللہ کے رسول ہیں؟۔ فرماتے ہیں وہ سب خاموش ہو گئے تو ان کے عالم اور سردار نے کہا۔ انہوں (عمر) نے تمہیں سخت قسم دی ہے ان کو جواب دو۔ وہ کہنے لگے آپ ہمارے عالم دین اور سردار ہیں انہیں جواب دیجئے۔ وہ کہنے لگا آپ نے ہمیں قسم دی ہے (سچ تو یہ ہے کہ) ہم جانتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں نے کہا تمہارا بھلا ہو پھر تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ وہ کہنے لگے ہم ہلاکت میں نہیں ہیں۔ میں نے کہا وہ کیسے؟۔

1۔ البخاری 23/6

حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ اللہ کے رسول ہیں پھر ان کی اتباع نہیں کرتے اور نہ ان کی تصدیق کرتے ہو۔ وہ کہنے لگے کہ فرشتوں میں ہمارا دشمن بھی ہے اور دوست بھی۔ انہوں نے اپنی نبوت کو ہمارے دشمن فرشتے سے ملا دیا ہے۔ میں نے پوچھا فرشتوں میں سے تمہارا دوست کون ہے اور دشمن کون ہے؟ وہ کہنے لگے ہمارا دشمن جبریل اور ہمارا دوست میکائیل ہے۔ وہ کہنے لگے جبریل درشتی، سختی، تنگدستی، شدت اور عذاب وغیرہ کا فرشتہ ہے اور میکائیل رحمت ورافت اور تخفیف وغیرہ کا فرشتہ ہے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ اپنے رب کے ہاں ان کا کیا مقام ہے؟ وہ کہنے لگے ایک دائیں طرف ہے اور ایک بائیں طرف۔ میں نے کہا اس ذات وحدہ لاشریک کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو ذات ان دونوں کے درمیان ہے (یعنی خدا تعالیٰ) وہ اس کی دشمن ہے جس سے یہ عداوت رکھتے ہوں اور دوست ہے جس کے یہ دوست ہوں۔ جبرائیل میکائیل کے دشمن سے دوستی نہیں رکھ سکتا اور میکائیل جبرائیل کے دوست سے دشمنی نہیں رکھ سکتا۔ فرماتے ہیں اس کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور حضور ﷺ کے ساتھ جا ملا۔ آپ ﷺ اس وقت بنو فلاں کے دریچے سے نکل رہے تھے مجھے دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا اے ابن خطاب کیا میں نے تمہیں وہ آیات نہ سناؤں جو ابھی مجھ پر نازل ہوئی ہیں پھر سرکار ﷺ نے یہ تلاوت فرمائی: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ...... تا آخر۔ میں نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ میں آپ کو یہ بات عرض کرنے کے لئے حاضر ہو رہا تھا مگر میری آمد سے قبل ہی اس لطیف وخبیر نے آپ کو یہ بات بتا دی۔

ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ حضرت عمر یہود کے پاس گئے۔ اور پوچھا تمہیں اس ذات کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تھی۔ حضرت محمد (ﷺ) کا ذکر مبارک تمہاری کتب میں ہے یا نہیں وہ کہنے لگے ہاں۔ آپ نے فرمایا تو پھر تم ان کی اتباع کیوں نہیں کرتے؟ وہ کہنے لگے اللہ نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر فرشتوں میں سے کسی کو اس کا کفیل بنایا۔ جبریل محمد (ﷺ) کے کفیل ہیں وہ آپ (ﷺ) کے پاس آتے ہیں۔ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ میکائیل ہمارے دوست ہیں اگر میکائیل ان کے پاس آتے تو ہم اسلام قبول کر لیتے۔ فرماتے ہیں میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی اللہ کے ہاں ان کا کیا مرتبہ ہے؟ وہ کہنے لگے جبریل اس کے دائیں اور میکائیل بائیں ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے حکم بغیر نہیں اترتے۔ میکائیل جبریل کے دشمن سے دوستی نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی جبریل میکائیل کے دشمن سے دوستی رکھ سکتا ہے۔ آپ ابھی ان کے پاس ہی تھے کہ وہاں سے حضور ﷺ کا گزر ہوا۔ وہ کہنے لگے اے ابن خطاب! یہ تمہارے نبی جا رہے ہیں۔ حضرت عمر اٹھ کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی ان دونوں سندوں سے بظاہر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شعبی کی یہ روایت متصل ہے لیکن اس میں شعبی اور عمر کے درمیان انقطاع ہے یعنی کوئی اور راوی ہے کیونکہ شعبی نے حضرت عمر کا زمانہ نہیں پایا۔ واللہ اعلم۔

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ ہمارے سامنے ذکر کیا گیا ہے کہ ایک دن حضرت عمر یہود کے پاس تشریف لے گئے۔ جب آپ واپس آنے لگے تو انہوں نے آپ کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔ حضرت عمر نے فرمایا اللہ کی قسم میں تمہاری محبت سمیٹنے یا کسی اور کام کے لئے نہیں آیا۔ میری تو خواہش ہے کہ تمہاری باتیں سنوں۔ چنانچہ دونوں فریق ایک دوسرے سے پوچھتے رہے۔ وہ کہنے لگے تمہارے ساتھی (نبی) کا رفیق کون ہے؟ آپ نے فرمایا جبریل وہ کہنے لگے اہل آسمان میں سے یہ ہمارا دشمن ہے محمد (ﷺ) کو ہمارے رازوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اور جب بھی آئے لڑائی اور قحط سالی لے کر آتا ہے۔ لیکن ہمارا ساتھی تو میکائیل ہے۔ وہ جب بھی آئے شادابی اور امن و سلامتی لے کر آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تم جبریل کو جانتے ہو اور (حضرت) محمد (ﷺ) کا انکار کرتے ہو۔ چنانچہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے اٹھ کر نبی کریم ﷺ کی طرف جانے لگے تاکہ آپ ﷺ کو خبر دے سکیں۔ جب وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ پر یہ آیت کریمہ نازل ہو چکی تھی۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ...... حضرت قتادہ سے ایک دوسری روایت میں یہی واقعہ مذکور ہے جسے آدم (رحمتہ اللہ علیہ) نے اپنی تفسیر میں ذکر فرمایا ہے۔ لیکن یہ منقطع ہے۔ سدی کی روایت کے الفاظ بھی تقریباً یہی ہیں وہ بھی منقطع ہے۔ ابن ابی حاتم نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملا اور کہنے لگا جبریل جس کا ذکر تمہارے ساتھی (پیغمبر) کرتے ہیں ہمارا دشمن ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ بعد ازاں آپ کی تائید میں یہی آیات نازل ہوئیں۔ عبد بن حمید نے ابن جریر کی سند سے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ یہود مسلمانوں سے کہنے لگے۔ اگر میکائیل تم پر اترنے والا ہوتا تو ہم تمہاری اتباع کرتے۔ وہ تو رحمت اور بارش لے کر آتا ہے۔ جبکہ جبریل عذاب اور انتقام کی نوید لاتا ہے۔ بلاشبہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔" محدث عبدالرزاق نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ یہودی کہنے لگے جبریل ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ سختی اور قحط سالی لے کر اترتا ہے۔ اور میکائیل فراخی، عافیت اور خوشحالی لے کر آتا ہے۔ پس جبریل ہمارا دشمن ہے تو اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ شان نزول کے بیان کے بعد اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جو جبرائیل سے دشمنی رکھتا ہے وہ جان لے کہ وہ روح الامین ہے جس نے اللہ کے حکم سے آپ (ﷺ) کے قلب منیر پر قرآن حکیم اتارا ہے۔ وہ اس معاملے میں رسول (قاصد) فرشتہ ہے۔ جس نے کسی ایک رسول سے دشمنی کی اس نے تمام رسولوں سے عداوت کا اظہار کیا۔ جس طرح ایک رسول پر ایمان لانے والے کے لئے لازمی ہے کہ وہ تمام مرسلین پر ایمان لائے۔ اسی طرح ایک رسول کا انکار کرنے سے تمام رسولوں کا انکار لازم آتا ہے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ...... (نساء:150) "بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں بعض رسولوں پر اور ہم کفر کرتے ہیں بعض کے ساتھ" بعض رسولوں پر ایمان لانے اور بعض کا انکار کرنے کی صورت میں واضح کفر کا حکم لگا دیا۔ اسی طرح جو جبریل کا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے کیونکہ جبریل اپنی مرضی سے نہیں اترتا۔ بلکہ وہ تو امر الٰہی کا پابند ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ...... "اور (اے جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے" (مریم:64) ایک اور جگہ فرمایا: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ "اور بلاشبہ یہ کتاب رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے۔ اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل) آپ کے قلب (منیر) پر تاکہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے" (شعراء:194-192)۔ بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس نے میرے ولی سے دشمنی کی اس نے مجھے جنگ کے لئے دعوت مبارزت دی۔" اس لیے جبریل کے دشمن پر اللہ کا غضب ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ سابقہ کتب سماویہ کی تصدیق کرنے والا ہے۔ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ان کے دلوں کے لئے ہدایت ہے اور ان کے لئے جنت کی خوشخبری ہے۔ اور نہیں ہے یہ مگر مومنین کے لئے۔ جیسے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ...... (حم السجدۃ:44) "آپ فرمائیے! یہ قرآن ایمان لانے والوں کیلئے تو ہدایت اور شفاء ہے)۔ ایک اور مقام پر فرمایا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (بنی اسرائیل:82) "اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے" پھر فرمایا: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ ...... اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں جس نے میرے فرشتوں اور رسولوں

سے دشمنی کی۔ ملائکہ بھی اس کے رسولوں میں شامل ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ (حج: 75) ''اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے فرشتوں سے بعض پیغام پہنچانے والے اور انسانوں سے بھی بعض کو رسول'' جبریل و میکائل۔ یہ خاص کے عام پر عطف کے باب سے ہیں۔ کیونکہ وہ ملائکہ اور رسل کے عموم میں بھی داخل ہیں۔ پھر ان کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔ کیونکہ سیاق کلام سے جبریل کے مقام کی وضاحت مطلوب ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین بطور سفیر کام کرتا ہے۔ ساتھ ہی میکائیل کا ذکر بھی کر دیا کیونکہ یہود یہ گمان کرتے تھے کہ جبریل ان کا دشمن اور میکائیل ان کا دوست ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بتایا کہ ان میں سے ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن ہے بلکہ اللہ رب العزت کا بھی دشمن ہے۔ کیونکہ حضرت میکائیل بھی بعض اوقات رسولوں کے پاس آتے رہے ہیں۔ جیسے ابتدائے نبوت میں حضور ﷺ کے پاس۔ لیکن جبریل کی آمد بکثرت ہوتی ہے بلکہ یہ ان کا فریضہ ہے۔ اور میکائیل نباتات اور بارش پر مقرر ہیں۔ وہ ہدایت کے لئے اور یہ رزق کی فراہمی کے لئے۔ جیسے اسرافیل کی ذمہ داری قیامت کے دن صور پھونکنے پر ہے۔ اسی لیے صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو اٹھتے تو یہ دعا مانگتے (اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبۡرَآئِیۡلَ وَ مِیۡکَآئِیۡلَ وَ اِسۡرَافِیۡلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ عَالِمَ الۡغَیۡبِ وَالشَّھَادَۃِ اَنۡتَ تَحۡکُمُ بَیۡنَ عِبَادِکَ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ اِھۡدِنِیۡ لِمَا اخۡتَلَفۡتُ فِیۡہِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِکَ اِنَّکَ تَھۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ) ''ترجمہ: اے اللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب، آسمانوں اور زمین کے خالق اے عالم غیب اور شہود کے جاننے والے، تو اپنے بندوں کے مابین اختلاف کا فیصلہ کرتا ہے۔ اختلافی معاملات میں اپنے اذن سے مجھے راہ ہدایت پر گامزن رکھ۔ تو جسے چاہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت عطا فرماتا ہے۔'' اس بات کا پہلے ذکر ہو چکا ہے جسے بخاری اور ابن جریر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ جبر ومیک واسراف: عبد (بندہ) کے معنی میں ہیں اور ایل کا معنی اللہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے عمیر مولی ابن عباس کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جبریل عبداللہ اور عبدالرحمٰن کی طرح ہے۔ محمد بن اسحٰق نے علی بن حسین سے روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا'' کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری زبان میں جبریل کا کیا معنی ہے؟ وہ کہنے لگے نہیں۔ آپ نے فرمایا اس کا نام عبداللہ ہے۔ ہر وہ اسم جس کے آخر میں ایل ہے اس کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ، مجاہد، ضحاک اور یحیٰی بن یعمر سے یہی مروی ہے۔ پھر لکھتے ہیں عبدالعزیز بن عمیر کا قول ہے جبرائیل کا معنی فرشتوں میں ''اللہ کا خادم'' ہے فرماتے ہیں جب میں نے یہ بات ابوسلیمان الدارانی کو بتائی تو وہ کانپ اٹھے۔ اور فرمانے لگے یہ حدیث مجھے اس دفتر کی تمام مرویات سے زیادہ محبوب ہے۔ جبریل اور میکائیل کی متعدد لغات اور قرأتیں مروی ہیں۔ جو کتب قرأت اور لغت میں مذکور ہیں ہم اپنی اس کتاب میں طوالت کے خدشہ سے ان کو بیان نہیں کرتے مگر جب اس پر معنی کا دار ومدار ہو یا کوئی حکم اس کی طرف لوٹتا ہو۔ وَ بِاللّٰہِ الثِّقَۃُ وَھُوَ الۡمُسۡتَعَانُ۔ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ یہاں پر اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا ہے۔ یعنی فَاِنَّہٗ عَدُوٌّ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ جیسے شاعر کا قول ہے۔

؂ لَا اَرٰی الۡمَوۡتَ یَسۡبِقُ الۡمَوۡتَ شَیۡءٌ سَبَقَ الۡمَوۡتُ ذَا الۡغِنٰی وَالۡفَقِیۡرَا

میں نے موت سے سبقت لے جانے والے کسی کو نہیں دیکھا موت تو غنی اور فقیر (دونوں) سے سبقت لے جاتی ہے۔ ایک دوسرے شاعر کا قول ہے۔

؂ لَیۡتَ الۡغُرَابَ غَدَاۃَ یَنۡعَبُ دَائِبًا کَانَ الۡغُرَابُ مُقَطَّعُ الۡاَوۡدَاجِ

اللہ تعالیٰ یہاں اسم ظاہر کو اس معنی کی تاکید، اظہار اور یہ خبر دینے کیلئے ذکر کیا کہ جو اللہ کے دوست سے عداوت ظاہر کرے اس نے

اللہ سے عداوت کی۔جس نے اللہ سے دشمنی کی، اللہ اس کا دشمن ہے اور جس کا دشمن اللہ ہو تو وہ دنیا و آخرت میں خسارہ میں ہے۔جس طرح حدیث شریف میں ہے:''جس نے میرے دوست سے عداوت ظاہر کی میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔'' ایک دوسری حدیث میں ہے۔'' میں اپنے دوستوں کا بدلہ لے لیتا ہوں جیسے شیر لڑائی کا بدلہ لیتا ہے۔ایک صحیح حدیث میں ہے'' میں جس کا دشمن بن جاؤں اس پر غالب آجاتا ہوں۔''

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ۭ وَمَا ھُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٣﴾ ع

''اور یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن نشانیاں اور کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا اُن کا بجز نافرمانوں کے۔کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا تو پھر توڑ پھینکا اسے انہیں میں سے ایک گروہ نے۔بلکہ ان کی اکثریت تو (سرے سے) ایمان ہی نہیں لائی۔اور جب آیا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے جیسے وہ کچھ جانتے ہیں نہیں۔ اور پیروی کرنے لگے اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیطان سلیمان (علیہ السلام) کے عہد حکومت میں حالانکہ سلیمان (علیہ السلام) نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو۔نیز وہ بھی جو اتارا گیا دو فرشتوں پر (شہر) بابل میں (جن کے نام) ہاروت اور ماروت تھے اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں (ان پر عمل کرکے) کفر مت کرنا۔(اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں سے وہ منتر جس سے جدائی ڈالتے تھے خاوند اور اس کی بیوی میں اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے ہیں وہ چیز جو ضرر رساں ہے ان کے لیے نہیں نفع پہنچا سکتی انہیں۔اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لیے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں اور بہت بری ہے وہ چیز جو بیچا ہے انہوں نے جسکے عوض اپنی جانوں (کی فلاح) کو کاش! وہ کچھ جانتے۔اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیز گار بنتے تو (اس کا) ثواب اللہ کے ہاں بہت اچھا ہوتا

کاش! وہ کچھ جانتے‘‘۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ ابوجعفر بن جریر لکھتے ہیں ’’یعنی اے محمد (ﷺ) ہم نے آپ کو واضح نشانیاں عطا فرمائی ہیں جو آپ کی نبوت کی قطعی دلیل ہیں۔ یہ نشانیاں وہ ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے یعنی یہود کے مخفی علوم، ان کے پوشیدہ اسرار، بنی اسرائیل کے اوائل کے حالات، ان کی کتابوں میں موجود علوم کی خبر جنہیں صرف ان کے علماء اور احبار ہی جانتے تھے، اور ان کے اوائل و اواخر نے تورات کے احکام میں جو تحریف و تغیر و تبدل کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب محمد ﷺ پر اتاری جانے والی کتاب میں ان تمام امور کی وضاحت کر دی ہے۔ یہ واضح نشانیاں اس شخص کے لئے ہیں جو اپنے آپ سے زیادتی نہ کرے اور انصاف سے کام لے اس کا حسد اور سرکشی اسے ہلاکت کی طرف نہ لے جائے۔ کیونکہ فطرت سلیمہ کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی دعوت جیسی دعوت کی تصدیق کرے۔ کیونکہ انہوں نے اسے نہ تو کسی بشر سے سیکھا ہے۔ اور نہ کس آدمی سے حاصل کیا ہے۔ ضحاک، ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں۔’’ آپ ہر وقت ان پر کتاب کی تلاوت فرماتے ہیں حالانکہ آپ امی ہیں آپ ﷺ نے کوئی کتاب نہیں پڑھی پھر ان کے پوشیدہ معاملات سے انہیں آگاہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کے لئے عبرت اور وضاحت ہے اور یہ بات ان پر حجت ہے اگر وہ سمجھیں تو۔ محمد بن اسحٰق نے عکرمہ یا سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ابن صوریا قطوینی رسول اللہ ﷺ سے کہنے لگا: اے محمد! آپ کوئی ایسی چیز نہیں لائے جسے ہم پہچان لیں۔ اللہ نے آپ پر کوئی واضح نشانی بھی نازل نہیں فرمائی کہ ہم اس کی اتباع کریں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے ذکر فرمایا جو میثاق ان سے لیا گیا تھا اور حضرت محمد ﷺ کے بارے میں جو عہد ان سے لیا گیا تھا۔ یہ سن کر مالک بن صیف کہنے لگا: اللہ کی قسم محمد (ﷺ) کے بارے میں کوئی عہد نہیں لیا گیا اور نہ ہی ہم سے کوئی میثاق لیا گیا ہے۔ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: اَوَکُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ۔ قولہ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ حسن بصری اس کے تحت فرماتے ہیں ہاں زمین میں کوئی ایسا عہد نہیں جو انہوں نے کیا ہو مگر انہوں نے اسے توڑ دیا۔ وہ آج وعدہ کرتے ہیں اور کل توڑ دیتے ہیں۔ سدی کا قول ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات پر ایمان نہیں رکھتے۔ قتادہ کا قول ہے نبذہ، کا معنی توڑ دینا ہے۔ ابن جریر کا قول ہے نبذ کا لفظ دراصل ڈالنے اور پھینک دینے کے لئے ہے۔ اسی وجہ سے لقیط (گرا پڑا بچہ) کو ’’منبوذ‘‘ کہتے ہیں۔ اسی سے نبیذ ہے جو کھجور یا انگور سے بنتی ہے جب انہیں پانی میں بھگو دیا جائے۔ ابوالاسود دولی کا قول ہے۔

نَظَرْتُ اِلٰی عُنْوَانِهٖ فَنَبَذْتُهٗ کَنَبْذِكَ نَعْلًا اَخْلَقَتْ مِنْ نِعَالِكَا

’’ترجمہ: میں نے خط کے ایڈریس کی طرف دیکھا۔ پھر اسے اس طرح پھینک دیا جس طرح پرانا جوتا اتار پھینکا جاتا ہے۔ (میں کہتا ہوں) اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی مذمت فرمائی۔ کیونکہ انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا جسے مضبوطی سے پکڑنے اور اس کا حق ادا کرنے کا اللہ نے حکم دیا تھا۔ اسی لیے اس کے پیچھے رسول کریم کی تکذیب کا ذکر کیا جو ان کی طرف اور دیگر تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ جن کی تمام علامات و صفات ان کی کتب میں موجود ہیں اور جن کی اتباع اور نصرت کا انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا ہے: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ..... (اعراف: 157)’’ یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں‘‘ اور یہاں فرمایا: وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ..... یعنی ان میں سے ایک فریق نے اس کتاب کو پس پشت ڈال دیا جو ان پر اتاری گئی تھی اور جس میں حضرت محمد ﷺ کی بشارت دی گئی تھی۔ انہوں نے اسے اس طرح چھوڑ دیا جیسے وہ اس کی تعلیمات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور

جادو کی تعلیم کی طرف لپک پڑے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ فریب کرنا چاہا اور کنگھی، کنگھی سے جھڑنے والے بالوں کو نر کھجور کے شگوفے کے غلاف میں رکھ کر جادو کیا گیا اور اسے بئر اروان میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا گیا۔ یہ ساری کاروائی ایک (بدبخت) شخص لبید بن اعصم لَعَنَهُ اللّٰهُ وَقَبَّحَهُ نے کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس کی خبر کردی۔ اور اس سے شفاء عطا فرمائی۔ جس طرح کہ یہ سارا واقعہ بالتفصیل صحیحین میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے مذکور ہے۔ (اس کا بیان آگے آئے گا)۔ سدی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں جب حضرت محمد ﷺ تشریف لائے تو تورات کا آپ سے موازنہ کرنے اور اس کے ساتھ آپ ﷺ سے مناظرہ کرنے لگے۔ جب تورات اور قرآن آپس میں متفق ہو گئے تو تورات کو چھوڑ کر آصف (1) کی کتاب اور ہاروت ماروت کا جادو لے آئے۔ یہ قرآن کے موافق نہ تھا۔ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جانتے تو تھے لیکن انہوں نے اپنے علم کو چھوڑ دیا اور اسے چھپالیا۔ اور اس کا انکار کر دیا۔ عوفی نے ابن عباس کا قول اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ...... جب حضرت سلیمان کی بادشاہت ختم ہوگئی تو جن وانس کی کچھ جماعتیں مرتد ہو گئیں اور شہوت پرستی میں پڑ گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی حکومت واپس انہیں عطا فرمائی اور لوگ پہلے کی طرح توحید کے قائل ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس دوران انتقال ہو گیا۔ تو جنات اور انسانوں نے وہ کتابیں نکال لیں کہنے لگے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے جو حضرت سلیمان پر اتاری گئی تھی۔ لیکن آپ علیہ السلام نے اسے ہم سے پوشیدہ رکھا۔ لوگوں نے یہ کتاب لے کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ...... الخ۔ اور ان چیزوں کی پیروی کرنا شروع کر دی جن کی شیاطین تلاوت کرتے تھے۔ یہ گانے بجانے، کھیل کود کے آلات اور ہر وہ چیز تھی جو ذکر الٰہی سے دور کر دے۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت سے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آصف حضرت سلیمان علیہ السلام کے سیکرٹری تھے۔ وہ اسم اعظم جانتے تھے۔ حضرت سلمان علیہ السلام کے حکم سے ہر چیز کو لکھتے تھے اور اسے آپ کی کرسی کے نیچے دفن کر دیتے تھے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو اسے شیاطین نے نکال لیا اور ہر دو سطروں کے مابین کفر اور جادو لکھ دیا۔ اور یہ مشہور کر دیا حضرت سلیمان علیہ السلام اس پر عمل پیرا تھے۔ چنانچہ جہلاء نے آپ کی طرف کفر کی نسبت کرنا شروع کر دی اور آپ کو برا بھلا کہنے لگے۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ابن جریر نے سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام جب بیت الخلاء یا ازواج مطہرات کے پاس جانا چاہتے تو اپنی انگوٹھی جرادہ کو دے جاتے۔ یہ آپ کی زوجہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب آپ کی آزمائش کا ارادہ کیا تو ایک دن ایسا ہوا کہ آپ اپنی انگوٹھی جرادہ کو دے کر گئے۔ شیطان آپ کی شکل میں آیا اور انگوٹھی طلب کی۔ اسے لے کر پہن لیا۔ تمام شیاطین جن وانس انگوٹھی پہنتے ہی اس کے تابع ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب تشریف لائے اور انگوٹھی مانگی۔ تو وہ کہنے لگیں تو جھوٹا ہے تو سلیمان نہیں ہے۔ (فرماتے ہیں) سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ ان ایام کے دوران شیاطین نے کفر وسحر پر مشتمل کتب تالیف کیں۔ انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ پھر اسے نکال کر لوگوں کو سناتے اور کہتے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان کتب کے ساتھ لوگوں پر غالب آیا کرتے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے برأت کا اظہار کرنا شروع کیا اور آپ کو کافر ٹھہرانے لگے (معاذ اللہ) تا آنکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اور یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا پھر ابن جریر عمران بن حرث کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا۔ آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ وہ کہنے لگا عراق سے۔ پوچھا کس شہر سے؟

1۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کاتب

وہ کہنے لگا کوفہ سے۔ فرمایا وہاں کے کیا حالات ہیں؟ وہ کہنے لگا میں نے انہیں اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ یہ بات چیت کرتے تھے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) دوبارہ آنے والے ہیں۔ یہ سن کر آپ کانپ اٹھے۔ اور فرمایا تم کیا کہہ رہے ہو تمہارا باپ نہ ہو؟ اگر ہمیں یہ خیال ہوتا تو ہم آپ کی ازواج سے نکاح نہ کرتے۔ اور میراث تقسیم نہ کرتے۔ میں عنقریب تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گا شیاطین تھے جو چوری چھپے آسمان کے پاس جا کر کان لگا کر سنتے ان میں سے کوئی سچی بات لے کر آتا جو اس نے سنی تھی تو اس ایک سچ کے ساتھ ستر جھوٹ ملا دیتا۔ لوگ ان سب باتوں کا یقین کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس راز سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو آگاہ فرما دیا۔ آپ نے انہیں کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ جب آپ کا وصال ہو گیا تو شیطان راستے میں کھڑا ہو کر لوگوں سے کہنے لگا کیا میں تمہیں اس کے مخفی خزانے کے بارے میں نہ بتاؤں جس کی نظیر نہیں؟ اس کرسی کے نیچے۔ انہوں نے اسے نکال لیا۔ وہ کہنے لگا یہ جادو ہے۔ یہی میراث ان میں منتقل ہوتی رہی۔ یہ اسی کی بقایاجات ہیں جن کے بارے میں اہل عراق باتیں کرتے ہیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حاکم نے مستدرک میں جریر سے یہی نقل کیا ہے۔ سدی آیت وَاتَّبَعُوْا ...... کی تفسیر میں فرماتے ہیں ملک سلیمان سے مراد ان کا عہد حکومت ہے۔ فرماتے ہیں شیاطین آسمان کی طرف چڑھ جاتے وہاں بیٹھ کر فرشتوں کی باتیں سنتے کہ زمین میں کس کی موت واقع ہوگی یا امور غیبیہ کے بارے میں وغیرہ پھر کاہنوں کے پاس آکر انہیں بتا دیتے کاہن وہی باتیں لوگوں کو بتاتے۔ وہ واقعہ اسی طرح رو پذیر ہو جاتا۔ جب کاہنوں کو ان پر یقین آ گیا تو انہوں نے جھوٹ بولا اور کچھ باتیں اپنی طرف سے شامل کر دیں۔ ہر کلمے کے ساتھ ستر کلمے جھوٹ ملا دیا۔ لوگوں نے یہ باتیں کتابوں میں لکھ لیں۔ اور بنو اسرائیل میں بات پھیل گئی کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہ تمام کتب صندوق میں رکھ کر تخت کے نیچے دفن کر دیں شیاطین میں سے جو بھی اس کے قریب جاتا جل جاتا۔ آپ علیہ السلام نے فرمان جاری کیا کہ آج کے بعد جس شخص نے یہ کہا جن غیب جانتے ہیں میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ جب آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ کے حالات جاننے والے علماء بھی نہ رہے۔ ناقدر شناس لوگ ان کے جانشین بنے۔ تو شیطان انسانی شکل میں بنو اسرائیل کے ایک گروہ کے پاس آیا اور کہا کیا میں تمہیں ایسے خزانے کے بارے میں نہ بتاؤں جسے تم کبھی ختم نہیں کر سکو گے؟۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا تخت کے نیچے کی جگہ کھودو۔ وہ ان کے ساتھ گیا اور تخت (کرسی) کی جگہ کی نشاندہی کی اور خود ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا قریب آؤ وہ کہنے لگا نہیں تم کھودو میں یہاں موجود ہوں اگر تمہیں نہ ملے تو میری گردن اڑا دینا۔ انہوں نے کھودا تو یہ کتب مل گئیں۔ جب انہوں نے انہیں نکال لیا تو یہ شیطان کہنے لگا یہ وہ جادو ہے جس کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام جنات اور انسانوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ یہ کہا اور غائب ہو گیا۔ لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے۔ بنو اسرائیل نے یہی کتب محفوظ رکھیں حتیٰ کہ حضور نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے۔ تو انہوں نے آپ سے مباحثہ کیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ ربیع بن انس کا قول ہے کہ یہود ایک عرصہ تک حضرت محمد ﷺ سے تورات کے امور کی بابت پوچھتے رہے۔ ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ ان کے سوال کا جواب قرآنی سورت میں نازل فرما دیتا اور ان پر حجت تمام ہو جاتی۔ جب انہوں نے یہ دیکھا تو کہنے لگے یہ ہماری نسبت بڑے عالم ہیں۔ انہوں نے جادو کے بارے میں سوال کیا اور آپ ﷺ سے جھگڑا کیا تو آیت نازل ہوئی: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا ...... شیاطین کتاب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں جادو، کہانت وغیرہ شامل کر کے اسے حضرت سلیمان کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا اور کہا آپ علیہ السلام غیب نہیں جانتے تھے۔ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو انہوں نے یہ جادو نکال لیا اور لوگوں کو دھوکہ دینے لگے اور کہنے لگے یہ علم حضرت سلیمان علیہ السلام چھپائے رکھتے تھے۔ لوگ آپ سے حسد کرنے لگے۔ نبی ﷺ نے انہیں اس بات سے آگاہ فرما دیا۔ جب وہ واپس پلٹے تو ان کی دلیل ختم ہو چکی تھی۔ مجاہد لکھتے ہیں کہ شیاطین وحی سنا کرتے جب وہ

کوئی کلمہ سن لیتے تو اس کے ساتھ دو سو باتوں کا اضافہ کر دیتے۔ سلیمان کو ان کی کتابیں بھیج دی گئیں۔ جب آپ کا وصال ہوا تو شیاطین نے یہ کتب لے لیں اور لوگوں کو یہ جادو سکھایا۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ سلیمان علیہ السلام شیاطین کے ہاتھوں سے جادو لے لیا کرتے اسے اپنے خزانہ میں کرسی کے نیچے دفن کر دیتے۔ شیاطین اس کے قریب نہ جا سکتے وہ انسانوں کے پاس گئے اور انہیں کہا کیا تمہیں پتہ ہے کہ کس علم کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام شیاطین اور ہواؤں وغیرہ کو مسخر کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ وہ کہنے لگے یہ اس کے بیت المال میں کرسی کے نیچے ہے۔ انہوں نے انسانوں کو ابھارا جنہوں نے اسے نکال لیا اور اس پر عمل کیا۔ اہل حجاز کہنے لگے سلیمان علیہ السلام اس پر عمل پیرا تھے اور یہ تو جادو ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی محمد ﷺ پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت کے لئے یہ آیت نازل فرمائی: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ...... محمد بن اسحٰق کا قول ہے کہ شیاطین کو جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کی وفات کا علم ہوا تو انہوں نے جادو کی اصناف تحریر کیں کہ جو اس مقام تک پہنچنا چاہتا ہے وہ یہ یہ کام کرے۔ اسے ایک کتاب کی شکل دے کر نقش سلیمان کی مہر لگا کر بند کر دیا اس کے عنوان پر لکھا کہ یہ آصف بن برخیا، جو کہ حضرت سلیمان کے دوست تھے، کا علمی خزانہ ہے۔ پھر اسے کرسی کے نیچے دفن کر دیا اسے بعد از اں بنو اسرائیل نے نکالا۔ اور کہنے لگے بخدا! حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملک اسی کے سہارے قائم تھا۔ انہوں نے ہر طرف جادو پھیلا دیا۔ اسے سیکھا اور لوگوں کو سکھایا۔ یہود **لعنهم الله** سے زیادہ یہ کسی قوم میں نہیں ہے جب رسول اللہ ﷺ نے قرآنی آیات سنائیں جو حضرت سلیمان بن داؤد کے بارے میں تھیں اور انہیں مرسلین میں شمار کیا تو مدینے کے یہودی کہنے لگے کیا تمہیں تعجب نہیں ہے کہ محمد (ﷺ) کا خیال ہے کہ ابن داؤد نبی تھے۔ اللہ کی قسم وہ تو صرف ایک جادوگر تھے۔ ابن جریر نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی سلب ہوگئی۔ شیاطین آپ کی عدم موجودگی میں جادو لکھتے مثلاً جو شخص کسی کے پاس جانا چاہے تو سورج کی طرف منہ کر کے اس طرح کہے۔ اور جو یہ کام کرنا چاہے سورج کی طرف پیٹھ کر کے اس طرح کے کلمات کہے۔ انہوں نے یہ سب باتیں لکھ کر اس کے سرورق پر لکھ دیا کہ یہ علمی خزانہ ہے جسے آصف بن برخیا نے شہنشاہ سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے لئے لکھا ہے۔ پھر اسے آپ کی کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ جب سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہوا تو ابلیس، اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ لوگوں میں خطبہ دینے کے لئے کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے لوگو! حضرت سلیمان نبی نہ تھے وہ تو جادوگر تھے۔ ان کا جادو ان کے گھروں اور اثاثے میں تلاش کرو۔ پھر اس جگہ کی طرف ان کی راہنمائی کی جہاں یہ مدفون تھا۔ انہوں نے کہا اللہ کی قسم سلیمان تو جادوگر تھے۔ یہ آپ کا جادو ہے اسی کے ساتھ ہمیں اپنا غلام اور محکوم بنائے رکھا۔ مومنین کا کہنا تھا نہیں بلکہ وہ تو مومن نبی تھے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ ﷺ نے سلیمان بن داؤد کا ذکر کیا تو یہود کہنے لگے محمد کی طرف دیکھو۔ حق کو باطل سے ملا رہے ہیں سلیمان کا ذکر انبیاء کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ تو جادوگر تھے جادو کے زور سے ہوا پر سواری کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ...... ابن جریر نے ابومجلز سے روایت کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے ہر چوپائے سے عہد لیا تھا۔ جب وہ کسی آدمی کے درپے آزار ہوتے تو انہیں وہ عہد یاد دلایا جاتا۔ وہ ایک طرف ہٹ جاتے۔ لوگوں نے اپنی طرف سے سجع اور جادو کا اضافہ کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس پر عمل کرتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ابن ابی حاتم، حسن سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک تہائی شعر، تہائی جادو اور ایک تہائی کہانت کا مطالعہ کرتے تھے۔ پھر یہود نے عہد سلیمانی میں ان شیطانوں کی پیروی کرنا شروع کی۔ جادو اس سے پہلے بھی کرۂ ارض میں موجود تھا۔ لیکن حضرت سلیمان کے عہد میں اس کی اتباع کی گئی۔ یہ تھا اس موضوع پر ائمہ سلف کے اقوال کا خلاصہ۔ اس سے اس واقعے کا خلاصہ ذہن میں آ جاتا ہے۔ صاحب

عقل وذکاء کے لئے ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں۔ واللہ الہادی۔ قولہ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ یہود جنہیں کتاب دی گئی تھی نے اپنی کتاب سے روگردانی کرنے اور رسول خدا حضرت محمد ﷺ کی مخالفت کے بعد اس چیز کی اتباع شروع کر دی جسے شیاطین بیان کرتے ہیں اور جو کچھ حضرت سلیمان کے عہد کے بارے میں وہ ذکر کرتے ہیں۔ علٰی کا صلہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ذکر کیا کہ تتلو تکذب کو متضمن ہے۔ ابن جریر کا قول ہے کہ علٰی یہاں فی کے معنی میں ہے۔ ابن جریج اور ابن اسحٰق سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔ (میں کہتا ہوں) تکذب کے معنی کا متضمن ہونا ہی زیادہ احسن اور اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔ اور حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول کہ جادو حضرت سلیمان بن داؤد کے زمانے سے پہلے بھی موجود تھا۔ بلاشبہ صحیح ہے کیونکہ جادوگر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی موجود تھے اور حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کا زمانہ تو اس کے بعد کا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى..... (بقرہ:246) ''کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا'' پھر اس کے بعد اس واقعہ کا ذکر فرمایا جس میں ہے کہ داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا تو اللہ نے انہیں بادشاہی اور حکمت عطا فرمائی۔ قوم صالح نے جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے قبل تھی اپنے نبی حضرت صالح علیہ السلام سے کہا: قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ (شعراء:153) ''تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے''۔ ''مُسَحَّرِيْنَ اَيِ الْمَسْحُوْرِيْنَ'' علی المشہور۔ قولہ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ...... علماء کا اس مقام پر اختلاف ہے بعض کے نزدیک ''ما'' نافیہ ہے۔ یعنی وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ میں۔ قرطبی کا قول ہے کہ یہ ما نافیہ ہے اور وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ پر اس کا عطف ہے۔ پھر فرمایا کہ کفر در حقیقت ان شیاطین نے کیا تھا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ کیونکہ یہود کا خیال تھا کہ جادو کی تعلیمات جبریل و میکائیل لے کر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلاتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی۔ (ہاروت ماروت) یہ شیاطین سے بدل ہے کیونکہ جمع کا اطلاق بعض اوقات تثنیہ پر بھی ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ (نساء:11) یا ان کے پیروکاروں کو بھی ساتھ شامل کر دیا گیا ہے یا شیاطین میں سے ان دونوں کی سرکشی کی وجہ سے بالخصوص ان کا ذکر فرمایا۔ اس صورت میں تقدیر کلام یوں ہوگی: يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ہاروت ماروت فرشتے لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔ پھر قرطبی لکھتے ہیں کہ اس پر آیت کو محمول کرنا زیادہ اولیٰ اور صحیح ترین ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور قول کی طرف التفات نہیں کرنا چاہئے۔ ابن جریر نے اپنی اسناد سے بروایت عوفی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (اللہ تعالیٰ نے جادو نازل نہیں فرمایا) اور ربیع بن انس سے روایت کیا ہے (اللہ تعالیٰ نے ان پر جادو نازل نہیں فرمایا) اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں بنے گا (اور پیروی کرنے لگے اس (جادو) کی جو پڑھا کرتے تھے شیاطین (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) کے عہد حکومت میں۔ اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے کفر نہیں کیا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں پر جادو اتارا۔ لیکن یہ شیاطین ہی تھے جنہوں نے کفر کیا۔ ہاروت ماروت لوگوں کو (شہر) بابل میں جادو سکھایا کرتے تھے۔ اس صورت میں بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ اگرچہ الفاظ میں موخر ہے لیکن معنی کے اعتبار سے اس کا تعلق ماقبل سے ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس تقدیم کی وجہ کیا ہے اسے کہا جائے گا اس کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ انہوں نے سلیمان (علیہ السلام) کے عہد میں اس جادو کی پیروی کی جو شیطان ان پر پڑھا کرتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں پر جادو اتارا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا۔ وہ لوگوں کو (شہر) بابل میں جادو سکھاتے تھے (جن کے نام) ہاروت ماروت تھے۔ اس صورت میں ''ملکین'' کے لفظ سے مراد جبریل اور میکائیل علیہ السلام ہوں گے۔ کیونکہ یہود کے جادوگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام کی زبان سے حضرت سلیمان بن داؤد

علیہ السلام پر جادو نازل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو جھٹلاتے ہوئے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو یہ خبر دی کہ جبریل اور میکائیل علیہ السلام جادو لے کر نہیں اترے تھے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو تہمت شرک سے مبرا قرار دے دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ جادو تو شیاطین کا عمل تھا وہی بابل میں لوگوں کو سکھاتے تھے ان کو سکھانے والے دو آدمی تھے ایک کا نام ہاروت اور دوسرے کا ماروت تھا...... یہ ان کے الفاظ ہیں۔

ابن ابی حاتم نے عطیہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اللہ نے جبریل و میکائیل پر جادو نہیں اتارا۔ ابن ابی حاتم اپنی سند سے نقل کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابزی اس طرح پڑھتے تھے: وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلِكَيْنِ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ یعنی دو بادشاہوں داؤد اور سلیمان پر جادو نہیں اتارا گیا۔ ابوالعالیہ کا قول ہے ان پر جادو نہیں اترا۔ وہ لکھتے ہیں وہ ایمان کی تعلیم دیتے تھے نہ کہ کفر کی۔ اور جادو کفر ہے وہ بڑی سختی سے اس سے منع کرتے تھے (بروایت ابن ابی حاتم) پھر ابن جریر اس قول کی تردید شروع کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "ما" یہاں بمعنی الذی ہے اور اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے تھے جنہیں اللہ نے زمین پر اتارا اور انہیں جادو کی تعلیم دینے کی اجازت دی۔ اس سے بندوں کی آزمائش اور امتحان مقصود تھا۔ اس کے بعد کہ اپنے بندوں کو صاف طور پر یہ بتا دیا کہ انبیاء اس سے منع کرتے رہے ہیں۔ اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہاروت و ماروت تو جادو کی تعلیم دینے میں امر الٰہی کے پابند تھے انہوں نے تو اللہ کے حکم کی بجا آوری کی۔ لیکن ان کا یہ مسلک بہت غریب ہے اور اس سے بھی غریب ترین وہ قول ہے کہ ھارت و ماروت جنوں کے دو قبیلے ہیں۔ جیسا کہ ابن حزم نے گمان کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنی اسناد سے ضحاک بن مزاحم کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلِكَيْنِ فرماتے تھے وہ اہل بابل کے معالج تھے۔ اس قول کے قائلین نے یہ توجیہ کی ہے کہ انزال یہاں خلق کے معنی میں ہے نہ کہ "ایحاء" کے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلِكَيْنِ اور ایک اور جگہ فرمایا: وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ "اور پیدا کیے تمہارے لیے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے" (زمر:6) اور فرمایا: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (حدید:25) "اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے" اور فرمایا: وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (مومن:13) "اور نازل فرماتا ہے تمہارے لیے آسمان سے رزق" ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے کوئی بیماری نہیں اتاری مگر ساتھ ہی اس کی دوا بھی نازل فرمائی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے اللہ نے خیر و شر کو نازل فرمایا۔ قرطبی نے ابن عباس، ابن ابزی اور حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ملکین کو لام کے زیر سے پڑھا ہے۔ ابن ابزی کا قول ہے کہ یہ دونوں داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام ہیں۔ قرطبی لکھتے ہیں اس صورت میں ما نافیہ ہوگا۔ بعض علماء نے يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ پر وقف کیا ہے اور ما نافیہ ہے۔ ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے قاسم بن محمد سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو انہیں نے فرمایا: وہ دو آدمی تھے جو لوگوں کو وہ سکھاتے تھے جو ان پر اتارا گیا تھا۔ اور وہ بھی سکھاتے تھے جو ان پر نہیں اتارا گیا۔ تو قاسم کہنے لگے مجھے کوئی پرواہ نہیں وہ ان دونوں میں سے کوئی صورت بھی ہو پھر ایک دوسری سند سے قاسم بن محمد کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کے بارے میں فرمایا مجھے کوئی پرواہ نہیں یہ جو صورت بھی تھی میرا اس پر ایمان ہے۔ بہت سے علماء سلف کا قول ہے کہ یہ دو آسمانی فرشتے تھے جنہیں زمین پر بھیجا گیا۔ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی ہے جسے ہم ان شاء اللہ بیان کریں گے۔ اس کے راوی امام احمد بن حنبل ہیں۔ اس صورت میں اس واقعہ اور فرشتوں کے معصوم ہونے کے بارے میں دلائل کے درمیان تطبیق یوں ہوگی کہ اللہ کے علم میں یہ بات پہلے سے موجود تھی کہ وہ ایسا کریں گے۔ اس طرح یہ ان کی تخصیص ہے اس لیے کوئی تعارض باقی نہ رہا۔ جس طرح اللہ کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ابلیس لعین ایسا کرے گا۔ اور یہ قول کہ وہ فرشتوں میں سے تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ...... (بقرہ:34) وغیرہ آیات جو اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ لیکن ہاروت ماروت کا معاملہ ابلیس کی

نسبت کم تر ہے۔ قرطبی نے علی، ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر، کعب احبار سدی، کلبی سے یہی نقل کیا ہے۔ مذکورہ بالا موضوع کی تائید میں حدیث مبارکہ کی سند، مرفوع ہونا اور اس پر بحث کا بیان۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو فرشتوں نے عرض کی اے رب قدوس! کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لیے۔ فرمایا بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' (بقرہ:30) انہوں نے عرض کی اے رب ہم بنو آدم کی نسبت تیرے زیادہ اطاعت گذار ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کر کے لاؤ۔ جنہیں ہم زمین پر اتاریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ھاروت و ماروت کو پیش کیا۔ انہیں زمین پر اتارا گیا ایک زہرہ نامی حسین وجمیل عورت ان کے لئے پیدا کی گئی۔ وہ ان کے پاس آئی انہوں نے اس سے خواہش نفس پورا کرنے کی رغبت ظاہر کی۔ وہ کہنے لگی بخدا ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تم یہ شرک آمیز کلمات نہ کہو۔ وہ کہنے لگے اللہ کی قسم ہم خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرا سکتے۔ وہ چلی گئی اور ایک بچے کو اٹھا کر لے آئی انہوں نے دوبارہ اپنی رغبت ظاہر کی۔ وہ کہنے لگے جب تک تم اسے بچے کو قتل نہیں کرو گے تمہارا مطالبہ پورا نہیں ہوگا۔ وہ دونوں کہنے لگے بخدا ہم اسے کبھی قتل نہیں کریں گے۔ وہ چلی گئی اور شراب کا ایک پیالہ لے کر آئی۔ انہوں نے پھر اپنی خواہش کو پورا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کہنے لگی یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تم یہ شراب نہ پیو۔ انہوں نے شراب پی۔ انہیں نشہ آ گیا۔ انہوں نے اس سے زنا کیا اور بچے کو بھی قتل کر دیا۔ جب انہیں ہوش آیا تو عورت نے انہیں بتایا کہ تم نے ان سب گناہوں کا ارتکاب کر لیا ہے جن سے تم ڈرتے تھے۔ انہیں دنیا اور آخرت کے عذاب میں اختیار دیا گیا تو انہوں نے دنیا کے عذاب کو پسند کر لیا(1)۔ ابو حاتم ابن حبان نے اپنی تفسیر میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ لیکن اس سند سے یہ حدیث غریب ہے۔ اس کے سارے راوی ثقہ اور صحیحین کے راویوں میں سے ہیں۔ ماسوائے موسیٰ بن جبیر کے یہ انصاری سلمی مدینی الحذاء ان کے مولی ہیں۔ انہوں نے ابن عباس، ابو امامہ بن سہل بن حنیف، نافع عبداللہ بن کعب بن مالک سے روایت کیا ہے۔ پھر ان سے ان کے فرزند عبد السلام، بکر بن مضر، زہیر بن محمد، سعید بن سلمہ، عبداللہ بن لہیعہ، عمرو بن حرث اور یحییٰ بن ایوب نے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے ان سے روایات لی ہیں ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ یہ مستور الحال ہیں۔ یہ روایت صرف انہوں نے ہی نافع مولی ابن کی سند سے مرفوعاً ذکر کی ہے۔ اس کے متابع ایک اور روایت سے بھی حضرت نافع سے مروی ہے جیسا کہ ابن مردویہ نے اپنی سند سے یہ طویل حدیث ذکر کی ہے۔ ابو جعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند سے حضرت نافع سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ہمراہ سفر میں تھا جب رات کا آخری وقت تھا مجھے فرمایا اے نافع دیکھو کیا زہرہ ستارہ طلوع ہوا ہے؟ میں نے دو یا تین مرتبہ نفی میں جواب دیا۔ پھر میں نے عرض کی اب وہ ستارہ طلوع ہو چکا ہے فرمایا اسے نہ خوشی ہو نہ بھلائی ملے میں نے عرض کی کمال ہے یہ تو صرف ایک ستارہ ہے۔ جو حکم الٰہی کے تابع ہے۔ فرمایا میں نے تمہیں صرف وہی کہا ہے جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ یا فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ بے شک فرشتوں نے عرض کی اے رب تعالیٰ بنو آدم کے گناہوں پر یہ صبر کیوں؟ فرمایا میں نے انہیں مبتلا کیا ہے اور تمہیں عافیت دی ہے۔ وہ کہنے لگے اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو تیری نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کر لو۔ انہوں نے خوب غور وفکر سے ہاروت و ماروت کو منتخب کیا(2)۔ یہ دونوں روایتیں بھی غریب

1۔ مسند احمد 134/2 2۔ الخطیب فی تاریخہ 42/8

ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے حضرت کعب احبار سے روایت کیا ہو نہ کہ حضور نبی کریم ﷺ سے۔ جیسا کہ عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں کعب احبار سے روایت کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ فرشتوں نے بنو آدم کے اعمال اور گناہوں کا تذکرہ کیا۔ ان سے کہا گیا کہ اپنے میں سے کوئی دو فرشتوں کو منتخب کرلو انہوں نے ہاروت ماروت کو چنا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا میں بنو آدم کی طرف رسول بھیجتا ہوں لیکن میرے اور تمہارے درمیان کوئی رسول نہیں۔ زمین پر چلے جاؤ اور میرے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا، زنا مت کرنا اور شراب نہ پینا۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ جس دن انہیں اتارا گیا تھا۔ اس کی شام نہیں ڈھلی تھی کہ انہوں نے سب معاصی کا ارتکاب کرلیا جن سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ ابن جریر نے اسے دو سندوں سے عبدالرزاق سے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے اپنی سند سے سالم بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ کو کعب احبار سے یہ روایت بیان کرتے ہوئے سنا۔ روایت بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ سابقہ دونوں اسناد کی نسبت حضرت عبداللہ بن عمر تک یہی روایت زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے اپنے باپ سے روایت میں سالم، نافع کی نسبت زیادہ مستند ہیں۔ پس یہ روایت اس طرف گھومتی ہے کہ اسے کعب احبار نے اسرائیلیات سے نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس موضوع سے متعلقہ صحابہ وتابعین کے آثار کا بیان

ابن جریر نے اپنی سند سے عمیر بن سعید سے روایت کیا ہے۔ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ زہرہ ایک حسین وجمیل ایرانی عورت تھی۔ یہ دو فرشتوں سے لڑی۔ انہوں نے اسے بہلایا پھسلایا لیکن اس نے یہ شرط عائد کی کہ اسے وہ کلام سکھائیں جس کے ساتھ آسمان پر چڑھا جاتا ہے۔ انہوں نے اسے سکھایا تو وہ یہ کلام پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی اور تارے کی شکل بنادی گئی۔ اس سند کے رجال ثقہ ہیں لیکن یہ بہت غریب ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ دو آسمانی فرشتے تھے۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت علی سے مرفوعاً یہی روایت کیا ہے۔ اور یہ اس سند سے ثابت نہیں۔ پھر دو اور اسناد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ زہرہ پر لعنت فرمائے۔ اسی نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو فتنہ میں مبتلا کیا۔ یہ روایت بھی صحیح نہیں اور بہت ہی منکر ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن جریر نے بھی اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب بنو آدم نے گناہوں کی حد کردی تو فرشتوں، پہاڑوں اور زمین نے ان پر بددعا کی اے اللہ! انہیں مہلت نہ دے۔ تو اللہ نے فرشتوں کی طرف وحی کی میں نے تمہارے دلوں سے شہوت اور شیطان کو نکال دیا ہے۔ اور یہی دونوں چیزیں ان کے دلوں میں ودیعت کی گئی ہیں۔ اگر تم اتارے جاتے تو تم بھی یہی کرتے۔ فرماتے ہیں۔ فرشتوں نے آپس میں طے کیا کہ اگر وہ امتحان میں مبتلا کیے گئے تو گناہوں سے محفوظ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے میں سے بہترین فرشتوں کو پسند کرلو۔ انہوں نے ہاروت و ماروت کو پسند کیا۔ وہ زمین پر اتارے گئے۔ اہل فارس میں سے زہرہ نامی ایک عورت ان کے پاس بھیجی گئی جسے وہ اپنی زبان میں بیذخت کہتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں بھی گناہ میں گرفتار ہوگئے۔ فرشتے اس سے قبل صرف ایمان والوں کے لیے بخشش کی دعا مانگتے تھے۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (مومن:7) اب انہوں نے تمام اہل زمین کے لیے مغفرت کی دعا کرنا شروع کردی۔ (اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ)۔ چنانچہ ان دونوں کو دنیا و آخرت کے عذاب میں اختیار دیا گیا انہوں نے دنیوی عذاب کو ترجیح دی۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ ایک سفر کے دوران میں حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک رات انہوں

نے اپنے غلام سے فرمایا دیکھو کیا زہرہ ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ اسے خوش آمدید نہ ہو اور نہ ہی اہلاً وسہلاً۔ اللہ اسے زندہ نہ رکھے یہ دونوں فرشتوں کی ساتھی تھی۔ ملائکہ نے عرض کی بارالہا! تو بنو آدم کے گناہ گاروں کو کیوں چھوڑ دیتا ہے حالانکہ وہ خونریزی کرتے، عزتوں کو پامال کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے انہیں مبتلا کیا ہے اگر تم بھی ان جیسی آزمائش میں مبتلا ہو جاؤ تو اسی طرح کرو گے۔ وہ عرض کرنے لگے: نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے میں سے دو بہترین افراد کو منتخب کر لو۔ چنانچہ انہوں نے ہاروت وماروت کا انتخاب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا میں تمہیں زمین پر اتارنے والا ہوں اور تم سے یہ عہد لے رہا ہوں کہ شرک، زنا اور خیانت نہیں کرو گے۔ پھر زمین پر اتار دیئے گئے۔ اور زہرہ کو خوبصورت عورت کی شکل میں ان کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہ ان کے سامنے آئی تو وہ اسے بہلانے پھسلانے لگے۔ وہ کہنے لگی میں ایک ایسے دین کی پیروکار ہوں جس کا ماننے والا ہی میرے پاس آسکتا ہے۔ انہوں نے دریافت کیا تمہارا دین کیا ہے۔ اس نے بتایا مجوسیت۔ انہوں نے اس دین کو اختیار کرنے سے گریز کیا وہ کچھ عرصے کے بعد دوبارہ ان کے پاس آئی۔ انہوں نے اسے بہلایا پھسلایا تو وہ کہنے لگی مجھے تمہارا مطالبہ منظور ہے لیکن مجھے اپنے خاوند کے سامنے فضیحت کا خوف ہے۔ تم میرے دین پر آجاؤ اور مجھے آسمان پر لے جانے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے ساتھ ہوں انہوں نے اس کے دین کا اقرار کیا اور اس سے شاد کام ہونے کے بعد آسمان کی طرف چلے تو وہ ان سے اچک لی گئی۔ اور ان کے پر کٹ گئے۔ وہ خوفزدہ اور عرق ندامت سے شرابور زمین پر آرہے اور رونے لگے۔ کرۂ زمین پر اس وقت ایک نبی تھا وہ ہر دو جمعہ کے درمیان دعا مانگتا تو اسے قبولیت سے سرفراز کیا جاتا۔ وہ دعا توبہ و دعا کے لیے اس نبی کے پاس گئے۔ نبی فرمانے لگے اللہ تم پر رحم فرمائے اہل زمین اہل آسمان کے لیے مغفرت کیسے مانگ سکتے ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا تو فرمایا جمعہ کو میرے پاس آنا وہ اگلے جمعہ آئے تو فرمایا تمہاری درخواست منظور نہیں ہوئی۔ اگلے جمعے پھر آنا۔ وہ آئے تو فرمایا تمہیں اختیار دیا گیا ہے دو چیزوں سے ایک چیز منتخب کر لو۔ دنیا میں معافی اور آخرت کا عذاب یا دنیا کا عذاب اور آخرت میں جو اللہ کا فیصلہ ہو۔ ایک کہنے لگا ابھی دنیا کی عمر کافی طویل ہے۔ دوسرا کہنے لگا تیرا برا ہو میں نے پہلے تمہاری بات مانی تھی اب تم میری بات سنو فانی عذاب دائمی عذاب کی طرح نہیں ہو سکتا۔ پہلا کہنے لگا ہم قیامت کے دن اللہ کی مرضی کے تابع ہوں گے مجھے خدشہ ہے کہ وہ ہمیں سزا نہ دے۔ دوسرا کہنے لگا نہیں مجھے امید ہے اگر دنیا میں ہم نے عذاب کو اختیار کر لیا تو آخرت میں بچ جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے دنیا کے عذاب کو اختیار کر لیا تو انہیں لوہے کی نلکیوں میں لپیٹ کر آگ کے گڑھے میں ڈال دیا گیا۔ (اس کی سند حضرت عبداللہ بن عمر تک عمدہ ہے)۔ صحیح ابن حبان، سند احمد، ابن جریر، عبدالرزاق میں یہ روایت مختلف اسناد سے مروی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس واقعہ سے قبل فرشتے صرف ایمان والوں کی بخشش کی دعا مانگتے تھے اس کے بعد تمام اہل زمین کے لئے استغفار کرنے لگے۔ اور ان فرشتوں کی کوتاہی کو دیکھ کر انہیں یہ یقین ہو گیا کہ بنو آدم جو اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ پاتے خشیت کا جذبہ ان میں کم ہوتا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اسے تفصیلاً روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے دنیا کے عذاب کو پسند کر لیا۔ اب انہیں بابل میں یہ عذاب ہو رہا ہے۔ (ثُمَّ قَالَ: صَحِیْحُ الْاِسْنَادِ وَلَمْ یُخْرِجَاهُ)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ تین فرشتے تھے لیکن ایک نے اس آزمائش سے انکار کر دیا تو باقی دو رہ گئے۔ پھر ان دونوں فرشتوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا تھا۔ سدی نے لکھا ہے کہ ہاروت وماروت نے اہل زمین کے احکام پر اعتراض کیا تھا تو اللہ نے فرمایا میں نے بنو آدم میں دس خواہشات رکھی ہیں جن کے سبب وہ میری نافرمانی کرتے ہیں۔ وہ دونوں کہنے لگے اگر ہم میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے تو پھر بھی ہم عدل کریں گے۔ چنانچہ ان کی خواہش پوری کر دی گئی اور کہا گیا اب زمین پر اتر جاؤ اور انصاف سے کام لینا۔ وہ بابل میں اتر آئے۔ بابل سے مراد بابل دیناوند ہے۔ اس عورت کا نام عربی میں زہرہ، نبطی میں بیدخت اور فارسی

میں اناہید تھا۔ یہ اپنے خاوند کے خلاف مقدمہ لائی تھی۔ اس نے فرشتوں کی شرط پوری کرنے سے قبل ان سے یہ مطالبہ کیا کہ مجھے وہ دعا سکھاؤ جسے پڑھ کر تم آسمان پر چلے جاتے ہو اور پھر اتر آتے ہو۔ انہوں نے دعا سکھادی۔ وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی۔ اب اللہ نے اترنے کی دعا اسے بھلادی تو وہ اپنی جگہ رک گئی اور اسے ستارے کی شکل دے دی گئی۔ حضرت ابن عمر اسے جب بھی دیکھتے تو اس پر لعنت فرماتے۔ اور فرماتے کہ اس نے ہی ہاروت وماروت کو آزمائش میں مبتلا کیا۔ اب فرشتوں نے اوپر جانا چاہا تو نہ جاسکے وہ سمجھ گئے کہ اب ہلاکت قریب ہے۔ حضرت مجاہد کی روایت میں ہے کہ ابتداء میں تو فرشتے عدل وانصاف سے کام لیتے رہے۔ صبح سے شام تک فیصلے کرتے اور رات کو آسمان پر چلے جاتے۔ زہرہ ستارے کو ایک عورت کی صورت میں جب ان کے پاس بھیجا گیا تو وہ اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ یہ قصہ تابعین کی ایک جماعت مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، اور ابو العالیہ، زہری ربیع بن انس اور مقاتل بن حیان وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ متقدمین اور متاخرین میں سے بہت سے مفسرین نے اسے ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کا دارومدار زیادہ تر اسرائیلی روایات پر ہے کوئی صحیح مرفوع متصل الاسناد حدیث اس بارے میں ثابت نہیں ہے قرآن کریم میں بھی یہ قصہ شرح وبسط سے بیان کرنے کی بجائے اجمال سے کام لیا گیا ہے۔ ہمارا ایمان قرآن پر ہے۔ حقیقت حال کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ ابن جریر نے اس بارے میں ایک عجیب وغریب روایت نقل کی ہے" حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ دومۃ الجندل کی ایک عورت حضور ﷺ کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ کی تلاش میں آئی۔ اور آپ کو نہ پا کر پیٹنے لگی۔ مجھے ترس آیا میں نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگی میرا خاوند ایک عرصہ سے لاپتہ تھا۔ میں نے ایک بڑھیا سے عرض کیا تو وہ کہنے لگی جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔ وہ خود بخود تیرے پاس آجائے گا۔ جب رات ہوئی تو وہ میرے پاس دو سیاہ کتے لے کر آئی۔ ایک پر میں سوار ہوگئی اور دوسرے پر وہ۔ چلتے چلتے ہم بابل پہنچے۔ میں نے دیکھا کہ دو آدمی الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کیوں آئی ہو۔ میں نے کہا میں جادو سیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ کہنے لگے ہم ایک آزمائش ہیں تم کفر نہ کرو اور واپس چلی جاؤ۔ میں نے واپس آنے سے انکار کر دیا تو وہ کہنے لگے اس تنور میں پیشاب کر کے آؤ میں گئی لیکن مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور واپس آگئی۔ اور انہیں کہا میں نے آپ کے کہنے پر عمل کیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا تم نے کوئی چیز دیکھی؟۔ میں نے کہا نہیں۔ وہ کہنے لگے پھر تم نے کچھ نہیں کیا اب بھی واپس اپنے ملک چلی جاؤ اور کفر نہ کرو مجھے شک گزرا اور میں نے واپسی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا اچھا جاؤ اور اس تنور میں پیشاب کر کے آؤ۔ میں گئی تو مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی اور ڈر کی وجہ سے میں ایسے ہی واپس آگئی پھر اسی طرح سوال وجواب ہوا۔ آخر میں تیسری مرتبہ گئی اور تنور میں پیشاب کر دیا۔ تو میں نے دیکھا کہ ایک گھڑ سوار لوہے کا نقاب اوڑھے نکلا اور آسمان کی طرف چلا گیا۔ میں نے واپس آکر انہیں ساری بات بتائی تو وہ کہنے لگے ہاں اب تو سچ کہتی ہے۔ وہ تیرا ایمان تھا جو تم سے نکل گیا۔ اب چلی جاؤ۔ میں نے بڑھیا سے کہا میں سمجھی نہیں اور انہوں نے بھی مجھے کچھ نہیں سکھایا۔ اس نے کہا تم نے سب کچھ سیکھ لیا ہے اب جو چاہو گی ہو جائے گا۔ یہ گندم کا دانہ لے اور اسے زمین میں بو ڈالو۔ میں نے اسے بو کر کہا اگ جا اور وہ فوراً اگ گیا۔ میں نے کہا پک جا وہ فوراً پک گیا میں نے کہا علیحدہ علیحدہ ہو جا تو وہ دانہ دانہ ہوگیا۔ میں نے کہا آٹا بن جا تو وہ آٹا بن گیا۔ میں نے کہا روٹی پک جا تو روٹی پک گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ میں جو چاہتی ہوں وہ اسی طرح ہو جاتا ہے تو مجھے دولت ایمان کے چھن جانے کا صدمہ ہونے لگا۔ اے ام المومنین! خدا کی قسم نہ میں نے جادو کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔ (ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ) میں نے صحابہ کرام سے دریافت کیا۔ لیکن وہ بھی مجھے کچھ جواب نہ دے سکے۔ مگر ابن عباس (یا کسی دوسرے صحابی) نے کہا۔ کاش تیرے والدین یا ان میں سے ایک زندہ ہوتا۔ ہشام کا قول ہے کہ اگر وہ ہمارے پاس آتی تو ہم اسے ضمانت کا فتوی دیتے۔ صحابہ کرام اہل ورع تھے اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔ (اس کی سند حضرت عائشہ تک

عمدہ ہے)۔اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء نے کہا ہے کہ جادوگر اپنے جادو کے زور سے چیز کی حقیقت بدل دیتا ہے۔ بعض دیگر حضرات کی رائے ہے کہ صرف دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (اعراف:116) اور ایک دوسری جگہ فرمایا: يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ:66) اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بابل سے مراد بابل عراق ہے نہ کہ بابل دیناوند جیسے سدی وغیرہ کا قول ہے۔ اس کی تائید ابن ابی حاتم کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت علی ایک دفعہ بابل کے پاس سے گزر رہے تھے کہ مؤذن نے عرض کی عصر کا وقت ہوگیا ہے آپ چلتے رہے جب آگے گزر گئے تو مؤذن کو حکم فرمایا۔ اس نے اقامت کہی نماز سے فارغ ہو کر فرمایا میرے محبوب کریم ﷺ نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے اور بابل میں نماز ادا کرنے سے۔ اس جگہ لعنت برستی ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد میں بھی مروی ہے۔ ان کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے۔ کیونکہ انہوں نے اسے ذکر فرمایا ہے اور اس پر خاموش رہے ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ بابل کی سرزمین میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ دیار ثمود میں بلکہ ان کے گھروں میں داخل ہونے سے رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے مگر روتے ہوئے۔ ہیئت دانوں کا قول ہے کہ بابل جو کہ اقلیم عراق میں ہے طولاً بحر محیط غربی (اوقیانوس) سے متر درجے ہے اور عرضاً اس کے اور وسط زمین اور اس کے مابین جنوب کی طرف 32 درجے ہے اور خط استواء کے ساتھ ہے۔ واللہ اعلم۔ ابوجعفر رازی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی آدمی ان کے پاس جادو سیکھنے کی غرض سے آتا تو وہ اسے سختی سے منع کرتے۔ کیونکہ انہیں خیر و شر اور کفر و ایمان میں فرق معلوم ہو گیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ جادو کفر ہے۔ جب وہ شخص ان کی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا تو وہ کسی جگہ جانے کا حکم دیتے جہاں اس کی ملاقات شیطان سے ہوتی وہ اسے جادو سکھا دیتا۔ اس کے ساتھ ہی نور ایمان اس سے نکل جاتا اور وہ اسے آسمان کی طرف جاتے دیکھتا اور حسرت و یاس کا اظہار کرتا۔ حضرت قتادہ اور حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی کو خبردار کیے بغیر جادو نہیں سکھائیں گے۔ سدی کا قول ہے کہ جب کوئی شخص ان کے منع کرنے کے باوجود بھی باز نہ آتا تو وہ اسے حکم دیتے کہ اس راکھ میں پیشاب کرد۔ اس کے ساتھ ہی اس کے باطن سے نور نکل کر پھیل جاتا اور آسمان میں داخل ہو جاتا۔ اور دھوئیں کی طرح کوئی سیاہ چیز اس کے روئیں روئیں میں داخل ہو جاتی۔ یہ اللہ کا غضب ہوتا۔ جب وہ شخص انہیں اس بات سے آگاہ کرتا تو وہ اسے جادو سکھا دیتے۔ حضرت ابن جریج سے مروی ہے کہ کافر کے علاوہ کوئی اور شخص جادو سیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اور فتنہ کے لفظ سے مراد یہاں امتحان اور آزمائش ہے۔ ایک شاعر کا قول ہے

وَقَدْ فُتِنَ النَّاسُ فِيْ دِيْنِهِمْ وَخَلّٰى ابْنُ عَفَّانَ شراً طَوِيْلًا

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول (اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ) (اعراف:155) سے مراد بھی یہی ہے۔ اسی آیت سے بعض علماء نے جادو سیکھنے والے کی تکفیر پر استدلال قائم کیا ہے۔ اس کی تائید بزار کی روایت سے بھی ہوتی ہے ''جو شخص کسی کاہن یا جادوگر کے پاس گیا اور اس کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کی تو اس نے محمد ﷺ پر جو کچھ اتارا گیا ہے اس کی تکذیب کی (1)۔ (اس کی اسناد صحیح ہے اور اس کی دیگر شواہد مرویات بھی موجود ہیں) فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (بقرہ:102) یعنی لوگ ہاروت و ماروت سے جادو سیکھتے تھے۔ جس کی مدد سے مذموم افعال سرانجام دیتے۔ میاں بیوی کی محبت و الفت کو نا چاقی سے بدل دیتے۔ یہ شیاطین کا کام ہے جس طرح کہ صحیح مسلم کی روایت میں حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''شیطان اپنا تخت پانی

1۔ مسلم، المنافقین:66

پر رکھتا ہے اور لوگوں میں اپنے دستے بھیج دیتا ہے۔ پھر ان میں سے مقرب ترین اس کے نزدیک وہ ہوتا ہے جو فتنہ پردازی میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ ایک ان میں سے آتا ہے اور کہتا ہے میں فلاں کے ساتھ لگا رہا حتی کہ جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ یوں کہہ رہا تھا۔ ابلیس کہتا ہے۔ نہیں اللہ کی قسم: تم نے کچھ کیا۔ پھر دوسرا آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔ شیطان اسے قریب کرتا ہے اور سینے سے لگا لیتا ہے۔ اور کہتا ہے تو نے بڑا کام کیا۔ میاں بیوی کے مابین جادو سے جدائی کی وجہ یہ ہے کہ مرد یا عورت میں سے ایک فریق دوسرے سے کراہت، نفرت پر مبنی کوئی بات دیکھتا ہے جس کے سبب اس کے دل میں نفرت آ جاتی ہے اور یہی چیز جدائی کا سبب بن جاتی ہے مرء (آدمی)۔ اس کی تانیث امراۃ ہے دونوں کا تثنیہ تو آتا ہے لیکن ان کی جمع نہیں آتی۔ واللہ اعلم وَمَاهُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ سفیان ثوری کا قول ہے کہ باذن اللہ سے مراد قضاء الٰہی ہے۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ اللہ جس پر چاہے انہیں مسلط فرما دے۔ اس کی مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ انہیں کا قول ہے کہ جادو اس کو نقصان دیتا ہے جو اسے حاصل کرے اور اس میں داخل ہو۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ یعنی ان کے دین کے لئے نقصان دہ ہے اور اس کا نفع اس کے ضرر کے برابر نہیں ہو سکتا۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ یہود جنہوں نے حضور ﷺ کی متابعت کو چھوڑ کر جادو اختیار کر لیا تھا یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ ابن عباس، مجاہد اور سدی کا قول ہے کہ "خلاق" سے مراد حصہ ہے قتادہ نے اس سے مراد جنت لیا ہے۔ عبدالرزاق اور حسن کا قول ہے کہ اس کا کوئی دین نہیں۔ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے اور حرام کردہ اشیاء سے بچتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا سے بھی بعض علماء نے جادوگر کے کفر کا استدلال کیا ہے جس طرح کے امام احمد بن حنبل اور سلف کے ایک گروہ کی رائے ہے۔ بعض دیگر علماء کے نزدیک وہ کافر تو نہیں لیکن اس کی سزا یہ ہے کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ جس طرح کہ امام شافعی اور احمد بن حنبل نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے اپنے ایک فرمان میں لکھا تھا کہ ہر جادوگر مرد اور عورت کو قتل کر دو۔ بن عبیدہ کہتے ہیں کہ ہم نے تین جادوگروں کو قتل کر دیا۔ (بخاری نے بھی اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے)۔ یہ روایت بھی صحیح ہے کہ حضرت ام المؤمنین حفصہ پر ان کی لونڈی نے جادو کیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ تین صحابہ کرام نے جادوگر کے قتل کا فتوی دیا۔ ترمذی نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جادوگر کی حد تلوار سے اس کی گردن اڑا دینا ہے۔ لیکن اس کی روایت میں اسماعیل بن مسلم ضعیف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اور طبرانی نے اسے ایک دوسری سند سے مرفوع بھی روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ متعدد اسناد سے یہ بات مروی ہے کہ ولید بن عقبہ کے پاس ایک جادوگر تھا جو اس کے سامنے اپنے کرتب دکھایا کرتا تھا۔ وہ بظاہر کسی آدمی کا سر کاٹ دیتا۔ پھر اسے آواز دیتا تو اس کا سر جڑ جاتا۔ لوگ متعجب ہو کر کہتے کہ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ ایک دفعہ مہاجرین میں سے کسی صالح آدمی نے اسے دیکھ لیا۔ اگلے دن جب وہ شخص اپنے کرتب دکھانے لگا اور کھیل شروع کیا تو اس (مہاجر) نے خود اس کی گردن اڑا دی اور کہا اگر سچا ہے تو اپنے آپ کو زندہ کرے پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ (اَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ) "ترجمہ: کیا تم جان بوجھ کر جادو کے پاس جاتے ہو؟ ولید یہ دیکھ کر غضب ناک ہو گیا کہ اس نے قتل سے قبل اجازت نہیں لی تھی۔ چنانچہ انہیں گرفتار کر لیا پھر چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم۔ امام ابوبکر خلال نے یہی واقعہ جندب کی طرف منسوب کیا ہے۔ امام شافعی نے حضرت عمر کے فرمان اور واقعہ حضرت حفصہ سے استدلال کیا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب جادو شرکیہ الفاظ کے ساتھ ہو۔ واللہ اعلم۔ (فصل) ابو عبداللہ رازی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ معتزلہ جادو کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا اعتقاد رکھنے والے کے کفر کے لائق ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک جادوگر ہوا میں

اڑسکتا ہے۔ انسان کو گدھا یا گدھے کو انسان بنا سکتا ہے۔ مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ جادوگر کے اس جھاڑ پھونک اور منتر کے وقت بھی ان اشیاء کو اللہ تعالیٰ ہی پیدا فرماتا ہے۔ لیکن فلاسفہ، نجومیوں اور صابی حضرات کے نزدیک فلک اور ستارے ان چیزوں میں مؤثر ہوتے ہیں۔ پھر جادو کے وقوع پذیر ہونے اور اللہ کی تخلیق ہونے پر بطور دلیل یہ آیت ذکر فرمائی ہے۔ وَمَاهُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ:102) نیز یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ خود حضور ﷺ پر جادو کیا گیا اور اس کا اثر آپ ﷺ پر ہونا ظاہر ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ کی روایت سے ذکر کردہ وہ واقعہ جس کا اوپر بیان ہوا۔ اسی طرح کے دیگر بے شمار واقعات ہیں۔

پانچواں مسئلہ: جادو سیکھنا قبیح اور ممنوع نہیں۔ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ علم بذات خود برا نہیں۔ نیز بطور استشہاد یہ آیت پڑھتے ہیں: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (زمر:9) یعنی اصحاب علم اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اگر جادو کا علم ہی نہ ہو تو معجزے اور جادو میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور معجزے کے معجز ہونے کا علم واجب ہے اور جس چیز پر واجب کا دارومدار ہو وہ واجب ہوتی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ جادو سیکھنا واجب ہے۔ اور جو چیز واجب ہو وہ کیسے حرام اور قبیح ہو سکتی ہے؟۔ (امام رازی کے یہی الفاظ ہیں۔) لیکن اس پر چند اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ (1) ان کا یہ کہنا کہ جادو کا علم قبیح نہیں اگر اس سے مراد عقلاً قبیح ہے تو معتزلہ اس کے مخالف ہیں۔ وہ اس کے قائل نہیں اور اگر شرعاً قبیح ہے تو قرآن کریم کی یہ آیت اس کی نفی کرتی ہے صحیح حدیث میں ہے جو کسی جادوگر یا کافر کے پاس جائے تو اس نے محمد ﷺ پر اتاری گئی وحی کا انکار کیا۔ سنن میں ہے جس نے گرہ باندھی اور پھونکا اس نے جادو کیا۔ (2) امام رازی کا یہ کہنا کہ محققین کے نزدیک یہ ممنوع نہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے جب کہ ہم نے آیت کریمہ اور حدیث کا ابھی ذکر کیا ہے۔ محققین کا اتفاق اس بات کا متقاضی ہے کہ اس مسئلہ پر ائمہ علماء یا اکثر نے نص قائم کی ہو لیکن ان کے ایسے اقوال کہاں ہیں۔ (3) پھر علم سحر کو آیت کریمہ هل يستوى الذين الآية کے عموم میں داخل کرنا بھی محل نظر ہے۔ کیونکہ اس آیت میں علماء علم شرعی کی تعریف فرمائی گئی ہے۔ (4) اور یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ اس طرح ہے پھر اس کی تعلیم کو وجوب کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ ضعیف بلکہ فاسد ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو قرآن ہے جس میں باطل کسی طرح بھی دراندازی نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کلام ہے۔ پھر علم کا معجز ہونا جادو کی تعلیم پر سرے سے موقوف نہیں۔ یہ بات بالضرورت معلوم ہے کہ صحابہ، تابعین، ائمہ اسلام بلکہ عام مسلمان بھی معجز اور غیر معجز میں فرق سمجھتے تھے حالانکہ انہیں سحر کا علم نہیں تھا۔ نہ انہوں نے اسے سیکھا اور نہ کسی کو آگے سکھایا۔ واللہ اعلم۔ پھر ابو عبداللہ رازی نے جادو کی آٹھ قسمیں ذکر فرمائی ہیں۔

(1) کذابوں اور کشدانیوں کا جادو:۔ یہ لوگ سات ستاروں (سیاروں) کی پوجا کرتے تھے۔ اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ دنیا کا انتظام ان سے ہے اور خیر و شر کے مالک یہی ہیں۔ اسی قوم کی تکذیب اور تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تھا۔ رازیؒ نے اس فن میں کتاب (اَلسِّرُّ الْمَكْتُوْمُ فِيْ مُخَاطَبَةِ الشَّمْسِ وَالنُّجُوْمِ) تالیف فرمائی تھی۔ جس طرح کہ قاضی ابن خلکان وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ بعض کے نزدیک پھر آپ نے اس سے توبہ کر لی تھی۔ جبکہ کچھ علماء کی رائے میں آپ نے یہ کتاب بطور اعتقاد نہیں لکھی تھی بلکہ اس علم میں اپنی مہارت سے آگاہ کرنے کے لئے لکھی تھی۔ یہ آپ کے خلاف گمان ہے حالانکہ آپ نے اس میں سیارگان سبعہ سے ان کے خطاب کا طریقہ اور ان کے اعتقاد وغیرہ ذکر کیا ہے۔

(2) قسم دوم: اصحاب اوهام وقوی نفوس کا جادو: پھر اس بات پر دلیل ذکر کی ہے کہ وہم و خیال کا بھی اثر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کھجور کی لکڑی کو زمین پر رکھ دیا جائے تو انسان کے لئے اس پر چلنا ممکن ہے۔ لیکن اگر اسے نہر وغیرہ پر رکھ دیا جائے تو اس کے

لئے اس پر سے گزرنا مشکل ہو جائے گا۔(یعنی اسے گر جانے کا خدشہ رہتا ہے) اسی لئے حکماء اور اطباء مرعوف شخص (نکسیر والا) کو سرخ چیزیں دیکھنے سے منع کرتے ہیں اور مرگی والے کو زیادہ روشن اور تیز حرکت کرنے والی چیزوں سے۔اس کا سبب یہ ہے کہ طبائع تخلیقی طور پر وہم کے تابع ہوتی ہیں۔قوت واہمہ کا ایک خاص اثر طبیعت پر پڑتا ہے۔رازی لکھتے ہیں کہ اصحاب عقول کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ نظر لگ جانا حق ہے۔ان کے موقف کی دلیل یہ صحیح حدیث بھی بن سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: نظر برحق ہے۔اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت لینے والی ہوتی تو نظر ہوتی۔رازی فرماتے ہیں اگر آپ نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ نفس جوان افعال کو سرانجام دیتا ہے کبھی تو انتہائی قوی ہوتا ہے اور ان افعال میں آلات وادوات سے استعانت لینے سے مستغنی ہوتا ہے۔اور اگر وہ ضعیف ہو تو اسے ان آلات سے مدد لینے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر نفس بدن سے اعلیٰ ہو اور عالم سماوی کی طرف شدید انجذاب رکھتا ہو گویا وہ آسمانی ارواح میں سے ایک روح ہے تو اس کی تاثیر میں بھی قوت ہوگی۔اور اگر نفس ضعیف ہو اور بدنی لذتوں کے ساتھ اس کا شدید تعلق ہو تو البتہ اس بدن میں اس کی تاثیر نہ ہوگی۔پھر ذکر فرماتے ہیں کہ اس بیماری کا علاج غذا کو کم کرنے،لوگوں سے میل جول میں کمی اور ریاء سے بچنے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔امام رازی نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے یہ تصرف بالحال ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔کبھی تو وہ حالت صحیح شرعی ہوتی ہے۔اگر وہ آدمی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے امر کے مطابق عمل کرتا ہے۔اور منہیات سے رکتا ہے۔تو یہ احوال اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مواہب اور صالحین امت کی کرامات ہوتے ہیں۔شرع میں اسے جادو کا نام نہیں دیا جا سکتا۔اور کبھی وہ حالت فاسدہ ہوتی ہے یعنی وہ شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو بجا نہیں لاتا۔یہ شقی اور مخالفین شریعت کی حالت ہے انہیں احوال کا عطا کرنا اللہ کی ان کے ساتھ محبت کی بنا پر نہیں ہوتا۔جس طرح کہ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ دجال کو طرح طرح کے خارق عادت عطا ہوں گے۔حالانکہ وہ ملعون ہے۔اسی طرح اس جیسے لوگ جو شریعت محمدیہ کے مخالفین سے ہیں۔اس کی وضاحت طوالت اختیار کی جائے گی۔جس کا یہ محل نہیں ہے۔

(3) **قسم سوم:** زمینی ارواح سے استعانت طالب کرنا وہ جنات ہیں۔معتزلہ اور فلاسفہ اس کے قائل نہیں۔ان کی دو قسمیں (1) مؤمنین (2) کفار اور وہ شیاطین ہیں۔نفوس ناطقہ کا ان کے ساتھ اتصال ارواح سماویہ کی نسبت زیادہ آسان ہے۔کیونکہ ان کے مابین قرب اور مناسبت ہوتی ہے۔اہل فن اور ارباب تجربہ کا بخوبی یہ مشاہدہ ہے کہ ارضی ارواح کے ساتھ اتصال تھوڑی محنت سے ہو سکتا ہے جیسے جادو ٹونے،دھوئیں اور خلوت کے ساتھ۔اسے سحر بالعزائم یا عمل تسخیر بھی کہتے ہیں۔

(4) **قسم چہارم:** جادو کی اس قسم میں تخیلات پر قابو پالینا،آنکھوں پر پردہ ڈال دینا اور شعبدہ بازی ہے۔اس کی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ بعض اوقات غلطی پر ہوتی ہے۔اور کسی معین چیز میں مشغول ہوتی ہے۔کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ماہر شعبدہ باز کوئی کرتب دکھا کر ناظرین کو دہشت زدہ کر دیتا ہے۔اور ان کی آنکھوں کو کنٹرول کر لیتا ہے حتی کہ جب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر نظریں گاڑ دیتے ہیں تو وہ فوراً کوئی دوسرا کام کر ڈالتا ہے جب بلا انتظار لوگوں کے سامنے کوئی دوسری چیز آتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔اگر وہ خاموش رہے اور لوگوں کی توجہ کو دوسری طرف مبذول کرنے کے لئے کوئی بات نہ کرے تو لوگ اس کے کرتبوں کی حقیقت کو فوراً سمجھ جائیں۔بعض مفسرین کا قول ہے کہ فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قسم کا شعبدہ تھا۔قرآن کریم میں آتا ہے: فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (اعراف:116) جب انہوں نے اپنی رسیاں ڈالیں اور لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ایک دوسری آیت میں ہے: يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ:66) ان کے جادو کے سبب آپ نے یوں محسوس کیا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

حالانکہ ایسا نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

(5) **قسم پنجم:** فن انجینئرنگ کی مدد سے بعض آلات کو اس طرح فٹ کرنا کہ ان سے عجیب وغریب حرکات ظاہر ہوں۔ مثلاً گھوڑ سوار کو گھوڑے پر بٹھا دینا جس کے ہاتھ میں باجا ہو جب ایک گھنٹا گذر جائے تو وہ کسی کے ہاتھ لگائے بغیر باجا بجانے لگے۔ اسی طرح وہ تصاویر ہیں جنہیں اہل ہند اور رومی بناتے ہیں۔ اور دیکھنے والا حقیقت اور تصویر میں فرق نہیں کرسکتا۔ بلکہ وہ بعض اوقات اس طرح بناتے ہیں جیسے انسان ہنس رہا ہو یا رو رہا ہو۔ فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قبیل سے تھا۔ یعنی جس طرح کہ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے وہ رسیاں اور عصا لے کر ان میں پارہ (زئبق) بھر دیا جس کے سبب وہ حرکت کرتی تھیں اور دیکھنے والا یہ گمان کرتا کہ وہ اپنے اختیار سے دوڑ رہے ہیں۔ رازی کہتے ہیں کہ اسی باب سے ہے گھڑیال کو سیٹ کرنے۔ اور ہلکے آلات کے ساتھ وزنی اشیاء کو کھینچ لینے کا علم۔ فی الحقیقت اسے جادو کا نام نہیں دینا چاہئے کیونکہ یہ تو ایک ترکیب اور کاریگری ہے جس کے یقینی اسباب ظاہر ہیں جو انہیں سیکھ لے یہ کام کرسکتا ہے اسی طرح نصاریٰ اپنے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ انتہائی خفیہ طور پر کلسیا کی قندیلیں جلا دیتے ہیں اور اسے گرجے کی کرامت مشہور کرتے ہیں۔ ان کے خاص پادری اس سے آگاہ اور اس کے معترف ہوتے ہیں لیکن وہ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اس کے ہاتھ ہم اپنی منتشر جمعیت کو اکٹھا کرتے ہیں۔ بعض جاہل، کند ذہن کرامیہ اسی شبہ کی بنا پر ترغیب وترہیب کی خاطر احادیث وضع کرنے کے جواز کے قائل ہیں۔ اس طرح ان کے زمرے میں آجاتے ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنی جگہ جہنم میں مقرر کرلے"(1)۔ اور فرمایا "میری طرف سے حدیث بیان کرو اور جھوٹ کی نسبت میری طرف نہ کرو۔ مجھ پر جھوٹ بولنے والا جہنمی ہے"۔ یہاں ایک عیسائی راہب کی حکایت بیان کی ہے کہ اس نے کسی پرندے کی غمگین آواز سنی۔ جو حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ پرندے اس کی آواز سن کر اس پر رحم کھاتے اور اس کے گھونسلے میں زیتون کے پھل لا کر ڈال دیتے۔ اس راہب نے اسی شکل کا ایک پرندہ بنایا اور اندر سے اسے کھوکھلا رکھا۔ جب ہوا اس میں داخل ہوتی تو اسی پرندے کی آواز نکلتی۔ اور اپنے بنائے ہوئے گرجے میں اسے لا کر رکھا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ یہ کسی نیک آدمی کی قبر پر ہے۔ وہ پرندہ اس میں کسی جگہ لٹکا دیا۔ جب زیتون کا موسم آتا تو اس طرف کا دروازہ کھول دیتا۔ ہوا اس میں داخل ہوتی تو آواز نکلتی۔ اس قسم کے پرندے جمع ہو جاتے اور بہت سے زیتون لا کر گرا دیتے۔ نصاریٰ اس گرجے میں زیتون دیکھ کر ششدر رہ جاتے لیکن اس کی حقیقت سے لاعلم تھے۔ وہ پادری انہیں دھوکہ دے کر کہتا کہ یہ صاحب قبر کی کرامت ہے۔ عَلَيْهِمْ لَعَائِنُ اللّٰهِ الْمُتَتَابِعَةُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔

(6) **قسم ششم:** بعض ادویہ کے مخفی خواص معلوم کرکے انہیں کام میں لانا۔ ان خواص کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً مقناطیس کی خاصیت سب کے سامنے ظاہر ہے۔ اسی طرح بعض نام نہاد فقیر لوگوں کو فریب دے کر حیلہ کرتے ہیں اور ان خواص سے مدد لیتے ہیں۔ جیسے آگ میں گھس جانا اور سانپوں کو پکڑ لینا۔ وغیرہ محال امور ہیں۔

(7) **نوع ہفتم:** دلوں کو قابو کرلینا۔ مثلاً یہ دعویٰ کرنا کہ میرے پاس اسم اعظم ہے یا جنات میرے قبضہ میں ہیں۔ حسن اتفاق سے سامع اگر ضعیف العقل اور قلت شعور کا شکار ہو تو وہ اس کی بات کو سچ سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کی طرف سے اس کے دل میں ڈر اور رعب جاگزیں ہو جاتا ہے۔ جب خوف طاری ہو جائے تو قوائے احساس کمزور ہو جاتی ہیں۔ اس وقت جادوگر جو چاہے کرسکتا ہے۔ اس طرز کو تنبلہ کہتے ہیں۔ یہ اکثر کم عقل لوگوں پر ہوتا ہے۔ علم فراست سے آدمی کامل ذہن والے اور ناقص ذہن کے مابین فرق کرسکتا ہے۔ اگر نبیل

1۔ البخاری: 1/38

علم فراست کا ماہر ہوتو وہ فوراً یہ سمجھ جاتا ہے کہ لوگوں میں سے اس کی بات کو تسلیم کون کرے گا۔

(8)**نوع ہشتم:** چغل خوری کی کوشش کرنا اور مختلف حیلے بہانوں سے کسی کے دل میں گھر کر لینا اور اسے اپنا گرویدہ بنا لینا یہ بات لوگوں میں عام ہے۔ مؤلف کی رائے میں چغلی کی دو قسمیں ہیں (1) اگر لوگوں کے مابین عداوت بھڑکانے اور دلوں میں افتراق پیدا کرنے کے لئے ہو تو یہ بالاتفاق حرام ہے۔ (2) اور اگر لوگوں کی اصلاح اور اتفاق پیدا کرنے کے لئے ہو جیسے حدیث شریف میں ہے اچھی چغلی کھانے والا جھوٹا نہیں ہے۔ (3) یا کفار کو رسوا کرنے اور ان کی جمعیت کو منتشر کرنے کے لئے ہو تو یہ شرعاً جائز ہے۔ جیسے حدیث میں ہے۔ ''لڑائی دھوکہ ہے۔'' جس طرح حضرت نعیم بن مسعود نے غزوۂ خندق کے موقع پر کفار اور بنوقریظہ کے درمیان جدائی ڈال دی۔ ایک فریق کو کوئی بات بتائی اور دوسرے کو اس کے الٹ بتایا۔ جب ان کی بات چیت ہوئی تو ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایسا صرف فہم وذکاء اور گہری بصیرت کا حامل شخص ہی کر سکتا ہے۔ وَبِاللّٰهِ الْمُسْتَعَانُ۔ یہ امام رازی کی ذکر کردہ جادو کی اقسام اور ان کی تفصیل ہے۔ انہوں نے ان میں سے بہت سی اقسام کو بوجہ لطافت سحر میں شامل کیا ہے کیونکہ سحر کا لغوی معنی ہے جو چیز لطیف ہو اور اس کا سبب مخفی ہو۔ اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے۔ '' بے شک بعض بیان تو جادو ہوتے ہیں'' سحری کے وقت کو بھی سحور کہتے ہیں کیونکہ یہ مخفی، رات کا آخری حصہ ہوتا ہے اس رگ کو بھی سحر کہتے ہیں جو غذا کی جگہ ہے۔ ابوجہل نے بھی یوم بدر عتبہ کو کہا تھا اس کی سحر یعنی رگ خوف کی وجہ سے پھول گئی ہے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں میرے سحر ونحر کے درمیان رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے نحر سے مراد سینہ ہے۔ قرآن کریم میں ہے (سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ) یعنی لوگوں سے مخفی طور پر اپنا کام سرانجام دیا۔ واللہ اعلم۔ ابوعبداللہ قرطبی فرماتے ہیں ہمارے نزدیک سحر حق ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہ ہو جاتا ہے ابو اسحٰق شافعی اور معتزلہ کی رائے اس کے برعکس ہے۔ ان کے نزدیک یہ تخیل ہوتا ہے۔ جادو کبھی ہاتھ کی چالاکی سے ہوتا ہے جیسے شعبدہ بازی۔ اور کبھی کوئی منتر یا اسمائے حسنیٰ میں سے کسی اسم کے ساتھ۔ کبھی شیاطین کا نام لے کر، کبھی دواؤں اور دھوئیں وغیرہ سے حدیث مبارکہ، بعض بیان جادو ہوتے ہیں کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ 1۔ بطور تعریف 2۔ بطور مذمت آپ نے فرمایا ہو۔ اور یہی اصح ہے کیونکہ وہ باطل کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ سچ بات معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے بعض اوقات تم میں سے کوئی اپنی دلیل کے ساتھ زیادہ اصرار کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں۔

(فصل) وزیر ابوالمظفر یحییٰ بن ہبیرہ نے اپنی کتاب ''اَلْاِشْرَافُ عَلٰی مَذَاهِبِ الْاَشْرَافِ'' میں جادو کا باب ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بالاتفاق سب کے نزدیک جادو کی حقیقت ہے۔ مگر ابوحنیفہ فرماتے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ جادو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے ابوحنیفہ، مالک اور احمد اسے کافر قرار دیتے ہیں۔ لیکن اصحاب ابوحنیفہ میں سے کسی کا قول ہے کہ اگر اپنے دفاع کی خاطر جادو سیکھے تو کافر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس کے جواز کا قائل اور اس کے نفع بخش ہونے کا اعتقاد رکھے تو کافر ہو جائیگا۔ اسی طرح وہ شخص جو یہ سمجھے کہ شیاطین اس کے لئے کام کرتے ہیں اور اس کے تابع ہیں وہ بھی کافر ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جادوگر سے دریافت کیا جائے گا اگر وہ اہل بابل کا سا عقیدہ رکھتا ہو اور سات سیاروں کے موثر ہونے کا قائل ہو تو وہ کافر ہے۔ لیکن اگر اس کا جادو کفر یہ تو نہ ہو لیکن وہ اس کا اعتقاد رکھتا ہو تو وہ بھی کافر ہے۔ ابن ہبیرہ لکھتے ہیں کیا اسے محض اس کے فعل یا جادو پر عمل کرنے سے قتل کر دیا جائے گا؟۔ مالک اور احمد کی یہی رائے ہے۔ شافعی اور ابوحنیفہ اس کے خلاف ہیں لیکن اگر اپنے جادو سے وہ کسی آدمی کو مار ڈالے تو مالک احمد اور شافعی کے نزدیک اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اس وقت تک قتل نہیں کیا جائے گا جب تک بار بار نہ کرے یا کسی شخص معین کے بارے میں خود اقرار نہ کرے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس کا یہ قتل حد ہوگا جبکہ شافعی کے نزدیک یہ قصاص ہے۔ اگر

جادوگر توبہ کر لے تو کیا اس کی توبہ مقبول ہے؟ مالک، ابوحنیفہ اور امام احمد کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں شافعی اور امام احمد کی ایک دوسری روایت ہے کہ اس کی توبہ قبول ہے۔ اور اہل کتاب کا جادوگر بھی مسلم ساحر کی طرح قتل ہوگا۔ امام مالک احمد اور شافعی کے نزدیک قتل نہیں کیا جائے گا؟ ان کی دلیل لبید بن اعصم یہودی کا واقعہ ہے۔ اسی طرح مسلمان جادوگر عورت کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ ابو حنیفہ کے نزدیک اسے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اسے بھی مرد کی طرح قتل کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ ابوبکر خلال نے زہری سے نقل کیا ہے کہ مسلمان ساحر کو قتل کر دیا جائے جبکہ مشرک کو نہیں۔ کیونکہ جس یہودی عورت نے آپ ﷺ پر جادو کیا تھا آپ نے اسے قتل نہیں فرمایا۔ قرطبی نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اگر ذمی کے جادو سے کوئی مر جائے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔ ابن خویز منداد نے مالک سے دو روایتیں ذمی کے بارے میں نقل کی ہیں۔ 1۔ اس سے توبہ کروائی جائے اگر وہ اسلام قبول کر لے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ 2۔ دوسری یہ کہ اسے قتل کیا جائے خواہ وہ مسلمان بھی ہو جائے۔ تاہم مسلمان جادوگر جس کے جادو میں شرکیہ الفاظ ہوں ائمہ اربعہ وغیرہ کے نزدیک قتل کیا جائے گا۔ لیکن امام مالک فرماتے ہیں کہ جب اس پر غلبہ پا لیا جائے تو اس کی توبہ قبول نہیں کیونکہ وہ زندیق ہے۔ ہاں اگر گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول ہے۔ اگر اس نے اپنے جادو سے کسی کو مار ڈالا تو بہر حال قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں اگر وہ کہے کہ نادانستہ میں نے یہ قتل کیا ہے تو وہ خطا کار ہے اس پر دیت ہوگی۔

(مسئلہ) کیا جادوگر سے جادو کھولنے کا مطالبہ کیا جائے گا؟ بروایت بخاری سعید بن مسیّب نے اسے جائز قرار دیا ہے عامر شعبی کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ حسن بصری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ صحیح میں ہے کہ سیدہ عائشہ نے عرض کی یارسول اللہ! آپ جادو کیوں نہیں کھلواتے؟ تو آپ نے فرمایا اللہ نے مجھے شفا دے دی۔ میں لوگوں پر برائی کھلوانے سے ڈرتا ہوں۔ قرطبی نے وہب سے نقل کیا ہے کہ بیری کے سات پتے لے کر دو پتھروں کے ساتھ کوٹ لیے جائیں اور پانی ملا کر آیت الکرسی پڑھی جائے اور تین گھونٹ مسحور کو پلایا جائے۔ باقی پانی سے وہ غسل کر لے تو جادو کا اثر زائل ہو جائے گا۔ یہ اس آدمی کے لئے بہت ہی اچھا ہے جو اپنی بیوی سے روک دیا گیا ہو۔ ابن کثیر کی رائے میں جادو کا توڑ کرنے کے لئے قرآن کریم کی آخری دو سورتیں (معوذتین) بہترین ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ان جیسا کوئی دم نہیں اس طرح آیت الکرسی بھی شیطان کو دھتکارنے والی ہے۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

''اے ایمان والو! (میرے حبیب ﷺ سے کلام کرتے وقت) مت کہا کرو ''راعنا'' بلکہ کہو ''انظرنا'' اور (ان کی بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرما لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل (فرمانے) والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ مومنین کو کفار کے ساتھ بول چال اور افعال میں مشابہت اختیار کرنے سے روک رہا ہے۔ کیونکہ یہودی بعض الفاظ کا مفہوم دوسرا لے کر شان رسالت کی تنقیص کرنا چاہتے تھے۔ علیہم لعائن اللہ۔ جب وہ یہ کہنا چاہتے کہ ہماری سنئے تو راعنا کہتے اور رعونت

مراد لیتے۔ جیسے ایک اور جگہ ہے: مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ...... (نساء:46)'' ترجمہ: یعنی یہودیوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو کلمات کو اصل مفہوم سے ہٹادیتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم سنتے ہیں لیکن نہیں مانتے۔ سنئے آپ کی بات نہ سنی جائے اور اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کرتے ہوئے اور دین میں طعنہ زنی کی خاطر راعنا کہتے ہیں۔ اگر وہ کہتے ہم نے سنا اور مانا۔ سنئے اور ہماری طرف توجہ کیجئے۔ تو یہ ان کے لئے یہ بہتر اور مناسب ہوتا۔ لیکن ان کے کفر کے سبب اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔ اسی طرح بہت سی احادیث میں بھی ان کے بارے میں یہ خبر دی گئی ہے کہ بوقت سلام وہ السام علیکم کہا کرتے۔ سام کا معنی موت ہے۔ اس لیے ہمیں حکم دیا گیا کہ جواباً انہیں وعلیکم کہیں۔ ہماری بددعا قبول ہو گی جبکہ ان کی بددعا مقبول نہیں۔ الغرض قول وفعل میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مشابہت سے منع فرمایا۔ امام احمد سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا'' میں قیامت کے قریب تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ تا کہ اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کی جائے۔ میرا رزق نیزے کے سائے تلے ہے۔ جو میرے اوامر کی خلاف ورزی کرے ذلت اور پستی اس کا مقدر ہے۔ جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرے وہ انہی سے ہے(1)۔'' حدیث کا آخری حصہ (مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ) ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ اقوال وافعال، لباس، اعیاد اور عبادات وغیرہ امور جو ہمارے لیے مشروع نہیں میں ان سے مشابہت اختیار کرنا سختی سے منع ہے اور اس پر عذاب کی دھمکی اور وعید ہے۔ ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی مجھے نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا جب تم یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سنو تو کان لگادو اور متوجہ ہو جاؤ کیونکہ یا تو بھلائی کا حکم ہو گا پھر شر سے منع کیا جارہا ہو گا۔ خیثمہ کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جس جگہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا آیا ہے تورات میں اس کی جگہ یٰۤاَیُّهَا الْمَسَاكِیْنُ آیا ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ راعنا سے مراد ہے ہماری طرف کان لگائیے یہ اسی طرح ہے جیسے عاطنا۔ ابن ابی حاتم، ابوالعالیہ، ابو مالک، ربیع بن انس، عطیہ عوفی اور قتادہ سے یہی مروی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں راعنا یعنی ہمارے خلاف نہ کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ نہ کہو کہ آپ ہماری سنئے اور ہم آپ کی۔ عطاء کا قول ہے کہ ایک زبان تھی جسے انصار نے استعمال کرنا شروع کر دیا تو اللہ نے اس سے منع فرمادیا۔ حسن فرماتے ہیں راعن کہتے ہیں تمسخر آمیز بات کو تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اسلام اور حضور ﷺ سے تمسخر کرنے سے منع فرمادیا۔ ابن جریج نے یہی لکھا ہے۔ ابو صخر فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ جانے لگتے تو مومنین میں سے جسے کوئی بات کہنا ہوتی وہ کہتا اپنا کان ادھر کیجئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بے ادبی کے کلمہ سے منع فرمادیا۔ سدی کا قول ہے کہ یہود بنو قینقاع میں سے رفاعہ بن زید نامی شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور ان کلمات سے مخاطب ہوتا۔ مسلمانوں نے انبیاء کے لئے ادبی کلمات سمجھتے ہوئے یہی کہنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے (اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ غَیْرَ صَاغِرٍ) جس طرح سورۂ نساء میں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کو ان کلمات سے روک دیا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو منع فرمادیا کہ اس کے نبی کو راعنا کہہ کر پکاریں۔ کیونکہ اس کی بارگاہ میں یہ ناپسندیدہ جملہ تھا۔ جس طرح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے انگور کو کرم اور غلام کو عبد کہنے سے منع فرمایا۔ اور فرمایا'' انگور کو حبلة اور عبد کی جگہ فتای (میرے جوان) کہو''(2)۔ وغیرہ۔

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اللہ تعالیٰ کافر اہل کتاب اور مشرکین کی مسلمانوں سے شدید عداوت کا ذکر فرمارہے ہیں۔ جن کی مشابہت اختیار کرنے سے مومنین کو منع فرمایا تا کہ ان کے مابین محبت ومودت منقطع ہو جائے۔ اور فرمایا کہ نبی ﷺ کے زیر سایہ تمہیں کامل شریعت عطا کی ہے یہ اللہ کا تم پر انعام واکرام ہے۔ اور اللہ جسے چاہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے۔ اللہ ہی فضل عظیم کا مالک ہے۔

1۔ مسند امام احمد 50/2	2۔ مسند امام احمد 509/2

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

''جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں''۔

ابن عباس فرماتے ہیں نسخ کا معنی تبدیل کرنا ہے۔ مجاہد کے نزدیک مٹا دینا ہے۔ اور کبھی وہ آیت لکھنے میں باقی رہتی ہے لیکن اس کا حکم بدل جاتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں، ابوالعالیہ اور محمد بن کعب قرظی سے اسی طرح مروی ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ نسخ سے مراد بھلا دینا ہے۔ عطاء کے نزدیک چھوڑ دینا۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ چھوڑ دیا گیا اور آپ ﷺ پر نازل نہیں ہوا۔ سدی کے نزدیک اٹھا لینا ہے۔ جیسے آیت ''اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھَا اَلْبَتَّۃَ''۔ یعنی بوڑھے اور بوڑھی کو سنگسار کر دو۔ جب وہ زنا کریں یا جیسے آیت ''لَوْ کَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَانِ مِنْ ذَھَبٍ لَا بْتَغٰی لَھُمَا ثَالِثًا'' اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی جستجو و آرزو کرے گا۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ ہم جو آیت کے احکام میں تبدیلی کر دیا کرتے ہیں۔ یعنی حلال کو حرام یا حرام کو حلال، جائز کو ناجائز اور ممنوع کو مباح وغیرہ۔ اور ایسا نہیں ہو سکتا مگر امر و نہی، حظر و اطلاق، اور ممانعت و اباحت کے ساتھ۔ اخبار و واقعات میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ نسخ کے لغوی معنی نقل کرنے کے ہیں یعنی ایک نسخہ سے دوسرے میں منتقل کر دینا۔ ایک حکم کو بدل کر دوسرا اس کی جگہ نافذ کرنے میں بھی یہی ہوتا ہے۔ خواہ نسخ حکم ہو یا نسخ عبارت۔ دونوں صورتوں میں یہ منسوخ ہے۔ نسخ کی تعریف وحد کے بیان میں علماء اصول کی عبارات اگرچہ مختلف ہیں لیکن مفہوم کے اعتبار سے سب قریب قریب ہیں۔ کیونکہ نسخ شرعی کا معنی علماء کے ہاں معروف ہے۔ بعض کے نزدیک متاخر دلیل شرعی کے ساتھ حکم کو اٹھا دینا۔ اسی میں داخل ہوگا اخف کو اثقل کے بدلے اٹھا دینا یا اس کے برعکس۔ یا نسخ بغیر بدل۔ نسخ کے احکام کی تفاصیل، انواع اور شرطیں اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔

طبرانی میں ہے کہ دو آدمیوں نے نبی کریم ﷺ سے ایک سورت یاد کی تھی۔ وہ اسے پڑھتے رہے۔ ایک رات وہ نماز پڑھنے کے لئے اٹھے تو اسے نہ پڑھ سکے۔ صبح اٹھ کر وہ نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ منسوخ ہوگئی اور بھلا دی گئی۔ اب تم اس کی فکر چھوڑ دو۔ زھری نون خفیفہ پیش کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس کے ایک راوی سلیمان بن ارقم ضعیف ہیں۔ ابوبکر انباری نے بھی اسے دوسری سند سے مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ (بروایت قرطبی) ''نُنْسِھَا'' کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے۔ نَنْسَاَھَا۔ نَنْسَاْھَا۔ پہلی قرأت یعنی ہمزہ اور نون کے زبر کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں اس کا معنی ہوگا مؤخر کر دینا۔ ابن عباس اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں منسوخ نہیں کرتے۔ مجاہد نے اصحاب ابن مسعود سے نقل کیا ہے ہم اس کے الفاظ کو باقی رکھتے ہیں اور حکم کو بدل دیتے ہیں۔ عبید بن عمیر، مجاہد اور عطاء سے مروی ہے ہم اسے مؤخر کر دیتے ہیں اور پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ عطیہ عوفی کہتے ہیں یعنی منسوخ نہیں کرتے۔ سدی اور ربیع بن انس سے بھی یہی مروی ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ ناسخ کو منسوخ کے پیچھے رکھتے ہیں۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں اپنے پاس اسے روک لیتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے

خطبہ میں ایک دفعہ اس کے معنی مؤخر کرنا بیان فرمائے اور ''نُنْسِهَا'' کی قرأت کے مطابق پڑھا جائے تو عبدالرزاق نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو حکم منسوخ کرنا چاہتا اپنے نبی کریم ﷺ کو بھلا دیا کرتا۔ ابن جریر نے حسن سے روایت کیا ہے کہ تمہارے نبی ﷺ نے قرآن پڑھا پھر آپ کو بھلا دیا گیا۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رات کو نبی اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوتی اور دن کو بھلا دی جاتی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا عبید بن عمیر کا قول ہے یعنی ہم اسے تمہارے پاس سے اٹھا لیتے ہیں۔ قاسم بن ربیعہ فرماتے ہیں میں نے سعد بن ابی وقاص کو ننسأھا پڑھتے سنا تو عرض کی سعید بن مسیب ننساھا کر کے پڑھتے تھے۔ تو آپ نے فرمایا قرآن سعید یا آل سعید پر تو نازل نہیں ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (الاعلیٰ:6) ہم تجھے پڑھائیں گے اور تجھے بھولے گا نہیں۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ (الکھف:24) جب آپ بھول جائیں تو اللہ کا ذکر کریں۔ عبدالرزاق نے ہشیم سے اور حاکم نے اپنی مستدرک میں اسی طرح روایت کیا ہے اور فرمایا ہے یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے لیکن انہوں نے اسے بیان نہیں کیا۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ محمد بن کعب، قتادہ اور عکرمہ سے سعید کے قول کی طرح مروی ہے۔ امام احمد نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم سے علی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے اور ابی سب سے بہترین قاری ہیں اور ہم ابی کا قول چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنا ہے اسے نہیں چھوڑوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا نَنْسَخْ ...... ہم جو منسوخ کریں یا بھلا دیں اس سے بہتر لاتے ہیں یا اس جیسا حکم یعنی مکلفین کی مصالح کے لحاظ سے (بخاری واحمد)۔ یا جیسے ابن عباس سے مروی ہے بہتر ہے تمہارے لیے منفعت کے اعتبار سے اور آرام دہ ہونے کے لحاظ سے ابوالعالیہ کا قول ہے: مَا نَنْسَخْ ...... یعنی ہم اس آیت پر عمل نہیں کرتے یا اسے اپنے پاس روک لیتے ہیں تو اسے لے آتے ہیں یا اس کی نظیر۔ سدی کا قول ہے کہ جسے ہم نے منسوخ کیا ہے اس جیسی چیز لاتے ہیں یا جسے ہم نے ترک کیا ہے اس جیسی۔ قتادہ کا قول ہے کہ ایک ہی آیت میں امر، نہی، تخفیف اور رخصت ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ ...... وَّلَا نَصِيْرٍ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ وہ جس طرح چاہے اپنی مخلوق میں تصرف کرتا ہے۔ تمام مخلوق اسی کی ہے۔ ہر طرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ وہی مختار کل ہے۔ جیسے چاہے پیدا کرتا ہے جسے چاہے خوش بخت بنا دے اور جسے چاہے بد بخت بنا دے۔ صحت، بیماری اس کی طرف سے ہے۔ عزت، ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اپنے بندوں میں جو چاہے حکم کرے۔ جسے چاہے حلال کر دے۔ جسے چاہے حرام فرما دے۔ جو چاہے مباح کر دے اور جسے چاہے ممنوع قرار دے دے۔ جو چاہے حکم فرما دے کوئی اس کے حکم پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ جو کرے اس سے پرسش نہیں کی جا سکتی حالانکہ ان کی باز پرس ہو گی۔ نسخ سے وہ بندوں کو آزماتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ وہ اس کے رسولوں کی اطاعت کس طرح کرتے ہیں۔ جس چیز میں مصلحت ہو (جس کا علم صرف اللہ کو ہی ہے) اس کا حکم دیتا ہے۔ پھر علم سے ہی اس سے روک دیتا ہے۔ اطاعت صرف اسی کے اوامر کو بجا لانے، اس کے رسولوں کی تصدیق کرنے، ان کے حکم پر عمل کرنے اور جس سے منع کریں رک جانے میں ہے۔ ان مقام پر یہودیوں کا زبردست رد اور ان کے کفر کا بلیغ بیان ہے۔ اور ان کے شبہ کا بطلان ہے جو وہ نسخ کے محال ہونے کا دعویٰ کرتے تھے خواہ عقلاً جیسے جہالت اور کفر کے سبب ان میں سے بعض کا خیال تھا۔ خواہ نقلاً (نقلی طور پر) جیسے ان میں سے بعض لوگ افترا پردازی کے طور پر اٹکل پچو لگاتے تھے۔ امام ابوجعفر بن جریر فرماتے ہیں اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ) کیا آپ کے علم میں نہیں کہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی بلا شرکت غیرے میرے پاس ہے۔ میں ان دونوں میں اور جو کچھ ان کے مابین ہے کے بارے میں جو چاہوں فیصلہ کرتا ہوں۔ جو چاہوں حکم دیتا ہوں۔ جو چاہوں منسوخ کر کے اس سے روک دیتا ہوں۔ اور بندوں کے بارے اپنے احکام میں تغیر و تبدل اپنی مرضی سے کرتا ہوں اگرچہ یہاں پر اللہ تعالیٰ اپنے

نبی کو اپنی عظمت کے بارے میں آگاہ کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی یہود کی تکذیب کی جا رہی ہے جنہوں نے تورات کے احکام میں نسخ کا انکار کر دیا۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا۔ کیونکہ ان کی شریعتوں میں تورات کے بعض احکام کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس بات سے آگاہ فرما رہے ہیں کہ آسمانوں اور زمین پر اقتدار صرف میرا ہے۔ تمام مخلوق میری رعایا ہے۔ ان پر سمع و طاعت واجب ہے۔ وہ جو چاہے انہیں حکم دے یا روک دے، جسے چاہے منسوخ کرے اور جسے چاہے باقی رکھے۔ (مؤلف کی رائے) مسئلہ نسخ پر یہود کے اعتراض کی وجہ محض عناد اور کفر تھا۔ ورنہ عقلاً اللہ تعالیٰ کے احکام میں نسخ محال نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے ارادہ اور مشیت کا خود مالک ہے۔ علاوہ بریں سابقہ کتابوں اور قدیم شریعتوں میں نسخ کا نظریہ موجود تھا۔ جیسے حضرت آدم کے لئے یہ جائز تھا کہ اپنی بیٹیاں اپنے بیٹوں سے بیاہ دیں۔ پھر اسے حرام کر دیا گیا۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی سے باہر آئے تو تمام جانوروں کا کھانا آپ کے لئے مباح تھا۔ پھر بعض جانوروں کو حرام کر دیا گیا۔ دو بہنوں کا نکاح اسرائیل اور آپ کے بیٹوں کے لئے جائز تھا۔ لیکن بعد میں تورات نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کو اپنا لخت جگر قربان کرنے کا حکم ملا۔ پھر عمل درآمد سے قبل ہی اسے منسوخ کر دیا گیا۔ بنو اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو قتل کر دیں۔ لیکن پھر ان کی نسل کو باقی رکھنے کے لئے یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ اسی طرح بہت سی اشیاء ہیں جن کا وہ اقرار کرتے ہیں اور ان کے تذکرے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ان ادلہ کے بارے میں جو لفظی جواب دیا جاتا ہے وہ معنی کی دلالت سے مانع نہیں کیونکہ وہی مقصود حقیقی ہے۔ اسی طرح ان کی کتابوں میں حضور ﷺ کے بارے میں بشارتیں ہیں اور آپ کی اتباع کا حکم ہے جو وجوب اطاعت کا فائدہ دیتا ہے اور یہ کہ آپ کی شریعت کے سوا کوئی عمل مقبول نہیں۔ خواہ کوئی یہ کہے کہ سابقہ شرائع صرف آپ ﷺ کی بعثت تک تھیں اس لیے اسے نسخ نہیں کہتے۔ جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد کہ روزے کو رات تک مکمل کرو۔ بعض علماء کے نزدیک یہ شریعتیں مطلق تھیں اور شریعت محمدیہ نے انہیں منسوخ کر دیا۔ علی کل حال ہر اعتبار سے آپ ﷺ کی متابعت واجب ہے کیونکہ آپ پر نازل شدہ کتاب اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اس مقام پر اللہ نے بیان کیا کہ نسخ جائز ہے۔ اس طرح یہود کی تردید کر دی کہ جس طرح اس کا اقتدار و نفوذ غیر متنازعہ ہے اسی طرح وہ جو چاہے حکم دے سکتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں بھی جس کے شروع میں اہل کتاب کو خطاب کیا گیا ہے۔ نسخ کے وقوع پذیر ہونے کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا (آل عمران:93) کہ تمام کھانے بنو اسرائیل پر حلال تھے ماسوائے ان کے جنہیں حضرت اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ (اس آیت کی تفسیر آگے آئے گی) تمام مسلمان اوامر الٰہیہ میں نسخ کے بالاتفاق قائل ہیں کیونکہ یہی پروردگار کی حکمت بالغہ ہے۔ مفسر ابو مسلم اصفہانی کا قول ہے کہ قرآن میں نسخ موجود نہیں۔ لیکن اس کا یہ قول ضعیف، مردود اور خطا ہے۔ قرآن کریم میں جن مقامات پر نسخ وارد ہوا ہے اس نے ان کے جوابات دینے کی بے سود سعی کی ہے۔ جس طرح عورت کی عدت کا مسئلہ ہے کہیں چار ماہ دس دن ہے یا ایک سال۔ لیکن اس کا جواب اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ تحویل قبلہ کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح پہلے مسلمانوں کو ایک کے مقابلے میں دس کافروں سے مقابلے کا حکم تھا پھر اسے ایک اور دو سے بدل دیا گیا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے مناجات کرنے سے قبل صدقہ دینے کا وجوبی حکم تھا جو منسوخ کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

''کیا تم (یہ) چاہتے ہو کہ پوچھو اپنے رسول (ﷺ) سے (ایسے سوال) جیسے پوچھے گئے موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے پہلے اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے وہ (قسمت کا مارا) تو بھٹک گیا سیدھے راستہ سے''۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ مومنین کو ارشاد فرما رہے ہیں کہ میرے نبی ﷺ سے قبل از وقت بکثرت سوال نہ کیا کرو۔ ایک اور جگہ فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ...... (مائدہ:101) اے ایمان والو ان چیزوں کا سوال نہ کیا کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تم برا محسوس کرو۔ اور اگر تم قرآن کے نزول کے بعد ان کی تفصیل کے بارے میں پوچھو تو وہ چیزیں تمہارے لیے واضح کر دی جائیں گی۔ اور قبل از وقت کسی چیز کے بارے میں مت پوچھو ایسا نہ ہو کہ کہیں اس سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام کر دی جائے اسی لیے صحیح میں ہے کہ ''مسلمانوں میں سے سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے ایسی چیز کے بارے میں پوچھا جو حرام نہ تھی لیکن اس کے سوال کے سبب حرام کر دی گئی۔'' ایک مرتبہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کوئی ایک شخص اپنی بیوی کے پاس غیر مرد کو دیکھتا ہے۔ اگر کسی کو بتائے تو یہ بھی بہت بری بات ہے اور اگر خاموش رہے تو بھی یہی صورت حال ہوگی۔ آپ ﷺ کو یہ سوال برا معلوم ہوا۔ آخر لعان کا حکم نازل ہوا۔ اسی طرح صحیحین میں مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیل وقال، مال کو ضائع کرنے اور کثرت سوال سے منع فرماتے تھے(1)۔ صحیح مسلم میں ہے جب میں تمہیں چھوڑ دوں تو مجھے چھوڑ دو۔ تم سے پہلی قومیں کثرت سوال اور اپنے انبیاء سے اختلاف کے سبب ہلاک ہو گئیں۔ جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اسے بجا لاؤ۔ اور اگر کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے اجتناب کرو(2)۔ آپ ﷺ نے یہ اس وقت فرمایا تھا جب آپ نے لوگوں کو خبر دی کہ اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے۔ تو ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ کیا ہر سال تو آپ خاموش ہو گئے۔ اس نے تیسری دفعہ جب پھر یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا نہیں۔ اور اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور اگر فرض ہو جاتا تو تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔ پھر فرمایا مجھے چھوڑ دو...... الحدیث۔ اسی طرح انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں کسی چیز کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے سے منع کر دیا گیا ہماری یہ خواہش ہوتی کہ کوئی بدو آئے اور آپ سے سوال کرے اور ہم سنیں۔ حافظ ابو یعلی موصلی اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت براء بن عازب نے ارشاد فرمایا کہ بعض اوقات ایک سال گذر جاتا اور مجھے رسول اللہ ﷺ سے کوئی چیز پوچھنا ہوتی میں آپ ﷺ کی ہیبت محسوس کرتا ہم یہ آرزو رکھتے تھے کہ کوئی اعرابی آئے۔ بزار نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے بہتر میں نے کوئی قوم نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپ ﷺ سے بارہ مسائل دریافت کیے جو سب قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ...... (بقرہ:219)۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ...... (بقرہ:217)، یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰى...... (بقرہ:220) یعنی شراب اور جوئے کا سوال، حرمت والے مہینوں کے بارے میں اور یتیموں کے بارے میں۔ اس طرح کے دیگر مسائل۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ اَمْ یہاں یا تو بل کے معنی میں ہے یا استفہام انکاری ہے۔ وہ مومنین اور کفار کو جانتا ہے آپ ﷺ پوری کائنات کی طرف اللہ کے رسول ہیں۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ ہے: یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ...... (نساء:153) ''ترجمہ: اہل کتاب تجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارے انہوں نے تو (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑی چیز کے بارے میں سوال کیا تھا۔ کہنے لگے ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے ظلم کی وجہ سے ایک کڑک دار آواز نے انہیں ہلاک کر دیا۔ محمد بن اسحٰق نے رافع بن حریملہ اور وہب بن زید نے مطالبہ

1۔ مسلم: کتاب اللعان:1131 2۔ مسلم: کتاب الفضائل 1830، 1831

کیا کہ اے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ محمد! کوئی آسمانی کتاب ہم پر نازل کیجئے جسے ہم پڑھیں اور ہمارے لیے نہریں جاری کر دیجئے ہم آپ کی اتباع اور تصدیق کریں گے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ ابو جعفر رازی نے ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! کاش ہمارے گناہوں کا کفارہ بھی بنو اسرائیل کے کفارہ کی طرح ہوتا۔ آپ نے یہ سنتے ہی تین دفعہ اللہ کی بارگاہ میں عرض کی نہیں خدایا نہیں ہم نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ کو عطا کیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو بنو اسرائیل کو دیا گیا۔ بنو اسرائیل میں سے کوئی شخص جب گناہ کرتا تو اسے اپنے دروازے پر لکھا پاتا۔ ساتھ ہی اس کا کفارہ بھی لکھا ہوتا۔ اگر وہ کفارہ دیتا تو دنیا میں رسوائی ہوتی۔ اور اگر کفارہ نہ دیتا تو آخرت میں رسوا ہو جاتا۔ اللہ نے تمہیں جو کچھ عطا فرمایا ہے وہ اس سے (بدرجہا) بہتر ہے جو بنو اسرائیل کو بخشا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے: وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا (نسا:110) "اور جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم کرے اپنے آپ پر پھر مغفرت مانگے اللہ تعالیٰ سے تو پائے گا اللہ کو بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا"۔ اور فرمایا "پانچ نمازیں، ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے مابین تمام گناہوں کا کفارہ ہے(1)۔ اور فرمایا "جس نے برائی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو وہ اسکے ذمے لکھی نہیں جاتی۔ اور اگر اس پر عمل کیا تو صرف ایک برائی لکھی جاتی ہے اور جس نے نیکی کا ارادہ کیا تو ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر وہ نیک کام کرے تو اس کے لئے دس گنا اجر ہوتا ہے اللہ پر ہلاک نہیں ہوتا مگر ہلاک ہونے والا"(2)۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ "اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ" مجاہد کا قول ہے کہ اس سے مراد ہے اللہ کو اعلانیہ دیکھنے سے قبل۔ فرماتے ہیں قریش نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ صفا پہاڑی ان کے لئے سونا بنا دیں۔ آپ نے فرمایا ہاں اور وہ تمہارے لیے ہے جیسے بنو اسرائیل کے لئے دستر خوان (مائدہ) پھر انہوں نے انکار کر دیا اور پھر گئے۔ سدی اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے۔ واللہ اعلم۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عناد اور سرکشی کے طور پر حضور ﷺ سے سوال کرنے والوں کی مذمت فرمائی۔ جس طرح بنو اسرائیل نے تکذیب اور عناد کی خاطر موسیٰ علیہ السلام سے طرح طرح کے سوالات کیے تھے۔ وَمَنۡ يَّتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ جو ایمان کے بدلے کفر خریدتا ہے وہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر گمراہی اور جہالت کی طرف نکل گیا ہے۔ یہی حال ہے ان لوگوں کا جنہوں نے انبیاء کی تصدیق اور اطاعت و انقیاد سے منہ موڑ لیا۔ اور ان کی مخالفت اور تکذیب کی خاطر بوجہ سرکشی اور کفران سے الٹے سیدھے سوال کرنا شروع کر دیئے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ كُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِۙ (ابراہیم:28) "ترجمہ: کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں۔" ابو العالیہ فرماتے ہیں خوشحالی کے بدلے تنگی لے لی جاتی ہے۔

وَدَّ كَثِيۡرٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ يَرُدُّوۡنَكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِكُمۡ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡحَـقُّ ۚ فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۱۱۰﴾

"دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (انکی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے جو انکے دلوں میں ہے (یہ سب کچھ) اسکے بعد جبکہ خوب واضح ہو چکا ہے ان پر حق۔ پس (اے غلامان

1۔ مسلم، الطہارۃ 14،15،16 2۔ مسند احمد 234/2

مصطفےٰ ﷺ) معاف کرتے رہو اور درگزر کرتے رہو یہاں تک کہ بھیج دے اللہ (ان کے بارے میں) اپنا حکم۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لیے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب دیکھ رہا ہے“۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے مومن بندوں کو کفار اہل کتاب کے راستے پر چلنے سے تنبیہ فرما رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کی ظاہری و باطنی عداوت اور مومنین اور ان کے نبی کی فضیلت کا علم ہونے کے باوجود وہ مسلمانوں سے جو حسد کرتے ہیں اس سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ مومنین کو عفو و درگذر اور برداشت سے کام لینے کا حکم دیا جا رہا ہے تاوقتیکہ اللہ کی طرف سے فتح و نصرت آ پہنچے۔ نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے کا حکم دیا اور اس کے بارے میں ترغیب دی جس طرح محمد بن اسحٰق نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حُیی بن اخطب اور یاسر بن اخطب یہود میں سے سب سے زیادہ عربوں سے عداوت رکھتے تھے۔ لہٰذا اللہ نے اپنے رسول کے سامنے بالخصوص ان کا ذکر فرمایا۔ وہ لوگوں کو اسلام سے روکنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ عبدالرزاق نے زہری سے روایت کیا ہے کہ یہ کعب بن اشرف یہودی تھا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ ابن ابی حاتم نے کعب بن مالک کے باپ سے روایت کیا ہے کہ کعب بن اشرف یہودی شاعر تھا اور آقائے دوعالم ﷺ کی ہجو کیا کرتا تھا (معاذ اللہ) وَدَّ كَثِيرٌ سے لے کر فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا تک آیت کریمہ کا مصداق وہی ہے۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک امی رسول نے انہیں ان کی کتابوں، رسولوں اور نشانیوں کے بارے میں خبر دی۔ بلکہ ان کی طرح ان کی تصدیق کی لیکن کفر و حسد اور سرکشی کی وجہ سے انہوں نے انکار کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ یعنی حق ان کے سامنے روز روشن کی طرح واضح تھا لیکن حسد نے انہیں انکار پر ابھارا۔ ربیع بن انس کا قول ہے ان کی اپنی طرف سے۔ مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ اس کے بعد کہ ان کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ بات ان کی تورات اور انجیل میں موجود تھی۔ حسد و سرکشی کی وجہ سے انہوں نے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ نبی کریم ﷺ ان کی نسل سے نہ تھے۔ جس طرح کہ قتادہ اور ربیع بن انس نے بھی کہا ہے۔ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ اس کے مثل یہ آیت ہے۔ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا...... (آل عمران:186) علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور سدی نے بھی لکھا ہے کہ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ (توبہ:5) ”ترجمہ: تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں“۔ اور قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ.......... عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (توبہ:29) ”ترجمہ: جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی۔ یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں ان دونوں آیات نے اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ ابو العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ اور سدی کا قول ہے کہ یہ آیت سیف سے منسوخ ہے۔ حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت زہری عروہ بن زبیر سے نقل کیا ہے کہ اسامہ بن زید نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب مشرکین اور اہل کتاب سے عفو و درگذر کرتے اور ان کی تکالیف برداشت کرتے۔ یہاں تک کہ دوسری آیات اتریں اور ان سے لڑائی کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت صناوید قریش میں کچھ لوگ مختلف غزوات میں مارے گئے۔ (اس کی اسناد صحیح ہے)۔ میں نے اسے صحاح ستہ میں تو نہیں پایا لیکن اس کی اصل صحیحین میں موجود ہے۔ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ...... تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ ۗ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی بات میں مشغول ہونے پر ابھار

رہے ہیں جس کا نفع اور فائدہ انجام کار قیامت کے دن انہیں ہی حاصل ہوگا۔ یعنی نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا تاکہ دنیا وآخرت دونوں میں ان کا بھلا ہوجائے۔ یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ الظّٰلِمِیۡنَ مَعۡذِرَتُهُمۡ وَلَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ (مومن:52)" ترجمہ: اس روز نفع نہ دے گی ظالموں کو ان کی عذرخواہی اور ان کے لئے لعنت ہوگی اور ان کے لیے (دوزخ کا) بدترین گھر ہوگا۔ اسی لیے فرمایا اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔ یعنی وہ کسی کے عمل سے غافل نہیں۔ خیر وشر کوئی چیز اسکے پاس ضائع نہیں ہوگی۔ ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا دی جائے گی۔ (ابن جریر فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ مومنین کو یہ خبر دی جارہی ہے کہ خیر وشر میں سے وہ جو کچھ بھی کریں گے خواہ خفیہ یا علانیہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ نیکی کا بدلہ احسان سے اور برائی کا بدلہ اس کے مثل سے دے گا۔ اس کلام میں اگرچہ خبر ہے۔ لیکن اس میں وعدہ، وعید، امر اور زجر وتوبیخ ہے۔ کیونکہ قوم کو یہ خبر دی جارہی ہے کہ ان کے تمام اعمال اس کی نظر میں ہیں۔ تاکہ وہ سنجیدگی سے اس کی اطاعت کریں اور معصیت سے بچیں۔ تمام اعمال اس کے پاس محفوظ ہیں اور وہ ان پر بدلہ عطا فرمائے گا۔ قولہ "بَصِيۡرٌ" مبصر کے بدلے بصیر کہا جس طرح مبدع کے بدلے بدیع اور مولم کی جگہ الیم فرمایا۔ ابن ابی حاتم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس آیت میں سمیع بصیر پڑھتے سنا آپ ارشاد فرمارہے تھے کہ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

وَقَالُوۡا لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ تِلۡكَ اَمَانِيُّهُمۡ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ۚ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور انہوں نے کہا نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی۔ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو ہاں جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لیے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتاب۔ اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات تو (اب) اللہ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے"۔

یہود ونصاریٰ کی خود فریبی کا بیان ہورہا ہے کہ ان میں سے ہر گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ جنت میں داخلے کا حقدار صرف وہی ہے۔ سورۂ مائدہ میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں۔ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ:18) اس کے جواب میں اللہ نے ان کی تکذیب کی اور انہیں بتایا کہ ان گناہوں کے بسبب ان پر عذاب ہوگا۔ اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے ہوتے تو وعید کیوں ہوتی۔ نیز جس طرح پہلے گذر چکا ہے کہ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ آگ انہیں نہیں چھوئے گی مگر چند ایام پھر وہ جنت چلے جائیں گے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے دعویٰ کی تردید فرمائی تھی۔ اسی طرح یہاں بھی ان کے دعویٰ بلا دلیل و برہان کو رد فرمادیا۔ تِلۡكَ اَمَانِيُّهُمۡ ؕ ابوالعالیہ کا قول ہے انہوں نے ناحق اللہ پر تمنائیں کی تھیں۔ قتادہ اور ربیع بن انس سے بھی یہی مروی

رہے ہیں جس کا نفع اور فائدہ انجام کار قیامت کے دن انہیں ہی حاصل ہوگا۔یعنی نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا تا کہ دنیا و آخرت دونوں میں ان کا بھلا ہو جائے۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (مومن:52)'' ترجمہ: اس روز نفع نہ دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی اور ان کے لئے لعنت ہوگی اور ان کے لیے (دوزخ کا) بدترین گھر ہوگا۔ اسی لیے فرمایا اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔یعنی وہ کسی کے عمل سے غافل نہیں۔ خیر و شر کوئی چیز اسکے پاس ضائع نہیں ہوگی۔ ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا دی جائے گی۔ (ابن جریر فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ مومنین کو یہ خبر دی جارہی ہے کہ خیر و شر میں سے وہ جو کچھ بھی کریں گے خواہ خفیہ یا علانیہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ نیکی کا بدلہ احسان سے اور برائی کا بدلہ اس کے مثل سے دے گا۔ اس کلام میں اگرچہ خبر ہے۔ لیکن اس میں وعدہ، وعید، امر اور زجر و توبیخ ہے۔ کیونکہ قوم کو یہ خبر دی جارہی ہے کہ ان کے تمام اعمال اس کی نظر میں ہیں۔ تا کہ وہ سنجیدگی سے اس کی اطاعت کریں اور معصیت سے بچیں۔ تمام اعمال اس کے پاس محفوظ ہیں اور وہ ان پر بدلہ عطا فرمائے گا۔ قولہ ''بَصِيْرٌ'' مبصر کے بدلے بصیر کہا جس طرح مبدع کے بدلے بدیع اور مولم کی جگہ الیم فرمایا۔ ابن ابی حاتم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس آیت میں سمیع بصیر پڑھتے سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے کہ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور انہوں نے کہا نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی۔ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں آپ (انہیں) فرمایئے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو ہاں جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لیے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتاب۔ اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات تو (اب) اللہ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے''۔

یہود و نصاریٰ کی خود فریبی کا بیان ہو رہا ہے کہ ان میں سے ہر گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ جنت میں داخلے کا حقدار صرف وہی ہے۔ سورۂ مائدہ میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ:18) اس کے جواب میں اللہ نے ان کی تکذیب کی اور انہیں بتایا کہ ان گناہوں کے بسبب ان پر عذاب ہوگا۔ اگر وہ اپنے دعوی میں سچے ہوتے تو وعید کیوں ہوتی۔ نیز جس طرح پہلے گذر چکا ہے کہ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ آگ انہیں نہیں چھوئے گی مگر چند ایام پھر وہ جنت چلے جائیں گے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے دعوی کی تردید فرمائی تھی۔ اسی طرح یہاں بھی ان کے دعوی بلا دلیل و برہان کو رد فرما دیا۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ابو العالیہ کا قول ہے انہوں نے ناحق اللہ پر تمنائیں کی تھیں۔ قتادہ اور ربیع بن انس سے بھی یہی مروی

ہے۔ پھر فرمایا: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اے محمد! انہیں فرما دیجئے۔ برہان کا معنی ابوالعالیہ، مجاہد، سدی اور ربیع بن انس نے حجت کیا ہے۔ قتادہ نے اس سے مراد "بینۃ" گواہی لیا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ جس نے بھی اللہ وحدہ لاشریک کے ساتھ اعمال میں خلوص اختیار کیا۔ ایک دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ (آل عمران:120)۔

ابوالعالیہ اور ربیع نے بھی اسلام سے مراد اخلاص لیا ہے۔ سعید بن جبیر نے اسلام سے اخلاص اور وجہ سے مراد دین لیا ہے۔ وَهُوَ مُحْسِنٌ یعنی رسول اکرم ﷺ کی اتباع کی۔ عمل مقبول کے لئے دو شرطیں ہیں۔ 1۔ خالص اللہ وحدہ لاشریک کے لئے ہو۔ 2۔ صحیح ہو اور شریعت کے موافق ہو۔ اگر خلوص پر تو مبنی ہو لیکن درست نہ ہو تو وہ عمل مقبول نہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا امر نہ ہو تو وہ مردود ہے (مسلم بروایت سیدہ عائشہ)۔ پس راہبوں وغیرہ کے اعمال کو خلوص پر مبنی ہوں وہ اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک ان کے ساتھ اطاعت رسول اکرم ﷺ شامل نہ ہو۔ کیونکہ آپ ان کی بلکہ تمام مخلوق کی طرف مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ ان جیسے لوگوں کے بارے میں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (فرقان:23) "ترجمہ: اور ہم متوجہ ہونگے ان کے کاموں کی طرف اور انہیں گرد وغبار بنا کر اڑا دیں گے۔" اور فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ .... حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا (نور:39) "ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہو کسی چٹیل میدان میں خیال کرتا ہے اسے پیاسا کہ پانی ہے حتیٰ کہ جب (پینے کے لئے) اس کے قریب آتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا اور فرمایا: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۙ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (الغاشیہ:2-5) "ترجمہ کتنے ہی چہرے اس دن ذلیل وخوار ہونگے مشقت میں مبتلا تھکے ماندے داخل ہوں گے دھکتی ہوئی آگ میں انہیں پلایا جائے گا کھولتے ہوئے چشمہ سے"۔

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے اس کی تاویل میں فرمایا اس سے مراد یہود ونصاریٰ کے راہب ہیں۔ اگر عمل بظاہر شریعت کے تو موافق ہو لیکن اخلاص سے خالی ہو تو یہ بھی مردود ہے۔ ریاکار لوگوں اور منافقین کے اعمال کا یہی حال ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ ...... وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (نساء:142) "بے شک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) اور جب کھڑے ہوتے ہیں نماز کی طرف تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر (وہ بھی عبادت کی نیت سے نہیں بلکہ) لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہیں ذکر کرتے اللہ تعالیٰ کا مگر تھوڑی دیر اور فرمایا: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ...... وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (ماعون:7) "ترجمہ: پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز (کی ادائیگی) سے غافل ہیں وہ جو ریاکاری کرتے ہیں اور (مانگے بھی) نہیں دیتے روزمرہ استعمال کی چیز"۔ اسی طرح فرمایا: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (کہف:110) "ترجمہ: پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو"۔ اور اس آیت کریمہ میں فرمایا (بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ) (بقرہ:112) اور فرمایا: فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اللہ تعالیٰ نے انہیں حصول اجر کی ضمانت دی اور خوف سے مامون کر دیا۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ مستقبل میں ان پر کوئی خوف نہیں۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ گذشتہ پر کوئی غم نہیں ہوتا۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ آخرت میں ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور موت سے وہ غم زدہ نہیں ہوں گے۔ قوله وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى ...... اللہ تبارک وتعالیٰ

ان کے تناقض، بغض، عداوت اور عناد کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں۔ محمد بن اسحٰق نے عکرمہ سعید بن جبیر کی روایت سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب نجران کے عیسائیوں کا وفد آپ ﷺ کی بارگاہ میں آیا۔ تو یہود کے علماء ان کے پاس آئے اور آپ ﷺ کے دربار میں جھگڑنے لگے۔ رافع بن حرملہ نے کہا تم کسی چیز پر نہیں ہو۔ اور حضرت عیسیٰ اور انجیل سے کفر کیا۔ اہل نجران کے نصاریٰ میں سے ایک آدمی نے یہودیوں سے کہا۔ تم کسی چیز پر نہیں (حق پر نہیں)۔ حضرت موسیٰ کی نبوت کا انکار کیا اور تورات کو تسلیم کرنے سے مکر گیا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ارشاد فرمایا دونوں میں سے ہر فریق کے لیے اپنی کتاب میں دوسرے کی تصدیق موجود ہے پھر ان کا یہ قول کس قدر لغو ہے۔ مجاہد نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ ابتدائی زمانہ میں حق پر تھے۔ قتادہ نے بھی کہا ہے کہ وہ دین حق پر قائم تو تھے لیکن بعد میں انہوں نے بدعتیں نکالیں اور فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک روایت میں ان کا قول ابوالعالیہ اور ربیع بن انس کی طرح بھی ہے۔ یہ اہل کتاب عہد رسالت مآب ﷺ میں تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر فریق دوسرے طائفہ پر الزام تراشی میں حق پر تھا۔ لیکن آیت کا ظاہری سیاق وسباق ان کی مذمت کا تقاضا کرتا ہے۔ جو انہوں نے اپنے علم سے اس کے برعکس کہا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ یعنی یہ بات انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تورات اور انجیل سے ہر ایک کی شریعت ایک خاص وقت کے لئے تھی۔ لیکن انہوں نے آپس میں عناد، کفر اور فاسد بمقابل فاسد کے ساتھ انکار کر دیا جس طرح ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کی پہلی روایت میں گذر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اس کے ساتھ یہود و نصاریٰ کی جہالت کو واضح کیا جس کا اظہار ان کی گفتگو میں ہوا تھا۔ یہ اشارے کنایے کے باب سے ہے۔ لَا يَعْلَمُوْنَ کا مصداق کون لوگ ہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ ربیع بن انس اور قتادہ کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ ابن جریج کہتے ہیں میں نے عطاء سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔ یہ تورات وانجیل اور یہود و نصاریٰ سے قبل قومیں تھیں۔ سدی نے لکھا ہے کہ یہ اہل عرب ہیں جنہوں نبوت محمدی کا انکار کیا۔ ابن جریر کا قول ہے کہ اس کا مفہوم عام ہے اور سب کو شامل ہے کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی کوئی دلیل بھی نہیں۔ لہٰذا سب پر محمول کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ..... یعنی اللہ انہیں قیامت کے دن جمع کرے گا اور اپنی قضائے عدل سے فیصلہ کرے گا جس میں ذرہ برابر بھی جور وستم نہیں ہوگا۔ سورۂ حج میں بھی اسی مضمون کا ذکر آیا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ..... (مائدہ:69) ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصرانی اور جو بھی (ان میں سے) ایمان لایا اللہ پر اور روز قیامت پر اور نیک عمل کیے تو نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔ اور فرمایا: قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ..... بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ (سبا:26) ''ترجمہ: فرمایئے ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر وہ فیصلہ کرے گا ہمارے درمیان حق (وانصاف) کے ساتھ وہی بہترین فیصلہ کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو روک دے اللہ کی مسجدوں سے کہ ذکر کیا جائے ان میں اس کے نام (پاک) کا اور کوشاں ہو انکی ویرانی میں انہیں مناسب نہیں تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے ان کے لیے دنیا میں (بھی بڑی) ذلت ہے اور ان کے لیے آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے''۔

اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے مساجد میں داخلہ سے روکا اور ان کی بربادی کی سعی کی۔ اس میں دو اقوال ہیں۔

(1) عوفی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ نصاریٰ ہیں۔ جو بیت المقدس میں گندگی ڈال دیتے اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے سے روکتے۔ عبد الرزاق نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ یہ بخت نصر اور اسکے ساتھی ہیں جنہوں نے بیت المقدس کو اجاڑ دیا۔ اور نصاریٰ نے ان کی مدد کی۔ سعید بن قتادہ سے روایت کیا ہے کہ یہ اللہ کے دشمن نصاریٰ تھے یہود کے ساتھ بغض کی وجہ سے انہوں نے بیت المقدس کی بربادی میں بخت نصر بابلی مجوسی کی مدد کی۔ سدی کا قول ہے کہ انہوں نے بیت المقدس کو ملیامیٹ کرنے میں بخت نصر سے تعاون کیا۔ اسی نے اسے اجاڑ کر اس میں مردار پھینکنے کا حکم دیا۔ رومیوں نے اس کے ساتھ اس لیے تعاون کیا تھا کہ بنو اسرائیل نے یحییٰ بن زکریا کو قتل کر دیا تھا۔ حسن بصری سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

(2) ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد مشرکین مکہ ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے دن رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ حتیٰ کہ آپ نے ذی طوی کے مقام پر اپنی قربانی کو ذبح کیا اور ان سے معاہدہ صلح طے کیا۔ اور فرمایا اس مقدس گھر سے کوئی نہیں روکتا۔ آدمی اپنے باپ یا بھائی کے قاتل سے ملتا تھا تو اس سے بھی تعرض نہیں کرتا تھا۔ وہ کہنے لگے وہ شخص ہمارے ہاں کس طرح آ سکتا ہے جس نے بدر کے دن ہمارے آباء کو قتل کیا۔ ''وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا'' اس لیے کہ انہوں نے حج اور عمرے کی خاطر آنے والوں کو روک دیا تھا۔ ابن ابی حاتم اور محمد بن اسحٰق نے بروایت عکرمہ یا سعید بن جبیر ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب قریش نے نبی کریم ﷺ کو کعبہ میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ پھر ابن جریر نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔ اور دلیل یہ دی ہے کہ قریش نے کعبہ کی بربادی کی سعی نہیں کی جبکہ رومیوں نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تھا۔ (مؤلف کی رائے) میرے نزدیک دوسرا قول جسے ابن زید اور ابن عباس نے نقل کیا ہے زیادہ راجح ہے کیونکہ نصاریٰ نے جب یہود کو بیت المقدس سے روکا تو گویا ان کا دین یہود کے دین سے زیادہ مستقیم تھا۔ حالانکہ وہ ان سے زیادہ قریب تھے۔ اور اس وقت یہود کا ذکر قابل قبول نہ تھا کیونکہ وہ اس سے قبل حضرت داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے ملعون قرار پا چکے تھے۔ اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ نیز جب یہود و نصاریٰ کی مذمت کا بیان ہو چکا تو مشرکین کی مذمت کا بیان شروع ہوا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں داخل اور مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے روک دیا۔ ابن جریر کا یہ کہنا کہ قریش نے کعبہ کو برباد نہیں کیا۔ اس سے بڑی بربادی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ اور اسکے صحابہ کو مکہ سے نکال دیا اور بیت اللہ کو بتوں اور شرک سے بھر دیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ ...... وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (انفال:34) ''ترجمہ: (مکہ سے آپ کی ہجرت کے بعد) اب کیا وجہ ہے ان کے لئے کہ نہ دے عذاب انہیں اللہ حالانکہ وہ روکتے ہیں (مسلمانوں کو) مسجد حرام سے اور نہیں ہیں وہ اس کے متولی اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی''۔ اور ارشاد فرمایا: مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۞ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (توبہ:9-18) ''نہیں ہے روا مشرکوں کیلئے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو حالانکہ وہ خود گواہی دے رہے ہیں اپنے نفسوں پر کفر کی یہ وہ (بدنصیب) ہیں ضائع ہو گئے جن کے اعمال اور (دوزخ کی) آگ میں ہی یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ صرف وہی آباد کر سکتا ہے اللہ کی مسجدوں کو جو ایمان لایا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر اور قائم کیا نماز کو اور ادا کیا زکوٰۃ کو اور نہ ڈرتا ہے اللہ کے سوا کسی سے پس امید

ہے کہ یہ لوگ ہو جائیں ہدایت پانے والوں سے'' اور ارشاد فرمایا: هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ...... كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (فتح:25) '' ترجمہ: یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں بھی روک دیا مسجد حرام (میں داخل ہونے) سے اور قربانی کے جانوروں کو بھی کہ وہ بند ہی رہیں اور اپنی جگہ تک نہ پہنچ سکیں اور اگر نہ ہوتے (مکہ میں چند مسلمان مرد اور چند مسلمان عورتیں جن کو تم نہیں جانتے (اور یہ اندیشہ نہ ہوتا) کہ تم روند ڈالو گے انہیں سو تمہیں پہنچے گی ان کی وجہ سے عار بے علمی کے باعث (نیز) تا کہ داخل کر دے اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے اور اگر یہ (کلمہ گو) الگ ہو جاتے تو (اس وقت) جنہوں نے کفر کیا ان میں سے تو ہم انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دیتے۔'' اور ارشاد فرمایا: اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (توبہ: 18) '' صرف وہی آباد کر سکتا ہے اللہ کی مسجدوں کو جو ایمان لایا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر اور قائم کیا نماز کو اور ادا کیا زکوٰۃ کو اور نہ ڈرتا ہو اللہ کے سوا کسی سے'' تعمیر اور آباد کرنے سے مراد اسے مزین کرنا اور بنانا نہیں بلکہ اسکا مقصد ان میں اللہ کا ذکر کرنا، اس کی شریعت کو قائم کرنا اور آلودگی اور شرک سے پاک کرنا ہے ارشاد ہوتا ہے: اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ (بقرہ: 114) '' ان کے لیے مناسب نہ تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے''۔ یہ خبر ہے اس کا معنی طلب ہے یعنی جب تم ان پر قادر ہو جاؤ تو معاہدہ اور جزیہ کے سوا انہیں اس میں داخل مت ہونے دو۔ اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو اگلے سال 9 ہجری میں حکم دیا کہ منیٰ کے مقام پر یہ اعلان کر دیا جائے کہ آج کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکے گا۔ جس کا کوئی معاہدہ ہوا سے اس وقت تک رخصت ہے۔ یہ حکم اللہ کے اس فرمان کی تصدیق اور عملی صورت تھی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ (توبہ: 28) '' اے ایمان والو مشرکین تو نرے ناپاک ہیں سو وہ قریب نہ ہونے پائیں مسجد حرام سے اس سال کے بعد اور اگر تم اندیشہ کرو تنگدستی کا تو غنی کر دے گا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اگر چاہے گا پس اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑا دانا ہے''۔ بعض کا قول ہے کہ ان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ مسجد میں آئیں مگر ڈرتے ہوئے اور مومنین کی ہیبت سے ڈرتے ہوئے اور رعب کی وجہ سے کانپتے ہوئے چہ جائیکہ کہ وہ انہیں روک دیں اور اس پر قابض رہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کفار کا ظلم نہ ہوتا تو حق اور واجب یہی تھا۔ ایک قول کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو بشارت تھی کہ وہ مسجد حرام اور دیگر تمام مساجد پر غالب آئیں گے۔ اور اللہ مشرکین کو رسوا کر دے گا اس طرح کہ کوئی مشرک مسجد حرام میں داخل نہیں ہو سکے گا مگر ڈرتے ہوئے کہ کہیں پکڑا نہ جائے اور سزا پائے یا اسلام قبول نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔ جس طرح کہ پہلے گذرا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو مسجد حرام میں داخلے سے روکنے کا وعدہ پورا کر دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ جزیرہ عرب پر دو مذہب باقی نہ رہیں اور یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے جلا وطن کر دیا جائے وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔ یہ نہیں ہے مگر مسجد حرام کے اکناف و اطراف کو مشرف کرنا اور اس بقعہ زمین کو پاک کرنا جس میں اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا تھا۔ یہ دنیا میں ان کی رسوائی تھی۔ یہ جزاء بالمثل (ادلے کا بدلہ) ہے۔ جس طرح انہوں نے مومنین کو مسجد حرام سے روکا تھا اسی طرح انہیں روک دیا گیا۔ جس طرح انہوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے جلا وطن کیا تھا۔ انہیں بھی جلا وطن کر دیا گیا۔ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ آخرت میں ان کے لئے عظیم عذاب ہے بیت اللہ شریف کی حرمت کو پامال کرنے، اس کے اردگرد بت نصب کرنے، اس کے پاس غیر اللہ سے دعا مانگنے، ننگے طواف کرنے وغیرہ جیسے ناپسندیدہ افعال جنہیں اللہ اور اس کا رسول ﷺ ناپسند فرماتے ہیں۔ جنہوں نے اس سے مراد بیت المقدس لیا ہے۔ کعب احبار کا قول ہے کہ نصاریٰ جب بیت المقدس پر غالب آ گئے تو انہوں نے اسے برباد کر دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

روئے زمین پر کوئی ایسا عیسائی نہیں جو بیت المقدس میں داخل ہونے کے وقت کانپتا نہ ہو۔ سدی کا قول ہے کہ روئے زمین پر آج کوئی ایسا رومی نہیں جو اس میں داخل ہو مگر اسے یہ ڈر نہ ہو کہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ یا اسے یہ خدشہ نہ ہو کہ جزیہ ادا کرنا پڑے گا اور وہ ادا کرے گا۔ قتادہ کا قول ہے کہ وہ مساجد میں داخل نہیں ہوتے مگر چھپکے سے۔ (میں کہتا ہوں) اس میں اس بات کی نفی نہیں کہ یہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل نہ ہو۔ نصاریٰ نے جب بیت المقدس پر چڑھائی کی تو اس صخرہ (چٹان) کی بے حرمتی کی جس کی طرف منہ کر کے نصاریٰ نماز ادا کرتے تھے تو انہیں ذلت اور رسوائی ملی ماسوائے کچھ اوقات کے۔ اسی طرح جب یہود نے نصاریٰ سے بھی بڑھ کر نافرمانی کی تو ان کی سزا اس بھی زیادہ تھی۔ واللہ اعلم سدی، عکرمہ، اور وائل بن داؤد کے نزدیک رسوائی سے مراد امام مہدی علیہ السلام کے زمانے کی رسوائی ہے۔ قتادہ نے اس سے مراد جزیہ کی ادائیگی لی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ دنیا کی رسوائی عام ہے۔ ایک حدیث شریف میں بھی دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ جس طرح کہ امام احمد نے بشر بن ارطاۃ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یوں دعا مانگا کرتے تھے۔ (اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ کُلِّھَا وَ اَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَ عَذَابِ الْاٰخِرَۃِ) (1) یہ حدیث حسن ہے لیکن صحاح ستہ میں مذکور نہیں۔ اس کے راوی صحابی حضرت بشر بن ارطاۃ سے صرف دو حدیثیں مروی ہیں ایک یہ اور دوسری وہ حدیث جس میں ہے کہ جنگ کے دوران ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی۔ سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے بیشک اللہ تعالیٰ فراخ رحمت والا اور خوب جاننے والا ہے''۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کو جنہیں مکہ مکرمہ اور بیت اللہ شریف سے نکال دیا گیا تھا اس آیت میں تسلی دی جا رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ مکہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے اور کعبہ آپ کے سامنے ہوتا۔ جب آپ ہجرت فرمائے مدینہ ہوئے تو سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا۔ اسی لیے اللہ فرما رہے ہیں کہ مشرق و مغرب سب سمتیں اسی کی ہیں۔ (ابو عبید قاسم بن سلام اپنی کتاب ناسخ و منسوخ میں بروایت عطاء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں سب سے پہلا منسوخ حکم یہی قبلہ کا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور بیت عتیق کو چھوڑ دیا پھر یہ حکم منسوخ کر کے بیت العتیق (کعبہ) کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا۔ ارشاد فرمایا: وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْھَكَ..... (بقرہ:149) علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن میں سے سب سے پہلے قبلہ کا حکم منسوخ ہوا۔ جب آپ ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں قیام فرما ہوئے۔ وہاں کے باشندے یہودی تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا تو یہودی خوش ہوئے۔ چنانچہ آپ ﷺ دس سے کچھ اوپر چند ماہ تک اسی طرح نماز ادا فرماتے رہے۔ لیکن آپ کو قبلہ ابراہیمی پسند تھا اور آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت آیت کریمہ: قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْھِكَ سے لے کر وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ (بقرہ:144) تک نازل ہوئی۔ یہود یہ سن کر شبہ میں پڑ گئے اور کہنے لگے: مَا وَلّٰىھُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْھَا (بقرہ:142) انہیں اپنے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ اور فرمایا تم جس طرف بھی رخ کرو اسی طرف اللہ ہے۔ عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ قبلہ کی

1۔ مسند امام احمد: 181/4

طرف ہے۔جس طرف تمہارا منہ ہو خواہ مشرق ہو یا مغرب۔مجاہد نے روایت کیا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا کعبہ بیت اللہ ہے اسی کی طرف رخ کرو۔ابوالعالیہ،حسن،عطاء خراسانی،عکرمہ،قتادہ،سدی اور زید بن اسلم سے اسی طرح مروی ہے۔بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ آیت کعبہ کی طرف رخ کرنے سے قبل نازل ہوئی تھی۔اس کا مقصد یہ تھا کہ صحابہ کرام اور نبی ﷺ کو یہ بتایا جائے کہ سب جہتیں اللہ کی ہیں۔مشرق و مغرب جس طرف رخ پھیرو اسی طرف اللہ ہے اس سے کوئی جگہ خالی نہیں۔جیسے ارشاد فرمایا: وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا (مجادلہ:7) ''ترجمہ: اور نہ اس سے کم ہیں اور نہ زیادہ ہیں مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں وہ ہوں''۔پھر یہ حکم منسوخ کر کے کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کو فرض قرار دیا گیا۔اور یہ قول کہ اس سے کوئی جگہ خالی نہیں سے مراد اس کا علم لیا جائے تو کلام صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام معلومات کو محیط ہے۔کیونکہ اس کی ذات عالیہ کسی چیز میں محصور نہیں ہو سکتی۔اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ابن جریر کا قول ہے کہ بعض علماء کی رائے میں یہ آیت اللہ کی طرف سے اس بات کی اجازت تھی کہ سفر اور خوف میں نوافل میں جس طرف چاہیں منہ کر سکتے ہیں۔سعید بن جبیر نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ اسی طرف منہ کر کے نماز ادا فرماتے جس طرف سواری کا رخ ہوتا اور ذکر فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہی معمول تھا۔اور اس آیت کی تاویل کرتے۔مسلم،ترمذی،نسائی،ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے اسے روایت کیا ہے اور ابن عمر اور عامر بن ربیعہ سے صحیحین میں اس کی اصل موجود ہے۔صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب نماز خوف کے بارے میں پوچھا جاتا تو آپ اس کا طریقہ بیان فرماتے۔اور فرماتے اگر خوف اس سے بھی شدید ہو تو پیدل اور سوار کھڑے کھڑے نماز پڑھ لیا کرو۔خواہ منہ قبلہ کی طرف ہو یا نہیں۔نافع کا خیال ہے کہ ابن عمر اسے مرفوع بیان فرماتے تھے۔(1)

(مسئلہ) امام شافعی کا مشہور مذہب یہ ہے کہ سفر خواہ پر امن ہو یا لڑائی کے لئے سواری پر نوافل پڑھنا جائز ہے۔امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔امام مالک اور ایک جماعت اس کے خلاف ہے۔ابو یوسف اور ابو سعید اصطخری نے شہر میں بھی سواری پر نوافل کو جائز قرار دیا ہے۔ابو یوسف نے انس بن مالک سے اسی طرح روایت کیا ہے۔اور ابو جعفر طبری نے تو اسے پیدل کے لئے بھی جائز قرار دیا ہے۔ابن جریر نے لکھا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جن پر قبلہ مشتبہ ہو گیا تھا اور انہوں نے اندازے سے نماز پڑھ لی تو اللہ نے فرمایا شرق و غرب سب میرے لیے ہیں جس طرف تمہارا منہ ہو مجھے پاؤ گے۔اور وہی تمہارا قبلہ ہے اس طرح انہیں بتایا کہ تمہاری نماز درست ہے۔محمد بن اسحٰق اہوازی نے اپنی سند سے عامر بن ربیعہ سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک تاریک رات میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ایک جگہ ہمارا پڑاؤ ہوا۔لوگوں نے پتھر لے لے کر مسجد سی بنائی اور نماز پڑھی صبح پتہ چلا کہ ہمارا رخ غلط سمت میں تھا۔ہم نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں عرض کی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ترمذی اور ابن ابی حاتم نے اسے ابو الربیع سمان سے اسی طرح نقل کیا ہے۔اس کا نام اشعث بن سعید بصری ہے اور وہ ضعیف ہے۔ترمذی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور اس کی سند اس طرح نہیں۔ہم اسے صرف اشعث السمان سے روایت کرتے ہیں اور وہ ضعیف الحدیث ہے۔میں کہتا ہوں اس کا شیخ عاصم بھی ضعیف ہے۔بخاری کا قول ہے کہ وہ منکر الحدیث ہے۔ابن معین کا کہنا ہے کہ ضعیف ہے اس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔اور ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ متروک ہے۔واللہ اعلم اس آیت کی تفسیر میں ابو بکر ابن مردویہ نے ایک دوسری سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سریہ بھیجا جس میں میں بھی شامل تھا۔نماز کا وقت تھا۔تاریکی کے سبب ہمیں سمت قبلہ کا علم نہ ہوا۔ایک گروہ

1۔البخاری: تفسیر سورۂ بقرہ،39,38/6

نے کہا قبلہ شمال کی طرف ہے چنانچہ ہم نے نماز ادا کی اور لکیریں کھینچ دیں۔ صبح جب سورج طلوع ہوا تو پتہ چلا کہ یہ سمت غلط تھی۔ جب ہم سفر سے واپس آئے تو آپ ﷺ سے دریافت کیا۔ آپ یہ بات سن کر خاموش ہو گئے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ دارقطنی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیں اعادے کا حکم نہ فرمایا اور ہماری نماز کو درست قرار دیا۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ لیکن ان سب اسناد میں ضعف ہے۔ شاید یہ سب روایات ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تقویت کا باعث ہوں۔ لیکن جس آدمی کو اپنی غلطی کا علم ہو جائے اس کی نماز کے اعادہ کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ اور یہ اس بات کے دلائل ہیں کہ قضا نہیں کی جائے گی۔ واللہ اعلم۔ ابن جریر اور بعض دیگر مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت نجاشی کے سبب نازل ہوئی۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ تمہارا بھائی انتقال کر گیا ہے۔ اس کی نماز جنازہ پڑھو۔ تو بعض نے کہا ہم ایک غیر مسلم کی نماز جنازہ کس طرح پڑھیں۔ تو یہ آیت اتری: وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ ...... اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ (آل عمران:199) ''ترجمہ: اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی (اور نیاز مندی) کرنے والے اللہ کے لئے''۔ پھر بعض کہنے لگے کہ وہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھتا تھا۔ آخر اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ روایت غریب ہے۔ واللہ اعلم۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نجاشی نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے اس وقت تک نماز پڑھی جب تک اسے قبلہ کی منسوخی کا علم نہ ہوا تھا۔ جیسا کہ قرطبی نے قتادہ سے نقل کیا ہے۔ قرطبی کا قول ہے کہ حضور ﷺ نے نجاشی کی نماز جنازہ پڑھی۔ غائبانہ جنازہ کے جواز کے قائلین کی دلیل یہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس میں حضور ﷺ کی خصوصیت ہونے کی تین دلیلیں ہیں۔ 1۔ آپ ﷺ نے اسے دیکھ لیا۔ زمین آپ کے سامنے لپیٹ دی گئی تھی۔ 2۔ یہ احتمال ہے کہ اس وقت اس کے پاس جنازہ پڑھنے والا کوئی نہ ہو۔ قرطبی نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ لیکن قرطبی کا قول ہے کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ کے دربار میں کوئی مسلمان شخص نہ ہو۔ ابن عربی اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ شاید ان کے نزدیک نماز جنازہ مشروع نہ ہو۔ یہ جواب بہت اچھا ہے۔ 3۔ حضور ﷺ نے اس کی نماز جنازہ اس لیے پڑھی کہ دوسرے بادشاہوں کے لئے تالیف قلوب کا سبب ہو۔ واللہ اعلم۔

حافظ ابوبکر بن مردویہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' مشرق و مغرب کے مابین اہل مدینہ، اہل شام اور اہل عراق کے لئے قبلہ ہے۔'' اور اس کی یہاں مناسبت ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے(1)۔ ترمذی کا قول ہے کہ یہ متعدد سندوں سے ابوہریرہ سے مروی ہے۔ اور بعض اہل علم نے اس کے ایک راوی ابومعشر کے حافظہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ امام ترمذی نے اسے ایک اور سند سے بھی روایت کیا ہے۔ اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ بخاری کا قول ہے کہ یہ روایت ابومعشر کی روایت کی نسبت اقوی اور اصح ہے ترمذی کا قول ہے کہ بہت سے صحابہ کرام سے بھی یہی مروی ہے۔ یعنی عمر بن خطاب، علی اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ابن عمر کا قول ہے کہ قبلہ کی سمت میں رخ کر کے اگر تو کھڑا ہو تو مغرب کو دائیں اور مشرق کو اپنے بائیں رکھے تو ان کے مابین قبلہ ہے۔ ابن مردویہ، دارقطنی اور بیہقی کے مطابق ابن عمر کی مشہور رائے یہی ہے ابن جریر کا قول ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ بوقت دعا تم جس طرف بھی منہ کرو گے مجھے اسی طرف پاؤ گے اور میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔ حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ جب آیت ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن:60)، اتری تو لوگوں نے کہا کس طرف دعا کریں۔ اس کے جواب میں یہ آیت فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا اتری۔ ابن جریر کا قول ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ:115) وہ اپنی

1۔ تحفۃ الاحوذی، ابواب الصلوۃ 318/2

تمام مخلوق کو جود وسخا اور فضل وکرم سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ ان کے تمام اعمال سے آگاہ ہے اس کی نگاہ سے کوئی چیز غائب نہیں چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

''اور یہ کہتے ہیں کہ بنالیا ہے اللہ نے (اپنا) ایک بیٹا، پاک ہے وہ (اس تہمت سے) بلکہ اسی کی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ سب اسی کے فرمانبردار ہیں موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب ارادہ فرماتا ہے کسی کام کا تو صرف اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے''۔

ان دونوں آیات کریمہ میں نصاریٰ اور ان جیسے یہود اور مشرکین عرب کا رد کیا جارہا ہے۔ جنہوں نے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دعویٰ کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ذات سبحانہ وتعالیٰ اولاد سے مبرا ومنزہ ہے۔ بات اس طرح نہیں جس طرح انہوں نے افتراء پردازی کی ہے بلکہ آسمان وزمین اور ان کے مابین جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ ان پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ وہی ان کا خالق ورازق، ان کو مسخر کرنے والا، انہیں چلانے والا اور اپنی مرضی سے ان میں تصرف کرنے والا ہے۔ سب اس کے تابع فرمان اور اس کی ملکیت میں ہیں، تو ان میں سے کوئی اس کا بیٹا (یا بیٹی) کس طرح ہو سکتا ہے۔ اولاد دو متناسب چیزوں سے پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس ذات قدوس کی کوئی نظیر نہیں اور نہ ہی اس کی عظمت وکبریا میں اس کا کوئی شریک ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی بیوی ہے۔ تو اولاد کیسے ہو سکتی ہے جیسے ایک اور جگہ فرمایا: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ...... وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (انعام:101) ''ترجمہ: موجد ہے آسمانوں اور زمین کا کیوں کر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کو اچھی طرح جاننے والا ہے''۔ ایک اور جگہ فرمایا۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا...... يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا۔ ''ترجمہ: اور کفار کہتے ہیں بنالیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا (اے کافرو!) یقیناً تم نے ایسی بات کی ہے جو سخت معیوب ہے قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے اور نہیں جائز رحمٰن کے لئے کہ وہ بنائے کسی کو (اپنا) فرزند کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں مگر وہ حاضر ہوگی رحمٰن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح اور وہ سب پیش ہونگے اس کے سامنے قیامت کے دن تنہا'' (مریم:95-88) اور فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص:4-1) ''اے حبیب) فرمادیجئے وہ اللہ ہے یکتا اللہ صمد ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے'' ان آیات کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرار دیا ہے کہ وہی مالک عظیم ہے۔ اس کی کوئی نظیر اور شبیہ نہیں اس کے سوا تمام اشیاء اس کی مخلوق اور پروردہ ہیں ان میں سے کوئی اس کی اولاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ بخاری سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ نافع بن جبیر بن مطعم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ابن آدم نے میری تکذیب کی حالانکہ اس کا یہ حق نہ تھا اس نے مجھے گالی دی حالانکہ اسے یہ روا نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں دوبارہ اسے پہلی حیثیت پر لانے پر قادر نہیں ہوں۔ اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ وہ میری اولاد بتاتا ہے حالانکہ میں پاک ہوں اس سے کہ میری بیوی یا اولاد ہو''(1)۔ (صرف بخاری نے اسی حدیث قدسی کو اس سند سے روایت کیا ہے)۔

1۔ البخاری، تفسیر البقرہ: 24/6

ابن مردویہ نے اسے ایک دوسری سند سے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" تکلیف دہ باتیں سن کر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ اس کی اولاد بتائیں اور وہ انہیں رزق و عافیت دیئے جاتا رہے"(1)۔

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قانتوں کا معنی ہے تسبیح کرنے والے۔ عکرمہ اور ابو مالک کا قول ہے کہ اس کی عبودیت کا اقرار کرنے والے ہیں۔ سعید بن جبیر نے اس کا معنی اخلاص کیا ہے۔ ربیع بن انس کا قول ہے کہ ہر چیز روز قیامت اس کے سامنے کھڑی ہوگی۔ سدی نے اس سے مراد مطیع لیا ہے۔ مجاہد سے مروی ہے اطاعت گذار یعنی اسے حکم دیا کہ انسان بن جا تو وہ بن گیا۔ اور فرمایا گدھا بن جا تو وہ گدھا بن گیا۔ فرمایا کافر کی اطاعت یہ ہے کہ اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے سائے اس کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ مجاہد کے اس قول کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے اور یہ تمام اقوال کو جامع ہے کہ قنوت سے مراد اللہ کی اطاعت اور اس کے سامنے جھکنا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ" اور اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی" (رعد:15) ابن ابی حاتم اور امام احمد نے روایت کیا ہے کہ" قرآن میں جہاں بھی قنوت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد طاعت ہے"(2)۔ لیکن اس کی اسناد میں ضعف ہے اور اس پر اعتماد نہیں۔ اس کا مرفوع ہونا بھی قابل تسلیم نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کسی صحابی کا یا کسی اور کا کلام ہو۔ واللہ اعلم۔ اس سند سے بہت سی تفاسیر مروی ہیں جو قابل قبول نہیں۔ کوئی شخص ان سے دھوکے میں نہ پڑے۔ بے شک سند ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی پیشگی نمونے کے بغیر انہیں پیدا کرنے والا ہے۔ مجاہد اور سدی کی رائے میں یہ معنی لغوی معنی کے مطابق ہے۔ نئی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے۔ جس طرح صحیح مسلم میں ہے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ 1۔ شرعی بدعت: جیسے کہا جاتا ہے ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ 2۔ لغوی بدعت: جیسے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول جب آپ نے لوگوں کو نماز تراویح پر جمع فرمایا اور پھر اسے اسی طرح جاری دیکھ کر فرمایا۔ یہ کتنی اچھی بدعت ہے۔ ابن جریر کا قول ہے۔ بدیع کو مبدع سے پھیرا گیا ہے جس طرح مولم کو الیم اور مسمع کو سمیع کی طرف پھیرا گیا ہے۔ مبدع کا معنی ہے ایسی چیز کو بنانے والا جس کے بنانے اور پیدا کرنے میں اس کی پہلے مثال نہ ہو۔ اسی لیے دین میں بدعت پیدا کرنے والے کو مبتدع کہا جاتا ہے کہ وہ بھی دین میں ایسی بدعت ایجاد کرتا ہے جس کی مثال نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر نئی بات یا کام کرنے والے کو بھی اہل عرب یہی نام دیتے ہیں۔ اعشی بن ثعلبہ، ھوذہ بن علی حنفی کی مدح میں کہتا ہے۔

یُدْعٰی اِلٰی قَوْلِ سَادَاتِ الرِّجَالِ اِذَا   اَبْدَوْا لَهُ الْحَزْمَ اَوْ مَاشَاءَ هٗ ابْتَدَعَا

یعنی جو چاہے پیدا کرتا ہے۔ ابن جریر کا قول ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اولاد سے پاک ہے وہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا مالک ہے۔ ہر چیز اس کی وحدانیت کی دلیل و راس کی اطاعت گذار ہے۔ وہ ان سب کو پیدا کرنے والا، خالق اور بغیر اصل و مثال کے انہیں وجود میں لانے والا ہے۔ اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اس کی گواہی ہر چیز دیتی ہے حتیٰ کہ مسیح علیہ السلام بھی جن کے بیٹا ہونے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اس بات کی خبر دی کہ جس ذات نے آسمان و زمین کو بغیر اصل اور مثال کے پیدا کیا وہی ہے جس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ سے بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ ابن جریر کی یہ بات عمدہ اور بالکل صحیح ہے۔ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا ...... اللہ تعالیٰ اپنی کمال قدرت اور عظیم سطوت کا بیان فرما رہے ہیں کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ فرما لے تو اسے حکم دیتا ہے تو وہ ہو جاتی

1۔ البخاری، کتاب التوحید 141/9   2۔ مسند احمد 75/3

ہے۔ یعنی اسے صرف ایک مرتبہ ہی کُنْ کا حکم دیتا ہے تو وہ اس کی مشیّت اور ارادہ کے مطابق ہو جاتی ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا: اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسین:82) ''اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے''۔ اور فرمایا: اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (نحل:40) ''ترجمہ: ہمارا فرمان کسی چیز کے لئے جب ہم ارادہ کرتے ہیں (اس کے پیدا کرنے کا) صرف اتنا ہے کہ ہم اسے حکم دیتے ہیں ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔ اور فرمایا: وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ (قمر:50) ''اور نہیں ہوتا ہمارا حکم مگر ایک بار جو آنکھ جھپکنے میں واقع ہو جاتا ہے''۔ کسی شاعر کا قول ہے۔

اِذَا مَا اَرَادَ اللّٰهُ اَمْرًا فَاِنَّمَا ـــ يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ قَوْلَةً فَيَكُوْنُ

جب اللہ تعالیٰ کسی شے کا ارادہ فرمالے تو صرف اسے ایک قول کن کہنے سے وہ چیز ہو جاتی ہے۔ اس بات سے آگاہ فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق بھی کلمہ کن سے ہوئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران:59) ''ترجمہ: بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ (خود) اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی۔ اسی طرح کہی تھی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے (گزرے) تھے انکی سی (بے سروپا) بات ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل بیشک ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں''۔

محمد بن اسحٰق نے بروایت عکرمہ یا سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رافع بن حریملہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو اللہ سے کہئے ہم سے ہم کلام ہو تا کہ ہم اس کی بات سنیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مجاہد کا قول ہے کہ یہ بات نصرانیوں نے کہی تھی۔ ابن جریر کا بھی یہی قول ہے کیونکہ سیاق کلام سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ آپ کی نبوت کی اطلاع اللہ تعالیٰ خود ہمیں کیوں نہیں دیتا۔ اور یہی بات ٹھیک ہے واللہ اعلم۔ ابو العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ اور سدی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کفار عرب کا یہی قول ہے۔ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ فرمایا یہ یہود و نصاریٰ ہیں اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یہ کہنے والے مشرکین عرب تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَاِذَا جَاۗءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ (انعام:124) ''اور جب آئے ان کے پاس کوئی نشانی کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں بھی ویسا ہی نہ دیا جائے جیسے دیا گیا اللہ کے رسولوں کو''۔ اور فرمایا: وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (بنی اسرائیل:90) ''اور کفار نے کہا ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کر دیں ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ''۔ اور فرمایا: وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا (فرقان:21) ''کہنے لگے وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ کیوں نہ اتارے گئے ہم پر فرشتے یا ہم دیکھ لیتے اپنے رب کو''۔ اور فرمایا: بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (مدثر:52) ''ترجمہ: بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیے جائیں''۔ وغیرہ آیات جو مشرکین عرب کے کفر اور عناد اور سرکشی پر دلیل ہیں۔

صرف اپنے کفر اور عناد کی بنا پر ہی انہوں نے حضور علیہ السلام سے لایعنی سوالات کیے۔ ان سے پہلے گذشتہ امتوں اہل کتاب وغیرہ نے بھی اسی طرح سوالات کیے تھے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ...... فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (نساء:153) ''مطالبہ کرتے ہیں آپ سے اہل کتاب کہ آپ اتروا دیں ان پر کتاب آسمان سے سو وہ تو سوال کر چکے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑی بات کا انہوں نے کہا (اے موسیٰ) ہمیں دکھا دو اللہ کھلم کھلا''۔ اور ارشاد فرمایا: وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (بقرہ:55) ''ترجمہ اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر''۔ اور فرمایا: تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (بقرہ:118) ''ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل''۔ یعنی مشرکین عرب کے دل کفر و عناد اور سرکشی میں سابقہ لوگوں کی طرح ہو گئے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ اَتَوَاصَوْا بِهٖ (ذاریات:53-52) ''ترجمہ: اس طرح نہیں آیا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے یہی کہا کہ ساحر یا دیوانہ کیا پہلوں نے پچھلوں کو یہی نصیحت کی تھی۔'' قولہ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ کہ ہم نے رسولوں کے تصدیق کے لئے مناسب نشانیاں بیان کر دی ہیں اب مزید کسی سوال یا اضافے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو کچھ لائے سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔ اور جس کے دل اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور ان کے دلوں پر پردہ ہے ان کے بارے میں اللہ نے فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (یونس:97-96) ''بیشک وہ لوگ ثابت ہو چکی ہے جن پر آپ کے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے اگرچہ آ جائیں ان کے پاس ساری نشانیاں جب تک کہ وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب''۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿١١٩﴾

''بیشک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے حبیب ﷺ) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا (عذاب سے) ڈرانے والا اور آپ سے باز پرس نہیں ہوگی ان دوزخیوں کے متعلق''۔

ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے حضرت عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ بشیر سے مراد جنت کی خوشخبری دینے والے اور نذیر سے مراد جہنم سے ڈرانے والے ہیں۔ ''لَا تُسْـَٔلُ'' اکثر کی قرأت یہی ہے۔ یعنی تاء کے ضمہ سے (پیش) کے ساتھ ابن ابی کعب نے وَمَا تُسْاَلُ کر کے پڑھا ہے اور ابن مسعودؓ کی قرأت میں لَنْ تُسْئَلَ ہے۔ ابن جریر نے یہی ذکر کیا ہے۔ یعنی آپ سے کفار کی بابت سوال نہیں کیا جائے گا۔ جیسے فرمایا: فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (رعد:40) ''ترجمہ: سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے اور یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ان سے حساب لیں''۔ اور فرمایا: فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (غاشیہ:22-21) ''ترجمہ: پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام کو سمجھانا ہی ہے''۔ اسی طرح فرمایا: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۗ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق:45) ''ترجمہ: ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں پس آپ نصیحت کرتے رہیں اس قرآن سے ہر اک شخص کو جو (میرے) عذاب سے ڈرتا ہے''۔ اور اس طرح کی دیگر آیات۔ بعض نے اسے لَا تَسْاَلْ صیغۂ نہی کی طرز پر پڑھا ہے۔ یعنی آپ ان کے حال کے بارے میں دریافت نہ کریں۔ جس طرح عبدالرزاق نے محمد بن کعب قرظی سے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کاش کہ میں اپنے ماں باپ کے بارے میں جان لیتا (تین مرتبہ یہی جملہ دہرایا) تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ پھر آخر دم تک آپ نے اپنے والدین کا ذکر نہ فرمایا۔ ابن جریر نے بھی اسے

بروایت موسیٰ بن عبیدہ نقل کیا ہے لیکن اس راوی میں کلام ہے۔قرطبی نے محمد بن کعب اور ابن عباس سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے کہ آپ فلاں کے بارے میں سوال نہ کریں۔اس کا حال تو آپ کے اندازے سے بھی برا ہے۔ہم نے تذکرہ نامی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے والدین کریمین زندہ کیے گئے اور وہ آپ پر ایمان لائے۔اسی طرح ہم نے صحیح مسلم کی اس روایت کا بھی جواب دیا ہے کہ'' میرا اور تیرا باپ آگ میں ہیں''(1)۔ابن کثیر کہتے ہیں) کہ والدین کریمین کے احیاء کی حدیث صحاح ستہ وغیرہ میں موجود نہیں۔اور اس کی اسناد ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔پھر ابن جریر لکھتے ہیں (بروایت مرسل) کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے پوچھا'' میرے والدین کہاں ہیں؟''(2)۔تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت سابقہ کی طرح مرسل ہے اور ابن جریر نے محمد بن کعب وغیرہ سے مروی قول کی تردید کی ہے کیونکہ بقول ان کے یہ بات محال ہے کہ آپ ﷺ اپنے والدین کے بارے میں شک کریں۔ اور پہلی قرأت کو ہی اختیار کیا ہے لیکن ان کے اس موقف کے بارے میں تعجب ہے کیونکہ ممکن ہے واقعہ اس وقت کا ہو جب آپ اپنے ماں باپ کے لئے استغفار کرتے تھے اور ان کے بارے میں آپ کو علم نہ تھا۔پھر جب ان کے بارے میں علم ہو گیا تو آپ ﷺ نے برأت کا اظہار کیا اور بتایا کہ وہ دونوں جہنمی ہیں۔جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے۔اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔اور ابن جریر کی بات لازم نہیں آتی واللہ اعلم۔(نوٹ: محققین علماء اور اہل سنت کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ آپ ﷺ کے والدین کریمین مؤمن اور جنتی ہیں۔ واللہ اعلم۔(3) (مترجم) مسند امام احمد میں ہے کہ عطاء بن یسار نے ایک دفعہ عبد اللہ بن عمرو بن عاص سے ملاقات کی اور آپ ﷺ کے تورات میں ذکر کردہ حلیہ کے بارے میں پوچھا۔تو انہوں نے فرمایا ہاں خدا کی قسم! تورات میں آپ کی وہی صفات بیان کی گئی ہیں جو کہ قرآن میں ہیں۔تورات میں ہے کہ اے نبی ہم نے آپ کو شاہد، خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور نہ پڑھے لکھے حضرات کے لئے بچاؤ بنا کر بھیجا ہے۔تو میرا بندہ اور رسول ہے۔میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے تو نہ بدزبان ہے نہ سخت گو، نہ بازاروں میں شور کرنے والا ہے برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے لیکن عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔اور اللہ انہیں اس دنیا سے نہیں اٹھائے گا یہاں تک کہ اس ٹیڑھی قوم کو کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھا نہ دیں۔اور ان کی اندھی آنکھیں کھل نہ جائیں اور بہرے کان سننے نہ لگیں اور بند دل کھل نہ جائیں''(4)۔بخاری نے اسے کتاب البیوع میں اور کتاب التفسیر میں بیان کیا ہے۔ابو بکر بن مردویہ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر فرماتے ہیں میں کعب احبار سے ملا اور پوچھا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ۧ

''اور ہرگز خوش نہیں ہونگے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔آپ (انہیں) کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آپ کے پاس آچکا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لیے اللہ کی (گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور

1۔مسلم، الایمان:374 2۔اتحاد السادہ:440/8

3۔اس موضوع پر مزید آگاہی کیلئے ضیاء النبی جلد دوم صفحہ 78 تا 91 مصنفہ پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ ملاحظہ فرمائیں 4۔البخاری، کتاب البیوع باب:50

نہ کوئی مددگار جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان لائے ہیں اس کے ساتھ اور جو کوئی انکار کرتا ہے اس کا تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اے محمد! یہود اور نصاریٰ آپ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ آپ ان کی رضا اور موافقت کو چھوڑ یئے اور انہیں دین حق کی طرف دعوت دے کر اللہ کی رضا طلب کیجئے۔ اور فرمایئے کہ صحیح دین وہی ہے جس کی طرف بلانے کے لئے اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ اس آیت میں آپ ﷺ اور صحابہ کرام کو طریقہ بتلایا جارہا ہے جس کے ساتھ آپ اہل ضلال کو خاموش کرا سکتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتے رہیں گے۔ غالب رہیں گے کسی کی مخالفت انہیں نقصان نہ دے گی حتی کہ اللہ کا امر آپہنچے۔ (میں کہتا ہوں) کہ یہ حدیث صحیح میں عبداللہ بن عمرو کی روایت کے ساتھ موجود ہے۔ اس بات کی شدید وعید کی جارہی ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کو جان لینے کے بعد یہود ونصاریٰ کے طریقوں کی اتباع مت کرنا۔ اس آیت میں خطاب اگرچہ رسول کریم کو ہے لیکن حکم امت کو دیا جارہا ہے۔ بہت سے فقہاء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ملت کا لفظ مفرد ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ سارا کفر ملت واحدہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (کافرون 6)'' ترجمہ: تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ لہٰذا مسلمان اور کفار ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ تاہم ہر کافر اپنے ساتھی کافر کا وارث ہوگا۔ خواہ دونوں کا مذہب آپس میں مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی ملت ہیں۔ امام شافعی، ابوحنیفہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کا مذہب بھی یہی ہے۔ دوسری روایت امام مالک کی رائے کے مطابق ہے کہ دو مختلف مذاہب والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ قولہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ قتادہ کا قول ہے کہ یہ یہود ونصاریٰ ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی بھی یہی رائے ہے ابن جریر بھی اسے ہی اختیار کیا ہے (بروایت عبدالرزاق) سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: جب دوران تلاوت جنت کا ذکر آئے تو جنت کا سوال کرے اور جہنم کے ذکر کے وقت اس سے اللہ کی پناہ مانگے۔ ابوالعالیہ کا قول ہے کہ ابن مسعود نے فرمایا اللہ کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تلاوت کا حق یہ ہے کہ حلال کو حلال جانے اور حرام کو حرام قرار دے۔ اور اسی طرح پڑھے جس طرح اللہ نے اسے نازل فرمایا ہے۔ کلمات کو ان کی جگہ سے نہ پھیرے۔ نامناسب تاویل نہ کرے (عبدالرزاق کی روایت یہی ہے) سدی نے اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے روایت کیا ہے حلال کو حلال کرتے ہیں اور حرام کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے مقامات میں تحریف نہیں کرتے۔ ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے حسن بصری کا قول ہے کہ محکم پر عمل کرتے ہیں۔ متشابہ پر ایمان لاتے ہیں اور مشکلات کو اس کے عالم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا کہ کما حقہ، اس کی اتباع کرتے ہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا (شمس:2)'' ترجمہ: اور قسم ہے مہتاب کی جب وہ (غروب) آفتاب کے بعد آوے''۔ یہاں تَلَا معنی اِتَّبَعَ ہے۔ عکرمہ، عطاء، مجاہد، ابو رزین اور ابراہیم نخعی سے اسی طرح مروی ہے۔ سفیان ثوری نے ابن مسعود سے بھی یہ نقل کیا ہے اور ایک مرفوع حدیث میں بھی اسی طرح ہے۔ پھر قرطبی لکھتے ہیں کہ اس کی اسناد میں متعدد راوی ضعیف ہیں جیسا کہ خطیب نے بیان کیا ہے لیکن اس کا معنی صحیح ہے۔ ابوموسیٰ اشعری کا قول ہے قرآن کی اتباع کرنے والا جنت کے باغیچوں میں اترنے والا ہے۔ عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ جب وہ آیت رحمت کے پاس سے گزرتے ہیں تو اللہ کی رحمت کا سوال کرتے ہیں اور آیت عذاب کے پاس سے گزرتے ہیں تو اللہ کے عذاب سے پناہ طلب کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کا معمول بھی یہی تھا۔ (1) قولہ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ یہ خبر ہے۔ یعنی سابقہ انبیاء پر نازل شدہ کتابوں

میں سے کسی کتاب پر صحیح طریقے سے عمل پیرا ہونے والا آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ...... وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ...... (مائدہ:66) ''ترجمہ: اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو (اپنے عمل سے) اور جو نازل کیا گیا ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے (تو فراخ رزق دیا جاتا انہیں حتیٰ کہ) وہ کھاتے اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی''۔ اور فرمایا: قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (مائدہ:68) ''ترجمہ: آپ فرمایئے اہل کتاب! نہیں ہو تم کسی چیز پر (ہدایت سے) یہاں تک کہ (عمل سے) قائم کرو تورات اور انجیل کو اور جو اتارا گیا تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے''۔ یعنی جب تم انہیں پوری طرح قائم کرو اور کما حقہ ان پر ایمان لاؤ اور حضور ﷺ کی بعثت، اوصاف، آپ کی اتباع کرنے اور آپ کی نصرت و موازرت کرنے کے بارے میں ان میں جو کچھ مذکور ہے اس کی تصدیق کرو تو اس میں تمہارا دنیا و آخرت کا بھلا ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ......(اعراف:157) ''ترجمہ: (یہ وہ ہیں جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے (جس کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں''۔ اور فرمایا: قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ ...... اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (اسراء:108-107) ''ترجمہ: (آپ کفار کو) کہیے خواہ تم ایمان لاؤ اس پر یا نہ ایمان لاؤ بے شک وہ لوگ جنہیں دیا گیا ہے علم اس سے پہلے جب اسے پڑھا جاتا ان کے سامنے تو وہ گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے ہمارا رب بلاشبہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے''۔ (17-108) یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بارے میں ہم سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اور فرمایا: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ...... وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (قصص:54-52) ''ترجمہ: جن کو ہم نے عطا فرمائی کتاب (نزول) قرآن سے پہلے وہ اس پر ایمان لائے ہیں اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکے ہیں یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر انہیں دو مرتبہ بوجہ ان کے صبر کے اور دور کرتے ہیں نیکی کے ساتھ برائی کو نیز اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں''۔ اور فرمایا: وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ...... وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (آل عمران:20) ''ترجمہ: اور کہیے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں سے کہ کیا تم ایمان لائے پس وہ اگر ایمان لے آئیں جب تو ہدایت پا گئے اگر وہ منہ پھیر لیں تو اتنا ہی آپ کے ذمہ تھا کہ آپ پیغام پہنچا دیں (جو آپ نے پہنچایا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو''۔ اسی لیے فرمایا: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ جیسے ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ (ہود:17) ''ترجمہ: اور جو کفر کرے اس کے ساتھ مختلف گروہوں سے تو آتش (جہنم) ہی اس کے وعدے کی جگہ ہے''۔ صحیح حدیث میں ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس امت یہود و نصاریٰ میں سے جو بھی میرے بارے میں سنے اور پھر مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا۔

يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی اور (خصوصاً یہ کہ) میں نے تم کو فضیلت دی (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر اور ڈرو اس دن سے کہ نہ پکڑا جائے گا کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی امداد کی جائے گی''۔

اس طرح کی آیت سورت کے شروع میں بھی گزر چکی ہے یہاں دوبارہ تاکید اور اس امی نبی ﷺ کی اتباع پر ابھارا جا رہا ہے جن کے اوصاف، نام اور امت کا ذکر ان کی کتب میں موجود ہے۔ پس انہیں اس کے چھپانے اور اللہ کی نعمتیں چھپانے سے ڈرایا جا رہا ہے۔ اور یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کی دینی اور دنیوی نعمتوں کو یاد کریں اور اپنے چچازاد اہل عرب سے حسد نہ کریں اس نعمت پر جو انہیں ارزانی ہوئی یعنی ان میں خاتم النبیین رسول تشریف لایا۔ اور یہ حسد انہیں اس کی مخالفت اور تکذیب پر آمادہ نہ کرے۔ صَلَوٰتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ دَائِمًا اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو انہیں پورے طور پر بجا لایا۔ اللہ نے فرمایا بیشک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔ عرض کی میری اولاد سے بھی؟ فرمایا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک''۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی بزرگی و شرف کا بیان ہو رہا ہے کہ اللہ رب العزت نے انہیں لوگوں کا امام بنایا۔ توحید میں ان کی اقتداء کی جائے گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر و نواہی کو بجا لائے۔ اسی لئے فرمایا اے محمد! (ﷺ) ان مشرکین اور اہل کتاب جو ملت حضرت خلیل اللہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں کو یہ یاد کروا دو کہ وہ اس پر نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے اسوہ پر تو اے محمد (ﷺ) آپ اور آپ کے پیروکار مومن مسلمان ہیں۔ انہیں حضرت ابراہیم پر اللہ کے امتحان کو یاد دلاؤ جسے انہوں نے پورا کر دیا۔ یعنی جو کچھ اوامر و نواہی ان پر نازل کیے گئے تھے پورا کر دکھائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاَتَمَّهُنَّ'' اور ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں جو پوری طرح احکام بجا لائے۔) اور ارشاد فرمایا: وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى (نجم: 37)۔ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَ لَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (نحل: 120)

''بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے۔'' اور فرمایا: قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (انعام: 162)۔'' آپ فرمایئے بے شک مجھے پہنچا دیا ہے میرے رب نے سیدھی راہ تک یعنی دین مستحکم (جو) ملت ابراہیم ہے جو باطل سے ہٹ کر صرف حق کی طرف مائل تھے اور نہیں تھے وہ مشرکوں سے''۔ اور فرمایا: مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا...... وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ'' نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے۔ اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا۔'' قولہ تعالیٰ (بِكَلِمٰتٍ) کلمات سے مراد شرائع اور اوامر و نواہی ہیں۔ کلمات کے لفظ سے مراد قدری کلمات بھی ہوتے ہیں جیسے سیدہ مریم کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ (تحریم: 12)'' اور مریم نے تصدیق کی اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں

کی اور وہ اللہ کے فرمانبرداروں میں سے تھیں"۔ اور کبھی کلمات سے مراد شرعی کلمات ہوتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ (انعام:115) "اور مکمل ہوگئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے"۔

یہاں پر یا تو حقیقت کی خبر دی جارہی ہے یا پھر طلب عدل ہے اگر امر یا نہی قرار دیا جائے۔ یہ آیت کریمہ اسی قبیل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آزمائش پر پورا اترنے کی وجہ سے انہیں یہ انعام ملا کہ انہیں لوگوں کا پیشوا اور مقتدا بنا دیا گیا۔ لفظ کلمات کی تعیین کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ امتحانات کیا تھے؟۔ ابن عباس سے اس بارے میں متعدد روایات مروی ہیں۔ عبدالرزاق نے بروایت قتادہ ذکر کیا ہے۔ کہ اس سے مراد مناسک ہیں۔ ابو اسحٰق السبیعی التمیمی نے بھی ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ طاؤس کی روایت میں ہے کہ اس سے مراد امور طہارت ہیں پانچ سر میں اور پانچ بقایا جسم میں۔ سر میں لبیں تراشنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، دانتوں کو مسواک سے صاف کرنا اور سر کی مانگ نکالنا ہے۔ اور جسم کے دیگر حصوں میں ناخن تراشنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، ختنہ کرنا، زیر بغل بالوں کو صاف کرنا۔ پیشاب اور پاخانے کی غلاظت کے اثرات کو پانی سے دھونا مراد تھا۔ ابن حاتم کہتے ہیں کہ سعید بن مسیب، مجاہد، نخعی، شعبی، ابو صالح اور ابو خلد سے اسی طرح مروی ہے۔ (میں کہتا ہوں کہ) اس کے قریب ہی صحیح مسلم کی حدیث سیدہ عائشہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا دس چیزیں فطرت کے مطابق ہیں۔ مونچھیں تراشنا، ڈاڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن اتارنا، انگلیوں کے جوڑ دھونا، موئے زیر بغل اور زیر ناف اتارنا اور پانی استعمال کرنا۔ معصب کا قول ہے کہ مجھے دسویں چیز بھول گئی ہے ممکن ہے یہ کلی ہو۔ اور پانی کے استعمال سے مراد استنجاء ہے۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا" پانچ چیزیں سنت کے مطابق ہیں۔ ختنہ، موئے زیر ناف صاف کرنا، مونچھیں تراشنا، ناخن اتارنا، اور بغلیں صاف کرنا" (مسلم) (1)۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ دس اشیاء ہیں چھ انسان میں اور چار مناسک ہیں۔ جو انسان میں ہیں وہ یہ ہیں۔ موئے زیر ناف، بغل کے بال لینا، ختنہ، ابن ہبیرہ کا قول ہے کہ تینوں اشیاء ایک ہیں۔ ناخن اتارنا، مونچھیں کاٹنا، مسواک اور غسل جمعہ اور چار مناسک یہ ہیں طواف، سعی، رمی جمار (جمروں پر کنکر مارنا) اور طواف افاضہ۔ داؤد بن ابی ہند نے بروایت عکرمہ، ابن عباس سے نقل کیا ہے اس امتحان میں کسی کو بھی مبتلا کیا گیا تو وہ اسے بجا نہ لایا ماسوائے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے۔ آپ انہیں پورے طور پر بجالائے۔ تو یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اتری۔ میں نے پوچھا وہ کلمات (امتحانات) کیا ہیں؟ تو فرمایا اسلام تیس حصے ہیں دس آیات سورۂ توبہ میں (اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ) سے آخر تک۔ اور دس آیات (قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ) اور (سَاَلَ سائل بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ) کے شروع میں۔ اور دس آیات سورۂ احزاب میں (اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ) سے آخر آیت تک)۔ آپ ان سب کو مکمل طور پر بجالائے تو آپ کے لئے برأت لکھ دی گئی۔ اور فرمایا: وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى (نجم:37)۔ حاکم، ابو جعفر بن جریر اور ابو محمد بن ابی حاتم نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ محمد بن اسحٰق نے بروایت عکرمہ یا سعید حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ کلمات سے مراد اللہ کے حکم کی بجا آوری میں اپنی قوم سے علیحدہ ہو جانا، نمرود سے مناظرہ، آگ کی آزمائش پر صبر، وطن سے ہجرت، ضیافت کا حکم اور اپنے جان و مال کے ساتھ صبر کرنا، بیٹے کے ذبح کرنے کے حکم کو بخوشی پورا کرنا ہے۔ جب آپ ان سب کو بجالائے تو اللہ نے فرمایا قولہ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ:131) " ترجمہ: (اے ابراہیم) گردن جھکا دو عرض کی میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے"۔ ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ اللہ نے ستاروں کے ساتھ آپ کی آزمائش فرمائی آپ اس پر راضی ہو گئے۔ پھر چاند اور سورج کے ساتھ آزمائش ہوئی۔ اسی

1۔ مسلم، الطہارۃ 50,49

طرح ہجرت، ختنہ اور بیٹے کو ذبح کرنے کی آزمائش ہوئی۔ آپ سب میں راضی برضا رہے۔ اسی طرح مناسک حج، مرتبہ امامت اور بیت اللہ کے باسیوں کی روزی کے ساتھ آپ کی آزمائش ہوئی۔ اور حضور ﷺ انہی کے دین میں مبعوث ہوئے۔ مجاہد کا قول ہے کہ اللہ نے فرمایا اے ابراہیم میں تمہیں آزماتا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو وہ کیا ہے۔ آپ نے عرض کی مجھے لوگوں کا پیشوا بنادے۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول کرلی۔ فرمایا اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں سے نہیں۔ عرض کی بارالہا کعبہ کو لوگوں کا مرکز بنادے۔ آپ کی دعا قبول ہوئی۔ پھر عرض کی مولا ہمیں اپنے فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا فرما جو تیری فرمانبردار ہو۔ فرمایا منظور ہے۔ پھر عرض کی اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی عطا فرما۔ یعنی جو ان میں سے ایمان لائے فرمایا تمہاری یہ درخواست بھی قبول ہے۔ ابن ابی نجیح کا قول ہے کہ میں نے عکرمہ سے یہ بات سنی اور مجاہد سے پوچھا تو انہوں نے انکار نہ کیا۔ ابن جریر نے بھی مجاہد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ سفیان ثوری نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ مابعد آیات کے ساتھ آپ کا امتحان لیا گیا۔ ربیع بن انس کا قول بھی یہی ہے۔ سدی کا قول ہے کہ کلمات جن سے آپ کی آزمائش کی گئی۔ وہ یہ ہیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ (بقرہ: 129-127)۔ قرطبی کا قول ہے کہ موطا وغیرہ میں ہے سب سے پہلے حضرت ابراہیم نے ختنہ کیا۔ سب سے پہلے مہمان نوازی کی۔ سب سے پہلے ناخن تراشے، سب سے پہلے مونچھیں کاٹنے والے بھی آپ ہیں۔ سب سے پہلے آپ کے بالوں میں چاندی آئی۔ جب آپ نے بڑھاپے کے آثار دیکھے تو پوچھا اے رب! یہ کیا ہے؟۔ فرمایا۔ وقار و عزت۔ آپ نے عرض کی اے رب میرے وقار میں اضافہ فرما۔ ابن ابی شیبہ نے ذکر فرمایا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہی منبر پر خطبہ دیا۔ بعض دیگر علماء کا قول ہے کہ آپ ہی سب سے پہلے قاصد بھیجنے والے ہیں۔ آپ نے ہی سب سے پہلے تلوار چلائی۔ آپ نے پہلے مسواک کی۔ سب سے پہلے استنجا کرنے والے، شلوار پہننے والے آپ ہی ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل ؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ اگر میں نے منبر بنایا ہے تو میرے باپ ابراہیم نے بھی منبر بنایا تھا۔ (میں کہتا ہوں کہ) یہ حدیث ثابت نہیں واللہ اعلم۔ اس کے بعد قرطبی نے ان احکام شرعیہ کا ذکر فرمایا ہے جو ان آیات کے متعلق ہیں۔ ابو جعفر جریر کا قول ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ کلمات سے مراد مذکورہ بالا تمام چیزیں بھی ہوسکتی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد بعض چیزیں ہوں۔ کسی چیز کی تخصیص کرنا جائز نہیں۔ مگر جب تک حدیث یا اجماع سے کوئی دلیل نہ ملے۔ اور ایسی کوئی دلیل نہیں۔ لیکن اس کے مفہوم کی دو روایات ہیں (1)۔ حضرت سہل بن معاذ بن انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو وفا کرنے والا کس لیے فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر صبح و شام یہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿١٧﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ...... (روم: 18-17) (1)۔ (2) ابوامامہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى، والی آیت پڑھ کر فرمایا: کیا تم جانتے ہو وفا کیا ہے۔ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا "اور وہ دن کے وقت چار رکعتیں پڑھتے تھے" (2) آدم نے اسے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ ابن جریر نے ان دونوں حدیثوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور ان کی بات ٹھیک ہے کیونکہ ضعیف روایات کو ضعف کا بیان کیے بغیر روایت کرنا جائز نہیں۔ اور ان میں ضعف کی متعدد وجوہ ہیں۔ دونوں احادیث کی سندوں میں کئی کئی راوی ضعیف ہیں اور ان کا متن بھی ضعف پر دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ قولہ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

1۔ مسند احمد: 439/3 2۔ الدر المنثور: 229/6

امام بنایا تو آپ نے اپنی اولاد کے لئے بھی اسی مقام کی دعا کی تو ارشاد ہوا کہ آپ کی دعا قبول ہے اور ساتھ ہی یہ خبر دی گئی کہ آپ کی اولاد میں سے ظالم لوگ بھی ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کا عہد نہ پہنچے گا۔ نہ وہ امام بنائے جائیں گے اور نہ ان کی اقتدا کی جائے گی۔ آپ کی دعا کی قبولیت کی دلیل سورۂ عنکبوت کی یہ آیت ہے: وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ (عنکبوت: 27) حضرت ابراہیم کے بعد ہر نبی جس کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اور اس پر کتاب نازل فرمائی وہ آپ کی اولاد سے ہی تھا۔

ظالموں کو عہد نہیں پہنچے گا سے کیا مراد ہے؟۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ ضعیف نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ آپ کی اولاد میں ظالم لوگ ہوں گے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ میں ظالم کو امام نہیں بناؤں گا۔ منصور نے مجاہد سے روایت کیا ہے کوئی ظالم امام یا پیشوا نہیں ہوگا۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ اس سے مراد مشرک ہیں۔ عطاء کا قول ہے کہ عہد سے مراد امر ہے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں آپ نے عرض کی میری اولاد کو بھی۔ پہلے آپ کی درخواست قبول نہ ہوئی۔ پھر فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ محمد بن اسحٰق نے بھی بروایت عکرمہ یا سعید بن جبیر یہی نقل کیا ہے۔ عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ظالم کا تم پر کوئی عہد نہیں کہ تم اس کے ظلم میں بھی اس کی اتباع کرو۔ ابن جریر نے بروایت مجاہد، ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ظالم کو میرا کوئی عہد نہیں پہنچے گا اگرچہ میں نے اس سے عہد کیا ہے۔ مجاہد، عطاء اور مقاتل بن حیان وغیرہ سے یہی مروی ہے۔ ثوری نے ہارون بن عنترہ کے باپ سے نقل کیا ہے کہ ظالم کا کوئی عہد نہیں۔ عبدالرزاق نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے ساتھ میرا وعدہ آخرت میں ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے وہ امن میں ہوگا۔ کھائے گا پیئے گا اور عیش کرے گا۔ اسی طرح ابراہیم نخعی، عطاء، حسن اور عکرمہ نے کہا ہے۔ ربیع بن انس کا قول ہے کہ اللہ کا عہد جو اس نے اپنے بندوں سے کیا ہے اس کا دین ہے۔ فرمایا اس کا دین ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ کیا آپ نے یہ آیت نہیں پڑھی؟ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (صافات: 113) '' ترجمہ: اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحٰق پر اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا''۔ فرمایا اے ابراہیم تیری ساری ذریت حق پر نہیں ہوگی۔ ابوالعالیہ، عطاء اور مقاتل بن حیان سے اسی طرح مروی ہے۔ جویبر نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ میری اطاعت میرے نافرمان دشمن کو نہیں ملے گی۔ میں اس کو عطا نہیں کروں گا مگر اپنے دوست فرمانبردار کو۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''میری اطاعت نہیں مگر صرف معروف میں'' (1)۔ سدی کا قول ہے کہ عہد سے مراد نبوت ہے۔ یہ اسلاف مفسرین کے اس آیت کے بارے میں اقوال تھے۔ اگرچہ ظاہراً جملے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امامت کے بارے میں اللہ کا عہد ظالم کو نہیں پہنچے گا۔ اس میں اللہ کی طرف سے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہاری اولاد میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوں گے۔ جیسے مجاہد وغیرہ کی رائے کا اوپر گزر ہوا ابن خویز منداد مالکی فرماتے ہیں کہ ظالم شخص نہ تو خلیفہ بن سکتا ہے اور نہ حاکم، نہ مفتی، نہ گواہ اور نہ راوی۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ

''اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر (خانہ کعبہ) کو مرکز لوگوں کے لیے اور امن کی جگہ اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز''۔

عوفی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے ان کی لگن ختم نہیں ہوتی آتے ہیں گھر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ پھر دوبارہ آ جاتے ہیں۔ علی

1۔ الدر المنثور، 1/118

بن ابی طلحہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے لوگوں کے لئے ثواب کی جگہ۔ یہ دونوں روایات ابن جریر نے ذکر کی ہیں۔ ابن ابی حاتم نے بروایت مجاہد ابن عباس سے روایت کیا ہے اس کی طرف آتے ہیں پھر لوٹ جاتے ہیں۔ ابو العالیہ، سعید بن جبیر، عطاء مجاہد، حسن، عطیہ، ربیع بن انس اور ضحاک کا یہی قول ہے۔ ابوعمرو اوزاعی نے عبیدہ بن لبابہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ کوئی شخص بھی یہاں سے اس حال میں واپس نہیں لوٹتا کہ اس کی رغبت وشوق پورا ہو چکا ہو۔ ابن زید نے لکھا ہے مَثَابَةً کا معنی ہے کہ دنیا بھر سے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر یہ شعر کتنا ہی خوبصورت ہے جسے قرطبی نے نقل کیا ہے۔

جُعِلَ الْبَيْتُ مَثَابًا لَّهُمْ لَيْسَ مِنْهُ الدَّهْرَ يَقْضُوْنَ الْوَطَرْ

سعید بن جبیر (ایک دوسری روایت): عکرمہ، قتادہ اور عطاء خراسانی نے مَثَابَةً کا معنی مرکز کیا ہے۔ "وَاَمْنًا" ضحاک نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کے لئے باعث امن۔ ابو العالیہ کا قول ہے کہ دشمن سے امن یعنی یہاں اسلحہ نہیں اٹھایا جاتا۔ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ اس کے اردگرد سے اچک لیے جاتے حالانکہ یہ لوگ پرامن ہوتے۔ انہیں قید نہ کیا جاتا۔ مجاہد، عطاء، سدی، قتادہ اور ربیع بن انس کا قول ہے کہ اس میں ہر داخل ہونے والا امن میں ہو جاتا ہے۔ اس آیت کی تشریح وتفسیر کے ضمن میں ان ائمہ کرام نے جو ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیت اللہ شریف کی شان کو بیان فرما رہے ہیں" ترجمہ: اور کوئی چیز مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے عطا فرمائے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق (جیسے فرزند) بلاشبہ میرا رب سننے والا ہے دعاؤں کا میرے رب بنا دے مجھے نماز کو قائم رکھنے والا اور میری اولاد کو بھی اے ہمارے رب میری یہ التجا ضرور قبول فرما" ۔ کہ ہم نے اسے قدر ومنزلت عطا کی ہے یہ ایسا مقام ہے کہ روحیں ہر وقت اس کی مشتاق رہتی ہیں۔ ہر سال آنے کے باوجود ان کے ذوق وشوق کی فراوانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی استجابت دعا کا ثمرہ ہے آپ نے دعا مانگی تھی۔ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ ...... رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ (ابراہیم: 40-37) " ترجمہ: پس کردے لوگوں کے دلوں کو کہ وہ شوق ومحبت سے اس کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں سے تاکہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں اے ہمارے رب یقیناً تو جانتا ہے جو ہم (دل میں) چھپائے ہوئے ہیں اور ہم ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے عطا فرمائے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق (جیسے فرزند) بلاشبہ میرا رب بہت سننے والا ہے، دعاؤں کا، میرے رب بنا دے مجھے نماز کو قائم کرنے والا اور میری اولاد کو بھی اے ہمارے رب میری یہ التجا ضرور قبول فرما"۔ اللہ تعالیٰ اس کی شان بیان فرماتے ہیں کہ اس میں جو بھی آئے وہ امن میں ہے اگرچہ کسی جرم کا ارتکاب کر کے ہی کیوں نہ آیا ہو۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ آدمی اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کا یہاں سامنا کرتا لیکن اس سے کوئی تعرض نہ کرتا۔ جس طرح کہ سورۂ مائدہ میں بیان کیا گیا ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (مائدہ: 97) " ترجمہ: بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو عزت والا گھر ہے بقا کا باعث لوگوں کے لئے"۔ یعنی اپنی عظمت کے سبب لوگوں سے شر کو دور کرتا ہے۔ جیسے ابن عباس کا قول ہے۔ اگر لوگ بیت اللہ کا حج نہ کریں تو اللہ تعالیٰ آسمان کو زمین پر گرا دے۔ یہ شرف صرف اس کے بانی حضرت خلیل الرحمٰن ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے ہے۔ ارشاد فرمایا: وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا (الحج: 26) " ترجمہ: اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیم کے لئے اس گھر (تعمیر کرنے) کی جگہ اور حکم دیا کہ شریک نہ ٹھہرانا میرے ساتھ کسی چیز کو اور فرمایا: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ ...... وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران: 96) اس آیت کریمہ میں مقام ابراہیم کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہاں نماز پڑھنے کا حکم بھی دیا۔ اور فرمایا کہ بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے۔ نماز قولہ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ لفظ مقام سے کیا مراد ہے۔ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت مجاہد حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ مقام ابراہیم سارا حرم ہے۔ مجاہد اور عطاء کی بھی یہی رائے ہے۔ عطاء سے ابن جریج نے پوچھا تو انہوں نے فرمایا میں نے ابن عباس کو ارشاد فرماتے سنا کہ مقام ابراہیم جس کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے مراد وہ مقام ہے جو مسجد میں ہے۔ پھر فرمایا کثیر علماء مقام سے مراد سارا حج لیتے ہیں۔ پھر عطاء نے میرے لیے اس کی تفسیر فرمائی اور فرمایا یہ عرفات، عرفہ میں دو نمازیں، مشعر حرام (مزدلفہ) منیٰ، رمی جمار، صفا و مروۃ کا طواف ہے۔ میں نے پوچھا کیا یہ تفسیر ابن عباس نے فرمائی تھی؟ فرمایا نہیں۔ بلکہ انہوں نے فرمایا تھا۔ مقام ابراہیم سارا حج ہے۔ سفیان ثوری نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ مقام ابراہیم یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم تعمیر فرماتے اور حضرت اسماعیل انہیں پتھر اٹھا کر دیتے تھے۔ سدی کا قول ہے کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جسے حضرت اسماعیل کی زوجہ حضرت ابراہیم کے قدم نیچے رکھ کر آپ کے پاؤں دھوتی تھیں۔ قرطبی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور دیگر نے اسے ترجیح دی ہے۔ رازی نے اپنی تفسیر میں حسن بصری، قتادہ، اور ربیع بن انس سے یہی نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے جعفر بن محمد کے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت جابر کو یہ ارشاد فرماتے سنا۔ آپ نبی اکرم ﷺ کے حج کا طریقہ بیان فرما رہے تھے۔ فرمایا جب آپ ﷺ طواف سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر نے عرض کی کیا یہی ہمارے باپ کا مقام ہے۔ آپ نے عرض کی کیا ہم اسے جائے نماز نہ بنالیں۔ اس وقت یہ آیت اتری۔ عثمان بن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا یہ ہمارے رب کے خلیل کا مقام ہے؟ فرمایا ہاں۔ عرض کی ہم اسے جائے نماز نہ بنالیں؟ تو یہ آیت اتری۔ ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق کے سوال پر تھوڑی دیر گزری تھی کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن مردویہ نے ایک دوسری سند سے بھی اسے روایت کیا ہے اور یہ غریب ہے۔ اسی طرح نسائی نے بھی ولید بن مسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بخاری نے باب قولہ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ سے انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا میں نے اپنے رب سے (ایک روایت میں ہے میرے رب نے مجھ سے) تین باتوں میں موافقت کی (1) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالیں (2) میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اچھے برے ہر قسم کے لوگ آپ کے پاس آتے ہیں کاش آپ امہات المؤمنین کو پردے کا حکم فرمائیں۔ تو آیت حجاب نازل ہوئی (3) جب مجھے پتہ چلا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی بعض ازواج سے خفگی کا اظہار کیا ہے تو میں ان کے پاس گیا اور کہا اگر تم باز نہیں آؤ گی تو اللہ تمہارے بدلے اپنے رسول کو اچھی بیویاں عطا فرمائے گا۔ تو یہ آیت اتری: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ...... (1) یہ متعدد اسناد سے متعدد کتب میں مروی ہے (دیکھئے بخاری، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، علی بن مدینی، مسلم)۔ مسلم کی روایت میں ان تین چیزوں کا ذکر ہے۔ حجاب، بدر کے قیدی مقام ابراہیم۔ ابو حاتم رازی نے تیسری چیز کی جگہ کہا ہے کہ جب منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی فوت ہو گیا۔ حضور ﷺ اس کے جنازہ کے لئے تیار ہوئے۔ تو حضرت عمر نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا آپ اس کافر، منافق کی نماز جنازہ پڑھیں گے تو یہ آیت اتری: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا...... (توبہ: 84) "ترجمہ: اور نہ پڑھئے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مر جائے کبھی"۔ اس کی اسناد بھی صحیح ہے اور ان میں کوئی تعارض نہیں بلکہ سب صحیح ہیں۔ اور مفہوم عدد کے مقابلے میں جب منطوق آجائے تو اسے ترجیح دی جائے گی۔ واللہ اعلم۔ ابن جریج نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے طواف کے تین چکروں میں رمل کیا اور چار پھیرے عام رفتار سے کیے۔ جب آپ ﷺ طواف سے فارغ ہوئے۔ تو مقام ابراہیم کے پیچھے آکر دو نفل ادا کیے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ابن

1۔ مسند امام احمد: 23/1

جریر کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے مقام کو اپنے اور بیت اللہ شریف کے درمیان کر لیا تھا۔ (یہ ایک طویل حدیث کا جز ہے جسے انہوں نے اپنی صحیح میں حاتم بن اسماعیل کی طرف منسوب کیا ہے)۔ بخاری نے اپنی سند کے ساتھ عمرو بن دینار کی روایت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی روایت کیا ہے(1)۔ ان سب احادیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ جب دیوار بلند ہوگئی تو حضرت اسماعیل اس پتھر کو لے آئے اور آپ اس پر کھڑے ہوئے۔ حضرت اسماعیل پتھر پکڑاتے جاتے اور آپ انہیں دیوار پر لگاتے جاتے۔ جب ایک طرف مکمل ہو جاتی تو دوسری سمت میں چلے جاتے اور اسی پتھر پر کھڑے ہوتے۔ جہاں دیوار کو اونچا کرنا مقصود ہوتا اسی پتھر پر کھڑے ہوتے۔ تا آنکہ کعبہ کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ (اس قصے کا پورا بیان حضرت ابراہیم اور اسماعیل کے واقعہ میں آئے گا۔) جس طرح کہ بخاری نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ آپ کے قدمین شریفین کے نشانات اس پتھر پر ثبت ہوگئے تھے۔ یہ بات زمانہ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاں معروف تھی۔ ابو طالب اپنے معروف لامیہ قصیدہ میں لکھتے ہیں۔

وَ مَوْطِئُ اِبْرَاہِیْمَ فِی الصَّخْرِ رَطْبَۃٌ　　عَلٰی قَدَمَیْہِ حَافِیًا غَیْرَ نَاعِلِ

''ترجمہ: اس چٹان پر حضرت ابراہیم کے پاؤں مبارک کے نشانات اب بھی تازہ ہیں۔ یہ نشان ننگے پاؤں کے ہیں اور ان میں جوتا نہیں۔ بلکہ مسلمانوں نے بھی اسے دیکھا۔ جس طرح کہ انس بن مالک سے مروی ہے کہ میں نے مقام پر حضرت ابراہیم کی انگلیوں اور پاؤں کے اخمص (وہ تلوے کا وہ حصہ جو زمین سے نہیں لگتا) کے نشانات دیکھے لیکن لوگوں کے بکثرت چھونے سے وہ مٹ گئے۔'' ابن جریر نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ اس کے پاس نماز پڑھنے کا حکم دیا چھونے کا حکم نہ دیا۔ اس امت نے بھی سابقہ امتوں کی طرح تکلف سے کام لیا۔ جن لوگوں نے ایڑی اور انگلیوں کا نشان دیکھا ہے انہوں نے ہم سے بیان کیا کہ لوگ مسلسل اس کو چھوتے رہے یہاں تک کہ وہ نشانات اب مٹ چکے ہیں۔ (میں کہتا ہوں کہ) مقام ابراہیم زمانہ قدیم میں دیوار کعبہ سے متصل تھی کعبہ کے دروازے کی جانب حجر اسود کی طرف دروازے سے داخل ہونے والے کے دائیں طرف۔ جو آج بھی لوگوں کو معلوم ہے۔ حضرت خلیل علیہ السلام جب تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے تو اسے دیوار کعبہ میں رکھا یا اس جگہ عمارت مکمل ہوگئی تو اسے وہیں چھوڑ دیا اسی لیے طواف سے فراغت کے بعد یہاں نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ اور مناسب ہے کہ یہ وہ جگہ ہو جہاں مقام ابراہیم ہے اور جہاں کعبہ کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ امام ہدایت، خلیفہ راشد، امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے دیوار کعبہ سے ہٹا کر رکھا۔ آپ خلفاء راشدین میں سے ہیں جن کی اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ آپ کا شمار ان دو آدمیوں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ ان کی اتباع کرو جو میرے بعد ہیں یعنی ابو بکر وعمر۔ آپ کی موافقت میں ہی قرآن نے یہاں نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اسی لیے صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہ کی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس کے ثبوت میں بہت سی روایات ہیں۔ (دیکھیے عبد الرزاق، بیہقی، ابن ابی حاتم، ابو بکر بن مردویہ بروایات متعددہ والفاظ مختلفہ)۔

وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ

1۔ تفسیر طبری: 537/1

بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

''اور ہم نے تاکید کردی ابراہیم (علیہ السلام) اور اسمٰعیل (علیہ السلام) کو کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم (علیہ السلام) نے اے میرے رب! بنادے اس شہر کو امن والا اور روزی دے اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے (یعنی) جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر۔ اللہ نے فرمایا (ان میں سے) جس نے کفر بھی کیا اسے بھی فائدہ اٹھانے دونگا چند روز پھر مجبور کروں گا اسے دوزخ کے عذاب کی طرف اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ اور یاد کرو جب اٹھار ہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل (علیہ السلام) بھی۔ اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بیشک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ انہیں حکم دیا کہ اسے گندگی، ناپاک چیزوں سے پاک رکھیں۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے پوچھا عہد سے کیا مراد ہے تو انہوں نے فرمایا امر۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے بھی یہی مروی ہے یہاں بظاہر حرف علی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے یعنی ہم نے حکم دیا اور وحی کی۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اسے بتوں سے پاک کرنا مراد ہے۔ مجاہد، سعید بن جبیر نے فرمایا ہے کہ بتوں، بری باتوں، جھوٹی گفتگو اور ناپاک چیزوں سے خالی رکھنا مراد ہے۔ ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ عبید بن عمیر، ابو العالیہ، سعید بن جبیر، مجاہد، عطاء اور قتادہ سے مروی ہے کہ کلمۂ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اسے شرک سے پاک کرو۔ (اَلطَّآئِفِيْنَ) طواف کا مفہوم واضح ہے یعنی طواف کرنے والے لیکن سعید بن جبیر نے اس سے مراد باہر سے آنے والے لوگ لیے ہیں۔ اور عَاكِفِيْنَ سے مراد وہاں کے مقیم باشندے۔ عطاء، قتادہ، ربیع بن انس نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ وکیع نے بروایت عطاء ابن عباس سے روایت کیا ہے جو وہاں بیٹھا ہو وہ عاکفین سے ہے۔ ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے ثابت نے کہا ہم نے عبداللہ بن عبید بن عمیر سے کہا میں امیر وقت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ لوگوں کو مسجد حرام میں سونے سے منع کردیں کیونکہ وہ جنبی اور بے وضو ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا ایسا نہ کرو حضرت ابن عمر سے ان کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا وہ عاکفین ہیں۔ بروایت عبد بن حمید بھی اسی طرح آیا ہے۔ (میں کہتا ہوں کہ) صحیحین میں یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب کنوارے تھے تو وہ مسجد نبوی میں سویا کرتے تھے۔ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وکیع نے بروایت عطا ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد نمازی ہیں۔ عطا اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کریں۔ تطہیر سے مراد بتوں، بت پرستوں اور شرک سے پاک کرنا تھا۔ پھر یہاں ایک اعتراض وارد کیا ہے کیا حضرت ابراہیم کی تعمیر سے قبل کعبہ کے پاس کوئی چیز تھی جسے پاک کرنے کا حکم دیا گیا پھر اس کے دو جوابات دیئے ہیں۔ قوم نوح کے وقت سے جو بت پرستی وہاں رائج تھی اس کو صاف کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ بعد والوں کے لئے سنت ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو امام و پیشوا بنایا تھا جیسا کہ عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے کہ تطہیر سے مراد بتوں سے پاک کرنا ہے جن کی مشرکین تعظیم کرتے تھے۔ (میں کہتا ہوں کہ) یہ جواب اس بات پر مبنی ہے کہ حضرت

ابراہیم علیہ السلام سے قبل بیت اللہ کے پاس بت پرستی رائج تھی۔ یہ بات دلیل کی محتاج ہے۔2 جواب دوئم: انہیں حکم دیا کہ وہ اسے خالص اللہ وحدہ لاشریک کے لئے بنائیں۔ اور اس میں شرک و بت پرستی کا شائبہ تک نہ ہو۔ جیسے اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ...... عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (توبہ:109) ’’ترجمہ: تو کیا وہ شخص جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ کے تقویٰ پر اور (اس کی) رضا جوئی پر بہتر ہے یا وہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی وادی کے کھوکھلے ڈھانے کے کنارے پر۔‘‘ اسی طرح یہ آیت ہے۔ سدی کا بھی یہی قول ہے۔ اس جواب کا ملخص یوں ہوسکتا ہے کہ اللہ نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا صرف اس وحدہ لاشریک کے نام سے گھر بنائیں طواف کرنے والوں، وہاں ٹھہرنے اور نماز پڑھنے والوں کے لئے۔ جیسے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ...... وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ...... (حج:26) ’’ترجمہ: یاد کرو جب ہم نے مقرر کردی اس گھر (کے تعمیر کرنے) کی جگہ اور حکم دیا کہ شریک نہ ٹھہرانا میرے ساتھ کسی چیز کو اور صاف ستھرا رکھنا میرے گھر کو طواف کرنے والوں قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں کے لیے‘‘۔ فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ بیت اللہ شریف کے پاس نماز افضل ہے یا طواف۔ امام مالک کے نزدیک باہر والوں کے لئے طواف افضل ہے۔ جمہور نے مطلقاً نماز کو افضل قرار دیا ہے ہر ایک کی توجیہ کتاب الاحکام میں مذکور ہے۔ اس سے مراد مشرکین کا رد کرنا ہے جو اللہ کے گھر کے پاس شرک کرتے جسے صرف اس وحدہ لاشریک کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا۔ پھر مومنین کو اس کے قریب آنے سے روکتے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (حج:25) ’’ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا (اور دوسروں کو) روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے جسے ہم نے (بلا امتیاز) سب لوگوں کے لئے (مرکز ہدایت) بنایا ہے یکساں ہیں اس میں وہاں کے رہنے والے اور پردیسی جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب‘‘۔ پھر ذکر فرمایا کہ بیت اللہ صرف اس شخص کے لئے بنایا گیا تھا جو وحدہ لاشریک کی عبادت کرتا ہے۔ خواہ طواف سے یا نماز سے۔ سورۂ حج میں اس کے تینوں اجزاء قیام، رکوع اور سجود کا ذکر ہے لیکن عاکفین کا تذکرہ نہیں ہوا۔ اس آیت کریمہ میں طائفین اور عاکفین کا ذکر آیا ہے اور قیام کو چھوڑ کر صرف رکوع و سجود پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ رکوع و سجود قیام کے بعد ہوتے ہیں۔ اس طرح اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی بھی تردید ہوگئی۔ وہ حضرت ابراہیم خلیل اور اسماعیل علیہما السلام کی فضیلت کے قائل ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ انہوں نے ہی یہ گھر طواف، اعتکاف اور نماز کے لئے بنایا تھا۔ وہ ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کرتے تو حضرت خلیل کی اتباع کا دعویٰ کس طرح کرتے ہیں؟ حالانکہ ان کی شریعت پر بھی یہ لوگ عمل پیرا نہیں۔ حضرت موسیٰ بن عمران اور دیگر انبیاء نے حج کیا تھا۔ جس طرح کہ نبی معصوم ﷺ نے خبر دی ہے جو اپنی خواہش سے تو بولتے ہی نہیں۔ مساجد کو پاک صاف رکھنے کا حکم بھی اس آیت اور۔ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ (النور:36) ’’ترجمہ: ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے بلند کیا جائے اور لیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کا نام اور اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان گھروں میں صبح اور شام‘‘۔ سنت میں ایسی بے شمار احادیث ہیں جن میں مساجد کی صفائی اور آرائش وغیرہ کا حکم ہے۔ حدیث شریف میں ہے ’’مسجدیں جس کام کے لئے ہیں اسی کام کے لئے ہیں‘‘(1)۔ (میں نے اس موضوع پر ایک علیحدہ رسالہ تصنیف کیا ہے۔ مؤلف) سب سے پہلے کعبہ کی تعمیر کس نے کی؟ اس میں اختلاف ہے۔ (1) بعض علماء کے نزدیک سب سے پہلے فرشتوں نے آدم علیہ السلام سے قبل بنایا (قرطبی) لیکن یہ غریب ہے۔ (2) عبد الرزاق نے ابن جریج، عطاء اور سعید بن مسیب وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اسے پانچ پہاڑوں حراء، طور سینا، طور زیتا جبل

1۔ مسلم، کتاب المساجد 397، 398

لبنان اور جودی پہاڑ سے بنایا۔ یہ بھی غریب روایت ہے۔(3) ابن عباس، کعب احبار، قتادہ اور وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ سب سے پہلے اسے شیث علیہ السلام نے بنایا تھا۔ اس روایت کے راویوں نے اہل کتاب کی کتب پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی تصدیق یا تکذیب نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی صرف ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی صحیح حدیث ہو تو سر آنکھوں پر قولہ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ ...... وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ امام ابن جریر نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کو حرم اور امن کی جگہ قرار دیا۔ میں مدینہ کی دونوں کالی پتھریلی زمینوں (میدانوں) کے درمیانی حصہ کو حرم مقرر کرتا ہوں۔ یہاں شکار نہ کیا جائے اور کانٹے دار درخت نہ کاٹے جائیں''(1)۔ (نسائی، مسلم اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے اسی طرح روایت کیا ہے)۔ ابن جریر نے ایک دوسری سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ابراہیم اللہ کے بندے اور خلیل تھے میں اس کا بندہ اور رسول ہوں۔ ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا میں مدینہ کو دونوں میدانوں میدانوں کے مابین حرم قرار دیتا ہوں۔ اس کے درخت اور شکار (کو نہ چھیڑا جائے) اور لڑائی کے لئے اسلحہ نہ اٹھایا جائے اور کوئی درخت نہ کاٹا جائے مگر اونٹ کے چارہ کے لئے۔ (یہ سند غریب ہے اور کتب صحاح ستہ میں موجود نہیں)۔ اصل حدیث صحیح مسلم میں ایک دوسری سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگ تازہ پھل لے کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ آپ ﷺ یہ پھل لے کر دعا فرماتے ''اے اللہ ہمارے پھل اور شہر اور صاع اور مد میں برکت عطا فرما۔ اے اللہ ابراہیم تیرے بندے، خلیل اور نبی تھے، میں بھی تیرا بندہ اور نبی ہوں انہوں نے تجھ سے مکہ کے لئے دعا کی تھی۔ میں اسی طرح تجھ سے مدینہ کے لئے دعا کرتا ہوں اور اس کے مثل بھی۔'' پھر سب سے چھوٹے بچے کو بلاتے۔ اور اسے یہ پھل عطا فرماتے۔ ایک روایت میں ''برکت کے ساتھ برکت'' کے لفظ آئے ہیں۔ (بروایت مسلم)۔ ابن جریر نے رافع بن خدیج سے یہی روایت کیا ہے(2)۔ صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو طلحہ سے فرمایا اپنے بچوں میں سے ایک بچہ لے کر آؤ جو میری خدمت کرے۔ ابو طلحہ مجھے اپنے پیچھے بٹھا کر لے آئے میں آپ ﷺ کی خدمت کرتا جب بھی آپ تشریف فرما ہوتے۔ حدیث میں ہے کہ آگے چلتے رہے حتیٰ کہ جب احد پہاڑ سامنے آ گیا تو فرمایا احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ جب مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا ''اے اللہ میں اس کے دونوں پہاڑوں کے مابین جگہ کو حرم قرار دیتا ہوں جس طرح حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم قرار دیا۔ اے اللہ ان کے صاع اور مد میں برکت دے''(3)۔ ایک روایت میں ساتھ کیل (پیمانے) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ بخاری نے ساتھ اہل مدینہ کے لفظ کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ایک اور روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! مکہ میں تو نے جو برکت دی ہے مدینہ میں اس سے دوگنا زیادہ برکت عطا فرما۔ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لیے دعا فرمائی اور میں مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں جیسے (حضرت) ابراہیم نے مکہ کو حرم قرار دیا۔ اور میں اس کے مد اور صاع کے لئے اسی طرح دعا کرتا ہوں جیسے حضرت ابراہیم نے مکہ کے لئے دعا فرمائی تھی''(بخاری و مسلم)(4)۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! ابراہیم نے مکہ کو حرم قرار دیا اور میں مدینہ کو جو اس کے دونوں تنگ راستوں کے مابین ہے حرم قرار دیتا ہوں۔ اس میں خون نہ بہایا جائے۔ لڑائی کے لئے اسلحہ نہ اٹھایا جائے۔ کسی درخت کے پتے نہ جھاڑے جائیں مگر چارہ کے لئے۔ اے اللہ ہمارے مدینہ میں برکت

1۔ مسلم، کتاب الحج: 993
2۔ مسلم، کتاب الحج: 1000
3۔ فتح الباری: کتاب الاطعمۃ: 554/9
4۔ مسلم، کتاب الحج: 991

دے۔ اے اللہ ہمارے صاع میں برکت دے اے اللہ ہمارے مد میں برکت دے۔ اے اللہ! ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں عطا فرما۔ الحدیث (مسلم) مدینہ کی حرمت (حرم ہونا) کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں ہم نے صرف وہ ذکر کی ہیں جن کا تعلق حضرت ابراہیم کے مکے کو حرم قرار دینے سے ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ کی مطابقت اسی سے ہے۔ ان سے اس شخص نے استدلال کیا ہے جو اس طرف گیا ہے کہ مکہ کو حضرت ابراہیم کی زبان مبارک سے حرم قرار دیا گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ شروع سے ہی حرم اور مامن ہے۔ یہی قول زیادہ ظاہر اور اقوی ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے قبل ہی مکہ کو حرم قرار دے دیا تھا۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا اس شہر کو اللہ نے اس دن حرم قرار دیا جس روز زمین و آسمان کی تخلیق ہوئی۔ یہ اللہ کی حرمت سے تا قیامت حرم ہے۔ اس کا کانٹا نہ کاٹا جائے۔ اس کا شکار نہ بھگایا جائے۔ اس کا لقطہ (گری پڑی چیز) نہ اٹھایا جائے مگر جو اعلان کرے۔ اس کی گھاس نہ کاٹی جائے۔ حضرت عباس نے عرض کی یا رسول اللہ! مگر اذخر یہ ہمارے سناروں (یا لوہاروں) اور گھروں کے لئے ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا "مگر اذخر" (یعنی آپ نے اس کے استعمال کی رخصت دی)۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں شیخین نے یہی روایت ابو ہریرہ سے بھی روایت کی ہے۔ امام بخاری نے اسے تعلیقاً بھی روایت کیا ہے۔ جسے امام ابن ماجہ نے صفیہ بنت شیبہ سے روایت کیا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فتح مکہ کے دن خطبہ دے رہے تھے (اس سے آگے اوپر والی روایت ہی مذکور ہے) ابو شریح عدوی نے عمرو بن سعید سے اس وقت کہا جب وہ مکہ کی طرف لشکر بھیج رہا تھا کہ اے امیر! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو ایک بات بتاؤں جو رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن فرمائی تھی اسے میرے کانوں نے سنا، دل نے یاد کیا اور آنکھوں نے آپ کو ارشاد فرماتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ بے شک اللہ نے مکہ کو حرم قرار دیا لیکن لوگوں نے اس کا خیال نہ رکھا۔ جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے لئے اس میں خون بہانا جائز نہیں۔ اس کا درخت نہ کاٹا جائے۔ اگر کوئی اللہ کے رسول کی لڑائی سے رخصت نکالے تو اسے کہہ دینا اللہ نے اپنے رسول کو اجازت دی اور تمہیں اجازت نہیں۔ مجھے بھی دن کا کچھ اجازت تھی آج اس کی حرمت اسی طرح لوٹ آئی ہے جس طرح کل تھی جو حاضر ہے وہ غیر موجود کو یہ خبر پہنچا دے۔ ابو شریح سے پوچھا گیا عمرو نے آپ کو کیا کہا تو فرمایا اس نے کہا اے ابو شریح میں تم سے زیادہ اس بات کو جانتا ہوں جرم مجرم، قاتل اور بربادی لانے والے کو نہیں بچاتا (بخاری و مسلم) (یہ الفاظ مسلم کے ہیں)۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو یاد رہے کہ ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اللہ نے مکہ کو تخلیق ارض و سما کے وقت حرم قرار دیا۔ اور وہ احادیث جن میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسے حرم قرار دیا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم نے اس حرمت کی خبر دی تھی۔ حضرت ابراہیم کے کعبہ بنانے سے قبل بھی یہ شہر حرام تھا۔ جس طرح رسول اکرم ﷺ اس وقت بھی اللہ کے ہاں خاتم النبیین مکتوب تھے۔ حالانکہ اس وقت آدم علیہ السلام کا خمیر ابھی تیار ہوا تھا۔ اس لیے حضرت ابراہیم نے عرض کی یا رب ان میں رسول بھیج جو انہی میں سے ہو۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! اپنی ابتدائے نبوت کا تو کچھ ذکر کیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے باپ ابراہیم کی دعا، عیسیٰ بن مریم کی خوشخبری، اور میری ماں نے نور دیکھا جس سے شام کے محلات ان کے سامنے روشن ہو گئے۔ رہا یہ مسئلہ کہ مکہ افضل ہے جیسا کہ جمہور کا قول ہے۔ یا مدینہ، مکہ سے افضل ہے جیسا کہ امام مالک اور آپ کے پیروکاروں کا مذہب ہے۔ فریقین کی آراء بمعہ ادلہ آگے ان شاء اللہ ذکر کی جائیں گی۔ **قولہ** رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا کہ اے رب اسے امن والا بنا دے۔ یعنی خوف سے۔ یہاں کے باشندوں کو کوئی خدشہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے منظور فرمالیا۔ جیسے ارشاد فرمایا: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ

اٰمِنًا(آل عمران:97) ''ترجمہ: جو بھی داخل ہوا اس میں ہو جاتا ہے (ہر خطرہ سے) محفوظ۔'' ایک اور مقام پر فرمایا۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِہِمْ (عنکبوت:67) ''کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا ہم نے بنا دیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے۔'' وغیرہ آیات۔ ارض حرم قتال اور لڑائی کی حرمت والی احادیث پہلے مذکور ہو چکی ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا۔ کسی کے لئے مکہ میں اسلحہ اٹھانا جائز نہیں(1)۔ (اٰمِنًا) یعنی اس خطہ مبارکہ کو امن والا شہر بنا۔ آپ کی یہ دعا کعبہ شریف کی بنا سے پہلے تھی۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے: وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰہِیْمُ...... اٰمِنًا (ابراہیم:35) ''ترجمہ: اور (اے حبیب) یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے کہ بنا دے اس شہر کو امن والا یہ اس مقام کے مناسب ہے گویا یہ دعا دوسری مرتبہ تعمیر کعبہ کے بعد، وہاں لوگوں کے آباد ہونے اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کے بعد کی ہے۔ آپ حضرت اسماعیل سے تیرہ ماہ چھوٹے تھے۔ اسی لیے دعا کے آخر میں فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (ابراہیم:39) ''ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے عطا فرمائے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (جیسے فرزند) بلاشبہ میرا رب بہت سننے والا ہے دعاؤں کا''۔ قولہ وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ...... وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (بقرہ:126) ابو جعفر رازی نے بروایت ربیع بن انس حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ، وَمَنْ كَفَرَ سے آخر آیت تک خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ مجاہد اور عکرمہ کا یہی قول ہے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کی تصحیح کی ہے۔ بعض لوگوں نے آیت کے اس حصہ کو بھی دعائے ابراہیمی میں داخل کیا ہے۔ جیسے ابو جعفر نے بسند ربیع ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے یعنی اے اللہ ان میں سے جو کفر کریں انہیں بھی تھوڑی سی مہلت دے اسی لیے بعض علماء نے اسے فامتعه کر کے پڑھا ہے۔ مجاہد نے اس سے مراد رزق لیا ہے یعنی ان میں کفار کو بھی تھوڑا سا رزق دے پھر انہیں عذاب میں مبتلا کر دے۔ محمد بن اسحٰق کا قول ہے کہ دعا کے بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پتہ چلا کہ منکرین کو اوامر الٰہیہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے اللہ نے حق ولایت ومحبت سے محروم کر دیا ہے اگرچہ وہ ذریت ابراہیمی سے ہی ہیں۔ تو آپ نے اچھی طرح جان لیا کہ ان میں سے ظالم لوگ بھی ہوں گے۔ جن کو اللہ کا عہد نہیں پہنچے گا۔ تو اللہ نے فرمایا جو کفر کرے گا میں نیک و بد کو رزق دوں گا اور کچھ مہلت دوں گا۔ حاتم بن اسماعیل نے اپنی سند سے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے صرف مومنین پر محدود کرنا چاہتے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ کفر کرنے والے کو بھی مومنین کی طرح رزق عطا کیا جائے گا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں مخلوق کو پیدا کروں اور انہیں رزق نہ دوں۔ میں انہیں ڈھیل دوں گا اور پھر انہیں عذاب میں مبتلا کروں گا جو کہ برا ٹھکانہ ہے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت فرمائی: كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ...... رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (بنی اسرائیل:20) ''ترجمہ: ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں ان کی بھی (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں) آپ کے رب کی بخششوں سے اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ (ابن مردویہ نے اسے روایت کیا ہے)۔ عکرمہ اور مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اسی طرح ایک اور آیت کریمہ میں آتا ہے۔ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ...... بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ (یونس:70-69) ''ترجمہ: آپ فرمائیے جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے (چند روزہ) لطف اندوزی ہے دنیا میں پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے'' ایک اور مقام پر فرمایا: وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا یَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ...... اِلٰی عَذَابٍ

1۔ مسلم، ص 989

غَلِيْظٍ (لقمان:24-23) ’’ترجمہ: اور جس نے کفر کیا تو نہ غمزدہ کرے آپ کو اس کا کفر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پس ہم آگاہ کریں گے انہیں جو انہوں نے کیا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (چھپا) ہے اور ہم لطف اندوز ہونے دیں گے تھوڑی دیر پھر ہم انہیں ہانک کر لے جائیں گے سخت عذاب کی طرف۔ وَ لَوْ لَاۤ اَنْ یَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ...... عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (زخرف:35-33) ’’ترجمہ: اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کے لئے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا ان کے مکانوں کے لئے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی) اور ان کے گھروں کے دروازے چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں وہ بھی چاندی اور سونے کے اور یہ سب (سنہری روپہلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہے اور آخرت (کی عزت اور کامیابی) آپ کے رب کے نزدیک پرہیزگاروں کے لئے ہے۔ قولہ ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (بقرہ:126) ’’ترجمہ: یعنی دنیا میں انہیں شان وشوکت دینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ انہیں مہلت دے رہے ہیں۔ پھر ان کی سخت پکڑ ہوگی‘‘۔ جیسے فرمایا۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ (حج:48) ’’ترجمہ: اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں میں نے (کافی عرصہ) ڈھیل دی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (بھی جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑ لیا تو میری طرف ہی (سب کو) لوٹنا ہے‘‘۔ صحیحین میں ہے کہ ناپسندیدہ بات کو سننے کے باوجود اس پر صبر کرنے میں اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ وہ اس کی اولاد بناتے ہیں لیکن وہ انہیں رزق دیتا اور معاف کرتا ہے۔ ایک اور مقام پر صحیح میں ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے اور جب اسے پکڑ لے تو اس کو نہیں چھوڑتا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (ہود:102) ’’ترجمہ: اور یونہی گرفت ہوتی ہے آپ کے رب کی جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو درآں حالیکہ وہ ظالم ہوتی ہیں بے شک اس کی گرفت بڑی دردناک (اور) سخت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قلیل سے تا آخر کو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں شامل کیا ہے لیکن یہ قرأت شاذ ہے اور قرائے سبعہ کے خلاف ہے ترکیب سیاق بھی اس کو قبول نہیں کرتی۔ واللہ اعلم۔ جمہور کی قرأت میں قال کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ ہے۔ سیاق کلام سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے اس شاذ قرأت کے مطابق قال کی ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ہوگی۔ یہ بات نظم کلام کے خلاف ہے۔ قولہ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ ...... قواعد یہ قاعدہ کی جمع ہے پایہ (ستون) اور بنیاد۔ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں اے محمد! اپنی قوم کو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا بیت اللہ کی تعمیر کرنا یاد دلایئے۔ جب وہ یہ کہہ رہے تھے اے ہمارے رب! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ قرطبی وغیرہ نے ابی اور ابن مسعود سے وَ اِسْمٰعِيْلُ کے بعد وَيَقُوْلَانِ کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں اگلی آیت میں جمع کا صیغہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ دونوں نیک عمل میں مصروف ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کا سوال کررہے ہیں۔ جس طرح کہ ابن ابی حاتم نے حضرت وہیب بن الورد کے بارے میں روایت کیا ہے کہ جب وہ تلاوت کے دوران اس آیت تک پہنچتے تو روتے اور فرماتے اے اللہ کے خلیل! آپ اللہ کے گھر کی بنیادیں اٹھارہے ہیں اور پھر یہ خدشہ محسوس کرتے ہیں یہ عمل مقبول نہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مخلص مومنین کا حال اس آیت میں بیان کیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ (مومنون:60) ’’ترجمہ: اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل ڈررہے ہیں‘‘۔ یعنی صدقات ونفقات اور عبادات کے بعد بھی وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ عبادت رد نہ کردی جائے۔ صحیح حدیث میں حضرت عائشہ سے بھی اسی طرح مروی ہے جس کا بیان اپنی جگہ آئے گا۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ حضرت ابراہیم بنیادیں اٹھارہے تھے اور حضرت اسماعیل دعا مانگ رہے تھے۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ دونوں ہر کام میں شریک تھے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت اور بعض آثار بھی

یہاں ذکر کیے جانے کے قابل ہیں۔ بخاری نے اپنی سند سے حضرت سعید بن جبیر کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ عورتوں نے کمر بند باندھنا حضرت اسماعیل کی والدہ ماجدہ سے سیکھا ہے۔ انہوں نے اسے اس لیے باندھا تھا کہ حضرت سارہ کے سامنے اپنا نقش قدم مٹا دیں۔ حضرت ابراہیم انہیں اور ان کے دودھ پیتے بچے اسماعیل کو لے کر آئے اور بیت اللہ شریف کے قریب زمزم سے اوپر بالائی مسجد میں ایک بڑے درخت کے پاس چھوڑ دیا۔ ان دنوں مکہ میں کوئی نہ تھا۔ یہ بے آب سرزمین تھی۔ آپ نے انہیں وہاں چھوڑا ایک تھیلے میں کچھ کھجوریں اور پانی کا مشکیزہ ان کے پاس رکھ کر واپس چل دیئے۔ حضرت ہاجرہ ان کے پیچھے آئیں اور آواز دی اے ابراہیم! اس بے آباد وادی میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بار بار بات دہرائی لیکن حضرت ابراہیم نے ان کی طرف منہ موڑ کر نہ دیکھا۔ پھر انہوں نے پوچھا کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ وہ فرمانے لگیں تو وہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ پھر وہ واپس لوٹ آئیں اور حضرت ابراہیم آگے چلتے رہے یہاں تک کہ جب گھاٹی (ثنیہ) کے پاس پہنچے جہاں وہ آپ کو نہیں دیکھ سکتیں تھیں۔ تو آپ نے بیت اللہ کی طرف منہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعائیں مانگیں۔ رَبَّنَآ اِنِّیۡٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ ...... لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ (ابراہیم: 37) ”ترجمہ: اے ہمارے رب میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں تیری حرمت والے گھر کے پڑوس میں اے ہمارے رب یہ اس لیے تاکہ وہ قائم کریں نماز پس کر دے ان لوگوں کے دلوں کو کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں سے تاکہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں۔ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو دودھ پلانے لگیں۔ اور وہ پانی پی لیتیں تا آنکہ مشک کا پانی ختم ہو گیا اور انہیں پیاس لگی اور ان کا بیٹا بھی پیاس محسوس کرنے لگا۔ وہ اسے پیاس سے تڑپتا دیکھ رہی تھیں۔ آخر اٹھ کھڑی ہوئیں تاکہ اسے نہ دیکھ سکیں۔ اور قریبی پہاڑی صفا پر چڑھ کر دیکھا کہ شاید کوئی آدمی نظر آ جائے۔ لیکن کوئی نہ تھا۔ وہ صفا سے نیچے اتر کر وادی میں آئیں تو اپنی چادر کا پلو لہرایا۔ پھر ایک اور انسانی کوشش میں آگے تشریف لے گئیں اور مروہ پر چڑھ گئیں اس پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی آدمی نظر آ جائے۔ لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ اس طرح انہوں نے سات چکر لگائے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اسی لیے لوگ ان دو پہاڑیوں کے مابین سعی کرتے ہیں۔ جب مروہ پر آئیں تو ایک آواز سنی۔ انہوں نے اپنے آپ سے کہا ”خاموش۔“ پھر غور سے سننے کی کوشش کی تو دوبارہ آواز آئی۔ حضرت ہاجرہ نے فرمایا کیا تو ہماری فریاد رسی کر سکتا ہے؟ اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ بئر زمزم کی جگہ ایک فرشتہ ہے۔ اس نے اپنی ایڑی یا پر مارا تو پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا وہ اس کے گرد حوض بنانے لگیں اور اسے اپنی مشک میں ڈالنے لگیں۔ پانی زور سے ابل رہا تھا(1)۔ ابن عباس نے فرمایا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم فرمائے اگر وہ زمزم کو چھوڑ دیتیں (ایک روایت میں ہے اس میں سے پانی نہ لیتیں) تو یہ ایک جاری چشمہ ہوتا۔ فرمایا انہوں نے خود بھی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا۔ فرشتے نے کہا کسی قسم کا خدشہ محسوس نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کرے گا۔ اللہ اپنے بندوں کو ضائع نہیں کرتا۔ بیت اللہ شریف ایک ٹیلے کی شکل میں زمین سے بلند تھا۔ سیلاب آتے تو دائیں بائیں سے گذر جاتے۔ آپ وہیں فروکش رہیں کہ کداء کی طرف سے آتے ہوئے بنو جرہم کے کچھ لوگوں کا یہاں سے گزر ہوا۔ وہ زیریں مکہ میں اترے۔ انہوں نے ایک پرندہ دیکھا وہ کہنے لگے یہ پرندہ پانی کے گرد منڈلاتا ہے۔ ہم عرصہ دراز سے اس وادی سے گذرتے ہیں یہاں پانی کا نام و نشان تک نہیں۔ انہوں نے ایک یا دو آدمی بھیجے جو پانی کی موجودگی کی خبر لے کر آئے۔ سب لوگ آ گئے اور حضرت ہاجرہ سے کہنے لگے اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے پاس فروکش ہو جائیں؟ انہوں نے فرمایا ہاں لیکن پانی پر تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ وہ مان گئے۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ نبی ﷺ نے

1۔ البخاری: 174/4

فرمایا ام اسماعیل کو یہ بات پسند آئی کیونکہ وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ کوئی ہم جنس مل جائے۔ وہ لوگ وہاں ٹھہر گئے اور اپنے اہل خانہ کو بھی وہیں بلالیا۔ اور گھر بنالیے۔ بچہ جوان ہو گیا۔ اور ان سے عربی سیکھی۔ انہیں یہ نوجوان پسند آ گیا۔ اسے اپنی ایک لڑکی سے بیاہ دیا۔ ام اسماعیل کا انتقال ہو گیا۔ حضرت اسماعیل کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم اپنے اہل وعیال سے ملنے کے لئے آئے۔ حضرت اسماعیل موجود نہ تھے۔ آپ نے حضرت اسماعیل کی اہلیہ سے ان کے بارے پوچھا۔ وہ کہنے لگیں ہمارے کھانے پینے کا کچھ سامان کرنے کے لئے گئے ہیں۔ پھر آپ نے اس سے ان کی گذر اوقات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا گذارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ اور آپ کے سامنے شکوہ کرنے لگی۔ آپ نے فرمایا جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دے۔ جب حضرت اسماعیل آئے تو آپ نے کچھ محسوس کیا۔ آپ نے پوچھا کیا کوئی آیا تھا؟ وہ کہنے لگی اس طرح کا ایک بوڑھا آیا تھا۔ اور آپ کا پوچھا میں نے بتادیا پھر پوچھا ہمارا گذارہ کیسے ہوتا ہے میں نے کہا کہ ہمارے دن عسرت سے گذر رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا اس نے تمہیں کوئی نصیحت کی۔ وہ کہنے لگی انہوں نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ آپ نے فرمایا وہ میرے والد ماجد تھے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں طلاق دے دوں جاؤ اپنے گھر چلی جاؤ۔ آپ نے اسے طلاق دے کر ایک اور عورت سے نکاح کر لیا۔ اس کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت ابراہیم دوبارہ آئے۔ اتفاقاً حضرت اسماعیل پھر موجود نہ تھے۔ آپ ان کی اہلیہ کے پاس آئے اور آپ کے بارے میں دریافت کیا وہ بتانے لگیں کہ خوراک کا انتظام کرنے گئے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا تمہارا کیا حال ہے؟ اور گذر بسر کیسی ہو رہی ہے؟ وہ کہنے لگی ہم خیریت سے ہیں اور خوشحال ہیں اور اللہ کی حمد وثناء بیان کرنے لگی۔ آپ نے پوچھا تمہارا کھانا کیا ہے؟ وہ کہنے لگی گوشت۔ آپ نے فرمایا اور مشروب؟ کہنے لگی پانی۔ آپ نے فرمایا اے اللہ ان کے گوشت اور پانی میں برکت دے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس وقت ان کے پاس غلہ نہ تھا۔ اگر ان کے پاس یہ اناج بھی ہوتا تو آپ اس میں بھی ان کے لئے دعا فرماتے۔ فرمایا اب اہل مکہ کے سوا کوئی شخص ان دو پر گذارہ کرے تو اسے یہ چیزیں موافق نہ آئیں۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا، جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور اسے حکم دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ سلامت رکھے۔ جب حضرت اسماعیل آئے تو پوچھا کیا کوئی آیا تھا؟ اس نے بتایا کہ ایک عمر رسیدہ شخص آیا تھا۔ جو بڑا خوبصورت تھا اور آپ کی تعریف کی۔ اس نے مجھ سے آپ کے بارے میں دریافت کیا۔ پھر ہماری معیشت کا پوچھا میں نے اسے بتایا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ حضرت اسماعیل نے پوچھا کیا اس نے آپ کو کوئی پیغام دیا؟ کہنے لگی ہاں وہ آپ کو سلام کہہ رہے تھے اور فرمار ہے تھے کہ گھر کی چوکھٹ سلامت رکھو۔ آپ نے فرمایا وہ میرے باپ اور تو میری چوکھٹ ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں اپنے پاس ہی رکھوں۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ دوبارہ تشریف لائے تو حضرت اسمٰعیل بئر زمزم کے قریب درخت کے نیچے تیر تراش رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر اٹھے اور تکریم وآداب بجالائے۔ پھر فرمایا اے اسماعیل اللہ نے مجھے ایک حکم دیا ہے فرمایا آپ کے رب نے آپ کو جو حکم دیا ہے اسے بجالائیے فرمایا کیا تم میری مدد کرو گے؟ کہا ہاں۔ فرمایا، اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہاں گھر تعمیر کروں پھر سامنے والے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت دونوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھائیں۔ حضرت اسماعیل پتھر لاتے اور حضرت ابراہیم تعمیر فرماتے۔ جب دیوار بلند ہو گئی تو یہ پتھر لائے اسے رکھا اور حضرت ابراہیم اس پر کھڑے ہو کر بنیادیں اٹھانے لگے۔ حضرت اسماعیل پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور دونوں یہ دعا بھی مانگتے جاتے۔ عبد بن حمید نے اسے عبد الرزاق سے مفصلاً روایت کیا ہے۔ طبرانی اور ابن جریر نے اسے مختصر روایت کیا ہے۔ ابوبکر بن مردویہ نے کثیر بن کثیر سے روایت کیا ہے کہ میں، عثمان بن ابی سلیمان اور عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی حسین کچھ لوگوں کے ساتھ سعید بن جبیر کے پاس رات کو بالائی مسجد میں بیٹھے تھے کہ سعید بن جبیر نے فرمایا مجھ سے پوچھ لو اس سے قبل کہ

تم لوگ مجھے نہ دیکھو۔ انہوں نے مقام ابراہیم کے بارے میں پوچھا تو حضرت سعید نے بروایت ابن عباس یہ طویل حدیث سنائی۔ بخاری نے یہی روایت کتاب الانبیاء میں ایک دوسری سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ حاکم نے اپنی متدرک میں یہی روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ ''یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ اور انہوں نے اسے روایت نہیں کیا۔'' حالانکہ ابھی اوپر مذکور ہوا کہ بخاری نے اسے روایت کیا ہے۔ گویا اس میں اختصار ہے۔ اور ذبح کا ذکر نہیں۔ صحیح میں ہے کہ مینڈھے کے دو سینگ کعبہ میں لٹکے ہوئے تھے اور حضرت ابراہیم براق پر سوار ہو کر مکہ میں اپنے اہل خانہ سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے تھے۔ پھر بلاد مقدسہ میں اپنے گھر واپس چلے جاتے۔ واللہ اعلم۔

امیر المومنین حضرت علی سے اس کے علاوہ بھی مروی ہے جیسا کہ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ تعمیر کعبہ کے حکم کے وقت حضرت ابراہیم جب مکہ آئے تو بیت اللہ کی جگہ پر ایک بادل دیکھا اس میں سر تھا جس نے آپ سے گفتگو کی اور کہا اے ابراہیم! جہاں تک میرا سایہ ہے تعمیر کرو۔ کمی زیادتی نہ ہو۔ تعمیر کے بعد آپ نکلے اور حضرت اسماعیل اور ہاجرہ کو وہیں چھوڑ دیا حضرت ہاجرہ نے عرض کی اے ابراہیم ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو فرمایا: اللہ کے حوالے کر کے (الحدیث)۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی روانگی سے قبل بیت اللہ کی تعمیر کی لیکن ان کی تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ پہلے اس کے نشانات لگائے ہوں۔ اور جب اسماعیل علیہ السلام بڑے ہو گئے تو اسے دونوں نے مل کر مکمل کیا ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے۔ ابن جریر نے خالد بن علیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑا ہوا اور عرض کی مجھے بتائیے کیا بیت اللہ سب سے پہلے تعمیر ہوا آپ نے فرمایا نہیں یہ وہ پہلا گھر ہے جس میں برکت رکھی گئی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ یہ کس طرح بنا؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ زمین پر میرا گھر بناؤ حضرت ابراہیم یہ سن کر پریشان ہوئے تو اللہ نے سکینت نازل فرمائی یہ تیز آندھی تھی۔ اس کے دو سر تھے۔ یہ ایک دوسرے کے پیچھے چلے یہاں تک کہ مکہ پہنچے۔ اس نے بیت اللہ کی جگہ کو طوق (سپر) کی طرح گھیر لیا۔ اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ سکینہ کے دائرے کی جگہ تعمیر کریں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے تعمیر کی اور ایک پتھر کی جگہ رہ گئی۔ نوجوان صاحبزادہ پتھر لینے گیا۔ جب آپ واپس آئے تو کیا دیکھا کہ حضرت ابراہیم اس جگہ حجر اسود لگا چکے ہیں۔ آپ نے پوچھا اے والد گرامی یہ پتھر کون لایا۔ آپ نے فرمایا اسے جبریل آسمان سے لائے تھے اس طرح کعبہ کی تعمیر مکمل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے کعب احبار سے نقل کیا ہے کہ زمین کی تخلیق سے چالیس سال قبل بیت اللہ پانی پر جھاگ کی طرح تھا۔ یہیں سے زمین پھیلائی گئی۔ سعید نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم آرمینیا کی سرزمین سے تشریف لائے تھے۔ اور سکینہ آپ کی راہنمائی کر رہی تھی۔ جیسے مکڑی جالا تن دیتی ہے۔ اس نے ایسے پتھر دکھائے جنہیں تیس آدمی مل کر اٹھا سکتے ہیں۔ سدی نے بھی قریباً یہی بات لکھی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم کو جب کعبہ کی تعمیر کا حکم ملا تو دونوں باپ بیٹا کدالیں اور پھاوڑے لے کر آ گئے۔ اس وقت اللہ نے تیز ہوا بھیجی جس کے دو پر اور سر سانپ کی طرح تھا اس نے کعبہ کی ابتدائی اساس سے آگاہ کیا اس کی روشنی میں ہی بنیادیں کھودی گئیں۔ اس کی طرف ایک اور آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (حج: 26) ''ترجمہ: اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیم کے لئے اس گھر کے (تعمیر کرنے کی) جگہ۔'' جب وہ دیوار بنا کر رکن کے مقام تک پہنچے تو حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو ایک خوبصورت پتھر لانے کا حکم دیا۔ وہ تلاش کو گئے تو جبرائیل حجر اسود ہندوستان سے لے آئے یہ خالص سفید یاقوت تھا۔ حضرت آدم اسے جنت سے لائے تھے۔ پھر یہ لوگوں کی خطاؤں سے سیاہ ہو گیا۔ ....الخ اس کلام سے پتہ چلتا ہے کہ کعبہ کی بنیادیں حضرت ابراہیم سے قبل موجود تھیں۔ انہی پر انہوں نے تعمیر کی۔ عبدالرزاق نے ابن عباس سے یہی روایت کیا ہے۔

عبدالرزاق نے ہی عطاء بن ابی رباح سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو آپ کی ٹانگیں زمین پر اور سر آسمان میں تھا۔ آپ اہل سماء کی بات چیت کی سماعت فرماتے۔ ملائکہ یہ دیکھ کر گھبرائے اور بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔ چنانچہ آپ کا قد گھٹا دیا گیا۔ جب وہ آوازیں آپ کو سنائی نہ دیں تو آپ نے وحشت محسوس کی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کی۔ چنانچہ آپ کو مکہ جانے کا حکم ملا۔ جہاں جہاں آپ کے قدم لگے وہاں آبادی ہوئی اور دو قدموں کے مابین جگہ جنگل تھی۔ حتیٰ کہ آپ مکہ جا پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے یاقوت اتارا۔ یہ موجودہ بیت اللہ کی جگہ تھا۔ آپ اس کا طواف کرتے رہے۔ حتیٰ کہ طوفان نوح کے زمانہ میں اسے اٹھالیا گیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور آپ نے اسے تعمیر کیا۔ اسی کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ..... (حج:26)۔ عبدالرزاق نے عطاء سے نقل کیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے عرض کی میں فرشتوں کی آوازیں نہیں سن پاتا۔ فرمایا یہ تمہاری غلطی کے سبب ہے۔ لیکن زمین پر چلے جاؤ اور میرے لئے گھر بناؤ پھر اسے اسی طرح گھیر لو جیسے تم نے فرشتوں کو دیکھا تھا کہ وہ میرے گھر کو گھیرے ہوئے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے اسے پانچ پہاڑوں، حراء، طور، زیتا، طور سینا اور جودی سے بنایا تھا۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر تھی۔ پھر اسے حضرت ابراہیم نے بنایا۔ اس کی سند عطاء تک صحیح ہے لیکن اس کے بعض راویوں کا انکار ہے واللہ اعلم۔ عبدالرزاق نے ہی قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ نے بیت اللہ کو حضرت آدم کے ساتھ اتارا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سرزمین ہند پر اتارا گیا.......... الخ۔ ابن جریر نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ بیت اللہ شریف کی بنیاد پانی پر چار ارکان پر رکھی گئی۔ یہ تخلیق دنیا سے دو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ پھر بیت اللہ کے نیچے سے زمین پھیلائی گئی۔ محمد بن اسحٰق سے مجاہد وغیرہ اہل علم کا قول ہے کہ اللہ نے جب حضرت ابراہیم کے لئے بیت اللہ کی حد مقرر کر دی تو آپ شام سے تشریف لائے۔ حضرت اسماعیل اور سیدہ ہاجرہ آپ کے ہمراہ تھیں۔ حضرت اسماعیل اس وقت شیر خوار بچے تھے۔ جبرائیل بیت اللہ اور حرم کی حدود کے بارے بتانے کے لئے ہمراہ تھے۔ جب کسی گاؤں کے پاس سے گزرتے تو آپ دریافت فرماتے اے جبرائیل! کیا ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ جبرائیل فرماتے آگے چلیے۔ حتیٰ کہ مکہ جا پہنچے۔ وہاں ان دنوں کانٹے دار درخت، سلم اور سمر وغیرہ تھے۔ عمالقہ نامی قوم وہاں رہائش پذیر تھی۔ بیت اللہ شریف کی جگہ سرخ مٹی کا ٹیلہ تھا۔ حضرت ابراہیم نے جبرائیل سے پوچھا کیا یہاں مجھے گھر تعمیر کرنے کا حکم ہوا ہے۔ جبرائیل نے فرمایا ہاں۔ انہیں حجر اسود کی جگہ اتارا ام اسماعیل کو حکم دیا کہ یہاں چھپر تیار کریں۔ اور یہ دعا کی: رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ...... لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ (ابراہیم:37) "اے ہمارے رب میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں اے ہمارے رب یہ اس لئے کہ وہ قائم کریں نماز پس کر دے لوگوں کے دلوں کو کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں سے تا کہ وہ تیرا (شکر) ادا کریں"۔

عبدالرزاق نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی یہ جگہ ہر چیز سے دو ہزار سال قبل تخلیق فرمائی۔ اس کی ارکان ساتویں زمین میں ہیں۔ ابن ابی حاتم نے علیاء بن احمر سے روایت کیا ہے کہ ذوالقرنین جب مکہ آیا۔ تو حضرت ابراہیم اور اسماعیل دونوں بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے۔ اس نے پوچھا ہماری سرزمین پر تم کیا کر رہے ہو تو انہوں نے بتایا کہ ہم اللہ کے حکم سے یہ گھر بنا رہے ہیں۔ اس نے کہا اپنے دعویٰ کی دلیل لاؤ۔ تو پانچ مینڈھوں نے گواہی دی کہ دونوں باپ بیٹے کو کعبہ کی تعمیر کا حکم ہے۔ یہ سن کر وہ مان گیا۔ ازرقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ ذوالقرنین نے حضرت ابراہیم کے ساتھ مل کر مکہ کا طواف کیا اور یہ اس کے مقدم (سابقہ زمانہ میں ہونا) ہونے کی دلیل ہے۔ واللہ اعلم۔ امام بخاری کا قول ہے کہ قواعد کا واحد قاعدہ ہے (اساس)۔ اور قواعد من النساء کا واحد بھی قاعدہ ہی ہے۔

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کیا تو نہیں دیکھتی کہ جب تیری قوم نے کعبہ کی تعمیر کی اور حضرت ابراہیم کی بنیاد سے گھٹا دیا؟۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! آپ اسے حضرت ابراہیم والی بنیادوں پر کیوں نہیں کر دیتے فرمایا اگر تیری قوم کا عہد کفر سے قریب نہ ہوتا تو میں ایسا کر دیتا(1)۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا فرمان ہے کہ اگر سیدہ عائشہ نے یہ بات حضور ﷺ سے سنی تھی میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضور ﷺ نے حجر اسود کی طرف والے دونوں ارکان کا استلام ترک فرمایا ہو۔ مگر بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر مکمل نہیں کیا گیا۔ بخاری نے اسے کتاب الحج میں قعنبی سے اور احادیث الانبیاء میں عبداللہ بن یوسف سے روایت کیا ہے۔ جبکہ مسلم نے یحیٰی بن یحیٰی اور حدیث ابن وہب سے، نسائی نے حدیث عبدالرحمٰن بن قاسم سے اور سب نے مالک سے روایت کیا ہے۔ جبکہ مسلم نے حدیث نافع میں بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''اگر تیری قوم زمانہ جاہلیت (یا کفر) سے قریب تر نہ ہوتی تو میں کعبہ کے خزانے کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا'' اس کا دروازہ زمین پر لگاتا۔ اور حطیم کو اس میں شامل کر دیتا(2)۔ بخاری نے اسود سے روایت کیا ہے کہ زبیر نے مجھے کہا سیدہ عائشہ تمہیں بہت احادیث سنایا کرتی تھیں۔ کعبہ کے بارے میں انہوں نے تمہیں کیا بیان کیا تھا؟۔ میں نے کہا انہوں نے مجھے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عائشہ! اگر تیری قوم نئی نئی دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئی ہوتی (ابن زبیر نے کہا کفر سے قریب) تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اس کے دو دروازے بنا دیتا۔ ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے باہر چلے جاتے۔ چنانچہ ابن زبیر نے اپنے زمانہ خلافت میں کعبہ کی اسی طرح از سر نو تعمیر کی۔ (اس روایت کو بخاری نے انفراداً روایت کیا ہے)(3)۔ بخاری نے ہی یہ روایت کتاب العلم میں بھی ذکر فرمائی ہے۔ مسلم کی روایت میں سیدہ عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا اگر تیری قوم کا عہد کفر سے قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا کر حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔ قریش نے جب کعبہ کی تعمیر کی تو اس کی بنیادوں کو چھوٹا کر دیا میں اس کا پچھلا دروازہ بھی رکھتا(4)۔ یہی روایت مسلم نے ابوبکر بن شیبہ اور ابو کریب کے حوالے سے بھی نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں عبداللہ بن زبیر نے فرمایا میں نے اپنی خالہ یعنی عائشہ کو ارشاد فرماتے سنا کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا اے عائشہ اگر تیری قوم شرک سے نئی نئی دور نہ ہوئی ہوتی تو میں کعبہ کو گرا کر زمین سے ملا دیتا اس کے دو دروازے (شرقی اور غربی) بناتا اور حطیم کے چھ ہاتھ اس میں شامل کرتا۔ قریش نے تعمیر کعبہ کے وقت اسے مختصر کر دیا تھا۔ مسلم اس روایت میں بھی منفرد ہیں(5)۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بعد اور بعثت نبوی سے پانچ سال قبل قریش کی طرف سے کعبہ کی تعمیر نو

حضور ﷺ ان کے ساتھ مل کر پتھر اٹھا کر لاتے رہے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک پینتس برس تھی۔ سیرت میں محمد بن اسحٰق کا قول ہے کہ جب آپ کی عمر شریف پینتس برس ہوئی تو قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا۔ وہ اس کی چھت بھی بنانا چاہتے تھے لیکن اسے گرانے سے بھی ڈرتے تھے۔ پہلی عمارت پتھر کی تھی اس کو مزید بلند کر کے اس پر چھت بھی ڈالنا چاہتے تھے۔ کیونکہ کچھ لوگ کعبے کا خزانہ چوری کر کے لے گئے تھے۔ یہ خزانہ جوف کعبہ میں ایک کنوئیں میں تھا۔ یہ مسروقہ مال دویل بنی ملیح بن عمرو خزاعی کے ہاں مل گیا قریش نے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ ایک رومی تاجر کا جہاز جدہ کے ساحل کے قریب تباہ ہو گیا تھا۔ قریش نے اس کی لکڑی خرید کر چھت کی تیاری کا کام شروع

1۔ البخاری 179/2 2۔ مسلم: ص969 3۔ البخاری 180/2 4۔ مسلم: 968 5۔ مسلم: ص969

کیا۔ مکہ میں ایک قبطی بڑھئی تھا۔ اس کی خدمات مستعار لی گئیں۔ کعبے کا وہ کنواں جس میں یومیہ نذرانے ڈالے جاتے تھے روزانہ ایک سانپ اس سے نکلتا اور کعبہ کی دیوار پر بیٹھ جاتا۔ وہ اس سے ڈرتے تھے۔ جو شخص اس کے قریب ہونے کی کوشش بھی کرتا تو وہ اوپر اٹھتا اور پھنکارتا ہوا منہ کھول دیتا۔ کوئی شخص اس کے قریب ہونے کی جرأت نہ کرتا۔ روزانہ کی طرح ایک دن وہ اژدھا باہر نکلا تو اللہ نے ایک بہت بڑا پرندہ بھیجا جو اسے اچک کر لے گیا۔ قریش کہنے لگے شاید اللہ تعالیٰ ہمارے ارادے سے راضی ہے۔ ہمارے پاس مستری بھی ہے لکڑی بھی۔ اور اللہ نے سانپ کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ جب تیاری مکمل ہوگئی تو ابن وھب بن عمرو اٹھا اور کعبے کا ایک پتھر اٹھایا لیکن یہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اپنی جگہ جا لگا۔ اس نے قریش سے کہا تعمیر کعبہ میں صرف حلال کی کمائی شامل کرنا۔ اس میں رنڈی کا روپیہ، سود کی اور ظلم سے حاصل کیا گیا مال شامل نہ کرنا۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ لوگ یہ کلام ولید بن مغیرہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ پھر قریش نے کعبہ کو تقسیم کر لیا۔ دروازہ بنو زہرہ اور عبد مناف کو ملا، رکن اسود اور یمانی کے مابین بنو مخزوم اور ان کی طرف منسوب قریشی قبائل کو۔ کعبہ کی پچھلی طرف بنو جمح اور سہم کو۔ حطیم کا حصہ بنو عبد الدار، بنو اسد اور بنو عدی بن کعب کو ملا۔ اب کسی کی ہمت گرانے کو نہیں پڑتی تھی۔ سب ڈرتے تھے۔ آخر کار ولید بن مغیرہ نے کہا میں شروع کرتا ہوں۔ وہ کدال لے کر اوپر چڑھ گیا اور کہہ رہا تھا اے اللہ ہمارا خوف دور کر، ہم صرف بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پھر دونوں رکنوں کی طرف سے کچھ حصہ گرا دیا۔ لوگوں نے اس رات انتظار کیا۔ وہ کہنے لگے ٹھہرو (اگر اس شخص کو کچھ ہوگیا تو) ورنہ ہم اسے نہیں گرائیں گے۔ اور اس حصے کی مرمت کر دیں گے۔ اور اگر یہ سلامت رہا تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ ہم سے راضی ہے۔ اگلی صبح ولید آ کر اپنے کام میں جت گیا۔ سب لوگ اس کے ساتھ شریک ہوگئے۔ حتیٰ کہ جب بناء ابراہیمی کی بنیادوں تک پہنچے تو سبز رنگ کے پتھر دیکھے جو ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ایک قریشی نے دونوں پتھروں کو جدا کرنے کے لئے آہنی سبل ڈالا تو پتھر کے ہلنے کے ساتھ ہی سارا کعبہ لرزنے لگا۔ چنانچہ وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ پھر قریش نے تعمیر نو کے لئے پتھر جمع کیے۔ ہر قبیلہ اپنا سٹاک علیحدہ جمع کرتا رہا۔ پھر اسے تعمیر کیا یہاں تک کہ رکن (حجر اسود) رکھنے تک پہنچ گئے۔ اب ان میں تنازعہ شروع ہوگیا۔ ہر قبیلہ یہ خواہش رکھتا تھا کہ یہ سعادت صرف اسی کے حصے میں آئے۔ مسئلے نے طول اختیار کیا تا آنکہ لڑائی تک نوبت آ پہنچی۔ بنو عبد الدار نے خون میں ہاتھ ڈال کر عہد کیا کہ اس مقصد کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ بنو عدی بن کعب انکے حلیف تھے۔ انہوں نے بھی اسی خون میں ہاتھ ڈال کر عہد کیا۔ اور ''خون چاٹنے والے'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اسی طرح چار یا پانچ راتیں گذر گئیں۔ پھر وہ مسجد میں مشاورت اور تصفیہ کے لئے اکٹھے ہوئے۔ بعض اہل روایت کا خیال ہے کہ ابو امیہ بن مغیرہ مخزومی جو اس وقت قریش کا سب سے معمر شخص تھا کہنے لگا۔ اے قریش! مسجد کے اس دروازے سے سب سے پہلے داخل ہونے والے شخص کو ثالث مان لو وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ انہوں نے اسی طرح کیا۔ سب سے پہلے رسول ﷺ اس دروازے سے اندر تشریف لائے۔ آپ کو دیکھ کر سب پکار اٹھے۔ یہ امین ہیں ہم ان سے راضی ہیں یہ محمد ہیں۔ جب آپ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے آپ کو اس بات سے آگاہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ۔ آپ ﷺ نے حجر اسود کو اٹھایا اور اس پر رکھ دیا۔ پھر فرمایا ہر قبیلہ کپڑے کا ایک سرا پکڑ لے۔ پھر سب یکبارگی اٹھائیں۔ جب اسے رکھنے کی جگہ پہنچے تو آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اسے اپنی جگہ رکھ دیا۔ اور تعمیر شروع ہوگئی۔ نزول وحی سے قبل ہی قریش آپ ﷺ کو امین کے نام سے پکارتے تھے۔ جب وہ تعمیر سے فارغ ہوئے اور اسے اپنی منشا کے مطابق تعمیر کیا تو سانپ جس نے قریش کو دہشت زدہ کر دیا تھا، کے واقعہ کو زبیر بن عبد المطلب نے اپنے قصیدے میں خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ اعلی ﷺ بن اسحٰق کا قول ہے کہ کعبہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اٹھارہ ہاتھ تھا۔ اسے قباطی (مصر کا بنا ہوا کپڑا) کا غلاف پہنایا جاتا تھا

پھر دھاری دار چادر کا۔ سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے دیبا کا غلاف پہنایا(1)۔ (میں کہتا ہوں) قریش کی یہ تعمیر قائم رہی حتی کہ ساٹھ سال کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر کی امارت کے ابتدائی دور اور یزید بن معاویہ کے آخری دور میں جبکہ اس نے ابن زبیر کا محاصرہ کر لیا تھا، کعبہ شریف جل گیا۔ چنانچہ ابن زبیر نے اسے گرا کر از سر نو بنائے ابراہیمی پر تعمیر کیا۔ حطیم کو اس میں شامل کر دیا۔ زمین سے متصل مشرق دمغرب میں اس کے دو دروازے رکھے۔ جس طرح کہ انہوں نے اپنی خالہ ام المؤمنین عائشہؓ سے حدیث سنی تھی۔ آپ کے عہد میں یہ تعمیر اسی طرح رہی تا آنکہ حجاج نے آپ کو شہید کر دیا اور عبدالملک بن مروان کے حکم سے قدیم طرز پر دوبارہ تعمیر کیا۔ جس طرح کہ مسلم بن حجاج نے اپنی صحیح میں حضرت عطاء سے روایت کیا ہے کہ یزید بن معاویہ کے زمانہ میں جب اہل شام نے حملہ کیا تو کعبہ شریف جل گیا ابن زبیر نے اسے اسی طرح رہنے دیا۔ یہاں تک کہ جب حج کا وقت آیا تو آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ اے لوگو! کعبہ کے بارے میں مجھے مشورہ دو۔ اسے گرا کر از سر نو تعمیر کروں یا اس کی مرمت کر دوں۔ حضرت ابن عباس نے رائے دی کہ اس کی مرمت کر دیں اور بقایا گھر کو اسی طرح رہنے دیں جن پر لوگ ایمان رکھتے ہیں۔ اور جن پر نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے۔ ابن زبیر نے کہا اگر تم میں سے کسی کا گھر جل جائے تو وہ اسے نئے سرے سے بنائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ تو اللہ رب العزت کے گھر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تین دن استخارہ کرنے کے بعد فیصلہ کروں گا۔ تین دن کے بعد آپ نے اسے گرانے کا حکم دیا۔ لوگ اس خدشہ سے اس کے قریب نہیں جاتے تھے کہ سب سے پہلے اس پر چڑھنے والے پر بلائے آسمانی نہ ٹوٹ پڑے آخر کار ایک آدمی چڑھا اور ایک پتھر گرا دیا۔ اسے جب کوئی گزند نہ پہنچا تو لوگ آگے بڑھے اور اسے اکھاڑ کر زمین کے برابر کر دیا۔ ابن زبیر نے چاروں طرف ستون بنا کر ان پر کپڑا تان دیا۔ تا آنکہ اس کی عمارت بلند ہوگئی۔ اس وقت ابن زبیر نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا اگر لوگوں کا عہد کفر سے قریب نہ ہوتا اور میرے پاس اس کی تعمیر کے لئے اخراجات نہیں ورنہ میں حطیم سے پانچ ہاتھ شامل کر دیتا اور اس کا ایک دروازہ بناتا لوگ اس سے اندر آتے اور دوسرا بناتا جس سے لوگ باہر جاتے(2)۔ ابن زبیر نے فرمایا: میرے پاس مصارف بھی موجود ہیں اور مجھے لوگوں کا بھی خوف نہیں لہٰذا انہوں نے اسی طرح تعمیر فرمایا۔ کعبے کا طول اٹھارہ ہاتھ تھا جب اس میں اضافہ کیا تو یہ چھوٹا ہو گیا تو اس کے طول کو دس ہاتھ اور بڑھایا گیا۔ اور دو دروازے رکھے ایک نکلنے کے لئے اور دوسرا اندر جانے کے لئے۔ جب ابن زبیر شہید ہو گئے تو حجاج نے عبدالملک بن مروان کو لکھا اور مشورہ لیا۔ یہ بھی وضاحت کی کہ ابن زبیر نے اس بنیاد پر تعمیر کیا ہے جسے اہل مکہ میں سے عادل لوگوں نے دیکھا ہے۔ عبدالملک نے جواباً لکھا ہم ابن زبیر کے غیر صحیح کاموں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ انہوں نے طول میں جو اضافہ کیا ہے اسے باقی رہنے دو اور حطیم کی طرف سے اضافے کو اپنی اصلی حالت پر کر دو اور دوسرا دروازہ بند کر دو۔ چنانچہ حجاج نے اسے گرا کر پھر تعمیر کیا۔ (نسائی نے اپنی سنن میں یہی حدیث بروایت ابن زبیر حضرت سیدہ عائشہ سے مرفوعاً ذکر کی ہے لیکن اس واقعے کو ذکر نہیں فرمایا)۔ سنت تو یہی بات تھی کہ ابن زبیر کی بنا کو باقی رکھا جاتا کیونکہ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے پسند فرمایا تھا لیکن اس خدشہ سے کہ وہ لوگ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں اس کا انکار نہ کر دیں۔ لیکن عبدالملک بن مروان کو اس سنت کا علم نہیں تھا۔ لہٰذا جب اسے پتہ چلا کہ سیدہ عائشہؓ نے حضور ﷺ سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے تو اس نے (از راہ افسوس) کہا ہماری یہ آرزو ہے کہ ہم اسے اسی طرح باقی رہنے دیتے۔ جیسے مسلم نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن حمید نے فرمایا: حارث بن عبید اللہ عبدالملک کے پاس گئے جبکہ وہ سریر آرائے خلافت تھا۔ عبدالملک نے کہا میرا خیال ہے کہ ابو حبیب (ابن زبیر) نے یہ حدیث سیدہ عائشہ سے نہیں سنی ہوگی۔ حارث نے کہا میں نے بھی اس

1۔ سیرۃ ابن ہشام 1/192-199 2۔ البخاری 2/180

روایت کو سنا ہے۔ عبدالملک نے کہا تم نے حضرت سیدہ کو کیا ارشاد فرماتے سنا۔ تو انہوں نے یہ پوری روایت سنا دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیری قوم نے کعبہ کو مختصر کر دیا اگر تیری قوم کا زمانہ شرک سے قریب تر نہ ہوتا تو میں اس کی کو پورا کر دیتا۔ اگر میرے بعد تیری قوم اسے تعمیر کرنا چاہے تو آ میں تمہیں بتا دوں جو انہوں نے ترک کیا تھا پھر آپ ﷺ نے انہیں تقریباً سات ہاتھ دکھائے(1)۔ یہ عبداللہ بن عبید بن عمیر کی روایت ہے۔ ولید بن عطاء کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں۔" میں زمین کے برابر مشرق و مغرب میں اس کے دو دروازے بناتا۔ تمہیں پتہ ہے تیری قوم نے کعبے کا دروازہ بلند کیوں رکھا"۔ سیدہ عائشہ کا قول ہے میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا عظمت و توقیر کی خاطر تاکہ جسے وہ چاہیں وہی اندر جا سکے۔ آدمی جب اندر جانا چاہتا تو اسے بلاتے حتیٰ کہ وہ اوپر چڑھتا اور اگر کوئی اور داخل ہوتا تو اسے اوپر سے دھکا دے دیتے۔ عبدالملک نے حارث سے پوچھا تم نے انہیں یہ ارشاد فرماتے سنا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہاں عبدالملک یہ سن کر کچھ دیر اپنی چھڑی سے کھر چتا رہا پھر کہا۔ میری خواہش ہے کہ میں کعبہ کو ابن زبیر کی بنا پر چھوڑ دیتا اور جو گناہ انہوں نے اٹھایا تھا اسکا بوجھ انہی پر رہتا۔ مسلم نے مختلف سندوں سے روایت کیا ہے کہ عبدالملک بن مروان کعبے کا طواف کر رہا تھا کہ اس نے کہا برا ہوا بن زبیر کا وہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ پر جھوٹ باندھتے تھے۔ اور پھر وہی حدیث بیان کی جس کا ذکر اوپر گزرا(2) یہ سن کر حارث بن عبداللہ نے کہا امیر المؤمنین اس طرح نہ کہو میں نے بھی سیدہ ام المؤمنین عائشہ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے۔ عبدالملک کہنے لگا اگر اس بات کا مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں ابن زبیر کی تعمیر کو چھوڑ دیتا۔ یہ حدیث اگرچہ مقطوع ہے۔ لیکن یہ متعدد صحیح سندوں سے بھی مروی۔ یہ سب ابن زبیر کے موقف کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ اگر وہ اسے باقی رہنے دیتا تو بہتر تھا لیکن اب عبدالملک کی اس ترمیم کے بعد بعض علماء نے اس بات کو مکروہ جانا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی کی جائے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین ہارون الرشید یا اس کے والد مہدی کے بارے میں ذکر کیا جاتا ہے کہ اس نے امام مالک سے کعبہ کو گرانے کے بارے میں پوچھا تاکہ پھر ابن زبیر کی تعمیر کے مطابق بنا دیا جائے۔ تو امام مالک نے جواب دیا امیر المؤمنین کعبے کو بادشاہوں کا کھلونا نہ بنائیں کہ جو آئے اس کو اپنی مرضی سے گراتا رہے۔ چنانچہ ہارون اپنے ارادے سے باز رہا۔ قاضی عیاض اور امام نووی نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ابھی تک وہی تعمیر چلی آتی ہے تا آنکہ آخری زمانہ میں دو چھوٹی پنڈلیوں والا حبشی کعبہ کو برباد کرے گا(3)۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں ہے حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کعبہ کو حبشہ کا دو پنڈلیوں والا شخص تباہ کرے گا۔ (متفق علیہ)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا گویا میں اسے دیکھ رہا ہوں کالا، دونوں پاؤں میں معمول سے زیادہ فاصلے والا کعبے کا ایک ایک پتھر اکھاڑ رہا ہے (بخاری)۔ امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا: کعبہ کو حبشہ کا چھوٹی پنڈلیوں والا شخص ویران کرے گا۔ اس کے زیورات غصب کر لے گا اور اس کا غلاف اتار لے گا۔ گویا میں اسے دیکھ رہا ہوں گنجا، ٹیڑھے پاؤں والا اس پر اپنا پھاؤڑا اور کدال چلا رہا ہے(4)۔ یہ واقعہ یاجوج ماجوج کے خروج کے بعد پیش آئے گا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یاجوج ماجوج کے خروج کے بعد بیت اللہ کا حج اور عمرہ کیا جائے گا(5)۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾

"اے ہمارے رب! بنا دے ہم کو فرمانبردار اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو اور

1۔ مسلم: ص 971 2۔ مسلم: ص 969 3۔ البخاری 183/2 4۔ البخاری 183/2 5۔ مسند امام احمد 220/2

بتادے ہمیں ہماری عبادت کے طریقے اور توجہ فرما ہم پر (اپنی رحمت سے) بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

ابن جریر کا قول ہے کہ ان کی مراد یہ تھی کہ ہمیں اپنے حکم کو بجالانے والا، اطاعت گزار بنالے۔ ہم تیری اطاعت کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہی عبادت میں۔ ابن ابی حاتم نے مسلمین سے مراد اخلاص لیا ہے یعنی ہمیں مخلص بنالے۔ اور سلام بن ابی مطیع کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ مسلمان تو تھے ہی لیکن ثابت قدمی کا سوال کیا۔ عکرمہ کا قول ہے کہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بشارت دی کہ تمہاری دعا قبول ہے۔ سدی کا قول ہے کہ ذریت سے مراد صرف عرب ہیں۔ ابن جریر کا قول ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اہل عرب اور دیگر سب کو شامل ہے۔ کیونکہ بنواسرائیل بھی ذریت ابراہیمی سے ہی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (اعراف: 159) ''ترجمہ: اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے (میں کہتا ہوں) ابن جریر کے قول سے سدی کے موقف کی نفی نہیں ہوتی اہل عرب کی تخصیص سے دیگر کی نفی نہیں ہوتی۔ سیاق کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد عرب ہی ہیں۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ...... اور اس آیت کا مصداق حضور ﷺ ہیں کیونکہ آپ ﷺ ہی ان کے مابین مبعوث ہوئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (جمعہ: 2) '' وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے''۔ لیکن اس کے باوجود سرخ وسیاہ کی طرف آپ ﷺ کی رسالت کی نفی نہیں ہوتی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف: 158) '' ترجمہ: آپ فرمایئے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف''۔ اسی طرح دیگر قطعی دلائل۔ یہ دعا حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن متقی بندوں کی خبر دی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا...... لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (فرقان: 74)۔ '' اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا ہمیں پرہیز گاروں کے لئے پیشوا''۔ اتنی مقدار شرعاً پسندیدہ اور مرغوب ہے۔ عبادت الٰہی کی محبت کا اتمام یہ ہے کہ بندہ یہ آرزو رکھتا ہو کہ اس کی صلب میں سے ایسے لوگ ہوں جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں۔ اسی لیے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیم میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں تو آپ نے فرمایا میری اولاد کو بھی فرمایا مرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ اس جگہ دعا کے الفاظ یہ ہیں۔ وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (ابراہیم: 35) '' ترجمہ: اور بچالے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی''۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب ابن آدم کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا اعمالنامہ منقطع ہوجاتا ہے ماسوائے تین چیزوں کے صدقہ جاریہ، علم نافع یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی ہے(1) (مسلم)۔ قولہ (وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا) ہمیں سکھا۔ مجاہد نے اس کا معنی مذابح کیا ہے۔ عطاء اور قتادہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ سعید بن منصور نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تو جبریل آپ کو لے کر بیت اللہ کے پاس آئے اور فرمایا بنیادیں اٹھاؤ۔ جب آپ نے بنیادیں اٹھائیں اور تعمیر مکمل ہوگئی۔ تو پھر آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو صفا پر لائے اور فرمایا یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ پھر آپ کو مروہ پر لائے اور فرمایا یہ بھی شعائر اللہ میں سے ہے۔ پھر آپ کو لے کر منی کی طرف چلے آئے۔ جب عقبہ کے پاس پہنچے تو شیطان ایک درخت کے پاس کھڑا تھا۔ فرمایا تکبیر کہہ کر کنکری مارو آپ نے ایسا ہی کیا۔ ابلیس یہاں سے بھاگ کر جمرہ وسطی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ جب حضرت جبریل اور ابراہیم وہاں سے گزرے تو فرمایا اسے تکبیر کہہ کر

1۔ مسلم، کتاب الوصیۃ: 1255

کنکری مارو آپ نے تکبیر کہہ کر کنکر مارے تو خبیث ابلیس چلا گیا۔ اس خبیث کا ارادہ تھا کہ حج کے امور میں دخل اندازی کرے لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ پھر جبریل حضرت ابراہیم کا ہاتھ پکڑ کر آپ کر مشعر حرام کے پاس لے کر آئے۔ اور فرمایا یہ مشعر حرام (مزدلفہ) ہے۔ پھر آپ کو عرفات میں لائے اور فرمایا جو کچھ میں نے آپ کو دکھایا کیا آپ اسے سمجھ گئے ہیں۔ (تین مرتبہ ایسے ہی کہا) آپ نے فرمایا ہاں۔ ابو مجلز اور قتادہ سے اسی طرح مروی ہے۔ ابوداؤد طیالسی نے اپنی سند سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو مناسک حج سمجھائے گئے تو شیطان سعی کے مقام پر آپ کو ملا۔ تو آپ اس سے آگے بڑھ گئے پھر جبریل آپ کو لے کر منی آئے اور فرمایا یہ لوگوں کے اونٹ بٹھانے کی جگہ ہے۔ جب جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچے تو شیطان نے تعرض کیا آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں تو وہ چلا گیا۔ پھر جمرۂ وسطی کے پاس آئے تو شیطان نے دوبارہ حملہ کیا۔ آپنے اسے سات کنکریاں ماریں حتی کہ وہ چلا گیا۔ پھر آخری جمرہ کے پاس آیا تو آپنے پھر اسے سات کنکریاں ماریں پھر مزدلفہ لائے اور فرمایا یہ بھی مشعر (عبادت) ہے۔ پھر جبریل آپ کو لے کر عرفات آئے اور فرمایا یہ عرفہ ہے۔ پھر فرمایا کیا آپ نے پہچان لیا۔

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۲۹﴾

''اے ہمارے رب! بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کر دے انہیں بے شک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے''۔

حضرت ابراہم علیہ السلام کی دعا کو مکمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ خبر دے رہے ہیں کہ آپ نے بارگاہ الٰہی میں التجا کی کہ اللہ تعالیٰ ان میں رسول مبعوث فرمائے جو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہو۔ یہ دعائے مستجاب تقدیر باری تعالیٰ سے موافق تھی جس نے پہلے ہی حضور کریم محمد ﷺ کو ان امیوں اور دیگر تمام جن وانس کے لئے بطور رسول متعین فرما رکھا تھا۔ جیسا کہ امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت عرباض بن ساریہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' میں اس وقت بھی اللہ کے ہاں خاتم النبیین تھا جب حضرت آدم کا پتلہ زمین پر پڑا ہوا تھا'' میں تمہیں اس کی ابتدا کے بارے میں بتاؤں، میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں، حضرت عیسیٰ نے میرے بارے میں بشارت دی، اور میری ماں کا خواب جو انہوں نے دیکھا اور انبیاء کی مائیں اسی طرح دیکھا کرتی ہیں (1)۔ ابن وہب اور لیث نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور عبداللہ بن صالح نے بھی مکاتبۃً یہی روایت کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور سند کے ساتھ امام احمد نے ابوامامہ سے روایت کیا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کی ابتدا کیا ہے۔ فرمایا میرے باپ ابراہیم کی دعا، حضرت عیسیٰ کی میرے بارے بشارت، اور میری ماں نے دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کی محلات روشن ہو گئے (2)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم نے ہی لوگوں میں آپ کا تذکرہ فرمایا اور آپ کو مشہور فرمایا۔ پھر ہر طرف آپ کا چرچا رہا حتی کہ نسب کے اعتبار سے بنو اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسی بن مریم علیہ السلام نے تو صراحۃً آپ کا اسم گرامی بھی ذکر فرما دیا۔ ایک دفعہ آپ بنو اسرائیل کو خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو فرمایا: اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ...... بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (الصف:6)'' ترجمہ: میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی اور مژدہ دینے والا ہوں ایک رسول کا جو تشریف لائے گا

1۔ مسند امام احمد 127/4　　2۔ مسند امام احمد 262/5

میرے بعد اس کا نام (نامی) احمد ہوگا"۔ اسی لیے اس حدیث مبارکہ میں "فرمایا میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا اور حضرت عیسیٰ بن مریم کی بشارت ہوں"۔ جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ آپ کی والدہ سے ایک نور خارج ہوا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے حمل کے بعد یہ نور دیکھا۔ اور اپنی قوم کو بتایا اس طرح یہ بات پھیل گئی۔ نور کے ظہور کے ساتھ شام کے ذکر کی تخصیص میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کا دین بلاد شام تک پھیل جائے گا۔ اسی لیے آخر زمانہ میں شام اسلام اور مسلمانوں کا قلعہ ہوگا۔ یہیں حضرت عیسیٰ بن مریم دمشق کے سفید شرقی مینار پر اتریں گے۔ اسی لیے صحیحین کی روایت میں ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہے گا۔ انہیں رسوا کرنے یا انکی مخالفت کرنے والے اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے حتیٰ کہ اللہ کا امر آجائے گا اور وہ اسی حال میں ہوں گے (1)۔ صحیح بخاری میں صرف یہ اضافہ ہے کہ وہ شام میں ہوں گے۔ ابو جعفر رازی نے بروایت ربیع بن انس، ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد امت محمد ﷺ ہے۔ آپ کو کہا گیا کہ آپکی دعا قبول ہے اور وہ پیغمبر آخری زمانہ میں ہوں گے۔ سدی اور قتادہ نے بھی یہی کہا ہے۔ قولہ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد قرآن کریم اور حکمت سے مراد سنت مبارکہ حسن، قتادہ، مقاتل بن حیان اور ابو مالک وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد دین کی فہم ہے اور اس میں کوئی منافاۃ نہیں۔ تزکیہ سے مراد ابن عباس کے نزدیک اللہ کی اطاعت اور اخلاص ہے۔ محمد بن اسحٰق اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انہیں خیر سکھلائے تو اس پر وہ عمل پیرا ہوں۔ اور اللہ کی رضا کے بارے میں بتلائے تاکہ وہ اس کی اطاعت کریں۔ تاکہ وہ بکثرت اطاعت کریں معصیت سے گریزاں رہیں۔ قولہ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ عزیز (زبردست) جسے کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ حکیم (حکمت والا) یعنی اپنے افعال و اقوال میں متعدد حکمتوں والا ہے۔ اپنے علم، حکمت اور عدل کے ساتھ ہر چیز کو اس کے محل پر رکھتا ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ۭ

"اور کون روگردانی کرسکتا ہے دین ابراہیم (علیہ السلام) سے بجز اس کے جس نے احمق بنا دیا ہو اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے چن لیا ابراہیم (علیہ السلام) کو دنیا میں اور بلاشبہ وہ قیامت کے دن نیکوکاروں میں ہوں گے۔ اور یاد کرو جب فرمایا اسکو اسکے رب نے (اے ابراہیم علیہ السلام!) گردن جھکا دو۔ عرض کی میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے۔ اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب (علیہ السلام) نے اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لیے یہی دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو"۔

جو انہوں نے شرک اور امام الحنفاء ابراہیم خلیل اللہ کی ملت کی مخالفت کی اللہ تعالیٰ اس آیت میں کفار کا رد فرما رہے ہیں۔ آپ نے توحید باری تعالیٰ کو ممتاز کیا۔ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ پکارا، لمحہ بھر بھی اس کے ساتھ شرک نہ کیا، اور ما سوا اللہ ہر معبود سے بیزاری کا اظہار کیا اور اس مسئلہ میں اپنی ساری قوم کی مخالفت کی بلکہ اپنے باپ (چچا) سے بھی برأت کا اظہار کیا۔ اور فرمایا: يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا

1۔ مسلم، کتاب الایمان: 247

تُشْرِكُوْنَ...... مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام: 79-78) ''ترجمہ: اے میری قوم! میں بیزار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو بے شک میں نے پھیر لیا ہے اپنا رخ اس ذات کی طرف جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمینوں کو یکسو ہو کر اور نہیں ہوں میں مشرکوں میں سے''۔ اور فرمایا ''وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ...... سَيَهْدِيْنِ'' (زخرف: 27-26) ''ترجمہ: اور (یاد کیجئے) جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہ میں بیزار ہوں ان سے جن کی تم عبادت کرتے ہو بجز اس کے جس نے مجھے پیدا فرمایا بے شک وہی میری رہنمائی کرے گا''۔ اور فرمایا: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ...... اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ: 114) ''ترجمہ: اور نہ تھی استغفار ابراہیم کی اپنے باپ کے لئے مگر ایک وعدہ (کو پورا کرنے) کی وجہ سے جو انہوں نے اس سے کیا تھا اور جب ظاہر ہو گئی آپ پر یہ بات کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو آپ بیزار ہو گئے اس سے بے شک ابراہیم بڑے ہی نرم دل (اور) بردبار تھے''۔ اور فرمایا: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا...... فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (نحل: 122-120) ''ترجمہ: بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے وہ (ہر لمحہ) شکر گزار تھے''۔ اللہ تعالیٰ کی (پیہم) نعمتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا۔ اور انہیں ہدایت فرمائی سیدھے راستے کی طرف اور ہمیں نے مرحمت فرمائی انہیں دنیا میں بھی (ہر طرح کی) بھلائی اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے''۔ اسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں۔ سَفِهَ نَفْسَهٗ: سوء تدبیر کی وجہ سے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ حق کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کی۔ اور شباب سے لے کر خلیل اللہ کے مقام پر فائز ہونے تک دنیا کے لئے باعث رشد و ہدایت شخصیت کے راستے کی مخالفت کی۔ اور وہ تو آخرت میں بھی سعادت مند صالحین میں سے ہوں گے۔ جس نے ایسی برگزیدہ ہستی کے مسلک اور ملت کی خلاف ورزی کی، گمراہی اور ضلال پر ڈٹا رہا اس سے بڑا احمق اور کون ہو سکتا ہے؟۔ یا اس سے بڑا ظلم اور کون سا ہو گا۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان: 13) ''ترجمہ: یقیناً شرک ظلم عظیم ہے''۔ ابو العالیہ اور قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے اللہ کی راہ چھوڑ کر ایک نئی ڈگر اختیار کی۔ اور ملت ابراہیمی (جو کہ دین فطرت ہے) کو قبول نہ کیا۔ اس قول کی تائید اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے۔ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا...... وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران: 67) ''ترجمہ: نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔ بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا۔) قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اخلاص اطاعت و انقیاد اور اس کے امر کے سامنے گردن رکھ دینے کا حکم دیا۔ اور آپ نے اس وعدہ کو پورا کر دکھایا۔ قولہ تعالیٰ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ ''اس ملت کی وصیت فرمائی اور یہ اللہ کے سامنے جھک جانا اور اسلام پر ثابت قدم رہنا ہے''۔ یا پھر ھا ضمیر کا مرجع کلمہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے ''یعنی اسلام قبول کرنا'' خود بھی تا حین وفات اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہے اور اپنی اولاد کو بھی اسی دین پر ثابت قدم رہنے کی وصیت فرمائی۔ جیسے ایک اور جگہ آتا ہے۔ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ (الزخرف: 28) ''ترجمہ: اور آپ نے بنا دیا کلمہ توحید کو باقی رہنے والی بات اپنی اولاد میں''۔ بعض علماء نے (یعقوب) کا عطف بَنِيْهِ پر کرتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے۔ اور حضرت یعقوب کو بھی وصیت میں شامل کیا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں اور پوتے یعقوب بن اسحٰق کو یہ وصیت کر رہے ہیں اور وہ بھی اس وقت موجود تھے۔ قشیری کا خیال ہے جس طرح کہ قرطبی نے ان سے نقل کیا ہے کہ حضرت یعقوب حضرت ابراہیم کی وفات کے بعد پیدا ہوئے (1)۔ لیکن یہ دعوی

1۔ تفسیر القرطبی، 136/2

صحیح دلیل کا محتاج ہے۔ بظاہر یہی پتہ چلتا ہے کہ حضرت یعقوب حضرت خلیل اللہ اور سارہ کی حیات مبارکہ میں ہی پیدا ہوئے۔ کیونکہ دونوں کی بشارت دی گئی تھی۔ ارشاد فرمایا: فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ'' ترجمہ: تو ہم نے خوشخبری دی سارہ کو اسحق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی''۔ غیر منصرف ہونے کی وجہ سے یہاں یعقوب پر کسرہ نہیں آیا۔ اگر حضرت یعقوب آپ کی زندگی میں نہیں تھے تو پھر حضرت اسحق علیہ السلام کی اولاد میں سے بالخصوص ان کا تذکرہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ'' ترجمہ: اور ہم نے عطا فرمایا آپ کو اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا پوتا) اور ہم نے رکھ دی ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب''۔ ایک دوسری آیت میں آتا ہے۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ (الانبیاء:72)'' ترجمہ: اور ہم نے عطا فرمایا انہیں اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا) پوتا''۔ یہ آیت بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ آپ ان کی زندگی میں ہی پیدا ہو چکے تھے۔ اسی طرح آپ ہی بیت المقدس کے بانی بھی ہیں جس کا تذکرہ سابقہ کتب میں آیا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوذر سے مروی ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟ فرمایا'' مسجد حرام'' میں نے عرض کی پھر کون سی فرمایا'' بیت المقدس'' میں نے پوچھا ان کے درمیان کتنا عرصہ گزرا؟ فرمایا'' چالیس سال'' الحدیث (1)۔ ابن حبان کا خیال ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کے بانی اول ہیں۔ ان کے اور حضرت ابراہیم کے مابین چالیس سال کا عرصہ ہے۔ لیکن اس بات کو تسلیم نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کے مابین ہزاروں سالوں کا فاصلہ ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کو ویران کیے جانے کے بعد دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ حضرت یعقوب کی اپنے بیٹوں کو وصیت کا تذکرہ آگے آئے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی وصیت کرنے والوں میں شامل تھے۔ قولہ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى ...... اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ حالت حیات میں احسان پر رہو۔ اور اسے لازم پکڑ لو تاکہ اللہ تمہیں اسی پر وفات دے دے۔ کیونکہ آدمی کا وصال اکثر اسی حالت پر ہوتا ہے جس پر وہ اپنی زندگی میں ہو۔ اور جس حالت میں مرا اسی پر اٹھایا جائے گا۔ اللہ رب العزت نے اپنی سنت بیان فرمائی کہ جو شخص خیر کا قصد کرتا ہے اسے توفیق عطا فرمادی جاتی ہے اور معاملہ اس کے لئے آسان بنا دیا جاتا ہے۔ جو نیکی کی نیت کرے اس پر ثابت قدم رہتا ہے۔ صحیح حدیث کے مضمون کے ساتھ اسے کوئی تعارض نہیں، جس میں ہے کہ آدمی اہل جنت کا سا عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے مابین دو ہاتھ یا ایک ہاتھ رہ جاتا ہے تو کتاب (تقدیر) اس سے سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل نار کا سا عمل کرنے لگتا ہے اور جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور (کبھی) کوئی شخص دوزخیوں جیسے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور آگ کے مابین دو ہاتھ یا ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر تقدیر اس سے سبقت لے جاتی ہے تو وہ اہل جنت کی طرح کے اعمال کر کے جنتی بن جاتا ہے (2)۔ اس حدیث کی بعض روایات کے الفاظ یوں ہیں بظاہر وہ جنتی لوگوں کی طرح اچھے اعمال کرتا اور بظاہر دوزخیوں جیسے اعمال کا مرتکب ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ...... فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (اللیل:10) '' ترجمہ: پھر جس نے (راہ خدا میں اپنا) مال دیا اور (اس سے) ڈرتا رہا اور (جس نے) اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم آسان کر دیں گے اس کے لئے آسان راہ اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ بنا رہا اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم آسان کر دیں گے اس کے لئے مشکل راہ''۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ

1۔ البخاری:177/4 2۔ البخاری:45/4

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

''بھلا کیا تم (اس وقت) موجود تھے جب آ پہنچی یعقوب (علیہ السلام) کو موت۔ جب کہ پوچھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہ تم کس کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد۔ انہوں نے عرض کی ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم (علیہ السلام) اور اسمٰعیل (علیہ السلام) اور اسحٰق علیہ السلام کے خدا کی جو خدائے وحدہ لاشریک ہے۔ اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ انہیں فائدہ دیگا جو (نیک عمل) انہوں نے کمایا اور تمہیں نفع دیں گے جو (نیک اعمال) تم نے کمائے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم اس سے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ مشرکین عرب جو کہ اولاد اسماعیل سے تھے اور کفار بنی اسرائیل جو کہ یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے کے خلاف دلیل ذکر فرماتے ہوئے یہ بیان فرما رہے ہیں کہ جب حضرت یعقوب کا وقت وصال قریب آیا تو اپنے بیٹوں کو بلا کر خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی وصیت فرمائی۔ اور فرمایا تم کس کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد تو وہ کہنے لگے۔ ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحٰق علیہم السلام کی۔ آباء میں حضرت اسماعیل کا تذکرہ بطور تغلیب آ گیا ہے حالانکہ آپ تو حضرت یعقوب کے چچا تھے۔ نحاس کا قول ہے کہ عرب چچا کو اب (باپ) کے لفظ سے تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ قرطبی نے یہی نقل کیا ہے (1)۔ جن لوگوں نے دادا (جد) کو باپ قرار دیا ہے اور اس کی موجودگی میں بھائیوں کو میراث سے محروم کر دیا ہے اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر کی بھی یہی رائے تھی۔ بخاری نے حضرت ابن عباس و ابن زبیر کی روایت سے حضرت ابوبکر صدیق سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اس سے آگے بخاری لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کی یہی رائے ہے حسن بصری، طاؤس اور عطاء سے بھی یہی منقول ہے اور امام ابوحنیفہ اور دیگر سلف وخلف کا یہی مذہب ہے مالک، شافعی اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد بھائیوں کو اس کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔ حضرات عمر، عثمان، علی، ابن مسعود، زید بن ثابت اور سلف وخلف میں سے ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ صاحبین (ابو یوسف اور محمد بن حسن) کی رائے بھی اسی طرح ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ قولہ ''اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ'': یعنی ہم اس کی وحدانیت کا اقرار کریں گے اور اس کی الوہیت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ قولہ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ: یعنی مطیع، سر تسلیم خم کیے ہوئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (آل عمران: 83)'' ترجمہ: حالانکہ اس کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا مجبوری سے اور اسی کی طرف وہ (سب) لوٹائے جائیں گے''۔ اسلام تمام انبیاء کا دین تھا۔ اگرچہ ان کی شریعتیں اور اسالیب مختلف تھے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء: 25)'' ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی بھیجی اس کی طرف کہ بلاشبہ نہیں ہے کوئی خدا بجز میرے پس میری عبادت کیا کرو''۔ اس مضمون کی آیات اور احادیث بے شمار ہیں۔ جیسے حضور ﷺ کا ارشاد گرامی'' ہم گروہ انبیاء ایک

1۔ تفسیر القرطبی 138/2

باپ اور مختلف ماؤں کی اولاد (علاتی بہن بھائی) ہیں۔ اور ہمارا دین ایک ہے (یعنی ہمارا ایمان ایک اور شرائع مختلف ہیں) (المعجم الوسیط) (1)۔ قولہ تعالیٰ "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ": یعنی گزر گئی۔ قولہ تعالیٰ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ: یعنی تمہارے اسلاف آباؤ اجداد میں سے انبیاء وصلحاء کی طرف تمہاری نسبت تمہیں اس وقت نہ کوئی فائدہ دے گی جب تک تم نیک اعمال سرانجام نہ دو بالآخر جن کا تمہیں نفع ہوگا۔ ان کے اعمال ان کے ہمراہ اور تمہارے اعمال تمہارے کھاتے میں ہوں گے۔ قولہ تعالیٰ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس کا عمل اسے پیچھے ڈال دے (یعنی وہ جنت میں داخلے سے محروم رہ جائے) تو اس کا نسب اس کے ساتھ جلدی نہیں کرے گا (یعنی بزرگوں کی اولاد ہونا چنداں نفع نہ دے گا)۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

"اور (یہودی) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ (عیسائی) کہتے ہیں عیسائی بن جاؤ (تب) ہدایت پالو گے۔ آپ فرمایئے میرا دین تو دین ابراہیم (علیہ السلام) ہے جو باطل سے منہ موڑنے والا حق پسند تھا اور وہ نہیں تھا شرک کرنیوالوں سے"۔

محمد بن اسحٰق نے سعید بن جبیر یا عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن صوریا، اعور، یہودی حضور ﷺ سے کہنے لگا کہ راہ ہدایت پر تو ہم ہیں۔ اے محمد! ہماری اتباع کرو تو ہدایت پا جاؤ گے۔ نصاریٰ نے بھی یہی دعویٰ کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ قولہ: قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا: یعنی ہم یہودیت اور نصرانیت جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو نہیں چاہتے بلکہ ہم تو دین ابراہیمی کے پیروکار ہیں جو کہ صراط مستقیم ہے۔ محمد بن کعب قرظی اور عیسیٰ بن جاریہ کا یہی قول ہے۔ خصیف نے مجاہد سے حنیف کا معنی مخلص نقل کیا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس سے اس کا معنی 'حاجی' (حج کرنے والا) روایت کیا ہے۔ حسن، ضحاک، عطیہ اور سدی سے بھی یہی مروی ہے۔ ابو العالیہ کا قول ہے کہ حنیف وہ ہے جو بیت اللہ شریف کی طرف منہ کرکے نماز پڑھے اور استطاعت کی صورت میں اپنے اوپر حج فرض سمجھے۔ مجاہد اور ربیع نے کہا ہے کہ حنیف سے مراد پیروکار ہے۔ ابو قلابہ کا قول ہے کہ حنیف وہ ہے جو اول تا آخر تمام رسولوں پر ایمان رکھتا ہو، قتادہ کا قول ہے کہ حنیفیت کا معنی اللہ تعالیٰ کے وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ ہونے کی گواہی دینا ہے۔ ماؤں بیٹیوں، خالاؤں پھوپھیوں اور دیگر محرمات کی حرمت اور ختنہ کرنا اس میں شامل ہے۔ (2)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

"کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم (علیہ السلام) واسمٰعیل (علیہ السلام) واسحٰق (علیہ السلام) ویعقوب (علیہ السلام) اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو اور جو عنایت کیا گیا دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں کرتے ان میں کسی پر ایمان لانے میں اور ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں"۔

1۔ زاد المسیر 373/2 2۔ ابن ابی حاتم

اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کو ارشاد فرما رہے ہیں جو کچھ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے ان پر اتارا ہے اس پر تفصیلاً ایمان لائیں۔ اور سابقہ انبیاء پر مجمل ایمان لائیں۔ کچھ رسولوں کا ذکر کیا اور بقیہ انبیاء کا ذکر مجمل رکھا۔ اور حکم دیا کہ ان میں سے کسی میں تفریق نہ کریں بلکہ سب پر ایمان لائیں۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا۔ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا...... هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا...... (نساء:151) ''ترجمہ: اور چاہتے ہیں کہ اختیار کرلیں کفر و ایمان کے درمیان کوئی (تیسری) راہ یہی لوگ کافر ہیں حقیقت میں''۔ بخاری نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: کہ اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھتے اور مسلمانوں کے لئے عربی میں اس کا ترجمہ کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا'' اہل کتاب کی تصدیق یا تکذیب نہ کرو۔ اور کہو ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا اس پر بھی'' (1)۔ مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر فجر سے پہلے کی دو سنتوں کی پہلی رکعت میں یہ آیت پڑھا کرتے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا (2)۔ اور دوسری میں ''اٰمَنَّا...... وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ'' ابو العالیہ، ربیع اور قتادہ کا قول ہے اسباط حضرت یعقوب کے فرزند تھے۔ یہ بارہ تھے، ہر ایک نسل سے کثیر اولاد ہوئی اور وہ اسباط کہلائے۔ خلیل بن احمد وغیرہ کا قول ہے بنی اسرائیل میں اسباط اسی طرح ہیں جیسے بنو اسماعیل میں قبائل، زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ اسباط حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے تھے۔ یعنی ان کے بارہ لڑکوں کی اولاد۔ رازی نے بھی الکشاف کے حوالے سے یہ بات نقل کرتے ہوئے اسے صحیح قرار دیا ہے اور مخالفت نہیں کی بخاری کا قول ہے کہ اسباط بنو اسرائیل کے قبائل ہیں۔ اس کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اسباط سے مراد اقوام بنو اسرائیل ہوں۔ اور جو کچھ ان کے انبیاء پر وحی نازل ہوئی۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تھا۔ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ...... وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا...... (مائدہ:20) ''ترجمہ: یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہوا جب بنائے اس نے تم میں سے انبیاء اور بنایا تمہیں حکمران''۔ اور فرمایا: وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا (اعراف:160) ''ترجمہ: اور ہم نے بانٹ دیا بارہ قبیلوں میں جو الگ الگ قومیں ہیں''۔ قرطبی کا قول ہے کہ اسباط یہ سبط کی جمع ہے اس کا معنی ہے تابع۔ وہ ایک جماعت تھے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ اصل میں سَبَطٌ (بالتحریک) سے ہے۔ اس کا معنی ہے درخت یعنی کثرت میں وہ درخت کی طرح ہیں۔ اس کا واحد سبطۃ ہے۔ ابو اسحٰق زجاج کا قول ہے کہ اس کی وضاحت حضرت ابن عباس کے اس قول سے بھی ہوتی ہے۔ جسے محمد بن جعفر انباری نے اپنی سند سے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: سارے انبیاء بنو اسرائیل سے ہی ہوئے ہیں ماسوائے دس کے یعنی نوح، ہود، صالح، شعیب، ابراہیم، لوط، اسحاق، یعقوب، اسماعیل اور حضرت محمد علیہم وعلی نبینا الصلوٰت والتسلیمات۔ قرطبی کا قول ہے کہ سبط یعنی جماعت اور قبیلہ ایک ہی اصل کی طرف راجح ہیں۔ قتادہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو حکم دیا کہ اس کی ذات پر ایمان لائیں۔ اور اس کی کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کریں۔ سلیمان بن حبیب کا قول ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم تورات اور انجیل پر ایمان لائیں لیکن ان کی محتویات پر عمل نہ کریں۔ ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ حضرت معقل بن یسار سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' تورات، زبور، اور انجیل پر ایمان لاؤ۔ اور قرآن کریم تمہارے لیے کافی ہے''۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ

1۔ فتح الباری، کتاب التفسیر 170/8 2۔ مسلم، کتاب الصلوٰۃ المسافرین:502

عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

"تو اگر یہ بھی ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیریں تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ تو کافی ہو جائے گا آپ کو ان کے مقابلے میں اللہ اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ (ہم پر) اللہ کا رنگ (چڑھا ہے) اور کس کا رنگ خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے۔ ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں"۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا: اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے اگر یہ کفار بھی ایمان لائیں یعنی اہل کتاب وغیرہ میں سے۔ بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ: اے مؤمنین جس طرح تم اللہ کی تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے ہو اور ان میں سے کسی پر ایمان لانے میں فرق نہ کریں۔ فَقَدِ اهْتَدَوْا: تو انہوں نے حق کو پا لیا اور وہ رشد وہدایت پر ہو گئے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: اگر وہ حق سے باطل کی طرف منہ پھیریں اس کے بعد کہ ان پر دلیل بھی قائم ہو چکی ہے۔ فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ یعنی اللہ آپ کو ان پر فتح ونصرت عطا فرمائے گا۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے حضرت نافع بن نعیم سے نقل کیا ہے کہ کسی، خلیفہ نے میرے پاس مصحف عثمانی کا ایک نسخہ بھیجا تا کہ اس کی اصلاح کروں۔ زیاد کا قول ہے میں نے اسے کہا لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کا مصحف آپ کی گود میں تھا جس وقت آپ کو شہید کیا گیا اور خون کے قطرات آیت کے اس حصہ پر پڑے۔ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ نافع نے کہا میں نے اپنی آنکھوں سے ان الفاظ پر خون دیکھا ہے وقت گزرنے کے ساتھ اس کا رنگ بھی بدل چکا تھا۔ قولہ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ: ضحاک نے ابن عباس سے اس کا معنیٰ "اللہ کا دین" نقل کیا ہے۔ مجاہد، ابو العالیہ، عکرمہ، ابراہیم، حسن، قتادہ، ضحاک، عبداللہ بن کثیر، عطیہ عوفی، ربیع بن انس، اور سدی سے اسی طرح مروی ہے۔ اس کا نصب بطور تحذیر واغراء کے ہے یعنی اللہ کے دین کو لازم پکڑ لو۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے (فِطْرَتَ اللّٰهِ) اَیِ اِلْزَمُوْا ذٰلِكَ عَلَيْكُمُوْهُ۔ بعض نے اسے ملۃ ابراہیم سے بدل قرار دیا ہے۔ سیبویہ کا قول ہے کہ یہ مصدر مؤکد ہے۔ اور "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" سے منصوب ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد (وَعْدَ اللّٰهِ) ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کی روایت میں بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ بنو اسرائیل نے عرض کی اے اللہ کے نبی! کیا آپ کا رب بھی رنگ کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ سے ڈرو۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی اے موسیٰ! انہوں نے تم سے سوال کیا ہے کہ کیا آپ کا رب رنگ کرتا ہے؟ فرمائیے ہاں میں سرخ، سفید اور سیاہ رنگ کرتا ہوں سارے رنگ میرے ہیں۔ اور اپنے نبی پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ابن مردویہ کی مرفوع روایت میں اسی طرح ہے۔ جبکہ ابن ابی حاتم کی روایت موقوف ہے۔ بشرطیکہ اس کی اسناد صحیح ہو۔ واللہ اعلم۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

"آپ فرمائیے کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک، اور

ہمیں ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال فائدہ پہنچائیں گے ہم تو اسی کی اخلاص سے عبادت کرتے ہیں۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم (علیہ السلام) واسمٰعیل (علیہ السلام) واسحٰق (علیہ السلام) و یعقوب (علیہ السلام) اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی فرمایئے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ وہ ایک امت تھی جو گزر چکی اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے نہ پوچھا جائے گا اس سے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے نبی کریم کو مشرکین کے مجادلے کا رد کرنے کے لئے راہنمائی فرما رہے ہیں۔ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ یعنی تم اللہ کی توحید، اخلاص، اطاعت وانقیاد، اتباع اوامر اور ترک نواہی کے بارے میں ہم سے مناظرہ کرتے ہو۔ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ یعنی ہم تم سے بری ہیں اور جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم ہم سے بری ہو۔ جس طرح ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ کَذَّبُوْکَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَکُمْ عَمَلُکُمْ اَنْتُمْ بَرِیْٓئُوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرما دیجئے میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل۔ تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو''۔ اور فرمایا: فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلّٰہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ''پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر اللہ کے سامنے اور جنہوں نے میری پیروی کی''۔ اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَحَآجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰہِ (انعام:80) ''اور جھگڑنے لگی ان سے ان کی قوم آپ نے کہا کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں''۔ اور فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ...... (بقرہ:258) اور اس آیت کریمہ میں فرمایا: وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ''یعنی ہم تم سے بری ہیں جس طرح تم ہم سے بری ہو''۔ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ۔ ''یعنی عبادت اور توجہ میں''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوی کی نفی فرمائی کہ حضرت ابراہیم اور ان کے بعد جن انبیاء اور اسباط کا ذکر ہے وہ ان کی ملت کے پیروکار تھے۔ یعنی یہودیت اور نصرانیت۔ فرمایا: تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ یعنی بلکہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اور فرمایا وہ یہودی یا نصرانی نہ تھے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا کَانَ اِبْرٰھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (آل عمران:67) ''نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے''۔

قولہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ وہ اپنی کتاب میں پڑھا کرتے تھے کہ دین، اسلام ہے۔ اور بلاشبہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب اور اسباط یہودیت اور نصرانیت سے پاک اور منزہ تھے۔ انہوں نے اللہ کے لئے گواہی دی اور اللہ کے لئے اپنے آپ پر اقرار کیا۔ لیکن اپنے پاس اللہ کی گواہی کو انہوں نے چھپالیا۔ قولہ: وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ دھمکی اور شدید وعید ہے۔ یعنی اس کا علم تمہارے علم کو محیط ہے اور اس پر تمہیں جزا دے گا۔ پھر فرمایا یہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی۔ ان کے اپنے اعمال تھے اور تمہارے اپنے۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ان کی اتباع کے بغیر ان کی طرف منسوب ہونا تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ محض ان کے ساتھ نسبت سے دھوکے میں نہ پڑو۔ بلکہ ان کی طرح اوامر الٰہیہ کو بجالانے والے اور اس کے رسولوں کی اتباع کرنے والے بنو جو بشیر و نذیر بنا کر مبعوث کیے گئے۔ جس نے ایک نبی کا انکار کیا گویا اس نے سارے رسولوں کا انکار کیا اور خصوصاً اس نبی کو جھٹلایا جو سید الانبیاء، خاتم المرسلین اور تمام جن وانس کی طرف مبعوث فرمائے گئے ہیں (صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ وَعَلٰی سَآئِرِ اَنْبِیَآءِ اللّٰہِ اَجْمَعِیْنَ)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

''اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ فرمایئے اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور (ہمارا) رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہو۔ اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول (ﷺ) کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں بے شک یہ (حکم) بہت بھاری ہے مگر ان پر (بھاری نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی۔ اور نہیں اللہ کی یہ شان کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت ہی مہربان (اور) رحم فرمانے والا ہے''۔

کہا گیا ہے کہ سُفَهَآءُ سے مراد یہاں مشرکین عرب ہیں۔ زجاج کا یہ قول ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ اس سے مراد یہودی علماء (احبار) ہیں۔ مجاہد سے یہی منقول ہے۔ سدی کی رائے میں اس کا مطلب منافقین ہے۔ لیکن یہ آیت عام ہے اور اس کا مصداق سب لوگ ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ بخاری کا قول ہے حضرت براء سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ آپ ﷺ کو یہ بات از حد پسند تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ ہو۔ خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے آپ نے سب سے پہلے عصر کی نماز پڑھائی۔ کچھ صحابہ نے بھی آپ کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ ان نمازیوں میں سے ایک شخص نکلا۔ اس کا گذر ایک مسجد پر ہوا وہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے کہا کہ میں اللہ کے نام سے گواہی دیتا ہوں کہ میں نے نبی ﷺ کی معیت میں مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے۔ وہ سب اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔ بیت اللہ شریف کی طرف تبدیلی سے قبل جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کی تھیں اور تحویل قبلہ سے قبل ان کا انتقال ہو گیا تھا ان کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بخاری نے اس کو منفرداً روایت کیا ہے(1)۔ مسلم نے اسے ایک اور سند سے بھی روایت کیا ہے۔ محمد بن اسحٰق کا قول ہے حضرت براء نے ارشاد فرمایا حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمایا کرتے اور بکثرت آسمان کی طرف نگاہ اٹھائے ہوئے اللہ کے امر کا انتظار فرماتے (2)۔ اور اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ .... الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ یہ سن کر بعض مسلمان کہنے لگے ہمیں ان مسلمانوں کا علم ہو جائے جو بیت اللہ کی طرف ہمارا رخ تبدیل ہونے سے قبل ہی وصال فرما گئے تھے۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (بقرہ:143) یہ سن کر بعض بے وقوف لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ لوگ تو اہل کتاب تھے۔ ان کے سابقہ قبلہ سے انہیں کس چیز نے پھیر دیا؟۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ

1۔ مسند احمد: 283/4 2۔ مسلم: المساجد: 15

عَنْ قِبْلَتِهِمُ آخر آیت تک۔ ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ تقریباً سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کعبہ کی طرف منہ کرنا پسند فرماتے تھے۔ تو یہ آیت اتری: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ .... الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ تو آپ نے کعبہ کی طرف رخ فرمالیا۔ یہ سن کر بعض بے وقوف لوگ (یہود) کہنے لگے۔ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَيْهَا۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ سن کر یہود خوش ہو گئے۔ چند ماہ تک رسول اللہ ﷺ اس کی طرف ہی منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے۔ آپ ﷺ کو قبلہ ابراہیمی پسند تھا آپ ہر وقت اللہ سے دعا مانگا کرتے اور نگاہ مبارک آسمان کی طرف اٹھ جاتی۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ اَیْ نَحْوَهٗ (اس کی سمت میں) اس سے یہود کو شبہ ہوا اور وہ کہنے لگے (مَا وَلّٰىهُمْ ......) تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اس باب میں وارد شدہ احادیث بے شمار ہیں۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت المقدس میں صخرہ (چٹان) کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مکہ میں آپ ﷺ دو رکنوں میں نماز ادا فرماتے اس طرح کعبہ آپ کے سامنے ہوتا اور صخرہ بیت المقدس کی سمت آپ کا رخ اقدس ہوتا۔ جب مدینہ ہجرت فرمائی تو دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ رہا اس وقت اللہ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا۔ ابن عباس اور جمہور کا یہی قول ہے۔ اس کے بعد اختلاف ہے کہ اس کا حکم قرآن میں تھا یا کسی اور ذریعے سے۔ اس میں دو اقوال ہیں۔ قرطبی وغیرہ نے اپنی تفسیر میں عکرمہ، ابوالعالیہ اور حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ کا بیت المقدس کی طرف رخ کرنا اپنے اجتہاد سے تھا۔ اس سے مقصود ہجرت مدینہ کے بعد بیت المقدس کی طرف رخ کرنا ہے۔ چند ماہ تک اسی پر عمل رہا۔ آپ ﷺ بکثرت دعا اور تضرع وزاری فرمایا کرتے تھے کہ کعبہ کو قبلہ بنایا جائے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔ آپ ﷺ کی یہ دعا مستجاب ہوئی اور بیت عتیق کی طرف رخ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ چنانچہ رسول ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور اس تبدیلی سے آگاہ فرمایا۔ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے سب سے پہلی عصر کی نماز ادا کی گئی جس طرح کہ صحیحین میں حضرت براء کی روایت کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔ نسائی نے ابوسعید بن معلّٰی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ یہ ظہر کی نماز تھی۔ میں اور میرے ایک ساتھی نے سب سے پہلے کعبہ کی طرف نماز ادا کی۔ بہت سے مفسرین اور دیگر علماء نے ذکر فرمایا ہے۔ کہ تحویل قبلہ کا حکم دوران نماز نازل ہوا۔ سرکار دو عالم ﷺ اس وقت ظہر کی دو رکعتیں ادا فرما چکے تھے۔ نماز کے دوران ہی آپ نے اپنا رخ اقدس قبلہ کی طرف کر لیا۔ یہ مسجد بنی سلمہ تھی جو بعد میں مسجد قبلتین کہلائی۔ نویلہ بنت مسلم کی روایت میں ہے کہ انہیں بعد میں اس وقت خبر ملی جب کہ وہ ظہر کی نماز ادا کر رہے تھے تو مرد عورتوں کی جگہ اور عورتیں مردوں کی جگہ چلی گئیں۔ شیخ ابوعمر بن عبدالبر نمری نے (تمہید میں) اسی طرح ذکر فرمایا ہے(1)۔ اہل قباء کو اگلے دن فجر کی نماز میں پتہ چلا جیسا کہ صحیحین کی روایت میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ قباء میں لوگ فجر کی نماز میں تھے کہ کسی آنے والے نے آکر خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ پر آج رات قرآن کریم نازل ہوا ہے اور آپ کو کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ تم بھی رخ بدل لو ان کے چہرے شام کی طرف تھے۔ چنانچہ وہ اپنی سمت بدل کر کعبہ کی طرف ہو گئے۔ اس واقعہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ ناسخ پر عمل کرنا اس وقت لازم ہوتا ہے جب اس کا علم ہو جائے اگرچہ وہ حکم پہلے ہی نازل ہو چکا ہو۔ کیونکہ ان لوگوں کو عصر، مغرب اور عشاء کے اعادے کا حکم نہیں دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر القرطبی: 148/2

تبدیلی کعبہ کے بعد بعض منافقین، متذبذب قسم کے لوگوں اور کافر یہودیوں کے دلوں میں شک پیدا ہوا اور وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے۔ مَاوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ کہ ان لوگوں کو کیا ہے کبھی ایک طرف رخ کرتے ہیں اور کبھی دوسری سمت میں۔ تو اللہ نے ان کے جواب میں فرمایا: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۭ حکم صرف اور صرف اللہ کا چلتا ہے۔ فرمایا: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ:115) ''سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے''۔ اور فرمایا: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (بقرہ:177)۔ ''نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنا رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر''۔ یعنی مقصود صرف اور صرف اس کے اوامر کو بجالانا ہے۔ جس طرف حکم ہو اسی طرف منہ کرنا چاہیے۔ اگر ایک دن میں متعدد اطراف میں منہ کرنے کا حکم ہو تو ہم تو اس کے بندے اور غلام ہیں۔ ہمیں سرتابی کی مجال کہاں۔ ہم تو اس کے فرمانبردار اور خدام ہیں جس طرف حکم فرمائے گا منہ کرلیں گے۔ اس قادر مطلق کی اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ اور آپ کی امت پر عظیم عنایت ہے کہ انہیں اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف راہنمائی فرمادی۔ اور اسی کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا جو اس وحدہ لاشریک کے نام پر بنا تھا۔ جو روئے زمین پر سب سے زیادہ برکتوں والا ہے کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دست مبارک سے بنا ہے۔ اسی لئے فرمایا: آپ فرمایئے اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی۔ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

امام احمد نے اپنی سند سے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (یعنی اہل کتاب کے بارے میں) کہ وہ ہم سے اتنا حسد کسی چیز پر نہیں کرتے جتنا وہ جمعہ کے دن پر حسد کرتے ہیں ہمیں اللہ نے اس کی توفیق دی اور وہ اس سے بھٹک گئے۔ اور قبلہ پر جس کی طرف اللہ نے ہماری راہنمائی فرمائی اور وہ اسے نہ پاسکے۔ اور امام کے پیچھے ہمارے آمین کہنے پر (1) قولہ تعالیٰ: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا......... عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہے ہیں کہ ہم نے قبلہ ابراہیمی کی طرف تمہارا رخ کیا اور اسے تمہارے لئے پسند کیا تاکہ تمہیں بہترین امت بنائیں۔ تاکہ تم قیامت کے دن تمام امتوں پر گواہ بن جاؤ۔ کیونکہ سب تمہاری فضیلت کے معترف ہیں۔ ''وسط'' کا معنی یہاں بہترین اور عمدہ ہے۔ جیسے کہا جاتا (قُرَيْشٌ اَوْسَطُ الْعَرَبِ نَسَبًا وَدَارًا) قریش نسب اور گھر کے اعتبار سے بہترین ہیں۔ اور کہا جاتا ہے (كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَسَطاً فِيْ قَوْمِهٖ) یعنی نسب کے اعتبار سے اپنی قوم میں افضل ترین تھے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ نماز وسطی (درمیانی نماز) ہی سب سے افضل نماز ہے اور یہ عصر ہے جس طرح صحاح وغیرہ سے ثابت ہے۔ جب اللہ نے اس امت کو امت وسط بنایا تو اسے اکمل ترین شریعت سے نوازا اور صراط مستقیم اور واضح ترین مذہب سے ممتاز فرمایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (حج:78) ''اس نے چن لیا ہے تمہیں (حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لئے) اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی پیروی کرو اپنے باپ ابراہیم کے دین کی اسی نے تمہارا نام مسلم (سراطاعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے تاکہ ہو جائے رسول (کریم) گواہ تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر''۔

امام احمد نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روز قیامت حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کیا تم نے میرا پیام رسالت لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ وہ ارشاد فرمائیں گے۔ ہاں۔ پھر آپ کی قوم کو بلا کر پوچھا جائے گا کیا انہوں (حضرت نوح) نے پیغام الٰہی آپ تک پہنچا دیا تھا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ ہمارے پاس کوئی نہیں

1۔ احمد: 135/6

آیا۔ حضرت نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ آپ کا گواہ کون ہے؟۔ وہ فرمائیں گے محمد (ﷺ) اور آپ کی امت۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ سے یہی مراد ہے۔ وسط کا معنی عدل ہے۔ چنانچہ تمہیں بلایا جائے گا اور اس تبلیغ رسالت پر گواہی لی جائے گی۔ پھر میں تمہاری گواہی پر گواہی دوں گا(1)۔ (بخاری، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اسے متعدد سندوں سے روایت کیا ہے۔) امام احمد نے ہی اپنی مسند میں ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک نبی آئیں گے۔ ان کے ساتھ صرف دو آدمی ہوں گے۔ اور اس سے زیادہ بھی۔ ان کی قوم کو بلایا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کیا انہوں نے پیغام رسالت تم تک پہنچا دیا تھا؟۔ وہ کہیں گے نہیں۔ اسے کہا جائے گا کیا تم نے میرا پیغام پہنچایا تھا؟۔ وہ کہے گا ہاں۔ کہا جائے گا تمہارا کون گواہ ہے۔ وہ کہے گا۔ محمد (ﷺ) اور آپ کی امت۔ چنانچہ محمد (ﷺ) اور آپ کی امت کو بلایا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کیا اس نبی نے میرا پیغام اپنی قوم تک پہنچایا تھا؟۔ وہ کہیں گے ہاں۔ پوچھا جائے گا تمہیں کیسے معلوم ہوا؟۔ وہ کہیں گے ہمارے نبی (ﷺ) نے ہمیں خبر دی تھی کہ تمام مرسلین نے پیغام حق پہنچا دیا تھا۔ یہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب ہے: كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ فرمایا وَّسَطًا کا معنی **عدلاً** ہے۔ لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ الخ۔ تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائے(2)۔ امام احمد نے ہی ایک اور حدیث میں وسطاً کا معنی عدلاً کیا ہے(3)۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں اور میری امت روز قیامت ایک ٹیلے پر ہوں گے اور خلائق کو دیکھ رہے ہوں گے۔ لوگوں میں سے ہر ایک کی خواہش ہوگی کاش وہ ہم سے ہوتا۔ کسی نبی کو بھی اس کی قوم نے نہیں جھٹلایا مگر ہم گواہی دیں گے کہ اس نے اپنے رب عزوجل کا پیغام دیا تھا۔ ابن مردویہ نے اور حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے اور الفاظ ابن مردویہ کے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ کا فرمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنوسلمہ کے ایک جنازہ میں شامل ہوئے۔ میں آپ ﷺ کے ایک طرف تھا کوئی آدمی کہنے لگا۔ اللہ کی قسم! یارسول اللہ یہ اچھا آدمی تھا۔ یہ پاک دامن مسلمان تھا۔ اور اس کی تعریف کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ بات تم کس طرح کہہ رہے ہو؟۔ وہ آدمی کہنے لگا اللہ تعالیٰ بھیدوں کو خوب جانتا ہے۔ لیکن بظاہر اس کی یہی حالت تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے لئے واجب ہوگئی'' پھر آپ ﷺ بنو حارثہ کے ایک آدمی کے جنازے میں تھے میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا یارسول اللہ! یہ آدمی برا تھا، یہ درشت مزاج اور کج خلق تھا۔ اور اس کی برائی بیان کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے کسی سے پوچھا: ''تم یہ بات کیسے کہہ رہے ہو''؟۔ وہ آدمی کہنے لگا اللہ دلوں کا حال بہتر جانتا ہے۔ ہماری معلومات یہی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا واجب ہوگئی''(4)۔ مصعب بن ثابت کا قول ہے کہ محمد بن کعب نے اس وقت کہا رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا پھر آیت تلاوت فرمائی: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ پھر حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن شیخین نے اسے روایت نہیں فرمایا۔ امام احمد نے ابوالاسود سے نقل کیا ہے کہ میں جب مدینہ آیا۔ تو اتفاقاً یہاں بیماری تھی۔ بکثرت اموات وقوع ہو رہی تھیں۔ میں حضرت عمر بن خطاب کے پاس بیٹھ گیا کہ ایک جنازہ آیا۔ اس آدمی کی تعریف و توصیف بیان کی گئی۔ آپ نے فرمایا واجب ہوگئی۔ پھر ایک اور جنازہ آیا۔ اس کی مذمت کی گئی تو حضرت عمر نے فرمایا واجب ہوگئی ابوالاسود نے کہا امیر المؤمنین کیا چیز واجب ہوگئی۔ فرمایا میں نے اسی طرح کہا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ ''اگر کسی مسلمان پر چار شخص بھلائی کی گواہی دیں تو اللہ اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ فرمایا اور ہم نے عرض کی ''اور تین بھی''؟۔ فرمایا اور تین بھی فرمایا اور ہم نے عرض کی دو بھی فرمایا'' ہاں دو بھی'' پھر ہم نے ایک کے بارے میں نہیں پوچھا(5)۔ (بخاری، ترمذی اور نسائی نے داؤد بن فرات سے اسی طرح نقل کیا ہے۔) ابن مردویہ

1۔ البخاری:171/8 2۔ احمد:58/3 3۔ مسند امام احمد:3/3 4۔ المستدرک:268/2 5۔ البخاری، الجنائز:75

نے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا" عنقریب تم اپنے اچھے اور برے لوگوں کو پہچان لو گے"۔ عرض کی یا رسول اللہ! کس طرح فرمایا" اچھی تعریف اور بری تعریف سے تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو"(1)۔ (اسے ابن ماجہ نے ابوبکر بن شیبہ سے اور احمد نے یزید بن ھارون اور عبد الملک بن عمر سے شریح نے نافع عن ابن عمر سے روایت کیا ہے۔) قولہ تعالیٰ: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ...... عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہے ہیں اے محمد! ہم نے پہلے آپ کے لئے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونا شروع کیا۔ پھر ہم نے آپ کو کعبہ کی طرف پھیر دیا تاکہ پتہ چل جائے آپ میں سے متبع اور مطیع کون ہے۔ اور جس طرف آپ منہ کریں اس طرف منہ کرنے والا کون ہے۔ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔ یعنی اپنے دین سے مرتد ہوتے ہوئے۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً ۔ یعنی یہ فعل۔ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف منہ کرنا اگرچہ لوگوں کے دلوں میں بڑی بات ہے لیکن وہ لوگ جنہیں اللہ نے ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے انہیں رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کا ایقان ہے۔ اور جو کچھ آپ لائے ہیں حق ہے انہیں کوئی شک نہیں۔ اللہ جو چاہے کرتا ہے اور جو چاہے حکم فرماتا ہے۔ وہ جس چیز کے بارے میں چاہے بندوں کو مکلّف بنا دے، جو چاہے منسوخ کر دے، حکمت تامہ اور حجت بالغہ اسی کو حاصل ہے۔ بخلاف ان لوگوں کے جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ جب بھی کوئی نئی بات ہوتی ہے وہ تشکیک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایمان والوں کو ایقان اور تصدیق کی دولت سرمدی عطا ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (توبہ:125-124) " ترجمہ: اور جب کبھی نازل ہوتی ہے کوئی سورۃ تو بعض ان میں سے وہ ہیں جو (شرارتاً) کہتے ہیں کہ کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا ہے اس سورۃ نے ایمان۔ تو وہ (سن لیں) ایمان والوں کے ایمان میں اس سورۃ نے اضافہ کر دیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔ اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو بڑھا دی اس سورۃ نے ان میں پلیدی ان کی (سابقہ) پلیدی پر اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے"۔ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... عَلَيْهِمْ عَمًى (حم السجدہ:44) " ترجمہ: آپ فرمائیے! یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے۔ اور جو ایمان نہیں لائے۔ ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے۔ انہیں گویا بلایا جاتا ہے دور کی جگہ سے"۔ اور فرمایا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ...... اِلَّا خَسَارًا (بنی اسرائیل:82) " ترجمہ: اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لیے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لیے مگر خسارہ کو"۔ اسی لیے جو لوگ تصدیق رسالتمآب ﷺ اور آپ کی اتباع پر قائم رہے اور بغیر شک وشبہ کے اللہ کے حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس طرف منہ کیا جدھر اللہ کا حکم تھا، وہ سادات صحابہ کرام تھے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ مہاجرین وانصار میں سے السابقون الاولون وہ لوگ ہیں جنہیں دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔ بخاری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: قبا میں جب لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہا کہ نبی کریم ﷺ پر قرآن نازل ہوا ہے۔ اور اس میں استقبال کعبہ کا حکم ہے تم بھی اسی طرف منہ کرو۔ چنانچہ وہ لوگ کعبہ رخ ہو گئے۔ مسلم نے یہی حدیث ایک اور سند سے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ اور ترمذی نے سفیان ثوری سے، ان کی روایت میں ہے وہ رکوع کی حالت میں تھے اور اسی طرح رکوع کی حالت میں ہی قبلہ رو ہو گئے۔ مسلم نے حضرت انس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ یہ اللہ اور رسول کے بارے ان کی کمال اطاعت اور اللہ کے اوامر کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین) وقولہ تعالیٰ: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۔ یعنی ضائع نہیں فرمائے گا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہوئی تمہاری پہلی نمازیں۔ ان کا ثواب اللہ کے ہاں ضائع نہیں جائے گا۔ صحیح میں ابو اسحٰق سبیعی نے حضرت براء

1۔ الدر المنثور، 145/1

سے روایت کیا ہے۔آپ نے فرمایا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والے کچھ لوگوں کا انتقال ہو گیا تھا۔بعض لوگ کہنے لگے اب ان کا کیا حال ہوگا؟۔تو اللہ نے یہ الفاظ نازل فرمائے ترمذی نے یہی روایت ابن عباس سے نقل فرمائی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ابن اسحٰق نے بروایت سعید بن جبیر یا عکرمہ حضرت ابن عباس سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ پہلے قبلہ کی طرف منہ کرنے، اپنے نبی کی تصدیق کرنے اور دوسرے قبلہ کے حکم کے بارے میں اس کی پیروی کرنے کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرمائے گا یعنی تمہیں ان سب کا اجر ملے گا۔اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے۔حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سیدنا محمد ﷺ اور اور آپ کے ساتھ پھر جانے کو ضائع نہیں فرمائے گا۔وہ تو رؤف اور رحیم ہے۔صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک قیدی عورت کو دیکھا۔اس کا بچہ چھوٹ گیا تھا۔(وہ اس کی تلاش میں سرگرداں تھی)۔چنانچہ جب بھی وہ کوئی بچہ دیکھتی اسے پکڑ کر سینے سے لگا لیتی۔یہ اسی طرح ادھر ادھر چکر لگا رہی تھی۔جب اسے اپنا بچہ مل گیا تو فوراً اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔اور اپنا پستان اس کے منہ میں دیا۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی جبکہ یہ اسے بچانے کی قدرت رکھتی ہو؟۔(یعنی بس چلتا ہو)انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ہرگز نہیں۔فرمایا اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے جس قدر یہ اپنے بچے پر شفقت کرتی ہے۔(1)

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف تو ہم ضرور پھیر دینگے آپکو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف اور بیشک وہ جنہیں کتاب دی گئی ضرور جانتے ہیں کہ یہ حکم برحق ہے ان کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں''۔

علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قرآن کریم میں سب سے پہلے قبلے کا حکم منسوخ ہوا۔جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو یہاں کے اکثر باشندے یہودی تھے۔اللہ نے آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تو یہودی خوش ہو گئے۔چند ماہ تک آپ ﷺ نے اسی سمت رخ کر کے نماز پڑھی۔آپ کو قبلۂ ابراہیمی از حد پسند تھا۔آپ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے رہتے اور نگاہ مبارک بار بار آسمان کی طرف بار بار اٹھتی رہتی۔تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: قَدْ نَرٰى سے لے کر فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ تک۔یہود کو اس سے تشویش پیدا ہوئی وہ کہنے لگے۔مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا۔ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ اب تک تھے۔ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ آپ فرمایئے اللہ کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی۔اور فرمایا: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ:115) اور فرمایا: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ۔ اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لیے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی اور کون مڑتا ہے الٹے پاؤں۔ابن مردویہ نے بروایت عکرمہ

1۔صحیح البخاری:9/8

حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز کی ادائیگی سے فارغ ہونے کے بعد سر اقدس کو آسمان کی طرف اٹھاتے۔ تو اللہ یہ آیت نازل فرمائی: فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ ”ترجمہ: تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ (لو) اب اپنا چہرہ پھیر لو مسجد حرام کی طرف، کعبہ کی طرف، میزاب رحمت کی طرف“۔ جبریل علیہ السلام نے جماعت کروائی۔ حاتم نے مستدرک میں یحیٰی بن قطۃ سے روایت کیا ہے کہ ”میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرو کو مسجد حرام میں میزاب کے سامنے تشریف فرما دیکھا۔ آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی: فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔ فرمایا میزاب کعبہ کی طرف۔ پھر لکھتے ہیں یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اسے روایت نہیں فرمایا۔ ابن ابی حاتم نے یعلیٰ بن عطاء سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ دیگر علماء کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا ایک قول یہی ہے کہ عین کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے۔ امام شافعی کا دوسرا قول اور اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ جہت قبلہ کی طرف منہ کرنا مراد ہے۔ جیسے حاکم نے علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ شطرہ سے مراد اس کی طرف ہے۔ (پھر فرماتے ہیں) اس کی سند صحیح ہے اور شیخین نے اسے روایت نہیں فرمایا۔ ابوالعالیہ، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، قتادہ، ربیع بن انس وغیرہ کا یہی قول ہے۔ جس طرح ایک اور حدیث میں ہے ”مشرق و مغرب کے مابین قبلہ ہے“۔ قرطبی کا قول ہے ابن جریج نے بروایت عطاء ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بیت اللہ اہل مسجد کا قبلہ ہے۔ اور مسجد قبلہ ہے حرم والوں کا اور حرم مشرق و مغرب کے مابین میری امت میں سے اہل زمین کا قبلہ ہے“۔ ابونعیم فضل بن دکین نے حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر سولہ یا سترہ ماہ تک نماز ادا کی آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والا ایک آدمی نکلا اس کا گزر اہل مسجد پر ہوا وہ رکوع کی حالت میں تھے۔ اس شخص نے کہا میں اللہ کے نام سے گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر مکہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی ہے۔ یہ سن کر وہ لوگ اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔ عبدالرزاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ میں جلوہ افروز ہوئے تو سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ آپ ﷺ کو قبلہ کی طرف رخ کرنا محبوب تھا۔ چنانچہ یہ حکم نازل ہوا تو آپ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ نسائی نے ابوسعید بن معلّٰی سے روایت کیا ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں ہم لوگ مسجد آیا کرتے تھے اور نماز ادا کرتے۔ ایک دن ہمارا گزر ہوا تو رسول اللہ ﷺ منبر پر بیٹھے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔ میں بیٹھ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ...... الآیہ یہاں تک کہ آپ آیت سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا آؤ رسول اللہ ﷺ کے نیچے اترنے سے قبل دو رکعتیں پڑھ لیں اس طرح ہم سب سے پہلے نماز پڑھنے والے ہو جائیں گے ہم ایک ستون کے پیچھے ہو گئے اور نماز پڑھ لی پھر سرکار ﷺ منبر سے اترے اور لوگوں کو اس دن کی ظہر کی نماز پڑھائی۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عمر سے اسی طرح روایت کیا ہے کہ بیت اللہ شریف کی طرف رخ کر کے آپ ﷺ نے سب سے پہلے ظہر کی نماز ادا فرمائی۔ اور یہ صلاۃ الوسطیٰ (درمیانی نماز) ہے۔ اور مشہور یہ ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے آپ ﷺ نے سب سے پہلے عصر کی نماز ادا کی۔ اس لیے اہل قباء کو اگلی فجر تک علم نہ ہو سکا۔ حافظ ابو بکر بن مردویہ نے حضرت نویلہ بنت مسلم سے روایت کیا ہے انہوں نے ارشاد فرمایا: ہم نے مسجد بنی حارثہ میں ظہر یا عصر کی نماز پڑھی ہمارا رخ مسجد ایلیا (بیت المقدس) کی طرف تھا۔ ہم نے دو رکعتیں ادا کی تھیں کہ کسی شخص نے آ کر بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بیت حرام کی طرف منہ کر لیا ہے تو عورتیں ہم میں سے مردوں کی جگہ اور مرد عورتوں کی جگہ چلے گئے۔ اس طرح ہم نے بقایا دو رکعتیں مسجد حرام کی طرف متوجہ ہو کر ادا کیں۔ بنو حارثہ کے ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ابن

مردویہ نے عمارہ بن اوس کا قول نقل کیا ہے کہ ہم بیت المقدس کے رخ پر دوران نماز رکوع کی حالت میں تھے کہ دروازے پر کسی نداد ینے والے نے ندادی کہ قبلہ کعبہ کی سمت تبدیل ہوگیا ہے۔ اور ہمارے امام کے سامنے گواہی دی۔ چنانچہ وہ، مرداور بچے کعبہ کی طرف گھوم گئے درآں حالیکہ سب رکوع میں تھے۔ قولہ: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام جہات شرق وغرب اور شمال وجنوب کی طرف سے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ حالت سفر میں نفل نماز کے سوائے اس حکم میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ حالت سفر میں وہ جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے جب کہ اس کا دل کعبہ کی طرف ہو۔ اسی طرح لڑائی کے دوران جب تلواریں چل رہی ہوں جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص جسے سمت قبلہ کا علم نہ ہوا پنے اجتہاد سے نماز پڑھے اگر چہ حقیقت میں وہ قبلہ کی سمت میں نہ بھی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی ہمت کے مطابق۔

(مسئلہ) مالکیہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ نمازی اپنے سامنے دیکھے گا نہ کہ اپنے سجدے کی جگہ جیسا کہ امام شافعی، احمد اور ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ مالکیہ نے آیت کریمہ۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ سجدے کی جگہ دیکھنے سے نمازی کو بتکلف جھکنا پڑے گا۔ اور یہ کمال قیام کے منافی ہے۔ بعض دیگر مالکی علماء کی رائے ہے کہ نمازی کو بوقت قیام اپنے سینے کی طرف نگاہ رکھنا چاہیے۔ شریک القاضی کا قول ہے کہ حالت قیام میں وہ اپنے سجدے کی جگہ نگاہ مرکوز کرے جیسا کہ جمہور علماء کی رائے ہے کیونکہ اس سے مکمل خشوع وخضوع حاصل ہوتا ہے۔ ایک حدیث سے بھی اس رائے کی تائید ہوئی ہے اور حالت رکوع میں اپنے پاؤں کی طرف، اور حال سجود میں ناک کی طرف اور حالت قعدہ میں گود میں نگاہ جمائے رکھے۔ (قولہ: وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۔ یعنی جنہوں نے تمہارے کعبہ کی سمت منہ کرنے اور بیت المقدس سے رخ تبدیل کرنے کو پسند نہیں کیا یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کا رخ اس طرف پھیر دے گا۔ کیونکہ ان کی کتابوں میں ان کے انبیاء کی زبانی آپ ﷺ اور آپ کی صفات وعلامات موجود ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن خصوصیات وامتیازات اور شریعت کاملہ سے نوازا ہے کا تذکار جمیل موجود ہے۔ لیکن اہل کتاب حسد، کفر اور عناد کی بنا پر اسے چھپاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ انہیں دھمکی فرمائی۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

''اور اگر آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی اور نہ آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے''۔

اللہ رب العزت یہود کے کفر، ہٹ دھرمی، اور شان رسول ﷺ کا علم ہونے کے باوجود ان کی مخالفت کا بیان فرمارہے ہیں کہ اگر وہ ان کے سامنے اپنی سچائی کی تمام دلیلیں بھی قائم کر دے تو بھی وہ اس کی اتباع نہیں کریں گے اور اپنی خواہشات کو نہیں چھوڑیں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ ...... الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (یونس: 97-96)'' ترجمہ: بے شک وہ لوگ ثابت ہو چکی

ہے جن پر آپ کے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اگر چہ آ جائیں ان کے پاس ساری نشانیاں جب تک کہ وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب''۔ اسی لیے یہاں فرمایا اگر آپ اہل کتاب کے پاس لے آئیں ہر دلیل تو پھر بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ قولہ: وَمَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ۔ اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ آقائے دو جہاں ﷺ سختی سے اوامر الٰہیہ کے پابند ہیں۔ جس طرح وہ اپنی آراء اور خواہشات نفس کے غلام ہیں اسی طرح آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کے تابع ہیں۔ وہ کسی حال میں بھی ان کی آرزوؤں کی اتباع کرنے والے نہیں۔ بیت المقدس کی طرف ان کا رخ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ یہود کا قبلہ ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے علماء کو حق کی مخالفت کرنے سے تنبیہ فرمائی یہاں بظاہر خطاب اگرچہ حضور کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد امت ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ۔

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ایک گروہ ان میں سے چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ بن جانا شک کرنے والوں سے''۔

اللہ رب العزت اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ اہل کتاب علماء حضور اکرم ﷺ کی دعوت کی حقانیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ جس طرح ان میں سے کوئی اپنے بیٹے کو پہچانے۔ کسی چیز کی صحت و یقین کی وقت اہل عرب بطور ضرب المثل یوں کہا کرتے تھے۔ جس طرح کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ تھا حضور ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کیا یہ تیرا بچہ ہے؟ اس نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! آپ بھی گواہ رہئے۔ آپ نے فرمایا نہ تو اس پر پوشیدہ ہے اور نہ وہ تجھ پر(1)۔ قرطبی کا قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن سلام سے کہا کیا (حضور سیدنا) محمد ﷺ کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹے کو فرمایا ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ آسمان کا امین زمین کے امین پر اس کا حلیہ اور اوصاف لے کر اترا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ لیکن مجھے اپنے بیٹے کے بارے میں خبر نہیں کہ اس کی ماں نے کیا کیا۔ (میں کہتا ہوں) اس سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تمام لوگوں میں سے آپ کو پہچانتے ہیں۔ آدمی اپنا بیٹا بلا تردد اور شک کے تمام لوگوں سے پہچان لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس صدق اور علمی مرتبے کے باوجود وہ اپنی کتب میں بیان کردہ پیارے نبی کی صفات کو لوگوں سے چھپا لیتے ہیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ اور مومنین کو ارشاد فرما رہے ہیں کہ میرے نبی ﷺ پر جو کچھ اتارا گیا ہے وہ حق ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک و ارتیاب کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ فرمایا: اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ۔

وَلِكُلٍّ وِّجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يَاۡتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور ہر قوم کے لیے ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے پس آگے بڑھ جاؤ دوسروں سے نیکیوں میں۔ تم کہیں ہو لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیت: 168/4

عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد اہل ادیان ہیں۔فرماتے ہیں ہر قبیلے کا قبلہ ہے جسے وہ پسند کرتے ہیں۔اور اللہ کی توجہ اس طرف ہے جس طرف مومنین ہیں۔ابو العالیہ کا قول ہے کہ یہود کا بھی قبلہ ہے، نصاریٰ کا بھی قبلہ ہے۔ اور اے امت تمہیں اپنے حقیقی قبلہ سے آگاہ فرما دیا۔مجاہد، عطاء، ضحاک، ربیع بن انس اور سدی کا یہی قول ہے۔مجاہد کی دوسری روایت اور حسن کا قول ہے کہ ہر قوم کو کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ابن عباس، ابوجعفر باقر اور ابن عامر نے مُوَلِّيهَا کو مُوَلَّاهَا کر کے پڑھا ہے۔یہ آیت کریمہ اس آیت کے مشابہ ہے۔لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ..... كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (مائدہ:48) ''ترجمہ: ہر ایک کے لیے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور علم کی راہ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو بنا دیتا تم (سب) کو ایک ہی امت لیکن آزمانا چاہتا ہے تمہیں اس چیز میں جو اس نے دی ہے تم کو تو آگے بڑھنے کی کوشش کرو نیکیوں میں اللہ کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم سب نے پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جن باتوں میں تم جھگڑا کرتے تھے''۔اور یہاں فرمایا: اَيْنَ مَا تَكُونُوا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یعنی اجساد وابدان کے جدا ہونے کے باوجود انہیں جمع کرنے پر قادر ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

''اور جہاں سے بھی آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے آپکے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر جو کچھ تم کرتے ہو۔اور جہاں سے آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو تو پھر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان سے سو نہ ڈرو تم ان سے (بلکہ صرف) مجھ سے ڈرا کرو تا کہ میں پورا کردوں اپنا انعام تم پر تا کہ تم راہ راست پر ثابت قدم رہو''۔

تمام روئے زمین پر استقبال قبلہ کا یہ تیسرا حکم ہے۔تین مرتبہ اس تکرار میں حکمت کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ایک قول کے مطابق یہ تاکید ہے کیونکہ قرآن کریم میں سے پہلا حکم منسوخ ہو رہا تھا۔جیسا کہ ابن عباس وغیرہ نے تصریح کی ہے۔ایک قول یہ ہے کہ یہ اس حکم کی مختلف صورتیں ہیں۔پہلا امر اس کے لئے کعبہ جن کے بالکل سامنے ہو۔دوسرا اس شخص کے لئے جو مکہ میں ہو لیکن کعبہ کو نہ دیکھ رہا ہو۔اور تیسرا حکم ان کیلئے ہے جو دیگر ممالک میں ہوں۔فخر الدین رازی نے یہی توجیہ کی ہے۔قرطبی کا قول ہے کہ پہلی آیت کا حکم اہل مکہ کے لئے دوسری جو دیگر شہروں میں ہیں اور تیسری آیت کا حکم ان کے لئے ہے جو حالت سفر میں ہوں۔قرطبی نے اس جواب کو ترجیح دی ہے۔(1) ایک قول یہ ہے کہ تینوں حکموں کا تعلق ایک دوسرے سے ہے پہلے فرمایا: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ۔سے لے کر۔وَاِنَّ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُونَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ۔اس جگہ آپ ﷺ کی قبولیت دعا کا ذکر ہے۔کہ آپ کے پسندیدہ قبلہ کی طرف آپ کا رخ پھیر دیا گیا۔دوسری آیت میں۔وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ۔فرمایا کہ یہی حق ہے۔جسے اللہ کے رسول ﷺ بھی پسند کرتے ہیں اور اس سے راضی ہیں۔تیسرے

امر میں حکمت یہ ہے کہ مخالف یہود کے لئے قطع حجت ہو جائے جو رسول اللہ ﷺ کے ان کے قبلہ کی طرف رخ کرنے سے مجادلہ کیا کرتے تھے حالانکہ اپنی کتابوں سے وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ آپ کو قبلہ ابراہیمی کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ اسی طرح مشرکین عرب کے لئے بھی اس میں اتمام حجت ہے جو کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ ﷺ کا اس کی طرف رخ کرنا ان کے لئے باعث اطمینان تھا۔ اس تکرار میں اور بہت سی حکمتیں بیان کی گئی ہیں جنہیں رازی وغیرہ نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔

قولہ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ: یعنی اہل کتاب جو یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ اس امت کا قبلہ، کعبہ شریف ہوگا۔ وگرنہ ان پر اعتراض ہو سکتا تھا (کہ دعویٰ تو ملت ابراہیمی کا ہوا اور ان کے قبلہ کی طرف منہ بھی نہیں کرتے)۔ نیز اس میں یہود کے اعتراض کا بھی جواب ہے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے قبلہ میں ہمارے ساتھ برابر ہیں اور یہ روایت اظہر ہے۔ ابو العالیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں جنھوں نے تبدیلی کعبہ کے وقت کہا تھا کہ آپ کو اپنے آبائی گھر اور اپنی قوم کے دین کا شوق بڑھ گیا ہے۔ بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ عنقریب آپ ہمارے دین کی طرف بھی پھر جائیں گے جس طرح آپ نے ہمارا قبلہ اختیار کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کا کہنا ہے کہ مجاہد، عطاء، ضحاک، ربیع بن انس قتادہ اور سدی سے یہی مروی ہے۔ ان لوگوں نے آیت اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ کا مصداق مشرکین قریش کو قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں نے ظلم کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ دین ابراہیم پر ہے اگر بیت المقدس کی طرف منہ کرنا ملت ابراھیمی ہے تو یہ اس سے رخ نہ پھیرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کرنا پسند فرمایا اس میں کوئی حکمت تھی۔ آپ نے اپنے رب کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ پھر آپ کو قبلہ ابراہیمی یعنی کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا تو آپ ﷺ نے اس حکم کی بھی بجا آوری فرمائی آپ ﷺ تمام احوال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرمانے والے ہیں آنکھ جھپکنے کی دیر بھی امر الٰہی سے انحراف نہیں فرماتے اور آپ کی امت آپ کی پیروکار ہے۔ قولہ: فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ یعنی تم سرکشوں کے شبہ سے مت ڈرو صرف اللہ سے ہی ڈرا کرو وہ ذات قدوس ہی اس بات کی سزاوار ہے کہ اس سے خشیت اختیار کی جائے۔ قولہ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ کا عطف لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ پر ہے یعنی تحویل کعبہ کی جو نعمت میں نے تمہیں عطا فرمائی ہے اس کا مقصد ہے کہ شریعت ہر اعتبار سے مکمل ہو جائے۔ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ یعنی سابقہ امتیں جس سے بہک گئیں ہم نے تمہیں اس کی طرف ہدایت عطا فرمائی اور اسے تمہارے ساتھ خاص کر دیا۔ اسی لیے یہ امت تمام امتوں سے افضل اور اعلیٰ قرار پائی ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾

”جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول (ﷺ) تم میں سے پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو“۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اس (جلیل القدر) نعمت کی یاد دلا رہے ہیں جو اس نے اُن پر فرمائی۔ یعنی حضرت سیدنا محمد

ﷺ کو ان پر رسول بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات بینات کی تلاوت فرماتے ہیں۔ انہیں رذائل اخلاق، نفوس کی غلاظت اور جاہلیت کے افعال سے پاک فرماتے ہیں اندھیروں اور جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے جاتے ہیں۔ کتاب (قرآن کریم) اور حکمت (سنت مبارکہ) کی تعلیم دیتے ہیں اور وہ کچھ بھی سکھاتے ہیں جو وہ نہیں جانتے تھے زمانہ جاہلیت میں وہ محض ان پڑھ اور جہلاء تھے اور جاہلانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ آپ کی برکت رسالت اور یمن سفارت کی بنا پر اولیاء وعلماء بلکہ دقیق علم والے، نیک دلوں والے، کم تکلف والے اور سچے لہجے والے بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ...... اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ...... (آل عمران: 164)۔ اور جن لوگوں نے اس نعمت کی قدر نہیں پہچانی ان کی مذمت بایں الفاظ بیان فرمائی: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا...... دَارَ الْبَوَارِ (ابراہیم: 28)۔ ''ترجمہ: کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں''۔ ابن عباس کا قول ہے کہ اس نعمت سے مراد حضرت محمد ﷺ کا وجود مسعود ہے۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اس نعمت کا اعتراف کرنے اور اس کے مقابلے میں ذکر وشکر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ حضرت مجاہد كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ۔ کی تفسیر میں فرماتے ہیں جیسے میں نے جس طرح (تم پر یہ احسان عظیم فرمایا ہے چنانچہ) تم بھی اسی طرح میرا ذکر کرو۔ عبداللہ بن وھب نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے رب میں تیرا شکر کیسے ادا کروں فرمایا مجھے یاد کرا اور مجھے بھول نہ جانا۔ جب تو نے مجھے یاد کیا تو یہ میرا شکر یہ ادا کرنا ہے اور اگر مجھے بھلا دیا تو یہ ناشکری کرنا ہے۔ حضرت حسن بصری، ابوالعالیہ، سدی اور ربیع بن انس کا قول ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے وہ اس کا ذکر کرتا ہے اور شکر کرنے والے کی نعمتوں میں اضافہ اور ناشکری کرنے والے کو سزا دی جاتی ہے۔ بعض سلف نے اس آیت: اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران: 102) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے۔ ذکر کیا جائے اسے بھلایا نہ جائے۔ اور اس کا شکر کیا جائے ناشکری نہ کی جائے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت مکحول ازدی کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے عرض کی۔ آپ کی کیا رائے ہے اگر قاتل، شرابی، چور اور زانی اللہ کا ذکر کرے تو فرمایا جب یہ اللہ کا ذکر کرے تو اللہ اس پر لعنت فرماتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جائے۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ جو کچھ میں نے تم پر فرض کیا ہے اسے یاد کرو میں نے جو اپنے اوپر واجب کیا ہے اسے میں یاد کروں گا۔ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے کہ تم میری طاعت سے مجھ کو یاد کرو میں تمہیں اپنی مغفرت سے یاد کروں گا۔ حضرت ابن عباس اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ اللہ کا تمہیں یاد کرنا تمہارے ذکر کرنے سے بڑا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جس نے مجھے اپنے دل میں یاد کیا میں بھی اسے ایسے ہی یاد کرتا ہوں۔ اور جو مجھے مجلس میں یاد کرے میں اس سے بہتر مجلس میں اسے یاد کرتا ہوں'' (1)۔ امام احمد کا قول ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (حدیث قدسی) اے ابن آدم اگر تو نے مجھے اپنے دل میں یاد کیا تو میں بھی تمہیں یاد کرتا ہوں۔ اگر تو مجھے مجمع عام میں یاد کرے تو میں تمہیں ملائکہ کے مجمع میں (یا ایک روایت کے الفاظ میں) اس سے بہتر مجمع میں تمہیں یاد کرتا ہوں اگر تو مجھ سے ایک بالشت نزدیک ہو تو میں ایک ہاتھ تیرے قریب ہو جاتا ہوں۔ اگر تو میری طرف چل کر آئے تو میں دوڑ کر تیری طرف آتا ہوں (2)۔ یہ حدیث صحیح سند والی ہے بخاری نے اسے روایت کیا ہے۔ اس میں قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت سے قریب ہے۔ قولہ: وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے شکر کرنے کا حکم دیا اور شکر ادا کرنے پر مزید خیر وبرکت کا وعدہ فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ

1۔ مسند احمد: 354/2 2۔ مسند احمد: 138/3

لَئِنْ شَكَرْتُمْ...... عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراہیم: 7) ’’ترجمہ: اور یاد کرو جب (تمہیں) مطلع فرمایا تمہارے رب نے (اس حقیقت سے) کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکر ادا کرو تو میں مزید اضافہ کر دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی (تو جان لو) یقیناً میرا عذاب شدید ہے‘‘۔ امام احمد نے ایک حدیث کے ضمن میں حضرت ابو رجاء عطاردی سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمران بن حصین ہمارے پاس آئے آپ پر ایک ریشمی چادر تھی ہم نے اسے اس سے پہلے یا بعد کبھی نہیں دیکھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جسے اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت عطا فرمائے تو اللہ تعالیٰ اس نعمت کے اثرات اپنی مخلوق پر دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں (اپنے بندے پر) کے الفاظ آئے ہیں(1)۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

’’اے ایمان والو! مدد طلب کیا کرو صبر اور نماز (کے ذریعہ) سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے اور نہ کہا کرو انہیں جو قتل کیے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اسے) سمجھ نہیں سکتے‘‘۔

شکر کے بیان سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ صبر کا بیان شروع فرما رہے ہیں۔ صبر اور نماز سے استعانت اور راہنمائی لینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ انسان اگر نعمت میں ہو تو شکر کرے اور اگر مشکلات میں ہو تو صبر کرے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے ’’مومن کے لئے تعجب ہے اللہ اس کی تقدیر میں کوئی چیز نہیں رکھتا مگر اس کے لئے اس میں بھلائی ہے۔ اگر اسے خوشی حاصل ہو اور اس پر شکر ادا کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر کوئی رنج پہنچے اور وہ صبر کرے تو یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں کہ مصائب کے برداشت کرنے میں جن چیزوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ان میں عمدہ ترین صبر اور نماز ہے۔ جیسے اس سے پہلے گزر چکا۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ ...... الْخٰشِعِيْنَ (بقرہ: 45) ’’ترجمہ: اور مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک نماز ضرور ی بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر (بھاری نہیں)‘‘۔ حدیث شریف میں ہے کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی مشکل درپیش آتی تو نماز ادا فرمایا کرتے تھے(2)۔ صبر کی دو صورتیں ہیں۔ 1۔ محارم (حرام کردہ اشیاء) اور گناہوں کے ترک کرنے پر صبر کرنا۔ 2۔ طاعات و عبادات کی بجا آوری پر صبر کرنا۔ دوسری صورت میں ثواب زیادہ ہے کیونکہ یہی مقصود ہے۔ صبر کی تیسری قسم مصائب و مشکلات پر صبر کرنا یہ بھی واجب ہے جیسے عیوب پر استغفار کرنا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ صبر کے دو باب ہیں۔ 1۔ اللہ تعالیٰ کیلئے صبر کرنا جو وہ پسند فرمائے اگرچہ یہ چیز نفس اور بدن پر دشوار ہی کیوں نہ ہو۔ 2۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر ناپسندیدہ امور سے کنارہ کشی اختیار کرنا اگرچہ دلی میلانات اسی طرف ہوں۔ جو شخص ان صفات سے متصف ہو وہ صابرین میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ سلام فرمائے گا۔ ان شاء اللہ۔ امام زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ روز حشر جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا اس وقت ایک منادی یہ ندا دے گا۔ صبر کرنے والے کہاں ہیں کہ انہیں بغیر حساب جنت میں داخل کیا جائے۔ لوگوں کی کچھ جماعتیں اٹھ کھڑی ہوں گی۔ فرشتے انہیں پوچھیں گے کہ اے بنو آدم آپ کہاں جا رہے ہیں؟ وہ کہیں گے جنت کی طرف۔ وہ پھر پوچھیں گے کیا حساب سے بھی پہلے؟۔ وہ کہیں گے ہاں۔ وہ پوچھیں گے آپ کون لوگ ہیں؟۔ وہ کہیں گے ہم صابرین ہیں۔ وہ کہیں گے تم نے کیا صبر کیا؟۔ وہ بتائیں گے ہم نے اللہ کی اطاعت پر صبر کیا۔ ہم اللہ کی معصیت سے بچتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وفات دے دی۔ وہ فرشتے کہیں گے تم اسی طرح ہو۔ جیسے تم نے بتایا جاؤ جنت چلے جاؤ۔ (نیک) اعمال کرنے

1۔ مسند امام احمد: 438/4 2۔ ایضاً، 388/5

والوں کا کتنا ہی اچھا اجر ہے۔ (میں کہتا ہوں) اسی کی تائید اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر:10)'' ترجمہ: (مصائب وآلام میں) صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔'' سعید بن جبیر کا قول ہے کہ صبر سے مراد بندے کا اعتراف ہے کہ ہر مصیبت جو اسے آئے اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اس پر اللہ کے ہاں اجر وثواب کی امید رکھے۔ بعض اوقات گھبراہٹ میں آدمی جزع فزع کرتا ہے۔ اسے صرف صبر کرنا ہی مناسب ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات سے آگاہ فرمارہے ہیں کہ شہداء برزخ میں زندہ ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح کہ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں جنت میں جہاں چاہے گھومتی ہیں۔ پھر زیر عرش معلق قندیلوں میں رہتی ہیں۔ تمہارے رب نے ان کی طرف نگاہ التفات فرمائی اور پوچھا ''تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ کہنے لگے اے ہمارے رب! ہم کس چیز کی خواہش کریں جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو کسی مخلوق کو نہیں بخشا؟ پھر دوبارہ ان سے یہی سوال کیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی سوال کیے بغیر انہیں نہیں چھوڑا جائے گا۔ وہ کہنے لگے ہمیں دار دنیا کی طرف لوٹایا جائے تاکہ ہم تیری راہ میں جہاد کریں اور دوبارہ رتبہ شہادت پر فائز ہوں۔ (وہ یہ مطالبہ شہادت کا اجر وثواب دیکھ کر کریں گے) اس وقت رب ذوالجلال فرمائے گا۔ میں نے یہ بات لکھ دی ہے کہ وہ دنیا کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے(1)۔ ایک اور حدیث شریف جسے امام احمد نے امام شافعی کے واسطہ سے امام مالک سے روایت کیا ہے، میں ہے عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، مومن کی روح ایک پرندہ ہے جو جنت کے درخت سے لٹکا ہوا ہے۔ تاآنکہ روز قیامت اللہ تعالیٰ اسے اپنے جسم کی طرف لوٹائے گا(2)۔ اس حدیث میں بالعموم مومنین کا ذکر ہے جبکہ قرآن کریم میں خصوصاً شہداء کا ذکر بطور تکریم وتعظیم اور شرف پر دلالت کرنے کے لئے فرمایا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کیساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے (تمہارے) مالوں اور جانوں اور پھلوں میں اور خوشخبری سنایئے ان صبر کرنیوالوں کو جو کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں بیشک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں''۔

اللہ رب العزت ارشاد فرمارہے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کو امتحان وآزمائش میں مبتلا کیا کرتا ہے۔ جیسے ایک اور جگہ فرمایا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ (محمد:31) '' ترجمہ: اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں اور ہم پرکھیں گے تمہارے حالات کو کبھی خوشی کے ساتھ اور کبھی خوف اور بھوک کے رنج کے ساتھ''۔ جیسے فرمایا: فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (نحل:112)'' ترجمہ: پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنا دیا

1۔ مسلم، کتاب الامارۃ:1502,3 2۔ مسند امام احمد:455/3

انہیں) بھوک اور خوف کا لباس ان کارستانیوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے"۔ بھوکے اور خائف پر دونوں چیزیں ظاہر ہو جاتی ہیں اسی لیے فرمایا: لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ اور یہاں فرمایا۔ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ (بقرہ:155)۔ یعنی قلیل مقدار کے ساتھ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کچھ مال ضائع کر کے۔ "وَ الْاَنْفُسِ" جیسے دوستوں، اقارب اور احباب کے وفات کے ساتھ۔ "وَ الثَّمَرٰتِ" یعنی باغات اور کھیتیاں پہلے کی طرح ثمر بار نہیں ہوتیں۔ سلف صالحین میں سے کسی کا قول ہے کہ کھجور کے کسی درخت پر صرف ایک کھجور لگتی۔ اسی طرح کی دیگر چیزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ پس جو صبر کرے اسے اجر و ثواب دیتا ہے اور جو مایوسی کا اظہار کرے اسے سزا دیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا: وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ خوف سے مراد یہاں خوف خدا۔ بھوک سے مراد صیام رمضان اور نقص اموال سے مراد زکوٰۃ اور انفس سے مراد امراض اور الثمرات سے مراد اولاد ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے۔ واللہ اعلم

پھر اللہ تعالیٰ صابرین میں سے شکر کرنے والوں کا بیان فرما رہے ہیں۔ فرمایا: الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ یعنی اپنے اس قول کے ساتھ اپنے اوپر پڑی اس آفت میں تسلی حاصل کی۔ اور یہ جان لیا کہ وہ اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ اپنے بندوں میں جو چاہے کرتا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ قیامت کے دن اس کے ہاں ذرہ برابر چیز بھی ضائع نہیں ہوگی۔ ان کے اس اعتراف نے انہیں اس نتیجے تک پہنچایا کہ بالآخر وہ دار آخرت کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نوازشات کے بارے میں فرمایا: اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ ۔ یعنی اللہ کی طرف سے ستائش۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ عذاب سے امن۔ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا دونوں اطراف کی چیزیں کتنی اچھی ہیں۔ اور درمیان والا بوجھ کتنا اچھا ہے۔ صلوٰت و رحمت یہ دونوں برابر کی چیزیں ہیں اور ہدایت یہ اوپر کی چیز ہے یہ دو بوریوں کے درمیان رکھی جاتی ہے۔ یہ بوجھ میں اضافہ ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کو ثواب بھی ملے گا اور اس پر اضافہ بھی ہوگا۔ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے کے ثواب میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ امام احمد نے حضرت سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے ایک دن ابو سلمہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر تشریف لائے اور فرمایا میں نے رسول اللہ کو ارشاد فرماتے آج ایک بات سنی ہے جس سے مجھے خوشی ہوئی فرمایا: کسی مسلمان کو کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر وہ اس پر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھتا ہے۔ پھر کہتا ہے اے اللہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور اس کی جگہ مجھے بہتر بدلہ عطا فرما تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور بدلہ دیتا ہے"۔ (اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْهَا)۔ فرماتی ہیں میں نے یہ کلمات یاد کر لیے۔ جب ابو سلمہ کی وفات ہوگئی تو میں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہہ کر یہی دعا مانگی۔ پھر میرے دل میں خیال گذرا ابو سلمہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟۔ جب میری عدت گذر گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اجازت طلب کی۔ میں اپنی کھال کی دباغت (چمڑا رنگنا) کر رہی تھی۔ میں نے قرظ (ایک درخت) والے ہاتھ دھوئے اور آپ کو اجازت دی۔ آپ کے لئے ایک چمڑے کا تکیہ رکھا جس میں کھجور کے پوست کی چھال بھری ہوئی تھی۔ آپ ﷺ تشریف فرما ہوئے اور مجھ سے منگنی فرمائی۔ جب آپ ﷺ اپنی بات سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کیا ہے کہ آپ میں رغبت ظاہر نہ کروں۔ لیکن میں شدید غیرت والی عورت ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ آپ ﷺ مجھ سے کوئی ایسی بات دیکھیں جس سے اللہ مجھے عذاب میں مبتلا فرما دے۔ میں عمر رسیدہ ہو چکی ہوں۔ اور میرے بال بچے ہیں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے جو (بے جا) غیرت کا ذکر کیا ہے اللہ اسے ختم فرما دے گا۔ عمر کے بارے میں جو تم نے کہا ہے تو میں بھی

اسی مرحلے پر ہوں جہاں تک عیال (بچوں) کا تعلق ہے تو تمہارے بال بچے میرے ہی بال بچے ہیں۔ میں نے یہ سن کر ہاں کر دی۔ اور آپ ﷺ نے مجھ سے نکاح فرما لیا(1)۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابوسلمہ کا نعم البدل عطا فرمایا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ۔ صحیح مسلم میں یہی حدیث باختلاف الفاظ وارد ہوئی ہے(2)۔ امام احمد نے بروایت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہ ذکر فرمایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان مرد یا عورت پر کوئی مصیبت آئی ہو اور وہ اسے یاد کرے اگرچہ کتنا عرصہ کیوں نہ گذر چکا ہو۔ (اور یاد آنے پر) وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے نئے سرے سے وہی اجر عطا فرمائیں گے جتنا اس مصیبت کے وقت ملا تھا۔ ابن ماجہ نے بھی اپنی سنن میں اسے روایت فرمایا ہے(3)۔ امام احمد نے اپنی سند سے ابوسنان سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے بچے کو دفن کیا۔ ابھی میں قبر میں ہی تھا کہ ابوطلحہ خولانی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجھے باہر نکال کر فرمایا کیا میں تمہیں خوشخبری نہ دوں؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ فرمایا مجھے ضحاک بن عبدالرحمن بن عوزب نے ابوموسیٰ سے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (حدیث قدسی ہے) اے ملک الموت تو نے میرے بندے کا بیٹا اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار چھین لیا۔ اس نے عرض کی۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو اس بندے نے کیا کہا۔ عرض کی اس نے تیری حمد وثنا کی اور اِنَّا لِلّٰهِ...... پڑھا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کے لئے جنت میں گھر بناؤ اور اس کا نام بَیْتُ الْحَمْدِ رکھو۔'' علی بن اسحٰق اور ترمذی نے عبداللہ بن مبارک سے اسی طرح روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور ابوسنان کا نام عیسیٰ بن سنان ہے۔(4)

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۵۸﴾

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جو حج کرے اس گھر کا یا عمرہ کرے تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو اللہ تعالیٰ بڑا قدردان خوب جاننے والا ہے''۔

امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کیا تم نے یہ آیت پڑھی ہے: اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ ...... الخ۔ میں نے کہا بخدا کسی پر کوئی گناہ نہیں اگر ان کا طواف نہ کرے۔ سیدہ عائشہ نے فرمایا اے بھانجے تم نے بری بات کہی ہے۔ اگر بات اسی طرح ہوتی جس طرح تو نے تاویل کی ہے تو الفاظ یوں ہوتے: فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ لَّا یَطَّوَّفَ بِهِمَا لیکن اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ قریش اسلام سے قبل منات کے پاس آ کر تلبیہ کہا کرتے یہ ایک بت تھا جو مشلل کے پاس تھا۔ اور جو شخص اس کے پاس تلبیہ کہہ لیتا وہ صفا و مروہ کے طواف کو گناہ سمجھتا۔ چنانچہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! زمانہ جاہلیت میں ہم صفا و مروہ کے طواف میں حرج سمجھتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صفا و مروہ کے طواف کو مسنون قرار دیا۔ اب کسی کے لئے اسے ترک کرنا جائز نہیں(5) (یہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے)۔ زہری کی روایت میں ہے کہ میں نے یہ حدیث ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کے سامنے بیان کی تو وہ فرمانے لگے۔ یہ واقعی علم ہے اسے میں نے نہیں سنا تھا۔ میں نے اہل علم میں سے بعض کو یہ کہتے سنا لوگ کہتے تھے کہ ان دو پتھروں کے مابین طواف امور جاہلیت میں سے ہے۔ بعض دوسرے قریش کہنے لگے۔ ہمیں صرف طواف کعبہ کا حکم ہے، صفا و مروہ کے طواف کا حکم نہیں فرمایا گیا۔ تو

1۔ مسند احمد: 28/4 2۔ مسلم، کتاب الجنائز: 3633۔ ابن ماجہ: 1598 4۔ مسند احمد: 415/4 5۔ صحیح البخاری: باب الحج: 79

یہ آیت اتری۔ ابوبکر بن عبد الرحمٰن نے فرمایا شاید یہ ان دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہو(1)۔ بخاری نے ایک دوسری سند سے بروایت مالک بن ہشام بن عروہ اسی طرح روایت کیا ہے۔ پھر بخاری لکھتے ہیں عاصم بن سلیمان کا قول ہے میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صفاو مروہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا'' ہم اسے امور جاہلیت میں سے خیال کرتے تھے۔ چنانچہ جب اسلام آیا تو ہم نے ان کی سعی کرنا چھوڑ دیا تو اللہ جل جلالہ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ شیاطین رات کو صفاو مروہ کے درمیان گھومتے رہتے تھے۔ ان کے درمیان بہت سے بت تھے۔ جب اسلام آیا تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے ان دونوں کے طواف کی بابت دریافت کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ شعبی کا قول ہے کہ اساف نامی بت ہے۔ نائلہ (بت) مروہ پر تھا۔ وہ ان دونوں کا استلام کیا کرتے تھے۔ قبول اسلام کے بعد وہ اسکی سعی کو باعث حرج تصور کرنے لگے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ میں کہتا ہوں محمد بن اسحٰق نے اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ اساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ انہوں نے کعبہ میں بدکاری کی تو اس وقت پتھر بنا دیئے گئے۔ تاکہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں۔ کچھ عرصہ گذرا تو ان کی پرستش شروع ہوگئی پھر انہیں صفاو مروہ پر منتقل کر دیا گیا۔ اور وہاں نصب کر دیا گیا(3)۔ قریش صفاو مروہ میں طواف کے وقت انہیں استلام کرتے اسی لیے ابو طالب اپنے مشہور قصیدہ میں فرماتے ہیں۔

وَحَيْثُ يُنِيْخُ الْاَشْعَرُوْنَ رِكَابَهُمْ
لِمُفْضِى السُّيُوْلِ مِنْ اِسَافٍ وَنَائِلِ

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ طواف سے فارغ ہو کر رکن کے پاس آئے استلام کیا اور باب الصفا سے نکلے یہ آیت کریمہ زبان اقدس پر تھی: اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ پھر فرمایا۔ اِبْدَءُ وْ ا بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ(4)۔ اسی سے ابتدا کرو جس سے اللہ نے ابتدا فرمائی ہے(یعنی پہلے ذکر فرمایا ہے)۔ نسائی کی روایت میں ہے: اِبْدَؤُوْا بِمَا بَدَاَ اللّٰهُ بِهٖ۔ (5)'' اسی سے ابتدا کرو جس سے اللہ نے ابتدا فرمائی ہے۔'' امام احمد نے حبیبہ بنت ابی تجراۃ سے روایت کیا ہے وہ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو صفاو مروہ کے درمیان چکر لگاتے دیکھا لوگ آپ کے آگے تھے اور آپ ﷺ ان کے پیچھے تھے اور سعی فرمارہے تھے۔ حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ تیز دوڑنے کی وجہ سے آپ کا تہبند آپ کے گھٹنوں کے ادھر ادھر ہو رہا تھا۔ اور آپ ﷺ ارشاد فرمارہے تھے۔ (اِسْعَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْىَ) '' سعی کرو بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی واجب کر دی ہے(6)۔'' امام احمد نے ہی دوسری سند سے صفیہ بنت شیبہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے اسے خبر دی کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو صفاو مروہ کے مابین ارشاد فرماتے سنا (كُتِبَ عَلَيْكُمُ السَّعْىُ فَاسْعَوْا (دار قطنی)(7)۔'' تم پر سعی لکھ دی گئی ہے پس سعی کرو۔'' اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو صفاو مروہ کے درمیان سعی کو حج کا رکن قرار دیتے ہیں۔ 1۔ جیسا کہ امام شافعی اور ان کے موافقین کا مذہب ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب بھی اسی طرح ہے۔ 2۔ بعض دوسرے فقہاء کی رائے میں یہ واجب ہے رکن نہیں۔ اگر عمداً یا سہواً ترک کر دے تو دم(قربانی) دے کر اس کی کو پورا کیا جائے گا۔ امام احمد کی ایک روایت یہ ہے۔ علماء کا ایک گروہ اسی طرح کہتا ہے۔ 3۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مستحب ہے۔ ابو حنیفہ، ثوری، شعبی اور ابن سیرین اسی طرف گئے ہیں۔ اور حضرت انس، ابن عباس اور ابن عمر سے

1۔ مسلم، کتاب الحج:929 2۔ فتح الباری، تفسیر سورۂ بقرہ:175/8 3۔ فتح الباری، تفسیر سورۂ بقرہ:175/8 4۔ مسلم:888
5۔ مسند امام احمد:294/3 6۔ مسند امام احمد:422/6 7۔ مسند امام احمد:437/6

یہی مروی ہے۔ مالک سے ''عتیبہ'' میں اسی طرح منقول ہے۔قرطبی نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے ارشاد باری تعالیٰ: فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا ۙ سے دلیل پکڑی ہے۔لیکن پہلا مذہب راجح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے ان کے مابین طواف فرمایا اور حکم دیا(لِتَاۡخُذُوۡا عَنِّیۡ مَنَاسِكَكُمۡ) مجھ سے اپنے مناسک حج سیکھو۔لہٰذا آپ ﷺ نے دوران حج جو کچھ کیا ہے وہ واجب ہے۔اس کا حج میں کرنا ضروری ہے مگر جو چیز دلیل سے خارج ہو جائے۔واللہ اعلم۔اس سے پہلے گذرا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا''سعی کرو اللہ نے تم پر سعی فرض کر دی ہے پس سعی کرو۔''پس اللہ تعالیٰ نے صفا و مروہ کے مابین سعی کو شعائر اللہ میں سے قرار دیا جو مناسک حج حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سکھلائے تھے۔اوپر حضرت ابن عباس والی روایت میں بیان ہو چکا ہے کہ سعی کی اصل حضرت سیدہ ہاجرہ کا بچے کے لئے پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کے درمیان چکر لگانا ہے۔جب ان کے پاس پانی اور زاد راہ ختم ہو گیا تھا۔جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں یہاں چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے۔وہاں ان کے سوا کوئی انسان نہ تھا۔جب ان کا توشہ ختم ہو گیا اور اپنے بیٹے کے ضائع ہونے کا خطرہ ہوا تو وہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے لگیں۔اور صفا و مروہ کے درمیان اس مقدس جگہ پر چکر لگاتی رہتیں۔اس وقت وہ از حد بے قرار، خوفزدہ ششدر اور پریشان تھیں اور نصرت خداوندی کی خواستگار تھیں۔حتیٰ کہ اللہ رب العزت نے ان کی مشکل کو آسان فرمایا۔ان کی اجنبیت ختم ہوئی۔رنج و غم کی شدت میں کمی آئی۔اور آپ کے لئے زمزم کا چشمہ جاری فرمایا جو کھانے کا کھانا اور بیماریوں کی شفا ہے۔لہٰذا ان کے درمیان سعی کرنے والے کو چاہئے کہ اپنے فقر و ذلت اور قلبی ہدایت، اصلاح احوال اور گناہوں کی مغفرت کے لئے اسے سامنے رکھے۔ اور اپنے نقائص و عیوب کی دوری کے لئے اللہ کی پناہ حاصل کرے کہ وہ اسے صراط مستقیم پر رکھے۔اور تا زیست اسی پر قائم رہے۔تاکہ وہ اسے ذنوب و معاصی کی غلاظت سے نکال کر مقام کمال و غفران اور استقامت پر فائز کر دے۔جس طرح حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ کیا تھا۔قولہ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا ۙ۔یعنی طواف کے چکروں میں واجب مقدار پر اضافہ کرے یعنی آٹھ یا نو چکر لگائے وغیرہ۔ایک قول کے مطابق حج تطوع اور عمرہ کا طواف مراد ہے۔(واضح رہے کہ طواف سے مراد سعی ہے)۔بعض علماء کے نزدیک عبادت سے ہر زیادتی مراد ہے رازی نے یہی لکھا ہے۔حضرت حسن بصری کی طرف تیسرا قول منسوب ہے۔واللہ اعلم۔

قولہ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيۡمٌ: یعنی تھوڑے عمل پر کثیر اجر دیتا ہے۔اور جزا کی صحیح مقدار کو جانتا ہے۔کسی کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا۔ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا وَيُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًا (نساء:40)''ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دوگنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم۔''

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالۡهُدٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الۡكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَيَّنُوۡا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوۡبُ عَلَيۡهِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۰﴾

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں روشن دلیلوں اور ہدایت سے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے واسطے (اپنی) کتاب میں یہی وہ لوگ ہیں کہ دور کرتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اور لعنت کرتے ہیں انہیں لعنت کرنیوالے۔البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور ظاہر کر دیں (جواب تک چھپاتے رہے) تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت توبہ قبول کرنیوالا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہوں۔بے شک

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی''۔

یہ ان لوگوں کے لئے شدید وعید ہے جو رسولوں کی لائی ہوئی مقاصد صحیحہ پر دلالت کرنے والی اور قلوب کے لئے باعث ہدایت باتوں کو چھپا لیا کرتے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر نازل کردہ کتب میں انہیں واضح فرما دیا۔ ابوالعالیہ کا قول ہے کہ یہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کی علامت کو چھپا لیا تھا۔ پھر بتایا کہ ان کے اس فعل شنیع پر کائنات کی ہر شے لعنت بھیجتی ہے۔ جس طرح عالم کے لئے ہر چیز استغفار کرتی ہے حتیٰ کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں۔ ان کی صورت حال علماء کے برعکس ہے اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت بھیجتا ہے اور لعنت بھیجنے والے بھی۔ مسند حدیث میں متعدد سندوں سے جو ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جس شخص سے (کسی دینی امر کے بارے) کوئی سوال پوچھا گیا اور اس نے اسے چھپایا تو اسے قیامت کے دن آگ کی لگام دی جائے گی(1)۔ صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا۔ اگر کتاب اللہ میں یہ آیت نہ ہوتی تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا: اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ ...... الخ۔ ابن ابی حاتم نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ میں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا'' کافر کی دونوں آنکھوں کے مابین ضرب لگائی جاتی ہے جسے جن وانس کے سوا سب جانور سنتے ہیں۔ ہر جانور جو اس کی آواز سنتا ہے اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب ہے۔ ابن ماجہ نے بھی اسے روایت کیا ہے(2)۔ عطاء بن ابی رباح کا فرمان ہے۔ اللّٰعِنُوْنَ میں تمام جانور اور جن وانس شامل ہیں۔ مجاہد کا قول ہے کہ جب خشک سالی کا دور دورہ ہو تو جانور کہتے ہیں یہ بنو آدم کے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ بنو آدم کے گناہ گاروں پر لعنت کرے۔ ابوالعالیہ، ربیع بن انس اور قتادہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ملائکہ اور مومنین ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ عالم کے لئے ہر چیز استغفار کرتی ہے یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں بھی۔ اس آیت میں آیا ہے کہ علم کو چھپانے والے پر اللہ تبارک وتعالیٰ، فرشتے، تمام لوگ اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ اور وہ تمام فصیح اللسان عرب اور عجمی ہیں خواہ زبان مقال سے ہو یا لسان حال سے۔ بشرطیکہ اس میں عقل ہو۔ اور قیامت کے دن بھی یہ سب چیزیں ان پر لعنت کریں گی۔ واللہ اعلم۔

پھر اللہ جل شانہ نے اس جگہ توبہ کر لینے والوں کو مستثنیٰ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا۔ یعنی حضور ﷺ کے کمالات کو چھپانے کے کام سے باز آ گئے اور اپنے اعمال کی اصلاح کر لی۔ اور جو بات وہ چھپاتے تھے اسے لوگوں کے سامنے بیان کر دیا۔ فَاُولٰٓىٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ میں ان کی توبہ قبول کر لیا کرتا ہوں اور میں تو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہوں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفر اور بدعت کی طرف بلانے والا جب بارگاہ الٰہی میں توبہ کر لے تو وہ اس کی توبہ قبول فرما لیا کرتا ہے۔ لیکن وارد ہوا ہے کہ سابقہ امتوں میں سے ایسے لوگوں کی توبہ بھی مقبول نہ تھی۔ لیکن یہ تو نبی توبہ اور نبی رحمت۔ صَلَوٰتُ اللّٰهِ وَ سَلَامُهٗ عَلَیْهِ کی شریعت ہے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے خبر دی کہ جس نے کفر کیا اور توبہ کے بغیر اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی تو عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ۔ یعنی تا قیامت وہ اس دائمی لعنت میں رہیں گے۔ پھر ان کا ٹھکانہ نار جہنم ہے۔ جس کے عذاب میں ان پر تخفیف نہیں ہو گی۔ اور وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ اور نہ ہی لحظہ بھر اس میں توقف یا انقطاع آئے گا۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم: 321/3   2۔ سنن ابن ماجہ: کتاب الفتن: 1334

بلکہ وہ مسلسل اور لگاتار رہے گا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ (ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں)۔ ابوالعالیہ اور قتادہ کا قول ہے کہ قیامت کے دن کافر کو کھڑا کیا جائے گا پہلے اللہ تعالیٰ اس پر لعنت فرمائے گا۔ پھر فرشتے اور پھر تمام لوگ اس پر لعنت کریں گے۔

(فصل) کفار پر لعنت کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد ائمہ قنوت وغیرہ میں کفار پر لعنت بھیجتے رہے ہیں۔ لیکن کسی معین کافر کے بارے میں علماء کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ اس پر لعنت کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس کے خاتمے کا ہمیں علم نہیں۔ بعض نے اس آیت۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا ...... الآیۃ سے جواز پر استدلال قائم کیا ہے۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ معین کافر کو بھی لعنت کرنا جائز ہے۔ فقیہ ابوبکر مالکی نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ لیکن انہوں نے جس حدیث سے دلیل پکڑی ہے۔ اس میں ضعف ہے۔ دیگر علماء نے اس واقعہ سے دلیل اخذ کی ہے کہ ایک شخص کو نشہ کی حالت میں بار بار آقا علیہ الصلاۃ والسلام کی بارگاہ میں لایا گیا۔ آپ نے اس پر حد جاری فرمائی۔ تو ایک شخص نے کہا اس پر اللہ کی لعنت ہو کتنی مرتبہ اسے لایا جاتا ہے تو حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا "اس پر لعنت نہ بھیجو وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہ رکھے تو اس پر لعنت بھیجنی جائز ہے۔"(1) واللہ اعلم۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۳﴾

"اور تمہارا خدا ایک خدا ہے۔ نہیں کوئی خدا بجز اس کے بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔"

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ: یہاں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ الوہیت کے اعتبار سے یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک ہے نہ مقابل۔ بلکہ وہی یکتا اور تنہا اور بے نیاز رب ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بہت ہی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ رحمٰن اور رحیم کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں گذر چکی ہے۔ حضرت یزید بن سکن روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیات میں ہے: وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ...... الٓمّٓ ۙ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۙ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے الوہیت میں اپنے یکتا ہونے کی دلیل ذکر کی۔ یعنی زمین و آسمان میں اپنی انواع و اقسام مخلوقات کی تخلیق کا ذکر فرمایا جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ فرمایا۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔"

1۔ الاحیاء: 322/4

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ :یعنی آسمان کی بلندی، اس کی لطافت ووسعت، اس میں سیارے اور ستارے اور اس کی گردش میں، زمین کی کثافت، اس کے نشیب وفراز، خشکی وتری، آبادی، گردش لیل ونہار یعنی دن آتا ہے پھر چلا جاتا ہے، رات آتی ہے چلی جاتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین:40)۔ ''ترجمہ: نہ سورج کی یہ مجال کہ چاند کو آ پکڑے، نہ رات کو یہ طاقت کہ دن سے آگے نکل جائے۔ (سب سیارے اپنے اپنے) فلک میں تیر رہے ہیں۔'' کبھی دن لمبا ہو جاتا ہے تو رات چھوٹی ہوتی ہے، جب رات چھوٹی ہوتی ہے تو دن لمبا ہو جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (الحج:61)۔ ''ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی داخل کرتا ہے رات (کے کچھ حصہ) کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کے (کچھ حصہ) کو رات میں''۔

وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ: یعنی سمندر کو مسخر کرنے میں وہ کشتیوں کو اٹھا کر ایک جانب سے دوسری جانب لے جاتا ہے۔ اس سے لوگوں کا کاروبار حیات چلتا ہے۔ اور اس سے لوگ دوسرے علاقے کی مصنوعات سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور اپنے علاقے کی مصنوعات ادھر لے جاتے ہیں۔

وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ :اور جو اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی اتارا پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ...... (یٰسین:33)۔ ''ترجمہ: اور ایک نشانی ان کے لئے یہ مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے نکالا اس سے غلّہ، پس وہ اس سے کھاتے ہیں اور ہم نے اگائے اس میں باغات کھجور اور انگور کے اور جاری کر دیئے اس میں چشمے''۔

وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ : اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور، جن کی شکلیں، رنگ اور افادیت مختلف ہے۔ ان میں کوئی چھوٹا ہے، کوئی بڑا۔ وہ اپنی اس تمام مخلوق سے باخبر ہے۔ ہر ایک کو رزق مہیا کرتا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا...... (ہود:6) ''ترجمہ: اور نہیں کوئی جانور زمین میں، مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو، اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو، ہر چیز روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے''۔

وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ :کبھی رحمت کی ہوا چلتی ہے اور کبھی عذاب کی آندھی۔ کبھی بادلوں سے پہلے بارش کی خوشخبری لاتی ہے۔ کبھی بادلوں کو اکٹھا کرتی ہے اور کبھی انہیں پھیر دیتی ہے۔ کبھی جنوب کی طرف سے چلتی ہے جسے شامی کہا جاتا ہے۔ اور کبھی یمن کی طرف سے چلتی ہے، کبھی بادِ صبا چلتی ہے یہ وہ مشرق کی طرف سے چلنے والی ہوا ہے جو بیت اللہ شریف کے چہرے سے ٹکرا کر آتی ہے۔ کبھی مغرب کی طرف سے چلتی ہے اسے دبور کہتے ہیں۔ لوگوں نے ہواؤں اور بارشوں کے متعلق بہت سی کتب تصنیف کی ہیں جن میں ان کے احکام ذکر کئے گئے ہیں۔

وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ: اور اس بادل میں، جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین میں لٹکا رہتا ہے۔ ان تمام چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔ یعنی یہ تمام چیزیں واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (آل عمران:190) ''ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، رات دن کے بدلتے رہنے میں کئی نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے''۔ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں: قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے آپ اپنے رب سے دعا کریں وہ صفا

پہاڑ کو سونے کا بنا دے۔ پھر ہم اس سونے سے گھوڑے اور ہتھیار خریدیں گے۔ آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کے ساتھ مل کر جہاد کریں گے۔ آپ نے فرمایا کیا یہ تمہارا پکا وعدہ ہے۔ میری دعا پر اگر اللہ تعالیٰ نے اسے سونے کا بنا دیا تو مجھ پر ایمان لے آؤ گے۔ انہوں نے کہا ہمارا وعدہ پکا ہے۔ آپ نے اپنے رب کے حضور دعا کی، حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کی اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کر لی ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ آپ پر ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ایسا عذاب نازل فرمائے گا جو اس نے آج تک کسی پر نازل نہیں فرمایا۔ یہ سن کر آپ نے عرض کی: اے باری تعالیٰ! میری قوم کو میرے سپرد کر دے۔ میں انہیں ہر روز تیرے دین کی دعوت دیتا رہوں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ایک روایت کے یہ بھی الفاظ ہیں کہ وہ صفا پہاڑ کے متعلق کیسا سوال کرتے ہیں حالانکہ وہ اس سے بڑی بڑی نشانیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں جب مدینہ طیبہ میں یہ آیت کریمہ: اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ نازل ہوئی تو کفار مکہ کہنے لگے ایک خدا تمام لوگوں کا نظام کیسے چلائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اس سے وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے وہی ہر چیز کا خالق، مالک اور معبود ہے۔ ایک روایت حضرت ابوضحیٰ سے منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ نازل ہوئی تو مشرکین نے اس پر دلیل کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

''اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مدمقابل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہیے اور جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے اور کاش! (اب) جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا (جو وہ اس وقت جانیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے (خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے اور دیکھ لیں گے عذاب کو اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات اور کہیں گے تابعداری کرنے والے کاش! ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے وہ (آج) بیزار ہو گئے ہیں ہم سے یونہی دکھائے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کے (برے) اعمال کہ باعث پشیمانی ہوں گے ان کے لیے اور وہ (کسی صورت میں) نہ نکل پائیں گے آگ (کے عذاب) سے''۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ: یہاں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دنیاوی احوال اور اخروی انجام کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری چیزوں کو اس کا شریک اور مدمقابل بنا لیا ہے۔ وہ ان کی عبادت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اس طرح محبت کرتے ہیں جس

طرح اللہ کے ساتھ محبت کرنی چاہیئے۔ حالانکہ اس کے سوا کوئی معبود حق نہیں۔ نہ ہی اس کی کوئی ضد ہے نہ کوئی مدمقابل اور نہ ہی اس کا کوئی شریک۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے اسے پیدا کیا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ: چونکہ ان کے دل محبت خداوندی، معرفت الٰہی اور اس کی تعظیم وتوقیر سے معمور ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے۔ صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اپنے تمام معاملات میں اسی کے دربار میں رجوع کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے مشرکین کو زجروتوبیخ فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَ لَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا: بعض مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ مشرکین اگر عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرلیں تو انہیں اس وقت معلوم ہو جائے کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ تمام کائنات میں اسی کا حکم نافذ ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے اور دنیا کی ہر شے اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔

وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ: اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌۙ۝ وَّ لَا یُوْثِقُ وَ ثَاقَهٗۤ اَحَدٌؕ۝ (فجر: 26-25)'' ترجمہ: پس جس دن اللہ کے عذاب کی طرح نہ کوئی عذاب دے سکے گا اور نہ ہی اس کے باندھنے کی طرح کوئی باندھ سکے گا''۔ یعنی اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کے کفر وشرک پر اللہ تعالیٰ ان کو اس طرح کا عذاب دے گا تو یہ اپنی گمراہیوں اور کارستانیوں سے باز آ جائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ بت، جن کی یہ آج پوجا کرتے ہیں، قیامت کے دن عذاب دیکھ کر ان کا انکار کر دیں گے۔ اور اس دنیا میں جس کی تابعداری کی گئی وہ اس دن اپنے تابعداروں سے بیزار ہو جائیں گے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا: فرشتے بھی ان لوگوں سے بیزاری کا اظہار کریں گے جو لوگ اپنے بزعم خویش اُن کی عبادت کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ فرشتے قیامت کے دن کہیں گے۔ تَبَرَّاْنَاۤ اِلَیْكَ٘ مَا كَانُوْۤا اِیَّانَا یَعْبُدُوْنَ (قصص:63)'' ترجمہ: ہم (ان) سے بیزار ہو کر تیری طرف توجہ کرتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کرتے تھے''۔ پھر فرشتے اللہ کی بارگاہ میں عرض کریں گے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ...... (سبا:41)'' ترجمہ: فرشتے عرض کریں گے تو پاک ہے (ہر شرک سے) ہمارا مالک تو ہے، ہمارا ان سے کیا واسطہ بلکہ یہ تو جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے''۔ اسی طرح جن بھی ان سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ...... (احقاف:5)'' ترجمہ: اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بدبخت) سے جو پکارتا ہے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کر سکتا اور وہ ان کے پکارنے سے ہی غافل ہیں۔ اور جب جمع کئے جائیں گے لوگ (روز محشر) تو وہ معبود ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔'' ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّیَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (مریم:81)'' ترجمہ: اور انہوں نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور خدا، کہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں۔ ہرگز نہیں، وہ جھوٹے خدا انکار کر دیں گے ان کی عبادت کا، اور وہ (الٹے) ان کے دشمن ہو جائیں گے''۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو ارشاد فرمایا: وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًاۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (عنکبوت:25)'' ترجمہ: اور ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ تم نے بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو باہمی محبت (اور پیار) کا باہمی ذریعہ اس دنیاوی زندگی میں۔ پھر قیامت کے دن تم انکار کرو گے ایک دوسرے کا اور پھٹکار بھیجو گے ایک دوسرے پر اور تمہارا

ٹھکانہ آتش (جہنم) ہوگا اور نہیں ہوگا تمہارا کوئی مددگار‘‘۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے دوسری بہت سی آیات میں بیان فرمایا ہے۔

وَ رَاَوُا الْعَذَابَ: جب وہ عذاب الٰہی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے تو اس روز تمام حیلے اور اس سے چھٹکارے کے تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے اور وہ آتش جہنم سے خلاصی کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں اس وقت باہمی محبت اور تعلقات ختم ہو جائیں گے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا : اور اس وقت تابعداری کرنے والے کہیں گے کاش! ہم ایک مرتبہ پھر دنیاوی زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے سوا ان معبودوں کی عبادت سے بیزاری کا اظہار کریں۔ اور ان کی طرف بالکل دھیان نہ دیں بلکہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں۔ لیکن ان کا دعویٰ سراسر جھوٹا ہے۔ اگر ان کو دنیاوی زندگی کی طرف واپس لوٹا دیا جائے تو وہ پھر کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ انہیں یہیں دکھائے گا ان کے برے اعمال جو ان کے لئے باعث پشیمانی ہوں گے اور یہ برے اعمال اس دن اکارت ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَ قَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (فرقان:23) ’’ترجمہ: اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے کاموں کی طرف اور انہیں گردوغبار بنا کر اڑا دیں گے‘‘۔ اسی طرح ارشاد فرمایا: مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ..... الخ (ابراہیم:18) ’’ترجمہ: ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ایسی ہے کہ ان کے اعمال راکھ کا ڈھیر ہیں۔ جسے تند ہوا تیزی سے اڑا کر لے گئی سخت آندھی کے دن نہ حاصل کریں گے ان اعمال سے جو انہوں نے کمائے تھے کوئی فائدہ۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہے‘‘۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کسی صورت میں آگ کے عذاب سے فرار نہ ہو سکیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

’’اے انسانو! کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے حلال (اور) پاکیزہ (چیزیں) اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں فقط برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں۔‘‘

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے معبود برحق ہونے اور خالق و مالک ہونے کا بیان کیا اور اب اپنی صفت رزاقیت کا ذکر فرماتا ہے کہ وہی تمام مخلوق کو رزق دینے والا ہے۔ اپنی مخلوق پر احسان کرتے ہوئے زمین سے پیدا ہونے والی تمام اشیاء کو مباح کر دیا۔ بشرطیکہ وہ چیز حلال، طیب اور پاک ہو۔ بدن اور عقل کے لئے نقصان دہ نہ ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو شیطان کی راہ پر چلنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ شیطان نے زمانہ جاہلیت میں اپنے پیروکاروں کو گمراہی کے ایسے گڑھے میں ڈالا جہاں وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھنے لگے۔ حدیث قدسی میں ارشاد ربانی ہے: میں نے جو مال اپنے بندوں کو عطا کیا ہے وہ ان کے لئے حلال ہے۔ میں نے اپنے بندوں کو موحد پیدا کیا مگر شیطان نے ان کو دین حنیف سے دور کر دیا۔ میری حلال کردہ چیزوں کو ان پر حرام کر دیا (1)۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس یہ آیت کریمہ تلاوت کی گئی۔ اسے سن کر حضرت سعد بن ابی وقاص کھڑے ہوئے اور عرض

1۔ مسلم، الجنۃ:3

کی یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ آپ نے فرمایا اے سعد! اپنے کھانے کو پاکیزہ اور حلال رکھو تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے، ایک لقمہ حرام جو انسان اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ جس بندے کا گوشت حرام اور سود کے مال سے پلا ہو وہ نار جہنم میں جلنے ہی کے زیادہ قابل ہے۔

اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ: بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس کا مقصد اللہ کی مخلوق کو اس سے نفرت دلانا اور اس سے ڈرانا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا (فاطر:6) ''ترجمہ: یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے۔ تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھا کرو۔ وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تا کہ وہ جہنمی بن جائیں''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا۔ اَفَتَتَّخِذُوۡنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِىۡ...... (الکہف:50) ''ترجمہ: (اے اولاد آدم) کیا تم بناتے ہو اسے اور اس کی ذریت کو اپنا دوست، مجھے چھوڑ کر۔ حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں۔ ظالموں کے لئے بہت برا بدلہ ہے''۔ حضرت قتادہ اور سدی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرنا شیطان کے قدموں پر چلنا ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ ''خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ'' سے مراد شیطان کا بہکاوا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد شیطان کی خطائیں ہیں۔ ابومجلز فرماتے ہیں اس سے مراد ایسی نذر ہے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو۔ شعبی فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنے بیٹوں کو ذبح کرنے کی نذر مانی۔ تو حضرت مسروق نے اسے اس کی جگہ مینڈھا قربان کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا یہ نذر خطوات شیطان سے ہے۔ حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نمک لگے بکری کا گوشت کھا رہے تھے۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک پیچھے ہٹ گیا۔ آپ نے فرمایا اپنے اس ساتھی کو بھی گوشت کا ٹکڑا دو۔ اس نے کہا کہ میں نہیں کھاؤں گا۔ آپ نے پوچھا کیا تم روزے سے ہو۔ کہا نہیں۔ فرمایا پھر کیا وجہ ہے تم گوشت نہیں کھاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنے اوپر بکری کا گوشت حرام کیا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ تو شیطان کی راہ پر چلنا ہے۔ گوشت کھاؤ اور اپنی قسم کا کفارہ دے دینا۔ ابورافع فرماتے ہیں کہ ایک دن میرا اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ تو وہ کہنے لگی کہ وہ ایک دن یہودیہ اور ایک دن نصرانیہ ہے۔ اور میرے سارے غلام آزاد ہیں اگر تو نے مجھے طلاق نہ دی۔ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے فرمایا یہ خطوات الشیطان میں سے ہے۔ اس کے بعد میں زینب بنت ام سلمہؓ کے پاس گیا۔ جن سے بڑھ کر اس وقت مدینہ میں کوئی فقیہ عورت نہ تھی۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ پھر حضرت عاصم کے پاس گیا تو انہوں نے بھی یہی فتویٰ دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص غصہ کی حالت میں قسم اٹھا لے۔ یہ بھی شیطان کی پیروی ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دے۔

اِنَّمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَ الۡفَحۡشَآءِ: (تمہارا دشمن شیطان) تمہیں برے افعال کا حکم دیتا ہے۔ برے افعال میں سے سب سے زیادہ سخت زنا وغیرہ ہے۔ اور اس سے بڑھ کر بغیر علم کے اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا ہے۔ ہر وہ کا فر اور بدعتی بھی اس میں داخل ہے جو برائی کا حکم دیتا ہے۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ مَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

''اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے (اللہ تعالیٰ) نے تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو۔ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو نہیں سنتے سوائے حالی پکار اور آواز کے یہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے''۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ: جب ان کافروں اور مشرکوں کو کہا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی کرو اور اپنی اس گمراہی اور جہالت کو دور کرو تو وہ جواباً کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے اباؤ اجداد کو پایا۔ یعنی بتوں کی پوجا پاٹ کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ اگرچہ ان کے یہ آباؤ اجداد جن کی یہ پیروی کرتے ہیں، بے عقل، ناسمجھ اور راہ ہدایت سے بھٹکے ہوئے ہوں۔ تب بھی ان کی پیروی کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جن کو رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی تو کہنے لگے ہم تو اپنے آباؤ اجداد کی ہی پیروی کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی مثال دی۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ (نحل:60) ''ترجمہ: ان لوگوں کے لئے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، بری مثالیں ہیں''۔ اور یہاں ارشاد فرمایا ان کافر لوگوں کی مثال ان چرنے والے جانوروں کی طرح ہے۔ جو اپنے چرواہے کی آواز کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ انہیں کیا کہہ رہا ہے۔ بلکہ وہ صرف آواز ہی سنتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں جو سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ مثال ان کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ اس قول کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ لیکن پہلا قول ہی بہتر ہے کیونکہ بت قوت سماعت، بصارت اور عقل سے عاری ہوتے ہیں۔ نہ تو وہ کسی چیز کی گرفت کر سکتے ہیں اور نہ ان میں زندگی ہوتی ہے۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ: کفار کی یہ جماعت حق بات سننے سے بہری، حق کہنے سے گونگی ہے۔ اور صراط مستقیم پر چلنے سے اندھی ہے۔ ان میں کسی چیز کو سمجھنے کے لیے عقل ہے نہ شعور۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ (الانعام:39) ''ترجمہ: اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو، وہ بہرے اور گونگے ہیں، اندھیروں میں سرگرداں ہیں''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۷۳﴾

''اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر ادا کیا کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو۔ اس نے حرام کیا ہے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔ بیشک اللہ بہت گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ پاکیزہ چیزیں کھائیں اور اللہ کی نعمت کا شکریہ بھی ادا کریں۔ رزق حلال دعا اور عبادت کی مقبولیت کا سبب ہے۔ اس طرح رزق حرام دعا و عبادت کی عدم قبولیت کا باعث ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے

مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی کو قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بھی وہی حکم فرمایا جو اپنے رسل کو فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ۚ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (المؤمنون: 51) ''اے میرے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ اچھے کام کرو، بے شک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں''۔ پھر مومنین کے لیے ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ پھر مثال کے طور پر ذکر فرمایا۔ ایک شخص طویل سفر پر ہے۔ اس کے بال پراگندہ، جسم غبار آلود ہے، وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا مانگتا ہے یارب! یارب! حالانکہ اس کا کھانا پینا اور پہننا سب حرام ہے۔ حرام کی خوراک سے ہی وہ پروان چڑھا۔ اس حالت میں اس کی دعا کیسے قبول ہوگی (1)۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پاکیزہ رزق کھانے کا حکم فرمایا۔ تو اس کے بعد ان چیزوں کا ذکر فرمایا جن کو اس نے اپنے بندوں پر حرام کیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ جانور ہے جو بغیر ذبح کے مر گیا ہو۔ خواہ وہ گلا گھونٹنے سے مرا ہو، یا کسی چوٹ سے یا اوپر سے نیچے گر کر، یا سینگ لگنے سے، یا درندے کے چیرنے پھاڑنے سے مرا ہو۔ جمہور علماء نے اس میں سے سمندر کے مردار کو خاص کیا ہے۔ یعنی مچھلی اگر پانی سے باہر آ کر مر بھی جائے تو اس کا کھانا حلال ہے۔ اس کی تفسیر ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ سمندر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا پانی طہور (یعنی پاک کرنے والا) اور اس کا مردار حلال ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مرفوع روایت ہے: ہمارے لیے دو مردار چیزوں اور دو خونوں کو حلال کر دیا گیا۔ دو مردار چیزوں سے مراد مچھلی اور مکڑی ہے اور دو خونوں سے مراد کلیجی اور تلی ہے۔ اس کی وضاحت ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

مسئلہ: امام شافعی کے نزدیک مردار جانور کا گوشت اور انڈے ناپاک ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ اس کا جزو ہیں امام مالک سے ایک روایت مطابق منقول ہے کہ وہ پاک ہیں لیکن ناپاک کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو جاتے ہیں اسی طرح مردار جانور کی پنیر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ مشہور یہی ہے کہ یہ ناپاک ہے۔ لیکن ان کو یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ صحابہ اہل مجوس کا پنیر کھا لیا کرتے تھے۔ امام قرطبی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ بہت سے دودھ میں اگر تھوڑا سا پنیر بھی مل جائے تو وہ دودھ پاک ہی رہے گا۔ جیسا کہ قلیل نجاست اگر کثیر مائع میں مل جائے تو وہ پاک ہی رہتا ہے۔ حضرت ابوعثمان نہدی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دودھ، گھی، پنیر اور جنگلی گدھا کے بارے میں سوال کیا گیا آپ نے فرمایا جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جس کو حرام کہا ہے وہ حرام ہے۔ اور جس کا بیان نہیں فرمایا وہ معاف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خنزیر کو بھی حرام کیا ہے۔ خواہ اسے ذبح کیا گیا ہو یا ویسے ہی مر جائے۔ خنزیر کی چربی بھی اس کے گوشت کے حکم میں داخل ہے۔ اس لیے کہ چربی گوشت کے ساتھ ہوتی ہے۔ یا پھر چربی کو گوشت پر قیاس کیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو بھی حرام قرار دیا ہے جن کو ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے بتوں کے نام سے جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے اپنی گڑیا کی شادی کے لیے اونٹ ذبح کیا تو حسن بصریؒ نے فرمایا یہ گوشت نہ کھایا جائے کیونکہ یہ اس بت کے لیے ذبح کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ یہ لوگ اپنے تہواروں کے موقع پر اپنے جانور ذبح کرتے ہیں اور مسلمان کو بھی ہدیہ گوشت بھیجتے ہیں۔ فرمایا جو اس دن کی تعظیم کے لیے جانور ذبح کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ۔ ہاں ان کے درختوں کے پھل کھا سکتے ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ضرورت اور حاجت کے وقت جب کہ کھانے کے لیے کوئی چیز نہ ملے اور جان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، حرام چیزوں کے کھانے کو مباح فرمایا۔ ارشاد فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ: یعنی وہ باغی، سرکش اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو۔ اس کے لیے ان چیزوں کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت ہی گناہ بخشنے والا اور

1۔ مسند امام احمد: 328/2

ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں: "غیر باغ ولا عاد" میں باغ اور عاد سے مراد ڈاکو، امام وقت کا مخالف، اور اللہ کی معصیت کے لیے نکلنے والا۔ ان کے لیے مجبوری کی حالت میں بھی کوئی رخصت نہیں۔ مقاتل بن حیان فرماتے ہیں: غیر باغ سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے حلال سمجھنے والا نہ ہو۔ سدی فرماتے ہیں کہ وہ اس میں لذت اور مزے کا خواہش مند نہ ہو۔ عطا خراسانی فرماتے ہیں وہ مردار بھون کر اور لذیذ بنا کر نہ کھائے۔ بلکہ اپنی جان بچانے کی خاطر ویسے ہی کھالے۔ اور اگر سفر میں ہے تو اپنے پاس اتنا ہی مردار کا گوشت رکھے جس قدر ضرورت ہو اور حلال چیز تک پہنچ سکے۔ اور جب اسے حلال چیز حاصل ہو جائے تو اسے پھینک دے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ پیٹ بھر کر نہ کھائے۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ حد سے تجاوز نہ کرے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں وہ حلال سے حرام کی طرف تجاوز نہ کرے جب تک وہ اس سے بچ سکتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں جس شخص کو مردار کھانے پر مجبور کیا گیا ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

مسئلہ: جب کوئی انسان بھوک کی وجہ سے بے بس ہو جائے اور کسی غیر کی ملکیت میں حلال چیز پائے تو اس کے لیے مردار کھانا جائز نہیں۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اگر وہ اس حالت میں کسی کی چیز کھالے کیا ضامن ہوگا یا نہیں اس میں امام مالک کے دو قول ہیں۔ حضرت عباد بن شرحبیل عنزی فرماتے ہیں کہ ایک سال ہمارے ہاں قحط پڑ گیا۔ میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا۔ یہاں ایک کھیت سے کچھ بالیں لے کر چبانے لگا اور کچھ تھوڑی سی بالیں اپنی چادر میں ڈال لیں۔ اسی دوران کھیت کا مالک آ گیا۔ اس نے مجھے خوب مارا اور میری چادر چھین لی۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سامنے یہ سارا واقعہ بیان کیا آپ نے اس شخص کو فرمایا کہ یہ بیچارہ بھوکا تھا نہ تم نے اسے کھانا کھلایا اور نہ ہی اس کی نادانی سے اسے آگاہ کیا۔ پھر آپ نے اسے چادر واپس کرنے کا حکم دیا اور فرمایا اسے ایک وسق یا نصف اناج دے دو (1)۔ رسول اللہ ﷺ سے درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا اگر کوئی ضرورت ہو تو اسے وہیں کھالے، ساتھ لے کر نہ جائے۔ حضرت مقاتل بن حیان فرماتے ہیں کہ اگر کوئی انسان کسی مجبوری کی حالت میں ان کو کھالے تو کوئی گناہ نہیں لیکن اسے تین لقموں سے زیادہ نہیں کھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمانے والا ہے۔ اور وہ بڑا مہربان ہے جس نے اس اضطراری حالت میں حرام کو حلال کر دیا۔ حضرت مسروق فرماتے ہیں جو شخص اضطراری حالت میں حرام چیز نہ کھائے اور مر جائے وہ جہنم میں داخل ہو گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایسی حالت میں حرام چیز کھانا عزیمت ہے نہ کہ رخصت۔ امام کیا ھراسی فرماتے ہیں کہ یہی ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ جیسا کہ بیمار شخص کا روزہ توڑنا اس کے لیے عزیمت ہے نہ کہ رخصت۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾

"بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ سو وہ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور نہ (ان کے گناہ بخش

1۔ القرطبی 226/2

کر) انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے عوض اور عذاب کو نجات کے بدلے (تعجب ہے) کس چیز نے انتا صابر بنا دیا ہے انہیں آگ (کے عذاب) پر یہ سزا اس وجہ سے ہوگی کہ اللہ نے تو اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بیشک جو لوگ اختلاف ڈال رہے ہیں کتاب میں وہ دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہیں''۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ: یہ آیت کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ حضور ﷺ کی ان صفات و کمالات کو چھپاتے تھے جن کا ذکر قرآن پاک میں ہوا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کی وجہ سے انہیں اپنی سرداری کے ختم ہونے کا خوف تھا اس لیے وہ یہ حرکت کرتے تھے۔ اسی طرح انہیں ان تحائف کے ختم ہونے کا بھی خدشہ تھا جو وہ عربوں کے آباؤ اجداد کی تعظیم و تکریم کرتے ہوئے وصول کیا کرتے۔ انہوں نے سوچا اگر انہوں نے رسول اللہ کی صفات و کمالات کو ظاہر کر دیا تو لوگ ان کی اقتداء کرنے لگیں گے ان کا کاروبار ماند پڑ جائے گا۔ اس طرح انہوں نے معمولی سی دنیاوی منفعت کی خاطر اللہ تعالیٰ کے رسول کی اتباع اور تصدیق سے اعراض کیا۔ اور اس انحراف کے سبب دنیا و آخرت میں اپنی تباہی و بربادی کا سودا کیا۔ دنیا میں تباہی تو یہ ہوئی کہ حضور ﷺ کی جن صفات و کمالات کو یہ چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ساتھ ایسے واضح اور روشن معجزات اور نشانیاں ظاہر فرمائیں جنہیں دیکھ کر دوسرے لوگ ایمان لے آئے اور یہی لوگ یہود کے خلاف رسول اللہ ﷺ کے مددومعاون بنے۔ اس طرح یہ یہود دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے اور آخرت میں آتش جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر قرآن پاک میں ان کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ جیسا کہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، بے شک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلہ میں دنیاوی مال و متاع حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں کھارہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے۔ یعنی حق کو چھپانے کی وجہ سے جو مال انہیں حاصل ہو رہا ہے وہ قیامت کے دن دھکتی ہوئی آگ بن جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًاؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا (النساء:10)'' ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے وہ تو بس کھارہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ اور وہ عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی ہوئی آگ میں''۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ کو بھرتا ہے۔

وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کلام نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس کے محبوب ﷺ کی صفات کو چھپاتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کے مستحق ہوں گے۔ وہ نہ تو ان کی طرف نظر رحمت فرمائے گا اور نہ ہی ان کی مدح اور تعریف کرے گا۔ بلکہ ان کو دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں سے نہ کلام فرمائے گا اور نہ ہی ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا۔ (1) بوڑھا زانی (2) جھوٹا بادشاہ (3) متکبر فقیر۔

اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى: یہی وہ بدنصیب ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی خرید لی۔ یہاں ہدایت سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی کتب میں بیان کردہ حضور ﷺ کی صفات کو ظاہر کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی بشارت کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے اور خود بھی ان پر ایمان لے آتے۔ لیکن انہوں نے اس کے بدلہ میں گمراہی کو اختیار کیا یعنی رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی اور آپ پر ایمان لانے سے انکار کیا اور اپنی کتب میں موجود آپ کی صفات کو چھپایا اور مغفرت کے بدلہ میں عذاب کو اختیار کیا۔ یعنی ایسے افعال کا ارتکاب کیا جو ان کے عذاب کا سبب بنے۔

فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ قیامت کے دن ایک ہولناک اور شدید عذاب میں مبتلا ہوں گے کہ دیکھنے والا متعجب ہوگا کہ اس دردناک اور شدید عذاب کو یہ کیسے برداشت کر رہے ہیں۔ اس کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہے ہیں جو انہیں آتش جہنم میں لے جانے کا سبب بنے گی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: وہ اس عذاب کے مستحق اس لیے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) اور دوسرے انبیاء پر کتب اس وجہ سے نازل کی تھیں تاکہ حق ثابت کیا جائے اور باطل کا ابطال کیا جائے۔ لیکن ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنالیا۔ ان کی کتاب نے تو انہیں حکم دیا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی صفات کو ظاہر کرو۔ لیکن انہوں نے مخالفت کی۔ یہ رسول معظم ﷺ تو انہیں اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ نیکی کا حکم اور برائی سے روکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی تکذیب کرتے ہیں مخالفت کرتے ہیں، آپ کا انکار کرتے ہیں۔ صفات کو چھپاتے ہیں۔ اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کی ان آیات کا استہزاء کرتے ہیں جو اس نے اپنے رسل پر نازل فرمائیں۔ اسی وجہ سے وہ اس کے عذاب کے مستحق ہوئے۔ اس لیے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ...... الخ۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

"نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوۃ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں اور کمال نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیزگار ہیں"۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ: یہ آیت کریمہ اسلام کے عمومی قواعد اور عقاید صحیحہ پر مشتمل ہے۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ فرماتے ہیں میں نے دوبارہ یہی سوال دہرایا تو آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ پھر سوال کیا تو فرمایا کہ نیکی کی محبت اور برائی سے نفرت ایمان ہے۔ لیکن یہ حدیث منقطع ہے۔ کیونکہ مجاہد کی حضرت ابوذر سے ملاقات ثابت نہیں۔ حضرت ابوذر سے کسی نے ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اسے یہ آیت طیبہ سنائی۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے آپ سے نیکی کے بارے میں سوال نہیں کیا اس پر ابوذر نے فرمایا یہی سوال ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا تو آپ نے یہی آیت کریمہ اس کو سنائی تھی۔ لیکن وہ اس جواب پر راضی نہ ہوا تو رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص نیکی سے خوش ثواب کا امیدوار ہو اور برائی سے بیزار، اور سزا سے خوفزدہ ہو تو وہ مومن ہے۔ یہ روایت بھی

منقطع ہے۔اس آیت مبارکہ کی تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے مسلمانوں کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمایا اور پھر بعد میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔اور یہ حکم بعض اہل کتاب اور مسلمانوں پر شاق گزرا۔تو اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت بیان کی کہ اصل مقصد اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم کی بجا آوری کرنا ہے۔جس سمت منہ کرنے کا حکم دے اس سمت منہ کرنا اور اس کے احکام کی پیروی کرنا، یہی حقیقی نیکی، تقویٰ اور ایمان کامل ہے۔ صرف مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنے میں کوئی نیکی اور اطاعت نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اس کا حکم نہ دے، اس لئے ارشاد فرمایا۔لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ......اسی طرح قربانی کے جانور کے بارے میں ارشاد فرمایا: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ......(الحج:37)" ترجمہ: نہیں پہنچتے اللہ تک ان کے گوشت اور نہ ان کے خون، البتہ پہنچتا ہے اس کے حضور تقویٰ تمہاری طرف سے"۔حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ نماز پڑھنا نیکی نہیں۔جب تک دوسرے اعمال سرانجام نہ دو۔یہ حکم ہجرت مدینہ سے پہلے کا ہے۔جب کہ مسلمان مکہ میں تھے۔ہجرت مدینہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرائض اور حدود نازل فرمائیں اور مسلمانوں کو ادائیگی فرائض اور دوسرے نیک اعمال کا حکم دیا۔ ضحاک اور مقاتل سے بھی یہی مروی ہے۔ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ یہود مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور نصرانی مشرق کی طرف۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔یعنی تمام عقائد کی بنیاد ایمان ہے اور ایمان کی حقیقت عمل۔یہ حسن بصری اور ربیع بن انس سے بھی مروی ہے، مجاہد فرماتے ہیں نیکی یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی محبت دل میں پیدا ہو جائے۔ضحاک فرماتے ہیں کہ نیکی اور تقویٰ یہ ہیں کہ فرائض کو پابندی کے ساتھ ادا کیا جائے حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں نیکی کی جملہ اقسام کو بیان کر دیا گیا ہے۔آپ کا یہ ارشاد حق ہے۔کیونکہ جس شخص نے اپنے آپ کو اس آیت میں مذکور اوصاف سے متصف کر لیا وہ کامل طور پر دین اسلام میں داخل ہو گیا۔ اور اس نے مکمل بھلائی کو سمیٹ لیا۔اس میں سب سے پہلی چیز اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے پر ایمان لانا ہے اور پھر فرشتوں کے وجود کو تسلیم کرنا ہے۔جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسل کے درمیان پیغام رسانی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔اور اس کے بعد تمام آسمانی کتب کو برحق جاننا ہے۔اور ان میں سب سے آخری کتاب قرآن حکیم جو اپنے سے ماقبل کتب سماوی کی تصدیق کرنے والا اور دنیا وآخرت کی سعادتوں کا جامع اور ان کتب سابقہ کا ناسخ ہے، پر ایمان لانا ضروری ہے۔اور تمام انبیاء پر ایمان لانا جن کی ابتداء حضرت آدم سے اور انتہاء حضرت محمد مصطفیٰ کی ذات پر ہوئی۔

وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ : مال کی محبت کے باوجود اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے۔حضرت ابوہریرہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ سب سے افضل صدقہ یہ ہے کہ وہ اس حال میں صدقہ کرے کہ وہ صحت مند، غناء کا حریص اور فقر سے ڈرنے والا ہو (1)۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے اس مضمون کی ایک حدیث مروی ہے جسے حاکم نے اپنی مستدرک میں ذکر کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ......(الدہر:8-9)" اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو، اور کہتے ہیں ہم تمہیں کھلاتے ہیں اللہ کی رضا کے لئے، نہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ کے"۔ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران:92)" ہرگز نہ پاسکو گے تم کامل نیکی (کا مرتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو"۔ اسی طرح اور ارشاد فرمایا: وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر:9)" ترجمہ: ترجیح دیتے ہیں انہیں اپنے آپ پر اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو"۔ یہ مقام سب سے ارفع واعلیٰ ہے کیونکہ یہ لوگ شدید ضرورت کے باوجود دوسرے لوگوں کو اپنی

1۔ مسلم، کتاب الزکاۃ:716

ذات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور جن لوگوں کا ان سے پہلے ذکر کیا وہ بھی دوسروں کو عطا کرتے ہیں لیکن وہ خود محتاج نہیں ہوتے۔ پھر مال سے محبت ہونے کے باجود دوسروں کو دے دیتے ہیں۔

ذَوِي الْقُرْبٰى: اس سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں۔ صدقہ وخیرات کرتے وقت ان لوگوں کو مقدم رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ فقراء ومساکین پر صدقہ کرنے سے ایک ثواب ملتا ہے اور رشتے داروں پر صدقہ کرنے سے دوگنا ثواب ملتا ہے۔ ایک صدقہ کرنے کا اور، دوسرا صلہ رحمی کا۔ یہی لوگ تمہاری بخشش اور عطاء کے زیادہ مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر ان کے ساتھ احسان کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

وَ الْيَتٰمٰى: اس سے مراد وہ چھوٹے بچے ہیں جن کے والد فوت ہو چکے ہوں۔ نہ تو ان کی کمائی کا ذریعہ ہو اور نہ ہی وہ خود کمائی کر سکتے ہوں۔ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا بلوغت کے بعد یتیمی ختم ہو جاتی ہے۔ وَ الْمَسٰكِيْنَ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس اتنا مال نہ ہو جو ان کی خوراک، پوشاک اور رہائش کے لیے کفایت کرے۔ انہیں بھی کچھ مال دے دیا جائے تا کہ ان کی بھی کچھ حاجت پوری ہو سکے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا، مسکین وہ نہیں جو مانگتے پھرتے ہیں۔ اور ایک یا دو کھجوریں یا ایک دو لقمے لے کر چلے جاتے ہیں۔ بلکہ مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اس کے لیے کفایت کرے گا۔ اور ان کی ایسی حالت بھی نہ ہو لوگ انہیں مسکین سمجھ کر صدقہ کریں۔

وَ ابْنَ السَّبِيْلِ: اس سے مراد وہ مسافر ہے جس کا دوران سفر خرچ ختم ہو جائے اسے بھی اتنا مال دے دیا جائے تا کہ وہ اپنے گھر پہنچ سکے۔ اس طرح وہ شخص جو اطاعت خداوندی میں سفر کر رہا ہے اسے بھی آنے جانے کا خرچ دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ مہمان بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔ یہی قول مجاہد سعید بن جبیر اور حسن بصری سے مروی ہے۔

وَ السَّآىِٕلِيْنَ: وہ لوگ جو مانگتے پھرتے ہیں۔ اور لوگ انہیں صدقہ وخیرات وغیرہ دیتے ہیں۔ حضرت حسین بن علی روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ سائل کے لیے حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے (1)۔

وَ فِي الرِّقَابِ: اس سے مراد وہ مکاتب غلام ہیں جو بدل کتابت ادا نہ کر سکتے ہوں۔ ان کی تفصیل سورۂ برأت کی تفسیر میں ذکر کی جائے گی۔ حضرت فاطمہ بنت قیس فرماتی ہیں کہ میں نے رسول ﷺ سے عرض کی۔ کیا ہمارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ اللہ کا حق ہے۔ تو آپ نے ''وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ''والی آیت سنائی۔ لیکن اس حدیث کے ایک راوی ابوحمزہ میمون اعور ضعیف ہے۔

وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ: کہ نماز کو اس کے اوقات میں اس کے جملہ ارکان رکوع، سجود کو اطمینان اور خشوع وخضوع سے ادا کرے۔

وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ: اس سے مراد نفس کی زکوٰۃ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو عادات رذیلہ اور اطوار قبیحہ سے پاک کرے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۞ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس 9-10) ''ترجمہ: یقیناً فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرعون کو یہی کہا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى (النازعات: 18) ''پس (اس سے) دریافت کرو کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے''۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (حم السجدہ 6-7) ''اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لیے۔ جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں''۔ سعید بن جبیر اور مقاتل بن حیان

1۔ مسند امام احمد، 1/201

فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مال کی زکوٰۃ ہے۔ اگر اس سے مراد مال کی زکوٰۃ ہو تو پھر باقی اصناف کو نفلی صدقات پر محمول کیا جائے گا۔ جیسا کہ پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں اللہ کا حق ہے۔

وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ: اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ (الرعد:20) ''ترجمہ: وہ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو اور نہیں توڑتے پختہ وعدہ کو''۔ وعدہ توڑنا منافقت کی نشانی ہے جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔ منافق کی پہچان کی تین علامات ہیں۔ 1۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، 2۔ وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے 3۔ اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو دھوکہ دے اور جب لڑائی جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ: باساء سے مراد حالت فقر ہے اور ضراء سے مراد حالت مرض۔ اور حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ سے مراد دشمن کے ساتھ مقابلہ کی حالت ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابو العالیہ، مرہ ہمدانی، مجاہد، سعید بن جبیر اور دوسرے مفسرین سے بھی یہی منقول ہے۔ یہاں صابرین، کو نصب مدح کے طور پر دی گئی ہے اور سختی اور مصیبت کی حالت میں صبر کرنے کی ترغیب دینے کے لئے ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ: یہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہیں، یہی اپنے ایمان میں سچے ہیں کیونکہ انہوں نے ایمان قلبی کی تصدیق اپنے اقوال و افعال سے کی ہے۔ یہی لوگ اللہ سے ڈرنے والے متقی پرہیزگار ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ کی معصیت سے بچتے ہیں اور اس کی اطاعت پر کاربند رہتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اے ایمان والو! فرض کیا گیا ہے تم پر قصاص جو (ناحق) مارے جائیں۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پس جس کو معاف کی جائے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز تو چاہیے کہ طلب کرے (مقتول کا وارث) خون بہا دستور کے مطابق اور (قاتل کو چاہیے) کہ اسے ادا کرے اچھی طرح۔ یہ رعایت ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے تو جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم (قتل کرنے سے) پرہیز کرنے لگو''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے مومنو! قصاص لینے میں تم پر عدل فرض کیا گیا ہے۔ آزاد کو آزاد کے بدلہ میں، غلام کو غلام کے بدلہ میں، اور عورت کو عورت کے بدلہ میں قتل کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے تجاوز نہ کرو۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے

تجاوز کیا۔ اور تجاوز کر کے اللہ کے حکم کو تبدیل کر دیا۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بنوقریظہ اور بنونضیر کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس میں بنونضیر بنوقریظہ پر غالب آ گئے۔ اب انہوں نے یہ ضابطہ بنالیا کہ اگر بنونضیر کا کوئی شخص کسی قرظی کو قتل کر دے اس کے بدلہ میں اسے قتل نہ کیا جاتا بلکہ ایک سو وسق کھجور دیت کے طور پر دی جاتی۔ لیکن اگر کوئی قرظی نضری کو قتل کر دیتا تو اس کے بدلہ میں اس کو قتل کر دیتے۔ اگر دیت لیتے تو اس سے دگنی دیت وصول کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرما کر زمانہ جاہلیت کے اس ضابطے کو مٹادیا اور قصاص میں عدل وانصاف سے کام لینے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اس کے حکم کی مخالفت کرنے والوں اور اس کے احکام میں تحریف کرنے والوں کی پیروی نہ کرو۔ حضرت سعید بن جبیر اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں جب قتل عمد ہو تو آزاد کو آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے دو قبائل کے درمیان جنگ ہوئی۔ جس میں بہت سے غلام اور عورتیں بھی قتل ہو گئیں۔ پھر یہ مسلمان ہو گئے۔ ان میں سے ایک قبیلہ نے دوسرے قبیلہ کے ساتھ زیادتی کی۔ انہوں نے قسم اٹھالی جب تک ہم اپنے غلام کے بدلے ان کے آزاد اور عورت کے بدلہ میں ان کے مرد قتل نہ کر دیں ہم راضی نہیں ہوں گے اور نہ صلح کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ پھر اس آیت کریمہ کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ...... (مائدہ:45) سے منسوخ ہو گیا۔ یعنی ہر قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا خواہ آزاد نے کسی غلام کو قتل کیا ہو یا غلام نے آزاد کو۔ اسی طرح خواہ مرد نے کسی عورت کو قتل کا ہو یا عورت نے مرد کو۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت کے لوگ مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل نہیں کرتے تھے۔ وہ مرد کو مرد کے بدلہ میں اور عورت کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ۔ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ...... فرمائی۔ اور قتل عمد میں تمام آزاد لوگوں کو برابر قرار دے دیا گیا۔ یعنی جان کے بدلہ میں جان لی جائے خواہ قاتل مرد ہو یا عورت۔ اسی طرح مقتول خواہ مرد ہو یا عورت۔ یہی حکم غلام اور لونڈیوں کا ہو گا۔ اگر کسی نے دوسرے کا کوئی عضو زخمی کر دیا تو اس میں مرد اور عورت کا حکم برابر ہو گا۔ ابو مالک بھی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ...... سے منسوخ ہے۔

مسئلہ: حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ ان کی دلیل سورۂ مائدہ کی آیت کا عموم ہے۔ یہی مذہب امام ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور داؤ ظاہری کا ہے۔ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی یہی مروی ہے۔ سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی، قتادہ اور حکم سے بھی یہی منقول ہے۔ امام بخاری، علی بن مدینی، ابراہیم نخعی اور ایک روایت کے مطابق ثوری سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے کہ آقا کو غلام کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ حضرت سمرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اس کے بدلہ میں اسے قتل کریں گے جس نے اپنے غلام کا ناک کاٹا اس کا ناک کاٹیں گے، اور جس نے اپنے غلام کو خصی کیا تو اسے خصی کر دیا جائے گا۔ اس کے برعکس جمہور علماء فرماتے ہیں کہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں نہیں قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ غلام ایک مال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر غلام خطأً قتل ہو جائے تو اس میں دیت واجب نہیں ہوتی بلکہ اس کی قیمت واجب ہوتی ہے۔ اور اسی طرح اس کے ہاتھ، پاؤں وغیرہ میں قصاص نہیں ہوتا۔ پھر اسے قتل کرنے میں بدرجہ اولیٰ قصاص نہیں ہونا چاہئے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ حضرت علی سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہ کرو(1)۔ اس حدیث کے خلاف کوئی دوسری صحیح حدیث نہیں اور نہ ہی اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے، مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔ اور ان کی دلیل سورۂ مائدہ کی آیت ہے۔

1۔ صحیح البخاری، 4/84

مسئلہ: حضرت حسن بصری اور عطاء فرماتے ہیں کہ مرد کو عورت کے بدلہ میں نہیں قتل کیا جائے گا اور ان کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے۔ لیکن جمہور علماء اس سے اختلاف کرتے ہیں اور ان کی دلیل سورۂ مائدہ کی آیت ہے۔ جس میں نفس بالنفس کا حکم ہے۔ اور دوسری دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔ حضرت لیث فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو قتل کردے تو اس کے بدلہ میں اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ: ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کا مذہب ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے مل کر ایک شخص کو قتل کر دیا تو اس کے قصاص میں ان سب کو قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں ایک شخص کو سات افراد نے مل کر قتل کیا تو آپ نے ان سب کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اگر تمام اہل صنعاء اس کے قتل میں شریک ہوتے تو ان سب کو قتل کرنے کا حکم دیتا۔ اس مسئلہ میں کسی صحابی نے آپ کی مخالفت نہیں کی۔ گویا اس پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہوا۔ حضرت امام احمد بن حنبل سے ایک روایت ہے کہ ایک شخص کے بدلہ میں ایک شخص ہی قتل کیا جائے گا۔ ابن منذر نے حضرت معاذ بن جبل، عبداللہ بن زبیر، عبدالملک بن مروان، زہری، ابن سلیم اور حبیب بن ابی ثابت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہی زیادہ صحیح ہے۔ اور ایک شخص کے بدلہ میں پوری جماعت کو قتل کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے بھی یہی ثابت ہے۔ اس طرح صحابہ کرام میں اس مسئلہ میں اختلاف ہو گیا۔ سو یہ مسئلہ محل نظر ہو گیا۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عفو سے مراد یہ ہے کہ قتل عمد میں دیت لے لی جائے قصاص نہ لیا جائے۔ یہی ابوالعالیہ، ابوشعلہ، مجاہد اور سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے۔ ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کا معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ قصاص واجب ہونے کے بعد دیت لے لے قصاص معاف کردے۔

فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی جب مقتول کے وارث دیت لینے پر راضی ہو جائیں تو انہیں عام دستور کے مطابق دیت کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ اور قاتل کو بھی چاہئے کہ وہ بغیر کسی کمی کے دیت ادا کردے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قاتل کو چاہئے کہ وہ دیت اچھے طریقہ سے ادا کرے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام مالک اور امام احمد کا مذہب ہے کہ مقتول کے اولیاء کو قصاص چھوڑ کر دیت پر راضی ہونا اس وقت جائز ہے جب قاتل بھی اس پر راضی ہو۔ لیکن بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس میں قاتل کی رضامندی ضروری نہیں۔

مسئلہ: بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر عورتیں قصاص چھوڑ کر دیت لینا چاہیں تو ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ حضرت حسن بصری، قتادہ، زہری، شبرمہ، لیث اور اوزاعی وغیرہم سے مروی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عورتوں کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ: یعنی قتل عمد میں قصاص کے بدلہ میں دیت لے لینا یہ امت مسلمہ پر اللہ کی تخفیف اور رحمت ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے امتوں کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل پر قصاص فرض تھا۔ انہیں معاف کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے یہ تخفیف فرما دی۔ قتل عمد میں عفو سے مراد یہ ہے کہ قصاص کے بدلہ دیت لے لی جائے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ اس امت پر اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے اس پر دیت کے مال کو حلال کر دیا اور اس سے پہلی امتوں پر یہ حلال نہیں تھا۔ اہل تورات کو یہ حکم تھا کہ وہ قصاص لیں یا معاف کر دیں لیکن دیت لینے کا حکم نہیں تھا۔ اور اہل انجیل کو معاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دے دیا قصاص لینے، معاف کرنے اور دیت لینے میں۔ یہ سعید بن جبیر، مقاتل بن حیان اور ربیع بن انس

سے بھی مروی ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو شخص دیت لینے کے بعد قاتل کو قتل کرتا ہے اس کے لیے سخت دردناک عذاب ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس اور دوسرے مفسرین سے مروی ہے۔ ابوشریح خزاعی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا کوئی عزیز قتل یا زخمی ہو جائے تو اسے تین چیزوں میں سے ایک کا اختیار ہے۔ چاہے قصاص لے لے، چاہے معاف کر دے اور چاہے تو دیت لے لے۔ اس کے علاوہ اگر وہ کچھ اور کرنا چاہے تو اسے پکڑ لو اور روک دو۔ اور جو شخص ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے بعد حد سے تجاوز کرے گا تو وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جائے گا۔ حضرت سمرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دیت وصول کرنے کے باوجود قاتل کو قتل کر دیا تو اب میں اس کی دیت قبول نہیں کروں گا بلکہ اسے قتل کرنے کا حکم دوں گا۔

وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ: قصاص کا حکم نافذ کرنے میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ یعنی قاتل کو قتل کرنے میں ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے اور وہ حکمت نسل انسانی کی بقاء اور اس کی حفاظت ہے۔ کیونکہ جب قاتل کو یقین ہوگا کہ اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا تو وہ اپنے اس فعل سے پہلے کئی بار سوچے گا۔ اس طرح اس قصاص میں زندگی ہے۔ پہلی کتابوں میں اس مفہوم کو اس عبارت اَلْقَتْلُ اَنْفَعُ لِلْقَتْلِ۔ سے ادا کیا گیا ہے۔ لیکن اس مقابلہ میں قرآن حکیم کی یہ عبارت وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ اس عبارت سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قصاص کو زندگی قرار دیا ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ کسی دوسرے کو قتل کرنا چاہتے ہیں لیکن قصاص کے خوف سے اس فعل کا ارتکاب نہیں کرتے۔

يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے اصحاب عقل و دانش! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، تقویٰ، ہر قسم کی نیکی کرنے اور ہر قسم کی برائی سے رکنے کو جامع ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨٢﴾

''فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کی موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لیے اور قریبی رشتہ داروں کے لیے انصاف کے ساتھ ایسا کرنا ضروری ہے پرہیزگاروں۔ پر پھر جو بدل ڈالے اس وصیت کو سن لینے کے بعد۔ تو اس کا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور جسے اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے کسی طرف داری یا گناہ کا پس وہ صلح کرا دے ان کے درمیان تو کچھ گناہ نہیں اس پر بے شک اللہ تعالیٰ غفور (اور) رحیم ہے''۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے والدین اور قریبی رشتہ داروں کو وصیت کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اصح قول کے مطابق یہ وصیت آیت میراث نازل ہونے سے پہلے واجب تھی۔ پھر آیت میراث نے یہ حکم منسوخ کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کا بغیر وصیت کے حصہ مقرر کر دیا۔ تاکہ کسی کو وصیت کرنے والے کا احسان مند نہ ہونا پڑے۔ حضرت عمرو بن خارجہ

روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب کسی وارث کے لیے کسی قسم کی وصیت کرنا جائز نہیں(1)۔ محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس سورۂ بقرہ کی تلاوت فرما رہے تھے جب اس آیت کریمہ پر پہنچے تو آپ نے فرمایا یہ آیت منسوخ ہے۔ دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں، فرماتے ہیں کہ پہلے میت کے ترکہ سے والدین کے علاوہ صرف انہی رشتہ داروں کو حصہ ملتا جن کے لیے مرنے والا وصیت کر جاتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میراث کی آیت نازل فرما کر والدین کے حصہ کو بیان کر دیا اور دوسرے قرابتداروں کے لیے میت کے مال کے تیسرے حصہ میں وصیت کو باقی رکھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے ہی مروی ہے کہ اس آیت کریمہ کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَ الۡاَقۡرَبُوۡنَ...... (نساء:7) مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اس ترکہ سے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مقرر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور ابو موسیٰ اشعری سے بھی یہی مروی ہے کہ اس آیت کریمہ کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا ہے۔ حسن بصری، مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر اور کئی دوسرے مفسرین سے یہی منقول ہے۔ لیکن اس کے باوجود تعجب کی بات یہ ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں ابو مسلم اصفہانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ یہ آیت میراث کی تفسیر ہے۔ اور "كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ" کا معنی یہ ہے کہ تم پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ جس کا بیان اور وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے۔ يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ (نساء:11) وہ فرماتے ہیں کہ یہی اکثر مفسرین اور معتبر فقہاء کرام کا مذہب ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان وارثوں کے حق میں منسوخ ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے وراثت میں حصہ مقرر کر دیا ہے۔ جن کا حصہ وراثت میں مقرر نہیں ہے ان کے حق میں یہ منسوخ نہیں۔ اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس، حسن بصری، مسروق، طاؤس، ضحاک، مسلم بن یسار، علا بن زیاد کا مذہب ہے۔ سعید بن جبیر، ربیع بن انس، قتادہ، مقاتل بن حیان سے بھی یہی منقول ہے۔ لیکن ان حضرات کے قول کی بناء پر متاخرین فقہاء کے نزدیک اسے منسوخ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ آیت میراث نے آیت وصیت کے عموم میں داخل بعض افراد کے حکم کو ختم کیا ہے۔ کیونکہ قریبی رشتہ داروں میں بعض ایسے ہیں جن کا حصہ وراثت میں مقرر ہے۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جن کا حصہ مقرر نہیں ہے۔ آیت میراث نے ان لوگوں کے حکم کو ختم کیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہے۔ اور جن کا مقرر نہیں ان کے لئے وصیت جائز ہے۔ اور یہ قول ان لوگوں کے موافق ہے جو فرماتے ہیں کہ وصیت ابتدائے اسلام میں مستحب تھی پھر منسوخ ہوگئی۔ مگر وہ مفسرین، جو فرماتے ہیں کہ پہلے وصیت واجب تھی۔ جیسا کہ آیت کا ظاہر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، ان کے نزدیک متعین ہو جاتا ہے کہ یہ آیت کریمہ آیت میراث سے منسوخ ہے۔ جیسا کہ اکثر مفسرین اور معتبر فقہاء کا قول ہے۔ والدین اور وہ قرابتدار جن کا وراثت میں حصہ مقرر ہے، ان کے لئے وصیت کا وجوب بالاجماع منسوخ ہے۔ بلکہ اس حدیث نبوی کی رو سے ممنوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے۔ کسی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ آیت میراث کا حکم مستقل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اصحاب فروض اور عصبات کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس آیت کا حکم کلی طور پر رفع ہو گیا اور صرف وہ قریبی رشتہ دار، جن کے لئے وراثت میں کوئی حصہ مقرر نہیں ان کے لئے ثلث مال سے وصیت کرنا مستحب ہے۔ اور یہ حکم آیت وصیت سے مستثنیٰ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ کسی مسلمان، جس کے پاس وصیت کے لئے کوئی مال ہو، کے لئے مناسب نہیں کہ وہ دو راتیں بغیر وصیت لکھے گزارے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کوئی رات ایسی نہ گزری جس

1۔ احمد:1874

میں میرے پاس وصیت لکھی ہوئی نہ ہو۔ اس کے علاوہ بہت آیات واحادیث ہیں جن میں قرابتداروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث قدسی ہے: اے ابن آدم! دو چیزیں ایسی ہیں جن میں سے کسی ایک پر بھی تیرا اختیار نہیں۔ 1۔ جب میں تیری روح قبض کرتا ہوں تو تیرے مال میں سے تیرا کچھ حصہ مقرر کر دیتا ہوں تا کہ اس کے ساتھ تجھے پاک کروں۔ 2۔ تیرے اس جہاں سے رخصت ہونے کے بعد تیرے لئے میرے بندوں کی دعائیں۔

اِنْ تَرَكَ خَيْرَا: یہاں خیر سے مراد مال ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ ان میں سے بعض علماء فرماتے ہیں کہ مال خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، ہر حال میں وصیت مشروع ہے۔ جس طرح کہ وراثت ہر حال میں جاری ہوتی ہے خواہ مال کم ہو یا زیادہ۔ بعض فرماتے ہیں کہ انسان اس صورت میں وصیت کرے جب اس کے پاس بہت زیادہ مال ہو۔ اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت علی سے پوچھا گیا کہ ایک قریشی تین چار سو دینار چھوڑ کر مر گیا لیکن اس نے وصیت نہیں کی۔ آپ نے فرمایا یہ قلیل مال ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اِنْ تَرَكَ خَيْرَا''، حضرت علی ایک شخص کی عیادت کے لئے گئے اس نے پوچھا کیا میرے لئے وصیت کرنا ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ جو تھوڑا بہت مال ہے اسے اپنے بچوں کے لئے چھوڑ جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ جو ساٹھ دینار چھوڑ کر مرے اس نے خیر نہیں چھوڑا۔ یعنی اس پر وصیت کرنا لازم نہیں۔ حضرت طاؤس کا اسی دینار کے بارے میں یہی قول ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ہزار یا اس سے زیادہ دینار ہوں۔ ''مَعْرُوْفٌ'' سے مراد نرمی اور مہربانی کرنا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں، معروف سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے لئے بغیر کسی افراط وتفریط کے وصیت کرے، جس سے ورثاء کا حق متاثر نہ ہو۔ حضرت سعد بن وقاص نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے پاس بہت سا مال ہے اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا میں اپنے دو ثلث (دو تہائی) مال کی وصیت کر جاؤں۔ فرمایا، نہیں۔ عرض کی نصف مال کی۔ فرمایا، نہیں۔ عرض کی۔ ثلث مال کی، فرمایا، ہاں۔ اگر چہ یہ بھی کثیر ہے۔ پھر فرمایا اگر تم اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ کر جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں فقیر اور تنگدست چھوڑ کر جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔ کاش لوگ ایک تہائی کو چھوڑ کر صرف چوتھائی مال کی وصیت کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا ثلث بہت زیادہ ہے۔ حضرت حنظلہ بن جذیم کے دادا حنیفہ نے ایک یتیم بچے کے لئے سو اونٹوں کی وصیت کی۔ یہ بچہ ان کی نگہداشت میں تھا۔ یہ وصیت ان کی اولاد کو بڑی شاق گزری۔ انہوں نے یہ مسئلہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے ان کے دادا سے فرمایا نہیں، نہیں۔ پانچ اونٹ دے دو۔ ورنہ دس دے دو۔ اس سے زیادہ دینا چاہتے ہو تو پندرہ دے دو۔ ورنہ بیس دے دو۔ حتیٰ کہ اگر بہت دینا چاہتے ہو تو چالیس دے دو۔(1)

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ: جو شخص وصیت کرنے کے بعد اس میں تبدیلی، تحریف یا اس میں کمی بیشی کر کے اس کے حکم کو تبدیل کرے گا اس کا گناہ اسی پر ہوگا۔ وصیت کو چھپانا بھی اس میں داخل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے وصیت کرنے والے کی وفات کے بعد اس کی وصیت میں تبدیلی کی تو وصیت کرنے والے کو اس کا اجر مل جائے گا اور تبدیل کرنے والا ہی گنہگار ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ اس وصیت پر مطلع ہے جو مرنے والے نے کی اور اسے خوب جانتا ہے۔ نیز تبدیلی کرنے والوں کے احوال سے بھی آگاہ ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ: حضرت عبداللہ بن عباس، ابوالعالیہ، مجاہد، ضحاک، ربیع بن انس اور سدی فرماتے ہیں کہ جنف سے مراد خطا

1۔ مسند امام احمد، 98/5

اور غلطی ہے۔ اور یہ ہر قسم کی خطا کو شامل ہے۔ مثلاً کسی وارث کو کسی واسطہ اور وسیلہ کے ذریعے زیادہ دے دینا۔ مثلاً یہ وصیت کر جانا کہ یہ چیز فلاں کے ہاتھ اتنے میں بیچ دینا۔ یا اپنے نواسے کے لئے وصیت کر جانا تا کہ اسے زیادہ مال ملے۔ اگر اس نے یہ خطا بغیر قصد کے فطری محبت اور شفقت کی وجہ سے کی یا جان بوجھ کر اس کا ارتکاب کر کے گنہگار رہوا۔ تو وصی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس میں ردوبدل کر کے اس کو شرعی احکام کے مطابق بنا لے۔ اور مرنے والے کی وصیت کو ترک کر کے ایسا حل نکالے جس میں وصیت کرنے والے کا بھی لحاظ ہو اور شرعی حکم پر بھی عمل ہو جائے۔ اصلاح کی خاطر اس کے اس عمل کو وصیت میں تبدیلی شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے اس کا عطف ماقبل پر کیا گیا ہے۔ تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ حکم ماقبل سے مختلف ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زندگی میں ظلم کر کے صدقہ کو لوٹا دیا جائے گا۔ جس طرح مرتے وقت ظالم کی وصیت کو لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ حدیث ابوبکر بن مردویہ نے روایت کی ہے۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ولید بن یزید سے خطا ہو گئی ہے۔ دراصل یہ حضرت عروہ کا کلام ہے۔ ولید بن مسلم نے اس کو اوزاعی سے بھی روایت کیا ہے۔ اور عروہ تک ہی اس کی سند پہنچتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وصیت میں ظلم اور زیادتی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اس حدیث کے مرفوع ہونے میں بھی کلام ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان ستر سال تک نیک لوگوں کے اعمال کی طرح عمل کرتا رہتا ہے اور جب وہ اپنی وصیت میں ظلم کرتا ہے اس کا خاتمہ اس برے عمل سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ نار جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک انسان ستر سال برے لوگوں کے اعمال کی طرح عمل کرتا رہتا ہے۔ پھر وہ اپنی وصیت میں عدل وانصاف کرتا ہے تو اس کا خاتمہ اس اچھے عمل سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے باعث جنت میں داخل ہو جاتا ہے حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر چاہو تو یہ یہ آیت پڑھ لو۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (بقرہ:229) ”ترجمہ: یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو“۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

”اے ایمان والو! فرض کیے گئے ہیں تم پر روزے جیسے فرض کیے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے کہ کہیں تم پرہیزگار بن جاؤ یہ گنتی کے چند روز ہیں پھر جو تم سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا اور جو خوشی سے زیادہ نیکی کرے تو وہ اس کے لیے زیادہ بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانتے ہو“۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں روزہ رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ روزہ کا معنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کی خالص نیت کے ساتھ کھانے پینے اور جماع کرنے سے رکنا ہے۔ روزہ رکھنے سے نفس انسانی اخلاق رذیلہ سے پاک ہو جاتا ہے اور جسم مختلف قسم کی بیماریوں سے تندرست ہو جاتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اسی طرح روزہ فرض کیا ہے جس طرح پہلی امتوں پر فرض کیا تھا۔ تا کہ مومنین اس فرض کی ادائیگی میں اکمل ترین طریقہ سے کوشاں رہیں۔ جیسا کہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا...... (المائدۃ:48) ''ہر ایک کے لئے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ، اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا تم (سب کو) ایک ہی امت۔ لیکن آزمانا چاہتا ہے تمہیں اس چیز میں، جو اس نے دی ہے تم کو، سو آگے بڑھنے کی کوشش کرو نیکیوں میں''۔ اس لئے یہاں ارشاد فرمایا: اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے، جیسے فرض کئے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے کہ کہیں تم پرہیزگار بن جاؤ۔ چونکہ روزہ ایک قسم کی طہارت اور پاکیزگی اور شیطانی راہ کو بند کرنے کا سبب ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اے نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کر سکتا ہے وہ نکاح کرے جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا اسے چاہئے کہ وہ روزہ رکھے۔ کیونکہ روزہ برائیوں سے رکنے کا ذریعہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے روزوں کی مقدار بیان فرمائی کہ یہ چند گنتی کے دن ہیں۔ کیونکہ اگر مسلسل لمبی مدت کے روزے فرض کر دیئے جاتے تو انسان کے لئے اس کی ادائیگی مشکل ہو جاتی۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان پہلے ہر مہینہ تین روزے رکھا کرتے تھے۔ پھر رمضان کے روزوں کی وجہ سے ان کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس کی وضاحت عنقریب آئے گی۔ حضرت معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود، اور عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ پہلے مسلمانوں پر ہر ماہ تین روزے رکھنا فرض تھے۔ جیسا کہ ان سے پہلی امتوں پر فرض تھے۔ ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے یہ روزے فرض چلے آرہے ہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں سے ان کو منسوخ کر دیا۔ حضرت قتادہ، عطاء، ضحاک وغیرہم سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ہم سے پہلی امتوں پر بھی ہماری طرح ایک مہینہ کے روزے فرض تھے۔ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد گنتی کے چند دن ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رمضان کے روزے اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ پہلی امتوں کے لئے یہ حکم تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد ان میں جب کوئی سو جاتا تو اس پر کھانا پینا آئندہ رات تک حرام ہو جاتا ہے اور عورتوں کے ساتھ مباشرت بھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں ''مِنْ قَبْلِكُمْ'' سے مراد اہل کتاب ہیں۔ حضرت شعبی، سدی اور عطا خراسانی سے بھی یہی منقول ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان روزوں کا حکم بیان فرمایا جو ابتدائے اسلام میں مسلمان رکھتے تھے۔ ارشاد فرمایا:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: یعنی مریض دوران مرض اور مسافر دوران سفر روزہ نہ رکھے۔ کیونکہ اس میں تکلیف اور مشقت ہوتی ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ روزہ چھوڑ دیں اور بعد میں قضاء کریں۔ اس کے علاوہ جو شخص مقیم ہو اور روزے کی طاقت رکھتا ہو اسے بھی پہلے اختیار تھا چاہے تو روزہ رکھے اور چاہے تو روزہ چھوڑ دے اور ہر روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اگر وہ ایک روزہ کے بدلہ میں ایک سے زیادہ مساکین کو کھانا کھلا دے تو یہ اس کے لئے بہتر ہو گا۔ اور اگر وہ کھانا کھلانے کی بجائے روزہ رکھ لے تو یہ افضل ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ مجاہد، طاؤس، مقاتل بن حیان وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں ان کے ذمہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا لازم ہے اور جو شخص خوشدلی سے نیکی کرنا چاہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور تمہارا روزہ رکھنا ہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں: نماز اور روزے میں تین قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

1۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ (بقرہ:142) ''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف، ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے

مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرا اپنے منہ اس کی طرف''۔ اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔

2۔ پہلے جب نماز کا وقت ہوتا تو صحابہ کرام نماز کے لئے ایک دوسرے کو بلاتے۔ ایک دفعہ انہوں نے ناقوس بجنے کی آواز سنی تو انہوں نے بھی ارادہ کیا کہ نماز کے وقت ناقوس بجایا کریں۔ اسی دوران ایک انصاری عبداللہ بن زیدؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی یارسول اللہ! میں نے نیم خوابی کی حالت میں ایک شخص دیکھا جو سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے قبلہ کی جانب منہ کیا اور کہنے لگا۔ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یہ کلمات اس نے دوبارہ دہرائے۔ حتیٰ کہ جب اس سے فارغ ہوا پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ یہ کلمات دہرائے۔ مگر ان میں قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ کے الفاظ دومرتبہ کہے۔ آپ نے فرمایا یہ کلمات بلال کو سکھاؤ تا کہ وہ اذان کہیں۔ چنانچہ حضرت بلال نے سب سے پہلے اذان دی۔ اسی اثناء میں حضرت عمر بھی حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! میں نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا ہے۔ لیکن ابن زید مجھ سے سبقت لے گئے۔

3۔ جب نبی کریم ﷺ نماز پڑھا رہے ہوتے تو بعد میں آنے والے صحابہ نماز پڑھنے والے کسی صحابی سے اشارہ کے ساتھ پوچھتے تو وہ انہیں بتادیتے کہ ایک یا دو رکعت ہوگئی ہیں۔ وہ پہلے یہ رکعت پڑھتے اور بعد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک ہوجاتے۔ حضرت معاذ بن جبل ایک مرتبہ آئے اور کہنے لگے میں حضور ﷺ کو جس حال میں پاؤں گا آپ کے ساتھ مل جاؤں گا۔ اور نماز کا جو حصہ باقی رہ جائے گا وہ حضور ﷺ کے سلام پھیرنے کے بعد پڑھ لوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ جب حضور ﷺ نے سلام پھیرا تو آپ کھڑے ہوکر باقی ماندہ نماز پڑھنے لگے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا معاذ نے تمہارے لئے اچھا طریقہ نکالا ہے۔ اب تم بھی اسی طرح اپنی نماز مکمل کیا کرو۔ نماز کی طرح روزہ کی بھی تین حالتیں ہیں۔

1۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے، ہر ماہ تین روزے اور یوم عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کر دیئے۔

2۔ ابتداء یہ حکم تھا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھ لے اور جو چاہے روزہ نہ رکھے بلکہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ:185) نازل فرما کر تندرست اور مقیم آدمی پر روزے کو لازم کر دیا۔ مریض اور مسافر کو روزہ چھوڑنے کی رخصت دے دی اور وہ بوڑھا شخص جو روزہ رکھنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے حکم دیا کہ ایک روزہ کے بدلہ کسی مسکین کو کھانا کھلا دے۔

3۔ پہلے صحابہ کرام کے لئے سونے سے قبل کھانا پینا، عورتوں کے ساتھ مباشرت جائز تھی۔ جب وہ سو جاتے تو ان کے لئے یہ چیزیں ممنوع ہوجاتی تھیں۔ ایک انصاری صحابی صرمہ روزہ کی حالت میں سارا دن کام کاج میں مصروف رہے، رات کو گھر آئے، عشاء کی نماز کے بعد کھائے پیئے بغیر ہی سو گئے۔ جب صبح رسول اللہ ﷺ نے ان کے چہرے پر شدید کمزوری اور نقاہت کے آثار دیکھے۔ آپ نے اس کی وجہ پوچھی تو عرض کی۔ یارسول اللہ! کل سارا دن کام میں مصروف رہا، رات کو تھکا ماندہ گھر آیا۔ کچھ کھائے پیئے بغیر سو گیا اور اسی حالت میں صبح روزہ رکھ لیا۔ حضرت عمر نے بھی سونے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ..... (بقرہ:187)'' ترجمہ: حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا.....''۔ اس حکم نے رمضان کی راتوں میں بھی کھانا پینا اور مباشرت مباح کر دی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پہلے عاشورہ کا روزہ رکھا جاتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے تو جو چاہتا رکھ لیتا اور جو چاہتا نہ رکھتا۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ: حضرت معاذ بن جبل اس کا معنی یہ بتاتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں جو شخص چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو شخص چاہتا روزہ چھوڑ دیتا۔ اور اس کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلاتا۔ حضرت سلمہ بن اکوع سے بھی یہی مروی ہے۔ ابتدائے اسلام میں بھی یہی حکم تھا کہ جب اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی۔ تو اس نے یہ حکم منسوخ کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بوڑھے جنہیں روزہ رکھنے میں مشقت ہو وہ روزہ چھوڑ دیں اور اس کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ حضرت ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ میں رمضان شریف میں حضرت عطاء کے پاس گیا۔ وہ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں اس آیت نے پہلی آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا اور اب یہ حکم صرف اس کمزور بوڑھے کے لئے خاص ہے جو روزہ کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ وہ چاہے تو روزہ نہ رکھے اور ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ حاصل کلام یہ ہے جو شخص مقیم اور تندرست ہو اس کے لئے یہ حکم نہیں۔ مگر وہ ضعیف اور کمزور بوڑھا جو روزہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ اس پر قضاء لازم نہیں۔ کیونکہ اب وہ بڑھاپے کی اس حالت کو پہنچ چکا ہے کہ اس کے لئے روزہ قضاء کرنا ممکن نہیں۔ اگر وہ بوڑھا شخص غنی ہو تو کیا اس پر ایک مسکین کو کھانا کھلانا واجب ہے۔ اس میں علماء کے دو قول ہیں۔

1۔ اس پر مسکین کو کھانا کھلانا واجب نہیں۔ کیونکہ وہ عمر کی اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس میں اس کے لئے روزہ رکھنا ممکن نہیں اس لئے اس پر فدیہ واجب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ بچے پر فدیہ واجب نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی طاقت کے مطابق احکام کا مکلف بناتا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول یہی ہے۔

2۔ اس پر فدیہ واجب ہے۔ یہی قول صحیح ہے۔ اسی کو اکثر علماء نے اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس، ابن مسعود وغیرھما سے مروی ہے۔ امام بخاری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ بوڑھا شخص جو روزے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے جیسا کہ حضرت انس نے اپنی عمر کے آخری ایک یا دو سالوں میں بڑھاپے کی وجہ سے روزہ نہ رکھا۔ وہ ہر روز روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو روٹی اور گوشت کھلاتے تھے۔ حضرت ابو تمیمہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس جب بہت بوڑھے ہو گئے تو ضعف کی وجہ سے روزے نہیں رکھتے تھے آپ گوشت اور روٹی کا ثرید تیار کروا کر تیس مساکین کو کھلا دیتے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اگر اپنے یا بچے کی جان کا خطرہ ہو تو ان کے لئے بھی روزہ چھوڑنا جائز ہے۔ اس کے بارے میں علماء کے مختلف قول ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ روزہ چھوڑ دے اور اس کا فدیہ دے دے اور بعد میں قضاء بھی کر لے۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف فدیہ ہی دے، اس پر قضاء لازم نہیں۔ بعض کہتے ہیں اس پر بغیر فدیہ کے قضا لازم ہے۔ اور کچھ علماء فرماتے ہیں کہ وہ روزہ چھوڑ دے اس پر فدیہ لازم ہے نہ قضاء۔ ہم نے اس مسئلہ کی تفصیلی بحث کتاب الصیام میں ذکر کی ہے الحمد للہ۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ٘ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

''ماہ رمضان المبارک جس میں اتارا گیا قرآن اس حال میں کہ یہ راہ حق دکھاتا ہے لوگوں کو اور (اس میں) روشن دلیلیں ہیں

ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو وہ یہ مہینہ روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لیے سہولت اور نہیں چاہتا تمہارے لیے دشواری اور (چاہتا ہے کہ) تم گنتی پوری کر لیا کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کیا کرو۔ اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تا کہ تم شکر گزاری کیا کرو''۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کی فضیلت اور عظمت بیان فرمائی ہے کہ اس ماہ مبارک کو اس نے قرآن کے نزول کے لئے منتخب فرمایا۔ حدیث نبوی ہے کہ تمام آسمانی کتب اسی ماہ مبارک میں انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں۔ حضرت واثلہ بن اسقع روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رمضان کی پہلی رات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صحائف نازل ہوئے۔ چھ کو تورات اور تیرہ کو انجیل اور چوبیس کو قرآن مجید نازل ہوا (1)۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ زبور بارہ رمضان کو انجیل اٹھارہ کو۔ تمام صحائف سماویہ، تورات، زبور، انجیل۔ انبیاء پر یکبارگی نازل ہوئی۔ لیکن قرآن بیت العزۃ سے آسمان دنیا پر یکبارگی نازل ہوا اور یہ نزول رمضان کی لیلۃ القدر میں ہوا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (قدر:1)'' ترجمہ: بے شک ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے شب قدر میں''۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان:3)'' ترجمہ: بے شک ہم نے اتارا ہے اسے بابرکت رات میں''۔ اس کے بعد قرآن کریم حسب ضرورت وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا گیا کہ قرآن پاک تو مختلف مہینوں میں نازل ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس کے نزول کو رمضان اور لیلۃ القدر کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا ہے۔ تو آپ نے یہی جواب دیا۔ قرآن پاک لیلۃ القدر، لیلہ مبارکہ میں آسمان دنیا پر یکبارگی نازل ہوا پھر اس کے بعد حسب ضرورت مختلف ایام اور مہینوں میں نازل ہوا۔ ایک روایت میں آپ فرماتے ہیں قرآن کریم رمضان کی پندرہ تاریخ کو نازل ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ حسب ضرورت اپنے نبی ﷺ پر نازل فرماتا رہا۔ جب بھی مشرکین کوئی اعتراض کرتے تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب نازل فرماتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ..... (الفرقان:32-33)'' ترجمہ: اور کہنے لگے کفار (از راہ اعتراض) کیوں نہیں اتارا گیا ان پر قرآن یکبارگی، اس طرح اس لئے کیا کہ ہم مضبوط کر دیں اس کے ساتھ آپ کے دل کو اور اسی لئے ہم نے ٹھہر ٹھہر کر اسے پڑھا ہے۔ اور نہیں پیش کریں گے آپ پر کوئی اعتراض مگر ہم لائیں گے آپ کے پاس اس کا صحیح جواب اور عمدہ تفسیر''۔

هُدًى لِّلنَّاسِ: یہ بھی قرآن پاک کی فضیلت ہے کہ جو شخص اس پر ایمان لا کر اس کی تصدیق اور اتباع کرے تو یہ اس کے لیے سراپا ہدایت ہے۔ بینات سے مراد واضح اور روشن دلائل ہیں۔ یعنی جو شخص اس میں غور و فکر کرتا ہے اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ قرآن پاک واقعی رشد و ہدایت کا منبع اور حق و باطل اور حلال و حرام کے درمیان تفریق کرنے والا ہے۔ بعض سلف صالحین سے منقول ہے کہ اس ماہ مبارک کو صرف رمضان نہیں کہنا چاہیے بلکہ شہر رمضان یعنی ماہ رمضان کہنا چاہیے حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ اسے رمضان نہ کہو کیونکہ یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ بلکہ اسے ماہ رمضان کہو۔ حضرت مجاہد اور محمد بن کعب وغیرھم سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور زید بن ثابت سے اس کے برعکس مروی ہے۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع روایت کی سند ضعیف ہے۔ امام بخاری بھی اسی کے قائل ہیں کہ اس ماہ کو رمضان کہنا چاہیے۔ انہوں نے صحیح بخاری میں اس کے بارے میں ایک باب بھی باندھا ہے۔ اور اس کے بارے میں کچھ احادیث بھی ذکر کی ہیں ان میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص رمضان کے روزے ایمان

1۔ مسند امام احمد: 107/4

اور نیکی کی نیت کے ساتھ رکھے اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ :اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب رمضان کا چاند طلوع ہو کوئی شخص اپنے گھر مقیم ہو اور تندرست بھی ہو تو اس پر روزہ رکھنا لازم ہے۔ اس آیت کریمہ نے ماقبل مذکورہ آیت سے ثابت رخصت کو منسوخ کر دیا۔ یعنی پہلے تندرست اور مقیم آدمی کے لیے رخصت تھی کہ وہ چاہے تو روزہ چھوڑ دے اور اس کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ روزوں کا بیان ختم کرنے سے پہلے مسافر اور مریض کے لیے اللہ تعالیٰ نے دوبارہ رخصت کا ذکر کیا ہے کہ وہ حالت سفر اور مرض میں روزہ چھوڑ سکتے ہیں اور بعد میں قضاء کر لیں۔ ارشاد فرمایا:

فَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ : یعنی اگر مریض کو روزہ رکھنے میں مشقت اور تکلیف ہو اور اس طرح مسافر کو حالت سفر میں روزہ چھوڑنا جائز ہے۔ اگر یہ اس حالت میں روزہ چھوڑ دیں تو بعد میں ان پر قضا لازم ہوگی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آسانی اور سہولت عطا فرماتا ہے۔ اور تمہیں مشقت میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے اس نے مریض اور مسافر کو روزہ چھوڑنے کی رخصت عطا فرمادی۔ حالانکہ تندرست اور مقیم پر روزہ فرض ہے۔ یہ رخصت تمہارے اوپر اس کا خاص فضل و احسان ہے۔

اس آیت کے متعلق چند مسائل: (1) بعض سلف صالحین کا یہ مذہب ہے کہ جو شخص ابتدائے رمضان میں مقیم تھا پھر اسے سفر پیش آ گیا تو اس کے لیے اس عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۔ یعنی صرف وہی مسافر روزہ چھوڑ سکتا ہے جو ابھی مسافر ہی تھا کہ رمضان کا چاند طلوع ہو گیا۔ لیکن یہ قول انتہائی غریب ہے۔ اس کو ابن حزم نے اپنی کتاب ''**المحلّٰی**'' میں بعض صحابہ کرام اور تابعین سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس کی یہ نقل محل نظر ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے لیے رمضان کے مہینہ میں مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ جب آپ مقام کدید پر پہنچے، آپ نے روزہ افطار کیا اور صحابہ کرام کو بھی افطار کرنے کا حکم دیا یعنی وہ دوران سفر روزہ نہ رکھیں۔ (1)

(2) بعض صحابہ کرامؓ اور تابعین کا مذہب ہے کہ دوران سفر روزہ نہ رکھنا واجب ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ لیکن جمہور علماء کا قول ہی صحیح ہے کہ سفر میں مسافر کو اختیار ہے کہ چاہے روزہ رکھے، چاہے چھوڑ دے۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم ماہ رمضان میں نبی کریم ﷺ کی معیت میں نکلتے تو بعض ہم میں سے روزہ رکھ لیتے اور بعض چھوڑ دیتے۔ لیکن ہم میں سے روزہ دار بے روزہ پر عیب نہ لگاتا اور نہ ہی بے روزہ روزہ دار پر۔ اگر دوران سفر روزہ چھوڑنا واجب ہوتا تو آپ ﷺ روزہ رکھنے والوں کو منع فرما دیتے۔ بلکہ خود نبی کریم ﷺ سے بحالت سفر روزہ رکھنا ثابت ہے۔ حضرت ابو درداء فرماتے ہیں کہ ہم رمضان المبارک میں شدید گرمی کے موسم میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ گرمی اتنی سخت تھی کہ اس سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لئے۔ رسول اللہ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ کے سوا کوئی بھی ہم سے روزہ دار نہ تھا۔

(3) بعض علماء فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس عمل کی وجہ سے دوران سفر روزہ رکھنا افضل ہے امام شافعیؒ سے بھی یہی منقول ہے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت پر عمل کرتے ہوئے دوران سفر روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے دوران سفر روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا جو روزہ نہ رکھے تو اس کا نہ رکھنا اچھا ہے۔ اور جو روزہ رکھے اس پر بھی کوئی

1۔ مسلم، کتاب الصیام: 784

گناہ نہیں۔ اور ایک روایت میں ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے چونکہ تمہیں رخصت عطا فرمائی ہے اس پر عمل کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ دوران سفر روزہ رکھنا یا نہ رکھنا دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی نے عرض کی یا رسول اللہ! میں اکثر روزہ سے رہتا ہوں۔ کیا سفر میں بھی روزہ رکھ لیا کروں۔ فرمایا چاہو تو رکھ لو، چاہو تو چھوڑ دو۔ بعض فرماتے ہیں کہ اگر روزہ سفر میں تکلیف دے تو چھوڑ دینا بہتر ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ لوگوں نے اس پر سایہ کیا ہوا ہے آپ نے پوچھا تو عرض کیا گیا کہ یہ روزے سے ہے۔ آپ نے فرمایا سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں (1) اگر کوئی شخص سنت سے اعراض کرے اور سفر میں روزہ چھوڑ نا مکروہ سمجھے اس پر روزہ رکھنا حرام ہے اسے چاہیے کہ وہ روزہ چھوڑ دے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رخصت کو قبول نہ کیا تو اس پر عرفات کے پہاڑ کے برابر گناہ ہے (2)۔

(4)۔ اگر کسی کے رمضان کے روزے قضاء ہو جائیں تو کیا رمضان کے بعد اس پر پے در پے روزے رکھنا واجب ہیں یا وہ متفرق طور پر بھی رکھ سکتا ہے؟ اس میں دو قول ہیں۔

(1) ان روزوں کو پے در پے رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ قضاء بھی ادا کی مثل ہوتی ہے۔

(2) اس پر پے در پے روزے رکھنا لازم نہیں۔ اگر چاہے تو مسلسل رکھ سکتا ہے۔ یہی جمہور علمائے خلف و سلف کا مذہب ہے۔ دلائل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ رمضان میں مسلسل روزے رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ وہ پورا مہینہ روزہ کی ادائیگی کے لیے مقرر ہے۔ رمضان کے بعد اس نے صرف گنتی کے وہی چند دن روزے رکھنے ہیں جو اس نے چھوڑے ہیں۔ ان کو وہ کسی وقت بھی رکھ سکتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اور اس کے بعد ارشاد فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین دین وہ ہے جو زیادہ آسان ہو۔ حضرت ابو عروہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے انتظار میں تھے۔ آپ کا شانہ نبوت سے باہر تشریف لائے تو آپ کے سر مبارک سے وضو یا غسل کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ آپ نے نماز پڑھائی۔ لوگ آپ سے سوال کرنے لگے کہ حضور (ﷺ) فلاں کام میں ہمارے لیے حرج تو نہیں ہے؟ آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمایا اللہ کا دین آسانی والا ہے (3)۔ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں پر دین کو آسان کر کے پیش کرو اسے مشکل نہ بناؤ۔ لوگوں کو اطمینان و سکون دلاؤ دین سے متنفر نہ کرو (4)۔ رسول ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کو یمن بھیجا تو ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ لوگوں کو نوید رحمت دینا اور دین سے متنفر نہ کرنا۔ دین کو آسان کرنا اسے مشکل نہ بنانا۔ آپس میں اتفاق سے رہنا، اختلاف نہ کرنا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے سہل اور آسانی والے دین کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔ حضرت محجن بن ادرع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ کچھ دیر غور سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا تمہارا کیا خیال ہے یہ اخلاص سے نماز پڑھ رہا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ تمام اہل مدینہ میں سب سے زیادہ نماز پڑھنے والا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ اس کو نہ بتانا کہیں وہ اس کے سبب ہلاک نہ ہو جائے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے بارے میں آسانی کا ارادہ فرمایا ہے سختی کا نہیں۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے بیماری، سفر، اور دوسرے اعذار میں رخصت عطا فرمائی ہے کیونکہ وہ تمہاری سہولت کا ارادہ فرماتے ہے۔ اور تمہیں یہ حکم فرمایا ہے کہ بعد میں ان روزوں کی قضاء کر کے ماہ رمضان کی مدت کو پورا کر لو۔

1۔ فتح الباری: 179/4 2۔ مسند احمد: عن ابن عمر: 71/2 3۔ مسند امام احمد: 69/5 4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد: 1359

وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ: یعنی اپنی عبادت کو پورا کرنے کے بعداللہ کا ذکر کیا کرو۔ جیسا کہ حج کے بارے میں ارشاد فرمایا: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (البقرۃ:200)'' ترجمہ: پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔'' نماز جمعہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ......الخ (الجمعہ:10)'' ترجمہ: اور جب پوری ہو چکے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں......'' ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ......الخ (طہ:130)'' اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور رات کے لمحوں میں......'' احادیث طیبہ سے فرض نمازوں کے بعد تسبیح وتہلیل کا استحباب ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں نماز کے بعد تکبیر سے حضور ﷺ کی نماز کے اختتام کا پتہ چل جاتا تھا۔ بہت سے علماء کرام نے اس آیت کریمہ کو دلیل بنا کر فرمایا کہ عیدالفطر میں یہ تکبیریں پڑھنی چاہئیں۔ حتیٰ کہ داؤد ظاہری کے نزدیک عید میں یہ تکبیریں پڑھنا واجب ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

'' اور جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (انکے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا دعا کرنے والے کی جب وہ دعا مانگتا ہے مجھ سے پس انہیں چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور ایمان لائیں مجھ پر تاکہ وہ کہیں ہدایت پا جائیں''۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ: ایک اعرابی نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ) کیا ہمارا رب قریب ہے کہ اس کے ساتھ سرگوشی کریں یا دور ہے کہ اس کو بلند آواز سے پکاریں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ہمارا رب کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن:60)'' ترجمہ: اور تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا''۔ نازل ہوئی۔ تو صحابہ کرام کہنے لگے کاش کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم اپنے رب کو کس وقت پکاریں تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں تھے۔ ہم جب بھی کسی ٹیلے پر چڑھتے یا کسی وادی میں اترتے تو بلند آواز سے تکبیریں کہنے لگتے۔ رسول اللہ ﷺ ہمارے قریب ہوئے اور فرمایا اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو۔ تم کسی بہرے یا غیر موجود رب کو نہیں پکار رہے بلکہ تم تو سمیع وبصیر رب کو پکار رہے ہو۔ وہ تو تمہاری سواریوں کی گردنوں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اے عبداللہ بن قیس! کیا تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ عطا نہ کر دوں۔ فرمایا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ(1)۔ حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا ہوں جیسا کہ وہ میرے متعلق خیال کرتا ہے اور جب وہ مجھے پکارے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں(2)۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور ذکر سے اس کے ہونٹ ہلتے ہیں تو میں اس کے قریب ہوتا ہوں۔ یہی مفہوم بعینہٖ ان دو آیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (النحل:128)'' ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں''۔ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى (طہ:46)'' ترجمہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر: 2076 2۔ مسند امام احمد: 210/3

: میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں ہر بات سن رہا ہوں۔ ہر چیز دیکھ رہا ہوں"۔ اس آیت کریمہ کا یہ مفہوم ہے کہ وہ کسی کی دعا کو رد نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی چیز اسے مشغول کر سکتی ہے۔ وہ اپنے بندے کی دعا کو بخوبی سنتا ہے۔ اس میں دعا کرنے کی ترغیب بھی ہے۔ اس کی بارگاہ میں کوئی دعا رائیگاں نہیں جاتی۔ حضرت سلمان فارسیؓ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات سے حیاء آتی ہے کہ اس کا بندہ اس کی بارگاہ میں اپنے ہاتھوں کو پھیلائے اور اس کو وہ خالی ہاتھ لوٹا دے۔ حضرت ابو سعید فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بھی کوئی مسلمان اللہ کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے۔ اگر اس میں کوئی گناہ والی بات اور قطع رحمی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تین چیزوں میں سے ایک ضرور عطا فرماتا ہے۔ یا تو اس کی دعا اسی وقت قبول ہو جاتی ہے، یا وہ دعا آخرت کے لیے ذخیرہ کر لی جاتی ہے یا اس کی وجہ سے کسی مصیبت کو دور کر دیا جاتا ہے۔ یہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کی پھر تو ہم بکثرت دعا کریں گے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کے خزانے بھی کثیر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن ثابت سے مروی دوسری روایت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری دعا اس وقت قبول ہوتی رہتی ہے جب تک تم جلدی نہ کرو۔ اور جلدی سے مراد یہ ہے کہ تم میں سے کوئی کہے کہ میں نے کئی دفعہ دعا مانگی ہے قبول نہیں ہوتی(1)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک وہ گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ مانگے اور جلدی نہ کرے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ (ﷺ) جلدی سے کیا مراد ہے۔ فرمایا۔ بندہ یہ کہے کہ میں نے بار بار دعا مانگی ہے وہ قبول ہی نہیں ہوتی۔ اور وہ اس طرح افسوس کرتے ہوئے دعا کرنا ہی چھوڑ دے(2)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں بندۂ مومن جب کوئی دعا مانگتا ہے تو وہ حریم قدس کی طرف پرواز کرتی ہے پھر یہ دعا یا تو قبول کر لی جاتی ہے یا آخرت کے لیے ذخیرہ کر لی جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہے جب وہ جلدی نہ کرے اور مایوس نہ ہو حضرت عروہ نے عرض کی اس جلدی اور مایوسی سے کیا مراد ہے۔ فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ کہے کہ میں نے اس کی بارگاہ میں سوال کیا تھا کچھ عطا ہی نہیں ہوا۔ دعا کی تھی قبول نہیں ہوئی۔ اسی قسم کا قول حضرت سعید بن مسیّب سے بھی مروی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دل برتنوں کی مانند ہوتے ہیں ان میں سے بعض اپنے اندر زیادہ چیز محفوظ کر لیتے ہیں۔ اے لوگو! جب تم اللہ کی بارگاہ میں سوال کرو تو اس کی قبولیت پر یقین رکھتے ہوئے کرو۔ جو بندہ غافل دل کے ساتھ دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرتا۔ حضرت نافع بن معدیکرب فرماتے ہیں کہ میں نے اور سیدہ عائشہ صدیقہ نے رسول ﷺ سے اس آیت کریمہ: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کے متعلق پوچھا تو آپ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی اے پروردگار! عائشہ کے سوال کا کیا جواب ہے۔ تو حضرت جبریل نازل ہوئے اور عرض کی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ میرا نیک بندہ جب پاکیزہ دل اور خلوص نیت سے دعا کرتا ہے اور میری بارگاہ میں کہتا ہے یا رب! تو میں اس کے جواب میں لبیک کہتا ہوں اور اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت کریمہ پڑھی۔ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ...... پھر فرمایا اے اللہ تو نے دعا کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کی قبولیت کو اپنے ذمہ کر لیا ہے۔ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ - فَرْدٌ اَحَدٌ، صَمَدٌ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ وَ اَشْهَدُ اَنَّ وَعْدَكَ حَقٌّ وَ لِقَاؤُكَ حَقٌّ وَالسَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنْتَ تَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ۔ حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ابن آدم! ایک بات خالص تیرے لیے ہے اور ایک خالص میرے لیے ہے اور ایک میرے اور تیرے درمیان مشترک ہے اور وہ بات جو میرے لیے ہے وہ یہ ہے کہ تو میری عبادت کرے اور میرے ساتھ کسی کو

1۔ مسند امام احمد:193 2۔ مسلم، کتاب الذکر:2096

شریک نہ ٹھہرائے اور تیرے لیے یہ ہے کہ تو جو کوئی عمل کرے گا میں اس کا پورا پورا اجر عطا کروں گا اور میرے اور تیرے درمیان مشترک بات یہ ہے کہ تیری طرف سے دعا ہو اور میری طرف سے قبولیت، روزہ کے احکام کے درمیان اس دعا والی آیت کریمہ کو ذکر کرنے کی حکمت سحری اور افطار کے وقت دعا کی رغبت دلانا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا افطار کے وقت روزہ دار کی دعا مقام اجابت میں ہوتی ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرو افطار کے وقت اپنے اہل وعیال کو اکٹھا کر کے دعا فرمایا کرتے تھے۔ آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ افطار کے وقت روزہ دار کی دعا رد نہیں ہوتی۔ آپ افطار کے وقت یہ دعا فرماتے" اے اللہ! میں تیری اس رحمت کے وسیلہ سے تیری بارگاہ میں سوال کرتا ہوں جو ہر چیز سے وسیع ہے کہ تو مجھے معاف فرما دے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین اشخاص کی دعا رد نہیں ہوتی: 1۔ عادل بادشاہ، 2۔ روزہ دار کی افطاری کے وقت، 3۔ مظلوم۔ اللہ تعالیٰ مظلوم کی دعا کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ مجھے میری عزت کی قسم میں تیری دعا ضرور قبول کروں گا۔ خواہ بدیر سہی۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَآئِكُمْ ۗ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷

" حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا وہ تمہارے لیے پردہ زینت وآرام ہیں اور تم ان کے لیے پردہ زینت وآرام ہو جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ اور طلب کرو جو (قسمت میں) لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے صبح کے وقت پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور نہ مباشرت کرو ان سے جب کہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں یہ اللہ کی حدیں ہیں ان (کو توڑنے) کے قریب بھی نہ جانا اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کر لیں"۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ : ابتدائے اسلام میں روزہ دار کے لیے نماز عشاء تک کھانے پینے اور جماع کی اجازت تھی۔ اسی طرح اگر کوئی نماز عشاء سے پہلے سو گیا اگرچہ وہ نماز سے پہلے بیدار بھی ہو گیا اسے اب کھانے پینے کی اجازت نہ تھی۔ صحابہ کرام کو اس میں مشقت اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں طلوع فجر تک کھانے پینے اور جماع کی اجازت دے دی۔ حضرت ابن عباسؓ اور بہت سے دوسرے مفسرین فرماتے ہیں یہاں رَفَثُ سے مراد جماع ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ : حضرات ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، حسن بصری، قتادہ، سدی اور مقاتل بن حیان فرماتے ہیں لباس سے مراد یہ

ہے کہ یہ عورتیں تمہارے لیے سکون کا باعث ہیں اور تم ان کے لیے۔ حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں یہاں سے لباس سے مراد لحاف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان انتہائی قرب ہوتا ہے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ لیٹنے کی اجازت ہے اس لیے مناسب تھا کہ ان کو رمضان کی راتوں میں جماع کی رخصت دے دی جاتی تا کہ وہ مشقت اور تکلیف سے بچ جائیں اور گناہ کے ارتکاب سے بھی محفوظ رہیں۔ اس آیت کی شان نزول کا بیان حضرت معاذ کی طویل حدیث میں گزر چکا ہے۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے اگر کوئی روزہ افطار کرنے سے پہلے سو جاتا اور افطار کے بعد بیدار ہوتا تب اسے پوری رات کھانے پینے کی اجازت نہ تھی۔ حضرت قیس بن صرمہ انصاری روزہ سے تھے سارا دن اپنے کھیتوں میں کام کرتے رہے، افطار کے وقت گھر آئے، بیوی سے پوچھا کیا کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ انہوں نے کہا کہ گھر میں تو کوئی چیز نہیں ہے لیکن میں جاتی ہوں اور آپ کے لیے کھانے کی کوئی چیز تلاش کر لاتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ اسی اثناء میں ان پر نیند کا غلبہ ہو گیا اور وہ سو گئے۔ جب کھانا لے کر واپس آئیں تو انہیں سویا ہوا دیکھ کر بہت افسردہ ہوئیں۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت بھوک کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئے۔ جب اس کا ذکر حضور ﷺ کی بارگاہ میں کیا گیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرام بہت خوش ہوئے۔ اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ صحابہ کرام پورا رمضان اپنی عورتوں سے صحبت نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان میں بعض اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان میں جب صحابہ کرام عشاء کی نماز پڑھ لیتے تو ان پر عورتیں اور کھانا پینا آئندہ رات تک حرام ہو جاتا۔ بعض صحابہ کرام نماز عشاء کے بعد کھانے پینے اور اپنی عورتوں کے ساتھ جماع کرنے کے مرتکب ہوئے۔ ان میں حضرت عمر بھی شامل تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رمضان شریف میں سونے کے بعد بیدار ہوئے اور اپنی زوجہ کے ساتھ صحبت کی۔ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی شکایت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے لیے ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی کہ اب تمہارے لیے کھانا پینا اور جماع کرنا جائز ہے۔ پس یہ عورتیں تمہارے لیے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لیے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کیا کرتے تھے۔ یعنی عشاء کے بعد کھا پی لیتے تھے اور جماع کرتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے تم پر نظر کرم فرمائی اور تمہیں معاف کر دیا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت کرو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں لکھا ہے یعنی اولاد اسے طلب کرو۔ اور کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے صبح کے وقت۔ پھر رات تک روزہ کو پورا کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے عفو و درگزر کا ایک نمونہ ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ حضرت عمر اپنے گھر تشریف لائے ان کی زوجہ لیٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان کے ساتھ صحبت کا ارادہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں تو پہلے سو گئی تھی۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ تم نہیں سوئی تھیں اور پھر ان کے ساتھ مباشرت کی اور یہی واقعہ حضرت کعب بن مالک کو بھی پیش آیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت ابوہریرہ، ابن عباس اور انس فرماتے ہیں کہ: وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ سے مراد اولاد ہے اور حضرت عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جماع ہے اور ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ اپنے عموم پر ہے۔ یعنی ان میں سے کوئی چیز بھی مراد لی جا سکتی ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا: جماع کی اجازت کے بعد یہاں اللہ تعالیٰ نے روزہ دار کو تمام رات کھانے پینے کی اجازت فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ

رات کی سیاہی ختم ہونے کے بعد فجر طلوع ہو جائے۔ یہاں رات کو سیاہ ڈورے اور صبح کو سفید ڈورے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "مِنَ الْفَجْرِ" کے لفظ سے ان کے ابہام کو دور کیا گیا ہے۔ حضرت سہل بن سعد فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو ابتداءً "مِنَ الْفَجْرِ" کے الفاظ نازل نہیں ہوئے تھے۔ بعض صحابہ کرام اپنی ٹانگ میں سفید اور سیاہ دھاگہ باندھ لیتے اور ان کو بار بار دیکھتے رہتے یہاں تک کہ وہ ان پر واضح ہو جاتے پھر اس کے بعد "مِنَ الْفَجْرِ" کے الفاظ نازل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ یہاں سفید اور سیاہ دھاگے سے مراد رات اور دن ہیں(1)۔ حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو میں نے سیاہ اور سفید دو دھاگے لیے اور ان کو اپنے سرہانے کے نیچے رکھ دیا اور انہیں بار بار دیکھتا رہا حتیٰ کہ جب سفید اور سیاہ کی تمیز ہوگئی تو میں نے روزہ بند کر دیا۔ صبح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ صورت حال بیان کی تو آپ نے فرمایا تمہارا تکیہ تو بڑا لمبا چوڑا ہے یہاں ان دھاگوں سے مراد دن رات ہیں(2)۔ آپ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ سیاہ اور سفید سے مراد دن اور رات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سرہانہ مشرق و مغرب ہے جس میں یہ دونوں دھاگے سما گئے۔ بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں "إِنَّكَ لَعَرِيضُ الْقِفَاءِ" بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ تو کند ذہن ہے۔ لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب تکیہ اتنا چوڑا ہے تو گردن بھی چوڑی ہوگی۔ چونکہ اس آیت کریمہ میں طلوع فجر تک کھانے پینے کی اجازت دی گئی ہے اس لیے اس میں سحری کے مستحب ہونے کی بھی دلیل ہے چونکہ یہ رخصت ہے اور رخصت پر عمل کرنا پسندیدہ ہوتا ہے اس لیے حضور ﷺ نے اپنے ارشادات عالیہ میں سحری کھانے پر برانگیختہ کیا۔ حضرت انس (ﷺ) سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سحری کھایا کرو اس میں برکت ہے(3)۔ حضرت عمرو بن عاص روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق سحری ہے(4)۔ حضرت ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سحری کا کھانا برکت ہے اس کو نہ چھوڑو اور اگر کچھ نہ ملے تو پانی کا گھونٹ ہی پی لو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے سحری کرنے والوں پر رحمت بھیجتے ہیں(5)۔ سحری کو طلوع فجر تک مؤخر کرنا مستحب ہے۔ حضرت انس حضرت زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی اور پھر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حضرت انس نے حضرت زید سے پوچھا کہ اذان اور سحری کے درمیان کتنا وقفہ تھا۔ فرمایا تقریباً پچاس آیات کا(6) حضرت ابوذر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت بھلائی پر رہے گی جب تک وہ افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کرتی رہے گی۔ اور ایک روایت میں آپ نے سحری کو بابرکت کھانا قرار دیا ہے۔ حضرت حذیفہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دن چڑھ گیا ہے۔ لیکن سورج ابھی طلوع نہیں ہوا۔ لیکن اس حدیث کے راوی عاصم بن ابی نجود منفرد ہیں۔ دن چڑھنے سے مراد یہ تھا کہ دن چڑھنے کے قریب تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ...... (الطلاق:2) جب وہ اپنی معیاد کے قریب پہنچ جائیں یعنی عدت ختم ہونے کے قریب۔ تو انہیں بھلائی کے ساتھ روک لو یا بھلائی کے ساتھ انہیں جدا کر دو۔ اس حدیث کو بھی اسی معنی پر محمول کیا جائے گا کہ وہ سحری کھا رہے تھے اور انہیں طلوع فجر کا یقین نہیں تھا حتیٰ کہ بعض کو طلوع فجر کا گمان ہونے لگا اور بعض کے نزدیک فجر طلوع نہیں ہوئی۔ اکثر صحابہ کرام اور تابعین سے یہی معمول مروی ہے کہ وہ طلوع فجر کے قریب تک سحری تناول کرتے رہتے۔ ہم نے ان تمام روایات کی اسناد اپنی مستقل کتاب "کتاب الصیام" میں ذکر کر دی ہیں۔ ابن جریر نے بعض لوگوں سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سورج کے طلوع ہونے تک کھانا پینا جائز ہے جس طرح سورج کے غروب ہوتے ہی کھانا پینا جائز ہے۔ لیکن کسی اہل علم نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔

1۔ فتح الباری، تفسیر سورۃ البقرہ:183/8 2۔ مسند امام احمد:377/4 3۔ فتح الباری:139/4
4۔ مسلم: کتاب الصوم:771,770 5۔ مسند امام احمد:44/3 6۔ فتح الباری:138/4

کیونکہ یہ نص قرآن کے مخالف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فجر سے پہلے کھا پی سکتے ہو۔ اسی طرح حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں بلال کی اذان سحری کھانے سے روک نہ دے کیونکہ وہ رات کے وقت (تہجد کے لئے) اذان دیتے ہیں اس لئے تم سحری میں مشغول رہا کرو یہاں تک کہ ابن مکتومؓ کی اذان سنو۔ کیونکہ وہ طلوع فجر کے بعد اذان دیتے ہیں (1)۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فجر وہ روشنی نہیں جو افق میں طولاً پھیلتی ہے بلکہ وہ سرخ روشنی ہے جو عرضاً پھیلتی ہے (2)۔ ترمذی کے یہ الفاظ ہیں کھاؤ، پیو، بلندی کی طرف پھیلنے والی روشنی تمہیں نہ روکے۔ کھاتے پیتے رہا کرو یہاں تک کہ سرخ روشنی ظاہر ہو جائے۔ ایک روایت میں ارشاد فرمایا کہ بلال کی اذان اور یہ سفیدی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہاں تک فجر طلوع ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بلال کی اذان تمہیں سحری سے نہ روکے۔ بلال رات کو اذان دیتے ہیں تا کہ سونے والے بیدار ہو جائیں اور تہجد کی نماز پڑھنے والے گھروں کو لوٹ جائیں۔ پھر آپ نے ہاتھ کے اشارے سے بیان فرمایا کہ فجر طولاً سفیدی نہیں بلکہ عرضاً سفیدی ہے اور دوسری روایت میں ارشاد فرمایا فجر دو ہیں۔ ایک وہ جو بھیڑیئے کی دم کی مانند ہوتی ہے یہ کسی چیز کو حرام نہیں کرتی۔ دوسری وہ جو افق میں عرضاً پھیلتی ہے یہ نماز کو حلال اور سحری کو حرام کر دیتی ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں فجر کی دو قسمیں ہیں۔ 1۔ وہ سفیدی جو آسمان پر بلندی کی طرف بڑھتی ہے یہ کسی چیز کو حرام اور حلال نہیں کرتی۔ 2۔ دوسری وہ فجر جو پہاڑ کی چوٹیوں پر چمکتی ہے۔ یہ کھانے پینے کو حرام کرتی ہے۔ حضرت عطاء سے بھی یہی قول مروی ہے کہ پہلی فجر سے کھانا پینا حرام نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے تہجد کی نماز کا وقت ختم ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے حج فوت ہوتا ہے۔ لیکن وہ فجر جو پہاڑ کی چوٹی پر پھیلتی ہے اس سے روزہ دار کے لئے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔

مسئلہ: چونکہ اللہ تعالیٰ نے روزہ دار کے لئے جماع اور کھانے پینے کا آخری وقت صبح صادق مقرر کیا ہے اس لئے اس سے اس مسئلہ پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص صبح جنابت کی حالت میں اٹھا اور پھر وضو کر لیا تو وہ اپنا روزہ مکمل کر سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ آئمہ اربعہ اور جمہور علماء خلف وسلف کا یہی مذہب ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کو صحبت کرتے اور صبح جنابت کی حالت میں بیدار ہوتے اور پھر غسل فرما کر روزہ کو مکمل فرماتے۔ حضرت ام سلمہ کی روایت میں ہے کہ آپ نہ افطار کرتے اور نہ قضاء کرتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر جنابت کی حالت میں نماز فجر کا وقت ہو جائے تو کیا اس صورت میں اپنا روزہ مکمل کر سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ مجھے بھی جب ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو میں روزہ رکھ لیتا ہوں۔ اس شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم آپ کی مثل نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے ہی گناہوں سے اپنی عصمت میں رکھا ہے اور بعد میں بھی اپنی حفاظت میں رکھے گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا قسم بخدا میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ جن چیزوں سے بچنا چاہئے ان کو زیادہ جاننے والا ہوں۔ یہاں تک حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب صبح کی اذان ہو جائے تم میں سے کوئی حالت جنابت میں ہو تو وہ اس دن روزہ نہ رکھے۔ یہ حدیث سند کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کی ہے اور شیخین کی شرط کے مطابق ہے۔ یہی حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلمؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ فضل بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ سنن نسائی میں یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ حضرت اسامہ بن زیدؓ اور فضل بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس حدیث کو مرفوع نہیں کہا۔ اس لئے بعض علماء نے اس حدیث کی یہ علت بیان کی ہے کہ یہ مرفوع نہیں۔ اور بعض نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ مذکورہ بالا

1۔ مسلم: کتاب الصیام: 768 4۔ مسند امام احمد: 23/4

صورت میں آدمی کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور یہ حضرات ابو ہریرہؓ، سالم، عطاء، ہشام بن عروہ، حسن بصریؒ سے منقول ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص پر جنابت کی حالت میں سوئے ہوئے فجر طلوع ہوگئی تو اس کا روزہ صحیح ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے مروی حدیث گزر چکی ہے۔ اور اگر اس نے عمداً غسل نہ کیا اور صبح ہوگئی تو حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے مطابق اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ یہ حضرت عروہ، طاؤس اور حضرت حسن سے مروی ہے۔ بعض نے فرض اور نفل روزے میں فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر فرض روزہ ہو تو اسے پورا کرے اور پھر قضاء کرے اور اگر روزہ نفلی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔ یہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے اور حضرت حسن بصریؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے مروی حدیث سے منسوخ ہے۔ لیکن یہاں کوئی تاریخ معلوم نہیں جس سے نسخ کا دعویٰ کیا جا سکے۔ ابن حزم نے اس آیت کریمہ کے ساتھ حدیث کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا لیکن یہ دعویٰ بھی بعید ہے کیونکہ اس آیت کریمہ کے حدیث پاک کے بعد نازل ہونے کی کوئی تصریح نہیں۔ بلکہ بظاہر یہ حدیث آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد کی لگتی ہے۔ بعض علماء نے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کو نفی کمال پر محمول کیا ہے یعنی اس شخص کا روزہ کامل نہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کی حدیث روزے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ یہی مسلک سب سے اچھا اور جامع ہے۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ: یہ حکم اس بات کا مقتضی ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی روزہ افطار کر لینا چاہئے۔ جیسا کہ امیر المومنین عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات ادھر سے آ جائے اور دن ادھر سے چلا جائے تو روزہ دار اپنا روزہ افطار کر لے(1)۔ حضرت سہل بن سعد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگ جب تک افطار میں جلدی کرتے رہیں گے خیر پر رہیں گے(2)۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میرے بندوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ بندہ ہے جو افطار میں جلدی کرے(3)۔ بشیر بن خصاصیہ کی زوجہ لیلیٰ فرماتی ہیں: میں نے دو دن کا مسلسل روزہ رکھنے کا ارادہ کیا تو میرے خاوند نے مجھے منع کر دیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ اس طرح نصاریٰ کرتے ہیں۔ تم اسی طرح روزہ رکھو جس طرح اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ یعنی رات تک روزہ مکمل کرو اور جب سورج غروب ہو جائے تو افطار کرو۔ اسی لئے صحیح احادیث میں صوم وصال سے منع کیا گیا ہے۔ صوم وصال کا معنی یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور پھر اسے افطار کئے بغیر ہی دوسرے دن کا روزہ اس کے ساتھ ملا لے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صوم وصال نہ رکھو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ بھی تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تمہارے جیسا نہیں ہوں۔ میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ صوم وصال سے باز نہ آئے۔ نبی کریم ﷺ نے مسلسل دو دن اور دو رات کا روزہ رکھا جب چاند نظر آ گیا تو آپ نے فرمایا اگر چاند نہ نکلتا تو میں یونہی صوم وصال جاری رکھتا گویا کہ آپ نے اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا(4)۔ امام بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو امام زہری سے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام پر کرم فرماتے ہوئے انہیں صوم وصال سے منع فرما دیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ بھی تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تمہاری مثل نہیں ہوں۔ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ صوم وصال حضور ﷺ کے خصائص میں شامل ہے۔ آپ اس کی طاقت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد آپ کے شامل حال تھی۔ اس حدیث میں جو آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اس سے مراد حقیقی کھانا پینا نہیں ہے کیونکہ اگر یہ مراد لیا جائے تو صوم وصال کیسے ہوگا؟ بلکہ اس سے روحانی قوت مراد ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

1۔ بخاری: کتاب الصوم: 196/4 2۔ فتح الباری: 198/4 3۔ مسند امام احمد: 237/2 4۔ البخاری: 119/9,49,48/3

''وہ تیری یاد میں اتنی مگن ہو جاتی ہے کہ تیرے متعلق گفتگو اسے کھانے پینے اور زادراہ سے غافل کر دیتی ہے۔''

مگر جو شخص سورج غروب ہونے کے بعد سحری کے وقت تک روزہ افطار نہ کرے اس کے لئے جائز ہے۔ جیسا کہ ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صوم وصال نہ رکھا کرو لیکن اگر تم میں سے کوئی صوم وصال کا ارادہ کرے تو سحری کر سکتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ آپ بھی تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تمہاری مثل نہیں ہوں۔ جب میں رات گزارتا ہوں تو کھلانے والا مجھے کھلاتا اور پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔ حاطب بن ابی بلتعہؓ کی لونڈی حضور ﷺ کے پاس سے گزری آپ سحری کھا رہے تھے آپ نے اسے سحری کی دعوت دی اس نے جواب دیا میں روزے سے ہوں۔ آپ نے دریافت فرمایا تم کیسا روزہ رکھتی ہو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ آل محمد ﷺ کی طرح ایک سحری سے دوسری سحری تک کا صوم وصال کیوں نہیں رکھتی۔ ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور کئی دوسرے سلف صالحین کے بارے میں بیان کیا ہے جو کئی دن کا مسلسل روزہ رکھتے تھے۔ اور کہا ہے کہ یہ روزہ وہ عبادت کے طور پر نہیں رکھا کرتے تھے بلکہ اپنے نفسوں کی ریاضت کے طور پر رکھا کرتے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا صوم وصال سے منع فرمانا مشقت اور مہربانی کے طور پر تھا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں ''رَحْمَةً لَهُمْ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت ابن جبیر اور ان کے بیٹے عامر اور ان کے طریق پر چلنے والے لوگ اپنے آپ میں اتنی قوت پاتے تھے اس لئے وہ صوم وصال رکھا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ جب وہ افطار کرتے تو پہلے گھی اور معبر استعمال کرتے تاکہ کھانے کے ساتھ ان کی انتڑیاں جل نہ جائیں۔ حضرت ابن زبیرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ مسلسل سات دن کا روزہ رکھتے۔ اور ساتویں دن ان سب سے قوی اور سخت معلوم ہوتے تھے۔ حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دن کا روزہ فرض کیا ہے اور جب رات ہو جائے تو جس کا دل چاہے کھائے اور جس کا دل چاہے نہ کھائے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد میں اعتکاف بیٹھے خواہ رمضان کا مہینہ ہو یا کوئی اور، اس پر اپنی عورت کے ساتھ دن اور رات کے وقت مباشرت کرنا حرام ہے یہاں تک کہ اس کا اعتکاف پورا ہو جائے۔ حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں ابتداء میں جب لوگ اعتکاف کرتے جب انہیں حاجت ضروریہ کے لئے مسجد سے باہر جانا پڑتا تو وہ اپنی بیویوں سے مباشرت کر لیا کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یعنی اعتکاف کی حالت میں اپنی بیویوں کے قریب نہ جاؤ خواہ تم مسجد میں ہو یا مسجد سے باہر۔ حضرت مجاہد، قتادہ اور دوسرے کئی مفسرین کا یہی قول ہے۔ پس علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معتکف پر مسجد میں بحالت اعتکاف مباشرت حرام ہے۔ اگر وہ ضروری حاجات کے لئے اپنے گھر جائے تو اس کے لئے اتنی مقدار ٹھہرنا ہی جائز ہے جس میں وہ اپنی حاجت اور کھانے سے فارغ ہو جائے۔ اس کے لئے عورت کا بوسہ لینا اور اس کے ساتھ معانقہ کرنا جائز نہیں۔ اپنے اعتکاف کے سوا کسی اور کام مشغول نہ ہو، نہ ہی مریض کی عیادت کرے ہاں اگر راستے میں مل جائے تو دریافت حال کر سکتا ہے۔ اعتکاف کے احکام کتب فقہ میں مفصل بیان کئے گئے ہیں جن میں سے بعض متفق علیہ ہیں اور بعض میں اختلاف ہے۔ ہم نے بھی اپنی کتاب (کتاب الصیام) میں اس کے مسائل بیان کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام قرآن کریم کی اقتداء کرتے ہوئے روزوں کے احکام کے بعد اعتکاف کے مسائل ذکر کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں روزہ کے مسائل ذکر کرنے کے بعد اعتکاف کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں روزہ کی حالت اور رمضان کے آخری عشرہ کے اعتکاف کی طرف اشارہ ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ سے بھی ثابت ہے کہ آپ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حریم ناز میں واپس بلا لیا۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کی ازواج مطہرات بھی

اعتکاف کیا کرتی تھیں۔ جس کا ذکر حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ملتا ہے۔ حضرت صفیہ بنت حیی اعتکاف کی حالت میں مسجد میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں۔ ایک دن وہ آپ سے کچھ دیر محو گفتگو رہیں۔ جب واپس جانے کا ارادہ فرمایا تو رسول اللہ علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ چلنے لگے تا کہ آپ کو گھر پہنچا ئیں۔ کیونکہ یہ رات کا وقت تھا اور ان کا گھر بھی مسجد نبوی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ راستے میں آپ کو دو انصاری صحابی مل گئے جب انہوں نے نبی کریم علیہ السلام کو دیکھا تو تیزی سے چلنے لگے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ آپ سے شرم وحیا کی وجہ سے چھپ گئے آپ نے انہیں فرمایا ٹھہرو۔ جلدی نہ کرو یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہیں۔ وہ یہ سن کر کہنے لگے سبحان اللہ۔ یارسول اللہ۔ آپ نے ارشاد فرمایا شیطان ابن آدم کی رگ رگ میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ وہ کہیں تمہارے دل میں بدگمانی پیدا نہ کرے۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے اس حدیث میں اپنی امت کو تہمت کی جگہ سے بچنے کا درس دیا ہے۔ وگرنہ یہ پاکباز صحابی نبی کریم علیہ السلام کے بارے میں بدگمانی کیسے کر سکتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں مباشرت سے مراد جماع اور اس کے دواعی ہیں۔ یعنی بوس وکنار اور معانقہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اپنی بیوی سے لین دین جائز ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام اعتکاف کی حالت میں اپنا سر مبارک اور پاؤں مبارک میرے قریب کر دیتے میں ان کو دھو دیتی حالانکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی اور گھر میں صرف ضروری حاجت کے لیے داخل ہوتے تھے۔ فرماتی ہیں کہ اگر گھر میں مریض ہوتو چلتے ہوئے اس کی مزاج پرسی کی جاسکتی ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ: یعنی یہ جو رمضان کے بارے میں ہم نے بیان کیا ہے، اس کے فرائض اور احکام جن میں بعض جائز ہیں اور بعض حرام ہیں۔ یہ سب اللہ کی حدود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے اور بذات خود بیان کیا ہے۔ پس تم ان حدود سے تجاوز نہ کرو۔ حضرت ضحاک اور مقاتل فرماتے ہیں کہ حدود اللہ سے مراد اعتکاف میں مباشرت کرنا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید ان سے یہ چار حدود مراد لیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ ہمارے مشائخ کا بھی یہی قول ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ: جس طرح اللہ تعالیٰ نے روزے کے احکام اور تفصیل بیان کی ہے اسی طرح باقی احکام بھی اپنے محبوب کی زبان پر بیان کرے گا۔ تا کہ لوگ پہچانیں کہ وہ کیسے راہ ہدایت پر چلیں اور اس کی اطاعت کریں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ...... (الحدید:9) (وہی ہے جو نازل فرما رہا ہے اپنے (محبوب) بندہ پر روشن آیات تا کہ تمہیں نکال لے (کفر کے) اندھیروں سے (ایمان کے) نور کی طرف''۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک تا کہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)''۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس شخص کے بارے میں ہے، جس پر کسی شخص کا مال لازم یا قرض ہو۔ اس شخص کے پاس اس کی کوئی دلیل نہ ہو اس وجہ سے یہ شخص انکار کر دے اور پھر عدالت سے مقدمہ جیت لے۔ حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اس معاملہ میں حق پر نہیں ہے اور وہ حرام کھا رہا ہے۔ حضرات مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ، سدی، مقاتل بن حیان اور

عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں کہ تو کسی سے نہ جھگڑ جب کہ تجھے معلوم ہو کہ تو ظالم ہے۔ حضرت ام سلمہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں انسان ہوں، میرے پاس لوگ جھگڑا لے کر آتے ہیں ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی زیادہ حجت باز ہو تو میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں (حالانکہ وہ حق پر نہیں ہوتا) ایسا شخص جو اس فیصلہ کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال لے وہ جہنم کی آگ کا ایک ٹکرا ہے وہ چاہے تو اسے لے چاہے اسے نہ لے۔ یہ آیت کریمہ اور حدیث طیبہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حاکم کا فیصلہ درحقیقت کسی چیز کو تبدیل نہیں کرتا وہ نہ تو کسی حرام چیز کو حلال کر سکتا ہے اور نہ حلال کو حرام۔ بلکہ اس کا فیصلہ صرف ظاہری شہادتوں پر ہوتا ہے۔ اگر تو حقیقت میں بھی معاملہ ایسا ہو پھر تو ٹھیک ہے وگرنہ حاکم کو اس کے فیصلے کا اجر مل جاتا ہے اور جھوٹے گواہ پیش کرنے والے کا گناہ اسی پر ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں ارشاد فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ........ یعنی تم اپنے دعویٰ کے باطل ہونے کو جانتے بھی ہو لیکن اس کے باوجود اپنے اس جھوٹے دعویٰ پر دلیل دیتے ہو۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں اے ابن آدم! قاضی کا فیصلہ تیرے لئے کسی حرام چیز کو حلال نہیں کرتا نہ ہی باطل کو حق بنا سکتا ہے۔ قاضی تو صرف گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ آخر کار وہ بھی بشر ہے اس سے بھی خطاء کا امکان ہے۔ بس یہ بات غور سے سنو کہ جس کے حق میں اس قسم کا غلط فیصلہ کیا گیا اس کا مقدمہ ختم نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن پیش ہوگا۔ وہ اہل باطل کے خلاف فیصلہ فرما کر صاحب حق کو دنیا کے اجر سے بہتر اجر عطا فرمائے گا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

"دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق (کہ یہ کیونکر گھٹتے بڑھتے ہیں) فرمایئے یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے۔ ہاں نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے اور آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اس امید پر کہ کامیاب ہو جاؤ"۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے چاند کے بارے میں پوچھا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یعنی تم چاند کے ذریعہ ادائیگی قرض کی میعاد، عورتوں کی عدت اور حج کا وقت معلوم کرتے ہو۔ ابوالعالیہ روایت کرتے ہیں کہ بعض لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ چاند کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چاند اللہ نے لوگوں کے لیے وقت معلوم کرنے کے لیے بنایا ہے۔ پس جب تم چاند دیکھو تو روزے رکھو اور چاند دیکھ کر ہی عید مناؤ اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن پورے کرو۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے اور حضرت علی بن ابی طالب سے بھی موقوفاً روایت کی گئی ہے۔

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ: حضرت براء روایت کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ وہ احرام کی حالت میں گھروں میں پچھلی جانب سے داخل ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ ایک دوسری روایت میں آپ فرماتے ہیں کہ انصار جب سفر سے واپس آتے تو وہ دروازے سے اپنے گھر میں داخل نہ ہوتے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ قریش نے

1۔ فتح الباری، تفسیر سورۃ البقرۃ 183/8

اپنا نام زمانہ جاہلیت میں حمس رکھا ہوا تھا۔ وہ حالت احرام میں دروازوں سے اپنے گھر میں آ جا سکتے تھے لیکن انصار اور باقی تمام اہل عرب کو حالت احرام میں دروازے سے داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ ایک باغ میں تشریف فرما تھے۔ آپ اس کے دروازے سے باہر نکلے آپ کے ساتھ قطبہ بن عامر انصاری بھی باہر نکل آئے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ قطبہ بن عامر انصاری تاجر ہے، یہ بھی آپ کے ساتھ دروازے سے نکلا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے عرض کی آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے بھی ایسا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا تعلق تو حمس سے ہے اس نے عرض کی کہ میں بھی تو آپ کے دین پر ہوں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یہ روایت حضرت ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ اسی طرح حضرات مجاہد، زہری، قتادہ، ابراہیم نخعی، سدی اور ربیع بن انس سے منقول ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی آدمی سفر کے ارادہ سے باہر نکلتا اور پھر اس کی رائے تبدیل ہو جاتی اور وہ سفر نہ کرنا چاہتا تو وہ دروازے سے اپنے گھر میں داخل نہ ہوتا بلکہ پچھلی طرف سے دیوار پھلانگ کر داخل ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا۔ حضرت محمد بن کعب فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اعتکاف کی حالت میں ہوتا تو وہ دروازے سے اپنے گھر میں داخل نہ ہوتا۔ حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ اہل یثرب جب عید منا کر اپنے گھروں کو لوٹتے تو وہ اپنے گھروں میں پچھلی طرف سے داخل ہوتے اور اسے وہ نیکی تصور کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما کر ان اطوار کو ختم کر دیا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ جو اس نے حکم دیا ہے اسے سرانجام دو اور جس سے روکا ہے اسے ترک کرو۔ اس طرح جب تم کل قیامت کے دن اس کی بارگاہ میں حاضر ہو گے تو حقیقی فلاح سے بہرہ ور ہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں کامل جزاء عطا فرمائے گا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

''اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو اور قتل کرو انہیں جہاں بھی انہیں پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے قریب یہاں تک کہ وہ (خود) تم سے وہاں جنگ کرنے لگیں، سو اگر وہ لڑیں تم سے تو پھر قتل کرو انہیں۔ یہی سزا ہے (ایسے) کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں (تو جان لو کہ) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کے نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لیے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر''۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: حضرت ابوعالیہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ سب سے پہلی آیت ہے جو مدینہ طیبہ میں جہاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کے خلاف جہاد کرتے جو آپ کے مقابلہ میں آتے اور جو لوگ آپ کے مقابلہ میں نہ آتے آپ بھی ان سے تعرض نہ فرماتے یہاں تک کہ سورۂ برأت نازل ہوئی۔ بلکہ حضرت عبدالرحمن بن زید فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ

منسوخ ہے اور اس کی ناسخ یہ آیت کریمہ ہے۔ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ...... (التوبہ:5) ''ترجمہ: مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی انہیں پاؤ''۔ لیکن ان کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ تو مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دلانے اور ان دشمنوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کے لیے نازل ہوئی جو اہل اسلام کے خلاف برسر پیکار ہوتے تھے۔ اس لیے حکم ہوا کہ جس طرح وہ تمہارے مقابلہ میں آتے ہیں اسی طرح تم ان کے خلاف جہاد کرو۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ...... (التوبہ:36) ''ترجمہ: اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے جس طرح وہ سب تم سے جنگ کرتے ہیں''۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔ اور ان کو نکالو ان کے گھروں سے جس طرح انہوں نے تمہیں نکالا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں بھی ان کے خلاف جہاد کرنے کے لیے مستعد رہنا چاہیے جس طرح وہ تمہارے خلاف مستعد ہیں۔ جس طرح انہوں نے تمہیں جلا وطن کیا ہے تم بھی بدلہ کے طور پر ان کو جلا وطن کرو۔

وَلَا تَعْتَدُوْا : اللہ کی راہ میں جہاد کرو لیکن اس میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کرو یعنی ایسے افعال کا ارتکاب نہ کرو جسے شرع نے ممنوع قرار دیا ہے۔ جیسے مُثلہ کرنا یعنی مخالفین کے ناک کان وغیرہ کاٹ کر ان کی صورت بگاڑنا۔ مال غنیمت میں خیانت کرنا، عورتوں، بچوں اور ان بوڑھوں کو قتل کرنا جو نہ تو جنگ کر سکتے ہوں اور نہ جنگ کے معاملات میں مہارت رکھتے ہوں۔ اسی طرح راہبوں کو قتل کرنا، بغیر کسی مصلحت کے درختوں کو جلانا اور جانوروں کو ہلاک کرنا۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس، عمر بن عبدالعزیز اور مقاتل بن حیان اور دوسرے مفسرین سے منقول ہے۔ حضرت بریدہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، خیانت نہ کرو، نہ کسی کو دھوکہ دو، نہ ہی کسی کا مثلہ بناؤ، نہ بچوں کو قتل کرو اور نہ ہی راہبوں کو(1)۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی مروی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ کسی غزوہ میں ایک عورت قتل کی ہوئی پائی گئی تو رسول اللہ علیہ السلام نے اس کو بہت ناپسند کیا اور عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے ہمارے سامنے گیارہ مثالیں بیان فرمائیں اور ان میں سے ایک کی تفصیلی وضاحت فرما دی، باقی کو چھوڑ دیا۔ فرمایا کچھ لوگ انتہائی کمزور مسکین تھے، ان پر طاقتور ظالم دشمن نے حملہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کمزوروں کو دشمن پر غالب کر دیا۔ لیکن ان کمزوروں نے دشمن کو اپنا غلام بنالیا، ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ جس کے باعث روز قیامت اللہ تعالیٰ ان سے ناراض رہے گا۔ حدیث کا مقصود یہ ہے کہ یہ کمزور لوگ جب اپنے مخالفین پر غالب آگئے تو انہوں نے ان پر طرح طرح کے ظلم شروع کر دیے اور اپنے اس ظلم اور زیادتی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔ اس کے بارے میں بہت سی احادیث اور صحابہ کرام کے اقوال موجود ہیں۔ چونکہ جہاد میں بظاہر قتل و غارت ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ دشمنان اسلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور لوگوں کو اس کی راہ سے روکتے ہیں۔ ان کا یہ عمل قتل و غارت سے بھی زیادہ شنیع ہے اسی لیے ارشاد فرمایا:

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ : حضرت ابو مالک فرماتے ہیں کہ تم جس روش پر چل رہے ہو یہ قتل سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ حضرت ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، حسن بصری وغیرہم فرماتے ہیں شرک قتل سے زیادہ قبیح ہے۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ : رسول اللہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اس شہر مکہ کو اللہ تعالیٰ نے اسی دن حرمت والا بنا دیا تھا جس دن زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا اور قیامت تک اس کا یہی حکم رہے گا صرف تھوڑے سے وقت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے میرے لیے حلال کیا ہے اور اب اس وقت کے بعد قیامت تک یہ شہر حرمت والا رہے گا۔ نہ تو اس کے درخت کاٹے جائیں اور نہ ہی گھاس اور اگر کوئی شخص میرے اس عمل (فتح

1۔ البیہقی 90/9

مکہ) کو دلیل بنا کر یہاں جنگ کرنا چاہے تو اس کو کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تو اجازت دی تھی تمہیں اجازت نہیں دی۔ اس سے مراد فتح مکہ کا دن ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے غلبہ کے ساتھ فتح کیا کیونکہ اس میں چند مشرکین مارے گئے تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ مکہ صلح کے ساتھ فتح ہوا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دروازہ بند کر لے وہ امن میں ہے اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے وہ بھی مامون ہے اور جو ابوسفیان کے گھر داخل ہو جائے وہ بھی مامون ہے۔

حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ: یعنی مسجد حرام میں مشرکین کے خلاف لڑائی کرنے کی اجازت نہیں ہاں اگر وہ خود لڑائی کا آغاز کریں تو تم اپنے دفاع کے لیے ان کے خلاف لڑ سکتے ہو۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش اور اس کے حلیف قبائل مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ایک درخت کے نیچے اپنے صحابہ سے جہاد کرنے کی بیعت کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جنگ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ...... (الفتح:24) اور اللہ وہی ہے جس نے روک لیا تھا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے وادی مکہ میں باوجودیکہ تمہیں ان پر قابو دے دیا تھا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی وہ حرم مکہ میں لڑائی کو بند کر دیں اور اسلام کی طرف رجوع کر لیں۔ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کر لیں تو اللہ ان کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اگرچہ انہوں نے حرم مکہ میں مسلمانوں ہی کو کیوں نہ قتل کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں رجوع کرنے والے کو معاف فرما دیتا ہے۔ اور اس کی مغفرت کے سامنے گناہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم فرمایا۔ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے۔ فتنہ سے مراد جنگ ہے اور یہ قول حضرت ابن عباس ؓ اور کئی دوسرے مفسرین سے منقول ہے۔

وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ: یعنی اللہ کا دین باقی تمام ادیان پر ظاہر اور غالب ہو جائے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کوئی شخص اپنی بہادری کا اظہار کرنے کے لیے لڑتا ہے اور کوئی حمیت وغیرت کی وجہ سے، اور کوئی لوگوں کو دکھلانے کے لیے۔ ان میں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا کون ہے۔ آپ نے فرمایا جس نے اس نیت سے جہاد کیا کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو وہی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا مجھے لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللّٰہ کا اقرار کر لیں اور اگر وہ یہ کلمہ پڑھ لیں گے تو وہ مجھ سے اپنا خون اور مال محفوظ کر لیں گے سوائے شرعی حق کے۔ اور ان کا (باطنی) حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ: اگر وہ شرک اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے باز آ جائیں تو اس کے باوجود جو ان کے خلاف جہاد کرے گا وہ ظالم ہے اور ظالموں کو اس زیادتی کا بدلہ ضرور دینا پڑے گا اور یہی مفہوم حضرت مجاہد کے قول کا ہے کہ جو لڑائی کرے پھر اس سے ہی لڑائی کی جائے۔ یا اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر وہ جنگ سے رک جائیں تو اس طرح وہ شرک سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ اب ان کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں "عُدْوَانَ" سے مراد سزا دینا یا جنگ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ (البقرۃ:194) "ترجمہ: پس جو تم سے زیادتی کرے تم اس سے زیادتی کرو"۔ اس لیے حضرت عکرمہ اور قتادہ فرماتے ہیں کہ ظالم وہ ہے جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھنے سے انکار کرے۔ جن دنوں یزید نے حضرت عبداللہ بن زبیر کے خلاف لشکر کشی کی ان دنوں دو آدمی حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ لوگ قتل ہو رہے ہیں آپ حضرت عمر کے صاحبزادے اور

صحابی رسول ہیں۔ آپ اس لڑائی میں کیوں شریک نہیں ہوتے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مسلمان بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ آپ نے فرمایا ہم جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور اللہ کا دین غالب آ گیا اور تم اس لیے لڑائی کرتے ہو تا کہ فتنہ پیدا ہو اور دوسرے مذاہب غالب آ جائیں۔ حضرت نافع فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آیا اور کہنے لگا کیا بات ہے تم ایک سال حج کرتے ہو اور ایک سال اپنے گھر میں رہتے ہو اور آپ نے اللہ کی راہ میں جہاد کو چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کے بارے میں کتنی ترغیب دی ہے۔ آپ نے فرمایا اے بھتیجے! اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے، زکوٰۃ اور حج بیت اللہ۔ اس نے کہا کیا آپ نے اللہ کا یہ حکم نہیں سنا: وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا...... (الحجرات:9)" ترجمہ اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو اور اگر زیادتی کرے ایک گروہ دوسرے پر تو سب مل کر لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف"۔ آپ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اس حکم کی تعمیل کرتے رہے۔ جب اسلام کمزور تھا اور مسلمان تھوڑے تھے۔ اگر کوئی مسلمان ہو جاتا تو اس کو اسلام کی وجہ سے آزمائش میں ڈال دیا جاتا۔ کافر اس کو یا تو قتل کر دیتے یا سخت اذیت پہنچاتے۔ یہاں تک کہ دین اسلام اطراف واکناف میں پھیل گیا اور اب یہ آزمائش اور فتنہ ختم ہو گیا۔ اس شخص نے کہا آپ کا حضرت علی اور حضرت عثمان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ آپ نے فرمایا حضرت عثمان کو تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا لیکن تم اللہ کی معافی کو ناپسند کرتے ہو اور حضرت علی رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ دیکھو یہ ان کا مکان ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۹۴

"حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہیے تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو (لیکن) اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ: سن چھ ہجری کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے لیکن مشرکین نے آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا۔ ذیقعد کا مہینہ تھا جس کا شمار حرمت والے مہینوں میں ہوتا ہے پھر اس بات پر صلح ہو گئی کہ مسلمان آئندہ سال عمرہ کے لیے آئیں گے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکوں سے بدلہ دلوایا اور اس بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں رسول حرمت والے مہینے میں جنگ نہیں کرتے تھے ہاں اگر کوئی دشمن ان مہینوں میں حملہ کر دیتا آپ اس کا مقابلہ کرتے۔ اسی طرح دوران جنگ اگر یہ مہینے آ جاتے تو آپ جنگ سے رک جاتے یہاں تک کہ یہ مہینے گزر جاتے(1)۔ حدیبیہ کے مقام پر جب رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی کہ حضرت عثمان کو مشرکین نے شہید کر دیا ہے۔ جن کو آپ نے ایک پیغام دے کر مشرکین کی طرف بھیجا تھا تو آپ نے ایک درخت کے نیچے اپنے چودہ سو صحابہ سے مشرکین کے خلاف جنگ کرنے پر بیعت لی۔ اور جب آپ کو حضرت عثمان کی عدم شہادت کا علم ہوا تو آپ نے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا اور صلح کی طرف مائل ہوئے۔ اسی طرح آپ غزوۂ حنین میں بنی ہوازن کے ساتھ

1۔ مسند احمد، 335،334/3

جنگ کرنے سے فارغ ہوئے اور کچھ مشرکین طائف میں جا کر قلعہ بند ہو گئے۔ آپ نے طائف کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران ذوالقعد کا مہینہ شروع ہو گیا آپ نے مسلسل چالیس دن محاصرہ کیے رکھا۔ بالآخر کچھ صحابہ کرام کی شہادت کے بعد آپ نے یہ محاصرہ اٹھا لیا اور عازم مکہ ہوئے۔ راستہ میں جعرانہ کے مقام پر مال غنیمت کو تقسیم کیا اور یہیں سے آپ نے عمرہ کا احرام باندھا۔ آپ نے عمرہ ذیقعد ۸ ھ میں ادا کیا۔

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ: یہاں مسلمانوں کو عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ مشرکین کے معاملہ میں بھی عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) ''اگر تم انہیں سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی''۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ: 40) ''برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے''۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ مکہ میں نازل ہوئی جہاں مسلمانوں کے پاس نہ ہی قوت تھی اور نہ ہی جہاد کا حکم۔ پھر یہ حکم مدینہ طیبہ میں نازل ہونے والی آیت قتال سے منسوخ ہو گیا۔ لیکن ابن جریر نے اس قول کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت کریمہ مدنی ہے اور عمرہ قضاء کے بعد نازل ہوئی۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور تقویٰ و پرہیزگاری کا حکم دیا ہے اور بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت متقی لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَ اَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

''اور خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں اور اچھے کام کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے''۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن عباس اور کئی دوسرے مفسرین کرام کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابوعمران فرماتے ہیں کہ ایک مہاجر صحابی نے قسطنطنیہ کی جنگ میں دشمن کی صف پر دلیرانہ حملہ کیا اور اسے چیرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اس جنگ میں حضرت ابو ایوب انصاری بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ شخص اپنی جان ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابو ایوب انصاری نے فرمایا کہ ہم اس آیت کریمہ کے بارے میں تم سے بہتر جانتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ ہمارے بارے میں نازل ہوئی۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتے رہے اور آپ کی نصرت اور اعانت میں پیش پیش رہے۔ یہاں تک کہ اسلام خوب پھیل گیا اور مسلمان غالب آ گئے۔ اور ہم انصاریوں نے ایک مرتبہ جمع ہو کر آپس میں مشورہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے نبی ﷺ کی صحبت سے نوازا ہے۔ ہم آپ کے ساتھ جہاد میں برسرپیکار رہے حتیٰ کہ دین اسلام دور دور تک پھیل گیا اور مسلمانوں کی کثرت ہو گئی۔ ہم نبی پاک ﷺ کی معیت میں جہاد کو اپنے اہل و عیال اور مال و دولت پر ترجیح دیتے تھے۔ اب چونکہ جنگ ختم ہو چکی ہے تو اب ہمیں اپنے اہل و عیال کی طرف سوچنا چاہیے اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یعنی جہاد کو چھوڑ کر اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کی فکر میں مشغول ہونا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے (1)۔ ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ قسطنطنیہ میں مصری فوج کے سالار عقبہ بن عامر تھے اور شامی فوج کے سپہ سالار یزید بن فضالہ تھے۔ ایک آدمی نے حضرت براء بن عازب سے پوچھا اگر میں اکیلا دشمن کی صف میں گھس جاؤں اور وہ مجھے قتل کر

1۔ ابوداؤد

دیں تو کیا میں اس آیت کریمہ کے مطابق اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہو جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم فرماتا ہے: فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ (النساء:84)'' (اے محبوب) جہاد کرو اللہ کی راہ میں، نہ تکلیف دی جائے گی آپ کو سوائے اپنی ذات کے''۔ اور تم جس آیت کا حوالہ دے رہے ہو یہ تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض نے کہا ہے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان گناہ کرے اور توبہ نہ کرے۔ عبدالرحمٰن اسود بن عبد یغوث فرماتے ہیں جب انہوں نے دمشق کا محاصرہ کیا تو قبیلہ ازدشنوءۃ کا ایک شخص جلدی سے اکیلا دشمن کی طرف بڑھا تو مسلمانوں نے اس کے اس کھیل کو ناپسند کیا اور حضرت عمرو بن عاص کے پاس اس کی شکایت کی۔ آپ نے اسے بلا کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ جہاد کے بارے میں نازل نہیں ہوئی بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی اگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرے تو گویا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابوجبیر فرماتے ہیں کہ انصار اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کیا کرتے تھے ایک سال انہیں قحط سالی نے آلیا تو اس سال انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے مراد بخل کرنا ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر فرماتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص گناہ در گناہ کرتا رہے اور کہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف نہیں کرے گا اور یہی قول عبیدہ سلمانی، حسن بصری اور ابن سیرین وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت محمد بن کعب اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ ایک شخص کے پاس ضرورت سے زائد زادراہ تھا۔ ایک غریب مجاہد اس کے زادراہ سے خرچ کرتا رہا یہاں تک کہ سارا زادراہ ختم ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو تسلی دینی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ابن وہب فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ مشرکین کے ساتھ جنگ کے لیے بغیر نفقہ کے نکل جاتے تھے۔ اور یہ لوگ یا تو راستہ میں ہی ہلاک ہو جاتے یا دوسروں پر بوجھ بنتے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس سے خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ''تَهْلُكَةٌ'' کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص بھوک، پیاس یا چلنے کی وجہ سے ہلاک ہو جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم فرمایا جن کے پاس وافر مال ہو کہ وہ احسان کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ یعنی نیکی کے ہر کام میں اللہ کا دیا ہوا مال خرچ کرو۔ خصوصاً جہاد کی تیاری میں زیادہ خرچ کرو تاکہ مسلمان اپنے دشمن کے مقابلے میں قوی ہو جائیں۔ اور اس کار خیر کو ترک کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ احسان اعلیٰ درجے کی اطاعت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی یہاں ذکر فرما دیا۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۥ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

''اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ (کی رضا) کے لیے پھر اگر تم گھر جاؤ تو قربانی کا جانور جو آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) اور نہ منڈواؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اسے کچھ تکلیف ہو سر میں (اور وہ سر منڈا لے) تو وہ فدیہ دے دے روزوں سے یا خیرات سے یا قربانی سے اور جب تم امن میں ہو جاؤ (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو فائدہ اٹھانا چاہے عمرہ کا حج کے ساتھ تو جو اسے میسر ہو قربانی دے پھر جسے قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے حج کے وقت اور سات جب تم گھر لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس (روزے) ہوئے۔ یہ رعایت اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں اور ڈرا کرو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے''۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ: پہلے اللہ تعالیٰ نے روزہ کے احکام ذکر کیے۔ اس کے بعد جہاد کا ذکر ہوا۔ اب حج کے مناسک بیان فرمائے جا رہے ہیں۔ حکم ہوا کہ حج اور عمرہ کو پورا کرو۔ بظاہر الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج اور عمرہ کو شروع کرنے کے بعد ان کو مکمل کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے اس کے بعد ذکر کیا کہ اگر تم کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا جائے پھر اس صورت میں انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حج اور عمرہ کو شروع کرنے کے بعد اسے پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اگرچہ عمرہ کے واجب اور مستحب ہونے کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔ جن کا تفصیلی ذکر ہم نے اپنی کتاب ''احکام'' میں کر دیا ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں حج اور عمرہ کو پورا کرنے کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو۔ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو اور تمہارا مقصد صرف حج اور عمرہ ہی ہو اور میقات پر پہنچ کر ''اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ'' پکارو۔ تمہارا یہ سفر تجارت یا کسی دنیاوی غرض کے لیے نہ ہو۔ یعنی یہ نہ ہو کہ تم کسی دنیاوی غرض کے لیے نکلو اور جب مکہ کے قریب پہنچو تو تمہیں خیال آئے کہ چلو حج اور عمرہ کرتے چلیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حج اور عمرہ کے پورا کرنے کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ ادا کرو اور عمرہ حج کے مہینہ میں نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرۃ:197) ''ترجمہ: حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں''۔ حضرت قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں میں عمرہ مکمل نہیں ہوتا ان سے محرم میں عمرہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ انہوں نے جواب دیا لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں عمرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ حضرت قتادہ بن دعامہ سے بھی یہی مروی ہے۔ لیکن یہ قول محل نظر ہے کیونکہ حضور ﷺ نے چار عمرہ کیے اور یہ چاروں ذوالقعدہ میں تھے۔ ایک چھ ہجری میں، دوسرا سات ہجری میں عمرہ قضاء، تیسرا آٹھ ہجری میں عمرہ جعرانہ اور چوتھا وہ عمرہ جو آپ نے حج کے ساتھ ادا کیا۔ ہجرت کے بعد آپ نے یہی عمرے کیے۔ حضرت ام ھانی فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان میں عمرہ میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔ آپ نے یہ ارشاد اس لیے فرمایا تھا حضرت ام ھانی نے آپ کے ساتھ حج کا ارادہ فرمایا تھا۔ لیکن سواری نہ ہونے کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکیں۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ آپ کے خصائص میں سے ہے۔ حضرت سدی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ حج اور عمرہ کو ادا کرو۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جس شخص نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا اس کے لیے انہیں مکمل کیے بغیر اسے کھولنا جائز نہیں۔ حج اس طرح مکمل ہوتا ہے کہ قربانی کے دن جمرہ عقبہ پر رمی کرے اس کے بعد بیت اللہ شریف کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اب وہ احرام کھول سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حج میدان عرفہ میں قیام کا نام ہے اور عمرہ طواف کا۔ حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ کی قرأت یہ ہے (وَاَقِيْمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ اِلَى الْبَيْتِ) یعنی عمرہ بیت اللہ شریف میں ہی مکمل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں میں نے اس کا ذکر سعید بن جبیر سے کیا۔ انہوں نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے۔ حضرت

علقمہ سے یہ قرأت مروی ہے۔(وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ اِلَى الْبَيْتِ)۔شعبی نے لفظ عمرہ کو رفع "عمرةُ" کے ساتھ پڑھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عمرہ واجب نہیں ان سے ایک قول اس کے برعکس بھی مروی ہے۔کثیر صحابہ کرام سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی احرام کے ساتھ حج اور عمرہ ادا فرمایا۔اور آپ نے اپنے صحابہ کرام کو یہ بھی فرمایا کہ جس کے پاس ھدی (قربانی کا جانور) ہے وہ حج اور عمرہ کا احرام باندھے۔نیز آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ قیامت تک عمرہ حج میں داخل ہو گیا۔ایک غریب حدیث میں اس آیت کا شان نزول بھی بیان کیا گیا ہے۔حضرت صفوان بن امیہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے جبہ سے زعفران کی بومہک رہی تھی۔اس نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ !) میرے عمرہ کے بارے میں ﷺ کیا حکم ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عمرہ کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے۔اس نے عرض کی میں حاضر ہوں آپ نے فرمایا۔اپنے ان کپڑوں کو اتار دو اور غسل کر دو اور اچھے طریقے سے اپنے بدن کو صاف کرو۔پھر جس طرح تو اپنا حج کرتا ہے اسی طرح اپنے عمرہ کو مکمل کرو۔بعض روایات میں غسل اور اس آیت کے نازل ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ چھ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر نازل ہوئی جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ میں آنے سے روک دیا۔اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر پوری سورۂ فتح نازل فرمائی اور صحابہ کرام کو یہ رخصت ارشاد فرمائی کہ وہ اپنی قربانیوں کو ذبح کر دیں اور یہ ستر اونٹ تھے، اپنے سروں کو منڈوائیں اور اپنے احرام کھول دیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو سر منڈوانے اور احرام کھولنے کا حکم فرمایا تو وہ کچھ دیر اس انتظار میں بیٹھے رہے شاید کوئی نیا حکم نازل ہو جو اس کو منسوخ کر دے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خیمہ سے باہر تشریف لائے اور اپنا سر مبارک منڈایا۔یہ دیکھ کر صحابہ کرام بھی اٹھے بعض نے سر منڈائے اور بعض نے بال کٹوائے۔جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سر منڈانے والے پر رحمت فرمائے لوگوں نے عرض کی بال کٹوانے والوں کے لیے دعا فرمائیں آپ نے پھر سر منڈانے والوں کے لیے دعا فرمائی اور پھر تیسری مرتبہ بال کٹوانے والوں کے لیے دعا فرمائی۔ سات سات صحابہ ایک اونٹ میں شریک تھے۔ان کی کل تعداد 1400 چودہ سو تھی اور وہ حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے جو حرم کی حدود سے باہر تھا۔اور بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ حرم کے کنارے پر واقع ہے۔یہی وجہ ہے کہ علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا یہ حکم ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جن کو دشمن نے روک دیا ہو یا مرض یا کسی مجبوری کی وجہ سے اس طرح احرام کھولا جا سکتا ہے۔حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ صرف دشمن سے روکنے کی صورت میں ہی یہ حکم ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی بیمار ہو جائے، یا راستہ بھٹک جائے تو اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم عام ہے اور اس کی دلیل حجاج بن عمرو انصاری کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو کوئی چوٹ لگ جائے یا تکلیف ہو، یا لنگڑا ہو جائے تو وہ اپنا احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج لازم ہے(1)۔راوی حدیث فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا ذکر حضرت ابو ہریرہ اور ابن عباس سے کیا تو انہوں نے فرمایا یہ صحیح ہے۔اصحاب سنن نے بھی اسے روایت کیا ہے۔حضرت عبد اللہ بن مسعود، ابن جبیر، علقمہ، سعید بن مسیّب، عکرمہ عروہ بن زبیر، مجاہد، ابراہیم نخعی، عطاء اور مقاتل بن حیان سے بھی یہی مروی ہے کہ دشمن کے روکنے کی صورت میں اور کسی مرض اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کی صورت میں بھی یہی حکم ہے۔حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں ہر وہ چیز جو انسان کو تکلیف پہنچانے والی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ضباعہ بنت جبیر کے پاس تشریف لائے۔اس نے عرض کی یا رسول اللہ! میرا حج کا ارادہ ہے لیکن میں اکثر بیمار رہتی ہوں۔آپ نے فرمایا حج

1۔مسند امام احمد 350/3 2۔مسند امام احمد 292/3

کو چلی جاؤ اور یہ شرط رکھ لو کہ میرے احرام سے فارغ ہونے کی وہی جگہ ہے جہاں مرض کی وجہ سے رک جاؤں (2)۔ اسی حدیث کی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا کہ حج میں اس قسم کی شرط رکھنا جائز ہے۔ حضرت شافعیؒ فرماتے ہیں اگر یہ حدیث صحیح ہو تو میرا بھی یہی قول ہے۔ امام بیہقی اور دوسرے محققین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: حضرت علی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک بکری ذبح کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں اونٹ، گائے، بکری اور بھیڑ میں سے کسی ایک کو ذبح کرسکتا ہے خواہ نر ہو یا مادہ۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ بکری کافی ہے۔ یہی قول حضرات عطاء، مجاہد، طاؤس، ابو عالیہ، محمد بن علی بن حسین، عبدالرحمٰن بن قاسم، شعبی، ابراہیم نخعی، حسن بصری، قتادہ، ضحاک، مقاتل بن حیان وغیرہم کا ہے۔ اور یہی آئمہ اربعہ کا ہے۔ حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے تھے کہ اس سے مراد صرف اونٹ اور گائے ہیں۔ حضرت سالم، قاسم عروہ بن زبیر اور سعید بن زبیر سے بھی یہی مروی ہے اور غالباً ان کی دلیل صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ اس میں کسی صحابی کا بکری کو ذبح کرنا منقول نہیں۔ انہوں نے صرف اونٹ اور گائے کو ذبح کیا تھا۔ حضرت جابر روایت فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ تم سات سات ایک ایک اونٹ اور گائے میں شریک ہو جاؤ (1)۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ جس جانور کی وسعت رکھتا ہو ذبح کرلے، اگر مالدار ہے تو اونٹ ذبح کرے اور اس سے کم حیثیت والا ہے تو گائے ورنہ بکری۔ حضرت ہشام بن عروہ فرماتے ہیں اس کا دارومدار جانور کے مہنگے یا سستے ہونے پر ہے اور جمہور علماء نے یہ جو فرمایا ہے کہ بکری ہی کافی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم کا حکم یہ ہے کہ جو آسانی سے میسر ہو یعنی کم از کم وہ چیز جس پر قربانی کا اطلاق ہو سکے۔ قربانی کے جانوروں میں اونٹ گائے، بھیڑیں، بکریاں سب شامل ہیں جیسا کہ ترجمان قرآن حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ بکری کی قربانی دی تھی۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ: اس کا عطف وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ پر ہے نہ کہ "فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ" پر جیسا کہ ابن جریر کا خیال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر جب کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو حرم مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تو انہوں نے حرم سے باہر ہی سر منڈوا لیے اور اپنی قربانی کے جانوروں کو ذبح کرلیا۔ لیکن امن کی حالت میں اگر حاجی حرم میں پہنچ سکتے ہوں تو ان کے لیے اس وقت تک سر منڈانا جائز نہیں جب تک قربانی کا جانور اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے اور وہ حاجی حج اور عمرہ کے مناسک سے فارغ نہ ہو جائے اگر اس نے حج اور عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا ہو۔ اسی طرح اگر اس نے صرف حج کا ارادہ کیا ہے یا وہ حج تمتع کرنے والا ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت حفصہ عرض کرتی ہیں یا رسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے کہ لوگوں نے عمرہ کر کے احرام کھول دیے ہیں لیکن آپ بدستور احرام باندھے ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں نے اپنے سر کے بالوں کو چپکا دیا تھا اور قربانی کے جانور کے گلے میں قلادہ ڈال دیا تھا اس لیے میں قربانی کرنے کے وقت تک احرام نہیں کھول سکتا۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا: حضرت عبداللہ بن معقل فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت کعب بن عجرہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا لوگ مجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئے اس حال میں کہ میرے سر کی جوئیں چہرے پر گر رہی تھیں مجھے دیکھ کر آپ نے فرمایا میرا خیال نہیں تھا تم اس حالت کو پہنچ جاؤ گے۔ کیا تم میں ایک بکری ذبح کرنے کی طاقت نہیں ہے، میں نے عرض کی نہیں، مفلس ہوں۔ فرمایا جاؤ اپنا سر منڈ والو۔ پھر تین روزے رکھ لینا یا چھ مساکین کو نصف نصف صاع اناج دے دینا اس وقت خصوصاً

1۔ صحیح مسلم: 26/4 2۔ صحیح البخاری: 13/3

میرے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی لیکن حکم کے اعتبار سے سب کے لیے عام ہے (2)۔ اور امام احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی پاک ﷺ میرے قریب سے گزرے میں ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہا تھا۔ اور میرے سر سے چہرے پر جوئیں گر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا کیا یہ جوئیں تمہیں تکلیف دیتی ہیں میں نے عرض کی ہاں تو آپ نے حکم فرمایا سر منڈ وا۔ پھر تین روزے رکھ لینا، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دینا، یا ایک بکری ذبح کر دینا۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کا ہے فرماتے ہیں اس وقت میرے سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ اس حدیث کو امام مالک نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے بکری ذبح کی۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نسک سے مراد بکری ذبح کرنا ہے۔ اور اگر کوئی روزہ رکھنا چاہے تو تین رکھے۔ یا ایک فرق (1) اناج چھ مساکین میں تقسیم کرے۔ حضرات مجاہد، عکرمہ، عطاء، طاؤس، حسن بصری، امیر الاعراج، ابراہیم نخعی اور ضحاک سے بھی یہی قول منقول ہے بلکہ ائمہ اربعہ اور جمہور علماء یہی فرماتے ہیں کہ اس کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو تین روزے رکھ لے، اگر چاہے تو تین صاع چھ مسکینوں پر تقسیم کر دے اور اگر چاہے تو بکری ذبح کر کے اس کا گوشت مساکین میں تقسیم کر دے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رخصت عطا کرنا تھی اس لیے پہلے روزہ کا ذکر کیا پھر اناج صدقہ کرنے کا پھر قربانی کرنے کا۔ اور جب نبی پاک ﷺ نے کعب بن عجرہ کو یہ مسئلہ بتایا آپ نے پہلے افضل چیز کا بیان فرمایا یعنی فرمایا بکری ذبح کرو، اگر یہ نہیں تو چھ مسکینوں کو اناج دو، یا تین روزے رکھو۔ بہر حال دونوں ترتیبیں دونوں مقام کے اعتبار سے گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیم نخعی نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔ پہلے تو اناج دینے کا حکم دیا جائے گا اگر اس کے پاس ہو نہیں تو بکری خریدے وگرنہ بکری کی قیمت کے برابر اناج صدقہ کرے نہیں تو ہر نصف کے بدلہ میں ایک دن کا روزہ رکھے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں جب محرم کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو بال منڈوا دے تین میں سے کسی ایک پر عمل کرے ا۔ دس روزے رکھے ۲۔ دس مسکین پر صدقہ کرے اس طرح کہ ہر مسکین کو ایک مکوک کھجوریں اور ایک مکوک گندم دے ۳۔ بکری ذبح کرے۔ حضرت حسن اور عکرمہ سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ لیکن یہ دونوں قول ضعیف ہیں کیونکہ حضرت کعب بن عجرہ والی حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ ایسے شخص کو اختیار ہے، چاہے تین روزے رکھ لے، چاہے چھ مسکینوں کو اناج دے اور چاہے ایک بکری ذبح کرے۔ ہاں یہ ترتیب احرام کی حالت میں شکار کرنے والے کے لئے ہے جیسا کہ نص قرآنی سے ثابت ہے اور اس پر فقہاء کا اجماع ہے۔ مگر یہاں یہ ترتیب درست نہیں۔ حضرت طاؤس فرمایا کرتے تھے کہ قربانی اور مساکین پر صدقہ مکہ میں کرے اور روزے جہاں چاہے رکھ لے۔ ابوالاسماء جو کہ ابن جعفر کے مولا ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان حج کے لئے نکلے تو ان کے ساتھ حضرت علی اور حضرت حسین بن علیؓ بھی تھے۔ ابوالاسماء فرماتے ہیں کہ میں ابن جعفر کے ساتھ تھا۔ دوران سفر میں نے ایک شخص کو سویا ہوا پایا۔ اس کی اونٹنی اس کے سرہانے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے جگایا تو وہ حضرت حسین بن علیؓ تھے۔ ابن جعفر نے ان کو اٹھایا یہاں تک کہ ہم اسے لے کر سقیاء میں پہنچ گئے۔ اور حضرت علی کو اطلاع دی آپ کے ساتھ اسماء بنت عمیس تھیں۔ ہم نے بیس دن ان کی تیمار داری کی۔ پھر ایک دن حضرت علیؓ نے آپ سے آپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ حضرت حسین نے اپنے ہاتھ کے ساتھ سر کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ سر منڈ والو۔ پھر ایک اونٹ منگوایا اور ذبح کیا۔ اگر یہ اونٹ کا ذبح کرنا فدیہ کے طور پر تھا پھر یہ مکہ کے باہر ذبح ہوا اور اگر احرام کھولنے کی وجہ سے تھا تو پھر واضح ہے۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ: جب تم حج کے باقی مناسک ادا کرنے سے فارغ ہو جاؤ تو حج تمتع کرنے والا قربانی کرے خواہ اس نے حج اور عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا ہو یا پہلے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور اس سے فارغ ہو گیا ہو اور پھر حج کا احرام باندھ لیا ہو۔ یہی اصل حج تمتع ہے اور فقہاء

1۔ فرق: 3 صاع

کے کلام میں بھی یہی مشہور ہے۔مگر عام تمتع ان دونوں قسموں میں شامل ہے جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔بعض راوی فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے حج تمتع کیا۔بعض فرماتے ہیں کہ آپ کا حج قران ہے۔بہر حال اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ آپ قربانی کے جانور ساتھ لے گئے تھے۔اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حج تمتع کرنے والا جس قربانی پر قادر ہو وہ گائے بھی ذبح کرسکتا ہے کیونکہ رسول ﷺ نے اپنی ازواج کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی۔اور وہ سب حج تمتع کرنے والی تھیں۔اس سے حج تمتع کا مشروع ہونا ثابت ہوگیا۔جیسا کہ حضرت عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ حج تمتع کا حکم قرآن پاک میں نازل ہوا۔ہم نے رسول ﷺ کے ساتھ حج تمتع کیا پھر نہ تو قرآن پاک میں اس کی ممانعت نازل ہوئی اور نہ ہی رسول پاک ﷺ نے اس سے روکا۔پھر لوگوں نے اپنی رائے سے اسے ممنوع قرار دے دیا۔امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت عمر ہیں کیونکہ آپ ہی لوگوں کو حج تمتع سے روکا کرتے تھے۔آپ فرماتے تھے کہ ہم کتاب اللہ پر عمل کریں گے۔اللہ تعالیٰ ہمیں حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ '' درحقیقت حضرت عمر لوگوں کو حج تمتع سے اس لیے نہیں روکتے تھے کہ وہ اس کو حرام سمجھتے تھے بلکہ آپ کا اس سے مقصد یہ تھا کہ لوگ بکثرت حج اور عمرہ کا قصد کر کے بیت اللہ شریف آئیں۔جیسا کہ آپ سے یہ صراحۃً بھی مروی ہے۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ : یعنی جو قربانی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ تین روزے حج کے ایام میں رکھے۔علماء فرماتے ہیں اولیٰ یہ ہے کہ تین روزے یوم عرفہ سے پہلے ذوالحج کے مہینے میں رکھے حضرت عطاء کا قول ہے۔حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ احرام باندھنے کے بعد تین روزے رکھ سکتا ہے کیونکہ قرآن پاک میں ''فِي الْحَجِّ'' کے الفاظ ہیں۔حضرت طاؤس اور مجاہد اور بعض دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ وہ شوال میں روزے رکھ سکتا ہے۔امام شعبی فرماتے ہیں کہ یوم عرفہ اور اس سے دو دن پہلے ملا کر تین روزے رکھ لے تو یہ بھی جائز ہے۔اور یہی قول حضرات مجاہد، سعید بن جبیر، سدی عطاء، طاؤس، حکم حسن بصری وغیرہ سے بھی مروی ہے۔اور حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی کہ اگر وہ شخص قربانی کا جانور نہ پائے تو وہ یوم عرفہ اور اس سے پہلے دو دن کو ملا کر تین دن روزے رکھ لے اور سات روزے اس وقت رکھے جب وہ گھر واپس لوٹ آئے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک روزہ یوم ترویہ سے پہلے رکھے دوسرا یوم ترویہ کو تیسرا عرفہ کے دن رکھے۔امام جعفر سے بھی یہی منقول ہے۔اگر کوئی شخص عید سے پہلے روزے نہ رکھ سکا۔تو کیا ایام تشریق میں اس کے لیے روزے رکھنا جائز ہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں۔امام شافعیؒ کے قدیم قول کے مطابق وہ ان دنوں میں روزے رکھ سکتا ہے۔کیونکہ حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایام تشریق میں صرف وہی روزہ رکھ سکتا ہے جو قربانی کے جانور کو نہ پائے۔یہی قول حضرت زین بن العابدین کا ہے۔عبید بن عمیر بن عمیر لیثی، عکرمہ، حسن بصری اور عمرو بن زبیرؓ سے بھی یہی مروی ہے۔انہوں نے فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ کے عموم سے استدلال کیا ہے۔امام شافعیؒ کا جدید قول یہ ہے کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنا جائز نہیں۔کیونکہ قتیبہ ہذلی حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔

وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ : اس میں بھی دو قول ہیں ایک یہ کہ جب تم اپنی قیام گاہ کی طرف واپس لوٹو تو سات روزے رکھو۔اس لیے مجاہد فرماتے کہ اگر کوئی شخص دوران سفر روزے رکھنا چاہتا ہے تو اسے رخصت ہے۔اور یہی قول عطاء بن ابی رباح کا ہے۔اور دوسرا قول یہ ہے کہ جب تم اپنے وطن واپس لوٹ آؤ اس وقت روزے رکھو۔یہ قول حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ہے۔نیز سعید بن جبیر، ابو عالیہ، مجاہد، عطاء، عکرمہ، حسن بصری وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ابن جریر نے کہا کہ اس پر علماء کا اجماع ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے حج الوداع میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر تمتع کیا۔آپ نے ذوالحلیفہ سے ہی قربانی کے جانور اپنے ساتھ لے لیے۔پہلے

آپ نے عمرہ کا احرام باندھا پھر آپ نے حج کا تلبیہ کہا۔ لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ حج تمتع کیا۔ رسول ﷺ نے پہلے عمرہ ادا کیا لوگوں میں سے بعض قربانی کے جانور ساتھ لے گئے تھے اور بعض ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ آپ نے فرمایا جس کے پاس قربانی کا جانور ہے وہ اپنا حج پورا کرنے سے پہلے احرام نہ کھولے اور جن کے پاس قربانی کا جانور نہیں وہ طواف اور سعی کرنے کے بعد اپنے بالوں کو کتروائے اور احرام کھول دے۔ پھر دوبارہ حج کے لیے احرام باندھے۔ اور جو شخص قربانی کا جانور نہیں پاتا ہو حج کے دنوں میں تین روزے رکھنے اور سات روزے گھر لوٹ کر رکھے۔(1)

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ: بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ خاص تاکید کے لیے ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں میں نے اسے دونوں آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سنا اور اپنے ہاتھ سے لکھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (انعام: 38) ''ترجمہ: اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دونوں پروں سے اڑتا ہو''۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (عنکبوت: 48) اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے اپنے دائیں ہاتھ سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان دس روزوں کو مکمل اور تمام کرنے کا حکم ہے۔ اور بعض نے کاملہ کا یہ معنی کیا ہے کہ یہ روزے قربانی کے جانور کے بدلے میں کافی ہیں۔

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ: اس بات پر تو علماء کا اجماع ہے کہ اہل حرم والے حج تمتع نہیں کر سکتے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اہل حرم ہیں۔ حضرت عباسؓ فرمایا کرتے تھے: اے اہل مکہ تمہارے لیے حج تمتع نہیں ہے۔ بلکہ یہ باہر سے آنے والوں کے لیے ہے۔ تمہارے لیے یہ حرام ہے۔ کیونکہ تمہیں عمرہ کے لیے زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی تم تو تھوڑی دور جا کر عمرہ کا احرام باندھ لیتے ہو۔ یہی قول حضرت طاؤس سے مروی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل حرم اور وہ لوگ ہیں جو مواقیت (احرام باندھنے کا مقام) اور حرم کے درمیان میں رہتے ہیں۔ یہ قول حضرت عطاء سے منقول ہے اور مکحول سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔ حضرت عطاء سے یہ بھی مروی ہے کہ میدان عرفات، مزدلفہ، عرناء، رجیع والوں کا بھی یہی حکم ہے وہ تمتع نہیں کر سکتے۔ حضرت زہری فرماتے ہیں جو شخص ایک دن یا ایک دن کی زائد مسافت پر ہو وہ تمتع کر سکتا ہے۔ اور ایک روایت میں دو دن کی مسافت بھی مروی ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اہل حرم اور جو اتنے فاصلے پر ہوں کہ وہاں اہل مکہ کے لیے نماز قصر کرنا جائز نہ ہو ان سب کے لیے یہی حکم ہے۔ کیونکہ ان سب کو حاضر شمار کیا جاتا ہے نہ کہ مسافر۔ واللہ اعلم۔ پھر ارشاد ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں جن چیزوں کا حکم دیا اور جن چیزوں سے روکا ہے ان میں اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: یعنی جو شخص اس کے حکم کی مخالفت کرنے والا ہے اور معاصی کا مرتکب ہے اللہ تعالیٰ اسے سخت سزا دیتا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ڼ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷

''حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں پس جو نیت کرلے ان میں حج کی تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ نافرمانی اور نہ

1۔ البخاری: 25/2

جھگڑا حج کے دنوں میں اور جو تم نیک کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پرہیز گاری ہے اور ڈرتے رہو مجھ سے اے عقلمندو!''۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ: علمائے نحو کا اس جملہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حج سے مراد چند معلوم اور مقرر مہینوں میں حج کرنا ہے۔ اس اعتبار سے ان مہینوں میں حج کا احرام باندھنا اکمل و افضل ہے گو ان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی احرام باندھنا صحیح ہے۔ امام مالک، ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، اسحاق بن راھویہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، لیث بن سعد کا بھی یہی قول ہے۔ انہوں نے اس آیت کریمہ۔ يَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (بقرہ:189) '' ترجمہ: دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق، فرمائیے یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے''۔ سے استدلال کیا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حج اور عمرہ کو نسک کہا گیا ہے۔ جب عمرہ کا احرام سارا سال باندھنا صحیح ہے تو حج کا احرام باندھنا بھی صحیح ہو۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں میں یہ احرام باندھنا صحیح ہے۔ اور اگر کسی نے ان مہینوں سے پہلے احرام باندھا تو اس کا احرام صحیح نہیں ہوگا۔ کیا اس احرام سے عمرہ کر سکتا ہے۔ اس کے بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ انکی دلیل یہی آیت کریمہ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ہے۔ بعض دوسرے علماء نحو فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ حج کا وقت کچھ معلوم مہینے ہیں جو یہاں سال کے مہینوں میں سے چند ماہ کو حج کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ان مہینوں سے پہلے احرام باندھنا صحیح نہیں ہوگا۔ جیسا کہ وقت داخل ہونے سے نماز پڑھنا صحیح نہیں۔ امام شافعیؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اس روایت کی دوسری بھی بہت سی اسناد ہیں اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ان مہینوں میں احرام باندھنا سنت ہے۔ صحابی کا یہ قول کہ '' فلاں چیز سنت ہے'' حدیث مرفوع کا حکم رکھتا ہے۔ خصوصا حضرت ابن عباسؓ کا قول جن کو ترجمان قرآن کہا جاتا ہے۔ حضرت جابرؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کسی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ حج کا احرام باندھے مگر حج کے مہینوں میں۔ اس کی سند بھی اچھی ہے۔ لیکن امام شافعی اور بیہقی نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ آپ سے یہ پوچھا گیا کہ کیا کوئی حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھ سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اور یہ موقوف حدیث اس مرفوع حدیث سے اصح ہے۔ پھر صحابی کے فتویٰ سے اس مذہب کی مزید تائید ہوتی ہے۔

اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔ ان سے مراد شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحج کے پہلے دس دن ہیں۔ امام بخاری نے اسے معلق ذکر کیا ہے۔ اور ابن جریر نے اسے موصول، اس کے علاوہ حاکم نے اس کو مستدرک میں روایت کر کے شیخین کی شرط پر کہا ہے۔ اور یہی حضرات عمر، علی، عبداللہ بن مسعود عبداللہ بن زبیر اور ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ اور یہی حضرت عطاء، طاؤس، مجاہد، ابراہیم نخعی، شعبی اور حسن بصریؒ وغیرہم سے منقول ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، ابو یوسف اور ابوثور کا بھی یہی مذہب ہے۔ اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ ''اَشْهُرٌ'' کا لفظ اگرچہ جمع ہے۔ لیکن اس کا اطلاق دو مہینوں اور تیسرے مہینے کے دس دنوں پر تغلیب کے طور پر ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں کہ میں نے اسے اس سال دیکھا یا آج کے دن دیکھا تو ظاہر بات ہے کہ پورا سال یا پورا دن انسان نہیں دیکھتا بلکہ دیکھنے کا وقت تھوڑا سا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (بقرہ:203) '' ترجمہ: اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔ یہاں بھی دو دن بول کر ڈیڑھ دن مراد ہے۔ امام مالکؒ اور

امام شافعیؒ کے پہلے قول کے مطابق حج کے مہینے شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحج کا پورا مہینہ ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی یہی مروی ہے اور یہی قول ابن شہاب، عطاء اور صحابی رسول جابر بن عبداللہ سے منقول ہے۔ حضرت طاؤس، مجاہد عروہ بن زبیر، ربیع بن انس اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس کا ذکر ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے لیکن یہ حدیث موضوع ہے کیونکہ اس کا ایک راوی حصین ابن مخارق ہے جس پر وضع حدیث کی تہمت لگائی گئی ہے۔ بلکہ اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت نہیں۔ امام مالک کے اس مذہب کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ ذوالحج کا مہینہ حج کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں عمرہ کرنا مکروہ ہے نہ یہ کہ عید کے بعد بھی حج ہوسکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حج کے معلوم مہینے ہیں جن میں عمرہ کرنا صحیح نہیں۔ ابن جریر بھی اس کی یہی وضاحت فرماتے ہیں۔ جن لوگوں کا یہی مذہب ہے کہ ذوالحج کا پورا مہینہ حج میں داخل ہے ان کا مطلب یہی ہے کہ اس مہینے میں عمرہ نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ حج کے مناسک ایام منیٰ کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ محمد بن سیرین فرماتے ہیں۔ تمام اہل علم کے نزدیک حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کرنا افضل ہے۔ ابن عون فرماتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد سے حج کے مہینوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ ان مہینوں میں عمرہ کو مکمل نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ان مہینوں کے علاوہ عمرہ کو پسند کرتے تھے اور حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے سے روکتے تھے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ: اس ارشاد باری تعالیٰ میں حج کے لیے احرام باندھنے اور اسے پورا کرنے کی دلیل ہے۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں فرض کا معنی واجب اور لازم کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے حج یا عمرے کا احرام باندھا۔ عطاء فرماتے ہیں کہ یہاں فرض سے مراد احرام باندھنا ہے۔ یہی قول ابراہیم نخعی اور ضحاک وغیرہ کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ حج کا احرام باندھنے اور تلبیہ کہنے کے بعد پھر مقیم ہونا صحیح نہیں۔ ابن مسعودؓ، ابن زبیرؓ، مجاہد، عطاء ابراہیم نخعی، سفیان ثوری وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ طاؤس، اور قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ یہاں فرض سے مراد تلبیہ (لبیک کہنا) ہے۔

فَلَا رَفَثَ: یعنی جس نے حج یا عمرے کا احرام باندھا اسے رفث سے اجتناب کرنا چاہیے اور رفث سے مراد جماع ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (بقرہ:187) ''ترجمہ: حلال کر دیا گیا تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانے کو''۔ احرام کی حالت میں جماع اور اس کی دواعی یعنی معانقہ اور بوس و کنار بھی حرام ہے۔ اسی طرح عورتوں کی موجودگی میں اس کے متعلق گفتگو ممنوع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مردوں کے سامنے بھی ایسی باتیں کرنا جائز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے احرام کی حالت میں ایک شعر پڑھا۔ جس میں عورتوں کا ذکر تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ احرام کی حالت میں یہ کیسا شعر پڑھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ عورتوں کے سامنے یہ شعر پڑھنا رفث ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''رفث'' سے مراد اشارۃً اور کنایۃً جماع کرنا ہے اور یہ رفث کا ادنیٰ درجہ ہے اور عطاء بن ابی رباحؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جماع اور فحش گوئی ہے یعنی کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ جب احرام کو کھولیں گے تو جماع کریں گے۔ اسی طرح بوس و کنار چھیڑ چھاڑ اور اشارہ کرنا سب رفث میں شامل ہیں۔ اور احرام کی حالت میں یہ سب حرام ہیں۔

وَلَا فُسُوْقَ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ کی معصیت اور اس کی نافرمانی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں اس سے مراد شکار وغیرہ کر کے اللہ کی نافرمانی کرنا ہے۔ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حرم کی حدود میں اللہ کی معصیت کا ارتکاب کرنا ہے۔ بہت سے دوسرے مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہاں ''فسوق'' سے مراد گالی گلوچ ہے۔ جیسا کہ حدیث

پاک میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کے ساتھ جھگڑا کرنا کفر ہے(1)۔ حضرت عبد الرحمٰن بن زید فرماتے ہیں کہ یہاں ''فسوق'' سے مراد بتوں کیلئے جانوروں کو ذبح کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ(انعام:145) ضحاک فرماتے ہیں کہ یہاں اس سے مراد کسی کو برے الفاظ سے یاد کرنا ہے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی اس میں داخل ہے۔ اگر چہ یہ فسق ہر وقت حرام ہے لیکن ان حرمت والے مہینوں میں اس کی حرمت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا: مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ (توبہ:36) '' ان میں سے چار عزت والے ہیں۔ یہی دین قیم ہے۔ پس نہ ظلم کرو ان مہینوں میں اپنے آپ پر''۔ اسی طرح حرم شریف کے بارے میں ارشاد فرمایا: مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ(الحج: 25)'' ترجمہ: اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق۔ تو ہم اس کو چکھائیں گے دردناک عذاب''۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہاں فسق سے مراد وہ امور ہیں جو احرام کی حالت میں ممنوع ہیں۔ جیسے شکار کھیلنا بال منڈوانا، ناخن کٹوانا، وغیرہ۔ لیکن ہم نے جو بیان کیا ہے وہی تفصیل بہتر ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا نہ اس نے رفث کیا نہ فسق۔ تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جائے گا جس طرح جنم کے وقت تھا۔

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ: اس میں دو قول ہیں (1) دوران حج حج کے مناسک ادا کرتے وقت جھگڑا نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے واضح اور اکمل طور پر بیان فرما دیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینوں کو بیان فرما دیا ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کے درمیان جھگڑا نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری روایت میں فرمایا۔ اب حج کے کسی مہینے کو آگے پیچھے نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس میں جھگڑا کیا جائے گا جس طرح کہ مشرکین مکہ کیا کرتے تھے۔ جن کی مذمت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمائی ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ حج میں لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ قریش مزدلفہ میں مشعر حرام کے قریب ٹھہرتے تھے اور باقی عرب عرفات میں ٹھہرتے تھے۔ یہ لوگ آپس میں جھگڑتے تھے اور ہر کوئی کہتا کہ ہم صحیح راہ اور طریق ابراہیمی پر ہیں۔ یہاں اس کی ممانعت کی جارہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تمام مناسک حج سے آگاہ کر کے اس جھگڑے کا خاتمہ کر دیا۔

(2) اس سے مراد لڑائی جھگڑا کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھی سے لڑائی کر کے اسے غصہ دلا دے۔ یہی قول عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ اسی طرح ابو العالیہ، عطاء، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ وغیرہم سے منقول ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ لوگ حج میں لڑائی جھگڑا کرنا پسند کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد گالی گلوچ اور آپس میں لڑائی جھگڑے کرنا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، طاؤس اور محمد بن کعبؒ فرماتے ہیں کہ جدال سے مراد لڑائی جھگڑا ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ جدال سے مراد یہ ہے کہ کوئی اپنے مسلمان بھائی کو غصہ دلا دے لیکن اپنے غلام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا اس میں داخل نہیں۔ مگر اسے مارنا نہیں چاہیے۔ میرے نزدیک اسے مارنا جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ فرماتی ہیں کہ ہم سفر حج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ حتیٰ کہ جب ہم مقام ''عرج'' پر پہنچے تو رسول اللہ ﷺ اپنی سواری سے اترے پڑاؤ کیا۔ سیدہ عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھیں اور میں اپنے والد ابوبکرؓ کے پاس بیٹھ گئی۔ میرے والد کے غلام کے پاس رسول اللہ ﷺ کا سامان تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بغیر اونٹ کے آ گیا۔ انہوں پوچھا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ کل رات مجھ سے اونٹ گم ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا تمہارے پاس ایک ہی اونٹ تھا وہ بھی تم نے گم

1۔ البخاری: 1/1

کر دیا اور غصہ میں آ کر اسے مارنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ مسکراتے ہوئے فرمار ہے تھے۔ دیکھو یہ احرام کی حالت میں کیا کر رہے ہیں (1)۔ اس حدیث ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس لیے بعض سلف سے یہ بھی مروی ہے کہ ساربان کو مارنا کمال حج ہے۔ لیکن یہ یادرہے کہ نبی کریم ﷺ کا حضرت ابوبکرؓ کا اس طرح فرمانا نہایت ہی پرلطف انکار کے طور پر تھا۔ اس لیے اسے ترک کرنا ہی اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنا حج اس طرح ادا کیا کہ دوسرے مسلمان اس کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ رہے تو اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ: چونکہ پہلے حجاج کرام کو قبیح افعال واقوال سے روکا تھا۔ اب یہاں نیکی کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس چیز سے بھی باخبر کر دیا ہے کہ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اس لیے قیامت کے دن نیکیوں کا بہترین بدلہ عطا فرمائے گا۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ لوگ بغیر زادراہ کے حج کے لئے نکلا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کے گھر کا حج کرنے نکلے ہیں کیا وہ ہمیں کھلائے گا نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ زادراہ ساتھ لے لیا کرو تا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ عکرمہ اور ابن عیینہ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہل یمن حج کے لئے نکلتے تو زادراہ ساتھ نہ لیتے اور کہتے کہ ہم اللہ پر بھروسہ کرنے والے ہیں۔ اسے ابن حبان، ابن جریر اور ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ جب احرام باندھتے تو وہ اپنے پاس موجود زاد راہ کو پھینک دیتے اور نئے سرے سے زادراہ لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا اور ان کو اس فعل سے روکا۔ اور انہیں حکم دیا کہ وہ آٹا، ستو وغیرہ زادراہ کے طور پر لے لیا کریں۔ یہی قول حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، ابوالعالیہ، مجاہد، شعبی، عکرمہ، ابراہیم نخعی، سالم بن عبداللہ، عطاء خراسانی، قتادہ، ربیع بن انس اور مقاتل بن حیان سے منقول ہے۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ خشک اناج اور ستو وغیرہ لے لیا کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سفر میں عمدہ زادراہ لینا انسان کی خوبی میں سے ہے۔ بلکہ آپ اسی شخص کو سفر میں لے جاتے جو سفر میں اس خوبی کا مظاہرہ کرتا۔

فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى: جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں زادراہ ساتھ لینے کا حکم فرمایا تو اس کے ساتھ ساتھ اخروی زادراہ کی طرف بھی رہنمائی فرمائی۔ اور اس سے مراد اپنے آپ کو تقوی سے متصف کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف:26) ''ترجمہ: (یہ لباس) تمہارے لئے باعث زینت ہے اور پرہیز گاری کا لباس سب سے بہتر ہے''۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے پھر ظاہری لباس کا ذکر فرمایا پھر اس کے ساتھ ہی معنوی لباس کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس سے مراد خشوع وخضوع، اطاعت وتقویٰ ہے اور بعد میں فرمایا کہ یہی ظاہری لباس سے بہتر اور نفع مند ہے۔ حضرت عطاء خراسانی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد آخرت کا زادراہ ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اس دنیا میں زادراہ لیتا ہے تو وہ زادراہ اسے آخرت میں بھی فائدہ دیتا ہے۔ مقاتل بن حیان فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو ایک مسکین شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے پاس تو کوئی ایسی چیز نہیں جو زاد راہ کے طور پر لے سکیں۔ آپ نے فرمایا: اتنا ضرور لو کہ کسی سے سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ اور بہترین زادراہ خدا کا خوف ہے۔

وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ: اے اصحاب عقل ودانش! میرے عذاب وسزا اور انتقام سے بچو۔ اور میرا یہ عذاب اس کے لیے ہے جو میرے حکم کی مخالفت کرے اور اس سے روگردانی کرے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

1۔ ابن ماجہ 2933

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

''نہیں ہے تم پر کوئی حرج (اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل (رزق) پھر جب واپس آؤ عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا اور اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے''۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز نامی میلے لگتے تھے۔ صحابہ کرام ایام حج میں ان میں خرید وفروخت اور تجارت کو گناہ سمجھتے تھے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور انہیں اجازت ہوگئی کہ ایام حج میں تجارت کرنا ممانعت نہیں ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حج سے پہلے اور حج کے بعد خرید وفروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور آپ کی قرات میں ''مِّنْ رَّبِّكُمْ'' کے بعد ''فِي مَوَاسِمِ الْحَجِّ'' کے کلمات بھی ہیں۔ اور یہ قرأت ابن زبیرؓ سے بھی مروی ہے۔ حضرات مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، منصور بن معتمد، قتادہ، ابراہیم النخعی اور ربیع بن انس وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابو اسیمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص حج پر جا رہا ہو اور اس کے پاس سامان تجارت ہو تو اس کا کیا حکم ہے آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھ کر سنائی۔ یہ روایت موقوف ہے۔ اور اسے مرفوع بھی روایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابو امامہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے عرض کی کہ ہم جانور کرایہ پر دیتے ہیں۔ کیا ہمارا بھی حج ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے۔ میدان عرفات میں نہیں جاتے، شیطانوں کو کنکریاں نہیں مارتے، اپنے سروں کو نہیں منڈواتے۔ میں نے عرض کی ہاں ہم یہ سب کام کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔ یہی سوال ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا تو جبرئیل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ تو اس شخص کو رسول اللہ ﷺ نے بلا کر فرمایا تمہارا حج ہو گیا۔ اس کو عبدالرزاق نے بھی اپنی مصنف میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح یہ حدیث سفیان ثوری سے مرفوعاً روایت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اور بھی اسناد ہیں۔ جن میں کچھ الفاظ کی کمی وبیشی سے یہی حدیث روایت کی گئی ہے۔ حضرت ابو صالح فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ سے عرض کی اے امیر المومنین! کیا آپ حج کے دوران تجارت کیا کرتے تھے تو آپ نے فرمایا: ہماری معیشت کا دارومدار حج میں تجارت پر ہی ہے۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ: عرفات کو غیر منصرف پڑھا گیا ہے حالانکہ اس میں غیر منصرف ہونے کے دو سبب علمیت اور تانیث مفقود ہے۔ منصرف پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں مسلمات اور مومنات کی طرح جمع ہے۔ اس کے ساتھ ایک معین جگہ کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ اس لیے وصل کی رعایت کی وجہ سے اسے منصرف پڑھا جاتا ہے۔ عرفات وہ جگہ ہے جہاں حاجی وقوف کرتے ہیں اور یہ حج کے ارکان میں سے بنیادی رکن ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا حج عرفات ہے۔ اور جو طلوع فجر سے پہلے پہلے میدان عرفات میں پہنچ گیا اس کا حج ہو گیا۔ منیٰ کے تین دن ہیں اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں چلا گیا اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں(1)۔ میدان عرفات میں وقوف کا وقت یوم عرفہ کے دن سورج ڈھلنے سے لے کر قربانی کے دن فجر طلوع ہونے سے پہلے تک ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد سے لے کر سورج غروب ہونے تک عرفات میں وقوف کیا اور فرمایا مجھ

1۔ الترمذی 2975

سے حج کے احکام سیکھ لو۔ اسی حدیث میں آپ نے فرمایا جو فجر طلوع ہونے سے پہلے میدان عرفات میں پہنچ گیا اس نے حج کو پالیا۔ یہی مذہب امام مالک، ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ کا ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ میدان عرفات میں ٹھہرنے کا وقت سورج کے طلوع ہونے سے شروع ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مزدلفہ میں نماز کے لیے نکلے تو ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں طے کی پہاڑیوں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی سواری کو تھکا یا، اپنے آپ کو مشقت میں ڈالا۔ قسم بخدا میں ہر پہاڑ پر ٹھہرتا ہوا آ رہا ہوں کیا میرا حج ہو گیا؟ آپ نے فرمایا جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا اور اس نے ہمارے ساتھ وقوف کیا اور اس سے پہلے وہ دن یا رات کے وقت میدان عرفات میں ٹھہرا ہوا اس کا حج مکمل ہو گیا۔ اور وہ اپنے فریضہ حج سے فارغ ہو گیا (1)۔ حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجا۔ انہوں نے انہیں حج کرایا حتیٰ کہ جب وہ میدان عرفات میں آئے تو انہوں نے پوچھا "عرفت" (آپ نے پہچان لیا) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا (عرفت) چونکہ پہلے بھی ایک مرتبہ تشریف لا چکے تھے۔ اس لیے اس کا نام عرفات پڑ گیا۔ حضرت عطاء سے بھی یہی مروی ہے۔ عَرَفٰتٍ کو مشعر حرام، مشعر اقصیٰ اور الال بھی کہتے ہیں۔ اور اس کے درمیان جو پہاڑ واقع ہے اسے جبل رحمت کہتے ہیں۔ حضرت ابوطالب نے بھی اپنے مشہور قصیدہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

وَبِالْمَشْعَرِ الْاَقْصٰى اِذَا قَصَدُوْا لَهٗ 　 اِلَالٌ اِلٰى تِلْكَ الشِّرَاجِ الْقَوَابِلِ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دور جاہلیت کے لوگ بھی میدان عرفات میں ٹھہرا کرتے تھے اور جب دھوپ پہاڑ کی چوٹیوں پر اتنی باقی رہ جاتی جتنا آدمی کے سر پر عمامہ ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے روانہ ہو جاتے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ اس وقت میدان عرفات سے چلتے جب سورج غروب ہو جاتا پھر مزدلفہ میں تشریف لاتے اور وقوف فرماتے۔ اور فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھتے اور جب صبح خوب روشن ہو جاتی تو سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ کی طرف لوٹتے۔ حضرت مسور بن مخرمہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میدان عرفات میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ اور اللہ کی حمد وثناء کے بعد حسب عادت اما بعد کے الفاظ کہے۔ پھر فرمایا: آج کا دن حج اکبر ہے۔ مشرکین اور بت پرست میدان عرفات سے سورج غروب ہونے سے پہلے مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ جب پہاڑ پر دھوپ اس طرح ہوتی جس طرح لوگوں کے سروں پر عمامے ہوتے ہیں۔ لیکن ہم سورج غروب ہونے کے بعد یہاں سے چلیں گے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے مزدلفہ سے نکلیں گے۔ ہمارا طریقہ مشرکوں کے طریقہ کے برعکس ہے۔ اس کو ابن مردویہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے شیخین کی شرط پر بتایا ہے۔ اس حدیث سے حضرت مسور کا سماع حضور ﷺ سے ثابت ہو گیا۔ بعض محدثین کا یہ قول صحیح نہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت تو کی ہے لیکن آپ سے ان کا سماع ثابت نہیں۔ حضرت معروف بن سوید فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو میدان عرفات سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ گویا کہ وہ منظر ابھی بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ آپ تیز رفتار اونٹ پر سوار تھے، اور آپ کے سر کے اگلے حصہ پر بال نہیں تھے اور آپ فرما رہے تھے۔ ہم نے افاضہ کو پالیا اور اس سے مراد تیزی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی طویل حدیث میں یہ بیان بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ میدان عرفات میں ٹھہرے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا اور زردی پھیل گئی۔ آپ نے اپنے پیچھے حضرت اسامہ کو بٹھایا اور میدان عرفات سے روانہ ہوئے۔ آپ نے اپنی اونٹنی قصوئی کی نکیل کو کھینچا ہوا تھا یہاں تک کہ اس کا سر حضور ﷺ کے پادان تک پہنچ گیا۔ اور آپ دائیں ہاتھ سے لوگوں کو اشارہ فرماتے کہ لوگو! آہستہ سے چلو۔ اور جب بھی کوئی پہاڑی آتی

1۔ جامع الترمذی: 891

تو آپ اونٹنی کی نکیل کو تھوڑا سا ڈھیلا کر دیتے تا کہ وہ آسانی سے چڑھ سکے۔حتیٰ کہ جب آپ مزدلفہ میں پہنچے تو آپ نے ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور ان کے درمیان نوافل نہیں پڑھے۔ پھر آپ نے آرام فرمایا۔ پھر جب فجر طلوع ہوئی تو ایک اذان اور اقامت کے ساتھ فجر ادا کی پھر آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر مشعر حرام تشریف لائے اور قبلہ رو ہو کر دعا اور تسبیح وتہلیل میں مشغول ہو گئے۔ آپ یہیں ٹھہرے رہے۔ جب روشنی خوب پھیل گئی تو سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ کی طرف نکلے (1)۔ حضرت اسامہؓ سے پوچھا گیا کہ جب رسول اللہ ﷺ عرفات سے روانہ ہوئے تو آپ کی رفتار کیسی تھی؟ آپ نے فرمایا: درمیانی تھی۔ راستہ میں جب کشادگی پاتے تو اونٹنی کو ذرا تیز کر دیتے۔ حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ مشعر حرام کے پاس ذکر سے مراد مغرب اور عشاء کی ایک ساتھ نماز پڑھنا ہے۔ حضرت عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو سے مشعر حرام کے بارے میں پوچھا تو آپ خاموش رہے حتیٰ کہ جب ہمارا قافلہ مزدلفہ میں جا کر ٹھہرا تو فرمایا مشعر حرام کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اور فرمایا یہ ہے مشعر حرام۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ تمام مزدلفہ مشعر حرام ہے۔ یہ پہاڑ بھی اور اس کے ارد گرد جگہ بھی۔ آپ نے قزح کی پہاڑی پر جمع ہوتے دیکھا تو فرمایا یہ لوگ یہاں کیوں جمع ہو رہے ہیں یہ تمام علاقہ مشعر حرام میں شامل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، سعید بن جبیر، مجاہد، سدی، ربیع بن انس، حسن بصری اور قتادہؒ فرماتے ہیں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان تمام جگہ مشعر حرام ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء سے پوچھا مزدلفہ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا جب تم میدان عرفات سے چلو تو میدان عرفات کے دونوں کونوں سے لے کر وادیٔ محسب تک پورا علاقہ مزدلفہ ہے۔ اس دوران جہاں بھی ٹھہرنا چاہو ٹھہر سکتے ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ قزح پہاڑی کے قریب ٹھہرو۔ تا کہ لوگوں کے راستے سے یکسوئی ہو جائے۔ مشاعر ظاہری نشانیوں کو کہتے ہیں۔ مزدلفہ کو مشعر حرام اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ حرم کی حدود میں داخل ہے۔ بعض سلف صالحین اور شافعی حضرات جیسے قفال اور ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ مزدلفہ میں ٹھہرنا فرض ہے اس کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ بعض نے اسے واجب کہا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول یہی ہے۔ یعنی اگر کوئی یہاں نہ ٹھہر سکے تو قربانی دینا پڑے گی اور ایک بکری ذبح کرنی پڑے گی۔ بعض نے اس کو مستحب کہا ہے۔ اسے ترک کرنے سے کوئی چیز لازم نہیں آتی۔ اور یہ امام شافعی کا دوسرا قول ہے۔ حضرت زبیر بن مطعم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میدان عرفات پورے کا پورا موقف ہے مگر وادی عرناء سے دور رہو۔ اسی طرح پورا مزدلفہ موقف ہے لیکن بطن محسب سے دور رہا کرو۔ منیٰ کی پوری وادی میں قربانی ہو سکتی ہے۔ تمام ایام تشریق قربانی کے دن ہیں۔ لیکن یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ سلمان بن موسیٰ جن کو اشدق کہتے ہیں۔ انہوں نے زبیر بن مطعم کو نہیں پایا۔ اس حدیث کی دوسری سند بھی ہے واللہ اعلم۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ: چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم کے طریقہ حج کو واضح طور بیان فرما کر مسلمانوں پر انعام فرمایا اس لیے اس نعمت کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے تنبیہ فرماتا ہے کہ میرا ذکر کرو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ یعنی تم حضرت ابراہیم کے طریقہ حج سے بے خبر تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم قرآن اور رسول سے بے خبر ہو۔ بہر حال یہ تینوں قول صحیح اور باہم ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

”پھر تم بھی (اے مغروران قریش) وہاں تک (جا کر) واپس آؤ جہاں جا کر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں، اور معافی مانگو

1۔ صحیح بخاری: کتاب الحج: 92

اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے ولا ہے۔"

ثُمَّ اَفِيْضُوْا: یہاں پر ثُمَّ خبر کا خبر پر عطف کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ تا کہ ترتیب ہو جائے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے میدان عرفات میں ٹھہرنے والے کو حکم دیا کہ وہ مزدلفہ جائے تا کہ مشعر حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرے۔ یہ بھی حکم دیا میدان عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرے۔ جیسا کہ عام لوگ تو میدان عرفات میں ٹھہرتے تھے مگر قریش حرم سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ اور حرم کے آخری کونے میں ٹھہرتے تھے اور فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ والے ہیں اور اس کے شہر کے باشندے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں قریش اور ان کے ہم خیال لوگ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور اپنے آپ کو حمس کہتے تھے اور باقی اہل عرب میدان عرفات میں ٹھہرتے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ پہلے میدان عرفات میں وقوف کرے اور پھر یہاں سے مزدلفہ کی طرف نکلے۔ جس طرح عام لوگ جاتے ہیں۔ یہی قول ابن عباسؓ، مجاہد، عطاء، قتادہ اور سدی وغیرہم کا ہے۔ اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ اور اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

حضرت زبیر بن مطعم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میدان عرفات میں میرا اونٹ گم ہو گیا میں اسے تلاش کرنے کے لیے نکلا۔ تو میں نے نبی کریم علیہ السلام کو وہاں ٹھہرے ہوئے پایا۔ اپنے آپ کو کہنے لگا ان کا تعلق تو حمس سے ہے یہ کیوں حرم سے باہر یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں افاضہ سے مراد شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے لیے مزدلفہ سے منیٰ کی طرف جانا ہے۔ ابن جریر نے اسے ضحاک بن مزاحم سے بھی نقل کیا ہے۔ اور "النَّاسُ" سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے مراد امام وقت ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں اگر اس قول کے خلاف اجماع کی دلیل نہ ہوتی تو یہ قول ہی زیادہ راجح ہے۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ: مومن کو اپنی عبادت کو مکمل کرنے کے بعد اپنے ذکر کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے اور آپ لوگوں کو تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کا حکم دیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ عرفہ کی شام کو رسول اللہ علیہ السلام اپنی امت کے لیے استغفار کیا کرتے تھے۔ حضرت شداد بن اوسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمام استغفاروں کا سردار یہ استغفار ہے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔ آپ نے فرمایا جس شخص نے یہ استغفار رات کو پڑھا اور پھر اسی رات فوت ہو گیا تو وہ جنتی ہو گا اور جس نے دن کے وقت پڑھا اور اسی وقت فوت ہو گیا تو وہ جنتی ہو گا۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی دعا سکھائیے جسے میں نماز میں پڑھا کروں۔ آپ نے فرمایا یہ دعا پڑھا کرو۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ استغفار کے بارے میں بکثرت احادیث مروی ہیں۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

’’ پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الٰہی کرو اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ۔ اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچالے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے حصہ ہے ان کی کمائی سے اور اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے‘‘۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ: افعال حج سے فارغ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ حاجیوں کو کثرت سے ذکر کرنے کا حکم دیتا ہے۔

كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ: اس کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں جس طرح بچہ اپنے ماں باپ کو یاد کرتا ہے اسی طرح تم بکثرت اللہ کو یاد کیا کرو۔ ضحاک اور ربیع بن انسؒ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دور جاہلیت میں جب لوگ حج کے لیے آتے تو کوئی کہتا کہ میرا باپ بڑا سخی تھا، لوگوں کو کھانا کھلاتا۔ کوئی کوئی کہتا میرا باپ مشکل وقت میں لوگ کی کرتا اور ان کے خون بہا ادا کرتا تھا۔ اسی طرح اپنے آباء واجداد کے کارناموں کو بیان کرنے کے علاوہ کوئی ذکر نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت انس بن مالکؓ سے بھی مروی ہے۔ ابو وائل، عطا بن ابی رباح، سعید بن جبیر ایک روایت کے مطابق عکرمہ، مجاہد سدی، عطاء خراسانی، حسن بصری وغیرہم سے بھی یہی مروی ہے۔ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے بکثرت ذکر کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔ اس لیے ’’ اَوْ اَشَدَّ ‘‘ پر زبر تمیز کی وجہ سے پڑھی گئی۔ یعنی اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے بڑوں پر فخر کیا کرتے تھے یا اس سے بھی زیادہ۔ یہاں ’’اَوْ‘‘ خبر میں مماثلت ثابت کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ان آیات میں آیا ہے۔ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ: 74)، يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً (نساء: 77)، اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (صافات: 147)، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (نجم: 9) ان آیات میں ’’ اَوْ ‘‘ قطعاً شک کے لیے نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کثرت ذکر کے بعد اپنی بارگاہ میں بدست بدعا ہونے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ کیونکہ اللہ کے ذکر کے بعد دعا اجابت کے قریب ہوتی ہے اور وہ شخص جو صرف دنیاوی زندگی کے لیے دعا کرتا ہے اس کی مذمت کرتا ہے

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ: خلاق کا معنی نصیب اور حصہ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت بیان فرمائی ہے جو صرف دنیاوی آسائش کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں اور اسی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اس میں وہ شخص بھی شامل ہے جو ان کی مشابہت اختیار کرتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: بعض اعرابی جب حج کے لیے آتے تو صرف یہی دعائیں کرتا اے اللہ! ہمارے اس سال کو بارش والا، زرخیزی والا بنادے اور ہمیں اولاد عطا فرما۔ لیکن وہ آخرت کے بارے میں کوئی سوال نہ کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔ جب کہ مومنین یہ دعا کرتے کہ ’’ اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی۔ اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔‘‘ تو اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرمایا انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا دونوں جہانوں میں سبب ان کی نیک کمائی کے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ: یہ دعا دنیا کی ہر خیر کو جامع اور ہر شر کو دور کرنے والی ہے۔ کیونکہ دنیا کی بھلائی میں عافیت اور راحت، گھر بار، بیوی بچے وسیع رزق، علم نافع، عمل صالح، بہترین سواری اور ہر قسم کی عزت وآبرو شامل ہے۔ اور آخرت کی بھلائی میں سب سے اعلیٰ درجہ

دخول جنت ہے اس کے علاوہ میدان حشر میں گھبراہٹ اور پریشانی سے نجات اور حساب کی آسانی وغیرہ سب داخل ہیں اور دوزخ کی آگ سے نجات کا یہ ذریعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے اسباب مہیا کردے جس سے انسان گناہوں، حرامکاری اور دوسری بری افعال سے بچ سکے۔ حضرت قاسم عبید الرحمٰن فرماتے ہیں: جسے شکرگزار دل اور ذکر کرنے والی زبان اور صبر کرنے والا جسم عطا ہو گیا اسے دنیا و آخرت کی بھلائی عطاء ہوگئی۔ اور وہ دوزخ کے عذاب سے نجات پا گیا۔ احادیث طیبہ میں بکثرت دعا کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ بکثرت یہ دعا پڑھا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ......۔ حضرت قتادہ نے حضرت انس سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کونسی دعا اکثر مانگا کرتے تھے۔ آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت انسؓ خود بھی جب دعا مانگتے تو اس میں یہ دعا ضرور مانگتے۔ حضرت عبدالسلام بن شداد فرماتے ہیں کہ میں حضرت انس بن مالک کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا تو حضرت ثابت نے عرض کی یہ دوست آپ کی خدمت میں دعا کے لیے عرض کررہے ہیں تو آپ نے یہی دعا فرمائی۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد جانے لگے تو پھر دعا کے لیے درخواست کی تو آپ نے فرمایا کیا آپ چاہتے ہو کہ میں تمہارے معاملات کو بکھیر دوں۔ اس دعا میں دنیا وآخرت کی تمام بھلائیاں آگئی ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ ایک شخص کی عیادت کے لیے گئے جو بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کا پنجر بن ہوا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم اللہ تعالیٰ سے کیا دعا کرتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں یہ دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ! جو عذاب تو نے مجھے آخرت میں دینا ہے وہ دنیا میں ہی دے لے۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ! تو اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ تم یہ دعا رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ......۔ کیوں نہیں مانگتے اس نے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اسے شفا عطا فرمادی۔ حضرت عبداللہ بن سائب فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ رکن بنی جمع اور رکن اسود کے درمیان یہ دعا کیا کرتے تھے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں جب بھی بیت اللہ شریف کے کسی رکن کے پاس سے گزرا تو میں نے ایک فرشتے کو آمین کہتے ہوئے پایا۔ اس لیے جب تم یہاں سے گزرو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔ ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کی میں نے کچھ لوگوں کی ملازمت اس شرط پر اختیار کی کہ وہ مجھے اجرت کے طور پر حج کے لیے اپنے ساتھ لے جائیں تو کیا میرا حج ادا ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ تیرا شمار ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

”اور (خوب) یاد کرلو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں اور جو جلدی کرکے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ ڈرتا رہا ہو۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اسی کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا۔“

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ: حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ”اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ“ سے مراد ایام تشریق ہیں اور ایام معلومات سے مراد ذوالحج کے دس دن ہیں۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں یہاں ذکر سے مراد ایام تشریق میں فرض نمازوں کے بعد تکبیر کہنا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا، عرفہ کا دن، قربانی کا دن اور ایام تشریق ہم اہل اسلام کے لیے عید کا دن ہیں۔ اور

یہ کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں (1)۔ یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے کہ مکمل میدان عرفات موقف ہے اور تمام ایام تشریق قربانی کے دن ہیں۔ اور یہ بھی گزر چکا ہے کہ منیٰ کے تین دن ہیں۔ اور جو دو دنوں میں جلدی کر کے چلا گیا اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ ؓ کو منیٰ میں اعلان کرنے کے لیے بھیجا کہ ان دنوں میں روزے نہ رکھو یہ کھانے، پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں مگر جس پر قربانی کے بدلہ میں روزے ہوں۔ لیکن یہ روایت مرسل ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے بشر بن سہم کو بھیجا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول نے ایام تشریق میں روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ یہ کھانے، پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ کے سفید خچر پر سوار ہو کر شعب انصار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے مروی ہے کہ "اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ" سے مراد ایام تشریق ہیں۔ اور یہ چار ہیں۔ ایک قربانی کا دن اور تین اس کے بعد۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور بہت سے تابعین سے بھی یہی منقول ہے۔ حضرت علی بن طالبؓ فرماتے ہیں کہ یہ تین دن ہیں۔ ایک قربانی کا دن اور دو دن اس کے بعد۔ ان دنوں میں سے جس دن چاہو قربانی کر سکتے ہو۔ ان میں سے سب سے افضل پہلا دن ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔ اور یہ آیت کے ظاہری الفاظ بھی اسی پر دال ہیں۔ کیونکہ دو دن کی جلدی اور دیر معاف ہے۔ ثابت ہوا کہ عید کے بعد تین دن ہیں۔ ان دنوں میں ذکر سے مراد قربانی کرتے وقت اللہ کا ذکر کرنا ہے۔ اور پہلے ذکر آچکا ہے کہ امام شافعیؒ کا راجح مذہب یہ ہے کہ قربانی کا یہ وقت عید کے دن سے ایام تشریق کے آخری دن ہے اور اس ذکر سے مراد وہ ذکر بھی مراد لیا جا سکتا ہے جو نمازوں کے بعد مقرر ہے اور اس کے علاوہ مطلق تمام احوال میں ذکر کرنا مراد ہو سکتا ہے۔ ایام تشریق میں نماز کے بعد جو تکبیر پڑھی جاتی ہے اس کے وقت میں اختلاف ہے۔ مشہور ترین قول جس پر عمل جاری ہے وہ یوم عرفہ کی صبح سے لے کر ایام تشریق کے آخری دن کی نماز عصر تک ہے۔ دار قطنی نے اس بارے میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے لیکن اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت نہیں۔ واللہ اعلم حضرت عمرؓ اپنے خیمے میں تکبیر کہتے تھے آپ کی آواز سن کر بازار والے لوگ بھی تکبیر کہتے یہاں تک کہ پورا منیٰ تکبیر کی آواز سے گونج اٹھتا۔ ایام تشریق میں شیطانوں کو کنکریاں مارتے وقت جو ذکر کیا جاتا ہے وہ بھی داخل ہے۔ حدیث پاک میں ہے بیت اللہ شریف کا طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، رمیٔ جمار کرنا یہ سب اللہ کے ذکر کو قائم کرنے کے لیے ہے (2)۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے منیٰ سے مکہ کی طرف جانے کا ذکر کیا۔ چونکہ لوگ ان مقامات مقدسہ کی زیارت کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اس لیے ارشاد فرمایا۔ ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اسی کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

1۔ مسند امام احمد 152/4

2۔ سنن ابی داؤد: کتاب المناسک 79/2

''اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی زندگی کے بارے میں اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ (حق کا) سخت ترین دشمن ہے اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کردے اور تباہ کردے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور جب کہا جائے اسے کہ (میاں) خدا سے ڈرو تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر پس اس کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لیے اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر''۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ: حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اخنس بن شریق ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی جو رسول ﷺ کے پاس آیا اور ظاہری طور پر مسلمان ہو گیا لیکن باطناً منافق تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت خُبَیبؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے جو رجیع کے مقام پر شہید ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذمت اور حضرت خبیبؓ اور ان کے ساتھیوں کے مدح میں یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت جملہ منافقین کی مذمت اور جملہ مومنین کی مدح کے لیے عام ہے۔ یہ حضرت قتادہ، مجاہد اور ربیع بن انس کی روایت سے منقول ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ حضرت نوف بکالیؒ جو کہ تورات وانجیل کے بھی عالم تھے، فرماتے ہیں۔ اس امت کے بعض لوگوں کی برائیاں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب میں موجود ہیں۔ وہاں مذکور ہے۔ بعض لوگ دین کے ذریعہ سے دنیا کماتے ہیں۔ انکی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی اور دل مصبر سے زیادہ کڑوے ہیں۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے بھیڑوں کی اون کے لباس پہنتے ہیں۔ لیکن ان کے دل بھیڑیوں کے دل جیسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کیا یہ لوگ مجھ پر جرأت کرتے ہیں۔ میرے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں، مجھے اپنے جلال کی قسم! میں ان کو ایک ایسے فتنے میں مبتلا کروں گا کہ بردبار لوگ بھی حیران ہو جائیں گے۔ حضرت قرظیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس میں غور وفکر کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو منافقوں کے اوصاف ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ ...... میں ہے۔ حضرت سعید بن مقبری نے بھی جب یہ اوصاف گزشتہ کتابوں کے حوالے سے بیان کیے تو محمد بن کعب قرظی نے انہیں بتایا کہ یہ تو قرآن پاک میں بھی موجود ہیں اور یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ حضرت سعید کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیت کس شخص کے بارے میں نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ آیت شان نزول کے اعتبار سے تو خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے۔

وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ: ابن محیصن نے اسے يُشۡهِدُ اللّٰهَ پڑھا ہے اور اس کا معنی یہ ہوگا کہ یہ منافق اگرچہ اپنی زبان سے جو کچھ بھی کہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے دل کی برائی کو خوب جانتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِذَا جَآءَكَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا......(منافقون:1)'' ترجمہ: (اے نبی مکرم) جب منافق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بھی خوب جانتا ہے کہ آپ بلاشبہ اس کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔'' جمہور کی قرأت ''يُشۡهِدُ اللّٰهَ'' ہے۔ اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا کہ یہ لوگوں کے لیے اسلام ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اللہ کے سامنے اس کے دل کا کفر ونفاق ظاہر ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسۡتَخۡفُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ (نساء:108)'' ترجمہ: وہ چھپا سکتے ہیں لوگوں سے اور نہیں چھپا سکتے اللہ تعالیٰ سے''۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہی معنی بیان کیا ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنے اسلام کو ظاہر کرتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں کہ جو کچھ ان کی زبان پر ہے وہی ان کے دل میں ہے۔ یہی معنی صحیح ہے۔ یہی عبدالرحمٰن بن زید اور مجاہد سے منقول ہے اور یہی

ابن جریر کا مختار قول ہے۔

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ: ''اَلَدُّ'' کا لغوی معنی سخت ٹیڑھا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (مریم:97) یہی حال منافق کا ہے کہ وہ جھگڑے کے وقت جھوٹ بولتا ہے، حق سے اعراض کرتا ہے، اس پر قائم نہیں رہتا بلکہ گالی گلوچ سے بھی باز نہیں آتا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک مبغوض ترین شخص وہ ہے جو سخت جھگڑالو ہو۔ اس حدیث کو عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی کئی دوسری اسناد بھی ہیں۔

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ: اب اس کی صفات بیان کی جارہی ہیں۔ بدکلام، بدافعال، اپنے قول و فعل میں تضاد کا شکار، جھوٹا، بد عقیدہ، بدکردار ہے۔ یہاں سعی سے مراد قصد اور ارادہ ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰى (نازعات:22) اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (جمعہ:9) یعنی جمعہ کی نماز کا ارادہ اور قصد کرو۔ یہاں سعی سے مراد دوڑنا نہیں ہے۔ کیونکہ نماز کے لئے دوڑنا ممنوع ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ نماز کے لیے دوڑتے ہوئے نہ آؤ۔ بلکہ سکون اور وقار کے ساتھ آؤ۔ الغرض ان منافقین کا مقصد زمین میں فساد برپا کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا ہے جن سے انسان کو خوراک حاصل ہوتی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی بدکرداری اور بداعمالی کی وجہ سے بارش روک لیتا ہے جس کی وجہ سے کھیتی اور نسل تباہ ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان رذائل کے حامل لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ: جب بھی کسی منافق کو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اپنے ان برے اقوال و افعال سے باز آجاؤ اور حق کا دامن تھام لو تو وہ اکڑ جاتا ہے اور ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے سرکشی اور گناہوں پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح کہ منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ..... (الحج:72) ''ترجمہ: اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں صاف صاف تو آپ پہچان لیتے ہیں کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار، یوں پتہ چلتا ہے کہ وہ عنقریب جھپٹ پڑیں گے ان لوگوں پر جو پڑھتے ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں۔'' اس لیے ان کے بارے میں اس آیت میں ارشاد فرمایا۔ پس ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ: پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذموم خصلتیں ذکر کیں۔ اب اس کے مومنین کے خصال حمیدہ کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، انس بن مالکؓ، سعید بن مسیب، ابوعثمان نہدی، عکرمہ اور کئی دوسرے مفسرین سے منقول ہے کہ یہ آیت کریمہ سہیل بن سنان رومیؓ کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ وہ مکہ میں مسلمان ہوئے اور جب ہجرت کا ارادہ کیا تو اہل مکہ نے کہا کہ اگر مدینہ کی طرف ہجرت کرنا چاہتا ہو تو اپنا مال ہمیں دے دو۔ آپ نے اپنا مال انہیں دے کر چھٹکارا حاصل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت عمر بن خطابؓ اور بہت سے دوسرے صحابہؓ آپ کے استقبال کے لیے حرہ تک آئے اور کہنے لگے تمہیں یہ سودا مبارک ہو تو نے نفع کا سودا کیا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری تجارت میں گھاٹا نہ ڈالے۔ یہ مبارکباد کس بات کی ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ جب آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے بھی یہ فرمایا کہ سہیل نے منافع کا سودا کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے ہجرت کا ارادہ کیا تھا تو قریش مکہ نے کہا اے سہیل! جب تم ہمارے پاس آئے تھے اس وقت تمہارے پاس کچھ نہیں تھا۔ اور آج تم مال لے کر جا رہے ہو۔ ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ میں

نے کہا کہ اگر میں تمہیں مال دے دوں تو کیا مجھے جانے دو گے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ میں نے مال دے دیا اور جب مدینہ پہنچا اور نبی پاک ﷺ کے پاس خبر پہنچی تو آپ نے دو مرتبہ فرمایا سہیل نے نفع کا سودا کیا ہے۔ سعید بن مسیّب روایت کرتے ہیں کہ حضرت سہیلؓ نے جب نبی کریم ﷺ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو قریش کی ایک جماعت نے آپ کو گھیر لیا آپ اپنی سواری سے اترے اور اپنے ترکش سے تیر نکال کر فرمایا کہ اے اہل قریش! تمہیں خوب معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا تیر انداز ہوں۔ جب تک میرے ترکش میں تیر باقی ہیں تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے ہو۔ پھر میں تلوار کے ساتھ تمہارا مقابلہ کروں گا اور جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے تم میرے قریب نہیں آ سکتے۔ پھر جو چاہے کر لینا۔ ہاں اگر تم چاہتے ہو تو مکہ میں اپنے دفن شدہ مال کے بارے میں تمہیں بتا دیتا ہوں اس شرط پر کہ تم میرا راستہ چھوڑ دو۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ جب آپ مدینہ طیبہ نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا تو نے نفع کا سودا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ تمام مجاہدین فی سبیل اللہ کی شان میں ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ...... (توبہ:111) ''ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ نے خرید لیے ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال کے عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ جب ہشام بن عامرؓ نے تنہا دشمن کی دو صفوں پر حملہ کر دیا کچھ لوگوں نے ان کے اس طرز عمل کو ناپسند کیا اور حضرت عمرؓ اور ابو ہریرہؓ نے ان لوگوں کی تردید کی اور یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آ چکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: یہاں اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں اور اپنے رسول کی تصدیق کرنے والوں کو حکم فرماتا ہے کہ وہ اسلام کے تمام احکام کو بجا لائیں اور حتی المقدور تمام ممنوعات سے اجتناب کریں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں ''سِلْمٌ'' سے مراد اسلام ہے۔ اور بعض فرماتے ہیں اس سے مراد اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، ابوعالیہ، عکرمہ ربیع بن انس وغیرہم فرماتے ہیں کہ ''كَآفَّةً'' کا معنی پورے کا پورا سب کا سب ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں: تمام اعمال سرانجام دو اور نیکیاں بجالاؤ۔ حضرت عکرمہ کا خیال ہے کہ یہ آیت کریمہ عبداللہ بن سلام اور اسد بن عبید، ثعلبہ اور کچھ دوسرے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو یہودیت کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس عرض کی کہ ہم کو ''یوم سبت'' منانے اور رات کے وقت تورات کے احکام پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے تو آپ نے انہیں اسلامی شعائر پر کاربند رہنے اور اس کے علاوہ ہر چیز سے اعراض کرنے کا حکم فرمایا لیکن یہاں عبداللہ بن سلام کا نام ان لوگوں کے ساتھ ذکر کرنا محل نظر ہے۔ کیونکہ ان جیسے مخلص مومن سے یہ بعید ہے کہ وہ اس قسم کی اجازت لیں حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ ہفتہ کے دن کی حرمت (عزت) منسوخ ہو چکی ہے اور اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جمعہ کا دن عطا فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے ''کافة'' کو حال بنایا ہے اور معنی یہ ہوگا کہ تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ حتی المقدور اسلام کے تمام احکام پر عمل پیرا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ بعض اہل کتاب بھی مسلمان ہو چکے تھے جو تورات کے بعض احکام پر عمل پیرا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ دین محمدی کے تمام

احکام پر عمل کرو۔اس میں سے کوئی عمل ترک نہ کرو۔تورات پر صرف ایمان لانا ہی کافی ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ: یعنی نیکی کے کام کرو، شیطان تمہیں جس چیز کا حکم دے اس سے اجتناب کرو کیونکہ شیطان تو برائی اور بدکاری ہی کا حکم دیتا ہے۔وہ اپنے ساتھیوں کو دعوت دیتا ہے تاکہ وہ جہنمی بن جائیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔مطرف کہتے ہیں۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ: اگر تم دلائل کو جان لینے کے باوجود بھی حق سے اعراض کرو گے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ انتقام لینے پر قادر ہے نہ تو اس سے کوئی بچ سکتا ہے اور نہ کوئی اس پر غالب آ سکتا ہے۔وہ حکیم ہے اپنے احکام جاری کرنے میں اور ان کے نسخ میں۔اس لیے ابوعالیہ، قتادہ، ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ وہ انتقام لینے میں غالب اور زبردست اور حکم دینے میں دانا اور حکیم ہے۔محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ بخل کرنے والوں کی مدد کرنے پر قادر ہے جب وہ چاہے۔اور اپنے بندہ کے عذر قبول کرنے اور ان پر حجت لازم کرنے میں حکیم ہے۔

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

''کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) اور فرشتے اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے۔اور (آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات''۔

هَلْ یَنْظُرُوْنَ: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی نبوت کے منکرین کو دھمکی دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کیا یہ اس بات کا انتظار کر رہے کہ ان پر اللہ کا عذاب بادلوں کی صورت میں چھا جائے اور فرشتے بھی نازل ہوں یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام اہل دنیا کے اعمال کا فیصلہ فرمائے گا اور اچھے برے عمل کی جزاء وسزا عطا فرمائے گا۔اس لیے یہاں فرمایا اور ان کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور آخر کار اللہ کی طرف ہی تمام معاملات لوٹائے جائیں گے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا ہے۔كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ (فجر:22-21)''ترجمہ: یقیناً جب زمین کو کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔جب آپ کا رب جلوہ فرما ہو گا اور فرشتے قطار اندر قطار حاضر ہوں گے''۔هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ (انعام:158)''ترجمہ: کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ آئیں ان کے پاس فرشتے یا خود آئے آپ کا رب، یا آئے کوئی نشانی آپ کے رب کی''۔امام ابن جریر نے یہاں طویل حدیث ذکر کی ہے جس میں صور پھونکنے کا ذکر ہے۔اس حدیث کو اصحاب مسانید نے بھی روایت کیا ہے۔رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں جب لوگ میدان حشر میں گھبرائیں گے تو وہ ایک ایک کر کے تمام انبیاء سے شفاعت طلب کریں گے۔حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہر ہر پیغمبر کے پاس جائیں گے لیکن وہ تمام جواب دیں گے۔یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچیں گے۔آپ فرمائیں گے ہاں میں شفاعت کروں گا۔پھر عرش الٰہی کے نیچے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔اور اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں گے کہ وہ بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے تشریف لائے۔اللہ تعالیٰ آپ کی سفارش قبول فرمائے گا اور بادلوں کے سائبان میں تشریف لائے گا۔اس سے پہلے آسمان دنیا پھٹ جائے گا اور ہر آسمان سے فرشتے نازل ہوں گے۔حتیٰ کہ حاملین عرش، کروبیین بھی اللہ تعالیٰ کی حمد، تسبیح اور تہلیل کرنے میں مشغول ہوں گے۔اس دن ان کی تسبیح یہ ہو گی۔(سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ ذِی

الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ، سُبْحٰنَ الَّذِيْ يُمِيْتُ الْخَلَائِقَ وَلَا يَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ وَ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ ، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ سُبْحَانَ رَبِّنَا الْاَعْلٰى، سُبْحٰنَ ذِي السُّلْطَانِ وَالْعَظَمَةِ ، سُبْحٰنَهٗ سُبْحٰنَهٗ اَبَدًا اَبَدًا)

حافظ ابوبکر بن مردویہ یہاں کچھ احادیث ذکر کی ہیں۔جن میں غرابت ہے۔جن میں ایک حدیث عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ ایک مقرر دن اولین و آخرین تمام مخلوق کو جمع کرے گا۔ان کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی ہوں گی۔اللہ کے فیصلہ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔اسی حالت میں اللہ تعالیٰ بادلوں کے سائبان میں عرش سے کرسی کی طرف تشریف لائے گا۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں، جس دن اللہ تعالیٰ نزول فرمائے گا اس دن اس کے اور مخلوق کے درمیان ستر ہزار پردے ہوں گے۔کچھ پردے نور کے ہوں گے۔کچھ تاریکی کے۔کچھ پانی کے،اس تاریکی میں پانی ایسی آواز نکالے گا کہ لوگوں کے دل دہل جائیں گے۔حضرت زبیر بن محمد فرماتے ہیں کہ بادلوں کے اس سائبان میں یاقوت جڑے ہوئے ہوں گے اور وہ جواہر و زمرد سے آراستہ ہوگا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ بادل کوئی عام بادل نہیں ہوگا۔یہ وہ بادل ہے جس نے بنی اسرائیل کے سروں پر وادی تیہ میں سایہ کیا تھا۔ حضرت ابو عالیہ فرماتے ہیں کہ فرشتے بادلوں کے سایہ میں حاضر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جیسے چاہے گا جلوہ افروز ہوگا۔چنانچہ بعض قرأت میں اسے اس طرح بھی پڑھا گیا ہے۔هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ۔اور یہ اللہ کے اس ارشاد کی مثل ہے۔وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا (فرقان:25)''ترجمہ:اور یاد کرو جس روز پھٹ جائے گا اور آسمان اور بادل نمودار ہوگا اور اتارے جائیں گے فرشتے گروہ در گروہ''۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾

''آپ پوچھئے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں عنایت فرمائیں اور جو (قوم) بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو اس کے مل جانے کے بعد تو یقیناً اللہ تعالیٰ (اس قوم کو) سخت عذاب دینے والا ہے۔آراستہ کردی گئی ہے کافروں کے لیے دنیا کی (فانی) زندگی اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے قیامت کے دن اور اللہ تعالیٰ روزی تو جسے چاہے بے حساب دے دیتا ہے''۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: یہاں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں کتنے ہی معجزات دیکھے جو ان کے صدق پر قطعی طور پر دلالت کرتے ہیں جیسے ید بیضاء، عصا، سمندر کا چیرنا، عصا کو پتھر پر مار کر پانی نکالنا، شدید گرمی میں بادلوں کا ان پر سایہ کرنا، من و سلویٰ کا اترنا وغیرہ۔یہ ایسے معجزات ہیں جو باری تعالیٰ کے وجود اور اس کے فاعل و مختار ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور جس ہستی کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے اس کی نبوت کی صداقت پر بھی داعی ہیں۔لیکن اسکے باوجود ان میں سے اکثر لوگوں نے ان پر اعراض کیا اور ان پر ایمان لانے کی بجائے کفر اختیار کیا۔

وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ: ایسا ہی ایک ارشاد کفار قریش کے بارے میں نازل ہوا۔اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (ابراہیم:28)''ترجمہ: کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا، اللہ کی نعمتوں کو ناشکری سے

اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں''۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ اس نے کافروں کے لیے اس دنیاوی زندگی کو مزین کر دیا ہے جس پر وہ راضی اور مطمئن ہیں۔ وہ دن رات مال جمع کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ اس مال کو اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صرف نہیں کرتے بلکہ وہ ان اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں جنہوں نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا ہے۔ وہ اپنے مال کو اللہ کی اطاعت اور اس کی رضا و خوشنودی میں خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ قیامت کے دن اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے اور ان کا مقام و مرتبہ ان کافروں سے ہر اعتبار سے بلند ہوگا۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اعلیٰ علیین میں انعام الٰہی سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس کے برعکس یہ کافر اسفل السافلین میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے۔ اس لیے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے بغیر کسی حساب کے رزق عطا فرماتا ہے۔ بلکہ دنیا اور آخرت میں عطا فرماتا ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے اے ابن آدم! تو خرچ کرتا جا میں تجھے عطا کرتا جاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو ارشاد فرمایا اے بلال! خرچ کرو اور عرش کے مالک سے تنگی اور فقر کا خوف نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَھُوَ یُخْلِفُهٗ (سبا:39) ''ترجمہ: اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے''۔ حدیث نبوی ہے کہ ہر صبح آسمان سے دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے، اے اللہ! بخل کرنے والے کا مال ضائع کر دے۔ (1)

ایک روایت میں ارشاد فرمایا۔ بنی آدم کہتا ہے، میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال وہ ہے جس کو تو نے کھایا، فنا کر دیا۔ اور جس کو تو نے پہنا اور پوشیدہ کر دیا اور جو تو نے صدقہ کیا اسے اللہ کے پاس بھیج دیا اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ لوگوں کے لیے چھوڑ کر جانے والا ہے۔ ارشاد نبوی ہے، دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہو اور اسے وہی جمع کرتا ہے جس میں عقل نہ ہو۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۱۳﴾

''(ابتداء میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں جھگڑنے لگے تھے اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد ازاں کہ آ گئی تھیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا۔ پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف''۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ : حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس اقوام تھیں جو شریعت کی پابند تھیں۔ پھر ان میں اختلاف پیدا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کو اس طرح پڑھتے ہیں۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا حضرت ابی بن کعبؓ سے بھی یہی قرأت مروی ہے۔ حضرت قتادہ نے بھی

1۔ فتح الباری 304/3

اس کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں کے درمیان اختلاف ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا پہلا پیغمبر نوح علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دوسری روایت یہ ہے کہ پہلے سب کہ سب لوگ کافر تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا لیکن پہلا قول سند کے اعتبار سے اصح ہے۔ معنی یہ ہوگا چونکہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے شریعت پر عمل پیرا تھے پھر بتوں کی پوجا کرنے لگے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نوح کو بھیجا۔ آپ اہل زمین کی طرف اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول علیہ السلام تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ برحق کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرے اور کسی نے اختلاف نہیں اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ بعض ازاں ان کے پاس روشن دلیلیں آ گئیں تھیں۔ لیکن ان دلائل کے باوجود اختلاف میں پڑ گئے اور اس کا سبب باہمی بغض وعناد اور حسد تھا۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اس آیت کی تفسیر کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، قیامت کے دن ہم ہی اول و آخر ہوں گے، ہم ہی جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے، اہل کتاب کو ہم سے پہلے کتاب عطا کی گئی اور ہمیں ان کے بعد۔ اور دین کے جن امور میں انہوں نے اختلاف کیا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے ان میں ہماری راہنمائی فرمائی۔ جمعہ کے دن کے بارے میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی فرمائی۔ اس اعتبار سے وہ ہمارے تابع ہیں کہ پہلے ہمارا جمعہ ہے۔ اس کے بعد یہود کا ہفتہ اور اس کے بعد نصاریٰ کا اتوار۔ حضرت زید بن اسلمؓ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ قبلہ میں بھی ان کا اختلاف ہو گیا۔ نصاریٰ نے مشرق کو بھی اپنا قبلہ بنالیا اور یہود نے بیت المقدس کو۔ اور اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اپنا گھر کعبہ عطا فرما دیا۔ ان کا نماز میں بھی اختلاف ہے۔ بعض رکوع کرتے ہیں تو سجدہ نہیں کرتے۔ بعض نماز میں گفتگو کرتے رہتے ہیں تو بعض نماز میں چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو نماز میں بھی راہ حق کی توفیق عطا فرمائی۔ اسی طرح روزوں میں بھی ان کا اختلاف ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ دن کے بعض حصے میں روزہ رکھتے ہیں اور بعض خاص قسم کے کھانے چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے روزہ کے بارے میں بھی امت محمدیہ کو راہ راست پر رکھا۔ ان کا حضرت ابراہیم کے بارے میں بھی اختلاف ہوا۔ یہود نے کہا کہ وہ یہودی تھے اور نصاریٰ نے کہا کہ وہ نصرانی تھے۔ لیکن وہ درحقیقت سچے اور یکسو مسلمان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں امت محمدیہ کی راہنمائی فرمائی۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کا اختلاف تھا۔ پہلے یہود نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کی والدہ ماجدہ پر بہتان لگایا۔ اور نصاریٰ نے آپ کو معبود اور خدا کا بیٹا بنا دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روح اور کلمہ قرار دیا۔ آپ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو حق راہ دکھائی۔ حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ جس طرح ابتداء میں سب لوگ خدا وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے والے تھے اور احکام پر عمل کرنے والے تھے۔ بعد میں ان میں اختلاف رونما ہو گیا تھا۔ پس اس آخری امت کو اول کی طرح اختلاف سے ہٹا کر صحیح راہ پر لگا دیا۔ یہ امت قیامت کے دن تمام امتوں پر گواہ ہوگی حتیٰ کہ حضرت نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امتوں پر گواہی دے گی کہ ان کے رسولوں نے پیغام حق کو ان تک پہنچا دیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے رسل کی تکذیب کر کے جھٹلا دیا تھا۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی قرأت میں "وَاللّٰهُ يَهْدِیْ" سے پہلے یہ الفاظ ہیں (وَلِيَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ) حضرت ابو عالیہ فرماتے ہیں اس آیت میں شبہات، گمراہوں اور فتنوں سے اجتناب کرنے کا حکم ثابت ہو رہا ہے۔

بِاِذْنِهٖ یعنی ان کو یہ ہدایت ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اذن کی وجہ سے حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا

ہے صراط مستقیم پر گامزن کر دیتا ہے۔ اپنی حکمتوں سے خوب آگاہ ہے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول ﷺ جب تہجد کے لیے اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے: اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرِیْلَ وَ مِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ آپ سے یہ دعا منقول ہے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبِسًا عَلَیْنَا فَنَضِلَّ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا۔ ”ترجمہ: اے اللہ! ہمیں حق کو حق ہی دکھا اور اس کی اتباع نصیب فرما اور باطل دکھا اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما۔ اور باطل کو ہم پر ملتبس نہ کر کہ ہم بھٹک جائیں اور ہمیں پرہیزگار لوگوں کا امام بنا۔“

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ﴿۲۱۴﴾

”کیا تم خیال کر رہے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں پہنچی انہیں سختی اور مصیبت اور وہ لرز اٹھے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا) رسول اور جو ایمان لے آئے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے“۔

اَمْ حَسِبْتُمْ: ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ کیا پہلی امتوں کی طرح امتحان و آزمائش میں مبتلا کیے بغیر ہی تم کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ ان لوگوں پر طرح طرح کے مصائب و آلام اور تکالیف نازل ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ ”بَاْسَآءُ“ کا معنی فقر اور ضَرَّآءُ سے بیماری مراد ہے۔ ان پر دشمنوں کا خوف اتنا مسلط کیا گیا کہ وہ لرزنے لگے اور انہیں سخت امتحان میں مبتلاء کیا گیا جیسا کہ حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت خباب بن الارتؓ روایت کرتے ہیں۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے ہماری مدد کی دعا کیوں نہیں فرماتے آپ نے فرمایا تم سے پہلے لوگوں کے سروں پر آرے رکھ کر ان کو دو حصوں میں چیر دیا جاتا تھا لیکن یہ تکلیف ان کو دین حق سے نہ پھیرتی۔ لوہے کی کنگھیوں کے ساتھ ان کے گوشت کو نوچ لیا جاتا لیکن پھر بھی وہ اپنے دین کو نہ چھوڑتے۔ پھر فرمایا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ اس دین کو اس قدر مکمل کرے گا کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک بلا خوف وخطر سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ اور بھیڑیا بکریوں کی رکھوالی کرے گا لیکن تم بہت جلدی کرتے ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا ..... (عنکبوت:1) ”ترجمہ: الف، لام، میم، کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے.....“ صحابہ کرام کی آزمائش غزوہ خندق کے وقت ہوئی۔ جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم یوں بیان فرمایا ہے۔ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ..... (احزاب:10) ”ترجمہ: جب انہوں نے ہلہ بول دیا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی جانب سے بھی، اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے، اس موقع پر خوب آزمالیا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے۔ جب بادشاہ روم ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کیا تم نے مسلمانوں کے ساتھ کبھی جنگ بھی کی ہے جواب دیا ہاں۔ اس نے پوچھا کہ یہ جنگ تمہارے درمیان کیسی رہی۔ جواب دیا کہ کبھی وہ ہم پر غالب آ گئے اور کبھی ہم ان پر۔ یہ سن کر

ہرقل نے کہا اسی طرح انبیاء کو آزمایا جاتا ہے۔لیکن آخر کار غلبہ انہی کو حاصل ہوتا ہے۔

مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ : یہاں مثل کا معنی طریقہ ہے، جیسے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ

وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ :وہ لرز اٹھے حتیٰ کہ اس زمانہ کے رسول اور مومنین نے کہا، اللہ کی مدد کب آئے گی۔یعنی وہ اپنے دشمنوں کے خلاف اللہ کی مدد اور ان مشکل حالات سے چھٹکارے کی دعائیں کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۭ (الانشراح:5-6)''ترجمہ: پس یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے''۔یعنی جس قسم کی مشکل اور پریشانی ہوگی اللہ کی مدد بھی اسی قسم کی ہوگی۔اسی لیے یہاں ارشاد فرمایا اللہ کی مدد قریب ہے۔ارشاد نبوی ہے، تمہارا رب اپنے بندوں کی ناامیدی اور اپنی نصرت کے قریب پر تعجب کرتا ہے۔وہ ان کو مایوسی کی حالت میں دیکھ کر مسکراتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ان کی خوشحالی قریب ہے۔

يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ ۲۱۵

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں آپ فرمایئے جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے''۔

يَسْــَٔلُوْنَكَ :مقاتل بن حیان فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ نفلی خیرات میں نازل ہوئی ہے۔سدی فرماتے ہیں، زکوٰۃ نے اس کو منسوخ کردیا ہے۔لیکن ان کا قول محل نظر ہے۔معنی آیت کا یہ ہوگا، صحابہ کرام آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیسے خرچ کریں پھر اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کا جواب ارشاد فرمایا کہ اپنے مال میں سے جو بھی خرچ کرو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ قریبی رشتے دار اور یتیم و مسکین ہیں۔اسی طرح حدیث پاک میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائی اور قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرو۔حضرت میمون بن مہران نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خیرات کرنے کے مواقع اور محل بیان کیے ہیں لیکن ان میں کہیں طبلوں، باجوں، تصویروں اور دیواروں پر کپڑے چڑھانے کا ذکر نہیں ہے۔پھر ارشاد فرمایا جو نیکی تم کرتے ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل سے خوب آگاہ ہے اور اس کی مکمل طور پر جزا عطا فرمائے گا۔اور وہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَھُوْا شَـيْـــًٔـا وَّھُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَـيْـــًٔـا وَّھُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ۲۱۶

''فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد اور وہ ناپسند ہے تمہیں اور ہوسکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ : یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد فرض کیا ہے کہ وہ دشمنوں کے شر کو روکنے کے لیے جہاد کریں۔امام زہری فرماتے ہیں: جہاد ہر شخص پر فرض ہے خواہ وہ لڑائی کے لیے نکلے یا گھر میں بیٹھا رہے اور گھر میں بیٹھنے والے کا جہاد یہ ہے کہ جب اس سے مدد طلب کی جائے وہ مدد کرے اور جب کسی تعاون کی ضرورت ہو تو تعاون کرے اور جب میدان جنگ میں نکلنے کے لیے پکارا جائے فوراً

تیار ہو جائے۔ اور اگر اس کی ضرورت نہ پڑے تو گھر میں بیٹھا رہے۔ اس لیے حدیث پاک میں ہے جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ اس نے جہاد کیا اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد کا خیال آیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس کے بعد اب کوئی ہجرت نہیں، لیکن جہاد اور نیت ہے۔ جب تمہیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو فوراً نکل جاؤ۔

وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ: اور یہ جہاد تمہارے لیے انتہائی مشقت اور شدت کا باعث ہے۔ کیونکہ اس میں مجاہد تو اللہ کی بارگاہ میں شہید ہو جاتا ہے یا زخمی ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے سفر کی صعوبت اور دشمن کی تکلیف بھی برداشت کرنا پڑتی ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا: ہوسکتا ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ کیونکہ جہاد کے ذریعہ دشمن پر فتح اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کے مال و اولاد اور ان کے شہروں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا: اور ہوسکتا تم کسی چیز کو پسند کرو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو۔ یہ حکم تمام امور میں عام ہے۔ کیونکہ کبھی انسان کسی چیز کو پسند کرتا ہے حالانکہ اس میں کوئی مصلحت یا بہتری نہیں ہوتی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اگر اہل اسلام جہاد سے گریز کریں تو دشمن کا غلبہ ہو جائے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ: اللہ تعالیٰ تمہارے معاملات کے انجام سے بخوبی آگاہ ہے اور دنیا و آخرت میں تمہارے لیے جو چیز بہتر ہے اس سے باخبر ہے۔ اس لیے اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دو تاکہ تم سرخرو ہو جاؤ۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے آپ فرمائیے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے اور ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے اور جو پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جائے حالت کفر پر یہی وہ (بدنصیب) ہیں کہ ضائع ہو گئے ان کے عمل دنیا و آخرت میں اور یہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے''۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ: حضرت جندب بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو صحابہ کرام

کی ایک جماعت کا امیر بنا کر بھیجا۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو حضور ﷺ سے جدائی کے غم سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ نے ان کی جگہ حضرت عبداللہ بن جحش ؓ کو امیر مقرر کر دیا۔ اور ان کو ایک خط دے کر حکم فرمایا کہ اس خط کو وادیٔ نخلہ میں پہنچنے سے پہلے نہ کھولنا اور نہ ہی کسی کو اپنے ساتھ جانے پر مجبور کرنا۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مقام پر پہنچے تو آپ نے حضور ﷺ کا نامہ مبارک کھول کر پڑھا اور ''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ'' پڑھ کر اپنے ساتھیوں کو یہ فرمان پڑھ کر سنایا اور کہا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے تیار ہوں۔ یہ خط سن کر دو شخص تو واپس آ گئے اور باقی ان کے ساتھ ہی رہے۔ دہاں ان کی ملاقات ابن حضرمی نامی مشرک سے ہوئی۔ انہوں نے اسے پکڑ کر قتل کر دیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ رجب کا مہینہ شروع ہو چکا ہے اور مشرکین مسلمانوں پر اعتراض کرنے لگے کہ مسلمانوں نے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کر کے ایک شخص کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اس سریہ میں سات صحابہ کرام شامل تھے۔ حضرت عبداللہ بن جحش ان کے امیر تھے اور ان کے علاوہ حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، سعد بن ابی وقاص، عتبہ بن غزوان سلمی، سہیل بن بیضا عامر بن فہیرہ اور واقد بن عبداللہ یربوعی شامل تھے۔ وادیٔ نخلہ میں پہنچ کر حضرت عبداللہ بن جحش نے فرمایا کہ جو شخص شہادت کا آرزومند ہے وہی آگے بڑھے اور اپنے اہل خانہ کے لیے وصیت بھی لکھ دے ان میں سے حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان پیچھے رہ گئے۔ ان کے پیچھے رہنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی سواری کا اونٹ گم ہو گیا تھا وہ اس کی تلاش میں لگ گئے تھے۔ عبداللہ بن جحش آگے بڑھے تو انہیں مشرکین میں سے حکم بن کیسان، عثمان بن عبداللہ وغیرہما ملے۔ واقد بن عبداللہ نے عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا۔ دو کو قیدی بنا لیا اور قافلے کے مال کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ یہ پہلا مال غنیمت تھا جو صحابہ کرام کو حاصل ہوا۔ جب صحابہ کرام مال غنیمت اور قیدی لے کر مدینہ پہنچے تو مشرکین مکہ نے چاہا کہ فدیہ دے کر اپنے قیدیوں کو چھڑا لیں اور اعتراضاً کہنے لگے، محمد (ﷺ) کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کی بڑی اطاعت کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے حرمت والے مہینے رجب میں ہمارے ساتھی کو قتل کیا۔ مسلمانوں نے جواب دیا ہم نے اسے رجب میں قتل نہیں کیا بلکہ جمادی الثانی کی آخری رات میں قتل کیا ہے اور رجب کا مہینہ داخل ہوتے ہی ہم نے اپنی تلواروں کو نیام میں ڈال دیا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرما کر اہل مکہ کو عار دلائی کہ ٹھیک ہے کہ اس مہینہ میں قتل کرنا حلال نہیں لیکن تم جن افعال کا ارتکاب کر رہے ہو وہ اس مہینہ میں قتل سے بھی زیادہ برے ہیں۔ تم نے اللہ سے کفر کیا اور میرے رسول اور اس کے صحابہ کو مسجد حرام سے نکالا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہارا یہ فعل قتل سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو اس مقدس مہینے میں بیت اللہ شریف میں داخل ہونے سے روکا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے میں اپنے نبی کو فتح عطا فرمائی۔ مشرکین مسلمانوں پر اس مہینے میں جنگ کرنے کی وجہ سے اعتراض کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا، اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے اس کے بسنے والوں کو نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان مہینوں میں لڑائی کرنے سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت عبداللہ بن جحش کے سریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ جس میں عمرو بن حضرمی قتل ہوا۔ ابن اسحاق نے اس واقعہ کو اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس سریہ میں آٹھ صحابہ کرام شامل تھے۔ سات کے نام تو پہلے ذکر چکے ہیں اور آٹھویں عکاشہ بن محصن تھے ابن اسحاق کی اس روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس مال غنیمت میں پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کا ہے حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مال غنیمت کو اس طرح تقسیم کرنے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ کا حصہ علیحدہ کر دیا تھا اور باقی مال آپس میں تقسیم کر دیا تھا۔ جب یہ مدینہ طیبہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں اس حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا

تھا۔اور مال غنیمت لینے سے انکار کر دیا۔ یہ سن کر ان مجاہدین پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔لوگ خیال کرنے لگے کہ ان کے دونوں جہان برباد ہو گئے دوسرے مسلمان بھی ان کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانے لگے۔قریش نے شور مچا دیا کہ محمد ﷺ اور ان کے صحابہ نے حرمت والے مہینوں کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔اس میں خون بہایا، مال لوٹا، لوگوں کو قیدی بنایا۔یہود نے حضرمی کے قتل سے یہ فال بدلی کہ اب لڑائی پر زور ہو گی۔ بلکہ لڑائی تو بالکل قریب آ گئی۔واقد بن عبداللہ کے نام سے یہ بدفالی نکالی کہ اب جنگ بھڑک اٹھے گی۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس کر دکھایا اور نتیجہ تمام کا تمام مشرکین کے خلاف رہا اور مسلمانوں کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی کہ اگر تم نے اس حرمت والے مہینے میں کسی مشرک کو قتل کیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ان لوگوں نے اللہ کے ساتھ کفر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو اللہ کی راہ اور مسجد حرام سے روکا اور تمہیں اس سے نکال دیا۔ان کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قتل سے زیادہ شنیع ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ: یعنی یہ کفار جو مسلمانوں کو فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کر کے اور تکالیف پہنچا کر مرتد بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی اسلام سے برگشتہ کرنے کی یہ مذموم حرکت قتل سے زیادہ بدتر ہے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ: اور یہ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں گے۔یعنی وہ اپنے اس قبیح فعل پر قائم رہیں گے۔ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں تو مسلمان جس رنج اور افسوس میں مبتلا تھے وہ ختم ہو گیا۔رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت لے لیا۔قریش مکہ نے پیغام بھیجا کہ ہمارے دونوں ساتھیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔آپ نے فرمایا: جب تک میرے دونوں صحابی سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان نہ آجائیں ہم فدیہ نہیں لیں گے۔ جب حضرت سعد اور عتبہ واپس آ گئے تو آپ نے فدیہ لے کر دونوں قیدی چھوڑ دیئے۔ان میں سے حکم بن کیسان مسلمان ہو گئے اور مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہی رہے حتیٰ کہ بئر معونہ کے واقعہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔عثمان بن عبداللہ مکہ چلا گیا اور وہاں کفر کی حالت میں واصل جہنم ہوا۔اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضرت عبداللہ بن جحش اور آپ کے ساتھیوں کو بہت خوشی ہوئی۔اور سوچنے لگے کیا انہیں اس کا اخروی اجر بھی ملے گا۔اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی۔کیا ہمیں مجاہدین کا اجر ملے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی امیدوں سے بڑھ کر عطا فرما دیا۔اس حدیث کو امام زہری اور یزید بن رومان نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے۔اس کی کئی اور دوسری اسناد بھی ہیں۔ان میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ ابن حضرمی مشرکین کا سب سے پہلا مقتول تھا۔قریش مکہ کا ایک وفد مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ پوچھنے لگے کیا اس حرمت والے مہینے میں جنگ جائز ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ "يَسْئَلُوْنَكَ" نازل فرمائی۔اس کا تفصیلی ذکر بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں کیا ہے۔ابن ہشام فرماتے ہیں کہ یہ سب سے پہلی غنیمت ہے جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔اور ابن حضرمی پہلا مشرک ہے جس کو مسلمانوں نے قتل کیا۔ اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان پہلے قیدی تھے جن کو مسلمانوں نے گرفتار کیا۔اس واقعہ کے بارے میں کچھ اشعار بھی کہے گئے ہیں۔ بعض نے ان کو حضرت ابوبکر صدیق کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اشعار خود عبداللہ بن جحش نے کہے ہیں: "تم حرمت والے مہینے میں قتل کو بڑا عظیم سمجھتے ہو۔لیکن ایک عقلمند کے نزدیک تمہارا رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے اعراض کرنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اس سے بھی عظیم ہے۔تمہارا مسجد حرام سے مسلمانوں کو نکالنا اس لئے ہے کہ وہاں تمہیں اللہ کو سجدہ کرنے والا نظر نہ آئے۔اگر تم ہمیں اس کے قتل کی عار دلاتے ہو، اور باغی اور حاسد لوگ اسلام کے خلاف افوائیں اڑاتے ہیں تو نخلہ کے مقام پر ہمارے نیزوں نے ابن حضرمی کا

خوب خون کیا۔ جب واقد نے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا۔ اور عثمان بن عبداللہ ہماری قید میں آ گیا۔"

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۰﴾

"وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت آپ فرمائیے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے اور پوچھتے ہیں آپ سے کیا خرچ کریں فرمائیے جو ضرورت سے زیادہ ہو اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے حکموں کو تاکہ تم غور و فکر کرو۔ دنیا و آخرت (کے کاموں) میں اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں فرمائیے (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے"۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ: حضرت عمر سے مروی ہے کہ جب شراب کی حرمت کی آیت نازل ہوئی تو انہوں نے عرض کی یا باری تعالیٰ! اس کے بارے میں قطعی اور واضح حکم نازل فرما۔ جب سورۂ بقرہ کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ کو انہیں بلا کر ان کے سامنے یہ آیت کریمہ پڑھی گئی تو آپ نے پھر یہی عرض کی یا باری تعالیٰ! شراب کے بارے میں کوئی واضح حکم نازل فرما۔ پھر سورۂ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء:43)" ترجمہ: اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جب تم حالت نشہ میں ہو"۔ جب نماز کا وقت ہوتا تو ایک منادی رسول اللہ ﷺ اعلان کرتا کہ نشہ کی حالت میں کوئی نماز کے قریب نہ جائے۔ حضرت عمر کے سامنے جب یہ آیت پڑھی گئی تو آپ نے یہی دعا مانگی۔ پھر سورۂ مائدہ والی آیت نازل ہوئی۔ آپ کو بلا کر یہ آیت سنائی گئی جب قاری فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ کے الفاظ پر پہنچا تو کہنے لگے ہم شراب سے رک گئے۔ ہم اس سے باز آئے (1)۔ اس کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ لیکن اس سند میں ایک راوی عمرو بن شرحبیل ہمدانی کوفی ہیں جن کے بارے میں ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کا سماع حضرت عمر سے ثابت نہیں۔ حضرت علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ یہ سند صحیح ہے۔ ترمذی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ ابن ابی حاتم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ حضرت عمر نے یہ بھی فرمایا کہ یہ شراب مال کو برباد اور عقل کو تباہ کرتی ہے۔ یہ حدیث اور حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث کا ذکر سورۂ مائدہ کی تفسیر میں پھر آئے گا۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانپ دے۔ جس کا تفصیلی بیان بھی سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ "مَیْسِرٌ" سے مراد جوا ہے۔

قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ: ان کا گناہ اور نقصان دینی اعتبار سے ہیں اور منافع دنیوی اعتبار سے ہے اس طرح کہ کھانے کو ہضم کرتی ہے، فضلات کو خارج کرتی ہے۔ بعض اوقات اس سے ذہن تیز ہو جاتا ہے اور اس سے لذت و سرور حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت حسان

1۔ مسند امام احمد: 53/1

بن ثابت کا دور جاہلیت کا شعر ہے۔ ''شراب پی کر ہم اپنے آپ کو شہنشاہ اور بہادر سمجھنے لگتے ہیں اور ہم دشمن کا سامنا کرنے سے بالکل خائف نہیں ہوتے۔'' اسی طرح اس کی خرید وفروخت اور تجارت میں نفع ممکن ہے۔ بعض اوقات انسان جوا میں بھی جیت کر اپنے اہل و عیال کو خوش کرتا ہے۔ لیکن ان کے یہ فوائد ان کے نقصان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کے نقصانات کا تعلق عقل اور دین سے ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بہت بڑا ہے۔ کیونکہ یہ آیت کریمہ شراب کی قطعی حرمت کا پیش خیمہ تھی اور یہ اس پر صراحۃً دلالت نہیں کرتی۔ اس لئے حضرت عمر نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی تھی کہ اے اللہ! شراب کی حرمت کے بارے میں کوئی واضح حکم نازل فرما۔ حتیٰ کہ شراب کی حرمت کا صریح حکم سورۂ مائدہ میں نازل ہوا جس کا تفصیلی بیان سورۂ مائدہ کی تفسیر میں آئے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، شعبی، مجاہد، قتادہ، ربیع بن انس اور عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں کہ شراب کے بارے میں سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد سورۂ نساء والی آیت نازل ہوئی اور اس کے بعد مائدہ والی آیت نازل ہوئی جس نے صریح طور پر شراب کو حرام کر دیا۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ : ''عُفُوٌ'' کو زبر اور پیش دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے یہ دونوں قرأتیں صحیح ہیں اور ان کا معنی قریب قریب ہے۔ حضرت یحییٰ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے غلام بھی ہیں اور اہل و عیال بھی ہم مالدار ہیں۔ ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عفو سے مراد وہ مال ہے جو اہل وعیال پر خرچ سے بچ جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، مجاہد، عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر، معمر بن کعب، حسن بصری وغیرہم کئی دوسرے مفسرین وعلماء سے یہی منقول ہے۔ طاؤس فرماتے ہیں، ہر چیز سے تھوڑا تھوڑا اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہا کرو۔ حضرت ربیع فرماتے ہیں کہ افضل و بہترین مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ ان تمام اقوال کا خلاصہ یہی ہے کہ حاجت سے زائد چیز خدا کی راہ میں خرچ کر دی جائے۔ حضرت حسن بصری نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے: اتنا خرچ نہ کرو کہ سارا مال ہی صرف کر دو اور لوگوں سے سوال کرنے بیٹھ جاؤ۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے پاس دینار ہے۔ آپ نے فرمایا اسے اپنی ذات پر خرچ کرو۔ اس نے عرض کی میرے پاس ایک اور ہے فرمایا اسے اپنی بیوی پر خرچ کرو، عرض کی۔ اس کے علاوہ ایک اور ہے۔ فرمایا، اسے اپنے بچوں پر خرچ کرو عرض کی، اس کے علاوہ ایک اور بھی ہے، فرمایا تم صاحب بصیرت ہو (1)۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو فرمایا اپنی ذات سے شروع کرو پہلے اپنے نفس پر صدقہ کرو اگر پھر کوئی چیز بچے تو اہل وعیال کو دو اور اگر اس سے بھی بچ جائے تو قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرو اور اگر اس سے بھی بچ جائے تو حاجت مندوں میں تقسیم کرو۔ ایک دوسری روایت میں فرمایا بہترین صدقہ وہ ہے جو انسان دولت اور غناء کی حالت میں کرتا ہے۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ جو لوگ تیری کفالت میں ہیں صدقہ وخیرات کی ابتداء ان سے کرو۔ حدیث قدسی میں ہے، اے ابن آدم! اگر اپنی حاجت سے زائد مال کو خرچ کرے گا تو اس پر تجھے کوئی ملامت نہیں ہوگی کہا گیا ہے کہ یہ آیت کریمہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ منسوخ ہو چکی ہے۔ یہ ابن عباسؓ، عطاء خراسانی سے منقول ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ منسوخ نہیں بلکہ آیت زکوٰۃ اس کی وضاحت اور تفسیر ہے اور یہی قول صحیح ہے۔

كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ: جیسے اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو تفصیلاً اور واضح طور پر بیان کیا ہے ایسے ہی دوسری آیات میں بھی اپنے احکام، وعدہ وعید بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا وآخرت کے کاموں میں خوب غور وفکر کر لو۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا کے زوال اور

1۔ تفسیر الطبری، 366/2:

آخرت کی بقاء کے بارے میں غور وفکر کرو۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں قسم بخدا: جو اس میں غور وفکر کرتا ہے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا آزمائش اور فنا کا گھر ہے اور آخرت جزاء اور بقاء کا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اس میں غور وفکر کرنے سے دنیا پر آخرت کی فضیلت معلوم ہو جائے گی اس لیے آخرت کو دنیا پر ترجیح دو۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰى ؕ : حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (انعام:152) ''ترجمہ: اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے کہ بہت اچھا ہو''۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا (النساء:10) ''ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کا مال ظلم سے، وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ، وہ عنقریب جھونکے جائیں بھڑکتی ہوئی آگ میں''۔ تو ان لوگوں نے جن کے پاس یتیم پرورش پا رہے تھے ان کا کھانا پینا اپنے کھانے پینے سے الگ کر لیا۔ اگر ان کا کچھ کھانا بچ جاتا تو علیحدہ رکھ دیتے۔ اب وہ کھانا یا یتیم کھا لیتا یا خراب ہو جاتا۔ اس طرح یتیموں کا بھی نقصان ہوتا اور اہل خانہ کو بھی پریشانی ہوتی۔ ان لوگوں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یعنی ان کے کھانے کو اپنے کھانے پینے سے ملا لو۔ اس کو ابوداؤد، نسائی، ابن ابی حاتم اور حاکم نے ذکر کیا ہے۔ اور اس کی مثل حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی مروی ہے۔ کئی ایک مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں، مجھے یہ چیز ناپسند ہے کہ میں اپنے پاس یتیم کا مال الگ رکھوں بلکہ میں اسے اپنے کھانے پینے کے ساتھ ملا کر رکھوں گی۔

قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ : اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا مال الگ رکھنا بہتر ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر تم ان کی خورونوش کی چیزوں کو اپنی چیزوں سے ملاؤ گے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اس لیے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، کس کی نیت بری ہے، کس کی اچھی ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ : اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں تنگی اور مشقت میں ڈال دیتا۔ لیکن اس نے تمہیں وسعت اور آسانی عطا فرمائی۔ اور یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملانے کو تمہارے لیے مباح کر دیا۔ بلکہ یتیم کا کفیل اگر فقیر اور محتاج ہو تو وہ معروف طریقہ سے اس کے مال سے خرچ کر سکتا ہے۔ پھر اگر وہ خوشحال ہو جائے تو مال واپس لوٹا دے وگرنہ ضروری نہیں۔ اس کا تفصیلی بیان سورۂ نساء میں آئے گا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى یُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَتّٰى یُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ یَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَیُبَیِّنُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

''اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے آزاد مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔ اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی

طرف اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بت پرست مشرک عورتوں سے مسلمانوں کے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس آیت کا حکم عام ہے اور اس میں ہر مشرک عورت داخل ہے خواہ اُس کا تعلق اہل کتاب سے ہو یا بت پرستوں سے۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر اہل کتاب عورتوں کو اس حکم سے خارج کر دیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ (المائدہ:5)'' ترجمہ: اور (حلال ہیں) پاک دامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی ہے کتاب تم سے پہلے''۔ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، مکحول اور حسن بصری وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں صرف بت پرست مشرک عورتیں ہی مراد ہیں۔ اہل کتاب کی عورتیں بالکل مراد نہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف اصناف کی عورتوں سے نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مگر ہجرت کرنے والی مومن عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو منع نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ ہر غیر مذہب عورت کے ساتھ نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ کافر کے اعمال برباد جائیں گے یعنی ان کا کوئی اعتبار اور حیثیت نہیں۔ لیکن یہ حدیث صحیح نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت طلحہ بن عبد اللہ نے یہودی عورت سے اور حذیفہ نے بن یمانؓ سے نصرانی عورت سے نکاح کیا تو حضرت عمرؓ نا راض ہوئے۔ انہوں نے عرض کی اے امیر المومنین! آپ ناراض نہ ہوں ہم ان کو طلاق دے دیتے ہیں۔ اگر ان کو طلاق دینا حلال ہے تو ان سے نکاح کرنا بھی حلال ہوگا۔ آپ نے فرمایا لیکن میں ان کو ذلیل کر کے تم سے چھین لوں گا۔ مگر یہ روایت انتہائی غریب ہے۔ ابن جریر نے اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح کے مباح ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔ حضرت عمر اسے اس لیے ناپسند کرتے تھے تاکہ لوگ مسلمان عورتوں سے بے رغبتی کا اظہار نہ کریں۔ اور آپ کے پیش نظر اس قسم کی اور بھی مصلحتیں تھیں۔ حضرت شقیقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہ نے ایک یہودی عورت کے ساتھ نکاح کیا تو حضرت عمرؓ نے انہیں کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ انہوں نے جواب دیا اگر آپ اسے حرام خیال کرتے ہیں تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ میں اسے حرام نہیں کہتا۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ تم اس کی وجہ سے مسلمان عورتوں سے اعراض کرنے لگو۔ ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ مسلمان نصرانی عورت سے نکاح کرسکتا ہے لیکن نصرانی مسلمان عورت سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اس روایت کی سند پہلی سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم اہل کتاب عورتوں سے نکاح کریں گے لیکن وہ ہماری عورتوں کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتے۔ اس کی سند میں اگرچہ کچھ ضعف ہے لیکن امت کا اجماع اسی قول پر ہے۔ حضرت میمون بن مہران روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ اور وہ اس آیت کریمہ کی تاویل کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے، اس سے بڑھ کر اور شرک کیا ہوگا کہ کوئی عورت کہے اس کا رب عیسیٰ ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل سے جب اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا، اس سے مراد عرب کی بت پرست مشرک عورتیں ہیں۔

وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ: حضرت سدی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی ایک سیاہ فام لونڈی تھی۔ ایک دن آپ نے غصے کی حالت میں اسے تھپڑ مار دیا۔ پھر گھبرا کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے لونڈی کے بارے میں پوچھا، عرض کی، وہ روزے رکھتی ہے، نماز پڑھتی ہے اور یہ گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے

سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا، اے عبداللہ! یہ لونڈی تو ایماندار ہے۔ انہوں نے عرض کی قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میں اسے آزاد کر کے اس کے ساتھ نکاح کر لیتا ہوں۔ اس پر بعض لوگوں نے آپ کو لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے کا طعنہ دیا۔ کیونکہ وہ لوگ مشرک عورتوں کے ساتھ خود بھی نکاح کرتے اور اپنی بیٹیوں کو بھی ان کے نکاح میں دیتے تاکہ ان کے حسب ونسب اور شرافت کا بھرم قائم رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے نہ نکاح کرو، ہوسکتا ہے حسن انہیں مغرور بنادے۔ اور نہ ہی ان کے مال کی وجہ سے ان سے نکاح کرو، ہوسکتا ہے مال انہیں سرکش بنادے۔ صرف ان کی دینداری کی وجہ سے ان سے نکاح کرو۔ اگر غریب، سیاہ فام لونڈی دیندار ہو تو وہ بہتر ہے اس حدیث کا ایک راوی افریقی ضعیف ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کسی عورت کے ساتھ چار وجوہ سے نکاح کیا جاتا ہے ۱۔ مال، ۲۔ حسب ونسب، ۳۔ حسن وجمال، ۴۔ دینداری تم دین والی کو تلاش کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ساری کی ساری دنیا ایک متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا: یعنی مشرک مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کا نکاح نہ کرو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (الممتحنہ:10) ''ترجمہ: نہ وہ حلال ہیں کفار کے لیے اور نہ وہ کفار حلال ہیں مومنات کے لیے''۔ پھر فرمایا، بے شک مومن غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند آئے۔ یعنی مومن شخص اگرچہ ایک حبشی ہو تو وہ ایک مالدار اور رئیس مشرک سے بہتر ہے۔

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ: مشرکین کے ساتھ میل جول، دنیا کی محبت اور حرص اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا باعث بنتا ہے۔ جس کا انجام انتہائی بھیانک ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ: اللہ تعالیٰ اپنے شرعی احکام، اپنے اوامر ونواہی کے ذریعے بندوں کو جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ اور اپنے حکم کو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳

''اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق فرمایئے وہ تکلیف وہ ہے پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں اور نہ نزدیک جایا کرو ان کے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جیسے حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں سو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو اور پہلے پہلے کر لو اپنی بھلائی کے کام اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو''۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ : حضرت انس فرماتے ہیں کہ یہود مدینہ حیض والی عورتوں کے ساتھ نہ تو کھاتے پیتے اور نہ ہی ان کو اپنے ساتھ گھروں میں رکھتے۔ صحابہ کرامؓ نے اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ جب رسول اللہ ﷺ اس آیت کی تلاوت کر کے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جماع کے علاوہ ہر چیز جائز ہے۔ یہود کو اس کا علم ہوا تو کہنے لگے یہ تو ہر معاملہ میں ہماری مخالفت کرنے لگے ہیں۔ حضرت اُسید بن حضیر اور عباد بن بشر نے عرض کی یارسول اللہ! یہودی اس طرح کہہ رہے ہیں۔ پھر عرض کرنے لگے کیا ہم اپنی عورتوں کے ساتھ اس حالت میں جماع نہ کیا کریں یہ سن کر حضور ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ صحابہ کرام نے گمان کیا کہ آپ ان سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس حالت میں وہ دونوں صحابی آپ کی مجلس سے باہر چلے گئے۔ ابھی وہ باہر نکلے ہی تھے کہ کسی نے حضور ﷺ کی خدمت میں دودھ کا پیالہ ہدیہ پیش کیا۔ آپ نے ان دونوں کو بلوایا اور انہیں دودھ پلایا۔ اس سے انہیں معلوم ہو گیا کہ آپ ان سے ناراض نہیں۔(1)

فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ : حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو۔ یعنی ان سے جماع نہ کرو۔ جماع کے علاوہ ہر چیز حلال ہے جیسا کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے۔ اس لیے اکثر علماء کا مذہب یہ ہے حالت حیض میں عورت کے ساتھ جماع کے علاوہ مباشرت جائز ہے۔ حدیث سے بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس حالت میں بھی ازواج مطہرات سے ملتے جلتے تھے لیکن وہ تہبند باندھے ہوئے ہوتے(2)۔ ایک صحابیہ سیدہ عائشہ سے سوال کرتی ہیں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ عورت کو حیض آ جاتا ہے اور گھر میں یہ حالت ہوتی ہے کہ میاں بیوی دونوں کے لیے صرف ایک بستر ہوتا ہے یعنی ایسی حالت میں اس کا خاوند اس کے ساتھ سو سکتا ہے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کا عمل بتاتی ہوں۔ ایک دفعہ حضور ﷺ گھر میں تشریف لائے گھر آتے ہی نوافل میں مشغول ہو گئے، کافی دیر مصروف رہے۔ اس اثناء میں مجھے نیند آ گئی۔ جب آپ کو سردی محسوس ہونے لگی تو آپ نے فرمایا عائشہ! میرے قریب آ جاؤ۔ میں نے عرض کی، میں حیض سے ہوں آپ نے مجھے اپنی ران سے کپڑا ہٹانے کا حکم فرمایا اور پھر میری ران پر اپنے رخسار مبارک اور سینے کو رکھ کر لیٹ گئے۔ میں بھی ان پر جھک گئی۔ اس طرح آپ کی سردی کچھ کم ہوئی۔ جسم مبارک گرم ہو گیا تو آرام فرما ہو گئے(3) حضرت مسروق حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ''اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَعَلٰی اَھْلِہٖ'' کے الفاظ کے ساتھ سلام کہا۔ انہوں نے جواباً مرحبا مرحبا کہا۔ اور اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے عرض کی میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں مگر مجھے شرم آتی ہے۔ انہوں نے فرمایا، میں تمہاری ماں ہوں اور تم میرے بیٹے ہو، جو پوچھنا ہو پوچھ لو۔ انہوں نے عرض کی کہ آدمی کے لیے حالت حیض میں اپنی بیوی کی کیا چیز حلال ہے۔ انہوں نے فرمایا، شرمگاہ کے علاوہ اس کے لیے ہر چیز جائز ہے۔ یہی قول حضرت ابن عباس، مجاہد، حسن بصری اور عکرمہ سے بھی منقول ہے۔ میمون بن مہران نے سیدہ عائشہ سے اس کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا تہبند کے اوپر اس کے لیے ہر چیز جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کھانا پینا اور لیٹنا جائز ہے۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حالت حیض میں مجھے اپنا سر دھونے کا حکم فرماتے، میں ان کا سر دھو دیتی۔ اسی حالت میں وہ میری گود کے ساتھ ٹیک لگا کر قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے۔ آپ فرماتی ہیں میں اسی حالت میں اگر ہڈی چوستی تو پھر اسے حضور ﷺ کو دے دیتی اور آپ اسی جگہ سے چوستے جہاں سے میں نے چوسا ہوتا۔ اسی طرح پانی پی کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتی آپ بھی وہیں سے منہ لگا کر پانی پیتے جہاں سے میں نے پیا ہوتا۔ آپ فرماتی ہیں ایام حیض میں رسول اللہ ﷺ اور میں ایک ہی لحاف میں آرام کرتے اگر آپ کا کپڑا کہیں سے خراب ہو جاتا تو اسے

1۔ مسند امام احمد:133,132/3 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ:77/1 3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارت:70/1

دھو لیتے ۔اسی طرح اگر جسم مبارک پر کوئی چیز لگ جاتی تو دھو لیتے۔ پھر انہی کپڑوں میں نماز پڑھتے ۔ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں، آپ فرماتی ہیں جب مجھے حیض شروع ہوتا تو میں بستر سے اتر کر چٹائی پر لیٹ جاتی۔ پاکیزگی کی حالت تک رسول اللہ ﷺ میرے قریب نہ آتے۔لیکن آپ کا یہ عمل احتیاط پر محمول ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ مرد کے لیے کپڑے کے اوپر عورت کے ساتھ مباشرت جائز ہے۔جیسا کہ میمونہ بنت حارث الہلالیہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حالت حیض میں اپنی کسی زوجہ کے ساتھ سو جانے کا ارادہ فرماتے تو آپ اسے تہبند باندھنے کا حکم فرماتے ۔اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔شیخین نے اس کی مثل حدیث حضرت عائشہ سے بھی روایت کی ہے۔حضرت عبداللہ بن سعد انصاری نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی، حالت حیض میں میری بیوی کی مجھ پر کیا چیز حلال ہے۔ آپ نے فرمایا جو کچھ تہبند کے اوپر ہو۔ یہ حدیث حضرت معاذ بن جبل سے بھی مروی ہے۔اس میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ اس سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس سعید بن مسیّب، قاضی شریح کا بھی یہی مذہب ہے۔یہ احادیث ان کے مذہب کی تائید کرتی ہیں امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔اکثر عراقی اور دوسرے علماء نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر تو تمام علماء کا اجماع ہے، اس حالت میں جماع حرام ہے۔اس لیے اس کے دواعی سے بھی بچنا ضروری ہے تاکہ انسان حرمت میں گرنے سے بچ جائے کیونکہ یہ دواعی جماع کے حریم ہیں۔اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ گنہگار ہوگا اور اسے توبہ و استغفار کرنی چاہیے۔کیا اس صورت میں اسے کوئی کفارہ بھی دینا پڑے گا۔اس میں دو قول ہیں۔(1) کفارہ دے گا۔اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص حالت حیض میں اپنی بیوی سے جماع کرے تو وہ نصف یا ایک دینار صدقہ کرے۔ترمذی کے یہ الفاظ ہیں، اگر خون سرخ ہو تو ایک دینار اور اگر پیلا ہو تو نصف دینار، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حائضہ عورت کے ساتھ جماع کرنے والے پر ایک دینار لازم کیا ہے۔اور اگر خون تو بند ہو گیا تھا لیکن ابھی تک اس نے غسل نہیں کیا تھا تو اس صورت میں نصف دینار صدقہ کرے۔دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر کوئی چیز لازم نہیں بلکہ اسے استغفار کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان علماء کے نزدیک ان احادیث کا مرفوع ہونا ثابت نہیں۔اگرچہ ان کو مرفوع اور موقوف دونوں طرح روایت کیا گیا ہے۔لیکن یہی قول صحیح ہے۔امام شافعی کا جدید قول بھی یہی ہے۔اور جمہور علماء نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ : یہ اللہ تعالیٰ کے حکم: فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ کی تفسیر ہے۔اور یہاں بیان کیا گیا ہے کہ جب تک حیض جاری رہے عورتوں کے ساتھ جماع ممنوع ہے۔اور اس سے ثابت ہوا کہ حیض ختم ہونے کے بعد جماع حلال ہو جائے گا۔حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "طُهْرٌ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس حالت میں انسان اپنی بیوی سے جماع کر سکتا ہے۔حضرت میمونہ اور حضرت عائشہ کا یہ فرمانا کہ جب ہم میں سے کوئی حیض والی ہو جاتی تو وہ تہبند باندھ لیتی اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کی چادر میں سوتی۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نزدیکی سے منع کیا گیا ہے وہ جماع ہے۔اس کے علاوہ سونا، بیٹھنا سب جائز ہے۔

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ : یہاں ارشاد ہوا ہے، غسل کرنے کے بعد ان کے ساتھ جماع کرنا جائز ہے۔ابن حزم فرماتے ہیں کہ ہر حیض ختم ہونے کے بعد جماع کرنا واجب ہے۔ان کی دلیل لفظ "فَاْتُوْهُنَّ" ہے۔ لیکن ان کی یہ دلیل صحیح نہیں۔کیونکہ کسی چیز کو منع کرنے کے بعد اس کے کرنے کا حکم دیا جائے تو اس کے مباح اور جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے۔علمائے اصول میں سے بعض جو کہتے ہیں کہ امر مطلق وجوب کے لئے آتا ہے۔ابن حزم کا قول ان کی موافقت میں ہے۔بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ اباحت کے لئے ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ امر سے

1۔ مسند امام احمد، 1/230

پہلے نہی (کسی چیز کا ممنوع ہونا) ہونا ایسا قرینہ ہے جو امر کو وجوب سے پھیر دیتا ہے۔ لیکن یہ قول محل نظر ہے۔ اور وہ چیز دلیل سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نہی سے پہلے جو حکم ہو وہ اپنی اصلی حالت پر برقرار رہتا ہے۔ اگر پہلے واجب ہے تو واجب ہی رہے گا۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ...... (توبہ:5) ''ترجمہ: پھر جب گذر جائیں حرمت والے مہینے تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم انہیں پاؤ''۔ اور اگر امر پہلے مباح تھا تو مباح رہے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا۔ (المائدہ:2) ''ترجمہ: اور جب احرام کھول چکو تو تم شکار کر سکتے ہو''۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ (الجمعہ:10) ''ترجمہ: پھر جب پوری ہو چکے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں''۔ اس قول پر علماء کرام کی تمام ادلہ جمع ہو جاتی ہیں۔ امام غزالی اور کئی دوسرے علماء اصولیین نے اس کو ذکر کیا ہے۔ بعض آئمہ متاخرین نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب حیض ختم ہو جائے تو اب اس عورت کے ساتھ جماع جائز نہیں یہاں تک کہ وہ غسل کر لے، یا تیمم کی شرائط پائی جائیں تو تیمم کر لے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر حیض دس دن مکمل ہونے کے بعد ختم ہوا تو حیض ختم ہوتے ہی بغیر غسل کے اس کے ساتھ جماع کرنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہاں تک وہ خون سے پاک ہو جائیں اور پانی سے طہارت حاصل کر لیں۔ یہی قول امام مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، مقاتل بن حیان اور لیث بن سعد کا ہے۔

مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ: حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد اور کئی دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ اس سے مراد فرج یعنی عورت کا مقام تولد ہے۔ ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے، فرج میں جماع کرے اور اس کے علاوہ کسی اور طرف تجاوز نہ کرے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ حد سے بڑھنے والا ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ اس میں دبر (مقام پاخانہ) میں جماع کرنے کی حرمت کی دلیل ہے۔ اس کی وضاحت ان شاء اللہ عنقریب ہی آئے گی۔ ابورزین، عکرمہ، ضحاک وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پاکیزگی کی حالت میں جماع کرو نہ کہ حیض کی حالت میں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وہ گناہ سے توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگرچہ وہ گناہ بار بار صادر ہو۔ گندگی اور اذیت رساں چیزوں سے بچنے والوں کو بھی پسند کرتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو حیض میں اور دبر میں جماع سے اجتناب کرتے ہیں۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ فرج سے مراد مقام تولد ہے اور اپنے کھیت میں جیسے چاہو آؤ۔ یعنی مقام جماع تو فرج ہی ہو، طریقہ خواہ کوئی ہو۔ حضرت جابر فرماتے ہیں، یہودی کہا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے پچھلی طرف سے جماع کرتا ہے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ ان کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اسے امام مسلم اور ابوداؤد نے سفیان ثوری سے روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مرد کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی عورت کے ساتھ جماع کر سکتا ہے خواہ وہ الٹی لیٹی ہو یا سیدھی۔ لیکن جماع فرج میں ہونا چاہئے۔ ایک شخص نے عرض کی، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) ہمیں اپنی عورتوں کے معاملہ میں کس چیز کے کرنے اور کس چیز کے چھوڑنے کا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا تمہاری کھیتی ہے جیسے چاہو اس کے پاس آؤ۔ مگر نہ تو اس کے چہرے پر ضرب لگاؤ اور نہ ہی اسے برا بھلا کہو۔ اور نہ ہی ناراضگی کی حالت میں اسے گھر سے نکالو(1)۔ قبیلہ حمیر کے کچھ لوگ دینی مسائل پوچھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک شخص نے پوچھا: مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے۔ مجھے اس کے بارے میں شرعی احکام سے آگاہ فرمائیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

1۔ مسند امام احمد: 5/5

ابو جعفر طحاوی اپنی کتاب ''مشکل الحدیث'' میں روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو الٹا لٹا کر مباشرت کی۔ لوگ اسے برا بھلا کہنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اسے ابن جریر، حافظ ابویعلیٰ نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سباط فرماتے ہیں۔ میں حفصہ بن عبدالرحمٰن بن ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن شرم آتی ہے۔ فرمایا اے بھتیجے! نہ شرماؤ، جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ میں نے پوچھا کیا عورتوں کے ساتھ پیچھے سے جماع کرنا جائز ہے۔ انہوں نے جواب دیا حضرت ام سلمہ نے فرمایا انصار اپنی عورتوں کو الٹا لٹا کر جماع کیا کرتے تھے۔ یہودی کہتے تھے جو شخص ایسے کرتا ہے تو اس کے ہاں بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ جب مہاجرین مدینہ تشریف لائے اور انہوں نے انصاری عورتوں کے ساتھ نکاح کیا۔ تو انہوں نے بھی ان کے ساتھ ایسے ہی کیا۔ ان میں سے ایک عورت نے اپنے خاوند کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ کہا کہ جب تک میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش نہ کرلوں تمہاری یہ بات نہیں مانوں گی وہ حضرت ام سلمہ کے پاس آئیں اور انہیں اس بارے میں مطلع کیا۔ انہوں نے کہا بیٹھ جاؤ۔ ابھی رسول اللہ تشریف لاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد حضور ﷺ تشریف لائے وہ عورت شرمندگی کی وجہ سے آپ سے مسئلہ نہ پوچھ سکی اور واپس چلی گئی، حضرت ام سلمہؓ نے آپ سے یہ پوچھا آپ نے فرمایا اس انصاری عورت کو بلاؤ۔ وہ عورت حاضر خدمت ہوئی آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کر کے حسن کہا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی حضور (ﷺ) میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کس چیز نے تمہیں ہلاک کر دیا۔ عرض کی آج رات میں نے اپنی سواری الٹی کر دی۔ آپ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی آگے سے آؤ یا پیچھے سے لیکن دبر اور حیض سے بچو (2)۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ عبداللہ بن عمر، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ انہیں اس حدیث میں وہم ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ انصاری پہلے بت پرست تھے اہل کتاب کے ساتھ مدینہ میں رہائش پذیر تھے اور ان کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کی علمیت کے قائل تھے اور اکثر افعال میں ان کی اتباع کرتے تھے۔ یہودی اپنی عورتوں سے صرف ایک ہی طرف سے جماع کرتے تھے۔ انصار بھی ان کے اس طریقہ پر عمل پیرا تھے۔ اس کے برعکس مکہ والے اس طریقہ سے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ مختلف طریقوں سے مباشرت کرتے تھے۔ جب مکہ والے مدینہ ہجرت کر کے آئے اور ان میں سے ایک شخص نے انصاری عورت کے ساتھ نکاح کیا۔ جب وہ اپنے طریقے کے مطابق اس کے ساتھ جماع کرنے لگا تو اس عورت نے کہا اگر تم ہمارے طریقے کے مطابق کرنا چاہو تو کرو ورنہ مجھ سے دور رہو۔ جب یہ بات حضور ﷺ تک پہنچی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یعنی یہ تمہاری کھتیاں ہیں انہیں سیدھا بھی لٹا سکتے ہو اور الٹا بھی اور اگر چت لٹانا چاہو تو بھی جائز ہے۔ اس حدیث کو صرف ابوداؤد نے راویت کیا ہے۔ ماقبل احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ خصوصاً حضرت ام سلمہ کی روایت اس کے مشابہ ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے سورۂ فاتحہ سے لے کر الناس تک قرآن پاک سنا۔ اس دوران میں ہر ایک آیت کے بارے میں آپ سے پوچھتا جاتا جب میں اس آیت کریمہ پر پہنچا۔ آپ نے یہ مذکورہ بالا روایت بیان فرمائی۔ حضرت ابن عباس نے مذکورہ روایت میں حضرت عبداللہ بن عمر کے جس وہم کا ذکر کیا ہے۔ شاید ان کا اشارہ صحیح بخاری کی اس راویت کی طرف ہو۔ حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس جب قرآن پاک کی تلاوت کرتے تو دوران تلاوت کسی سے بات نہ کرتے۔ ایک دن وہ سورۂ بقرہ پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت کریمہ پر پہنچے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ میں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ عورتوں کے دبر میں جماع کرنے کے بارے

1۔ مسند امام احمد: 305/6 2۔ مسند امام احمد: 297/1

میں نازل ہوئی۔ اس حدیث کو اس سند سے صرف امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ امام مالک نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ نسائی کی روایت میں آپ کے یہ بھی الفاظ ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کی دبر میں جماع کیا پھر اسے بہت افسوس ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ابو حاتم رازی نے اسے حدیث معلل کہا ہے۔ اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اگر یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر سے زید بن اسلم بھی روایت کرتے تو لوگ حضرت نافع کی حدیث پر اکتفاء نہ کرتے بعض نے اس کی تاویل یہ بیان کی ہے کہ آپ کے اس قول سے مراد یہ ہے کہ وہ جماع تو پچھلی طرف سے کرے لیکن اصل مقصد فرج ہی ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ابونضر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت نافع کو کہا لوگ تمہارے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ تم حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہو کہ انہوں نے دبر میں جماع کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں میں تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایک دن حضرت عبداللہ بن عمر قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب وہ اس آیت کریمہ پر پہنچے تو مجھے کہنے لگے کیا تم اس آیت کے بارے میں جانتے ہو۔ میں نے عرض کی نہیں۔ آپ نے فرمایا: ہم قریشی لوگ پچھلی طرف سے بھی اپنی عورتوں سے جماع کر لیتے تھے۔ جب مدینہ آئے تو انصاری عورتوں کے ساتھ نکاح کیا اور ان کے ساتھ بھی اس طرح کرنا چاہا تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا کیونکہ ان عورتوں نے یہ عمل یہودیوں سے سیکھ رکھا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اس کو ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ بہرحال حضرت عبداللہ بن عمر سے اس کے برعکس بھی روایت مروی ہے اور یہ بھی منقول ہے کہ آپ کے نزدیک یہ نہ مباح ہے نہ حلال۔ اور یہی قول بعض فقہائے مدینہ اور دوسرے فقہاء سے منقول ہے۔ حتیٰ کہ بعض نے امام مالک کی طرف بھی اس قول کو منسوب کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس کا انکار کرتے ہیں کہ امام مالک کی طرف اسے منسوب کرنا صحیح نہیں۔ اس فعل کی حرمت پر کئی ایک احادیث وارد ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا، اے لوگو! شرم و حیا کا دامن تھامو، اللہ تعالیٰ حق بات بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا۔ عورتوں کی دبر میں جماع کرنا حلال نہیں۔ حضرت خزیمہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی دبر میں جماع کرنے سے منع کیا ہے۔ اس مضمون کی احادیث کئی دوسری اسناد سے بھی مروی ہیں جن کو نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن حضرت خزیمہ بن ثابتؓ والی روایت کی سند میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا جو کسی مرد یا عورت کی دبر میں فعل بد کا ارتکاب کرے (1)۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ ابن حزم نے اس کی تصحیح کی ہے۔ نسائی نے اسے موقوفاً روایت کیا ہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا تم مجھ سے کفر کے بارے میں پوچھتے ہو؟ اس کی سند صحیح ہے۔ نسائی نے بھی اسے دوسری سند سے روایت کیا ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اپنی بیوی کی دبر میں جماع کرتا ہوں۔ اور کہا کہ میں نے اس آیت سے اس فعل کو حلال گمان کیا۔ آپ نے فرمایا، کمینے! اس کا یہ معنی نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنی بیوی کی فرج میں جماع کر سکتے ہو، خواہ بیٹھی ہو، کھڑی ہو، سیدھی لیٹی ہو، یا الٹی۔ ایک روایت میں رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس فعل بد کا ارتکاب کرنا لواطت صغریٰ ہے (2)۔ حضرت قتادہؓ سے بھی یہی سوال کیا گیا۔ تو آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ یہ لواطت صغریٰ ہے۔ حضرت ابو درداءؓ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اس فعل کا ارتکاب تو کافر ہی کر سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے بھی یہی قول منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

1۔ مسند امام احمد: 213/5
2۔ مسند امام احمد: 210/2

نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سات افراد کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ ہی ان کا تزکیہ فرمائے گا۔ اور انہیں فرمائے گا کہ جہنمیوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ (1) لوطی (فاعل اور مفعول دونوں) (2) مشت زنی کرنے والا (3) کسی جانور کے ساتھ فعل بد کا ارتکاب کرنے والا (4) عورت کی دبر میں وطی کرنے والا (5) ماں بیٹی کو نکاح میں جمع کرنے والا (6) اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرنے والا (7) اپنے پڑوسی کو اتنا تنگ کرنے والا کہ وہ اس کو ملامت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس حدیث کے راوی ابن لہیعہ اور اس کے استاد دونوں ضعیف ہیں۔ حضرت علی بن طلق روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کی دبر میں وطی کرنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے حیا نہیں فرماتا۔(1)

امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو کچھ زیادت کے ساتھ روایت کیا ہے۔ بعض محدثین نے اس حدیث کو حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے۔ لیکن صحیح علی بن طلق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی روایت میں ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ جو اپنی بیوی کی دبر میں وطی کرتا ہے(2)۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اسے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ اس فعل بد کا مرتکب ملعون ہے۔ یہ روایت کئی اسناد سے مروی ہے۔ جس کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اس کے ایک راوی مسلم بن خالد ضعیف ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے حالت حیض میں یا اپنی بیوی کی دبر میں وطی کی، یا کاہن کے پاس گیا اور اس کی تصدیق کی تو اس نے محمد (ﷺ) پر نازل شدہ احکام سے کفر کیا(3)۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح حیا کرو جیسے حیا کرنے کا حق ہے اور عورتوں کی دبر میں وطی نہ کرو۔ اس سند سے اس حدیث کو صرف نسائی نے روایت کیا ہے۔ حمزہ بن محمد کنانی نے فرمایا کہ یہ حدیث امام زہری، ابوسلمہ اور سعید کی اسناد سے منکر اور باطل ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں عورتوں کی دبر میں وطی کرنا کفر ہے۔ امام نسائی نے اس کو ایک دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اسے موقوفاً بھی روایت کیا ہے۔ موقوف ہی زیادہ صحیح ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے حیاء نہیں فرماتا، عورتوں کی دبر میں وطی نہ کرو۔ اس کو امام نسائی نے دوسری سند سے روایت کیا ہے۔ اور ایک روایت آپ سے موقوف ہے۔ اور موقوف ہی زیادہ صحیح ہے۔ یزید بن طلق نے بھی اس کو نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ اور عبدالرزاق نے اسے طلق بن علی سے روایت کیا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی روایت بھی علی بن طلق سے مروی ہے۔ بہرحال کئی دوسرے صحابہ سے بھی اس مفہوم کی روایات مروی ہیں۔ حضرت علی سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں نیچا کرے کیا تم نے یہ ارشاد باری تعالیٰ نہیں سنا: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف:80) ”ترجمہ: کیا تم کیا کرتے ہو ایسی بے حیائی کا فعل، جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا ساری دنیا میں“۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، ابودرداء، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن عاص اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اسے بلاشبہ حرام قرار دیتے ہیں۔ آپ سے ایک دفعہ اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے جواب دیا کیا کوئی مسلمان اس فعل کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ آپ کی طرف سے اس کی حرمت کی صریح نص ہے۔ اس کے علاوہ آپ سے جو بھی روایات مروی ہیں ان میں تاویل کی گنجائش ہے اس لیے اس صریح روایت کو ان پر ترجیح دی گئی ہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا ہم لونڈیاں خریدتے ہیں۔ کیا ان کی دبر میں وطی کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا

1۔ تحفۃ الاحوذی:327/4　　2۔ مسند امام احمد:272/2　　3۔ سنن ابن ماجہ: کتاب الطہارۃ:209

افسوس، کیا مسلمان ایسا کرسکتا ہے۔ اسرائیل بن روح فرماتے ہیں میں نے امام مالک سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا تم لوگ بڑے جاہل ہو کیا کھیتی کے علاوہ بھی کہیں بیج بویا جاسکتا ہے۔ فرج سے تجاوز نہ کیا کرو۔ میں نے کہا کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ آپ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ فرمایا وہ جھوٹے ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ سعید بن مسیّب، ابوسلمہ، عکرمہ، طاؤس، عطاء، عروہ بن زبیر، حسن بصری اور کئی دوسرے سلف صالحین سے یہی منقول ہے۔ وہ اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض تو اس پر کفر کا اطلاق کرتے تھے۔ اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے۔ بعض فقہائے مدینہ حتیٰ کہ امام مالک سے بھی اس کا جو جواز منقول ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن بن قاسم فرماتے ہیں کہ میں نے دین کے معاملہ میں کسی ایسے قابل اعتماد شخص کو نہیں پایا جو اس کی حرمت میں شک کرتا ہو۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور فرمایا کہ اس سے واضح حکم اور کیا ہوسکتا ہے۔ امام شافعی سے بھی اس کے مباح ہونے کی ایک روایت منقول ہے۔ لیکن حضرت ربیع فرمایا کرتے تھے۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ کیونکہ امام شافعی نے اپنی چھ کتابوں میں اس کی حرمت کی تصدیق فرمائی ہے۔

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ: ارشاد باری تعالیٰ ہے بھلائی کے کام سرانجام دو اور اس کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کو ترک کرو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا اور ڈرتے رہو اللہ سے، اور خوب جان لو تم اس سے ملنے والے ہو۔ وہ تمہارے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائے گا۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اے حبیب! مومنوں کو خوشخبری دو۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ کے احکام کو بجالانے والے اور ہر اس چیز کو ترک کرنے والے ہیں جس سے اس نے روکا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا معنی یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ ہم بستری کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھے۔ (بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّيْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا) آپ فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے اس جماع کے بعد بچہ عطا فرمادیا تو شیطان اس بچے کو کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا(1)۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

"اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر کہ نیکی نہ کرو گے اور پرہیزگاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری لا یعنی قسموں پر لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا حلم والا ہے"۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، نیکی اور صلہ رحمی نہ کرنے کے لیے خدا کی قسموں کو نشانہ نہ بناؤ۔ یعنی یہ قسم نہ کھاؤ کہ میں یہ نیکی کا کام نہیں کروں گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ...... (النور:22) (اور نہ قسم کھائیں جو برگزیدہ ہیں ان میں سے اور خوشحال ہیں اس بات پر کہ وہ نہ دیں گے رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو۔ اور

1۔ فتح الباری، کتاب بدء الخلق: 335/6

چاہیے کہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہیں، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے) اگر کسی شخص نے ایسی قسم کھالی اور اس پر قائم رہا تو گنہگار ہوگا۔ اسے چاہیے کہ وہ قسم کو توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔ جس طرح کہ ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ہم پیچھے آنے والے ہیں۔ اور قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔ فرمایا اگر تم میں سے کوئی ایسی قسم اٹھالے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جو کفارہ بیان کیا ہے وہ ادا نہ کرے تو وہ گنہگار رہوگا(1)۔ اس حدیث کو امام اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری نے ایک دوسری سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم نیکی نہ کرنے میں اپنی قسم کو رکاوٹ نہ بنالو بلکہ اپنی قسم کا کفارہ دے کر نیکی کا کام سرانجام دو۔ یہی قول مسروق، شعبی، ابراہیم نخعیؒ اور دوسرے بہت سے علماء سے منقول ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت کردہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم بخدا اگر میں کوئی قسم اٹھالوں اور اسے توڑنے میں مجھے بہتری نظر آئے تو میں اس قسم کو توڑ دونگا اور کفارہ ادا کردوں گا(2)۔ آپ نے عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کو ارشاد فرمایا: اے عبدالرحمٰن! امارت اور سرداری کو طلب نہ کیا کرو۔ اگر بغیر مانگے ہی تمہیں عطا ہوگئی تو اللہ کی طرف سے تجھے تائید حاصل ہوگی اور مانگنے پر عطا کی گئی تو تجھے اس کے سپرد کردیا جائے گا۔ اور جب تو کوئی قسم اٹھالے اور اس قسم کے برعکس نیکی اور بھلائی خیال کرے تو اس نیکی کے کام کو سرانجام دو اور اپنی قسم کا کفارہ دے دو ابو ہریرہؓ سے بھی اسی مفہوم کی حدیث مروی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی اسی کی مثل حدیث ذکر کی ہے ابو داؤد کے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جس چیز کا مالک نہ ہو اس میں نہ تو قسم ہوتی ہے اور نہ نذر۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور قطع رحمی میں بھی قسم نہیں۔ جس نے کسی چیز پر بھی قسم اٹھائی پھر اس کے غیر کو بہتر پایا اسے چاہیے کہ اپنی اس قسم کو توڑ دے اور نیکی کے کام کو سرانجام دے۔ اور اس کا چھوڑ دینا ہی کفارہ ہے۔ ابوداؤد فرماتے ہیں اس حدیث کے علاوہ باقی تمام حدیثوں میں یہی حکم ہے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے قطع رحمی یا کسی مصیبت پر قسم اٹھائی تو اس قسم کو پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے توڑ دے اور اپنی قسم سے رجوع کرے۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس حدیث کے راوی حارثہ بن ابی رجال تمام محدثین کے نزدیک متروک الحدیث اور ضعیف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، سعید بن مسیّب، مسروق اور شعبی سے بھی منقول ہے کہ معصیت میں قسم نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کفارہ دینا واجب ہوتا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ: ارشاد ہوتا ہے اللہ تعالیٰ لایعنی اور لغو قسموں کی وجہ سے تمہارا مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ یعنی وہ قسمیں جن میں قسم اٹھانے والے کا قصد اور ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ بلکہ عادت کے طور پر اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے لات اور عزیٰ کی قسم اٹھائی۔ اسے فوراً کلمہ توحید پڑھنا چاہیے۔ یہ ارشاد آپ نے ان لوگوں کو فرمایا جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور انکی زبانوں پر بغیر کسی قصد و ارادہ کے لات اور عزیٰ کی قسم جاری ہوجاتی تھی۔ تو آپ نے ان کو کلمہ توحید پڑھنے کا حکم فرمایا۔ تاکہ بغیر قصد کے انکی زبانوں پر جو کلمہ کفر جاری ہوا ہے اس کا ازالہ ہوسکے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ: ارشاد باری تعالیٰ ہے لیکن وہ تمہیں ان قسموں پر پکڑے گا جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا: بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ''ترجمہ: (لیکن) باز پرس کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم پختہ کرچکے ہو''۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لغو قسمیں وہ ہوتی ہیں کہ انسان اپنے گھر میں دوران گفتگو کھاتا

1۔ البخاری، کتاب الایمان، مسلم: 1276   2۔ مسلم، کتاب الایمان: 1270

رہتا ہے۔جیسے قسم بخدا، ہرگز نہیں۔قسم بخدا کیوں نہیں۔ابوداؤد اور زہری نے اس حدیث کو موقوف قرار دیا ہے۔اس طرح ابن جریج اور ابن ابی لیلیٰ نے بھی اس کو موقوف روایت کیا ہے۔حضرت عائشہؓ آیت لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ کی تفسیر کے تحت فرماتی ہیں کہ اس سے مراد وہ قسمیں ہیں جو لوگ آپس میں لڑائی جھگڑے کے وقت اٹھاتے ہیں۔ایک کہتا ہے کہ اللہ کی قسم ایسا نہیں ہوا۔دوسرا کہتا ہے خدا کی قسم ایسا ہوا ہے۔لیکن یہ قسم اٹھانے میں ان کا ارادہ پختہ نہیں ہوتا۔اس کو عبدالرزاق نے اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ایک روایت میں ارشاد فرماتی ہیں کہ لغو قسم سے مراد وہ قسم ہے جو انسان ہنسی اور مذاق کے وقت کھاتا ہے۔اس میں کفارہ لازم نہیں ہوتا۔کفارہ صرف اسی قسم میں لازم ہوتا ہے کہ جو انسان پختہ ارادہ سے قسم اٹھائے کہ وہ یہ کام کرے گا پھر اس نے یہ کام نہ کیا تو اس پر یہ کفارہ لازم ہوگا۔حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس شعبی اور عکرمہ کے ایک قول کے مطابق ،عروہ بن زبیر ابوصالح ،ابوقلابہ اور زہریؒ سے بھی یہی منقول ہے۔حضرت عروہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ اس آیت کی تاویل فرمایا کرتی تھیں کہ یمین لغو سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے گمان میں سچی قسم اٹھائے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہو۔حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس کے ایک قول کے مطابق ،سلمان بن یسار اور سعید بن جبیر اور دوسرے بہت سے تابعین سے یہی تفسیر مروی ہے۔ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے پاس سے گزرے جو تیر اندازی کر رہے تھے۔آپ کے ساتھ آپ کے ایک صحابی بھی تھے۔تیر اندازی کرنے والے ایک شخص نے کہا اللہ کی قسم !میرا نشانہ لگے گا۔دوسرے نے کہا، خدا کی قسم ،تیرا نشانہ نہیں لگے گا۔اس صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ !اس شخص کی قسم ٹوٹ گئی۔آپ نے فرمایا ہرگز نہیں ،تیر اندازوں کی قسمیں لغو ہوتی ہیں۔ان میں کفارہ ہوتا ہے نہ کوئی سزا۔یہ حدیث مرسل حسن ہے۔حضرت عائشہ سے اس میں دو قسم کے قول منقول ہیں۔حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں۔یمین لغو سے مراد یہ ہے کہ انسان قسم اٹھائے پھر بھول جائے۔حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ بددعائیہ جملے بھی اسی میں داخل ہیں۔مثلاً کوئی شخص کہے اگر میں یہ کام نہ کروں تو اللہ تعالیٰ میری آنکھیں اندھی کر دے۔حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ غصے کی حالت میں قسم کھانا بھی یمین لغو ہے اور ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد کسی حلال چیز کو حرام کرنا ہے اس میں کفارہ نہیں ہے۔حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ دو انصاری بھائیوں کے درمیان وراثت کا مال مشترک تھا۔ان میں سے ایک نے دوسرے کو مال تقسیم کرنے کے لیے کہا تو وہ کہنے لگا کہ اگر تو نے دوبارہ مال تقسیم کرنے کے بارے میں پوچھا تو میرا سارا مال بیت اللہ شریف کے لئے وقف ہے۔حضرت عمر نے اس سے کہا کہ بیت اللہ کو تیرے مال کی ضرورت نہیں۔قسم کا کفارہ دے اور اپنے بھائی سے بات چیت کر۔میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا، اللہ کی معصیت اور قطع رحمی میں اور ایسے مال میں جس کا تو مالک نہیں ہے ان میں نہ قسم ہوتی ہے اور نہ نذر۔مجاہد فرماتے ہیں اگر کوئی شخص جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا مؤاخذہ فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور علم والا ہے۔یعنی اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف فرماتا اور ان کے معاملہ میں حلم و بردباری سے کام لیتا ہے۔

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾

’’ان کے لیے جو قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے مہلت ہے چار ماہ کی پھر اگر رجوع کر لیں (اس مدت میں) تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔اور اگر پکا ارادہ کر لیں طلاق دینے کا تو بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا

جاننے والا ہے"۔

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ: ایلاء کا معنی قسم اٹھانا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت نہ کرنے کی قسم اٹھائے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو اس کی یہ قسم چار ماہ سے کم ہوگی یا زائد اگر مدت چار ماہ سے کم ہوگی تو وہ شخص اس مدت کے گزرنے کا انتظار کرے اور پھر مدت پوری ہونے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرسکتا ہے۔ اس دوران عورت کو صبر کرنا چاہیے اور وہ اس مدت میں اپنے شوہر سے رجوع کرنے کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات سے ایک ماہ کے لئے ایلاء کیا۔ اور انتیس دن الگ رہے اور فرمایا کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے(1)۔ یہ حدیث حضرت عمر سے بھی مروی ہے۔ اگر مدت ایلاء چار ماہ سے زائد ہو تو چار ماہ گزرنے کے بعد عورت اپنے خاوند سے مطالبہ کرسکتی ہے یا تو وہ رجوع کرے اور مجامعت کرے یا اسے طلاق دے۔ اور حاکم وقت اسے اس پر مجبور کرسکتا ہے تاکہ عورت کو تکلیف نہ ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ یعنی جو لوگ اپنی بیویوں سے جماع نہ کرنے کی قسم اٹھالیں۔ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ایلاء صرف بیویوں کے ساتھ مختص ہے، لونڈیوں کے ساتھ نہیں ہوگا۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔

تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ: یعنی خاوند قسم کھانے کے وقت سے چار ماہ انتظار کرے گا پھر اس سے مطالبہ کیا جائے کہ یا تو رجوع کر یا بیوی کو طلاق دے۔ اور اگر وہ رجوع کرے تو یہ رجوع کرنا جماع سے کنایہ ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس، مسروق، شعبی سعید بن جبیر وغیرہم سے منقول ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اس قسم کی وجہ سے عورت کے حقوق میں جو کوتاہی ہوئی ہے اسے بخشنے والا ہے۔ اور اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ اس صورت میں مرد پر کوئی کفارہ لازم نہیں۔ یہ امام شافعی کا قدیم قول ہے۔ اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو اس سے مقدم آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ اس پر کفارہ لازم ہے۔ اور یہی امام شافعیؒ کا جدید مذہب ہے۔

وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ: یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صرف چار مہینے گزرنے سے طلاق نہیں ہوتی۔ یہ جمہور متاخرین علماء کا مذہب ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ چار ماہ پورے ہوتے ہی ایک طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ قول حضرت عمر، عثمان، علی ابن مسعود، ابن عباس اور زبیر بن ثابت سے صحیح اسناد سے مروی ہے۔ ابن سیرین، مسروق، قاسم، سالم، ابوسلمہ، قتادہ، قاضی شریح، ابراہیم نخعی، ربیع بن انس اور سدی وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق رجعی ہوگی اور یہ قول سعید بن مسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، مکحول، ربیعہ، زہری اور مروان بن حکم سے منقول ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ طلاق بائنہ ہوگی اور یہ قول حضرت علی، ابن مسعود، عثمان، ابن عباس، ابن عمر، اور زید بن ثابت سے منقول ہے۔ ان کے علاوہ عطاء، جابر بن زید، مسروق، عکرمہ، حسن بصری، ابن سیرین، محمد بن حنیفہ، ابراہیم نخعی، قبیصہ بن زویب، ابوحنیفہ، ثوری، حسن بن صالح کا بھی یہی مذہب ہے۔ جن علماء نے یہ فرمایا ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق ہو جاتی ہے ان کے نزدیک اس عورت پر عدت گزارنا واجب ہے۔ مگر حضرت عبداللہ بن عباس اور ابوشعسہ سے مروی ہے اگر تین حیض گزر چکے ہوں تو اب اس پر کوئی عدت لازم نہیں۔ اور یہی امام شافعی کا قول ہے۔ جمہور متاخرین فرماتے ہیں چار ماہ گزرنے کے بعد خاوند سے رجوع کرنے یا طلاق دینے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اس مدت کے گزرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں جب کوئی شخص اپنی عورت سے ایلاء کرے تو اس پر طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ چار ماہ گزر جائیں۔ اس مدت

1۔ مسلم، کتاب الطلاق: 1113

کے گزرنے کے بعد اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ یا تو وہ رجوع کرے یا طلاق دے دے(1)۔ حضرت سلیمان بن یسار فرماتے ہیں کہ میں نے دس سے زیادہ صحابہ کو پایا کہ ان کا یہی مذہب ہے۔ امام شافعی حضرت علی سے یہی روایت کرتے ہیں کہ ایلاء کرنے والے کو روکا جائے گا اور اس سے طلاق یا رجوع کا مطالبہ کیا جائے گا۔ پھر فرمایا کہ یہی ہمارا قول ہے۔ یہ حضرت عمر، ابن عمر، عائشہ، عثمان، زید بن ثابت اور کئی دوسرے صحابہ کے قول کے موافق ہے۔ حضرت سہیل بن ابی صالح اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے بارہ صحابہ کرام سے ایلاء کرنے والے شخص کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو ان سب نے فرمایا اس پر کوئی چیز لازم نہیں یہاں تک کہ چار مہینے گزر جائیں۔ پھر اس کو روکا جائے۔ اگر رجوع کرلے تو فبہا ورنہ وہ طلاق دے دے۔ یہی قول حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابودرداء، حضرت علی، ام المومنین، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ سعید بن مسیّب، عمر بن عبدالعزیز، مجاہد، طاؤس، محمد بن کعب اور قاسم سے بھی منقول ہے۔ امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیث بن سعد، اسحاق بن راھویہ، ابوعبید، ابوثور، اور داؤد سے بھی یہی ثابت ہے۔ یہ سب حضرات فرماتے ہیں کہ اگر چار ماہ گزرنے کے بعد وہ رجوع نہ کرے تو اسے طلاق دینے پر مجبور کیا جائے۔ اور اگر طلاق نہ دے تو حاکم ازخود اس کی طرف سے طلاق دے دے۔ یہ طلاق رجعی ہوگی اور خاوند کو عدت میں رجوع کا حق حاصل ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ عدت میں رجعت جائز نہیں یہاں تک کہ وہ عدت میں اس کے ساتھ رجوع کرے۔ لیکن یہ قول نہایت ہی غریب ہے۔ ایلاء کرنے والے کو چار ماہ کی تاخیر کی اجازت ہوتی ہے۔ اس مناسبت کی وجہ سے فقہاء اور دوسرے علماء یہاں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس کو امام مالک نے موطا شریف میں عبداللہ بن دینار سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات حضرت عمر گشت کے لئے مدینہ کی گلیوں میں نکلے تو آپ نے ایک عورت کو یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔

1۔ یہ رات کتنی لمبی اور تاریک ہے! جس نے مجھے جگا رکھا ہے۔ میرا محبوب یہاں نہیں جس کے ساتھ میں دل لگی کروں۔

2۔ قسم بخدا اگر مجھے اللہ کا خوف نہ ہوتا تو اس چارپائی کے بازو حرکت کرتے۔

یہ سن کر آپ گھر تشریف لائے اور اپنی بیٹی حضرت حفصہ سے پوچھا کہ ایک عورت اپنے خاوند کی جدائی پر زیادہ سے زیادہ کتنا صبر کرسکتی ہے۔ فرمایا چھ ماہ یا چار ماہ۔ آپ نے فرمایا اب میں حکم جاری کردوں گا کہ کسی مسلمان مجاہد کو اس سے زیادہ محاذ جنگ پر نہ روکا جائے۔ اس واقعہ کی اور بھی بہت سی اسناد ہیں۔ جن میں کچھ تفصیل بھی ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

"اور طلاق دی ہوئی عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک اور جائز نہیں ان کے لیے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر اور ان کے خاوند زیادہ حق دار ہیں ان کو لوٹانے

1۔ فتح الباری، کتاب الطلاق :426/9

کے اس مدت میں اگر وہ ارادہ کرلیں اصلاح کا۔ اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔"

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ :وہ عورتیں جو مدخولہ (وہ جو اپنے خاوندوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرچکی ہوں) اور حیض والی ہوں، اگر انہیں طلاق ہو جائے اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرماتا ہے کہ وہ تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ یعنی خاوند کے طلاق دینے کے بعد وہ تین حیض تک انتظار کریں پھر اگر چاہیں تو دوسرا نکاح کرسکتی ہیں۔ ائمہ اربعہ نے اس عمومی حکم سے لونڈی کو خارج کردیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک طلاق کے بعد لونڈی کی عدت دو حیض ہے۔ اس لیے کہ لونڈی کی آزاد عورت کے مقابلہ میں نصف عدت ہوتی ہے اور حیض کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس کے لیے دو حیض گزارنا ضروری ہیں۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لونڈی کی طلاقیں دو ہیں اور عدت دو حیض ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس کا راوی مظاہر انتہائی ضعیف ہے۔ حافظ دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ قاسم بن محمد کا اپنا قول ہے۔ ابن ماجہ نے اسے عبداللہ بن عمر سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے۔ دارقطنی اسے بھی کہتے ہیں کہ یہ ابن عمرؓ کا اپنا قول ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب سے بھی یہی مروی ہے بلکہ صحابہ کرام کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت کریمہ کے عمومی حکم کی وجہ سے لونڈی کی عدت بھی آزاد عورت کی طرح ہے۔ اور چونکہ یہ ایک فطری امر ہے اس لیے آزاد اور لونڈی کو اس حکم میں برابر ہونا چاہیے۔ یہ قول ابن عبدالبر نے محمد بن سیرین اور بعض اہل ظاہر سے نقل کرکے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید بن سکن انصاریہ فرماتی ہیں کہ مجھے میرے خاوند نے طلاق دی۔ اور اس وقت مطلقہ کی کوئی عدت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

قُرُوْٓءٌ کے بارے میں آئمہ کرام کے دو قول ہیں۔ 1۔ قروء سے مراد طُہر ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضرت حفصہ بنت عبدالرحمٰن (جو آپ کی بھتیجی ہیں) نے تین طہر مکمل کرلیے اور تیسرا حیض شروع ہوگیا تو وہ اپنے سابقہ خاوند کے مکان میں منتقل ہوگئیں۔ حضرت حمراء بنت عبدالرحمٰن نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ جب لوگوں نے حضرت عائشہ سے اس کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں "ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ" کے الفاظ ذکر کیے ہیں فرمایا تم سچ کہتی ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ قروء سے کیا مراد ہے۔ قروء سے مراد طہر ہے۔ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں نے جتنے فقہائے کرام کو پایا ان کا یہی مذہب تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے اور طلاق کے بعد عورت کو تیسرا حیض شروع ہو جائے تو وہ عورت اس سے آزاد ہے اور وہ مرد اس عورت سے۔ امام مالک فرماتے ہیں ہمارے نزدیک بھی یہی قول راجح ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، زید بن ثابتؓ سالم، قاسم، عروہ، سلیمان یسار، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، ابان بن عثمان، عطاء بن ابی رباح، قتادہ اور باقی فقہائے سبعہ سے یہی مروی ہے۔ امام مالک، شافعی کا بھی یہی مذہب ہے۔ داؤد ظاہری، ابوثور، اور امام بن حنبل سے ایک روایت یہی ہے۔ انکی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ یعنی ان کو طہر اور پاکیزگی کی حالت میں طلاق دو۔ کیونکہ وہ طہر جس میں طلاق دی جائے اسے عدت میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس آیت میں قروء سے مراد طہر ہے۔ اسی لیے یہ فرماتے ہیں کہ تیسرا حیض شروع ہوتے ہی عدت ختم ہو جائے گی اور وہ عورت اپنے خاوند سے جدا ہو جائے گی۔ اور عورت کی کم از کم عدت بتیس دن اور چند گھڑیاں ہیں۔ عرب شعراء نے بھی اس لفظ کو طہر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ اعشیٰ کا قول ہے: لَمَّا

ضَاعَ فِيْهَا مِنْ قُرُوْءِ نِسَائِكَ

دوسرا قول یہ ہے کہ قروء سے مراد حیض ہے۔ان کے نزدیک عدت اس وقت ختم ہوگی جب عورت تیسرے حیض سے پاک ہوگی۔ بعض نے یہ بھی شرط لگائی ہے حتیٰ کہ عورت تیسرے حیض سے غسل کرلے۔اس صورت میں عدت ختم ہونے کی کم از کم مدت تینتیس دن اور ایک لمحہ ہے۔حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عمر بن خطاب کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی میرے خاوند نے ایک یا دو طلاقیں دی تھیں۔ پھر میرے پاس اس وقت آیا جب میں نے کپڑے اتارے ہوئے تھے اور دروازہ بند کیا ہوا تھا۔یعنی تیسرے حیض سے نہانے کی تیاری کر رہی تھی۔حضرت عمر نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے فرمایا میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ اس کی بیوی ہے یعنی اس کے دیکھنے سے رجوع ثابت ہو گیا۔ابن مسعود نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے۔حضرت ابوبکر صدیق، عمر، عثمان، علی، ابو درداء، عبادہ بن صامت، انس بن مالک، عبداللہ ابن مسعود، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، عبداللہ بن عباس سے یہی قول مروی ہے۔سعید بن مسیب، علقمہ، اسود، ابراہیم نخعی، مجاہد، عطاء، طاؤس، سعید بن جبیر، عکرمہ، محمد بن سیرین، حسن بصری، قتادہ، شعبی، ربیع بن انس، مقاتل بن میان، سدی، مکحول، ضحاک اور عطاء خراسانی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قروء سے مراد حیض ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔اور صحیح ترین روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مذہب ہے۔اثرم حضرت امام احمد بن حنبل سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ اکابر صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ قروء سے مراد حیض ہیں۔سفیان ثوری، اوزاعی، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ، حسن بن صالح، ابوعبید اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مذہب ہے۔اس کی تائید حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش سے مروی حدیث سے ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اپنے اقراء کے ایام میں نماز چھوڑ دیا کرو(1)۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قروء سے مراد حیض ہے۔بشرطیکہ یہ حدیث صحیح ہو۔اس کے ایک راوی منذر کے بارے میں ابو حاتم کہتے ہیں کہ یہ مجہول ہے۔لیکن ابن حبان نے اسے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ابن جریر فرماتے ہیں کہ لغت عرب میں قرء ہر چیز کے آنے جانے کے وقت کو کہتے ہیں جس کے آنے جانے کا وقت معلوم ہوا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ان دونوں معنی میں مشترک ہے۔بعض اصولیوں نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔واللہ اعلم۔اصمعی کہتے ہیں کہ قرء سے مراد وقت ہے۔ابوعمرو بن علاء کا قول ہے کہ اہل عرب حیض کو بھی قرء کہتے ہیں اور طہر کو بھی۔شیخ ابوعمرو ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ لغت عرب کے ماہرین اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرء کے لفظ سے حیض بھی مراد لیا جاتا ہے اور طہر بھی۔لیکن ان کا اختلاف اس پر ہے کہ یہاں اس آیت سے کیا مراد ہے۔اس کے بارے میں انکے دو قول ہیں۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ: اللہ تعالیٰ نے انکے ارحام میں جو کچھ پیدا کیا ہے انکے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے چھپائیں۔یعنی انکے لیے حمل اور حیض کو چھپانا ناجائز ہے۔

اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: یہاں ان کو تنبیہ کی جارہی ہے۔کہ وہ خلاف واقع چیز ظاہر نہ کریں اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ ایسے شرعی احکام کو جن پر صرف عورتیں ہی آگاہ ہوتی ہیں۔ان میں ان کا قول معتبر ہوگا۔اس لیے یہاں تنبیہ فرمائی کہ وہ خلاف واقع خبر نہ دیں۔یعنی عدت کے جلد ختم، یا بعض مقاصد کے تحت اسے لمبا کرنے کی کوشش نہ کریں۔بلکہ انہیں حکم ہوا ہے کہ بغیر کسی کمی بیشی کے صحیح حکم کو ظاہر کریں۔

1۔نسائی، کتاب الحیض 1/183

وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ: یعنی اس کا وہ خاوند جس نے اسے طلاق دی ہے، وہ دوران عدت اسے واپس لوٹانے کا زیادہ حقدار ہے جبکہ وہ صلح اور نیک برتاؤ کا خواہاں ہو۔ یہ حکم طلاق رجعی کا ہے۔ یعنی ایک طلاق، دو طلاقیں ہوں۔ لیکن اگر طلاق، بائنہ ہو جائے۔ اس کا حکم الگ ہے۔ آیت کے نزول کے وقت طلاق بائنہ نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص اپنی عورت کو سو طلاقیں بھی دے دیتا تو اسے رجوع کا حق حاصل ہوتا پھر طلاق بائنہ اسلامی احکام کا حصہ بن گئی۔ کیونکہ فقہاء کرام نے اس کے بعد آنے والی آیت کو تین طلاقوں میں محصور کیا ہے۔ اس طلاق کی دو قسم ہو گئیں ایک بائنہ اور دوسری غیر بائنہ۔ اس آیت کریمہ سے بعض اصولیوں کے اس قاعدہ کا ضعف بھی ثابت ہو گیا جس میں فرماتے ہیں عموم پر دلالت کرنے والے لفظ کی طرف اگر ضمیر لوٹائی جائے تو اس کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ پس اس آیت کریمہ کے ساتھ یہ استدلال کرنا صحیح نہیں۔

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی مردوں پر حقوق ہیں۔ اس لیے ان میں ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنے حقوق ادا کرے۔ حضور ﷺ نے اس سلسلہ میں حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا عورتوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ تم نے اللہ کی ضمانت کے ساتھ انہیں حاصل کیا ہے۔ اور اللہ کے کلام کے ساتھ ان کی شرمگاہوں کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ تمہارے لیے ان پر واجب ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو تمہارے گھر میں داخل نہ ہونے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو اتنا مار سکتے ہو کہ نشان نہ پڑے اور ان کے لیے تم پر لازم ہے کہ انہیں کھلاؤ، پلاؤ اور پوشاک مہیا کرو۔ ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ ہم پر ہماری عورتوں کے کیا حقوق ہیں فرمایا جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ۔ جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ اس کے چہرے پر نہ مارو۔ اسے گالی نہ دو۔ جھگڑا ہو جائے تو اسے گھر سے نہ نکالو۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ میں پسند کرتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کے لیے صاف ستھرا رہوں جس طرح کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میری بیوی میرے لیے بن سنور کر رہے۔

وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ: مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ جسمانی اعتبار سے بھی، اور اخلاقی حیثیت سے بھی مرتبہ اور اطاعت حکم کے اعتبار سے بھی۔ ان پر مال و دولت خرچ کرنے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے اعتبار سے اور یہ فضیلت دنیوی واخروی اعتبار سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: 34) ''مرد محافظ اور نگران ہیں عورتوں پر''۔

وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ: اللہ تعالیٰ اپنے حکم کی نافرمانی کرنے والوں کو سزا دینے پر قادر ہے اور اپنے اوامر و نواہی اور احکام شرعیہ میں بڑی حکمت والا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

”طلاق دو بار ہے پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لیے کہ لوتم اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔ یہ حدیں ہیں اللہ کی سو ان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔ (دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ پس اگر وہ (دوسرا) طلاق دے اسے تو کوئی حرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں بشرطیکہ انہیں خیال ہو کہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو اور یہ حدیں ہیں اللہ کی وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں“۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ : زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دو طلاقیں بھی دے دیتا تو عدت میں اسے رجوع کرنے کا حق حاصل ہوتا۔ اس آیت کریمہ نے اس حکم کو ختم کر دیا۔ چونکہ اس میں عورتوں کا نقصان تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے مرد کے اختیار کو تین طلاقوں میں محصور کر دیا۔ پہلی اور دوسری طلاق میں تو وہ رجوع کر سکتا ہے لیکن تیسری طلاق میں اسے رجوع کا حق حاصل نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔ پہلے اگر کوئی شخص اپنی عورت کو طلاق دے دیتا تو اسے رجوع کا حق حاصل ہوتا۔ اگرچہ اس نے تین طلاقیں دی ہوتیں۔ اس آیت کریمہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ ایک شخص نے اپنی عورت سے کہا کہ میں تمہیں نہ بساؤں گا نہ طلاق دونگا۔ اس نے پوچھا کیسے؟ اس نے کہا کہ میں تجھے طلاق دونگا جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوگی تو رجوع کر لوں گا۔ اس عورت نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لوگ سنبھل گئے۔ اور جو پہلے طلاق دے چکے تھے اور جنہوں نے طلاق نہیں دی تھی وہ اس حکم کا لحاظ کرنے لگے۔ اس حدیث کی کئی دوسری اسناد ہیں جن کو ابن مردویہ، ترمذی اور حاکم نے اپنی کتب میں روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں پہلے طلاق کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں تھا آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا۔ ایک دفعہ ایک انصاری اور اس کی بیوی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ اس شخص نے اپنی بیوی سے کہا: قسم بخدا! کہ میں تجھے نہ خود بساؤں گا اور نہ کسی دوسرے کے ساتھ شادی کرنے دوں گا۔ پس وہ اسے طلاق دیتا اور عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر لیتا۔ اس طرح اس نے طلاق کے اس عمل کو کئی بار دھرایا تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کی ایک حد مقرر کر دی۔ یعنی تین طلاقوں کے بعد رجوع کا حق حاصل نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ عورت کسی دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ : ابن جریر فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی عورت کو ایک یا دو طلاقیں دے دیں، اب اسے اختیار ہے چاہے تو اصلاح اور نیکی کی نیت سے رجوع کر لے۔ چاہے تو اسے اپنی حالت پر چھوڑ دے حتیٰ کہ جب اس کی عدت گزر جائے تو وہ عورت اس سے جدا ہو جائے گی۔ لیکن چھوڑنے کی صورت میں بھی اسے چاہیے کہ اس کے ساتھ احسان کرے اور اس کے کسی حق کو غصب نہ کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں جب کسی شخص نے اپنی عورت کو دو طلاقیں دے دیں تو تیسری طلاق دینے میں اسے اللہ سے ڈرنا چاہیے اور دو صورتیں ہیں۔ یا تو اس سے رجوع کرے اور اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ یا احسان کے ساتھ اس کو چھوڑ دے۔ اور اس کے کسی حق کو غصب نہ کرے۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! یہاں دو طلاقوں کا ذکر ہے۔ آپ نے فرمایا ”تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ“ تیسری طلاق ہے۔ یہ روایت صحیح اسناد سے مروی ہے

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا: یعنی ان عورتوں کو اتنا تنگ نہ کرو کہ وہ تمہارا دیا ہوا کل مال یا اس کا بعض حصہ تمہیں واپس کر کے تم سے اپنی جان چھڑانے پر مجبور ہو جائیں۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (النساء:19) ''ترجمہ: اور نہ روکے رکھو انہیں تاکہ لے جاؤ کچھ حصہ (اس مہر وغیرہ کا) جو تم نے دیا ہے انہیں بجز اس صورت کے کہ ارتکاب کریں کھلی بدکاری کا''۔ ہاں عورت اگر اپنی خوشدلی سے کچھ مہر واپس کر دے تو یہ الگ بات ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا (النساء:4) ''ترجمہ: پھر اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوشدلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے''۔ ہاں اگر میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو جائے اور عورت مرد کو ناپسند کرتی ہو اور اس کے حقوق ادا نہ کرتی ہو اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر قدرت نہ رکھتی ہو تو ایسی صورت میں وہ کچھ مال دے کر خاوند سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں اور وہ مال قبول کرنے میں خاوند بھی گنہگار نہیں ہوگا۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا: ہاں اگر عورت بلا وجہ طلاق طلب کرے تو اس صورت میں وہ گنہگار ہوگی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو عورت بغیر کسی وجہ کے اپنے خاوند سے طلاق طلب کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ اس حدیث کی اور بھی مختلف اسناد ہیں۔ جن کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، امام احمد بن حنبل، ابن جریر وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ایسی عورتیں منافق ہیں۔ اس لیے ائمہ خلف وسلف کی ایک بہت بڑی جماعت کا یہ مذہب ہے کہ خلع صرف اس صورت میں جائز ہے جب لڑائی جھگڑا عورت کی طرف سے ہو۔ اس صورت میں مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ فدیہ لے کر عورت کو طلاق دے دے۔ اور انہوں نے اسی آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ خلع کے جواز کی کوئی دلیل نہیں۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس، طاؤس، ابراہیم نخعی، عطاء، حسن بصری اور جمہور علماء کا ہے۔ حتی کہ امام مالک اور اوزاعی فرماتے ہیں۔ اگر جھگڑا مرد کی طرف سے تھا اور اس نے اس سے مال لے کر خلع کیا تو اس پر اس کا مال واپس کرنا واجب ہے۔ اس صورت میں طلاق رجعی ہوگی۔ امام شافعی فرماتے ہیں: جب اختلاف کی صورت میں خلع جائز ہے۔ پھر اتفاق کی صورت میں بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ امام مزنی فرماتے ہیں کہ خلع اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے منسوخ ہے۔ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا (النساء:20) ''ترجمہ: اور دے چکے ہو تم اسے، ڈھیروں مال، نہ لو اس مال میں سے کوئی چیز''۔ لیکن یہ قول ضعیف اور مردود ہے۔ ابن جریر اس آیت کے شان نزول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ثابت بن قیس بن شماس اور ان کی زوجہ جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی بن سلول کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن روایت کرتی ہیں کہ حبیبہ بنت سہل انصاری ثابت بن قیس کی بیوی تھیں۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ صبح صبح اپنے گھر سے نکلے تو انہوں نے حضرت حبیبہ کو اپنے دروازے پر پایا۔ آپ نے پوچھا تم کون ہو؟ عرض کیا میں حبیبہ ہوں۔ فرمایا کیا بات ہے عرض کیا میں اور ثابت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ جب حضرت ثابت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا تمہاری بیوی تمہارے متعلق کچھ کہہ رہی تھی۔ یہ سن کر حبیبہ نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے خاوند نے مجھے جو کچھ دیا تھا وہ میرے پاس ہے، میں اسے واپس کرنے پر تیار ہوں۔ آپ نے فرمایا ثابت لے لو۔ انہوں نے وہ مال لے لیا، اس طرح حضرت حبیبہ اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئیں (1)۔ ابوداؤد کی روایت میں ہے ان دونوں میں لڑائی ہوگئی تو حضرت ثابت نے ان کو مارا۔ اس سے ان کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی۔ صبح انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی۔ آپ نے حضرت ثابتؓ سے فرمایا کہ اس سے یہ مال لے لو اور اسے طلاق دے دو۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ مال لینا

1۔ تفسیر الطبری 462/2

میرے لیے جائز ہے، آپ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے عرض کی میں نے اسے مہر میں دو باغ دیے تھے جو اس کے پاس ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دونوں باغ لے کر اسے طلاق دے دو۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ بخاری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے ان کے اخلاق اور دینداری کے بارے میں کوئی شکایت نہیں۔ لیکن میں اسلام میں کفر (ناشکری) کو ناپسند کرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا کیا تم اس کا مال واپس کر دوگی۔ اس نے عرض کی ہاں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس کے خاوند کو فرمایا یہ باغ لے لو اور اسے طلاق دے دو (1)۔ اس کو نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ نے دوسری اسناد سے بھی اسے روایت کیا ہے۔ مشہور یہی ہے کہ ان کا نام حبیبہ تھا۔ لیکن عبد اللہ عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جمیلہ بنت اُبی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی قسم بخدا میں ثابت بن قیس کی دینداری اور اخلاق کی شکایت نہیں کرتی لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی کیونکہ وہ مجھے ناپسند ہیں۔ تو آپ نے ان کا مال واپس کروا کر حضرت ثابت سے طلاق دلوا دی۔ اس کو ابن مردویہ اور ابن ماجہ نے بھی اسی سند سے روایت کیا ہے۔ اور یہ سند بھی عمدہ ہے۔ کسی نے حضرت عکرمہ سے پوچھا کیا خلع کی بھی کوئی اصل موجود ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس فرمایا کرتے تھے کہ اسلام میں سب سے پہلے خلع جمیلہ بنت ابی کا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! میرا اور ثابت کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔ ایک دن میں نے خیمہ کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو وہ کچھ لوگوں کے ساتھ آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا وہ ان سب میں سب سے زیادہ سیاہ، چھوٹے قد والے اور بدصورت تھے۔ ان کے خاوند نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اسے اپنا بہترین باغ مہر میں دیا تھا اگر یہ واپس کر دے تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ نے جمیلہ سے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے عرض کی۔ ہاں میں یہ باغ واپس کرنے پر تیار ہوں۔ بلکہ اگر وہ کوئی اور چیز لینا چاہتے ہوں تو میں اس پر بھی تیار ہوں۔ ایک روایت میں یہ بھی الفاظ بھی ہیں انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ اگر مجھے اللہ کا خوف نہ ہوتا تو میں ان کے منہ پر تھوک دیتی۔ علمائے کرام کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا خلع میں مرد عورت سے اس سے زیادہ مال لے سکتا ہے جو اس نے دیا ہے۔ جمہور علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے اور ان کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب کے پاس ایک عورت آئی اس کا اپنے خاوند سے جھگڑا ہوا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کو انتہائی گندے اور کوڑا کرکٹ والے کمرے میں بند کر دیا جائے۔ صبح اٹھے اور اسے بلایا اور اس سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے۔ اس نے عرض کی جب سے میری شادی اس شخص کے ساتھ ہوئی ہے آج وہ پہلی رات ہے جو میں نے سکون کے ساتھ گزاری۔ یہ سن آپ نے اس کے خاوند کو حکم فرمایا کہ اس سے خلع کر لو خواہ ایک بالی کے بدلے میں ہو۔ عبد الرزاق کی روایت میں ہے کہ آپ نے اسے تین دن تک قید کیا۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں اگر یہ اپنے بالوں کی چٹیا دے تو لے کر اسے آزاد کر دو۔ حضرت عثمانؓ نے بالوں کی چٹیوں سے کم سے بھی اسے جائز قرار دیا ہے۔ حضرت ربیع بنت معوذ فرماتی ہیں میرے خاوند جب گھر موجود ہوتے تو بہت کم خرچہ دیتے جب کہیں باہر چلے جاتے تو بالکل ہی محروم کر دیتے۔ ایک دن اس جھگڑے کے دوران میں نے انہیں کہا کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ لے لو اور خلع کر لو۔ انہوں نے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ اس پر ہمارے درمیان خلع ہو گیا۔ لیکن میرے چچا معاذ بن عفراء یہ مقدمہ حضرت عثمانؓ کے پاس لے گئے۔ آپ نے اس خلع کو جائز قرار دے دیا اور حکم دیا کہ وہ میرے بالوں کی چٹیا یا اس سے بھی کم کوئی چیز لے لے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے پاس جو تھوڑا بہت مال ہے وہ لے لے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس، مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، قبیصہ بن زویب، حسن بن صالح اور عثمان لیثی سے یہی منقول ہے۔ امام مالک، لیث شافعی اور ابوثور کا بھی یہی مذہب ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی کو

1۔ فتح الباری، کتاب الطلاق: 395/9

اختیار کیا ہے۔ احناف فرماتے ہیں اگر لڑائی جھگڑا عورت کی طرف سے ہو تو مرد کے لیے جائز ہے کہ جو کچھ اس نے دیا ہے وہ واپس لے لے، اس سے زیادہ لینا جائز نہیں ہے اور اگر کوئی چیز لے لی تو قضاءً جائز ہے۔ امام احمد بن حنبل، ابو عبید، اسحاق بن راھویہ فرماتے ہیں خاوند کے لیے جو کچھ اس نے دیا ہے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ یہی قول سعید بن مسیّب، عطاء، عمرو بن شعیب، زہری، طاؤس، حسن بصری اور شعبی وغیرہم کا ہے۔ حضرت معمر روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی فرمایا کرتے تھے کہ خاوند اپنی عورت سے اس سے زیادہ نہ لے جو اس نے اسے دیا ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں اگر کوئی خاوند اپنے دیئے ہوئے مال سے زیادہ لیتا تو قاضی اسے جائز قرار نہیں دیتا تھا۔ ان کی دلیل حضرت ثابت والی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو حکم فرمایا تھا کہ اپنا باغ واپس لے لو اس سے زیادہ نہ لینا۔ حضرت عطاء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس کو ناپسند فرماتے تھے کہ خاوند اپنی بیوی سے دیے ہوئے مال سے زیادہ لے۔ انہوں نے اس آیت فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ کا معنی یہ کیا ہے کہ جو کچھ اس نے پہلے ادا کیا تھا اسے واپس لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم اتر چکا ہے۔ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا...... (بقرہ:229) اور ایک قرات میں اس کو اس طرح بھی پڑھا گیا ہے۔ فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ مِنْهُ اسی لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

فصل: امام شافعی فرماتے ہیں خلع میں بعض علماء کا اختلاف ہے۔ بعض اسے طلاق شمار نہیں کرتے حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی عورت کو دو طلاقیں دے دے پھر وہ عورت اس سے خلع کرا لے تو اب اگر وہ خاوند چاہے تو اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ ان کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے۔ حضرت سعید بن ابی وقاص سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ہاں نکاح کر سکتا ہے۔ خلع طلاق نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اول و آخر طلاق کا ذکر کیا ہے اور درمیان میں خلع کا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ حضرت عثمان بن عفان، عبداللہ بن عمر سے یہی مروی ہے۔ یہی طاؤس اور عکرمہ سے منقول ہے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راھویہ، ابوثور، داؤد بن علی ظاہری کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قدیم مذہب بھی یہی ہے۔ آیت کے ظاہری الفاظ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ خلع طلاق بائن ہے۔ اگر اس نے ایک سے زائد طلاق کی نیت کی تو یہ نیت معتبر ہے۔ ام بکر اسلمیہ نے اپنے خاوند عبداللہ بن حارث سے خلع کیا وہ دونوں حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا یہ طلاق ہے۔ ہاں اگر تم نے کوئی اور نیت کی ہے تو پھر وہ بھی ہو گی۔ لیکن اس روایت کے ایک راوی جھمان کو مجہول قرار دیا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اس روایت کو ضعیف فرمایا ہے۔ حضرت عمر، حضرت علی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر سے بھی یہی مروی ہے۔ سعید بن مسیّب، حسن بصری، عطاء، قاضی شریح، شعبی، ابراھیم نخعی اور جابر بن زید سے بھی یہی منقول ہے۔ امام مالک، ابوحنیفہ، ثوری، اوزاعی، ابوعثمان بتی اور امام شافعی کا جدید مذہب یہی ہے۔ مگر احناف فرماتے ہیں اگر خاوند نے خلع کے ساتھ ایک یا دو طلاقوں کی نیت کی تو ایک طلاق بائنہ واقع ہو گی اور اگر تین کی نیت کی تو تینوں واقع ہو جائیں گی۔ امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے خلع میں لفظ طلاق نہ بولا جائے اور نہ ہی کوئی گواہ ہوں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

مسئلہ: امام مالک، ابوحنیفہ، شافعی، احمد، اسحاق بن راھویہ کا مسلک ہے کہ خلع کی عدت طلاق کی عدت یعنی تین حیض ہیں۔ حضرت عمر، علی اور عبداللہ بن عمر سے بھی یہی مروی ہے۔ سعید بن مسیّب، سلیمان بن یسار، عروہ، سالم، ابوسلمہ، عمر بن عبدالعزیز، ابن شہاب، حسن بصری، شعبی، ابراہیم نخعی وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہی اکثر صحابہ اور اہل علم کا مسلک ہے۔ وہ فرماتے ہیں چونکہ خلع طلاق کے قائم مقام ہے اس لیے وہ عورت دوسری مطلقات کی طرح عدت گزارے گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ خلع والی عورت

کی عدت صرف ایک حیض ہے۔ یہ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر تین حیض گزارنے کا فتویٰ دیا کرتے تھے۔ جب حضرت عثمان نے ایک حیض عدت کا فتویٰ دیا تو وہ بھی اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عثمان ہم سے بہتر اور زیادہ عالم ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، عکرمہ اور ابان بن عثمان کا بھی یہی مسلک ہے۔ اس کے علاوہ جو علماء خلع کو فسخ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بھی اس کی عدت ایک حیض ہونی چاہئے۔ ان کی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ثابت بن قیس کی زوجہ کو ایک حیض عدت گزارنے کا حکم فرمایا(1)۔ مصنف عبدالرزاق میں یہ حدیث حضرت عکرمہ سے مرسل روایت کی گئی ہے حضرت ربیع بنت معوذ سے بھی مروی ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک حیض گزارنے کا حکم فرمایا(2)۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عثمان نے اس مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کی اقتداء فرمائی۔

مسئلہ: ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کرام کے نزدیک خاوند خلع والی عورت کے ساتھ اس کی رضا کے بغیر رجوع نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس نے مال خرچ کر کے اپنے آپ کو اس سے آزاد کرایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ، مہان حنفی، سعید بن مسیب، اور زہری فرماتے ہیں کہ اگر اس عورت نے خاوند کا دیا ہوا مال واپس لوٹا دیا تو عدت میں اس کی رضا کے بغیر رجوع کرسکتا ہے۔ یہی قول ابوثور کا ہے۔ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اگر خلع میں طلاق کا لفظ نہیں بولا گیا تھا اب ان میں جدائی ہوگئی اس صورت میں رجوع نہیں کرسکتا۔ اور اگر اس میں طلاق کا لفظ استعمال کیا گیا تو عدت میں رجوع کرسکتا ہے۔ یہی قول داؤد ظاہری کا ہے۔ اس بات پر تمام علماء کا اختلاف ہے کہ وہ شخص عدت میں اس کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے۔ ابن عبدالبر سے یہ قول مروی ہے کہ وہ خاوند نکاح نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ دوسرا بھی اس سے نکاح نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ قول شاذ اور مردود ہے۔

مسئلہ: کیا خلع کرنے والا عدت میں اپنی بیوی کو دوسری طلاق دے سکتا ہے اس میں علماء کے تین قول ہیں۔ 1۔ وہ طلاق نہیں دے سکتا۔ کیونکہ خلع کے بعد عورت اپنے نفس کی مالک ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس، اور عبداللہ بن زبیر سے مروی ہے۔ عکرمہ، جابر بن زید، حسن بصری، شعبی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابوثور سے بھی یہی مروی ہے۔ 2۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر خلع کے بعد بغیر کسی وقفہ کے طلاق دی تو واقع نہیں ہوگی۔ یہ حضرت عثمان سے مروی ہے۔ 3۔ دوران عدت ہر حال میں طلاق دے سکتا ہے یہ امام ابو حنیفہ آپ کے اصحاب، ثوری، اور اوزاعی کا مذہب ہے۔ سعید بن مسیب، قاضی شریح، طاؤس، ابراہیم نخعی، زہری، حاکم اور حماد بن ابی سلیمان سے بھی یہی منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابودرداء سے بھی یہی مروی ہے۔ لیکن ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ قول ان سے ثابت نہیں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا: یعنی یہ احکام جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں۔ یہ اس کی حدود ہیں اس سے تجاوز نہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ کچھ فرائض لازم کیے انہیں ضائع نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان سے اجتناب کرو۔ اور تم پر رحمت اور مہربانی فرما کر کچھ چیزوں سے خاموشی اختیار فرمائی ہے۔ ان کے متعلق سوال نہ کرو۔ جن علماء نے ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقوں کو حرام قرار دیا ہے انہوں نے اسی آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ مالکیہ اور بعض دوسرے علماء کا مذہب ہے۔ ان کے نزدیک سنت ہے کہ ایک طلاق دی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ'' فرمایا اور اس کے بعد ارشاد فرمایا یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اس کی تائید محمود بن لبید کی روایت کردہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنی

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب الطلاق: 159,157/5 2۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب الطلاق: 160/5

بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی۔ جب اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ غصہ کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب سے کھیلتا ہے۔ صحابہ کرام میں سے ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو قتل کر دوں (1)۔ مگر اس کی سند میں انقطاع ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ: اگر کسی شخص نے اپنی عورت کو دو طلاقیں دینے کے بعد تیسری طلاق بھی دے دی تو یہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح صحیح کرے۔ اور اس کے بعد دوسرا مرد اس سے مباشرت کرے۔ اگر کسی نے بغیر نکاح کے مباشرت کی تو وہ عورت پہلے کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ اس کا خاوند نہیں ہے۔ اس طرح اگر کسی نے نکاح تو کیا لیکن مباشرت نہ کی تو تب بھی پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ اکثر فقہاء کرام میں یہ قول مشہور ہے کہ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ صرف نکاح کرنے سے ہی مقصود حاصل ہو جائے گا۔ یعنی پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے گی۔ اگرچہ دوسرا خاوند اس کے ساتھ مباشرت نہ بھی کرے۔ لیکن یہ قول ثابت نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے۔ پھر دخول سے پہلے ہی طلاق بتہ (بائنہ) دے دیتا ہے۔ پھر دوسرا شخص اس سے نکاح کرتا ہے اور دخول سے پہلے اسے طلاق دے دیتا ہے کیا یہ عورت پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے؟ فرمایا نہیں۔ یہاں تک کہ عورت دوسرے مرد سے لطف اندوز ہو جائے اور وہ اس سے لطف اٹھا لے۔ اس حدیث کو سعید بن مسیّب نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ اس کی دوسری اسناد بھی ہیں جن کو نسائی اور ابن جریر وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب نے اس حدیث کو حضرت عبد اللہ بن عمر سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود اس حدیث کو روایت کریں اور پھر اس کے مخالف رائے دیں۔ واللہ اعلم۔ عبد اللہ بن عمر کی اس حدیث کو امام احمد بن حنبل، نسائی اور ابن جریر نے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو حضرت انس بن مالک نے بھی بیان کیا ہے۔ اس کو احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے ایک راوی محمد بن دینار صندل بصری کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، بعض نے ثقہ۔ ابن جریر نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے ایک حدیث حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔ جس کو بخاری، مسلم اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً روایت کرتی ہیں کہ رفاعہ قرظی نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا اور پھر اسے طلاق بائنہ دے دی۔ وہ عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھے رفاعہ نے طلاق بائنہ دے دی ہے اور میں نے عبد الرحمٰن بن زبیر سے نکاح کر لیا ہے۔ لیکن وہ شادی کے قابل نہیں۔ تو کیا اب میں پہلے خاوند کے پاس جا سکتی ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں حتیٰ کہ تو اس کا مزہ چکھ لے اور وہ تیرا چکھ لے (2)۔ ایک روایت میں فرماتی ہیں کہ میں اور میرے والد ابو بکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے جب اس عورت نے مسئلہ پیش کیا۔ خالد بن سعید اس وقت دروازے پر اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ لیکن آپ کو اجازت نہ ملی۔ مسلم میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ رفاعہ نے تین طلاقیں دیں۔ اس حدیث کو عبد الرزاق، نسائی اور ابو داؤد نے مختلف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مؤطا امام مالک میں بھی مروی ہے۔ لیکن اس کی سند میں انقطاع ہے۔

فصل: دوسرا آدمی اس ارادہ سے عورت سے شادی کرے کہ وہ اپنا گھر بسانا چاہتا ہو جیسا کہ عام نکاح سے مقصود ہوتا ہے۔ امام مالک نے یہ بھی شرط لگائی گئی ہے کہ وہ مباح اور جائز طریقہ سے مباشرت کرے۔ اگر اس نے اس حال میں مباشرت کی کہ عورت حج کا

1۔ النسائی، کتاب الطلاق: 142/6 2۔ فتح الباری، کتاب الطلاق: 464/9

احرام باندھے ہوئے تھی یا روزہ دار تھی یا حالت اعتکاف میں تھی۔ یا حائضہ، نفاس والی تھی۔ یا وہ خود روزہ دار تھا، یا محرم تھا، معتکف تھا۔ ان صورتوں میں وہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں۔ اسی طرح دوسرا خاوند ذمی تھا، وہ اس کے ساتھ نکاح سے پہلے مسلمان مرد کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کے نزدیک کافر کا نکاح باطل ہے، حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ دوسرے خاوند کا انزال بھی شرط ہے۔ شاید انہوں نے حضور ﷺ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہو (حَتّٰی تَذُوْقَ عَسِيْلَتَهٗ وَيَذُوْقَ عَسِيْلَتَكِ) لیکن یہاں "عسیلہ" سے مراد منی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جماع ہے جیسا کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ اگر دوسرے خاوند کا مقصد صرف پہلے کے لیے حلال کرنا ہو تو وہ حدیث کی رو سے ملعون اور مذموم ہوگا۔

حلالہ کے بارے میں وارد شدہ احادیث: حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جسم پر نقش کندہ کرنے والی اور کروانے والی، مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی، عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جارہا ہے، سود کھانے اور کھلانے والے پر لعنت فرمائی ہے (1)۔ اسے امام ترمذی اور نسائی نے دوسری اسناد سے بھی روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حسن اور صحیح ہے۔ اور اہل علم صحابہ کرام جیسے حضرت عمر، عثمان اور ابن عمر وغیرہم کا اسی پر عمل ہے۔ تابعین فقہاء کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت علی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ مسند کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ حلال کرنے والے اور جس کے لیے کیا ہے اس پر خدا کی لعنت ہو۔ مسند امام احمد اور نسائی کی حرمت میں یہ الفاظ ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سود کھانے والے، کھلانے والے، اس پر گواہ بننے والے، لکھنے والے، جبکہ ان کو معلوم ہو، مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی سب قیامت کے دن ملعون ہوں گے۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے اور اس میں زیادتی کرنے والے اور مدینہ ہجرت کرنے کے بعد پھر واپس لوٹنے والے، حلالہ کرنے والے اور کروانے والے سب قیامت کے دن ملعون ہوں گے۔ حضرت علی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے، سود کے گواہوں اور لکھنے والوں، حسن کے لیے بدن پر نقش بدھوانے والی اور بدھانے والی، زکوٰۃ روکنے والوں اور حلالہ کرنے اور کروانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ آپ نوحہ خوانی سے منع فرماتے تھے (2)۔ اس کو ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور امام احمد نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت علی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے کروانے والے اور جس کے لیے کیا ہے اس پر لعنت فرمائی ہے۔ لیکن اس کی سند صحیح نہیں کیونکہ اس کے ایک مجالد کو کئی علماء نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں عاریۃً لیے ہوئے سانڈ کے متعلق نہ بتاؤں۔ صحابہ نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا وہ حلالہ کرنے والا ہے۔ پھر فرمایا، حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے کیا جارہا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کو صرف ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی حدیث مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے حلالہ کرنے والے کے نکاح کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا نکاح تو رغبت اور خواہش سے ہوتا ہے نہ کہ دھوکہ فریب سے۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاق اڑانے کے لیے۔ حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے، اور جس کے لیے کرایا جارہا ہے اس پر لعنت فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیتا ہے، پھر اس کا بھائی اس کے حکم کے بغیر ہی اس کے ساتھ نکاح کر لیتا ہے حتیٰ کہ وہ اسے اپنے بھائی کے لیے حلال کر دے۔ کیا اس طرح وہ پہلے کے لیے حلال ہو جائے گی تو آپ نے فرمایا نکاح تو گھر بسانے کی نیت

1۔ مسند امام احمد: 448/1 2۔ مسند امام احمد: 107/1

سے کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم اسے گناہ سمجھتے تھے(1)۔ حضرت عثمان بن عفان کے پاس ایک شخص کو پیش کیا گیا جس نے ایک عورت کے ساتھ نکاح اس لیے کیا کہ وہ اسے اس کے پہلے شوہر کے لیے حلال کر دے آپ نے ان کے درمیان تفریق کر دی۔ اسی طرح حضرت علی، ابن عباس اور کئی دوسرے صحابہ کرام سے مروی ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا: یعنی جب دوسرا خاوند مباشرت کے بعد طلاق دے دے تو اب اس عورت کو اپنے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن انہیں یہ خیال رہے کہ وہ اللہ کی حدود کو صحیح طریقہ سے قائم کر سکیں گے یعنی آپس میں پیار محبت کے ساتھ گزارہ کرتے رہیں گے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب انہیں گمان ہو کہ ان کا نکاح کسی دھوکہ فریب پر مبنی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

تِلْكَ حُدُودُ اللهِ: یہ شرعی احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جن کو وہ ان لوگوں کے سامنے بیان فرماتا ہے جو علم رکھتے ہوں۔ اگر کسی شخص نے اپنی عورت کو ایک یا دو طلاقیں دیں پھر اس کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ عدت گزر گئی اس کے بعد اس نے کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اس نے اس کے ساتھ مباشرت کی اور پھر طلاق دے دی۔ پھر عدت گزرنے کے بعد اس نے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کیا تو کیا اب پہلے خاوند کو تین طلاقیں دینے کا حق ہے یا نہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل اور بعض صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ پہلے خاوند کو تین طلاقیں دینے کا حق نہیں ہوگا بلکہ باقی ماندہ ایک یا دو طلاقیں دے سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے تلامذہ کا مذہب یہ ہے کہ پہلے خاوند کو اب نئے سرے سے تین طلاقیں دینے کا حق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دوسرا خاوند جب تین طلاقوں کو ختم کر دیتا ہے تو وہ تین سے کم طلاقوں کو بدرجہ اولیٰ ختم کر دیتا ہے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

''اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو اور وہ پوری کر لیں اپنی عدت پس یا تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو اور جو کوئی کرے گا اس طرح تو وہ ظلم کرے گا اپنی ہی جان پر اور نہ بنالو اللہ کی آیتوں کو مذاق اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور (یاد کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم فرمایا ہے کہ جب ان میں سے کوئی اپنی بیوی کو ایسی طلاق دے دے جس میں رجوع کر سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے بھلائی کے ساتھ رجوع کر لے۔ یعنی اپنے رجوع پر گواہ بنالے اور اپنی بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی نیت کرے۔ اور اگر وہ رجوع نہیں کرنا چاہتا تو پھر اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دے حتیٰ کہ جب عدت گزر جائے

1۔ المستدرک، کتاب الطلاق: 199/2

تو پھر بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے اسے اپنے گھر سے فارغ کردے۔

وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا: حضرت عبد اللہ بن عباس، مجاہد، مسروق، حسن بصری، قتادہ اور کئی دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ پہلے یہ دستور تھا کہ جب کوئی آدمی اپنی عورت کو طلاق دیتا اور اس کی عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تو اسے تکلیف دینے کی نیت سے رجوع کر لیتا تاکہ وہ کسی دوسرے سے نکاح نہ کرسکے۔ پھر اسے طلاق دے دیتا۔ اس طرح جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تو پھر رجوع کر لیتا۔ اس طرح اس عورت کی عدت طویل ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس عمل سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا جو کوئی ایسا کرے گا یعنی اللہ کے حکم کی مخالفت کرے گا تو وہ اپنی جان پر ظلم کرے گا۔

وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اشعری قبیلہ والوں سے ناراض ہو گئے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! آپ ہم لوگوں پر کس وجہ سے ناراض ہیں۔ فرمایا تم میں سے جب کوئی مرد اپنی عورت کو طلاق دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے میں نے طلاق دی، میں نے رجوع کر لیا۔ یہ مسلمانوں کی طلاق نہیں، عورت کو اس کی عدت کے مطابق طلاق دیا کرو۔ مسروق فرماتے ہیں اس سے مراد وہ شخص ہے جو بغیر کسی وجہ کے اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور بیوی کو تنگ کرنے کے لیے رجوع کر لیتا ہے تاکہ اس کی عدت لمبی ہو جائے۔ حسن بصری، قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے، یا اپنے غلام کو آزاد کرتا ہے یا نکاح کرتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے کہ میں مذاق کر رہا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو زجر و توبیخ کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اپنی عورت کو طلاق دی، یا غلام آزاد کیا، نکاح کیا، نکاح کرایا خواہ وہ سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ اس پر یہ افعال لازم ہو جائیں گے۔ حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں ایک شخص دوسرے آدمی کو کہتا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے کیا۔ پھر کہتا ہے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یا کہتا ہے کہ میں نے غلام آزاد کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جو سنجیدگی یا مزاح کی حالت میں صادر ہوں تو انہیں سنجیدہ ہی شمار کیا جاتا ہے۔ 1: طلاق، 2: عتاق، (غلام، لونڈی کو آزاد کرنا)، 3: نکاح۔(1)

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت و راہنمائی اور واضح دلائل کے ساتھ اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا، اس کی اس نعمت کو یاد رکھو۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر جو کتاب اور حکمت یعنی سنت نازل فرمائی اسے بھی یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی وصیت فرماتا ہے۔ یعنی بعض امور کو سرانجام دینے اور بعض کو ترک کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ اور اس کی حرام کردہ چیزوں کے مرتکب افراد کو اپنے عذاب کی وعید فرماتا ہے۔ اپنے ان افعال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔ اور یہ خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ہمارے ظاہری اور باطنی امور اس سے مخفی نہیں۔ وہ ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ دے گا۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ ذٰلِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمۡ اَزۡكٰى لَكُمۡ وَاَطۡهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۲﴾

1۔ سنن ابن ماجہ: 2039

''اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے جب کہ رضامند ہو جائیں آپس میں مناسب طریقہ سے۔ یہ فرمان الٰہی (ہے) نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت پر یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لیے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ: حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کے شان نزول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنی عورت کو ایک یا دو طلاقیں دے دیتا پھر عدت گزرنے کے بعد وہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تو عورت کے اہل خانہ اسے نکاح کرنے سے روک دیتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فعل سے منع فرمایا۔ حضرت مسروق، ابراہیم نخعی، زہری اور ضحاک سے بھی یہی منقول ہے۔ اس آیت کریمہ میں اس امر کی بھی دلیل ہے کہ عورت بذات خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی بلکہ نکاح کے لیے کسی ولی کا ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ ابن جریر، ترمذی کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی عورت کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ ہی کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔ جو عورت خود اپنا نکاح کرے وہ زانیہ ہے۔ اور ایک دوسری موقوف روایت میں ارشاد ہے کہ ولی مرشد اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ہم نے اس کا کتاب الاحکام میں ذکر کیا ہے۔ حضرت معقل بن یسار فرماتے ہیں کہ میری بہن کے خاوند نے اسے طلاق دے دی جب عدت گزر گئی تو پھر دوبارہ نکاح کا پیغام بھیجا۔ میں نے اس نکاح سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن مردویہ نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ جب طلاق دینے کے بعد پھر دوبارہ نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت معقل نے اس سے کہا کہ میں نے تجھے اپنی بہن کا رشتہ دے کر تیری تکریم کی پھر تو نے اسے طلاق دے دی۔ قسم بخدا اب میں کبھی اس کا تمہارے ساتھ نکاح نہیں کروں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ سینوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے بھی آگاہ ہے۔ وہ ان دونوں میاں بیوی کی ایک دوسرے کے ساتھ محبت کو جانتا تھا۔ اس نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت معقل نے یہ آیت کریمہ سنی تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا اور اسے بلا کر اپنی بہن کا اس کے ساتھ نکاح کر دیا۔ ایک روایت میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ یہ جمیلہ بنت یسار تھیں۔ جن کا نکاح ابو بداح سے ہوا تھا۔ ابو اسحاق فرماتے تھے کہ ان کا نام فاطمہ بنت یسار تھا۔ سدی فرماتے ہیں کہ یہ آیت جابر بن عبداللہ اور ان کی ایک چچازاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ لیکن پہلا قول ہی صحیح ہے۔

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ: یہ وعظ و نصیحت ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت میں اس کے عذاب و سزا، سے ڈرتے ہیں۔

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ: یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کر کے اور اپنی جھوٹی انا ترک کر کے ان عورتوں کو ان کے خاوندوں کی طرف لوٹا دینا تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ اور تمہارے دلوں کی پاکیزگی کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے کس فعل کو سرانجام دینے اور کس کو ترک کرنے میں تمہاری بھلائی ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

''اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دوسال (یہ مدت) اس کے لیے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی مدت۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر دونوں ارادہ کرلیں دودھ چھڑانے کا اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں دونوں پر اور اگر تم چاہو تو دودھ پلاؤ (دایہ سے) اپنی اولاد کو، پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور (خوب) جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کررہے ہو اسے دیکھنے والا ہے''۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ماؤں کو حکم فرمایا ہے کہ وہ مکمل مدت تک اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔ دودھ پلانے کی مکمل مدت دوسال ہے۔ اور اس کے بعد رضاعت (دودھ پلانا) کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے ارشاد فرمایا جو رضاعت کی مدت مکمل کرنا چاہتی ہے وہ دوسال دودھ پلائے۔ اکثر ائمہ کرام کا بھی یہی مذہب ہے کہ اگر کسی بچے نے دوسال کے بعد دودھ پیا تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ حضرت ام سلمہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صرف اس رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے جو دودھ پلانے کی مدت میں انتڑیوں کو پر کردے (1)۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ اور اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ اس حدیث میں ''فی الثدی'' کے الفاظ کا معنی دوسال سے پہلے پہلے کا وقت رضاعت ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرا بیٹا (ابراہیم) شیر خوارگی کی عمر میں ہی انتقال کر گیا۔ اب جنت میں اس کے لیے دودھ پلانے والی مقرر ہے۔ جب آپ کے صاحبزادہ کا وصال ہوا تو ان کی عمر ایک سال دس ماہ تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صرف وہی رضاعت حرمت کا باعث بنتی ہے جو دوسال کے اندر ہو۔ اسے دارقطنی اور امام مالک نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، دودھ چھڑانے کے بعد رضاعت نہیں اور بلوغت کے بعد یتیمی نہیں۔ اس کی مزید وضاحت اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے ہوتی ہے: وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ (لقمان:14) اس کا دودھ چھوٹنے میں دوسال لگے'' (اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کر میرا اور اپنے ماں باپ کا)۔ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف:15) ''ترجمہ: اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے تک تیس مہینے لگ گئے''۔ حضرت علی، عبداللہ بن عباس، ابن مسعود، جابر، ابوہریرہ، ابن عمر اور ام سلمہ سے مروی ہے کہ دوسال کے بعد رضاعت سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ سعید بن مسیب، عطاء اور مشہور علماء سے یہی مشہور ہے۔ امام شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راھویہ، ثوری، ابو یوسف، محمد اور ایک روایت میں امام مالک کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ رضاعت کی مدت دوسال اور دو ماہ ہیں۔ اور ایک روایت میں دوسال اور تین ماہ بھی منقول ہے۔ امام ابوحنیفہ

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب الرضاع:5/96،97

فرماتے ہیں کہ دو سال اور چھ ماہ ہے۔ امام زفر بن ہذیل فرماتے ہیں کہ جب تک وہ دودھ نہیں چھوڑتا۔ زیادہ سے زیادہ تین سال تک ہے۔ امام اوزاعی سے بھی یہی مروی ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر بچہ دو سال سے پہلے دودھ چھوڑ دے تو پھر کوئی عورت اسے اپنا دودھ پلائے تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ دودھ اس کی خوراک کے قائم مقام ہوگیا۔ امام اوزاعی سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عمر اور حضرت علی فرماتے ہیں کہ دودھ چھڑانے کے بعد رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔ اس ارشاد کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ یا تو اس سے مراد دو سال کے بعد چھڑانا ہے۔ جیسا کہ جمہور علماء فرماتے ہیں خواہ اس سے پہلے دودھ چھڑایا گیا ہو یا نہ۔ یا اس سے مطلق دودھ چھڑانا مراد ہے جیسا کہ امام مالک کا قول ہے۔ حضرت عائشہ کا خیال تھا کہ اگر کسی بڑے آدمی کو دودھ پلا دیا جائے تو یہ بھی حرمت میں مؤثر ہے۔ یہی عطاء بن ابی رباح اور لیث بن سعد کا قول ہے۔ حضرت عائشہ کسی شخص کا کہیں آنا جانا ضروری سمجھتیں تو وہاں حکم دیتیں کہ وہ عورتیں اسے اپنا دودھ پلا دیں۔ ان کی دلیل حضرت سالم کی روایت ہے جو کہ حضرت ابو حذیفہ کے غلام تھے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو حذیفہ کو حکم دیا تھا کہ وہ سالم کو دودھ پلوا دیں۔ حالانکہ وہ اس وقت بڑی عمر کے تھے۔ اس رضاعت کی وجہ سے وہ ان کے گھر میں آتے جاتے تھے۔ لیکن دوسری تمام ازواج مطہرات اس کو ناپسند فرماتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت سالم کو اجازت نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا غور سے دیکھ لیا کرو تمہارے بھائی کون ہیں۔ رضاعت تو اس وقت ثابت ہوتی ہے جب دودھ بھوک مٹائے۔ رضاعت کے متعلق بحث ان شاء اللہ آیت کریمہ (اُمَّھٰتُکُمُ اللّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ) کی تفسیر کے تحت آئے گی۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ: یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ بچوں کی والدہ کا نان ونفقہ اس کے والد پر لازم ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے علاقے کے رسم و رواج اور اپنی استطاعت کے مطابق نان ونفقہ دے۔ اس میں اسراف کرے اور نہ بخل سے کام لے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ (طلاق: 7) ''ترجمہ: خرچ کرے وسعت کے مطابق، اور وہ تنگ کر دیا گیا ہے جس پر اس کا رزق خرچ کرے اس سے جو اللہ نے اسے دیا ہے اور تکلیف نہیں دیتا اللہ کسی کو مگر اس قدر، جتنا اسے دیا ہے۔ عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد فراخی وے دے گا''۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اس کا چھوٹا بچہ ہو اور وہ اس کو دودھ پلائے، تو اس شخص پر اس کا نان ونفقہ واجب ہے۔

لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا: یعنی ماں بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر کے اس کے والد کو نقصان نہ پہنچائے۔ کیونکہ والد کو اس کی دیکھ بھال میں اپنا کام کاج چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے جب تک بچہ دودھ کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا اسے دودھ پلانا چاہیے۔ اس کے بعد جب چاہے واپس کر سکتی ہے۔ اسی طرح والد کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ بچے کی والدہ کو تکلیف پہنچانے کے لیے بچہ اس سے چھین لے، یہ مجاہد، قتادہ، ضحاک وغیرہم کا قول ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ: وارث کو چاہئے کہ وہ بچے کی والدہ کو تنگ نہ کرے۔ یہ مجاہد اور ضحاک کا قول ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح بچے کے والد کے اوپر اس کی والدہ کا نان ونفقہ واجب تھا اسی طرح وارث پر بھی نان ونفقہ اور والدہ کے حقوق کی نگہداشت واجب ہے۔ بعض حنفی اور حنبلی علماء نے اسی آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ قریبی رشتہ داروں پر ایک دوسرے کا نفقہ واجب ہوتا ہے۔ یہ حضرت عمر اور جمہور سلف صالحین سے مروی ہے۔ اس کی تائید اس مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے کسی قریبی رشتہ دار کا مالک ہو جائے وہ اس پر آزاد ہو جاتا ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ دو سال کے

بعد بچے کو دودھ پلانا بچے کو نقصان دیتا ہے اور یہ نقصان جسمانی بھی ہو سکتا ہے اور عقلی بھی۔ حضرت علقمہ نے ایک عورت کو دو سال کے بعد دودھ پلاتے ہوئے دیکھا تو اسے دودھ پلانے سے منع کر دیا۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ: اگر بچے کے والدین دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑانے پر متفق ہو جائیں اور وہ یہ گمان کریں کہ اس میں اس کی مصلحت ہے اور وہ آپس میں مشورہ کر کے پختہ عزم کر لیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے اگر کوئی ایک تنہا یہ فیصلہ کرنا چاہے تو اس کے لیے جائز نہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے مشورہ کیے بغیر زبردستی نہیں کرنی چاہیے۔ اس حکم میں اللہ تعالیٰ نے بچے کے لیے انتہائی احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور اس کے بارے میں خوب غور فکر کرنے کو لازم قرار دیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر رحمت کی نشانی ہے۔ اس میں بچے کی پرورش میں والدین پر بھی کچھ پابندیاں عائد کر دیں اور ان کی ایسے امور کی طرف راہنمائی فرمائی جو والدین، بچے سب کے لیے بہتر ہے۔ جیسا کہ سورۂ طلاق میں فرمایا: فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ...... (الطلاق:6) ''ترجمہ: پھر اگر وہ بچے کو دودھ پلائیں تمہاری خاطر تو تم ان کی اجرت دو۔ اور آپس میں مشورہ کر لیا کرو دستور کے مطابق، اگر آپس میں طے نہ کر سکو تو اسے کوئی دوسری دودھ پلائے''۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ: یعنی جب والدہ اور والد اس بات پر متفق ہو جائیں کہ کسی عذر کی بناء پر اس بچے کو دودھ پلوانے کے لیے اور عورت کو دے دیں تو اس میں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ والدہ نے جو پہلے دودھ پلایا ہے اس کی مکمل اجرت اس کو ادا کر دی جائے۔ پھر کسی عورت کو بچہ دودھ پلانے کے لیے دے دیا جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اپنے تمام احوال میں اس سے ڈرو اور یہ جان لو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارے احوال و افعال میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

''اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں تو وہ بیویاں انتظار کریں چار مہینے اور دس دن اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس) مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب واقف ہے۔''

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ: اللہ تعالیٰ نے یہاں ان عورتوں، جن کے شوہر فوت ہو جائیں، کو حکم دیا ہے کہ چار ماہ دس دن عدت گزاریں۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ اس حکم میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں شامل ہیں اس کی دلیل اس آیت کریمہ کا عموم ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے پوچھا گیا، کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے اور پھر دخول سے پہلے ہی فوت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے اس کے لیے مہر بھی مقرر نہیں کیا تھا۔ آپ نے فرمایا میں اس مسئلہ کا جواب اپنی رائے سے دے رہا ہوں۔ اگر یہ جواب صحیح ہوا تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس سے بری ہیں۔ پھر فرمایا اس عورت کو بغیر کسی کمی و بیشی کے مکمل مہر دیا جائے، عدت بھی گزارے گی اور اسے میراث بھی ملے گی۔ یہ سن کر حضرت

معقل بن یسار کھڑے ہوئے، کہنے لگے رسول اللہ ﷺ نے بروع بنت واثق کے بارے میں یہی فیصلہ فرمایا۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مسعود بہت خوش ہوئے۔ اگر حاملہ کا خاوند فوت ہو جائے تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی عدت وضع حمل ہوگی۔ اگر اس نے خاوند کے فوت ہونے کے چند لمحے بعد بچہ جن دیا تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق:4)'' ترجمہ: اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچہ جننے تک ہے۔'' کے عموم میں داخل ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ وہ عورت وضع حمل اور چار ماہ دس دن میں سے جو لمبی عدت ہوگی، وہ گزارے گی۔ اس طرح دونوں آیتوں کے درمیان تطبیق ہو جائے گی۔ یہ قول بہت عمدہ اور قوی ہے لیکن اس کے خلاف صحیحین کی ایک صریح حدیث موجود ہے۔ حضرت سبیعہ اسلمیہ فرماتی ہیں کہ ان کے خاوند حضرت سعد بن خولہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں۔ وفات کے چند دنوں بعد بچہ پیدا ہوا۔ جب وہ نفاس سے فارغ ہوئیں۔ اچھا لباس پہنا ایک دن ان کے پاس ابو سنابل بن بعکک آئے اور انہیں دیکھ کر کہنے لگے، کیا بات ہے کہ تم نے بڑا اچھا لباس پہنا ہوا ہے کہیں نکاح کا ارادہ تو نہیں۔ پھر کہنے لگے کہ چار ماہ دس دن گزرنے سے پہلے تم نکاح نہیں کر سکتیں۔ فرماتی ہیں کہ میں شام کے وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا وضع حمل کے ساتھ ہی تمہاری عدت ختم ہو چکی ہے۔ اگر نکاح کرنا چاہتی ہو تو نکاح کر لو۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کو جب اس حدیث کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا۔ اس کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے شاگرد اسی حدیث کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح لونڈی بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہوگی کیونکہ اس کی عدت آزاد عورت کے مقابلہ میں نصف ہوتی ہے۔ جمہور علماء کے قول کے مطابق اس کی عدت دو ماہ پانچ دن ہوگی۔ محمد بن سیرین اور بعض اہل ظواہر اس آیت کریمہ کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آزاد اور لونڈی دونوں کی عدت برابر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عدت قدرتی امر ہے اس میں تمام عورتیں برابر ہیں۔ حضرت سعید بن مسیّب اور ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ چار ماہ دس دن عدت مقرر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اگر عورت کو حمل ہو تو اس دوران ظاہر ہو جائے۔ جیسا کہ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ انسان کی پیدائش کے مراحل اس طرح ہوتے ہیں کہ چالیس دن رحم مادر میں نطفہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ پھر چالیس دن تک جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر چالیس دن گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ بھیج دیتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ دس دن احتیاط کے لیے رکھ دیے گئے ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔ پھر روح پھونکنے کے بعد ان دنوں میں بچے کی حرکت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان دس دنوں کے بارے میں سعید بن مسیّب سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا، ان دنوں میں بچے میں روح پھونکی جاتی ہے۔ ابو العالیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت ہے کہ جس لونڈی سے بچہ پیدا ہو جائے اس کی عدت بھی آزاد عورت کی عدت کے برابر ہے اس لیے کہ وہ فراش بن گئی۔ حضرت عمرو بن عاص سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اے لوگو! ہمارے نبی ﷺ کی سنت کو ہم پر خلط ملط نہ کرو۔ ام ولد کا آقا جب فوت ہو جائے تو اس کی مدت چار ماہ دس دن ہے۔ اس حدیث کو امام احمد کے علاوہ ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد اس روایت کو منکر قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کے ایک راوی قبیصہ کا حضرت عمرو سے سماع ثابت نہیں۔ حضرت سعید بن مسیّب، مجاہد، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابن سیرین، ابو ایاز، اور عمر بن عبدالعزیز سے بھی یہی منقول ہے۔ یزید بن عبدالملک بھی یہی حکم دیا کرتے تھے۔ امام اوزاعی، اسحاق بن راھویہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مذہب ہے۔ طاؤس اور قتادہ فرماتے ہیں کہ ام ولد کی عدت دو ماہ اور پانچ دن ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور آپ کے شاگرد، ثوری، حسن بن صالح

فرماتے ہیں کہ وہ تین حیض عدت گزارے۔ یہی قول حضرت علی اور ابن مسعود سے مروی ہے۔ عطاء اور ابراہیم نخعی سے بھی یہی منقول ہے۔ امام مالک اور شافعی اور مشہور قول کے مطابق امام احمد فرماتے ہیں کہ اس کی عدت ایک حیض ہے۔ یہ عبداللہ بن عمر سے بھی مروی ہے۔ شعبی، مکحول، لیث، ابوعبید، ابوثور اور جمہور علماء سے یہی منقول ہے۔ حضرت لیث فرماتے ہیں کہ اگر ام ولد کا آقا اس حالت میں مرا کہ وہ حیض میں تھی تو یہی حیض کافی ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں اگر اسے حیض نہ آتا تو اس کی عدت تین ماہ ہے۔ امام شافعی اور جمہور فرماتے ہیں ایک ماہ تین دن زیادہ پسندیدہ ہے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ: اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت پر عدت میں سوگ واجب ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ ام المومنین زینب بنت جحش روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگوار رہے سوائے اپنے خاوند کے۔ اس کے لیے چار ماہ دس دن تک سوگ کرے(1)۔ حضرت ام سلمہ روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ!) میری بیٹی کا خاوند فوت ہوگیا ہے اس کی آنکھ میں تکلیف ہے کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے دو یا تین مرتبہ سوال دہرایا۔ آپ نے یہی جواب دیا اور فرمایا یہ صرف چار ماہ اور دس دن تو ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں تو تم سال بھر بیٹھی رہا کرتی تھی۔ حضرت زینب بنت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تو اس کو جھونپڑے میں داخل کر دیا جاتا وہ بدترین کپڑے پہنتی، خوشبو استعمال نہ کرتی حتیٰ کہ جب ایک سال مکمل گزر جاتا تو وہاں سے نکلتی اس کو اونٹ کی مینگنی دی جاتی یہ اس کو لے کر پھینکتی۔ پھر کسی جانور مثلاً گدھے، بکری، پرندے کے ساتھ اپنے جسم کو رگڑتی بعض اوقات تو اس کی موت ہی واقع ہو جاتی۔ اس لیے اکثر علماء کا مذہب ہے کہ یہ آیت اپنی بعد میں آنے والی آیت وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ...... (بقرہ:240) ''ترجمہ: اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں ان میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہیے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لیے کہ انہیں خرچ دیا جائے گا ایک سال تک (اور) نہ نکالا جائے انہیں گھر سے''۔ کے لئے ناسخ ہے۔ یہی حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ لیکن یہ محل نظر ہے جس کی وضاحت عنقریب آئے گی۔ سوگ سے مراد بھڑکیلے کپڑے، زیورات اور خوشبو وغیرہ کو ترک کرنا ہے۔ اور بغیر کسی اختلاف کے سب کے نزدیک واجب ہے۔ طلاق رجعی کی عدت میں واجب نہیں۔ طلاق بائن کی عدت میں سوگ کے دو قول ہیں۔ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان سب پر سوگ واجب ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، آزاد ہو یا لونڈی۔ مسلمان ہو یا کافر۔ امام ثوری اور ابوحنیفہ فرماتے ہیں کافر عورت پر واجب نہیں۔ امام مالک کے شاگردوں میں سے اشعب اور ابن نافع کا بھی یہی قول ہے ان کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جو عورت اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگوار رہے سوائے اپنے خاوند پر۔ اس پر چار ماہ دس دن سوگ منا سکتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم تعبدی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ نابالغہ عورت سوگ نہیں منائے گی کیونکہ وہ غیر مکلفہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب نے مسلمان لونڈی کا بھی یہی حکم بیان کیا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ جب ان کی عدت پوری ہو جائے ان کے اولیاء پر کوئی حرج نہیں اگر وہ بناؤ سنگھار کریں، نکاح کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں لیکن شرط یہ ہے کہ سب کچھ مناسب طریقے سے ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں نکاح حلال اور طیب ہے یعنی اس کے لیے نکاح کرنا جائز ہے۔ یہ حسن بصری اور زہری سے بھی مروی ہے۔

1۔ مسلم، کتاب الطلاق: 1124، 1125

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

''اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بھی مگر یہ کہ کہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات اور نہ پکی کرلو نکاح کی گرہ یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہا کو اور جان لو یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے''

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ: ان عورتوں کو دوران عدت اشارۃً وکنایۃً نکاح کا پیغام دیا جاسکتا ہے۔لیکن اس میں صراحت نہیں کرنی چاہیے۔مثلاً کہے، میں ایسی عورت کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہوں جس میں یہ یہ خصوصیات ہوں پھر اس عورت کا اشارۃً ذکر کردے۔یا یہ کہے، میں تیرے بغیر کسی عورت سے نکاح کا ارادہ نہیں رکھتا۔میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی نیک عورت مل جائے۔یہ قول مجاہد، طاؤس، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعیؒ وغیرہ کا ہے۔طلاق بائن کی مطلقہ کا بھی یہی حکم ہے۔جیسا کہ حضور ﷺ نے فاطمہ بنت قیس کو ابن ام مکتوم کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا۔جب ان کے خاوند ابوعمر بن حفص نے تیسری آخری طلاق دی اور فرمایا جب تمہاری عدت پوری ہو تو مجھے بتانا۔جب اس کی عدت پوری ہوگئی آپ نے اس کے لئے اسامہ بن زید کا پیغام بھیجا، اور پھر ان کا نکاح کردیا طلاق رجعی میں خاوند کے سوا کسی کو جائز نہیں کہ وہ اس کو اشارۃً یا کنایۃً منگنی کا پیغام دے۔

أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ: منگنی کے جس پیغام کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو، اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کا ذکر کرو گے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ (القصص:69)'' اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو چھپائے ہوئے ہیں ان کے سینے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں''۔

وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا: ابومجلز، جابر بن زید، حسن بصری، ابراہیم نخعی، قتادہ، ضحاک، لبید بن انس، سلیمان تیمی، مقاتل بن حیان اور سدی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ زنا سے بچو۔حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ نہ کہو کہ میں تمہارا عاشق ہوں، میرے ساتھ وعدہ کرو کہ میرے بغیر کسی سے نکاح نہ کروگی۔قتادہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دوران عدت ہی عورت سے وعدہ لے لے کہ وہ اس کے علاوہ کسی سے نکاح نہیں کرے گی۔اللہ تعالیٰ نے اس کو مذموم قرار دیا ہے۔اور منگنی کے پیغام اور شریعت کے مطابق بات کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔حضرت ابن زید فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوران عدت ہی پوشید طور پر ہی اس سے نکاح کرے اور عدت گزرنے کے بعد اسے ظاہر کرے۔آیت کریمہ ان تمام اقوال کا احتمال رکھتی ہے۔

إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا: حضرت عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، سعید بن جبیر، سدی، ثوری اور ابن زید فرماتے ہیں کہ قَوْلًا مَعْرُوفًا سے یہی مراد ہے کہ وہ اشارۃً کنایۃً نکاح کا پیغام دے سکتا ہے۔جیسے یہ کہے کہ میں تیرے بارے خواہش رکھتا ہوں۔محمد بن سیرین فرماتے ہیں میں نے ابوعبیدہ سے اس ارشاد کا معنی پوچھا تو فرمایا کوئی شخص اس عورت کے ولی سے کہے جلدی نہ کرنا یعنی اس کا نکاح کرنے سے

پہلے مجھے آگاہ کرنا۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ :عقد نکاح نہ کرو جب تک عدت نہ گزر جائے۔ یہ عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد، شعبی اور قتادہ وغیرہم سے منقول ہے۔ علماء کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ دوران مدت عقد صحیح نہیں۔ اگر کسی نے نکاح کرنے کے بعد دخول بھی کر لیا تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی تو پھر کیا یہ عورت ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے گی۔ اس میں دو قول ہیں۔ جمہور علماء فرماتے ہیں وہ اس پر حرام نہیں ہوگی بلکہ وہ عدت کے بعد دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ امام مالک کے نزدیک وہ ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو جائے گی اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ جس عورت کا نکاح اس کی عدت میں ہوا اگر اس کے خاوند نے اس کے ساتھ دخول نہیں کیا تھا تو ان کے درمیان تفریق کرا دی جائے گی اور پھر وہ اپنے پہلے خاوند کی عدت گزارے گی۔ عدت گزارنے کے بعد وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح منگنی کا پیغام بھیج سکتا ہے۔ اور اگر اس نے نکاح کے بعد دخول کیا تھا۔ پھر بھی ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ پھر وہ پہلے خاوند کی بقیہ عدت گزارے گی اور اس کے بعد دوسرے خاوند کی عدت گزارے گی اور یہ شخص اس کے ساتھ کبھی نکاح نہیں کر سکے گا۔ اس حکم کی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب اس شخص نے جلدی کر کے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت کا لحاظ نہ رکھا تو اسے اس کی سزا دی جائے گی کہ وہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے گی۔ جیسے قاتل کو مقتول کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ امام شافعی نے اس اثر کو امام مالک سے روایت کیا ہے۔ بیہقی فرماتے ہیں کہ امام شافعی کا قدیم قول یہی تھا۔ پھر آپ نے اس سے رجوع کر لیا۔ اور جدید قول کے مطابق وہ شخص اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ کیونکہ حضرت علی کا قول ہے کہ وہ اس کے لیے حلال ہے۔ پھر حضرت عمر سے منقول یہ اثر منقطع ہے بلکہ مسروق فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے بھی اس سے رجوع کر لیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ وہ اس کا مہر ادا کرے اور عدت کے بعد آپس میں مل سکتے ہیں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ :اور جان لو یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو جانتا ہے۔ یعنی عورتوں کے بارے میں تمہارے دلوں میں جو خیالات آتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ آگاہ ہے اس لیے اس بات سے تنبیہ فرما کر ان کی راہنمائی فرمائی کہ اپنے دلوں میں اچھی باتوں کو جگہ دیا کرو۔ لیکن انہیں اپنی رحمت سے مایوس نہیں کیا۔ اور فرمایا کہ جان لو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور حلم والا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو ان عورتوں کو جن کو تم نے چھوا بھی نہیں اور نہیں مقرر کیا تم نے ان کا مہر اور خرچہ دو انہیں مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق یہ خرچہ مناسب طریقہ پر ہونا چاہیے یہ فرض ہے نیکوکاروں پر''

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ :اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بعد دخول سے پہلے طلاق کو مباح قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس، طاؤس، ابراہیم نخعی اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں اس سے مراد نکاح ہے۔ بلکہ مہر مقرر کرنے اور دخول سے پہلے طلاق دینا جائز ہے جبکہ عورت نے مہر کے بغیر ہی اپنے آپ کو مرد کے سپرد کر دیا ہو۔ چونکہ اس میں عورت کی دل شکنی ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، اسے متعہ

دیا جائے۔ یعنی وہ شخص حسب استطاعت اس عورت کو متعہ دے تا کہ اس کی دل شکنی کا مداوا ہو سکے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سب سے اعلیٰ متعہ غلام ہے، اس سے کم چاندی اور اس سے کم کپڑے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر خاوند خوشحال ہو تو غلام دے اگر تنگدست ہو تو تین کپڑے دے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ درمیانی درجہ یہ ہے کہ وہ اسے ایک کرتہ، دوپٹہ، چادر، لحاف دے۔ قاضی شریح فرماتے ہیں کہ پانچ سو درہم دے دے۔ ابن سیرین فرماتے ہیں کہ غلام یا نان ونفقہ یا کپڑے دے دے۔ حضرت حسن بن علی نے دس ہزار درہم دیے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی بیوی نے کہا کہ محبوب کی جدائی میں یہ انتہائی قلیل ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ میاں بیوی کا اس کی مقدار میں جھگڑا ہو جائے تو اس پر نصف مہر مثلی واجب ہوگا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ خاوند کو کسی مقرر چیز پر مجبور نہ کیا جائے مگر کم از کم اتنا کپڑا دے دے جس میں نماز صحیح ہو جائے۔ اور اپنے دوسرے قول میں فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں لیکن تیس درہم دینا اچھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ قول مروی ہے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ متعہ کس مطلقہ کے لیے واجب ہے۔ اس میں مختلف اقوال ہیں:۔ یہ ہر مطلقہ کے لیے واجب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ (بقرہ:241) ”ترجمہ: اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہیے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر“۔ یہ حکم اپنے عموم کی وجہ سے تمام مطلقات کو شامل ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ ...... (الاحزاب:28) ”ترجمہ: اے نبی مکرم (ﷺ) آپ فرما دیجیے اپنی بیویوں کو اگر تم دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش وآسائش کی خواہاں ہو تو آؤ تمہیں مال و متاع دے دوں، پھر تمہیں رخصت کر دوں بڑی خوبصورتی کے ساتھ“۔ یہ تمام ازواج مطہرات وہ تھیں جن کا مہر مقرر تھا اور وہ حضور ﷺ کی خدمت میں بھی آ چکی تھیں۔ یہ حضرت سعید بن جبیر، ابوالعالیہ، حسن بصری، ایک روایت کے مطابق امام شافعی سے منقول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اس عورت کے لیے واجب ہے جس کو مباشرت سے پہلے طلاق ہوگئی ہو۔ اگرچہ اس کا مہر پہلے مقرر ہو۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ (الاحزاب:49) ”ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم نکاح کرو مؤمن عورتوں سے پھر تم انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ پس تمہارے لیے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں۔ جسے تم شمار کرو۔ لہٰذا انہیں کچھ مال دے دو اور انہیں رخصت کر دو خوبصورتی سے“۔ حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں: سورۂ احزاب کی اس آیت نے سورۂ بقرہ کی آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ حضرت ابواسید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے امیمہ بنت شرحبیل سے نکاح فرمایا جب آپ ان کے پاس تشریف لائے تو اس نے ہچکچاہٹ کی۔ (تو راوی فرماتے ہیں کہ) مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسے دو نیلے رنگ کے کپڑے دے کر رخصت کر دو۔ تیسرا قول یہ ہے کہ متعہ اس مطلقہ کے لیے واجب ہوتا ہے جس کے ساتھ دخول ہوا ہو نہ مہر مقرر کیا گیا ہو۔ اگر دخول کے بعد طلاق دی تو اس پر مہر مثل واجب ہوگا جب کہ عورت نے اپنے آپ کو بغیر حق مہر کے خاوند کے سپرد کر دیا ہو۔ اور اگر مہر پہلے مقرر ہو چکا تھا اور دخول سے پہلے طلاق دی تو اس صورت میں نصف مہر واجب ہوگا۔ اور اگر دخول کے بعد طلاق ہوئی تو مکمل مہر دینا واجب ہے۔ اور یہی متعہ کا بدل ہو جائے گا۔ صرف وہ مصیبت زدہ عورت جس کا نہ تو مہر مقرر کیا گیا اور نہ ہی دخول ہوا اور پھر اسے طلاق دے دی گئی تو اس کے متعہ کے وجوب پر یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر اور مجاہد کا قول ہے۔ بعض علماء نے ہر مطلقہ کے لیے متعہ کو مستحب قرار دیا ہے۔ ماسوائے اس مطلقہ کے جس نے بغیر مہر کے ہی اپنے آپ کو خاوند کے سپرد کر دیا ہو اور اسے دخول سے پہلے طلاق ہو جائے۔ سورۂ احزاب کی آیت تخییر کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗۚ ...... بعض علماء نے مطلق مستحب قرار دیا ہے۔ حضرت شعبیؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص طلاق کے بعد اپنی بیوی کو متعہ نہ

دے تو کیا قاضی اسے قید کرسکتا ہے تو آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا کہ میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا جو اس کی وجہ سے قید کیا گیا ہو۔ اگر یہ واجب ہوتا تو پھر قاضی اسے قید کرنے کا ضرور حکم دیتا۔

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۲۳۷

''اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لیے مہر تو نصف مہر (ادا کرو) جو تم نے مقرر کیا ہے مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) معاف کردیں یا معاف کردے وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور (اے مردو!) اگر تم معاف کردو تو یہ بہت قریب ہے تقویٰ سے اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس (کے لین دین) میں، بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے''۔

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ: یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ متعہ صرف انہی عورتوں کے ساتھ خاص ہے جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے۔ کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو نصف مہر دینے کا حکم فرمایا جس کا مہر مقرر ہو چکا ہو اور اسے دخول سے پہلے طلاق ہو چکی ہو۔ اگر ایسی حالت میں متعہ بھی واجب ہوتا تو اس کا حکم بیان کردیا جاتا۔ اس حالت میں نصف مہر کے وجوب پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس وقت مکمل مہر واجب ہوتا ہے جب مرد اور عورت کے درمیان خلوت ہوگئی ہو۔ اگرچہ دخول نہ بھی کیا ہو۔ امام شافعی کا قدیم مذہب بھی یہی ہے۔ خلفائے راشدین سے بھی یہی مروی ہے۔ لیکن امام شافعی کے ایک قول کے مطابق اس صورت میں نصف مہر واجب ہوگا۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ اگر کسی شخص نے نکاح کیا اور عورت کے ساتھ خلوت ہوگئی لیکن مباشرت نہ ہوئی اور عورت کو طلاق دے دی تو اب اس پر نصف مہر واجب ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ...... الخ۔ قرآن حکیم کے ظاہری الفاظ بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ایک راوی لیث بن ابی سلیم اگرچہ غیر ثقہ ہے لیکن یہ روایت دوسری سند سے بھی مروی ہے۔

اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ: یعنی مرد پر جو مہر واجب ہوا ہے اگر عورت خود اسے معاف کردے تو اس صورت میں خاوند کے ذمہ مہر دینا لازم نہ ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ثیبہ عورت اگر اپنا حق چھوڑے تو اس کے لیے جائز ہے۔ قاضی شریح، سعید بن مسیّب، عکرمہ، مجاہد، شعبی اور حسن بصری وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔ لیکن محمد بن کعب قرظی فرماتے ہیں کہ مردوں کا معاف کرنا ہے۔ لیکن یہ قول شاذ ہے۔

اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ: ارشاد نبوی ہے نکاح کی گرہ کا مالک خاوند ہے۔ اس روایت کو ابن مردویہ اور ابن جریر نے روایت کیا ہے۔ قاضی شریح فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت علی بن طالب نے پوچھا کہ نکاح کی گرہ کس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ میں نے جواب دیا عورت کے ولی کے ہاتھ میں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ یہ گرہ خاوند کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس اور کئی دوسرے مفسرین سے مروی ہے۔ امام شافعی کا جدید مذہب بھی یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ، آپ کے اصحاب، ثوری، ابن شبرمہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ حقیقت میں مرد کو ہی نکاح باقی رکھنے اور اس کو توڑنے کا اختیار ہوتا ہے۔ اس طرح ولی کو جائز نہیں کہ وہ مولیہ (عورت) کا مال ہبہ کرسکے۔ اسی طرح اس کے مہر کو معاف کرنے کا بھی حق نہیں۔ دوسرا قول

یہ ہے کہ اس سے مراد عورت کا والد یا بھائی یا ہر وہ شخص ہے جس کی اجازت کے بغیر وہ نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے اور علقمہ، حسن بصری، عطاء، طاؤس، زہری اور کئی دوسرے علماء سے بھی مروی ہے۔ عکرمہ اور محمد بن سیرین کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا قدیم مذہب بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں اس ولی نے ہی اس کا نکاح کیا ہے اس لیے وہ اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے مال کے کہ اس میں اسے تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں معاف کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اگر کسی عورت نے خود معاف کر دیا تو اس کا معاف کرنا صحیح ہوگا۔ اور اگر اس نے بخل کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف نہ کیا اور اس کے ولی نے معاف کر دیا تو یہ بھی جائز ہے۔ اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت اگر عاقلہ بالغہ ہو تو تب بھی ولی معاف کر سکتا ہے۔ قاضی شریح سے بھی یہی قول مروی ہے۔ لیکن جب امام شعبی نے اس کو ناپسند کیا تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ اور یہی قول اختیار کیا کہ اس سے مراد خاوند ہے۔ اور آپ اس کے لیے مباہلہ کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے تھے۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی: یہاں مردوں اور عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ معاف کر دیں تو ان کا معاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ مجاہد، نخعی، ضحاک، اور امام ثوری، وغیرہم فرماتے ہیں کہ اس سے مراد احسان ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے اس سے مراد نیکی ہے۔ یعنی نیکی کو آپس میں حقیر نہ سمجھو، حضرت علی بن طالب فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لوگوں پر ایک ایسا برا زمانہ بھی آئے گا کہ مؤمن اپنے ہاتھوں کو کاٹ کھائے اور فضل و احسان کو بھول جائے گا۔ اور برے لوگ اس کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس سے اس کا مال خریدیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کی بیع اور ایسی بیع جس میں دھوکہ ہو، سے منع فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے پاس کچھ مال ہے تو اپنے بھائی کی مدد کرو وگرنہ اس کی پریشانی میں اضافہ نہ کرو مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ تو اسے غمگین کرتا ہے اور نہ ہی اسے اپنے فضل و احسان سے محروم کرتا ہے۔ حضرت عون جب یہ حدیث بیان فرماتے تو ان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ فرماتے ہیں کہ امراء کی محفل میں بیٹھا ان کا خوبصورت لباس، بہترین خوشبو اور اعلیٰ ترین سواریاں دیکھ کر دل پریشان ہو گیا۔ پھر فقراء کی صحبت اختیار کی تو راحت محسوس ہوئی۔ اس کا یہ بھی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ اگر تمہارے کسی کے پاس کوئی سائل آئے اور اس کے پاس دینے کے لئے کوئی چیز نہ ہو تو اس کے لیے دعا کر دینی چاہیے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: تمہارے معلومات اور حالات میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

''پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لیے عاجزی کرتے ہوئے۔ پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیادہ یا سوار (جیسے بن پڑے) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے''۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے نماز کو اس کے مقررہ وقت میں ادا کرنے کی محافظت کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا نماز کو اس وقت پر ادا کرنا۔

عرض کی اس کے بعد فرمایا، جہاد فی سبیل اللہ۔ عرض کی اس کے بعد، فرمایا والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ تین باتیں بتائیں۔ اگر میں مزید پوچھتا تو آپ اور بتا دیتے۔ حضرت ام فروہ، حضور ﷺ کی بیعت حاصل کرنے والی صحابیات میں سے ہیں۔ فرماتی ہیں کہ آپ اعمال خیر کا تذکرہ فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل اول وقت میں نماز کی ادائیگی میں جلدی کرنا ہے(1)۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس کی ایک ہی سند ہے جو کہ ضعیف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نمازوں میں صلوۃ وسطیٰ کی پابندی کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ صلوۃ وسطیٰ کون سی ہے(1)۔ اس سے مراد صبح کی نماز ہے۔ یہ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ حضرت ابورجاء عطاردی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس کے پیچھے فجر کی نماز پڑھی۔ آپ نے اس میں ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت پڑھی اور فرمایا یہی وہ صلوۃ وسطیٰ ہے جس میں ہمیں قنوت پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسے ابن جریر نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے رکوع سے پہلے قنوت پڑھی اور پھر فرمایا یہی صلوۃ وسطیٰ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بصرہ میں عبداللہ بن قیس کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ صلوۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، ابوامامہ، انس بن مالک سے یہی مروی ہے۔ ابوالعالیہ، عبید بن عمیر، عطاء، مجاہد، جابر بن زید، عکرمہ، ربیع بن انس سے یہی منقول ہے۔ امام شافعی کا مذہب بھی یہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں۔ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اور امام شافعیؒ کے نزدیک صبح کی نماز میں قنوت پڑھی جاتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ وسطیٰ اس اعتبار سے ہے کہ اس میں قصر نہیں ہوتی اور یہ دو نمازوں عشاء اور ظہر کے درمیان ہے جن میں قصر ہوتی ہے۔ لیکن یہ قول اس اعتبار سے ساقط العمل ہے کہ مغرب میں بھی قصر نہیں ہوتی۔ اسے صلوٰۃ وسطیٰ کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ رات کی دو جہری نمازوں اور دن کی دوسرِی نمازوں کے درمیان میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد صبح کی نماز ہے۔ ابن معبد فرماتے ہیں کہ ہم حضرت زید بن ثابت کے پاس بیٹھے تھے انہوں نے حضرت اسامہ کی طرف صلوۃ وسطیٰ کے بارے میں پوچھنے کے لیے ایک آدمی بھیجا انہوں نے فرمایا صلوۃ وسطیٰ ظہر کی نماز ہے۔ رسول اللہ ﷺ سخت دوپہر میں ظہر کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ مسند کی روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ صحابہ کرام پر اس سے زیادہ سخت کوئی نماز نہیں تھی۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ قریشیوں کا ایک گروہ حضرت زید بن ثابت کے قریب سے گزرا۔ انہوں ن آپ سے صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ عصر کی نماز ہے۔ پھر انہوں نے حضرت اسامہ سے پوچھا انہوں نے فرمایا کہ یہ ظہر کی نماز ہے رسول اللہ ﷺ سخت گرمی میں ظہر کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اور آپ کے پیچھے نمازیوں کی صرف ایک یا دو صفیں ہوتی تھیں۔ کچھ لوگ دوپہر کے وقت آرام کر رہے ہوتے اور بعض لوگ تجارت میں مصروف ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ آپ نے فرمایا اگر یہ لوگ اپنی اس حرکت سے باز نہ آئے تو ان کے گھروں کو جلا دوں گا۔ لیکن اسی روایت کے راوی زبرقان کی صحابہ کرام میں سے کسی کے ساتھ ملاقات ثابت نہیں۔ لیکن حضرت زید بن ثابت سے مروی دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے نزدیک بھی صلوٰۃ وسطیٰ ظہر کی نماز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، ابوسعید خدری اور حضرت عائشہ سے باختلاف روایت یہی مروی ہے اور یہی عروہ بن زبیر، عبداللہ بن شداد اور ایک روایت کے مطابق امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے۔ امام ترمذی اور امام

1۔ مسند امام احمد: 375/6

بغوی فرماتے ہیں کہ اکثر صحابہ کرام کا یہی قول ہے۔ قاضی ماوردی فرماتے ہیں کہ جمہور تابعین کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عبدالبر نے اسے اکثر اہل اثر کا قول قرار دیا ہے۔ ابن عطیہ نے فرمایا ہے کہ یہ جمہور کا قول ہے۔ عبدالمؤمن بن خلف الدمیاطی اپنی کتاب کشف الغطا فی تبیین صلوٰۃ الوسطیٰ میں فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے۔ انہوں نے یہ قول حضرت عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، ابوایوب انصاری، عبداللہ بن عمرو، سمرہ بن جندب، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، سیدہ حفصہ، ام حبیبہ، اور ام سلمہؓ، سے روایت کیا ہے۔ صحیح روایت کے مطابق عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہؓ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عبیدہ، ابراھیم نخعی، زر بن حبیش، سعید بن جبیر، ابن سیرین، حسن بصری، قتادہ، ضحاک وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ امام احمد بن حنبل اور امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے۔ اور صحیح روایت کے مطابق امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کا یہی مسلک ہے۔ ابن حبیب مالکی نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ حافظ دمیاطی نے اس کی دلیل میں امام احمد کی مسند کی حدیث نقل کی ہے۔ رسول اللہ نے غزوۂ خندق کے موقع پر ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ان مشرکین کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ الوسطیٰ (نماز عصر) سے روک دیا ہے۔ پھر آپ نے مغرب اور عصر کے درمیان اسے ادا کیا۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور کئی دوسرے محدثین نے مختلف اسناد سے ذکر کیا ہے۔ حضرت عبیدہ نے حضرت علی سے صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم خیال کیا کرتے تھے کہ، یہ صبح کی نماز ہے۔ حتیٰ کہ میں نے غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ مشرکین کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ یعنی عصر کی نماز پڑھانے سے روکا ہے۔ یہ حدیث کئی صحابہ سے مروی ہے۔ حضرت سمرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی اور فرمایا اس سے مراد نماز عصر ہے۔ یہ روایت حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا بھی اس کے بارے میں اختلاف ہوگیا تھا۔ ہم میں ابوہاشم بن عتبہ کہنے لگے میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں، وہ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر اندر داخل ہو گئے۔ پھر واپس آ کر بتایا کہ یہ نماز عصر ہے۔ ابراہیم بن یزید دمشقی فرماتے ہیں کہ میں عبدالعزیز بن مروان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس مسئلہ کے بارے میں اختلاف ہوگیا انہوں نے ایک شخص کو کہا کہ فلاں صحابی کے پاس جاؤ اور ان سے اس نماز کے بارے میں پوچھ کر آؤ۔ وہیں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا بچپن میں مجھے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق نے بھیجا کہ میں رسول اللہ ﷺ سے صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں دریافت کروں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے میری چھوٹی چھنگلیا پکڑ کر فرمایا کہ یہ فجر کی نماز ہے۔ پھر ساتھ والی پکڑی کہ یہ ظہر کی ہے۔ پھر میرا انگوٹھا پکڑا فرمایا یہ مغرب کی نماز ہے پھر اس کے ساتھ والی انگلی پکڑی تو فرمایا کہ یہ عشا کی ہے۔ پھر پوچھا کہ اب کونسی انگلی باقی رہ گئی ہے۔ میں نے عرض کی درمیانی، فرمایا نماز کونسی باقی رہ گئی ہے۔ میں نے عرض کی عصر کی۔ فرمایا صلوٰۃ وسطیٰ عصر کی نماز ہے۔ لیکن اس روایت کی سند انتہائی غریب ہے۔ ابو مالک اشعری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صلوٰۃ وسطیٰ عصر کی نماز ہے۔ یہ حدیث کئی دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہے۔ صحیح مسلم کے یہ الفاظ ہیں کہ ان کافروں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ (نماز عصر) سے روک دیا۔ یہ تمام احادیث صراحۃً اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ عصر کی نماز ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اس نماز کی محافظت کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ حضرت سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کی عصر کی نماز رہ گئی گویا کہ اس کے اہل خانہ ہلاک ہوگئے اور اس کا مال برباد ہوگیا۔ ایک روایت میں فرمایا بادل والے دن نماز کو جلدی پڑھا کرو جس نے عصر کی نماز کو چھوڑ دیا اس کے اعمال اکارت ہوئے۔ حضرت ابونضرہ

نجاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وادی حمیس میں ہمارے ساتھ عصر کی نماز ادا فرمائی پھر ارشاد فرمایا یہ نماز تم سے پہلی امتوں کو بھی عطا کی گئی لیکن انہوں نے اسے ضائع کر دیا۔ خبردار رہو جو اس نماز کو پڑھتا ہے اسے دوہرا اجر ملتا ہے اس کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک کہ تم تارے دیکھ لو(1)۔ اس حدیث کو امام مسلم اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو یونس فرماتے ہیں کہ مجھے آپ نے قرآن پاک لکھنے کا حکم دیا۔ فرمایا جب اس آیت کریمہ پر پہنچنا تو مجھے بتانا۔ میں جب اس آیت کریمہ پر پہنچا تو آپ کو بتایا تو آپ نے صلوۃ وسطیٰ کے بعد والصلوۃ العصر کے الفاظ لکھوائے اور فرمایا کہ میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے خود سنا ہے(2)۔ اور مسلم کے یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے مصحف میں یہ آیت کریمہ اس طرح لکھی گئی (حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَهِيَ صَلٰوةُ الْعَصْرِ)۔ حضرت عمرو بن رافع فرماتے ہیں کہ میں ام المومنین حضرت حفصہ کے لیے قرآن پاک لکھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا جب اس آیت پر پہنچنا تو مجھے بتانا۔ جب میں نے انہیں بتایا تو انہوں نے "والصلوٰۃ الوسطیٰ" کے بعد صلوٰۃ العصر کے الفاظ لکھوائے۔ ایک روایت کے یہ بھی الفاظ ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ اس کی اور بھی مختلف اسناد ہیں۔ حضرت نافع فرماتے ہیں کہ میں نے یہ قرآن خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جس میں صلوٰۃ العصر لکھا ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور عبید بن عمیر سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس کو اسی طرح پڑھا ہے۔ کیونکہ ان روایات میں صلوٰۃ العصر کے الفاظ واؤ عاطفہ کے بعد ذکر کیے گئے ہیں اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ واؤ عطف معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلوۃ وسطیٰ اور ہے اور نماز عصر اور۔ اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں۔ اگر ان روایات کو جن میں واؤ عاطفہ ذکر کی گئی ہے حدیث تسلیم کیا جائے تو حضرت علیؓ کی روایت کردہ حدیث ان سے زیادہ صحیح ہے اور صراحۃً مقصود پر دلالت بھی کرتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ واؤ زائدہ ہو۔ جیسا کہ ان آیات میں واؤ زیادہ ہے: وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (الانعام:55)۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (الانعام:75) یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ واؤ صفات کے عطف کے لیے نہ ہو بلکہ ذوات کے عطف کے لیے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب:40)۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ۙ وَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى (الاعلی:4-1) اس کی مثل اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ شعراء کے اشعار میں بھی اس واؤ کا ذکر ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

؎ اِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَابْنِ الْهُمَامِ وَلَيْثِ الْكَتِيْبَةِ فِي الْمُزْدَحَمْ

اسی طرح نحویوں کے امام سیبویہ بھی اس کے جواز کے قائل ہیں اور وہ دلیل کے طور پر اہل عرب کا یہ قول پیش کرتے ہیں "مَرَرْتُ بِأَخِيْكَ وَصَاحِبِكَ" یہاں اخ اور صاحب سے ایک ہی ذات مراد ہے۔ اگر ہم اس کو قرآنی الفاظ تسلیم کریں تو یہ متواتر نہیں اور اس قسم کی خبر واحد سے قرأت قرآنی ثابت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان نے اسے اس مصحف (قرآن) میں ذکر نہیں کیا جس کو آپ نے مختلف علاقوں میں بھیجا۔ اس کے علاوہ کسی معتبر قاری سے یہ قرأت بھی مروی نہیں۔ بلکہ ایک حدیث سے اس قرأت کا منسوخ ہونا ثابت ہے۔ حضرت براء بن عازب روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ پہلے اس طرح نازل ہوئی "حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْعَصْرِ" ہم کچھ عرصہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس کی تلاوت کرتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا پھر یہ آیت اس طرح نازل ہوئی۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ (3) ایک شخص نے اس حدیث کے راوی شقیق سے پوچھا کیا یہ نماز عصر ہی ہے۔ انہوں نے جواب

1۔ مسند امام احمد:397/6 2۔ مسند امام احمد:73/6 3۔ مسلم، کتاب المساجد:438

دیا میں نے تمہیں بتادیا ہے کہ یہ آیت کریمہ کیسے نازل ہوئی اور پھر کیسے اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا۔ اس اعتبار سے یہ قرآن حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کی قرات کو لفظاً منسوخ کر دیتی ہے۔ اور اگر واؤ کو مغایرت پر محمول کیا جائے تو معناً بھی منسوخ کر دیتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نماز مغرب ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے لیکن اس کی سند محل نظر ہے۔ قبیصہ بن زویب اور ایک روایت میں قتادہ سے بھی یہ قول مروی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ مغرب کی نماز تعداد اور رکعات کے اعتبار سے وسطیٰ ہے کیونکہ اس کی تین رکعات ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ باقی نمازیں چار اور دو رکعات والی ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ فرض نمازوں کی وتر ہے اور اس کی فضیلت میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نماز عشاء ہے۔ یہ علی بن احمد واقدی کا مختار قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ پانچ نمازوں میں سے ایک ہے اس کو معین نہیں کیا گیا بلکہ اسے مبہم کر دیا گیا ہے جیسا کہ لیلۃ القدر کو پورے سال یا رمضان کے مہینے کے آخری عشرے میں مبہم کر دیا گیا ہے یہ سعید بن میسّب، قاضی شریح، نافع اور ربیع بن خیثم سے منقول ہے۔ حضرت زید بن ثابت سے بھی مروی ہے۔ امام الحرمین جوینی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پانچ نمازوں کا مجموعہ صلوۃ وسطیٰ ہے یہ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے۔ لیکن اس کی صحت میں کلام ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس قول کو شیخ ابن عبدالبر نے اختیار کیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ عشاء اور فجر کی نماز ہے۔ اس بارے میں کئی اور قول بھی ہیں۔ 1۔ نماز باجماعت۔ 2۔ نماز جمعہ۔ 3۔ صلوۃ خوف۔ 4۔ عید الفطر کی نماز۔ 5۔ عید الاضحیٰ کی نماز۔ 6۔ وتر کی نماز۔ 7۔ نماز چاشت۔ بعض نے اس میں توقف اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان ادلہ میں تعارض ہے۔ نہ تو ان میں وجہ ترجیح ظاہر ہے اور نہ ہی اس میں اجماع ہوا ہے۔ بلکہ صحابہ کرام کے زمانہ سے آج تک اختلاف جاری ہے۔ حضرت سعید بن میسّب فرماتے ہیں کہ صلوۃ وسطیٰ کے بارے میں صحابہ کرام کے درمیان میں اختلاف تھا۔ پھر آپ نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر اسے واضح کیا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ان میں سے ہر ایک قول اپنے ماقبل قول کی نسبت سے ضعیف ہے۔ جھگڑا اور اختلاف صرف فجر اور عصر کی نماز میں ہے۔ اور حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس لیے اسی قول پر ہی اعتماد کرنا چاہئے۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ میرے قول کے خلاف اگر کوئی صحیح حدیث مل جائے تو اس پر عمل کرنا اولیٰ ہے اس میں میری تقلید نہ کی جائے۔ امام شافعی سے اس قول کو ربیع، زعفرانی اور امام احمد بن حنبل نے بھی روایت کیا ہے۔ ابوالولید بن ابی جارود امام شافعی سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی حدیث میرے قول کے خلاف صحیح ثابت ہو جائے تو میں اپنے قول سے رجوع کرتا ہوں اور اسی حدیث پر عمل کرتا ہوں۔ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور امانت علمی کا ثبوت ہے۔ اور یہی حال دوسرے ائمہ کرام کا ہے۔ (رَحِمَهُمُ اللّٰهُ وَ رَضِيَ عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ)۔ اسی وجہ سے قاضی ماوردی نے قطعی فیصلہ فرمایا کہ امام شافعیؒ کا مذہب یہی صلوۃ وسطیٰ یعنی نماز عصر ہے۔ اگرچہ خود امام شافعیؒ نے اپنے جدید قول میں صراحت فرمائی ہے کہ صبح کی نماز ہے۔ شافعی مذہب کے کئی دوسرے محدثین نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ بعض فقہاء اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ نماز عصر امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صرف ایک ہی قول ہے۔ یعنی نماز فجر۔ ماوردی فرماتے ہیں کہ بعض فقہاء نے اس مسئلہ میں دو قول ذکر کیے ہیں۔ ان اقوال پر اعتراضات اور جوابات کی یہاں گنجائش نہیں۔

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ: یہاں حکم ہو رہا ہے کہ دوران نماز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خشوع و خضوع اور عاجزی و انکسار کے ساتھ کھڑے رہو۔ اور یہ حکم نماز میں ترک سلام کو مستلزم ہے۔ کیونکہ کلام نماز کے منافی ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا جب انہوں نے دوران نماز حضور ﷺ کو سلام کیا۔ نماز کے بعد آپ نے انہیں فرمایا بے شک نماز میں مشغولیت

ہے۔ یعنی بندہ مناجات الٰہی میں مشغول ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت معاویہ بن حکم نے دوران نماز آپ سے گفتگو کی تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ نماز میں گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تسبیح تہلیل اور اللہ کے ذکر کا نام ہے۔ حضرت زید بن ارقم روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے نازل ہونے سے پہلے لوگ نماز میں ضروری بات چیت کر لیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہمیں نماز میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا(1)۔ لیکن اس حدیث میں اشکال یہ ہے کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ نماز میں بات چیت کرنے کی حرمت کا حکم ہجرت حبشہ کے بعد اور ہجرت مدینہ سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکا تھا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ ہم ہجرت حبشہ سے پہلے نبی کریم ﷺ کو نماز میں سلام کرتے تو آپ دوران نماز ہی جواب دے دیتے۔ جب حبشہ سے واپس آئے تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا تو آپ نے دوران نماز اس کا جواب نہ فرمایا۔ اس پر میں رنجیدہ ہوا۔ طرح طرح کے خیال دل میں آنے لگے۔ آپ نے نماز سے سلام پھیرنے کے بعد فرمایا میں نے تمہیں سلام کا جواب اس لیے نہیں دیا کیونکہ میں نماز میں مشغول تھا۔ اللہ تعالیٰ جو حکم چاہے نازل فرما دیتا ہے۔ اب اس نے حکم فرمایا کہ نماز میں گفتگو نہ کیا کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابتداءً ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ پہلے آپ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی پھر وہاں سے واپس آ کر دیگر صحابہ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے پہلے کا ہے۔ اور یہ آیت کریمہ بالاتفاق مدنی ہے۔ بعض علماء اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ارقم کے قول سے جنس کلام مراد ہے اور اس آیت کریمہ سے کلام کی حرمت اور استدلال۔ ان کے اپنے فہم کے مطابق ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ حکم دو دفعہ نازل ہوا۔ یعنی پہلے مکہ میں ''جس میں نماز میں گفتگو کرنا مباح تھا پھر اسے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد پھر مباح ہو گیا، پھر مدینہ میں دوبارہ اس کی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ پہلا قول زیادہ اظہر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ دوران نماز ہم ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ کے قریب سے گزرا آپ نماز میں تھے۔ میں نے آپ کو سلام کیا آپ نے جواب ارشاد نہ فرمایا میرے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ شاید میرے بارے میں وحی نازل ہو گئی ہو۔ جب آپ نے اپنی نماز مکمل کی تو آپ نے فرمایا: ''وَعَلَيْكَ السَّلَامُ أَيُّهَا الْمُسْلِمُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ'' اور فرمایا کہ جب تم نماز میں ہو تو خاموش رہا کرو اور گفتگو نہ کیا کرو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نماز کی طرف خصوصی توجہ کرنے اور اس کے فرائض و واجبات کو کامل طریقہ سے ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کی سختی سے تاکید بھی فرمائی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس حالت کو ذکر کیا جس میں انسان نماز کو کامل طریقہ سے ادا نہیں کر سکتا یعنی دوران جنگ جب وہ دشمن کے ساتھ برسر پیکار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اس حالت میں جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو، پیدل یا سوار ہو کر، قبلہ رو ہو کر یا کسی اور سمت۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے جب نماز خوف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ اس کو بیان کرتے اور فرماتے کہ جب خوف سخت ہو تو کھڑے ہو کر نماز پڑھو یا سوار ہو خواہ قبلہ کی طرف منہ ہو یا نہ ہو۔ حضرت نافع فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر نے یہ قول نبی کریم ﷺ سے سنا ہو گا(2)۔ اسے بخاری اور مسلم نے بھی دوسری اسناد سے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس جہنی کو جب رسول اللہ ﷺ نے خالد بن سفیان ہذلی کو قتل کرنے بھیجا جو میدان عرفات کی طرف بھاگ گیا۔ جب وہ اس کو قتل کرنے کے لیے گئے تو انہوں نے راستہ میں عصر کی نماز اشارہ کے ساتھ پڑھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے رخصت عطا فرمائی ہے اور ان سے سختی و مشقت کو دور کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ سوار اپنی سواری پر نماز پڑھے اور پیدل اپنی ٹانگوں پر۔ حضرت حسن بصری، مجاہد، مکحول، سدی، حکم، امام مالک، اوزاعی وغیرہم سے بھی یہی مروی ہے۔ اور ایک

1۔ المسند: 368/4 2۔ البخاری، کتاب التفسیر: 38/6

روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ وہ اپنے سر کے اشارہ سے نماز پڑھے خواہ اس کا منہ کسی طرف ہو۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ جب دونوں لشکروں کے درمیان گھمسان کا رن ہو تو ایک رکعت نماز پڑھی جائے گی۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی علیہ السلام کی زبانی حضر میں چار رکعت، سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔ حضرت حسن بصری، قتادہ اور ضحاک وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی مروی ہے کہ خوف کی نماز ایک رکعت ہے۔ اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ امام بخاری نے بھی صحیح بخاری میں ایک باب قلعوں کو فتح کرنے اور دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے وقت نماز کا باب باندھا ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اگر فتح قریب ہو اور اکھٹے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو ہر شخص اشارہ سے اپنی نماز پڑھ لے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو نماز کو مؤخر کریں یہاں تک کہ جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔ اور دشمن سے امن میں ہو جائیں تو دو رکعت پڑھیں اور اگر اس پر قادر نہ ہوں تو ایک ہی رکعت پڑھ لیں۔ پھر اگر اس پر بھی قادر نہ ہوں تو صرف تکبیر کہنا کافی نہ ہوگا۔ پھر نماز کو امن کی حالت تک مؤخر کریں۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ میں قلعہ تستر کی فتح میں حاضر تھا۔ فجر کی نماز کے وقت جنگ اپنے زوروں پر تھی حتیٰ کہ ہم فجر کی نماز ادا نہ کر سکے۔ پھر خوب دن چڑھنے کے بعد ہم نے ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ نماز پڑھی۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ اگر اس نماز کے بدلہ میں مجھے دنیا و مافیھا دے دی جائے تو میں تب بھی خوش نہ ہوں گا(1)۔ اس کے بعد امام بخاری نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے غزوۂ خندق کے دن نماز عصر کو سورج کے غروب ہونے کے بعد پڑھا۔ اس کے علاوہ آپ نے غزوۂ بنی قریظہ کے وقت رسول اللہ علیہ السلام کے اس فرمان سے بھی استدلال کیا ہے۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا، تم میں سے کوئی بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز عصر ادا نہ کرے۔ راستہ میں جب نماز عصر کا وقت ہوا تو بعض صحابہ نے وہیں نماز پڑھی لی اور کہا کہ رسول اللہ علیہ السلام کا ارشاد کا مطلب جلدی کرنا ہے۔ بعض نے راستہ میں نماز نہ پڑھی بلکہ سورج غروب ہونے کے بعد بنو قریظہ میں جا کر نماز پڑھی۔ جب حضور علیہ السلام کو اس کا علم ہوا تو آپ نے کسی پر سختی نہ فرمائی۔ ان کا یہ استدلال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے یہی قول اختیار کیا ہے۔ لیکن جمہور علماء کا مذہب اس کے برعکس ہے۔ وہ فرماتے ہیں سورۂ نساء میں جس نماز خوف کا ذکر ہے۔ اور جس کی تفصیلات حدیث میں ذکر کی گئیں ہیں۔ یہ غزوۂ خندق کے موقع پر مشروع نہیں تھی۔ یہ اس غزدہ کے بعد مشروع کی گئی ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث اور اس کے علاوہ کئی دوسری احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ امام اوزاعی، مکحول اور امام بخاری یہ جواب دیتے ہیں، غزوۂ خندق کے بعد اس کا مشروع ہونا اس کے جواز کے منافی نہیں۔ کیونکہ یہ حالت شاذ و نادر ہی واقع ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے قول کے موافق عمل کرنا بھی جائز ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب کے دور خلافت میں فتح تستر کے موقع پر صحابہ کا عمل بھی اسی کا تائید کرتا ہے۔ یہ واقعہ مشہور ہے۔ کسی صحابی نے اس کا انکار نہیں کیا۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ: یعنی جب تم حالت امن میں ہو جاؤ تو اپنی نماز کو ادا کرو جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ اس کے رکوع، سجود، قیام و قعود کو کامل طریقہ سے ادا کرو۔ خشوع خضوع کا خیال رکھو۔

كَمَا عَلَّمَكُمْ: یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح تم پر اپنی نعمتوں کی برکھا برسائی اور تمہیں دولت ایمان سے نوازا اسی طرح تمہیں دنیا و آخرت کا نفع بخش علم عطا فرمایا۔ تمہیں بھی چاہیے کہ اس کا شکر یہ ادا کرو اور اس کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ۔ نماز خوف کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ارشاد فرمایا: فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (نساء:103)'' ترجمہ: پھر جب مطمئن ہو جاؤ (دشمن کی طرف سے) تو نماز ادا کرو۔ بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے وقت پر''۔ نماز خوف کے

1۔ البخاری:18/2

بارے میں وارد شدہ احادیث اور اس کا طریقہ ان شاء اللہ سورۂ نساء میں آیت کریمہ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (نساء:102) کی تفسیر کے تحت ذکر کیا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾

''اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہیے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لیے کہ انہیں خرچ دیا جائے ایک سال تک (اور) نہ نکالا جائے (انہیں گھر سے) پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں مناسب طور پر اور اللہ بہت زبردست بڑا دانا ہے اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہیے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام تاکہ تم سمجھ جاؤ''۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ: اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ منسوخ ہے۔ اور اس کی ناسخ وہ آیت کریمہ ہے جس میں اس عورت کو جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو، کی چار ماہ دس دن تک کی عدت کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے حضرت عثمان بن عفان کی خدمت میں عرض کی کہ جب یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے تو پھر اسے قرآن میں کیوں لکھواتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوا کہ جب یہ آیت کریمہ منسوخ ہو چکی ہے۔ تو پھر قرآن میں اسے لکھنے کی کیا حکمت ہے۔ تو امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ نے انہیں جواب دیا کہ یہ توقیفی امر ہے۔ چونکہ قرآن پاک کے پہلے نسخہ میں اس کو اسی طرح لکھا ہوا پایا۔ اس لیے میں نے حکم دیا کہ اس کو وہیں لکھ دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جاتا۔ پہلے اس کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ اور رہائش مقرر تھی۔ پھر آیت میراث نے اسے منسوخ کر دیا۔ اور یہ حکم ہوا کہ اگر خاوند کی کوئی اولاد نہیں تو اس کو چوتھا حصہ دیا جائے اور اگر اولاد ہو تو آٹھواں حصہ دیا جائے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری عبداللہ بن زبیر، مجاہد، حسن بصری، ابراہیم نخعی، عکرمہ، قتادہ، ضحاک اور کئی دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کی بیوی ایک سال تک اس کے گھر میں عدت گزارتی۔ اس کا نان ونفقہ اس کے مال سے دیا جاتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (بقرہ:234)۔ یعنی چار ماہ، دس دن اس عورت کی عدت ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ ہاں اگر یہ عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ اس کے بعد میراث کی آیت نازل فرما کر عورت کی میراث کو بیان فرما دیا۔ اور اس کے لیے وصیت، نان ونفقہ نہ دینے کا حکم فرمایا۔ حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کو سورۂ احزاب کی اس آیت نے منسوخ کیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ..... (الاحزاب:49) ''اے ایمان والو! جب تم نکاح کرو مؤمن عورتوں سے.....'' حضرت مقاتل اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ آیت میراث سے منسوخ ہے۔ حضرت مجاہد اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں پہلے عورت پر یہ عدت خاوند کے مرنے کے بعد

اس کے اہل خانہ میں گزارنا لازمی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما کر اس کی اصل عدت چار ماہ دس دن میں سات ماہ اور بیس دن کا اضافہ کر دیا لیکن یہ واجب نہیں۔ وصیت کے طور پر ہے۔ عورت اگر چاہے تو اس وصیت پر عمل کر کے خاوند کے گھر ٹھہری رہے اور چاہے تو اپنی اصل عدت ختم کر کے اپنے والدین کے گھر چلی جائے۔

غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ :حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ اگر عورت چاہے تو وہ وہیں عدت گزارے اور اگر چاہے تو اپنے والدین کے پاس چلی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر۔ جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں مناسب طور پر۔ وہ فرماتے ہیں اس کے بعد میراث کی آیت نے مکان کی سکونت کو منسوخ کر دیا اور وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔ اس کے مرحوم خاوند کے ذمہ مکان کا خرچہ لازم نہیں۔ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس سے وہی قول نقل کیا ہے جو مجاہد اور عطاء کا مختار قول ہے۔ یعنی یہ آیت کریمہ ایک سال کی عدت کے وجوب پر دلالت نہیں کرتی جیسا کہ جمہور علماء کا خیال ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آیت چار ماہ دس دن والی عدت کی آیت سے منسوخ ہو گی۔ یہ آیت تو صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خاوند کو چاہیے کہ وہ اپنے لواحقین کو وصیت کر جائے کہ اگر اس کی بیوی اس کے وصال کے بعد ایک سال رہنا چاہے تو اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عورتوں کے بارے میں وصیت کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ (النساء:11)۔

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ: اس کو منصوب پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے "فَلْتَوْصُوْالَهُنَّ" محذوف ہے۔ بعض نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ اس وقت اس سے پہلے كُتِبَ عَلَيْكُمْ محذوف ہوگا۔ یعنی تم پر وصیت فرض کی گئی۔ اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ یعنی اگر وہ ایک سال رہنا چاہیں تو انہیں منع نہ کیا جائے۔ اگر ان کی عدت چار ماہ دس دن گزر جائے۔ یا وضع حمل کی وجہ سے گزر جائے اور وہ اپنے مرحوم شوہر کے مکان سے منتقل ہونا چاہیں تو انہیں روکا نہ جائے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ یہ قول وجیہہ ہے۔ ظاہری الفاظ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ علماء کی ایک جماعت نے اسے اختیار کیا ہے۔ جن میں امام ابن تیمیہ بھی ہیں۔ لیکن دوسرے علماء اس کو رد کرتے ہیں۔ خصوصاً ابن عبد البر نے اس قول کو رد کیا ہے۔ حضرت عطاء اور بعض دوسرے علماء کا یہ قول ہے، کہ یہ آیت کریمہ آیت میراث سے منسوخ ہو گئی ہے۔ اگر تو ان کی اس سے مراد چار ماہ دس دن کی زیادہ کی عدت ہے تو یہ بات مسلم ہے۔ لیکن اگر ان کی مراد یہ ہو کہ چار ماہ دس دن کی رہائش میت کے ترکہ میں واجب نہیں ہے۔ تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ اس میں دو قول ہیں جو امام شافعیؒ سے منقول ہیں اکثر فرماتے ہیں کہ خاوند کے گھر میں عدت گزارنا ضروری ہے اور ان کی دلیل موطا امام مالک کی یہ حدیث ہے کہ حضرت ابو سعید خدری کی ہمشیرہ فریعہ بنت مالک حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی۔ ہمارے کچھ غلام بھاگ گئے تھے۔ میرے خاوند ان کو تلاش کرنے کے لیے نکلے، قدوم کے قریب انہیں پایا اور انہوں نے پکڑ کر اسے قتل کر دیا۔ کیا اب میں اپنے قبیلہ بنی خضرہ میں واپس آ سکتی ہوں۔ کیونکہ میرے خاوند نہ تو رہائش کے لیے کوئی مکان چھوڑ گئے ہیں نہ نان نفقہ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں۔ میں واپس مڑی۔ ابھی میں حجرہ شریف ہی میں تھی تو حضور ﷺ نے خود مجھے آواز دی یا کسی کو مجھے بلانے کے لیے حکم دیا۔ میں دوبارہ حاضر خدمت ہوئی۔ پوچھا تو فرمایا کہ ابھی تم نے کون سا مسئلہ پوچھا تھا۔ میں نے آپ کو اپنے خاوند کے متعلق تمام قصہ عرض کیا۔ آپ نے تمام واقعہ سن کر فرمایا۔ اپنے گھر میں ہی ٹھہری رہو یہاں تک کہ تمہاری عدت پوری ہو جائے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے چار ماہ دس دن تک عدت گزاری۔ فرماتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں مجھے بلایا اور اس مسئلہ کے بارے

میں مجھ سے پوچھا تو میں نے انہیں تمام واقعہ بیان کر دیا تو انہوں نے اس کی اتباع کی اور اسی پر فیصلہ فرمایا۔ اس حدیث کو ابو داؤد، ترمذی اور نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ: حضرت عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں جب یہ آیت کریمہ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ نازل ہوئی۔ بعض لوگ کہنے لگے اگر ہم احسان کرنا چاہیں کریں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اسی آیت کریمہ سے ان علماء نے استدلال کیا ہے جو ہر مطلقہ کو متعہ دینا واجب قرار دیتے ہیں۔ یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے، سعید بن جبیر اور دوسرے علمائے سلف سے بھی یہی مروی ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ جو اس کے وجوب کے قائل نہیں وہ اس آیت کے عمومی حکم سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے حکم کو خاص کر دیتے ہیں۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ...... (بقرہ:236) پہلے قول کے قائلین اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس آیت میں تو عموم کے بعد افراد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس سے تخصیص ثابت نہیں ہوتی۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ: اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے، یعنی حلال و حرام اور فرائض و واجبات میں بعض چیزوں کو کرنے کا حکم دیتا ہے اور بعض سے منع کر دیتا ہے۔ ان کو واضح طور پر کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اور جس وقت ان کو بیان کرنے کی ضرورت ہو ان کو مجمل نہیں چھوڑتا۔ حتیٰ کہ تم ان احکام کو سمجھو اور غور و فکر کرو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۠ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۠ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''کیا نہیں دیکھا تو نے ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ پھر زندہ فرمایا انہیں بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لیے کئی گنا اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا: ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ کیا نہیں دیکھا تم نے ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے، اور وہ ہزاروں تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ ایک روایت میں آپ سے نو ہزار اور دوسری میں چالیس ہزار بھی منقول ہے۔ ابو صالح نو ہزار بتاتے ہیں۔ حضرت وہب بن منبہ اور ابو مالک فرماتے ہیں کہ یہ تیس ہزار سے زیادہ تھی۔ یہ داوردان کی بستی کے رہنے والے تھے۔ جو واسط سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سعید بن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ ان کی بستی کا نام اذرعات تھا۔ یہ لوگ طاعون کی بیماری کے خوف سے اپنی بستی سے نکلے اور کہنے لگے ہم ایسی جگہ جائیں گے جہاں موت نہ ہو۔ لیکن ابھی کسی بستی میں پہنچے ہی نہ تھے کہ اللہ کے حکم سے یہ سب مر گئے۔ کسی نبی کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے رب تعالیٰ سے انہیں زندہ کرنے کی دعا کی تو اللہ

تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ لوگ بنی اسرائیل کے زمانہ میں اسی شہر میں آباد تھے۔ لیکن ان کو وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی۔ وہاں کوئی وبا پھیل گئی۔ وہ وہاں سے موت کے خوف سے جنگل کی طرف نکلے۔ دوران سفر وہ ایک کھلی وادی میں اترے ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ یہ پوری وادی ان سے بھر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے وادی کے دونوں اطراف سے بھیجے۔ ان دونوں فرشتوں نے ایسی چیخ ماری جس کو سنتے ہی تمام لوگ یکا یک مر گئے۔ لوگوں نے ان کے چاروں طرف دیوار بنا دی۔ اس طرح ایک عرصہ بیت گیا۔ حتیٰ کہ ان کی ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو گئیں وہاں سے بنی اسرائیل کے ایک نبی کا گزر ہوا۔ جن کا نام حزقیل تھا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ان کو زندہ کرنے کی دعا کی۔ اللہ نے انہیں حکم فرمایا کہ بلند آواز سے یہ پکارو۔ اے بوسیدہ ہڈیوں اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے، گوشت، پٹھے اور جلد کا لباس پہن لو۔ ان کے سامنے اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ پھر اللہ کے حکم سے نداء دی۔ اے روحو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ہر روح اپنے اپنے جسم میں لوٹ آئے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہ ایک طویل مدت کے بعد زندہ ہوئے تھے اس لیے بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا (سُبْحَانَكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ) ان کو دوبارہ زندہ کرنا لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے اور قیامت کے دن مر کر دوبارہ جی اٹھنے پر قطعی دلیل ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا مہربان ہے۔ یعنی ان کو اپنی واضح نشانیاں، قطعی دلائل اور ٹھوس شواہد دکھا کر ان پر فضل واحسان فرماتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے یعنی اللہ تعالیٰ ان کو جو دینی اور دنیوی نعمتیں عطا کرتا ہے ان پر شکر نہیں کرتے۔ اس واقعہ میں اس بات پر دلیل ہے کہ تقدیر کے سامنے کوئی تدبیر فائدہ نہیں دیتی۔ اللہ کے سوا کوئی اور ملجا و ماویٰ نہیں۔ جو لوگ وبا سے ڈر کر لمبی زندگی کی خواہش میں اپنے گھر سے نکلے ان کے ارادے اور قصد کے برخلاف ایک ہی آن میں موت نے ان کو آلیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ مدینہ طیبہ سے ملک شام کی طرف نکلے۔ جب ''سرغ'' کے مقام پر پہنچے تو یہاں آپ کی ملاقات حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور دوسرے سرداران لشکر سے ہوئی۔ اور انہوں نے آپ کو خبر دی کہ آج کل ملک شام میں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اب صحابہ کرام میں اختلاف ہو گیا کہ امیر المومنین کو اس حال میں شام جانا چاہئے یا نہیں۔ اسی اثناء میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حاضر ہوئے جو کسی کام سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے میں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے حدیث سنی تھی جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی جگہ وباء پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اس کے ڈر سے وہاں سے نہ بھاگو۔ اور اگر تمہیں معلوم ہو کہ فلاں علاقے میں وبا پھیلی ہوئی ہے تو اس علاقے میں نہ جاؤ۔ یہ حدیث سن کر حضرت عمر نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی اور واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ ایک روایت کے یہ بھی الفاظ ہیں کہ یہ بیماری (طاعون) تم سے پہلی امتوں پر اللہ کا نازل کردہ عذاب ہے۔ جب کسی علاقے میں اسکے بارے میں سنو تو وہاں نہ جاؤ۔ اور اگر تم اس علاقے میں ہو تو پھر اس سے ڈر کر نہ نکلو(1)۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جس طرح تدبیر اور احتیاط تقدیر کے سامنے انسان کو کوئی فائدہ نہیں دیتیں اس طرح اللہ کی راہ میں جہاد سے فرار اور اجتناب کسی کی عمر کو بڑھا سکتا ہے نہ گھٹا سکتا ہے۔ بلکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ ہر ایک کی قسمت میں اس کا رزق بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا (آل عمران:168) جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے اگر وہ ہمارا کہنا مانتے تو نہ مارے جاتے۔ آپ فرمایئے ذرا دور تو کر دکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ (النساء:78-77) ''اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! کیوں فرض کر دیا تو نے ہم پر جہاد (اور) کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں تھوڑی مدت تک''۔ (اے

1۔ مسند امام احمد: 193/1

ترجمان حقیقت انہیں کہو) کہ دنیا کا سامان بہت قلیل ہے اور آخرت زیادہ بہتر ہے اس کے لیے جو تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہے اور نہ ظلم کیا جائے گا تم پر کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر۔ جہاں کہیں تم ہو گے آ لے گی تمہیں موت اگرچہ (پناہ گزیں) ہو تم مضبوط قلعوں میں۔ اسلامی لشکروں کے سردار یعنی اسلام کے محافظ، دشمنوں کے خلاف اللہ کی بے نیام تلوار حضرت خالد بن ولیدؓ نزع کے وقت بڑی حسرت سے فرماتے ہیں کہ میں بہت سے غزوات اور جنگوں میں حاضر ہوا۔ میرے جسم کے ہر عضو پر تیر، نیزے، تلوار کے زخم ہیں۔ لیکن آج میں اپنے بستر پر موت کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں۔ بزدل اس سے عبرت حاصل کریں اور سبق سیکھیں۔ یعنی انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ وہ میدان جنگ میں جام شہادت نوش نہ کر سکے۔

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ: اس ارشاد میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کون ہے جو اس ذات کو قرض دے جو نہ مفلس ہے اور نہ ہی ظالم۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداح انصاریؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض لینا چاہتا ہے آپ نے فرمایا، ہاں ابوالدحداح۔ عرض کی یا رسول اللہ! اپنا دست مبارک دکھائیے۔ آپ نے اپنا دست اقدس انکے ہاتھ پر رکھ دیا۔ تو انہوں نے یہ عرض کی کہ میں نے اپنا یہ باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دے دیا۔ باغ میں چھ سو کھجور کے درخت اور ان کے اہل و عیال بھی تھے۔ حضرت ابوالدحداح باغ کے دروازے پر آئے اور نداء دی اے ام الدحداح! اس باغ سے باہر نکل آ ؤ یہ باغ میں نے اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ اس کو ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔

قَرۡضًا حَسَنًا: قرض حسن سے مراد اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا ہے بعض فرماتے ہیں کہ اس سے تسبیح و تکبیر مراد ہے۔

فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضۡعَافًا کَثِیۡرَۃً: تو اللہ تعالیٰ بڑھا دے گا اس قرض کو اس کے لیے کئی گنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ..... (البقرۃ:261) مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں، ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو اگاتا ہے سات بالیں اور ہر بالی میں سو دانہ ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی بڑھا دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسیع بخشنے والا اور جاننے والا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ حضرت ابوعثمان نہدی فرماتے ہیں کہ میں نے ابوہریرہؓ سے پوچھا تو مجھے معلوم ہوا کہ آپ فرماتے ہیں کہ ایک نیکی کا بدلہ اللہ تعالیٰ ایک لاکھ تک بڑھا دیتا ہے آپ نے فرمایا اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا ثواب دو لاکھ نیکیوں تک بڑھا دیتا ہے۔ لیکن یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت ابوعثمان نہدی فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حضرت ابوہریرہؓ کی خدمت میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے حج پر تشریف لے گئے۔ میں بھی پیچھے نکل پڑا۔ بصرہ پہنچا تو وہاں میں نے بعض اہل بصرہ سے سنا کہ وہ آپ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ نیکیوں تک بڑھا دیتا ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اکثر ان کی خدمت میں رہتا ہوں لیکن میں نے ان سے یہ حدیث نہیں سنی۔ اس کے بعد میں ان کی تلاش میں نکل گیا تاکہ میں ان سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کروں۔ جب میری ملاقات آپ سے ہوئی تو میں نے عرض کی کہ اہل بصرہ آپ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے ابوعثمان! اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے: مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا...... اور یہ بھی ارشاد فرماتا ہے: فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیۡلٌ (التوبۃ:38) سو نہیں سروسامان دنیوی زندگی کا آخرت میں مگر قلیل) پھر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت

میں میری جان ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا بدلہ دو لاکھ تک بڑھا دیتا ہے۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بازار میں جائے اور وہاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں ایک لاکھ نیکیاں لکھ دیتا ہے۔ اور ایک لاکھ گناہ معاف فرما دیتا ہے(1)۔ حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ جب آیت کریمہ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ (بقرہ:261) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کی یا باری تعالیٰ! میری امت کو اس سے بھی زیادہ عطا فرما تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا......۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر عرض کی یا الٰہی! میری امت کو مزید عطا فرما تو یہ آیت کریمہ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر:10) صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ نازل ہوئی۔ حضرت کعب الاحبار سے کسی شخص نے پوچھا ایک شخص یہ کہتا ہے جو ایک مرتبہ سورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ...... پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے موتی اور یاقوت کے دس لاکھ محل بنا دے گا۔ کیا یہ سچ ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس میں تعجب کیوں کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تو بیس لاکھ اور تیس لاکھ بلکہ بے حد و شمار عطا کرنے پر قادر ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ پڑھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کثیرہ کا لفظ ذکر کیا ہے۔ اس کثرت کا شمار بندے کی قدرت سے باہر ہے۔

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ: یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور مال ختم ہونے کی پرواہ نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی رازق ہے۔ اپنی مخلوق میں سے جس کے لیے چاہے اس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے اور چاہے تو وسعت عطا فرما دیتا ہے۔ اپنی حکمتوں سے وہ خود ہی آگاہ ہے۔ اور تم قیامت کے دن اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

"کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے کہ مقرر کر دو ہمارے لیے ایک امیر تا کہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں نبی نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو وہ کہنے لگے (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لیے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند نے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو"۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ مقرر کر دو ہمارے لیے ایک امیر تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑائی کریں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ نبی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام ہیں۔ یعنی یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب۔ لیکن یہ قول بعید ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب الدعاء: 312/12

کے زمانہ سے بہت عرصہ بعد واقع ہوا۔ بلکہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا۔اس کا صراحۃً ذکر قرآن پاک میں بھی ملتا ہے۔حضرت داؤدعلیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً ایک ہزار سال کی مدت کا فاصلہ ہے۔حضرت سدی فرماتے ہیں اس نبی سے مراد حضرت شمعون ہیں۔مجاہد کا قول ہے کہ حضرت شمویل علیہ السلام ہیں وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ یہ شمویل بن بالی بن علقمہ بن یرحام بن الیہو بن صوف بن علقمہ بن ماحث بن عمو، صابن عزریا بن صفیہ بن علقمہ بن ابی یاسف بن قارون بن یصہر بن قاھث بن لاوی بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ بنو اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک عرصہ تک صراط مستقیم پر گامزن رہے۔ پھر مختلف بدعات میں گرفتار ہو گئے۔ان میں سے بعض بتوں کی پوجا کرنے لگے۔اللہ تعالیٰ ان میں مسلسل انبیاء مبعوث فرماتا رہا جو ان کو نیکی کا حکم دیتے، برائی سے روکتے اور تورات کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہونے کا درس دیتے۔حتیٰ کہ جب ان کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ان پر مسلط کر دیا۔دشمنوں نے ان میں سے اکثر کو قتل کر دیا۔باقی ماندہ کو قیدی بنالیا اور ان کے علاقہ پر قابض ہو گئے۔ پہلے تو ان کے پاس تورات اور تابوت سکینہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ سے موروثی طور پر چلا آرہا تھا۔اس لیے جس دشمن پر بھی حملہ کرتے، غالب آجاتے۔لیکن ان کی مسلسل سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ان سے چھین لی۔دشمنوں نے غالب آنے کے بعد تابوت سکینہ اور تورات کو اپنے قبضہ میں لے لیا، باقی بچنے والوں میں بہت کم تھے جن کو تورات یاد تھی۔ان میں نبوت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔لاوی کی اولاد جس میں انبیاء چلے آرہے تھے، سب ختم ہوگئی۔لیکن ایک حاملہ عورت بچ گئی جس کا خاوند قتل ہو چکا تھا۔انہوں نے اس عورت کو حفاظت کی خاطر ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ان کا خیال تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو بیٹا عطا کرے اور وہ لڑکا نبی بنے، وہ عورت بھی اللہ تعالیٰ سے بیٹے کے لیے دعا کرتی رہی۔اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی۔اس نے اپنے بیٹے کا نام شمویل رکھا۔جس کا معنی ہے اللہ نے میری دعا قبول کر لی۔بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام شمعون رکھا۔یہ دونوں ہم معنی ہیں۔وہ لڑکا ان میں پروان چڑھتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اسے خوب حسن و جمال سے نوازا۔نبوت کی عمر کو پہنچنے پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نبی بنایا اور اس کی طرف وحی نازل فرمائی اور انہیں اپنی توحید کی تبلیغ پر مامور فرمایا۔انہوں نے بنی اسرائیل کو توحید کی دعوت دی تو انہوں نے درخواست کی کہ آپ ان پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیں تاکہ اس کی سربراہی میں جہاد کریں وہ بادشاہ ان میں ظاہر ہو چکا تھا۔حضرت شمویل علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ ہوسکتا ہے اگر اللہ تعالیٰ تم پر ایک بادشاہ مقرر کر دے اور تم لڑائی میں حصہ نہ لے کر اپنا وعدہ پورا نہ کرو، تو وہ کہنے لگے کوئی وجہ نہیں ہمارے لیے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے۔یعنی ہمارے وطن پر دشمن نے قبضہ کر لیا اور ہماری اولادوں کو قیدی بنالیا۔ مگر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو بجز چند کے سب نے جہاد سے منہ پھیر لیا، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔یعنی وہ اپنا وعدہ وفا نہ کر سکے اور ان میں سے اکثر نے جہاد سے انکار کر دیا۔اللہ تعالیٰ انہیں خوب جاننے والا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٧﴾

”اور کہا انہیں ان کے نبی نے بیشک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لیے طالوت کو امیر بولے کیونکر ہوسکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر، حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت میں نبی نے فرمایا

بیشک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ: جب انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کردیں تو انہوں نے حضرت طالوت کا نام پیش کیا جوان کے لشکر کے ایک سپاہی تھے۔ ان کا تعلق شاہی خاندان سے نہ تھا۔ چونکہ ان کے دستور کے مطابق بادشاہ یہودا کے خاندان سے ہوتا تھا اس لیے انہوں نے اسے اپنا بادشاہ ماننے سے انکار کردیا اور کہنے لگے۔ یہ ہمارا بادشاہ کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ ہم اس بادشاہت کے اس سے زیادہ حقدار ہیں۔ اسے مال کی فراوانی بھی عطا نہیں کی گئی۔ مال و دولت کے بغیر کاروبار سلطنت چلانا کیسے ممکن ہوگا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت طالوت سقے تھے۔ بعض کے نزدیک دباغ (رنگریز) تھے۔ یہ جواب دے کر انہوں نے اپنے نبی کے حکم کی نافرمانی کی حالانکہ ان پر ان کی اطاعت کرنا لازم تھی۔ اس لیے نبی علیہ السلام نے انہیں یہ جواب دیا کہ یہ اختیار اور چناؤ میری طرف سے نہیں۔ بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو تم سے بہتر جاننے والا ہے۔ اور اسے تمہارے مقابلہ میں علم و جسم میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ یعنی علم و فضل کے اعتبار سے تم سب سے افضل اور شکل و صورت کے اعتبار سے حسین اور جنگی امور میں زیادہ واقف اور جنگی مصائب میں تم سے زیادہ صبر کرنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہت صاحب علم، صاحب جمال، صاحب بدن قوی کو ملنی چاہیے۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ: وہی حقیقی بادشاہ ہے۔ وہ جو چاہے کرتا ہے، کسی کی مجال نہیں کوئی اس کے افعال کے بارے میں دریافت کرے۔ بلکہ اس کی مخلوق سے ہی سوال کیا جائے گا۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اس کا فضل و احسان انتہائی وسیع ہے۔ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے اور وہ اس چیز سے بھی باخبر ہے کہ کون اس ملک و سلطنت کا حقدار ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون اٹھالائیں گے اس صندوق کو فرشتے بیشک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان دار ہو''

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ: نبی انہیں فرمارہے ہیں کہ طالوت کی بادشاہت کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہیں تابوت سکینہ واپس لوٹا دے گا جو تم سے چھین لیا گیا تھا۔ یہ بھی ان کی بادشاہت کی نشانی اور علامت ہے۔

فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: سکینہ سے مراد وقار اور عظمت ہے۔ ربیع فرماتے ہیں کہ اس سے مراد رحمت ہے۔ حضرت ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ عطاء فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ کی وہ نشانیاں ہیں جن سے تمہیں دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سکینہ سے مراد سونے کا ایک طشت ہے۔ جن میں انبیاء کے قلوب مبارک دھوئے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا

فرمایا تھا۔ آپ اس میں تورات کی تختیاں رکھا کرتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں۔ سکینہ کا انسان کے چہرے کی طرح چہرہ تھا۔ اس کی شفاف روح تھی۔ حضرت علی سے مروی ہے کہ اس سے مراد تیز رفتار ہوا ہے جس کے دو سر تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کے دو پر اور دم بھی تھی۔ حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ سکینہ سے مراد مردہ بلی کا سر ہے۔ جب وہ تابوت میں بولتا تو انہیں فتح و نصرت کا یقین ہو جاتا۔ اور ایک قول کے مطابق وہ اللہ کی طرف سے ایک روح تھی جو گفتگو کرتی تھی۔ جب بنی اسرائیل میں اختلاف ہو جاتا تو وہ انہیں اس اختلاف کا صحیح حل بتاتی۔

بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ: حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصاء، اور تورات کی تختیاں ہیں۔ عطیہ بن سعد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عصا موسیٰ و ھارون اور آپ کے کپڑے اور تورات کی کچھ تختیاں ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں ان چیزوں کے علاوہ بنی اسرائیل پر نازل ہونے والے من کا کچھ حصہ اور نعلین بھی تھے۔

تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ: حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ فرشتے اس تابوت کو زمین و آسمان کے درمیان اٹھائے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے تمام لوگوں کی موجودگی میں اسے حضرت طالوت کے سامنے رکھ دیا۔ حضرت سدی فرماتے ہیں لوگ جب صبح کو اٹھے انہوں نے اس تابوت کو حضرت طالوت کے گھر پڑا ہوا پایا تو انہیں حضرت شمعون علیہ السلام کی نبوت اور طالوت کی بادشاہت کا یقین ہو گیا۔ بعض بزرگ فرماتے ہیں کہ یہ تابوت ایک بیل گاڑی پر رکھا ہوا تھا جسے فرشتے چلا کر لائے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تابوت اریحاء میں تھا۔ مشرکین نے جب اس پر قبضہ کیا تو انہوں نے اسے اپنے بت خانہ میں سب سے بڑے بت کے نیچے رکھ دیا۔ صبح کو اٹھے تو دیکھا کہ تابوت بت کے سر پر رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے نیچے اتار کر رکھا۔ دوسری صبح پھر یہی ماجرا پیش آیا۔ اب انہوں نے تابوت کو اس کے سر سے ہٹا کر اس میں میخیں لگا کر اسے گاڑ دیا۔ صبح اٹھے تو دیکھا بت ٹوٹ کر چکنا چور پڑا ہے اس سے انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ حکم ربی ہے۔ اور اسے قابو کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح انہوں نے اس تابوت کو اپنے شہر سے نکال کر ایک گاؤں میں پھینک دیا۔ گاؤں میں ایک وبائی بیماری پھیل گئی تو وہاں بنی اسرائیل کی ایک قیدی عورت نے انہیں بتایا کہ اگر تم اس بیماری سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو، صندوق بنی اسرائیل کے حوالہ کر دو۔ انہوں نے اس صندوق کو ایک بیل گاڑی پر لاد دیا۔ جسے دو گائیں کھینچ رہی تھیں۔ یہ گائیں اسے لیکر چلتی رہیں۔ جو بھی شخص اس تابوت کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ یہاں تک کہ یہ بنی اسرائیل کے ایک شہر کے قریب پہنچ گئی۔ تو وہ گائیں بیل گاڑی کا جوا توڑ کر واپس بھاگ گئیں۔ بنی اسرائیل آئے اور انہوں نے تابوت سکینہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ بعض فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس تابوت کو وصول کیا۔ جب آپ اسے وصول کرنے کے لیے اٹھے تو خوشی کی وجہ سے آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے دو نوجوانوں نے اسے وصول کیا۔ واللہ اعلم۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تابوت فلسطین کے ازدودہ نامی گاؤں میں تھا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ: بے شک اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے یعنی میری نبوت کی صداقت اور میں نے جو تمہیں طالوت کی اطاعت کرنے کا جو حکم دیا تھا اس پر نشانی ہے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۗ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ

جُنُوۡدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۲۴۹﴾

''پھر جب روانہ ہوا طالوت اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے سو جس نے پانی پی لیا اس سے وہ نہیں میرے ساتھیوں سے اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے پس سب نے پیا اس سے مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کہنے لگے کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی (مگر) کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ جب وہ لشکر لے کر نکلے تو بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ ان کے لشکر کی تعداد اسی ہزار تھی۔

اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ ۚ: یعنی انہوں نے اپنے لشکر کو مخاطب کر کے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں نہر کے ذریعہ آزمانا چاہتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس کے قول کے مطابق یہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان واقع تھی۔ جس کا نام نہر شریعت تھا۔

فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ ۚ: یعنی جو اس نہر سے پانی پیئے گا وہ میرے ساتھ اس جہاد میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہوگا۔ ہاں اگر کسی نے اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لیا تو اس پر کوئی حرج نہیں۔

فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِيۡلًا: حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ لشکر میں سے جنہوں نے ایک چلو پانی پیا ان کی پیاس تو بجھ گئی اور جنہوں نے خوب پیٹ بھر کر پانی پیا ان کی پیاس نہ بجھ سکی۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ لشکر کی کل تعداد اسی ہزار تھی۔ جن میں سے چھہتر ہزار نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ صرف چار ہزار ایسے خوش نصیب تھے جنہوں نے اپنے امیر کی اطاعت کی۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ ہم اکثر یہ بات کیا کرتے تھے کہ غزوۂ بدر کے دن صحابہ کرام کی جماعت تین سو سے کچھ زائد تھی اور یہی تعداد طالوت کے ساتھیوں کی تھی۔ جنہوں نے ان کے ساتھ نہر پار کی اور ان کے ساتھ نہر اسی نے پار کی جو کامل مومن تھا۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ: اور جب طالوت اور ان لوگوں نے جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے نہر کو عبور کیا تو وہ کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی کوئی ہمت نہیں یعنی جب انہوں نے دشمن کے لشکر کی کثرت اور اس کے کروفر کو دیکھا تو اس کے ساتھ مقابلہ کرنے میں پس وپیش کرنے لگے۔ تو ان میں سے مجاہد علماء نے ان کی ہمت بڑھائی۔ اور انہیں بتایا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے۔ فتح و نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے نہ کہ کثرت تعداد پر۔ بارہا اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۵۰﴾ؕ فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ

الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

''اور جب سامنے آ گئے جالوت اور اس کی فوجوں کے، تو بارگاہ الٰہی میں عرض کرنے لگے اے ہمارے رب! اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے۔ اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا فرمائی داؤد کو اللہ نے حکومت اور دانائی اور سکھا دیا اس کو جو چاہا اور اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے تو برباد ہو جاتی زمین لیکن اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر یہ آیتیں ہیں اللہ کی ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر (اے حبیب) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں''۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ: جب اہل ایمان کی مختصری جماعت یعنی حضرت طالوت کے لشکر نے اپنے دشمن جالوت کے بہت بڑے لشکر کو دیکھا تو اللہ کی بارگاہ میں دعا کرنے لگے اے ہمارے پروردگار! تو اپنے خصوصی فضل واحسان سے ہمیں صبر کی ہمت عطا فرما اور دشمن کے مقابلہ میں استقامت اور ثابت قدمی عطا فرما اور میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنے سے محفوظ رکھ اور ہمیں کافروں کی قوم پر فتح ونصرت عنایت کر۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ: اللہ تعالیٰ کی فتح ونصرت کی بدولت انہوں نے اپنے دشمن کو شکست دی اور ان پر غالب آ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کفار کے لشکر کے امیر جالوت کو قتل کر دیا۔ اسرائیلی روایات میں ہے کہ آپ نے اسے گوپیا کے ذریعہ قتل کیا اور طالوت نے ان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر انہوں نے جالوت کو قتل کر دیا تو انہیں اپنی بیٹی کا رشتہ اور آدھی سلطنت دے گا۔ اس نے اپنے وعدہ کے مطابق اپنی بیٹی کی شادی ان کیساتھ کر دی اور آدھی سلطنت میں شریک کر لیا۔ اس کے بعد ساری سلطنت حضرت داؤد علیہ السلام کے تصرف میں آ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت پر بھی سرفراز کر دیا۔ اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ'' یعنی جو سلطنت حضرت طالوت کے تصرف میں تھی وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو دے دی۔ حکمت سے مراد نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شمویل علیہ السلام کے بعد نبوت عطا فرما کر ان خصوصی علوم سے بھی مشرف فرمایا جو آپ کے ساتھ خاص تھے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ یعنی اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا تو یہ سب ہلاک ہو جاتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا دفاع حضرت داؤد کی شجاعت اور حضرت طالوت کی جنگی تدبیر سے کیا۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ..... (الحج:40) ''اور اگر اللہ تعالیٰ بچاؤ نہ کرتا لوگوں کا ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر تو (طاقتور کی غارتگری سے) منہدم ہو جائیں خانقاہیں۔ اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے''۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ایک نیک مسلمان کے وسیلہ سے اس کے اردگرد سو گھروں سے آفت اور مصیبت ٹال دیتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی۔ لیکن اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مسلمان کے نیک اور شریف ہونے کی وجہ سے اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد، اس کے اہل خانہ اور اس کے پڑوسیوں کی اصلاح فرما دیتا ہے۔ اور وہ جب تک ان میں زندہ رہتا ہے وہ اللہ کی حفظ وامان میں رہتے ہیں۔ ایک مرفوع حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ تم میں ہمیشہ سات ایسے افراد رہیں گے جن کی وجہ سے دشمن کے خلاف تمہاری مدد کی جائے گی۔ ان کے وسیلہ سے تم پر بارش برسائی جائے گی تمہیں رزق عطا کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ قیامت قائم ہو

جائے۔ حضرت عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت میں تیس ابدال رہیں گے۔ انہی کی برکت سے تمہیں رزق دیا جائے گا۔ بارش برسائی جائے گی۔ اور تمہاری مدد کی جائے گی۔ اس حدیث کے راوی حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ حضرت حسن بصری بھی انہی میں سے ایک ہیں۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں پر فضل وکرم فرمانے والا ہے۔ جو اپنے خاص فضل واحسان سے بعض کی بعض سے حفاظت کرتا ہے۔ وہی حقیقی بادشاہ ہے اور اس کے افعال واقوال بھی کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ: یعنی ہم نے تم پر یہ جو واقعات بیان کیے ہیں ہماری سچی آیات اور نشانیاں ہیں۔ ان کو حق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعات بنی اسرائیل کے بیان کردہ واقعات کے مطابق ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پرزور الفاظ کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت ورسالت کی تصدیق فرمائی اور ارشاد فرمایا یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

”یہ سب رسول، ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا ان میں سے کوئی ایمان پر (ثابت) رہا اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے“۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا: یہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (الاسراء:55)“ ترجمہ: اور بے شک ہم نے بزرگی دی ہے بعض انبیاء کو بعض پر اور ہم نے عطا فرمائی ہے داؤد کو زبور“۔ اور یہاں ارشاد فرمایا کہ یہ سب رسول، ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر۔ یعنی ان میں سے کسی سے کلام فرمایا یعنی موسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ اور اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام سے بھی۔ جیسا کہ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے۔

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ: معراج والی حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انبیاء کی ان کے مراتب کے مطابق آسمانوں میں زیارت کی۔ اس آیت کریمہ میں تو بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ لیکن حضرت ابو ہریرہ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ ایک مسلمان اور یہودی کا جھگڑا ہو گیا۔ یہودی نے کہا قسم ہے مجھے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ یہ سن کر مسلمان سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے یہودی کے منہ پر تھپڑ مارا اور کہا اے خبیث! کیا وہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ سے بھی افضل ہیں؟ یہودیوں نے حضور ﷺ کے پاس اس مسلمان کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا مجھے

دوسرے انبیاء پر فضیلت نہ دو، قیامت کے دن سب لوگ بیہوش ہونگے۔ میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا۔ اس وقت میں دیکھوں گا موسیٰ (علیہ السلام) عرش الٰہی کا پایہ تھامے کھڑے ہوں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا بیہوش ہی نہیں ہوئے۔ اور کوہ طور پر بیہوشی کے بدلہ میں آج ان پر بیہوشی طاری نہیں ہوئی۔ پس مجھے دوسرے انبیاء پر فضیلت نہ دو۔ اس حدیث کے علماء کرام نے متعدد جواب دیے ہیں۔

(1) ہوسکتا ہے آپ کا یہ ارشاد اس وقت کا ہو جب آپ کو دوسرے انبیاء پر اپنی فضیلت کا علم نہیں تھا۔

(2) آپ نے یہ تواضع اور انکساری کے طور پر ارشاد فرمایا۔

(3) جب آپس میں لڑائی جھگڑا ہو اس وقت اس قسم کی باتیں کرنے سے منع فرمایا تاکہ کسی نبی کی شان میں تنقیص نہ ہو جائے۔

(4) اپنی ذاتی آراء اور تعصب کی بناء پر کسی نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت نہ دو۔

(5) کسی نبی کو فضیلت عطا کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ تم پر لازم ہے کہ تم اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور اس پر ایمان لے آؤ۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ: یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے واضح اور قطعی دلائل عطا فرمائے جن سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور بنی اسرائیل کی طرف اس کے فرستادہ رسول ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے روح القدس یعنی جبریل علیہ السلام کے ساتھ ان کی مدد فرمائی اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ لوگ جو ان رسولوں کے بعد آئے، آپس میں نہ لڑتے جھگڑتے۔ یعنی یہ سب کچھ اللہ کی قضا و قدر کے موافق ہوا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٥٤﴾

”اے ایمان والو! خرچ کر لو اس (مال) سے جو ہم نے دیا تم کو اس سے پہلے کہ آ جائے وہ دن جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ (کفار کے لیے) دوستی ہوگی اور نہ (ان کے لیے) شفاعت۔ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں“۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: یہاں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو حکم فرما رہا ہے کہ وہ اس کے دیے ہوئے رزق میں سے نیکی کی راہ میں خرچ کریں۔ تاکہ ان کے رب کے پاس ان کا ثواب جمع ہو جائے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اس دنیاوی زندگی میں اس نیکی کے کام میں جلدی کریں قبل اس کہ قیامت کا دن آ جائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی، نہ کوئی دوستی اور نہ ہی شفاعت یعنی اس دن کوئی شخص زمین بھر سونا دے کر اپنی جان چھڑانا چاہے گا تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا۔ اس دن تو کوئی دوستی کام آئے گی نہ رشتہ داری۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ...... (المؤمنون: 101) ”ترجمہ: اور جب صور پھونکا جائے گا کوئی رشتہ داریاں نہیں رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کو کسی کی سفارش نفع دے گی“۔

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: یہاں اس مبتداء کو خبر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے یعنی حقیقی ظالم وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کفر کی حالت میں ملے گا۔ حضرت عطاء بن دینار فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے ارشاد فرمایا کہ کافر ہی ظالم ہیں۔ یہ نہیں فرمایا ظلم کرنے والے کافر ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِـيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـــوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿255﴾

''اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم سے مگر جتنا وہ چاہے سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اور نہیں تھکاتی اسے زمین و آسمان کی حفاظت اور وہی ہے سب سے بلند عظمت والا''۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ: اس آیت کو آیت الکرسی کہتے ہیں۔ یہ بڑی شان اور عظمت والی آیت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آیت الکرسی قرآن مجید میں سب سے افضل آیت ہے۔ حضرت ابی ابن کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ قرآن کریم میں سب سے عظمت والی آیت کون سی ہے میں نے عرض کی اللہ ورسولہ اعلم۔ آپ کے بار بار پوچھنے پر میں نے عرض کی یہ آیت الکرسی ہے۔ آپ نے خوش ہو کر فرمایا تمہیں یہ علم مبارک ہو۔ پھر فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اس کی قیامت کے دن زبان ہوگی اور ہونٹ ہوں گے اور یہ عرش الٰہی کے پایہ کے پاس اس کی پاکیزگی بیان کرے گی۔ اس روایت کو مصنف عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم نے اسے اپنی صحیح میں بھی روایت کیا ہے۔ لیکن اس میں یہ آخری جملہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ اپنے والد ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے کھجوروں کو خشک کرنے کے لیے گھر کے صحن میں ڈالا ہوا تھا۔ میرے والد وقتاً فوقتاً اس پر نظر رکھتے۔ انہوں نے دیکھا کہ کھجوریں کچھ دن سے کم ہو رہی ہیں۔ ایک رات ان کی حفاظت کے لیے پہرہ پر بیٹھ گئے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اچانک ایک نوجوان لڑکے کی مانند جانور دیکھا میں نے اسے سلام کیا تو اس نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کیا تو جن ہے یا انسان۔ اس نے کہا میں جن ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ۔ اس نے مجھے اپنا ہاتھ پکڑایا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کتے کا ہاتھ ہے۔ اس کے بال کتے کے بالوں کی طرح تھے۔ میں نے اس سے کہا کیا جن اس طرح کے ہوتے ہیں۔ اس نے کہا مجھ سے زیادہ بھی طاقتور جن ہیں۔ میں نے کہا تمہیں کس طرح چوری کرنے کی جرأت ہوئی۔ اس نے کہا ہمیں خبر ملی تھی کہ آپ صدقہ وخیرات کو پسند کرتے ہیں ہم نے چاہا کہ ہم بھی تمہارے اس اناج سے اپنا حصہ لے لیں۔ میں نے کہا کونسی چیز تمہارے شر سے بچا سکتی ہے۔ اس نے کہا یہ آیت الکرسی۔ پھر وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس واقعہ کے بارے میں بتایا۔ فرمایا اس خبیث نے سچ کہا ہے۔ حضرت ابوسلیل کے پاس کثرت سے لوگ احادیث سننے کے لیے آتے جب مجمع بہت زیادہ ہو جاتا تو آپ مکان کی چھت پر چڑھ کر انہیں احادیث سناتے۔ ایک دفعہ آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ قرآن مجید میں سب سے عظیم آیت کونسی ہے؟ ایک صحابی نے عرض کی اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک ان کے کندھوں کے درمیان رکھا۔ وہ صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے اسکی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی۔ حضرت انس بن مالک بیان فرماتے ہیں

کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک صحابی سے دریافت کیا کیا تم نکاح شدہ ہو۔ اس نے عرض کی نہیں۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کے ساتھ نکاح کروں فرمایا کیا تمہیں سورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ یاد نہیں۔ اس نے عرض کی کیوں نہیں، مجھے یاد ہے۔ آپ نے فرمایا یہ چوتھائی قرآن ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تمہیں "قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" یاد نہیں۔ اس نے جواب دیا کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ بھی چوتھائی قرآن ہے۔ پھر فرمایا کیا تمہیں سورۃ "اِذَا زُلْزِلَتِ" یاد نہیں اس نے جواباً عرض کی کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ بھی چوتھائی قرآن ہے۔ پھر آپ نے پوچھا کیا تمہیں سورۃ "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ" یاد نہیں۔ عرض کی کیوں نہیں۔ فرمایا یہ بھی چوتھائی قرآن ہے۔ پھر فرمایا کیا تمہیں آیت الکرسی یاد نہیں۔ عرض کی کیوں نہیں۔ فرمایا یہ بھی چوتھائی قرآن ہے(1)۔ حضرت ابوذر بیان فرماتے ہیں۔ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے پوچھا اے ابوذر کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا اٹھو نماز پڑھو۔ میں نے نماز پڑھی اور پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا اے ابوذر! شیاطین انس و جن سے رب کی پناہ مانگو۔ میں نے عرض کی کیا شیاطین انس کی پناہ بھی؟ فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! نماز کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا۔ نماز سراپا خیر ہے جو چاہے اس سے کم لے لے اور جو چاہے زیادہ۔ میں نے روزہ کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا روزہ کفایت کرنے والا فرض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر مزید اجر عطا فرماتا ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صدقہ کے بارے میں ارشاد فرمائیے۔ فرمایا اس کا کئی گنا ثواب ملتا ہے۔ میں نے عرض کی سب سے افضل صدقہ کونسا ہے۔ فرمایا کم مالدار کا اپنی ہمت کے مطابق صدقہ کرنا۔ یا پوشیدہ طور پر کسی محتاج کو عطا کرنا۔ میں نے عرض کی۔ سب سے پہلے نبی کونسے ہیں؟ فرمایا۔ آدم علیہ السلام میں نے عرض کی کیا وہ نبی تھے؟ فرمایا ہاں وہ نبی تھے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلام بھی کرتے تھے۔ میں نے عرض کی رسولوں کی تعداد کتنی ہے؟ آپ نے فرمایا تین سو دس سے کچھ اوپر ہے۔ ایک روایت میں تین سو پندرہ کے الفاظ ہیں۔ میں نے عرض کی سب سے عظیم آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ (2)۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ان کی ایک الماری تھی جس سے ایک جن مال چرا کر لے جاتا تھا۔ آپ نے نبی کریم ﷺ سے اس کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا اب اگر وہ آئے تو اس سے کہنا "بسم اللہ' اللہ کے رسول تمہیں بلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں وہ جن دوبارہ آیا تو میں نے اسے یہ کلمات کہے اور پھر اسے پکڑ لیا تو وہ کہنے لگا مجھے چھوڑ دو پھر میں اس کے بعد نہیں آؤں گا۔ فرماتے ہیں میں نے اسے چھوڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا تمہارے قیدی کا کیا بنا؟ میں نے عرض کی میں نے اسے پکڑا تو وہ کہنے لگا میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ اس پر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا وہ دوبارہ پھر آئے گا فرماتے ہیں اس کے بعد وہ دو تین مرتبہ آیا میں اسے پکڑتا تو وہ یہی کہتا کہ میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پوچھتے تمہارے قیدی کا کیا بنا؟ میں عرض کرتا میں جب اسے پکڑتا ہوں تو کہنے لگتا ہے کہ میں پھر نہیں آؤں گا۔ آپ نے فرمایا وہ پھر آئے گا۔ فرماتے ہیں میں نے اسے ایک دن پھر پکڑ لیا تو وہ کہنے لگا مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں ایک ایسی چیز سکھاتا ہوں اگر اسے پڑھو گے تو کوئی جن اور شیطان تمہارے پاس نہیں آ سکے گا۔ پھر کہنے لگا یہ آیت الکرسی ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انہیں تمام ماجرا سنایا۔ فرمانے لگے ہے تو بہت جھوٹا لیکن سچ کہہ گیا ہے(3)۔ اس کو ترمذی نے بھی فضائل قرآن میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر کے مال کی حفاظت پر مجھے مامور کیا وہ فرماتے ہیں کہ میں اس پر پہرہ دے رہا تھا کہ ایک آدمی آیا اور اناج سے اپنے دامن کو بھرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ

1۔ مسند امام احمد 221/3 2۔ مسند امام احمد 178/5 3۔ مسند امام احمد 423/5

منت سماجت کرنے لگا۔ مجھے چھوڑ دو میں محتاج ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شدید حاجت مند ہیں۔ فرماتے ہیں میں نے اس کی یہ بات سن کر اسے چھوڑ دیا۔ صبح حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے: اے ابو ہریرہ تمہارے رات والے قیدی کا کیا بنا؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اس نے اپنے فقر اور بچوں کا واسطہ دیا تو مجھے اس پر رحم آ گیا اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے دوبارہ پھر آئے گا۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں۔ مجھے حضور ﷺ کے اس ارشاد سے یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ ضرور آئے گا۔ اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر آیا۔ جب تیسری بار آیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ اب کی بار تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تم تو کہتے تھے کہ دوبارہ نہیں آؤ گے اور تم پھر آ جاتے ہو۔ اس نے کہا کہ اس دفعہ مجھے چھوڑ دو میں تمہیں چند کلمات سکھاتا ہوں اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہیں فائدہ دے گا۔ میں نے پوچھا وہ کون سے کلمات ہیں۔ کہنے لگا جب تم سونے لگو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر محافظ مقرر ہو جائے گا اور صبح تک کوئی شیطان تمہارے قریب نہ آ سکے گا۔ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں تمام ماجرا بیان کیا۔ تو فرمانے لگے ہے تو بہت جھوٹا۔ لیکن تمہارے ساتھ سچ بول گیا ہے۔ پھر فرمانے لگے ابو ہریرہؓ! جانتے ہو وہ کون تھا؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا یہ شیطان تھا (1)۔ اس حدیث کو امام نسائی نے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے۔ ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ صدقہ کی کھجوروں پر نگران تھے۔ ایک دن انہوں نے دروازہ کھولا تو ان میں سے مٹھی بھر کھجوروں کو کم پایا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ تو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا اگر تم اسے پکڑنا چاہتے ہو تو دروازے کھولتے وقت یہ کلمات کہنا ''سُبْحَانَ مَنْ سَخَّرَكَ لِمُحَمَّدٍ'' وہ فرماتے ہیں میں نے دروازہ کھولا تو یہی کلمات پڑھے۔ میں نے پایا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ میں نے کہا اے اللہ کے دشمن! کیا تم ہی چور ہو۔ اس نے کہا ہاں مجھے چھوڑ دو۔ آج کے بعد پھر نہیں آؤں گا۔ یہ میں ایک فقیر جن کے بال بچوں کے لیے لے جا رہا تھا۔ یہ سن کر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب تیسری مرتبہ آیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا تو نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا آج میں تمہیں پکڑ کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا ایسا نہ کرنا۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تمہیں کچھ کلمات سکھا دوں گا۔ اگر تم یہ کرو گے تو کوئی چھوٹا بڑا جن تمہارے قریب نہیں پھٹکے گا۔ آپ نے فرمایا کیا تم ایسا کرو گے۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا وہ کلمات کیا ہیں۔ اس نے پوری آیت الکرسی پڑھ کر سنا دی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا اس کی بات تو ٹھیک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ تین صحابہ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک حضرت ابی بن کعب دوسرے حضرت ابو ایوب انصاری اور تیسرے حضرت ابو ہریرہ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک شخص کی ایک جن سے ملاقات ہو گئی۔ جن نے اس سے کہا: کیا تم میرے ساتھ کشتی کرو گے۔ اگر تم نے مجھے اس میں پچھاڑ دیا تو میں تمہیں ایسی آیت سکھاؤں گا کہ جب تم اس آیت کو پڑھو گے تو کوئی شیطان تمہارے گھر میں داخل نہیں ہوگا۔ دونوں میں مقابلہ ہوا۔ اس شخص نے جن کو پچھاڑ دیا۔ اور وہ شخص جن کو کہنے لگا تم انتہائی نحیف اور ڈرپوک ہو۔ تمہارے بازو کتے کے بازوؤں کی طرح ہیں۔ کیا تمام جن اسی طرح کے ہوتے ہیں یا صرف تم ہی ایسے ہو۔ جن نے جواب دیا۔ میں اپنی قوم میں سب سے زیادہ قوی ہوں میرے ساتھ دوبارہ مقابلہ کر لو۔ دوبارہ مقابلہ ہوا تو پھر اس نے جن کو پچھاڑ دیا۔ تو اس جن نے کہا کہ آیت الکرسی پڑھا کرو جب کوئی شخص گھر میں داخل ہوتے ہوئے آیت الکرسی پڑھتا ہے تو شیطان اس کے گھر سے گدھے کی طرح ہینگتا ہوا نکل جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے پوچھا گیا کیا یہ شخص حضرت عمر تو نہیں تھے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سورۂ بقرہ میں ایک ایسی آیت

1۔ فتح الباری، کتاب فضائل القرآن 55/9

ہے جو تمام آیات کی سردار ہے۔ جس گھر میں اسے پڑھا جائے شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ اور یہ آیت آیت الکرسی ہے(1)۔ اور ترمذی کے یہ الفاظ ہیں کہ ہر چیز کی کوہان اور بلندی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی کوہان سورۂ بقرہ ہے اور اس میں ایک ایسی آیت ہے جو تمام آیات کی سردار ہے اور وہ آیت الکرسی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب مسجد میں تشریف لائے۔ تمام لوگ صفوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ان سے دریافت کیا۔ تم میں سے کون بتائے گا کہ قرآن کریم کی سب سے عظیم آیت کونسی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود بولے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے۔ قرآن کریم کی سب سے عظیم آیت اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ حضرت اسماء بنت یزید بن سکن فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے: 1۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ 2۔ الٓمّٓ ۙ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران:1) اس حدیث کو ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوامامہ فرماتے ہیں۔ وہ اسم اعظم جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے۔ وہ یہ تین سورتیں ہیں۔ 1۔ بقرہ۔ 2۔ آل عمران۔ 3۔ طٰہٰ۔ ہشام بن عمار خطیب دمشق فرماتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں تو آیت الکرسی ہے۔ اور آل عمران کی پہلی آیت اور سورۂ طٰہٰ کی یہ آیت ہے: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ (طٰہٰ:111)'' اور (فرط نیاز سے) جھک جائیں گے (سب لوگوں کے) چہرے حیی قیوم کے سامنے''۔ حضرت ابوامامہ سے ہی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے موت کے سوا کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ نسائی نے اپنی کتاب ''عَمَلُ الْیَوْمِ وَاللَّیْلَةِ'' اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں کیا ہے۔ ابوالفرج ابن جوزی نے اسے موضوع کہا ہے۔ لیکن یہ حدیث موضوع نہیں ہے مگر اسکی سند ضعیف ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرو۔ اور جو شخص اس کو ہر فرض نماز کے بعد پڑھے گا میں اسکے دل کو شاکر اور زبان کو ذاکر بنا دوں گا۔ اور اسے نبیوں اور صدیقوں کا عمل عطا کروں گا۔ اور اس پر مواظبت و دوام نبی یا صدیق یا وہ بندہ جس کے دل کو میں نے ایمان کے لیے منتخب کر لیا۔ یا جسے اپنی راہ میں شہید کرنا چاہتا ہوں۔ ہی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ حدیث انتہائی منکر ہے۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں جو شخص سورۂ حٰم مومن کو ''اِلَیهِ المصیر'' اور آیت الکرسی کو صبح کے وقت پڑھے گا وہ شام تک ان کی برکت سے (شر سے) محفوظ رہے گا۔ اور جو ان کو شام کے وقت پڑھے گا وہ صبح تک محفوظ رہے گا (2)۔ آیت الکرسی کی فضیلت میں اور بھی بہت سی احادیث وارد ہیں لیکن ہم نے اختصار اور ان کی اسناد میں ضعف کی خاطر ترک کر دیا۔ یہ آیت مستقل دس جملوں پر مشتمل ہے۔ 1۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں یکتائی کا بیان ہے۔ 2۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ حی سے مراد وہ ذات ہے جو بذات خود زندہ ہو اور اس پر کبھی موت طاری نہ ہو۔ قیوم سے مراد وہ ذات ہے جو دوسروں کو قائم کرنے والی ہے۔ اس میں دوسری قرأت القیام ہے۔ تمام مخلوق اس کی محتاج ہے۔ لیکن وہ ہر ایک سے غنی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کوئی چیز قائم نہیں رہ سکتی۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ (الروم:25)'' اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے قائم ہیں آسمان و زمین اس کے حکم سے''۔ 3۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی مخلوق کے معاملہ میں کسی نقص، غفلت، کوتاہی کا کوئی دخل نہیں۔ بلکہ وہ ہر ایک کے عمل سے باخبر ہے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی قیومیت کا کمال یہ ہے کہ اس پر کسی قسم کی نیند حتی کہ اونگھ تک طاری نہیں ہوتی۔ یہاں اونگھ کا لفظ پہلے ذکر کیا گیا ہے اور نیند کا بعد میں۔ کیونکہ نیند اونگھ سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر ہمیں چار کلمات ارشاد

1۔ المستدرک، کتاب التفسیر: 259/2 2۔ عارضۃ الاحوذی، فضائل القرآن: 11،10/11

فرمائے۔آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے۔اور نہ ہی نینداس کی ذات کے لائق ہے وہ میزان کا مالک ہے۔جب چاہے اسے جھکا دے اور جب چاہے اسے بلند کردے۔دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے اس کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں اور رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے۔اس کے سامنے نور یا آگ کے حجاب ہیں۔اگر ان پردوں کو ہٹادیں تو اس کے نور کی تجلیاں ان تمام چیزوں کو جلا دیں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ سوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو وحی کے ذریعہ حکم فرمایا کہ موسیٰ کو تین دن تک جگائے رکھواور اسے سونے نہ دینا۔پھر اسے دو بوتلیں پکڑا دینا اور انہیں کہنا کہ خیال رکھنا کہیں انہیں توڑ نہ دینا فرشتوں نے ایسا ہی کیا۔آخر وہ اونگھنے لگے۔ان کے ہاتھ میں بوتلیں تھیں۔کبھی بیدار ہو جاتے اور کبھی اونگھ لیتے۔آخر کار آپ کو ایک ایسی اونگھ آئی کہ آپ نے ایک کو دوسری پر مارااور توڑ دیا۔گویا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ جب ایک اونگھنے والا دو بوتلوں کی حفاظت نہیں کرسکتا تو وہ قادر مطلق جس کے قبضہ قدرت میں زمین وآسمان ہے اگر وہ اونگھ جائے یا سو جائے تو زمین وآسمان کا نظام کیسے چل سکتا ہے۔لیکن یہ روایت اسرائیلیات سے تعلق رکھتی ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سا جلیل القدر پیغمبر اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے بے خبر ہو۔اور اس سے بھی عجیب ترین وہ حدیث ہے جس کو ابن جریر نے روایت کیا ہے۔جس میں بعینہٖ یہی واقعہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں ہے۔بلکہ اس کا تعلق بھی اسرائیلیات سے ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کیا تمہارا رب سوتا ہے۔آپ نے فرمایا اس سے ڈرو،کیسی باتیں کرتے ہو۔اللہ تعالیٰ نے ندا دی اے موسیٰ (علیہ السلام!) تم سے یہ میرے سونے کے بارے میں پوچھتے ہیں اپنے ہاتھ میں دو بوتلیں لو اور ساری رات کھڑے رہو۔انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔جب تہائی رات گزری تو اونگھنے لگے اور اپنے گھٹنوں کے بل جھک گئے پھر کچھ ہوش سنبھالا۔لیکن رات کے آخری پہر ایسی اونگھ آئی کہ دونوں بوتلیں گر کر ٹوٹ گئیں۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے موسیٰ! اگر میں سو جاؤں تو یہ زمین وآسمان ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں جس طرح یہ بوتلیں ٹوٹ گئیں۔پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر آیت الکرسی نازل فرمائی۔

4۔لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ یہاں بیان فرمایا زمین وآسمان کی ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے اور اس کے حکم کے تابع ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (مریم:94\93) ''کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے مگر وہ حاضر ہو گی رحمٰن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح''۔

5۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ : یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا (النجم:26) ''اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آسکتی مگر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ اذن دے جس کے لیے چاہے اور پسند فرمائے''۔اسی طرح ارشاد فرمایا: وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) ''اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لیے جسے وہ پسند فرمائے''۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا بیان ہے کہ اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت یا سفارش کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔جیسا کہ حدیث شفاعت میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے جاؤں گا اور سجدہ میں گر جاؤں گا اور اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدہ میں ہی رہنے دے گا پھر ارشاد فرمائے گا۔سجدہ سے سر اٹھاؤ۔کہو تمہاری بات سنی جائے گی۔شفاعت کرو۔قبول کی جائے گی۔آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی اور میں انہیں جنت میں داخل کروں گا۔

6۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ علم باری تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو محیط ہے۔ ماضی وحال اور مستقبل اس کے احاطہ علم سے ماوراء نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ..... (مریم :64) ''اور (جبرائیل) (میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے مگر آپ کے رب کے حکم سے اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ درمیان میں ہے۔ اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا''۔

7۔ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ: یعنی اس کے آگاہ کرنے اور مطلع کرنے کے بغیر کوئی بھی اس کے علم سے باخبر نہیں ہوسکتا۔ اور اس کا یہ معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ اس کی ذات وصفات کا علم صرف اسی کو ہوسکتا ہے جس کو وہ خود عطا فرمائے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا (طٰہٰ :110) ''اور لوگ نہیں کر سکتے اس کا احاطہ اپنے علم سے''۔

8۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ یہاں کرسی سے مراد علم ہے۔ اور ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کرسی اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے کی جگہ ہے اور عرش کی مقدار کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اس روایت کو ابن مردویہ، وکیع اور حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔ لیکن یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباس پر موقوف ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے بھی یہ مرفوعاً روایت کی گئی ہے لیکن اسے مرفوع کہنا صحیح نہیں۔ ابو مالک فرماتے ہیں کہ کرسی عرش کے نیچے ہے۔ سدی فرماتے ہیں: زمین وآسمان کرسی کے جوف ہیں اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اگر ساتوں زمینوں اور آسمانوں کو پھیلا دیا جائے اور پھر ان کو آپس میں ملا دیا جائے تو یہ سب کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہوں گے جیسے چٹیل میدان میں ایک حلقہ۔ اور ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ یہ ساتوں آسمان اس طرح ہیں جیسے ایک ڈھال میں سات درہم۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں عرش کے مقابلہ میں کرسی ایسی ہے جیسے لوہے کا ایک چھوٹا سا حلقہ چٹیل میدان میں ہو۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے کرسی کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے مقابلہ میں اس طرح ہیں جس طرح چٹیل میدان میں پڑا ہوا ایک حلقہ۔ اور عرش کو کرسی پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح چٹیل میدان کو اس حلقہ پر۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور جنت میں داخل ہونے کی دعا کی درخواست کی آپ نے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ اس کی کرسی نے زمین وآسمان کو سمار رکھا ہے۔ اور اس کی اس طرح آواز آتی ہے جس طرح تمہیں پالان کی۔ اس روایت کو بزاز نے اپنی مسند، عبد بن حمید اور ابن جریر نے اپنی تفاسیر میں اور طبرانی اور حافظ ضیاء مقدسی نے روایت کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے حضرت عمر سے موقوفاً روایت کیا ہے اور بعض نے مرسلاً۔ اور بعض نے اس کے متن میں عجیب وغریب زیادتی کی ہے اور بعض نے اس کو حذف کر دیا ہے۔ اور اس سے بھی عجیب حدیث وہ ہے جو عرش کے بارے میں جابر بن مطعم سے مروی ہے بعض روایات میں قیامت کے دن فیصلہ کے لیے کرسی کا رکھا جانا بھی منقول ہے۔ لیکن اس آیت کے ظاہری الفاظ میں اس کا ذکر نہیں۔ بعض متکلمین مسلمان ہیئت دانوں سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک کرسی آٹھواں آسمان ہے جسے فلک الثوابت بھی کہتے ہیں اور اس کے اوپر نواں آسمان ہے جسے فلک اثیر اور اطلس بھی کہتے ہیں۔ لیکن بعض دوسرے علماء نے ان کا رد کیا ہے۔ حسن بصریؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ کرسی ہی عرش ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ کرسی اور چیز ہے اور عرش اور۔ کیونکہ وہ کرسی سے بہت بڑا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آثار واحادیث میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ابن جریر نے حضرت عمر کی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس کی صحت محل نظر ہے۔ واللہ اعلم۔

9۔ وَلَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ: یعنی زمین وآسمان میں جو کچھ ہے۔ اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو نہیں تھکاتی اور اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ بلکہ انتہائی آسان ہے۔ وہ ہر شخص کے اعمال کو جاننے والا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔ تمام اشیاء اس کے سامنے ذلیل وحقیر اور اس کی محتاج ہیں۔ وہی حقیقی غنی، اور لائق حمد وثناء ہے۔ جو چاہے کرتا ہے، مخلوق میں سے کوئی اسے نہیں پوچھ سکتا۔ بلکہ ان سے ان کے افعال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جو ہر چیز پر غالب ہے وہی محافظ اور نگران ہے۔ سرفرازی اور عظمت کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور نہ ہی کوئی رب ہے۔

10۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ: اور وہی ہے سب سے بلند عظمت والا اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (لقمان:30) اللہ بڑی شان والا بزرگ ہے۔ یہ آیات اور اس جیسی دوسری آیات اور صحیح احادیث جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر ہے۔ اس میں سلف صالحین کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو کسی چیز سے تشبیہ اور کسی کیفیت سے مقید کیے بغیر۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾

’’کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں بے شک خوب واضح ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے تو جو انکار کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو اس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔‘‘

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ: دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ دین اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی کو مجبور نہ کرو۔ کیونکہ دین اسلام ایک واضح اور روشن حقیقت ہے۔ اسے مجبوراً قبول کرانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت فرما دیتا ہے اور اس کے سینے کو کشادہ اور اس کی بصیرت کو روشن کر دیتا ہے وہ خود بخود دین اسلام قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جس کا دل غافل ہو بلکہ کانوں اور بصارت پر مہر لگی ہو اگر اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور بھی کیا جائے تو اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کا شان نزول یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کسی انصاری عورت کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوتا تو وہ نذر مانتی کہ اگر میرا بچہ ہوا تو میں اسے یہودی بناؤں گی۔ اس طرح جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ یہودیوں کے سپرد کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جب بنو نضیر کا مدینہ سے جلا وطن کیا گیا تو ان میں کچھ انصاریوں کے لڑکے بھی تھے جو یہودیوں میں رہنے کی وجہ سے یہودی بن چکے تھے۔ انصاری کہنے لگے کہ ہم اپنے لڑکوں کو نہیں جانیں دیں گے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بنو سالم بن عوف کے ایک انصاری صحابی کے بارے میں نازل ہوئی۔ جن کا نام حصینی تھا۔ ان کے دو بیٹے نصرانی تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ کیا میں ان کو اسلام پر مجبور نہ کروں۔ وہ دونوں نصرانیت کو بہت چاہتے ہیں۔ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اور ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ وہ دونوں شامی تاجروں کے ہاتھوں نصرانی ہوئے تھے۔ یہ تاجر کشمکش کی تجارت کرتے تھے۔ جب انہوں نے تاجروں کے ساتھ شام جانے کا ارادہ کیا تو ان کے والد نے انہیں روکنا چاہا اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت طلب کی۔ اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عمر کا ایک غلام اسبق نصرانی تھا۔ آپ اس پر اسلام پیش کرتے وہ انکار کر دیتا تو آپ فرماتے دین اسلام میں کوئی سختی اور زبردستی نہیں۔ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم مسلمانوں کے بعض معاملات میں تم سے اعانت طلب کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان اہل کتاب اور ان

لوگوں کے حق میں ہے جو نسخ اور تبدیل سے پہلے ان کے دین میں داخل ہو گئے ؛ جبکہ وہ جزیہ ادا کرتے۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ آیت قتال سے منسوخ ہو گئی ہے۔ اس لیے اب تمام قوموں کو دین اسلام کی دعوت دینا ضروری اور واجب ہے۔ اگر اسلام قبول کرنے سے انکار کریں اور نہ دعوت قبول کریں اور نہ جزیہ دیں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے جہاں تک قتل کر دیے جائیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ (الفتح :16) ''عنقریب تمہیں دعوت دی جائے گی ایک ایسی قوم سے جہاد کی جو بڑی سخت جنگجو ہے، تم ان سے لڑائی کرو یا وہ ہتھیار ڈال دیں گے''۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبہ :73) ''اے نبی (کریم ﷺ) جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ اور سختی کیجئے ان پر'' ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ..... (التوبہ :123) ''اے ایمان والو! جنگ کرو ان کافروں سے جو آس پاس ہیں تمہارے اور چاہئے کہ وہ پائیں تم میں سختی۔ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔ حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر تعجب فرمائے گا جن کو زنجیروں میں جکڑ کر جنت میں لے جایا جائے گا۔ اس سے مراد وہ مشرک قیدی ہیں جن کو میدان جنگ سے پابند سلاسل لایا جاتا ہے پھر وہ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ ان کے ظاہری اعمال اچھے اور باطنی پاکیزہ ہو جاتے ہیں اس طرح وہ اچھے بن جاتے ہیں۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ارشاد فرمایا کہ مسلمان ہو جاؤ اس نے کہا کہ میرا دل نہیں مانتا۔ آپ نے فرمایا مسلمان ہو جاؤ اگرچہ تمہارا دل نہیں مانتا۔ یہ حدیث صحیح ہے اور ثلاثی ہے۔ یعنی صرف تین واسطوں سے حضور ﷺ سے مروی ہے۔ لیکن اس حدیث سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو اسلام پر مجبور کیا تھا۔ بلکہ آپ نے تو اسے اسلام کی دعوت دی تھی اس نے جواباً کہا کہ میرا دل اس کو ناپسند کرتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان ہو جاؤ اگرچہ تمہارا دل اسے ناپسند کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں اخلاص عطا فرمادے گا۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ: جس نے معبودان باطلہ اور ہر اس چیز کی عبادت کو چھوڑ دیا جس کی عبادت کی دعوت شیطان دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کر کے اس وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے لگا تو اس نے مضبوط حلقے کو تھام لیا۔ یعنی وہ صراط مستقیم پر گامزن ہو گیا۔ حضرت عمر فرماتے ہیں "جِبْتٌ" سے مراد جادو ہے اور طَاغُوْتٌ سے مراد شیطان ہے۔ بہادری اور بزدلی انسان میں فطرتی ہوتی ہے بہادر آدمی اس کے لیے بھی جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جسے وہ نہیں جانتا۔ اور ڈرپوک، بزدل آدمی اپنی ماں کی خاطر بھی نہیں لڑسکتا۔ کسی آدمی کی شرافت اس کا دین، اس کا حسب ونسب اس کا اخلاق ہے۔ اگرچہ وہ پارسی یا نبطی ہے۔ حضرت عمر نے ایک روایت میں شیطان کو طاغوت قرار دیا ہے۔ آپ کا یہ قول انتہائی قوی ہے۔ کیونکہ یہ ہر اس برائی کو شامل ہے جو زمانہ جاہلیت میں پائی جاتی تھی۔ اس میں بتوں کی پوجا کرنا اور ان سے مدد مانگنا سرفہرست ہے۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى: یعنی اس نے دین کے سب سے قوی سبب کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اسے مضبوط حلقہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جو اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ ٹوٹتا نہیں۔ اور اس کا دوسرے کے ساتھ بھی انتہائی قوی تھا۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ عروۃ الوثقیٰ سے مراد ایمان ہے۔ سدی کے نزدیک اسلام ہے۔ سعید بن جبیر اور ضحاک فرماتے ہیں کہ اس سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہے۔ حضرت انس بن مالک سے منقول ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ حضرت سالم بن ابی جعد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اَلْحُبُّ فِى اللّٰهِ اور اَلْبُغْضُ فِى اللّٰهِ ہے۔ یہ تمام اقوال صحیح ہیں۔ ان میں کوئی منافات نہیں۔ حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر ایمان لایا اس نے ایک ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا جو جنت میں داخل ہونے سے پہلے نہیں ٹوٹے گا۔ حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر سے جب اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو

آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد:11) ''بلا شبہ اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری حالت کو) جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے''۔ حضرت محمد بن قیس بن عبادہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں تھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر خشوع و خضوع کے اثرات تھے۔ اس نے دو رکعت مختصراً نماز پڑھی۔ لوگوں نے کہا یہ شخص جنتی ہے۔ جب وہ باہر نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ ہی اس کے گھر پہنچ گیا جب اس کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد کچھ اجنبیت دور ہوئی تو میں نے کہا کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوئے تھے تو آپ کے بارے میں لوگوں نے یہ کہا تھا۔ یہ سن کر انہوں نے فرمایا سبحان اللہ! ایسی بات نہیں کہنی چاہئے جس کا علم نہ ہو۔ لیکن میں تمہیں اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں خواب دیکھا۔ دیکھتا ہوں کہ میں سرسبز و شاداب باغ میں ہوں۔ اس کے درمیان میں ایک لوہے کا ستون ہے جو زمین سے لے کر آسمان تک طویل ہے۔ اس کے اوپر ایک کٹہرا بنا ہوا ہے مجھے کہا گیا کہ اس پر چڑھ جاؤ لیکن میں اس پر چڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک شخص آ گیا۔ اس نے میرے کپڑوں کو پیچھے سے اٹھایا میں آسانی سے اس ستون پر چڑھ گیا حتیٰ کہ میں اس کٹہرے تک پہنچ گیا۔ اس نے کہا اس کٹہرے کو مضبوطی سے تھام لو۔ اسی اثناء میں میری آنکھ کھل گئی۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی خدمت میں یہ خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا باغ سے مراد اسلام ہے۔ ستون سے مراد دین ہے اور کٹہرے سے مراد عروۃ الوثقیٰ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا خاتمہ اسلام پر ہوگا۔ راوی فرماتے ہیں کہ یہ شخص حضرت عبداللہ بن سلام تھے (1)۔ اس کو امام بخاری نے دوسری سند سے روایت کیا ہے۔ حضرت خرشہ بن حر فرماتے ہیں کہ مدینہ شریف حاضری ہوئی۔ میں مسجد نبوی شریف میں کچھ بزرگوں کے ساتھ ان کی مجلس میں بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے تشریف لائے تو اہل مجلس نے فرمایا کہ جو جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کو دیکھ لے۔ اس بزرگ نے ایک ستون کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کی۔ تو میں نے انہیں عرض کی کہ یہ لوگ آپ کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں انہوں نے فرمایا جنت اللہ کی ملکیت ہے جسے چاہے عطا کرے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں خواب دیکھا تھا۔ دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ایک آدمی آیا اور مجھے کہا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے ایک وسیع و عریض میدان میں لے کر چلنے لگا۔ دوران سفر میں نے دیکھا کہ ایک راستہ بائیں طرف نکل رہا ہے۔ میں نے اس راستے پر چلنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا تم اس پر نہ چلو اس کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ پھر ایک دائیں طرف راستہ نظر آیا۔ میں اس پر چل نکلا۔ حتیٰ کہ راستہ ایک پہاڑ پر ختم ہو گیا جس پر بڑی پھسلن تھی۔ اس شخص نے میرا ہاتھ پکڑا اور آگے کی طرف دھکیل دیا۔ تو میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ ابھی میرے اس پر قدم نہیں جمے تھے کہ اچانک مجھے لوہے کا ایک ستون نظر آیا جس پر سونے کا ایک کڑا تھا۔ اس شخص نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ستون پر چڑھا دیا۔ میں نے سونے کے اس کڑے کو پکڑ لیا۔ اس نے کہا اسے مضبوطی سے تھام لو۔ میں نے جواب دیا میں نے اسے تھام لیا ہے۔ پھر اس نے اپنا پاؤں زمین پر مارا تو وہ کڑا میرے ہاتھ میں رہ گیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا خواب سنایا آپ نے فرمایا تم نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے۔ اس وسیع و عریض میدان سے مراد میدان محشر ہے۔ اور وہ راستہ جو بائیں طرف نکلتا تھا وہ جہنم کا راستہ تھا اور جو دائیں جانب راستہ تھا وہ جنت کا راستہ تھا۔ اور پھسلن والا پہاڑ شہداء کی منزل ہے۔ اور وہ کڑا جس کو تو نے مضبوطی سے پکڑا تھا وہ اسلام کا کڑا ہے۔ اسے مضبوطی سے دم آخر تک تھامے رکھنا۔ اس وجہ سے مجھے امید ہے کہ اللہ مجھے جنت میں داخل کرے گا (2)۔ راوی فرماتے ہیں کہ یہ بزرگ حضرت عبداللہ بن سلام ہیں۔ اس کو نسائی، ابن ماجہ اور امام مسلم نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔

1۔ مسند امام احمد 452/5 2۔ مسند امام احمد 452/5

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾

''اللہ مدد گار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف اور جنہوں نے کفر کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے اندھیروں کی طرف یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ اس کی رضا اور خوشنودی کے طلبگار اور احکام شرعیہ کے پیروکار کی راہنمائی فرماتا ہے۔ اور اپنے مومن بندوں کو کفر وشرک کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ حق کی صاف روشنی عطا فرماتا ہے۔ اس کے برعکس کافروں اور مشرکوں کا دوست شیطان ہے وہ ان کے لیے گمراہیوں کو مزین کرتا ہے جن میں وہ سرگرداں ہیں۔ وہ ان کو حق کے واضح راستہ سے کفر وشرک کی دلدل کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نور کو مفرد ذکر کیا ہے اور ظلمات کو جمع۔ کیونکہ حق ایک ہی ہے اور کفر کی مختلف شکلیں ہیں جو سب کی سب باطل ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام:153) ''اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی (ورنہ) وہ جدا کر دیں گے تمہیں اللہ کے راستے سے۔ یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں جن کا تا کہ تم متقی بن جاؤ''۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (الانعام:1) ''اور بنایا اندھیروں اور نور کو''۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں حق کے واحد اور یکتا ہونے اور باطل کے تفرق اور انتشار کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت ایوب بن خالد فرماتے ہیں کہ اہل ہوا اور اہل فتن کو لایا جائے گا جس کی خواہش ایمان ہوگی وہ روشن اور نورانی ہوگا اور جس کی خواہش کفر ہوگی وہ انتہائی تاریک اور سیاہ ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰھٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٥٨﴾

''کیا نہ دیکھا آپ نے (اے حبیب) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ نے بادشاہی۔ جب کہ کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے (اسے) کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اس نے کہا میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو''۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ: اس بادشاہ کا نام نمرود بن کنعان بن کوش بن سام بن نوح تھا۔ یہ بابل کا بادشاہ تھا۔ بعض نے اس کا نسب اس طرح لکھا ہے۔ نمرود بن فالح بن عابد بن شالخ بن ار فخشذ بن سام بن نوح۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ دنیا کے مشرق ومغرب پر حکومت کرنے والے چار بادشاہ گزرے ہیں دو مومن اور دو کافر۔ مومن سلیمان بن داؤد اور ذوالقرنین ہیں اور کافر نمرود اور بخت نصر ہے۔ واللہ

اعلم۔ آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! (ﷺ) کیا تم نے اپنے دل کے نور سے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا تھا۔ وہ خدا ہونے کا دعویدار تھا۔ اس لیے وہ اپنے سوا کسی کو خدا ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جیسا کہ اس کے بعد فرعون نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا۔ اور اپنے پیروکاروں کو کہنے لگا: مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (القصص:38) (میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سواء کوئی اور خدا ہے) چونکہ نمرود ایک عرصہ دراز تک اپنے ملک کا بادشاہ رہا۔ اس لیے اس کے ذہن پر سر کشی، کفر، عناد کا غلبہ ہو گیا کہا جاتا ہے کہ وہ چار سو سال تک اپنی سلطنت کا فرمانروا رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ (اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ) اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس رب کے وجود پر دلیل طلب کی جس کی وہ دعوت دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت کا مالک ہے۔ کیونکہ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اور موجود پر عدم طاری کرنا یہ اللہ کے وجود کی بہترین دلیل ہے جو ہر روز کے مشاہدہ سے عیاں ہے۔ کیونکہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ چیزیں بذات خود پیدا نہیں ہوتیں اس لیے ان چیزوں کے پیدا کرنے والے موجد یا خالق کا ہونا ضروری ہے۔ اور وہ صرف اللہ کی ذات ہی ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔ یہ دلیل سن کر اس نے کہا (اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ) زندہ اور مار تو میں بھی سکتا ہوں۔ اس نے یہ کہہ کر دو شخصوں کو طلب کیا جو واجب القتل تھے ان میں سے ایک کے قتل کا حکم دیا اسے قتل کر دیا گیا اور دوسرے کو معاف کرنے کا حکم دیا اسے چھوڑ دیا گیا۔ گویا اس کے نزدیک زندگی اور موت کا یہی مفہوم تھا۔ اس طرح اس نے حضرت ابراہیم کے سوال کا حقیقی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنے عناد اور تکبر کی وجہ سے لوگوں کو دھوکہ اور فریب دینا چاہا کہ وہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ صورت حال دیکھی۔ تو فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ: یعنی جب تم یہ زندہ کرنے اور مارنے کا دعویٰ کرتے ہو تو جو اس پر قدرت رکھتا ہے وہ تمام مخلوق میں بھی تصرف کر سکتا ہے۔ اس کے سامنے تمام سیارے اور ان کی حرکات مسخر ہیں۔ اگر تم اِلٰہ ہونے کے مدعی ہو زندگی اور موت عطا کرنے کے دعویدار ہو تو اس سورج کو جو ہر روز مشرق سے نکلتا ہے تم اسے مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ جب نمرود نے یہ سنا تو جواب دینے سے عاجز آ گیا۔ زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ کی حجت اس پر قائم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ظالموں کو ہدایت نہیں عطا فرماتا۔ یعنی ان کو حجت اور دلیل الہام نہیں کرتا بلکہ ان کی حجت اس کے سامنے باطل ہو جاتی ہے اور ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ بعض منطقی فرماتے ہیں کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے ایک دلیل پیش کی پھر اس سے اعراض کر کے ایک دوسری دلیل پیش کی جو پہلی دلیل سے زیادہ واضح تھی۔ لیکن ان کی یہ بات صحیح نہیں۔ کیونکہ پہلی دلیل درحقیقت دوسری دلیل کا مقدمہ تھا۔ ان دونوں دلیلوں سے نمرود کے دعویٰ کا بطلان واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت سدی فرماتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ مناظرہ آگ کے واقعہ کے بعد کا ہے۔ اس سے پہلے آپ کی اس ظالم بادشاہ کے ساتھ ملاقات نہیں ہوئی۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ قحط سالی کا زمانہ تھا۔ نمرود کے پاس اناج کا بہت سا ذخیرہ تھا۔ لوگ اس کے پاس اناج کے لیے جاتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان کے ساتھ گئے۔ بادشاہ نمرود کے ساتھ یہ مناظرہ ہو گیا۔ اس نے اناج دینے سے انکار کر دیا۔ آپ خالی ہاتھ واپس آ رہے تھے۔ جب گھر کے قریب پہنچے اپنی سواری سے بوریاں اتار کر جلد ہی سو گئے ان کی اہلیہ حضرت سارہ نے ان بوریوں کو کھولا تو انہوں نے ان کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ آپ نے پوچھا یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آ گیا۔ انہوں نے عرض یہ تو وہی اناج ہے جو آپ لے کر آئے ہیں اس سے آپ سمجھ گئے یہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ رزق ہے۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس ظالم بادشاہ کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔ جس نے اسے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس نے دوبارہ دعوت دی اس نے انکار کر دیا۔ تیسری بار انکار

کرنے پر فرشتہ نے کہا، تم اپنا لشکر تیار کرلو۔ میں بھی اپنا لشکر تیار کرتا ہوں۔ نمرود نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا اور سورج کے نکلنے سے پہلے ہی لڑائی کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے مچھروں کا ایک لشکر اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی کثرت کی وجہ سے سورج کی روشنی چھپ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے اس لشکر نے نمرود کی فوج پر حملہ کر دیا۔ اور اس کا گوشت پوست کھا کر انہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا۔ انہی مچھروں میں سے ایک مچھر نمرود کی ناک میں گھس گیا اور چار سو سال تک اس کے دماغ کو چاٹتا رہا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے سخت عذاب میں مبتلا کیا۔ اس کے سر پر کوڑے مارے جاتے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے سے مچھر کے ذریعہ اس ظالم بادشاہ کو ہلاک کر دیا۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر درآں حالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک پھر زندہ کیا اسے۔ فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا اس نے عرض کی میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ اللہ نے فرمایا نہیں، بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان) کی طرف یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لیے کہ ہم بنائیں تجھے نشان لوگوں کے لیے اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت۔ پھر جب حقیقت روشن ہوگئی اس کے لیے (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ: اس واقعہ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذکورہ بالا واقعہ پر عطف ہے۔ اب تک اس بارے میں اختلاف ہے کہ گزرنے والا شخص کون تھا؟ حضرت علی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عزیز علیہ السلام تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور کئی دوسرے مفسرین سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت وہب بن منبہ اور عبداللہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ یہ ارمیا بن حلقیار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام کا نام ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ وہ حزقیل بن بوار تھے۔ اور اس قریہ سے مراد بیت المقدس ہے۔ یہ اس وقت اس کے پاس سے گزرے جب بخت نصر نے وہاں کے باشندوں کو قتل کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ''خَاوِیَةٌ'' کا معنی ہے کہ یہ شہر بالکل خالی تھا۔

عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ: یعنی مکانوں کی چھتیں اور دیواریں گری ہوئی تھیں۔ وہ بزرگ اس عظیم الشان شہر کی تباہی کو دیکھ کر سوچنے لگے کہ اللہ اسے اس کے ہلاک ہونے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا۔ یعنی جب انہوں نے اس شہر کی تباہی و بربادی اور اس کی خستہ حالت دیکھی تو اس وقت یہ فرمایا۔

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں سو سال تک مردہ رکھا پھر انہیں زندہ کیا۔ ان کے مرنے کے ستر سال بعد یہ شہر آباد ہو

گیا اور بنو اسرائیل جو بخت نصر سے ڈر کر بھاگ گئے تھے واپس آ گئے جب اللہ تعالیٰ ان کو زندہ کیا تو سب سے پہلے ان کی آنکھوں کو زندگی عطا فرمائی تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کاریگری کا نظارہ کریں کہ وہ ان کے بدن کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے بدن میں مکمل روح ڈال دی تو فرشتہ کے ذریعہ پوچھا تو کتنا عرصہ تک مردہ رہا۔ انہوں نے کہا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان پر موت طاری کی تھی وہ سورج کے طلوع ہونے کا وقت تھا۔ اور دن کے آخری حصہ میں زندہ کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تو انہوں نے یہ گمان کیا کہ یہ اسی دن کا سورج ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں بلکہ تم ایک سو سال تک مردہ رہے ہو۔ اپنے کھانے اور پینے کے سامان کی طرف دیکھو یہ باسی نہیں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان پر موت طاری کی گئی اس وقت ان کے پاس انگور، انجیر اور انگوروں کا جوس تھا۔ لیکن سو سال گزرنے کے بعد ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ نہ تو جوس کا رنگ تبدیل ہوا اور نہ ہی انجیر کھٹی اور بدبودار ہوئی اور نہ ہی انگور خراب ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اپنے گدھے کی طرف دیکھو اسے اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے کیسے زندہ کرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کیا تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی اور علامت بنا دیں۔ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر ایک دلیل قائم ہو جائے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے گدھے کی ہڈیاں ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔ حاکم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے "نُنْشِزُهَا" کو زا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسے "نُنْشِرُهَا" را کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی ہم اسے زندہ کریں گے۔ حضرت سدی اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ان کے گدھے کی ہڈیاں ان کے اردگرد بکھری پڑی تھیں۔ اور بوسیدہ ہونے کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا کو بھیجا جس نے ان تمام ہڈیوں کو جمع کیا اور پھر ان ہڈیوں کو جوڑ کر گدھے کا ایک ڈھانچہ بنا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر گوشت پوست اور جلد چڑھا دی اور ایک فرشتہ بھیجا جس نے گدھے کے ناک میں پھونک ماری وہ ہینگنے لگا۔ یہ سب کچھ حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوا۔ اس وقت ان پر یہ چیز واضح ہوئی کہنے لگے میں جان گیا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اس لیے میں لوگوں سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔ بعض نے اس اَعْلَمُ کو اِعْلَمْ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾

"اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار! دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو فرمایا (اے ابراہیم) کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے عرض کی ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لیے ہے) تا کہ مطمئن ہو جائے میرا دل فرمایا تو پکڑ لے چار پرندے پھر مانوس کر لے انہیں اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے"۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ: علمائے کرام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کرنے کے مختلف اسباب بیان فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ نے یہی دلیل نمرود کے سامنے پیش کی تھی۔ اس لیے آپ نے چاہا کہ آپ کو علم یقین سے عین الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے اور آپ اس کا مشاہدہ فرمالیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی نسبت شک کے زیادہ حقدار ہیں۔ جب انہوں نے کہا تھا: رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی .... یہاں بلا اختلاف شک کا عام معنی مراد نہیں ہے۔ اس لیے کسی جاہل کو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے رب کی قدرت احیاء میں شک تھا۔ علماء کرام نے اس حدیث کی مختلف تاویلات بیان کی ہیں (1)۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ: مفسرین کرام کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ چار پرندے کون سے تھے۔ لیکن انہیں متعین کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اگر اس میں کوئی فائدہ ہوتا تو قرآن خود بیان کر دیتا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ چار پرندے سارس، مور، مرغ، اور کبوتر تھے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مرغابی، شترمرغ کا بچہ، مرغ اور مور تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ یہ کبوتر، مرغ، مور اور کوا تھے۔

فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ: یعنی ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ یہ حضرت حضرت عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر اور دوسرے مفسرین سے مروی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس سے دوسری روایت کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو مضبوطی سے باندھ دو۔ یعنی پہلے ان کو پکڑ کر باندھ دو پھر انہیں ذبح کر کے ہر پہاڑ پر ان کے ٹکڑے پھیلا دو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندے پکڑے، ان کو ذبح کیا، پھر ان کے پروں کو اکھیڑ کر ان کے گوشت کے ٹکڑے کر دیے اور ان کے گوشت کو آپس میں ملا دیا۔ پھر اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہر پہاڑ پر ایک حصہ رکھ دیا۔ بعض نے کہا چار پہاڑوں پر رکھے اور بعض کے نزدیک سات پہاڑوں پر۔ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان پرندوں کے سر پاس رکھ لیے تھے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان پرندوں کو بلایا تو ان کے سامنے پر ایک دوسرے کی طرف اڑنے لگے اس طرح گوشت کے ٹکڑے اور اجزاء بھی اڑتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہر ایک پرندہ زندہ ہو کر الگ الگ کھڑا ہو گیا اور اڑتے ہوئے آپ کی خدمت میں پہنچے۔ ہر پرندہ اپنا سر لینے کے لیے آپ کے پاس آیا۔ جب آپ اس کے سامنے دوسرے پرندے کا سر کرتے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا اور جب آپ اس کا اپنا سر اس کی طرف بڑھاتے تو اللہ کے حکم سے اس کا سر اس کے ساتھ جڑ جاتا۔

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ: یعنی وہ ہر چیز پر غالب ہے اس کی قوت کے سامنے کوئی چیز غالب نہیں ہو سکتی۔ وہ جو چاہے وہی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ اس کے اقوال و افعال اور اس کے شرعی احکام بڑی حکمت والے ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس (وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ) کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ میرے نزدیک تمام قرآن میں زیادہ امید افزا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اتفاقاً حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ملاقات ہو گئی۔ ہم اس وقت نوجوان تھے حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک قرآن پاک کی کون سی آیت امید افزا ہے۔ انہوں نے فرمایا یہ آیت کریمہ: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ (زمر: 53)'' ترجمہ: آپ فرمائیے اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر، مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو''۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ آپ تو یہ فرماتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ آیت کریمہ اس امت کے لیے اس سے بھی زیادہ امید افزا ہے۔ اسے ابن جریر نے روایت کیا ہے۔ اور اس قسم کی ایک روایت حاکم اور ابن ابی حاتم نے بھی ذکر کی ہے۔

1۔ فتح الباری، کتاب التفسیر 201/8

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

''مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو اگاتا ہے سات بالیں (اور) ہر بال میں سو دانہ ہو اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے۔''

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر کیا ہے جو شخص اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا ثواب عطا فرماتا ہے۔ بلکہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر سات سو گنا عطا فرما دیتا ہے۔ حضرت مکحول فرماتے ہیں یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھوڑے پالنے اور اسلحہ خریدنے کے لیے خرچ کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ جہاد اور حج میں خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ ایک درہم کا ثواب سات سو گنا تک عطا فرماتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ: یہ مثال انتہائی بلیغ اور دل میں اتر جانے والی ہے۔ اور صراحۃً سات سو گنا ذکر کرنے سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اعمال اس طرح بڑھاتا ہے جس طرح زرخیز زمین میں کھیتی بڑھتی ہے۔ حدیث پاک میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ ایک نیکی کا ثواب سات سو گنا ہے۔ حضرت عیاض بن غطیف فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابوعبیدہ کی عیادت کے لیے ان کے گھر حاضر ہوئے۔ ان کی زوجہ محترمہ ان کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں ہم نے پوچھا ان کی رات کیسی گزری۔ انہوں نے فرمایا بڑی سختی سے۔ یہ سن کر حضرت ابوعبیدہ فرمانے لگے میری رات سختی سے نہیں گزری۔ آپ نے پہلے اپنا منہ دیوار کی طرف کیا ہوا تھا۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے۔ جو شخص اپنی بچی ہوئی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے اسے سات سو گنا ثواب ملتا ہے۔ اور جو شخص اپنی ذات پر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے یا کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو اسے ایک کے بدلہ میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔ روزہ ڈھال ہے جب تک روزہ دار اسے خراب نہ کرے۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی جسمانی آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے(1)۔ اس روایت کو امام نسائی نے باب الصوم میں روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اللہ کی راہ میں نکیل والی اونٹنی خیرات کی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس شخص کو قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں ملیں گی(2)۔ اس کو امام مسلم نے بھی کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ابن آدم کو ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے سات سو گنا تک اجر عطا فرماتا ہے سوائے روزہ کے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں خود ہی دوں گا۔ روزہ دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک افطار کے وقت، دوسری قیامت کے دن۔ اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اور آخر میں یہ الفاظ ہیں روزہ ڈھال ہے، ڈھال ہے۔ حضرت حریم بن وائل سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے اسے سات سو گنا ثواب ملتا ہے۔ سہل بن معاذ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ مسند امام احمد، 195/1 2۔ مسند امام احمد، 121/4

ارشاد فرمایا نماز، روزہ اور شکر کا ثواب اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے سات سو گنا ثواب سے بھی زیادہ ہے (1)۔ حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے خرچ کرے اور خود گھر میں بیٹھا رہے تو اسے قیامت کے دن ہر درہم کے بدلہ سات سو درہم ملیں گے اور جو شخص جہاد فی سبیل اللہ میں خود شریک ہو کر مال خرچ کرے اسے ہر درہم کے بدلہ میں سات لاکھ درہم کا ثواب ملے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ یہ حدیث غریب ہے اور آیت کریمہ: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کی تفسیر کے تحت حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث گزر چکی ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دو کروڑ نیکیوں تک ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ: مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی اے پروردگار! میری امت کو مزید عطا فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً (بقرہ:245) ''کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لیے کئی گنا''۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے عرض کی اے باری تعالیٰ! میری امت کو مزید عطا فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (الزمر:10) ''صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا''۔ اس روایت کو ابن مردویہ، ابو حاتم اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ: اللہ تعالیٰ وسیع فضل و کرم کا مالک ہے اور وہ مستحق اور غیر مستحق کو خوب جانتا ہے۔ (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ)

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں انہیں کے لیے ثواب ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اچھی بات کرنا اور (غلطی) معاف کر دینا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے بڑے حلم والا ہے۔ اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر اس آدمی کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور روز قیامت پر اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر مٹی پڑی ہو پھر برسے اس پر زور کی بارش اور چھوڑ جائے اسے چٹیل صاف پتھر۔ (ریاکار) حاصل نہ کر سکیں گے کچھ بھی اس سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفر اختیار کرنے والوں کو''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد 3/8

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کی تعریف فرماتا ہے جو اس کی راہ میں صدقہ وخیرات کرتے ہیں اور لینے والے پر کسی قسم کا احسان نہیں جتاتے۔ یعنی اپنے کسی قول وفعل سے احسان جتلا کر انہیں تکلیف نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجر عظیم عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: یعنی ان کا اجر وثواب اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اس کے سوا کسی پر لازم نہیں۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ: یعنی زمانہ مستقبل میں قیامت کی ہولناکی کا انہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: انہیں اپنی اس اولاد کا غم نہ ہوگا جو وہ پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ نیز دنیا کی رنگارنگی چھوڑنے پر انہیں کوئی غم نہ ہوگا۔ کیونکہ انہیں اس سے کئی درجہ بہتر اجر مل جائے گا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ: اس سے مراد کلمہ طیبہ اور کسی مسلمان بھائی کے لئے دعا کرنا ہے۔ اور کسی کے قولی یا فعلی جرم کو معاف کرنا ہے۔ یہ اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے۔ حضرت عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اچھی بات سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی صدقہ نہیں۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا: ''قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ''۔

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ: یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے مستغنی اور انتہائی بردبار ہے۔ اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے اور ان کی خطاؤں سے درگزر فرماتا ہے۔ حضرت ابوذر روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تین قسم کے لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن گفتگو نہیں فرمائے گا۔ (1) کسی کو دے کر احسان جتانے والا۔ (2) تہبند کو ٹخنوں سے نیچے رکھنے والا (3) جھوٹی قسم کے ساتھ اپنا سودا بیچنے والا۔ حضرت ابو داؤد روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا، صدقہ کر کے احسان جتانے والا، کثرت سے شراب پینے والا، تقدیر کو جھٹلانے والا، جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین اشخاص پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر کرم نہیں فرمائے گا۔ (1) والدین کا نافرمان، (2) شراب کا رسیا، (3) صدقہ کر کے احسان جتلانے والا[1]۔ انہی الفاظ میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا: یعنی اے ایمان والو! صدقہ وخیرات کرنے کے بعد احسان جتلا کر اور اذیت دے کر اپنے صدقات کو باطل نہ کرو۔ احسان جتلانے سے اور اذیت پہنچانے کے گناہ سے صدقہ کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ: یعنی جس طرح احسان اور اذیت سے صدقہ وخیرات کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے اسی طرح صدقہ و خیرات میں ریاکاری سے بھی ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے لیکن حقیقت میں لوگوں کی تعریف وتوصیف اور اچھی صفات کے ساتھ مشہور ہونے کا خواہاں ہو۔ تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں اور کہیں کہ یہ بڑا سخی اور کریم ہے۔ جو شخص اس قسم کے گھٹیا دنیاوی مقاصد کے لئے صدقہ وخیرات کرتا ہے وہ اللہ کی رضا اور خوشنودی اور اس کے ثواب واجر اور جزاء کو مدنظر نہیں رکھتا تو اسے کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: یعنی یہ صدقہ کر کے احسان جتانے والا اور ریاکار درحقیقت اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس ریاکار کے بارے میں مثال دے کر وضاحت فرمائی ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس میں وہ شخص بھی شامل ہے جو

1۔ مستدرک 146/4

صدقہ کر کے احسان جتاتا ہے۔ارشادفرمایا:

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ: یہ صَفْوَانَۃٌ کی جمع ہے۔بعض کہتے ہیں کہ یہ مفرد ہے۔اوراس سے مرادوہ صاف چٹان ہے جس پر کوئی مٹی پڑی ہو۔جب اس پر کوئی شدت کی بارش برسے تو بارش اسے بالکل صاف کر دیتی ہے۔یعنی اس پر جو تھوڑی بہت مٹی ہوتی ہے وہ بھی بارش کی وجہ سے ڈھل جاتی ہے اور صاف ہو جاتی ہے۔اسی طرح ان ریا کاروں کے اعمال کی اللہ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔ اگر چہ بظاہر لوگ سمجھتے ہوں گے کہ یہ لوگ بڑے نیک ہیں۔اس طرح ریا کاری سے ان کے اعمال کا صفایا ہو جاتا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ: ''(ریاکار) حاصل نہ کرسکیں گے کچھ بھی اس سے جوانہوں نے کمایااوراللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفراختیارکرنے والوں کو۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

''اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لیے اوراس لیے تاکہ پختہ ہو جائیں ان کے دل ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو برسا ہو اس پر زور کا مینہ تو لایا ہو وہ باغ دوگنا پھل اوراگر نہ برسے اس پر بارش تو شبنم ہی کافی ہو جائے اوراللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے۔''

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ: یہاں ان مؤمنین کی مثال بیان کی گئی ہے جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔انہیں یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین جزاء عطا فرمائے گا۔جیسا کہ حدیث پاک میں ہے جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے روزے رکھے وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔شعبی فرماتے ہیں ''تَثْبِيْتًا'' کامعنیٰ یقین اور تصدیق ہے۔مجاہد اور حسن بصری فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ صدقہ ادا کرنے سے پہلے تحقیق کر لیتے ہیں۔

كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ: یعنی ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو بلند زمین پر ہو۔جمہور علماء کے نزدیک ''رَبْوَةٍ'' کامعنی بلند زمین ہے۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد وہ بلند زمین ہے جس میں نہریں جاری ہیں۔

لفظ ربوۃ کو تین طرح پڑھا گیا ہے۔(1) رَبوۃ (2) رِبوۃ (3) رُبوۃ۔

اَصَابَهَا وَابِلٌ: یعنی اس باغ پر شدید بارش برسی تو اس کا پھل دوگنا ہو گیا۔یعنی دوسرے باغوں کی نسبت اس کا دوگنا زیادہ ہو گیا۔اور اگر اس پر بارش نہ برسے تو اس کے لیے ہلکی پھلکی شبنم ہی کافی ہو جاتی ہے۔یعنی یہ کسی حالت میں بھی ویران اور بنجر نہیں ہوتا۔اسی طرح مومن کا عمل بھی کبھی ضائع نہیں ہوتا۔بلکہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازتا ہے۔اور عامل کو اس کے عمل کے مطابق بلکہ اس سے بڑھ کر اسے جزا دیتا ہے۔اس لیے ارشاد فرمایا:

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: اوراللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے۔کس کا کوئی عمل اس سے مخفی نہیں۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

''کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے ندیاں (کھجور و انگور کے علاوہ) اس کے لیے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں اور آلیا ہو اسے بڑھاپے نے اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس کے باغ کو بگولہ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے۔ ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو''۔

اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ: حضرت عبید بن عمیر فرماتے ہیں کہ ایک دن امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب نے صحابہ کرام سے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ آیت کریمہ کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ انہوں نے جواب دیا اللہ بہتر جانتا ہے۔ آپ ناراض ہو گئے اور فرمایا سیدھی بات کرو تم اس کے بارے میں جانتے ہو یا نہیں اس پر حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا اے امیر المومنین! میرے دل میں اس کے بارے میں کچھ بات ہے۔ آپ نے فرمایا اے بھتیجے! جو دل میں بات ہے وہ کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھو۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ اس آیت کریمہ میں کسی عمل کے بارے میں مثال بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ کیسے؟ انہوں نے جواب دیا یہ ایک دولت مند آدمی کے عمل کی مثال ہے۔ جو اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے عمل کرتا ہے پھر شیطان اسے بہکا دیتا ہے وہ معاصی کا ارتکاب کر کے اپنے پہلے اعمال کو بھی برباد کر لیتا ہے (1)۔ اس حدیث پاک میں آیت کریمہ کی مکمل تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص پہلے نیک عمل کرتا ہے۔ پھر اس کی حالت تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ نیکی کو چھوڑ کر برائی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے پہلے نیک عمل کو بھی برباد کر لیتا ہے۔ اور اپنے آخری وقت میں جب کہ انسان کو نیکیوں کو بہت ضرورت ہوتی ہے۔ نیکیوں سے تہی دامن ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ: اور آلیا ہو اسے بڑھاپے نے اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو۔ کیا یہ پسند کرتا ہے کہ پہنچے اس باغ کو بگولہ، اس میں آگ ہو اور وہ باغ جل جائے۔ یعنی اس کا پھل جل جائے اور درخت تباہ و برباد ہو جائیں۔ تو ایسی صورت میں اس شخص کی کیا حالت ہو گی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ایک بہترین مثال بیان کی ہے اور اس کی تمام مثالیں ہی بہترین ہیں۔ یہاں بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس باغ اور جاگیر ہو جس میں طرح طرح کے پھل اور پھول ہوں۔ نہریں رواں دواں ہوں اور جب وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کی اولاد چھوٹی یا کمزور ہو تو اس آخر عمر میں اگر یہ باغ جل جائے تو اب نہ تو خود اس کے پاس قوت ہے کہ وہ اسے دوبارہ کاشت کر سکے اور نہ ہی اس کی اولاد اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے یہی حال قیامت کے دن کافر کا ہو گا۔ جب اسے اللہ تعالیٰ کے پاس پیش کیا جائے گا اب نہ اس کے پاس کوئی نیک عمل ہے جس کے ذریعہ اپنے رب کو راضی کر سکے جیسے اس بوڑھے کے پاس کوئی قوت نہ تھی جس سے وہ دوبارہ باغ کاشت کر سکتا۔ اور نہ ہی اس نے آگے کوئی نیک عمل بھیجا تھا جو اس کے کام آسکے۔ جیسا کہ اس بوڑھے کی اولاد نے اسے کوئی فائدہ نہیں دیا۔ یہ کافر اپنے اجر سے اس وقت محروم ہو گیا جب اسے شدید ضرورت تھی جیسا کہ وہ بوڑھا اپنے بڑھاپے میں باغ سے محروم ہو گیا جب کہ اسے سخت ضرورت تھی۔ حاکم اپنی مستدرک میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا

1۔ فتح الباری، کتاب التفسیر: 201/8

فرمایا کرتے تھے۔(اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ اِلَیَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّیْ وَانْقِضَاءِ عُمُرِیْ) ''ترجمہ: اے باری تعالیٰ! بڑھاپے اور آخری عمر میں اپنے رزق کو مجھ پر وسیع فرمادے۔'' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ: ایسے ہی اللہ تعالیٰ کھول کر بیان کرتا ہے تمہارے لیے اپنی آیات تاکہ تم غور وفکر کرو۔ یعنی ان مثالوں کو سمجھو اور ان کے معانی کو کما حقہ سمجھ کر اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرو۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (العنکبوت 44) (اور یہ مثالیں ہیں ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور نہیں سمجھتے مگر اہل علم)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۞ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۞ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۞

''اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لیے زمین سے اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو) تم نہ لو اسے بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں اور (خوب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔ شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل (و کرم) کا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا: یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی کمائی سے پاکیزہ اور عمدہ ترین مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کو صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں پاکیزہ کمائی سے مراد تجارت ہے جس کی راہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسان فرمادی۔ سدی فرماتے ہیں اس سے مراد سونا، چاندی، پھل اور وہ اجناس ہیں جو زمین ان کے لیے پیدا کرتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنا پاکیزہ ترین اور نفیس ترین مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ گھٹیا اور حقیر مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی قبول فرماتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ اپنی کمائی کی ردی چیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ حالانکہ اگر وہی چیز تمہیں دی جائے تو تم اسے نہ لو مگر چشم پوشی کرتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ تو اس چیز سے مستغنی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ چیز نہ دو جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ اس کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم حلال مال سے اعراض کر کے حرام مال کا قصد نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان جس طرح رزق تقسیم کیا ہے اسی طرح اخلاق بھی تقسیم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا دوستوں، دشمنوں سب کو دیتا ہے مگر دین اسے ہی عطا فرماتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اور جس کو

اللہ تعالیٰ نے دین عطا فرما دیا وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کوئی شخص اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل اور زبان مسلمان نہ ہو۔ اور نہ ہی وہ کامل مومن ہوسکتا ہے یہاں تک کہ اس کا پڑوسی اس کی اذیت سے محفوظ ہوجائے۔ صحابہ نے عرض کی اس سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا اس سے مراد دھوکہ اور ظلم ہے۔ پھر فرمایا جو شخص حرام طریقہ سے مال کماتا ہے اور پھر اسے خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہیں ڈالتا۔ اور اگر صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول نہیں کرتا۔ اور اگر یہ مال چھوڑ کر مر جائے تو یہ اس کے لیے توشہ جہنم بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ خبیث چیز خبیث کو نہیں مٹا سکتی۔ یہاں خبیث کے بارے میں دو قول بیان ہوئے۔ ایک ردی چیز، دوسرا حرام مال۔ یہاں پہلا معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ انصار کھجوروں کے موسم میں اپنے باغات سے عمدہ کھجوروں کے خوشے لاکر مسجد نبوی کے دو ستونوں کے درمیان رسی سے باندھ کر لٹکا دیتے۔ اصحاب صفہ اور مسکین مہاجرین ان کھجوروں کو استعمال کرتے۔ ایک انصاری نے ردی کھجوروں کا ایک خوشہ ان کھجوروں کے ساتھ لٹکا دیا تو اپنے خیال کے مطابق اسے جائز سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ اس کو ابن ابی حاتم نے کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یعنی معنی یہ ہے کہ اگر تم میں سے کسی کو اس قسم کا ہدیہ پیش کیا جائے تو تم بادل نخواستہ ہی لوگے۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں اس کے بعد ہم سے ہر شخص اپنے باغ کی بہترین کھجوریں اللہ کی راہ میں خیرات کے لیے لے کر آتا۔ اسے امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت سہل بن حنیف اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ردی اور ناقص کھجوریں خیرات کرنے سے منع فرمایا ہے لوگ ردی کھجوریں صدقہ وخیرات کردیتے تھے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مغفل فرماتے ہیں کہ مومن کی کمائی کبھی خبیث نہیں ہوتی مگر اسے چاہیے کہ ردی کھجوروں، کھوٹے دراہم اور بیکار چیزوں کو اللہ کی راہ میں صدقہ نہ کرے۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کی خدمت میں گوہ کا گوشت پیش کیا گیا۔ آپ نے نہ خود اسے تناول فرمایا اور نہ اس سے منع کیا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! اسے کسی مسکین کو نہ دے دیں۔ آپ نے فرمایا جس کو تم خود کھانا پسند نہیں کرتے مسکین کو مت دو۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں جب تمہارا کسی پر حق واجب ہوتو وہ تمہیں گھٹیا چیز دے تو تم اسے نہیں لوگے۔ مگر جب تمہیں اپنے حق کے ضائع ہونے کا خدشہ ہوتو پھر تم چشم پوشی کرتے ہوئے لے لوگے۔ حضرت ابن عباس اس کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ اگر تمہارا کسی پر کوئی حق لازم ہو اور وہ تمہارے پاس کوئی گھٹیا چیز لے کر آئے تو تم اپنی عمدہ چیز کے مقابلہ میں وہ چیز نہیں لوگے۔ جب تک کہ اس کی قیمت کم نہ کرلے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم میرے لیے اس چیز کو کیوں پسند کرتے ہو جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ میرا تم پر حق ہے کہ تم اپنا پاکیزہ اور نفیس ترین مال میری راہ میں صدقہ کرو۔ ابن جریر کی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے اس کے بعد یہ آیت پڑھی۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران:92)'' ہرگز نہ پاسکو گے تم کامل نیکی (کا رتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو''۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ: اللہ تعالیٰ تمہیں صدقہ وخیرات میں پاکیزہ مال خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ حالانکہ وہ اس سے مستغنی ہے۔ اور اس حکم دینے کا مقصد صرف یہی ہے کہ فقیر بھی غنی کے ساتھ برابر ہوجائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (آل عمران:92)'' ترجمہ: نہیں پہنچتے اللہ تعالیٰ کو ان کے گوشت اور نہ ان کے خون، البتہ پہنچتا ہے

1۔ تفسیر الطبری:83/3

اس کے حضور تک تقویٰ تمہاری طرف سے"۔یعنی وہ وحدہ لاشریک اپنی تمام مخلوق سے بے نیاز ہے اور تمام مخلوق اس کی محتاج ہے۔ وہ صاحب فضل عظیم ہے۔اس کے خزانے کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ جو بھی اپنا پاکیزہ مال اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے اسے جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ بلکہ وہ تو کئی گنا زیادہ عطا فرماتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔ اس کے تمام افعال، اقوال اور شرعی احکام قابل ستائش ہیں۔ اس کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور نہ ہی اس کے سوا کوئی پروردگار ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ: حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابن آدم کے ساتھ شیطان کی سنگت بھی ہوتی ہے اور فرشتے کی بھی۔ شیطان کی سنگت یہ ہے کہ وہ اسے برائی پر آمادہ کرتا ہے اور حق کو جھٹلانے پر اکساتا ہے۔ اور فرشتے کی سنگت یہ ہے کہ وہ اسے نیکی پر آمادہ کرتا ہے اور حق کی تصدیق پر برانگیختہ کرتا ہے۔ اور جس کو یہ نصیب ہو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور جس کے حصہ میں شیطان کی سنگت آئے اسے شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ اس حدیث کو ابن ابی حاتم، ابن حبان اور ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے تاکہ تم اپنا مال اپنے پاس جمع رکھو اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی میں اسے خرچ نہ کرو اور اس کے ساتھ ساتھ تمہیں اللہ کی نافرمانی، گناہوں کے ارتکاب، حرام خوری، اور مخالفت حق پر اکساتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری مغفرت کا مژدہ جانفزا سناتا ہے۔ اور بے حد وحساب رزق عطا کرنے کا وعدہ فرماتا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد قرآن حکیم کا علم اور معرفت ہے یعنی قرآن پاک کے ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، مقدم ومؤخر، حلال وحرام اور اس کی امثلہ کا فہم وادراک عطا فرمادیتا ہے۔ دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے قرآن کریم کی تفسیر میں بصیرت عطا فرمادیتا ہے حالانکہ اسے نیک وبد ہر قسم کے لوگ پڑھتے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں، کہ حکمت سے مراد اصابت رائے ہے۔ فرماتے ہیں اس سے مراد نبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد علم فقہ اور قرآن ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد خشیت الٰہی ہے کیونکہ خشیت الٰہی پر حکمت کی اساس اور بنیاد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی مرفوعاً روایت ہے کہ حکمت کی اساس اللہ کا خوف ہے (رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ)۔ حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد فہم وفراست ہے۔ ابو مالک فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عقل ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حکمت سے مراد دین کی سمجھ بوجھ اور وہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک انسان دنیا کے معاملات میں تو بہت عقلمند اور ہوشیار ہوتا ہے اس کے برعکس دنیاوی امور میں اتنا ہوشیار نہیں ہوتا لیکن وہ دینی امور میں صاحب بصیرت ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے جسے چاہے نواز دے جسے چاہے اس سے محروم رکھے۔ سدی کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد نبوت ہے۔ لیکن جمہور علماء کا قول ہی صحیح ہے کہ حکمت نبوت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ اس سے عام ہے۔ اور اس کا سب سے اعلیٰ ترین درجہ نبوت ورسالت ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی اتباع اور پیروی کرنے کی برکت سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے جس نے قرآن پاک حفظ کرلیا اس نے اپنے کندھوں کے درمیان نبوت کو محفوظ کرلیا۔ مگر وہ صاحب وحی نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صرف دو شخص قابل رشک ہیں۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے وافر مال عطا فرمایا ہو اور اسے راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عطا کی ہو۔

اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی ہو وہ اس کے ذریعہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہو اور دوسروں کو بھی اس کا درس دیتا ہو(1)۔اس حدیث کو بخاری، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی متعدد اسناد سے روایت کیا ہے۔

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ: وعظ و نصیحت سے عقل مند ہی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ صاحب عقل ہی اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے احکام کو سمجھ سکتا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۲۷۰ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۷۱

''اور جو تم خرچ کرتے ہو یا منّت مانتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور نہیں ہے ظالموں کے لیے کوئی مددگار اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لیے اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا تم سے تمہارے بعض گناہ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے''۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ تمام صدقہ و خیرات اور نذر ماننے والوں کو جانتا ہے۔ جو اس کی رضا، خوشنودی اور ثواب کے حصول کے لیے یہ افعال سرانجام دیتا ہے وہ اسے بہترین جزا سے نوازے گا اور جو اس کی اطاعت سے گریزاں رہتا ہے بلکہ اس کے حکم کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کے احکام کو جھٹلاتا ہے، اور اس کے ساتھ اس کے غیر کو عبادت میں شریک کرتا ہے تو اس کے لیے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے کوئی معاون و مددگار نہیں ہوگا جو ان کو عذاب الٰہی سے چھڑا سکے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ یعنی اگر تم اپنے صدقہ و خیرات کو ظاہر کرو تو یہ بھی اچھی بات ہے اور اگر ان کو پوشیدہ رکھو اور فقیروں کو عطا کرو تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ یہ حکم خداوندی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پوشیدہ طور پر صدقہ کرنا ظاہری صدقہ سے افضل ہے۔ کیونکہ یہ ریاء کے شائبہ سے خالی ہوتا ہے۔ ہاں اگر صدقہ و خیرات کو ظاہر کرنے میں کوئی مصلحت ہو جیسا کہ کوئی اس نیت سے صدقہ و خیرات کو ظاہر کرے کہ لوگ اسے دیکھ کر اس کار خیر میں شریک ہو جائیں اس حیثیت سے اس کو ظاہر کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بلند آواز سے قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا صدقہ کو ظاہر کرنے والے کی مثل ہے اور پست آواز سے تلاوت کرنے والا چھپا کر صدقہ کرنے والے کی مثل ہے۔ بہرحال اس کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقہ کو پوشیدہ رکھنا ہی افضل ہے۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سات افراد کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے گا جس دن اس سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔(1) عادل حکمران۔(2) اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جوانی گزارنے والا نوجوان۔(3) وہ دو آدمی جو اللہ کی محبت میں اکٹھے ہوں اور اس پر جدا ہوں۔(4) وہ شخص جو مسجد سے نکلے تو اس کا دل مسجد میں ہی لگا رہے۔ یہاں تک کہ وہ مسجد میں لوٹ آئے۔(5) وہ شخص جو تنہائی اور خلوت میں اللہ کا ذکر کرے اور اس دوران اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔(6) وہ شخص جو صاحب جاہ و مال اور حسن و جمال عورت برائی کی دعوت دے اور وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔(7) وہ آدمی جو پوشیدہ طور پر صدقہ کرے حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے

1۔ مسند امام احمد: 432/1

زمین کو پیدا کیا تو یہ حرکت کرنے لگی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کر کے ان کو زمین میں گاڑ دیا تو اس کی حرکت بند ہوگئی۔ فرشتے پہاڑوں کی تخلیق پر بڑے متعجب ہوئے اور عرض کی اے پروردگار! کیا تیری مخلوق میں پہاڑوں سے بھی کوئی سخت چیز ہے۔ فرمایا لوہا۔ عرض کی کیا تو نے لوہے سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز پیدا فرمائی ہے۔ فرمایا آگ۔ عرض کی اے پروردگار تو نے آگ سے بھی کوئی سخت چیز پیدا کی ہے۔ فرمایا پانی۔ عرض کی اس سے سخت، فرمایا ہوا۔ عرض کی اس سے سخت۔ فرمایا ہاں اس سے سخت وہ ابن آدم ہے جو اپنے دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے اور اسے بائیں ہاتھ سے چھپاتا ہے(1)۔ آیت الکرسی کی فضیلت میں حضرت ابوذر سے مروی یہ روایت ہم نقل کر چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ!) کون سا صدقہ افضل ہے۔ فرمایا پوشیدہ طور پر فقیر کو دے دینا یا قلیل المال کا اپنی ہمت سے بڑھ کر صدقہ کرنا۔ ایک اور روایت میں ارشاد فرمایا کہ پوشیدہ صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی تپش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ حضرت شعبی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب کہ حضرت عمر نے اپنا نصف مال حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے پوچھا اے عمر! اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ آئے ہو۔ عرض کی ان کے لیے میں نصف مال چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق اپنا کل مال لے آئے اور چپکے سے نبی پاک ﷺ کی خدمت میں لاکر رکھ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا اے ابوبکر! گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو۔ عرض کی اللہ اور اس کا رسول۔ یہ سن کر حضرت عمر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے اے ابوبکر! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں قسم بخدا: ہم جس نیکی میں بھی سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تو تم اس میں ہم سب سے آگے اور پہلے ہوتے ہو۔ یہ روایت کئی دوسری اسناد سے بھی مروی ہے۔ اس آیت کریمہ کا حکم عام ہے۔ یعنی ہر صدقہ مخفی کرنا افضل ہے۔ خواہ وہ صدقہ فرض ہو یا نفل۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ نفلی صدقہ کو پوشیدہ رکھنا ظاہر کرنے سے ستر گنا افضل ہے۔ اور واجب صدقہ کو علانیہ طور پر دینا پوشیدہ رکھنے سے پچیس گنا افضل ہے۔

وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ : یعنی اللہ تعالیٰ اس صدقہ کی برکت سے تمہارے بعض گناہوں کو معاف فرمادے گا۔ اور اس جزم کے ساتھ يُكَفِّرْ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس وقت یہ جواب شرط یعنی "فَنِعِمَّا هِيَ" کے محل پر معطوف ہوگا۔ جیسا کہ (فَاَصَّدَّقَ) کے بعد اَكُنْ اور اَكُوْنَ دونوں طرح پڑھا ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: اور اللہ تعالیٰ اس سے خبردار ہے جو تم کر رہے ہو یعنی اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ پس وہ ہر ایک کو اس کے عمل کی جزاء عطا فرمائے گا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا

1۔ مسند امام احمد، 3/124

وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

''نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو (اپنے) مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ کی رضا طلبی کے اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا (خیرات) ان فقیروں کے لیے ہے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لیے) چلنے پھرنے کی زمین میں خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔ (اے حبیب!) آپ پہچانتے ہیں انہیں ان کی صورت سے یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ تو ان کے لیے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ: حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام اپنے مشرکین رشتہ داروں پر خرچ کرنا ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے بارے میں آپ سے سوال کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور انہیں یہ رخصت دے دی گئی(1)۔ اسے ابو حذیفہ، ابن مبارک، ابو احمد زبیری اور ابو داؤد حضرمی نے بھی روایت کیا ہے۔ اور حضرت عبد اللہ بن عباس سے دوسری روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ صدقہ صرف مسلمان ہی کو دیا کرو حتیٰ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا ہر سائل کو عطا کرو خواہ اس کا کوئی دین ہو۔ آیت کریمہ: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (الممتحنہ:8) کی تفسیر کے تحت اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی حدیث بھی آئے گی۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ: اور جو کچھ تم اپنے مال سے خرچ کرو گے اس میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے۔ ایک دوسری جگہ یہی مفہوم اس طرح بیان فرمایا: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (حم سجدہ:46) ''جو نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے''۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ: حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مومن جب بھی خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ حضرت عطاء خراسانی فرماتے ہیں جب تو نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دے دیا تو تجھے اس کا ثواب مل جائے گا خواہ لینے والے کا عمل کیسا بھی ہو۔ یعنی صدقہ وخیرات کرنے والے نے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لیے صدقہ کیا تو اسے اللہ کی طرف سے ثواب مل جائے گا۔ خواہ مال کسی نیک کو دیا ہو یا بد کو۔ مستحق کو دیا ہو یا غیر مستحق کو۔ صدقہ کرنے والے کو اپنی نیت کا ثواب مل جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو کچھ تم اپنے مال سے خرچ کرو گے اس کا اجر تمہیں پورا عطا کیا جائے گا اور تم سے زیادتی نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص نے ارادہ کیا کہ وہ آج رات صدقہ وخیرات کرے گا۔ وہ رات کی تاریکی میں اپنی خیرات لے کر نکلا اور چپکے سے ایک عورت کو دے آیا۔ صبح ہوئی تو لوگ باتیں کرنے لگے کہ آج رات کوئی بدکار عورت کو خیرات دے گیا ہے۔ اس نے بات سنی تو خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر ارادہ کیا کہ آج رات پھر صدقہ کروں گا۔ اس رات اس نے کسی مالدار کو صدقہ دے دیا۔ لوگ صبح پھر باتیں کرنے لگے کہ آج کوئی مالدار کو صدقہ دے گیا۔ اس نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

1۔ تفسیر الطبری:94/3

ارادہ کیا کہ آج رات پھر صدقہ کرے گا۔ اس رات اس نے کسی چور کو خیرات دے دی۔ صبح پھر باتیں ہونے لگیں کہ آج رات کوئی چور کو خیرات دے گیا ہے اس شخص نے عرض کی اے باری تعالیٰ! میں تیری حمد وثناء بیان کرتا ہوں۔ بدکار عورت، مال دار اور چور پر صدقہ کرنے پر۔ اس پر ہاتف غیبی سے آواز آئی کہ تیرا یہ صدقہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو گیا ہے شاید وہ بدکار عورت تمہارے اس مال کی وجہ سے زنا سے باز آجائے۔ شاید اس مال دار کو عبرت حاصل ہو اور وہ بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگے۔ شاید وہ چور اس مال کی وجہ سے چوری کرنے سے باز آجائے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا: اس سے مراد وہ مہاجرین ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خاطر اپنے گھر بار کو چھوڑا اور مدینہ طیبہ میں ڈیرے ڈال دیے۔ ان کے پاس ذریعہ معاش نہیں ہے جو ان کو کفایت کر سکے۔ اور نہ ہی روزی کی تلاش میں سفر کر سکتے ہیں۔ (اَلضَّرْبُ فِي الْاَرْضِ) کا معنی سفر کرنا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ '' اور جب تم سفر کرو زمین میں تو نہیں تم پر کوئی حرج اگر تم قصر کرو نماز میں''۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ '' وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے، اور کچھ سفر کرتے ہوں گے زمین میں، تلاش کر رہے ہوں گے اللہ کے فضل (رزق حلال) کو، اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوں گے''۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ: ان کے حال سے ناواقف انہیں مالدار گمان کرتا کیونکہ وہ کسی سے سوال نہیں کرتے۔ یعنی جو شخص ان کے احوال سے ناواقف ہوتا ہے وہ ان کی ظاہری بود و باش اور گفتگو سے انہیں مال دار خیال کرتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ مسکین وہ نہیں جو در بدر پھرتا ہے کہیں سے اسے ایک کھجور مل جاتی ہے اور کہیں سے دو۔ کہیں سے ایک لقمہ اور کہیں سے دو۔ کہیں سے ایک وقت کا کھانا مل جاتا ہے اور کہیں سے دو وقت کا۔ بلکہ مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں ہوتا کہ وہ مستغنی ہو جائے اور نہ ہی اس کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ لوگ اسے دیکھ کر اس پر صدقہ کریں۔ اور نہ ہی وہ لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ اسے امام احمد نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ: اے حبیب! آپ نے انہیں ان کی صورت سے پہچانتے ہیں۔ اسی طرح ہر صاحب عقل و دانش بھی ان کی صفات سے ان کو پہچان سکتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ '' ان کی علامت ان کے چہروں پر ہے'' حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ '' مومن کی فراست سے بچو بلاشبہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے'' پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ '' بے شک اس واقعہ میں نشانیاں ہیں غور و فکر کرنے والوں کے لیے''۔

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ: یعنی یہ لوگ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے اور بلا ضرورت لوگوں کو تنگ بھی نہیں کرتے۔ وہ شخص جو اپنے پاس مال و دولت ہونے کے باوجود کسی سے مانگتا ہے وہ بھی لوگوں سے لپٹ کر سوال کرنے والا شمار ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا مسکین وہ نہیں جو ایک ایک دو دو اور ایک یا دو لقمے مانگتا پھرتا ہے۔ بلکہ مسکین وہ ہے جو ضرورت کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اگر چاہو تو قرآن پاک کی یہ آیت پڑھ لو: لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ (البقرۃ:273) اس حدیث کو امام مسلم، نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ اسی طرح اس کو ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بھی بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ قبیلہ مزینہ کی ایک عورت نے اپنے لڑکے سے کہا کہ تم جاؤ اور حضور ﷺ سے سوال کرو جیسا کہ دوسرے سوال کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اسی

نیت سے گھر سے نکلا۔ جب میں مسجد نبوی میں پہنچا تو دیکھا کہ حضور ﷺ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ جو شخص سوال کرنے سے بچتا ہے اللہ تعالیٰ اسے سوال کرنے سے بچا لیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ سے غناء طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے غنی کر دیتا ہے۔ جو شخص پانچ اوقیہ کی مقدار مال رکھنے کے باوجود سوال کرے تو وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال کرنے والا ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد سن کر میرے دل میں خیال آیا میرے پاس جو اونٹنی ہے وہ پانچ اوقیہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور اسی طرح ایک دوسری اونٹنی میرے غلام کے پاس ہے اس لیے میں نے آپ سے سوال نہ کیا اور واپس لوٹ آیا (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے اور ایک روایت میں یہ واقعہ ابوسعید خدری کے بارے میں مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ اسے غنی کر دے اور اس کے باوجود وہ سوال کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے چہرے پر اس کے باعث زخم ہوں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ کس قدر مال غناء ہے؟ آپ نے فرمایا پچاس درھم یا اس کی قیمت سونا (2)۔ اس حدیث کو اصحاب سنن نے بھی روایت کیا ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ شام میں ایک قریشی بزرگ رہتے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ حضرت ابوذر غفاری ضرورت مند ہیں۔ انہوں نے آپ کی خدمت میں تین سو اشرفیاں بھیجیں۔ آپ خفا ہو کر فرمانے لگے اس اللہ کے بندے کو مجھ سے زیادہ کوئی مسکین نظر نہیں آیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے جس شخص نے چالیس درہم ہونے کے باوجود سوال کیا وہ لپٹ کر سوال کرنے والا ہے۔ حالانکہ ابوذر کے گھر میں چالیس درھم، چالیس بکریاں اور دو غلام موجود ہیں اور ایک روایت میں یہ ارشاد ہے کہ جس نے چالیس درہم ہوتے ہوئے سوال کیا وہ اصرار کرنے والا ہے۔ وہ ریت پھانکنے والا ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ: اور جو کچھ تم اپنے مال سے خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اسے یقیناً جاننے والا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں اور قیامت کے دن جب انسان انتہائی ضرورت مند ہوگا تو وہ اس کا بہترین بدل اور جزاء عطا فرمائے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔ جو اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے اس کی راہ میں شب و روز خرچ کرتے ہیں۔ کبھی علانیہ اور کبھی خفیہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے تو اسے اس کا بھی اجر و ثواب ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع والے سال حضرت سعد بن ابی وقاص کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اس کے سبب اللہ تعالیٰ تمہارے درجات بلند فرمائے گا۔ حتیٰ کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے اس کا بھی تمہیں ثواب ملے گا۔ حضرت ابو مسعود نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص ثواب کی نیت سے اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔ ایک روایت میں اس آیت کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان مجاہدین کے بارے میں نازل ہوئی جو جہاد کے لیے گھوڑے پالتے ہے اور ان پر خرچ کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت جبیر فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس چار درہم تھے۔ آپ نے ایک درہم رات کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا ایک دن کو۔ ایک پوشیدہ طور پر خرچ کیا اور ایک علانیہ۔ تو آپ کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس کو ابن جریر نے بھی عبدالوہاب بن مجاہد سے روایت کیا ہے لیکن وہ ضعیف ہیں۔ اس کے علاوہ ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ: یعنی قیامت کے دن انہیں اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔

1۔ مسند امام احمد: 138/4 2۔ مسند امام احمد: 388/1

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

''جولوگ کھایا کرتے ہیں سود وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے چھو کر یہ حالت اس لیے ہوگی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے تو وہ (سود سے) رک گیا تو جائز ہے اس کے لیے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا: اولاً اللہ تعالیٰ نے اپنے ان نیک بندوں کا ذکر کیا جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ فقراء و مساکین پر صدقہ و خیرات بھی کرتے رہتے ہیں۔ اب اس کے بعد سود خوروں اور ان لوگوں کا ذکر ہے جو باطل طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی اس حالت کو بیان کیا ہے قیامت کے دن جو قبروں سے نکلتے وقت ہوگی۔ ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ یعنی قیامت کے دن وہ اپنی قبروں سے اس طرح نکلیں گے جس طرح مجنون، دیوانے، خبطی اور پاگل ڈگمگاتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں قیامت کے دن سود خور اپنی قبر سے اس طرح نکلے گا جس طرح مجنون جنون کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور ایک قرأت میں ''مِنَ الْمَسِّ'' کے بعد ''يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' کے الفاظ بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں قیامت کے دن سود خور کو کہا جائے گا کہ یہ ہتھیار لو اور اپنے رب کے ساتھ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ حضرت ابو سعد خدری معراج والی حدیث میں بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جن کے پیٹ بڑے بڑے کمروں کی مانند تھے۔ آپ نے ان کے بارے میں دریافت فرمایا۔ عرض کی گئی یہ سود خور ہیں۔ اس روایت کو بیہقی نے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا معراج کی رات میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے پیٹ بڑے بڑے کمروں کی مانند تھے اور ان میں سانپ چل رہے تھے۔ میں نے پوچھا جبرئیل! یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا یہ سود خور ہیں۔ ایک دوسری طویل روایت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم ایک نہر کے قریب پہنچے جس کا پانی خون کی طرح سرخ تھا۔ اس میں ایک شخص تیر رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک آدمی کھڑا تھا جس کے پاس بہت سے پتھر تھے۔ وہ تیرنے والا جب اس شخص کے پاس آتا تو اپنا منہ کھول دیتا تو وہ شخص ایک بڑا سا پتھر اس کے منہ میں ڈال دیتا۔ اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا وہ سود خور ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا: سود خوروں کو یہ سزا اس لئے دی جائے گی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے شرعی احکام پر اعتراض کیا اور وہ سود کو بیع کی مثل گمان کرتے تھے۔ یہ بات قابل توجہ ہے۔ کہ انہوں نے سود کو بیع پر قیاس نہیں کیا تھا کیونکہ وہ اصلاً اس بیع کے قائل ہی نہ تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ اگر وہ یہ قیاس کرتے تو یہ کہتے سود بیع کی مثل ہے لیکن انہوں نے اس

کے برعکس کہا کہ بیع سود کی مثل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو کیوں حرام قرار دے دیا اور بیع کو جائز قرار دے دیا۔ اسی طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام شریعت پر اعتراض کیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کے اعتراض کا جواب ہو کہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔ اس کے حکم کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ مخلوق میں سے کوئی اس سے سوال نہیں کرسکتا بلکہ مخلوق ہی اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ وہ تمام اشیاء کے حقائق اور اپنے بندوں کی مصالح سے آگاہ ہے۔ جس چیز میں اس کے بندوں کا فائدہ ہو اسے حلال کر دیتا ہے اور جس میں ان کا نقصان ہو ان کو اس سے روک دیتا ہے۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچے کے لیے شفیق اور مہربان ہوتی ہے اس طرح رب اس سے کہیں زیادہ اپنی مخلوق پر رحیم اور مہربان ہوتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: یعنی اس کو یہ پیغام پہنچے کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دے دیا ہے اور وہ اس حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اس سے باز آجائے تو اس کے لیے وہ سب کچھ جائز ہے جو اب تک کر چکا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ (1)۔ معاف فرما دیا اللہ تعالیٰ نے جو گزر چکا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا۔ زمانہ جاہلیت کے تمام سود میں نے اپنے ان دونوں قدموں کے نیچے روند ڈالے ہیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس کا سود ختم کرتا ہوں۔ اس طرح آپ نے وہ سود واپس کرنے کا حکم نہ فرمایا جو زمانہ جاہلیت میں وہ لے چکے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر اور سدی فرماتے ہیں کہ "فَلَهٗ مَا سَلَفَ" کا معنی یہ ہے کہ اس سود کی حرمت سے پہلے جو کچھ کوئی شخص لے چکا ہے وہ اسے معاف ہے۔ ان میں ام محبہ جو حضرت زید بن ارقم کی ام ولد تھیں۔ وہ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کیا آپ زید بن ارقم کو جانتی ہیں۔ فرمایا ہاں۔ کہنے لگیں میں نے ان کو اپنا غلام آٹھ سو میں بیچا تھا تو انہوں نے کہا جب ان کو امیر المومنین کی طرف سے وظیفہ ملے گا وہ ادا کر دیں گے۔ پھر انہیں وظیفہ ملنے سے پہلے ہی کچھ پیسوں کی ضرورت ہوئی تو میں نے یہ غلام ان سے چھ سو میں خرید لیا۔ اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا یہ تو نے برا کیا اور فرمایا کہ زید بن ارقمؓ کو میرا پیغام بھیج دو کہ اگر انہوں نے توبہ نہ کی تو ان کا وہ جہاد بھی اکارت ہو جائے گا جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا۔ میں نے کہا اگر میں انہیں دو سو چھوڑ دوں اس طرح کہ خریدوں آٹھ سو کا اور لوں صرف چھ سو۔ تو آپ نے فرمایا یہ ٹھیک ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ یہ روایت بہت مشہور ہے اور ان فقہاء کی دلیل ہے۔ جنہوں نے بیع عینہ حرام قرار دیا ہے۔ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن کو کتاب الاحکام میں نقل کیا جاتا ہے۔

فَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: یعنی جو شخص اللہ کا حکم پہنچنے کے باوجود سود لیتا رہے اور باز نہ آئے تو اس سزا کا مستحق ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ حضرت جابر روایت فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ: اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مخابرت کو نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ مخابرت سے مراد پیداوار کے بعض حصے پر زمین کو کرایہ پر لینا ہے۔ اسی طرح مزابنہ اور محاقلہ کو حضور ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔ مزابنہ سے مراد یہ ہے کوئی شخص یہ کہے کہ مجھ سے یہ گندم لے لو اور اس کے بدلہ میں مجھے وہ گندم دے دینا جو خوشوں میں ہے۔ ان چیزوں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو اس لیے حرام قرار دیا گیا ہے تاکہ سود کو جڑ سے ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ خشک ہونے سے پہلے ان دونوں چیزوں کے درمیان برابری نہیں ہوسکتی۔ اس لیے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ دو چیزوں کے درمیان برابری کی یہ حالت حقیقی طور پر زیادتی لینے کے مترادف ہے۔ بعض فقہاء کرام نے اسی علت کو مدنظر رکھتے ہوئے بیع

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع: 262/3

کی ان تمام صورتوں کو حرام قرار دیا ہے جو سودی کاروبار کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اور بعض فقہاء نے دوسری علت کی بناء پر ان کو حرام قرار دیا ہے۔ بہر حال ہر ایک نے اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس آیت میں غور و فکر کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (اور ہر صاحب علم سے بڑھ کر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے)۔ بہر حال سود شریعت کے مشکل ترین مسائل میں سے ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ارشاد فرمایا۔ تین ایسے مسئلے ہیں جو مجھے سمجھ نہیں آئے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے تسلی کر لیتا۔ (1) دادا کی میراث کا مسئلہ (2) کلالہ کا مسئلہ (3) سود کے بعض مسائل۔ یعنی بعض وہ مسائل جن میں سود کا شائبہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو چیز حرام کا وسیلہ اور سبب بنے وہ حرام ہوتی ہے۔ جس طرح کہ جس چیز کے بغیر واجب مکمل نہ ہو وہ بھی واجب ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت نعمان بن بشیر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: حلال واضح ہے، حرام بھی واضح ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں۔ جو شخص ان شبہات سے بچتا ہے وہ اپنے دین اور عزت کو محفوظ کر لیتا ہے اور جو ان شبہات میں پڑتا ہے وہ حرام میں پڑ جاتا ہے۔ اس چرواہے کی طرح جو کسی چراگاہ کے آس پاس بکریاں چراتا ہے تو ممکن ہے اس کی کوئی بکری اس چراگاہ میں منہ مارے(1)۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ حدیث نبوی ہے کہ جو چیز تمہیں شک میں ڈالے اسے چھوڑ دو اور اسے اختیار کرو جو شک وشبہ سے پاک ہو۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔ جس کے بارے میں تیرے دل میں تردد ہو اور تو اس کو ناپسند کرے کہ لوگ اس سے مطلع ہوں۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا اپنے دل سے فتویٰ لو اگرچہ لوگ تمہیں کچھ ہی فتویٰ دیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ پر آیت ربوا نازل ہوئی۔ حضرت عمر سے بھی یہی مروی ہے۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہم اِس مسئلہ کی ابھی پوری طرح تفصیلات سے آگاہ نہیں ہوئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ وصال فرما گئے۔ سود اور ہر وہ چیز جس میں شک وشبہ ہو اسے چھوڑ دو(2)۔ ایک دفعہ حضرت عمر نے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، ممکن ہے میں تمہیں ایسی چیزوں سے روکوں جن میں تمہاری کوئی مصلحت ہو۔ سود کی آیت کریمہ سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ اور رسول اللہ ﷺ اس کی مکمل وضاحت فرمانے سے پہلے وصال فرما گئے۔ اس لیے ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے لیے شک وشبہ کا باعث بنے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سود کے تہتر گناہ ہیں۔ ان میں سے سب سے ہلکا اور خفیف یہ ہے کہ انسان اپنی ماں سے بدکاری کرے اور سب سے بڑا اپنے مسلمان بھائی کی ہتک عزت کرنا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے جو روایت مروی ہے اس میں ستر گناہ کا ذکر ہے۔ اور ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا لوگوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ وہ سب سود کھائیں گے۔ عرض کی گئی کیا سب کے سب؟ فرمایا جو سود نہیں کھائے گا وہ اس کی گرد و غبار سے بچ نہیں سکے گا(3)۔ اسی وجہ سے ان تمام اسباب ووسائل کو بھی حرام قرار دیا جاتا ہے جو اسے حرام چیز کی طرف لے جانے والے ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سود کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو آپ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور ان آیات کی تلاوت فرمائی اور پھر شراب کی تجارت کو حرام قرار دے دیا۔ شارحین حدیث فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سود اور اس کے تمام اسباب ووسائل کو حرام قرار دیا تو شراب اور اس کے وسائل تجارت وغیرہ کو بھی حرام قرار دے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہود پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی کیونکہ ان پر چربی حرام کی گئی تھی۔ وہ چربی کو پگھلا کر اور بیچ اس کی قیمت کھانے لگے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سود کھانے والے اور اس کے گواہوں اور اس کی تحریر لکھنے والوں سب پر اللہ کی لعنت ہو۔ علماء فرماتے ہیں کہ سود کا کوئی گناہ بنتا

1۔ فتح الباری، کتاب الایمان: 126/1   2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات: 764   3۔ مسند امام احمد: 494/2

ہے اور نہ ہی اس کے لکھنے میں کوئی معاون بنتا ہے۔ کیونکہ جان بوجھ کر کوئی بھی اللہ کی لعنت میں گرفتار نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ سود خور اسے شرعی عقد ظاہر کرے تو اس وقت کوئی ظاہر حال دیکھ کر گواہ بن جائے یا اسے لکھ دے۔ بہر حال ظاہر کا اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ اعمال کا دارومدار تو نیتوں پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری ظاہری صورتوں اور اعمال کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔ علامہ ابوالعباس ابن تیمیہ نے ان حیلوں کے ابطال میں ایک کتاب تحریر کی ہے۔ جس میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيۡمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾

''مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ناشکرے گنہگار کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور کرتے رہے اچھے عمل، اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور دیتے رہے زکوٰۃ کو ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا: یہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ سود ختم کرتا ہے اور مٹاتا ہے۔ یعنی یا تو وہ سود خور کے ہاتھ سے اس کو کلیۃً ختم کر دیتا ہے یا اس کو اپنے مال کی برکت سے محروم کر دیتا ہے اس طرح وہ اپنے ہی مال سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ اس طرح اس دنیا میں بھی اس کی بربادی ہوتی ہے اور قیامت کے دن بھی اسے سزا ملے گی۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: قُلۡ لَّا يَسۡتَوِي الۡخَبِيۡثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوۡ اَعۡجَبَكَ كَثۡرَةُ الۡخَبِيۡثِ ۚ (مائدہ:100) ''ترجمہ: آپ فرما دیجئے نہیں برابر ہوسکتا ناپاک اور پاک۔ اگرچہ حیرت میں ڈال دے تجھے ناپاک کی کثرت''۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَيَجۡعَلَ الۡخَبِيۡثَ بَعۡضَهٗ عَلٰى بَعۡضٍ فَيَرۡكُمَهٗ جَمِيۡعًا فَيَجۡعَلَهٗ فِيۡ جَهَنَّمَ (انفال:37) ''اور رکھ دے سب ناپاکوں کو ایک دوسرے کے اوپر پھر اکٹھا کر دے ان سب کو پھر ڈال دے اس مجموعہ کو جہنم میں''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَمَاۤ اٰتَيۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّيَرۡبُوَا۠ فِيۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ (روم:39) ''اور جو روپیہ تم دیتے ہو بیاج پر تاکہ وہ بڑھتا رہے لوگوں کے مالوں میں (سن لو) اللہ کے نزدیک یہ نہیں بڑھتا''۔ اس مقام پر ابن جریر نے عبداللہ بن مسعود کی روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سود اگرچہ ظاہری طور پر بڑھتا نظر آتا ہے لیکن انجام کار کے لحاظ سے اس میں کمی ہوتی رہتی ہے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ باہر اناج کا ڈھیر دیکھا۔ آپ نے فرمایا یہ غلہ کہاں سے آیا ہے۔ لوگوں نے عرض کی یہ بیچنے کے لیے یہاں لایا گیا ہے آپ نے دعا کی اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈالے اور لانے والے کو بھی بابرکت کرے۔ پھر لوگوں نے بتایا کہ یہ تو مہنگا بیچنے کے لیے ذخیرہ کیا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا ذخیرہ اندوز کون ہے لوگوں نے بتایا ایک فروخ جو حضرت عثمانؓ کے غلام ہیں، دوسرے آپ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ آپ نے ان دونوں کو بلایا اور پوچھا تم نے مسلمانوں کے اناج کو کس لیے ذخیرہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے مال سے اناج خریدتے ہیں جب چاہیں خریدیں جب چاہیں بیچیں۔ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ آپ نے فرمایا جو شخص مسلمانوں کے مال ذخیرہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر افلاس کو مسلط کر دیتا ہے یا اسے کوڑھی بنا دیتا ہے۔ یہ سن کر فروخ نے کہا میں آج سے اللہ تعالیٰ اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد اس فعل کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ لیکن آپ کا آزاد کردہ غلام کہنے لگا ہم اسے اپنے

مال سے خریدتے ہیں۔ جب چاہیں اسے خریدیں اور بیچیں۔ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ میں نے اس غلام کو دیکھا تھا کہ وہ کوڑھی ہو گیا تھا۔ ابن ماجہ نے بھی اس کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے اناج کو ذخیرہ کرے اور مہنگے داموں بیچے تو اللہ تعالیٰ اس پر افلاس اور کوڑھ مسلط کر دیتا ہے۔

وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ : اور اللہ تعالیٰ خیرات بڑھاتا ہے۔ اسے يُرَبِّىْ بھی پڑھا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور صدقہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالیتا ہے۔ اور اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر اسے بڑھاتا ہے جیسا کہ تم اپنے بچھیرے کی پرورش کرتے ہو۔ حتیٰ کہ وہ کھجور کا دانہ ایک پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے(1)۔ امام بخاری نے اسے کئی اسناد سے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام مسلم نے اسے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام بیہقی، نسائی، ابن ابی حاتم، امام احمد ترمذی، ابن جریر وغیرہم نے کئی اسناد سے روایت کیا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک لقمہ صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالیتا ہے تو وہی لقمہ پہاڑ کی مثل بن جاتا ہے۔

وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ: یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں فرماتا جس کے دل میں کفر ہو اور جس کے قول اور فعل برے ہوں۔ اس آیت کریمہ کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کرنے میں حکمت اور مناسبت یہ ہے سود خور اس رزق حلال پر راضی نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں لکھ دیا ہے۔ اور نہ ہی وہ جائز طریقہ سے روزی کمانے پر اکتفا کرتا ہے۔ بلکہ وہ باطل اور خبیث طریقوں سے لوگوں کے مال کھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اوپر کی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا منکر ہوتا ہے۔ اپنی جان پر ظلم کرنے والا اور گنہگار ہوتا ہے۔ لوگوں کے مال باطل طریقہ سے کھاتا ہے۔ اس وجہ سے اس آیت کریمہ کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے ان مومن بندوں کی تعریف فرمائی ہے جو اس کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں اس کا شکریہ بجالاتے ہیں۔ اس کی مخلوق پر احسان کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد اس عزت اور شرف کا ذکر کیا ہے جو قیامت کے دن انہیں حاصل ہو گی۔ اور اس چیز کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ قیامت کے دن ہر قسم کی آزمائش اور مصیبت سے امن میں ہوں گے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے رہے اور نماز کو صحیح طریقہ پر ادا کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے انہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

”اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا

1۔ فتح الباری، کتاب الزکاۃ: 278/3

کر دنہ تم پر ظلم کیا جائے اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم جانتے ہو اور ڈرتے رہو اس دن سے لوٹائے جاؤ گے جس میں اللہ کی طرف پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے اور ان پر زیادتی نہ کی جائے گی''۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا: یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو تقویٰ اختیار کرنے اور اس چیز کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے جو اس کی ناراضگی کا باعث اور اس کی رضا و خوشنودی سے دور کرنے والی ہے۔ فرمایا: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اپنے تمام اعمال میں اس کے حکم کو پیش نظر رکھو۔ اس کے اس حکم کے بعد لوگوں سے سود لینا بند کر دو۔ صرف اپنا راس المال واپس لے لو۔ اگر تم حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے ہو۔ حضرت سدی اور دوسرے کئی مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ قبیلہ بنی عمرو بن عمیر جن کا تعلق بنو ثقیف سے تھا اور بنو مغیرہ جن کا تعلق بنو مخزوم سے تھا کے بارے میں نازل ہوئی۔ زمانہ جاہلیت میں ان قبیلوں کے دوران سودی کاروبار کا رواج تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد بنی عمرو نے بنو عمیر سے سود کا مطالبہ کیا تو بنو مغیرہ نے کہا کہ اب ہم مسلمان ہو چکے ہیں۔ اسلام کی کمائی سے ہم سود ادا نہیں کریں گے۔ اس طرح ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ حضرت عتاب بن اسید جو مکہ کے عامل تھے، نے یہ مقدمہ لکھ کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ لکھوا کر حضرت ابن اسید کو ارسال فرما دی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سن کر انہوں نے توبہ کی اور اپنا تمام سود چھوڑ دیا۔ اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو سود کی حرمت کو جاننے کے باوجود سود کھاتے رہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ: حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم نے سود لینا ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا یقین کر لو۔ اور ایک روایت میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن سود خور کو کہا جائے گا کہ اپنا ہتھیار سنبھالو اور اللہ تعالیٰ سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ حضرت علی بن ابی طلحہ عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص سود لینے سے باز نہ آئے تو حاکم وقت پر واجب ہے کہ اس سے توبہ کرائے اور پھر بھی باز نہ آئے تو اس کی گردن اڑا دے۔ حضرت حسن بصری اور ابن سیرین کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاکت کی دھمکی دی ہے اور یہ لوگ ذلیل و رسوا ہو کر رہیں گے اس لئے سودی لین دین سے بچو۔ اللہ تعالیٰ نے حلال کاروبار کو بہت وسعت عطا فرمائی ہے اور اسے پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس لئے فقر و فاقہ تمہیں اس کی معصیت اور نافرمانی پر تمہیں مجبور نہ کر دے۔ حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سود خور کو قتل کی دھمکی دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ نے حضرت زید بن ارقم کی لونڈی کو بیع عینہ کے مسئلہ میں فرمایا تھا کہ زید بن ارقمؓ کو بتا دو کہ اگر تم نے اس سے توبہ نہ کی تو نبی کریم ﷺ کی معیت میں کیا ہوا جہاد ضائع ہو جائے گا۔ یہاں سیدہ عائشہؓ نے خصوصاً جہاد کا ذکر کیا کیونکہ جہاد دشمنان خدا کے ساتھ جنگ کرنے کا نام ہے اور سود لینا خود خدا کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ اس مفہوم کو کئی مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ لیکن اس روایت کی سند میں کچھ ضعف ہے۔

فَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ: یعنی اگر تم سود سے توبہ کر دو گے تو تمہیں تمہارے اصل مال مل جائیں گے سود لے کر تم ظلم نہ کیا کرو اور تم پر بھی کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یعنی تمہارا راس المال ضائع نہیں ہوگا۔ بلکہ جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے اسے بغیر کسی کمی و بیشی کے لے سکتے ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا زمانہء جاہلیت کے تمام سود باطل کیے جاتے ہیں۔ تمہیں تمہارے اصل مال مل جائیں گے نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تم پر کوئی ظلم کیا جائے گا۔ سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا تمام سود باطل کرتا

ہوں۔ اسے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ: یہاں اللہ تعالیٰ نے قرض خواہوں کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے کہ اگر کوئی تنگ دست وقت پر قرضہ ادا نہ کر سکے تو تمہیں صبر کرنا چاہیے۔ زمانہء جاہلیت کے لوگوں کی طرح تمہیں سلوک نہیں کرنا چاہئے کہ وہ جب قرضہ لینے کا وقت آتا تو مقروض کو کہتے کہ قرضہ ادا کرو اور اگر قرضہ ادا نہ کر سکتا تو اس پر سود لگا دیتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے قرض خواہوں کو قرض معاف کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور اس پر اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اس قرض کو بخشنا تمہارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ حضرت اسعد بن زرارہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سایہ کے نیچے پناہ لینا پسند کرتا ہے اسے چاہیے کہ وہ تنگ دست کو مہلت دے یا بالکل معاف کر دے۔(1)

ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی تنگ دست کو مہلت دی جتنے دن مہلت دے گا اسے ان میں سے ہر دن صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ پھر فرمایا اسے ہر روز دگنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ بلکہ ایک روایت میں ارشاد فرمایا کہ قرضہ کی میعاد پوری ہونے سے پہلے بھی اسے اتنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا جتنی اس نے مقروض سے لینی ہو۔ پھر جب قرضہ ادا کرنے کا وقت آئے گا تو اب وہ اس تنگ دست کو مہلت دے گا تو اسے ہر روز دوگنا صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا(2)۔ حضرت محمد بن کعب قرظی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوقتادہؓ کا ایک شخص کے ذمہ کچھ قرض تھا۔ جب وہ ادائیگی کے لیے جاتے تو وہ چھپ جاتا۔ ایک دن آپ اس کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بچہ باہر نکلا تو بچے نے بتایا کہ وہ اندر کھانا کھا رہے ہیں۔ حضرت قتادہؓ نے آواز دی کہ باہر نکلو آج ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ تم گھر میں ہو۔ وہ باہر آیا۔ آپ نے پوچھا تم مجھ سے چھپتے کیوں ہو۔ وہ کہنے لگا میں انتہائی تنگدست ہوں میرے پاس قرض ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم واقعی تنگ دست ہو۔ اس نے کہا ہاں میں واقعی تنگ دست ہوں۔ یہ سن کر حضرت قتادہ رونے لگے اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس نے اپنے مقروض کو مہلت دی یا اس کا قرض معاف کر دیا تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ کے نیچے ہوگا(3)۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ایک بندہ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اے بندے! تو نے دنیا میں میرے لیے کیا کام کیا ہے۔ بندہ عرض کرے گا اے پروردگار! میں نے دنیا میں ایک ذرہ برابر بھی نیکی نہیں کی جس کی جزاء کی مجھے امید ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ سوال تین دفعہ کرے گا۔ تیسری دفعہ وہ بندہ عرض کرے گا یا باری تعالیٰ تو نے مجھے اپنے فضل واحسان سے مال عطا فرمایا تھا۔ میں تجارت کیا کرتا تھا۔ میری یہ عادت تھی کہ اگر مجھ سے کوئی مال ادھار لے جاتا اگر وہ مالدار ہوتا تو میں اس پر سختی نہ کرتا اور اگر وہ تنگ دست ہوتا تو اسے میں مہلت دے دیتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تو میں آج تم پر آسانی کیوں نہ کروں۔ میں آسانی کرنے کا زیادہ حقدار ہوں۔ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس حدیث کو حافظ ابویعلی نے اپنی سند میں روایت کیا ہے: اس کے علاوہ بخاری، مسلم اور ابن ماجہ نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ اور صحیح بخاری کے الفاظ ہیں ایک تاجر لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا جب وہ کسی تنگدست کو دیکھتا تو اپنے خدام سے کہتا کہ اس سے قرض طلب نہ کرنا شاید کہ اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا۔ حضرت سہل بن حنیف فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی مجاہد، نمازی، تنگدست، مقروض یا مکاتب غلام کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے عرش تلے سایہ عطا فرمائے گا جس دن کوئی سایہ نہیں ہوگا(4)۔ حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ

1۔ المعجم الکبیر: 304/1　2۔ مسند امام احمد: 360/5　3۔ مسلم، کتاب المساقاة: 1196　4۔ مسند امام احمد: 427/3

وعا قبول ہو اور اس کی مصیبت دور ہو جائے اسے چاہئے کہ وہ تنگ دستوں پر کشادگی کرے۔ حضرت عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص کا کسی دوسرے شخص پر کوئی حق لازم تھا۔ اور اس نے اسے کچھ مہلت دے دی تو اسے ہر دن صدقہ کرنے کا اجر ملے گا۔ حضرت ابوالیسر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی تنگدست کو مہلت دی یا اس کا قرض معاف کر دیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے عرش کے سایہ تلے اسے پناہ دے گا جس دن کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ میں نے اور میرے والد محترم نے انصار سے علم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سب سے پہلے صحابی رسول ابوالیسر کو ملے ان کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا۔ جس کے پاس حساب و کتاب کے کچھ کاغذات تھے۔ انہوں نے اور ان کے غلام نے ایک ہی جیسا لباس پہنا ہوا تھا۔ میرے والد نے ان سے پوچھا اے چچا! آپ کے چہرے پر کچھ خفگی کے آثار ہیں۔ فرمایا ہاں۔ میں نے فلاں شخص سے قرض لینا تھا۔ میں ان کے گھر گیا سلام کیا۔ پوچھا کیا وہ گھر میں ہیں؟ جواب ملا وہ باہر گیا ہوا ہے۔ اسی اثناء میں ان کا چھوٹا لڑکا گھر سے باہر نکلا میں نے اس سے پوچھا تمہارے والد کہاں ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ آپ کی آواز سن کر وہ چارپائی کے نیچے چھپ گئے ہیں۔ میں نے بلند آواز سے کہا باہر نکلو مجھے معلوم ہو گیا تم کہاں ہو۔ وہ باہر نکلا۔ میں نے اس سے پوچھا تم میری آواز سن کر کیوں چھپ گئے۔ انہوں نے جواب دیا۔ قسم بخدا میں اس خوف سے چھپ گیا تھا کہ کہیں مجھے جھوٹ نہ بولنا پڑ جائے یا وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی نہ کرنی پڑ جائے۔ آپ صحابی رسول اللہ ہیں۔ آپ سے جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں۔ میں اس وقت انتہائی تنگدست ہوں۔ میں نے کہا قسم اٹھاؤ تم واقعی تنگدست ہو۔ اس نے تین دفعہ قسم اٹھائی۔ میں نے اس کا کھاتہ نکالا اور اسے مٹا دیا اور کہا اگر تمہیں کہیں مال ملے گا تو ادا کر دینا ورنہ معاف۔ پھر فرمانے لگے: سنو! میری ان دونوں آنکھوں نے دیکھا ہے اور ان دونوں کانوں نے سنا ہے اور اپنے دل کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میرے اس دل نے اس کو خوب یاد رکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی کو مہلت دی یا اسے معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے عرش کے سایہ کے نیچے جگہ دے گا۔ (1)

حضرت عثمان روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ جس نے کسی بندے کو مہلت دی یا اس کا قرض معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اس کو اس دن اپنے عرش کا سایہ عطا فرمائے گا جس دن کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لائے اور آپ نے زمین کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی گرمی سے بچا لے گا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: جنت کا عمل انتہائی مشکل ہے۔ اور جہنم کا عمل آسان اور خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ خوش نصیب وہی ہے جو فتنوں سے بچ جائے۔ غصے کا وہ گھونٹ جو انسان پیتا ہے اس سے زیادہ کوئی گھونٹ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب نہیں۔ جب انسان غصہ پی لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ایمان سے لبریز کر دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے کسی تنگدست کو اس کی خوشحالی تک مہلت دی تو اللہ تعالیٰ بھی گناہوں پر اس کی پکڑ نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو وصیت فرماتا ہے اور انہیں دنیا کے زوال، اس کے مال و دولت کے فنا ہونے اور آخرت میں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ یہاں ہر شخص کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ نیکی کرنے والے کو اس کی جزاء ملے گی اور برائی کرنے والے کو اس کی سزا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ: حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کریم کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی

1۔ مسلم، کتاب الزہد: 2302,2301

آیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نو دن تک اس ظاہری دنیا میں رہے۔ پھر آپ کا 12 ربیع الاول بروز پیر وصال ہو گیا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ سب سے آخری آیت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے اور نبی کریم ﷺ کے وصال کے درمیان اکتیس دن کا فاصلہ ہے۔ حضرت ابن جریج اور کئی دوسرے سلف صالحین فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نو دن زندہ رہے پھر پیر کے روز آپ کا وصال ہو گیا۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْــــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىھُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ٢٨٢

''اے ایمان والو! جب تم ایک دوسرے کو قرض دو مدت مقرر تک تو لکھ لیا کرو اسے اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف سے۔ اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسے سکھایا ہے اس کو اللہ نے پس وہ بھی لکھ دے اور لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرضہ) ہے اور ڈرے اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور نہ کمی کرے اس سے ذرہ بھر پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو یا کمزور ہو یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے اور بنا لیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو تم (اپنے لیے) گواہ تاکہ اگر بھول جائے ایک عورت تو یاد کرائے (وہ) ایک دوسری کو اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں اور نہ اکتایا کرو اسے لکھنے سے خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ اس کی معیاد تک یہ تحریر عدل قائم کرنے کے لیے بہت مفید ہے اللہ کے نزدیک اور بہت محفوظ رکھنے والی ہے گواہی کو اور آسان طریقہ ہے تمہیں شک سے بچانے کا مگر یہ کہ سودا دست بدست ہو جس کا تم لین دین آپس میں کرو (اس صورت میں) نہیں تم پر کوئی حرج اگر نہ بھی لکھو اسے اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو اور ضرر نہ پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ نافرمانی ہو گی تمہاری اور ڈرا کرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ (آداب معاشرت) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا: یہ قرآن کریم کی طویل ترین آیت ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ عرش الٰہی سے اترنے والا سب سے لمبا کلام یہی آیت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام انکار کرنے والے سب سے پہلے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو آپ کی پشت پر اپنا دست قدرت پھیر کر قیامت تک آنے والی اولاد آدم کو ظاہر فرمایا۔ آپ نے اپنی اولاد کو دیکھا اس میں سے ایک آدمی کو خوبصورت اور نکھرے چہرے والا پایا۔ آپ نے عرض کی اے پروردگار! یہ شخص کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یہ تمہارا بیٹا داؤد ہے۔ عرض کی اس کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا ساٹھ سال۔ عرض کی پروردگار! اس کی عمر میں اضافہ کر دو۔ فرمایا نہیں۔ ہاں اگر میں تمہاری عمر میں سے کچھ اسے دے دوں تو پھر ٹھیک ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی اس میں سے چالیس حضرت داؤد کو دے دیے گئے۔ اسے لوح تقدیر پر لکھ کر فرشتوں کو اس پر گواہ بنا دیا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا آخری وقت آیا اور موت کے فرشتے آپ کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا میری عمر ابھی باقی ہے ملائکہ نے کہا کہ آپ نے اپنے چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو دے دیئے تھے۔ آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتہ تقدیر کو ظاہر فرمایا اور گواہی کے لیے گواہ فرشتوں کو لایا گیا(1)۔ اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر کو سو سال کر دیا اور حضرت آدم علیہ السلام کی عمر کے ہزار سال مکمل کر دیئے۔ اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے لیکن یہ حدیث انتہائی غریب ہے۔ اس کے علاوہ اس کو حاکم نے اپنی مستدرک میں مختلف اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ میعاد مقرر کر کے قرض کا باہمی لین دین کریں انہیں چاہئے کہ اسے لکھ لیا کریں تا کہ اس کی مقدار بھی یاد رہے اور اس کے مقررہ وقت میں بھی اختلاف نہ ہو۔ اور اس کے گواہ کو بھی آسانی رہے۔ جیسا کہ اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا: ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا (بقرہ: 282) حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ مدت معلوم تک بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی۔ دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے اس وقت اہل مدینہ پھلوں میں بیع سلم کیا کرتے تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا جو شخص بھی بیع سلم کرے اسے چاہئے کہ اس بیع میں کیل، وزن معلوم اور مدت مقرر ہو۔

فَاكْتُبُوْهُ: یہاں اللہ تعالیٰ نے باہمی لین دین کے وقت اس کو لکھنے کا حکم فرمایا ہے تا کہ یاد رہے اور ضائع ہونے سے محفوظ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ اور نہ ہی حساب کر سکتے ہیں(2)۔ یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باہمی لین دین کو لکھنے کا حکم دیا ہے اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور نہ ہی حساب کر سکتے ہیں۔ اس کے درمیان تطبیق کیسے ہوسکتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی دینی امور اور شرعی مسائل کو انتہائی آسان فرما دیا ہے۔ اس میں لکھنے کی بالکل ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ قرآن حکیم کے حفظ کو اللہ تعالیٰ نے ان پر آسان بنا دیا ہے۔ اسی طرح احادیث طیبہ بھی صحابہ کرام کے سینہ میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ اور جہاں تک لکھنے کا حکم ہے اس کا تعلق ان جزوی امور کے ساتھ ہے جو لوگوں کے باہمی لین دین کے وقت پیش آتے ہیں اور یہاں بھی یہ حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ ارشاد و نصیحت کے لیے ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے فرمایا۔ ابن جریج فرماتے ہیں جو کسی کو قرضہ دے اسے چاہئے کہ وہ لکھ لے اور جو کوئی چیز بیچے اسے چاہیے کہ اس پر کوئی گواہ بنا لے۔ حضرت ابوسلیمان مرعشی نے اپنے ساتھیوں سے ایک دن فرمایا کیا تم ایسے مظلوم کو جانتے ہو

1۔ مسند امام احمد: 252،251 2۔ مسلم: 761

جو اپنے رب سے دعا کرے اور اس کی دعا قبول نہ ہو۔ انہوں نے عرض کی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا یہ اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایک مدت مقررہ تک کوئی چیز بیچتا ہے اس پر نہ تو کوئی گواہ بناتا ہے اور نہ ہی اسے لکھتا ہے اور جب مدت گزرنے پر رقم کا تقاضا کرتا ہے تو وہ شخص انکار کر دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے رب سے دعا کرتا ہے تو اس کی دعا قبول نہیں کیونکہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

حضرت ابو سعید، شعبی، ربیع بن انس، حسن بصری، ابن جریج اور ابن زید وغیرہم فرماتے ہیں کہ یہ پہلے واجب تھا۔ پھر یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہو گیا: فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ (البقرۃ:283) پھر اگر اعتبار کر لے کوئی تم میں سے دوسرے پر پس چاہئے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ اگرچہ یہ واقعہ پہلی امتوں کا ہے۔ بہرحال پھر بھی ان کی شریعت ہماری شریعت ہے جب تک کہ ہماری شریعت میں ان کے خلاف کوئی حکم نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے ایک دوسرے سے ایک ہزار قرض مانگا۔ اس نے کہا گواہ لے آؤ۔ اس نے جواب دیا گواہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کافی ہے۔ پھر اس نے کہا کہ ضامن لے آؤ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا ضامن کافی ہے اس نے کہا تم سچ کہتے ہو۔ پھر اسے ایک مدت مقررہ تک ایک ہزار دے دیا کہ وہ شخص مال لے کر تجارت کی غرض سے سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ پھر جب مقررہ مدت پوری ہونے کے قریب پہنچی اس نے بحری جہاز تلاش کیا تاکہ مقررہ مدت پر اپنا قرض ادا کر سکے۔ لیکن اسے کوئی جہاز نہ ملا۔ اس نے ایک لکڑی لی۔ اسے کھوکھلا کر کے ہزار دینار اور اس کے مالک کے نام ایک رقعہ لکھ کر بند کر دیا اور یہ دعا کی اے اللہ تعالیٰ! تجھے معلوم ہے کہ میں نے فلاں سے ہزار دینار لیے تھے، اس نے مجھ سے ضامن طلب کیا تھا میں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ضامن ہے۔ اس نے مجھ سے گواہ طلب کیا تو میں نے کہا اللہ تعالیٰ ہمارا گواہ ہے۔ وہ اس پر راضی ہو گیا۔ میں نے آج پوری کوشش کی ہے کہ کوئی جہاز تلاش کر کے اس رقم کو بھیج دوں لیکن میں نے کوئی جہاز نہیں پایا۔ اسے میں تیرے ہی سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے لکڑی کو دریا میں پھینک دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی پانی میں ڈوب گئی اور وہ شخص واپس لوٹ آیا۔ اور پھر جہاز کی تلاش میں رہا۔ اگر جہاز مل جائے تو وہ بھی سوار ہو کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ ادھر قرض خواہ بھی اس کے انتظار میں تھا۔ وہ ساحل سمندر پر کھڑا جہاز کا انتظار کر رہا تھا شاید وہ آدمی آ جائے۔ سارا دن انتظار کرنے کے بعد جب شام کے وقت مایوسی کے عالم میں لوٹنے کا ارادہ کیا تو اسے سمندر میں تیرتی ہوئی ایک خشک لکڑی نظر آئی۔ اس نے وہ لکڑی اٹھا لی تاکہ کم از کم اہل خانہ کے لیے ایندھن کے کام آ جائے۔ گھر جا کر اس لکڑی کو چیرا تو اس میں سے مطلوبہ رقم اور خط نکل آیا۔ چند ہی دنوں بعد وہ شخص بھی آ گیا جس نے ہزار دینار لیے تھے۔ اس نے ہزار دینار پیش کیے اور معذرت کی کہ میں بہت دنوں سے جہاز کی تلاش میں تھا تاکہ وقت مقررہ پر اپنا قرض ادا کرتا۔ لیکن جہاز نہ مل سکا جس کی وجہ سے کچھ تاخیر ہو گئی۔ اس نے پوچھا کیا تم نے میری طرف کوئی لکڑی بھیجی تھی۔ اس نے کہا کہ تمہیں ابھی تو بتا رہا ہوں کہ میں ابھی پہنچا ہوں۔ صاحب قرض نے کہا جو رقم لکڑی میں بھیجی تھی وہ بفضل الٰہی میرے پاس پہنچ گئی ہے۔ اس لیے یہ ہزار دینار اپنے پاس رکھو۔ اس کی سند صحیح ہے(1)۔ اس روایت کو امام بخاری نے بھی کئی ایک مقامات پر روایت کیا ہے۔

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ: پس کاتب کو چاہئے کہ وہ عدل و انصاف سے لکھے اور اس لکھنے میں کسی فریق پر ظلم نہ کرے بلکہ دونوں فریق جس پر متفق ہوں اسے کسی زیادتی و نقصان کے بغیر لکھے۔

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ: یعنی جو شخص لکھنا جانتا ہے اگر لوگ اسے لکھنے کے لیے کہیں تو اسے انکار نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے چاہئے کہ

1۔ مسند امام احمد: 338/2

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر فضل و کرم کرتے ہوئے اسے پڑھنا لکھنا سکھایا ہے وہ بھی اپنے علم کا صدقہ ادا کرے اس آدمی کے لیے لکھ کر جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ حدیث پاک میں ہے کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے کہ تو کسی کام کرنے والے کی مدد کر دے یا خود کام کرنا جانتا ہے تو کسی ایسے شخص کے لیے کام کر دے جو نہیں جانتا۔ اور ایک دوسری روایت میں فرمایا جو شخص کسی شے کا علم ہوتے ہوئے چھپائے تو اللہ تعالیٰ روز قیامت اسے آگ کی لگام پہنائے گا۔ حضرت مجاہد اور عطا فرماتے ہیں کہ کاتب پر لکھ کر دینا واجب ہے۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ یعنی وہ شخص کاتب کو لکھوائے جس پر قرض لازم ہوا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اس میں کسی چیز کو نہ چھپائے۔ اور اگر وہ شخص جس پر قرض ہے وہ بیوقوف ہو۔ یعنی اس کی فضول خرچی اور اسراف کی وجہ سے قاضی نے اس کے تصرف پر پابندی لگائی ہو۔ یا وہ کمزور ہو یعنی چھوٹا بچہ یا دیوانہ ہو یا جہالت کی وجہ سے خود نہ لکھوا سکتا ہو تو ان تمام صورتوں میں اس کے ولی یعنی سرپرست کو چاہئے کہ وہ عدل وانصاف سے لکھوائے۔

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ: یہاں لکھوانے کے ساتھ ساتھ گواہ بنانے کا بھی حکم ہوا ہے۔ تاکہ معاملہ خوب مضبوط ہو جائے اور شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اگر دو مرد گواہ نہ مل سکیں تو ایک مرد دو عورتیں گواہ بنالی جائیں۔ یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہونے چاہئیں جن کو تم پسند کرتے ہو۔ دعویٰ مال اور مقصود مال کے دعویٰ میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی برابر کہا گیا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں ناقص العقل ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے عورتو! صدقہ دیا کرو اور بکثرت استغفار کیا کرو۔ میں نے تمہاری کثیر تعداد جہنم میں دیکھی ہے۔ ایک عورت نے عرض کی یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے فرمایا تم اکثر لعن طعن کرتی رہتی ہو اور اپنے خاوند کی ناشکری کرتی ہو، تم عقل اور دین کی کمی کے باوجود ایک صاحب عقل آدمی پر غالب آ جاتی ہو۔ اس نے عرض کی یارسول اللہ! دین اور عقل کی کمی سے کیا مراد ہے۔ فرمایا عقل کی کمی تو یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ اور دین کی کمی یہ ہے کہ مخصوص ایام میں عورت کسی دن نماز نہیں پڑھ سکتی اور رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتی۔ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ گواہوں کا عادل ہونا ضروری ہے۔ اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں بھی گواہوں کا ذکر ہے وہاں اس کا عادل ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ کہیں عدالت کی قید نہ بھی لگائی۔ وہ مطلق حکم کو اس آیت کریمہ کے ساتھ مقید کرتے ہیں۔ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے کہ گواہ کا عادل ہونا ضروری ہے۔

أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا: یہاں ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی مقرر کرنے کی حکمت بیان کی گئی ہے۔ اگر ایک گواہی لو بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ جس شخص نے یہ کہا ہے کہ ایک عورت کی گواہی دوسری عورت کی گواہی سے مل کر ایک مرد کی گواہی کی طرح ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ قول بہت بعید ہے۔ پہلا قول ہی صحیح ہے۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ یعنی جب کسی کو بلایا جائے کہ آؤ اس معاملہ میں گواہ بن جاؤ۔ تو اسے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اس پر یہ لازم ہے۔ اور یہ قتادہ اور ربیع بن انس کا قول ہے۔ یہی حکم کاتب کے بارے میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ گواہ بننا فرض کفایہ ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے اور اس کا یہ بھی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ جب گواہ کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو اسے گواہی دینے سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اگر کوئی اور گواہی کے لیے نہ ملے تو اس پر گواہی دینا واجب ہے وگرنہ فرض کفایہ۔ مجاہد، ابو مجلز اور دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ جب تجھے گواہ بننے کے لیے بلایا جائے تو تمہیں اختیار ہے جاؤ یا نہ جاؤ۔ لیکن جب گواہی دینے کے لیے بلایا جائے تو اس کے لیے گواہی دینا ضروری ہے۔ حضرت زید بن خالد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں

بہترین گواہ کے بارے میں نہ بتادوں۔ پھر فرمایا بہترین گواہ وہ ہے جو بلائے بغیر ہی گواہی کے لیے آجائے۔ اور ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ بدترین گواہ وہ ہے جس سے گواہی طلب نہ کی جائے لیکن وہ خود ہی گواہی کے لیے آجائے۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آخر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے جن کی قسمیں گواہیوں سے اور گواہیاں قسموں سے بڑھ کر ہوں گی۔ اور ایک روایت میں فرمایا پھر ایک ایسی قوم آئے گی جو خود ہی گواہی دیں گے حالانکہ ان سے گواہی طلب نہ کی جائے گی۔ ان ارشادات میں جھوٹے گواہوں کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ اور پہلی جس حدیث میں گواہی کی تعریف کی گئی ہے اس سے مراد سچی گواہی دینے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ دونوں حالتوں کو شامل ہے۔ یعنی گواہ بننا اور گواہی دینا۔

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ: اور لکھنے سے اکتایا نہ کرو خواہ قرض کی رقم تھوڑی ہو یا زیادہ۔ اسے لکھنا بہتر ہے۔ اور مدت مقررہ تک یہ تحریر لکھنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدل قائم کرنے کے لیے بہت مفید ہے اور گواہی کو بھی بہت زیادہ محفوظ رکھنے والی ہے۔ کیونکہ گواہ جب لکھی ہوئی تحریر کو دیکھے گا تو اسے گواہی یاد آجائے گی اور اگر اسے نہ لکھا جائے تو غالب گمان یہی ہے کہ وہ بھول جائے گا۔ اور یہ شک سے بچنے کا آسان طریقہ ہے۔ کیونکہ اگر تحریر موجود ہوگی تو باہمی اختلاف کے وقت اس تحریر سے شک وشبہ دور ہو جائے گا۔ ہاں اگر معاملہ ایسا ہو جس میں لین دین دست بدست ہوتا ہے اور اس صورت میں اگر اسے نہ بھی لکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ تحریر کی علت اس میں موجود نہیں۔ مگر ایسی خرید وفروخت پر گواہ بنا لینے چاہئیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ) حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں۔ بہر حال اپنے حق پر گواہ بنا لیا کرو خواہ اس کی میعاد مقرر ہو یا نہ ہو۔ حضرت جابر بن زید، مجاہد، عطاء اور ضحاک سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت شعبی اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ گواہ بنانے کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے۔ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا...... لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ یہاں امر وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ استحباب کے لیے ہے اور اس کی دلیل حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ فرماتے ہیں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا اور آپ نے اسے حکم فرمایا کہ میرے پیچھے آؤ تا کہ میں تمہیں اس کی رقم ادا کروں نبی کریم ﷺ تیزی سے چل رہے تھے، اعرابی بہت پیچھے رہ گیا۔ راستہ میں لوگ اس اعرابی کے ساتھ گھوڑے کا سودا کرنے لگے انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ گھوڑا نبی کریم ﷺ نے خرید لیا ہے۔ حتیٰ کہ جب اعرابی نے دیکھا مجھے اس کی زائد رقم مل رہی ہے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو آواز دی اگر آپ اسے لینا چاہتے ہیں تو لے لیں ورنہ میں نے اس کو بیچ دیا ہے۔ آپ یہ آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے تم سے یہ گھوڑا خرید لیا ہے۔ اعرابی کہنے لگا میں نے آپ کے ہاتھ نہیں بیچا۔ اسی تکرار میں کچھ لوگ جمع ہو گئے اور اعرابی نے کہا اچھا آپ اپنا گواہ لائیں کہ میں نے اپنا گھوڑا تمہارے ہاتھ بیچا ہے۔ مؤمنین نے اس اعرابی سے کہا بد بخت یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ کی زبان مبارک سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ لیکن اس اعرابی نے کسی کی بات نہ سنی اور اپنی تکرار جاری رکھی کہ گواہ لاؤ اسی اثناء میں حضرت خزیمہؓ آگئے اور اس صورت حال کو دیکھا تو فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ گھوڑا بیچا ہے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت فرمایا کہ یہ تم کیسے گواہی دے رہے ہو۔ میں نے عرض کی کہ آپ کی تصدیق کی بنا پر گواہی دی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت خزیمہ کی گواہی کو دو گواہوں کے قائم مقام قرار دے دیا(1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خرید وفروخت پر گواہ بنانا ضروری نہیں۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ گواہ بنا لیا جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن کی دعا اللہ کی بارگاہ میں قبول

1۔ نسائی، کتاب البیوع: 302,301/7

نہیں ہوتی۔ 1۔ وہ شخص جس کی بیوی بد اخلاق ہو اور وہ اسے طلاق نہ دے۔ 2۔ جو یتیم کو بالغ ہونے سے پہلے ہی مار دے۔ 3۔ وہ شخص جو کسی کو قرض دے اور اس پر گواہ نہ بنائے حاکم فرماتے ہیں کہ یہ شیخین کے شرط کے مطابق ہے۔ لیکن انہوں نے اس کو اپنی صحیحین میں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ شعبہ کے شاگرد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ پر موقوف ہے۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ: اس کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ کاتب کو چاہئے کہ وہ نقصان نہ پہنچائے۔ یعنی جو اسے لکھوایا جا رہا ہے وہ اس کے خلاف نہ لکھے۔ اور اس گواہ کو بھی چاہیے کہ جو کچھ سنا ہے اس کے خلاف گواہی نہ دے یا کلی طور پر گواہی کو نہ چھپائے۔ حضرت حسن بصری اور قتادہؒ کا قول ہے۔ اور اس کا معنی ہی بیان کیا گیا ہے کہ کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ان دونوں کو لکھنے اور گواہی کے لیے بلائے اور وہ کہیں کہ ہم کسی ضروری کام میں مصروف ہیں وہ انہیں کہے کہ تم پر گواہی دینا اور لکھنا فرض ہے اپنا کام چھوڑو اور میرے ساتھ چلو اس طرح اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ انہیں نقصان پہنچائے۔ حضرت عکرمہ، مجاہد، طاؤس، سعید بن جبیر، ضحاک، عطیہ، مقاتل بن حیان وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔

وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ: یعنی اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی یا ایسے فعل کا ارتکاب کیا جس سے تمہیں روکا گیا ہے۔ یہ فسق ہے اور اللہ کی نافرمانی۔ اپنے تمام معاملات میں اس سے ڈرتے رہو۔ اس کے حکم کی پیروی کرو ممنوعات کو چھوڑ دو

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ: اور یہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی مثل ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال: 29) ''ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے وہ تم میں پیدا کرے گا حق و باطل میں تمیز کرنے کی قوت''۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (حدید: 28) '' اے ایمان والو! تم ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور (سچے دل سے) ایمان لے آؤ اس کے رسول (مقبول) پر، اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا دو حصے اپنی رحمت کے اور تمہارے لیے ایک نور بنا دے گا جس کی روشنی میں تم پھرو گے''۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ تمام امور اور معاملات کے حقائق، ان کی مصلحتوں اور ان کے مآل و انجام سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس پر کوئی شی مخفی نہیں۔ بلکہ اس کا علم کائنات کی ہر شے کو محیط ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

''اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرلے کوئی تم میں سے دوسرے پر، پس چاہیے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا ہے اپنی امانت کو اور ضروری ہے کہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا رب ہے۔ اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص چھپاتا ہے اُسے تو یقیناً گنہگار ہے اس کا ضمیر اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے''۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ: اگر تم سفر پر ہو اور دوران سفر قرض لینے کی حاجت پیش آجائے اور پھر لکھنا والا نہ ملے، یا لکھنے والا تو ہو لیکن دوات نہ ہو تو اس صورت میں قرضہ لینے والا صاحب حق کے پاس کوئی چیز گروی رکھ دے۔ ''مَّقْبُوْضَةٌ'' کے الفاظ سے استدلال کیا گیا ہے کہ

رہن جب تک قبضہ میں نہ آ جائے تو لازم نہیں ہوتا۔ یہ امام شافعی اور جمہور علماء کا مذہب ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ رون کا مرتہن کے ہاتھ میں مقبوض ہونا ضروری ہے۔ یہ امام احمد بن حنبل اور کئی دوسرے علماء کا مذہب ہے اور بعض بزرگوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ رہن صرف سفر کی حالت میں جائز اور مشروع ہے۔ اور یہ امام مجاہد اور بعض دوسرے مفسرین کرام کا مذہب ہے۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا جب وصال ہوا تو آپ کی زرہ ایک یہودی ابوشحم کے پاس تیس وسق جو کہ بدلے گروی تھی جو آپ نے گھر والوں کے خورد ونوش کے لیے لیے تھے۔

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا: حضرت ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں۔ ان کلمات نے ماقبل کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ شعبی فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہو پھر اگر تم نہ بھی لکھوا اور نہ گواہ بناؤ تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے۔ حضرت سمرہ روایت کرتے ہیں کہ ہاتھ پر اس چیز کا بوجھ رہتا ہے جو اس نے لی ہے یہاں تک کہ وہ اسے واپس کر دے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ: گواہی نہ چھپاؤ اور نہ ہی اس میں خیانت کرو۔ جب گواہی دینے کا وقت آئے تو اسے ظاہر کرو اس سے پہلے ظاہر نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں، جھوٹی گواہی گناہ کبیرہ ہے اسی طرح گواہی کو چھپانا بھی گناہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں ارشاد فرمایا، جو شخص گواہی کو چھپاتا ہے بلاشبہ اس کا ضمیر گنہگار ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ (مائدہ:106)" اور ہم نہیں چھپائیں گے اللہ کی گواہی کو (اگر ہم ایسا کریں) تو یقیناً ہم اس پر گنہگاروں میں (شمار) ہوں گے"۔ اور ایک مقام پر گواہی کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ...... (نساء:135) "اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر، گواہی دینے والے محض اللہ کے لیے، چاہے گواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف (جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے) وہ دولت مند ہو یا فقیر۔ پس اللہ تعالیٰ زیادہ خیر خواہ ہے دونوں کا۔ تو نہ پیروی کرو خواہش نفس کی انصاف کرنے میں۔ اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے"۔

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٤﴾

"اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رہو حساب لے گا تم سے اُس کا اللہ تعالیٰ پھر بخش دے گا جسے چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ وہ زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی ہر چیز کا مالک ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی پوشیدہ کیوں نہ ہو اور یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں کا محاسبہ فرمائے گا اور ان کے تمام ظاہری و باطنی افعال و اعمال کا حساب لے گا۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: قُلْ إِن تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران:29) "فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کرو اسے جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ

ہر چیز پر قادر ہے''۔ اور ایک مقام پر اسی مفہوم کو اس طرح بیان فرماتا ہے: فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى (طٰہٰ:7) ''وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور دل کے بھیدوں کو بھی''۔ اس مفہوم کی بہت سی آیات ہیں یہاں اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے علم کے بارے میں خبر دی ہے وہاں یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ اعمال کا محاسبہ بھی کرے گا۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر اس کا بہت اثر ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ہر چھوٹے بڑے اعمال کا محاسبہ کرے گا۔ اور یہ ان کی قوت ایمان اور حد درجہ ایقان کی نشانی ہے۔ وہ اس آیت کریمہ کو سن کر کانپ اٹھے اور گھٹنوں کے بل رسول اللہ ﷺ کی خدمت حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمیں نماز، روزہ، جہاد، صدقہ و خیرات کا حکم ہوا جو ہمارے بس میں تھا۔ لیکن اب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے جو ہماری سمجھ سے بالا تر ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم یہود و نصاریٰ کی طرح کہنا چاہتے ہو کہ ہم نے اللہ کا حکم سنا اور اس کی نافرمانی کی۔ بلکہ یہ کہو ہم نے اللہ کا حکم سنا اور اس کی اطاعت کی۔ اے ہمارے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلب گار ہیں اور ہم نے تیری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔ جب صحابہ کرام نے آپ کا یہ حکم تسلیم کر لیا۔ ان کی زبان پر یہ کلمات جاری ہو گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن، یہ سب دل سے مانتے ہیں۔ اللہ اور اس کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے۔ اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہم نے لوٹنا ہے۔ یہ آیت کریمہ نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی اس پریشانی کو دور کر دیا۔ اسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ پھر مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے کوئی بھول ہو جائے یا کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس پر ہمارا مواخذہ نہ فرمانا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمالی۔ پھر عرض کی اے ہمارے رب! ہم پر وہ بھاری بوجھ نہ ڈال جس طرح تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا۔ تو اللہ تعالیٰ ان کی یہ دعا بھی قبول کر لی۔ پھر عرض کی اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت اور طاقت نہیں۔ یہ دعا بھی قبول ہوئی۔ اس کے بعد عرض کی ہم سے درگزر فرما ہمیں بخش دے ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا دوست اور مددگار ہے، قوم کفار پر ہماری مدد فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا بھی قبول فرمالی۔ اس روایت کو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں ایک دن حضرت عمر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ آیت کریمہ ''اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ'' تلاوت فرمائی اور بہت روئے تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہاں جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تھی تو صحابہ کرام بڑے غمگین ہوئے تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ! ہم تو ہلاک ہو جائیں گے، ہمارے عمل اور زبان کا مواخذہ ہمارے بس میں ہے، لیکن ہمارے دل ہمارے بس میں نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اے میرے صحابہ! تم یہ کہو ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' جب صحابہ کرام نے یہ کہا تو بعد والی آیات نازل ہوئیں۔ جنہوں نے اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ ابن جریر نے یہی واقعہ سعید بن مرجانہ سے بھی روایت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا چونکہ دل کے وسوسہ پر انسان کا بس نہیں ہوتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے مواخذہ سے صرف نظر کر لیا ہے۔ اور یہ حکم فرمایا کہ ہر شخص کو اس کے نیک عمل کا اجر ملے گا اور اس کے برے عمل کا وبال اس پر ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دل کے وساوس کو معاف فرما دیا ہے۔ اور پکڑ صرف اسی پر ہوگی جو زبان سے نکلے گا اور ہاتھ سے سرزد ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ

تعالیٰ اپنے فرشتوں کو فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ کسی برائی کا ارادہ کرے تو اسے نہ لکھو۔ ہاں اگر اس کا ارتکاب کرے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک برائی لکھ دو۔ اگر وہ نیکی کا ارادہ کرے تو اگرچہ اسے سرانجام نہ دے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو۔ اگر وہ نیکی کرے تو پھر دس نیکیوں کا ثواب لکھ دو۔(1) اور ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ نیکی کرتا ہے تو میں اس کے نامہ اعمال میں دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک لکھ دیتا ہوں۔ ایک اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں فرشتے کہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! تیرا یہ بندہ برائی کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اس پر نگاہ رکھو اگر اس نے اس کا ارتکاب کرلیا تو اس کے نامہ اعمال میں ایک بدی لکھ دینا اور اگر اس نے برائی نہ کی تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دینا۔ کیونکہ اس نے میرے ہی خوف سے برائی کو چھوڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں جب تم میں سے کوئی ایک کامل الایمان ہو جاتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے لے کر پانچ سو گنا تک لکھا جاتا ہے اور برائی صرف ایک ہی لکھی جاتی ہے۔ اسی حکم کی بہت سی روایات بہت سے صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں اس فضل و احسان کے باوجود وہی ہلاک ہوتا ہے جو اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہو۔ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! ہمارے دل میں ایسے ایسے وسوسے آتے ہیں جن کو زبان پر لانا مشکل ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم ایسا محسوس کرتے ہو۔ انہوں نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی خالص ایمان ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا یہ آیت منسوخ تو نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوق کو جمع فرمائے گا اور ارشاد فرمائے گا میں تمہیں تمہاری ان خفیہ باتوں سے مطلع کرتا ہوں جن سے میرے فرشتے بھی آگاہ نہیں ہوئے۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ خبر دے گا اور ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے خطرات کو معاف فرما دے گا۔ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ سے یہی مراد ہے۔ اور پھر منافقین، شک وشبہ میں مبتلا لوگوں کو ان کی تکذیب سے آگاہ فرمائے گا جس کو انہوں نے دنیاوی زندگی میں چھپا رکھا تھا۔ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ (بقرہ:225) سے یہی مراد ہے۔ مجاہد، ضحاک، اور حسن بصریؒ سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ محکم ہے منسوخ نہیں ابن جریر نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محاسبہ اور عذاب میں فرق ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ محاسبہ کرتا ہے اور معاف فرما دیتا ہے اور کبھی محاسبہ فرماتا ہے اور عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے اور سزا دیتا ہے۔ حضرت صفوان بن محرز فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن عمر کے ساتھ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے۔ دوران طواف ایک شخص نے پوچھا اے عبداللہ بن عمر! سرگوشی کے بارے میں آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کیا ارشاد سنا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک مومن کو اپنے قریب بلائے گا حتیٰ کہ اپنا دست قدرت اس پر رکھے گا۔ پھر اس سے دریافت فرمائے گا کہ تم نے فلاں فلاں گناہ کیا تھا۔ وہ بندہ اقرار کرتا جائے گا اور جب بہت سے گناہوں کا اعتراف کرلے گا تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ میں نے دنیا میں تیرے ان گناہوں پر پردہ ڈال رکھا تھا آج بھی میں ان کو معاف کر دیتا ہوں۔ پھر اس کی نیکیوں کا صحیفہ اس کے دائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ مگر کفار اور منافقین کو تمام مجمع کے سامنے رسوا کیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (ہود:18) ''یہی وہ (گستاخ) ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا۔ خبردار اللہ کی پھٹکار ہو ظالموں پر''۔ اس حدیث کو صحیح بخاری، مسلم اور دوسری کتب حدیث میں متعدد اسناد سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت زید نے حضرت عائشہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کریمہ کے بارے میں دریافت کیا ہے تو مجھ سے اس کے بارے میں کسی نے نہیں پوچھا۔ اس

1۔ مسلم، کتاب الایمان:117

سے مراد وہ تکالیف ہیں جو بندے کو اس دنیاوی زندگی میں پہنچتی ہیں۔ مثلاً بخار وغیرہ حتیٰ کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے پیسے ایک جیب میں رکھتا ہے پھر بھول جاتا ہے۔ تلاش کرنے پر اسے نہیں ملتے اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے پھر وہ پیسے اسے دوسری جیب سے مل جاتے ہیں تو ان تکالیف اور مصائب کے ذریعہ اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ خالص سرخ سونا(1)۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ۥ وَ اغْفِرْ لَنَا ۥ وَ ارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۸۶﴾

"ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن۔ یہ سب دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔ اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا خطا کر بیٹھیں اے ہمارے رب! نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں اے ہمارے پروردگار! نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر تو ہی ہمارا دوست (اور مددگار) ہے۔ تو مدد فرما ہماری قوم کفار پر"۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ: ان آیات مذکورہ کی فضیلت کے بارے میں وارد شدہ احادیث

1۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے رات کے وقت سورۂ بقرہ کی یہ دو آیات پڑھیں تو اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں۔

2۔ حضرت ابوذر غفاری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سورۂ بقرہ کی یہ دو آیات عرش الٰہی کے نیچے خزانہ سے مجھے عطا کی گئی ہیں۔(2)

3۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کو معراج کرائی گئی تو آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور یہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں

1۔ عارضۃ الاحوذی تفسیر سورۃ البقرہ: 112/11
2۔ مسند امام احمد: 147/4

آسمان میں ہے۔ زمین سے آسمان کی طرف بلند ہونے والی چیزیں ہی سدرۃ المنتہیٰ ہے اور عرش الٰہی سے نازل ہونے والی کی انتہاء بھی یہی سدرۃ المنتہیٰ ہے اس کے بعد اس چیز کو یہاں سے نیچے بھیجا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى (نجم: 16) ''جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا''۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ اس پر سونے کی تتلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ وہاں رسول اللہ ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں۔ 1۔ پانچ وقت کی نماز۔ 2۔ سورۂ بقرہ کی اختتامی (آخری) آیات 3۔ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنے والے آپ کے امتیوں کی بخشش۔

4۔ حضرت عقبیٰ بن عامر جہنی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات پڑھا کرو جو مجھے عرش تلے خزانے سے عطا کی گئیں۔ (1)

5۔ حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمیں دوسرے لوگوں پر تین چیزوں سے فضیلت دی گئی ہے۔ مجھے یہ سورۂ بقرہ کی آخری آیات عرش تلے خزانے سے دی گئی ہیں۔ یہ نہ تو مجھ سے پہلے کسی کو عطا کی گئی ہیں اور نہ مجھ سے بعد کسی کو عطا ہوں گی۔

6۔ حضرت علی فرماتے ہیں: میرا خیال نہیں کہ کوئی اسلام کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو اور پھر آیت الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات پڑھے بغیر سو جائے۔ یہ وہ خزانہ ہے جو تمہارے نبی کریم ﷺ کو عرش کے نیچے سے عطا کیا گیا۔

7۔ حضرت لقمان بن بشیر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی۔ اس میں سے دو آیات نازل فرما کر سورۂ بقرہ کا اختتام فرمایا جس گھر میں بھی یہ آیات تین رات تک پڑھی جائیں شیطان اس گھر کے قریب نہیں جا سکتا (2)۔

8۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی تلاوت فرماتے تو آپ مسکراتے اور فرماتے کہ یہ عرش تلے رحمٰن کے خزانہ سے مجھے عطا ہوئی ہیں اور جب یہ آیات مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (النساء: 123) ''جو عمل کرے گا برے اسے ملے گی اس کی سزا'' اور وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰى ۪ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (النجم: 41) ''ترجمہ: اور نہیں ملتا انسان کو مگر وہی کچھ جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش کا نتیجہ جلد نظر آئے گا۔ پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا''۔ پڑھتے تو آپ کی زبان پر ''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ'' جاری ہو جاتا۔

9۔ حضرت معقل بن یسار فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات عرش کے تلے سے عطا کی گئی ہیں۔ اور جو باقی مفصل سورتیں ہیں وہ تو نفع میں ملی ہیں۔

10۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بیٹھے تھے کہ انہوں نے اچانک اوپر سے ایک شدید آواز سنی۔ انہوں نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا آسمان کا ایک دروازہ کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا۔ اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا۔ اس نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی آپ کو خوشخبری ہو۔ آپ کو دو نور عطا فرمائے گئے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے۔ اور وہ دو نور سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات ہیں۔ آپ اس میں سے ایک حرف بھی پڑھیں گے تو آپ کو نور عطا کیا جائے گا۔

1۔ بخاری: 28/1   2۔ تحفۃ الاحوذی: 189/8

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ: حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ذات اس بات کی سزاوار ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ "وَالْمُؤْمِنُوْنَ" کا عطف رسول پر ہے۔ پھر ارشاد فرمایا یہ سب دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو، اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو۔ یعنی تمام مومنین کا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ یکتا تنہا اور بے نیاز ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود و پروردگار نہیں۔ اور وہ سچے دل سے تمام انبیاء و رسل کی تصدیق کرتے ہیں اور ان پر نازل کی ہوئی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ بعض پر ایمان لاتے ہوں اور بعض کا انکار کرتے ہوں بلکہ ان کے نزدیک تمام انبیاء و رسل سچے، پاکباز، ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والے ہیں۔ اگرچہ حکم الٰہی کے مطابق بعض انبیاء دوسرے بعض انبیاء کی شریعت کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ خاتم الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد ﷺ کی شریعت مطہرہ نے سابقہ تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ جبکہ آپ کی شریعت قیامت تک باقی رہے گی۔ اور آپ کی امت کا ایک گروہ قیامت تک اس پر قائم رہے گا۔

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے تیرے ارشاد کو سنا اور اس کو سمجھا اور اسے اس تقاضوں کے مطابق بجالائے۔

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا: یہ اللہ تعالیٰ سے اس کی مغفرت، رحمت، لطف و کرم کی التجا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس اس کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں نے تمہیں معاف کیا۔

وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ: قیامت کے دن تیری طرف لوٹنا ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ (امن الرسول) نازل ہوئی تو جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ) اللہ تعالیٰ نے آپ کی اور آپ کی امت کی بہت تعریف فرمائی ہے آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کیجئے آپ کو عطا کیا جائے گا تو آپ نے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا..... کا سوال کیا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا: اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت اور ہمت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق پر فضل و کرم اور لطف و احسان ہے۔ اس آیت کریمہ نے ماقبل آیت: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ (بقرہ: 284) کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے جس سے صحابہ کرام کبیدہ خاطر اور پریشان ہو گئے تھے۔ معنی یہ ہے کہ اگرچہ حساب و کتاب ہوگا اور سوال بھی ہوگا لیکن کسی شخص کو اس کے خیالات و وساوس پر عذاب نہیں دیا جائے گا جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا اس کو سزا انہی اعمال کی ملے گی جو اس کے بس میں ہے اور حدیث پاک میں گزر چکا ہے کہ برے وساوس کو ناپسند کرنا ایمان کی نشانی ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ: جو کوئی نیک عمل کرے گا اسے اس کا اجر ملے گا جس نے کوئی برا عمل کیا اس کا وبال اسی پر ہوگا۔ اور یہ سزا انہی اعمال پر ہوگی جو انسان کی قدرت اور طاقت میں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی بارگاہ میں سوال کرنے کی راہنمائی فرمائی اور اس کی قبولیت کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔ اور انہیں یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اس کی بارگاہ میں ان الفاظ کے ساتھ دعا کریں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ: اے ہمارے رب! اگر ہم بھولیں یا خطا کر بیٹھیں ہمارا مواخذہ نہ کرنا یعنی اگر بھول کر کوئی فرض چھوٹ جائے یا کسی حرام چیز کا ارتکاب ہو جائے، یا حکم شرعی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کوئی غلط کام کر بیٹھیں تو ہماری پکڑ نہ فرمانا۔ اس سے پیشتر صحیح مسلم کی حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں نے اسے قبول کیا اور میں نے یہی کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کو خطا اور نسیان معاف فرما دیا ہے اور اگر کوئی کام ان سے زبردستی یا بحالت مجبوری کرایا گیا تو اسے بھی معاف فرما دیا ہے (1)۔ یہی حضرت ام درداء سے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مروی ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ: 2045

راوی حدیث ابوبکر ہذلی فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کا ذکر حضرت حسن بصری سے کیا آپ نے فرمایا ہاں، حدیث صحیح ہے اور فرمایا کیا تو قرآن نہیں پڑھتا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ: اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال، جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے گزر رے۔ یعنی ہمیں مشکل اعمال کا مکلّف نہ بنا اگرچہ ان کو برداشت کرنے کی ہم میں طاقت ہو۔ جیسا کہ تو نے ہم سے پہلی امتوں پو بوجھ ڈالے۔ وہ بوجھ جن کو ختم کرنے کے لیے اپنے نبی رحمت ﷺ کو مبعوث فرمایا اور انہیں وہ دین حنیف عطا کر کے بھیجا جو انتہائی آسان ہے اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول کیا ہے۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا: اے ہمارے پروردگار: ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں۔ یعنی ہمیں ایسے مسائل اور تکالیف میں مبتلا نہ کر جو ہماری ہمت اور برداشت سے باہر ہوں۔ حضرت مکحول فرماتے ہیں اس سے مراد فریب، غلبہ شہوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو بھی قبول فرمایا۔

وَاعْفُ عَنَّا: اے اللہ! ہماری ان کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرما جو تیرے اور ہمارے درمیان سربستہ ہیں۔ اور ہماری ان خطاؤں کو بھی معاف فرما جو ہمارے اور تیرے بندوں کے درمیان ہوئیں۔ ہمارے برے اعمال کو کسی پر ظاہر نہ فرما اور ہم پر رحم فرما یعنی ہمیں اپنی توفیق سے آئندہ گناہوں سے بھی بچا۔ بعض بزرگ فرماتے ہیں کہ گنہگار کو تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ 1۔ اللہ تعالیٰ اس کی کوتاہیوں کو معاف کرے جو اس نے اس کے حق میں کیں۔ 2۔ وہ اس کے گناہ پر پردہ ڈالے تاکہ وہ اس کے بندوں میں رسوا نہ ہو۔ 3۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی حفاظت میں لے تاکہ آئندہ اس قسم کا گناہ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو بھی قبول فرما لیا۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا: تو ہی ہمارا دوست اور مددگار ہے۔ ہم تجھ پر ہی بھروسہ کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ تیری حفاظت کے بغیر ہم برائی سے نہیں بچ سکتے اور نہ ہی تیری اعانت کے بغیر نیکی کر سکتے ہیں۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: ہمیں کفار پر نصرت و فتح عطا فرما جو تیرے دین کے منکر ہیں۔ تیری وحدانیت اور تیرے نبی کی رسالت و نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ تجھے چھوڑ کر غیر کی پوجا کرتے ہیں تیری عبادت میں غیر کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ اے اللہ دنیا میں ہمیں ان پر غلبہ عطا فرما اور آخرت میں ان پر فضیلت عطا فرما۔ اس کے جواب میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے یہ دعا قبول کی۔ حضرت معاذ بن جبل جب اس آیت کو ختم کرتے تو آمین کہتے۔

تفسیر سورۂ آل عمران

یہ سورت مدنی ہے کیونکہ اس کی ابتدائی تراسی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب مدینہ طیبہ میں عیسائیوں کا ایک وفد نجران سے حضور ﷺ کے پاس 9 ہجری میں آیا۔ اس کی تفصیل آیت مباہلہ کی تفسیر میں آئے گی (ان شاء اللہ)۔ اور اس کی فضیلت میں وارد شدہ احادیث کو ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر کی ابتداء میں بیان کر دیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

''الف۔ لام۔ میم اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔ نازل فرمائی اس نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ تصدیق کرنے والی ہے ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے (اتری) ہیں اور اتاری اس نے توراۃ اور انجیل اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے اور اتارا فرقان کو بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اللہ کی آیتوں کے ساتھ ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلہ لینے والا ہے''۔

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: آیت الکرسی کی تفسیر میں ہم یہ حدیث بیان کر چکے ہیں کہ اسم اعظم آیت الکرسی اور اس آیت: اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں ہے۔ الم کی تفسیر سورۂ بقرہ کی ابتداء میں گزر چکی ہے۔ اس لیے یہاں اس کے اعادہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اسی طرح اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کی تفسیر بھی آیت الکرسی میں بیان کر دی گئی ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: یعنی یہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ نے آپ پر حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یقیناً یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق نازل فرمایا ہے۔ فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: اور یہ کتاب اپنے سے پہلے نازل شدہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ یہ ان تمام واقعات اور اخبار کی تصدیق کرتی ہے جو قدیم زمانہ کی ان میں بیان کی گئی ہیں اور اسی طرح وہ کتابیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ کیونکہ اس میں وہ چیزیں بعینہٖ بیان کی گئی ہیں جن کی خبر پہلی کتابوں میں دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کرنے کی خوشخبری بیان فرمائی تھی۔ وہ بالکل سچ ثابت ہوئی۔

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ: اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم سے پہلے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام پر تورات اور عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل فرمائی۔ اور یہ دونوں کتابیں اپنے دور کے لوگوں کی راہنمائی کے لیے نازل فرمائی گئی تھیں۔ پھر ''فرقان''

کو نازل فرمایا۔ یعنی قرآن کریم۔ جو ہدایت وگمراہی، حق وباطل صحیح وخطا میں فرق کرنے والا ہے۔ اس میں واضح اور روشن آیات، دلائل قاہرہ، براہین قاطعہ کا بیان موجود ہے۔ حضرت قتادہ اور ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ فرقان سے یہاں مراد قرآن ہے۔ اور ابن جریر فرماتے ہیں چونکہ پہلے قرآن حکیم کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ لفظ یہاں اپنے مصدری معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔ ابوصالح کا قول ہے کہ یہاں فرقان سے مراد تورات ہے۔ لیکن ان کا یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ تورات کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کیا ان کا انکار کر کے ان کو باطل قرار دیتے رہے۔ قیامت کے دن ان کے لیے سخت عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بڑی غالب شان اور عظیم قوت کا مالک ہے۔ وہ اپنی آیات کو جھٹلانے والوں، اپنے انبیاء اور رسل عظام علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں سے انتقام لینے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿٥﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پوشیدہ رہتی اس پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں وہی ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے کوئی معبود نہیں بغیر اس کے (وہی) غالب ہے حکمت والا ہے''۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ زمین وآسمان کے جملہ مغیبات کو جانتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہی ہے جو ماؤں کے رحم میں تمہاری صورتیں بناتا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے۔ اچھی و بری، نیک و بد، مذکر و مؤنث۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: وہی ذات ہے جس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا۔ اس لیے وہی اکیلا الوہیت کا سزاوار ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ زبردست قوت کا مالک اور صاحب حکمت ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہی نہیں بلکہ صراحت ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔ جس طرح کہ باقی تمام بشر اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی رحم مادر میں ان کی صورت بنائی۔ پھر جیسے چاہا ان کو پیدا کیا۔ پھر وہ خدا کیسے بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ نصاریٰ گمان کرتے ہیں۔ اللہ کی لعنت ہو اس گروہ نصاریٰ پر۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رحم مادر میں ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتے رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (زمر:56) ''وہ پیدا فرماتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں (تدریجاً) ایک حالت سے دوسری حالت، تین اندھیروں میں''۔ پس جس کی پیدائش اس طرح ہوئی ہو وہ معبود والہ کیسے ہوسکتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٧﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿٩﴾

''وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے سو وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے (ان کا مقصد) فتنہ انگیزی اور (غلط) معنی کی تلاش ہے اور نہیں جانتا اس کے صحیح معنی کو بغیر اللہ تعالیٰ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے ساتھ اس کے۔ سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند اے ہمارے رب! نہ ٹیڑھے کر ہمارے دل بعد اس کے کہ تو نے ہدایت دی ہمیں اور عطا فرما ہمیں اپنے پاس سے رحمت بے شک تو ہی سب کچھ بہت زیادہ دینے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! بے شک تو جمع کرنے والا ہے سب لوگوں کو اس دن کے لیے نہیں کوئی شبہ جس (کے آنے) میں بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدے سے''۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں۔ جن کا حکم بالکل واضح اور صاف ہے۔ جسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ انہیں آیات محکمات کہتے ہیں۔ اور بعض آیات ایسی ہیں جن کے مفاہیم و مطالب عامتہ الناس کی رسائی سے باہر ہیں انہیں متشبہات کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو متشبہات کو محکمات کی طرف لوٹائیں اور ان کو آیات محکمات سے سمجھنے کی کوشش کریں وہ ہدایت پر ہیں۔ اور جو اس کے برعکس روش اپنائیں وہ حق سے دور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیات محکمات کو ام الکتاب فرمایا ہے۔ یعنی یہ قرآن کریم کی اصل ہے جب کوئی مسئلہ مشتبہ ہو جائے تو اس اصل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ: اور دوسری آیات متشابہ ہیں۔ یعنی بعض اوقات یہ آیات ایسے معانی و مفاہیم پر دلالت کرتی ہیں جو محکم آیات کے موافق ہوتے ہیں۔ لیکن لفظ اور ترکیب کے اعتبار سے دوسرے مطالب کا بھی احتمال رکھتی ہیں۔ محکم اور متشابہ آیات کے بارے میں سلف صالحین کی مختلف آراء ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: محکمات وہ آیات ہیں جو ناسخ ہوں اور جن میں حلال و حرام اور اوامر و نواہی کے احکام ہوں۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا (انعام:151) اور اس کے بعد والی آیات: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (بنی اسرائیل:23) اور اس کے بعد والی تین آیات محکمات ہیں۔ ابو فاختہ فرماتے ہیں اس سے مراد سورتوں کی ابتدائی آیات ہیں۔ حضرت یحییٰ بن یعمر فرماتے ہیں: اس سے مراد فرائض، اوامر و نواہی اور حلال و حرام ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ انہیں ام الکتاب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ تمام کتب سابقہ میں لکھی ہوئی ہیں۔ مقاتل بن حیان فرماتے ہیں: انہیں ام الکتاب اس لیے کہتے ہیں کیونکہ تمام مذاہب اس پر عمل پیرا ہیں۔ اور متشابہات کے بارے میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منسوخ آیات ہیں اور وہ آیات جو مقدم و مؤخر ہوں۔ جن میں مثالیں اور قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ اور جن پر ایمان لانا ضروری ہو اور عمل کرنا ضروری نہ ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں متشابہات ایک دوسرے کی تشریح کرتی ہیں اور یہ قول اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ''كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ'' (زمر:23) '' یعنی وہ کتاب جس کی آیات ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی جانے والیں'' یہاں متشابہ سے مراد وہ کلام ہے جو ایک ہی طرز پر ہو۔ اور مثانی سے مراد وہ کلام ہے جس میں دو متقابل چیزوں کا ذکر ہو جیسے جنت و دوزخ، نیک و بد۔ لیکن یہاں متشابہ سے مراد وہ کلام ہے جو محکم کے مقابلہ میں ہو۔ اس میں بہترین قول وہی ہے جسے ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اور یہ قول محمد بن اسحٰق بن یسار کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں آیات محکمات، رب تعالیٰ کی حجت اور اس کے بندوں کی حفاظت ہیں۔ انہی کے ذریعہ باطل قوتوں کو رد کیا جا سکتا ہے۔ اور ان میں کسی قسم کی تحریف و تغیر نہیں ہو سکتا۔ آپ فرماتے ہیں متشابہات میں بھی حقیقت میں کوئی تحریف اور تاویل نہیں ہو سکتی۔ ان سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ایمان کو آزماتا ہے۔ جیسے انہیں حرام و حلال کے ذریعہ آزماتا ہے۔ یعنی ان آیات کی باطل اور غلط تاویل

نہ کی جائے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی تحریف کی جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جن لوگوں کے دل میں کجی، ضلالت اور حق سے باطل کی طرف جانے کا رجحان ہو وہ صرف ان آیات کی پیروی کرتے ہیں جو متشابہ ہیں یعنی وہ متشابہ آیات کو لے کر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے ان میں تحریف کر ڈالتے ہیں۔ چونکہ یہ الفاظ کئی معانی کا احتمال رکھتے ہیں اس لیے وہ اپنی خواہش کے مطابق ان کا مفہوم مراد لے لیتے ہیں۔لیکن اس کے مقابلہ میں محکم آیات میں اپنی من مانی تحریف نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کا معنی اور مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا اس لیے ان کا مقصد فتنہ انگیزی ہوتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو گمراہ کرنا۔ کیونکہ وہ اپنا باطل عقیدہ قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن ان کے باطل عقائد کی تردید کرتا ہے۔ جیسا کہ عیسائی یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ کہا گیا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں محکم آیات کی طرف توجہ نہیں کرتے جن میں یہ صراحۃً ذکر کیا گیا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق اس کے بندے اور رسول ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (زخرف:59) ''نہیں ہے عیسیٰ مگر بندہ ہم نے انعام فرمایا ہے اس پر''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران:59) ''مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا''۔

وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ: یہاں بیان فرمایا کہ یہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت مقاتل بن حیان اور سدی فرماتے ہیں کہ یہ لوگ قرآن عظیم سے مختلف حالات و واقعات کے مآل وانجام کی پیشین گوئیاں کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات میں جھگڑا کرتے ہوں تو ان سے بچو(1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ، ابن حبان، ترمذی، ابوداؤد طیالسی، سعید بن منصور، مسلم، بخاری اور ابوداؤد نے اپنی کتاب حدیث میں مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوامامہ سے مروی ہے کہ ان لوگوں سے مراد خوارج ہیں۔ یہ حدیث کم از کم موقوف ہے کیونکہ یہ صحابی کا قول ہے اس کا معنی صحیح ہے۔ اسلام میں جو سب سے پہلی بدعت رونما ہوئی وہ یہی فتنہ خوارج ہے۔ اور اس فتنہ کی ابتداء دنیا کے مال ومتاع کی حرص سے ہوئی۔ کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ حنین کے موقع پر مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے تو ذوالخویصرہ نامی ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ عدل کیجئے آپ نے عدل نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا تو خائب وخاسر ہوا اگر میں عدل نہیں کروں گا تو کون عدل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اہل زمین پر امین بنایا ہے اور تم مجھے امین نہیں سمجھتے۔ جب وہ شخص واپس جانے کے لیے مڑا تو حضرت عمر نے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی اور ایک روایت میں ہے، یہ اجازت طلب کرنے والے حضرت خالد بن ولید تھے۔ تو آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دو اس کی جنس سے ایک ایسی قوم نکلے گی کہ ان کی نمازوں اور قرآن کی تلاوت کے مقابلہ میں تم اپنی نماز اور تلاوت کو حقیر سمجھو گے۔ اور وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح کمان سے تیر نکلتا ہے۔ تم جہاں بھی انہیں پاؤ قتل کرو، ان کو قتل کرنے والے کو بڑا ثواب ملے گا۔ اس فرقہ کا ظہور حضرت علی کے دور خلافت میں ہوا۔ آپ نے نہروان کے مقام پر ان کے ساتھ جنگ کی۔ پھر انہی خوارج سے مختلف فرقوں کا ظہور ہوا۔ قدریہ، معتزلہ اور جہمیہ وغیرہم۔ رسول اللہ ﷺ نے ان فرقوں کے بارے میں پہلے ہی خبر دے دی تھی۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور سوائے ایک کے باقی تمام جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کی یہ جنت میں جانے والا گروہ کون ہوگا؟ فرمایا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر کاربند رہے گا(2)۔ حضرت حذیفہ روایت کرتے ہیں رسول

1۔ مسند امام احمد 48/6 2۔ المستدرک، کتاب العلم 129,128/1

اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا میری امت میں ایک قوم ایسی ہوگی جو قرآن کریم تو پڑھے گی لیکن اسے کھجور کی گٹھلیوں کی طرح بکھیریں گے اور اس کی غلط تاویل کریں گے۔

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ: لفظ اللہ پر وقف کرنے یا نہ کرنے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں تفسیر کی چار قسمیں ہیں۔1۔وہ تفسیر، جسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔2۔وہ، جسے عرب اپنی لغت سے سمجھتے ہیں۔3۔وہ، جسے علماء راسخین سمجھتے ہیں۔4۔ وہ، جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔یعنی حضرت ابن عباس لفظ اللہ پر وقف کرنے کے قائل ہیں۔ یہی قول حضرت عائشہؓ، عروہ، ابوشعشہ، ابونہیک وغیرہم سے مروی ہے۔حضرت ابو مالک اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ علیہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا خوف ہے۔1۔ مال کی کثرت ہوگی اور یہ ایک دوسرے حسد وبغض کریں گے اور آپس میں لڑائی جھگڑے پر اتر آئیں گے۔2۔قرآنی آیات کی تاویل کے درپے ہوں گے حالانکہ ان کی حقیقی تاویل اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اور علماء راسخین کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔3۔علم حاصل کر کے لا پرواہی سے ضائع کر دینا یہ حدیث انتہائی غریب ہے۔حضرت عمرو بن العاص رسول اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں۔آپ نے ارشاد فرمایا: قرآن پاک اس لیے نازل نہیں کیا گیا اس کی بعض آیات بعض کو جھٹلائیں گی، پس تمہیں جس چیز کا علم ہو اس پر عمل کرو اور جو متشابہ ہو اس پر ایمان لے آؤ۔حضرت عبداللہ بن عباس، عمر بن عبدالعزیز اور مالک بن انس فرمایا کرتے تھے کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔مگر اس کی تاویل کو نہیں جانتے۔حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اس کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے۔اور علمائے راسخین فرماتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ابن جریر نے بھی اسی قول کو پسند اور اختیار کیا ہے۔بعض علماء "وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" پر وقف کرتے ہیں۔یہی اکثر مفسرین اور اہل اصول کی رائے ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ ایسی چیز جو سمجھ نہ آئے، ایسا خطاب اللہ تعالیٰ کی جناب سے بعید ہے۔حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں ان علمائے راسخین میں ہوں جو تاویل کو جانتے ہیں۔حضرت مجاہد فرماتے ہیں ترَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ تاویل کو جانتے ہیں اور پھر کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ ربیع بن انس سے بھی یہی مروی ہے۔محمد بن جعفر بن زبیر فرماتے ہیں اس کی حقیقی تاویل اور مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور علمائے راسخین فرماتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔پھر متشابہ آیت کی تفسیر ان محکمات آیات سے کرتے ہیں جن میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی یوں قرآن کریم کی تمام آیات باہم مربوط اور منظم ہو جاتی ہیں۔نیز ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔دلیل اور حجت نافذ ہوتی ہے۔عذر ظاہر ہوتا ہے باطل عیاں ہو جاتا ہے کفر زائل ہو جاتا ہے۔حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے لیے دعا فرمائی اے اللہ! اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما۔تاویل کا علم مرحمت فرما۔بعض علماء نے یہاں تفصیل بیان کی ہے۔وہ فرماتے ہیں تاویل کا لفظ قرآن پاک میں دو معانی میں استعمال ہوا ہے۔1۔کسی چیز کی حقیقت واصلیت اور انجام ومآل جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَالَ يَاَبَتِ هٰذَا تَأْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ (یوسف:100)" یوسف نے کہا اے میرے پدر بزرگوار! یہ تاویل ہے میرے خواب کی جو پہلے (عرصہ ہوا میں نے) دیکھا تھا"۔اور ایک مقام پر ارشاد فرمایا: هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا تَأْوِيْلَهٗ ۚ يَوْمَ يَأْتِيْ تَأْوِيْلُهٗ (الاعراف:53)"یعنی مرنے کے بعد زندہ ہونے کی انہیں جو خبر دی گئی ہے اس کی حقیقت کے جاننے کا انتظار کرتے ہیں"۔اگر تاویل کا یہ معنی کیا جائے تو لفظ "اللہ" پر وقف کیا جائے گا۔کیونکہ جملہ امور کی اصل اور حقیقت سے اللہ ہی آگاہ ہے۔اس طرح الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مبتدا ہوگا اور يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ اس کی خبر ہوگا (آل عمران:7) تفسیر بیان کرنا اور کسی چیز کو تعبیر کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: نَبِّئْنَا بِتَأْوِيْلِهٖ ۚ (یوسف:36)" آپ بتائیے ہمیں اس کی تاویل"۔ اگر تاویل کا یہ معنی مراد لیا جائے تو پھر وقف الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ پر ہوگا۔کیونکہ علمائے راسخین اس کی تفسیر کو جانتے ہیں اس لیے کہ خطاب

انہی کو ہو رہا ہے۔ گو حقائق اشیاء کا انہیں بھی علم نہیں۔ اس بناء پر یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ حال ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بلا معطوف علیہ معطوف ہو۔ جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ..... يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا (الحشر:10-8) اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (الفجر:22) (یعنی وجاء الملا ئکۃ صفوفاً صفوفاً علمائے راسخین کی طرف سے یہ خبر دی گئی ہے) کہ وہ کہتے ہیں۔ ہم متشابہ پر ایمان لائے، محکم اور متشابہ تمام ہمارے رب کی طرف سے حق اور سچ ہے۔ ان میں ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اور یہ اس پر شاہد ہے کہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اس میں تضاد اور تناقض نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء:82) ''کیا وہ غور نہیں کرتے قرآن میں، اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر) اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں ارشاد فرمایا:

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ: یعنی اس کے صحیح معانی اور مفاہیم کو وہی سمجھتے ہیں جو عقل بیدار اور فکر سلیم کے مالک ہوتے ہیں۔ حضرت عبید اللہ بن یزیدؒ، جنہیں حضرت انس بن مالک، ابوامامہ اور ابودرداء سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے علمائے راسخین کے بارے میں سوال کیا گیا۔ فرمایا جن کی قسم سچی ہو۔ زبان راست گو، دل مستقیم، پیٹ حرام سے پاک، اور شرمگاہ زنا سے محفوظ۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو قرآن کریم کے بارے میں جھگڑا کرتے دیکھا۔ فرمایا تم سے پہلے لوگ بھی اسی لیے ہلاک ہوئے انہوں نے اللہ کی کتاب کی آیات کو ایک دوسرے کے خلاف ٹھہرایا۔ حالانکہ اللہ کی کتاب اس لیے نازل کی جاتی ہے کہ اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کریں۔ پس تم اس کی آیات میں اختلاف بتا کر ان میں تضاد پیدا نہ کرو جو تمہیں معلوم نہ ہو اسے اہل علم کے سپرد کر دو۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن حکیم سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔ ان میں لڑائی جھگڑا کرنا کفر ہے۔ آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمایا پھر فرمایا جو کچھ تمہیں معلوم ہو اس پر عمل کرو اور جو نا معلوم ہو اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ اس کی سند صحیح ہے لیکن یہ اس اعتبار سے معلل ہے کہ اس کے راوی کہتے ہیں کہ میں تو اسے ابو ہریرہ ہی سے جانتا ہوں۔ نافع بن یزید فرماتے ہیں: راسخون فی العلم سے مراد وہ علماء ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع کرتے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ بزرگوں کی تعظیم کرتے ہیں اور اپنے سے کم درجہ والوں کی تحقیر نہیں کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ اپنے رب سے یہ دعا کرتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا: اے باری تعالیٰ! جب تو نے ہمارے دلوں کو ہدایت پر ثابت قدم کر دیا ہے۔ اب ان کو اس راہ ہدایت سے دور نہ کر اور ہمیں ان لوگوں کی طرح نہ بنا دے جن کے دلوں میں کجی ہے۔ اور قرآن کی متشابہ آیات کی تاویل کرتے ہیں۔ بلکہ ہمیں صراط مستقیم اور اپنے دین حنیف پر قائم رکھ اور ہمیں اپنی جناب سے وہ رحمت عطا فرما جس سے تو ہمارے دلوں کو مضبوط کر دے اور ہمارے اختلاف کو دور کر کے ہمارے ایمان وایقان میں اضافہ فرما بے شک تو ہی سب کچھ اور بہت زیادہ دینے والا ہے رسول اللہ ﷺ یہ دعا اکثر کیا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ)۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا دل بھی الٹ پلٹ ہوتا ہے۔ فرمایا ہاں بنی آدم میں سے ہر ایک انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اسے سیدھا رکھے اور اگر چاہے تو اسے ٹیڑھا کر دے۔ ہم اپنے رب کی بارگاہ میں سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا نہ کرے اور وہ اپنی جناب سے ہمیں اپنی رحمت عطا فرمائے۔ کیونکہ وہی سب سے زیادہ عطا کرنے والا ہے۔ ایک روایت میں یہ

الفاظ زائد ہیں: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی دعا سکھائیے جو میں مانگا کروں۔ آپ نے فرمایا تم یہ دعا مانگا کرو: (رَبَّ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَاذْهَبْ غَيْظَ قَلْبِيْ وَاَجِرْنِيْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ) ''ترجمہ: اے اللہ! محمد نبی کریم ﷺ کے رب میرے گناہ معاف فرما دے۔ میرے دل کے غیظ وغضب کو دور کر دے اور میری گمراہ کن فتنوں سے حفاظت فرما''۔ حضرت عائشہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ اکثر یہ دعا (يَا مَقَلِّبَ الْقُلُوْبِ الخ) کیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ ہر دل رحمن کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ الی آخرہ۔ پھر فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا نہیں سنا۔ اس حدیث کی یہ سند اگرچہ غریب ہے لیکن اس کی اصل صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں مختلف اسناد سے مروی ہے۔ ایک روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کے وقت نیند سے بیدار ہوتے تو آپ یہ کلمات پڑھتے (لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِيْ وَ اَسْئَلُ رَحْمَتَكَ اَللّٰهُمَّ زِدْنِيْ عِلْمًا وَلَا تُزِغْ قَلْبِيْ بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنِيْ وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ) حضرت عبداللہ صنابحی فرماتے ہیں کہ انہوں نے مغرب کی نماز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی۔ انہوں نے پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ شریف اور قصار مفصل میں سے دو سورتیں پڑھیں۔ اور جب تیسری رکعت پڑھی تو میں ان کے قریب ہو گیا۔ یہاں تک کہ قریب تھا کہ میرے کپڑے ان کے کپڑوں سے مس ہو جاتے۔ میں نے سنا کہ وہ تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد یہ آیت پڑھ رہے تھے: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب تک یہ روایت نہیں سنی تھی وہ دوسری رکعت میں الحمد کے بعد ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ'' پڑھتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے یہی آیت پڑھنی شروع کر دی۔ فرماتے ہیں جب سے میں نے اسے سنا ہے اس کو ترک نہیں کیا۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ: یعنی علمائے راسخین یہ بھی دعا مانگتے ہیں اے ہمارے رب! تو قیامت کے دن تمام مخلوق کو جمع کرے گا۔ اور ان کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا۔ اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ عطا فرمائے گا۔ یعنی جو کچھ بھی اس نے دنیا میں اچھا یا برا عمل کیا اسے اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ⑩ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی۔ اور وہی (بدبخت) ایندھن ہیں آگ کا (ان کا طریقہ) مثل طریقہ آل فرعون کے اور ان لوگوں کے تھا جو ان سے پہلے تھے انھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یہاں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ (الروم: 57) ''پس نہ نفع دے گی اس دن ظالموں کو ان کی عذر خواہی''۔ دنیاوی زندگی میں انہیں جو مال و دولت عطا کی گئی وہ انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گی اور نہ ہی انہیں اللہ تعالیٰ کے دردناک عذاب سے بچا سکے گی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (التوبہ: 85) ''اور نہ

تعجب میں ڈالیں آپ کو ان کے اموال اور ان کی اولاد۔ یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں اس دنیا میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں'' دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (آل عمران: 197) ''اے سننے والے! نہ دھوکہ میں ڈالے تجھے چلنا پھرنا ان کا جنہوں نے کفر کیا ملکوں میں، یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لیے ہے پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے''۔ یہاں ان کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ (اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا) بے شک وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات سے کفر کیا اس کے رسل کو جھٹلایا۔ اس کی کتاب کی مخالفت کی اس کے انبیاء کے ارشادات و ہدایات سے مستفید نہ ہوئے۔ ان کو ان کے اموال واولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے یہی لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے ان کے ساتھ جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98) ''اے مشرکو! تم اور جن بتوں کی عبادت کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سب جہنم کا ایندھن ہوں گے''۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی والدہ ماجدہ ام الفضل فرماتی ہیں جب ہم مکہ میں تھے ایک رات رسول اللہ ﷺ اٹھے اور بلند آواز سے تین دفعہ پکارا اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا۔ یہ سن کر عمر بن خطاب کھڑے ہوئے اور عرض کی بے شک آپ نے اللہ تعالیٰ کے دین کا پیغام پہنچا دیا۔ اس کے بعد پھر صبح رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دین اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔ یہاں تک کہ کفر اپنی جگہ جا چکے گا۔ مسلمان اسلام کا پیغام لے کر سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے نکل جائیں گے۔ اور ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ لوگ قرآن سیکھیں گے پھر اس کی تلاوت بھی کریں گے (تکبر کے طور پر اور پھر کہیں گے) ہم نے قرآن پاک پڑھا اور اس کے احکام کو جانا۔ سو ہم سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ پھر فرمایا کیا یہ لوگ بھی بھلائی پر ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا یہ تم میں سے ہی ہوں گے اور یہی لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ اس کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ اور دوسری روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ حضرت عمر نے جواب میں کہا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بڑی محنت، کوشش سے پہنچایا۔ آپ نے لوگوں کو نصیحت فرمائی۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ: ان لوگوں کا طریقہ آل فرعون کے طریقہ کی مثل ہے۔ بعض نے داب کا معنی فعل بتایا ہے یعنی ان کا کام آل فرعون کے فعل کی مثل ہے۔ اور داب کے ہمزہ کو ساکن بھی پڑھا گیا ہے اور حرکت دے کر بھی پڑھا گیا ہے۔ جیسے نَهْر کو نَهَر بھی پڑھتے ہیں۔ اس کا معنی طریقہ، حال، شان، معاملہ اور عادت ہے۔ جس طرح کہ عرب کہتے ہیں (لَا يَزَالُ هٰذَا دَأْبِيْ وَ دَأْبُكَ) ''ترجمہ: میرا اور تمہارا حال یہی رہے گا'' امرؤ القیس نے بھی اس لفظ کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے (كَدَأْبِكَ مِنْ اُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا) ''ترجمہ: جیسا کہ اس سے پہلے ام الحویرث کے بارے میں تمہاری عادت تھی۔ جب تو نے اس کی محبت میں اپنے آپ کو تباہ کر دیا'' آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ ان کافروں کو ان کے مال واولاد فائدہ نہیں دیں گے بلکہ یہ تباہ و برباد ہو کر عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جیسے آل فرعون اور ان سے پہلے ان قوموں کا حال ہوا جنہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور اللہ تعالیٰ کی آیات و بینات سے کفر کیا۔ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس کی پکڑ سے کوئی نہیں بچ سکتا اور نہ ہی کوئی چیز اس کے احاطہ سے باہر ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہر چیز پر غالب ہے۔ اس کے سوا نہ تو کوئی معبود ہے اور نہ ہی پروردگار۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ

الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⑬

''(اے میرے رسول!) فرما دو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے جہنم کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ بے شک تھا تمہارے لیے (عبرت کا) نشان (ان) دو گروہوں میں جو ملے تھے (میدان بدر میں) ایک گروہ لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا کافر تھا دیکھ رہے تھے (مسلمان انہیں) اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے اور اللہ مدد کرتا ہے اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے یقیناً اس واقعہ (بدر) میں بہت بڑا سبق ہے آنکھ والوں کے لیے''۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اے محمد (ﷺ) ان کافروں کو کہہ دیجئے تم اس دنیا میں بھی مغلوب و مقہور ہو گے اور قیامت کے دن تمہیں ہانک کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔ حضرت عاصم بن عمرو فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ میدان بدر سے فتح و نصرت کے ساتھ لوٹے تو آپ نے یہودیوں کو بنو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور انہیں ارشاد فرمایا اے گروہ یہود مسلمان ہو جاؤ قبل اس کے کہ تمہیں بھی اس ذلت و رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے جس سے قریش دو چار ہوئے۔ تو ان یہودیوں نے یہ جواب دیا کہ آپ نے قبیلہ قریش کے ان چند لوگوں کو قتل کیا ہے جو اناڑی اور فنون حرب سے نابلد تھے۔ اس لیے کہیں دھوکہ نہ کھا جانا۔ اگر تم ہم سے جنگ کرو گے تو پھر معلوم ہوگا کہ مرد میدان کون ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا:

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ: اے شیخی بگھارنے والے یہودیو! تمہارے لیے جنگ بدر میں سامان عبرت ہے اور یہ انتباہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو عزت اور اپنے رسول کو فتح و نصرت دی ہے۔ جب یہ دو گروہ آپس میں برسر پیکار ہوئے۔ ایک گروہ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا تھا اور دوسرا کافر۔ یعنی مشرکین مکہ۔

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ: بعض علماء فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن مشرکین کو مسلمان تعداد میں دو گنا نظر آئے تھے۔ اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فتح و نصرت کا سبب بنا دیا۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے مشرکین نے عمرو بن سعد کو جاسوسی کے لیے بھیجا تا کہ مسلمانوں کی تعداد معلوم کرے اس نے آ کر بتایا کہ مسلمانوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے اور حقیقت میں بھی مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ جب جنگ شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار خاص فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیجے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ مسلمان دیکھ رہے تھے کہ کافروں کی تعداد ان سے دو گنا ہے۔ اس کے باوجود کہ مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح و نصرت عطا کی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھیں اور مشرکین کی تعداد چھ سو چھبیس تھی۔ انہوں نے یہ تعداد اس آیت کے ظاہر سے اخذ کی ہے۔ لیکن جمہور مورخین لکھتے ہیں۔ مشرکین کی تعداد نو سو ہزار کے درمیان تھی۔ حضرت عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بنی حجاز کے سیاہ فام غلام سے قریش کی تعداد کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا وہ بہت ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا وہ ہر روز کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں۔ اس نے کہا ایک دن نو اور ایک دن دس۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا ان کی تعداد نو سو اور ہزار کے درمیان ہے۔ حضرت علی سے بھی مروی ہے کہ ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ بہر حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مسلمانوں سے تین گنا تھے۔ اس بنا پر یہ قول مشکل ہے کیونکہ قرآن پاک نے ان کو دو گنا زیادہ بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے اس کی یہ توجیہ بیان کی ہے کہ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ کوئی کہے میرے پاس ہزار روپیہ ہے۔ اور مجھے اس کے دو

مثل کی ضرورت ہے۔ اس طرح اسے تین ہزار کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح یہ اشکال دور ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک سوال ابھی باقی ہے اور وہ ان دونوں قوموں پر وارد ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں غزوۂ بدر کے بارے میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (انفال:44) ''اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے دکھایا تمہیں (لشکر کفار) جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل اور قلیل کر دیا تمہیں ان کی نظروں میں تاکہ کر دکھائے اللہ تعالیٰ وہ کام جو ہو کر رہنا تھا''۔ یہاں تو بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین تعداد میں مسلمانوں سے کم نظر آ رہے تھے۔ اور اوپر والی آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا نظر آ رہے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو مختلف حالتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں جب ہم نے پہلے مشرکین کو دیکھا تو ہمیں دوگنا نظر آئے۔ اور پھر جب ہم نے ان کو دوبارہ دیکھا تو ایسے معلوم ہوا کہ ان کی تعداد ہمارے جتنی ہے۔ دوسری روایت میں فرماتے ہیں پھر مشرکین کی تعداد کو ہماری نگاہوں میں کم کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ کیا خیال ہے ان کی تعداد ستر ہوگی تو اس نے کہا نہیں میرے خیال میں یہ سو ہوں گے۔ اور جب ہم نے ان کو قید کیا تو ان میں سے ایک آدمی سے پوچھا تمہاری تعداد کتنی تھی تو انہوں نے کہا ایک ہزار۔ بہر حال پہلی دفعہ جب مسلمانوں نے مشرکین کی طرف دیکھا تو انہیں ان کی تعداد دوگنا معلوم ہوئی۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اس سے مدد اور استعانت اور نصرت و فتح طلب کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ مشرکین کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آئی۔ تو ان میں خوف و ہراس اور رعب و دبدبہ پیدا ہوا۔ اور پھر جب جنگ شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نظروں میں مشرکین کی تعداد کم کر دی۔ اور مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد کم کر دی۔ تاکہ ہر فریق بڑھ چڑھ کر دوسرے پر حملہ کرے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ وہ کام دکھائے جو ہو کر رہنا ہے نیز اللہ تعالیٰ حق اور باطل کے درمیان تمیز کر دے اور ایمان کے کلمہ کو کفر پر غالب کر دے۔ مومنین کو عزت عطا فرمائے اور کافروں کو ذلیل کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (آل عمران:123) ''اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدان) بدر میں حالانکہ تم بالکل کمزور تھے''۔ اور یہاں ارشاد فرمایا:

وَ اللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ: اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی نصرت سے مدد فرماتا ہے۔ اور بے شک اس واقعہ میں اصحاب عقل و خرد کے لیے عبرت ہے۔ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم، اس کے افعال کو سمجھ سکیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کیسے اپنی قدرت کے ساتھ اس دنیا میں اپنے مومنین بندوں کی مدد فرماتا ہے اور قیامت کے دن بھی انہیں اپنی نصرت سے سرفراز فرمائے گا۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَیْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

''آراستہ کی گئی لوگوں کے لیے ان خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور چوپائے اور کھیتی یہ سب کچھ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا

ہے۔ (اے میرے رسول!) آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز۔ ان کے لیے جو متقی بنے ان کے رب کے ہاں باغات ہیں رواں ہیں ان کے نیچے نہریں ہمیشہ رہیں گے (متقی) ان میں اور (ان کے لیے) پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور حاصل ہوگی انہیں خوشنودی اللہ کی اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو"۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیاوی زندگی کی ان لذتوں کو بیان فرمایا ہے جنہیں لوگوں کے لیے آراستہ کیا گیا ہے۔ ان چیزوں میں سب سے پہلے عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ عورت کا فتنہ سب سے زیادہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ نقصان دہ فتنہ نہیں چھوڑا۔ ہاں اگر کوئی شخص گناہ سے بچنے اور امت محمدیہ میں اضافہ کی نیت سے نکاح کرتا ہے تو اس کے لیے یہ عمل پسندیدہ، مسنون اور مستحب ہے۔ اس کی ترغیب کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ دنیا سامان لذّت ہے اس کا بہترین سامان لذّت نیک عورت ہے۔ اگر مرد اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کرے اور اگر اسے حکم دے تو اس کی اطاعت کرے اور اگر وہ گھر سے غیر حاضر ہو تو وہ اپنی عزت اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا عورتوں اور خوشبو کو میرے لیے محبوب بنادیا گیا ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی ازواج سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ تھی۔ مگر آپ گھوڑوں کو بھی پسند فرماتے تھے۔ بیٹوں کی محبت کبھی تو باہمی فخر اور زینت کے لیے ہوتی ہے لیکن یہ مذموم ہے۔ لیکن کبھی یہ محبت امت محمدیہ میں اضافہ کی نیت سے ہوتی ہے۔ یہ چیز پسندیدہ اور محبوب ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔ زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت کے ساتھ نکاح کرو قیامت کے دن میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔ اسی طرح مال کی محبت اگر فخر و تکبر، فقراء و مساکین پر جبر اور ظلم کا اظہار کرنے کے لیے ہو تو یہ مذموم ہے۔ لیکن اگر یہ محبت عزیز و اقارب کی مدد کے لیے اور نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہو تو یہ محمود اور پسندیدہ ہے۔ "قنطار" کی مقدار میں مفسرین کرام کا اختلاف ہے۔ بعض نے ہزار دینار کہا ہے۔ بعض کہتے ہیں گیارہ سو دینار بعض بارہ سو دینار، اسی طرح چالیس ہزار، ساٹھ ہزار، ستر اور اسی ہزار کے قول بھی موجود ہیں۔ ان تمام اقوال کا حاصل یہی ہے کہ قنطار مال کثیر کو کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے۔ اور ایک اوقیہ زمین و آسمان کی تمام اشیا سے بہتر ہے:(1)۔ ابن ماجہ نے اسے حضرت ابوہریرہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے اسے معاذ بن جبل اور عبداللہ بن عمر سے اور ابن ابی حاتم نے ابوہریرہ اور ابو درداء سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابی بن کعب سے یہی مروی ہے۔ حضرت ابودرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایک سو آیات پڑھے اس کا نام غافلوں میں نہیں لکھا جاتا۔ اور جو شخص سو سے لے کر ہزار تک آیات پڑھے اسے اللہ تعالیٰ ایک ہزار قنطار اجر عطا فرماتا ہے۔ اور ایک قنطار بہت بڑے پہاڑ کی مثل ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ایک دو ہزار اوقیہ کا ہے۔ اور طبرانی کی روایت میں ایک ہزار دینار بتایا گیا ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں، قنطار بارہ سو دینار کا ہے۔ یہی حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ ضحاک کہتے ہیں کہ بعض اہل عرب کے نزدیک قنطار بارہ سو دینار کا ہے اور بعض کے نزدیک بارہ ہزار دینار کا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ بیل کی کھال کو اگر سونے سے بھر دیا جائے تو یہ ایک قنطار ہوگا۔ اسے مرفوعاً بھی روایت کیا گیا ہے۔ لیکن موقوف زیادہ صحیح ہے۔ گھوڑوں کے ساتھ محبت تین صورتوں میں ہے۔ **1**۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھوڑوں کو پالا جائے کہ جب بھی ان کی ضرورت پیش آئے تو ان پر سوار ہو کر جہاد کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے گھوڑے

1۔ مسند امام احمد 363/2

پالنے والے کو ثواب ملے گا۔ 2۔ گھوڑے فخر و غرور اور مسلمانوں کی دشمنی کے لیے پالے جائیں تو یہ پالنے والوں کے لیے بوجھ ثابت ہوں گے۔ 3۔ کسی سے سوال کرنے سے بچنے کے لیے اور ان کی نسل کی حفاظت کے لیے گھوڑے پالے جائیں۔ اور گھوڑے پالنے والا ان میں اللہ کے حق یعنی زکوٰۃ کو نہ بھولے تو یہ گھوڑے اس کے لیے ستر ثابت ہوں گے۔ اس مضمون کی ایک اور آیت کریمہ کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (انفال:60)۔

مُسَوَّمَةِ سے مراد چرنے والے اور پنج کلیان گھوڑے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر عربی گھوڑا فجر کے وقت اللہ تعالیٰ کی اجازت سے دو دعائیں کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اے اللہ! تو بنی آدم میں سے مجھے جس کے قبضہ میں دے مجھے اس کے نزدیک اس کے مال و اہل سے زیادہ محبوب کر دے اور میرے نزدیک اس کے اہل اور مال کو مجھ سے زیادہ محبوب کر دے۔ الانعام، سے مراد اونٹ گائے اور بکریاں وغیرھا ہے۔ اور "اَلْحَرْثِ" سے مراد وہ زمین ہے جسے کاشتکاری کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ انسان کا بہترین مال سدھایا ہوا گھوڑا اور پھلدار کھجور ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ دنیاوی زندگی کی فانی اور زائل ہونے والی زیب و آرائش اور کروفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہی اچھا ٹھکانہ اور واپس لوٹنے کی جگہ ہے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی میں نے عرض کی یا باری تعالیٰ! تو نے خود ہی اس دنیاوی زندگی کو ہمارے لیے زینت بنایا ہے۔ تو اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ: اے نبی (ﷺ) فرما دیجئے اے لوگو! کیا تمہیں میں اس سے بہتر چیز نہ بتا دوں۔ یعنی دنیا کی زندگی کی نعمتوں اور آسودگی سے جو کہ ختم اور زائل ہونے والی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے ہاں باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں۔ یعنی ان باغوں کے درمیان اور اطراف میں شہد، دودھ، شراب طہور، اور پانی کی نہریں جاری ہیں اور اس کے علاوہ ایسے ایسے حسین مناظر اور خوبصورت نظارے ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھے نہ کسی کان نے سنے اور نہ ہی کسی دل میں کھٹکے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہیں گے۔ اس جگہ کو بدلنے کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہیں آئے گا اور ان کے لیے جنت میں ایسی ازواج ہوں گی جو ہر قسم کی نجاست، حیض اور نفاس اور ان تمام عوارض سے پاک ہوں گی جو دنیا میں عورتوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی۔ اس کے بعد ان پر اللہ تعالیٰ کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمائے گا۔ اور سورۂ برأت میں ارشاد فرمایا: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ "یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہوگی"۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ: اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے وہ ہر ایک کو اس کے حق کے مطابق عطا فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿16﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿17﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے تو معاف فرما دے ہمارے لیے ہمارے گناہ اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے (یہ مصیبتوں میں) صبر کرنے والے ہیں اور (ہر حالت میں) سچ بولنے والے ہیں اور (عبادت میں) عاجزی کرنے والے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے ہیں اور (اپنے گناہوں کی) معافی مانگنے والے ہیں سحری کے وقت"۔

اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ: اللہ تعالیٰ اپنے ان متقی اور پرہیزگار بندوں کا وصف بیان کرتا ہے۔ جن کو اس نے بے حد وحساب انعام دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم یقیناً تجھ پر ایمان لے آئے۔ تیرے رسولوں، تیری نازل کردہ کتابوں پر بھی ایمان لائے۔ اس ایمان کی برکت سے ہمارے گناہوں کو معاف کردے اور اپنے وسیع فضل واحسان سے ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔ یہ لوگ عبادات کو سرانجام دینے اور محرمات کو ترک کرنے میں مشقت پر صبر کرنے والے ہیں اور ہر حال میں سچ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے ہیں اور اپنے مال کو ان تمام راہوں میں خرچ کرتے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ وہ اعزہ واقارب، محتاج اور ضرورت مندوں کی حاجات کو پورا کرتے ہیں۔ اور سحری کے قوت اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اس سے سحری کے وقت استغفار کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو کہا: قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ ''ترجمہ: فرمایا عنقریب مغفرت طلب کروں گا تمہارے لیے۔'' تو اپنی دعا کو سحری کے وقت کے لیے موخر کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں جب رات کا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے۔ ہے کوئی مانگنے والا میں اسے عطا کروں، ہے کوئی دعا کرنے والا، اس کی دعا قبول کروں، ہے کوئی مغفرت طلب کرنے والا اس کی مغفرت کروں۔ اس حدیث کو صحیحین اور دوسری بہت سی حدیث کی کتب میں روایت کیا گیا ہے۔ حافظ دارقطنی نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں اس حدیث کو مختلف اسناد سے بیان کیا ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کبھی وتر رات کے ابتدائی حصہ میں کبھی درمیانے اور کبھی آخری حصہ میں پڑھتے تھے پھر آپ نے وتروں کو سحری کے وقت پڑھنے کا معمول بنالیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر تہجد کی نماز پڑھتے رہتے اور اپنے غلام نافع سے پوچھتے کیا سحری کا وقت ہوگیا ہے۔ جب وہ بتاتے ہاں سحری کا وقت ہوگیا ہے تو آپ طلوع فجر تک دعا اور استغفار میں مشغول رہتے۔ حضرت حاطب فرماتے ہیں میں نے سحری کیوقت مسجد کے کونہ میں ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا اے رب! تو نے مجھے حکم دیا میں نے تیری اطاعت کی یہ سحری کا وقت ہے مجھے بخش دے جب میں نے غور سے دیکھا تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود تھے۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں ہمیں یہ حکم تھا کہ جب ہم تہجد کی نماز پڑھیں تو آخر میں سحری کے وقت ستر دفعہ استغفار پڑھیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

''شہادت دی اللہ تعالیٰ نے (اس بات کی کہ) بیشک نہیں کوئی خدا سوائے اس کے۔ اور (یہی گواہی دی) فرشتوں نے۔ اور اہل علم نے (ان سب نے یہ بھی گواہی دی کہ وہ) قائم فرمانے والا ہے عدل وانصاف کو نہیں کوئی معبود سوائے اس کے (جو)

عزت والا حکمت والا ہے بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور نہیں جھگڑا کیا جن کو دی گئی تھی کتاب مگر بعد اس کے کہ آ گیا تھا ان کے پاس صحیح علم (اور یہ جھگڑا) باہمی حسد کی وجہ سے تھا اور جو انکار کرتا ہے اللہ کی آیتوں کا تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے تو آپ کہہ دیجیے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر اللہ کے سامنے اور جنہوں نے میری پیروی کی اور کہیے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں سے کہ کیا تم اسلام لائے پس اگر وہ اسلام لے آئیں جب تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیر لیں تو اتنا ہی آپ کے ذمہ تھا کہ آپ پیغام پہنچا دیں (جو آپ نے پہنچا دیا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو''۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اور اس کی گواہی کافی ہے۔ وہی تمام گواہوں سے سچا گواہ ہے کہ وہی تمام مخلوق کا یکتا معبود ہے۔ تمام مخلوق اس کی غلام اور محتاج ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ (النساء: 166) ''لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اس کتاب کے ذریعہ جو اس نے اتاری آپ پر''۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور اہل علم کی شہادت کو اپنی شہادت کے ساتھ ملایا اور فرمایا فرشتے اور اہل علم بھی اس کے معبود حقیقی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اس سے علماء کی بڑی فضیلت اور خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔ ''قَآئِمًا'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ ہر وقت، اور ہر حال میں وحدہ لا شریک ہے۔ پھر تاکید اً ذکر فرمایا کہ معبود حقیقی وہی ہے۔ عزیز اس ذات کو کہتے ہیں جو اپنی عظمت و کبریائی کے اعتبار سے غالب ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ذات اپنے اقوال و افعال و شرعی احکام اور قضا و قدر میں صاحب حکمت بھی ہے۔ حضرت زبیر بن عوام فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو میدان عرفات میں یہ آیت کریمہ پڑھتے ہوئے سنا آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھ کر یوں عرض کی۔ اے رب! میں بھی تیری الوہیت کی گواہی دینے والوں میں سے ہوں'' (1)۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے عرض کی اے میرے پروردگار میں بھی گواہی دیتا ہوں۔ حضرت غالب القطان فرماتے ہیں کہ میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا۔ حضرت اعمش کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ رات کو تہجد کے لیے اٹھے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کو پڑھا تو فرمانے لگے میں بھی وہی گواہی دیتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے گواہی دی ہے اور اس گواہی کو اللہ تعالیٰ کے پاس ودیعت رکھتا ہوں۔ اور یہ اللہ کے پاس میری امانت ہے۔ اور پھر بار بار اس آیت کو پڑھتے رہے۔ پھر میرے دل میں خیال آیا کہ شاید انہوں نے کوئی حدیث سنی ہو، صبح ہوتے ہی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے ابو محمد! کیا وجہ ہے تم اس آیت کو بار بار پڑھ رہے ہو۔ کیا اس کی فضیلت کے بارے میں کوئی حدیث وارد ہوئی ہے؟ میں ایک مہینہ بھر تمہارے پاس ٹھہرا ہوں لیکن آپ نے یہ حدیث مجھے بیان نہیں فرمائی۔ انہوں نے کہا قسم بخدا میں تو تمہیں ایک سال تک حدیث بیان نہیں کروں گا۔ حضرت غالب فرماتے ہیں میں ایک سال تک ان کے پاس ٹھہرا رہا اور ان کے دروازے پر پڑا رہا جب سال ختم ہو گیا تو میں نے عرض کی کہ اب مکمل سال گزر چکا ہے۔ اب تو مجھے یہ حدیث سنائیے۔ انہوں نے فرمایا ابو وائل نے حضرت عبداللہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن اس کے پڑھنے والے کو حاضر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ عزوجل فرمائے گا کہ میرے بندے نے میرے ساتھ ایک عہد کیا تھا۔ اور مجھ سے زیادہ عہد پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میرے اس بندے کو جنت میں داخل کر دو۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اس کے ہاں اسلام کے سوا اور کوئی دین مقبول نہیں۔ اسلام

1۔ مسند امام احمد: 1/166

سے مراد تمام رسل وانبیاء کی اتباع کرنا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا سب سے آخر میں انبیاء ورسل کے خاتم محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں جنہوں نے نبوت کے راستوں کو مسدود کر دیا۔ اب آپ کی بعثت کے بعد اگر کوئی شخص آپ کی شریعت کو چھوڑ کسی اور دین پر عمل کرے گا تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آل عمران:85) ''اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی اور دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے''۔ اور اس آیت میں دین کو صرف اسلام میں ہی منحصر کر دیا گیا ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کو شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ...... اِنَّ الدِّيْنَ پڑھتے تھے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بذات خود فرشتے اور اہل علم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین اسلام ہی ہے۔ لیکن جمہور قراء نے اسے (اِنَّ الدِّيْنَ......) ہی پڑھا ہے۔ اور جمہور کا قول زیادہ ظاہر ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب نے پیغمبروں کے مبعوث ہونے اور آسمانی کتب کے نازل کرنے میں اختلاف کیا۔ اور انہوں نے یہ اختلاف اور جھگڑا باہمی حسد اور بغض کی وجہ سے کیا اور اپنے اس حسد اور بغض کی وجہ سے حق بات میں بھی اختلاف کرنے لگے۔ یعنی ان کے درمیان اتنا سخت اختلاف ہو گیا کہ وہ کسی کی حق بات کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے ارشاد فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ آیات میں اختلاف کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کا بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ وہ ان کی اس تکذیب کا محاسبہ فرمائے گا۔ اور اپنی نازل کردہ کتاب کی مخالفت پر سزا دے گا۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ: اگر یہ لوگ توحید کے بارے میں آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرما دیجئے میں نے اپنی عبادت کو اللہ وحدہ لا شریک کے لیے خالص کیا۔ جس کا نہ کوئی مدمقابل ہے اور نہ ہی اولاد اور بیوی۔ اور جو میرے امتی اور پیروکار ہیں ان کا بھی یہی قول ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ۗ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف:108) '' آپ فرما دیجئے، یہ میرا راستہ ہے میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ کی طرف، واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو حکم فرمایا کہ وہ اہل کتاب اور ان پڑھ مشرکوں کو اپنے دین اور شریعت کی دعوت دیں۔ ارشاد فرمایا:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ: اہل کتاب اور ان پڑھوں کو کہ دیجئے کہ مسلمان ہو جاؤ اگر وہ اسلام لے آئیں تو وہ ہدایت پالیں گے۔ اور اگر انہوں نے اسلام سے منہ پھیرا تو آپ کے ذمہ صرف پیغام پہنچانا ہی تھا۔ پس اللہ تعالیٰ ان سے حساب لے گا۔ انہوں نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت عطا فرمائے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون گمراہی کا۔ اسی سے اس کے کسی فعل کے بارے میں سوال نہیں کیا جا سکتا بلکہ مخلوق سے ہی سوال ہوگا۔ یہ آیت کریمہ اور اس قسم کی دوسری آیات صراحۃً اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام مخلوق کی طرف مبعوث فرمایا گیا ہے۔ اور یہ اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ قرآن وسنت اس پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:158) '' اے نبی فرمائیے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ (فرقان:1) '' ترجمہ: بڑی (خیر و) برکت والا ہے وہ جس نے اتارا الفرقان اپنے (محبوب) بندہ پر تا کہ وہ بن جائے سارے جہان والوں کو (غضب الٰہی سے) سے ڈرانے والا''۔ بخاری ومسلم اور اس کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب وعجم کے بادشاہوں اور امراء کو اپنی نبوت اور دین پر ایمان لانے کی دعوت کے لیے خطوط لکھے۔

اسی طرح آپ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو بجا لائے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اس امت میں سے جس کسی نے بھی میری نبوت کے بارے میں سنا خواہ یہودی ہو یا نصرانی اور وہ مجھ پر ایمان نہ لایا تو وہ جہنمی ہوگا(1)۔ اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا مجھے سرخ و سیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کو اس کی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں ایک یہودی لڑکا نبی کریم ﷺ کے لیے وضو کا پانی پیش کرتا تھا اور آپ کے نعلین مبارک آپ کے سامنے رکھتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہو گیا آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اس کا والد اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے اس لڑکے کا نام لے کر فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھو۔ اس نے اپنے والد کی طرف دیکھا لیکن وہ خاموش رہا۔ آپ نے اسے دوبارہ کلمہ پڑھنے کی تلقین کی اس نے اپنے والد کی طرف دیکھا اس کے والد نے کہا ابو القاسم کی بات مان لو۔ یہ سن کر اس لڑکے نے پڑھا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ نبی کریم ﷺ یہ فرماتے ہوئے اس کے گھر سے نکلے کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری وجہ سے اسے جہنم کی آگ سے بچا لیا(2)۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات و احادیث ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾

''بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے ہیں انبیاء کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں عدل و انصاف کا لوگوں میں سے تو خوشخبری دو انہیں دردناک عذاب کی یہ ہیں وہ (بدنصیب) اکارت گئے جن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں۔ اور نہیں ہے ان کے لیے کوئی مددگار''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت بیان فرمائی ہے اور ان کے بعض کرتوت کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے انبیاء سابقہ اور رسول اللہ ﷺ پر نازل کردہ آیات کی تکذیب کی۔ اور یہ صرف تکبر، عناد اور مخالفت کی بناء پر کیا۔ اور بہت سے لوگوں کو قتل کرنے کے ساتھ ساتھ ان انبیاء کو بھی قتل کیا بغیر کسی وجہ اور جرم کے، جنہوں نے احکام الٰہی ان تک پہنچائے۔ ان کا جرم صرف یہی تھا کہ انہوں نے انہیں حق کی طرف دعوت دی تھی۔

وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ: اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں۔ اور یہ تکبر کی انتہاء ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حق کا انکار کرنا، لوگوں کے حقوق غصب کرنا تکبر ہے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! قیامت کے دن سب سے سخت عذاب کس کو ہوگا۔ فرمایا اس شخص کو جس نے کسی نبی کو قتل کیا۔ یا ایسے شخص کو قتل کیا جو نیکی کا حکم دیتا تھا اور برائی سے روکتا تھا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی اور فرمایا اے ابو عبیدہ! بنو اسرائیل نے دن چڑھتے ہی ایک گھڑی میں تینتالیس انبیاء کو قتل کیا۔ پھر بنی اسرائیل سے ستر صالح اور نیک مرد کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ان قاتلوں کو نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا۔ تو بنی اسرائیل نے دن کے آخری حصہ میں ان سب کو بھی قتل کر دیا۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کا ذکر کیا۔

1۔ مسلم، کتاب الایمان: 134 2۔ فتح الباری، کتاب الجنائز: 3/319

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں بنی اسرائیل نے دن کے پہلے حصہ میں تین سو انبیاء کو قتل کیا اور آخری حصہ میں بازار میں اپنے کاروبار میں لگ گئے۔ چونکہ انہوں نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا اور مخلوق خدا پر ظلم وستم کیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیا میں ذلت ورسوائی مسلط کر دی اور آخرت میں انہیں دردناک اور رسوا کن عذاب دیا جائے گا۔ فرمایا ان لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔ یہی وہ بدنصیب ہیں جن کے اعمال دنیا وآخرت میں اکارت گئے۔ اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

”کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا کچھ حصہ کتاب کا (جب) بلائے جاتے ہیں کتاب الٰہی کی طرف تاکہ تصفیہ کر دے ان کے باہمی جھگڑوں کا تو پیٹھ پھیر لیتا ہے ایک گروہ ان میں سے درآنحالیکہ وہ روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس (بیباکی) کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بالکل نہیں چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ مگر چند دن گنے ہوئے اور فریب میں مبتلا رکھا انہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان باتوں نے جو وہ خود گھڑا کرتے تھے۔ سو کیا حال ہوگا (ان کا) جب ہم جمع کریں گے انہیں اس روز جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا“۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا: یہاں اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر تعجب کا اظہار فرماتا ہے جو اپنے زعم کے مطابق تورات وانجیل پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور جب انہیں یہ دعوت دی جائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا جو حکم تورات وانجیل میں آیا ہے اسے فیصل اور حکم مانتے ہوئے آپ پر ایمان لاؤ تو اس وقت بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ اس میں ان کی انتہائی مذمت ہے۔ کیونکہ اس میں ان کے بغض وعناد اور جان بوجھ کر حق کا انکار کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا: ان کو حق کی مخالفت اور ذات باری تعالیٰ پر بہتان باندھنے پر اس چیز نے جری کیا کہ وہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ انہیں جہنم میں صرف سات دن عذاب دیا جائے گا۔ یعنی دنیا میں ہر ہزار سال کے بدلہ میں انہیں صرف ایک دن عذاب ہوگا۔ اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں ذکر چکی ہے۔

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: اور ان کے دین کے معاملہ میں انہیں فریب میں مبتلا کر دیا تھا ان باتوں نے جو وہ گھڑا کرتے تھے۔ ان کو اس باطل دین پر اس چیز نے مزید پختہ کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو یہ دھوکہ دیا کرتے تھے کہ نار جہنم ان کو گناہوں کی وجہ سے صرف چند دن تک مس کرے گی۔ اور یہ ان کا اپنی طرف سے افتراء اور جھوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ایسا کچھ نازل نہیں فرمایا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زجر وتوبیخ اور دھمکی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اس دن ان کی کیا حالت ہوگی جب اللہ تعالیٰ ان کو جمع کرے گا۔ درآنحالیکہ انہوں نے ذات الٰہی پر افتراء باندھا۔ اس کے رسولوں کو جھٹلایا، اس کے انبیاء، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے علماء کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کے بارے میں ان سے سوال کرے گا۔ انہیں ان کے تمام برے اعمال کی سزا دے گا۔ اس لیے

ارشاد فرمایا۔ ان کا اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم انہیں اس دن جمع کریں گے جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں اور ہر ایک شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

”(اے حبیب! یوں) عرض کرو اے اللہ! اے مالک ملکوں کے تو بخش دیتا ہے ملک جسے چاہتا ہے اور چھین لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو داخل کرتا ہے رات (کا حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن (کا حصہ) رات میں اور نکالتا ہے تو زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب“

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد (ﷺ!) اپنے رب کی عظمت کا اظہار، اس کی نعمتوں پر شکر ادا اپنے تمام امور اس کے سپرد کرتے ہوئے اس کی بڑائی اس طرح بیان کرو اے اللہ! ملکوں کے مالک! تو جسے چاہتا ہے بادشاہی عطا فرما دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ تو ہی دینے والا ہے، تو ہی دے کر واپس لینے والا ہے۔ جس چیز کا تو نے ارادہ فرمایا وہ وجود میں آ گئی اور جس کو تو نے نہ چاہا وہ عدم میں رہی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے اور اس نے نبی کریم ﷺ اور امت محمدیہ کو جو نعمت عظیمہ عطا فرمائی ہے اس پر شکر بجالانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اور وہ عظیم نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کو بنی اسرائیل سے رسول عربی، قریشی، مکی، امی، خاتم النبیین کی طرف منتقل کیا ہے۔ وہ رسول جس کو جن وانس ہر دو کی طرف مبعوث فرمایا گیا۔ جو اپنے سے قبل تمام انبیاء ورسل کے فضائل وکمالات اور محاسن وخوبیوں کا حامل ہے۔ اور آپ کو ایسے خصائص عطا فرمائے جو آپ سے پیشتر کسی نبی کو عطا ہوئے نہ کسی رسول کو۔ اپنی ذات وصفات اور شرعی احکام کا علم اور مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ کے تمام مغیبات پر مطلع فرمایا آخرت کے حقائق روز روشن کی طرح آپ کے سامنے آشکار کر دیئے۔ آپ کی امت کو شرق وغرب میں پیدا کیا۔ آپ کے دین اور شریعت کو تمام ادیان اور شرائع پر غالب کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے دائم درود وسلام ہوں آپ پر جب تک گردش لیل ونہار قائم ہے۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ (آل عمران: 26) یعنی اے اللہ! تو ہی اپنی مخلوق میں ہر قسم کے تصرف کا مالک ہے تو جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جب کفار مکہ نے یہ کہا کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی صاحب حیثیت اور غنی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا تو ان کے رد میں ارشاد فرمایا: اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ۔ (زخرف: 32) ”کیا وہ تقسیم کرتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو“۔ یعنی ان کو یہ اختیار نہیں ہے۔ ہم جیسے چاہیں اپنی مرضی کے مطابق اپنی مخلوق کے بارے میں فیصلہ کریں۔ ہمیں نہ تو کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہمیں ہمارے کسی فیصلہ پر ٹوک سکتا ہے۔ ہمارے ہر امر میں کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی مرضی ومنشاء سے نبوت عطا کر دے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام: 124) ”اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ (اس دل کو) جہاں وہ رکھتا ہے اپنی رسالت کو“۔ ایسا ہی ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بنی اسرائیل: 21) ”دیکھو کیسے بزرگی دی ہے

ہم نے بعض کو بعض پر''۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں لکھا ہے۔ خلیفہ مامون نے روم کے علاقہ میں حمیری زبان میں ایک محل پر لکھا ہوا دیکھا۔ اس نے ترجمان کو اس کا عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ ترجمان نے بتایا ''جب تک لیل ونہار کی گردش رہے گی اور نیلگوں آسمان پر ستارے چمکتے رہیں گے، یہ ملک وسلطنت ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے۔ مگر صاحب عرش کی بادشاہی قائم رہے گی اسے زوال وانحطاط نہیں ہوگا۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ: دن کی طوالت کا کچھ حصہ رات کی چھوٹائی کو عطا کر دیتا ہے اس طرح دن رات برابر ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح اس کے برعکس۔ اسی سے سال کے چاروں موسم بہار، گرمی، سردی اور خزاں معرض وجود میں آتے ہیں۔

وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ: یعنی دانے سے فصل اگاتا ہے اور دانہ فصل سے۔ کھجور کا درخت ایک گٹھلی سے اگاتا ہے اور گٹھلی کھجور کے درخت سے۔ مومن کو کافر سے پیدا کرتا ہے اور کافر کو مومن سے۔ انڈے کو مرغی سے پیدا کرتا ہے اور مرغی سے انڈہ۔ اسی طرح اور بھی بہت سی اشیاء ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی کامل قدرت سے پیدا کرتا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا تو جسے چاہے بغیر حساب کا رزق عطا فرماتا ہے۔ یعنی اتنا مال عطا فرما دیتا ہے جس کو وہ شمار نہیں کر سکتا۔ بعض لوگوں پر رزق تنگ کر دیتا ہے۔ اپنی حکمتوں سے تو ہی آگاہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم جس سے دعا مانگی جائے وہ قبول فرماتا ہے۔ آل عمران کی اس آیت میں ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

''نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر اور جس نے کیا یہ کام، پس نہ رہا (اس کا) اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ۔ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے) اور اللہ ہی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جانا ہے''۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو کافروں کے ساتھ ترک موالات کا حکم دیا ہے اور انہیں اس سے منع کیا ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر مشرکین کے ساتھ راہ ورسم نہ بڑھائیں۔ پھر دھمکی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جو شخص ایسا کرے گا اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہے گا جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ڰ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ڰ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (الممتحنہ: 1) ''اے ایمان والو! نہ بناؤ میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو (اپنے) جگری دوست تم تو اظہار محبت کرتے ہو ان سے ...... اور جو ایسا کرے تم میں سے تو وہ بھٹک گیا راہ راست سے'' اور یہی مفہوم کئی دوسری آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے مہاجر وانصار کے درمیان مواخات کا ذکر کرنے کے بعد کافروں کے بارے میں ذکر فرمایا: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (الانفال: 73) ''اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں۔ اگر تم (ان حکموں پر) عمل

نہیں کرو گے تو برپا ہو جائے گا فتنہ ملک میں اور (پھیل جائے گا) بڑا فساد)"۔

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً : یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی رخصت دی ہے جو کفار کے ساتھ رہتے ہوں کہ وہ کسی وقت ان کے شر سے بچنے کے لیے ظاہری طور پر میل جول رکھیں۔ لیکن دل سے مومن کو مشرک سے دوستی نہیں لگانی چاہیے۔ جیسا کہ حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں ہم بعض لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں حالانکہ ہمارے دل ان پر لعنت بھیج رہے ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ صرف زبان سے دوستی کا اظہار کریں اور عملاً اس سے بچے۔ کئی دوسرے مفسرین نے بھی اس رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس ارشاد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (النحل:106) "جس نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا اور اس کا دل مطمئن ہے ایمان کے ساتھ"۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں یہ حکم قیامت تک ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔ یعنی اگر کسی نے اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اس کے دشمنوں سے دوستی لگائی یا اس کے اولیاء واحباء سے دشمنی کی تو وہ اس سے اس کا انتقام لے گا۔ پھر فرمایا اسی کی طرف ہر ایک نے لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ عطا فرمائے گا۔ حضرت میمون بن مہران فرماتے ہیں ایک دن حضرت معاذ بن جبل ہمیں خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا اے بنی اودا! میں تمہاری طرف رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں۔ یہ جان لو سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر کسی کا ٹھکانہ جنت ہوگا اور کسی کا جہنم۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ښ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ښ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

"فرما دیجیے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کرو اسے، جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ، اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن موجود پائے گا ہر نفس جو کی تھی اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کی تھی اس نے برائی تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان (حائل ہوتی) مدت دراز اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے (عذاب) سے اور اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر"۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ: اللہ تعالیٰ یہاں بیان فرماتا ہے۔ کہ وہ ظاہر و باطن سے آگاہ ہے۔ بلکہ دلوں میں چھپے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔ اس کا علم اپنے بندوں کے تمام احوال اور اوقات کو محیط ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔ خواہ وہ ریت کا ذرہ ہو بلکہ اس سے بھی کم۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی ان تمام چیزوں میں اس کی قدرت نافذ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو تنبیہ ہے کہ وہ ہر حال میں اس سے ڈرتے رہیں تاکہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہ کریں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اور وہ انہیں جلد ہی سزا دینے پر قادر ہے۔ اگرچہ بعض اوقات مہلت عطا کر دیتا ہے۔ لیکن اگر ایک دفعہ مہلت دے کر پکڑے تو پھر بڑی سختی سے پکڑتا ہے اس لیے اس کے بعد ارشاد فرمایا جس دن ہر شخص اپنی نیکی اور برائی کو اپنے سامنے حاضر پائے

گا۔ یعنی قیامت کے دن انسان کے ہر اچھے برے عمل اس کے سامنے ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ (القیامہ:13) ”آگاہ کر دیا جائے گا انسان کو اس روز جو عمل اس نے پہلے بھیجے اور جو (اثرات) وہ پیچھے چھوڑ آیا“۔ پس جو اپنے اچھے اعمال دیکھے گا وہ اس سے خوش ہوگا اور جو اپنے برے اعمال دیکھے گا وہ رنجیدہ ہوگا۔ اور تمنا کرے گا کاش! اس کے اور اس کے برے اعمال کے دوران ایک مدت حائل ہوتی۔ جیسا کہ وہ شیطان جو دنیا میں انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور اسے برائی کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے قیامت کے دن انسان اس کو اس طرح کہے گا: يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ (الزخرف:38) ”کاش! میرے درمیان اور (اے شیطان) تیرے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی۔ تو تو بہت برا ساتھی ہے“۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے عذاب سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی امید وڈھارس بندھائی تاکہ وہ اس کی رحمت اور لطف واحسان سے مایوس نہ ہو جائیں۔ اور فرمایا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بہت مہربانی اور لطف واحسان ہے کہ اس نے انہیں اپنی ذات ہی سے ڈرایا۔ اور اپنی مخلوق پر بڑا مہربان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق اس کے دین حنیف پر کاربند رہے اور اس کے رسول کی اطاعت واتباع کرتی رہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

”(اے محبوب!) آپ فرمائیے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ کی اور (اس کے) رسول کی پھر اگر وہ منہ پھیریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کفر کرنے والوں کو“۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے دعویٰ محبت کی قلعی کھولی ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ اور اس کی دوستی کا دم تو بھرتا ہے لیکن شریعت محمدی پر کاربند نہیں۔ وہ شخص اپنے اس دعویٰ میں سراسر جھوٹا ہے۔ جب تک کہ اپنے اقوال وافعال میں شریعت اور سنت محمدی کی پیروی نہ کرے۔ اس لیے حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہمارے طریقہ کے مطابق نہ ہو اس کا یہ عمل مردود ہوگا (1)۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا اے محبوب! انہیں فرما دیجیے۔ تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ تب اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمانے لگے۔ یعنی تم تو صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کے طالب تھے اگر تم میرے نبی ﷺ کی پیروی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی محبت عطا فرما دے گا۔ اس کا درجہ تمہاری طلب سے بڑھ کر ہے۔ جیسا کہ کسی دانا کا قول ہے ”یہ تو کچھ نہیں کہ تو محبت کرے بلکہ اصل یہ ہے کہ تم کو محبوب بنا لیا جائے۔“ حضرت حسن بصری اور کئی دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اللہ کے ساتھ محبت کا دعویٰ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما کر یہ بتا دیا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو میرے نبی کی اتباع کرو۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دین صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے محبت اور اسی کے لیے بغض کا نام ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ حضرت ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے۔

وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی رسول کریم ﷺ کی اتباع کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔

1۔ فتح الباری، کتاب الاعتصام 13/317

اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر خاص و عام کو حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ......: اے نبی فرمایئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اتباع کرو اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کریں تو اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کفر ہے جو شخص رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں فرماتا۔ اگرچہ وہ بزعم خویش دعویٰ کرتا رہے کہ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کا بڑا مقرب ہے۔ اس کا یہ دعویٰ اس وقت تک سچا نہیں ہوگا جب تک وہ رسول کریم ﷺ نبی الامی اور خاتم المرسلین کی اتباع نہ کرے۔ یہ وہ عظیم الشان رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام جن وانس کی طرف رسول بنا کر بھیجا اگر سابقہ انبیاء و مرسلین بلکہ ان میں سے اولوالعزم رسول بھی آپ کے زمانہ میں ہوتے تو ان کو بھی آپ کی اتباع اور اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ مزید اس کی تفسیر آیت کریمہ: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ (آل عمران:81) کے تحت آئے گی۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا آدم (علیہ السلام) اور نوح (علیہ السلام) اور ابراہیم (علیہ السلام) کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہان والوں پر۔ یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى: اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے کہ اس نے تمام اہل زمین میں سے ان چند گھرانوں اور خاندانوں کو چن لیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے تخلیق فرمایا۔ ان میں اپنی خاص روح پھونکی۔ فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ تمام اشیاء کے ناموں اور ان کے حقائق سے آگاہ کیا۔ پھر جنت میں بسایا۔ پھر اپنی خاص حکمت کی وجہ سے وہاں سے زمین پر اتارا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اس وقت پہلا رسول بنا کر بھیجا اہل عرب کی طرف جب لوگ بتوں کی پوجا کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگے تھے۔ پھر جب آپ ایک طویل مدت تک دن رات قوم کو اللہ تعالیٰ کی دعوت دیتے رہے کبھی سرا اور کبھی علانیۃً۔ لیکن اس سے وہ دور ہوتے گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی اے اللہ تعالیٰ! ان سب کو غرق کر دے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور صرف وہی چند لوگ بچے جنہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کا دین قبول کیا تھا۔ اسی طرح آل ابراہیم کو بھی فضیلت عطا فرمائی اور آپ کی آل سے ہی سید البشر، خاتم النبیین کو بھی مبعوث فرمایا۔ اس جگہ عمران سے حضرت مریم علیہا السلام کے والد مراد ہیں۔ ابن اسحاق نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ عمران بن یاشم بن اُمون بن میشا بن حزقیا، بن اُحریق بن عزاریا بن اُمصیا بن ناوُش بن اُحزیو بن بھوا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایاذ بن رحیعم بن سلیمان بن داؤد۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ان شاء اللہ اس کا تفصیلی بیان سورۃ انعام میں آئے گا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾

''جب عرض کی عمران کی بیوی نے اے میرے رب! میں نذر مانتی ہوں تیرے لیے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے سوقبول فرمالے (یہ نذرانہ) مجھ سے بے شک تو ہی (دعائیں) سننے والا (نیتوں کو) جاننے والا ہے پھر جب اس نے جنا اسے (تو حیرت وحسرت سے) بولی اے رب! میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا۔ اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے۔ اور (ماں نے کہا) میں نے نام رکھا ہے اس کا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے''۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ: حضرت عمران کی زوجہ اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کا نام حنہ بنت فاقوذ تھا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن انہوں نے ایک پرندے کو دیکھا جو اپنے بچوں کو دانہ کھلا رہا تھا۔ اس پر ان کے دل میں بھی اولاد کی خواہش پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بچے کے لیے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا اور اسی رات انہیں حمل ٹھہر گیا۔ جب انہیں حمل کا یقین ہو گیا تو انہوں نے نذر مانی کہ انہیں اللہ تعالیٰ جو بھی اولاد دے گا اس کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی اے اللہ! میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے کہ میرے شکم میں جو بچہ ہو گا اسے تمام امور سے آزاد کر کے بیت المقدس کی خدمت کے لیے مقرر کر دوں گی۔ اے باری تعالیٰ! میرے اس نذرانہ کو قبول فرمالے یقیناً تو ہی میری دعا کو سننے والا اور نیت کو جاننے والا ہے۔ اس وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے ہاں لڑکا پیدا ہو گا یا لڑکی۔ لیکن لڑکی پیدا ہوئی تو بڑی حیرت و حسرت سے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی میں نے لڑکی کو جنم دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اس نے کیا جنا ہے۔ ''وضعتُ'' کو ''وضعتُ'' بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی یہ قول حضرت حنہ (والدہ مریم) کا تھا۔ اور وضعت بھی پڑھا گیا ہے اس کا معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اس نے کیا جنا ہے۔ پھر عرض کی کہ وہ جس لڑکے کا سوال کیا کرتی ہے لڑکی تو اس طرح نہیں ہے۔ یعنی جس طرح ایک لڑکا مسجد کی خدمت کر سکتا ہے اور طاقت وہمت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکتا ہے اس طرح لڑکی نہیں کر سکتی۔

وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ: میں نے اس کا نام مریم رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس دن بچہ پیدا ہو اسی دن نام رکھنا بھی جائز ہے۔ جس طرح کہ اس آیت کریمہ کے ظاہری سیاق سے معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ حکم اسلام کی شریعت سے پہلے کا ہے۔ چونکہ یہ ہماری شریعت کے خلاف نہیں ہے اس لیے اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی یہی ثابت ہے کہ جب آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو آپ نے فرمایا اس رات اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹا عطا فرمایا ہے اور میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کے نام پر ابراہیم رکھا ہے۔ اس طرح حضرت انس کے بھائی کی پیدائش ہوئی تو آپ اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ آپ نے اسے اپنے دست مبارک سے گھٹی دی اور اس کا نام عبداللہ رکھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اس رات اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹا عطا فرمایا ہے۔ اس کا کیا نام رکھوں۔ آپ نے فرمایا اپنے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھو(1)۔ حضرت ابی اسید کے ہاں جب بیٹا پیدا ہوا تو آپ رسول اللہ ﷺ سے گھٹی دلانے کے لیے آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ آپ کسی اہم معاملہ میں مصروف تھے اس لیے بچے کی طرف توجہ نہ رہی۔

1۔ فتح الباری، کتاب الادب 10/57

تو حضرت ابی اسید نے بچے کو گھر واپس بھجوا دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ فارغ ہوئے اور آپ نے بچے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے عرض کی کہ میں نے اسے واپس بھجوا دیا ہے۔ آپ نے اس کا نام منذر رکھا۔ حضرت سمرہ بن جندب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ اپنے عقیقہ میں گروی ہوتا ہے۔ پس ساتویں دن بچے کا عقیقہ کیا جائے اس کا نام رکھا جائے اور اس کی چنڈ کی جائے (سر منڈوایا جائے) اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ایک روایت میں "یُدمٰی" کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کا معنی یہ ہے کہ خون بہایا جائے یعنی جانور ذبح کیا جائے۔ اور یہی الفاظ زیادہ ثابت شدہ ہیں۔ زبیر بن بکار سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عقیقہ کیا اور ان کا نام ابراہیم رکھا۔ لیکن اس کی سند ثابت نہیں ہے اور مذکورہ بالا صحیح حدیث کے بھی مخالف ہے۔ اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو پھر ان میں تطبیق یہ ہوگی کہ ان کا نام ابراہیم عقیقہ کے دن مشہور ہوا۔

وَاِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِكَ: میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ یعنی حضرت حنہ نے اپنی بیٹی مریم علیہا السلام اور ان کی اولاد عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ میں دے دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا۔ مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا شیطان ہر بچے کو اس کی پیدائش کے وقت کچوکا لگاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ چیخ چیخ کر رونے لگتا ہے۔ مگر مریم علیہا السلام اور آپ کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے محفوظ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں اگر چاہو تو اس آیت کو پڑھ لو۔ اس حدیث کو ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ بخاری، مسلم، ابن اسحاق اور لیث بن سعد نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں صرف عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ جب شیطان نے ان کو کچوکا مارنا چاہا تو وہ کچوکا انہیں نہ لگا بلکہ پردے پر لگ گیا۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ وَّ اَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا ۚ قَالَ يٰمَرۡيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

"پھر قبول فرمایا اسے اس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا اور نگران بنا دیا اس کا زکریا کو جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا (علیہ السلام) (اس کی) عبادت گاہ میں (تو) موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں۔ (ایک بار) بولے اے مریم! کہاں سے تمہارے لیے آتا ہے یہ (رزق) مریم بولیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب"۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اس نے مریم علیہا السلام کی والدہ حنہ کی نذر کو قبول فرما لیا۔ اور حضرت مریم علیہا السلام کی بہترین پرورش کی اور انہیں ظاہری و باطنی حسن و جمال سے نوازا۔ نیک اور صالح بندوں کی صحبت مہیا کی تاکہ وہ ان سے علم، دین اور اخلاق سیکھ سکیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ: یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کا کفیل بنا دیا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت مریم یتیم ہوگئی تھیں۔ لیکن دوسرے مورخین فرماتے ہیں: بنی اسرائیل میں قحط پڑ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کو اپنی

کفالت میں لے لیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں منافات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کا کفیل مقرر کیا تھا تا کہ وہ ان سے علم نافع اور عمل صالح حاصل کریں اور دوسری وجہ یہ بھی کہ وہ حضرت مریم علیہا السلام کے خالو بھی تھے۔ یہ ابن اسحاق اور ابن جریر کا قول ہے۔ بعض کے نزدیک ان کے بہنوئی تھے۔ جیسا کہ حدیث اسراء میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں خالوزاد بھائی تھے۔ یہ بات ابن اسحٰق کے قول پر صادق آسکتی ہے۔ کیونکہ اہل عرب ماں کی خالہ کے لڑکے کو خالہ زاد بھائی کہتے تھے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ کی یتیم صاحبزادی حضرت عمارہ کے بارے میں فیصلہ کیا کہ ان کو ان کی خالہ حضرت جعفر بن ابی طالب کی بیوی کی پرورش میں دیا جائے اور آپ نے فرمایا خالہ والدہ کے قائم مقام ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی عظمت و بزرگی اور عبادت و کرامت کا ذکر کیا ہے ارشاد فرمایا:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ: حضرت مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابوشعشہ، ابراہیم نخعی، ضحاک اور قتادہ وغیرہم فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب مریم علیہا السلام کے پاس ان کے عبادت خانہ میں جاتے تو وہاں سردیوں میں گرمیوں کے پھل اور گرمیوں میں سردیوں کے پھل موجود پاتے۔ بعض نے رزق کا معنی علم بتایا ہے، بعض نے فرمایا ہے کہ ان کے پاس صحائف تھے جن میں دین کے احکام اور علمی مسائل لکھے ہوتے تھے۔ لیکن پہلا قول ہی صحیح ہے اور وہ اولیاء کرام کی کرامات پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی احادیث بھی موجود ہیں۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے آپ کے پاس یہ بے موسمی پھل دیکھے تو ایک دن پوچھا: اے مریم! یہ تمہارے پاس کہاں سے آتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا فرماتا ہے۔ حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے کئی دن کھائے پیئے بغیر گزار دیئے۔ حتیٰ کہ جب آپ کو بھوک کی وجہ سے تکلیف محسوس ہوئی تو آپ اپنی ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے گئے لیکن کسی کے پاس بھی کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ حضرت سیدہ فاطمہ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا بیٹی! کھانے کی کوئی چیز ہے۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ انہوں نے عرض کی میری جان آپ پر قربان ہو قسم بخدا میرے پاس کوئی چیز نہیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ ابھی رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر نکلے ہی تھے کہ میری ایک پڑوسن نے مجھے دو روٹیاں اور گوشت کا ایک ٹکڑا بھیجا۔ میں نے اسے ایک طشت میں رکھا اور دل میں خیال کیا کہ بہتر یہی ہے کہ میں اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں بھیج دوں میں نے حسن اور حسین کو بلایا اور کہا کہ بھاگ کر جاؤ اور اپنے نانا جان کو لے آؤ۔ آپ تشریف لائے تو میں نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی ابھی کچھ کھانا بھیجا ہے جو میں نے آپ کے لیے رکھ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا بیٹا لاؤ، کیا چیز ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے وہ طشت آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب اس کے اوپر سے کپڑا ہٹایا تو وہ روٹیوں اور گوشت سے پر تھا۔ میری اچانک اس پر نظر پڑی۔ پہلے تو میں بڑی حیران ہوئی۔ پھر سوچا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی برکت ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اس کے نبی ﷺ پر درود پڑھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے دیکھا تو فرمایا اے بیٹی! یہ کہاں سے آیا ہے۔ میں نے عرض کی ابا جان یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حد و حساب رزق دیتا ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ حمد و ثنا ہو اس ذات باری تعالیٰ کے لیے جس نے تمہیں بنی اسرائیل کی سیدہ کا مقام عطا کیا۔ کیونکہ جب ان کے پاس کوئی چیز آتی اور ان سے پوچھا جاتا کہ یہ کہاں سے آئی تو وہ بھی یہی جواب دیتیں۔ پھر آپ نے حضرت علیؓ کو بلوایا اور یہ کھانا آپ نے، حضرت علی، فاطمہ، حسن، حسین اور آپ کی تمام ازواج مطہرات اور اہل بیت نے کھایا اور سیر ہو گئے۔ حضرت فاطمہ فرماتی ہیں اس کے باوجود کھانا اسی طرح تھا۔ میں نے وہ کھانا اپنے

پڑوسیوں کے ہاں بھیج دیا۔ یہ سب برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

''وہیں دعا مانگی زکریا نے اپنے رب سے عرض کی اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا۔ پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (اپنی) عبادت گاہ میں کہ بے شک اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے آپ کو یحییٰ کی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرمان کی اور سردار ہوگا اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہوگا اور نبی ہوگا صالحین سے۔ زکریا کہنے لگے اے رب! کیونکر ہوگا میرے ہاں لڑکا حالانکہ آ لیا ہے مجھے بڑھاپے نے اور میری بیوی بانجھ ہے فرمایا بات اسی طرح ہے (جیسی تم نے کہی لیکن) اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ عرض کی اے میرے رب! مقرر فرما دے میرے لیے کوئی نشانی۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ نہ بات کر سکو گے لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت اور پاکی بیان کرو (اس کی) شام اور صبح''۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ: حضرت زکریا علیہ السلام نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم علیہا السلام کو غیر موسمی پھل عطا کرتا ہے۔ تو آپ کے دل میں اولاد کی خواہش پیدا ہوئی۔ اگرچہ آپ اس وقت بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور آپ کی زوجہ محترمہ بھی بوڑھی ہونے کے ساتھ ساتھ بانجھ ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنے رب کے حضور دست طلب پھیلا دیا۔ اور بڑی آہستگی سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا کی۔ اے میرے پروردگار! مجھے اپنی جناب سے نیک اولاد عطا فرما کیونکہ تو ہی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس دعا کو قبول فرمایا اور جس وقت آپ اپنی عبادت گاہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ فرشتے نے آپ کو ندا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک بچے کی نوید جانفزا دیتا ہے اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ ان کا نام یحییٰ اس لیے رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کے ساتھ زندہ رکھا۔

مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ: جو تصدیق کرے گا اللہ تعالیٰ کے ایک فرمان کی۔ حضرت عبداللہ بن عباس، حسن بصری، قتادہ، عکرمہ، مجاہد اور کئی دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ہی سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی تھی۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طور طریقہ پر ہی گامزن ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ اور حضرت یحییٰ کی والدہ اکثر حضرت مریم علیہا السلام سے فرمایا کرتی تھیں کہ مجھے اپنے شکم میں موجود بچہ تیرے شکم میں موجود بچے کو سجدہ کرتے ہوئے محسوس

ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اور آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عمر میں تھوڑے سے بڑے تھے۔

وَسَيِّدًا: حضرت ابوالعالیہ، ربیع بن انس، قتادہ، سعید بن جبیر وغیرہم نے سید کا معنی بردبار اور حلیم بیان کیا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ علم اور عبادت کے اعتبار سے سردار تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ثوری اور ضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد بردبار اور متقی ہیں۔ سعید بن مسیّب فرماتے ہیں فقیہ عالم کو سید کہا جاتا ہے۔ عطیہ کا قول ہے کہ وہ اپنے اخلاق عالیہ اور دینداری میں سردار تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں سید وہ ہوتا ہے جسے غضب اور غصہ مغلوب نہ کر سکے۔ ابن زید نے اس کا معنی شریف بتایا ہے۔ مجاہد وغیرہ فرماتے ہیں سید سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہو۔

وَّحَصُوْرًا: حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر وغیرہم فرماتے ہیں "حصور" وہ ہوتا ہے جو عورتوں کے پاس نہ آئے۔ ابوالعالیہ اور ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ جس کی اولاد نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک روایت ہے کہ "حصور" وہ ہوتا ہے جسے انزال نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ روز قیامت تمام مخلوق میں سے حضرت یحییٰ ہی بغیر کسی گناہ کے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے۔ اس کے راوی سعید بن مسیّب ہیں۔ انہوں نے اس کو روایت کرنے کے بعد یہ آیت تلاوت کی اور زمین سے کوئی چیز اٹھائی اور فرمایا حصور وہ ہوتا ہے جس کا عضو خاص اس کی مثل ہوتا ہے۔ حضرت یحییٰ بن سعید قطان نے اپنی شہادت کی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اس روایت مرفوع سے موقوف زیادہ اصح ہے۔ یہی روایت ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر ابن آدم قیامت کے دن گناہ کے ساتھ ملے گا۔ خدا تعالیٰ چاہے تو اسے عذاب دے چاہے اسے معاف فرما دے سوائے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے جو سردار، عورتوں سے پرہیز کرنے والے اور صالح نبی تھے۔ پھر آپ نے ایک تنکا پکڑا اور فرمایا ان کا عضو خاص اس کی مثل ہے۔ حضرت قاضی عیاض نے اپنی کتاب شفاء شریف میں فرمایا ہے۔ جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کی لفظ حصور سے صفت بیان کی ہے بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ یہ بیان کیا ہے کہ حصور وہ شخص ہوتا ہے جس کا عضو خاص نہ ہو لیکن محققین نے اس کا انکار کیا ہے۔ کیونکہ یہ تو ایک عیب اور نقص ہے جو نبی کی شان کے خلاف ہے۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ گناہوں سے معصوم ہیں۔ یعنی آپ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ گویا آپ کو گناہوں سے روک کر محفوظ رکھا گیا۔ اور اس کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ حصور وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے آپ کو نفسانی خواہش سے دور رکھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حصور اسے کہتے ہیں جو عورتوں کی خواہش نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جماع پر عدم قدرت نقص اور عیب ہے۔ بلکہ فضیلت یہ ہے کہ اس قوت کے موجود ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھے۔ یہ یا تو مجاہدہ سے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف عطا ہوتی ہے جیسا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام تھے۔ اور جو شخص یہ قوت رکھے اور اپنی بیوی کے حقوق پورے کرے لیکن یہ چیز اس کو اس کے رب کی یاد سے غافل نہ کرے تو یہ درجہ انتہائی بلند ہے۔ یہ اعلیٰ مرتبہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو عطا ہوا کہ ازواج مطہرات کی کثرت آپ کی یاد الٰہی میں مائل نہ ہوئی۔ بلکہ اپنی ازواج کے حقوق ادا کرنے اور ان کو نان ونفقہ مہیا کرنے اور دین کے معاملہ میں ان کی راہنمائی کرنے کی وجہ سے آپ کا مقام ومرتبہ مزید بلند ہوا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حصور کے لفظ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح بیان کرنا مقصود ہے فضیلت نہیں۔ اور یہ فضیلت اسی وقت ظاہر ہوگی جب اس کا معنی یہ کیا جائے کہ وہ نفسانی خواہشات سے پاک تھے۔ اور یہ چیز ان کے شرعی طریقہ سے کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنے، اس کے حقوق پورے کرنے اور اولاد چاہنے میں مانع نہیں۔ حضرت زکریا علیہ

السلام کی دعا سے بھی حضرت یحییٰ کی نسل پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی تھی۔ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً گویا اس کا معنی یہ ہے: اے اللہ! مجھے ایک ایسا بچہ عطا فرما جس کی آگے اولاد اور نسل چلے۔ واللہ اعلم۔

وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ: یہ حضرت یحییٰ کی ولادت کی بشارت کے بعد آپ کی نبوت کی بشارت ہے اور یہ خوشخبری پہلی نوید سے اعلیٰ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ارشاد فرمایا (اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) ''ترجمہ: یقیناً ہم لوٹا دیں گے اسے تیری طرف اور ہم بنانے والے ہیں اسے رسولوں میں سے۔'' اس بشارت کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام کو تعجب اور حیرت ہوئی کہ اس بڑھاپے میں ان کے ہاں اولاد کیسے ہوگی۔ تو انہوں نے عرض کی اے میرے پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہوگا۔ حالانکہ میں بھی بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ اس فرشتے نے جواب دیا بات تو ایسی ہی ہے جیسی آپ نے کہی۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کر کے رہتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بڑی عظمت کا مالک ہے۔ کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ پھر حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! میرے لیے کوئی علامت مقرر فرما دے۔ یعنی کوئی ایسی نشانی ہو جس سے میں یہ جان سکوں کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے سوائے اشارہ کے۔ یعنی تمہاری زبان تو صحیح ہوگی لیکن اس سے بات نہ کر سکو گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں ذکر و تسبیح و تہلیل کرنے کا حکم فرمایا۔ اور فرمایا اپنے پروردگار کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکی اور تقدیس بیان کرو۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ سورۂ مریم کی تفسیر کے تحت آئے گی۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

''اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں اور پسند کیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے۔ اے مریم! خلوص سے عبادت کرتی رہ اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب پھینک رہے تھے وہ (مجاور) اپنی قلمیں (یہ فیصلہ کرنے کے لیے) کہ کون ان میں سے سرپرستی کرے مریم کی اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے''۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کی گفتگو کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت مریم علیہا السلام سے ہمکلام ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو ان کی کثرت عبادت، زہد اور عفت و پاکدامنی اور پاکیزگی و طہارت کی وجہ سے تمام جہان کی عورتوں میں سے چن لیا۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں سے بہترین قریش کی عورتیں ہیں۔ جو اپنے بچوں پر بہت زیادہ شفقت کرنے والی اور اپنے خاوند کے مال و اسباب کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ حضرت مریم بنت عمران کبھی اونٹ پر سوار نہیں ہوئی تھیں۔ محدث عبدالرزاق نے اسے اپنی مصنف میں ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام مسلم نے بھی اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ حضرت علی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی

قوم بنی اسرائیل میں عورتوں میں سب سے بہترین عورت حضرت مریم علیہا السلام تھیں۔ اور قبیلہ قریش میں سب سے بہترین عورت خدیجہ بنت خویلد ہے۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام جہان کی عورتوں میں سے چار عورتیں افضل ہیں۔ 1۔ مریم بنت عمران، 2۔ خدیجہ بنت خویلد 3۔ فاطمہ بنت محمد (ﷺ) 4۔ آسیہ علیہا السلام زوجہ فرعون۔(1) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مردوں میں سے کامل تو بہت سے ہیں۔ لیکن عورتوں میں سے صاحب کمال صرف تین ہیں۔ 1۔ مریم بنت عمران۔ 2۔ آسیہ زوجہ فرعون۔ 3۔ خدیجہ بنت خویلد۔ اور عائشہ کو عورتوں پر اس طرح افضلیت حاصل ہے جس طرح ثرید کو تمام کھانوں پر۔ اس حدیث کو ابوداؤد کے علاوہ باقی صحاح میں بھی روایت کیا گیا ہے۔ لیکن بخاری کی راویت میں حضرت خدیجہ کا اسم گرامی نہیں ہے۔ میں نے اس حدیث کی تمام اسناد اور الفاظ کو اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے تذکرہ میں بیان کی ہیں۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو کثرت سے عبادت، خشوع وخضوع اور رکوع وسجود کرنے کا حکم دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے حصول کے لیے مسلسل عمل اور اس کی قضا وقدر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا حکم دیا۔ اس میں اگرچہ آپ کی آزمائش وابتلاء ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کو دنیا وآخرت میں بلند مرتبہ بھی ملے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ میں اپنی عظیم قدرت کا اظہار فرمایا۔ فرمایا کہ آپ سے بغیر باپ کے بچہ پیدا کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ قنوت کا معنی خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (الروم: 26) ''اور اسی کا ہے جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب اس کے تابع فرمان ہیں''۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جہاں بھی قنوت کا ذکر آیا ہے اس کا معنی اطاعت وفرمانبرداری ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام نماز میں اتنا طویل قیام فرماتیں کہ آپ کے پاؤں سوجھ جاتے۔ اور قنوت سے مراد نماز میں لمبے لمبے رکوع کرنا ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے رب کے لیے عبادت کرو اور رکوع وسجود کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ حضرت اوزاعی فرماتے ہیں کہ آپ اپنی عبادت گاہ میں بکثرت رکوع وسجود اور قیام میں مصروف رہتیں۔ حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک میں سے زرد رنگ کا پانی نکلنے لگتا۔ ابن عسا کر نے یحییٰ بن کثیر سے روایت کیا ہے کہ آپ نے اس قدر سجدے کیے کہ آپ کی آنکھوں سے زرد رنگ کا پانی نکلنے لگا۔ ابوشوزبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام ہر رات غسل فرمایا کرتی تھیں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کو ان تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد فرماتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ: اے محمد (ﷺ) آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے کہ اس واقعہ کی آپ خبر دیتے۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس واقعہ پر مطلع فرمادیا ہے گویا کہ آپ وہاں حاضر ہیں اور اس تمام واقعہ کا مشاہدہ فرمارہے ہیں۔ جب انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی کی۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ وہ یہ سعادت حاصل کرے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے پیدائش کے وقت ان کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور بیت المقدس کے خدام کے پاس لے آئی۔ یہ خدام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔ انہوں نے فرمایا یہ بچی لے لو۔ میں نے اس کی نذر مانی ہوئی تھی کہ اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کروں گی۔ یہ اگرچہ ہے تو لڑکی اور مجھے معلوم ہے کہ عورت حیض کی حالت میں مسجد

1۔ عارضۃ الاحوذی، کتاب المناقب: 255,254/13

میں داخل نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ میں نذر مان چکی ہوں اس لیے میں اسے اپنے گھر واپس نہیں لے جاؤں گی۔ وہ کہنے لگے یہ ہمارے امام عمران کی صاحبزادی ہے۔ اس لیے انہوں نے برضا و رغبت قبول کر لیا۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا اس بچی کو مجھے دے دو۔ کیونکہ اس کی خالہ میری بیوی ہے۔ وہ کہنے لگے یہ ہمارے امام کی صاحبزادی ہے اس لیے آپ کے حوالے کرنے پر ہمارا دل نہیں مانتا۔ اس پر قرعہ اندازی کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اور انہوں نے اپنی ان قلموں کے ساتھ قرعہ اندازی کی جن کے ساتھ وہ تورات لکھتے تھے۔ اس طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ حضرت عکرمہ اور کئی دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ قرعہ ڈالنے کے لیے دریائے اردن پر گئے اور فیصلہ یہ ہوا کہ سب اپنی قلمیں دریا میں ڈالیں گے۔ جس کی قلم پانی کے بہاؤ میں ٹھہری رہے گی وہی ان کی پرورش کا حقدار ہوگا۔ جب انہوں نے دریا میں قلمیں ڈالیں تو پانی حضرت زکریا علیہ السلام کی قلم کے سوا باقی تمام قلموں کو بہا کر لے گیا۔ بلکہ بعض روایات میں تو یہ آتا ہے کہ آپ کا قلم پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت اوپر کو چڑھنے لگ گیا۔ آپ حضرت مریم علیہا السلام کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان سب کے سردار، عالم، امام اور نبی بھی تھے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٤٧﴾

''جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا معزز ہوگا دنیا اور آخرت میں اور (اللہ کے) مقربین سے ہوگا۔ اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی اور پکی عمر میں بھی اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ مریم بولیں اے میرے پروردگار! کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ؟ حالانکہ ہاتھ تک نہیں لگایا مجھے کسی انسان نے۔ فرمایا بات یونہی ہے (جیسے تم کہتی ہو لیکن) اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے''۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ: فرشتے حضرت مریم علیہا السلام کو خوشخبری دے رہے تھے کہ ان کے ہاں ایک عظیم الشان بچہ پیدا ہوگا۔ یعنی یہ بچہ ایسا ہوگا جس کا وجود اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے ہوگا۔ اور یہ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ کی تفسیر ہے۔ ان کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ یعنی آپ اس نام کے ساتھ دنیا میں مشہور ہوں گے۔ مؤمنین آپ کو اسی نام سے پہچانیں گے۔ آپ کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا کیونکہ کثرت سے سیاحت کرتے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آپ کو مسیح اس لیے کہتے ہیں کہ آپ کے پاؤں نیچے سے برابر تھے ان میں کوئی خم نہ تھا۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ بیماروں پر اپنا دست مبارک پھیرتے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے شفایاب ہو جاتا۔ قرآن کریم میں عیسیٰ بن مریم کہا گیا ہے۔ یعنی آپ کی نسبت والدہ کی طرف کی گئی ہے۔ اس لیے کہ آپ کے والد نہیں تھے۔

وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کو بڑا مقام و مرتبہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ پر وحی نازل فرمائے گا۔ آپ کو کتاب عطا فرمائی جائے گی اور اس کے علاوہ آپ پر اللہ کا خصوصی فضل و احسان ہوگا۔ اور آخرت میں آپ شفاعت فرمائیں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شفاعت کا اذن فرمائے گا اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ کی شفاعت بھی قبول ہوگی۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا: یعنی آپ بچپن میں اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دیں گے اور یہ آپ کے لیے معجزہ ہوگا۔ اور ادھیڑ عمر میں بھی آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیں گے۔ اور آپ قول وعمل کے اعتبار سے صالحین میں سے ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بچپن میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جریج کے ساتھی نے گفتگو کی۔ اور ایک دوسری روایت میں تیسرے بچے کا بھی ذکر ہے۔ جب حضرت مریم علیہا السلام نے فرشتوں سے اس بچے کی بشارت سنی۔ تو اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتے ہوئے یہ عرض کی۔

رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ: اے میرے پروردگار! یہ بچہ میرے ہاں کیونکر پیدا ہوگا۔ حالانکہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ ہی نکاح کرنے کا ارادہ ہے اور نہ ہی میں بدکار ہوں (حَاشَا لِلّٰهِ) فرشتے نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب دیا کہ بات تو یونہی ہے جیسے تم کہتی ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ عظیم قدرت کا مالک ہے۔ کوئی چیز اسے عاجز نہیں کرسکتی۔ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے سوال کے جواب میں (يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ) فرمایا تھا۔ اور یہاں (يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ) فرمایا۔ تاکہ کسی منکر کے لیے کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ فرمالیتا ہے تو بس اسے اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کے حکم کے بعد ایک لمحہ کی تاخیر نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (القمر: 50) ''اور نہیں ہوتا ہمارا حکم مگر ایک بار جو آنکھ جھپکنے میں ہو جاتا ہے''۔ یعنی ہم صرف ایک دفعہ ہی حکم دیتے ہیں۔ دوبارہ حکم نہیں دیتے وہ چیز آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی وجود میں آجاتی ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴿٤٨﴾ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

''اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا اسے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل۔ اور (بھیجے گا اسے) رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف (وہ انہیں آکر کہے گا کہ) میں آگیا ہوں تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر تمہارے رب کی طرف سے (وہ معجزہ یہ ہے کہ) میں بنا دیتا ہوں تمہارے لیے کیچڑ سے پرندے کی سی صورت پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان صورت) میں تو وہ فوراً ہو جاتی ہے پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور (لاعلاج) کوڑھی کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع کر رکھتے ہو اپنے گھروں میں بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان دار ہو۔ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پہلے آئی

ہوئی کتاب تورات کی اور تا کہ میں حلال کر دوں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے سوڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ بیشک اللہ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے مجھے اور مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے تمہیں، سو اس کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے''۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: فرشتوں نے مریم علیہا السلام کو بیٹے کی جو خوشخبری سنائی تھی یہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے گا۔ کتاب سے مراد یہاں تورات ہے اور حکمت کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ تورات وہ کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ دونوں کتابیں یاد تھیں۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اور وہ انہیں بنی اسرائیل طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ وہ انہیں فرمائیں گے کہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ لے کر آیا ہوں۔ اور وہ معجزہ یہ ہے کہ میں تمہارے لیے مٹی سے ایک پرندے کی صورت بناؤں گا پھر اس میں پھونک ماروں گا تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزہ عطا فرمایا تھا کہ آپ مٹی سے پرندے کی مورتی بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو پھر وہ اللہ کے حکم سے سب کے سامنے پرندہ بن کر اڑنے لگتا۔

وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ: میں مادرزاد اندھوں کو تندرست کروں گا۔ ایک قول کے مطابق ''اکمه'' اسے کہتے ہیں جسے دن میں نظر آئے رات کو نظر نہ آئے۔ بعض نے اس کے برعکس کہا۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد بھینگا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ بچہ ہے جو پیدائشی طور پر اندھا ہو۔ یہ معنی ہی اعلیٰ اور آپ کے معجزہ کے طور پر زیادہ قوی اور بلیغ ہے۔

وَالْاَبْرَصَ: سفید داغ والے کوڑھی کو کہتے ہیں۔

وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ: اکثر علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس کے زمانہ کے اعتبار سے اسے کچھ خاص معجزات عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو کا بول بالا تھا۔ اور جادوگروں کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے معجزات عطا فرمائے۔ جنہوں نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور تمام بڑے بڑے جادوگروں کو حیران کر دیا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے یہ کرشمے معجزات ہیں اور یہ عظیم قدرت کے مالک کی طرف سے ہیں تو وہ سب مسلمان ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقرب بندے بن گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حکمت وطب کا دور دورہ تھا۔ تو آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزات عطا فرمائے جنہوں نے ان تمام حکماء اور اطباء کو عاجز کر دیا جو اپنے فن کے امام اور استاد تھے کیونکہ کسی طبیب کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ جماوات میں روح پھونک دے یا مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا بخشے اور قبروں میں پڑے ہوئے مردوں کو زندہ کر دے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ جس زمانہ میں مبعوث ہوئے۔ اس میں بڑے بڑے بلغاء، فصحاء خطباء اور شعراء کا طوطی بولتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی کتاب عطا فرمائی جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بے نظیر و بے مثال ولا جواب ہے۔ اگر تمام جن وانس مل کر ایک دوسرے کی مدد وتعاون سے اس جیسی ایک سورت بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے جو کسی بشری کلام کے مشابہ نہیں ہو سکتا۔

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ: یعنی میں تمہیں بتاؤں گا جو تم ابھی کھا کر آؤ گے اور جو تم کل کے لیے اپنے گھر میں ذخیرہ کر آئے ہو۔ اور بے شک ان تمام معجزات میں میری صداقت کی دلیل ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور میں اپنے سے پہلی نازل کی ہوئی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ میں تمہارے لیے ان بعض چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے تورات کے بعض احکام کو منسوخ کر دیا تھا۔ اور یہی قول اصح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ آپ

نے تورات کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کیا بلکہ آپ نے ان چیزوں کو حلال کیا جن کو انہوں نے اپنی باہمی مخالفت اور عناد کی وجہ سے حرام کیا تھا۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ (الزخرف:63) ''اور میں بیان کروں گا تم میں کچھ وہ بات جس میں تم اختلاف کرتے ہو''۔

وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ: اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لایا ہوں۔ جو میرے قول کی صداقت کی دلیل ہے۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی مجھے اور تمہیں مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ سو اسی کی عبادت کرو اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے سامنے خشوع و خضوع کرنے میں ہم سب برابر ہیں۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٥٢﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾

''پھر جب محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کفر (وانکار) (تو) آپ نے کہا کون ہیں میرے مددگار اللہ کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی۔ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور (اے نبی علیہ السلام!) آپ گواہ ہو جائیو کہ ہم (حکم الٰہی کے سامنے) سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا اور ہم نے تابعداری کی رسول کی، تو لکھ لے ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں کے ساتھ۔ اور یہودیوں نے بھی (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لیے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر (اور مؤثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے''۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ: پھر جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس کیا کہ وہ کفر اور گمراہی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں میرا کون مددگار رہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے لیے میری کون اتباع کرتا ہے۔ حضرت سفیان ثوری وغیرہ فرماتے ہیں اللہ کی معیت میں میرا کون مددگار رہے۔ مجاہد کا قول ہی زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہی ارادہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے میں میرا مددگار کون ہے۔ جیسا کہ مدینہ طیبہ ہجرت کرنے سے پہلے نبی کریم ﷺ حج کے موقع پر فرمایا کرتے تھے۔ کون ہے؟ جو مجھے پناہ دے تاکہ میں اپنے رب کے پیغام کو پہنچاؤں۔ کیونکہ قریش نے مجھے اپنے رب کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے۔ حتیٰ کہ انصار مدینہ اس کام کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو پناہ و نصرت دینے کا وعدہ کیا۔ تو آپ ہجرت کر کے مدینہ کے لیے تشریف لے گئے۔ انہوں نے آپ کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور آپ کا تمام دشمنوں سے دفاع کیا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جب یہ ارشاد فرمایا تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ اس کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کیا اور اس نور کی اتباع کی جو آپ پر نازل ہوا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ: بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ دھوبی تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کو ان کے سفید کپڑوں کی وجہ سے حواری کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ شکاری تھے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ حواری مددگار کو کہتے ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو فرمایا کون ہے؟ جو میرے ساتھ سینہ سپر ہو جائے تو حضرت زبیر اس کام کے لیے تیار ہوئے

اور کھڑے ہوئے۔ آپ نے دوبارہ ارشاد فرمایا تو پھر آپ ہی کھڑے ہوئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس (فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں امت محمد یہ میں لکھ لینا۔ اس کی سند عمدہ ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس گروہ کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی پر چڑھانے کا پورا ارادہ کیا۔ اور آپ کی مخالفت کی وجہ سے اس وقت کے بادشاہ کے پاس مخبری کر دی۔ وہ بادشاہ کافر تھا۔ انہوں نے بادشاہ کو بتایا کہ ایک شخص لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے وہ ان کو بادشاہ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے روکتا ہے۔ رعایا میں فساد برپا کرتا ہے۔ باپ بیٹے میں تفریق کرا دیتا ہے اس کے علاوہ اور بہت سی جھوٹی باتیں آپ کی طرف منسوب کیں۔ حتیٰ کہ ان بدکاروں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ولد الزنا ہے (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ / نقل کفر کفر نباشد) یہ باتیں سن کر بادشاہ غصہ میں آ گیا اس نے اپنے آدمی بھیجے جو انہیں گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیں۔ تا کہ اس سے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ ان آدمیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اپنے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر کے لے آئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان ظالموں سے نجات دلائی اور اور آپ کو اسی گھر کی چھت کے روزن سے آسمان پر اٹھا لیا۔ اور گھر میں موجود آدمیوں میں سے ایک کو آپ کے مشابہ بنا دیا۔ وہ لوگ اس کو پکڑ کر لے گئے۔ اسے خوب ذلیل و رسوا کیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ اور اس کے سر پر کانٹے رکھ دیئے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی ان کے خلاف تدبیر تھی کہ اس نے اپنے نبی کو آسمان پر اٹھا لیا۔ اور انہیں ان کی گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کے دلوں میں سختی اور حق کی مخالفت ڈال دی۔ اور ایسی ذلت و رسوائی مقرر کی جو قیامت تک ان پر مسلط رہے گی۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ: اور یہودیوں نے (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لیے) اللہ تعالیٰ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ تعالیٰ متواتر (اور موثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٥٥﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٧﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾

"یاد کرو جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں تمہیں ان لوگوں (کی تہمتوں) سے جنہوں نے (تیرا) انکار کیا اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے تیری پیروی کی غالب کفر کرنے والوں پر قیامت تک پھر میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم نے پس (اس وقت) میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان (ان امور کا) جن میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے۔ تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں عذاب دوں گا انہیں سخت

عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لیے کوئی مددگار اور وہ جو ایمان لائے اور کیے نیک کام تو اللہ پورے پورے دے گا انہیں ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظلم کرنے والوں سے یہ جو ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو آیتیں ہیں اور نصیحت حکمت والی''۔

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ: حضرت قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں تقدیم وتاخیر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ! میں تجھے اپنی طرف اٹھاؤں گا اور اس کے بعد تمہیں موت دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ ''متوفيك'' کا معنی'' میں تجھے موت دوں گا'' ہے۔ ابن اسحاق نے وھب بن منبہ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ کو آسمان پر اٹھایا۔ اس وقت تین گھڑی کے لیے فوت کر دیا تھا۔ نصرانیوں کا خیال ہے کہ آپ کو سات گھڑی کے لیے موت دی گئی تھی۔ پھر آپ کو زندہ کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ کو تین دن کے لیے موت دی۔ پھر آپ کو زندہ کیا اور آسمان پر اٹھالیا۔ مطر الوراق کہتے ہیں۔ کہ میں تمہیں دنیا سے بچالوں گا۔ یہاں وفات سے مراد موت نہیں ہے۔ ابن جریر کا قول ہے متوفی کا معنی آپ کو اٹھانا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین فرماتے ہیں: یہاں وفات سے مراد نیند ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَھُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ (الانعام:60)'' اور وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو''۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: اَللّٰہُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا (الزمر:42)'' اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا۔ (ان کی روحیں) حالت نیند میں''۔ رسول اللہ ﷺ جب نیند سے بیدار ہوتے تو آپ یہ دعا پڑھتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ ''شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے مجھے مارنے کے بعد زندہ کیا''۔ اور اسی واقعہ کو ایک اور مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا۔

وَّ بِکُفْرِھِمْ وَقَوْلِھِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُھْتَانًا عَظِیْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّ قَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ۚ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْہُ ۭ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًۢا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا ﴿۱۵۹﴾ (النساء:159)۔ ان آیات میں ''قَبْلَ مَوْتِہٖ'' کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی یہ ہے کہ قیامت کے قریب جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر نازل ہوں گے تو تمام اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے۔ آپ جزیہ کو ختم کر دیں گے اور اسلام کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کریں گے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیند کی حالت میں آسمان کی طرف اٹھایا اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے اور وہ قیامت سے پہلے تمہاری طرف لوٹ کر آئیں گے۔

وَمُطَھِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: یعنی میں تمہیں آسمان کی طرف اٹھا کر ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے تیرا انکار کیا۔ اور جنہوں نے تیری پیروی کی ان کو قیامت تک اہل کفر پر غالب کرنے والا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر اٹھایا تو اس کے بعد آپ کے ساتھیوں کے کئی گروہ بن گئے۔ بعض کا عقیدہ تو یہ تھا کہ آپ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اس کی ایک نیک بندی کے بیٹے ہیں۔ بعض نے غلو سے کام لیتے ہوئے آپ کو اللہ کا بیٹا بنا دیا۔ بعض اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور انہوں نے آپ کو خدا قرار دے دیا اور بعض نے کہا کہ آپ تین میں سے ایک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کے عقائد بیان فرما کر ان کا رد کیا ہے۔ تین سو سال تک ان کا یہی حال رہا۔ پھر یونان کے ایک بادشاہ جو بڑا فلسفی اور حکیم تھا اس کا نام قسطنطین تھا، نے نصرانی مذہب قبول کر لیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس نے تو دین کو بگاڑنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے اس دین میں داخل ہوا۔

بہر حال اس نے دین مسیح کو بدل ڈالا۔ اس میں تحریف و تغییر کی۔ کچھ بڑھایا اور کچھ کم کیا۔ اس نے کئی قوانین اپنی طرف سے ایجاد کیے۔ امانت کبریٰ بھی اس کی ایجاد کردہ ہے اس نے اپنے دور میں خنزیر کے گوشت کو حلال قرار دیا۔ اسی زمانہ میں نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے اور انہوں نے اپنی عبادت گاہوں، کلیساؤں میں تصویریں بنوائیں۔ اور اپنے ایک گناہ کے باعث نصاریٰ کے روزوں میں دس روزوں کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح دین مسیح نہ رہا بلکہ دین قسطنطین بن گیا۔ اس نے بارہ ہزار سے زیادہ عبادت گاہیں بنوائیں اور اپنے نام سے منسوب ایک شہر تعمیر کیا۔ نصاریٰ میں سے ملکیہ فرقہ نے اس کی اتباع اور پیروی کی۔ اس تمام دور میں نصاریٰ یہودیوں پر غالب رہے۔ دراصل یہود نسبتاً ان سے زیادہ حق کے قریب تھے۔ اگرچہ یہ سب کافر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اپنا رسول بنا کر مبعوث فرمایا تو آپ پر جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، کتابوں، اور اس کے تمام رسولوں پر حقیقی طور پر ایمان لانے والے تھے۔ اس لیے وہی روئے زمین پر تمام انبیاء کی اتباع کرنے والے ہیں کیونکہ انہوں نے اس رسول عربی، خاتم المرسلین اور علی الاطلاق بنی آدم کے سردار کی تصدیق کی جس نے انہیں تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی دعوت دی۔ اس طرح مسلمان ہر نبی کے اس کے امتیوں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ کیونکہ ان انبیاء کے امتیوں نے دین میں تحریف و تغییر کر دی تھی۔ اگر یہ تحریف نہ بھی ہوتی تو دین اسلام نے سابقہ تمام شرائع کو منسوخ کر دیا ہے۔ یہ وہ دین حق ہے جس میں قیامت تک کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ اور یہ ہر دین پر غالب ہو گا۔ اس لیے اسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرق و مغرب میں فتح و نصرت سے نوازا ہے۔ انہوں نے تمام ممالک کو فتح کیا اکثر حکومتیں ان کی باجگزار بن گئیں۔ کسریٰ کی حکومت کو بھی تاخت و تاراج کیا اور قیصر کی مملکت کو بھی محدود کر دیا۔ اور ان کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ جیسا کہ ان کے نبی کریم ﷺ نے اپنے رب کے حکم سے انہیں پہلے ہی یہ عظیم خبر دے دی تھی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا (النور:55)'' وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں جس طرح خلیفہ بنایا ان کو جو ان سے پہلے تھے اور مستحکم کر دے گا ان کے لیے ان کے دین کو جسے اس نے پسند فرمایا ہے ان کے لیے اور وہ ضرور بدل دے گا انہیں ان کی حالت خوف سے امن میں۔ وہ میری عبادت کرتے ہیں۔ کسی کو میرا شریک نہیں کرتے''۔ چونکہ مسلمان ہی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے والے ہیں۔ اس لیے انہوں نے نصاریٰ سے شام کا علاقہ چھین لیا اور انہیں روم کی طرف دھکیل دیا حتیٰ کہ وہ قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ آخر کار قسطنطنیہ کو بھی مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کو قیامت تک نصرانیوں پر غلبہ رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو خبر دی ہے کہ وہ آخر زمانہ میں قسطنطنیہ کو فتح کریں گے اور اہل روم کے ساتھ ان کی ایک جنگ عظیم ہوگی۔ جس کی مثل پہلے ہوئی نہ بعد میں ہوگی۔ اس جنگ میں اہل اسلام بہت سا مال غنیمت حاصل کریں گے۔ میں نے اس کے بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت عطا فرمائی تھی اس لیے یہاں ارشاد فرمایا:

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ: اور یہی سلوک اللہ تعالیٰ نے ان یہودیوں کے ساتھ کیا جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار کیا اور نصاریٰ میں سے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو کیا۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے عذاب دیا۔ اس طرح کہ بعض تو قتل ہو گئے۔ بعض کو قید کر لیا گیا۔ ان کے مال چھین لیے گئے۔ اور ان کی حکومتیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ اور آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔ وہاں تو ان کو عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے تو اللہ انہیں دنیا و آخرت میں پورا پورا اجر عطا فرمائے گا، دنیا میں فتح و نصرت عطا فرما کر اور آخرت میں جنت کی ابدی نعمتیں عطا فرما کر۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں

کو پسند نہیں کرتا۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ: اے محمد (ﷺ!) (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش کے بارے میں جو کچھ بھی ہم نے بیان کیا ہے اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ جیسا کہ سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (مریم:35) ''یہ ہے عیسیٰ بن مریم (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے وہ پاک ہے، جب وہ فیصلہ فرمالیتا ہے کسی کام کا پس وہ اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتا ہے''۔ اور یہاں ارشاد فرمایا:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝

''بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے۔ پھر فرمایا اسے ہوجا تو وہ ہوگیا۔ (اے سننے والے!) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے پس تو نہ ہوجا شک کرنے والوں سے۔ پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آگیا آپ کے پاس (یقینی) علم تو آپ کہہ دیجیے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی۔ پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔ بے شک یہی ہے واقعہ سچا اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بے شک اللہ ہی غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے فساد برپا کرنے والوں کو''۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا بیان فرمایا ہے۔ ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال (حضرت) آدم (علیہ السلام) کی طرح ہے کہ جس طرح اس نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا اسی طرح اس نے (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور جو ذات (آدم علیہ السلام) کو ماں باپ کے بغیر پیدا کرنے پر قادر ہو وہ (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کو باپ کے بغیر پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو نصاریٰ نے ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیا۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کو بدرجہ اولیٰ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہونا چاہئے کیونکہ باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دینا بالاتفاق باطل ہے تو نصاریٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہنے کا بطلان بالکل ظاہر ہے۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے لیے اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو مذکر و مونث کے بغیر پیدا کیا، حضرت حواء، کو مونث کے بغیر پیدا کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مونث سے مذکر کے بغیر پیدا کیا اور باقی تمام مخلوق کو مذکر و مونث سے پیدا کیا اور کرتا ہے۔ اس لیے سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے

میں ارشاد فرمایا: وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ (مریم:21) ’’اور (مقصد یہ ہے کہ) ہم بنائیں اسے اپنی (قدرت کی) نشانی لوگوں کے لیے‘‘۔ اور یہاں ارشاد فرمایا: (اے مخاطب) یہ حقیقت تیرے رب کی طرف سے ہے تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جا۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، یہی حق ہے۔ اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اس لیے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس حقیقت سے انکار کرنے والے سے مباہلہ کریں۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ: مباہلہ اور اس کی ماقبل آیات کا شان نزول یہ ہے کہ نجران سے عیسائیوں کا ایک گروہ مدینہ طیبہ آیا۔ یہاں آ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث وتمحیص کرنے لگے۔ اور اپنے عقیدہ کے مطابق ان کو خدا کا بیٹا اور معبود قرار دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتدائی آیات نازل فرمائیں۔ ابن اسحاق اپنی مشہور سیرت کی کتاب میں لکھتے ہیں۔ نجران کا ایک وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے چودہ افراد بڑے معزز اور ان کے سردار تھے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ 1۔ عاقب، عبدالمسیح 2۔ السید، الایہم 3۔ ابوالحارثہ بن علقمہ (ابوبکر وائل کا بھائی) 4۔ اولیس بن حارث 5۔ زید 6۔ قیس 7۔ یزید اور اس کے دو بیٹے۔ 8۔ خویلد 9۔ عمرو 10۔ خالد 11۔ عبداللہ 12۔ محسن۔ اور ان چودہ افراد میں سے تین بڑے سردار تھے۔ عاقب، ان کا امیر تھا۔ بڑا صائب الرائے تھا۔ تمام لوگوں کو اس پر اور اس کی رائے پر اعتماد تھا۔ السید، ان کا بڑا پادری تھا۔ اور ابو الحارثہ ان کا سب سے اعلیٰ مدرس تھا۔ یہ بنوبکر بن وائل کے عرب قبیلہ سے تھا۔ لیکن بعد میں نصرانی ہو گیا۔ رومیوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس کے لیے بڑے بڑے گرجے بنائے۔ اور اس کی نصرانیت کے ساتھ گہری وابستگی کی وجہ سے لوگ اس کی بڑی خدمت اور عزت کرتے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی شان وشوکت اور عظمت ورفعت کو جانتا تھا۔ کیونکہ اس نے آپ کی یہ صفات پہلی کتابوں میں پڑھی ہوئی تھیں۔ وہ دل سے آپ کی نبوت کا قائل بھی تھا۔ لیکن نصرانیت میں اپنی تعظیم وتکریم اور جاہ ومرتبہ کی حرص کی وجہ سے اسلام قبول نہ کر سکا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں یہ وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ نماز عصر سے فارغ ہوئے تھے۔ یہ لوگ خوبصورت ومنقش لباس اور بہترین چادریں اوڑھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بنوحارث بن کعب کے خاندان کے لوگ۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں ان کے بعد اس جیسی شان وشوکت والا وفد پھر نہیں آیا۔ اسی دوران ان کی نماز کا وقت ہو گیا تو وہ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے گفتگو فرمائی۔ ان میں سے گفتگو کرنے والے ابوالحارثہ، عاقب اور السید تھے۔ یہ تینوں شاہی مذہب پر تھے۔ اگرچہ بعض امور میں ان کا آپس میں اختلاف تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ تینوں متفق تھے کہ وہ خدا ہیں، خدا کے بیٹے ہیں اور تین میں تیسرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس ناپاک قول سے پاکیزہ اور بلند وبالا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے کی دلیل یہ دیتے تھے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے، مادرزاد اندھوں کو بینا کرتے تھے۔ کوڑھیوں اور بیماروں کو صحت یاب کرتے تھے۔ غیب کی خبریں دیتے تھے۔ مٹی سے پرندے کی صورت بناتے تھے اور پھر اس میں پھونک مارتے تو پرندہ بن کر اڑنے لگتا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی نشانی بنایا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا تعالیٰ کے بیٹا ہونے کی دلیل دیتے تھے کہ ان کا کوئی ظاہری باپ نہیں تھا۔ آپ نے پنگھوڑے میں گفتگو فرمائی۔ اس سے پہلے کسی بنی آدم سے ایسی چیز ظاہر نہیں ہوئی۔ اور وہ اپنے قول کہ حضرت عیسیٰ تین میں سے تیسرے ہیں، کی دلیل یہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں

فرماتا ہے۔ ہم نے یہ حکم دیا، ہم نے پیدا کیا، ہم نے فیصلہ کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ایک ہوتا تو فرماتا میں نے یہ کام کیا، میں نے حکم دیا، میں نے پیدا کیا اور میں نے فیصلہ کیا۔ یہ ان کے فاسد عقائد تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام ان کے ان برے عقائد سے پاک، بری اور منزہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیات نازل فرمائیں۔ اس وقت آپ کے پاس ان کے دو سردار ابوالحارثہ اور السید موجود تھے۔ آپ نے انہیں فرمایا اسلام قبول کرلو۔ انہوں نے کہا ہم مسلمان ہی ہیں، آپ نے فرمایا، تم مسلمان نہیں ہو، ہو جاؤ۔ وہ کہنے لگے ہم تو آپ سے پہلے کے مسلمان ہیں۔ آپ نے فرمایا تم جھوٹ بولتے ہو۔ بھلا تم کیسے مسلمان ہو سکتے ہو حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ صلیب کی پوجا کرتے ہو خنزیر کا گوشت کھاتے ہو۔ انہوں نے آپ سے پوچھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی اسّی سے زائد آیات ان کے جواب میں نازل فرمائیں۔

ابن اسحاق ان آیات کی مختصر تفسیر بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ آیات سنا دیں اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بتا دیا کہ اگر تم نہیں مانتے تو مباہلہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ کہنے لگے اے ابوالقاسم ہمیں کچھ مہلت دیں تاکہ ہم آپس میں غور و فکر اور مشورہ کرنے کے بعد آپ کو اس کا جواب دیں۔ اب وہ تنہائی میں عاقب کے پاس آئے وہ بڑا اصائب الرائے اور عقل مند تھا۔ اور اس سے کہنے لگے کہ عبدالمسیح! تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے۔ اس نے کہا گروہ نصاریٰ، قسم بخدا تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انہوں نے جو فرمایا ہے وہ مبنی برحق ہے۔ تمہیں یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ جو قوم نبی کے ساتھ مباہلہ کرتی ہے ان کے نہ تو بڑے باقی رہتے ہیں اور نہ ہی چھوٹے پروان چڑھتے ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مباہلہ کیا تو تمہیں تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ اس لیے اسلام قبول کرلو۔ اور اگر تم اسلام قبول نہیں کرنا چاہتے اور اپنے دین اور عقائد پر قائم رہنا چاہتے ہو تو ان سے صلح کرلو اور اپنے وطن واپس لوٹ جاؤ۔ چنانچہ یہ مشورہ کرنے کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے مباہلہ نہیں کرنا چاہتے آپ اپنے دین پر رہیں اور ہم اپنے عقائد پر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے صحابیوں میں سے ایک پسندیدہ صحابی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں جو ہمارے مالی جھگڑوں میں ہمارے درمیان فیصلہ کریں۔ آپ لوگ ہمارے نزدیک بڑے معزز، محترم اور ہردلعزیز ہیں۔ آپ نے فرمایا ظہر کے بعد آنا میں تمہارے ساتھ قوی اور امین آدمی کو بھیجوں گا۔ حضرت عمر بن خطاب فرماتے ہیں کہ میرے دل میں امیر بننے کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی لیکن اس دن میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ شاید میں ہی رسول اللہ ﷺ کے فرمان کا مصداق بن جاؤں اس دن ظہر کی نماز کے لیے گھر سے جلدی نکلا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی تو آپ نے دائیں بائیں نظر دوڑائی میں نے اپنے آپ کو اونچا کر دیا تاکہ آپ کی نظر مجھ پر پڑ جائے آپ بغور صحابہ کرام کو دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ کی نظر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح پر پڑی۔ آپ نے انہیں بلایا اور فرمایا ان کے ساتھ جاؤ اور حق کے ساتھ ان کے اختلافات کا فیصلہ کرو۔ حضرت عمر فرماتے ہیں اس طرح یہ سعادت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح لے گئے۔ ابن مردویہ نے اس واقعہ کو اس سے بھی زیادہ تفصیل سے روایت کیا ہے۔ لیکن انہوں نے سرداروں کی تعداد بارہ لکھی ہے۔ حضرت حذیفہ روایت کرتے ہیں کہ نجران کے دو سردار عاقب اور السید جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مباہلہ کرنے آئے تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا کہ ان سے مباہلہ نہ کرنا۔ قسم بخدا اگر یہ واقعی نبی ہیں اور ہم نے ان سے مباہلہ کیا تو ہم بچیں گے نہ ہماری اولاد۔ چنانچہ دونوں نے متفق ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی آپ ہم سے جو (جزیہ) طلب کرتے ہیں ہم وہ ادا کر دیں گے۔ ہمارے ساتھ کسی امین شخص کو بھیج دیجیے آپ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ حقیقی امین کو بھیجوں گا۔ یہ بات سن کر صحابہ کرام متوجہ ہو گئے۔ آپ نے فرمایا اے ابوعبیدہ کھڑے ہو جاؤ۔ آپ نے

فرمایا یہ اس امت کے امین ہیں(1)۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے۔ اور اس امت کے امین ابو عبیدہ بن الجراح ہیں(2)۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ابوجہل ملعون نے کہا تھا اگر میں نے محمد ﷺ کو بیت اللہ میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن کچل دوں گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ ایسا کرتا تو سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ فرشتے اس کو دبوچ لیتے۔ اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو وہ سب مرجاتے اور جہنم میں اپنی قرارگاہوں کو دیکھ لیتے۔ اور اگر نصاریٰ رسول اللہ ﷺ سے مباہلہ کرتے تو وہ واپس لوٹنے پر اپنے اہل وعیال اور مال کو نہ پاتے(3)۔ اس کو بخاری، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اس واقعہ کو تفصیلاً روایت کیا ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں کیونکہ اس میں بہت سے فوائد ہیں۔ اگرچہ اس میں کچھ غرابت ہے۔ لیکن یہ اس کے مقام کے مناسب ہے۔ سلمہ بن عبد یسوع اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں جو نصرانی ہے پھر مسلمان ہوگئے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۂ طسٓ اور سورۂ سلیمان (النحل) نازل ہونے سے پہلے اہل نجران کو نامہ مبارک لکھا۔ جس کا مضمون یہ تھا:

حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب علیہ السلام کے رب کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے نجران کے بڑے سردار اور اہل نجران کی طرف۔

''میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرتا ہوں جو حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا معبود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد میں تمہیں بندوں کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف اور بندوں کی ولایت سے اللہ تعالیٰ کی ولایت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم اسے قبول نہیں کرتے تو جزیہ ادا کرو۔ اور اگر جزیہ بھی ادا نہیں کرتے تو پھر ہمارا تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے''۔

جب ان کے سردار نے یہ خط پڑھا تو اس پر خوف طاری ہوگیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے فوراً شرحبیل بن وداعہ کو بلایا۔ جب بھی کوئی مصیبت پڑتی تو اسے ہی بلایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایھم، السید اور عاقب سے اس سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ سردار نے وہ خط اس کو دیا۔ اس نے اسے پڑھا۔ سردار نے پوچھا تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اولاد میں سے ایک نبی بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ ممکن ہے یہ وہی نبی ہوں۔ اس لیے نبوت کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر کوئی دنیاوی معاملہ ہوتا تو ضرور تمہیں اس کے بارے میں مشورہ دیتا۔ سردار نے اسے حکم دیا کہ تم یہیں علیحدگی میں بیٹھو۔ پھر اس نے جبار بن فیض کو بلایا۔ جس کا تعلق بنوحارث بن کعب سے تھا اور یہ بھی اس کا مشیر تھا۔ سردار نے اسے خط پڑھوایا اور اس کی رائے دریافت کی۔ اس نے بھی شرحبیل جیسا جواب دیا۔ بادشاہ نے اس کو بھی علیحدہ بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر ایک عبداللہ نامی شخص کو بلایا۔ اس نے بھی یہی رائے دی۔ اس کو بھی علیحدہ بٹھا دیا گیا۔ جب سردار نے دیکھا کہ یہ تینوں ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ ناقوس بجایا جائے، آگ جلائی جائے اور گرجوں میں جھنڈے بلند کیے جائیں۔ ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی مشکل کے وقت لوگوں کو اکٹھا کرنا مقصود ہوتا تو دن کے وقت گرجوں پر جھنڈے بلند کردیے جاتے اور رات کے وقت ناقوس بجائے جاتے اور آگ جلائی جاتی۔ ناقوس کی آواز سن کر اور گرجوں پر پھڑ پھڑاتے جھنڈے دیکھ کر تمام لوگ وادی میں جمع ہوگئے۔ اس وادی کی لمبائی اتنی تھی کہ ایک تیز رفتار سوار صبح سے شام تک ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچتا۔ اس میں تہتر گاؤں آباد تھے۔ تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار جنگجو اکٹھے ہوگئے۔ سردار نے انہیں رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھ کر سنایا اور اس کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ وہ سب اس بات پر متفق ہوگئے کہ پہلے شرحبیل بن وداعہ ہمدانی، عبداللہ بن شرحبیل اصبحی، جبار بن فیض الحارثی کو بھیجا جائے تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں صحیح معلومات لے کر آئیں۔ یہ تینوں

1۔ فتح الباری، کتاب المغازی 93/8 2۔ مسلم، کتاب فضائل الصحابہ 1882 3۔ مسند امام احمد 248/1

نجران سے نکلے۔ جب مدینہ طیبہ کے قریب پہنچے سفر کا لباس اتارا اور ریشمی منقش لباس اور سونے کی انگوٹھیاں پہن لیں۔ اسی حالت میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام پیش کیا لیکن آپ نے جواب نہ دیا۔ وہ کافی دیر آپ سے گفتگو کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن آپ نے ان کے ریشمی لباس اور سونے کی انگوٹھیوں کی وجہ سے گفتگو نہ فرمائی۔ وہ حضرت عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف کی تلاش میں نکلے کیونکہ ان کے ساتھ ان کی کچھ جان پہچان تھی۔ آخر کار انہوں نے دیکھا کہ وہ مہاجرین وانصار کی ایک مجلس میں بیٹھے ہیں۔ انہیں کہنے لگے کہ تمہارے نبی نے ہمیں خط لکھا تھا ہم اس کا جواب دینے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں سلام عرض کیا تو انہوں نے ہمارے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہمارے ساتھ کوئی گفتگو فرمائی ہے۔ آخر کار ہم تھک کر آ گئے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ کیا ہم واپس لوٹ جائیں۔ انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب سے پوچھا: اے ابوالحسن! آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ آپ نے انہیں فرمایا کہ میرے خیال میں انہیں ریشمی لباس اور سونے کی انگوٹھیاں اتار کر سفر کے کپڑے پہننے چاہئے۔ اور پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ انہوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا۔ پھر ارشاد فرمایا: قسم اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا جب یہ پہلی مرتبہ مجھے ملنے کے لیے آئے تھے تو شیطان ان کے ساتھ تھا۔ پھر آپ نے ان کے احوال کے بارے میں دریافت کیا اور انہوں نے آپ سے پوچھا: پھر مختلف گفتگو ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ انہوں نے کہا کہ آپ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ہمیں یہ خوشی ہوگی کہ اگر آپ نبی ہیں تو آپ سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں پوچھیں تا کہ ہم اپنی قوم کو واپس لوٹ کر اس سے آگاہ کریں۔ آپ نے فرمایا: اس وقت میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے تم ابھی ٹھہر و اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو بھی فرمائے گا وہ تمہیں بتا دوں گا۔ پھر صبح یہ آیات (اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ) نازل ہوئیں۔ آپ نے یہ آیات ان کے سامنے تلاوت فرمائیں۔ لیکن انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن صبح رسول اللہ ﷺ مباہلہ کے لیے حضرت حسن، حسین کو اپنی کملی میں لپیٹے ہوئے تشریف لائے۔ حضرت فاطمہ آپ کے پیچھے تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر شرحبیل نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کہا تمہیں تو بخوبی معلوم ہے کہ تمام اہل نجران میری رائے کا احترام کرتے ہیں۔ قسم بخدا یہ معاملہ بڑا سخت معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس شخص (رسول اللہ ﷺ) کو مبعوث نہیں کیا گیا ہے تو تمام اہل عرب میں سب سے پہلے اس کی نگاہوں میں ہم ہی مطعون ہوں گے اور سب سے پہلے اس کی تردید کرنے والے ہم ہی ہوں گے۔ یہ بات ان کے اور ان کے صحابہ کے دلوں میں بیٹھ جائے گی۔ پھر یہ ہمیں کسی نہ کسی وجہ سے نقصان پہنچائیں گے۔ اور اہل عرب کے زیادہ قریب ہم ہی ہیں۔ اور اگر یہ نبی مرسل ہیں اور پھر اگر ہم نے ان کے ساتھ مباہلہ کیا تو روئے زمین پر ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ یہ بات سن کر اس کے ساتھیوں نے کہا تو پھر تمہاری کیا رائے ہے۔ اس نے جواب دیا میرا خیال ہے کہ ہم انہیں اپنا حکم بنا دیتے ہیں اور جو بھی فیصلہ کریں ہمیں قبول ہوگا۔ اور میرے خیال میں وہ عدل ہی کریں گے۔ باقی دو نے بھی شرحبیل کی رائے سے اتفاق کیا۔ شرحبیل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں اس مباہلہ سے بہتر چیز آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے عرض کی کہ ہم آپ کو اپنا حکم بناتے ہیں۔ آپ صبح تک ہمارے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے وہ ہمیں منظور ہوگا۔ آپ نے فرمایا شاید لوگ تمہارے اس فیصلے کو نہ مانیں۔ شرحبیل نے عرض کی آپ میرے ساتھیوں سے رائے لے لیں آپ نے ان سے دریافت کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ تمام اہل نجران شرحبیل کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے گئے۔ اور آپ نے ان سے مباہلہ نہ کیا۔ صبح وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ایک تحریر ان کو لکھ کر دی۔ جس میں بسم اللہ کے بعد یہ مضمون تھا'' یہ تحریر اللہ کے

رسول ''محمد'' (ﷺ) کی طرف سے اہل نجران کی طرف ہے۔ ان پر اللہ کے رسول کا حکم نافذ ہوگا۔ ہر پھل اور ہر زرد، سفید و سیاہ میں، اور ہر غلام میں۔ لیکن اللہ کے رسول یہ سب کچھ تم ہی کے لیے چھوڑتے ہیں۔ وہ انہیں ہر سال دو ہزار حلے (پوشاک) دیا کریں۔ ایک ہزار رجب میں اور ایک ہزار صفر میں'' امام بیہقی نے اس کے علاوہ دوسرے واقعات کو تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وفد سن نو ہجری میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ کیونکہ امام زہری فرماتے ہیں سب سے پہلے اہل نجران نے جزیہ ادا کیا تھا۔ جزیہ کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبہ:29) ''جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے، اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں''۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ عاقب اور طیب رسول اللہ ﷺ کے پاس مباہلہ کے لیے آئے۔ آپ نے صبح مباہلہ کا وعدہ فرمایا۔ صبح رسول اللہ ﷺ، حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو ساتھ لیے ہوئے تشریف لائے، انہیں مباہلہ کے لیے پیغام بھیجا لیکن انہوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا اور جزیہ دینے پر رضامند ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر یہ مباہلہ سے انکار نہ کرتے تو یہ وادی ان پر آگ کی بارش برساتی۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں انہی کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ آپ فرماتے ہیں کہ یہاں ''اَنْفُسَنَا'' سے مراد رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی ہیں۔ اور ''اَبْنَآءَنَا'' سے مراد حسن اور حسین ہیں۔ اور (نساءنا) سے مراد حضرت فاطمہ ہیں[1]۔ اس کو ابوداؤد طیالسی نے امام شعبی سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عبداللہ بن عباسؓ اور براء بن عازبؓ سے بھی مروی ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ: یہ جو ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا ہے یہ حق اور سچ ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بلا شبہ اللہ ہی غالب اور حکمت والا ہے۔ اور اگر وہ اس حقیقت سے منہ پھیریں تو بے شک اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو خوب جانتا ہے یعنی جو حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتا ہے وہی حقیقت میں فساد برپا کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتا ہے۔ اور انہیں اس عمل کی سخت سزا دے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی چیز اس کے قبضہ قدرت سے باہر نہیں۔ وہ ہر قسم کے نقص اور عیب سے مبرا ہے، منزہ اور پاک ہے۔ ہم اس کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں۔ اور اس کے عذاب سے اس کی پناہ لیتے ہیں۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

''(میرے نبی!) آپ کہیے اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو یکساں ہے ہمارے اور تمہارے درمیان (وہ یہ کہ) ہم نہ عبادت کریں (کسی کی) سوائے اللہ کے اور نہ شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو اور نہ بنالے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا پھر اگر وہ روگردانی کریں (اس سے) تو تم کہہ دو گواہ رہنا (اے اہل کتاب) کہ ہم مسلمان ہیں''۔

1۔ المستدرک 594,593/2

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ: یہ خطاب یہود، نصاریٰ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو ہے۔ کلمہ کا اطلاق جملہ مفیدہ پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہاں کلمہ بول کر جملہ مراد لیا گیا ہے۔ اور پھر اس کی صفت (سواء) کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ یعنی اے اہل کتاب اس کلمہ (بات) کی طرف آؤ جو عدل وانصاف والی ہے۔ جس میں ہم اور تم برابر ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کلمہ کی تفسیر اپنے اس قول کے ساتھ فرمائی۔

اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ: ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ نہ کسی بت کو، نہ کسی صلیب کو، نہ کسی طاغوت کو نہ آگ کو اور نہ ہی کسی اور چیز کو۔ بلکہ تنہا اسی کی عبادت کریں جو وحدہ لاشریک ہے۔ اور یہی دعوت اور پیغام انبیاء کا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء:25) ''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی بھیجی اس کی طرف کہ بلاشبہ نہیں ہے کوئی خدا بجز میرے، پس میری عبادت کیا کرو''۔ اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:36) ''اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول، (جو انہیں یہ تعلیم دے) کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور دور رہو طاغوت سے''۔ پھر ارشاد فرمایا۔ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب نہ بنائے۔ ابن جریر فرماتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں دوسرے کی اطاعت نہ کرے۔ عکرمہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے، ہم ایک دوسرے کو سجدہ نہ کریں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا: اگر یہ عدل وانصاف والی بات اور توحید سے منہ پھیریں اور روگردانی کریں تو تم انہیں مسلمان ہونے پر گواہ بنالو۔ ہم نے شرح بخاری میں اس واقعہ کی تفصیلاً بیان کیا ہے۔ جس میں ابوسفیان کے قیصر روم کے پاس جانے کا ذکر ہے۔ کہ قیصر روم نے ابوسفیان سے رسول اللہ ﷺ کے نسب مبارک، آپ کے اوصاف حمیدہ، حلیہ شریف اور آپ کی دعوت حق کے بارے میں پوچھا۔ ابو سفیان اگرچہ اس قوت مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قیصر روم کے سوالات کا صحیح اور درست جواب دیا۔ اور یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ قیصر روم نے ابوسفیان سے پوچھا تھا کیا وہ بدعہدی بھی کرتے ہیں اس نے کہا نہیں۔ ہمارا ان کے ساتھ معاہدہ ہوا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کے بارے میں ان کا طرز عمل کیا ہوگا۔ ابوسفیان کہتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں صرف اسی بات کے اضافہ کرنے کا موقع ملا۔ پھر جب قیصر روم نے یہ تمام دریافت کر لیں تو پھر رسول اللہ ﷺ کا خط لایا گیا۔ پھر خط پڑھا گیا جس کی تحریر یہ تھی۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللہ تعالیٰ کے رسول محمد (ﷺ) سے روم کے عظیم بادشاہ ہرقل کی طرف۔ اللہ کی سلامتی ہو اس شخص پر جس نے ہدایت کی راہ کی اتباع کی۔ امابعد۔ تم اسلام قبول کرلو تو تم سلامت رہو گے اور اگر تم اسلام قبول کرو گے تو تمہیں دوہرا اجر دیا جائے گا۔ اور اگر تم نے اسلام سے روگردانی کی تو تم پر تمام رئیسوں کا وبال ہوگا۔ پھر اس کے بعد یہی آیت لکھی ہوئی تھی''۔ ابن اسحاق وغیرہ نے کہا ہے کہ سورۂ آل عمران کی اسی سے زائد ابتدائی آیات اہل نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئیں۔ امام زہری فرماتے ہیں اہل نجران نے سب سے پہلے جزیہ دیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جزیئے کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہرقل کے خط میں ان آیات کو لکھنے میں اور ابن اسحاق اور امام زہری کے اقوال میں کیسے تطبیق ہوسکتی ہے۔ اس کے کئی ایک جواب دیے گئے ہیں۔ 1۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آیت کریمہ دو دفعہ نازل ہوئی ہو۔ ایک دفعہ صلح حدیبیہ سے پہلے اور دوسری مرتبہ فتح مکہ کے بعد۔ 2۔ یہ بھی احتمال ہے کہ سورۂ آل عمران کی ابتدائی آیات اہل نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئیں اور یہ آیت اس سے پہلے بھی نازل ہوچکی ہو۔ ابن اسحاق کا یہ قول ''اسی سے زائد آیات نازل ہوئیں'' یہ صحیح نہ ہو۔ کیونکہ ابوسفیان کی حدیث اس کے برعکس دلالت کرتی ہے۔ 3۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اہل نجران کا وفد صلح حدیبیہ سے پہلے آیا ہو اور مباہلہ کے وقت جو

کچھ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرنا منظور کیا وہ جزیہ کے طور پر نہ ہو بلکہ بطور مصالحت دیا ہو۔ اور اسی حکم کے مطابق بعد میں آیت جزیہ نازل ہوگئی ہو۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن جحش نے غزوۂ بدر سے پہلے ایک سریہ میں مال غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ پانچواں حصہ رکھ کر چار حصے اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیے۔ پھر اس کے بعد مال غنیمت کو تقسیم کرنے کی آیت اسی کے مطابق نازل ہوئی۔ 4۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کو خط لکھنے کا حکم دیا ہو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل نہ ہوئی ہو اور پھر رسول اللہ ﷺ کی موافقت کے لیے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جیسا کہ حجاب، جنگ بدر کے قیدی اور منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کے بارے میں حضرت عمر کی رائے کے موافق آیات نازل ہوئیں۔ اسی طرح مقام ابراہیم پر نماز پڑھنے کے بارے میں حضرت عمر کی رائے کی موافقت میں وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ: 125) ''اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز''۔ نازل ہوئی۔ اسی طرح آیت کریمہ: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ...... (التحریم: 5) بھی آپ کی رائے کے مطابق نازل ہوئی۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۞ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞

''اے اہل کتاب! کیوں جھگڑتے ہو تم ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں حالانکہ نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھ سکتے۔ سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو جو جھگڑتے رہے ہو (اب تک) ان باتوں میں جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا پس (اب) کیوں جھگڑنے لگے ہو ان باتوں میں، نہیں ہے تمہیں جن کا کچھ علم اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ نہ تھے ابراہیم (علیہ السلام) یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔ بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا''۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ: یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس دعویٰ کی تردید فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: کہ جب اہل نجران کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہودی علماء بھی وہاں آ گئے اور ان سے بحث و تمحیص کرنے لگے۔ یہودی علماء نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔ نصرانی کہنے لگے کہ وہ عیسائی تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اے قوم یہود! یہ کیسے دعویٰ کرتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے حالانکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہونے کے زمانہ سے پہلے تھے، اے گروہ نصاریٰ تم یہ کیسے دعویٰ کرتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے۔ حالانکہ عیسائیت تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے بعد کی پیداوار ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ: جو شخص بغیر علم کے کسی چیز کے بارے میں جھگڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ناپسند کرتا ہے۔ یہود و نصاریٰ

بھی بغیر علم کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں اس فعل پر زجر و توبیخ فرمائی ہے۔ اگر وہ ان دینی احکام میں بحث و تمحیص کرتے جن کا انہیں علم تھا۔ وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا ہے۔ جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو۔ اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ جو تمام امور کے حقائق سے آگاہ ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ جانتا ہے وہ تم نہیں جانتے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی۔ بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ اور مسلمان تھے۔ اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔ یہ آیت کریمہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کریمہ: وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (البقرہ: 135) کی مثل ہے۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ: حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے نزدیک ترین وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور ان کے دین پر کاربند رہے اور یہ نبی حضرت محمد ﷺ اور وہ لوگ ہیں جو آپ پر ایمان لائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کے لیے دوسرے انبیاء میں سے کوئی دوست اور ولی ہوتا ہے میرا دوست اور ولی میرے جد امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی۔ اس حدیث کو سعید بن منصور نے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ ترمذی اور بزاز نے روایت کیا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا جو بھی میرے رسولوں پر ایمان لائے۔ میں اس کا دوست اور مددگار رہوں۔

وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۞ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۞ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞ وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۞ وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۞ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۞

”دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔ اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا حالانکہ تم خود گواہ۔ ہو اے اہل کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور (کیوں) چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔ کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت اور انکار کر دو اس کا سر شام شاید (اس طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں۔ (ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں) کہ مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی۔ فرمائیے ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) دیا جا سکتا ہے کسی کو جیسے تمہیں دیا گیا یا کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس (اے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) فرما دیجیے کہ فضل (وکرم) تو

اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے''۔

وَدَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ یہودی مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں اور انہیں گمراہ کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ لیکن ان کی ان تمام کوششوں کا وبال انہی پر پڑے گا۔ اور انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔ اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کارگر ہو چکی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود گواہ ہو۔ یعنی ان کے سچا اور حق ہونے کا تمہیں بخوبی علم ہے۔ پھر ارشاد فرماتا ہے اے اہل کتاب! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔ یعنی تمہاری کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان کو کیوں چھپاتے ہو حالانکہ تم یہ جانتے ہو کہ یہ حق ہیں۔ بلکہ تمہیں ان کے حق ہونے کا یقین ہے۔

وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ: اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا صبح کے وقت اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو اہل کتاب پر نازل کی گئی ہے۔ اور سر شام اس کا انکار کردو۔ شاید اس طرح وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔ یہ یہود کی ایک چال تھی کہ انہوں نے ضعیف الایمان لوگوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لیے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ وہ صبح کے وقت مسلمان ہو جائیں گے اور مسلمانوں کے ساتھ صبح کی نماز پڑھیں گے۔ اور جب شام ہوگی تو دین اسلام کو چھوڑ کر اپنے مذہب کو اختیار کرلیں گے۔ تاکہ جاہل لوگ یہ سمجھیں کہ انہیں مسلمانوں کے دین میں کوئی نقص اور عیب نظر آیا ہے جس کی وجہ سے اس دین کو چھوڑا ہے۔ اس لیے انہوں نے ''لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ'' کے الفاظ استعمال کیے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں یہود کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے صبح کی نماز حضور ﷺ کے ساتھ پڑھی اور شام کو کفر اختیار کرلیا۔ تاکہ لوگوں کو دھوکہ دیں کہ انہوں نے دین اسلام کو کسی نقص اور عیب کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کے ایک گروہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ جب تم صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے ملو تو ایمان لے آنا اور پھر شام کے وقت اپنے مذہب کے مطابق نماز پڑھنا شاید یہ مسلمان یہ سمجھیں چونکہ یہ لوگ ہم سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں اس لیے انہوں نے کسی وجہ سے ہی اسلام چھوڑا ہے۔

وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِيۡنَكُمۡ: وہ ایک دوسرے کو تاکید کرتے تھے کہ تم صرف اسی کی بات مانو جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ تم کسی پر اعتماد نہ کرو اور جو تمہارے پاس علم ہے اسے صرف انہی لوگوں پر ظاہر کرو جو تمہاری پیروی کرنے والے ہیں۔ اہل اسلام کے لیے اپنے علم کو ظاہر نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس علم میں مہارت حاصل کرکے وہ تمہارے خلاف استعمال نہ کریں۔

قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰى هُدَى اللّٰهِ: فرمائیے کہ ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔ یعنی وہ اللہ ہی ہے جو مومنین کو ان تمام آیات بینات اور قطعی دلائل پر کامل ایمان لانے کی توفیق عطا فرماتا ہے جو اس نے اپنے بندے اور رسول محمد (ﷺ) پر نازل فرمائے۔ اگرچہ اے گروہ یہود! تم نے محمد ﷺ کی ان صفات کو چھپا دیا جو تمہاری آسمانی کتابوں میں تھیں اور جن کو تم نے اپنے انبیاء سے نقل کیا تھا۔

اَنۡ يُّؤۡتٰٓى اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ: وہ کہتے تھے یہ بھی نہ ماننا کہ کسی کو تمہارے جیسا علم دیا جاسکتا ہے۔ یا تمہارے رب کے پاس تم پر کوئی حجت لاسکتا ہے۔ یعنی جو علم تمہارے پاس ہے وہ مسلمانوں کے لیے ظاہر نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ تم سے علم سیکھ کر تمہارے برابر ہو جائیں بلکہ اپنی قوت ایمانی کی وجہ سے وہ تم سے فوقیت لے جائیں گے۔ یا اسی علم کو تمہارے رب کے پاس تمہارے خلاف دلیل بنالیں گے اس

لیے دنیا و آخرت میں تمہارے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ: فرما دیجئے فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہی میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ یعنی تمام امور اس کے تصرف میں ہیں۔ وہی عطا کرتا ہے۔ وہی منع کرتا ہے۔ اور جسے چاہے اسے اپنے خاص فضل و احسان سے ایمان اور علم کی دولت عطا فرما دیتا ہے۔ اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اسے بصیرت و بصارت دونوں سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اس کے ہر عمل میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ جسے چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر دیتا ہے اور وہ صاحب فضل و عظیم ہے۔ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنا خصوصی فضل و احسان فرمایا ہے جو حد و حساب سے باہر ہے۔ اس نے تمہارے نبی محمد ﷺ کو دوسرے انبیاء پر شرف و فضیلت عطا فرمائی۔ اور تمہیں وہ شریعت عطا فرمائی جو ہر حیثیت سے کامل ترین ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

''اور اہل کتاب سے بعض ایسے (دیانتدار) ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) تو ادا کر دے اسے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک اشرفی تو واپس نہ کرے گا اسے بھی تیری طرف مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے اس (بددیانتی) کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ ہاں کیوں نہیں جس نے پورا کیا اپنا وعدہ اور پرہیز گار بنا تو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیز گاروں سے''۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ یہودیوں میں بعض انتہائی خائن ہیں مسلمانوں کو ان سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ اور ان میں بعض امانت دار بھی ہیں۔ اگر تم ان کے پاس سونا چاندی کا ڈھیر امانت رکھو وہ تمہیں بعینہٖ واپس لوٹا دیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر امانت اس سے کم بھی ہو تو وہ بدرجہ اولیٰ واپس کر دیں گے۔ اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت کے طور پر رکھو تو وہ واپس نہیں کریں۔ مگر جب تم ان کے سر پر کھڑے ہو اور اپنی امانت واپس لینے کا سختی سے مطالبہ کرو۔ جب ایک دینار میں ان کا یہ وطیرہ ہے تو اس سے زیادہ بدرجہ اولیٰ واپس نہیں کریں گے۔ ''قنطار'' کے بارے میں تفصیلی بحث اس سورت کی ابتداء میں گزر چکی ہے۔ اور دینار مشہور و معروف ہے۔ حضرت مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ دینار کو دینار اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ دین بھی ہے اور نار بھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے اگر دینار کو حق کے ساتھ لیا جائے تو وہ دین ہے اور اگر ناحق لیا جائے تو یہ نار ہے۔ اس جگہ اس حدیث کو ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسے امام بخاری نے کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ کتاب الکفالہ میں اسے تفصیلاً بیان کیا۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کسی سے ایک ہزار دینار قرض کے طور پر طلب کیا۔ اس نے کہا پہلے گواہ لاؤ۔ وہ کہنے لگا اللہ ہی ہمارا گواہ کافی ہے۔ پھر اس نے کہا کوئی ضامن لاؤ۔ اس نے کہا ہمارا ضامن

اللہ ہی کافی ہے۔ اس نے کہا تم سچ کہتے ہو۔ پھر ایک مقررہ مدت کے لیے اسے ہزار دینار دے دیے وہ یہ رقم لے کر تجارت کی غرض سے سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی تجارت میں مشغول رہا۔ جب قرض ادا کرنے کا وقت آیا جہاز تلاش کرنے لگا تا کہ مقررہ وقت پر قرض واپس کر سکے۔ اسے کوئی جہاز نہ ملا۔ اس نے ایک لکڑی لی اس کے اندر سوراخ کر کے اس میں ہزار دینار رکھے اور اوپر سے سوراخ بند کر دیا۔ اور یہ لکڑی لے کر سمندر پر آیا۔ اور عرض کی اے باری تعالیٰ! تو جانتا ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ہزار دینار قرض لیا تھا۔ اس نے مجھ سے گواہ طلب کیا تھا تو میں نے کہا کہ اللہ ہی گواہ کافی ہے اور پھر اس نے مجھ سے ضامن طلب کیا میں نے اس سے کہا ہمارا ضامن اللہ ہی ہے۔ وہ اس پر راضی ہو گیا تھا۔ اور آج میں نے جہاز کو تلاش کیا تا کہ مقررہ وقت پر اس کا قرض ادا کروں۔ اسے میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے لکڑی کو سمندر میں پھینک دیا۔ جب لکڑی تیرنے لگی تو واپس لوٹ آیا۔ اور جہاز کی تلاش میں رہا۔ تا کہ واپس وطن لوٹ سکے۔ ادھر وہ شخص جس نے قرض دیا تھا وہ ساحل سمندر پر انتظار کر رہا تھا۔ شاید کسی جہاز پر اس کا مال آنے والا ہو۔ اسی اثناء میں اس کی نظر لکڑی پر پڑی جس میں دینار تھے۔ اس نے وہ لکڑی اٹھالی تا کہ گھر میں ایندھن کے کام آئے۔ جب اس نے لکڑی کو چیرا تو اس کے اندر سے ہزار دینار اور ایک خط نکل آیا۔ چند دنوں کے بعد وہ شخص بھی واپس آ گیا جس نے قرض لیا تھا۔ اس نے اسے ہزار روپیہ دیا اور کہا قسم بخدا میں کافی دنوں سے جہاز کی تلاش میں تھا تا کہ مقررہ وقت پر قرض ادا کر سکوں لیکن مجھے جہاز نہ مل سکا۔ اس نے کہا کیا تم نے اس سے پہلے میری طرف کوئی چیز بھیجی تھی۔ اس نے جواب دیا میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اس سے پہلے مجھے جہاز نہیں ملا تھا۔ اس نے کہا کہ جو تم نے لکڑی میں رقم بھیجی تھی وہ اللہ تعالیٰ نے تیری طرف سے ہم تک پہنچا دی ہے۔ یہ ہزار دینار لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری راہنمائی فرمائے (1)۔ اس واقعہ کو امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی مسند میں تفصیلاً ذکر کیا ہے اور اسے امام بزاز نے بھی اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا: اس بددیانتی اور خیانت کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دین میں ان ان پڑھ لوگوں کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے لیے حلال کر دیا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے یہ بات اپنے پاس سے گھڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سوائے حق کے دوسرے کے مال کو کھانا حرام قرار دیا ہے۔ یہ انتہائی جھوٹی قوم ہے۔ انہیں بہتان باندھنے کی عادت ہے۔ ابوصعصعہ بن یزید فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا کہ دوران جنگ بعض اوقات ہمیں ذمیوں کی مرغی یا بکری مل جاتی ہے تو آپ نے فرمایا تم اس کا کیا کرتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم اسے کھا جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اہل کتاب بھی ایسا ہی کہتے تھے۔ ہمیں ان کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ ذمی تمہیں جزیہ ادا کرتے ہیں۔ ان کی رضامندی کے بغیر تمہارے لیے ان کا مال حلال نہیں۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ جب اہل کتاب نے کہا کہ امیوں کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ دشمنان خدا جھوٹ بولتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کی تمام اشیاء میرے قدموں تلے مٹ چکی ہیں سوائے امانت کے۔ جو کہ ہر نیک اور بد کو ادا کرنی پڑے گی۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى: اے اہل کتاب تم میں سے جس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تم سے وعدہ لیا ہے کہ محمد ﷺ پر ایمان لانا جب وہ مبعوث ہوں۔ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے لیا تھا۔ اور جو تم میں سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء سے بچتا رہا اور اس کی اطاعت پر کاربند رہا اور اس شریعت پر عمل پیرا رہا جو اس نے خاتم النبیین اور سید الرسل کو عطا فرمائی

1۔ فتح الباری، کتاب الکفالۃ: 468/4

ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''بے شک جو لوگ خریدتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت۔ یہ وہ (بدنصیب) ہیں کہ کچھ حصہ نہیں ان کے لیے آخرت میں اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ اور دیکھے گا بھی نہیں ان کی طرف قیامت کے روز اور نہ پاک کرے گا انہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے جو اہل کتاب اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے عوض اس حقیر، فانی اور ختم ہو جانے والی دنیا کا فائدہ حاصل کرتے ہیں انہیں آخرت میں کوئی حصہ نہیں دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے عہد کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنے اور اپنی کتابوں میں موجود ان کی صفات کو لوگوں پر ظاہر کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو ان سے بات کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھے گا۔ یعنی ان کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا اور نہ ہی ان پر اپنا فضل واحسان فرمائے گا۔ انہیں ان کے گناہوں سے پاک نہیں فرمائے گا۔ بلکہ انہیں جہنم میں ڈالنے کا حکم دے گا۔ اس آیت کریمہ کے متعلق کچھ احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے چند ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

1۔ حضرت ابوذر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے قیامت کے دن نہ گفتگو فرمائے گا، نہ نظر رحمت فرمائے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟ یہ تو خائب وخاسر ہو گئے رسول اللہ ﷺ نے تین دفعہ یہی فرمایا۔ اور پھر جواب دیا: ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکانے والا، جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا بیچنے والا۔ اور احسان جتلانے والا(1)۔ اس کو امام مسلم اور اصحاب سنن نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کی دوسری سند کے یہ الفاظ ہیں۔ ابوالاحمس فرماتے ہیں میری ملاقات حضرت ابوذر سے ہوئی۔ میں نے انہیں کہا مجھے معلوم ہوا کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: میرے متعلق یہ ہرگز گمان نہ کرنا کہ میں رسول اللہ ﷺ سے حدیث سننے کے بعد آپ کی طرف کوئی جھوٹی چیز منسوب کروں گا۔ بتاؤ تمہارے پاس میری طرف سے کون سی حدیث پہنچی ہے۔ میں نے عرض کی: مجھے آپ کی طرف سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے لوگوں کو مبغوض رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ہاں میں نے یہ حدیث بیان کی ہے اور حضور ﷺ سے سنی ہے۔ میں نے عرض کی یہ کون لوگ ہیں؟ جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ایک وہ جو سینہ تان کر دشمن کے مقابلہ کے لیے نکلتا ہے اور پھر اللہ کی راہ میں شہید ہو جاتا ہے یا فتح ونصرت سے واپس لوٹتا ہے۔ دوسرا وہ جو کسی قافلہ کے ساتھ نکلے۔ قافلہ رات کے آخری پہر تک سفر پر گامزن رہے اور جب اہل قافلہ تھک کر آرام کرنے کے لیے اپنی سواریوں سے اترتے ہیں تو وہ شخص ایک کونہ میں نماز میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کوچ کا وقت آتا ہے تو اپنے ساتھیوں کو جگا دیتا ہے۔ تیسرا وہ جسے اس کا پڑوسی اذیت دیتا ہے۔ وہ اس کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ موت یا سفر ان کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے۔ پھر میں نے عرض کی وہ کون لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ایک بہت

1۔ مسلم، کتاب الایمان: 102

قسمیں کھانے والا تاجر، دوسرا متکبر فقیر، تیسرا احسان جتانے والا بخیل۔ اس کی سند غریب ہے۔ 2۔ بنو کندہ کے ایک شخص امرؤالقیس بن عامر کا ایک حضرمی کے ساتھ زمین کے معاملہ میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ فیصلہ کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حضرمی سے کہا اپنے گواہ لاؤ۔ اس کے پاس گواہ نہیں تھے۔ تو آپ نے امرؤالقیس سے فرمایا کہ تم قسم اٹھاؤ حضرمی نے عرض کی یا رسول اللہ! رب کعبہ کی قسم! اگر قسم سے فیصلہ ہوا تو یہ میری زمین لے جائے گا۔ آپ نے فرمایا جس شخص نے مال کے حصول کے لیے جھوٹی قسم کھائی۔ وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ تو امرؤالقیس نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر اسے کوئی چھوڑ دے تو اسے کیا اجر ملے گا۔ تو آپ نے فرمایا اسے اس کے بدلہ میں جنت ملے گی۔ اس نے عرض کی آپ گواہ رہیے میں نے یہ تمام زمین اس کے لیے چھوڑ دی (1)۔

3۔ حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے کسی مسلمان کا مال غصب کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھائی۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا۔ حضرت اشعث فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میرے بارے میں تھا۔ میری ایک یہودی کے ساتھ زمین میں شراکت تھی۔ اس نے زمین سے میرے حصے کا انکار کر دیا۔ میں نے اسے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے مجھے فرمایا کیا تمہارے پاس گواہ ہیں۔ میں نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! آپ نے یہودی کو قسم اٹھانے کا فرمایا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ قسم اٹھا کر میرا حصہ لے جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی مروی ہے۔ اور وہاں زمین کی جگہ کنواں کے بارے میں جھگڑے کا بیان ہے۔

4۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں سے گفتگو نہیں فرمائے گا نہ انہیں پاک کرے گا اور نہ ہی انہیں نظر رحمت سے دیکھے گا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں۔؟ فرمایا اپنے والدین سے بیزار اور ان سے روگردانی کرنے والا۔ اپنی اولاد سے بیزار، وہ شخص جس نے کسی پر احسان کیا ہوا اور وہ اپنے محسن کا ناشکر گزار بن جائے اور اس سے بیزار ہو جائے۔

5۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ فرماتے ہیں ایک آدمی نے اپنا سودا بازار میں لگایا اور جھوٹی قسمیں کھانے لگا تا کہ وہ کسی مسلمان کو اپنے دام فریب میں پھنسائے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

6۔ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں تین قسم کے لوگوں کے ساتھ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ گفتگو فرمائے گا نہ نظر رحمت سے دیکھے گا۔ اور نہ ہی انہیں گناہوں سے پاک کرے گا اور انہیں دردناک عذاب ہوگا۔ ایک وہ جو اپنا فالتو اور بچا ہوا کھانا اپنے ہم سفر ساتھی کو نہ دے۔ دوسرا وہ، جو عصر کے بعد اپنا سودا بیچنے کے لیے جھوٹی قسم کھائے، تیسرا وہ، جس نے کسی حاکم وقت کے ہاتھ پر بیعت کی اور اگر اس نے مال دیا تو وفا کی اور اگر نہ دیا تو دغا نہ کی۔ (2)

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝

''اور بے شک ان میں ایک فریق وہ ہے جو مروڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ تا کہ تم خیال کرنے لگو (ان کی) اس

1۔ مسند امام احمد: 191/4 2۔ مسند امام احمد: 480/2

(الٹ پھیر) کو بھی اصل کتاب سے حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے (اترا) ہے حالانکہ وہ نہیں ہے اللہ کے پاس سے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر"۔

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف و تغییر کرتے ہیں۔ معنی مقصود بیان کرنے میں ہیر پھیر سے کام لیتے ہیں۔ تاکہ سادہ لوح لوگ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر جان بوجھ کر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے۔ مجاہد، شعبی، حسن بصری، قتادہ، ربیع بن انسؒ نے "یلون" کا معنی یہ کیا ہے کہ وہ تحریف کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مخلوق میں سے کسی کے بس کی بات نہیں جو اللہ کی کتاب میں ایک لفظ کی بھی کمی وبیشی کر سکے۔ لیکن اس میں تحریف و تغییر کرتے ہیں اور غلط قسم کی تاویلیں کرتے ہیں۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں تورات اور انجیل تو ویسے ہی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نازل فرمائیں۔ لیکن یہ لوگ اس میں تحریف و تاویل کرتے ہیں۔ اور کچھ کتابیں ایسی ہیں جو انہوں نے اپنی طرف سے لکھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابیں محفوظ ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اگر وہب بن منبہ نے یہ ان کتابوں کے بارے میں کہا ہے جو یہود و نصاریٰ کے پاس ہیں۔ تو ظاہر ہے ان میں تحریف و تغییر اور کمی وبیشی ہوئی ہے۔ اور اگر ان کی مراد حقیقی اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں تو بے شک وہ ہر قسم کی کمی وبیشی سے محفوظ ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ان کی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو اس میں بعض مقامات پر کمی وبیشی ہو جاتی ہے۔ یا غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

"نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لیے کہ (جب) عطا فرما دے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر (وہ تو یہ کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے اس لیے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنا لو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان بن چکے ہو"

ابن اسحاق فرماتے ہیں جب نجران کا عیسائی وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہود کے علماء بھی آگئے۔ آپ نے عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ابو رافع قرظی یہودی نے کہا اے محمد (ﷺ)! کیا ہم بھی تیری اسی طرح عبادت کریں جس طرح نصاریٰ (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ بات سن کر نصاریٰ میں سے رئیس نامی شخص کہنے لگا۔ اے محمد! (ﷺ) کیا ہم سے بھی یہی چاہتے ہو۔ ہمیں بھی یہ دعوت دینا چاہتے ہو۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ معاذ اللہ: ہم غیر اللہ کی عبادت کریں اور غیر اللہ کی عبادت کا کسی کو حکم دیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے ساتھ مبعوث نہیں فرمایا اور نہ ہی مجھے اس کا حکم ملا ہے۔ تو اس وقت یہ آیت کریمہ

نازل ہوئی۔ یعنی کسی انسان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اسے کتاب، نبوت، اور حکمت عطا فرمائے تو وہ لوگوں کو کہے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ جب یہ قول ایک نبی مرسل کے لیے مناسب نہیں تو ایک عام انسان کے لیے بدرجہ اولیٰ غیر مناسب اور ناموزوں ہوں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کسی مومن کے لیے مناسب نہیں کہ لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم دے۔ وہ فرماتے ہیں اہل کتاب ایک دوسرے کی عبادت کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے علماء اور راہبوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ:31)'' انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور راہبوں کو (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر''۔ حضرت عدی بن حاتم نے عرض کی یا رسول اللہ! (ﷺ) وہ لوگ ان کی پوجا تو نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کیوں نہیں؟ راہب اور پادری لوگوں پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کو دیا کرتے تھے۔ اور لوگ ان کی اتباع کیا کرتے تھے اور یہی ان کی عبادت تھی۔ جاہل پادری، راہب اور جعلی پیر اس مذمت اور زجر و توبیخ میں داخل ہیں۔ بخلاف انبیاء اور رسل اور ان کے متبعین علمائے عاملین کے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو پیغام دیتے ہیں اور جن چیزوں سے انہوں نے روکا ہے اس سے روکتے ہیں۔ انبیاء و رسل اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان سفیر ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اس کی امانت کو اس کی مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس فریضہ کو بڑے احسن طریقہ سے ادا کیا۔ مخلوق کو وعظ و نصیحت کی اور ان تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا۔

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ: لیکن رسول تو لوگوں کو یہ کہتے ہیں کہ تم اللہ والے بن جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابو رزین وغیرھم فرماتے ہیں کہ ربانیین سے مراد بردبار علماء اور حکماء ہیں۔ حضرت حسن بصری اور بعض دوسرے بزرگ فرماتے ہیں اس سے مراد فقہاء ہیں۔ سعید بن جبیر، قتادہ، عطا خراسانی اور عطیہ عوفی، ربیع بن انس اور ایک قول کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد عابد زاہد اور متقی لوگ ہیں۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ قرآن پاک پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ فقیہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں ''تُعَلِّمُوْنَ'' بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کا معنی تعلیم دینا ہے۔ ''تَدْرُسُ'' کا معنی اس کے الفاظ کو یاد کرنا ہے۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ: اور نہ ہی وہ حکم دیتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کی عبادت کرو خواہ وہ نبی مرسل ہو یا کوئی مقرب فرشتہ۔

اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: یہ کام تو وہی کر سکتا ہے جو غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دے اور جو غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دے وہ کافر ہے۔ اور انبیاء علیہ السلام صرف وحدہ لاشریک کی عبادت کرتے تھے اور اسی کی دعوت دیتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء:25) ''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول، مگر یہ کہ ہم نے وحی بھیجی اس کی طرف کہ بے شک نہیں ہے کوئی خدا بجز میرے، پس میری عبادت کیا کرو''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ''وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ'' (النحل:36) ''اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول (جو انہیں یہ تعلیم کرے) عبادت کیا کرو اللہ کی اور دور رہو طاغوت سے''۔ اللہ نے فرشتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء:29) ''اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو ہم اسے سزا دیں گے جہنم کی۔ یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ہم ظالموں کو''۔

1۔ مسند احمد: 49/1

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو دوں میں تم کو کتاب اور حکمت سے پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی (اس کے بعد) فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اٹھا لیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ؟ سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا (اللہ نے) فرمایا تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں پھر جو کوئی پھرے اس (پختہ عہد) کے بعد تو وہی لوگ فاسق ہیں''۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ اس نے حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک تمام انبیاء سے وعدہ لیا ہے کہ جب ان میں سے کسی ایک کو اللہ تعالیٰ کتاب اور حکمت عطا کرے اور وہ بلند مقام و مرتبہ پر پہنچ جائے تو جب اس کے زمانہ میں وہ رسول آ جائے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے۔ اس کا اپنا مقام و مرتبہ اور علم نبوت اس رسول کی اتباع کرنے میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں سے یہ وعدہ لینے کے بعد ارشاد فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور میرا بھاری ذمہ اٹھا لیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، ربیع بن انس اور سدی فرماتے ہیں کہ ''اصری'' سے مراد عہد ہے۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں اس سے مراد وہ بوجھ ہے جو اللہ تعالیٰ کے پختہ میثاق اور مضبوط عہد کی وجہ سے اٹھایا۔ انبیاء کرام نے اس کے جواب میں عرض کیا ہم نے اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم سب گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ پھر جو کوئی اس پختہ عہد کے بعد پھرے گا وہ فاسق ہوگا۔ حضرت علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی نبی کو مبعوث فرمایا اس سے یہ پختہ وعدہ لیا کہ اگر میں نے محمد ﷺ کو تمہاری زندگی میں مبعوث کر دیا تو تم اس پر ضرور ایمان لانا۔ اور اپنی امت سے بھی وعدہ لے لینا اگر تمہاری زندگی میں اللہ تعالیٰ نے محمد (ﷺ) کو مبعوث فرمایا تو ان پر ضرور ایمان لانا اور ان کی معاونت بھی کرنا۔ حضرات طاؤس، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے ایک دوسرے کی تصدیق کرنے کا عہد لیا ہے اور یہ حضرت علی اور عبداللہ بن عباس کے قول کے منافی نہیں۔ بلکہ یہ اس کو مستلزم اور اس کا مقتضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طاؤس کے صاحبزادے نے ان سے حضرت علی اور عبداللہ بن عباس کے قول کی مثل روایت کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن ثابت روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی۔ میں نے اپنے ایک یہودی دوست کو کہا تھا کہ وہ مجھے تورات کی کچھ جوامع الکلم لکھ کر دے۔ اس نے مجھے لکھ کر دیا ہے۔ کیا میں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ یہ سن کر حضور ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے حضرت عمر سے کہا کہ آپ دیکھتے نہیں کہ حضور ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔ اس پر حضرت عمر نے عرض کی کہ میں اللہ تعالیٰ کے پروردگار ہونے، اسلام کے دین حق ہونے اور محمد ﷺ کے رسول برحق ہونے پر راضی ہوں۔ اس سے نبی کریم ﷺ کا غصہ فرو ہو گیا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر موسیٰ تم میں

آ جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ تمام امتوں میں سے تم میرے حصے میں آئے ہو اور میں تمام انبیاء میں سے تمہارے حصے میں آیا ہوں (1)۔ حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اہل کتاب سے کچھ نہ پوچھو وہ خود گمراہ ہیں تمہیں کیسے ہدایت دے سکتے ہیں۔ بلکہ یہ ممکن ہے تم ان کی باتوں میں کسی باطل کی تصدیق کر دو یا حق کی تکذیب کر بیٹھو۔ قسم بخدا اگر آج موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری اتباع کے سوا کچھ جائز نہیں ہوتا۔ ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں اگر (موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام) زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے رسول خاتم النبیین ہیں اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ وہی امام الانبیاء ہیں۔ اگر آپ کسی بھی نبی کے زمانہ میں تشریف لاتے تو آپ واجب الاطاعت اور مقدم ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب معراج کی رات تمام انبیاء کرام بیت المقدس میں جمع ہوئے تو آپ نے ان کی امامت فرمائی۔ آپ ہی محشر میں شفیع المذنبین ہوں گے۔ اور اس مقام محمود پر فائز ہوں گے جو آپ کے لیے ہی خاص ہے۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء و رسل کو بھی اس مقام تک رسائی حاصل نہ ہوگی۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾

”کیا اللہ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں حالانکہ اسی کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ خوشی سے یا مجبوری سے اور اسی کی طرف وہ (سب) لوٹائے جائیں گے۔ آپ فرمائیے ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہم پر اور جو اتارا گیا ابراہیم (علیہ السلام)، اسمٰعیل (علیہ السلام)، اسحٰق (علیہ السلام)، یعقوب (علیہ السلام) اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ (علیہ السلام)، عیسیٰ (علیہ السلام) اور (دوسرے) انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے نہیں فرق کرتے ہم کسی کے درمیان اُن میں سے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے اور وہ قیامت کو زیاں کاروں میں سے ہوگا“۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر تعجب اور ناپسندیدگی کا اظہار فرماتا ہے جو دین الٰہی کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ اس دین سے روگردانی کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے ذریعہ نازل فرمایا اور اس کی اشاعت کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ اس دین کا بنیادی اور اہم فریضہ اس اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔ جس کے سامنے زمین و آسمان کی ہر مخلوق طوعاً و کرھاً، چار و ناچار اپنی گردن جھکائے ہوئے ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (الرعد: 15) ”اور اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً“۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ

1۔ مسند احمد: 266،265/4

هُمْ دٰخِرُوْنَ (النحل:48) ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔) تمام کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں''۔ مسلمان تو اپنے ظاہر اور باطن سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی عاجزی کا اظہار کر رہا ہے۔ اور کافر مجبوراً اللہ کے سامنے عاجز ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرتابی نہیں کر سکتا۔ اس آیت کی تفسیر میں کچھ احادیث وارد ہوئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آسمانوں میں تو فرشتے ہیں اور زمین میں اللہ کی ہر رضا اور رغبت اطاعت کرنے والے فرزندان اسلام ہیں۔ اور ''کَرْهًا'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو میدان جنگ میں مسلمانوں کی قید میں آئے انہیں زنجیروں اور طوقوں میں جکڑ کر جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ حالانکہ وہ اس کو ناپسند کریں گے اور صحیح حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں کہ آپ کا رب تعجب فرماتا ہے ان لوگوں پر جن کو زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ اس حدیث کی ایک اور بھی سند ہے۔ لیکن اس آیت کا وہی معنی زیادہ بہتر ہے جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ حضرت وکیع اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی مثل ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزمر:39) ''اور اگر دریافت کریں ان سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے اللہ نے''۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب اس نے روز ازل میں ان سب سے عہد لیا تھا۔ پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے اسی کی طرف انہیں لوٹایا جائے گا۔ یعنی قیامت کے دن سب اسی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا۔ ''وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا'' سے مراد قرآن ہے اور (اَلْاَسْبَاط) سے مراد بنو اسرائیل کے وہ بارہ قبائل ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔ اور وَمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى سے مراد تورات اور انجیل ہیں۔ وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ تمام انبیاء کو شامل ہے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے یعنی تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔ امت محمدیہ کے مومن، تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا انکار نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتابوں اور اس کے تمام فرستادہ رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا: جو دین اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کو تلاش کرے گا تو اس سے یہ قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہماری شریعت کے خلاف ہو وہ رد کر دیا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تمام اعمال اللہ کی بارگاہ میں پیش کیے جائیں گے۔ نماز کہے گی یا باری تعالیٰ! میں نماز ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو اچھی چیز ہے۔ پھر صدقہ حاضر ہو کر عرض کرے گا میں صدقہ ہوں۔ پھر روزے اور دیگر تمام اعمال حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہی عرض کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے جواب میں یہی ارشاد فرمائے گا۔ پھر آخر میں اسلام آئے گا اور عرض کرے گا اے پروردگار! تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا آج میں تیرے باعث مواخذہ کروں گا اور تیری ہی وجہ سے لوگوں کو انعام دوں گا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی(1)۔ اس حدیث کو صرف امام احمد نے ہی روایت کیا ہے۔ اور اس حدیث کے راوی حسن کا حضرت ابوہریرہ سے سماع ثابت نہیں۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ

1۔ مسند امام احمد: 362/2

الْبَیِّنٰتُ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَةَ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿ۙ۸۷﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿ۙ۸۸﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۸۹﴾

’’کیسے ہوسکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد اور (وہ پہلے خود) گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں، اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔ ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔ ہمیشہ رہیں اسی پھٹکار میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے دل سے) توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنی اصلاح کر لی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (انہیں بخش دے گا)‘‘۔

کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا: حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں ایک انصاری پہلے مسلمان ہوا۔ پھر مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا۔ پھر شرمندہ ہو کر اپنی قوم کو پیغام بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس کی قوم نے اس کی طرف پیغام بھیجا تو وہ آ کر مسلمان ہو گیا۔ اس حدیث کو ابن جریر، نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ حارث ابن سوید مسلمان ہوا۔ پھر مرتد ہو گیا۔ پھر جب وہ اپنی قوم کی طرف آیا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس کی قوم کے ایک شخص نے اسے یہ آیات پڑھ کر سنائیں تو اس حارث نے کہا قسم بخدا مجھے معلوم ہوتا ہے؟ تم سچے ہو اور رسول اللہ ﷺ تم سے زیادہ سچے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سچا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ اور بہترین طریقہ سے اسلام پر کاربند رہے۔ (بینات) سے مراد وہ دلائل اور براہین قاطعہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے صدق پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن وہ لوگ ان واضح دلائل کے باوجود کفر و شرک کی تاریکی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہدایت کے کیسے مستحق ہو سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اندھا کر لیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ: ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے گی اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور اس کی مخلوق کی اور وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے۔ نہ تو ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ: مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد سچے دل سے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔ وہ انہیں بخش دے گا اور یہ اللہ کی اپنی مخلوق پر خاص مہربانی اور فضل و احسان ہے کہ جو بھی سچے دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ ۚ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا وَّلَوِ افْتَدٰی بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۹۱﴾

’’یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں ہرگز نہ قبول کی جائے گی ان کی توبہ اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگر چہ وہ (اپنی نجات کے لیے) عوضانہ دے اتنا سونا ایسے لوگوں کے لیے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے ان کا کوئی مددگار‘‘۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ: وہ لوگ جو ایمان کے بعد کفر کو اختیار کرتے ہیں اور پھر اس کفر میں بڑھتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ اسی کفر پر ان کی موت واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو زجر و توبیخ کرتے اور دھمکی دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ موت کے وقت ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد فرمایا: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (النساء:8) ’’اور نہیں ہے یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لیے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آ جائے کسی ایک کو ان میں سے موت، تو کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب‘‘۔ اور یہاں ارشاد فرمایا کہ ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔ یعنی صراط مستقیم کو چھوڑ کر گمراہی کے راستہ کو اختیار کرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ مسلمان ہوئے پھر مرتد ہو گئے۔ پھر مسلمان ہوئے اور دوبارہ مرتد ہو گئے۔ انہوں نے اپنی قوم کے کچھ لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا کیا ان کی اب بھی توبہ قبول ہوگی۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا: یعنی جو شخص کفر کی حالت میں مر گیا۔ اس کی کوئی نیکی قبول نہیں ہوگی۔ اگر چہ وہ اپنے گمان کے مطابق زمین بھر سونا خرچ کر دے۔ رسول اللہ ﷺ سے عبداللہ بن جدعان کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ مہمان نوازی کرتا تھا، غلاموں کو آزاد کرتا اور مساکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ تو کیا اسے اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے زندگی بھر ایک دفعہ بھی نہیں کہا اے میرے رب! قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف کر دے۔ اسی طرح اگر وہ زمین بھر سونا بھی خرچ کر دیتا تو اسے قبول نہ کیا جاتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ (البقرہ:48) ’’اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش‘‘۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ (ابراہیم:31) ’’اس سے پیشتر کہ آ جائے وہ دن جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی‘‘۔ ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (المائدہ:36) ’’بے شک وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اگر انہی کی ملکیت میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تا کہ بطور فدیہ دیں اسے (اور نجات پائیں) عذاب سے روز قیامت نہ قبول کیا جائے گا ان سے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا‘‘۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا، وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ میں واؤ عاطفہ ہے جو مغایرت پر دلالت کرتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ واؤ زائدہ ہے لیکن جو تفسیر اس کی ہم نے ذکر کی ہے وہی زیادہ بہتر ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے عذاب سے اسے کوئی چیز نہیں بچا سکے گی۔ اگر چہ وہ زمین بھر سونا خرچ کر دے۔ خواہ زمین کے پہاڑوں، ٹیلوں، مٹی، ریت، میدانوں، خشکی و تری کے برابر سونا خرچ کر دے، حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن اہل جہنم میں سے ایک شخص کو کہا جائے گا۔ بتاؤ اگر روئے زمین کی ہر چیز تمہاری ملکیت ہو تو کیا تم اپنی جان بخشی کے لیے اسے فدیہ کے طور پر دے دو گے وہ کہے گا ہاں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا میں نے تو تجھ سے معمولی چیز کا مطالبہ کیا تھا لیکن تم نے اسے پورا نہ کیا جب تو اپنے باپ آدم کی پشت میں تھا۔ اس وقت میں نے تجھ سے عہد لیا تھا کہ

میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ لیکن تم نے اس وعدہ کو پورا نہ کیا اور غیر کو میرے ساتھ شریک ٹھہراتا رہا(1)۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ قیامت کے دن ایک جنتی کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اے ابن آدم! جنت کو تو نے کیسا پایا۔ وہ عرض کرے گا اے پروردگار! میری یہ بہترین منزل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ اگر تمہارے دل میں کوئی تمنا ہو تو بیان کرو۔ وہ عرض کرے گا یا باری تعالیٰ میری ایک ہی تمنا ہے کہ تو مجھے دنیا میں واپس بھیج دے اور میں تیری راہ میں بار بار قتل کیا جاؤں۔ وہ یہ بات اس لیے کہے گا کیونکہ وہ شہادت کی قدر و منزلت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر چکا ہے۔ پھر ایک جہنمی کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا اے ابن آدم! تو نے اپنا ٹھکانہ کیسا پایا وہ عرض کرے گا بڑا برا ٹھکانہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کیا تو زمین بھر سونا فدیہ دے کر اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے وہ عرض کرے گا ہاں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تو جھوٹا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے تو تجھ سے اس سے معمولی چیز کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن تو نے اسے سرانجام نہ دیا۔ پھر اس کو واپس جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔ یعنی کوئی ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکے گا اور نہ ہی انہیں اللہ تعالیٰ کے دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

"ہرگز نہ پا سکو گے تم کامل نیکی (کا رتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے"۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ: حضرت عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ یہاں "اَلْبِرَّ" سے مراد جنت ہے۔ یعنی تم جنت کو ہرگز نہیں پا سکو گے جب تک راہ خدا میں ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جن چیزوں کو تم پسند کرتے ہو۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ ابوطلحہ انصاری انصار میں سب سے زیادہ مالدار تھے۔ اور بئر حاء نامی باغ انہیں بہت پسند تھا۔ اور یہ باغ مسجد نبوی کے بالکل مقابل ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس باغ میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور اس کنواں کا میٹھا اور عمدہ پانی پیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو ابوطلحہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا...... اور میرا سب سے زیادہ محبوب مال یہی بئر حاء ہے۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ اور اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا امیدوار ہوں۔ لہٰذا آپ جیسے مناسب سمجھیں اسے تقسیم فرما دیں۔ نبی کریم ﷺ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا یہی نفع مند مال ہے۔ یہی نفع مند مال ہے۔ پھر فرمایا میرا خیال ہے تم اسے اپنے قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کرو۔ ابوطلحہ نے عرض کی ٹھیک یا رسول اللہ! جیسے آپ کا حکم۔ پھر آپ نے اپنے قریبی رشتہ داروں اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا(2)۔ حضرت عمر نے عرض کی یا رسول اللہ! خیبر میں میری زمین کا ایک ٹکڑا مجھے بہت عزیز اور محبوب ہے اس کے بارے میں مجھے کوئی حکم فرمائیے۔ آپ نے فرمایا اصل زمین اپنے قبضہ میں رکھو اور اس کی پیداوار کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دو(3)۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ تلاوت کرتے ہوئے میں جب اس آیت کریمہ پر پہنچا تو میں نے اس تمام مال میں غور و فکر کیا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کیا تھا تو مجھے رومی کنیز سے زیادہ کوئی محبوب چیز نظر نہ آئی۔ لہٰذا میں نے اسے خدا کی راہ میں آزاد کر دیا۔ اور میرے دل میں اس کی اتنی محبت ہے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں دی ہوئی کسی چیز کو واپس لے سکتا تو اس کنیز سے ضرور نکاح کر لیتا۔

1۔ مسند احمد: 127/3 2۔ مسند احمد: 141/3 3۔ فتح الباری، کتاب الشروط: 354/5

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

"سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کے لیے مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر اس سے پہلے کہ نازل کی گئی تورات آپ فرماؤ لاؤ تورات پھر پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ پس جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اس کے بعد تو وہی ظالم ہیں۔ آپ کہہ دیجئے سچ فرمایا ہے اللہ نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے اور (بالکل) نہ تھے وہ شرک کرنے والوں سے"۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا: حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں ایک دفعہ یہودیوں کا ایک گروہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا ہم آپ سے کچھ ایسی باتیں پوچھیں گے جو صرف نبی ہی بتا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا جو چاہو پوچھو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر میرے ساتھ وہی عہد کرو جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے لیا تھا کہ اگر میں نے تمہارے سوالات کے جوابات دے دیئے تو تم مسلمان ہو کر میری اتباع کرو گے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے ہم وعدہ کرتے ہیں۔ پھر کہنے لگے ہمیں چار اشیاء کے بارے میں بتائیے۔ 1۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کونسا کھانا اپنے اوپر حرام فرمایا۔ 2۔ مرد اور عورت کا پانی (منی) کیسا ہوتا ہے۔ اور پھر کبھی اس پانی سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ 3۔ امی نبی کی نیند کیسی ہوتی ہے؟ 4۔ فرشتوں میں سے کونسا فرشتہ معاون و مددگار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سوال سن کر ان سے ایک مرتبہ پھر پکا وعدہ لیا کہ اگر میں نے تمہارے ان سوالات کا جواب دے دیا تو تم ضرور میری اتباع کرو گے۔ پھر آپ نے فرمایا میں تمہیں اس رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے (حضرت) موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سخت بیمار ہو گئے تھے۔ ان کی یہ بیماری طوالت اختیار کر گئی آپ نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی تو اپنے کھانے پینے میں سے سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ چیز چھوڑ دوں گا۔ کھانے میں سب سے زیادہ آپ کی پسندیدہ چیز اونٹ کا گوشت اور پینے میں سب سے زیادہ اونٹنی کا دودھ تھی۔ انہوں نے بیک زبان ہو کر کہا ہاں ہاں ہم جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے اللہ! تو گواہ رہنا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں واسطہ دیتا ہوں اللہ تعالیٰ کا جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی۔ پھر فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے مرد کا پانی سفید اور گاڑھا ہوتا ہے اور عورت کا پانی زردی مائل اور پتلا ہوتا ہے۔ ان دونوں میں سے جو پانی غالب آجائے بچہ بحکم الٰہی اس کے مشابہ ہوتا ہے۔ اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجائے تو لڑکا اور اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجائے تو لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ نے عرض کی اے اللہ گواہ رہنا۔ پھر آپ نے فرمایا میں تمہیں واسطہ دیتا ہوں خدا جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس امی نبی کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا۔ انہوں نے بیک زبان ہو کر کہا جی ہاں۔ آپ نے عرض کی یا باری تعالیٰ گواہ رہنا۔ پھر آپ نے فرمایا میرا معاون و مددگار فرشتہ جبرئیل ہے اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کا معاون و مددگار جبرئیل کو بنایا ہے۔ یعنی وہی ہر نبی (علیہ السلام) پر وحی لے کر آتا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے ہم آپ کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔ (حضرت) جبرئیل کے علاوہ کوئی دوسرا فرشتہ آپ کا معاون و

مددگار ہوتا تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللهِ (البقرہ:97) ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے پانچ سوال پوچھے۔ پانچواں سوال یہ پوچھا کہ یہ رعد (بجلی کی کڑک) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک آگ کا کوڑا ہے۔ وہ اس کوڑے کے ساتھ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہو بادلوں کو ہانک کرلے جاتا ہے۔ انہوں نے پوچھا یہ آواز کیسی ہے جو ہم بادلوں میں سنتے ہیں آپ نے فرمایا یہ بھی فرشتے کی آواز ہے۔ اس روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا مرض تھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا نام سن کر کہنے لگے۔ وہ جنگ وجدال کرانے اور عذاب نازل کرنے والا فرشتہ ہے اور ہمارا دشمن ہے۔ اگر اللہ کی رحمت، بارش اور روزی دینے والے فرشتے میکائیل کا نام لیتے تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی تکلیف لاحق ہوئی۔ جس کی پریشانی سے آپ سو نہیں سکتے تھے۔ دن کو یہ درد دور ہو جاتا۔ آپ نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی تو وہ اونٹ کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ ابن جریر فرماتے ہیں آپ کی اولاد بھی آپ کی اتباع میں اونٹ کے گوشت سے پرہیز کرتی رہی۔ یہ واقعہ تورات نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اس آیت کریمہ کی سابقہ آیت سے ایک مناسبت یہ ہے کہ جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے نذر مان کر اپنی محبوب ترین چیز کو چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ ان کی شریعت میں جائز تھا۔ اسی طرح تم بھی اپنی پسندیدہ اور محبوب چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دو اگرچہ اسے اپنے اوپر حرام کرنا تمہارے لیے جائز نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ (البقرہ:177) "اور دے اپنا مال اللہ کی محبت میں۔" ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ (الدہر:8) "اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی محبت میں"۔ اور دوسری مناسبت یہ ہے کہ سابقہ آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصاریٰ کے باطل عقائد کا بطلان اور رد تھا۔ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ ماجدہ علیہا السلام کے بارے میں تفصیلی بیان تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ذکر کیا کہ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو کیسے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ بغیر باپ کے پیدا کیا اور انہیں بنی اسرائیل کی طرف دعوت وتبلیغ کے لیے بھیجا۔ اور یہاں یہود کے عقائد باطلہ کا رد ہو رہا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ وہ جس نسخ کے جواز کا انکار کرتے ہیں وہ ان کی اپنی کتاب تورات میں واقع ہوا ہے۔ تورات میں یہ واضح طور پر موجود ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے باہر نکلے ان کے لیے تمام جانوروں کا کھانا حلال تھا۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام کر لیا۔ پھر آپ کی اولاد بھی آپ کی اتباع میں اسے حرام سمجھتی رہی۔ پھر تورات میں اس کی حرمت نازل ہوئی۔ اس کے علاوہ کچھ دوسری چیزیں حرام کر دی گئی تھیں۔ نسخ اسی کو کہتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی صلبی اولاد میں بہن بھائیوں کا آپس میں نکاح جائز تھا اس کے بعد یہ حرام کر دیا گیا۔ اپنی بیوی پر لونڈی لانا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں مباح تھا۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سائرہ پر حضرت ہاجرہ کو نکاح میں لائے۔ اور پھر تورات میں یہ حرام قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرنا بھی جائز تھا۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں دو سگی بہنیں تھیں پھر تورات میں اس کی حرمت نازل ہوئی۔ یہ سب کچھ ان کی کتاب تورات میں موجود ہے۔ اور اسی کو نسخ کہتے ہیں۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ان بعض چیزوں کو حلال کر دیا جو تورات میں حرام تھیں تو اب یہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت اور تکذیب کیوں کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو جس دین متین اور صراط مستقیم کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْ إِسْرَآءِيْلَ...... "ترجمہ: یعنی نزول تورات سے پہلے بنی اسرائیل پر تمام کھانے حلال تھے۔ سوائے ان دو چیزوں

کے جن کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ پھر فرمایا تورات لے آؤ اور اسے پڑھ کر سناؤ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کیونکہ تورات میں وہی کچھ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ پس جو اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھے گا یعنی یہ دعویٰ کرے گا کہ ان کے لیے ہفتہ کا دن مشروع کیا گیا ہے اور ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تورات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا اور یہی لوگ ظالم ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ : اے محبوب فرما دیجیے اللہ تعالیٰ نے جو یہ تمام خبریں دی ہیں اور قرآن کے جو احکام نازل کیے ہیں اس میں وہ سچا ہے۔ پس تم اس دین ابراہیمی کی اتباع کرو۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ پر قرآن کی صورت میں نازل فرمایا۔ یہی وہ دین حق ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور یہی وہ شریعت ہے کہ جس سے کامل اور واضح ترین شریعت کوئی نبی نہیں لے کر آیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (انعام:161) ''آپ فرمائیے مجھے پہنچا دیا ہے میرے رب نے سیدھی راہ تک۔ یعنی دین مستحکم (جو) ملت ابراہیم ہے جو باطل سے ہٹ کر صرف حق کی طرف مائل تھے۔ اور نہیں تھے وہ مشرکوں سے......'' دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (النحل:123) ''اور ہم نے وحی فرمائی (اے حبیب) آپ کی طرف کہ پیروی کرو ملت ابراہیم کی جو یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا''۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾

''بے شک پہلا (عبادت) خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لیے وہی ہے جو مکہ میں ہے بڑا برکت والا ہدایت (کا سرچشمہ) ہے سب جہانوں کے لیے۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو بھی داخل ہوا اس میں ہو جاتا ہے (ہر خطرہ سے) محفوظ اور اللہ کے لیے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی اور جو شخص (اس کے باوجود) انکار کرے تو بے شک اللہ بے نیاز ہے سارے جہان سے''۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گھر کے بارے میں بیان کیا ہے جس کو سب سے پہلے عام لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا۔ تاکہ لوگ اس کا طواف کریں۔ وہاں نمازیں پڑھیں۔ اعتکاف کریں اور یہ گھر مکہ میں ہے یعنی وہ کعبہ شریف جس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تعمیر کیا اور لوگوں کو حج کے لیے پکارا۔ تعجب تو ان یہود و نصاریٰ پر ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین اور آپ کے طریقہ کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس بیت اللہ کا حج نہیں کرتے جو انہوں نے تعمیر کیا تھا۔ یہ گھر بڑا بابرکت ہے اور تمام جہانوں کی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ حضرت ابوذر فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! سب سے پہلے کونسی مسجد تعمیر کی گئی آپ نے فرمایا مسجد حرام۔ میں نے عرض کی پھر اس کے بعد فرمایا مسجد اقصیٰ میں نے عرض کی۔ ان دونوں کی تعمیر کے درمیان کتنی مدت ہے؟ فرمایا۔ چالیس سال۔ میں نے پھر عرض کی اس کے بعد پھر کونسی مسجد تعمیر کی گئی۔ آپ نے فرمایا جہاں بھی نماز کا وقت

ہو پڑھ لیا کرو تمام زمین مسجد ہے(1)۔اس کو بخاری و مسلم نے دوسری اسناد سے روایت کیا ہے۔حضرت علی اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں گھر تو پہلے بھی بہت تھے لیکن یہ وہ پہلا گھر ہے جو خاص اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا۔ایک شخص نے عرض کی کیا یہ زمین پر سب سے پہلا تعمیر کیا جانے والا گھر ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں۔لیکن وہ پہلا گھر ہے جو بڑا بابرکت ہے۔اسی میں مقام ابراہیم ہے۔اس میں داخل ہونے والا امن میں ہو جاتا ہے۔بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تفصیل ہم نے سورۂ بقرہ کی ابتداء میں ذکر کر دی ہے۔اس لیے یہاں اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔سدی فرماتے ہیں روئے زمین پر سب سے پہلے یہی گھر تعمیر ہوا۔لیکن حضرت علی کا قول ہی صحیح ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حضرت آدم اور حوا کی طرف کعبہ شریف کی تعمیر کا حکم دے کر بھیجا۔آدم علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا پھر آپ کو اس کے طواف کا حکم دیا گیا اور یہ نداء آئی اے آدم! تم سب سے پہلے انسان ہو اور یہ سب سے پہلا گھر ہے۔اس کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے۔یہ روایت ابن لہیعہ کے مفردات میں سے ہے اور وہ ضعیف ہے۔ممکن یہ ہے کہ یہ حضرت عبداللہؓ کا اپنا قول ہو اور آپ نے اہل کتاب کی ان کتب سے پڑھا ہو جو آپ کو جنگ یرموک کے دوران میں ملیں بَکَّہ مکہ کا مشہور نام ہے۔اس کو بکہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے جابروں اور ظالموں کی گردنیں توڑ دیتا ہے۔یعنی وہ بھی یہاں آ کر گردن جھکا لیتے ہیں یا اس کا یہ نام اس لیے ہے کہ یہاں لوگوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔یا اس کا نام بکہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ لوگ یہاں خلط ملط ہوتے ہیں عورتیں مردوں کے سامنے نماز پڑھتی ہیں اور یہ کسی دوسرے شہر میں جائز نہیں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔فج سے تنعیم تک تو مکہ ہے اور بیت اللہ شریف سے بطحاء تک بکہ ہے۔حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں بیت اللہ شریف اور مسجد حرام کو بکہ کہتے ہیں اور اس کے ارد گرد کو مکہ۔میمون بن مہران سے بھی یہی مروی ہے۔مقاتل بن حیان، عطیہ عوفی وغیرہما فرماتے ہیں بیت اللہ شریف بکّہ اور اس کے علاوہ مکہ ہے۔بیت اللہ شریف کے اور بھی بہت سے نام ہیں مثلاً بیت العتیق۔بیت الحرام۔البلد الامین۔البلد المامون۔ام الرحم۔ام القریٰ۔صلاح۔عرش القادس۔المقدسہ۔الناسۃ۔الباسۃ۔الحاطمۃ۔الراس۔الکوثاء۔البلد۔البینۃ۔الکعبۃ۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ: اس میں روشن نشانیاں ہیں۔یہ دلالت کرتی ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے عزت وعظمت بخشی ہے۔اس میں مقام ابراہیم ہے۔یعنی وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف کی تعمیر کرتے رہے اور آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پتھر پکڑاتے تھے۔یہ مقام ابراہیم ہے۔بیت اللہ شریف کی دیوار کے ساتھ ملا ہوا تھا۔لیکن حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں اس کو وہاں سے ہٹا کر مشرق کی جانب کر دیا۔تاکہ لوگ آرام سے طواف کریں اور طواف کے بعد اس کے پیچھے دو رکعت نفل ادا کر سکیں۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مقام ابراہیم پر نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ:125)'' اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز''۔اس آیت کی تفسیر کے تحت اس کے متعلق احادیث ہم بیان کر چکے ہیں اس لیے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں ان آیات بینات سے ایک مقام ابراہیم ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مشاعر حج بھی ہیں۔مجاہد فرماتے ہیں۔اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشان واضح نشانی ہے۔یہی حضرت عمر بن عبدالعزیز، حسن بصری، قتادہ اور دوسرے مفسرین سے مروی ہے۔

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا: اگر کوئی خوفزدہ حرم مکہ میں داخل ہو جائے تو وہ ہر قسم کی تکلیف سے بے خوف ہو جاتا ہے۔حسن بصریؒ

1۔مسند امام احمد 150/5

فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہی دستور تھا کہ اگر کوئی شخص حرم مکہ میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی پاتا تو وہ اسے نہ چھیڑتا۔ جب تک کہ وہ حرم مکہ سے باہر نہ نکل جاتا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں جو شخص بیت اللہ شریف میں پناہ لیتا ہے۔ بیت اللہ اسے پناہ دیتا ہے۔ لیکن اسے کھانا پینا نہیں دیتا۔ جب وہ یہاں سے نکلتا ہے پھر وہ اپنے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کے بارے میں فرمایا: اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِہِمۡ (العنکبوت: 67) ''کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو اس کے آس پاس''۔ اور ایک مقام پر ارشاد فرمایا: فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ (قریش: 4) ''پس وہ عبادت کیا کریں اس خانہ کعبہ کے رب کی۔ جس نے انہیں رزق دے کر فاقہ سے نجات بخشی اور امن عطا فرمایا انہیں (فتنہ اور) خوف سے''۔ یہ انسانوں کے لیے ہی امن والا نہیں ہے۔ بلکہ جانوروں کے لیے بھی باعث امن ہے کہ اس کی حدود میں شکار کرنا منع ہے اور جانوروں کو ان کے گھونسلوں سے دور کرنا اور خوفزدہ کرنا ممنوع ہے۔ یہاں کے درخت اور گھاس کاٹنا حرام ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے صحابہ کرام سے مرفوع احادیث وآثار مروی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا آج کے بعد کوئی ہجرت نہیں مگر اللہ کی راہ میں جہاد اور نیک نیت سے عبادت کرنا باقی ہے۔ اگر تمہیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو جہاد کے لیے نکلا کرو۔ فتح مکہ کے دن آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے اسی دن حرام (محترم) قرار دے دیا تھا جس دن اس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا۔ اور یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی اس حرمت کی وجہ سے حرام رہے گا۔ مجھ سے پہلے کسی کے لیے اس میں جنگ کرنا حلال نہیں تھا۔ صرف میرے لیے دن کے ایک مختصر حصہ میں یہاں جنگ کو حلال کیا گیا ہے۔ پھر یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام رہے گا۔ نہ اس کے کانٹے اکھیڑے جائیں اور نہ ہی اس کے شکار کو بھگایا جائے۔ اور نہ ہی یہاں سے کسی گری ہوئی چیز کو اٹھایا جائے۔ صرف وہ شخص اٹھا سکتا ہے جو اس کی تشہیر کرنا چاہتا ہو۔ اور نہ ہی اس کا گھاس کاٹا جائے۔ حضرت عباسؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! اذخر گھاس کی اجازت دے دیجیے۔ اس کو لوگ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں اور لوہار اپنی بھٹیوں میں آپ نے فرمایا سوائے اذخر کے دوسری گھاس نہ کاٹی جائے (1)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم نے ابو ہریرہ سے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابو شریح العدوی فرماتے ہیں میں نے عمرو بن سعید کو کہا جب کہ وہ مکہ کی طرف فوج بھیج رہا تھا۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کو وہ حدیث سناؤں۔ جس کو میرے کانوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ دل نے یاد رکھا اور جب آپ یہ ارشاد فرما رہے تھے تو میری ان آنکھوں نے شرف دید حاصل کیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد ارشاد فرمایا مکہ کو اللہ تعالیٰ نے حرام (محترم) قرار دیا ہے۔ لوگوں نے حرام قرار نہیں دیا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے جائز نہیں وہ کسی کا خون بہائے۔ کوئی درخت کاٹے اور اگر کوئی فتح مکہ کے دن اللہ تعالیٰ کے رسول کے وہاں جنگ کرنے کی وجہ سے اپنے لیے رخصت تلاش کرے تو اسے کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کی اجازت دی تھی تمہیں اس کی اجازت نہیں۔ مجھے دن میں چند گھڑیوں کے لیے اجازت تھی اب اس کی حرمت کل کی طرف پھر واپس لوٹ آئی ہے۔ حاضر کو چاہئے کہ وہ غائب کو بھی اس کی اطلاع دے دے۔ ابو شریح سے کسی نے پوچھا عمرو بن سعید نے تمہیں اس کا کیا جواب دیا تھا، تو انہوں نے فرمایا کہ وہ یہ حدیث سن کر کہنے لگا میں اس حدیث کو تجھ سے زیادہ جانتا ہوں لیکن بیت اللہ شریف کسی گنہگار، قتل کر کے فرار ہونے والے یا کسی جرم کے مرتکب کو پناہ نہیں دیتا۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ مکہ میں کسی کے لیے ہتھیار اٹھا کر چلنا جائز نہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے

1۔ مسلم، کتاب الحج 987,986

ہجرت کرنے لگے تو آپ نے حزورہ کے مقام پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا اے مکہ! خدا کی قسم تو اللہ تعالیٰ کی سب سے افضل زمین ہے۔ اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور اگر مجھے یہاں سے نہ نکالا جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا(1)۔ اس کو ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ یحییٰ بن جعدہ اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ جو شخص حرم میں داخل ہوتا ہے وہ جہنم کی آگ سے امن میں ہو جاتا ہے۔ یہی مفہوم حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی حدیث میں بھی پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بیت اللہ شریف میں داخل ہوگا وہ نیکی میں آگیا اور برائی سے دور ہو گیا۔ اور جب وہ اس سے باہر نکلا اس کے گناہ بخش دیے گئے۔ لیکن اس کے ایک راوی عبد بن المومن قوی نہیں۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا: جمہور علماء کے نزدیک یہ آیت کریمہ حج کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حج کی فرضیت آیت کریمہ: وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرہ:196) سے ثابت ہوتی ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ متعدد احادیث میں بیان کیا گیا ہے کہ حج اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے۔ جس کی فرضیت پر علماء کا اجماع ہے۔ اور عمر میں ایک مرتبہ صاحب استطاعت مکلّف مسلمان پر واجب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے تم حج کرو۔ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج فرض ہے۔ آپ خاموش رہے۔ حتیٰ کہ اس شخص نے تین دفعہ یہ سوال کیا۔ پھر آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کر دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ اور تم اس کی استطاعت نہ رکھتے۔ پھر ارشاد فرمایا مجھ سے ایسے سوال نہ کیا کرو۔ تم سے پہلی امتوں کے ہلاک ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے انبیاء سے بکثرت سوال کرتے اور آپس میں اختلاف کرتے۔ جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس کو بجالاؤ۔ جب کسی چیز سے منع کروں تو اس کو چھوڑ دو(2)۔ مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ سوال کرنے والے اقرع بن حابس تھے۔ اور آپ نے جواب میں یہ بھی فرمایا تھا کہ حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ اس کے علاوہ مستحب۔ اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔ اور یہ حضرت اسامہ بن زید سے بھی مروی ہے۔ حضرت علی سے روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا گیا تو یہ آیت کریمہ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ”اے ایمان والو! مت پوچھا کرو ایسی باتیں کہ اگر ظاہر کی جائیں تمہارے لیے تو بری لگیں تمہیں“ اتری۔ حضرت سراقہ بن مالک نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا حج تمتع اسی سال ہے یا ہمیشہ کے لیے؟ آپ نے فرمایا نہیں ہمیشہ کے لیے۔ اور ایک روایت میں آپ نے اپنی ازواج مطہرات کو فرمایا کہ تمہارا حج ہو گیا۔ اب تم گھروں سے نہ نکلنا۔ استطاعت کی کئی قسمیں ہیں۔ کبھی تو انسان بذات خود صاحب استطاعت ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات کسی دوسرے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کے تفصیلی احکام فقہ کی کتب میں موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ حاجی کون ہے۔ فرمایا پراگندہ بالوں اور میلے کپڑوں والا۔ ایک اور شخص کھڑا ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ) سب سے افضل حج کونسا ہے؟ فرمایا جس میں کثرت سے جانوروں کا خون بہایا جائے اور اللّٰھم لبیك زیادہ پڑھا جائے۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! سبیل سے کیا مراد ہے؟ فرمایا زادراہ اور سواری(3)۔ اس حدیث کا ایک راوی اگرچہ ضعیف ہے لیکن یہ حدیث دوسری اسناد سے بھی مروی ہے۔ حضرت محمد بن عباد بن جعفر فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس بیٹھا تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا سبیل سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا زادراہ اور

1۔ مسند احمد،4/305 2۔ مسلم، کتاب الحج:975 3۔ ابن ماجہ، کتاب الحج:967

سواری۔ اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، حسن بصری، مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر، ربیع بن انس اور قتادہ سے بھی یہی مروی ہے۔ اس حدیث کو مختلف اسناد سے حضرت انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود اور حضرت عائشہ سے مرفوعاً روایت کیا گیا۔ لیکن ان کی اسناد محل نظر ہیں۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے اس حدیث کے تمام طرق کو جمع کیا ہے۔ حاکم نے اس کو حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے لیکن اس کو انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی تو صحابہ نے عرض کی۔ سبیل سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا زادراہ، اور سواری۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا فرض حج جلدی ادا کر لیا کرو کیونکہ تمہیں معلوم نہیں کہ کیا پیش آ جائے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں جس نے حج کا ارادہ کیا ہے اسے چاہئے کہ جلدی کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ جس کے پاس تین سو درہم ہیں وہ صاحب استطاعت ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں سبیل سے مراد صحت ہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ: حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں جس نے حج کی فرضیت کا انکار کیا۔ اس نے کفر کیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں۔ جب آیت کریمہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران:85) نازل ہوئی تو یہودی کہنے لگے ہم بھی مسلمان ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرمایا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر حج فرض کیا ہے۔ تم بھی حج کرو تو کہنے لگے ہم پر حج فرض نہیں۔ گویا اس طرح انہوں نے حج سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کے پاس زادراہ اور سواری ہو اور وہ حج نہ کرے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ پھر آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ اس کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ابن جریر، ابن ابی حاتم، ترمذی وغیرہ نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ ترمذی کی حدیث کے راوی ہلال مجہول ہیں ان کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث موقوف نہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب فرمایا کرتے جو حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہ کرے اس کے لیے برابر ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی۔ اس کی سند صحیح ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں امیر المومنین حضرت عمر نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا میرا ارادہ ہے میں مختلف شہروں کی طرف اپنے آدمی بھیجوں۔ وہ تحقیق کریں جو لوگ استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتے ان پر جزیہ لگا دیا جائے کیونکہ وہ مسلمان نہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

’’آپ فرمائیے اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ آپ فرمائیے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے جو ایمان لا چکا تم چاہتے ہو کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دو حالانکہ تم خود (اس کی راستی کے) گواہ ہو۔ اور نہیں ہے اللہ بے خبر ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو‘‘۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو زجر و توبیخ فرمائی ہے۔ یہ لوگ جان بوجھ کر حق کی مخالفت اور اللہ کی آیات سے

کفر کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے روکتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یقینی علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات حق ہیں۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیاں اور بشارتیں یہ سب ان کو معلوم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کیسے ان انبیاء نے اس امی ہاشمی، مکی، عربی نبی کا ذکر مبارک کیا۔ یہ وہ نبی ہیں جو اولاد آدم کے سردار، خاتم النبیین، زمین و آسمان کے رب کے فرستادہ رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے اس فعل پر دھمکی دی ہے اور انہیں اس بات سے آگاہ بھی کیا ہے کہ وہ ان کی ان کرتوتوں پر گواہ ہے۔ کیونکہ یہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کی بھی مخالفت کرتے ہیں کہ وہ اسی رسول کی تکذیب اور مخالفت کرتے ہیں جن کی بشارت انہوں نے اپنی کتابوں میں بیان کی۔ اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ وہ ان کے اس عمل سے غافل نہیں ہے۔ جلد ہی انہیں اس کی سزا دے گا۔ جس دن نہ مال فائدہ مند ہوگا نہ اولاد۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

”اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا اہل کتاب سے (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کرنے لگو حالانکہ تم وہ ہو کہ پڑھی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اللہ کا رسول بھی تشریف فرما ہے اور جو مضبوطی سے پکڑتا ہے اللہ (کے دامن) کو تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ تک“۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ وہ اہل کتاب کے بد باطن گروہ کی اطاعت سے بچیں جو مسلمانوں کے ساتھ حسد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تم میں جو اپنا رسول مبعوث فرمایا ہے اسے پسند نہیں کرتے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ (البقرہ:196) ”دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب، کہ کسی طرح پھر بنادیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے جو ان کے دلوں میں ہے“۔ اور یہاں ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ”اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا“

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ: اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم کفر کرنے لگو۔ حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں۔ اور تم میں اللہ تعالیٰ کے رسول تشریف فرما ہیں۔ یعنی کفر تم سے بہت بعید ہے۔ دن رات اللہ تعالیٰ کے رسول پر آیات نازل ہوتی ہیں اور وہ تمہیں پڑھ کر سناتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (الحدید:8) ”آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اللہ پر ایمان لاتے کیوں نہیں حالانکہ (اس کا) رسول دعوت دے رہا ہے تمہیں کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ بھی لے چکا ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو“۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے فرمایا۔ تمہارے نزدیک سب سے بڑا ایمان والا کون ہے؟ انہوں نے عرض کی فرشتے۔ آپ نے فرمایا بھلا وہ کیسے ایمان نہ لاتے حالانکہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی پھر ہم۔ فرمایا بھلا تم کیسے ایمان نہ لاتے حالانکہ میں خود تمہارے درمیان موجود ہوں۔ صحابہ کرام نے عرض کی آپ خود ہی ارشاد فرمائیے۔ فرمایا تمام لوگوں میں زیادہ عجیب ایمان والے وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں

گے۔ وہ کتابوں میں لکھا پائیں گے اور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ میں نے شرح بخاری کی ابتداء میں اس حدیث کی اسناد کی تفصیل بیان کی ہے۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ: اور جو اللہ تعالیٰ کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے تو اسے ضرور سیدھی راہ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ کرنا اور اسی کے دامن کو مضبوطی سے تھامنا یہی صراط مستقیم تک جانے کا ذریعہ اور گمراہی سے دور ہونے کا سبب ہے۔ یہی رشد و ہدایت اور صحیح راستے اور منزل مراد تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا اور (خبردار) نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے احسان سے بھائی بھائی اور تم (کھڑے) تھے دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تو اس نے بچا لیا تمہیں اس (میں گرنے) سے یونہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتیں تاکہ تم ہدایت پر ثابت رہو''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: یہاں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے نہ کہ نافرمانی۔ اس کا ذکر کیا جائے نہ کہ اس کے ذکر کو فراموش کیا جائے، اس کا شکر کیا جائے نہ کہ ناشکری۔ اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن مردویہ اور حاکم نے بھی عبداللہ بن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ لیکن اس کا موقوف ہونا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے اس وقت تک حقیقی طور پر نہیں ڈرتا جب تک کہ اپنی زبان کو تالہ نہ لگائے۔ سعید بن جبیر، ابو العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن: 16) ''پس ڈرتے رہو اللہ سے جتنی تمہاری استطاعت ہے'' سے منسوخ ہے۔ ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' کا معنی یہ ہے کہ اس کی راہ میں جہاد کیا جائے جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اور اس کے حکم کے سامنے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کی جائے۔ اور عدل و انصاف سے کام لیا جائے۔ اگرچہ اپنی ذات، ماں باپ اور اولاد زد میں آجائیں۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: اپنی صحت اور تندرستی کی حالت میں اپنے ایمان کا خیال رکھو تاکہ اسی حالت میں تمہاری موت واقع ہو۔ کیونکہ اس کریم پروردگار کی یہ عادت ہے کہ جس حالت پر کوئی زندہ رہے اسی پر اس کی موت واقع ہو۔ اور قیامت میں اسے اسی حالت میں اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے برعکس حالت سے ہمیں اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس وہاں تشریف فرما تھے۔ آپ کے

ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا اگر ”زقوم“ کا ایک قطرہ اس دنیا میں گرا دیا جائے تو اہل دنیا کا جینا دوبھر ہو جائے۔ تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کی خوراک زقوم کے علاوہ اور کوئی نہیں (1)۔ اس کو ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرط کے مطابق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے نار جہنم سے دور کر دیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے اسے چاہئے کہ اس کی موت اس حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اور لوگوں سے ایسا سلوک کرتا ہو جیسا وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا جائے (2)۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آپ کے وصال سے تین روز پہلے یہ فرماتے ہوئے سنا۔ ”تم میں سے ہر ایک کو اس حال میں موت آنی چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے حسن ظن رکھتا ہو (3)۔ اس کو امام مسلم نے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں اپنے بندہ کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہوں جس کا وہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ اگر وہ میرے متعلق حسن ظن رکھے تو میں بھی اس کے ساتھ نیک معاملہ کرتا ہوں۔ اور اگر وہ میرے بارے بدگمانی کرے تو اس کو اپنے گمان کے مطابق بدلہ مل جائے گا“ (4)۔ یہ حدیث صحیحین میں ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں ”ایک انصاری صحابی بیمار تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے بازار میں ہی ان سے ملاقات ہوگئی۔ سلام کے بعد آپ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہے۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ! خیریت سے ہوں۔ امیدوار رحمت پروردگار ہوں اور اپنے گناہوں پر نادم و شرمسار ہوں۔ آپ نے فرمایا اس حالت میں جس بندے کے دل میں یہ دونوں جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرما دیتا ہے جس کی وہ امید کرتا ہے اور

اس وقت انصار دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّتَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ ۟ اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ ابۡيَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِيۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۱۰۹﴾

”ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔ اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے

گا۔ پھر اگر تم دعا کرو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی(1)۔ اس کو ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس مضمون کی اور بھی احادیث ہیں۔ جن کو دوسرے مقامات پر ذکر کیا جائے گا۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا: اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد بھی کہ ان کے پاس روشن نشانیاں آ چکی تھیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس بات سے منع کیا ہے کہ تم سابقہ امتوں کی طرح آپس میں اختلاف وافتراق کا شکار نہ ہو جانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرنا۔ حضرت ابو عامر عبداللہ بن یحییٰ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت امیر معاویہ کے ساتھ حج کرنے کے لیے آئے۔ آپ ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا اہل کتاب اپنے دین میں اختلاف پیدا کر کے بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور اس امت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ اور ایک کے سوا تمام جہنمی ہوں گے۔ اور فرقہ ناجیہ اہل سنت و جماعت ہے۔ اور میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے۔ جن کی رگ رگ میں اسی طرح خواہشات نفسانی رچ بس جائیں گی جس طرح کتا کسی کو کاٹ دے اس کا اثر ہر رگ وریشہ میں پھیل جاتا ہے۔ اے اہل عرب! اگر تم نے اپنے نبی کی لائی ہوئی شریعت پر عمل نہ کیا تو دوسرے لوگ تو شریعت سے بہت دور ہو جائیں گے(2)۔ اسے ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ: یعنی قیامت کے دن اہل سنت و جماعت کے چہرے روشن ہوں گے۔ اور اہل بدعت اور تفرقہ بازوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ تو وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے انہیں کہا جائے گا کہ تم نے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اس سے مراد منافقین ہیں۔ پس اب تم عذاب کی اذیتیں چکھو بہ سبب اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے۔ اس عذاب میں منافقوں کے ساتھ دوسرے تمام کافر بھی شامل ہیں۔ اور وہ خوش نصیب جن کے چہرے روشن ہوں گے وہ رحمت الٰہی کے سایہ میں ہوں گے۔ اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ ابو غالب فرماتے ہیں کہ ابوامامہ نے خارجیوں کے سر دمشق کی جامع مسجد کے زینوں پر لٹکے ہوئے دیکھے تو فرمایا یہ جہنم کے کتے ہیں۔ اور روئے زمین پر بدترین مقتول ہیں۔ اور ان کے قتل کرنے والے بہترین مجاہد ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ میں نے ابوامامہ سے دریافت کیا، کیا آپ نے یہ حدیث خود رسول ﷺ سے سنی ہے؟ انہوں نے فرمایا ایک یا دو دفعہ نہیں بلکہ سات مرتبہ میں نے اس کو سنا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی بیان نہ کرتا(3)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت ابن مردویہ نے حضرت ابوذر غفاری سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ لیکن وہ حدیث انتہائی عجیب اور سند کے اعتبار سے غریب ہے۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ: یہ اللہ تعالیٰ کی آیات دبینات ہیں جن کو ہم پڑھ کر آپ کو سناتے ہیں۔ یعنی ہم دنیا وآخرت کے امور سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ: اور اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ یعنی وہ ظالم نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا عادل حاکم ہے۔ جو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ اس لیے وہ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ارشاد فرماتا ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔ یعنی کائنات کی ہر چیز اس کی ملکیت اور غلامی میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سارے کام لوٹائے جائیں گے۔ دنیا وآخرت میں وہی حاکم مطلق ہے۔

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب الفتن 9: 17 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ 4: 198 3۔ سنن ابن ماجہ، المقدمہ: 62

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ لَـكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ ؕ مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنۡ يَّضُرُّوۡكُمۡ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَاِنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ يُوَلُّوۡكُمُ الۡاَدۡبَارَ ثُمَّ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

''ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لیے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو یہ بہتر ہوتا ان کے لیے بعض ان میں سے مومن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں۔ (کچھ) نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا سوائے ستانے کے اور اگر لڑیں گے تمہارے ساتھ تو پھیر دیں گے تمہاری طرف اپنی پیٹھیں (اور بھاگ جائیں گے) پھر ان کی امداد نہ کی جائے گی۔ مسلط کر دی گئی ہے ان پر ذلت (اور رسوائی) جہاں کہیں یہ پائے گئے بجز اس کے کہ اللہ کے عہد سے یا لوگوں کے عہد سے (کہیں پناہ مل جائے) اور یہ مستحق ہو گئے ہیں غضب الٰہی کے اور مسلط کر دی گئی ہے ان پر محتاجی یہ اس لیے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے اور قتل کیا کرتے تھے انبیاء کو ناحق یہ (بے باکی) اس لیے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور سرکشی کیا کرتے تھے''۔

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تمام امتوں میں سے بہترین امت ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ تم دوسرے لوگوں کے حق میں سب سے بہتر ہو کہ تم لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اسلام کی طرف لائے ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس، مجاہد، عطیہ عوفی، عکرمہ، عطاء، اور ربیع بن انس بھی یہی فرماتے ہیں۔ یہ تمام امتوں میں بہترین امت ہے۔ اور دوسرے لوگوں کے لیے زیادہ نفع مند ہے۔ اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔ رسول اللہ ﷺ ایک دن منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! لوگوں میں سب سے بہتر شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو تم میں زیادہ قرآن پاک کی تلاوت کرنے والا، اللہ سے ڈرنے والا، نیکی کا حکم دینے والا، برائی سے روکنے والا اور صلہ رحمی کرنے والا ہو(1)۔ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں: یہاں خیر امت سے مراد وہ صحابہ کرام ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ سے ہجرت کی۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ تمام امت کو شامل ہے۔ بہر حال امت میں بہترین لوگ وہ ہیں جن میں رسول کو مبعوث کیا گیا۔ پھر اس کے بعد والے لوگ، پھر اس کے بعد والے لوگ۔ ایک دوسری آیت میں واضح طور پر فرما دیا: وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ:143) ''اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر''۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم نے امتوں کی تعداد، ستر کو مکمل کر دیا ہے اور تم خدا کے نزدیک سب سے بہترین اور معزز ترین امت ہو(2)۔ اس کو ترمذی

1۔ مسند امام احمد 432/6 2۔ مسند امام احمد 272/1:

نے بھی روایت کیا ہے۔اس امت کو یہ مقام ومرتبہ اور اعزاز واکرام ان کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی نسبت سے نصیب ہوا ہے۔کیونکہ آپ علی الاطلاق تمام مخلوق سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام رسولوں سے زیادہ معزز ومحترم ہیں۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی عظیم اور کامل شریعت کے ساتھ مبعوث فرمایا جو پہلے کسی رسول کو عطا ہوئی نہ کسی نبی کو۔اس شریعت کے مطابق قلیل عمل بھی دوسری شریعتوں کے مقابلہ میں بہتر اور افضل ہے۔حضرت علی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا مجھے کچھ ایسی نعمتیں دی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں۔انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! یہ کیا ہیں؟ فرمایا رعب ودبدبہ کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں۔میرا نام احمد رکھا گیا۔میرے لیے مٹی کو پاک کردیا گیا۔اور میری امت کو سب سے بہترین امت بنایا گیا(1)۔اس حدیث کی سند حسن ہے۔حضرت ابودرداء فرماتے ہیں کہ میں نے ابوالقاسم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا۔اے عیسیٰ! میں تمہارے بعد ایک ایسے نبی کو بھیجنے والا ہوں جو خوشی وراحت کے موقع پر میری حمد وثناء کرے گا۔اور مصیبت پر صبر کرے گا حالانکہ انہیں حلم اور علم نہ ہوگا۔آپ نے تعجب سے پوچھا کہ بغیر حلم اور علم کے یہ کیسے ممکن ہوگا۔تو اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا کہ میں انہیں اپنا علم اور حلم عطا کردوں گا۔یہاں کچھ دوسری احادیث بھی وارد ہوئی ہیں۔جن کو یہاں ذکر کرنا ہی مناسب ہے۔حضرت ابوبکر صدیق روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ مجھے یہ فضیلت عطا کی گئی کہ میری امت کے ستر ہزار آدمی بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتے ہوں گے۔اور وہ سب ایک دل ہوں گے۔میں نے رب تعالیٰ سے عرض کی اے باری تعالیٰ اور عطا فرما۔تو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار کا اضافہ کردیا۔یہ حدیث بیان کر کے جناب سیدنا ابوبکر نے فرمایا اس تعداد میں گاؤں اور شہر والے ہی شامل نہیں بلکہ بادیہ نشین بھی شامل ہیں(2)۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ارشادفرمایا، اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ خوشخبری دی ہے کہ میرے ستر ہزار امتی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوجائیں گے۔حضرت عمر نے عرض کی یارسول اللہ! آپ نے اس میں مزید کا مطالبہ کیوں نے کیا۔آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کی بارگاہ میں مزید کے لیے عرض کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار کا وعدہ فرمایا۔حضرت عمر نے دو بار یہی گزارش کی تو رسول اللہ ﷺ نے یہی جواب دیا۔پھر تیسری بار آپ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا عطا فرمایا ہے اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔راوی حدیث فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے۔جو کسی حساب وشمار میں نہیں ہے۔شریح بن عبادہ فرماتے ہیں حضرت ثوبان حمص میں بیمار ہو گئے،حمص کے والی عبداللہ بن قرط ازدی ان کی عیادت کو نہ آسکے۔ایک کلاعی شخص آپ کی عیادت کے لیے آیا۔آپ نے فرمایا کیا تم لکھنا جانتے ہو۔اس نے کہا ہاں۔فرمایا ایک خط لکھو۔رسول ﷺ کے خادم ثوبان کی طرف سے والی حمص عبداللہ بن قرط کی طرف۔اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوئی خادم بیمار ہوتا تو تم اس کی عیادت کے لیے ضرور جاتے۔پھر فرمایا اس خط کو ضرور بند کرو اور اس کو والی حمص کے پاس پہنچادو۔وہ شخص گیا اور عبداللہ بن قرط کو پہنچا دیا۔جب اس نے یہ خط پڑھا تو گھبرا کر کھڑے ہوئے۔لوگوں نے سوچا کہ کوئی مشکل پیش آ گئی ہے تو اسی وقت حضرت ثوبان کی عیادت کے لیے ان کے پاس آئے اور کچھ دیر آپ کے پاس ٹھہرے جب جانے لگے تو حضرت ثوبان نے ان کی چادر پکڑ کر روک لیا اور فرمایا کہ یہاں بیٹھو میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنی۔آپ نے فرمایا کہ میرے ستر ہزار امتی بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار مزید۔اس حدیث کے تمام راوی ثقہ اور شامی ہیں(3)۔اس حدیث کو

1۔مسند امام احمد،1/98 2۔مسند امام احمد،1/6 3۔المعجم الکبیر،2/92

طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں ایک رات ہم دیر تک نبی پاک کی خدمت میں حاضر رہے۔جب صبح حاضر ہوئے تو فرمایا آج رات تمام انبیاء اپنی امتوں کے ساتھ مجھے دکھائے گئے۔کسی نبی کے ساتھ صرف تین شخص تھے۔بعض کے ساتھ ایک مختصر گروہ بعض کے ساتھ ایک جماعت اور بعض کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔حتیٰ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام گزرے تو ان کے ساتھ بنی اسرائیل کا ایک بہت بڑا گروہ تھا۔مجھے وہ گروہ بہت پسند آیا میں نے پوچھا یہ کون ہے۔بتایا گیا کہ یہ تمہارے بھائی موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل ہیں۔میں نے پوچھا میری امت کہاں ہے؟ جواب ملا اپنے دائیں طرف دیکھئے۔میں نے ادھر دیکھا وہاں بہت بڑا مجمع تھا۔جنہوں نے اپنی کثرت سے پہاڑوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔مجھ سے پوچھا گیا کیا تم اب راضی ہو میں نے عرض کی اے پروردگار! میں راضی ہوں۔فرمایا ان کے ساتھ ستر ہزار اور ہیں جو حساب و کتاب کے بغیر داخل ہوں گے۔پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا (آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔) اگر ہو سکے تو تو ان ستر ہزار میں ہونا۔اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر ان لوگوں میں سے ہو جانا جو پہاڑوں پر ہیں۔اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ان لوگوں میں سے ہو جانا جو آسمان کے کنارے پر تھے۔حضرت عکاشہ نے عرض کی یا رسول اللہ! دعا کیجئے مجھے اللہ تعالیٰ ان ستر ہزار میں سے کر دے۔ایک دوسرے صحابی کھڑے ہوئے تو انہوں نے بھی یہی گزارش کی۔فرمایا عکاشہ تم سے سبقت لے گئے۔پھر ہم آپس میں گفتگو کرنے لگے۔شاید یہ ستر ہزار لوگ وہ ہیں جو مسلمان پیدا ہوئے اور پھر عمر بھر کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرایا اور اسی پر ان کی اجل آئی۔جب نبی کریم ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا یہ لوگ وہ ہیں جو جھاڑ پھونک نہیں کراتے(1)۔آگ کے داغ نہیں لگواتے۔شگون نہیں لیتے بلکہ اپنے رب پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں۔(2) ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں۔جب میں نے عرض کی میں راضی ہوں تو ارشاد ہوا تو اپنے بائیں طرف دیکھو۔میں نے دیکھا تو وہاں بھی ایک بہت بڑا مجمع تھا۔تا حد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عکاشہ کے بعد کھڑے ہونے والے صحابی انصاری تھے۔حضرت سہل بن سعد فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت کے ستر ہزار یا سات لاکھ آدمی جنت میں ایک ساتھ داخل ہوں گے۔ان کے چہرے ماہ تاباں کی طرح چمک رہے ہوں گے۔حصین بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں۔میں سعید بن جبیر کے پاس تھا۔انہوں نے فرمایا آج رات ایک ستارہ ٹوٹا تھا۔تم میں سے کس نے دیکھا ہے۔میں نے کہا یہ ستارہ میں نے دیکھا ہے لیکن میں نماز تہجد میں مصروف نہیں تھا۔بلکہ مجھے بچھو نے ڈس لیا تھا۔اس کی وجہ سے میں جاگ رہا تھا۔انہوں نے پوچھا پھر تم نے کیا۔میں نے عرض کی میں نے اس پر دم کرایا تھا۔پوچھا کیوں؟ عرض کی حضرت شعبی سے ایک حدیث سنی تھی کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا آج رات مجھے تمام امتیں دکھائی گئیں۔میں نے دیکھا کسی نبی کے ساتھ ایک مختصر سی جماعت ہے، کسی کے ساتھ ایک شخص، کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ کوئی بھی نہیں۔پھر اچانک میری نظر ایک بہت بڑی جماعت پر پڑی۔میں نے خیال کیا کہ شاید یہ میری امت ہے۔مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم ہے۔آپ افق کی طرف دیکھئے میں نے دیکھا وہاں ایک بہت بڑی جماعت تھی۔پھر کہا گیا کہ دوسری طرف دیکھئے دیکھا تو وہاں بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی۔مجھے بتایا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے۔اور ان کے ساتھ ستر ہزار اور بھی ہیں جو بغیر حساب و کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔حضور ﷺ یہ بیان فرما کر کاشانہ نبوت میں تشریف لے گئے۔صحابہ کرام آپس میں گفتگو کرنے لگے۔شاید یہ وہ لوگ ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی۔کسی نے کہا شاید یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمان پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا۔اس طرح مختلف باتیں ہوتیں رہیں حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے۔دریافت فرمایا تم کس چیز کے بارے میں بحث کر رہے ہو۔صحابہ

1۔اس سے مراد غیر شرعی جھاڑ پھونک ہے 2۔مسند امام احمد،1/401

کے عرض کرنے پر فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو تعویذ کرتے ہیں نہ کراتے ہیں۔ اور نہ زخموں کو آگ کے ساتھ داغتے ہیں اور نہ ہی شگون لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ حضرت عکاشہ کھڑے ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! میرے لیے دعا کیجئے، اللہ تعالیٰ مجھے ان میں سے کردے۔ آپ نے فرمایا تم انہی میں سے ہو پھر ایک اور شخص کھڑا ہوا اور یہی گزارش کی۔ آپ نے فرمایا عکاشہ تم سے سبقت لے گئے (1)۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ایک طویل حدیث میں ہے۔ پہلا گروہ نجات پا جائے گا۔ کیونکہ ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے۔ حضرت ابو امامہ باہلی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ کہ میرے ستر ہزار امتی بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی تین لپوں کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ ستر ہزار کا سن کر حضرت یزید بن اخنس نے عرض کی یارسول اللہ یہ تعداد آپ کی امت کے مقابلے میں انتہائی قلیل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار کا وعدہ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تین لپ بھر کر عطا فرمائے۔ ایک اور روایت میں ارشاد فرمایا میرے رب عزوجل نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے ستر ہزار امتیوں کو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل کرے گا۔ پھر ان میں سے ہر ایک ستر ہزار کی شفاعت کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے دونوں ہاتھوں کی لپ تین دفعہ بھر کر جنت میں ڈالے گا۔ یہ سن کر حضرت عمر نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور فرمایا۔ پہلے ستر ہزار اپنے آباؤ اجداد اور اولاد کے لیے شفاعت کریں گے اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی آخری لپ میں جنت میں ڈالے گا۔ حافظ الضیاء مقدسی فرماتے ہیں مجھے اس حدیث کی سند کی کوئی علت معلوم نہیں۔ حضرت رفاعہ جہنی فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے قدید کے مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ میرے ستر ہزار امتی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ تم ان کے داخل ہونے سے پہلے اپنے اہل وعیال سمیت جنت میں اپنے ٹھکانے بنا چکے ہو گے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری امت کے چار لاکھ آدمی جنت میں داخل ہوں گے۔ حضرت ابو بکر نے عرض کی یارسول اللہ! میرے لیے کچھ مزید طلب فرمائیے یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا اے ابو بکر بس کرو۔ ابو بکر نے جواب دیا اگر ہم سب جنت میں داخل ہو جائیں تو آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے ایک ہاتھ سے اپنی تمام مخلوق کو جنت میں داخل کردے۔ اس حدیث کو حافظ عبدالرزاق اور حافظ ابونعیم اصفہانی نے روایت کیا ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ تعداد ایک لاکھ بیان کی گئی ہے۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت کے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کی ہمارے لیے مزید طلب فرمائیں۔ آپ نے فرمایا ان میں سے ہر ایک آدمی کے ساتھ ستر ہزار داخل ہوں گے۔ صحابہ نے پھر عرض اور طلب فرمائیں۔ آپ ریت کے ٹیلے پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ریت سے بھرا اور فرمایا اس طرح اللہ تعالیٰ میری امت کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا گر اس کے بعد بھی کوئی جہنم میں داخل ہوگا تو وہ بدقسمت ہے۔ اس حدیث کی سند عمدہ ہے۔ عبدالقاہر سری سبکی کے علاوہ باقی تمام راوی ثقہ ہیں۔ یحییٰ بن معین سے ان کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا کہ وہ صالح ہے۔ یہ ایک دوسری سند سے مروی ہے۔ جس میں تین لاکھ تعداد بیان کی گئی ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ میری امت کے سب مہاجر تو اس میں آجائیں گے۔ باقی تعداد اعرابیوں سے پوری کردے گا۔ حضرت ابو سعید فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے

1۔ مسلم، کتاب الایمان 199، 200

یہ حساب کیا گیا کہ کل تعداد چار کروڑ نوے لاکھ ہوئی۔ حضرت ابو مالک روایت کرتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ تم قیامت کے دن سیاہ رات کی طرح جنت کی طرف بڑھو گے حتیٰ کے زمین تم سے پر ہو جائے گی، فرشتے کہیں گے کہ (حضرت) محمد ﷺ کے ساتھ جو امت آئی ہے وہ تعداد میں تمام انبیاء کی امتوں سے زیادہ ہے۔ حضرت ابو زبیر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے امید ہے قیامت کے دن میری اتباع کرنے والی امت جنت کا چوتھائی حصہ ہوگی۔ ہم نے پھر نعرہ تکبیر بلند کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ مجھے امید ہے کہ میری امت جنت کے نصف حصے میں ہوگی (1)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ارشاد فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم جنتیوں کا تیسرا حصہ ہو۔ ہم نے پھر نعرہ تکبیر بلند کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ تم جنتیوں کا نصف ہو گے۔ اور دوسری روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب کہ چوتھائی جنت تمہارے لیے ہوگی۔ تین حصوں میں باقی لوگ ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اس وقت کیا عالم ہوگا جب جنت کا تیسرا حصہ تم ہو گے۔ صحابہ نے عرض کی پھر تو بہت زیادہ ہے۔ آپ نے فرمایا اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب نصف جنت تمہاری ہوگی۔ صحابہ کرام نے عرض کی یہ تو بہت زیادہ ہے۔ آپ نے فرمایا جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی۔ جن میں اسی صفیں تمہاری ہوں گی (2)۔ اسی حدیث کو امام احمد بن حنبل، ترمذی، ابن ماجہ نے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں جب آیت کریمہ: ثُلَّةٌ مِّنَ الۡأَوَّلِينَ ۝ وَثُلَّةٌ مِّنَ الۡأٰخِرِينَ (الواقعہ:40) ''ایک بڑی جماعت اگلوں کی اور ایک بڑی جماعت پچھلوں سے ہوگی''۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم جنتیوں کا چوتھائی حصہ ہو۔ تم جنتیوں کا تہائی حصہ، تم جنتیوں کا نصف حصہ، تم جنتیوں کا دو تہائی حصہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم دنیا میں سب سے آخر میں ہیں جب کہ قیامت کے دن جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے۔ مگر اہل کتاب کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہمیں ان کے بعد۔ جن امور میں انہوں نے اختلاف کیا اللہ تعالیٰ نے ہماری ان میں راہنمائی فرمائی۔ جمعہ کے دن میں بھی انہوں نے اختلاف کیا۔ یہ دن ہمارے لیے ہے۔ کل (ہفتہ) یہود کے لیے ہوگا، پرسوں (اتوار) نصاریٰ کے لیے ہوگا۔ اس کو بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تک میں جنت میں داخل نہ ہو جاؤں گا دوسرے انبیاء کا داخلہ حرام ہے۔ اور جب تک میری امت جنت میں داخل نہ ہو جائے گی دوسری امتوں کے لیے جنت میں داخل ہونا حرام ہے۔ اس حدیث کو دارقطنی اور کئی دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ یہ تمام احادیث اس آیت کریمہ کی تفسیر بیان کرتی ہیں کہ امت محمدیہ کا جو شخص ان صفات سے متصف ہوگا وہ اسی زمرہ میں داخل ہو جائے گا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ نے جب لوگوں کو سہل پسندی میں دیکھا تو آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا جو شخص اس خیر امت میں داخل ہونا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے آپ میں ایسی صفات بھی پیدا کرے۔ جو شخص اپنے آپ کو ان صفات سے متصف نہیں کرتا وہ اہل کتاب کے مشابہ ہو جاتا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: كَانُوا لَا يَتَنَاهَوۡنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ (مائدہ:79) ''ترجمہ: نہیں منع کیا کرتے تھے ایک دوسرے کو برائی سے جو وہ کرتے تھے''۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی توصیف فرمانے کے بعد آئندہ آیات میں اہل کتاب کی مذمت بیان کی ہے۔

1۔ مسند احمد: 383/3 2۔ المعجم الکبیر: 209,208/10

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ: اگر اہل کتاب رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ تعلیمات پر ایمان لے آتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ بعض ان میں مومن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان۔ یعنی ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کے رسول ﷺ پر نازل کردہ تعلیمات اور اپنے انبیاء کے احکامات پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر گمراہی، فسق و فجور اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو خوشخبری دی ہے کہ تمہیں اہل کتاب پر فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ ارشاد فرمایا یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے سوائے تمہیں ستانے کے اگر تمہارے ساتھ لڑیں گے تو یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے اور ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔ غزوہ خیبر کے موقع پر اللہ کی دی ہوئی خوشخبری پوری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دن قوم یہود کو ذلیل و رسوا کیا۔ اسی طرح مدینہ کے یہودی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کو ذلت و رسوائی سے دوچار کیا۔ اسی طرح صحابہ کرام نے شام میں بسنے والے نصاریٰ کے کروفر کو خاک میں ملا کر ملک شام کو ان کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ ملک شام میں مسلمانوں کا ایک گروہ اسلام پر قائم رہے گا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے۔ تو وہ بھی دین اسلام اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا التسلیم کے مطابق حکم کریں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ کو ختم کریں گے اور اسلام کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کریں گے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ: وہ جہاں بھی ہوں گے ذلت اور رسوائی ان پر مسلط ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت و رسوائی کو لازم کر دیا ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ ذلت و رسوائی ان کا مقدر رہے گی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی پناہ کے ساتھ یعنی جب وہ مسلمان حکمران کی اطاعت قبول کر لیں، جزیہ ادا کریں اور ریاستی قوانین کو اپنے اوپر لاگو کر لیں۔ اور لوگوں کی پناہ میں۔ یعنی مسلمانوں میں سے کوئی انہیں پناہ دے دے۔ اگرچہ وہ پناہ دینے والی عورت ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایک قول کے مطابق مسلمان غلام کی پناہ بھی قابل قبول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہاں ''حبل'' سے مراد عہد ہے۔ مجاہد عکرمہ، عطاء وغیرہم سے بھی یہی مروی ہے۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے اور محتاجی اور فقیری ان پر مسلط کر دی گئی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔ اور ناحق انبیاء کرام کو قتل کرتے تھے۔ انہوں نے ان شنیع افعال کا ارتکاب اپنے تکبر، سرکشی اور حسد کی وجہ سے کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت و رسوائی اور محتاجی و فقیری مسلط کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ آخرت میں جو عذاب ملے گا وہ علیحدہ ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: اور یہ بے باکی اس لیے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور سرکشی کیا کرتے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار، اس کے رسل کا قتل۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ احکام الٰہی کی نافرمانی کیا کرتے تھے۔ اور شریعت الٰہی میں حد سے تجاوز کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل ایک دن میں تین تین سو انبیاء کو قتل کر ڈالتے تھے۔ اور دن کے آخری حصہ میں اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ

اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَیۡـًٔا ؕ وَ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا كَمَثَلِ رِیۡحٍ فِیۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾

''سب یکساں نہیں اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدے کرتے ہیں۔ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے اور جلدی کرتے ہیں نیکیوں میں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ اور جو یہ کریں گے نیک کاموں سے تو ہرگز انکار نہ کیا جائے گا اس کار خیر کا۔ اور اللہ جاننے والا ہے پرہیزگاروں کو۔ بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ بھر اور وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہو اس میں سخت ٹھنڈک ہو (اور) لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہو اپنے نفسوں پر پھر فنا کر دے اس کھیت کو۔ نہیں ظلم کیا ان پر اللہ تعالیٰ نے لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں''۔

لَیۡسُوۡا سَوَآءً ؕ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اور امت محمد یہ برابر نہیں۔ اس قول کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس کو حضرت عبداللہ بن مسعود نے ہی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ نے عشاء کی نماز کو بہت مؤخر کر دیا۔ جب آپ گھر سے باہر تشریف لائے۔ میں نے دیکھا کہ صحابہ کرام نماز کے منتظر ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے علاوہ اہل ادیان میں سے کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ لیکن اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی جو مشرف باسلام ہوئے۔ ان میں عبداللہ بن سلام، اسد بن عبید اور ثعلبہ بن شعبہ وغیرھم شامل ہیں۔ معنی یہ ہو گا کہ وہ اہل کتاب جن کی سابقہ آیات میں مذمت بیان ہوئی ہے اور وہ جو اسلام کی دولت سے سرفراز ہوئے برابر نہیں۔ یعنی وہ تمام کے تمام برابر نہیں ان میں سے بعض مجرم ہیں بعض مومن۔ اس لیے ارشاد فرمایا اہل کتاب کا ایک گروہ حق پر قائم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی شریعت کی پابندی کرتے ہیں اور اس کے نبی ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔ رات کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ نماز تہجد ادا کرتے ہیں اور اس میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ اور یہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ انہی کا ذکر اس سورت کے آخر میں بھی ہے۔ اسی لیے یہاں ارشاد فرمایا وہ نیکی کے جو کام کیا کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضائع نہیں ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی بہترین جزاء دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو جاننے والا ہے۔ کسی کا عمل اس پر مخفی نہیں اور کسی کی نیکی کا اجر اس کے پاس ضائع نہیں ہو گا۔ اس کے بعد کفار و مشرکین کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ یعنی جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے مال اور اولاد انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے اور وہی دوزخی ہیں وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کافروں کی اس دنیا میں مال خرچ کرنے کی مثال بیان کی

1۔ مسند احمد: 936/1

ہے۔ارشاد فرمایا اس دنیاوی زندگی میں جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہوا ہو، اس میں سخت ٹھنڈ ہو اور وہ ہوا اس قوم کے کھیت کو لگے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور وہ اس کھیت کو فنا کردے۔ "صِرٌّ" کا معنی سخت سردی ہے۔ بعض نے کہا ہے سخت سردی اور برف باری۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد آگ ہے۔ بہر حال ان کا معنی قریب قریب ہے۔ کیونکہ جس طرح سخت سردی اور برف باری کھیت کو جلا دیتی ہے۔ اسی طرح آگ بھی جلا دیتی ہے۔ "فَاَهۡلَكَتۡهُ" کا معنی یہ ہے کہ وہ اس کھیت کو جلا دے۔ یعنی جب وہ کھیتی پک کر بالکل تیار ہو اور اس کے مالک کو اس کی بڑی ضرورت ہو۔ اس وقت وہ ہوا اس کو جلا دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کافروں کے اس دنیا میں کیے ہوئے اعمال کو ضائع کر دے گا۔ جس طرح کہ اس کھیتی کو اس کے مالک کے گناہوں کی وجہ سے تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ پھر ارشاد فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ یہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۖۚ وَمَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۞﴿۱۱۸﴾ هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَاۤءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَلَا يُحِبُّوۡنَكُمۡ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۞﴿۱۱۹﴾ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ۞﴿۱۲۰﴾ ع

"اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمہیں ضرر دے ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لیے اپنی آیتیں اگر تم سمجھ دار ہو۔ سنو! تم تو وہ (پاک دل) ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور وہ (ذرا) محبت نہیں کرتے تم سے اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے (اے حبیب!) آپ فرمائیے مر جاؤ اپنے غصہ (کی آگ میں جل کر) یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا۔ (ان کا حال تو یہ ہے کہ) اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا فریب کچھ بھی بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کیے ہوئے ہے"۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً: اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو منافقین اور مشرکین سے گہری دوستی لگانے اور انہیں اپنا راز دار بنانے سے منع کرتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو اپنے پوشیدہ راز اور اپنے دشمنوں کے خلاف جنگی چالوں سے منافقین کو آگاہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ لوگ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور اپنی پوری کوشش صرف کرتے ہیں اور ہر قسم کے دھوکہ، فریب کو کام میں لا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس فعل کو پسند کرتے ہیں جو مسلمانوں کے لیے تکلیف اور رنج کا باعث ہو۔

"بِطَانَۃً" کسی انسان کے دوست اور راز دار کو کہتے ہیں۔ "مِّنْ دُوْنِكُمْ" سے مراد مسلمانوں کے علاوہ باقی دوسرے لوگ ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب بھی اللہ تعالیٰ کسی نبی کو مبعوث فرماتا ہے یا کسی کو خلیفہ مقرر کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے دو راز دار بھی ہوتے ہیں۔ ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے۔ اور اسے نیکی کی ترغیب دیتا ہے۔ دوسرا اسے برائی کا حکم دیتا ہے اور اس پر اسے برانگیختہ کرتا ہے۔ اور معصوم وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ بچالے (1)۔ اس حدیث کی اس کے علاوہ اور بھی مختلف اسناد ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمر سے عرض کی گئی یہاں حیرہ کا ایک پڑھا لکھا شخص ہے۔ جو اچھی قوت حافظہ کا مالک ہے۔ اسے آپ اپنا کاتب مقرر کرلیں۔ آپ نے فرمایا اگر میں نے ایسا کیا تو اس طرح میں مسلمانوں کو چھوڑ کر ایک غیر کو اپنا بطانہ (راز دار) بناؤں گا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اس آیت کریمہ اور حضرت عمر کے اس قول سے ثابت ہوتا ہے۔ اہل ذمہ کو ایسے مناصب پر مقرر نہ کیا جائے جن کے ذریعہ وہ مسلمانوں کے بھیدوں سے آگاہ ہو کر انہیں ان کے دشمنوں تک پہنچادیں۔ ازہر بن راشد فرماتے ہیں لوگ احادیث سننے کے لیے حضرت انس کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اگر کسی حدیث کا معنی و مفہوم انہیں سمجھ میں نہ آتا تو وہ حضرت حسن بصری سے پوچھ لیتے تو آپ ان کی وضاحت فرمادیتے۔ ایک دن حضرت انس نے ایک حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو۔ اور اپنی انگوٹھیوں میں عربی نقش نہ کرو۔ وہ یہ حدیث سن کر حضرت حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا دوسرے جملہ کا مطلب تو یہ ہے کہ اپنی انگوٹھیوں پر محمد نہ لکھواؤ اور پہلے جملہ کا معنی یہ ہے کہ اپنے امور میں مشرکین سے مشورہ نہ لو۔ پھر آپ نے فرمایا اس حدیث کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ اس حدیث کو حافظ ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو نسائی اور امام احمد بن حنبل نے بھی روایت کیا ہے۔ لیکن آپ نے اس حدیث کی جو تشریح بیان کی وہ محل نظر ہے۔ کیونکہ انگوٹھیوں میں عربی نقش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انگوٹھی پر عربی عبارت نہ لکھو تاکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی کے مشابہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ آپ کی انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" لکھا ہوا تھا۔ اور حدیث پاک میں اس کی ممانعت بھی وارد ہوئی ہے۔ اور پہلے جملہ کا معنی یہ ہے کہ تم مشرکین کے شہروں میں ان کے قریب نہ رہو۔ بلکہ ان سے دور ہو جاؤ اور ان کے وطن سے ہجرت کر جاؤ۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے مسلم اور مشرک کا گھر اتنا دور ہونا چاہیے کہ ان کی آگ ایک دوسرے کو نظر نہ آئے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا جو کسی مشرک کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے وہ اسی مشرک کی مثل ہو جاتا ہے۔

وَقَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ: بغض ان کے موہنوں سے ظاہر ہو چکا ہے۔ ان کے چہروں پر اس کے اثرات ظاہر ہیں۔ اور ان کی زبانوں سے بھی وقتاً فوقتاً دشمنی کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اور اسلام کے خلاف جو بغض و عناد ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ کسی صاحب عقل و خرد سے پوشیدہ نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں ارشاد فرمایا ہم نے اپنی آیات تمہارے لیے صاف بیان فرمادی ہیں اگر تم سمجھ دار ہو۔

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ: اے مسلمانو! تم تو منافقین کے ظاہری ایمان کو دیکھ کر ان سے محبت کرتے ہو لیکن وہ تم سے کسی قسم کی ظاہری و باطنی محبت نہیں رکھتے۔ اور تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو یعنی تمہیں ان میں سے کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ لیکن یہ لوگ شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ تم اپنی کتاب قرآن کریم اور سابقہ کتب پر ایمان رکھتے ہو اور وہ تمہاری کتاب کے منکر ہیں۔ تو اس طرح تم ان کے نزدیک بدرجہ اولیٰ مبغوض ہو۔

1۔ فتح الباری، کتاب الاحکام 189/13

وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا: اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں۔ اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو تم پر غصہ سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔ "اَنَامِلْ" انگلیوں کے پوروں کو کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، سدی اور ربیع بن انس فرماتے ہیں انامل سے مراد انگلیاں ہیں۔ منافقوں کا یہی حال ہے کہ مومنوں کے سامنے تو اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور ان سے اپنی محبت جھٹلاتے ہیں اور باطنی طور پر اس کے برعکس ہیں۔

قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ: یعنی تم مومنوں پر خواہ کتنا ہی حسد کرو۔ اور اپنے غیظ وغضب کا اظہار کرو لیکن یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں پر اپنے دین اور نعمت کو ہر حال میں مکمل فرمائے گا۔ اور وہ اپنے دین کو باقی تمام ادیان پر غالب فرمائے گا۔ اور تم اپنے غصہ کی آگ میں جل کر مر جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ دل کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ یعنی تم نے اپنے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو بغض وحسد اور کینہ وعناد چھپایا ہے وہ اس سے خوب آگاہ ہے۔ وہ تمہیں دنیا میں بھی اس کی سزا دے گا کہ مسلمانوں کو تمہاری آرزو کے خلاف ترقی عطا فرمائے گا اور آخرت میں نار جہنم کے شدید عذاب سے دوچار کرے گا جس میں تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہو گے۔ تمہارے لیے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ: ان کا تو یہ حال ہے کہ اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں کوئی برائی پہنچے تو اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مسلمانوں سے شدید عداوت ہے اگر مسلمانوں کو فتح ونصرت، تائید الٰہی اور خوشحالی حاصل ہو تو منافقین کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اور اگر مسلمان قحط سالی میں مبتلا ہو جائیں یا کسی حکمت خداوندی کی وجہ سے اپنے دشمن سے مغلوب ہو جائیں تو یہ منافقین بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اگر تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تو ان کا مکروفریب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مخالفین کے مکروفریب اور ان کے شر سے بچنے کا طریقہ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ صبر کریں، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں اور اسی پر مکمل بھروسہ کریں۔ کیونکہ وہ ان کے دشمنوں کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ اس کے حکم بغیر وہ اُنکو نقصان نہیں پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کی ذات تو وہ ہے کہ اگر کسی چیز کا ارادہ فرمالے تو وہ وجود میں آجاتی ہے۔ اور جس چیز کا ارادہ نہ فرمائے وہ عدم میں رہتی ہے۔ ہر چیز کا وجود اس کی قضاء وقدر پر موقوف ہے جو اس پر توکل اور بھروسہ کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد کے واقعات کو بیان فرمایا ہے کہ اس نے اس غزوہ میں اپنے مومن بندوں کو کیسے آزمایا۔ اور کیسے مومنین اور منافقین میں خط امتیاز کھینچا اور پھر صبر کرنے والوں کا بھی بیان فرمایا ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اور یاد کرو (اے محبوب!) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھروں سے (اور میدان احد میں) بٹھا رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لیے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا (اس لیے اس نے اس لغزش سے بچا لیا) اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے

مومنوں کو اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدان) بدر میں حالانکہ تم بالکل کمزور تھے۔ پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے تا کہ تم (اس بروقت امداد کا) شکر ادا کر سکو''۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ: حضرت عبداللہ بن عباس، حسن بصری، قتادہ، سدی اور جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں غزوۂ احد کا ذکر ہے۔ حضرت حسن بصری سے ایک روایت ہے کہ اس سے مراد غزوۂ خندق ہے۔ لیکن یہ روایت غریب ہے اور قابل اعتماد نہیں۔ غزوۂ احد بروز ہفتہ گیارہ شوال تین ہجری کو پیش آیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غزوۂ بدر میں مشرکین کے بہت سے سردار قتل ہو گئے۔ انہوں نے اس کا بدلہ لینے کے لیے بڑے زور و شور سے تیاری کی اور غزوۂ بدر کے دوران مشرکین مکہ کا وہ تجارتی قافلہ جو ابوسفیان کی سرکردگی میں بچ کر نکل گیا تھا اس کے تمام مال اور آمدنی کو جنگ میں صرف کر دیا۔ اپنے اردگرد کے قبائل کو جمع کر کے تین ہزار کا لشکر جرار تیار کیا۔ اور مدینہ طیبہ کے سامنے میدان احد میں اس لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد مالک بن عمرو انصاری کی نماز جنازہ پڑھائی جو قبیلہ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کیا ہمیں مدینہ میں ہی رہ کر دفاع کرنا چاہیے یا مدینہ سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ عبداللہ بن اُبی نے مشورہ دیا کہ ہمیں مدینہ میں ہی ٹھہرنا چاہیے اگر مشرکین مکہ وہیں ٹھہرے رہے تو وہاں ان کا ٹھہرنا ایک برے قید خانے کی مثل ہو گا۔ اگر وہ مدینہ میں داخل ہوئے تو مدینہ کی گلیوں میں ہمارے نوجوان ان کا مقابلہ کریں گے۔ اور ہماری عورتیں اور بچے چھتوں سے ان پر پتھر برسائیں گے۔ اور اگر وہ یونہی لوٹ گئے تو خائب و خاسر ہو کر لوٹیں گے۔ مگر کچھ ایسے صحابہ کرام جو کسی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر کو تشریف لے گئے تھوڑی دیر بعد آپ ہتھیار لگا کر باہر تشریف لائے۔ اس وقت بعض صحابہ کرام پشیمان ہوئے۔ کہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کی منشا کے خلاف باہر نکلنے پر مجبور تو نہیں کیا اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! اگر آپ کا مدینہ میں ٹھہرنے کا ارادہ ہوا تو ایسا ہی کر لیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ہتھیار پہن کر اتار دے تا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی فیصلہ فرما دے۔ آپ ایک ہزار کا لشکر لے کر مدینہ طیبہ سے نکلے۔ شوط کے مقام پر رئیس المنافقین تقریباً اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس چلا آیا۔ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ اس کی بات نہیں مانی گئی تھی۔ یہ منافق کہنے لگے اگر جنگ ہوئی تو ہم بھی آجائیں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے تم جنگ نہیں لڑو گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی پروا کیے بغیر اپنے جانثاروں کے لشکر کو احد پہاڑ کے دامن میں اترنے کا حکم دیا۔ یہاں آپ نے فرمایا۔ جب تک ہم لڑائی کا حکم نہ دیں۔ کوئی جنگ شروع نہ کرے آپ نے اپنے سات سو صحابہ کو جنگ کے لیے تیار کیا۔ آپ نے پچاس تیر اندازوں کی ایک جماعت پر عبداللہ بن زبیر ؓ کو مقرر فرمایا اور انہیں حکم فرمایا کہ اس پہاڑی پر چڑھ جاؤ اور دشمن کے گھڑ سوار دستوں کو ہم سے دور رکھنا۔ تمہاری طرف سے دشمن ہم پر حملہ آور نہ ہو۔ تم اپنی جگہ سے پیچھے نہ ہٹنا۔ خواہ ہم دشمن پر غالب ہوں یا مغلوب۔ اگر تم دیکھو کہ ہمیں پرندے نوچ رہے ہیں تو پھر بھی تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔ ان انتظامات کو مکمل کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دہری زرہ پہنی اور موسیٰ بن عمیر کو جھنڈا عطا فرمایا۔ لشکر میں چند ایک نوخیز نوجوان بھی نظر آرہے تھے۔ آپ نے بعض کو جنگ میں شریک ہونے کی اجازت عطا فرما دی اور بعض کو واپس بھیج دیا۔ ان نوجوانوں کو بھی دو سال بعد غزوۂ خندق میں لشکر میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ قریش کا لشکر بھی جنگ کے لیے تیار تھا۔ ان کی تعداد تین ہزار تھی۔ ان میں سو گھڑ سواروں کا دستہ بھی تھا۔ جس کو انہوں نے ایک طرف کھڑا کر دیا۔ خالد بن ولید کو میمنہ پر، اور عکرمہ بن ابی جہل کو میسرہ پر مقرر کیا اور جھنڈا بنی عبدالدار کو دیا۔ اس کے بعد دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ جس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یاد کرو اے محبوب! جب صبح سویرے آپ اپنے گھر

سے روانہ ہوئے اور میدان احد میں مومنوں کو جنگ کے لیے مورچوں میں بٹھا رہے تھے۔ یعنی کسی کو میمنہ پر مقرر فرما رہے تھے اور کسی کو میسرہ پر۔ اور اللہ تعالیٰ تمہاری اس گفتگو کو سننے والا اور دلوں کے رازوں کو جاننے والا ہے۔ یہاں ابن جریر نے ایک اعتراض وارد کیا ہے کہ تم کہتے ہو کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے بعد مدینہ طیبہ سے نکلے تھے اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وہ صبح سویرے نکلے تھے۔ پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے کہ آپ ہفتہ کی صبح کو اپنے مجاہدین کی صفوں کو ترتیب دینے کے لیے نکلے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کا بیان آیت کریمہ میں فرمایا ہے۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآىٕفَتٰنِ مِنْكُمْ: جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا کہ وہ ہمت ہار جائیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی۔ یعنی ہمارے دو گروہ بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے بارے میں۔ اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ ہمارے بارے میں نازل نہ ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ ان گروہوں کا ولی اور مددگار ہے۔ اس کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ (طائفتان) سے مراد بنو حارثہ اور بنو سلمہ ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ: اور بے شک اللہ تعالیٰ نے میدان بدر میں تمہاری مدد کی تھی۔ حالانکہ تم اس وقت کمزور تھے۔ غزوۂ بدر بروز جمعہ، سترہ رمضان المبارک دو ہجری کو پیش آیا۔ یہ وہی یوم فرقان ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو عزت بخشی، شرک کو جڑ سے اکھیڑا اور مشرکین کو ذلیل ورسوا کر کے تباہ وبرباد کیا۔ حالانکہ اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد انتہائی قلیل تھی۔ مسلمانوں کا لشکر صرف تین سو تیرہ افراد پر مشتمل تھا۔ اس میں دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے اور باقی پیادہ۔ ان کے پاس بنیادی ضروریات کا معمولی سامان بھی نہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں دشمن کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ جو لوہے کی زرہوں اور ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح تھے۔ ان کے پاس ہر قسم کے جنگی ساز وسامان کے علاوہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے بھی تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور آپ کے اصحاب کے چہروں کو روشن کیا۔ شیطان اور اس کے چیلوں کو ذلت ورسوائی سے دوچار کیا۔ اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اپنا احسان یاد کراتے ہوئے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہاری میدان بدر میں مدد کی تھی۔ حالانکہ اس وقت تم انتہائی کمزور اور قلیل تعداد میں تھے۔ تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ فتح ونصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ نہ کہ لشکر کی کثرت اور جنگی ساز وسامان کی فراوانی سے۔ لہٰذا ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا (التوبہ:25) ''اور حنین کے روز بھی، جب کہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے) کچھ بھی''۔ حضرت عیاض اشعری فرماتے ہیں کہ میں جنگ یرموک میں موجود تھا۔ ہمارے پانچ سپہ سالار، ابو عبیدہ، یزید بن سفیان، ابن حسنہ، خالد بن ولید اور عیاض تھے۔ یہ عیاض راویٔ حدیث نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ نے خط بھیجا کہ جب معرکہ شروع ہو تو حضرت ابو عبیدہؓ کو اپنا سپہ سالار بنالینا۔ ہم نے جواب میں لکھا موت ہمارے سر پر کھڑی ہے۔ ہماری مدد کے لیے کچھ لشکر بھیجیں۔ انہوں نے جواباً ہمیں لکھا مجھے تمہارا خط پہنچ گیا ہے۔ جس میں تم نے کمک کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن میں تمہاری راہنمائی اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا ہوں۔ جو فتح ونصرت عطا کرنے میں سب سے غالب اور لشکر کی نسبت زیادہ محفوظ ہے۔ پس اللہ سے مدد طلب کرو۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو غزوۂ بدر میں مدد اور نصرت سے نوازا تھا۔ حالانکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد تم سے بہت کم تھی۔ میرا خط ملتے ہی دشمن پر حملہ کر دو۔ اور اس سلسلے میں مجھے دوبارہ نہ لکھنا۔ راوی فرماتے ہیں ہم نے آپ کے حکم کے مطابق دشمن پر حملہ بول دیا۔ انہیں چار فرسخ پیچھے دھکیل کر بدترین شکست سے دوچار کیا۔ راوی فرماتے ہیں اس جنگ میں ہمیں بہت سامال غنیمت حاصل ہوا۔ جب ہم نے اس کے بارے میں باہمی مشورہ کیا۔ تو حضرت عیاض نے فرمایا ہم ہر شخص کو دس گھوڑے عطا کریں گے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے بعد حضرت ابو

عبیدہ نے فرمایا میرے ساتھ کون گھڑ دوڑ میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ ایک نوجوان نے کہا آپ ناراض نہ ہوں تو تیار ہوں۔ راوی فرماتے ہیں۔ وہ نوجوان آپ سے سبقت لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت ابوعبیدہ اپنے عربی گھوڑے پر سوار تھے۔ آپ کے سر کے بال دونوں طرف سے اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اس کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ حافظ الضیاء مقدسی نے بھی اسے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ بدر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک وادی ہے۔ جو بدر نامی کنواں سے منسوب ہے۔ اس کنویں کو بدر بن نارین نے کھودا تھا۔ شعبی کا بھی یہی قول ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے پس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تاکہ تم اس کی بروقت امداد کا شکر ادا کرسکو۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ﴿١٢٤﴾ بَلَىٰ ۚ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ ۗ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١٢٦﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ ﴿١٢٧﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١٢٨﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٢٩﴾

"(عجب سہانی گھڑی تھی) جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمارہے تھے مومنوں سے کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہاری مدد فرمائے تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے۔ ہیں ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تم تقویٰ اختیار کرو اور اگر آدھمکیں کفار تم پر تیزی سے اسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ (یہ مدد اس لئے تھی) تاکہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں سے یا ذلیل کر دے ان کو پس لوٹ جائیں نامراد ہو کر۔ نہیں ہے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل چاہے تو اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے چاہے تو عذاب دے انہیں بے شک وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے"۔

اس وعدہ کے متعلق اختلاف ہے کیا یہ وعدہ غزوۂ بدر کے متعلق ہے یا اس کا تعلق غزوۂ احد سے ہے۔ علماء مفسرین کے دو قول ہیں:

1۔ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ کا تعلق وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ سے ہے۔ یہ قول حضرات حسن بصری، عامر شعبی اور ربیع بن انس وغیرہ سے روایت ہے اور ابن جریر نے اسے منتخب کیا ہے۔ عباد بن منصور حضرت حسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ...... غزوۂ بدر کے متعلق ہے۔ ابن ابی حاتم اسے روایت کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ کرز بن جابر مسلمانوں کی مدد کر رہا ہے۔ یہ سن کر انہیں بہت دکھ ہوا۔ اس وقت اس آیت کا نزول ہوا کرز کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ نہ مسلمانوں کی مدد کرسکا اور نہ ہی کفار کی۔ حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں پہلے اللہ تعالیٰ نے ہزار ملائکہ بھیج کر مسلمانوں کی مدد کی۔ پھر ان کی

تعداد تین ہزار اور بعد میں چار ہزار کر دی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت اور اللہ کے اس فرمان: اِذۡ تَسۡتَغِيۡثُوۡنَ رَبَّكُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَـكُمۡ اَنِّىۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ..... (انفال:9) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں الف (ایک ہزار تعداد) کا تعین تین ہزار یا اس سے زائد ملائکہ کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے مُرۡدِفِيۡنَ کا ذکر کیا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ان جیسے کئی ہزار ملائکہ ان کے بعد آئیں گے۔ سورۂ آل عمران میں ذکر کردہ آیت میں اس آیت کے ساتھ تشبیہ ہے ظاہر یہی ہے کہ یہ آیت غزوۂ بدر کے متعلق ہے کیونکہ مشہور قول کے مطابق غزوۂ بدر میں ہی ملائکہ قتال میں شریک ہوئے تھے۔ سعید بن ابی عروبہ حضرت قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار ملائکہ سے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وعدہ اللہ رب العزت کے اس فرمان کے متعلق ہے: وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ‌ؕ (آل عمران:121) جبکہ یہ آیت غزوۂ احد کے متعلق ہے۔ یہ قول حضرات مجاہد، عکرمہ، ضحاک، زہری اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کا ہے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو پانچ ہزار ملائکہ کی تائید حاصل نہ ہو سکی کیونکہ مسلمان ڈٹ کر نہ لڑ سکے اور حضرت عکرمہ فرماتے ہیں اس روز مسلمانوں کی اعانت تین ہزار ملائکہ سے بھی نہ ہوئی کیونکہ اللہ کا فرمان تھا: بَلٰٓى‌ ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لیکن مسلمانوں نے صبر نہ کیا بلکہ بھاگ گئے اس طرح ان کی مدد ایک فرشتے سے بھی نہ کی گئی۔ بَلٰٓى‌ ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا اگر تم نے دشمن کے ساتھ جنگ پر صبر کیا، میری اطاعت کی اور مجھ سے ڈرتے رہے۔ وَيَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا حضرات حسن، قتادہ، ربیع اور السدی کہتے ہیں اَیۡ مِنۡ غَضَبِهِمۡ هٰذَا۔ یعنی ان کے اس غصہ کی وجہ سے۔ علامہ ضحاک نے غصہ اور وجہ دونوں کا ذکر کیا ہے۔ علامہ عوفی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں مِنۡ سَفَرِهِمۡ هٰذَا۔ ان کے سفر کی وجہ سے يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ۔ یعنی ان کی پیشانیوں پر نشانات ہوں گے۔ ابو اسحاق البیہقی، حارثہ بن مغرب اور وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ غزوۂ بدر کے روز ملائکہ کی علامت یہ تھی کہ انہوں نے سفید صوف پہن رکھا تھا۔ ان کے گھوڑوں کے چہروں پر مخصوص علامت تھی۔ اسے ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت میں مُسَوِّمِيۡنَ سے مراد سفید صوف ہے۔ حضرت مجاہد سے روایت ہے ''مُسَوِّمِيۡنَ'' سے مراد یہ ہے کہ ان کے گھوڑوں کی گردنوں کے بال برابر ہے۔ ان کی پیشانیوں پر گھوڑوں کی دموں کی طرح بال تھے۔ حضرت علامہ عوفی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ ملائکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس حالت میں آتے کہ ان پر صوف کے نشانات لگے تھے۔ اس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے بھی اپنے آپ پر اور اپنے گھوڑوں پر صوف کے نشانات لگا دیئے۔

حضرت عکرمہ اور قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد قتال کی علامت ہے۔ علامہ مکحول نے اس سے مراد عمامے لئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور نبی محترم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ''مُسَوِّمِيۡنَ'' سے مراد نشانات لگائے ہوئے ہیں۔ غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے ملائکہ نے سیاہ اور غزوۂ حنین میں شرکت کرنے والے ملائکہ نے سرخ عمامے پہن رکھے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ غزوۂ بدر کے علاوہ ملائکہ نے کسی اور جنگ میں قتال نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے ہی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں غزوۂ بدر کے روز ملائکہ نے سفید عمامے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے انہیں اپنی پشتوں کی طرف لٹکا رکھا تھا انہوں نے غزوۂ حنین کے دن بھی عمامے پہن رکھے تھے ملائکہ نے غزوۂ بدر کے علاوہ کسی اور غزوۂ میں قتال نہیں کیا۔ دیگر غزوات میں وہ اعانت اور تعداد کے لئے شرکت تو کرتے تھے لیکن شمشیر زنی نہیں کرتے تھے۔

ابن ابی حاتم فرماتے ہیں حضرت زبیر نے غزوۂ بدر کے دن زرد عامہ پہن رکھا تھا۔ انہوں نے تمام عمامہ اپنے سر کے اردگرد لپیٹ رکھا تھا جب ملائکہ آئے تو انہوں نے بھی زرد عمامے پہن رکھے تھے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ .... اللہ رب العزت نے ملائکہ کو اس لئے نازل کیا اور تمہیں ان کے نزول کی خبر اس لئے دی تا کہ تمہیں مژدہ جانفزا مل جائے اور تمہیں اطمینان قلب حاصل ہو سکے۔ نصرت واعانت تو اللہ کی طرف سے ہے اگر وہ چاہتا تو وہ تمہیں چھوڑ کر تمہارے دشمنوں کی مدد کر دیتا۔ تمہارے ساتھ جنگ لڑنے کی انہیں کوئی ضرورت نہ تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد کا حکم دینے کے بعد فرمایا: ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝ (محمد:6-4)۔

بات یہ ہے اور اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لیتا مگر اس لئے کہ تم میں سے ایک کو دوسرے سے جانچے اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے اللہ ہرگز ان کے عمل ضائع نہ فرمائے گا۔ جلد انہیں راہ دے گا اور ان کا کام بنا دے گا اور انہیں جنت میں لے جائے گا انہیں اس کی پہچان کرا دی ہے۔

اسی لئے رب العزت نے فرمایا: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ وہ ان عزتوں کا مالک ہے جن کا قصد نہیں کیا جا سکتا اس کی قدرت واستحکام میں کئی حکمتیں پنہاں ہیں۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا۔ تمہیں جہاد اور شمشیر زنی کا حکم دینے میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان تمام اقسام کا ذکر فرمایا جو لڑنے والے کفار میں ممکن تھیں۔ فرمایا لِيَقْطَعَ طَرَفًا کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کرے۔ اَوْ يَكْبِتَهُمْ یا انہیں رسوا کرے اور ان کے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا کر ان کے غیض وغضب میں اضافہ کرے پھر وہ اس حالت میں لوٹیں کہ وہ خائب وخاسر ہوں اور انہیں مقصد نہ مل سکے پھر اللہ رب العزت نے وہ آیت ذکر فرمائی جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا وآخرت میں حکم اللہ رب العزت کے لئے ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں۔ تمام معاملہ اللہ کے لئے ہے۔ ارشاد ربانی: فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (رعد:40) ''بے شک آپ کے اوپر پہنچانا ہے اور ہمارے اوپر حساب''۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (بقرہ:272) ''انہیں راہ دینا تمہارے ذمہ لازم نہیں ہاں اللہ راہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے''۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (قصص:56) ''بے شک یہ نہیں کہ تم جسے اپنی طرف سے چاہو ہدایت کرو ہاں اللہ ہدایت فرماتا ہے جسے چاہے''۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں اس آیت کا مفہوم یہ ہے میرے بندوں کے حکم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی دخل ہے جو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دوں پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کی دیگر ممکنہ صورتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ یا اللہ تعالیٰ ان کے کفر کو معاف فرمائے اور گمراہی کے بعد انہیں ہدایت عطا فرمائے اَوْ يُعَذِّبَهُمْ یا انہیں دنیا وآخرت میں ان کے کفر اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر عذاب نازل کرے فرمایا۔ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ وہ اس عذاب کے مستحق ہیں۔

امام بخاری نے حضرت ابوسالم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دوسری رکعت سے سر اٹھاتے تو'' سمع اللہ لمن حمدہٗ ربنا ولك الحمد '' کہنے کے بعد دعا کرتے اللّٰھم العن فلانا و فلانا۔ مولانا! فلاں، فلاں پر اپنی لعنت فرما۔ اس وقت اللہ رب العزت نے یہ آیت نازل کی لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ...... امام نسائی اور امام

عبدالرزاق نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ حضرت ابوسالم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی: ''مولا! فلاں پر لعنت فرما، مولا! حارث بن ہشام پر لعنت فرما، مولانا! سہیل بن عمرو پر لعنت فرما، مولا! صفوان بن امیہ پر لعنت فرما۔'' اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام کی توبہ کو قبول کر لیا۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چار افراد کے لئے بددعا فرمایا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت کی توفیق عطا فرمائی۔ محمد بن عجلان حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشرقین میں سے کچھ افراد کے لئے بددعا فرماتے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

امام بخاری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے لئے بددعا کا ارادہ فرماتے تو رکوع سے اٹھنے کے بعد سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد اس کے لئے بددعا کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی مولا! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات عطا فرما، کمزور مومنین کو نجات دے۔ مولا! بنو مضر پر اپنی سختی کو شدید فرما، ان پر ایسا قحط مسلط فرما جس طرح کا قحط تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مسلط فرمایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بلند آواز سے مانگتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فجر کی نماز میں اس طرح بددعا فرمایا کرتے تھے مولا! عرب کے قبائل میں سے فلاں فلاں پر لعنت فرما۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

امام بخاری فرماتے ہیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب غزوۂ احد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ قوم کامیاب ہو سکتی ہے جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی کرتی ہو اس وقت آیت نازل ہوئی۔ امام بخاری حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی آخری رکعت سے سر اٹھاتے تھے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد عرض کرتے مولا! فلاں، فلاں پر اپنی لعنت بھیج اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ حنظلہ بن ابی سفیان سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سالم بن عبداللہ کو سنا وہ فرما رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ، سہیل بن اشرف اور حارث بن ہشام کے لئے بددعا کی۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی۔

امام احمد فرماتے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔ رخ انور زخمی ہو گیا۔ طلعت زیبا سے خون رواں ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنی نبی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بددعا کی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے چہرہ مبارک زخمی ہو گیا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''زرہیں پہن رکھی تھیں۔ خون رواں تھا۔ حضرت ابوحذیفہ کے غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بٹھایا۔ رخ زیبا سے خون صاف کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افاقہ ہوا تو فرمایا وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو جبکہ انہیں بارگاہ ربوبیت کی طرف بلاتا ہو۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ تمام ملک اس ہی کے لئے ہے زمین اور آسمان والے اس کے بندے ہیں۔ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وہ ہر قسم کا تصرف فرمانے والا ہے۔ اس کے حکم کے متعلق کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ جو وہ کرتا ہے اس کے متعلق اس سے سوال

نہیں کیا جائے گا جبکہ مخلوق سے پوچھا جائے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿١٣١﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٣٢﴾ وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٣﴾ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣٤﴾ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٣٥﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دوگنا چوگنا کر کے اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (کریم) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور دوڑو بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے جو تیار کی گئی پرہیزگاروں کے لیے۔ وہ (پرہیزگار) جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور تنگ دستی میں اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور درگزر کرنے والے ہیں لوگوں سے اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کر بیٹھیں گے جو کوئی برا کام یا ظلم کریں اپنے آپ پر (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگنے لگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور نہیں اصرار کرتے اس پر جو ان سے سرزد ہوا اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں۔ یہ وہ (نیک بخت) ہیں جن کا بدلہ بخشش ہے اپنے رب کی طرف سے اور جنت رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا''۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو سودی کاروبار اور سود خوری سے منع فرما رہا ہے دور جاہلیت میں بعض لوگ سود پر قرض دیتے تھے۔ مقررہ وقت پر وہ قرض دار کو کہتے یا تو اپنا قرضہ ادا کر دو یا اس میں سود میں اضافہ کرو۔ اگر وہ قرض ادا کر دیتا تو فبہا۔ وگرنہ وہ مدت میں اضافہ کرنے کے ساتھ سود میں بھی اضافہ کر دیتے۔ اس طرح ہر سال اضافہ کرتے جاتے جس کی وجہ سے تھوڑا سا قرض کئی گناہ ہو جاتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تقویٰ کا حکم دیا ہے تاکہ وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکیں، اور اس کے ساتھ ساتھ آتش دوزخ سے بھی ڈرایا ہے پھر اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دے کر اپنے قرب کے حصول کے لیے سبقت لے جانے کی تاکید فرمائی ہے۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ: جس طرح اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے نار جہنم تیار کی ہے اسی طرح مومن کے لیے جنت تیار کی ہے جس کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے اس کی لمبائی کا کیا عالم ہوگا۔ جس طرح جنتی بستر کی تعریف میں فرمایا بَطَائِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ (رحمٰن: 54)

یعنی اس کا استر نرم ریشم کا بنا ہوا ہے۔ جب اس کا استر اتنا نرم ہے تو اس کا ظاہر کتنا نرم ہوگا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ جنت کی چوڑائی اور لمبائی برابر ہے کیونکہ جنت عرش کے نیچے واقع ہے اور جو چیز قبہ نما گول ہو اس کی لمبائی اور چوڑائی برابر ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث اس کی تائید کرتی ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو تو اس سے جنت فردوس مانگا کرو کیونکہ یہ سب سے اعلیٰ اور عمدہ جنت ہے اسی سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں اور اس کی چھت اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔'' یہ آیت کریمہ سورۂ حدید کی اس آیت (تیزی سے آگے بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان وزمین کے برابر ہے)۔ کی مثل ہے۔ مسند امام میں ہے کہ شہنشاہ روم ہرقل نے بطور اعتراض حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں سوال بھیجا کہ آپ نے مجھے جس جنت کی دعاوی ہے اس کی چوڑائی زمین وآسمان کے برابر ہے تو فرمائیے جہنم کہاں گئی۔ رسول خدا ﷺ نے جواب میں فرمایا سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے۔ حضرت یعلی بن مرہؓ فرماتے ہیں کہ حمص میں میری ملاقات ہرقل کے اس قاصد سے ہوئی جو رسول اللہ ﷺ کے پاس ہرقل کا خط لے کر گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت بوڑھا ہو چکا تھا اس نے بیان کیا کہ جب میں نے یہ خط رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے اپنے بائیں طرف بیٹھے ہوئے ایک صحابی کو یہ خط دیا میں نے لوگوں سے خط پڑھنے والے کا نام دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ حضرت معاویہؓ ہیں یہود نے بھی حضرت عمر بن خطابؓ سے یہی سوال کیا تھا۔ آپ نے انہیں ارشاد فرمایا مجھے یہ بتاؤ جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے اور جب رات آتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے۔ یہودی اس جواب سے کھسیانے ہو کر کہنے لگے کہ یہ جواب تو تورات سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہی جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔'' حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جب رات آتی ہے تو ہر چیز پر چھا جاتی ہے تو دن کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا جہاں خدا چاہتا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا اسی طرح جہنم بھی وہاں ہوگی جہاں اللہ چاہے گا۔'' یہ جواب دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے ایک یہ کہ دن کے وقت رات نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی دوسری جگہ موجود نہ ہو اسی طرح گو جنت کا عرض اتنا ہی ہے لیکن پھر بھی جہنم کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا جہنم اسی جگہ ہے جہاں خدا کی مشیت ہے۔ دوسرا یہ کہ جب دنیا کے ایک حصے میں دن ہوتا ہے تو ایک حصہ میں رات ہوتی ہے اسی طرح جنت آسمان کے اوپر اعلیٰ علیین میں ہے اور دوزخ اسفل السافلین میں ہے۔ اس قول سے مذکورہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِى السَّرَّآءِ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ تنگی اور خوشحالی، خوشی اور غمی، تندرستی اور بیماری الغرض ہر حال میں اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (بقرہ:274) ''ترجمہ: جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات اور دن میں چھپ کر اور علانیہ طور پر''۔ مقصد یہ کہ کوئی چیز بھی ان کو اللہ کی اطاعت اور اس کی خوشنودی میں مال خرچ کرنے اور اس کی مخلوق پر احسان کرنے سے نہیں روک سکتی۔

وَالۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ: جب ان کو غصہ آتا ہے تو اس کو پی جاتے ہیں یعنی اپنے غصے کا اظہار نہیں کرتے اور برائی سے پیش آنے والے کو معاف کر دیتے ہیں۔ حدیث قدسی ہے اے ابن آدم! اگر غصے کے وقت تو مجھے یاد رکھے گا تو میں تجھے ہلاکت سے بچا لوں گا۔ امام ابو یعلی اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے غصے کو روک لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے اپنا عذاب دور کر دیتا ہے اور جو شخص اپنی زبان کو (بری باتوں سے) سے محفوظ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنا عذر پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عذر کو قبول کرتا ہے۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں کلام ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول

اللہ علیہ ﷺ نے فرمایا بہادر وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو پالے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو۔ لوگوں نے عرض کی ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ تم اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو پسند کرتے ہو کیونکہ تمہارا مال حقیقت میں وہی ہے جو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اور جو تم باقی چھوڑ جاؤ گے وہ تمہارا نہیں تمہارے وارثوں کا ہوگا پھر ارشاد فرمایا کہ تمہارے نزدیک پہلوان کون ہے۔ ہم نے عرض کی جسے کوئی گرا نہ سکے آپ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ پھر ارشاد فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ بے اولاد کون ہے ہم نے عرض کی جس کی اولاد نہ ہو آپ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ بے اولاد وہ ہے جس کی زندگی میں کوئی بچہ فوت نہ ہوا ہو۔ اس حدیث کے پہلے حصے کو امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں ارشاد فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے۔ صحابہ نے عرض کی جس کے پاس مال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ حقیقی مفلس وہ ہے جس کے پاس مال ہو اور وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرے اور اسی حالت میں مر جائے پھر آپ نے ارشاد فرمایا پہلوان کون ہے؟ عرض کی کہ وہ جسے کوئی پچھاڑ نہ سکے آپ نے فرمایا کہ حقیقی پہلوان وہ ہے جسے شدید غصہ آئے اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ اور جسم کپکپانے لگے تو وہ اس غصے کو پی جائے۔ حضرت حارثہ بن قدامہؓ نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جو میرے لئے فائدہ مند ہو اور مختصر ہو تا کہ میں اسے یاد رکھ سکوں آپ نے فرمایا کہ غصہ نہ کر حضرت حارثہؓ نے بار بار یہی سوال دہرایا اور آپ نے ہر بار یہی جواب دیا۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ غصہ مت کرو۔ وہ شخص کہتا ہے کہ غور و فکر کے بعد کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ غصہ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ روایت کرتے ہیں حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے حوض پر جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ کچھ لوگوں کا وہاں سے گزر ہوا وہ اپنے ساتھ سے کہنے لگے کہ تم میں سے کون ہے جو حضرت ابوذرؓ کے حوض کو توڑ کر انہیں غصہ دلائے؟ ایک شخص نے کہا میں۔ وہ آگے بڑھا اور اس حوض کو توڑ دیا۔ حضرت ابوذر کھڑے تھے۔ آپ بیٹھ گئے اور پھر لیٹ گئے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اگر بیٹھنے سے غصہ ختم ہو جائے تو ٹھیک ورنہ لیٹ جائے۔ ابو وائل اصمعانی فرماتے ہیں ہم حضرت عروہ بن محمد کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک ایک آدمی آیا اور کوئی ایسی بات کہی جس سے وہ غصے میں آگئے۔ جب آپ کو غصہ آیا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ وضو فرمایا اور واپس آگئے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصے آئے تو وہ وضو کر لیا کرے۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اس کا قرضہ معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ سے بچا لیتا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا لوگو! غور سے سنو جنت کے اعمال سخت اور مشکل ہیں اور جہنم کا کام آسان اور سہل۔ خوش بخت وہ ہے جو فتنوں سے بچے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غصے کے گھونٹ سے زیادہ اور کوئی پسندیدہ نہیں ہے۔ جب کوئی مومن اللہ تعالیٰ کے لئے غصہ پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو نور ایمان سے بھر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنا غصہ اتارنے کی طاقت رکھنے کے باوجود پی جائے اللہ تعالیٰ اس کا دل امن و امان سے بھر دیتا ہے۔ اور شخص تواضع اور انکساری کی وجہ سے قدرت کے باوجود خوبصورت کپڑا نہ پہنے اللہ تعالیٰ اسے عزت و کرامت کی خلعت پہنائے گا۔ اور جو کسی کا سر چھپائے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن بادشاہت کا تاج پہنائے گا۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جو شخص قدرت کے باوجود اپنا غصہ پی لے

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے تمام مخلوق کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ وہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔ اس مضمون کی اور بھی احادیث ہیں۔اور اس آیت کا یہی مفہوم ہے کہ لوگوں پر اپنا غصے نہیں اتارتے بلکہ غصہ پی کر لوگوں کو تکلیف دینے کی بجائے راحت پہنچاتے ہیں۔اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جناب سے ثواب کی امید رکھتے ہیں۔

وَالۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ : وہ لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور جو ان پر ظلم کرے اسے بھی معاف کر دیتے ہیں حتیٰ کہ ان کے دلوں میں کسی کے متعلق کوئی میل نہیں ہوتا۔ یہی مومن کا کامل ترین درجہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ محسن بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ درگزر کرنے سے بندے کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ تواضع وانکساری کرنے والے کا مقام اللہ تعالیٰ بلند کرتا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص یہ آرزو رکھتا ہو کہ جنت میں اس کے عالیشان محل ہوں اور درجات بلند ہوں اسے چاہیے کہ وہ ظلم کرنے والے کو معاف کرے، محروم کرنے والے کو عطا کرے اور قطع تعلق کرنے والے سے صلح رحمی کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن نداء دینے والا پکارے گا اے لوگوں کو معاف کرنے والو اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ اور اپنا اجر وانعام حاصل کر لو۔ معاف کرنے والے کا اجر جنت ہے۔

وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً : جب بھی ان سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو فوراً استغفار کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی بندے سے گناہ سرزد ہو گیا۔ اس نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی اے میرے پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے مجھے معاف فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بندے نے گناہ کیا اور اسے معلوم ہے کہ اس کا رب اس کے گناہوں کہ معاف کرتا ہے اور ان کی سزا دیتا ہے۔ پھر اس بندے سے ایک اور گناہ کا ارتکاب ہو گیا اللہ نے معاف کر دیا اور اسی طرح تیسری مرتبہ بھی معاف کر دیا۔ جب چوتھی بار گناہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا اے فرشتوں گواہ رہنا میں نے اپنے اس بندے کو معاف کر دیا اب میرا بندہ جو چاہے کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب ہم آپ کی زیارت کرتے ہیں تو ہم پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور آخرت کے سوا ہر چیز بھول جاتی ہے۔ اور جب آپ سے جدا ہوتے ہیں تو دنیا کی جھنجھٹ اور اہل وعیال کی فکر میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا تمہارے دلوں کی جو کیفیت میرے سامنے ہوتی ہے اگر یہی ہر وقت قائم رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے اور تمہاری زیارت کے لیے تمہارے گھروں پر اترتے۔ اگر تم گناہ نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ ایسی قوم کو لے آئے گا جو گناہ کرے گی (اور اس پر مغفرت طلب کرے گی) تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جنت کی بناوٹ کیسی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہاں ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی اور اس کا گارا مشک کا، اس کے کنکر موتی اور یاقوت کے اور اس کی مٹی زعفران کی ہے۔ جو بھی اس میں داخل ہو گا اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہے گا اور اسے موت کا کھٹکا نہیں ہو گا۔ نہ اس کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ اس کا شباب ڈھلے گا۔ تین افراد کی دعا رد نہیں ہوتی۔ عادل حکمران، روزہ دار اور مظلوم جس کی دعا بادلوں پر اٹھائی جاتی ہے اور اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے مجھے میری عزت کی قسم میں تیری ضرور مدد کروں گا خواہ کچھ دیر کے بعد۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں میں جب بھی حضور ﷺ سے کوئی حدیث سنتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نفع دیتا ہے اور جب کوئی دوسرا شخص مجھ سے حدیث بیان کرتا ہے تو میں قسم لیتا ہوں اگر وہ قسم اٹھا لے تو میں اس کی تصدیق کر دیتا ہوں۔ حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے حدیث بیان کی ہے اور انہوں نے سچ فرمایا کہ انہوں نے حضور ﷺ کو ارشاد

فرماتے ہوئے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب کوئی بندہ گناہ کرے پھر احسن طریقے سے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور اللہ سے مغفرت طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو شخص بھی کامل وضو کر کے ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' پڑھے اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ نے صحابہ اکرامؓ کے سامنے نبی پاک ﷺ جیسا وضو کیا اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ نے فرمایا جو شخص میرے جیسا وضو کرے اور پھر دو رکعت نماز ادا کرے جس میں اس کے دل میں کسی قسم کا خیال نہ آئے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ اس طرح یہ حدیث چاروں خلفائے راشدین حضور سید الاولین والآخرین ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ قرآن پاک کی آیت کریمہ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ استغفار گنہگاروں کے لیے نفع مند ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو شیطان رونے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا! کثرت سے لا الہ الا اللہ کا ورد کرو اور استغفار کو لازم پکڑو۔ یہ حالت دیکھ کر شیطان کہتا ہے کہ میں لوگوں کو گناہوں سے ہلاک کرنا چاہتا ہوں اور وہ مجھے لا الہ الا اللہ اور استغفار سے ہلاک کرتے ہیں اور جب میں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو میں نے انہیں خواہشات نفسانی میں مبتلا کر دیا۔ اب وہ اپنے آپ کو راہ راست پر گمان کرتے ہیں حالانکہ وہ ہلاکت میں ہیں۔ حضرت ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس نے کہا اے رب مجھے تیری عزت کی قسم میں بنی آدم کو آخری دم تک گمراہ کرتا رہوں گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے بھی میری عظمت وجلال کی قسم! جب تک وہ مجھ سے مغفرت طلب کرتے رہیں گے میں انہیں معاف کرتا رہوں گا حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا۔ آپ نے فرمایا جب تم سے گناہ ہو جائے تو اپنے رب سے مغفرت طلب کیا کرو۔ حتیٰ کہ اس نے جب چوتھی بار عرض کی تو آپ نے ارشاد فرمایا اپنے رب سے مغفرت طلب کرو یہاں تک شیطان مایوس ہو جائے۔

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ: یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا گناہوں کو کوئی معاف نہیں کر سکتا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ ایک قیدی حضور ﷺ کی بارگاہ میں گیا تو وہ کہنے لگا اے اللہ میں تیری بارگاہ میں توبہ کا خواستگار ہوں محمد ﷺ کی بارگاہ سے نہیں۔ آپ نے فرمایا اس نے صاحب حق کو پہچان لیا۔ اصرار کا معنی یہ ہے کہ وہ جلد ہی اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں، اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گناہ پر کار بند نہیں رہتے۔ ان سے جونہی کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ گناہ پر مصر نہیں (جو گناہ کے بعد) اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے اگرچہ اس سے ایک دن میں ستر مرتبہ بھی گناہ سرزد ہو جائے۔ یعنی ستر بار گناہ کرنے کے بعد اگر وہ اللہ سے مغفرت چاہے گا تو اسے مصر نہیں کہیں گے۔

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ: یعنی وہ جانتے ہیں کہ جو بھی اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ یہ آیت کریمہ ان دو آیات کی مثل ہے۔ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (التوبہ:104) ''ترجمہ: کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے''۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء:110) ''ترجمہ: اور جو شخص برا کام کر بیٹھے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑا بخشنے والا اور بہت رحم کرنے والا پائے گا''۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے منبر پر ارشاد فرمایا تم لوگوں پر رحم کرو تم پر رحم کیا جائے گا، تم اللہ سے مغفرت طلب کرو تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔ باتیں بنانے والوں کے لیے ہلاکت ہے اور گناہوں پر اصرار کرنے والوں کے لیے بھی بربادی ہے۔ اللہ

تعالیٰ متقین کی یہ صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ ان لوگوں کی جزا اس کی طرف سے مغفرت اور ایسی جنت ہے جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور عمل کرنے والوں کے لیے یہ بہترین اجر ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ﴿١٤١﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿١٤٣﴾

''گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج وزوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔ یہ ایک بیان ہے لوگوں (کے سمجھانے) کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے، پرہیزگاروں کے واسطے اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تمہیں سربلند ہو گے اگر تم سچے مومن ہو (احد میں) اگر لگی ہے تمہیں چوٹ تو (بدر میں) لگ چکی ہے (تمہاری دشمن) قوم کو بھی چوٹ ایسی ہی اور یہ (ہار جیت کے) دن ہم پھراتے رہتے ہیں انہیں لوگوں میں اور یہ اس لیے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنالے تم میں سے کچھ شہید اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو اور اس لیے کہ نکھار دے اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے اور دیکھا ہی نہیں (آزمائش میں) صبر کرنے والوں کو۔ اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کے تم اس سے ملاقات کرو سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں) سے مشاہدہ کر رہے ہو''۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ: جنگ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے اور بہت سے زخمی اللہ تعالیٰ انہیں تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ اس قسم کے حالات تم سے پہلے انبیاء کے رحم پر بھی گزر چکے ہیں لیکن آخر کار غلبہ انہی کو حاصل ہوا اور کافر خائب وخاسر ہوئے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ تم پہلی قوموں کے بارے غور وفکر کرو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کافروں کا کیا انجام ہوا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ قرآن حکیم میں ان امور کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ کی کتاب ہمارے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ یعنی قرآن کریم میں تم سے پہلے لوگوں کے واقعات موجود ہیں اور یہ تمہارے دلوں کے لیے باعث ہدایت اور گناہوں سے نجات کا ذریعہ ہے۔ پھر مسلمان کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جنگ احد میں جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے کمزور نہ ہونا اور نہ ہی غمگین ہونا۔ فتح ونصرت اور غلبہ تمہارے ہی لیے ہے۔ اگر تمہارے کچھ لوگ زخمی اور شہید ہو گئے ہیں تو تمہارے دشمن بھی تو پہلے زخمی اور قتل ہو چکے ہیں۔ یعنی ہم کبھی دشمن کو کسی حکمت کی وجہ سے تم پر غالب کر دیتے ہیں

اگر چہ اچھا انجام تمہارے ہی حق ہوگا اور یہ وقتی شکست اس لیے ہوئی تا کہ ہم دشمن کے مقابلے میں صبر کرنے والوں کا امتحان لیں اور جو مدت سے شہادت کی آرزو کرتے تھے انہیں موقع دیں کہ وہ اپنی جان و مال ہماری راہ میں خرچ کریں یقیناً اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اس شکست کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کے گناہ معاف کرے اور نیکوکاروں کے درجات بلند کرے اور کافروں کو تباہ و برباد کرے کیونکہ وہ غالب ہو کر تکبر اور سرکشی میں مبتلا ہو جائیں گے یہی چیز ان کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔ پھر ارشاد فرمایا کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم مصائب و مشکلات کی آزمائش سے گزرے بغیر ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا (البقرہ:214) ''ترجمہ: کیا تم خیال کررہے ہو کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے لوگوں پر گزرے ہیں۔ انہیں سختی اور مصیبت پہنچی اور وہ لرزا اٹھے''۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (العنکبوت:2) ''ترجمہ: کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا''۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ...... یعنی ابتدا و آزمائش کے بغیر جنت میں داخلہ ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدین اور دشمن کے مقابلے میں صبر کرنے والوں کا امتحان لیتا ہے۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ: اے مومنو! تم آج سے پہلے دشمنوں کے ساتھ مقابلے کی تمنا کیا کرتے تھے اور ان کے مقابلے کے لیے سخت پریشان تھے۔ آج تمہاری تمنا پوری ہو چکی ہے۔ اور جو کچھ تم مطالبہ کیا کرتے تھے وہ تمہارے سامنے ہے آگے بڑھ کر دشمن کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ ''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن کے ساتھ مقابلے کی تمنا نہ کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو اور جب دشمن کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہو جائے تو ڈٹ جاؤ'' جان لو کہ جنت تلواروں کے سایے تلے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم نے موت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا'' یعنی تلواریں آپس ٹکرا رہی ہیں نیزے حرکت میں ہیں کیا خوب گھمسان کی جنگ جاری ہے۔ یہاں موت کو جو کہ غیر محسوس چیز ہے محسوس چیز کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ متکلمین اسے تخییل سے تعبیر کرتے ہیں یعنی غیر محسوس چیز کو محسوس خیال کرنا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع

''اور نہیں محمد ﷺ (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول۔ تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں پھر جاؤ گے تم اُلٹے پاؤں (دین اسلام سے) اور جو پھرتا ہے اُلٹے پاؤں تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو۔ اور نہیں ممکن کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے۔ لکھا ہوا ہے (موت کا) مقرر وقت اور جو شخص چاہتا ہے دنیا کا فائدہ ہم دیتے ہیں اس کو اس سے اور جو شخص چاہتا ہے آخرت کا فائدہ ہم دیتے ہیں اسے اس میں سے اور ہم جلدی اجر دیں گے اپنے شکر گزار بندوں کو۔ اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے سو نہ ہمت ہاری انہوں نے بوجہ ان تکلیفوں کے جو پہنچیں انہیں اللہ کی راہ میں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ انہوں نے ہار مانی اور اللہ تعالیٰ پیار کرتا ہے (تکلیفوں میں) صبر کرنے والوں سے۔ اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کیں ہم نے اپنے کام میں اور ثابت قدم رکھ ہمیں اور فتح دے ہم کو قوم کفار پر۔ تو دے دیا اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب (یعنی کامیابی) اور عمدہ ثواب آخرت کا (یعنی نعیم جنت اور لذتِ وصل) اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکو کاروں سے''۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ: جب غزوہ احد میں بہت صحابہ شہید ہوئے اور مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی تو شیطان نے مشہور کر دیا کہ محمد ﷺ بھی شہید ہو گئے۔ ابن قمیہ نے مشرکین کو کہا کہ میں نے محمد ﷺ کو قتل کر دیا ہے۔ حالانکہ اس نے آپ کے چہرے مبارک پر وار کر کے زخمی کیا تھا۔ اس افواہ کا بعض صحابہ پر گہرا اثر ہوا اور وہ یقین کر بیٹھے کہ واقعی حضور ﷺ شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے میدان جنگ سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ پہلے انبیاء کی طرح یہ بھی ایک نبی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میدان جنگ میں شہید کر دیے جائیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک مہاجر ایک انصاری کے پاس سے گزرا جو کہ خون میں لت پت تھا۔ اس نے اس انصاری سے کہا کیا تمہیں معلوم ہے کہ محمد شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس انصاری نے جواب دیا اگر آپ کو شہید کر دیا گیا تو پھر بھی آپ نے اپنے فرائض نبوت کو ادا کر دیا ہے تم بھی اپنے دین پر قربان ہو جاؤ۔ اسی کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اس افواہ سے مسلمانوں میں جو کمزوری پیدا ہوئی اس کو ناپسند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کیا محمد ﷺ انتقال کر گئے یا شہید ہو گئے تو تم خدا کے دین سے الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے گا جو اس کی اطاعت پر قائم رہے۔ اس کے دین کی حفاظت کے لیے دشمنوں سے برسر پیکار رہے۔ اور ہر حال میں اس کے رسول اللہ ﷺ کی اتباع۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ سنح کے مقام پر اپنی زمین پر تھے۔ آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ واپس تشریف لائے اور مسجد نبوی میں داخل ہوئے۔ اور لوگوں سے کسی قسم کی گفتگو کیے بغیر ہی حضرت عائشہ کے حجرہ میں چلے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ حضور کا چہرہ مبارک چادر سے ڈھکا ہوا ہے۔ آپ نے حضور ﷺ کے چہرہ مبارک سے چادر ہٹا کر بوسہ لیا اور روتے ہوئے فرمانے لگے کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ قسم بخدا اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا جو موت آپ کے لیے مقدر تھی وہ آ چکی ہے۔ پھر آپ مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو خطبہ دے رہے ہیں۔ آپ نے انہیں فرمایا اے عمر بیٹھ جاؤ پھر آپ نے لوگوں کو مخاطب ہو کر فرمایا ''جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد ﷺ انتقال فرما گئے ہیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ پھر آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ اس آیت کو پڑھنے لگا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ

میں نے جونہی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یہ آیت سنی ایسے محسوس ہوا کہ میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی حتی کہ میں زمین پر گر پڑا حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں فرمایا کرتے تھے۔ قسم بخدا اگر حضور ﷺ اس دنیا سے وصال فرما گئے یا شہید ہو گئے تو ہم بھی اس دین پر مر مٹیں گے۔ اللہ کی قسم میں آپ کا بھائی۔ ولی، چچازاد اور وارث ہوں اور مجھ سے زیادہ حضور ﷺ سے قرابتداری کا کون حق دار ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفۡسٍ: ہر شخص اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ مدت کو پورا کرنے کے بعد ہی مرتا ہے اور یہی ان دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ وَمَا يُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ ؕ (فاطر:11)'' ترجمہ: اور نہ کسی طویل العمر کو لمبی زندگی دی جاتی ہے اور نہ ہی کسی کی عمر کم کی جاتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ کتاب میں درج ہے''۔ دوسری آیت میں ہے: هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنۡدَهٗ (انعام:2)'' ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک میعاد مقرر کی اور اللہ کے نزدیک ایک میعاد مقرر ہے''۔ اس آیت کریمہ میں بزدل لوگوں کو شجاعت کی ترغیب اور خدا کی راہ میں جہاد کا شوق دلایا جا رہا ہے اور یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ آگے بڑھنے سے نہ عمر کم ہوتی ہے اور نہ پیچھے ہٹنے سے عمر بڑھتی ہے۔ حضرت حجر بن عدیؓ جب دشمنان اسلام کا مقابلہ کرتے ہوئے دریائے دجلہ پر پہنچتے ہیں اور لشکر اسلام دریا کی موجوں کو دیکھ کر ٹھہر جاتا ہے تو آپ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے اپنے گھوڑے کو دریا میں ڈال دیتے ہیں اور آپ کو دیکھ کر دوسرے مجاہدین بھی اپنے گھوڑوں سمیت دریا میں کود پڑتے ہیں یہ دیکھ کر ان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور خوفزدہ ہو کر کہہ اٹھتے ہیں دیوآ گئے، دیوآ گئے۔ یہاں تک کہ بھاگ جاتے ہیں۔

وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡيَا: جس کا عمل صرف دنیا کے لیے ہوگا تو اسے جو اس کے مقدر میں ہو مل جاتا ہے لیکن آخرت میں اسے کوئی حصہ نہیں ملتا اور جو آخرت کے لیے عمل کرتا ہے تو اسے آخرت مل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے دنیا بھی مل جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَةِ نَزِدۡ لَهٗ فِىۡ حَرۡثِهٖ ۚ (الشوریٰ:20) جو آخرت کی کھیتی کا طلبگار ہو تو ہم اسے عطا کر دیں گے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اور اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ (بنی اسرائیل:18)'' ترجمہ: اور جو صرف دینا کے طلب گار ہیں ہم اس دنیا میں جتنا چاہیں انہیں جلدی دے دیتے ہیں پھر ہم اس کے لیے جہنم مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ اس حال میں داخل ہوگا کہ وہ مذموم اور ٹھکرا ہوا ہوگا اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کے لیے پوری جدوجہد کرتا ہے درآنحالیکہ وہ مومن بھی ہوگا۔ پس یہ وہ خوش نصیب ہے جس کی کوشش مقبول ہوگی۔'' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم شکر اور صبر کرنے والوں کو دنیا و آخرت میں اپنے افضل واحسان سے نوازیں گے۔ پھر مسلمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ: اس کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم سے پہلے بھی بہت سے نبی اپنے اصحاب کی معیت میں دشمنوں کے ساتھ برسر پیکار رہے ہیں اس قول کو امام طبری نے اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ جن حضرات نے اسے قتل پڑھا ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ نبی اور اس کے بعض اصحاب کو قتل کر دیا گیا اور جو اصحاب باقی بچے وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ ان میں کسی قسم کی کمزوری اور ضعف کے آثار ظاہر نہیں ہوئے اور جنہوں نے قاتل پڑھا ہے ان کے نزدیک بھی آیت کا یہی مفہوم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے کمزوری اور ناتوانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ڈٹے رہے۔ اگر وہ سارے قتل ہو جاتے تو پھر اس قول کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ پھر طبری ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات سے ان لوگوں کو عتاب کیا ہے جنہوں نے حضور ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر ہتھیار پھینک دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل پر ملامت کرتے ہوئے فرمایا'' اے مومنو! کیا اگر محمد ﷺ انتقال

فرما گئے یا شہید ہو گئے تو تم اپنے دین سے پھر جاؤ گے۔ اس کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم سے پہلے بھی کئی انبیاء علیہم السلام کے سامنے ان کے اصحاب کو شہید کر دیا گیا۔ ابن اسحاق نے اس آیت کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ کئی انبیاء علیہ السلام کو ان کے اصحاب کی موجودگی میں شہید کر دیا گیا لیکن وہ اس کے بعد نہ تو کمزور ہوئے اور نہ ہی دشمن کے مقابلہ میں پسپائی اختیار کی بلکہ مصائب پر صبر کرتے ہوئے ڈٹ گئے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انہوں نے ''مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ'' کو (قاتل) میں ھو ضمیر سے حال بنایا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ ربیون سے مراد بہت بڑا گروہ ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں اس سے مراد صالح اور متقی علماء کا گروہ ہے۔ علامہ طبری نے نقل کیا ہے کہ ربیون سے مراد اپنے رب کی عبادت کرنے والے ہیں۔

فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: وہ اللہ کی راہ میں پہنچنے والی مصیبتوں سے نہ تو انہوں ہمت ہاری اور نہ ہی کمزور ہوئے اور نہ ہی دشمن کے مقابلے میں ہار مانی اور اللہ تعالیٰ مصائب صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ پس انہوں نے صرف یہی کہا اے اللہ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کاموں میں ہم سے جو زیادتیاں سرزد ہوئی ہیں انہیں بھی معاف فرما دے۔ ہمیں ثابت قدم رکھ اور کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت عطا فرما۔ پس اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں فتح و کامرانی عطا فرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ آخرت کا ثواب بھی عطا فرمایا اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿١٥٠﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٥٣﴾

''اے ایمان والو! اگر پیروی کرو گے تم کافروں کی تو وہ پھیر دیں گے تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) تو تم لوٹو گے نقصان اُٹھاتے ہوئے۔ بلکہ اللہ حامی ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔ ابھی ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس لیے کہ انہوں نے شریک بنا لیا اللہ کے ساتھ اس کو جس کے لیے نہیں اُتاری اللہ نے کوئی دلیل اور ان کا ٹھکانہ آتش (جہنم) ہے اور بہت بری جگہ ہے ظالموں کی۔ اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول ﷺ کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے۔ بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تا کہ آزمائے تمہیں اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم کو اور اللہ تعالیٰ بہت فضل

وکرم فرمانے والا ہے مومنوں پر۔ اور یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کو دیکھتے بھی نہ تھے کسی کو اور رسول کریم (ﷺ) بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے پس اللہ نے پہنچایا تمہیں غم کے بدلے غم تا کہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی ہے تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو"۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا: ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو کفار اور منافقین کی پیروی سے منع فرماتا ہے کیونکہ ان کی پیروی دینا وآخرت کی ہلاکت کا باعث ہے اس لیے ارشاد فرمایا کہ اگر تم ان کی پیروی کرو گے وہ تم کو الٹے پاؤں کفر کی طرف پھیر دیں گے اور اس طرح تم نقصان اٹھاؤ گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ اسی کی اطاعت اور دوستی کا دم بھریں، اسی سے مدد طلب کریں اور اسی پر بھروسہ کریں۔ فرمایا" بلکہ تمہارا حامی ہے اور وہ بہتر مدد فرمانے والا ہے" پھر ان کو خوشخبری دی کہ وہ ان کے دشمنوں کے دلوں میں خوف ڈال دے گا اور ان کے کفر وشرک کے سبب انہیں اس دنیا میں ذلیل ورسوا کرے گا اور آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ امور ایسے عطا کیے گئے ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے۔ 1۔ ایک ماہ کی مسافت تک مجھے رعب ودبدبے سے نوازا گیا ہے، 2۔ میرے لیے زمین کو مسجد اور پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے یعنی جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے میرے امتی کے لیے وہی جگہ مسجد اور طہارت کا ذریعہ ہے۔ 3۔ میرے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا گیا ہے خواہ وہ ایک ماہ کی مسافت پر ہوں۔ 4۔ مال غنیمت کو میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔" حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال اللہ تعالیٰ میری نصرت فرمائی۔ دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں 1۔ مجھے ہر سرخ سیاہ میں مبعوث کی گیا ہے، 2۔ زمین کو میرے لیے پاکیزگی کا ذریعہ اور مسجد بنا دیا گیا ہے۔ 3۔ میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ مجھ سے پہلے کسی نبی پر حلال نہیں تھا۔ 4۔ ایک ماہ کی مسافت تک مجھے میری رعب ودبدبے سے مدد کی گئی ہے۔ 5۔ مجھے شفاعت سے نوازا گیا ہے۔ تمام انبیاء علیہ السلام نے اپنی شفاعت اللہ سے طلب کر لی، میں نے اپنی شفاعت اپنے ان امتیوں کے لیے چھپا رکھی ہے کہ جن کو اس حال میں موت آئی کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا اس لیے وہ غزوۂ احد کے بعد مکہ کی طرف دوڑ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان نے غزوۂ احد میں تمہیں نقصان پہنچا کر مدینے کی طرف آنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ فتح ونصرت کا وعدہ فرمایا۔ اس آیت کریمہ سے یہ بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ یہ وعدہ احد کے دن کا تھا۔ کیونکہ اس وقت دشمن کی تعداد تین ہزار تھی تاہم مقابلہ پر آتے ہی ان کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں کو فتح وکامرانی حاصل ہوگئی مگر بعد میں تیر اندازوں کی حکم عدولی اور بعض مجاہدوں کی پست ہمتی کی وجہ سے فتح ونصرت کا وہ وعدہ جو ثابت قدمی اور عزم واستقلال پر موقوف تھا مؤخر کر دیا گیا اس لیے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو ابتداء میں پورا کر دیا جبکہ تم کافروں کو قتل کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ جب تم نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور آپس میں جھگڑنے لگے اور تم نے حضور ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نصرت وکامرانی عطا فرمائی تھی جیسے تم پسند کرتے ہو۔ تم میں سے بعض دنیا کو پسند کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جو صرف مال غنیمت میں رغبت رکھتے ہیں اور بعض آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس خطا کو معاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ مشرکین کی کثرت اور مومنین کی قلت کو بخوبی جانتا ہے۔ علامہ ابن جریر طبری کا قول ہے کہ وَلَقَدْ عَفَا

عَنْكُمْ ؕ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نیست ونابود نہیں کیا۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح غزدہٴ احد میں اپنے نبی کی مدد کی ہے اس طرح کسی اور غزوہ میں مدد نہیں کی ہے۔لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب فیصل اور حکم ہے۔اللہ تعالیٰ غزدہٴ احد کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔تم اس کے حکم سے انہیں قتل کرنے لگے حتیٰ کہ جب تم بزدل ہوگئے اور حضور ﷺ کے حکم بارے میں جھگڑنے لگے اور ان کے حکم کی نافرمانی کی۔اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وہ کچھ دکھا دیا تھا جو تم پسند کرتے تھے نافرمانی کرنے والوں سے مراد وہ تیرانداز ہیں جن کو حضور ﷺ نے ایک گھاٹی پر متعین فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ یہاں پیچھے سے آنے والے دشمن کا خیال رکھنا اور اگر ہم شکست سے دوچار ہو گئے تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔اگر تم ہمیں مال غنیمت بھی اکٹھا کرتے دیکھو تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔پھر جب مسلمان مشرکین کو شکست دینے کے بعد مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے تو وہ تیرانداز بھی مجاہدین میں شامل ہوگئے۔صفیں درہم برہم ہوگئیں جبکہ کفار نے درے کو خالی پایا تو کچھ گھوڑسواروں نے وہاں سے داخل ہوکر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کردیا۔اس اچانک حملہ سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے ابتداء میں اہل اسلام کا پلڑا بھاری رہا حتیٰ کہ مشرکین کے نوعلمبردار قتل ہوئے اور پھر جب مشرکین نے پیچھے سے حملہ کیا تو ان کا پلڑا بھاری ہوگیا۔شیطان نے مشہور کردیا کہ حضور ﷺ شہید ہوگئے،مسلمانوں نے اس افواہ پر یقین کرلیا تھوڑی دیر بعد جب ان کی نگاہیں روئے مبارک پر پڑیں تو انہیں سب تکالیف بھول گئیں اور وہ خوشی سے رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھے۔آپ ارشاد فرمارہے تھے کہ

اس قوم پر اللہ کا غضب ہو جس نے اس کے رسول کا چہرہ خون سے آلود کردیا تھا پھر آپ نے فرمایا کہ وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے۔اسی اثناء میں ابوسفیان نے پہاڑ کے دامن سے باآواز بلند اُعْلُ هُبُلْ کہا (ہبل کا بول بالا ہو) اور کہنے لگا ''محمد (ﷺ) کہاں ہیں۔ابن ابی قحافہ اور ابن خطاب کہاں ہیں۔حضرت عمرؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا میں اسے جواب نہ دوں۔آپ نے فرمایا کیوں نہیں ضرور جواب دوں۔دونوں نے اس کے جواب میں کہا: اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ (اللہ تعالیٰ بلندوبالا اور عظمت والا ہے)۔ابوسفیان نے کہا ابن ابی قحافہ،اور ابن خطاب کہاں ہیں۔حضرت عمرؓ نے جواب دیا یہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر ہیں اور میں عمر ہوں۔اس نے کہا کہ یہ جنگ بدر کا بدلہ ہے، گردش دوراں اسی طرح جاری رہتی ہے اور جنگ کنوایں کے ڈول کی مانند ہوتی ہے۔حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ مومن اور کافر میں برابری نہیں ہوسکتی۔ہمارے شہداء جنت میں ہیں اور تمہارے مقتول جہنم میں ہیں۔ابوسفیان نے کہا اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے تو واقعی ہم گھاٹے میں ہیں پھر کہنے لگا تمہارے مقتولوں میں سے بعض کے ناک اور کان کٹے ہوئے ہوں گے لیکن یہ ہمارے سرداروں کے حکم سے نہیں ہوا لیکن ہم اس کو ناپسند بھی نہیں کرتے۔'' یہ حدیث غریب ہے اور اس سیاق مضمون عجیب ہے،یہ حضرت ابن عباسؓ کی مرسلات میں سے ہے۔جنگ احد میں نہ تو وہ خود حاضر تھے اور نہ ان کے والد گرامی۔حاکم نے اسے مستدرک میں روایت کیا ہے اور دوسری صحیح حدیثوں میں سے اس کے شواھد ملتے ہیں۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ غزدہٴ احد میں عورتیں صفوں کے پیچھے زخمی مسلمانوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔اس دن ہم میں سے کوئی بھی طالب دنیا نہیں تھا اگر میں اس بات پر قسم کھاؤں تو سچا ہوں گا۔حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا...... یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے حضور ﷺ کی حکم عدولی کی اور درہ چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے کی طرف لپکے۔جب کفار نے پلٹ کر یکبارگی سے حملہ کیا تو حضور ﷺ کے ساتھ صرف سات انصاری اور دو مہاجر صحابہ باقی رہ گئے۔جب مشرکین نے حضور ﷺ کو گھیر لیا تو آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو انہیں پیچھے ہٹائے۔ایک انصاری اٹھے

اور مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور پھر جب مشرکین نے آپ کا گھیرا تنگ کی تو آپ نے یہی ارشاد فرمایا۔ اسی طرح تمام انصاری صحابہ یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ حضور ﷺ نے مہاجرین سے فرمایا کہ تم نے اپنے ساتھیوں سے انصاف نہیں کیا، پھر ابوسفیان نے بلند آواز سے کہا "أُعْلُ هُبَلُ" آپ نے فرمایا اسے جواب دو "اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلّ"۔ اس نے جواباً کہا: "لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ" ہمارے پاس عزیٰ بت ہے اور تمہارے لیے کوئی عزیٰ نہیں۔ آپ نے فرمایا اسے جواب دو "اَللّٰهُ مَوْلٰنَا وَالْكَافِرُوْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ" اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا کہ یہ جنگ بدر کا بدلہ ہے اور پھر کہنے لگا ہم نے فلاں کے بدلے میں فلاں کو قتل کر دیا۔ آپ نے فرمایا یہ برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمارے شہدا زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہارے مقتول جہنم میں ہیں اور عذاب میں مبتلا ہیں۔ پھر ابوسفیان نے کہا کہ اگر تمہارے مقتولوں میں سے بعض کا مثلہ کیا گیا ہو تو میں نے اس کا حکم دیا ہے نہ روکا، اسے پسند کیا نہ ناپسند، اس چیز نے مجھے خوش کیا نہ افسردہ۔ صحابہ کرام نے دیکھا کہ حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر دیا گیا ہے۔ ہندہ نے ان کے جگر کو چبایا لیکن نگل نہ سکی۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا اس نے حمزہؓ کے گوشت کا کوئی حصہ کھایا۔ انہوں نے عرض کی نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حمزہؓ کے کسی عضو بدن کو جہنم میں لے جانا نہیں چاہتا۔ پھر آپ نے حضرت حمزہؓ کی نماز جنازہ ادا کی۔ پھر ایک انصاری کا جنازہ لایا گیا پھر اسے حضرت حمزہ کے پہلو میں رکھا گیا اور آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی، پھر انصاری کا جنازہ اٹھالیا گیا لیکن حضرت حمزہؓ کا جنازہ وہیں رہا۔ اس طرح ستر افراد کے جنازے لائے گئے اور حضرت حمزہ کی ستر مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ صحیح بخاری میں حضرت براءؓ سے مروی ہے کہ جنگ احد کے دن جب ہم مشرکین کے مقابلہ کے لیے نکلے تو نبی کریم ﷺ نے تیراندازوں کا ایک دستہ ایک پہاڑی درے پر مقرر فرمایا اور حضرت عبداللہ بن زبیر کو ان کا امیر بنایا اور انہیں حکم فرمایا کہ تم نے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا خواہ ہم ان پر غالب آ گئے یا وہ ہم پر غالب آ گئے پس مسلمان جنگ میں غالب آ گئے حتیٰ کہ مشرکین کی عورتیں بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر پہاڑی درے پر مقرر تیرانداز آپس میں کہنے لگے آؤ ہم بھی مال غنیمت اکٹھا کریں۔ ان کے امیر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا کہ حضور ﷺ نے ہمیں یہاں سے نہ ہٹنے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور مال غنیمت اکٹھا کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ کفر نے اچانک حملہ کر کے ستر مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ابوسفیان ایک ٹیلے پر چڑھ کر پکارنے لگا کیا تم لوگوں میں محمد (ﷺ) ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دینے سے منع فرما دیا۔ اس نے کہا کیا تم میں ابوبکر ہے؟ آپ نے جواب دینے سے منع فرمایا۔ اس نے پوچھا کیا تم میں عمر ہے؟ جواب نہ ملنے پر کہنے لگا کیا یہ سب لوگ جنگ میں کام آ گئے ہیں اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ یہ بات سن کر حضرت عمرؓ کو چارہ ضبط نہ رہا اور فرمایا اے اللہ کے دشمن تو جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تجھے رسوا کرنے کے لیے باقی رکھا ہے۔ ابوسفیان نے کہا ہبل بلند و بالا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کہو کہ اللہ بزرگ و برتر اور عظمت والا ہے۔ پھر صحابہ اور ابوسفیان کے درمیان وہی مکالمہ ہوا جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جنگ احد میں مشرکین کو جب شکست ہوئی تو شیطان نے نداء دی اے اللہ کے بندو! پچھلی صفوں کی خبر لو۔ یہ نداسن کر اگلی صفیں پیچھے کو لوٹیں۔ حضرت حذیفہؓ نے دیکھا کہ ان کے والد حضرت یمانؓ مسلمانوں کی تلواروں کی زد میں ہیں۔ وہ پکارتے رہے اے اللہ کے بندو! یہ میرے والد یمان ہیں مگر کسی نے ان کی نہ سنی اور اسی بھگدڑ میں ان کے والد کو شہید کر دیا گیا۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہ میں یہ بھلائی آخری دم تک رہی۔ سیرت ابن اسحٰق میں ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے خود ہندہ اور اس کی ساتھی عورتوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا اور جب دشمن پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا تو پہاڑی ٹیلے پر متعین تیرانداز بھی مجاہدین کے ساتھ مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو گئے اور اس اہم چوکی کو خالی

چھوڑ دیا اس طرح دشمن نے پیچھے سے اچانک حملہ کر دیا۔ کسی نے آواز لگائی کہ محمد (ﷺ) شہید ہو گئے۔ پھر معاملہ الٹ ہو گیا۔ حالانکہ ہم پہلے مشرکین کے علمبردار تک پہنچ گئے تھے اور جھنڈا اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا لیکن عمرہ بنت علقمہ بن حارثہ نے اسے تھام لیا اور مشرکین کے حوالے کر دیا۔

ثُمَّ صَرَفَكُمْ: حضرت انس بن نضرؓ حضرت عمر بن خطابؓ، طلحہ بن عبیدہ اور دوسرے مہاجرین وانصار کے پاس آئے جنھوں نے ہتھیار پھینک دیئے تھے اور پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ شہادت رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے۔ انہوں نے کہا کہ تم ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ جس مقصد کے لیے انہوں نے جان قربان کی اس کے لیے تم بھی قربان ہو جاؤ۔ پھر وہ مشرکین کی صفوں کی طرف بڑھے اور جوانمردی سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ کسی وجہ سے جنگ بدر میں حاضر نہیں ہو سکے تھے۔ انہوں نے اللہ سے عہد کر رکھا تھا کہ اگر مجھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی جنگ میں حاضر ہونے کا موقع حاصل ہوا تو میں دلیری سے لڑوں گا۔ چنانچہ وہ اس جنگ میں شریک ہوئے اور جب مسلمانوں میں کھلبلی مچی تو کہنے لگے اے خدا میں مسلمانوں کے اس عمل سے معذرت کرتا ہوں۔ جو کچھ مشرکین نے کیا ہے اس سے بری ہوں پھر تلوار لے کر آگے بڑھے، راستے میں سعد بن معاذؓ سے ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے فرمایا مجھے احد پہاڑ سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے پھر جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور آپ کو اسی سے زیادہ تلوار اور نیزے کے زخم آئے حتیٰ کہ آپ کی بہن نے آپ کی انگلی کے پوروں کو دیکھ کر آپ کی شناخت کی۔ ایک آدمی حج کے لیے آیا۔ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے متعلق پوچھا یہ کون ہیں بتایا گیا کہ یہ قریشی ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ ان کے درمیان یہ بزرگ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ وہ شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں آپ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا پوچھو اس نے کہا میں تمہیں اللہ کے گھر کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کیا جنگ احد میں حضرت عثمانؓ بھاگ گئے تھے۔ آپ نے جواب دیا ہاں۔ اس نے پھر پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان جنگ بدر میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر اس نے پوچھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بیعت رضوان میں شرکت نہیں کی آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ جوابات سن کر اس شخص نے نعرہ تکبیر بلند کیا تو حضرت عبداللہؓ نے اس شخص سے کہا کہ آؤ میں تمہارے سامنے ان سوالوں کی وضاحت کرتا ہوں۔ جہاں تک جنگ احد میں حضرت عثمان کے فرار ہونے کا تعلق ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہے، رہا جنگ بدر میں غیر حاضری کا مسئلہ تو آپ کے گھر میں حضور ﷺ کی بیٹی سخت بیمار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود حکم فرمایا تھا کہ تم مدینہ میں ہی رہو، تمہیں اللہ تعالیٰ جنگ بدر میں حاضر ہونے کا اجر عطا فرمائے گا۔ اور بیعت رضوان کے موقع پر حضور ﷺ نے آپ کو اہل مکہ کی جانب سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ کیونکہ اہل مکہ میں جو عزت آپ کو حاصل تھی وہ کسی کو حاصل نہ تھی۔ آپ کے مکہ شریف جانے کے بعد اور بیعت رضوان کا واقعہ پیش آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا دایاں دست مبارک بلند کر کے فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے پھر بائیں ہاتھ پر رکھا اور بیعت کی۔

إِذْ تُصْعِدُونَ: جب تم اپنے دشمن سے ڈر کر پہاڑ پر چڑھ رہے تھے اور خوف ودہشت کی وجہ سے کسی اور سمت کی طرف متوجہ نہ ہوئے حتیٰ کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کو وہیں چھوڑ دیا۔ وہ تمہیں پکار رہے تھے کہ دشمن سے نہ ڈرو واپس لوٹ آؤ۔ حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ مشرکین کے اچانک بھرپور حملے سے مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے ان میں بعض مدینہ کی طرف نکل آئے اور بعض پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تو حضور ﷺ انہیں اپنی طرف بلانے لگے اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ۔ مشہور مشرک شاعر عبداللہ بن زبعری نے اس واقعہ کو اپنے قصیدے میں نظم کیا ہے۔ ''اے جدائی کی آواز لگانے والے کوے! اپنی بات سناؤ تو جو کچھ کہتا ہے ہو کر رہتا ہے خیر وشر ہر چیز کی ایک انتہاء

ہے اور ان دونوں کا انجام ایک نہ ایک دن مستقبل میں آنے والا ہے۔ کاش ہمارے بزرگ میدان بدر میں اہل خزرج کے اس جزع وفزع کو دیکھتے جو نیزہ لگنے سے کر رہے تھے۔ جب قبا میں ان کے اونٹ زمین سے سینہ لگا کر بیٹھ گئے تھے اور بنو عبد الاشہل میں قتل سرگرمی سے ہونے لگا تھا۔ پھر یہ لوگ ایسے ناچتے ہوئے بڑی تیزی سے بھاگ رہے تھے جیسے پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے شتر مرغ ناچتے ہیں۔ ہم نے ان کے دوگنا اشراف قتل کر دیے اور جنگ بدر کے نقصان کو پورا کر دیا۔'' جنگ احد کا یہ مکمل واقعہ امام احمد نے بھی براء بن عازب سے روایت کیا ہے۔ دلائل نبوت میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ احد کے دن جب مشرکین کے اچانک حملے سے مسلمان منتشر ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف گیارہ افراد باقی تھے جن میں ایک حضرت طلحہ بن عبید اللہ تھے۔ حضور ﷺ پہاڑ پر چڑھنے لگے مشرکین نے پیچھے سے حملہ کر دیا آپ نے فرمایا کوئی ہے جو ان سے مقابلہ کرے۔ حضرت طلحہؓ نے آپ کی آواز پر لبیک کہا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم ابھی ٹھہرو۔ اسی اثناء میں ایک انصاری صحابی مقابلے کے لیے تیار ہوئے اور دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے۔ ابھی حضور ﷺ اور آپ کے باقی ساتھی کچھ بلندی چڑھے ہی تھے کہ وہ انصاری صحابی شہید ہو گئے۔ مشرکین پھر آپ ﷺ کی طرف لپکے تو آپ نے فرمایا کون ہے جو ان کے ساتھ مقابلہ کرے۔ حضرت طلحہ نے پھر لبیک کہا لیکن آپ نے پھر انہیں روک دیا۔ ایک اور انصاری صحابی مقابلے کے لیے تیار ہو گئے اس طرح ایک ایک کر کے تمام انصار شہید ہو گئے تو حضرت طلحہ آگے بڑھے اور خوب جم کر مقابلہ کیا حتیٰ کہ آپ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ سخت تکلیف کی وجہ سے آپ کی زبان سے آہ نکل گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم بسم اللہ پڑھ لیتے یا اللہ کا نام لے لیتے تو فرشتے تمہیں اٹھا لیتے اور لوگوں کے سامنے آسمان کی بلندیوں پر لے جاتے۔ اس کے بعد حضور ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور دوسرے صحابہ بھی آپ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ حضرت قیس بن حازمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت طلحہؓ کا وہ ہاتھ دیکھا تھا جو حضور ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے شل ہو گیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ احد والے دن اپنے ترکش کے تمام تیر مجھے عطا فرما دیے اور فرمایا تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں مشرکین پر تیر مارو۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ مجھے اپنے دست مبارک سے تیر پکڑاتے اور انہیں مشرکین کو مارتا۔ حتیٰ کہ آپ بغیر پھل والے تیر بھی دیتے تو میں وہ بھی چلا دیتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اس دن سفید لباس میں ملبوس دو آدمیوں کو رسول اللہ ﷺ کے دائیں اور بائیں سخت جنگ کرتے ہوئے دیکھا۔ ان کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ دونوں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ اس دن حضور ﷺ کے ساتھ سات انصاری اور دو مہاجر تھے۔ جب مشرکین حملے کے لیے آگے بڑھتے تو آپ فرماتے جو ان کو روکے گا اس کے لیے جنت ہے اور جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ وہ تمام انصاری صحابی یکے بعد دیگر شہید ہو گئے۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ فرماتے ہیں کہ ابی بن خلف نے مکہ میں یہ قسم اٹھائی تھی کہ وہ محمد (ﷺ) کو ضرور قتل کرے گا۔ جب آپ کو اس کی قسم کی خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا بلکہ ان شاء اللہ میں اسے قتل کروں گا۔ جنگ احد کے دن وہ سرتاپا آہنی زرہ میں غرق تھا۔ حضور ﷺ کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا کہ آج محمد (ﷺ) بچ گئے تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ اور آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے آپ پر حملہ کر دیا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے آگے بڑھ کر اس کا وار روکا اور شہید ہو گئے۔ حضور ﷺ نے اس کی طرف دیکھا کہ اس کا سارا جسم لوہے میں چھپا ہوا ہے صرف ذرا سی پیشانی نظر آ رہی تھی۔ آپ نے تاک کر نیزہ لگایا جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگا جس کی وجہ سے وہ زمین پر گر گیا۔ گو اس سے خون تو نہ نکلا لیکن وہ زور زور سے بلبلانے لگا۔ اس کے ساتھی اسے اٹھا کر لے گئے اور تسلی دینے لگے کہ کیوں گھبراتے ہو یہ معمولی سی خراش ہے۔ اس نے انہیں بتایا کہ محمد (ﷺ) نے کہا تھا کہ میں ابی کو قتل کروں گا۔ پھر کہنے لگا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تمام اہل حجاز کو یہ خراش لگتی تو وہ اس کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے۔ پھر اسی زخم سے مر کر جہنم رسید

ہوا۔ سیرت ابن اسحاق میں ہے: جب رسول اللہ ﷺ احد پہاڑ کی گھاٹی میں چند صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے تو ابی بن خلف ادھر آ نکلا اور آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا میں ہلاک ہو جاؤں گا اگر آپ بچ گئے۔ صحابہ کرامؓ نے اس پر وار کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے انہیں روک دیا۔ جب وہ قریب ہوا تو آپ نے حضرت حارث بن صمہ سے نیزہ لے کر اس پر وار کر دیا۔ حضور ﷺ کے ہاتھ میں نیزہ دیکھتے ہی وہ کپکپانے لگا۔ آپ نے اس پر نیزے کا وار کیا جس کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ بطن راغب میں اس کافر کو موت آئی میں ایک مرتبہ رات کے پچھلے حصے میں گزرا میں نے ایک جگہ سے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کو دیکھا اور دیکھا کہ ایک شخص کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس آگ میں گھسیٹا جا رہا ہے، اسے سخت پیاس لگی ہے۔ ایک دوسرا شخص کہہ رہا ہے اسے پانی نہ دینا یہ وہ ابی بن خلف ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے قتل کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دندان مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ان لوگوں پر اللہ کا سخت ترین غضب ہو جنہوں نے اپنے رسول سے یہ سلوک کیا اور اس پر بھی سخت ترین غضب ہو جسے اللہ کا رسول خدا کی راہ میں قتل کر دے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا سخت غضب اس قوم پر ہو جنہوں نے اپنے رسول کے چہرے کو خون آلود کیا۔ ابن اسحاق کا قول ہے کہ غزوۂ احد میں حضور ﷺ کے چار دندان مبارک شہید ہو گئے۔ آپ کے رخساروں اور ہونٹ پر بھی زخم آیا تھا۔ حضرت سعد ابن وقاصؓ فرماتے ہیں میں عتبہ بن ابی وقاص کے قتل سے زیادہ کسی اور کے قتل پر حریص نہیں تھا۔ اگرچہ وہ بد اخلاق اور اپنی قوم میں مبغوض تھا لیکن میرے لیے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کا اس پر شدید غضب ہو جس نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے کو زخمی کیا۔ جب اس نے آپ کے دندان مبارک کو شہید کیا تو آپ نے اس کے لیے بددعا کی کہ اے باری تعالیٰ یہ کفر کی حالت میں ایک سال کے اندر ہلاک ہو جائے۔ چنانچہ اس کا یہی انجام ہوا کہ وہ ایک سال سے پہلے واصل جہنم ہو گیا۔ ایک مہاجر صحابیؓ کا بیان ہے کہ احد کے دن حضور ﷺ پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن خدا کی قدرت اور رحمت سے آپ ان سے محفوظ رہے۔ ابی بن خلف نے قسم کھا کر کہا مجھے بتاؤ محمد (ﷺ) کہاں ہیں اگر وہ بچ گئے تو میں ہلاک ہو جاؤں گا حالانکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ جب واپس نامراد لوٹا تو صفوان نے اس پر طعنہ زنی کی اس نے کہا میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے انہیں نہیں دیکھا وہ اللہ کی حفظ و امان میں ہیں۔ ہم چار افراد نے ان کے قتل کا پختہ ارادہ کیا تھا اور آپس میں عہد و پیمان کیے لیکن انتہائی کوشش کے باوجود کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ واقدی کا کہنا ہے کہ ہمارے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ آپ کے رخسار مبارک کو زخمی کرنے والا شخص ابن قمیہ تھا۔ اور جس نے دندان مبارک کو شہید کیا وہ عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے والد گرامی حضرت ابوبکرؓ جب بھی غزوۂ احد کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ وہ دن تو تھا ہی طلحہ کا جب میں سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ کر آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے بڑی دلیری سے لڑ رہا ہے۔ میں نے کہا خدا کرے یہ طلحہ ہو۔ جب میں نے قریب آ کر دیکھا تو وہ طلحہ ہی تھے۔ میں نے کہا میرے لیے یہ زیادہ محبوب ہے کہ میری قوم کا کوئی فرد رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرے۔ میں نے اپنے اور مشرکین کے درمیان ایک اور شخص کو بے جگری سے لڑتے ہوئے دیکھا جسے میں نہ پہچان سکا کیونکہ میں حضور ﷺ کے زیادہ قریب تھا۔ جب میں نے غور سے دیکھا کہ تو وہ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے چہرے مبارک کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے دندان مبارک شہید اور چہرہ زخمی ہے۔ اور خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں دھنس ہوئی ہیں۔ میں آپ کی طرف آگے بڑھا تو آپ نے فرمایا طلحہ کی خبر لو۔ آپ ﷺ کا خون جاری تھا میں آگے بڑھ کر آپ کے چہرے مبارک سے خود کی کڑیاں نکالنے لگا تو حضرت ابو عبیدہؓ نے قسم دے کر مجھے روک دیا اور خود کڑیاں

نکالنے کے لیے قریب آئے لیکن انہوں نے سوچا کہ ہاتھ سے کڑیاں نکالنے سے حضور ﷺ کو تکلیف ہوگی۔ لہٰذا اپنے دانتوں سے کھینچ کر ایک کڑی نکالی۔ لیکن اس میں ان کا بھی ایک دانت ٹوٹ گیا۔ میں نے چاہا کہ دوسری کڑی میں نکال لوں۔ لیکن ابوعبیدہؓ نے قسم دے کر مجھے پھر روک دیا۔ انہوں نے خود دوسری کڑی نکالی۔ اس بار بھی ان کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد ہم حضرت طلحہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ انہیں ستر سے زیادہ چھوٹے بڑے زخم لگے ہیں۔ ان کی انگلیاں کٹ چکی ہیں۔ ہم نے ان کے حال کی خبر لی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کے والد نے رسول اللہ ﷺ کے زخم کا خون چوس کر اسے صاف کیا۔ انہیں کہا گیا اس خون کی کلی کر دو۔ لیکن انہوں نے قسم بخدا میں اس کی کلی نہیں کروں گا۔ پھر میدان جنگ کی طرف چلے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ انہیں دیکھ لے۔ انہوں نے اسی غزوہ میں شہادت پائی۔ حضرت سہل بن سعدؓ سے رسول اللہ ﷺ کے زخمی ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا آپ ﷺ کا چہرہ زخمی، دندان مبارک شہید اور خود کی کڑیاں آپ کے چہرہ مبارک میں دھنس گئیں۔ حضرت فاطمہؓ خون کو دھو رہی تھیں اور حضرت علیؓ ڈھال سے پانی ڈال رہے تھے۔ پھر حضرت فاطمہؓ نے جب دیکھا کہ پانی ڈالنے کی وجہ سے خون زیادہ بہہ رہا ہے تو آپ نے چٹائی کے ایک ٹکڑے کو جلا کر راکھ بنایا اور اسے زخم پر لگایا جس سے خون بہنا بند ہو گیا۔

فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ: پھر اللہ کی طرف سے تمہیں غم پہ غم پہنچا۔ یہاں باء علی کے معنی میں ہے۔ جیسے فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (طٰہٰ:71) میں فی علی کے معنی میں ہے۔ پہلا غم شکست و ہزیمت اور حضور ﷺ کے شہید ہونے کی افواہ اور دوسرا غم مشرکین کا پہاڑ کے اوپر غالب آنے کا۔ اس وقت حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اے اللہ ان کے لئے یہ لائق نہیں کہ وہ ہم پر غالب آئیں۔'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ پہلا غم شکست و ہزیمت کا تھا اور دوسرا حضور ﷺ کی شہادت کی افواہ اور یہ مسلمانوں کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ سخت تھا۔ سدی فرماتے ہیں کہ پہلا غم مال غنیمت اور فتح نصرت کے چھن جانے کا تھا اور دوسرا کافروں کے مسلمانوں پر غالب آنے کا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ تمہیں ایک تکلیف کے بعد دوسری تکلیف پہنچی یعنی تمہارے مسلمان بھائی شہید ہو گئے۔ تمہارے دشمن تم پر غالب آ گئے اور حضور ﷺ کی شہادت کی افواہ نے بھی تمہیں سخت تکلیف پہنچائی۔ یہ تمام غم پے در پے آئے تھے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں پہلے غم سے مراد حضور ﷺ کی شہادت کی افواہ ہے اور دوسرا مسلمانوں کا شہید اور زخمی ہونا۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں ان اقوال میں سب سے بہتر قول یہ ہے کہ مسلمان مشرکین کے مال غنیمت اور ان پر فتح و نصرت سے محروم ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرکین کے اچانک حملے سے بہت مسلمان شہید اور زخمی ہوئے حالانکہ اللہ تعالیٰ پہلے انہیں فتح و نصرت سے نواز دیا تھا اور یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حکم عدولی کی وجہ سے ہوا۔ اور ایک غم حضور ﷺ کی شہادت کی افواہ کا بھی تھا۔ پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''سب کچھ اس لیے ہوا تاکہ تم اس فتح و نصرت کے چھن جانے اور زخموں سے چور چور ہونے پر غم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بخوبی باخبر ہے''۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ

قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

''پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر غم واندوہ کے بعد راحت (یعنی) غنودگی جو چھارہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے اور ایک جماعت ایسی تھی جسے فکر پڑا ہوا تھا (صرف) اپنی جانوں کا بدگمانی کررہے تھے اللہ کے ساتھ بلاوجہ عہد جاہلیت کی بدگمانی کہتے کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے آپ فرمایئے اختیار تو سارا اللہ کا ہے چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر۔ کہتے ہیں (اپنے دلوں میں) اگر ہوتا ہمارا اس کام میں کچھ دخل تو نہ مارے جاتے ہم یہاں (اس بے دردی سے) آپ فرمایئے اگر تم (بیٹھے) ہوتے اپنے گھروں میں تو ضرور نکل آتے (وہاں سے) وہ لوگ، لکھا جاچکا تھا جن کا قتل ہونا اپنی قتل گاہوں کی طرف (یہ سارے مصائب اس لیے تھے) تاکہ آزمالے اللہ تعالیٰ جو کچھ تمہارے سینوں میں (چھپا) تھا اور صاف کردے جو (میل کچیل) تمہارے دلوں میں تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا سینوں کے رازوں کا بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم سے اس روز جب مقابلے میں نکلے تھے دونوں لشکر تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بے شک (اب) معاف فرمادیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے''۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس احسان کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے اس رنج وغم کے عالم میں اپنے بندوں پر کیا۔ یعنی ان پر اونگھ طاری کردی حالانکہ دشمن ان کے سامنے ہے۔ ان حالات میں اونگھ کا طاری ہونا امن کی علامت ہے۔ جیسا کہ سورۂ انفال میں واقعہ بدر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ (انفال: 11) ''ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن بصورت اونگھ نازل ہوا''۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جنگ میں اونگھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور نماز میں شیطان کے فعل سے۔ حضرت ابوطلحہؓ فرماتے ہیں احد کے دن مجھے اس زور سے نیند آنے لگی کہ میری تلوار کئی بار ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔ میں اسے ہر بار اٹھالیتا۔ ایک روایت میں فرماتے ہیں کہ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو تمام مجاہدین کی گردنیں نیند کی وجہ سے جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے برعکس منافقین کے گروہ کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ یہ لوگ انتہائی بزدل اور خوفزدہ تھے۔ اس لیے اہل حق کو چھوڑ گئے۔ قتادہ کا قول ہے کہ اہل ایمان و یقین، اللہ کی راہ ثابت قدم رہنے والے اور اس پر کامل بھروسہ کرنے والوں کو یہ یقین تھا کہ خدا تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی ضرور مدد کرے گا اور اس کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو ضرور پورا کرے گا۔ اس لیے ان پر تو اونگھ طاری ہوگئی لیکن اس کے برعکس دوسرے گروہ پر اضطراب و پریشانی اور خوف کی وجہ سے اونگھ طاری نہ ہوئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناحق بدگمانیاں کرنے لگے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا (الفتح: 12) ''ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ تم نے خیال کر لیا تھا کہ پیغمبر اور مومنین اپنے اہل خانہ کی طرف ہرگز نہیں لوٹیں گے''۔ اسی طرح ان لوگوں نے یہ یقین کرلیا کہ مشرکین اہل اسلام پر غالب آجائیں گے اور اسلام ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔ اہل نفاق اور اہل شک کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ کے بارے میں قسم قسم کی بدگمانیوں کا اظہار کرنے لگ جاتے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ وہ اس حالت میں کہتے ہیں کہ

ہمیں بھی کچھ اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے رسول انہیں فرما دیجئے کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے یعنی وہ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اگر ہم کو کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں اس طرح قتل نہ ہوتے۔ حضرت زبیر بن عوامؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا جب خوف سخت ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ہم پر نیند طاری کر دی اس نیند کی وجہ سے ہم میں سے ہر ایک کی ٹھوڑی سینے کے ساتھ لگنے لگی۔ میں نے اس حالت میں معتب بن قشیر کے یہ الفاظ سنے کہ اگر ہمیں کچھ بھی اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ: یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے جس کو اس نے تم پر نافذ کر دیا ہے اور یہ اس کا وہ حکم ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تا کہ تم میں سے اچھے اور برے کی تمیز ہو جائے اور مومن و منافق میں فرق واضح ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ دل کے بھیدوں سے بھی آگاہ ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے جب دونوں لشکر برسرپیکار تھے۔ انہیں شیطان نے کسی عمل کے سبب پھسلا دیا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ نیکی کا ثواب اس طرح بھی دیا جاتا ہے کہ اس کے بعد کسی دوسری نیکی کی توفیق بخشی جاتی ہے اور بدی کی سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعد دوسری بدی میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ: اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں سرزد ہونے والی تمام خطاؤں کو معاف فرما دیا کیونکہ وہ بہت زیادہ معاف کرنے والا اور بردبار ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ان کی کوتاہیوں سے درگزر کرتا ہے۔ اس سے پہلے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر مومنین کے ساتھ حضرت عثمانؓ کو بھی معاف کر دیا۔ ایک مرتبہ ولید بن عقبہؓ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ سے کہا کیا وجہ ہے کہ تم حضرت عثمانؓ سے ناراض سے رہتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ انہیں میرا پیغام پہنچا دو کہ میں غزوۂ احد میں فرار نہیں ہوا تھا اور نہ غزوۂ بدر میں غیر حاضر رہا اور نہ ہی میں نے سنت عمر کو ترک کیا ہے۔ جب یہ پیغام حضرت عثمانؓ کو پہنچا تو آپ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے کہ اس نے غزوۂ احد میں فرار ہونے والوں کو معاف کر دیا ہے تو اس پر عار دلانے کا کیا معنی؟ اور غزوہ بدر کے دن میں حضور ﷺ کی بیٹی رقیہ کی تیمارداری میں مصروف تھا یہاں تک کہ وہ اسی بیماری میں فوت ہو گئیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے مجھے مال غنیمت سے پورا حصہ دیا ظاہر ہے حصہ اسے ملتا ہے جو جنگ میں شریک ہو۔ پس حکماً میری موجودگی ثابت ہو گئی یہاں تک سنت عمر کا تعلق ہے تو اس کی نہ میں طاقت رکھتا ہوں اور نہ عبد الرحمٰن۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر اختیار کیا اور جو کہتے تھے اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں یا ہوتے تھے جہاد کرنے والے کہ اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تا کہ بنائے اللہ تعالیٰ اس (خیال باطل) کو حسرت (کا باعث) ان کے دلوں میں اور (درحقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور

مارتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو دیکھ رہا ہے۔ اور واقعی اگر تم قتل کیے جاؤ راہ خدا میں یا تم مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت (جو تمہیں نصیب ہوگی) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ کے حضور جمع کیے جاؤ گے''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو کافروں جیسے اعتقاد رکھنے سے منع فرما رہا ہے۔ یہ کفار خیال کرتے تھے کہ ان کے جو لوگ سفر یا لڑائی میں مارے گئے اگر وہ سفر یا لڑائی میں نہ ہوتے تو نہ مرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''یہ اعتقاد اس لیے ان کے دل میں پیدا کیا تا کہ مرنے اور قتل ہونے والوں پر ان کا افسوس اور حسرت بڑھ جائے در حقیقت زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی مشیت اور قدرت کے بغیر نہ تو کوئی زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو موت آسکتی ہے۔ اس کے حکم بغیر کسی چیز کی عمر میں کمی ہو سکتی ہے نہ اضافہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی تمام مخلوق پر محیط ہے۔ کوئی بھی چیز اس پر مخفی نہیں۔

وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ: یہ آیت کریمہ دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں شہادت اور موت اللہ تعالیٰ کی رحمت عفو و در گزر اور اس کی خوشنودی کا ذریعہ ہے اور یہ اس فانی دنیا و مافیھا سے بہتر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو بھی شخص مرتا یا ختم ہوتا ہے وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔ جہاں اسے اس کے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ اگر اچھے اعمال ہوں گے تو اچھی جزا اور اگر برے ہوں گے تو اس کی سزا بھی بری ہوگی۔

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۠ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِیۡنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنۡ یَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ ۚ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلۡیَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ ؕ وَمَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰهِ كَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۶۴﴾

''پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لیے اور اگر آپ ہوتے تند مزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ در گزر فرمایئے ان سے اور بخشش طلب کیجیے ان کے لیے اور صلاح مشورہ کیجیے ان سے اس کام میں اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔ اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔ اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت

کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا اور لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ تو کیا جس نے پیروی کی رضائے الٰہی کی اس کی طرح ہو سکتا ہے جو حق دار بن گیا ہے اللہ کی ناراضگی کا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ لوگ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یقیناً بڑا احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب اس نے بھیجا ان میں ایک رسول انہیں میں سے پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں اور پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے انہیں قرآن اور سنت۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے''۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ: اللہ تعالیٰ اپنے نبی معظم ﷺ اور مسلمانوں پر احسان جتلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ نبی کے حکم کی اطاعت کرنے والوں اور اس کی نافرمانی سے بچنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کے دل کو نرم کر دیا۔ اگر وہ اللہ کی یہ رحمت نہ ہوتی تو یہ نرمی اور شفقت نہ ہوتی۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ ماصلہ ہے جس کو اہل عرب معرفہ کے ساتھ بھی ذکر کرتے ہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ (مائدہ:13) اور نکرہ کے ساتھ بھی جیسے (عما قَلِيْلٍ)۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کے اخلاق کریمانہ ہیں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا اور یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ (التوبہ: 128) ''ترجمہ: بیشک تمہارے پاس تم میں سے ایک برگزیدہ رسول تشریف لایا، تمہارا مشقت میں پڑنا اسے گراں گزرتا ہے، تمہاری بھلائی کا بہت ہی خواہش مند ہے، مومنوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا اور بڑا رحیم ہے''۔ حضرت ابوامامہ باہلیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ بعض مومنوں کے لیے میرا دل انتہائی نرم ہے۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا: یہاں فظاً سے مراد سخت کلام ہے کیونکہ اس کے بعد ''غَلِيْظَ الْقَلْبِ'' کا لفظ ہے۔ یعنی آپ تنگ مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کو چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کے ارد گرد جمع کر دیا ہے اور آپ کی طبیعت کو ان کے لیے نرم کر دیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صفات کو پہلی کتابوں میں دیکھا ہے کہ آپ نہ تو تنگ مزاج ہیں اور نہ سخت دل اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے اور نہ ہی برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے، بلکہ معاف کرنے والے اور درگزر کرنے والے ہیں۔ حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح مجھے اللہ تعالیٰ نے اقامت فرائض کا حکم دیا ہے اسی طرح لوگوں کی دلجوئی کا حکم بھی دیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''آپ (اہل ایمان سے) درگزر فرمایئے، ان کی بخشش طلب کیجیے اور ان سے اس معاملہ میں مشورہ کیجیے۔'' یہی وجہ ہے کہ جب کوئی معاملہ پیش آتا تو حضور ﷺ صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرتے تھے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ کام پوری چستی اور دل جمعی کے ساتھ کریں۔ جیسا کہ غزوۂ بدر سے پہلے آپ نے ابوسفیان کے قافلہ کی طرف پیش قدمی کرنے کے بارے میں صحابہ اکرام سے مشورہ فرمایا تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ ہمیں سمندر میں چھلانگ لگانے کا حکم دیں تو ہم سمندر میں کود جائیں گے اور اگر آپ ہمیں برک الغماد تک لے جائیں تو ہم آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم قوم موسیٰ علیہ السلام کی طرح نہیں کہیں گے کہ ''تم جاؤ اور تمہارا رب اور لڑو ہم تو یہاں بیٹھیں گے۔'' بلکہ ہم عرض کریں گے کہ آپ چلیے اور ہم آپ کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دشمنوں کے خلاف جہاد کریں گے اسی طرح آپ نے جنگ بدر میں لشکر کی قیام گاہ کے بارے میں بھی مشورہ کیا تو حضرت منذر بن عمروؓ نے آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ غزوۂ احد کے موقع پر بھی صحابہ اکرام سے مشورہ کیا کہ مدینہ میں رہ کر دفاع کرنا چاہیے یا باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے تو اکثر صحابہ نے

مدینے سے باہر مقابلے کی رائے دی اور آپ نے ان کے مشورہ پر عمل کیا۔ اسی طرح غزوۂ خندق کے موقع پر صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ اس سال مدینے کی پیداوار کا تیسرا حصہ دے کر ان گروہوں سے صلح کر لی جائے لیکن حضرت سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہ کی رائے مختلف تھی۔ اس لیے آپ نے صلح کی تجویز کو ترک کر دیا اسی طرح حدیبیہ کے دن اس معاملے میں مشورہ کیا کہ کیا مشرکین کے گھروں پر حملہ کر دیا جائے تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے بلکہ عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ آپ نے ان کی بات منظور کر لی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر واقعہ افک پر تہمت لگی تو آپ نے فرمایا اے مسلمانو! مجھے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ دو جنھوں نے میرے اہل خانہ کے بارے میں تہمت لگائی۔ قسم بخدا میرے علم میں میرے اہل خانہ نے کوئی برائی نہیں کی۔ فرمایا میں اپنے اہل خانہ کے متعلق خیر کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔ اس طرح آپ نے حضرت عائشہؓ سے جدائی کے بارے میں حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے مشورہ کیا۔ الغرض آپ جنگ اور دیگر معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مشورہ کرنے کا حکم وجوبی تھا یا اختیاری امر تھا تا کہ لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے مشورہ کرنے کا حکم ہے۔ آپ فرماتے ہیں کے یہ دونوں حضور ﷺ کے حواری اور وزیر اور مسلمانوں کے باپ ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی مسئلہ میں تمہاری رائے ایک ہو جائے تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا(1)۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عزم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد اہل رائے سے مشورہ کرنا اور پھر اس مشورہ پر کاربند ہونا۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ امین ہے(2)۔ حضرت جابر روایت فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی سے مشورہ طلب کرے تو وہ اسے مشورہ دے دے(3)۔

فَإِذَا عَزَمْتَ: جب آپ کسی معاملے میں صحابہ کرام سے مشورہ کریں تو پھر اس معاملے کو سرانجام دینے کا پختہ ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور پھر ارشاد فرمایا: إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ…… یہ آیت کریمہ: وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (آل عمران:126) کی مثل ہے اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے پھر حکم ہوا کہ مومنین کو صرف اللہ کی ذات پر توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ: حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ نبی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ بدر کے مال غنیمت سے ایک چادر گم ہو گئی، صحابہ کرام نے گمان کیا کہ شاید حضور ﷺ نے چادر لے لی ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل کی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ منافقین نے رسول اللہ ﷺ پر کسی چیز کی چوری کی تہمت لگائی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ اس کا محبوب ہر قسم کی خیانت سے مبرا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آیت کا ایک معنی یہ کہ نبی ﷺ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ مال غنیمت میں حاصل ہونے والے بعض قیدیوں کو تقسیم کر دے اور بعض کو نہ تقسیم کرے۔ ابن اسحاق کا قول ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی ﷺ کے لیے مناسب نہیں کہ خدا کی نازل کردہ چیز کو ترک کر دے اور اپنی امت تک نہ پہنچائے۔ يُغَلَّ کی یاء کو پیش کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا یہ مناسب نہیں کہ نبی کی ذات کے ساتھ خیانت کی جائے۔ قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت کریمہ بدر کے دن

1۔ مسند امام احمد: 227/4 2۔ ابن ماجہ: 1233 3۔ ابن ماجہ، کتاب الادب: 1233

نازل ہوئی جب آپ کے کسی صحابی نے مال غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے کوئی چیز لے لی۔

وَ مَنْ يَّغْلُلْ: اور یہ خیانت کرنے والوں کے لیے انتہائی شدید وعید ہے۔ متعدد احادیث میں بھی خیانت سے سخت منع فرمایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بڑا خیانت کرنے والا وہ شخص ہے جو پڑوسی کے کھیت یا اس کے گھر کی ایک گز زمین پر قبضہ کر لے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں کا طوق پہنائے گا(1)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو ہم والی بنائیں اگر اس کے پاس گھر نہ ہو تو وہ گھر بنا لے، اگر شادی شدہ نہ ہو تو شادی کر لے، اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم رکھ لے، اگر اس کے پاس سواری نہ ہو تو سواری رکھ لے۔ ان چیزوں کے علاوہ اگر وہ کوئی چیز لے گا تو وہ خائن شمار ہوگا(2)۔ اس روایت کو ابو داؤد نے بھی الفاظ کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم میں سے اس شخص کو پہچانتا ہوں جو قیامت کے دن چلاتی ہوئی بکری اٹھائے ہوئے آئے گا اور میرا نام لے کر مجھے پکارے گا تو میں کہوں گا کہ میں تمہارے لیے اس معاملہ میں اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ اس سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ شفاعت متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ میں نے تمہیں دین کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ میں اسے بھی پہچانتا ہوں جو قیامت کے دن بلبلاتا ہوا اونٹ اٹھائے ہوئے آئے گا اور میرا نام لے کر پکارے گا تو اسے بھی یہی کہوں گا۔ اور میں اسے بھی پہچانوں گا جو ہنہناتے ہوئے گھوڑے کو اٹھائے ہوئے آئے گا اور مجھے یا محمد یا محمد کہہ کہ پکارے گا تو میں کہوں گا کہ میں تمہارے لیے اس معاملے میں اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں(3)۔ حضرت ابو حمید ساعدی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ ازد کے ابن اللتبیہ نامی شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عامل بنایا۔ جب مال زکوٰۃ وصول کر کے واپس آیا تو کہنے لگا یہ مال آپ کے لیے ہے اور مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا کیا وجہ ہے کہ جب ہم کسی عامل کو کسی کام کے لیے بھیجتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ہے اور مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ اگر یہ شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہتا تو پھر دیکھتے انہیں کوئی ہدیہ دیتا ہے یا نہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے تم میں سے جو کوئی اس میں سے کوئی چیز لے گا وہ قیامت کے دن اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے لائے گا۔ اگر اونٹ ہوگا تو بلبلا رہا ہوگا، اگر گائے ہوگی تو ڈکار رہی ہوگی اور اگر بکری ہوگی تو چلا رہی ہوگی۔ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے یہاں تک کہ ہمیں بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور تین مرتبہ فرمایا اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا(4)۔ ایک روایت میں فرمایا کہ عمال کو ملنے والے تحائف بھی خیانت میں شمار ہوتے ہیں۔ اس حدیث کو صرف امام احمد نے ہی اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے یمن بھیجا۔ جب میں یمن کی طرف چل دیا تو مجھے پیغام دے کر واپس بلایا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ میں نے تمہیں صرف اس بات کے لیے واپس بلایا ہے کہ میری اجازت کے بغیر تم جو چیز لو گے وہ خیانت ہوگی۔ اور ہر خائن قیامت کے دن اپنی خیانت کے ساتھ حاضر ہوگا۔ بس اسی بات کے لیے تمہیں بلایا تھا اب جاؤ اور اپنا فرض نبھاؤ(5)۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یاد فرمایا جس میں آپ نے خیانت کا ذکر فرمایا اور اس کی ہولناکیاں بیان کیں۔ پھر وہی فرمایا جو گزشتہ حدیث میں گزر چکا ہے اس کے علاوہ سونے چاندی کا بھی ذکر کیا۔ ایک روایت میں فرمایا اے لوگو! اگر تم میں سے کوئی عامل بنے اور ہم میں سے کوئی ایک چیز چھپائی تو وہ خیانت ہوگی۔ قیامت کے دن اسی کے ساتھ حاضر ہوگا۔ یہ

1۔ مسند امام احمد: 140/4　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج: 134/3　3۔ تفسیر الطبری: 159/4

4۔ مسند احمد: 424،423/5　5۔ عارضۃ الاحوذی: 80،79/6

بات سن کر سانولے رنگ کے انصاری صحابی سعد بن عبادہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں عامل بننے سے دستبردار ہوتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیوں؟ عرض کی آپ کے فرمان کی وجہ سے۔ آپ نے فرمایا اب سنو! اگر ہم کسی کو عامل بنائیں اور اسے جو تھوڑا بہت ملے تو اسے چاہیے کہ وہ لے آئے اور اس میں سے جو اسے عطا کیا جائے وہ لے لے اور جس سے روکا جائے اس سے رک جائے(1)۔ حضرت ابو رافعؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر نماز عصر کے بعد بنو عبد الاشہل کے پاس تشریف لے جاتے اور مغرب تک وہیں ان کے ساتھ گفتگو کرتے۔ ایک دن مغرب کے وقت وہاں سے چلے۔ وقت چونکہ تنگ تھا اس لیے آپ تیز تیز قدم اٹھانے لگے، بقیع کے پاس گزرے تو فرمانے لگے افسوس ہے تجھ پر، افسوس ہے تجھ پر۔ میں نے خیال کیا کہ آپ مجھے فرما رہے ہیں اور تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے۔ عرض کی میں آپ کے اس ارشاد کی وجہ سے پیچھے ہٹ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں نہیں کہا بلکہ یہ فلاں شخص کی قبر ہے جس کو میں نے فلاں قبیلے کی طرف عامل بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے خیانتاً ایک چادر اپنے پاس رکھ لی اب وہ چادر آگ بن کر اس پر بھڑک رہی ہے(2)۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت کے اونٹ کی پیٹھ کے چند بال لیے اور ارشاد فرمایا کہ اس میں میرا بھی وہی حق ہے جو تم میں سے کسی ایک کا ہے۔ خیانت سے بچو، خائن قیامت کے دن رسوا ہوگا۔ اگر کسی کے پاس سوئی دھاگہ یا اس سے بھی کوئی حقیر چیز ہو تو واپس کر دے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قریب اور دور والوں کے ساتھ جہاد کرو۔ جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جہاد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ رنج و غم سے نجات بخشتا ہے۔ اللہ کی حدود کو لوگوں پر نافذ کرو خواہ وہ قریب کے ہو یا دور کے۔ اللہ کے حکم کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے مت ڈرو(3)۔ ایک روایت میں فرمایا کہ مال غنیمت کی سوئی اور دھاگہ واپس کر دو کیونکہ یہ خیانت خائن کے لیے روز قیامت جہنم کی آگ بن جائے گی اور اس کے لیے ذلت اور رسوائی کا باعث ہوگی۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مجھے عامل بنا کر بھیجا تو فرمایا اے ابو مسعود! جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں قیامت کے دن تجھے اس حال میں دیکھوں کہ تمہاری پیٹھ پر اونٹ بلبلا رہا ہو جسے تم نے خیانت سے حاصل کیا ہو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ تب میں نہیں جاؤں گا ارشاد فرمایا میں تمہیں مجبور نہیں کرتا(4)۔ ابن مردویہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی پتھر کو جہنم میں پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک بھی نیچے جاتا رہے تو اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ خیانت سے حاصل کی ہوئی چیز کو اسی طرح جہنم میں پھینک دیا جائے گا پھر خائن کو کہا جائے گا کہ جاؤ اسے پکڑ کر لاؤ۔ اور یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ہے۔ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ خیبر کے دن صحابہ کرامؓ آپس میں باتیں کرنے لگے فلاں شہید ہے، فلاں شہید ہے۔ جب انہوں نے ایک شخص کے بارے میں کہا کہ وہ شہید ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں میں نے اسے جہنم کی آگ میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے مال غنیمت کی ایک چادر چرائی تھی، پھر فرمایا جاؤ لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنت میں صرف ایمان والے ہی داخل ہوں گے۔ میں نے یہ اعلان کر دیا(5)۔ ایک دن حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن انیس سے زکوٰۃ کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے کہا کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کا صدقات میں خیانت کرنے والوں کے بارے میں فرمان نہیں سنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مال غنیمت سے اونٹ یا بکری چوری کرے گا تو قیامت کے دن اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لائے گا۔ حضرت عبداللہ بن انیسؓ نے فرمایا ہاں میں نے یہ فرمان سنا ہے(6)۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہؓ کو صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجنا چاہا۔

1۔ مسند امام احمد 192/4
2۔ مسند احمد 392/6
3۔ مسند احمد 330/5
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الامارۃ 135/3
5۔ مسند احمد 30/1
6۔ تفسیر الطبری 160/4

فرمایا اے سعد کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تم بلبلاتے ہوئے اونٹ کو اٹھا کر لاؤ۔ حضرت سعد نے عرض کی نہ میں یہ عہدہ لوں گا اور نہ ہی ایسا ہونے کا احتمال رہے گا۔ حضور ﷺ نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی۔ حضرت صالح بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ وہ رومیوں کے خلاف جہاد میں مسلمہ بن عبدالماجد کے ساتھ شریک تھے ایک شخص کے مال سے کچھ خیانت کا مال نکلا انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا میرے والد عبداللہ بن عمرؓ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم جس کے سامان میں خیانت کا مال پاؤ اس کو جلا دو۔ راوی فرماتے ہیں میرا خیال ہے آپ نے فرمایا کہ اسے سزا بھی دو۔ یہ سن کر مسلمہ نے اس سامان کو کھلوایا اس میں قرآن پاک کا ایک نسخہ تھا۔ انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ اسے بیچ کر اس کی قیمت کو صدقہ کر دو(1)۔ علی بن مدینی اور امام بخاریؒ کا قول ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ دارقطنی نے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ سالم بن عبداللہ کا فتویٰ ہے امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ حضرت حسن بصری کا بھی یہی قول ہے کہ خیانت کرنے والے کی سزا یہ ہے کہ اس کا تمام سامان جلا دیا جائے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اس کا سامان جلا دیا جائے اور اسے غلام کی سزا سے کم کوڑے لگائے جائیں اور اسے مال غنیمت سے محروم کر دیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالک، امام شافعی اور جمہور یہ علماء کا مذہب اس کے برعکس ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خائن کے مال کو جلایا نہیں جائے گا بلکہ اس پر تعزیر لگائی جائے گی۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خائن کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کیا لیکن اس کا سامان نہیں جلایا۔ زبیر بن مالک فرماتے ہیں جب حضرت عثمانؓ نے تمام امت کو ایک قرآن پر جمع کرنے کے لیے دیگر مصاحف کو جلانے کا حکم دیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا تم میں سے جو اپنے مصحف کو چھپا سکتا ہے وہ چھپا لے کیونکہ قیامت کے دن ہر آدمی وہی چیز لائے گا جو اس نے چھپائی ہوگی۔ پھر فرمانے لگے میں نے ستر مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی زبانی یہ قرآن پڑھا ہے۔ کیا میں رسول اللہ ﷺ کی پڑھائی ہوئی قرأت چھوڑ دوں۔ امام وکیع نے بھی اس واقعہ کو اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب بھی مال غنیمت آتا تو آپ حضرت بلالؓ کو حکم دیتے کہ وہ لوگوں میں منادی کر دیں کہ جس کے پاس مال غنیمت ہے وہ لے آئے۔ پھر آپ اس میں سے پانچواں حصہ نکال لیتے اور باقی کو تقسیم کر دیتے۔ ایک مرتبہ تقسیم کے بعد ایک شخص بالوں کی بنی ہوئی ایک رسی لے کر آیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ مال غنیمت میں سے ہے۔ تو آپ نے فرمایا، کیا تم نے بلال کی منادی نہیں سنی تھی جو تین مرتبہ کی گئی اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا تو تم اس وقت کیوں نہیں لے کر آئے۔ اس نے عذر بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ ہرگز نہیں سنوں گا، قیامت کے دن تم اس کے ساتھ آؤ گے۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ: جو شریعت خداوندی کی پیروی کرتے ہوئے اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرتا اور اس کی بارگاہ سے اجر و ثواب کی امید رکھتا اور اس کے دردناک عذاب سے بچنے کی سعی کرتا ہے وہ، اور جو (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے) اس کے عذاب کا مستحق ٹھہرا اور جس کا روز قیامت جہنم ٹھکانہ ہوگا، وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ یہی حکم ان آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے: اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى (الرعد:19) ''ترجمہ: کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو اندھا ہے''۔ ''اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (القصص:61) ''ترجمہ: کیا وہ شخص جس کے ساتھ ہم نے بہت اچھا وعدہ کیا اور وہ اس وعدہ کو پانے والا بھی ہے، اس کی مانند ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دنیاوی زندگی کا سامان دیا''۔

1۔ مسند احمد: 22/1

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ: حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں اہل خیر وشر کے درجات بیان کیے گئے ہیں۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ اہل جنت کے جنت میں مختلف درجات ہوں گے اور اسی طرح اہل جہنم کے مختلف طبقات۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (انعام:132) ''ترجمہ: ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کے مطابق درجات ہیں''۔ اس لیے اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے خوب آگاہ ہے۔ عنقریب ان کو پورا پورا بدلہ دے گا نہ تو کسی کی نیکی کو ضائع کرے گا اور نہ کسی کی برائی کو زیادہ بلکہ ان کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: اہل ایمان پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ انہی کی جنس میں سے ایک پیغمبر بھیجا تاکہ وہ اس کے ساتھ گفتگو اور ہم نشینی کر کے فائدہ حاصل کر سکیں۔ جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (الروم:21) اس آیت کریمہ کا بھی یہی معنی ہے کہ تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے پیدا کیے۔ دوسرے مقام پر ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ...... (الکھف: 110) ''ترجمہ: آپ فرمائیے کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی کہ تمہارا خدا صرف اللہ وحدہ ہے''۔ دوسری جگہ ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ (فرقان:20) ''ترجمہ: ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھیجے وہ سب کھانا کھایا کرتے تھے اور بازاروں میں چلا پھرا کرتے تھے''۔ ایک اور ارشاد ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ (یوسف:109) ''ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے''۔ ایک اور فرمان ہے: يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ (الانعام:130) ''ترجمہ: اے گروہ انس وجان کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے''۔ الغرض یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنی مخلوق کی طرف رسول انہی جنس میں سے بھیجے تاکہ وہ ان کے ساتھ ہم کلامی اور بار بار سوال کر کے ان سے دین سیکھیں۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ رسول ﷺ ان پر قرآن حکیم کی آیات تلاوت کرتا ہے، انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے تاکہ ان کے دل شرک اور جاہلیت کی آلودگیوں سے پاک ہو جائیں اور انہیں کتاب وحکمت یعنی قرآن وسنت کی تعلیم دیتا ہے اور اس رسول ﷺ کے آنے سے پہلے کھلی اور واضح گمراہی میں تھے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

''کیا جب تمہیں پہنچی کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو) اس سے دگنی تو تم کہہ اٹھے کہاں سے آپڑی یہ مصیبت؟ فرمائیے! یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب

مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی اور (مقصد یہ تھا کہ) دیکھ لے اللہ تعالیٰ مومنوں کو۔ اور دیکھ لے جو نفاق کرتے تھے اور کہا گیا ان سے کہ آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا بچاؤ کرو (اپنے شہر کا) بولے اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے وہ کفر سے اس روز زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔ جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے آپ فرمایئے ذرا دور تو کرد کھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو''۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ: یہاں غزوۂ احد کے دن پیش آنے والی مصیبت کا ذکر کیا جارہا ہے جس میں ستر مسلمان شہید ہوئے۔

قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا: غزوۂ بدر میں تم نے مشرکین کو دوگنا نقصان پہنچایا یعنی ان کے ستر افراد کو قتل کیا اور ستر کو قیدی بنایا۔ اب تم پر مصیبت آئی ہے تو کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آ گئی۔ محبوب ﷺ فرما دیجیے کہ یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔ حضرت عمر بن خطاب ؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں نے جن کفار کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سزا اگلے سال یہ ملی کہ غزوۂ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے، کفار کے اچانک حملے سے صحابہ کرام میں بھگدڑ مچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور خود کی کڑیاں لگنے سے چہرہ مبارک زخمی ہوا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ غزوۂ بدر میں آپ کی قوم نے مشرکین جو قیدی بنایا ہے، اللہ نے اسے ناپسند فرمایا ہے۔ اب آپ کو دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ یا تو ان قیدیوں کو قتل کر دیں یا ان سے فدیہ وصول کر کے انہیں چھوڑ دیں مگر ان مسلمانوں میں اتنی ہی تعداد شہید ہوگی۔ آپ نے ان لوگوں کو جمع کر کے یہ دونوں باتیں بتا دیں تو انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کہ یہ لوگ ہمارے اپنے ہی قبائل کے اپنے ہی بھائی ہیں۔ کیوں نہ ہم ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیں اور اس مال سے قوت حاصل کر کے اپنے دوسرے دشمنوں سے جنگ کریں۔ پھر اگر ہم میں سے اتنے ہی آدمی شہید ہو گئے تو یہ کوئی ہمارے لیے ناپسندیدہ بات نہیں۔ چنانچہ جرمانہ وصول کر کے قیدیوں کو چھوڑ دیا گیا۔ لہٰذا اس کے بعد غزوۂ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے (2)۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ تم پر یہ مصیبت حضور ﷺ کی نافرمانی کی وجہ سے نازل ہوئی ہے کیونکہ آپ نے تم تیراندازوں کو حکم دیا تھا کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹو۔ تم نے نافرمانی کی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ جو چاہے کرے اس کے حکم کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ: غزوۂ احد میں جو تمہیں نقصان پہنچا کہ تم دشمن کے مقابلہ میں بھاگ گئے اور تم میں سے بعض زخمی ہوئے اور بعض شہید۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قضاوقدر کی وجہ سے تھا۔ اس میں کئی حکمتیں پوشیدہ تھیں کہ اس میں صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے والے بھی ظاہر ہو گئے اور منافقین کا حال بھی واضح ہو گیا۔ یعنی جب عبداللہ بن ابی اور دوسرے منافقین واپس لوٹے تو بعض مسلمانوں نے انہیں کہا کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر دشمن کے ساتھ جہاد کرو۔ اگر جہاد نہیں کر سکتے تو کم از کم مسلمانوں کی صفوں میں رہو تاکہ دشمن پر رعب پڑ جائے تو انہوں نے بہانے بنانے شروع کر دیے۔ اور کہا کہ اگر واقعی لڑائی شروع ہوئی تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ نہیں ہوگی۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ایک ہزار صحابہ کی معیت میں میدان احد کی طرف نکلے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کہنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے لوگوں کی بات مان کر مدینہ سے نکلے ہیں اور انہوں نے میری بات تسلیم نہیں

1۔ مسند احمد: 30/1　2۔ تفسیر الطبری: 166/4

کی۔ پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ قسم بخدا مجھے معلوم نہیں کہ ہم اپنے آپ کو کیوں قتل کروائیں۔ اس کی یہ بات سن کر منافقین اس کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح وہ ایک تہائی لشکر لے کر واپس لوٹ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام ان کے پیچھے گئے اور انہیں کہا کہ اے میری قوم میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم اپنے نبی اور اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر نہ جاؤ کہ دشمن سامنے موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہمیں جنگ کے بارے میں یقین ہوتا تو ہم تمہیں چھوڑ کر نہ جاتے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ جنگ نہیں ہوگی۔ جب منافقین نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو انہوں نے فرمایا اے اللہ کے دشمنو! اللہ تمہیں غارت کرے، ہمیں تمہاری کوئی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تم سے مستغنی کر دے گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ انہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

وَهُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ: اس سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کے مختلف احوال ہیں کبھی وہ کفر کے قریب ہو جاتا ہے اور کبھی ایمان کے نزدیک۔ پھر ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے مونہوں سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔ جیسا کہ انہوں نے کہا کہ اگر جنگ ہوئی تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے حالانکہ ان کو یقین تھا کہ مشرکین کے جنگ لازمی امر ہے کیونکہ مشرکین کا لشکر دور دراز سے آیا تھا اور غزوۂ بدر میں ان کے سرداروں کے قتل کی وجہ سے انہیں مسلمانوں پر بڑا غضب تھا اور ان کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا تھی۔ اس لیے جنگ کا برپا ہونا لابدی امر تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ان باتوں کو بہتر جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائیوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارا مشورہ مانتے اور یہیں بیٹھے رہتے اور جنگ میں شرکت نہ کرتے تو ہرگز نہ مارے جاتے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر گھر میں بیٹھا رہنا اگر کسی شخص کو موت یا قتل سے بچا سکتا تو پھر تم کبھی نہ مرتے حالانکہ موت تم پر یقینی طور پر آ کر رہے گی اگرچہ تم مضبوط گھروں میں بیٹھے ہو۔ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو موت کو اپنے آپ سے دور کرو۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ عبداللہ بن ابی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ړ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِيْمَانًا ڰ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْھُمْ سُوْۗءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاۗءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْھُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

''اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کیے گئے ہیں اللہ کی راہ میں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس (اور) رزق

دیئے جاتے ہیں شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اور خوش ہو رہے ہیں بسبب ان لوگوں کے جو ابھی تک نہیں آملے ان سے ان کے پیچھے رہ جانے والوں سے کہ نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوش ہو رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر اور (اس پر) کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر ایمان والوں کا۔ جنہوں نے لبیک کہا اللہ اور رسول کی دعوت پر اس کے بعد کے لگ چکا تھا انہیں (گہرا) زخم ان کے لیے جنہوں نے نیکی کی ان میں سے اور تقویٰ اختیار کیا اجر عظیم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کہا انہیں لوگوں نے کہ بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لیے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے تو (اس دھمکی نے) بڑھا دیا ان کے (جوش ایمان کو) اور انہوں نے کہا کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کارساز ہے۔ (ان کے عزم توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے اور پیروی کرتے رہے رضائے الٰہی کی اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔ یہ تو شیطان ہے جو ڈراتا ہے (تمہیں) اپنے دوستوں سے پس نہ ڈرو ان سے بلکہ مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مومن ہو"۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چالیس یا ستر صحابہ کو بئر معونہ کی طرف بھیجا۔ جب یہ جماعت اس غار تک پہنچی جو بئر معونہ کے اوپر تھا اور وہاں پڑاؤ ڈال کر آپس میں باتیں کرنے لگے کہ کون اللہ کے رسول کا پیغام ان لوگوں تک پہنچائے گا تو ایک انصاری صحابی ابوملحانؓ اس کے لیے تیار ہو گئے اور ان کے گھروں کے پاس پہنچ کر بآواز بلند کہا اے بئر معونہ کے باسیو! میں تمہاری طرف رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی رسول نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ یہ سن کر ایک کافر نیزہ پکڑے ہوئے اپنے گھر سے نکلا اور اس نے صحابی پر نیزہ اس طرح تاک کر مارا کہ وہ اس کے بدن سے آر پار ہو گیا اس صحابی کی زبان سے بے ساختہ یہ نعرہ بلند ہوا: "اَللّٰهُ اَكْبَرُ، فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ کافر اس صحابی کے پیروں کے نشان دیکھتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے اور عامر بن طفیل رئیس قبیلہ کی سرکردگی میں تمام صحابہ کو شہید کر دیا(1)۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ان شہداء کے بارے میں قرآن پاک نازل ہوا کہ ہماری قوم کو یہ پیغام پہنچا دو کہ ہماری ملاقات اپنے پروردگار سے ہوئی وہ ہم سے راضی ہو گیا ہم اس سے راضی ہو گئے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ہم ایک مدت تک اس آیت کو پڑھتے رہے پھر اسے منسوخ کر کے اٹھا لیا گیا۔ اور وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا نازل ہوئی۔ حضرت مسروقؒ سے مروی ہے کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو فرمانے لگے کہ ہم نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ہیں۔ عرش معلیٰ کے نیچے لٹکی ہوئی قندیلوں پر ان کا بسیرا ہے وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی ہیں اور پھر ان قندیلوں کی طرف واپس لوٹ آتی ہیں۔ ایک مرتبہ ان کے پروردگار نے ان پر نظر کرم فرمائی اور پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ انہوں نے عرض کی یا باری تعالیٰ ہم کیا چاہیں گے ساری جنت تو ہمارے لیے ہے۔ ہم جہاں چاہتے ہیں سیر کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا تو انہوں نے خیال کیا کہ اللہ کی بارگاہ سے مانگے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ انہوں نے عرض کی اے باری تعالیٰ ہماری خواہش ہے کہ تو ہماری روحوں کو واپس لوٹا دے تاکہ ایک دفعہ پھر تیری راہ میں شہید ہو جائیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا(2)۔ ایک اور روایت میں فرمایا کہ جب کوئی شخص اس دنیا سے کوچ کرتا ہے اور اللہ کی جناب سے اچھی جزاء پاتا ہے تو وہ دنیا میں واپس لوٹنا پسند نہیں کرتا

1۔ تفسیر الطبری، 174،173/4 2۔ مسلم، کتاب الامارۃ 1503،1502

سوائے شہید کے کہ وہ چاہتا ہے کہ اسے دنیا میں واپس لوٹایا جائے تاکہ ایک بار پھر اللہ کی راہ میں شہید ہو، کیونکہ وہ اللہ کی راہ میں شہادت کی فضیلت کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کر لیتا ہے(1)۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے والد کو زندہ کیا اور پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو تو اس نے عرض کی یا باری تعالیٰ مجھے ایک دفعہ پھر دنیا میں بھیج دے تاکہ تیری راہ میں ایک مرتبہ پھر قربان ہو جاؤں(2)۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ یہاں سے کوئی واپس نہیں جائے گا۔ ان کا نام عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاریؓ ہے۔ آپ غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ جب میرے والد شہید ہوئے تو میں رونے لگا اور بار بار ان کے چہرے سے کپڑا اٹھاتا۔ صحابہ کرام نے مجھے منع کیا لیکن حضور ﷺ نے منع نہ فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا اے جابر نہ رو تیرے باپ کا جنازہ اٹھائے جانے تک فرشتے اپنے پروں کے ساتھ اس پر سایہ فگن رہیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غزوۂ احد میں جب تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے قالب میں رکھ دیا۔ جو جنت کی نہروں کا پانی پیتے ہیں اور اس کا پھل کھاتے ہیں اور عرش بریں کے نیچے لٹکی ہوئی قندیلوں میں آرام کرتے ہیں۔ جب ان کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لیے بہترین نعمتیں ملیں تو کہنے لگے کاش ہماری بھائیوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کیا احسان فرمایا ہے تاکہ وہ جہاد سے منہ نہ پھیریں اور نہ جنگ سے تھک کر بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم بے فکر رہو میں تمہارا یہ پیغام پہنچا دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ آیات نازل فرمائیں(3)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیات حضرت حمزہ اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا: جابر! کیا بات ہے غمگین نظر آتے ہو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے والد صاحب شہید ہو گئے اور بہت سا قرض اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ نے فرمایا سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس کسی سے بھی کلام کیا پردے کے پیچھے سے کیا لیکن تیرے باپ کے روبرو کلام کیا اور اسے فرمایا تم مجھ سے مانگو میں عطا کروں گا۔ اس نے عرض کی یا باری تعالیٰ مجھے واپس دنیا میں لوٹا دو تاکہ دوسری مرتبہ تیری راہ میں شہید ہو جاؤں۔ اللہ نے فرمایا: یہ میں پہلے ہی مقرر کر چکا ہوں کہ یہاں سے واپس کوئی نہیں جائے گا۔ انہوں نے عرض کی یا پروردگار! میرے پیچھے والوں کو میرے ان مراتب کی خبر پہنچا دو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ حضرت عبداللہ نے عرض کی اے پروردگار میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کی ارواح جنت کے دروازے کے قریب نہر کے کنارے پر سبز گنبد میں ہیں۔ جنت کی نعمتیں صبح و شام ان پر پہنچتی ہیں۔ اس حدیث اور اس سے پہلے گزری ہوئی احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ شہداء کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض کی روحیں جنت میں پھرتی ہیں اور بعض کی روحیں اس سبز گنبد میں ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ روحیں سیر کرتی ہوئی اس نہر پر پہنچ جاتی ہوں اور وہاں ان کا اجتماع ہوتا ہو۔ اور یہیں ان کو صبح و شام نعمتیں پہنچتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ہر مومن کو یہ بشارت دی جاتی ہے کہ اس کی روح جنت میں سیر کرتی ہے اور اس کے پھل کھاتی ہے۔ اور وہاں کی تر و تازگی اور شادابی کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اس حدیث کے راویوں میں مذاہب اربعہ کے ائمہ میں سے تین امام شامل ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس حدیث کو امام شافعی سے اور امام شافعی نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ مومن کی روح پرندے کی شکل میں ہوتی ہے وہ جنت کے درختوں سے پھل کھاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پھر اسے جسم میں لوٹا دے گا۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عام مومن کی روح جنت میں پرندے کی شکل میں ہوتی ہے مگر شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے

1۔ مسند احمد 126/3 2۔ مسند احمد 361/3 3۔ مسلم، فضائل الصحابہ 1918

قالب میں ہوتی ہیں۔اور یہ روحیں عام مسلمانوں کی نسبت ستاروں کی مانند ہیں۔خود بخود اڑ سکتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو انتہائی کرم اور احسان فرمانے والا ہے یہ دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی ایمان پر موت دے۔

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ : وہ شہداء جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے وہ زندہ ہیں۔اور وہاں عطا ہونے والی اللہ کی نعمتوں اور آسائشوں سے خوش ہیں۔اور انہیں یہ بھی خوشی ہے کہ ان کے جو بھائی بعد میں شہید ہوں گے وہ بھی ان کے پاس آجائیں گے۔انہیں نہ تو مستقبل کا کوئی خوف ہے اور نہ گزشتہ زندگی کا کوئی غم۔ابن اسحٰق فرماتے ہیں کہ وہ اس لیے خوش ہیں کہ ان کے وہ بھائی جو جہاد میں مصروف ہیں وہ شہید ہو کر آخر ان کے پاس آجائیں گے اور ان نعمتوں میں شریک ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی ہیں۔سدی فرماتے ہیں کہ شہید کو ایک کتاب دی جاتی ہے اس میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں دن فلاں تمہارے پاس آئے گا اور فلاں دن فلاں۔وہ اسے پڑھ کر اس طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح اہل دنیا کسی گمشدہ چیز کے ملنے پر خوش ہوتے ہیں۔حضرت سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ جب شہداء جنت میں داخل ہوتے ہیں تو تعظیم و تکریم دیکھ کر یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش کہ دنیا میں ہمارے بھائی بھی اس کو جان لیں تاکہ جہاد میں شامل ہو کر بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہید ہو جائیں اور ان ابدی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں۔سو رسول اللہ ﷺ نے ان کے احوال کی خبر دے دی۔اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہارے احوال کے متعلق تمہارے نبی پر آیات نازل کر دی ہیں۔یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ستر انصاری صحابہ کو بئر معونہ کے پاس بیک وقت شہید کر دیا گیا۔یہ خبر سن کر رسول اللہ ﷺ کو بڑا رنج ہوا۔آپ ایک ماہ تک قنوت میں ان کے قاتلوں کے لیے بددعا کرتے رہے اور لعنت بھیجتے رہے۔انہی کے بارے میں قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ہماری قوم کو ہماری خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے رب کی زیارت سے لطف اندوز ہوئے وہ ہم سے راضی ہوا ہم اس سے راضی ہوئے۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ جب اپنے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا ہوتے دیکھا تو خوش ہوئے۔حضرت عبد الرحمٰنؒ فرماتے ہیں کہ آیت: يَسْتَبْشِرُوْنَ......تمام مسلمانوں کے بارے میں خواہ شہید ہوں یا غیر شہید۔کیونکہ اکثر اوقات اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کی فضیلت اور ان کے اجر و ثواب کو ذکر کر کے مومنین کے اجر و ثواب کو ذکر کرتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ :اس آیت کریمہ میں حمراء الاسد کے واقعہ کا ذکر ہے۔اور یہ واقعہ اس طرح ہے کہ غزوہ احد کے موقع پر جب مشرکین مکہ نے اچانک حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو شہید اور زخمی کر کے واپس جا رہے تھے تو انہیں یہ خیال آیا کہ اگر ہم مدینہ پر حملہ کر کے اسے نیست و نابود کر دیتے تو آج ہی فیصلہ ہو جاتا۔جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے مسلمانوں کو ان کے پیچھے جانے کے لیے تیار کیا تاکہ ان پر رعب طاری ہو جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں میں ابھی دم خم باقی ہے اور سوائے جابر بن عبد اللہؓ کے صرف انہی صحابہ کو اجازت دی جو غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔صحابہ کرام نے زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر لبیک کہا۔حضرت عکرمہؒ بیان فرماتے ہیں کہ جب مشرکین غزوۂ احد سے واپس لوٹے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے افسوس! ہم نے محمد (ﷺ) کو قتل کیوں نہیں کیا اور ان کی عورتوں کو قیدی کیوں نہیں بنایا۔چلو واپس لوٹو۔جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا اسی حالت میں جلدی سے تیار ہوئے اور مشرکین کے تعاقب میں حمراء الاسد تک پہنچ گئے۔مسلمانوں کو اس طرح آتا دیکھ کر مشرکین کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ یہ کہتے ہوئے مکہ کی طرف بھاگ گئے کہ اگلے سال مقابلہ ہوگا۔اور رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔اس واقعہ کو مستقل غزوہ شمار کیا جاتا ہے۔یہ آیت کریمہ اسی واقعہ کا بیان ہے۔غزوۂ احد 15 پندرہ شوال بروز ہفتہ واقع ہوا۔سولہ شوال بروز اتوار رسول اللہ ﷺ کے مؤذن نے دشمن کے پیچھے نکلنے کا اعلان کیا۔اور یہ بھی اعلان کیا کہ آج سے وہی ہمارے

ساتھ نکلے گا جو کل غزوہ میں ہمارے ساتھ شریک تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے والد مجھے ان سات بہنوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ اور انہوں نے مجھے فرمایا تھا کہ بیٹے ہم میں سے کسی ایک کا یہاں عورتوں کے پاس رہنا ضروری ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے جہاد میں شریک ہوں۔ اس لیے تم اپنی بہنوں کے ساتھ رہو۔ اس وجہ سے میں غزوۂ احد میں شریک نہ ہو سکا۔ اس پر حضور ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔ رسول اللہ ﷺ دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور دشمن کو باور کرانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں ابھی قوت موجود ہے۔ اور احد کی مشکلات و مصائب نے ہمیں کمزور نہیں کیا۔ قبیلہ بنوعبدالاشہل کے ایک صحابی کا بیان ہے کہ ہم دو بھائی غزوۂ احد میں شریک ہوئے تھے۔ ہم سخت زخمی ہو کر واپس لوٹے ہی تھے کہ مؤذن رسول اللہ ﷺ نے دشمن کا پیچھا کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ نہ تو ہمارے پاس سواری ہے جس پر سوار ہو کر اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ جائیں اور نہ ہی زخموں کی وجہ سے جسم میں اتنی طاقت ہے کہ پیدل سفر کر سکیں۔ ہائے افسوس! ہم اس غزوہ میں شامل نہ ہو سکیں گے۔ بہرحال ہم نے ہمت نہ ہاری اور اسی حالت میں مسلمانوں کے پیچھے چل پڑے۔ چونکہ میرے زخم کچھ ہلکے تھے اس لیے جب میرے بھائی کو تکلیف زیادہ ہوتی تو اسے اٹھا لیتا حتی کہ گرتے پڑتے ہم بھی لشکر رسول اللہ ﷺ میں شریک ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ اپنے بھانجے حضرت عروہ سے فرمایا کہ تمہارے والد زبیر بن العوام اور ابوبکر صدیقؓ بھی انہی لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں ''اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا'' کی آیت نازل ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ غزوۂ احد کے دن جب مسلمان کفار کے اچانک حملہ سے دوچار ہوئے اور اس کے بعد مشرکین مکہ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے خیال کیا کہ کہیں یہ واپس نہ لوٹ آئیں تو آپ نے فرمایا کون ہے جو ان کے پیچھے نکلے۔ تو ستر صحابہؓ نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ جن میں حضرت ابوبکرؓ اور زبیرؓ شامل تھے (1)۔ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ عائشہ! تمہارے دونوں باپ ابوبکرؓ اور زبیرؓ ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر لبیک کہا۔ یہ حدیث بہت سی کتب میں روایت کی گئی ہے اور اس کو مرفوع کہنا محض خطا ہے۔ کیونکہ اکثر ثقہ راویوں نے اسے حضرت عائشہؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے اور معنی کے اعتبار سے بھی یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت زبیر سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے آباء میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو اپنے بھانجے عروہ بن زبیر کو فرمایا تھا جو آپ کی بہن اسماء بنت ابی بکر کے بیٹے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابوسفیان جب تمہارے بہت سے ساتھیوں کو شہید کر کے واپس مکہ جا رہا تھا تو اس کے دل میں مدینہ پر حملہ کرنے کا خیال آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا۔ غزوۂ احد شوال میں واقع ہوا تھا۔ تاہم تاجر ذی قعدہ کے مہینہ میں مدینہ آتے اور بدر صغریٰ میں ہر سال اپنا میلہ لگاتے، اس سال بھی وہ غزوۂ احد کے بعد آئے مسلمان زخموں سے چور چور تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنی تکلیف کا ذکر کیا کیونکہ انہیں مشرکین کے دوبارہ حملے سے سخت صدمہ ہوا تھا۔ آپ نے ان کو مشرکین کا تعاقب کرنے پر آمادہ کیا۔ آپ نے فرمایا حج قریب ہے۔ یہ مکہ لوٹ جائیں گے۔ ان میں اب اتنی جرأت نہیں کہ آئندہ سال سے پہلے واپس آ سکیں۔ لیکن شیطان نے اپنے پیروکاروں کو بہکانا شروع کر دیا اور انہیں خوفزدہ کیا کہ اہل مکہ کے پاس بہت سے لشکر ہیں جس کی بناء پر بعض لوگ ہمت ہار بیٹھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی ایک بھی میرے پیچھے نہ آئے تب بھی میں دشمن کے لیے نکلوں گا۔ اس پر ستر صحابہ کرام آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جن میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، زبیرؓ، سعدؓ، طلحہؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، عبداللہ مسعودؓ، حذیفہ بن الیمانؓ اور ابوعبیدہ بن الجراحؓ شامل تھے۔ یہ لشکر ابوسفیان کے تعاقب میں حمراء الاسد تک پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان

1۔ تفسیر الطبری 177/4

جانثاروں کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ یہ حمراء الاسد مدینہ طیبہ میں آٹھ میل دور ہے اور ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن ام مکتومؓ کو مدینہ میں اپنا نائب بنایا اور حمراء الاسد کے مقام پر سوموار، منگل اور بدھ تین دن تک مقیم رہے اور پھر واپس مدینہ لوٹ آئے۔ اسی قیام کے دوران قبیلہ خزاعہ کا سردار معبد خزاعی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جو خود تو مشرک تھا لیکن اس کے قبیلے سے مسلمانوں کی صلح تھی۔ اس قبیلہ کے مسلمان اور مشرک سب آپ کے خیر خواہ تھے۔ اس نے عرض کی کہ آپ کے اصحاب کو جو صدمہ پہنچا ہے اس پر ہمیں دلی رنج ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی خوشی نصیب فرمائے۔ پھر وہ وہاں سے نکلا اور روحاء کے مقام پر ابوسفیان اور اس کے لشکر کو ملا۔ وہ واپس لوٹنے کا مشورہ کر رہے تھے اور آپس میں کہہ رہے تھے کہ ہم نے محمد (ﷺ) اور ان کے صحابہ کو کافی تکلیف پہنچائی لیکن ان کا قلع قمع کرنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے۔ اب ہمیں واپس جانا چاہئے تا کہ باقی ماندہ کا کام تمام کر دیں۔ اسی اثناء میں ابوسفیان نے معبد کو دیکھا اور پوچھا کہ کیا خبر لائے ہو۔ اس نے کہا کہ محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ تمہارے تعاقب میں نکلے ہیں، وہ سخت غصے میں ہیں اور وہ مسلمان جو پہلے لڑائی میں شریک نہیں ہو سکے تھے وہ بھی نکل آئے ہیں۔ اور شرمندگی کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ پہلے کیوں نہیں جہاد میں شامل ہوئے۔ میں نے انہیں اتنے سخت غصے میں آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ سن کر ابوسفیان نے کہا، تمہارا برا ہو یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس نے کہا قسم بخدا اگر تم نے جلدی کوچ نہ کیا تو ان کے گھڑ سواروں کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ ابوسفیان کہنے لگے کہ ہم نے یہ ارادہ کیا تھا کہ ان کے باقی ماندہ کو نیست و نابود کر دیں۔ خزاعی نے کہا کہ میں تمہیں آگے بڑھنے سے منع کرتا ہوں۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے یہ بات سن کر اپنا ارادہ بدل لیا۔ قبیلہ عبدالقیس کے دو آدمی کاروبار کے سلسلہ میں مدینہ جا رہے تھے۔ ابوسفیان نے ان سے کہا کہ تم محمد (ﷺ) کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو تو ہم تمہیں سوق عکاظ میں بہت سی کشمش دیں گے اور پیغام یہ ہے کہ "ہم نے تمہیں تہہ تیغ کرنے کے لیے بہت سا لشکر جمع کر لیا ہے۔" جب یہ لوگ حمراء الاسد کے مقام پر مسلمانوں کے لشکر کے قریب سے گزرے تو یہ پیغام انہیں پہنچا دیا پیغام سن کر صحابہ کرامؓ نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ خبر سنی تو فرمایا کہ میں نے ان کے پتھر کا نشان مقرر کیا ہے اگر وہ لوٹیں گے تو وہاں پہنچ کر گزرے ہوئے کل کی طرح مٹ جائیں گے۔ حضرت حسن بصریؒ اس آیت کریمہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب ابوسفیان نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان واپس پلٹ آیا تھا لیکن اللہ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا ہے۔ تم میں سے کون ان کے تعاقب میں نکلے گا یہ سن کر بہت سے صحابہ کرامؓ آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے جب ابوسفیان کو یہ خبر پہنچی کہ حضور ﷺ ان کے تعاقب کے لیے نکل آئے ہیں تو اس نے تاجروں کے ایک قافلے سے کہا اگر تم نے محمد ﷺ کو واپس لوٹا دیا تو تمہیں بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔ تم ان کو آگاہ کر دو کہ میں نے تمہارے لیے بہت بڑا لشکر تیار کر لیا ہے۔ جب ان تاجروں نے رسول اللہ ﷺ کو ابوسفیان کا پیغام پہنچایا تو آپ نے فرمایا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کہ یہ آیت بدر کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس میں پہلی رائے ہی صحیح ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ: یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے غزوۂ احد کے بعد صحابہ کرامؓ کو ڈرانا چاہا تو صحابہ کرام نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ نے یہ مبارک کلمات حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ پڑھے۔ اور رسول اللہ ﷺ یہ فرمان اس وقت ارشاد فرمایا جب غزوۂ احد کے بعد لوگوں نے آکر بتایا کہ اہل مکہ نے تمہارے لیے لشکر جمع کر رکھا ہے تو آپ نے سن کر فرمایا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران:173)

حضرت عبد بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت آپ کی زبان پر آخری کلمہ: حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ تھا(1)۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ احد کے بعد لوگوں نے آپ سے کہا کہ اہل مکہ نے آپ کے لیے لشکر جمع کیا ہے۔ آپ کو ان سے ڈرنا چاہئے تو آپ نے فرمایا: حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کی سرکردگی میں ایک دستہ بھیجا تو بنوخزاعہ کے ایک اعرابی نے انہیں کہا کہ تمہارے مقابلے میں ایک بہت بڑا لشکر جمع ہے تو آپ نے فرمایا: حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ تو حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ پڑھا کرو۔ حضرت عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کیا۔ اور جس شخص کے خلاف ہوا تھا جب وہ لوٹنے لگا تو اس نے یہ کلمہ پڑھا۔ آپ نے اسے واپس بلوا کر فرمایا کہ سستی اور کاہلی کرنے والے پر اللہ لعنت کرتا ہے، عقلمندی اور دانائی سے کام لیا کرو اور جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ تو پھر کہو "حَسۡبِيَ اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ" حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کیسے آسودہ حال رہ سکتا ہوں جبکہ صاحب قرن صور کو اپنے منہ میں لیے ہوئے ہے اور سر کو جھکائے منتظر ہے کہ کب اس کو حکم دیا جائے اور وہ صور پھونکے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم کیا پڑھا کریں؟ فرمایا: حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ، عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا پڑھا کرو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن ام المومنین حضرت زینب نے فخر سے کہا کہ میرا نکاح خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور تمہارے نکاح تمہارے خاندان والوں نے کیے ہیں۔ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا میری برات اور پاکیزگی کی آیات اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمائی ہیں تو حضرت زینبؓ نے تسلیم کر لیا اور پوچھا جب تم ذکوان بن معطر کی سواری پر بیٹھے تھے تو کیا پڑھا تھا تو انہوں نے فرمایا: حَسۡبِيَ اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ یہ سن کر حضرت زینب فرمانے لگیں آپ نے اہل ایمان کا کلمہ پڑھا تھا۔

فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ: یعنی جب مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا تو اس نے ان کے غم واندوہ کو دور کر دیا اور دشمن کی سازشوں اور چالوں کو ناکام بنا دیا اور وہ سلامتی سے مدینے کی طرف لوٹے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نعمت سے مراد یہ ہے کہ وہ صحیح سلامت واپس لوٹ آئے اور فضل سے مراد یہ ہے کہ ان دنوں ایک قافلہ وہاں سے گزرا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا مال خرید کر آگے بیچ دیا اور نفع حاصل کر کے صحابہ میں تقسیم کر دیا(1)۔ مجاہد بیان فرماتے ہیں کہ ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اب وعدہ کی جگہ بدر ہے جہاں تم نے ہمارے ساتھیوں کو قتل کیا تھا آپ نے فرمایا ممکن ہے۔ چنانچہ اگلے سال رسول اللہ ﷺ وعدہ کے مطابق مقام بدر پہنچے لیکن ابوسفیان اور اس کے ساتھی ڈر کے مارے نہ آئے۔ اتفاقاً ان دنوں بدر میں میلہ لگا ہوا تھا، مسلمانوں نے وہاں خرید وفروخت کر کے نفع کمایا۔ اس غزوہ کو بدر صغریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کے وعدہ کے مطابق مدینہ سے نکلنے کا ارادہ فرمایا تو راستے میں مسلمانوں سے مشرکین ملتے تو وہ قریش کے بارے پوچھتے وہ جواب دیتے کہ قریش نے تمہارے لیے بہت لشکر جمع کر رکھے ہیں اس طرح وہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنا چاہتے تھے لیکن مسلمان کہتے حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ حتیٰ کہ وہ میدان بدر میں پہنچ گئے وہاں سالانہ میلہ لگا ہوا تھا، کسی نے وہاں جھگڑا نہ کیا اور تمام مسلمان امن وامان سے واپس لوٹ آئے۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيۡطٰنُ: شیطان اپنے مریدوں کے ذریعے تمہیں ڈراتا ہے اور تمہیں یہ وہم دلاتا ہے کہ وہ بڑی طاقتور اور قوی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جب شیطان تمہارے دل میں اس قسم کا خیال ڈالے تو تم مجھ پر ہی بھروسہ کیا کرو اور اس سے ڈرنے کی بجائے مجھ سے ڈرا کرو، کیونکہ اس کے خلاف میں ہی تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ

1۔ فتح الباری، تفسیر سورۃ آل عمران 229/8 2۔ دلائل النبوۃ 318/3

''ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا''۔ دوسری جگہ فرمایا: اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ''ترجمہ: بے شک ہم اس دنیاوی زندگی اور اس دن جب گواہی دینے کے لیے گواہ کھڑے ہوں گے اپنے رسولوں اور مومنین کی مدد کریں گے''۔

وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

''اور (اے جان عالم) نہ غمزدہ کریں آپ کو جو جلدی سے کفر میں داخل ہوئے ہیں بے شک یہ لوگ نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ نہ رکھے ان کے لیے ذرا حصہ آخرت (کی نعمتوں) سے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ بیشک جنہوں نے خرید لیا کفر کو ایمان کے عوض میں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور نہ خیال کریں جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لیے صرف اس لیے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ زیادہ کرلیں گناہ اور ان کے لیے عذاب ہے، ذلیل وخوار کرنے والا۔ نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ چھوڑے رکھے مومنوں کو اس حال پر جس پر تم اب ہو جب تک الگ الگ نہ کردے پلید کو پاک سے اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لیے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے اجر عظیم ہے۔ اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے لیے بلکہ یہ بخل بہت برا ہے ان کے لیے طوق پہنایا جائے گا اور انہیں وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن اور اللہ کے لیے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے خبردار ہے''۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ: چونکہ رسول اللہ ﷺ لوگوں پر انتہائی مشفق اور مہربان تھے اس لیے کفار کی مخالفت اور عناد پر آپ غمگین ہو جایا کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آپ کو ان لوگوں کے کفر میں منہمک رہنے سے غمگین نہ ہوں۔ کیونکہ ان کا کفر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ ان کے کفر اختیار کرنے میں یہ حکمت کارگر ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کو کوئی اجر

عطا نہ فرمائے بلکہ ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے اسی مضمون کو مزید تاکید کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جن لوگوں نے ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کیا ہے وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ان کے لیے دردناک عذاب بھی ہے۔

وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡٓا: اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ اہل کفر کو یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مہلت دی ہے اس لیے ان کے لیے کوئی بھلائی کا پہلو ہے بلکہ یہ مہلت اس لیے ہے کہ وہ مزید گمراہیوں میں مبتلا ہو کر اپنا نامہ اعمال سیاہ کر لیں۔اور یہی مفہوم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ اَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمۡ بِهٖ مِنۡ مَّالٍ ...... ''ترجمہ: کیا وہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو مال واولاد کی کثرت سے ان کی مدد کر رہے ہیں، تو انہیں بھلائیاں پہنچانے میں جلدی کر رہے ہیں۔نہیں بلکہ وہ حقیقت حال سے بے خبر ہیں''۔دوسری آیت میں ہے: فَذَرۡنِىۡ وَمَنۡ يُّكَذِّبُ ...... ''ترجمہ: پس اے حبیب ﷺ! آپ چھوڑ دیجئے اور اسے جو اس کتاب کو جھٹلاتا ہے، ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا''۔تیسری آیت میں ہے فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَآ اَوۡلَادُهُمۡ ...... ''ترجمہ: سو تعجب میں نہ ڈال دیں تمہیں ان کے اموال اور نہ ان کی اولاد، اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ انہیں ان چیزوں کے ذریعے سے دنیاوی زندگی میں عذاب دے اور ان کا سانس اس حال میں نکلے کہ وہ کافر ہوں''۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: یہ لابدی امر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو امتحان اور آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تاکہ اس امتحان میں اس کا دوست کامیاب ہو کر ظاہر ہو جائے اور دشمن ناکام ہو کر رسوا ہو جائے۔صابر مومن اور فاسق منافق کی پہچان ہو جائے۔اور اس سے مراد یوم احد ہے اللہ تعالیٰ نے اس دن مومنین کا امتحان لیا تھا جس میں ان کا ایمان، صبر، ثابت قدمی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ظاہر ہوئی اور منافقین کا پردہ چاک ہو گیا۔اور ان کی مخالفت اور جہاد سے انکار، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے خیانت بالکل واضح ہو گئی۔اسی لیے ارشاد فرمایا کہ یہ اس کی شان نہیں ہے کہ وہ مومنین کو ایک حال میں چھوڑ دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ پاک و پلید کو جدا جدا کرے۔مجاہد فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد میں اللہ تعالیٰ نے مومنین اور منافقین کے درمیان تمیز کر دی۔قتادہ کا قول ہے کہ جہاد اور ہجرت کا حکم دے کر ان کے درمیان تمیز فرما دی۔سدی فرماتے ہیں کہ منافقین نے کہا اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو ہمیں بتلائیں کہ ہم میں سے سچا مومن کون ہے اور کافر کون؟۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ: اگر اللہ تعالیٰ غیب سے پردہ اٹھانے والے اسباب پیدا نہ کرے تو تم بذات خود غیب کو نہیں جان سکتے حتیٰ کہ وہ خود ہی مومن اور منافق میں تمیز کر دیتا ہے۔پھر ارشاد فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اسے غیب کے لیے چن لیتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا ...... (الجن: 26)''ترجمہ: اللہ تعالیٰ غیب کو جاننے والا ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو آگاہ نہیں کرتا بجز اس کے رسول کے جس کو اس نے پسند فرما لیا ہو (غیب کی تعلیم کے لیے) اور پھر مقرر کر دیتا اس رسول کے آگے اور پیچھے محافظ''۔پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم اس پر ایمان لا کر تقویٰ اختیار کرو گے وہ تمہیں اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ: اور پھر یہ لوگ گمان نہ کریں کہ ان کا جمع کردہ مال انہیں نفع دے گا بلکہ یہ اس کے دین کے لیے ضرر رساں ہے۔اور بعض اوقات دنیا میں بھی نقصان کا موجب ہوتا ہے۔پھر ان کے مال کے انجام کے بارے میں بتایا کہ قیامت کے دن یہ مال ان کے گلے کا طوق سانپ بنایا جائے گا۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے اس کی زکوٰۃ

ادا نہ کی تو یہی مال قیامت کے دن ایک گنجا سانپ بن جائے گا جس کی آنکھوں پر دو نشان ہوں گے اور طوق کی شکل میں اس کے گلے میں لپٹ جائے گا اور اس کی باچھوں کو چیر دے گا اور کہے گا میں تمہارا مال ہوں۔ میں تمہارا خزانہ ہوں۔ پھر آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی(1)۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ قیامت کے دن اس کے مال کو زہریلے سانپ کی صورت میں بنا دیا جائے گا اور سانپ اس شخص کے پیچھے لگ جائے گا وہ اس سے بھاگے گا لیکن وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور کہے گا کہ میں تمہارا مال ہوں۔ پھر راوی نے دلیل کے طور پر یہ آیت پڑھی: سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ حضرت ثوبان ؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اپنے بعد خزانہ چھوڑ جاتا ہے۔ اس کا خزانہ زہریلا ناگ بن جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر دو نقطے ہوتے ہیں وہ اس شخص کے پیچھے لگ جاتا ہے وہ اس سے پوچھتا ہے تیرا برا ہو تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے میں تیرا وہ خزانہ ہوں جو تو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اور اس کے پیچھے لگا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنا ہاتھ سانپ کے منہ میں دے دیتا ہے اور وہ اسے کھا جاتا ہے۔ اور اسی طرح اس کے باقی جسم کو بھی۔ ایک اور روایت میں ارشاد فرماتے ہیں جو شخص اپنے آقا سے اپنی حاجت طلب کرے اور وہ اسے عطا نہ کرے۔ قیامت کے دن اس کے لیے بہت بڑا اژدھا بلایا جائے گا جو پھنکارتا ہوا اس کی طرف آئے گا۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کوئی رشتہ دار اپنے قریبی سے سوال کرے اور وہ بخل کی وجہ سے اسے عطا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کے لیے پھنکارتا ہوا اژدھا نکلے گا جو اس کے گلے میں لپٹ جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے آسمانوں کتب کے احکام کو چھپایا اور انہیں بیان کرنے میں بخل سے کام لیا۔ مگر پہلا قول ہی صحیح ہے اگرچہ یہ بھی اسی کے ضمن میں آجاتا ہے۔ پھر اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے تم اس کے دیئے ہوئے مال سے اس کی راہ میں خرچ کرو۔ تمام امور کا مرجع اسی کی طرف ہے۔ تم اپنے مالوں کو خرچ کرو تا کہ قیامت کے دن وہ تمہیں فائدہ دیں۔ اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں اور دل کے ارادوں سے باخبر ہے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

''بے شک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا کہ اللہ مفلس ہے حالانکہ ہم غنی ہیں ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) اور ہم کہیں گے کہ (اب) چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ تحقیق اللہ (تعالیٰ) نے اقرار لیا ہے ہم سے کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایک قربانی کھا لے اس کو آگ آپ فرمائیے آچکے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے

1۔ مسند احمد: 98/2

ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو اگر جھٹلاتے ہیں آپ کو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے جو لائے تھے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب''۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ: حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب آیت کریمہ ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا...... (بقرہ:245) ''ترجمہ: کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تو اللہ اس قرض اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے گا، اللہ تعالیٰ رزق کو تنگ کرتا ہے اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔ نازل ہوئی تو یہودی کہنے لگے اے محمد (ﷺ) کیا تمہارا رب فقیر ہو گیا ہے کہ اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ہی مروی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ ایک دن یہودیوں کے مدرسے گئے۔ آپ نے وہاں دیکھا کہ بہت سے لوگ فنحاص نامی یہودی عالم کے ارد گرد جمع ہیں اور اس کے ساتھ اشیاع نامی یہودی عالم بھی موجود ہے۔ آپ نے فرمایا اے فنحاص! اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ قسم بخدا تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور اس کے پاس سے حق لے کر آئے ہیں۔ ان کی صفات تورات وانجیل میں موجود ہیں۔ فنحاص نے جواب دیا اے ابو بکرؓ! ہم خدا کے محتاج نہیں بلکہ وہ ہمارا محتاج ہے۔ ہم اس کی بارگاہ میں عاجزی نہیں کرتے جس طرح کہ وہ ہمارے لیے عاجزی کرتا ہے بلکہ ہم اس سے بے پرواہیں اگر وہ ہم سے مستغنی ہوتا تو ہم سے قرض طلب نہ کرتا جس طرح تمہارے رسول (ﷺ) نے کہا۔ تمہیں تو سود سے روکتا ہے اور ہمیں سود دیتا ہے۔ اگر وہ غنی ہوتا تو ہمیں سود نہ دیتا یہ سن کر حضرت ابو بکر صدیقؓ کو سخت طیش آ گیا آپ نے اسے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تمہارے ساتھ معاہدہ نہ ہوتا تو اے دشمن خدا میں تیری گردن اڑا دیتا۔ اس کے بعد فنحاص رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور حضرت ابو بکرؓ کی شکایت کی۔ آپ نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا، تم نے کیوں مارا۔ آپ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس دشمن خدا نے بڑی غلط بات کہی ہے یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ یہ سن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ فنحاص اس بات سے مکر گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا: یعنی جو کچھ انہوں نے کہا ہے ہم اسے ان کے نامہ اعمال میں لکھ دیں گے۔ یہ ان کے لیے سخت وعید ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی ان کے قتل انبیاء کو ذکر کیا ہے۔ یعنی اللہ کے بارے میں تمہارا یہ خیال ہے اور اس کے رسولوں کے معاملہ میں تمہارا یہ رویہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی سخت سزا دے گا۔ اسی وجہ سے ارشاد فرمایا: وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (آل عمران:181) یعنی ان کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے انتہائی حقارت آمیز انداز میں فرمایا کہ آگ کا عذاب چکھو۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا: یہاں ان کے اس خیال کو جھوٹا ثابت کیا جا رہا ہے جو کہتے تھے کہ پہلے سے نازل شدہ آسمانی کتابوں میں یہ حکم دے رکھا ہے کہ کسی نبی پر ایمان نہ لانا حتیٰ کہ وہ تمہیں یہ معجزہ نہ دکھائے کہ اس امت میں جب کوئی شخص قربانی کرے تو اس قربانی پر آسمان سے آگ نازل ہو اور اسے کھا جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ تمہارے پاس بڑے دلائل اور براہین کے ساتھ پیغمبر تشریف لائے اور ان کو وہ معجزہ بھی عطا فرمایا گیا جس کا تم نے مطالبہ کیا تھا لیکن تم نے ان کی تصدیق کرنے کی بجائے ان کی مخالفت اور تکذیب کی حتیٰ کہ ان کو قتل کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے دعویٰ میں سچے نہیں ہو۔ کیونکہ اگر تم سچے ہوتے تو تم رسولوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ ان لوگوں کے جھٹلانے کی وجہ سے تمہیں غمگین نہ ہونا چاہئے بلکہ تم سے پہلے گزرے ہوئے رسول تمہارے لیے اسوہ ہیں۔ وہ دلائل و براہین، آسمانی صحائف اور کتب کے ساتھ مبعوث کیے گئے، اس کے باوجود ان کی تکذیب کی گئی۔ ''زُبُرٌ'' سے مراد وہ آسمانی کتابیں ہیں جو رسولوں پر صحیفوں کی طرح آسمان سے نازل ہوئیں۔

كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبۡلَوُنَّ فِىۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ ۚ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۸۶﴾

’’ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن پس جو شخص بچا لیا گیا آتش (دوزخ) سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر ساز و سامان دھوکہ میں ڈالنے والا۔ یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت دینے والی بہت باتیں اور اگر تم (ان دل آزاریوں پر) صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے‘‘۔

كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ: یہاں اللہ تعالیٰ نے عام اعلان فرمادیا ہے کہ ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: ’كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ ...... (رحمٰن: 26)‘‘ ترجمہ: جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے اور آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے باقی رہے گی‘‘۔ یعنی جن و انس، ملائکہ اور حاملین عرش سب فنا ہو جائیں گے اور صرف اللہ تعالیٰ وحدہ کو دوام اور بقا حاصل ہے وہی اول وہی آخر ہے۔ اس آیت کریمہ میں تمام لوگوں کو یہ تسلی دی جارہی ہے کہ اس روئے زمین پر کوئی بھی باقی نہیں بچے گا اور جب اس کائنات کی مقرر کردہ مدت ختم ہو جائے گی اور صلب آدم سے مقرر شدہ اولاد پیدا ہو جائے گی تو تمام مخلوقات کا خاتمہ کر دیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ قیامت قائم کرے گا اور ہر ایک کو اس کے چھوٹے اور بڑے عمل پر جزا یا سزا دے گا اور کسی پر بھی ایک ذرہ بھر ظلم نہیں کرے گا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: وَ اِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال مبارک ہوا تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی آرہا ہے۔ پاؤں کی آہٹ تو سنائی دیتی لیکن صورت نظر نہ آتی۔ اس نے آکر کہا اے اہلبیت! تم پر اللہ کی سلامتی ہو اور رحمت و برکت بھی۔ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے اور قیامت کے دن تمہیں تمہاری پوری اجرت مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے پاس ہر مصیبت کی تلافی، ہر مرنے والے کا بدلہ اور ہر فوت ہونے والا کا حاصل ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی اعتماد اور بھروسہ رکھو اور اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کرو۔ حقیقتاً مصیبت زدہ شخص وہ ہے جو ثواب سے محروم ہو۔ اور پھر آخر میں کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تمہیں معلوم ہے یہ کون ہے؟ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ: یعنی جسے نار جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب و کامران ہو گیا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں ایک کوڑا رکھنے کے برابر جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ (1)۔ اس حدیث کو حاکم اور ابن مردویہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ جسے یہ پسند ہو کہ اسے نار جہنم سے دور کر دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے اسے اس حال میں موت آنی چاہئے کہ اس کا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت

1۔ فتح الباری، کتاب الجہاد: 85/6

پر ایمان ہو اور لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہو جسے وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ یہ حدیث آیت کریمہ: لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران:102) کی تفسیر میں بھی گزر چکی ہے۔

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ: یہاں دنیا کی حقارت اور ذلت کا بیان ہے کہ یہ انتہائی ذلیل، فانی اور ڈھلتی چھاؤں کی طرح ہے۔ جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد فرمایا: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ''ترجمہ: البتہ تم دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت اس سے کہیں بہتر اور باقی رہنے والی ہے''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ''ترجمہ: پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس وہ بہت عمدہ اور باقی رہنے والا ہے''۔ حدیث پاک میں ہے کہ خدا کی قسم دنیا آخرت کے مقابلے میں صرف ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈبو لے تو اس کی انگلی کے پانی کو جو نسبت سمندر کے ساتھ ہے وہی نسبت دنیا کو آخرت سے ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ دنیا فانی اور ناپائیدار ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔ اس میں سے اللہ کی اطاعت کے لیے تھوڑا بہت حصہ لے لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا نیکی کی توفیق کوئی نہیں عطا کر سکتا۔

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ: یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ...... (بقرہ:155) ''ترجمہ: اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف، بھوک، تمہارے مال، جان اور پھلوں میں کمی کرنے کے ساتھ اور خوشخبری سنایئے ان صبر کرنے والوں کو''۔ کی مثل ہے۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ مومن کو اس کے مال، جان، اولاد اور اس کے اہل وعیال میں سے کسی ایک چیز کے ساتھ آزمایا جائے اور یہ آزمائش بقدر ایمان ہوتی ہے، ایمان قوی ہو تو آزمائش بھی قوی ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب فرماتا ہے کہ جب تم مکہ سے مدینہ آؤ گے تو تمہیں غزوۂ بدر سے پہلے اہل کتاب اور مشرکین سے تکلیف دہ باتیں سننا پڑیں گی اور پھر تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم صبر اور درگزر سے کام لو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں خوشحال کر دے۔ اور پھر ارشاد فرمایا یہ صبر کرنا اور تقویٰ اختیار کرنا بہت بڑی بات ہے۔ حضرت اسامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق مشرکین اور کفار کو معاف کر دیتے تھے اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف جہاد کی اجازت دے دی۔ حضرت اسامہؓ ہی روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر سے قبل رسول اللہ ﷺ اپنے دراز گوش پر سوار، مجھے اپنے پیچھے بٹھائے، حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لیے، حارث بن خزرج کے قبیلہ میں تشریف لے گئے۔ راستہ میں آپ کا گزر ایک مجلس میں ہوا۔ جس میں مسلمان یہودی، مشرک اور عبداللہ بن ابی جو کہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا بھی شامل تھا۔ حضور ﷺ کی سواری سے غبار اڑا تو ابن ابی نے اپنے ناک پر رومال رکھ دیا اور کہنے لگا کہ غبار نہ اڑاؤ۔ حضور ﷺ نے قریب پہنچ کر انہیں سلام کیا اور نیچے اتر کر اسلام کی دعوت دی اور قرآن پاک کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ یہ سن کر عبداللہ بن ابی کہنے لگا مجھے آپ کا یہ انداز پسند نہیں ہے۔ آپ کی باتیں اگرچہ حق ہی سہی لیکن ہمیں ہماری مجالس میں تکلیف نہ پہنچایا کریں۔ اپنے گھر جایئے اور جو آپ کے پاس آئے اسے پیغام سنائیں۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ضرور ہماری مجالس میں لایا کریں، ہمیں تو اس کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ اس بات پر مسلمان اور یہود طیش میں آ گئے۔ قریب تھا کہ لڑ پڑتے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے افہام وتفہیم سے خاموش کرا دیا۔ پھر آپ سواری پر سوار حضرت سعد بن عبادہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر حضرت سعدؓ سے فرمایا کہ عبداللہ بن ابی نے یہ یہ کہا ہے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کی آپ اسے معاف فرمایئے اور درگزر کیجئے قسم ہے اس خدا

کی جس نے آپ پر قرآن اتارا ہے۔ آپ سے اس کی دشمنی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے اسے سردار بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی تاجپوشی ہونے والی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ اس نے آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ ان پر حضور ﷺ نے اسے معاف کر دیا اسی طرح آپ اور آپ کے صحابہ مشرکین اور اہل کتاب کو معاف کر دیتے تھے اور ان کی تکالیف پر صبر کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف جہاد کی اجازت دے دی۔ غزوۂ بدر میں جب قریش کے بڑے بڑے سردار قتل ہو گئے تو عبداللہ بن ابی اور اس کے مشرک ساتھی گھبرا گئے اب ان کے لیے مسلمان ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں لہٰذا وہ مسلمان ہو گئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی حق کی دعوت دیتا ہے یا نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے تو یہ لابدی امر ہے کہ لوگ اسے اذیت پہنچاتے ہیں اور اس کا صبر، اللہ سے طلب اعانت اور اس کی بارگاہ میں رجوع کے علاوہ کوئی علاج نہیں۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

”اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے لیا پختہ وعدہ تو ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو تو (الٹا) انھوں نے پھینک دیا اس وعدہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے اور انہوں نے خرید لی اس کے عوض تھوڑی سی قیمت۔ سو بہت بڑی ہے وہ چیز جو وہ خرید رہے ہیں ہرگز آپ یہ خیال نہ کریں کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنی کارستانیوں پر اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے کیے ہی نہیں تو ان کے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ وہ امن میں ہیں عذاب سے ان کے لیے ہی تو دردناک عذاب ہے اور اللہ ہی کے لیے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے“۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل کتاب کو زجر و توبیخ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاءؑ کے ذریعے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ذکر کو لوگوں میں عام کرتے رہیں گے تاکہ وہ آپ کی بعثت کے انتظار میں رہیں اور جب اللہ تعالیٰ ان کو مبعوث فرمائے تو ان پر ایمان لا کر ان کی اتباع کریں لیکن انہوں نے اس عہد کی خلاف ورزی کی اور آپ کی صفات کو چھپا دیا اور دنیا و آخرت کے انعام و اکرام کے بدلے میں دنیا کے حقیر اور عارضی فوائد کو اختیار کر لیا۔ اور اس طرح انہوں نے ایک بہت بڑے گھاٹے کا سودا کیا۔ یہاں علماء کرام کے لیے بھی ضروری ہے کہ اگر انہوں نے بھی ان کا راستہ اختیار کیا تو وہ بھی اسی سزا کے مستحق ہوں گے علماء کو چاہئے کہ ان کے پاس جو نفع بخش علم ہو وہ لوگوں کو عمل کی طرف لے جائے، اسے لوگوں میں عام کریں۔ اس علم کو ہرگز نہ چھپائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص سے علم کا کوئی مسئلہ پوچھا جائے۔ وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ: اس آیت کریمہ میں ریاکاروں کی مذمت کی جا رہی ہے۔ یہاں ان لوگوں کی بھی مذمت ہے جو کسی غیر

کے مال پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے جھوٹا دعویٰ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مال میں کمی کر دیتا ہے اور جو شخص ایسی چیز کے ساتھ اپنی آسودہ حالی ظاہر کرتا ہے جو اسے عطا نہیں کی گئی وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے یعنی وہ جھوٹا ہے(1)۔ ایک مرتبہ مروان نے اپنے دربان رافع سے کہا عبداللہ بن عباسؓ کے پاس جاؤ اور انہیں عرض کرو کہ اگر اپنے کام پر خوش ہونے اور نہ کیے ہوئے کام پر تعریف پسند کرنے باعث خدا کا عذاب ہوگا تو ہم میں سے کوئی بھی اس سے نہیں بچ سکے گا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا اس آیت سے کیا تعلق ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے جب اہل کتاب میں سے کسی نے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے حق کو چھپالیا اور اس کے برعکس جواب دے دیا اور باہر نکل کر یہ گمان کرنے لگے کہ ہم نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا اور یہ بھی خواہش کرنے لگے کہ ہماری تعریف کی جائے اور حق چھپانے پر خوش بھی ہونے لگے۔ اس آیت کریمہ میں ان کی اس روش کا بیان ہے(2)۔ ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ میدان جنگ میں تشریف لے جاتے تو منافقین اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر خوش ہوتے اور جب حضور ﷺ جنگ سے واپس تشریف لاتے تو یہ طرح طرح کے بہانے بنا کر معذرت کرتے اور قسمیں اٹھاتے اور چاہتے کہ ان کے اس طرز عمل پر تعریف کی جائے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی مروان نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی اس آیت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ آیت کریمہ ان منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے اور جہاد کے لئے مسلمانوں کے ساتھ نہ جاتے۔ اگر اس لشکر کو نقصان پہنچتا تو یہ خوش ہوتے اور اگر انہیں نصرت اور کامیابی حاصل ہوتی تو یہ لوگ قسمیں اٹھا کر مسلمانوں کو راضی کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ سن کر مروان نے کہا کہاں یہ واقعہ اور کہاں یہ آیت۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے زید بن ثابتؓ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ واقعہ انہیں بھی معلوم ہے۔ مروان نے زید بن ثابتؓ سے پوچھا کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟ انہوں نے جواب دیا ابوسعید نے سچ کہا ہے۔ پھر ابوسعید فرمانے لگے اس کے بارے میں رافع بن خدیج کو بھی معلوم ہے۔ لیکن اسے خوف ہے کہ اگر اس نے تمہیں یہ واقعہ بتا دیا تو صدقہ کی اونٹنیاں اس سے چھین لی جائیں گی۔ پھر جب وہ مروان کی مجلس سے باہر نکلے تو حضرت زیدؓ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے کہا میں نے جو تمہاری گواہی دی ہے کیا تم اس پر میری تعریف نہیں کرو گے تو انہوں نے فرمایا تم نے سچی گواہی دی ہے تو حضرت زید فرمانے لگے کیا سچی گواہی پر تعریف نہیں ہوتی۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب مروان بن حکم مدینہ کا گورنر تھا۔ اس سے پہلے اس آیت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا جواب گزر چکا ہے لیکن دونوں جوابوں کے بارے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آیت کریمہ عموم پر دلالت کرتی ہے اور ان تمام واقعات کو شامل ہے۔ حضرت ثابت بن قیس انصاریؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ مجھے اپنی ہلاکت کا بڑا خدشہ ہے۔ آپ نے پوچھا کیوں؟ تو عرض کی اللہ تعالیٰ نے ایسے عمل پر تعریف کو پسند کرنے سے منع فرمایا ہے جو اس نے خود نہ کیا ہو۔ حالانکہ مجھے تعریف پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تکبر سے منع کیا ہے۔ حالانکہ میں جمال کو پسند کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ کی آواز سے اپنی آوازوں کو بلند کرنے سے منع فرمایا ہے میری حالت یہ ہے کہ میری آواز انتہائی بلند ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں یہ چیز پسند نہیں ہے کہ تمہاری زندگی بہترین ہو۔ اللہ کی راہ میں تم شہید کیے جاؤ اور جنت میں داخل ہو جاؤ۔ انہوں نے عرض کی کیوں نہیں؟ یارسول اللہ ﷺ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا وہ خوشگوار زندگی گزار مسیلمہ کذاب کے خلاف معرکہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اس آیت کریمہ میں ''تَحْسَبَنَّهُمْ'' کو (یَحْسَبَنَّهُمْ) بھی پڑھا

1۔ مسلم، کتاب اللباس: 1681　　2۔ مسند احمد: 298/1

گیا۔ اس وقت معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ عذاب الٰہی سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہ اس لیے ارشاد فرمایا کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے پھر ارشاد فرمایا کہ زمین وآسمان کی بادشاہی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی وہ کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے۔ اس کے سامنے کسی چیز کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اس لیے اس سے ڈرتے رہو اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو اور اس کے غضب اور انتقام سے بچنے کی کوشش کرو۔ اس سے بڑھ کر کوئی عظیم ہے اور نہ قدرت والا۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ ۖ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ أَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۖ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿١٩٤﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں بڑی نشانیاں ہیں اہل عقل کے لیے۔ وہ عقل مند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں) اے ہمارے مالک! نہیں پیدا فرمایا تو نے یہ (کارخانہ حیات) بے کار پاک ہے تو (ہر عیب سے) بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے اے ہمارے رب! بے شک تو نے جسے داخل کر دیا آگ میں تو رسوا کر دیا تو نے اسے اور نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار اے ہمارے رب! بے شک سنا ہم نے منادی کرنے والے کو کہ بلند آواز سے بلاتا تھا ایمان کی طرف (اور کہتا تھا) کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے مالک! پس بخش دے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں اور (اپنے کرم سے) موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ۔ اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ اپنے رسولوں کے ذریعے اور نہ رسوا کر ہمیں قیامت کے دن۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا''۔

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قریش یہود کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ حضرت موسیٰ تمہارے پاس کیا معجزات لے کر آئے۔ انہوں نے جواب دیا عصا اور ید بیضا۔ پھر عیسائیوں کے پاس گئے اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مادر زاد اندھوں کو بینا کر دیتے، کوڑھ کے مریض کو اچھا کر دیتے اور مردوں کو زندہ کرتے۔ اس کے بعد قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہمارے لیے صفا کے پہاڑ کو سونا بنا دے۔ إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ نازل ہوئی۔ یعنی اہل عقل کے لیے اس کائنات میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ اگر وہ صرف انہی میں غور وفکر کریں تو یہ

1۔ مسلم، کتاب صفات المنافقین: 2142

کسی معجزے سے کم نہیں ہیں۔ لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ یہ سوال مکہ میں ہوا تھا اور یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان کی بلندی اور وسعت، زمین کی پستی اور کثافت، آسمان میں رواں دواں سیاروں اور ستاروں، زمین میں بڑے بڑے سمندروں، پہاڑوں، وسیع میدانوں، سرسبز کھیتیوں اور پودوں، رنگ رنگ کے پھلوں، مختلف النوع کے جانوروں اور معدنیات، انواع واقسام کے کھانوں، طرح طرح کے کئی خوشبوؤں، گردش لیل ونہار اور ان کے گھٹنے اور بڑھنے میں اہل عقل ودانش کے لیے نشانیاں ہیں۔ یعنی ان واضح نشانیوں میں غور وفکر کر کے انسان اپنے خالق کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔ اہل عقل سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقل انتہائی پختہ اور پاکیزہ ہو جو آسانی سے اشیاء کی حقیقت کا ادراک کر سکے۔ اس سے مراد بے عقل گونگے بہرے نہیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا: وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف: 105) ''اور کتنی ہی بے شمار نشانیاں ہیں جو آسمانوں اور زمین (ہر گوشے) میں (سجی ہوئی) ہیں جن پر یہ (ہر صبح وشام) گزرتے ہیں اور وہ ان سے روگردانی کیے ہوئے ہیں''۔ پھر اللہ تعالیٰ اہل عقل کی صفات بیان فرماتا ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر اور پھر اگر اس طرح بھی نہ پڑھ سکو تو پہلو پر لیٹ کر یعنی اہل اللہ کسی حال میں بھی اللہ کے ذکر کو ترک نہیں کرتے اور ہر حال میں اپنی زبان ودل کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمین وآسمان کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں اور ان حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو خالق کی عظمت وقدرت اور اختیار ورحمت پر دال ہیں۔ شیخ ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ میں جب بھی گھر سے باہر نکلتا اور میری نظر کسی چیز پر پڑتی تو میں دیکھتا کہ اس چیز میں میرے لیے ایک نعمت بھی موجود ہے اور وہ میرے لیے باعث عبرت بھی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ لمحہ بھر کے لیے غور وفکر کرنا رات بھر کے قیام سے افضل ہے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے کہ فکر وتدبر ایک ایسا آئینہ ہے جو تم پر برائیوں اور اچھائیوں کو واضح کر دیتا ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ غور وفکر ایسا نور ہے جو تیرے دل میں داخل ہوتا ہے اور بسا اوقات یہ شعر پڑھتے۔

جب انسان غور وفکر کرنے کا عادی ہو تو اس کے لیے ہر شے باعث عبرت ہوتی ہے

حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ خوشخبری ہے اس شخص کے لیے جس کا قول باعث نصیحت اور جس کی خاموشی غور وفکر اور جس کا دیکھنا عبرت حاصل کرنے کے لیے ہو۔ حضرت لقمان حکیم فرماتے ہیں کہ طویل گوشہ نشینی غور وفکر کا باعث ہے اور طویل غور وفکر راہ جنت کی علامت ہے۔ حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں کہ جس قدر غور وفکر زیادہ ہوگا اسی قدر سمجھ بوجھ بھی تیز ہوگی اور جس قدر سمجھ بوجھ تیز ہوگی اسی قدر علم نصیب ہوگا اور جس قدر علم زیادہ ہوگا اسی کے مطابق نیک اعمال بھی بڑھتے جائیں گے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں کہ زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھنا بہتر ہے اور اللہ کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا سب سے افضل عبادت ہے۔ حضرت مغیث اسودؒ فرماتے ہیں کہ ہر روز قبروں کی زیارت کیا کرو تاکہ تمہیں اپنے انجام کا فکر ہو اور پھر اپنے دل میں اس منظر کو حاضر کرو کہ خدا تعالیٰ کے سامنے دو گروہ حاضر ہیں ایک جنت کی طرف جانے والا ہے اور دوسرا جہنم کی طرف۔ اور اپنے ذہنوں اور بدنوں کو دوزخ کی آگ، اس کے ہتھوڑے اور اس کے مختلف طبقات کا شعور دلاؤ۔ اس کے بعد آپ رونے لگتے۔ یہاں تک کہ آپ بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک شخص کسی راہب کے پاس سے گزرا جو قبرستان اور گندگی کے ڈھیر کے درمیان ڈیرہ لگائے ہوئے تھا۔ اس نے راہب کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا تیرے پاس دنیا کے دو خزانے ہیں جو تیرے لیے باعث عبرت ہیں۔ایک خزانہ قبرستان اور ایک خزانہ مال کا یعنی کوڑا کرکٹ کا ڈھیر۔حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بعض اوقات کسی ویران کھنڈر کے پاس جاتے تو بڑی غمگین آواز کے ساتھ کہتے۔اے اجڑے ہوئے دیارو! تمہارے مکین کہاں ہیں؟ پھر خود ہی فرماتے کہ اللہ کی ذات کے سوا ہر شے فانی ہے۔حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور قلب کے ساتھ پڑھی ہوئی دو مختصر رکعات اس رات بھر کی عبادت سے افضل ہے جس میں دل غافل ہو۔حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں اے ابن آدم! اپنے پیٹ کے ایک تہائی حصے میں کھانا کھاؤ دوسرے حصے میں پانی پیو اور تیسرے حصے کو سانس لینے کے لیے چھوڑ دو تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرسکو۔کسی دانا کا قول ہے کہ جو شخص بغیر عبرت کے دنیا کی طرف دیکھتا ہے اسی غفلت کی مقدار اس کے دل کا نور ماند پڑ جاتا ہے۔حضرت عمرو بن عبد قیس فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے صحابہؓ سے سنا ہے کہ نور ایمان غور و فکر کا نام ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم! جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو، دنیا میں مہمان بن کر رہو، مسجدوں کو اپنا گھر بنا لو، اپنی آنکھوں کو رونا، جسم کو صبر، اور دل کو غور و فکر کی تعلیم دو۔کل کی روزی کا غم نہ کرو۔امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ رونے لگے جب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ میں نے دنیا کی لذتوں اور خواہشات میں غور و فکر کیا اور ان سے عبرت حاصل کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا کی تمام لذات آخر کار مکدر ہو جاتی ہیں اگر اس میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت نہ ہو تو کم از کم نصیحت حاصل کرنے والے کے لیے نصیحت ہو۔حسین بن عبد الرحمٰن فرماتے ہیں کہ مومن کی خوشی غور و فکر میں ہے۔اور اس کی لذت عبرت حاصل کرنے میں ہے۔ہم ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں۔بعض غافل ایسے ہیں کہ ان کی عمر کا اکثر حصہ گزر گیا لیکن انہیں اس کا شعور تک نہ ہوا۔بعض اوقات انسان کی زندگی اس کی دلپسند خواہشات کے مطابق ہوتی ہے مگر زمانہ جلد ہی اسے بدل دیتا ہے۔ہم اللہ کی محبت میں حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔یقیناً ان امور میں غور و فکر کرنے سے عقل مند آدمی کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو اس کی ذات وصفات اور قدرت پر دلالت کرنے والی نشانیوں میں غور و فکر نہیں کرتے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ ...... وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (یوسف:106) ''ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر یہ (صبح و شام) گزرتے ہیں اور ان سے روگردانی کیے ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر اس حالت میں کہ وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں''۔اس کے بعد اللہ اپنے ان مومن بندوں کی تعریف فرماتا ہے جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے اس کا ذکر کرتے ہیں۔اور زمین و آسمان کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں اے باری تعالیٰ! تو نے اس مخلوق کو عبث اور بیکار پیدا نہیں کیا بلکہ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ برے اعمال والوں کو ان کے اعمال بد کی سزا اور اچھے عمل والوں کو ان کے اعمال حسنہ کی جزا عطا فرمائے۔پھر اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں کہ تو اس سے منزہ ہے کہ کسی چیز کو بیکار پیدا کرے۔اے عدل و انصاف کے ساتھ مخلوق کو پیدا کرنے والے! اے ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک! ہمیں اپنی قوت و طاقت سے آگ سے بچا اور ایسے اعمال کی توفیق عطا فرما جس سے تو راضی ہو جائے اور ان اعمال کی برکت سے ہمیں جنت کی راہ دکھا اور اپنے دردناک عذاب سے محفوظ رکھ۔پھر عرض کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار! جس کو تو نے نار جہنم میں داخل کیا وہ تمام اہل حشر کے سامنے رسوا ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔اور نہ تیری مشیت اور ارادے کے سامنے انہیں کوئی بچانے والا ہوگا۔اے ہمارے رب! ہم نے ایک نداء دینے والے کی نداء سنی جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا یعنی رسول اللہ ﷺ۔آپ ارشاد فرمارہے تھے کہ اپنے رب

پر ایمان لے آؤ۔ ہم آپ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لے آئے اور آپ کی اتباع کی۔ اے ہمارے پروردگار! ہم تجھ پر ایمان لے آئے اور تیرے نبی مکرم ﷺ کی اتباع کی۔ اس کی برکت سے ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے۔ ہماری برائیوں کی پردہ پوشی فرما اور ہمیں نیک اور صالح لوگوں کے ساتھ ملا دے۔ اور تو نے جو ان سے وعدے اپنے رسولوں کی زبانی کیے انہیں پورا فرما۔ اس کا یہ بھی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ وہ وعدہ جو تو نے اپنے رسولوں پر ایمان لانے کا کیا تھا۔ لیکن پہلا مفہوم زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عسقلان ان دو شہروں میں سے ایک ہے جہاں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ستر ہزار ایسے افراد اٹھائے گا جن سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا اور پچاس ہزار ایسے شہداء کو اٹھائے گا جو وفد بن کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور یہیں سے شہداء کی ایسی صفیں ہوں گی جن کے کٹے ہوئے سر ان کے ہاتھوں میں ہوں گے اور ان کی رگوں سے خون جاری ہوگا اور وہ اللہ کی بارگاہ میں عرض کریں گے: رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا ...... اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے ان بندوں نے سچ کہا۔ انہیں نہر بیضاء میں غسل دو۔ یہ غسل کے بعد اس نہر سے اس حال میں نکلیں گے کہ ان کا رنگ صاف سفید ہوگا اور وہ جنت میں جہاں چاہیں گے سیر کریں گے۔ یہ حدیث غریب ہے اور بعض نے اسے موضوع کہا ہے۔ واللہ اعلم۔

لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ : اے اللہ! ہمیں قیامت کے دن لوگوں کے سامنے رسوا نہ کرنا۔ تیرا وعدہ سچا ہے۔ اور وہ ضرور پورا ہوگا۔ جس کے بارے میں تیرے رسولوں نے بھی خبر دی ہے۔ یعنی قیامت کے دن ساری مخلوق تیرے سامنے حاضر ہوگی۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ابن آدم کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اتنی رسوائی اور شرمندگی ہوگی کہ وہ آگ میں جانے کی تمنا کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ جب نماز تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو آپ آل عمران کی آخری دس آیات تلاوت فرماتے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ ام المومنین حضرت میمونہؓ کے پاس تھا۔ جب رات ہوئی تو رسول اللہ ﷺ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کچھ دیر کے لیے محو گفتگو رہے پھر آرام فرما ہو گئے۔ جب رات کا تہائی حصہ رہ گیا تو آپ نیند سے بیدار ہوئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر یہ آیت کریمہ: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... تلاوت فرمائی اور پھر مسواک کی اور وضو فرمایا اور پھر گیارہ رکعت نماز ادا فرمائی۔ پھر جب حضرت بلالؓ نے اذان دی تو دو رکعت سنت ادا فرمائی اور پھر مسجد میں تشریف لا کر لوگوں کو نماز پڑھائی(1)۔ امام بخاریؒ نے دوسرے مقام پر یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں تکیے کی عرض کی طرف لیٹا، رسول اللہ ﷺ اور آپ کی زوجہ محترمہ حضرت میمونہؓ تکیے کے طول کی طرف لیٹ گئے۔ آدھی رات یا اس سے کچھ پہلے یا بعد رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور اپنے دست مبارک کے ساتھ اپنی نیند کو دور کیا اور پھر آل عمران کی دس آیات تلاوت فرمائیں۔ اور پھر ایک لٹکے ہوئے مشکیزے سے پانی لے کر اچھی طرح وضو فرمایا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ میں بھی کھڑا ہوا اور اسی طرح سب کچھ کیا اور آپ کی بائیں جانب نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھ کر میرے کان کو پکڑا اور مجھ گھما کر اپنی دائیں جانب کر لیا اور دو دو رکعات کر کے چھ مرتبہ یعنی بارہ رکعات پڑھیں پھر وتر ادا کیے اور پھر آرام فرما گئے۔ یہاں تک موذن نے آ کر صدا دی۔ تو آپ نے دو مختصر رکعتیں ادا کیں اور باہر آ کر صبح کی نماز پڑھائی(2)۔ ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے حکم دیا کہ میں ایک رات رسول اللہ ﷺ کے گھر گزاروں اور آپ کی نماز کی کیفیت دیکھوں۔ حضرت عبد اللہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھائی۔ میرے سوا تمام صحابہ کرام گھروں کو چلے گئے۔ جب حضور ﷺ میرے پاس سے گزرے تو فرمایا کون ہو؟

1۔ فتح الباری، تفسیر آل عمران: 235/8　2۔ فتح الباری، کتاب التفسیر: 237,236/8

عبداللہ ہو۔ میں نے عرض کی ہاں۔ فرمایا مسجد میں کیوں رہے ہوئے ہو۔ میں نے عرض کی میرے والد نے حکم فرمایا ہے کہ میں آج کی رات آپ کے پاس گزاروں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے میرے ساتھ آؤ۔ گھر میں داخل ہوا تو فرمایا عبداللہ بستر بچھاؤ۔ بالوں کا بنا ہوا ایک تکیہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس پر سر رکھ کر سو گئے حتیٰ کہ مجھے ان کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ پھر آپ بیدار ہوئے اور بستر پر بیٹھ کر آسمان کی طرف سر اٹھایا اور تین مرتبہ (سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ) پڑھا اور آل عمران کی آخری آیات تلاوت فرمائیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ان آیات کے بعد یہ دعا پڑھی (اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَ فِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَ فِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَ عَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَ عَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا وَ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ نُوْرًا وَ مِنْ خَلْفِیْ نُوْرًا وَ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَ مِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا وَ اَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ) ''ترجمہ: اے بار خدایا! میرے دل کان اور میری آنکھ میں نور کر دے، اور میرے دائیں اور بائیں، سامنے اور پیچھے اوپر اور نیچے نور کر دے، اور قیامت کے دن میرے نور کو عظیم کر دے''۔ یہ دعا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے شروع میں طبرانی کے حوالے سے جو حدیث گزری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ یہ آیت کریمہ مدنی ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عطاءؒ، ابن عمرؓ اور عبید بن عمیرؒ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے درمیان اور ان کے درمیان پردہ تھا۔ ام المومنین نے حضرت عبید سے فرمایا کہ تم کیوں نہیں آیا کرتے۔ آپ نے جواب دیا کسی شاعر کا قول ہے کہ (کم ملا کرو تا کہ محبت بڑھے)۔ حضرت ابن عمرؓ نے عبید سے کہا کہ ان باتوں کو چھوڑو۔ ہم تو اس لیے حاضر ہوئے کہ آپ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی کوئی ایسی بات بتائیں جو عجیب ہو۔ آپ یہ سن کر رونے لگیں اور فرمانے لگیں کہ حضور ﷺ کے تمام کام تعجب انگیز تھے اچھا ایک واقعہ سنو! ایک رات میری باری میں حضور ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میرے ساتھ سو گئے پھر فرمانے لگے اے عائشہ! میں اپنے رب کی کچھ عبادت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے جانے دو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں آپ کا قرب پسند کرتی ہوں اور میری یہ بھی خواہش ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کریں۔ آپ کھڑے ہوئے اور مشکیزے سے پانی لے کر وضو فرمایا اور بہت کم پانی استعمال کیا اور پھر نماز میں مشغول ہو گئے۔ پھر اتنا روئے کہ ریش مبارک آنسو سے تر ہو گئی اور پھر سجدے میں گئے اور اتنا روئے کہ زمین آنسوؤں سے میراب ہو گئی۔ پھر آپ پہلو کے بل لیٹ گئے اور روتے رہے حتیٰ کہ حضرت بلالؓ نے آ کر نماز کے لیے بلایا اور آنسو دیکھ کر عرض کی۔ یا رسول اللہ آپ کس لیے روئے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے وہ تمام الزامات دور فرما دیئے ہیں (جو آپ پر ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد لگائے گئے)۔ آپ نے فرمایا اے بلال! میں کیوں نہ روؤں۔ مجھ پر آج رات یہ آیت نازل ہوئی ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ پھر فرمایا ہلاکت ہے اس کے لیے جس نے اس آیت کو پڑھا اور غور و فکر نہ کیا۔ عبد بن حمید کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ ہم نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں سلام عرض کیا تو آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ ہم نے اپنے نام بتائے۔ اور آخر میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے اپنے رخسار کے نیچے اپنا دست مبارک رکھا اور روتے رہے حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ آپ کے آنسوؤں نے زمین کو تر کر دیا ہے۔ اور حضرت بلالؓ کے جواب میں یہ بھی فرمایا کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں (1)۔ امام اوزاعیؒ سے ان آیات میں غور و فکر کرنے کی غایت کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا ان آیات کو اس طرح پڑھے کہ ان کے معانی کو اچھی طرح سمجھ لے۔ ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ حضور ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ہر رات سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

1۔ الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان، کتاب الرقاق: 9,8/2

فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَیِّاٰتِهِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

''تو قبول فرمالی ان کی التجا ان کے پروردگار نے (اور فرمایا) کہ میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد ہو یا عورت بعض تمہارا جز ہے بعض کی تو وہ جنہوں نے ہجرت کی اور نکالے گئے اپنے وطن سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور (دین کے لیے) لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں مٹادوں گا ان (کے نامہ عمل) سے ان کے گناہ اور ضرور داخل کروں گا انہیں باغوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ (یہ) جزاء ہے (ان کے اعمال حسنہ کی) اللہ کے ہاں اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے''۔

فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ: یہاں اِسۡتَجَابَ بمعنی اَجَابَ ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہجرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ انصار کا بیان ہے کہ ہجرت کے موقع پر سب سے پہلے جو عورت مدینہ پہنچی وہ ام سلمہؓ ہی تھیں۔ آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ صاحب عقل وایمان لوگوں نے جب اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی جن کا ذکر پہلی آیات میں آچکا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا۔ اس لیے اس آیت کو فاء کے ساتھ شروع کیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ '' ترجمہ: جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق پوچھیں (تو انہیں بتادو) کہ میں ان کے قریب ہوں اور دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے۔ پس انہیں چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ ہدایت پاسکیں''۔

اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ: اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت کی جارہی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ تم میں سے کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا بلکہ ہر عمل کرنے والے کو اس کی پوری پوری جزادیتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یعنی وہ ارشاد فرماتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک ثواب میں برابر ہے۔

وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا: وہ لوگ جو دار شرک وکفر کو چھوڑ کر دار ایمان کی طرف آگئے اور دین کی خاطر اپنے دوست واحباب، بہن بھائی اور عزیز واقارب چھوڑے۔ اور وہ جن کو مشرکین نے تنگ کیا حتیٰ کہ انہیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کردیا۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ جن کو میری راہ میں تکلیف دی گئی۔ ان کا گناہ صرف یہی تھا کہ وہ خدا وحدہ لاشریک پر ایمان لائے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَ اِیَّاكُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ (الممتحنہ:1) '' ترجمہ: انہوں نے رسول مکرم ﷺ اور تمہیں مکہ سے محض اس لیے نکالا کہ تم ایمان لائے ہو اللہ پر جو تمہارا پروردگار ہے''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ (بروج:8)۔ '' ترجمہ: اور نہیں ناپسند کیا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں سے بجز اس کے کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر، وہ سب پر غالب، سب خوبیوں سراہا ہے''۔

وَقٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا: اور یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے کہ مومن اللہ کی راہ میں جہاد کرے، اس کی سواری زخمی ہو جائے، اس کا منہ خاک وخون

میں رنگین ہو جائے۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر میں صبر، نیک نیتی اور دلیری سے آگے بڑھ کر، اور پیٹھ نہ پھیر کر جہاد کروں تو کیا اللہ تعالیٰ میرے گناہ معاف فرمادے گا آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر فرمایا۔ ذرا اپنا سوال دہرانا تم نے ابھی کیا کہا تھا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ آپ نے فرمایا ہاں قرض کے سوا تمام خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ یہ بات ابھی ابھی جبریل مجھے بتا کر گئے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں ان کی برائیوں کو معاف کر دوں گا اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن میں مختلف قسم کی نہریں رواں ہوں گی۔ کوئی دودھ کی ہوگی، کوئی شہد ہوگی اور کوئی شراب کی ہوگی اور کوئی صاف پانی کی۔ اور اس کے علاوہ ایسی نعمتیں ہوں گی جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسانی دل پر اس کا خیال گزرا۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی تاکہ ان چیزوں کی عظمت پر دلالت ہو۔ کیونکہ جو ذات عظیم اور کریم ہو اس کا عطیہ بھی عظیم اور بے انتہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

اگر ممدوح سزا دے تو وہ سزا سخت ہوتی ہے اور اگر عطا کرے تو وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ: نیک عمل کرنے والے کی بہترین جزاء اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ حضرت شداد بن اوسؓ فرمایا کرتے تھے۔ اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی قضا پر غمگین نہ ہو جایا کرو۔ وہ کسی مومن پر ظلم نہیں کرتا اگر تمہیں کوئی خوشی اور راحت پہنچائے تو اس کی حمد وثناء بیان کرو۔ اگر کوئی تکلیف پہنچے تو صبر کرو اور نیکی وثواب کی تمنا رکھو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہر عمل کی بہترین اور عمدہ جزاء ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

"(اے سننے والے!) نہ دھوکا میں ڈالے تجھے چلنا پھرنا ان کا جنہوں نے کفر کیا ملکوں میں یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لیے ہے پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے لیکن وہ جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے ان کے لیے باغ ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے ندیاں (وہ متقی) ہمیشہ رہیں گے ان میں یہ تو مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو (ابدی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ بہتر ہیں نیکوں کے لیے"۔

لَا يَغُرَّنَّكَ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کافروں کی خوشی ومسرت، ناز ونعمت اور خوشحالی کی طرف نہ دیکھئے۔ یہ سب عنقریب زائل ہو جائے گا اور پھر انہیں اپنے برے اعمال کی سزا میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ ہم نے ان کو جو مہلت دے رکھی ہے وہ بطور آزمائش ہے اور یہ تمام نعمتیں آخرت کے مقابلہ میں انتہائی حقیر ہیں۔ یہی مفہوم ان آیات میں بھی بیان کیا ہے۔ 1۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ...... الخ "ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لطف اندوزی ہے اس دنیا میں (چندروزہ) پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے۔ پھر ہم انہیں چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ کفر کیا کرتے تھے"۔ 2۔ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ ...... "ترجمہ: ہم لطف اندوز ہونے دیں گے انہیں تھوڑی دیر۔ پھر ہم انہیں ہانک کر لے جائیں گے سخت عذاب کی طرف"۔ 3۔ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا "ترجمہ: پس آپ کفار کو تھوڑی مہلت اور دے دیجئے کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہئے"۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ: جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کافروں کے احوال اور آخرت میں ان کے ٹھکانے جہنم کا ذکر کیا تو اس کے بعد

مومنین اور متقین کے لیے انعامات کا ذکر فرماتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان متقین کو ابرار اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ اپنے ماں باپ اور اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس طرح تیرے والدین کا تجھ پر حق ہے۔ اسی طرح تیری اولاد کا بھی تجھ پر حق ہے۔ یہی روایت حضرت ابن عمرؓ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ ابرار وہ ہیں جو اپنی اولاد کو اذیت نہیں پہنچاتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ہر شخص کے لیے موت اچھی ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد ہو۔ اگر وہ نیک ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ارشاد فرمایا ہے: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ اور برے لوگوں کے لیے بھی موت بہتر ہے۔ کیونکہ ان کے زندہ رہنے میں ان کے اعمال بد میں اضافہ ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ...... ''ترجمہ: اور نہ خیال کریں جو کفر کررہے ہیں کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے ہیں یہ ان کے لیے بہتر ہے۔ ہم تو انہیں صرف اس لیے مہلت دے رہے ہیں تا کہ وہ اور زیادہ گناہ کرلیں اور ان کے لیے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ہے''۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

''اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی اور (نیازمندی) کرنے والے ہیں اللہ کے لیے۔ نہیں سودا کرتے اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمتوں پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ثواب ان کے رب کے پاس۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمربستہ رہو (خدمت دین کے لیے) اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ''۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اہل کتاب کے اس گروہ کی خبر دی ہے جو اللہ تعالیٰ اس کے رسول ﷺ اور قرآن حکیم پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلی سماوی کتب پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور اس کے سامنے خشوع وخضوع کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان کی کتابوں میں جو نبی کریم ﷺ کی آمد کی بشارت۔ آپ کے اور آپ کی امت کے اوصاف کا ذکر ہے وہ انہیں چھپاتے نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں یہی بہترین لوگ ہیں۔ خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی۔ اللہ تعالیٰ سورۂ قصص میں ان کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ...... ''ترجمہ: جن کو ہم نے عطا فرمائی کتاب (نزول) قرآن سے پہلے۔ وہ اس پر ایمان لائے ہیں اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ۔ بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے۔ ہم اس سے پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو مرتبہ دیا جائے گا بوجہ ان کے صبر کے''۔ دوسری جگہ فرماتا ہے: لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ ...... ''سب یکساں نہیں۔ اہل کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے وقت تلاوت کرتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں''۔ یہ صفات اہل یہود میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور آپ کے علاوہ دوسرے یہودی علماء جو مسلمان ہوگئے۔ ان کی تعداد دس سے زیادہ نہیں۔ مگر نصرانی اکثر حق کی اطاعت کرتے

ہیں اور طلب ہدایت میں کوشاں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً...... ترجمہ: آپ ضرور پائیں گے سب لوگوں سے زیادہ دشمنی رکھنے والے مومنوں سے یہود کو اور مشرکوں کو۔ اور آپ ایمان والوں سے سب سے زیادہ قریب انہیں پائیں گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں'' ۔اس لیے یہاں ارشاد فرمایا۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر عظیم ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے سامنے عیسائی علماء کی موجودگی میں سورۂ مریم کی آیات تلاوت فرمائیں تو آپ پر رقت طاری ہوگئی تو سب حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور روتے روتے ان کی ڈاڑھیاں تر ہوگئیں۔ اسی نجاشی کا جب انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو اس کے انتقال کی خبر دی۔ فرمایا کہ تمہارا ایک بھائی حبشہ میں انتقال کر گیا ہے۔ اس کی نماز جنازہ ادا کرو۔ پھر آپ باہر تشریف لائے اور صحابہ کرامؓ کی صفوں کو مرتب کر کے اس کی نماز جنازہ ادا کی(1)۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی کے لیے مغفرت طلب کرو تو بعض لوگ کہنے لگے کہ آپ ہمیں اس نصرانی کے لیے استغفار کرنے کا حکم دیتے ہیں جو حبشہ میں مر گیا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کے انتقال کے وقت ارشاد فرمایا تمہارا بھائی اصحمہ انتقال کر گیا ہے۔ پھر آپ باہر تشریف لائے اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور عام نماز جنازہ کی طرح چار تکبیریں کہیں۔ منافقین کہنے لگے کہ حبشہ میں مرنے والے نصرانی پر نماز جنازہ پڑھی ہے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نجاشی کی وفات کے بعد ہم سنا کرتے تھے کہ اس کی قبر پر نور نظر آتا ہے۔ حاکم نے روایت کی ہے کہ نجاشی کے ایک دشمن نے اس کی سلطنت پر چڑھائی کر دی۔ مسلمان مہاجرین اس کے پاس گئے اور اسے کہا ہم چاہتے کہ آپ اس دشمن کے مقابلہ میں نکلیں ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر مقابلہ کریں گے۔ اس طرح آپ ہماری جرات و دلیری کا مظاہرہ بھی دیکھ لیں گے اور اس احسان کا بدلہ بھی اتر جائے گا جو آپ نے ہم پر کیا۔ نجاشی نے جواب دیا لوگوں کی نصرت و مدد کے مقابلہ میں اللہ کی نصرت و مدد بہتر ہے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عباد بن منصور فرماتے ہیں میں نے حضرت حسن بصریؒ سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔ اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے پہلے تھے۔ جب وہ آپ پر ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوگنا اجر عطا فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین قسم کے لوگوں کو دوگنا اجر ملے گا۔ ان میں سے ایک اہل کتاب کا وہ شخص ہے جو پہلے اپنے نبی پر ایمان لایا اور پھر مجھ پر۔

لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ: یعنی وہ علوم و معارف کو دوسرے لوگوں سے نہیں چھپاتے۔ جس طرح کہ تم میں سے ایک گھٹیا گروہ کا شیوہ ہے۔ بلکہ وہ ان علوم کی اشاعت میں کوشاں رہتے ہیں۔ اس پر کوئی اجر بھی طلب نہیں کرتے اس لیے ارشاد فرمایا کہ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا: حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین ''اسلام'' پر ثابت قدم رہیں۔ اس تنگی وشدت کی وجہ سے اسے ترک نہ کریں حتیٰ کہ ان کی موت بھی اسی دین پر آئے۔ اور اپنے ان دشمنوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کریں جو اپنے دین کو چھپاتے ہیں سلف صالحین سے اس کی یہی تفسیر مروی ہے۔ جائے عبادت اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی اور دوام اختیار کرنے کو مرابطہ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے اور دوسرے کئی مفسرین نے فرمایا ہے کہ مرابطہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتادوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ گناہوں

1۔ فتح الباری: 186/3

کو مٹاتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا تکلیف کے باوجود صحیح وضو کرنا، دور سے مسجد کی طرف چل کر جانا، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا یہی رباط ہے، یہی رباط ہے، یہی رباط ہے۔ حضرت ابو سلمہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابو ہریرۃؓ نے مجھ سے پوچھا۔ اے میرے بھتیجے! کیا تمہیں اس آیت کا شان نزول معلوم ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ تو فرمانے لگے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کوئی سرحدی چوکیاں نہ تھیں جہاں مسلمان پہرہ دیتے۔ بلکہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مسجدوں کو آباد کرتے ہیں، نمازوں کو وقت مقررہ پر ادا کرتے ہیں اور پھر وہاں خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ انہی کو حکم ہو رہا ہے کہ ان پانچ نمازوں پر دوام اختیار کرو۔ اپنی خواہشات نفسانی پر کنٹرول رکھو۔ اور اپنی مسجدوں میں مرابطہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں وہ اعمال نہ بتاؤں جو گناہوں اور خطاؤں کا کفارہ ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا ناپسندیدگی کے باوجود کامل وضو کرنا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ سے بھی یہ روایت مروی ہے حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کیا میں تمہیں ایسے اعمال بتاؤں جن سے اللہ گناہوں کو مٹاتا اور اجر و ثواب بڑھاتا ہے۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ کونسے اعمال ہیں؟ فرمایا ناپسندیدگی کے باوجود وضو کرنا، دور سے مسجد کی طرف چل کر آنا اور نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ پھر فرمایا کہ یہی اس آیت کا مفہوم ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مرابطہ سے مراد دشمن کے خلاف جہاد کرنا، اسلامی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کو اسلامی حدود میں داخل ہونے سے روکنا ہے۔ اس کی ترغیب میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ جن میں ان اعمال پر کثرت ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ حضرت سہل بن سعد الساعدی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہاد کے لیے ایک دن کی تیاری دنیا و مافیہا کے مال و اسباب سے افضل ہے (1)۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایک دن اور ایک رات کی جہاد کی تیاری ایک ماہ کے روزوں اور ایک ماہ کی شب بیداری سے افضل ہے۔ اگر اسی حالت میں اسے موت آجائے، تو جتنے اعمال صالحہ کرتا تھا اس کا ثواب رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رزق ملے گا اور وہ فتنوں سے امن میں رہے گا (2)۔ ایک روایت میں ارشاد فرمایا: ہر مرنے والے کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں مگر وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کی تیاری میں فوت ہو جائے اس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ فتنہ قبر سے بھی محفوظ رہے گا۔ اسی مفہوم کی احادیث حضرت ابو ہریرہ سے دیگر اسناد سے بھی مروی ہیں۔ مسند امام احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کو صبح و شام جنت سے رزق ملتا ہے۔ حضرت ام درداء سے مروی ہے کہ جو شخص اسلامی حدود کے ساحل پر تین دن تک پہرہ دے اسے پورے سال کا ثواب ملتا ہے۔ ایک دن حضرت عثمانؓ نے منبر پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا: اب میں تمہیں وہ حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے اور جسے آج تک کسی خاص مصلحت کے باعث تمہیں نہیں سنائی۔ آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن کا پہرہ ایک ہزار راتوں کی عبادت اور دن کے وقت روزہ رکھنے سے افضل ہے (3)۔ آپ نے اس حدیث کو اب تک بیان نہ کرنے کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ مجھے ڈر تھا کہ اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے کہیں تم سب مدینہ چھوڑ کر میدان جنگ میں نہ چلے جاؤ۔ اب میں نے یہ حدیث سنا دی ہے۔ اب تم میں سے جو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا اے اللہ! گواہ رہنا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت شرحبیل بن سمط کے ساتھیوں کے پاس سے گزرے جو کسی سرحد پر پہرہ دے رہے تھے اور طویل مدت کے باعث گراں محسوس کر رہے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے

1۔ فتح الباری، کتاب الجہاد: 85/6   2۔ مسند احمد: 20/6   3۔ مسند احمد: 61/1

فرمایا کیا میں تمہیں وہ حدیث بیان نہ کروں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن کا پہرہ ایک مہینے کے صوم وصلوٰۃ سے افضل ہے۔ اور جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے وہ عذاب قبر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور قیامت تک اس کا عمل بڑھتا رہتا ہے (1)۔ حضرت ابی بن کعب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کی سرحد پر ایک رات کے لیے ثواب کی نیت سے پہرہ دینا اگر وہ رات رمضان شریف میں نہ ہو۔ تو اس کا یہ پہرہ ایک سو سال کی نمازوں اور روزوں سے زیادہ اجر والا ہے۔ اور نیکی کی نیت کے ساتھ مسلمانوں کی سرحد کا ایک دن کا پہرہ ایک ہزار سال کے صوم وصلوٰۃ سے زیادہ اجر والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اگر اس کو صحیح سلامت اپنے اہل خانہ میں لوٹا دے تو ایک ہزار سال کی برائیاں اس کے نامہ اعمال میں نہیں لکھی جائیں گی۔ جبکہ اس کی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی۔ اور قیامت تک اسے اللہ کی راہ میں پہرہ دینے کا ثواب ملتا رہے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک رات کا پہرہ دینا اپنے اہل خانہ میں ہزار سال کے روزوں اور نمازوں سے افضل ہے۔ ہر سال کے تین سو ساٹھ دن ہیں اور ہر دن ایک ہزار سال کی مثل ہے۔ لیکن یہ حدیث غریب ہے۔ اس کے راوی سعید بن خالد کو ابوزرعہ اور دوسرے ائمہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسلامی لشکر کے محافظ پر اللہ کی رحمت ہے۔ یہ حدیث منقطع ہے۔ حضرت سعد بن حنظلیہ فرماتے ہیں کہ وہ غزوۂ حنین میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے شام کی نماز آپ کے ساتھ ادا کی تو ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا۔ عرض کی۔ یا رسول اللہ! میں آپ سے آگے نکل گیا۔ فلاں پہاڑی پر چڑھ کر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ بنو ھوازن اپنی اونٹنیوں بکریوں اور عورتوں کے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر آپ مسکرائے اور فرمایا کہ یہ سب کل ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا مال غنیمت بنے گا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ آج رات ہمارا پہرہ کون دے گا۔ حضرت انس بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ نے فرمایا سوار ہو کر آؤ۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اس وادی کی طرف جاؤ اور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاؤ۔ اور خبردار! ہم پر اس طرف سے کوئی حملہ آور نہ ہو۔ صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور دو رکعت سنتیں ادا کیں اور فرمایا کہ کیا تمہیں اپنے پہریدار کے بارے میں معلوم ہے۔ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمیں اس کے بارے میں معلوم نہیں۔ آپ نے نماز فجر کی تیاری کا حکم دیا اور نماز پڑھاتے ہوئے گھاٹی کی طرف توجہ فرماتے رہے۔ جب آپ نے نماز مکمل کی تو فرمایا کہ تمہیں خوشخبری ہو تمہارا پہرے دار آ گیا ہے ہم درختوں کے درمیان سے گھاٹی کی طرف دیکھنے لگے تو وہ شہسوار درختوں سے نکل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور عرض کی کہ میں آپ کے حکم کے مطابق اس گھاٹی کی چوٹی پر پہنچ گیا تھا اور صبح میں نے دوسری گھاٹی کا بھی معائنہ کیا لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم رات کو اپنے گھوڑے سے نیچے اترے تھے۔ اس نے عرض کی نہیں مگر نماز اور قضاء حاجت کے وقت۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے اپنے اوپر جنت کو واجب کر لیا ہے۔ اگر تم آج کے بعد کوئی عمل بھی نہیں کرو گے تو تم پر کوئی حرج نہیں (2)۔ حضرت ابو ریحانہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے جب ہم ایک ٹیلے پر پہنچے تو وہاں رات گزارنے کا حکم ہوا۔ سردی اتنی سخت تھی کہ میں نے دیکھا کہ بعض مجاہدین زمین میں گڑھا کھود کر اس میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے نداء دی۔ آج رات جو ہمارا پہرہ دے گا اس کو میں ایسی دعا دوں گا جس میں اس کا بھلا ہو گا۔ ایک انصاری نے عرض کی یا رسول اللہ! میں پہرہ دوں گا۔ آپ نے فرمایا قریب آ جاؤ جب قریب آئے تو

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب فضائل الجہاد: 162/7
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد: 10،9/3

آپ نے اس کا نام دریافت کر کے اسے دعا دی۔ ابوریحانہ یہ دعا سن کر آگے بڑھے اور کہنے لگے۔ یا رسول اللہ ﷺ! میں بھی اس کے ساتھ پہرہ دوں گا۔ آپ نے مجھے بھی پاس بلایا اور نام پوچھ کر میرے لیے بھی دعا کی۔ لیکن اس انصاری کی دعا سے یہ دعا کم تھی۔ پھر فرمایا کہ اس آنکھ پر جہنم کی آگ حرام ہے جو اللہ کے ڈر سے روئے اور اس آنکھ پر بھی جو راہ خدا میں شب بیداری کرے(1)۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں چھو سکتی ایک وہ جو اللہ کے ڈر سے روئے اور دوسری وہ جو اللہ کی راہ میں حفاظت کے لیے بیدار رہے(2)۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بخوشی بادشاہ سے اجرت اور تنخواہ لیے بغیر مسلمانوں کی سرحد کی حفاظت کرے وہ جہنم کی آگ کو صرف قسم پوری کرنے کے لیے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ (مریم:71) ''ترجمہ: اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا.....''۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ درہم و دینار اور کپڑوں کی بیجا خواہش کرنے والا بندہ ہلاک ہوا۔ اگر اسے مال دے دیا تو راضی رہتا ہے اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص ہلاک اور برباد ہوا اگر اسے کانٹا بھی چبھ جائے تو کوئی نہیں نکالتا ۔خوش قسمت ہے وہ شخص جو اپنے گھوڑے کی لگام تھامے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے تیار رہتا ہے اس کا سر پراگندہ اور قدم غبار آلود ہوتے ہیں۔ اگر پہریداری کے لیے اس کی ذمہ داری لگا دی جائے تو وہاں ذمہ داری نبھاتا ہے۔ اور اگر لشکر کے پچھلے حصے میں بھیجا جائے تو وہاں چلا جاتا ہے۔ اگر وہ اجازت طلب کرے تو اسے رخصت نہیں ملتی اور اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہیں کی جاتی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کی طرف خط لکھا جس میں رومی فوج کی کثرت اور اس کی تیاری کے بارے میں لکھا! اور یہ بھی بتایا کہ بہت سخت خطرہ ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ مومن پر جب کبھی سختی آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد اسے راحت و کشائش عطا فرماتا ہے۔ دو آسانیوں پر ایک سختی غالب نہیں آسکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...... حضرت عبداللہ بن مبارک طرطوس شہر میں محمد بن ابراہیم ابن ابی سکینہ کو الوداع کرنے کے لیے آئے جو حج کے لیے جارہے تھے اور ان کے ہاتھ کچھ اشعار لکھ کر فضل بن عیاض کے لیے بھجوائے۔

- (اے مکہ و مدینہ میں عبادت کرنے والے! اگر تو ہم مجاہدین کو دیکھ لیتا تو تجھے معلوم ہوتا کہ عبادت ایک کھیل ہے)
- (ایک وہ شخص ہے جو اپنے رخساروں کو اپنے آنسوؤں سے تر کرتا ہے اور ہم اپنی گردنیں کٹوا کر خون میں نہاتے ہیں)
- (کسی کا گھوڑا باطل اور بیکار کاموں میں تھکتا ہے تو ہمارے گھوڑے صبح کے وقت حملہ کرنے میں تھکتے ہیں)
- (تم عنبر کی خوشبوئیں سونگھتے ہو تو ہم گھوڑوں کے ٹاپوں کی خاک اور پاکیزہ گرد و غبار سونگھتے ہیں)
- (ہمیں حضور ﷺ کی وہ حدیث پہنچی ہے جو بالکل سچی ہے جس میں جھوٹ کی گنجائش نہیں۔)
- (کہ جس شخص کی ناک میں اللہ کے گھوڑوں کی غبار داخل ہو اس میں جہنم کی بڑھکتی ہوئی آگ کا دھواں داخل نہیں ہوگا)
- (خدا کی پاکیزہ کتاب ہمارے درمیان موجود ہے جو سچ کہہ رہی ہے کہ شہید مردہ نہیں ہوتا۔)

محمد بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ مسجد حرام میں پہنچ کر جب میں نے یہ حضرت فضل بن عیاضؒ کو پہنچائے تو وہ پڑھ کر زار و قطار رونے لگے اور فرمانے لگے عبداللہ بن مبارک نے سچ کہا ہے پھر مجھ سے پوچھا کہ کیا تم احادیث روایت کرتے ہو میں نے عرض کی ہاں۔ تو فرمایا کہ جو تم نصیحت نامہ میرے پاس لائے ہو میں اس کے بدلے تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں ایک شخص نے

1۔ مسند احمد:135,134/4 2۔ عارضۃ الاحوذی، الجہاد:138/7

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی ۔ مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جس سے میں مجاہدین کا ثواب حاصل کرسکوں ۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ طاقت رکھتے ہو کہ تم نماز پڑھتے رہو اور تھکو نہ، اور ہمیشہ روزے رکھتے رہو اور کبھی ترک نہ کرو ۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں تو بہت کمزور ہوں میں اس کی طاقت نہیں رکھ سکتا ۔ آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ۔ اگر تم ان اعمال کی طاقت بھی رکھتے تو مجاہدین کے درجے کو نہ پہنچ سکتے ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ مجاہد کا گھوڑا اپنی رسی کو کھینچ کر جب ادھر ادھر چرتا ہے تو اس کا ثواب بھی مجاہد کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اپنے تمام امور اور احوال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو یمن بھیجتے ہوئے ارشاد فرمایا ۔ اے معاذ تم جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو، اگر کوئی برائی ہو جائے تو فوراً نیکی کرو، یہ نیکی اس کو مٹا دے گی ۔ اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آؤ ۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم دنیا و آخرت میں فلاح پا جاؤ ۔ حضرت محمد بن کعب قرظی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ۔ اے لوگو! میرے اور تمہارے درمیان جو امور ہیں ۔ ان میں تم ڈرتے رہو تا کہ کل قیامت کے دن جب تمہاری مجھ سے ملاقات ہو تو تم کامیاب ہو جاؤ ۔

الحمد للہ تفسیر سورۂ آل عمران ختم ہوئی

سورۂ نساء (مدنیہ)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور زید بن ثابتؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سورۂ نساء میں پانچ آیات ایسی ہیں کہ اگر ان کے بدلے میں مجھے دنیا و مافیہا مل جائے تب بھی خوش نہ ہوں۔ 1۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ...... (نساء:40) ''ترجمہ: اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا''۔ 2۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ...... (نساء:31) ''ترجمہ: اگر تم کبائر سے پرہیز کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے صغیرہ گناہ بھی معاف فرمادے گا''۔ 3۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ...... (نساء:48) ''ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس کو کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ۔ اور بخش دیتا ہے اس کے ماسوا (جتنے جرائم ہوں) جس کے لیے چاہتا ہے''۔ 4۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ...... (نساء:64) ''ترجمہ: اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنے آپ پر۔ آپ کے پاس حاضر ہوتے اور مغفرت طلب کرتے اللہ تعالیٰ سے نیز رسول (ﷺ) ان کے مغفرت طلب کرتا تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا پاتے''۔ حاکم نے اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے لیکن اس کے ایک راوی عبدالرحمٰن کے اپنے باپ سے سننے میں اختلاف ہے۔ عبدالرزاق کی اس روایت میں آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا...... (نساء:64) کی جگہ آیت: وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (نساء:110) ''ترجمہ: جس شخص سے کوئی برا کام ہو جائے اپنے نفس پر کوئی زیادتی کر گزرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرے بے شک اللہ تعالیٰ کو معاف کرے والا اور مہربان پائے گا''۔ ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ پہلی حدیث میں ایک آیت کا بیان رہ گیا تھا، جس کا ذکر دوسری حدیث میں آ گیا۔ یا یہ کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ (نساء:40) کو مکمل آیت شمار کیا جائے اور اِنْ تَكُ حَسَنَةً کو الگ آیت شمار کیا جائے تو دونوں حدیثوں میں پانچ پانچ آیات ہوگئیں۔ واللہ اعلم۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس سورت میں آٹھ آیات ایسی ہیں جو امت محمدیہ کے لیے ہر اس چیز سے بہتر ہیں جس پر سورہ طلوع ہوتا اور غروب ہوتا ہے۔ 1۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ...... (نساء:26)۔ 2۔ وَاللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْكُمْ...... (نساء:27)۔ 3۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْكُمْ...... (نساء:28) باقی پانچ آیات وہی ہیں جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے اے لوگو! مجھ سے سورۂ نساء کے بارے میں پوچھو۔ میں نے قرآن پاک اس وقت پڑھ لیا تھا جب میں چھوٹا سا تھا(1)۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ كَانَ

1۔ المستدرک، کتاب التفسیر: 301/2

عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ①

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں) اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے وہ اللہ مانگتے ہو تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق) اس کے واسطہ سے اور (ڈرو) رحموں (کے قطع کرنے سے) بیشک اللہ تم پر ہر وقت نگران ہے"۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تقویٰ کا حکم فرمایا ہے۔ اور یہاں تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے بعد اپنی اس قدرت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کے ذریعے تمام مخلوق کو ایک نفس یعنی حضرت آدم سے پیدا کیا اور پھر انہیں سے ان کی زوجہ حضرت حواء علیہ السلام کی پیدائش ان کی بائیں پسلی سے ہوئی۔ آپ نیند سے بیدار ہوئے تو حضرت حواء کو اپنے سامنے پا کر خوش ہوئے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر باہم مانوس ہو گئے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورت مرد سے پیدا ہوئی اس لیے اس کی حاجت و شہوت بھی مرد کے ساتھ وابستہ ہے۔ مرد زمین سے پیدا ہوا اس لیے اس کی حاجت زمین کے ساتھ وابستہ ہے۔ پس تم اپنی عورتوں کی حفاظت کرو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا اور سب سے اوپر والی پسلی زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی اور اگر اسے اسی طرح ٹیڑھا رہنے دو تو تم لطف اندوز ہوتے رہو گے۔

وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حواء علیہ السلام سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور ان کو دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیلا دیا۔ جن کے رنگ و روپ، صفات اور زبانیں مختلف ہیں۔ اور پھر آخر کار یہ سب لوگ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ: پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اس سے ڈرتے رہو۔ اسی خدا کے نام تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو جس طرح کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور قرابتداری کے نام پر سوال کرتا ہوں۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم معاہدے کرتے ہو اور قطع رحمی سے بچو اور صلہ رحمی اختیار کرو۔ ایک قرأت میں اَرۡحَامِ میں بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نام پر اور رشتہ داری کے واسطے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا: یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال واحوال پر نگہبان ہے جس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ (بروج:9) صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (تم کم از کم یہ خیال ہو) کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس ذات کا لحاظ رکھو جو ہر چیز کی نگہبان اور نگران ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کی اصل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا گیا ہے تا کہ وہ ایک دوسرے سے مہربانی سے پیش آئیں اور کمزوروں پر شفقت کریں۔ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی روایت کرتے ہیں کہ جب قبیلہ مضر کے چند لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ غربت و فقر کی وجہ سے ان کے جسم پر صرف ایک چادر تھی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے نماز ظہر کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا جس میں یہ آیات تلاوت فرمائیں: 1۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ ......2۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ "ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے آگے کل کے لیے کیا بھیجا ہے"۔ اور پھر آپ نے صحابہ کرام کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دلائی تو ہر ایک نے اپنی استطاعت کے مطابق درہم و دینار، گندم اور کھجوریں صدقہ کیں(1) اور مسند امام احمد کی روایت میں ہے کہ آپ نے تین آیات تلاوت فرمائیں۔ جن میں تیسری

1۔ مسند احمد:358/4

آیت يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ ...... تھی۔

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝

''اور دے دو یتیموں کو ان کے مال اور نہ بدلو (اپنی) ردی چیز کو (ان کی) عمدہ چیز سے اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں سے ملا کر واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو گے تم یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی یا کنیزیں جن کے مالک ہوں تمہارے دائیں ہاتھ یہ زیادہ قریب ہے، اس کے کہ تم ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ۔ اور دیا کرو (اپنی) عورتوں کو ان کے مہر خوشی خوشی پھر اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوشدلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوش گوار سمجھتے ہوئے''۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ حکم دے رہا ہے کہ یتیم بچے جب بالغ ہو جائیں تو ان کے اموال مکمل طور پر ان کے سپرد کر دیے جائیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یتیم کا مال کھانے، اور اس کو اپنے مال کے ساتھ ملانے سے منع فرمایا ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا کہ حلال مال کو حرام مال سے نہ بدلو۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ جلدی میں حرام مال کی طرف متوجہ نہ ہو جاؤ بلکہ وہ حلال مال جو تمہاری قسمت میں لکھا ہوا ہے اس کا انتظار کرو۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ لوگوں کے حرام مال کو اپنے حلال مال کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یعنی اپنا حلال مال چھوڑ کر لوگوں کا حرام مال مت کھاؤ۔ حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ کمزور جانور دے کر اس کے بدلے میں موٹا جانور نہ لو۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ گھٹیا دے کر عمدہ نہ لو۔ سدی فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اس طرح کرتے تھے کہ یتیم کے ریوڑ سے موٹی بکریاں لے لیتے اور اس کی جگہ کمزور بکریاں دے دیتے یا کھرے درہم لے کر اس کی جگہ کھوٹے درہم رکھ دیتے اور کہتے کہ حساب برابر ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یتیموں کے مال اپنے مال کے ساتھ نہ ملاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس کا سارا مال ہڑپ کر جاؤ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے (حُوْبًا كَبِيْرًا) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اس سے مراد گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ سنن ابی داؤد میں یہ دعا مروی ہے کہ (اِغْفِرْ لَنَا حُوْبَنَا وَ خَطَايَانَا) ''ترجمہ: اے اللہ ہمارے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے''۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اپنی زوجہ کو طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابو ایوب! ام ایوب کو طلاق دینا گناہ ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے جب اپنی زوجہ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ ام ایوب کو طلاق دینا گناہ ہے۔ اس پر انہوں نے طلاق کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی طرح ابو طلحہ کے بارے میں بھی یہ روایت مروی ہے اس آیت کا یہ معنی ہوگا کہ یتیموں کا مال اپنے مال سے ملانا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس لیے اس سے اجتناب کرو۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا: اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم میں سے کسی ایک کی پرورش میں یتیم بچی ہو اور اسے خوف ہو کہ اگر اس نے اس کے ساتھ نکاح کیا تو اس کے مہر میں کمی کر دے گا تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ شادی کر لے کیونکہ عورتیں کثیر تعداد میں ہیں اور وہ اس میں مجبور بھی نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک آدمی کی کفالت میں یتیم بچی تھی جس کا ایک باغ تھا۔ اس شخص نے باغ کے لالچ میں حق مہر مقرر کیے بغیر ہی اس سے نکاح کر لیا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ راوی فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی اس باغ اور اس مال میں بطور شریک ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا اے بھانجے! اس آیت میں اس یتیم لڑکی کا ذکر ہے جو کسی شخص کی نگہداشت میں ہو اور اس کے مال میں شریک بھی ہو۔ پھر وہ شخص اس کے حسن و جمال اور مال کی وجہ سے اس کے ساتھ شادی کا ارادہ رکھتا ہو لیکن حق مہر مقرر کرنے میں انصاف سے کام نہ لیتا ہو اسے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں اگر وہ اس سے شادی کرنا چاہے تو مہر میں انصاف سے کام لے اور اسے اعلیٰ ترین مہر ادا کرے۔ اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو وہ اس کے علاوہ کسی بھی عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ لوگوں نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا تو وَ یَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ (نساء:127) نازل ہوئی۔ آپ فرماتی ہیں کہ آیت وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ (نساء:127) کا مطلب یہ ہے کہ جب یتیم لڑکی کم مال والی اور زیادہ خوبصورت نہ ہو تو تم اس سے بے رغبتی رکھتے ہو۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں انہیں اس چیز سے منع کیا گیا ہے کہ مال و جمال والی یتیم لڑکی سے اگر نکاح کرنا چاہیں تو انصاف کے ساتھ نکاح کریں۔

مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ: یعنی یتیم لڑکوں کے علاوہ جن سے چاہو تم نکاح کر لو۔ اگر کوئی دو سے کرنا چاہتا ہے تو دو سے کر لے اور اسی طرح تین اور چار تک نکاح کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: جَاعِلِ الْمَلٰٓىِٕكَةِ رُسُلًا اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ’’ترجمہ: جس نے بنایا ہے فرشتوں کو پیغام رساں جو پردار بازوؤں والے ہیں کسی کے دو، کسی کے تین اور کسی کے چار‘‘۔ اس آیت کریمہ میں صرف ان فرشتوں کا ذکر ہے جن کے پر دو، تین اور چار ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بھی فرشتے موجود ہیں جن کے پر چار سے زیادہ ہوتے ہیں اور یہ حدیث پاک سے ثابت شدہ امر ہے۔ لیکن مرد کے لیے ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنا منع ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر احسان اور انعام کو بیان فرما رہا ہے پس اگر چار سے زیادہ کی اجازت دینی منظور ہوتی تو ضرور بیان فرما دیتا۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف جو قرآن کریم کی وضاحت کرتی ہے اس نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی امتی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بیک وقت چار سے زائد بیویاں رکھ سکے۔ اس پر علمائے کرام کا اجماع ہے۔ مگر بعض اہل تشیع کا قول ہے کہ نو تک بیویاں رکھی جا سکتی ہیں۔ بلکہ بعض نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اس کی تعداد مقرر ہی نہیں آدمی جتنی چاہے، رکھ سکتا ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ کی نو ازواج مطہرات تھیں۔ اور بخاری شریف کی ایک معلق روایت میں گیارہ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پندرہ خواتین سے عقد کیا۔ ان میں سے تیرہ کی رخصتی ہوئی اور گیارہ بیک وقت آپ کے پاس رہیں۔ جب آپ کا وصال ہوا تو اس وقت نو ازواج مطہرات تھیں۔ ہمارے علماء کرام کی نزدیک یہ رسول اللہ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ لیکن امت کو ایک وقت میں چار سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت غیلان بن سلمہ جب مسلمان ہوئے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ حضور ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ ان میں سے چار کو رکھ لو اور باقی کو طلاق دے دو۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں

انہوں نے اپنی ان بیویوں کو بھی طلاق دے دی اور اپنا مال بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ شاید شیطان نے تمہارے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ تم عنقریب مرنے والے ہو۔ اس لیے تم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے کر اپنا مال بیٹوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اپنی بیویوں سے رجوع کرو اور اپنے بیٹوں سے اپنا مال واپس لے لو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا میں تمہارے مرنے کے بعد تمہاری مطلقہ بیویوں کو تمہارا وارث بنا دوں گا اور لوگوں کو حکم دوں گا کہ وہ تمہاری قبر پر سنگباری کریں اس طرح ابو رغال کی قبر پر سنگ باری کی گئی(1)۔ مرفوع حدیث تو ترمذی، ابن ماجہ، دار قطنی اور بیہقی وغیرہ میں موجود ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ صرف مسند امام احمد میں ملتا ہے۔ یہ زیادتی حسن ہے۔ اگرچہ امام بخاریؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس کی دوسری سند کو ذکر کر کے اسے غیر محفوظ کہا ہے۔ مگر ان کی یہ بات محل نظر ہے۔ اس کو عبدالرزاق نے معمر سے اور امام مالک نے زہری سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ابو زرعہ نے کہا ہے کہ یہی زیادہ اصح ہے۔ اس کے علاوہ مسند امام احمد کی روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں اور شیخین کی مقررہ کردہ شرائط ان میں موجود ہیں۔ سنن نسائی میں ہے کہ وہ دس عورتیں بھی صحابی کے ساتھ مسلمان ہوگئی تھیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر چار سے زیادہ بیویاں رکھنا جائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ صحابی کو دس کی دس بیویاں رکھنے کی اجازت دے دیتے حالانکہ وہ سب مسلمان بھی ہوگئی تھیں۔ اس کے باوجود بھی رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ چار کو رکھ لو اور باقی کو چھوڑ دو۔ سو ثابت ہوا کہ چار سے زیادہ بیویاں رکھنا جائز نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اسی طرح ایک دوسری روایت حضرت عمیرہ اسدی فرماتے ہیں کہ میں مسلمان ہوا تو میری آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو(2)۔ حضرت نوفل بن معاویہؓ دیلمی فرماتے ہیں کہ میں مسلمان ہوا تو میری پانچ بیویاں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ ان میں سے جو چاہو چار رکھ لو اور ایک چھوڑ دو۔ میں نے ان میں سے سب سے بوڑھی ساٹھ سالہ بانجھ کو طلاق دے دی۔ یہ تمام روایات پہلی مذکورہ حدیث کی مؤید ہیں۔

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا: یعنی اگر تمہیں خوف ہو کہ تم عورتوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک پر ہی اکتفاء کر و یا پھر لونڈیاں رکھ لو۔ اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ ''ترجمہ: تم بیویوں کے درمیان پورا پورا انصاف کرنے کی ہرگز طاقت نہیں رکھتے۔ اگرچہ تم اس کے بڑے خواہش مند بھی ہو''۔

ذٰلِكَ اَدۡنٰۤى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا: بعض مفسرین نے اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اس طرح تمہاری تنگدستی اور مفلسی زیادہ نہیں ہوگی۔ اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَاِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً (توبہ:28) سے ماخوذ ہے۔ شاعر کا قول بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

فَمَا يَدۡرِیۡ الۡفَقِيۡرُ مَتٰى غِنَاهُ ۔ وَمَا يَدۡرِیۡ الۡغَنِیُّ مَتٰى يَعِيۡلُ

(فقیر نہیں جانتا کہ وہ کب امیر ہوگا اور امیر کو معلوم نہیں کہ کب فقیر بن جائے گا۔)

جب کوئی آدمی غریب ہو جائے تو عرب کہتے ہیں ''عَالَ الرَّجُلُ عَيۡلَةً'' لیکن اس آیت کی یہ تفسیر محل نظر ہے کیونکہ اگر آزاد عورتوں کی کثرت فقیری کی باعث بن سکتی ہے تو لونڈیوں کی کثرت بھی سبب ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس آیت کے بارے میں جمہور علماء کا قول ہی صحیح ہے جو فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو کیونکہ جب کوئی ظلم کرتا ہے تو عرب اس کے بارے میں عَالَ فِی الۡحُكۡمِ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہی معنی حضرت ابو طالب کے مشہور قصیدہ میں بھی ہیں۔

بِمِيۡزَانِ قِسۡطٍ لَا يَخِيۡسُ شَعِيۡرَةً ۔ لَهٗ شَاهِدٌ مِنۡ نَفۡسِهٖ غَيۡرُ عَائِلٍ

1۔ المسند: 14/2　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق: 272/2

(وہ ایسے ترازو سے تولتے ہیں جو جو برابر بھی کمی نہیں کرتا۔ اوران کا نفس گواہ ہے جو ظلم نہیں کرتا۔)

جب اہل کوفہ نے حضرت عثمانؓ پر ایک خط میں کچھ الزامات لکھ کر بھیجے تو اس کے جواب میں آپ نے لکھا۔ "اِنِّیۡ لَسۡتُ بِمِیۡزَانٍ اَعۡوَلَ۔"، میں ظلم کا ترازو نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے تاکہ تم ظلم نہ کرو۔ لیکن ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ یہ مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرات مجاہد، عکرمہ، حسن بصری ابو مالک، ابوغزین، نخعی، شعبی، ضحاک، عطاء خراسانی، قتادہ، سدی، مقاتل بن حیان رحمہم اللہ سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عکرمہ نے ابو طالب کا مذکورہ شعر بھی پیش کیا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً : حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نحلہ کا معنی مہر ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس سے مراد مقررہ شدہ مہر ہے۔ ابن زید نے فرمایا ہے کہ نحلہ کا لفظ کلام عرب میں واجب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس آیت کا مفہوم ہے کہ عورت کا مہر مقرر کیے بغیر اس سے شادی نہ کرو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ واجب مہر کے بغیر کسی عورت سے نکاح کرے۔ اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی پر مہر دینا واجب ہے۔ اور وہ مہر خوشدلی سے ادا کرے اور اس کے بعد اگر عورت اپنی مرضی سے اسے مہر واپس کر دے تو اس کا کھانا اس کے لیے حلال ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا اگر وہ اس مہر میں سے خوشدلی سے کچھ بخش دیں تو اس سے لذت حاصل کرتے ہوئے اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو جائے تو وہ اپنی بیوی سے تین درہم یا اس سے کم وبیش لے اور اس سے شہد خریدے اور اس میں بارش کا پانی ملا کر پی جائے۔ کیونکہ اس میں تین چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔ یعنی اس نے عورت سے جو پیسے لیے ہیں وہ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا (نساء:4) ہیں، شہد میں شفا ہے اور بارش کا پانی مباح ہے۔ حضرت ابو صالح فرماتے ہیں کہ جاہلی دور میں جب کوئی شخص اپنی بیٹی کی شادی کرتا تو مہر اپنے پاس رکھ لیتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ باہمی مہر سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا اس سے مراد وہ ہے جس پر اس کے اہل خانہ راضی ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور اس میں تین مرتبہ ارشاد فرمایا کہ بیوہ عورتوں سے نکاح کرو۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی۔ ان کا مہر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جس پر اس کے اہل وعیال راضی ہو جائیں اس کے ایک راوی ابن سلمانی ضعیف ہیں۔ اور اس میں انقطاع بھی ہے۔

وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَكُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ قِیٰمًا وَّارۡزُقُوۡهُمۡ فِیۡهَا وَاكۡسُوۡهُمۡ وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۝ وَابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ وَلَا تَاۡكُلُوۡهَاۤ اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ یَّكۡبَرُوۡا ؕ وَمَنۡ كَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَمَنۡ كَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِمۡ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیۡبًا ۝

"اور نہ دے ان نادانوں کو اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے) لیے سہارا اور کھلاؤ انہیں اس مال سے اور پہناؤ انہیں اور کہو ان سے بھلائی کی بات اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو پس

1۔ تفسیر الطبری:243/4

اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال۔ اور نہ کھاؤ انہیں فضول خرچی سے اور جلدی جلدی اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے اور جو سرپرست غنی ہو تو اسے چاہیے کہ (یتیموں کے مال سے) پرہیز کرے۔ اور جو سرپرست فقیر ہو تو وہ کھالے مناسب مقدار سے۔ پھر جب لوٹاؤ ان کی طرف ان کے مال، تو گواہ بنالو ان پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ ان پر حساب لینے والا''۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ: اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں لوگوں کو حکم فرمایا ہے کہ وہ کم عقل اور بیوقوفوں کو مال میں تصرف کرنے سے روکیں۔ تا کہ یہی مال تجارت وغیرہ میں لگا کر لوگوں کے لیے ذریعہ معاش بن سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کم عقل لوگوں کو ان کے مال میں تصرف کرنے سے روک دینا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ صاحب مال نابالغ بچہ ہو یا مجنوں، دیوانہ ہو یا کم عقل اور بیوقوف اور بے دین ہو جو بری طرح سے اپنے مال کا ضیاع کر رہا ہو، اسی طرح اگر کوئی ایسا شخص ہو جس پر بہت زیادہ قرضہ ہو جسے وہ اپنے کل مال سے ادا نہ کر سکتا ہو۔ اگر قرض خواہ حاکم وقت سے درخواست کریں تو حاکم تمام مال اس کے قبضے سے لے لے گا اور اسے بے دخل کر دے گا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہاں سفہاء سے مراد کم عمر اولاد اور عورتیں ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حکم بن عیینہؒ، حضرت حسن بصریؒ اور ضحاکؒ سے مروی ہے کہ اس سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یتیم ہیں۔ حضرات مجاہد، عکرمہ اور قتادہؒ کا قول ہے کہ اس سے مراد عورتیں ہیں۔ حضرت ابوامامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک عورتیں بے وقوف ہیں مگر وہ جو اپنے خاوند کی اطاعت گزار ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ سفہاء سے مراد وہ خادم ہیں جو چالاک اور عیار ہوں۔

وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اپنا وہ مال جس پر تیری گزر اوقات کا دارومدار ہے وہ اپنی بیوی یا بیٹی کو نہ دے کہ بعد میں تمہیں خرچ کے لیے ان کا منہ دیکھنا پڑے بلکہ اپنا مال اپنے پاس رکھو، اس کی حفاظت کرو اور پھر خود اپنے ہاتھ سے ان کے کھانے پینے اور پہننے پر صرف کرو۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ تین قسم کے لوگوں کی دعا اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا۔ ایک وہ جس کی بیوی بداخلاق ہو اور وہ اسے طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ جو اپنا مال کسی بیوقوف کو دے دے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اپنا مال بیوقوف کو نہ دو۔ تیسرا وہ شخص جس کا قرض کسی پر ہو اور اس نے اس قرض پر کسی کو گواہ نہ بنایا ہو۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ تم نیکی اور صلہ رحمی میں شگفتہ رویہ اپناؤ۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ فقراء اور مساکین سے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ اور اسی طرح جس شخص کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا گیا ہو اس کے کپڑے اور کھانے پینے کا خیال رکھنا چاہیے اور اس کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش کلامی سے پیش آنا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ یتیموں کی دیکھ بھال کرو یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں۔ یہاں نکاح سے مراد سن بلوغت ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک لڑکا اس وقت بالغ ہوگا جب اسے احتلام ہونے لگے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کا فرمان بخوبی یاد ہے کہ احتلام کے بعد یتیمی نہیں رہتی اور نہ ہی مکمل دن خاموشی کا روزہ ہے۔ دوسری روایت میں فرمایا کہ تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ بچے سے جب تک اسے احتلام نہ ہو جائے۔ یا جب تک وہ پندرہ سال کو نہ پہنچ جائے۔ سوئے ہوئے سے حتیٰ کہ وہ جاگ جائے اور مجنوں سے حتیٰ کہ وہ ہوش میں آجائے۔ فقہاء کرام نے سن بلوغت کی اس حد کو صحیحین کی حدیث سے اخذ کیا ہے۔ جس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد کے دن میں چودہ سال کا تھا۔ مجھے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے مجھے شرکت کی اجازت نہ دی۔ اور جب غزوۂ خندق میں پندرہ برس کا ہو گیا تو آپ نے مجھے اجازت عطا فرما دی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو جب یہ حدیث پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ یہی بالغ اور نابالغ کی حد ہے۔ اور بلوغت کی ایک علامت زیر ناف بالوں کا اگنا بھی ہے۔ اس میں علماء کے تین قول ہیں۔ 1۔ یہ بالغ

ہونے کی علامت ہے۔ 2۔ علامت نہیں ہے۔ 3۔ مسلمانوں میں نہیں البتہ ذمیوں میں علامت ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بال کسی دوا کی وجہ سے نکل آئے ہوں۔ لیکن چونکہ ذمی پر بالغ ہوتے ہی جزیہ لگ جاتا ہے اس لیے وہ اسے استعمال کرنے سے گریز کرے گا۔ مگر صحیح قول یہی ہے کہ یہ سب کے حق میں بلوغ کی علامت ہے۔ کیونکہ یہ فطرتی بات ہے جس میں سب لوگ شریک ہیں اور اس میں علاج معالجہ کا احتمال بہت بعید ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ حدیث سے بھی ثابت ہے۔ حضرت عطیہ القرظیؓ فرماتے ہیں کہ بنو قریظہ کی لڑائی کے وقت ہمیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص دیکھے کہ جس کے بال نکلے آئے ہوں اسے قتل کر دیا جائے اور جس کے نہ نکلے ہوں اسے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میرے بال ابھی نہیں نکلے تھے اس لیے مجھے چھوڑ دیا گیا(1)۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا تھا کہ بنو قریظہ نے حضرت سعد بن معاذؓ کا حکم تسلیم کیا تھا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے، ہمیں منظور ہوگا۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ ان میں سے لڑنے والوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے بچوں کو قیدی بنالیا جائے۔ ابو عبید فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک لڑکے نے اپنے اشعار میں ایک لڑکی پر زنا کی تہمت لگائی۔ جب حضرت عمرؓ اس پر تہمت کی حد لگانے لگے تو فرمایا دیکھو! اگر اس کے زیر ناف بال ہیں تو اس پر حد جاری کر دو ورنہ نہیں۔ دیکھا تو اس کے بال ابھی نہیں اگے تھے۔ اس لیے آپ نے اس پر حد ساقط کر دی۔

فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا: حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ جب دیکھو کہ یہ لوگ اپنے دین کے معاملے میں صالح اور اپنے مال کی حفاظت کرنے کے قابل ہو گئے ہیں تو ان کا مال انہیں واپس کر دو۔ یہی حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور دیگر ائمہ سے مروی ہے۔ اس لیے فقہاء کرام نے فرمایا کہ جب بچہ بالغ ہو جائے اور اپنے دین اور مال کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائے تو اس پر مال میں تصرف کرنے کی پابندی تھی وہ ختم ہو جائے گی اور اس کے مال پر جسے نگران مقرر کیا گیا تھا وہ اس کا مال اس کے سپرد کر دے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ (فضول خرچی سے اور جلدی جلدی اس خوف سے مال نہ کھاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔) اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بلا ضرورت یتیموں کا مال کھانے سے منع کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ (جو سرپرست غنی ہو اسے یتیموں کے مال سے پرہیز کرنا چاہیے) یعنی وہ ان کا مال بالکل نہ کھائے۔ حضرت شعبی فرماتے ہیں کہ یہ مال اس پر مردار اور خون کی طرح حرام ہے۔

وَمَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ: یہ آیت کریمہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کسی یتیم کے مال کا نگران ہو اور اگر وہ خود بھی محتاج وفقیر ہو تو وہ ضرورت کے مطابق اسے کھا سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ آیت کریمہ یتیم کے مال کی نگرانی کرنے والے کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ بقدر ضرورت اپنی نگرانی کے بدلے میں یتیم کے مال سے لے سکتا ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ وہ اپنی محنت اور ضرورت کو دیکھے اگر ضرورت محنت سے کم ہو تو ضرورت کے مطابق خرچ کرے اور اگر محنت ضرورت سے کم ہو تو پھر محنت کا بدلہ لے۔ اور یہ شخص اگر مالدار ہو جائے تو کیا اسے مال واپس لوٹانا پڑے گا یا نہیں۔ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ وہ واپس نہیں لوٹائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے کام کا معاوضہ لیا ہے اور وہ ضرورت مند بھی تھا۔ اصحاب شافعیؒ کے نزدیک یہی قول صحیح ہے۔ اس لیے کہ اس آیت کریمہ نے فقیری کی حالت میں بغیر کسی بدلے کے اس مال کو مباح قرار دیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ میرے پاس اپنا مال نہیں ہے اور میں ایک یتیم کا نگران ہوں۔ کیا میں اس کے مال سے لے سکتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا کہ فضول خرچی اور اسراف کے بغیر تم اس کا مال استعمال کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ تم اپنا مال بچا کر اس کا مال خرچ نہ کرو(2)۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عرض کی کہ میری پرورش میں کچھ یتیم ہیں جن کے اونٹ ہیں اور میرے اپنے بھی اونٹ ہیں۔ میں اپنے اونٹ

1۔ مسند امام احمد: 310/4 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا: 115/3

مساکین کو دودھ پینے کے لیے دے دیتا ہوں۔ کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں یتیموں کی اونٹنیوں کا دودھ پی لوں۔ آپ نے فرمایا اگر ان یتیموں کی گمشدہ اونٹنیوں کو تلاش کر کے لاتا ہے، ان کے چارے، پانی کا خیال رکھتا ہے ان کے حوض کو درست کرتا ہے اور ان کی نگہبانی بھی کرتا ہے تو بے شک تو بھی دودھ پی سکتا ہے۔ اس طرح کہ نہ ان کے بچوں کو نقصان پہنچے اور نہ ضرورت سے زیادہ لے(1)۔ اور یہی قول حضرت عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، ابراہیم نخعی، عطیہ اوفی اور حسن بصریؒ کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تنگدستی کے دور ہو جانے کے بعد وہ مال یتیم کو واپس لوٹانا پڑے گا کیونکہ اصلاً یتیم کا مال کھانا ممنوع ہے۔ صرف ضرورت کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے اس لیے تنگدستی ختم ہو جائے تو اس کا کھایا ہوا مال واپس کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ کوئی بے بس اور مجبور کسی غیر کا مال کھا لے تو اسے بعد میں واپس کرنا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ جب امیر المومنین بنے تو آپ نے فرمایا کہ میرے بیت المال کے امین ہونے کی حیثیت اتنی ہی ہے کہ جتنی یتیم کے مال کے نگران کی ہے۔ اگر ضرورت نہ ہوئی تو بیت المال سے کچھ نہیں لوں گا اور اگر ضرورت پڑی تو قرض کے طور پر لوں گا اور جب خوشحالی ہو گی تو واپس کر دوں گا اس حدیث کو سعید بن منصور نے دوسری مسند کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسی طرح امام بیہقیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے بالمعروف کی تفسیر قرض سے کی ہے۔ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ وہ اپنی ذات پر اپنے مال سے خرچ کرے تاکہ یتیم کے مال سے خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ حضرت عامر شعبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اتنا مجبور ہو گیا کہ اس کے لیے مردار کھانا جائز ہو جائے تو پھر یتیم کے مال سے اس کے لیے کھانا جائز ہے۔ اور بعد میں خوشحالی کے وقت اسے ادا کر دے۔ حضرت ربیعہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یتیم فقیر ہو تو اس کا ولی بقدر ضرورت اس پر خرچ کرے لیکن ولی کا اس میں کوئی حق نہیں۔ مگر یہ قول محل نظر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یتیم کے ولی کے لیے فرمایا ہے کہ (اگر وہ غنی ہو تو یتیم کا مال نہ لے اور اگر فقیر ہو تو احسن طریقے سے اس کا مال کھا سکتا ہے۔) جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ''ترجمہ: یتیم کے مال کے قریب مت جاؤ۔ مگر اس طریقہ سے جو کہ بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے''۔ یتیم کے مال کے قریب بالکل نہ جاؤ مگر اصلاح کی خاطر اور اگر تمہیں ضرورت ہو تو تم بطریق احسن اس سے کھا سکتے ہو۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ: یعنی جب وہ بالغ ہو جائیں اور انہیں اچھے برے کی تمیز ہو جائے تو ان کا مال ان کے سپرد کرو اور اس پر گواہ بنا لو۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یتیموں کے اولیاء کو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے تاکہ بعد میں لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے اور وہ مال وصول کرنے کے بعد اس کا انکار نہ کر سکیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حساب لینے والا کافی ہے۔ یعنی حقیقی حساب لینے والا، شاہد اور نگران تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتا ہے کہ کس نے مکمل مال واپس کیا اور کس نے اس میں کمی کی، کیونکہ وہ ان تمام امور سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے ابوذر! میں تمہیں ناتواں پاتا ہوں۔ میں تمہارے لیے وہی کچھ پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ ہرگز دو شخصوں کا سردار اور امیر نہ بننا اور نہ ہی کسی یتیم کا والی بننا(2)۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۞ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۞ وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب صفۃ النبی: 934

2۔ مسلم، کتاب الامارۃ: 1457، 1458

تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰ ع

''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اس ترکہ سے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ حصہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مقرر ہے اور جب حاضر ہوں (ورثہ کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم بچے اور مسکین، تو دو انہیں بھی اس سے اور کہو ان سے اچھی بات اور چاہیے کہ ڈریں جو (یتیموں کے سرپرست ہیں اور سوچیں) کہ اگر چھوڑ جاتے وہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے تو وہ کتنے فکر مند ہوتے ان کے متعلق۔ پس چاہیے کہ وہ ڈریں اللہ سے اور کہیں ایسی بات جو بالکل درست ہو۔ بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ اور عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی آگ میں''۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ: حضرت سعید بن جبیرؓ اور حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ مشرکین کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنی بڑی اولاد کو اپنا وارث بنا لیتے تھے۔ لیکن عورتوں اور بچوں کو نہ دیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اصل وراثت میں تمام حقدار برابر ہیں اگرچہ ان تمام کے حصے الگ الگ مقرر کر دیے گئے ہیں۔ کیونکہ ورثاء میں سے کوئی مرنے والے کے ساتھ قرابتداری رکھتا ہے اور کسی کا زوجیت کے لحاظ سے تعلق ہے اور کسی کا اس لحاظ سے ہے کہ میت نے اسے آزاد کیا ہے کیونکہ یہ تعلق بھی نسبی تعلق کی طرح ہے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ام کجہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! میری دو لڑکیاں ہیں، ان کا والد فوت ہو گیا ہے اور ان کے پاس کوئی چیز نہیں۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ عنقریب یہی حدیث دوسرے الفاظ سے میراث کی دونوں آیات کی تفسیر میں پھر آئے گی۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ: اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی کا ورثہ تقسیم ہونے لگے اور وہاں کوئی ایسا دور کا رشتہ دار آ جائے جس کا وراثت میں حصہ نہ ہو، اس کے علاوہ یتیم اور مساکین بھی آ جائیں تو ورثہ میں سے انہیں بھی کچھ نہ کچھ عطا کر دیا جائے۔ ابتدائے اسلام میں تو یہ واجب تھا۔ بعض نے کہا ہے مستحب ہے اور اب یہ حکم باقی ہے یا نہیں اس میں دو قول ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ورثاء پر واجب ہے کہ خوشدلی سے ان لوگوں کو دیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ وغیرہ سے یہی مروی ہے۔ حضرات ابن سیرین، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، عطا بن ابی رباح، شہاب زہری اور یحییٰ بن یعمرؒ بھی اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ حضرت ابن سیرین فرماتے ہیں کہ حضرت عبیدہ کو وصیت میں کچھ مال ملا تو آپ نے بکری ذبح کرنے کا حکم دیا اور اس کا گوشت دور کے رشتہ داروں اور یتیموں اور مساکین کو کھلایا۔ اور فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو بکری میرے مال کا حصہ تھی۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ عروہ نے جب مصعب کا مال تقسیم کیا تو اس میں سے ان لوگوں کو بھی عطا کیا۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ واجب ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ مرنے والے کو حکم ہے کہ مرنے سے پہلے ان لوگوں کے لیے وصیت کر جائے۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نے اپنے باپ

کا ورثہ تقسیم کیا تو گھر میں جتنے بھی مساکین اور قرابتدار تھے، سب کو عطا کیا اور پھر یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔ اس وقت حضرت عائشہؓ زندہ تھیں۔ جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا انہوں نے صحیح نہیں کیا کیونکہ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ جب مرنے والا خود ان کے لیے وصیت کر جائے تو پھر ان کو عطا کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بالکل منسوخ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ آیت (يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ......) ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت تھا جب وراثت میں تمام لوگوں کے حصے مقرر نہ تھے اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے تمام کے حصے مقرر کر دیے اور ہر مستحق کو اس کا حق ادا کر دیا تو اب صدقہ صرف وہی رہ گیا جو مرنے والا کہہ گیا۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ منسوخ ہے۔ حصے مقرر کرنے سے پہلے یتیم، فقراء مساکین اور قریبی رشتہ داروں کو مرنے والے کے مال سے حصہ ملتا تھا جب وہ ورثہ کی تقسیم کے وقت حاضر ہوتے تھے۔ لیکن آیت میراث نے اسے منسوخ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کر دیا۔ اب مرنے والا ان کے لیے وصیت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اسی طرح حضرات عکرمہ، ابوشعثاء، قاسم ابن محمد، ابوصالح، ابو مالک، زید بن اسلم، ضحاک، عطاء خراسانی، مقاتل بن حیان اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن بھی اس آیت کے نسخ کے قائل ہیں۔ یہی جمہور فقہاء اور آئمہ اربعہ کا مذہب ہے۔ لیکن ابن جریر نے یہاں انتہائی عجیب قول اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مال وصیت کی تقسیم کے وقت جب میت کے قریبی رشتہ دار آ جائیں تو ان کو عطا کرو۔ اگر یتیم اور مساکین آ جائیں تو ان سے خوش کلامی سے پیش آؤ۔ یہ ان کی طویل بحث کا ماحصل ہے۔ البتہ ان کا یہ قول محل نظر ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں تقسیم سے مراد میراث کی تقسیم ہے۔ اسی طرح دوسرے کئی حضرات نے بھی یہی بیان کیا ہے۔ جو کہ ابن جریر کی رائے کے خلاف ہے۔ آیت طیبہ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ میراث کی تقسیم کے وقت یہ غریب رشتہ دار حاضر ہو جائیں اور اسی طرح غریب یتیم اور مساکین بھی آ جائیں اور وہ دیکھیں کہ سب نے اپنا اپنا حصہ لے لیا ہے تو وہ مایوس ہو جائیں گے کہ ان کے لیے کوئی چیز نہیں بچی تو اللہ تعالیٰ جو کہ بڑا ہی مہربان اور رحیم ہے، نے حکم دیا ہے کہ ان لوگوں کو بھی بطور صدقہ کچھ دے دیا جائے۔ اس طرح ان پر احسان بھی ہو جائے گا اور ان کا دل بھی نہیں ٹوٹے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (انعام: 141) ''ترجمہ: اس کے پھل سے کھاؤ جب وہ پھل دار ہو جائے تو کٹائی کے دن اس کا حق بھی ادا کرو''۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جو اپنے مال کو خفیہ طور پر اس خوف سے لے جاتے ہیں کہ کہیں محتاجوں اور مسکینوں کو اس کی اطلاع نہ ہو جائے۔ جیسا کہ سورۂ نون میں باغ والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ انہوں نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ باغ کے پھل کو صبح صبح ہی کاٹ لیں گے تاکہ کوئی مسکین نہ پہنچ سکے۔ جب وہ اس ارادے سے باغ کی طرف نکلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے باغ کو تباہ کر دیا۔ اور جو شخص دوسروں کے حقوق کا انکار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے سخت سزا دیتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے جس مال میں صدقہ مل جائے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اپنے مال کا صدقہ نہ نکالے تو اس کا مال صدقہ نہ دینے کے باعث تباہ ہو جاتا ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس شخص کے بارے میں ہے جو قریب المرگ ہو اور کوئی آدمی اس کے پاس موجود ہو اور اس کی ایسی وصیت کو سن رہا ہو جو اس کے ورثاء کے لیے نقصان دہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سننے والے کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس سے ڈرے اور اس کی صحیح رہنمائی کرے اور اس کے ورثاء کے لیے وہی بھلائی چاہے جو وہ اپنے ورثاء کے لیے چاہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب سعد بن ابی وقاصؓ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں بہت مالدار ہوں اور میرے پیچھے صرف ایک ہی بیٹی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا دو تہائی مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔

انہوں نے عرض کی پھر آدھا مال صدقہ کر دوں۔آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر عرض کی کہ ایک تہائی مال صدقہ کر دوں۔آپ نے فرمایا ہاں لیکن یہ بھی زیادہ ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اگر تم اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو فقیر چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں(1)۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ایک تہائی سے کم یعنی چوتھائی کی وصیت کریں تو یہ اچھا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تہائی کو بھی کثیر کہا ہے۔فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر مرنے والے کے ورثاء مالدار ہوں تو اس کے لیے مستحب ہے تو وہ اپنے ایک تہائی مال کی وصیت کرے اور اگر ورثاء غریب ہوں تو اس کے لیے ایک تہائی سے کم کی وصیت کرنا مستحب ہے۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تم یتیموں کا مال استعمال کرنے میں اللہ سے ڈرو، اس میں اسراف نہ کرو اور ان کے بالغ ہونے کے خوف سے جلدی جلدی نہ کھاؤ۔ یہ قول ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یہ قول بھی بڑا حسین اور عمدہ ہے۔ کیونکہ اس کے بعد یتیموں کا مال ناحق کھانے والوں کی سزا بیان کی جارہی ہے۔یعنی یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح تم چاہتے ہو کہ تمہارے مرنے کے بعد تمہاری اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اس طرح تم بھی لوگوں کی اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کرو جب تمہیں ان کا نگران بنادیا جائے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں خبردار کیا ہے کہ جو ظلماً یتیم کا مال کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتا ہے۔اس لیے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا: جولوگ بغیر کسی وجہ کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ مال قیامت کے دن ان کے پیٹوں میں بھڑکتی ہوئی آگ بن جائے گا؟ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات ہلاکت خیز گناہوں سے بچو۔عرض کی یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک، جادو، بے وجہ قتل، سود خوری، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے فرار ہونا، اور پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا(2)۔حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! ہمیں معراج کی رات کا کوئی واقعہ سنائیں۔آپ نے فرمایا کہ میں نے بہت سے آدمی دیکھے جن میں ہر ایک کا ہونٹ اونٹ کے ہونٹ کی طرح لٹک رہا تھا۔ان پر کچھ فرشتے مقرر تھے جو ان کے دونوں جبڑوں کو کھول رہے تھے، پھر جہنم کا ایک گرم پتھر لا کر ان کے منہ میں ڈال دیتے۔ وہ پتھر ان کے پیٹ سے پچھلے راستے سے نکل جاتا اور وہ بری طرح چیخ و پکار کرتے تھے۔ میں نے جبرائیل سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ کہا یہ یتیموں کا مال کھانے والے ہیں جو اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔عنقریب جہنم میں دھکیل دیے جائیں گے۔حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ یتیم کا مال کھانے والا قیامت کے دن اپنی قبر سے اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کے منہ، ناک، کانوں اور آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے۔ ہر شخص دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ یہ یتیم کا مال کھانے والا ہے۔حضرت ابوبرزہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں کو قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ ان کے منہ میں آگ بھڑک رہی ہوگی۔عرض کی گئی یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال کھانے والے کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں دو ضعیفوں عورت اور یتیم کا مال کھانے سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو جن کے پاس یتیم بچے پرورش پارہے تھے۔انہوں نے ان کے کھانے پینے کو اپنے کھانے پینے سے الگ کر دیا اور ان کی باقی ماندہ چیزوں کو بھی انہی کے لیے رکھ دیتے حتیٰ کہ یتیم خود انہیں کھا لیتے یا وہ خراب ہو جاتیں۔اور یہ چیز ان پر سخت گراں گزری تو انہوں نے بارگاہ رسول اللہ ﷺ میں ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت (وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی) نازل فرمائی جس کا مطلب یہ ہے کہ

1۔فتح الباری، کتاب الفرائض 14/12 2۔مسلم، کتاب الایمان:92

جس کام میں تم یتیموں کی بہتری سمجھو وہ کرو۔ چنانچہ اس کے بعد پھر لوگوں نے ان کے کھانے پینے کو اپنے کھانے پینے کے ساتھ ملا لیا اور اپنے ساتھ شریک کر لیا۔

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ‌ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ‌ ۚ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ‌ ۚ وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ‌ ؕ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ‌ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ‌ ؕ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا‌ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝۱۱

''حکم دیتا ہے تمہیں اللہ تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں۔ ایک مرد (لڑکے) کا (حصہ) برابر ہے دو عورتوں (لڑکیوں) کے حصہ کے۔ پھر اگر ہوں صرف لڑکیاں دو سے زائد تو ان کے لیے دو تہائی ہے جو میت نے چھوڑا۔ اور اگر ہو ایک ہی لڑکی تو اس کے لیے نصف ہے۔ اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس سے جو میت نے چھوڑا بشرطیکہ میت کی اولاد ہو اور اگر نہ ہو اس کی اولاد اور اس کے وارث صرف ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا تیسرا حصہ ہے (باقی سب باپ کا) اور اگر میت کے بہن بھائی بھی ہوں تو ماں باپ کا چھٹا حصہ ہے (اور یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے جو میت نے کی اور قرض ادا کرنے کے بعد، تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کون ان میں سے زیادہ قریب ہے تمہیں نفع پہنچانے میں، یہ حصے مقرر ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جاننے والا ہے بڑا دانا ہے''۔

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ: یہ آیت کریمہ، اس کے بعد والی آیت اور اس سورت کی آخری آیت کا تعلق علم میراث سے ہے۔ یہ مکمل علم ان آیات اور احادیث طیبہ سے مستنبط کیا گیا ہے۔ گویا یہ احادیث ان آیات کی تفسیر ہیں۔ ہم اس علم کے مسائل، دلائل اور ائمہ کرام کے اختلافات کو ذکر کریں گے۔ یہ مسائل اکثر احکام کی کتب میں ذکر کیے گئے ہیں۔ علم میراث کی رغبت کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ علم کی تین قسمیں ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زائد ہے۔ 1۔ محکم آیات۔ 2۔ ثابت شدہ احادیث۔ 3۔ فریضہ عادلہ یعنی مسائل میراث (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ علم میراث سیکھو اور دوسرے لوگوں کو سکھاؤ۔ یہ نصف علم ہے جو بھلا دیا جاتا ہے۔ اور یہ پہلی چیز ہے جو میری امت سے اٹھالی جائے گی (2)۔ حضرت ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ اسے نصف علم اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس کی ضرورت ہر ایک کو پیش آتی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ میری عیادت کے لیے بنو سلمہ کے محلہ میں پاپیادہ تشریف لائے۔ اس وقت میں بے ہوش تھا۔ حضور ﷺ نے پانی منگوا کر وضو فرمایا اور وضو کے باقی پانی کو مجھ پر چھڑکا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے مال کی تقسیم کس طرح کروں تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (3)۔ ایک دوسری روایت میں حضرت جابر فرماتے

1۔ ابن ماجہ، المقدمہ: 21 2۔ ابن ماجہ، کتاب الفرائض: 908 3۔ مسلم، کتاب الفرائض: 1235

ہیں کہ حضرت سعد بن ربیع کی زوجہ محترمہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض یارسول اللہ! یہ سعد بن ربیع کی بیٹیاں ہیں۔ ان کے والد تو غزوۂ احد میں شہید ہو گئے، ان کے چچا نے ان کا کل مال لے لیا ہے اور ان کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ اب مال کے بغیر ان کی شادی نہیں ہوسکتی۔ آپ نے فرمایا ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ نے ان لڑکیوں کے چچا کی طرف پیغام بھیجا کہ سعد کی بیٹیوں کو کل مال کا دو تہائی اور ان کی والدہ کو آٹھواں حصہ دو اور باقی اپنے پاس رکھ لو(1)۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابرؓ کے سوال پر اس صورت کی آخری آیت نازل ہوئی جیسا کہ عنقریب اس کا بیان آرہا ہے۔ کیونکہ ان کی وارث ان کی بہنیں تھیں، ان کی بیٹیاں نہ تھیں۔ اس لیے وہ کلالہ تھے۔ دوسری حدیث کے راوی بھی خود حضرت جابر ہی ہیں جس میں سعد بن ربیع کے ورثہ کے بارے میں نازل ہونے والی آیت کا ذکر ہے۔ لیکن چونکہ امام بخاری نے اس حدیث کو یہاں ذکر کیا تھا اس لیے ہم نے بھی ان کی اتباع کرتے ہوئے ذکر کردی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اولاد کے بارے میں عدل کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ جاہلیت کے دور میں لوگ اپنی تمام میراث لڑکوں میں تقسیم کردیتے اور لڑکیوں کو کچھ نہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اصل میراث میں لڑکیوں کا حق مقرر کردیا۔ لیکن ان کے حصے اور لڑکوں کے حصے میں فرق رکھا ہے۔ کیونکہ مردوں کے ذمہ جو ضروریات ہیں وہ عورتوں کے ذمہ نہیں۔ مثلاً مرد کو کھانے پینے کا خرچ، تجارت اور روزی کمانے کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہی مناسب تھا کہ اس کا حصہ لڑکی کے حصے سے دگنا ہوتا۔ بعض دانا بزرگوں نے اس آیت کریمہ سے ایک لطیف نکتہ مستنبط کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر بہ نسبت ان کے ماں باپ کے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے والدین کو ان کی اولاد کے بارے میں وصیت فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ان پر ان کے والدین سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ قیدی عورتوں میں سے ایک عورت کا بچہ اس سے جدا ہوگیا۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے بچے کو ڈھونڈنے لگی اور جب اسے اپنا بچہ مل گیا تو اسے اپنے سینے سے لگایا اور دودھ پلانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ دیکھ کر اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ بتاؤ! کیا یہ عورت اپنے اختیار کے باوجود اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے۔ انہوں نے عرض کی ہرگز نہیں۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پہلے مال کا حقدار صرف لڑکا ہوتا تھا۔ اور ماں باپ کو بطور وصیت کچھ مل جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کردیا اور لڑکے کو لڑکی سے دگنا حصہ عطا فرمایا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا اور تیسرا حصہ عطا فرمایا۔ بیوی کے لیے آٹھواں اور چوتھا اور خاوند کے لیے نصف اور چوتھا حصہ مقرر فرمایا۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے احکام میراث کو نازل فرمایا تو بعض لوگوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ بیوی کو چوتھایا آٹھواں حصہ دیا جارہا ہے اور بیٹی کو نصف اور اس کے علاوہ چھوٹے بچوں کا حصہ بھی مقرر کردیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے کوئی بھی جنگ کرنے اور مال غنیمت حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ پھر کہنے لگے اس مسئلے پر خاموشی اختیار کرو۔ شاید رسول اللہ ﷺ اس کو بھول جائیں یا ہم ان کی بارگاہ میں عرض کریں کہ وہ ان احکام کو تبدیل کردیں۔ پھر انہوں نے آپ کی بارگاہ میں عرض کی کہ آپ نے بیٹی کو باپ کی میراث سے نصف حصہ دینے کا حکم فرمایا ہے حالانکہ وہ نہ تو گھوڑے پر سوار ہوسکتی ہے اور نہ جنگ کرسکتی ہے۔ اور اسی طرح چھوٹے بچے کا میراث میں حصہ مقرر کیا گیا ہے حالانکہ وہ بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ یہ لوگ زمانہ جاہلیت میں بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے کہ میراث سے صرف اسی کو حصہ دیتے جو جنگ کرنے کے قابل ہوتا۔ پس سب سے پہلے بڑے لڑکے کو حصہ دیتے پھر اس سے چھوٹے کو۔

فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں فوق کا لفظ زائد ہے۔ جیسا کہ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ (انفال: 12)

1۔ مسند احمد 352/3

میں فوق کا لفظ زائد ہے۔ لیکن ہم نہ اس آیت میں اور نہ اس آیت میں فوق کو زائد تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک میں کوئی ایسی زائد چیز نہیں جو بے فائدہ ہو کیونکہ اللہ کے کلام میں ایسا ہونا محال ہے۔ اس لیے کہ ان کی بات صحیح ہوتی تو فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ کی جگہ فَلَهُمَا ثُلُثَا مَا تَرَكَ کا ذکر کیا جاتا۔ ہاں اگر لڑکیاں صرف دو ہوں تو ان کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کو دو ثلث ملے گا۔ کیونکہ دوسری آیت میں دو بہنوں کو دو ثلث دیا گیا ہے۔ جب دو بہنوں کو دو ثلث عطا کیا گیا ہے تو دو بیٹیوں کو بدرجہ اولیٰ دو ثلث عطا کیا جائے گا۔ پہلے حضرت جابرؓ کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ربیع کی دو بیٹیوں کو دو ثلث عطا کرنے کا حکم فرمایا۔ اس طرح یہ قرآن وسنت سے ثابت ہو گیا۔ اسی طرح اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ اگر بیٹی ایک ہو اور بیٹا نہ ہو تو اسے آدھا حصہ ملتا ہے۔ پس اگر دو کو بھی آدھا حصہ دینا مقصود ہوتا تو اس کو یہاں بیان کر دیا جاتا۔ جب ایک بیٹی کے حصے کو علیحدہ ذکر کر دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ دو بیٹیوں کو وہی حصہ ملے گا جو دو سے زائد کا ہے۔

وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ: والدین کے لیے وراثہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ 1۔ اگر مرنے والے کی اولاد ایک لڑکی سے زیادہ ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر مرنے والے کی صرف ایک بیٹی ہو تو نصف ترکہ اس بیٹی کو ملے گا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اس کے علاوہ باقی جو چھٹا حصہ بچے گا وہ باپ کو بطور عصبہ مل جائے گا۔ اس صورت میں باپ کو اس کے مقرر کردہ حصے کے علاوہ عصبہ ہونے کے اعتبار سے بھی ملے گا۔ 2۔ مرنے والے کی کوئی اولاد نہ ہو اور صرف اس کے والدین ہوں تو والدہ کو اس صورت میں تیسرا حصہ ملے گا باقی کل مال باپ کو عصبہ ہونے کے لحاظ مل جائے گا۔ گویا کہ اس کو دو ثلث یعنی ماں سے دوگنا ملے گا۔ اگر مرنے والے کی اولاد نہ ہو اور والدین اور بیوی ہو یا مرنے والی عورت تھی اور اس کی کوئی اولاد نہ تھی البتہ والدین اور شوہر تھا۔ ان دونوں صورتوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ خاوند کو نصف ملے گا اور بیوی کو چوتھا حصہ۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ اس کے بعد ماں کو کیا ملے گا۔ اس میں تین قول ہیں۔ i۔ ان دونوں مسئلوں میں خاوند یا بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد باقی مال کا تیسرا حصہ والدہ کو دیا جائے گا۔ کیونکہ باقی مال ان دونوں کی نسبت گویا کل مال ہے اور والدہ کا حصہ باپ سے نصف ہے اس لیے باقی مال کا تیسرا حصہ والدہ لے لے گی اور باقی جو دو حصے بچے وہ باپ لے لے گا۔ یہ حضرات عمر، عثمان، عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابتؓ کا قول ہے۔ اصح روایت کے مطابق حضرت علیؓ کا بھی یہی قول ہے۔ اور یہی رائے فقہائے سبعہ اور ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کی ہے۔ ii۔ ان دونوں صورتوں میں والدہ کو کل مال کا ثلث ملے گا۔ کیونکہ آیت کریمہ عام ہے۔ خواہ والدہ کے ساتھ مرنے والے کی بیوی ہو یا مرنے والی کا شوہر یا دونوں نہ ہوں۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے اور حضرت علی اور معاذ بن جبلؓ سے بھی مروی ہے۔ قاضی شریح اور داؤد ظاہری کی بھی یہی رائے ہے۔ ابوالحسین محمد بن عبداللہ بن لبان بصری نے بھی اپنی کتاب "الایجاز" جو کہ علم الفرائض میں ہے، میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ قول محل نظر ہے۔ بلکہ یہ ضعیف ہے۔ کیونکہ آیت کے ظاہری مفہوم کے مطابق والدہ کا حصہ اسی صورت میں مقرر کیا ہے جب کہ کل مال وراثت کے حقدار صرف ماں باپ ہوں۔ مگر یہاں خاوند یا بیوی پہلے اپنا مقرر شدہ حصہ لیں گے اور اس کے بعد جو باقی بچے گا وہ بلاشبہ ان دونوں کا حصہ ہے۔ اس میں سے اس کو تیسرا حصہ ملے گا۔ iii۔ اگر مرنے والا مرد ہے اور اس کی بیوی موجود ہے تو اس صورت میں والدہ کو کل مال کا تیسرا حصہ ملے گا۔ کیونکہ اس صورت میں بیوی کو کل مال کا چوتھا حصہ ملنا ہے۔ اگر کل مال کے بارہ حصے کیے جائیں تو اس کی بیوی کو تین حصے ملیں گے۔ والدہ کو چار اور باقی پانچ حصے باپ لے گا اور اگر مرنے والی عورت ہو اور اس کا خاوند موجود ہو تو ماں کو باقی مال کا تیسرا حصہ ملے گا۔ کیونکہ اگر کل مال کا تیسرا حصہ اس صورت میں ماں کو دے دیا جائے تو اسے باپ سے زیادہ حصہ ملے گا۔ مثلاً اگر کل مال کے چھ حصے کیے جائیں تو تین حصے خاوند کو ملیں

گے، دو حصے ماں کو اور باپ کے لیے صرف ایک حصہ بچے گا جو کہ ماں سے کم ہے اس لیے اس صورت میں چھ میں سے تین خاوند کو دیے جائیں گے۔ ایک حصہ ماں کو اور دو باپ کو۔ یہ حضرت ابن سیرینؒ کا قول ہے۔ اور یہ پہلے دونوں اقوال کا مرکب ہے۔ یہ ضعیف ہے اور پہلا قول ہی اصح ہے۔ 3۔ اگر والدین کے ساتھ مرنے والے کے بھائی بھی ہوں خواہ وہ سگے ہوں یا صرف باپ کی طرف سے یا صرف ماں کی طرف سے تو ان تمام کو باپ کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن ان کی موجودگی سے ماں کو تیسرے حصے کی بجائے چھٹا حصہ ملے گا۔ اور پھر اگر ماں کے ساتھ باپ کے علاوہ اور کوئی وارث نہ ہو تو اس صورت میں باقی سارا مال باپ کو مل جائے گا۔ جمہور علماء کے نزدیک دو بھائیوں کا وہی حکم ہے جو دو سے زائد کا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ ایک دفعہ حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور کہا کہ دو بھائیوں کی موجودگی میں ماں کو تیسرا حصہ ہی ملے گا کیونکہ قرآن حکیم میں ''اِخۡوَۃٌ'' کا لفظ آیا ہے جو کہ جمع ہے۔ اگر دو بھائی مراد ہوتے ''اَخَوَانِ'' کہا جاتا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا! یہ مسئلہ مجھ سے پہلے اسی طرح چلا آ رہا ہے میں اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا کیونکہ تمام علاقوں میں یہی رائج ہے۔ اول تو یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے راوی شعبہ پر امام مالک نے جرح کی ہے۔ پھر اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے خاص اصحاب اور شاگرد اس قول کو اختیار کرتے حالانکہ ان سب سے اس کے برعکس منقول ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ دو کو بھی ''اِخۡوَۃٌ'' کہا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن قتادہ سے بھی یہی مروی ہے۔

فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ: اگر بھائی دو سے زیادہ ہوں وہ خود تو وارث نہیں بنیں گے لیکن ان کی موجودگی میں والدہ کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر بھائی ایک ہو تو والدہ کو تیسرا حصہ ملے گا۔ اور اگر ایک سے زیادہ ہوں گے تو اس کو چھٹا حصہ ہی ملے گا۔ علمائے کرام نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ماں کو تیسرے کی چھٹا اس لیے ملتا ہے اس لیے کہ میت کے بھائیوں کی شادی اور ان کے نان ونفقہ کی ذمہ داریاں والد پر ہوتی ہے۔ اسی حکمت کی بناء پر باپ کو زیادہ حصہ ملتا ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ سے بسند صحیح مروی ہے کہ یہ چھٹا حصہ جو ماں کا کم ہو گیا وہ انہی کو ملے گا۔ یہ قول شاذ ہے۔ حضرت ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ کا یہ قول تمام امت کے مخالف ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کلالہ وہ ہوتا ہے جس کا نہ بیٹا ہو نہ باپ۔

مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ: تمام علمائے سلف وخلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہوگا۔ بنظر عمیق دیکھا جائے تو اس آیت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ تم قرآن حکیم میں وصیت کا حکم پہلے پڑھتے ہو اور قرض کا بعد میں، لیکن یاد رکھو کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے قرض کی ادائیگی کا حکم دیا اور بعد میں وصیت کا۔ والدہ کی طرف سے سگے بھائی وارث ہوں گے۔ علاتی بھائی وارث نہیں ہوں گے۔ آدمی اپنے سگے بھائی کا وارث ہوگا۔ نہ کہ اس بھائی کو جو صرف باپ کی طرف سے ہو(1)۔ یہ حدیث صرف حضرت حارث سے مروی ہے اور بعض محدثین نے ان پر جرح کی ہے۔ لیکن یہ علم میراث کے حافظ تھے اس لیے آپ کو اس علم سے خاص دلچسپی تھی اور اس کے حساب میں انتہائی ماہر تھے۔

اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ بلکہ ابتداء اسلام میں بھی مال اولاد کو مل جاتا تھا اور ماں باپ کو اس صورت میں بطور وصیت ہی کچھ ملتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اب یہ منسوخ کر کے ان دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ حصہ مقرر کر دیا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات انسان کو باپ کی طرف سے دنیاوی یا اخروی نفع حاصل ہوتا ہے۔ جو اسے بیٹے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہیں باپ کی طرف سے زیادہ نفع پہنچے

1۔ مسند احمد، 1/144

گا یا اولاد کی طرف سے۔ یعنی دونوں کی طرف سے امید ہے۔ اس لیے ہم نے باپ کا حصہ بھی مقرر کر دیا ہے اور بیٹے کا بھی۔ اور اصل میراث میں ان دونوں کو برابر کر دیا ہے۔

فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ: میراث کے بارے یہ جو مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ بعض وراث کو کم اور بعض ورثاء کو زیادہ۔ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں جو کہ علیم اور حکیم ہے۔ ہر ایک کو وہ حصہ عطا کرتا ہے جس کا وہ مستحق ہو۔ اس لیے ارشاد فرمایا: إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

''اور تمہارے لیے نصف ہے جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں بشرطیکہ نہ ہو ان کی اولاد اور اگر ہو ان کی اولاد تو تمہارے لیے چوتھائی ہے اس سے جو وہ چھوڑ جائیں (یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے وہ جو کر جائیں اور قرض ادا کرنے کے بعد اور تمہاری بیویوں کا چوتھا حصہ ہے اس سے جو تم چھوڑ و بشرطیکہ نہ ہو تمہاری اولاد اور اگر ہو تمہاری اولاد تو ان کا آٹھواں حصہ ہے اس سے جو تم پیچھے چھوڑ جاؤ (یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے جو تم نے کی ہو اور (تمہارا) قرض ادا کرنے کے بعد اور اگر ہو وہ شخص جس کی میراث تقسیم کی جانے والی ہے کلالہ وہ مرد ہو عورت اور اس کا بھائی یا بہن ہو تو ہر ایک کے لیے ان میں سے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب شریک ہیں تہائی میں (یہ تقسیم) وصیت پوری کرنے کے بعد ہے جو کی گئی ہے اور قرض ادا کرنے کے بعد بشرطیکہ کہ اس سے نقصان نہ پہنچایا گیا ہو (یہ نظام وراثت) حکم ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے''۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے مردو! تمہاری وہ عورتیں جو مر جائیں اگر ان کی اولاد نہ ہو تو تمہیں ان کے ورثہ سے نصف ملے گا۔ اگر ان کی اولاد ہو تو تمہیں چوتھائی حصہ ملے گا اور یہ قرض اور وصیت ادا کرنے کے بعد ملے گا۔ ترتیب اس طرح ہوگی کہ پہلے قرض ادا کیا جائے گا۔ پھر وصیت پوری کی جائے گی اور پھر ورثہ تقسیم ہوگا۔ اس مسئلہ پر تمام علماء امت کا اجماع ہے۔ پوتے بھی اس مسئلہ میں بیٹوں کی طرح ہیں بلکہ ان کی اولاد در اولاد کا بھی یہی حکم ہوگا۔ ان کی موجودگی میں خاوند کو چوتھائی حصہ ملے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیویوں کا حصہ بیان کیا ہے کہ ان کو اولاد کی غیر موجودگی میں چوتھا حصہ ملے گا اور ان کی موجودگی میں آٹھواں حصہ ملے گا۔ اور اس چوتھائی یا آٹھویں حصے میں مرنے والے کی تمام بیویاں ہوں گی یعنی اگر وہ چار، تین یا دو ہیں تو ان کو یہی حصہ ملے گا۔ اور وہ اس حصے کو آپس میں تقسیم کر لیں گی اور اس کے بعد وصیت کا ذکر ہے جس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً: کلالہ اکلیل سے مشتق ہے۔ اور اکلیل اس تاج کو کہتے ہیں جو سر کو تمام طرف سے گھیر لے۔ یہاں اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے وارث ارد گرد کے لوگ ہوں۔ اصل اور فرع یعنی جڑ یا شاخ اس کے وارث نہ ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا میں اپنی رائے سے جواب دے رہا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ اللہ کی طرف سے اور اگر یہ غلط ہوا تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔ اللہ اور اس کا رسول اس سے بری ہیں۔ کلالہ وہ ہوتا ہے جس کی نہ کوئی اولاد نہ ہو نہ والد۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو آپ نے فرمایا کہ مجھے ابوبکر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے حیاء آتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کا سب سے آخری زمانہ پانے والا ہوں۔ میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کلالہ وہی ہے جس کی اولاد ہو نہ والد۔ حضرت علیؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، زید بن ثابتؓ کا بھی یہی قول ہے۔ امام شعبی، نخعی، حسن بصری، قتادہ اور جابر بن زیدؒ سے بھی یہی منقول ہے۔ اہل مدینہ، کوفہ، بصرہ، ائمہ اربعہ اور جمہور علمائے سلف و خلف کا اسی پر اتفاق ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس پر اجماع امت کا قول کیا ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی وارد ہوئی ہے ابن لبان فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایات میں یہ بھی مروی ہے کہ کلالہ وہ ہے کہ جس کی اولاد نہ ہو۔ لیکن پہلا قول ہی صحیح ہے۔ ممکن ہے کہ راوی نے ان کی مراد نہ سمجھی ہو۔

وَلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ: یعنی اس کلالہ کا ماں کی طرف سے کوئی بھائی یا بہن ہو۔ یہ روایت قتادہ کی حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے۔ اسی طرح حضرت نے ابوبکر سے بھی یہ تفسیر روایت کی ہے۔

فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ: ماں کی طرف سے بھائی باقی وارثوں سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ 1۔ یہ اس کے بھی وارث بنیں گے جس کی وجہ سے انہیں یہاں وراثت میں حصہ مل رہا ہے۔ یعنی اپنی والدہ کے بھی وارث ہوں گے۔ 2۔ ان کے مرد اور عورت یعنی بہن بھائی دونوں میراث میں برابر ہیں۔ 3۔ یہ اسی صورت میں وارث ہوں گے جب مرنے والا کلالہ ہوگا۔ یعنی میت کے باپ دادا، بیٹے پوتے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوں گے۔ 4۔ انہیں تیسرے حصے سے زیادہ نہیں ملے گا۔ اگرچہ تعداد میں زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک روایت میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ماں کی طرف سے بہن بھائیوں میں ورثہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ مرد کو دو اور عورت کو ایک ملے گا۔ حضرت زہری فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ تب ہی کیا ہوگا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوگا۔ آیت کریمہ میں اتنا تو واضح ہے کہ اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو تمام کی تمام ثلث میں شریک ہوں گی۔ اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر میت کے وارثوں میں خاوند، والدہ یا دادی اور ماں کی طرف سے دو بھائی اور باپ کی طرف سے ایک یا ایک سے زائد بھائی ہو تو جمہور علماء کہتے ہیں کہ اس صورت میں خاوند کو نصف ماں یا دادی کو چھٹا اور ماں کی طرف سے بھائیوں کو تیسرا حصہ ملے گا۔ اور اسی تیسرے حصے میں سگے بھائی بھی شریک ہو گے۔ کیونکہ ان کے درمیان قدر مشترک ہے۔ یہ مسئلہ حضرت عمرؓ کے دور میں پیش آیا آپ نے خاوند کو نصف، والدہ کو چھٹا اور ماں کی طرف سے بھائیوں کو تیسرا حصہ دیا۔ اور جب سگے بھائیوں نے وراثت کا مطالبہ کیا تو آپ نے ان کو بھی اس تیسرے حصے میں شریک کر دیا اسی طرح حضرت عثمانؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ اور ایسی ہی ایک روایت ابن مسعود، ابن عباس اور زید بن ثابتؓ سے مروی ہے۔ حضرات سعید بن مسیب، قاضی شریح، مسروق، طاؤس، ابراہیم نخعی، عمر بن عبدالعزیز، صاوی، شریکؒ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، شافعی اور اسحاق بن راہویہ کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن حضرت علیؓ اس شرکت کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ تیسرا حصہ ماں کی طرف سے بھائیوں کو دے دیتے اور دونوں کی طرف سے اولاد کو کچھ نہ عطا فرماتے کیونکہ یہ عصبہ ہیں اور عصبہ کو اسی وقت ملتا ہے جب ذوی الفروض سے بچ جائے۔ حضرت وکیع ابن جراح فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے اس کے خلاف کوئی قول مروی نہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ کا بھی یہی

قول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی قول مشہور ہے۔ امام شعبی، ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد بن حسن، حسن بن زیاد، زفر بن ہذیل، امام احمد، یحییٰ بن آدم، نعیم بن حماد، ابوثور، داؤد بن علی ظاہریؒ کا بھی یہی قول ہے۔ اور ابوالحسین بن لبان نے اپنی کتاب ''ایجاز'' میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ: اور ورثہ کی تقسیم وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے۔ یہ وصیت بھی عدل و انصاف پر مبنی ہونی چاہیے۔ اس سے نہ تو کسی دوسرے کا نقصان ہو اور نہ ہی کسی پر ظلم۔ یعنی اس وصیت کی وجہ سے کسی وارث کو اس کے حصے سے محروم کرنے یا اس کا حصہ کم کرنے یا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصے زیادہ کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اور ایسی کوشش کرنے والا اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی شریعت کی مخالفت کا مرتکب ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ وصیت کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچانا گناہ کبیرہ ہے۔ یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً بھی روایت کی گئی ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں۔ اسی لیے علماء میں اختلاف ہے کہ اگر مرنے والا وارث کے لیے کسی مال کا اقرار کرے تو کیا اس کا یہ اقرار صحیح ہے یا نہیں۔ اس میں دو قول ہیں۔ 1۔ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں تہمت کا خطرہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کر دیا ہے اس لیے وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔ یہ امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ اور امام شافعیؒ کا پہلا قول بھی یہی ہے۔ اور ایک دوسرے قول میں امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ اقرار صحیح ہے۔ اور یہی حضرات طاؤس، عطاء، حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا بھی مذہب ہے۔ امام بخاریؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور حضرت رافع بن خدیج کی حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کیونکہ انہوں کی وصیت کی تھی کہ فزار یہ نے جس چیز کا دروازہ بند کر دیا ہے اس کو نہ کھولا جائے پھر امام بخاری فرماتے ہیں بعض لوگوں کا قول ہے کہ اقرار صحیح نہیں کیونکہ اس سے دوسرے ورثاء کے بارے میں سوء ظن کا پہلو نکلتا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بدگمانی سے بچو اور یہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جس کی جو امانت ہو وہ اسے پہنچا دے۔'' یہاں وارث یا غیر وارث کی تخصیص نہیں کی گئی لیکن یہ اختلاف اسی صورت میں ہے جب اقرار فی الواقع صحیح ہو اور نفس الامر کے مطابق ہو۔ لیکن اگر یہ حیلہ سازی اور بعض ورثاء کو زیادہ دینے اور بعض کا حصہ کم کرنے کا ذریعہ ہو تو یہ بالاجماع حرام ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ کے ظاہری الفاظ بھی یہی ثابت ہو رہا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

''یہ حدیں اللہ کی (مقرر کی ہوئی) ہیں اور جو شخص فرمانبرداری کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی داخل فرمائے گا اسے اللہ تعالیٰ باغوں میں بہتی ہوں گی جن کے نیچے نہریں ہمیشہ رہیں گے وہ ان میں اور یہی ہے بڑی کامیابی۔ اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی اور تجاوز کرے اللہ کی (مقررہ) حدوں سے داخل کرے گا اسے اللہ آگ میں ہمیشہ رہے گا اس میں اور اس کے لیے عذاب ہے، ذلیل کرنے والا''۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ: اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے لیے جو حصے مقرر کیے ہیں اور ان میں سے بعض کو میت کے زیادہ قریب ہونے اور ان کی

ضرورت کے مطابق حصہ عطا فرمایا ہے۔ یہ سب اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں۔ تم ان حدود کو نہ توڑو اور نہ ہی ان سے آگے بڑھو اور نہ ان سے تجاوز کرو۔ اس لیے اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان احکام میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصے سے نہ تو کسی وارث کو زیادہ دے گا اور نہ ہی کسی حیلے بہانے سے کسی وارث کا حصہ کم کرے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی جنت میں داخل کرے گا جس میں نہریں رواں ہوں گی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں رہیں گے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ کے لیے نار جہنم میں داخل کر دے گا اور یہاں اس کے لیے رسوا کن عذاب ہوگا کیونکہ اس نے اللہ کی حدود کی خلاف ورزی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہیں ہوا۔ اسی لیے اسے اس دائمی عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص ستر سال تک نیکی کا عمل کرتا رہتا ہے اور پھر وصیت کے وقت ورثاء کے حق میں ظلم وستم سے کام لیتا ہے تو اس کا خاتمہ برے عمل پر ہوتا ہے اس طرح وہ نار جہنم میں داخل ہو جاتا ہے اور ایک شخص ستر سال تک برائی کرتا رہتا ہے لیکن وصیت میں عدل سے کام لیتا ہے تو اس کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر تم چاہو تو یہ آیت کریمہ پڑھ لو (تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ......)

امام ابو داؤد "الاضراب فی الوصیت" کے باب میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرد یا عورت ساٹھ سال تک اللہ کی بندگی میں مصروف رہتے ہیں اور پھر جب موت کا وقت قریب آتا ہے تو وصیت میں نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ جس کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے آیت کریمہ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ پڑھی(1)۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

"اور جو کوئی ارتکاب کرے بدکاری کا تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کرو (تہمت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو بند کر دو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ پورا کر دے ان (کی زندگی) کو موت یا بنا دے اللہ تعالیٰ ان (کی رہائی) کے لیے کوئی رستہ۔ اور جو مرد عورت ارتکاب کریں بدکاری کا تم میں سے تو خوب اذیت دو انہیں۔ پھر اگر دونوں توبہ کر لیں اور (اپنی) اصلاح کر لیں تو چھوڑ دو انہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے"۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ: ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ جب عادل گواہوں کی سچی گواہی سے کسی عورت پر زنا ثابت ہو جاتا تو اس کو گھر میں قید کر لیا جاتا اور گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جاتی یہاں تک کہ اس کو اسی حالت میں موت آ جاتی۔ اس آیت کریمہ میں یہی حکم بیان کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی سزا اس وقت تک رہے گی جب تک کہ اللہ تعالیٰ ان کی رہائی کے لیے کوئی دوسرا راستہ بیان نہ کر دے اور یہاں اس راستے سے مراد وہ آیت کریمہ ہے جس نے اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ

1۔ مسند احمد 278/2

فرماتے ہیں کہ زانی عورت کی یہی سزا تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کو نازل فرما کر اس کو منسوخ کر دیا اور وہاں شادی شدہ زانیہ کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ کو کوڑے مارنے کا حکم فرمایا۔ اسی طرح حضرت عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن بصری، عطاء خراسانی، ابو صالح، قتادہ، زید بن اسلم، ضحاکؒ سے بھی مروی ہے کہ اس آیت کا مفہوم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور اس امر پر سب کا اتفاق ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو اس کا آپ پر بڑا اثر ہوتا آپ کو تکلیف محسوس ہوتی اور چہرہ مبارک متغیر ہو جاتا۔ ایک دن اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر وحی نازل فرمائی اور جب وحی کی یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے یہ ارشاد فرمایا اے لوگو! میری بات غور سے سنو اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لیے راستہ نکال لیا ہے اگر زنا کرنے والے مرد اور عورت دونوں شادی شدہ ہوں تو پہلے انہیں سو کوڑے ماریں جائیں پھر پتھروں سے سنگسار کر دیا جائے اور اگر غیر شادی شدہ ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے (1)۔ اور یہ حدیث صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں بھی الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مروی ہے۔ ابن مردویہ کی ایک غریب حدیث میں شادی شدہ اور غیر شادی کے حکم کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اگر زنا کرنے والے بوڑھے ہوں تو ان کو رجم کر دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب سورۂ نساء نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بس اس کے بعد عورتوں کو قید کرنے کا حکم باقی نہیں رہا۔ امام احمد اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زانی اگر شادی شدہ ہو تو اسے کوڑے بھی لگائے جائیں اور رجم بھی کیا جائے۔ لیکن جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ اس کو کوڑے نہیں لگائے جائیں گے صرف رجم ہی کیا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز اسلمیؓ اور غامدیہ کو رجم کیا تھا، کوڑے نہیں لگائے تھے۔ اور اسی طرح آپ نے دو یہودیوں کے رجم کا بھی حکم دیا تھا اور انہیں کوڑے نہیں لگائے تھے۔ یہ عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رجم کے ساتھ کوڑے لگانا منسوخ ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ: یعنی اگر مرد اس برائی کا ارتکاب کریں تو ان کو برا بھلا کہہ کر عار دلاؤ اور جوتے مار کر سزا دو۔ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ زانی اگر غیر شادی شدہ ہے تو اسے کوڑے لگائیں جائیں اور شادی شدہ ہے تو اس کو رجم کیا جائے۔ حضرات عکرمہ، عطاء، حسن بصری اور عبداللہ بن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس مرد اور عورت کے بارے نازل ہوئی جو زنا کا ارتکاب کریں۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ جواں مرد اور عورتیں ہیں جو شادی شدہ نہ ہوں۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ ان مردوں کے بارے میں نازل ہوئی جو لواطت کا ارتکاب کریں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم کسی کو لواطت کرتے ہوئے دیکھو تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔

فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا: اگر وہ دونوں اپنی بدکاری سے باز آ جائیں اور توبہ کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں تو ان سے اعراض کرو۔ یعنی درشت کلامی اور سختی سے پیش نہ آؤ۔ کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اس نے گناہ نہ کیا ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ جب تم میں سے کسی کی لونڈی برائی کا ارتکاب کرے تو وہ اسے کوڑے لگائے اور اس پر ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے یعنی حد لگانے کے بعد اسے عار نہ دلائے کیونکہ حد اس کے گناہ کا کفارہ ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

1۔ مسند احمد: 318/5

السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

”توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے ان کی توبہ ہے جو کر بیٹھتے ہیں گناہ بے سمجھی سے پھر توبہ کرتے رہتے ہیں جلدی سے پس یہی لوگ ہیں (نظر رحمت سے) توجہ فرماتا ہے اللہ ان پر اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑی حکمت والا اور نہیں توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لیے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آجائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب اور نہ ان لوگوں کی توبہ جو مرتے ہیں اس حال میں کہ وہ کافر ہیں انہیں کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے عذاب دردناک“۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر کوئی بندہ جہالت کی بناء پر کسی فعل بد کا ارتکاب کر بیٹھے اور پھر اللہ تعالیٰ سے توبہ کا خواستگار ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے اگرچہ یہ توبہ فرشتہ موت کو دیکھنے کے بعد غرغرے سے پہلے ہو۔ حضرت مجاہد وغیرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی خطأ یا قصداً اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے وہ جاہل ہے حتیٰ کہ وہ اس گناہ سے باز آجائے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے کہ بندہ جو بھی گناہ کرے وہ جہالت ہے۔ قتادہ نے بھی صحابہ کرام کی ایک جماعت سے یہ روایت کی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اللہ کی نافرمانی کرنے والا شخص جب کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ جاہل ہے۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس ؓ اور عطاء ؒ سے مروی ہے۔

ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ: حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ ملک الموت کو دیکھنے سے پہلے پہلے توبہ کرنے کو قریب کہا ہے۔ ضحاک ؒ کہتے ہیں جس نے موت سے پہلے توبہ کر لی اس پر بھی قریب کا اطلاق ہوتا ہے۔ قتادہ اور سدی ؒ فرماتے ہیں کہ صحت کی حالت میں توبہ کر لینی چاہئے۔ حضرت حسن بصری ؒ فرماتے ہیں کہ غرغرے کی کیفیت سے پہلے توبہ کرنی چاہئے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ ”اَلدُّنْیَا كُلُّهَا قَرِیْبٌ“ حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ کو قبول کرتا ہے جب تک اسے غرغرے کی کیفیت لاحق نہ ہو (1)۔ انہی سے دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ اس کے مرنے سے ایک مہینہ پہلے تک قبول کر لیتا ہے۔ بلکہ اگر وہ مرنے سے ایک گھڑی اخلاص سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا۔ ایک اور روایت میں ارشاد نبوی ہے: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی موت سے ایک سال پہلے توبہ کرے تو میں اس کی توبہ کو قبول کر لیتا ہوں حتیٰ کہ اگر کوئی بندہ اپنی موت سے پہلے ایک مہینہ، ایک ہفتہ یا ایک دن بلکہ ایک ساعت بھی توبہ کرے گا تو میں اس کی توبہ قبول کر لیتا ہوں۔ راوی فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سن کر حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ کی خدمت میں عرض کی کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے (اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ……) آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں وہ حدیث سنائی ہے جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی۔ حضرت عبد الرحمٰن بن سلمانی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے چار صحابی ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ ان میں سے ایک نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کی توبہ قبول کر لیتا ہے جو مرنے سے ایک دن پہلے توبہ کرے دوسرے نے پوچھا کہ تم نے یہ حضور ﷺ سے خود سنا ہے۔ انہوں نے جواب دیا ہاں۔ دوسرے صحابی نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص اپنی موت سے نصف دن پہلے توبہ کر لے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے۔ تیسرے صحابی نے پوچھا کہ کیا تم نے یہ حضور ﷺ سے خود سنا ہے۔ اس

1۔ مسند احمد: 132/2

نے جواب دیا ہاں۔ پھر تیسرے صحابی فرمانے لگے کہ میں نے تو آپ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص اپنی موت سے ایک پہر پہلے توبہ کر لے اس کی توبہ بھی قبول ہو گی۔ چوتھے صحابی نے کہا کیا تم نے یہ خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ اس نے جواب دیا ہاں۔ اس پر چوتھے صحابی بولے کہ میں نے تو آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر بندہ روح نکلنے سے پہلے پہلے توبہ کر لے تو اس کی توبہ مقبول ہو گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ غرغرہ کی کیفیت شروع ہونے سے پہلے تک قبول کر لیتا ہے۔ اس مضمون کے متعلق مرسل احادیث بھی وارد ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ غرغرہ کی کیفیت لاحق ہونے سے پہلے تک قبول کر لیتا ہے۔ حضرت ابو قلابہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اپنی بارگاہ سے دھتکار دیا تو اس نے مہلت طلب کی اور کہا کہ تیرے عزت اور جلال کی قسم جب تک ابن آدم کے جسم میں روح رہے گی میں اس کے دل سے نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم کہ جب تک اس کے جسم میں روح رہے گی میں اس کی توبہ قبول کرتا رہوں گا۔ اور یہی مفہوم اس حدیث مرفوع میں بھی ہے جو ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان نے کہا اے اللہ! مجھے تیری عزت کی قسم میں اولاد آدم کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کے جسموں میں روح باقی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم۔ میں انہیں معاف کرتا رہوں گا جب تک وہ مجھ سے مغفرت طلب کرتے رہیں گے۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جب تک انسان زندہ ہے اور اسے اپنی زندگی کی امید ہے اگر وہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرے اور اس کی توبہ مقبول ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا مگر جب انسان زندگی سے مایوس ہو جائے اور روح نکل کر حلق میں پہنچ جائے، سینہ میں گھٹن محسوس ہو اور غرغرے کی کیفیت طاری ہو جائے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں کیونکہ یہ توبہ کی گھڑی نہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں جو مرتے دم تک گناہوں پر اصرار کرتے رہے اور جب موت سامنے نظر آئی تو اس وقت توبہ کرنے لگے۔ اسی مفہوم کو اسی آیت کریمہ: فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ”ترجمہ: پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ ہم ایک اللہ پر ایمان لائے“۔ اور اسی طرح ارشاد فرمایا کہ جب سورج مغرب سے طلوع ہو گا تو اہل زمین اس کو دیکھ کر توبہ کریں گے لیکن ان کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا...... (انعام:158) ”ترجمہ: جس روز آپ کے رب کی کوئی نشانی آئے گی تو نفع نہ دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو اس سے پہلے ایمان نہیں لا چکا“۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو کافر اپنے کفر و شرک پر مرے گا اسے اس کی ندامت اور توبہ کچھ فائدہ نہیں دے گی اور نہ ہی اس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اگرچہ زمین بھر سونا دینا چاہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل شرک کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور اس کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ جب تک پردہ نہ پڑ جائے۔ عرض کی گئی کہ اس پردہ پڑ جانے سے کیا مراد ہے۔ فرمایا کہ شرک کی حالت میں جان کا نکلنا۔ انہی لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کے لیے دردناک اور دائمی عذاب تیار کر رکھا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ

اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

”اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لیے کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی۔ اور نہ روکے رکھو انہیں تاکہ لے جاؤ کچھ حصہ اس (مہر وغیرہ) کا جو تم نے دیا ہے انہیں بجز اس صورت کے کہ ارتکاب کریں کھلی بدکاری کا۔ اور زندگی بسر کرو اپنی بیویوں کے ساتھ عمدگی سے پھر اگر تم ناپسند کرو انہیں تو (صبر کرو) شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور رکھ دی ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لیے) خیر کثیر۔ اور اگر تم ارادہ کرلو کہ بدلو ایک بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز۔ کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے۔ اور کیوں کر (واپس) لیتے ہو تم مال کو حالانکہ مل جل چکے ہو تم (تنہائی میں) ایک دوسرے سے اور وہ لے چکی ہیں تم سے پختہ وعدہ۔ اور نہ نکاح کرو جن سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا مگر جو ہو چکا (اس سے پہلے سو معاف ہے)۔ بے شک یہ فعل بہت بے حیائی اور نفرت کا فعل تھا اور بہت برا طریقہ تھا“۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص مر جاتا اس کے وارث اس کی عورت کے پورے حقدار سمجھے جاتے۔ اگر ان میں سے کوئی چاہتا تو خود اس سے شادی کر لیتا۔ اگر وہ چاہتے تو کسی دوسرے کو نکاح میں دے دیتے۔ اور اگر وہ چاہتے تو اسے نکاح ہی نہ کرنے دیتے۔ بہر حال وہ اس عورت کے رشتہ داروں سے بھی زیادہ خیال کرتے تھے۔ جاہلیت کی اس رسم کے خلاف یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1)۔ ایک دوسری روایت میں آپؓ سے یہ مروی ہے کہ وہ لوگ اس عورت کو مجبور کر دیتے کہ وہ حق مہر سے دست بردار ہو جائے یا نکاح کے بغیر ہی بیٹھی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے ان کو ان عمل سے روک دیا(2)۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور روایت میں مروی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تو اس کے ورثہ میں سے جو اس پر کپڑا اڈال دیتا وہ اس کا حق دار سمجھا جاتا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ کپڑا اڈالنے والا اس عورت کو حسین پاتا تو خود اس سے نکاح کر لیتا۔ اور اگر وہ بد صورت ہوتی تو اسے یہیں روکے رکھتا تا کہ مرنے کے بعد اس کا وارث بنے۔ حضرت عوفی روایت کرتے ہیں کہ جب کسی کا گہرا دوست فوت ہو جاتا تو وہ اپنا کپڑا اس عورت پر ڈال لیتا اور پھر اس کو نکاح کا مختار سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ اس کا نکاح کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس عورت کو اپنے پاس قید رکھتا حتیٰ کہ وہ عورت کچھ فدیہ دے کر اس سے اپنی جان چھڑا لیتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما کر اس رسم کو ختم کر دیا۔ حضرت زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اہل یثرب میں یہ رواج تھا کہ جب ان میں سے کوئی آدمی مر جاتا تو جو اس کے مال کا وارث بنتا وہ اس کی عورت کا بھی وارث بن جاتا۔ وہ شخص اپنی مرضی سے جہاں چاہتا اس کا نکاح کر دیتا۔ یا اس کو مجبور کر کے اپنے پاس رکھتا تا کہ اس کے مال کا وارث بن سکے۔ اسی طرح اہل تہامہ بھی عورتوں کے ساتھ برا سلوک کرتے۔ حتیٰ کہ طلاق دیتے وقت بھی یہ شرط لگا لیتے کہ وہ ان کی مرضی کے بغیر کہیں نکاح نہیں کر سکے گی اور اس سے چھٹکارے کی صورت یہی ہوتی کہ وہ عورت اسے کچھ مال

1۔ فتح الباری، تفسیر سورۃ النساء: 245/8
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح: 231/2

دے کر اپنی جان چھڑا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین کو اس سے منع فرما دیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جاہلیت کے دور میں ابو قیس بن اسلت کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے نے اس کی بیوی سے نکاح کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا۔ حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ وہ خاوند کے مرنے کے بعد اس عورت کو اپنے کسی بچے کی پرورش پر مقرر کر دیتے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کا لڑکا اس کی بیوی کا زیادہ حقدار سمجھا جاتا۔ اگر وہ چاہتا تو خود سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتا یا اپنے بھائی یا بھتیجے سے نکاح کر دیتا۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ ابو قیس بن اسلت کی بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ! میرے خاوند کے مرنے کے بعد یہ لوگ نہ تو مجھے میراث سے حصہ دیتے ہیں اور نہ یہ مجھے کسی سے نکاح کرنے دیتے ہیں اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ دور جاہلیت میں جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کا وارث اس کی عورت پر اپنا کپڑا ڈال دیتا۔ اگر تو اس وارث کا چھوٹا بیٹا یا بھائی ہوتا تو وہ اس عورت کو روک لیتا تا کہ وہ جوان ہو کر اس کے ساتھ نکاح کر سکے۔ یا وہ عورت اس کے پاس ہی مر جاتی۔ اگر وہ عورت اس کے کپڑا ڈالنے سے پہلے ہی اپنے میکے آ جاتی تو اس کی جان چھوٹ جاتی۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ جب کسی آدمی کی پرورش میں یتیم بچی ہوتی تو وہ اس کو اس امید سے اپنے پاس روکے رکھتا اگر اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تو وہ خود اس سے شادی کر لے گا یا اپنے بیٹے سے اس کا نکاح کرا دے گا۔ ان تمام اقوال سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کر کے عورتوں کی جان اس مصیبت سے چھڑا دی۔

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا: اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ میں ارشاد فرماتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ برا سلوک کر کے ان کو مجبور نہ کرو کہ وہ اپنا مکمل حق مہر یا اس کا بعض حصہ یا کوئی اور حق چھوڑ دے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب کسی مرد کو اپنی عورت سے نفرت ہوتی اور وہ اسے چھوڑنا چاہتا لیکن مہر سے بچنے کے لیے اس کو طرح طرح کی تکالیف دیتا تا کہ وہ مہر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ حضرت ابن سلمانی فرماتے ہیں کہ ان دونوں آیات میں سے پہلی آیت امر جاہلیت کو مٹانے کے لیے اور دوسری آیت امر اسلام کی اصلاح کے لیے نازل ہوئی۔

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرات سعید بن مسیب، شعبی، حسن بصری، محمد بن سیرین، سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، عطاء خراسانی، ضحاک، ابو قلابہ، ابو صالح، سدی، زید بن اسلم اور سعید بن ابی ہلالؒ فرماتے ہیں کہ فاحشہ مبینہ سے مراد زنا ہے۔ یعنی جب عورت زنا جیسے فعل بد کا ارتکاب کرے تو مرد کے لیے جائز ہے کہ اپنا حق مہر واپس لے لے یا اس پر سختی کرے حتیٰ کہ وہ اپنا حق مہر چھوڑ کر خلع پر مجبور ہو جائے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا...... ''ترجمہ: اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اس میں سے لو جو تم نے انہیں دیا ہے۔ بجز اس کے کہ ان دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان پر کوئی حرج نہیں کہ عورت فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لے''۔ حضرت ابن عباسؓ عکرمہ اور ضحاک فرماتے ہیں کہ فاحشہ مبینہ سے مراد عورت کی نافرمانی اور لڑائی جھگڑا ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ سب کو شامل ہے۔ یعنی زنا، نافرمانی، لڑائی جھگڑا، بدزبانی وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں مرد کے لیے جائز ہے کہ وہ عورت پر سختی کرے تا کہ وہ اپنا مکمل حق مہر یا اس کا بعض حصہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے اور یہی قول زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی یہ روایت پہلے گزر چکی ہے کہ یہ آیت کریمہ زمانہ جاہلیت کی رسم کو ختم کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ حضرت عکرمہ اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ روایات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ یہ آیت کریمہ جاہلی دور کی رسم ختم کرنے کے لیے نازل ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اس چیز سے روک دیا گیا۔ حضرت

عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں کہ قریش مکہ میں یہ رواج تھا کہ جو شخص کسی شریف عورت سے شادی کرتا اور جب ان کے درمیان باہمی موافقت نہ ہو پاتی تو اسے اس شرط پر طلاق دیتا کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر کہیں شادی نہیں کرے گی۔ پھر اس عورت پر گواہ مقرر ہو جاتے اور اقرار نامہ لکھ دیا جاتا۔ اب اس عورت کو کہیں سے شادی کا پیغام آتا تو وہ عورت اسے کچھ مال دے کر راضی کر لیتی تو وہ اسے نکاح کی اجازت دے دیتا اور اگر مال نہ دیتی تو اسے اپنے پاس ہی روکے رکھتا اس کی ممانعت میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ حکم اور سورۂ بقرہ کی آیت کا حکم ایک ہی ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی عورتوں کے ساتھ شائستگی کے ساتھ گفتگو کرو اور ان کے ساتھ حسن خلق سے پیش آؤ اور حسب طاقت اپنی وضع قطع درست رکھو۔ کیونکہ جس طرح تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیویاں بن سنور کے رہیں اس طرح ان کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ:228) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنی گھر والی کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا ہو۔ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ تم سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہوں۔ نبی کریم ﷺ اپنے اہل خانہ سے انتہائی اچھا سلوک کرتے اور ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ ان کو خوش رکھتے، نرمی کے ساتھ پیش آتے، کشادہ دلی سے ان پر خرچ کرتے۔ کبھی کبھار ان سے مزاح بھی کر لیتے حتیٰ کہ آپ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ لگائی۔ آپ خود ہی روایت فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے آگے نکل گئی اور کچھ عرصے کے بعد ہمارے درمیان دوڑ ہوئی تو اس بار حضور ﷺ آگے نکل گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اس جیت کا بدلہ ہے۔ یعنی اس طرح آپ حضرت عائشہؓ کا دل بہلایا کرتے تھے۔ اور جس زوجہ محترمہ کے پاس آپ نے رات گزارنی ہوتی وہیں آپ کی تمام ازواج مطہرات جمع ہو جاتیں، بات چیت ہوتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ ان سب کے ساتھ رات کا کھانا تناول فرماتے اور پھر یہ سب اپنے اپنے حجروں میں چلی جاتیں اور آپ وہیں آرام فرماتے۔ آپ اپنی زوجہ کے ساتھ ایک ہی چادر میں آرام فرماتے اور عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد گھر تشریف لاتے تو اپنے اہل خانہ کے ساتھ سونے سے پہلے تھوڑی سی گفتگو فرماتے اسی طرح آپ ﷺ ان کو خوش رکھتے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب:21) اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آپ کے اسوہ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (مترجم)

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ: یعنی اگر تم اپنی عورتوں کو ناپسند کرتے ہو اور اس کے باوجود ان کو اپنے پاس رکھتے ہو تو ممکن ہے اس میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بہتری ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں مرد اس عورت پر نرمی کرے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کوئی بچہ عطا فرما دے اور وہ ان کے لیے خیر کثیر کا سبب بنے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت کو اپنے آپ سے الگ نہ کرے کیونکہ اگر اس کی کوئی عادت ناگوار ہوگی تو اس کی بہت سی عادات بھلی بھی ہوں گی۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ: اگر تم میں کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ تو پہلی بیوی کو جو مہر دیا ہے اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لے خواہ وہ مال بہت زیادہ ہو۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں قنطار کی مکمل تفصیل بیان کی جا چکی ہے اسے یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو مہر میں زیادہ مال دینا بھی جائز ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ کثیر مہر دینے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابوالعجف اسلمی فرماتے ہیں کہ میں نے عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا کہ عورتوں کو بہت زیادہ مہر نہ دیا کرو۔ اگر یہ دنیاوی طور پر کوئی اچھی چیز ہوتی یا اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ شمار ہوتا تو اللہ کے رسول اس پر سب سے پہلے عمل کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ یا بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں کیا۔ انسان بہت زیادہ مہر مقرر کر کے مصیبت میں پڑ

جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی بیوی اسے بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کے دل میں اس کی دشمنی بیٹھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے کہتا ہے کہ تو نے میرے کندھوں پر مشک لٹکا دی ہے(1)۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ منبر رسول پر چڑھ گئے اور کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے لوگو! تم عورتوں کے مہر بہت زیادہ مقرر کرنے لگے ہو حالانکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے چار سو درہم یا اس سے کم مہر دیا ہے۔ اگر مہر میں زیادتی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ اور کرامت کا باعث ہوتی تو تم ان سے سبقت نہ لے جاتے۔ خبردار! آج کے بعد کوئی آدمی چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر نہ کرے۔ یہ فرمایا کر آپ منبر سے نیچے اترے تو ایک قریشی عورت آپ کے سامنے آئی اور کہنے لگی اے امیر المومنین! کیا آپ نے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس عورت نے کہا کہ کیا آپ نے اس کے بارے اللہ کا حکم نہیں سنا۔ آپ نے فرمایا وہ کیا ہے؟ عورت نے کہا کہ اللہ کا یہ ارشاد ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا...... تو حضرت عمر نے عرض کیا کہ اے اللہ مجھے معاف فرما، کہ ہر آدمی عمر سے زیادہ سمجھدار ہے۔ پھر آپ واپس لوٹے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ اے لوگو! میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن اب جو شخص اپنے مال سے جتنا مہر دینا چاہے دے دے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ عورت نے یہ آیت کریمہ اس طرح پڑھی: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا مِّنْ ذَهَبٍ حضرت عبداللہ بن مسعود کی بھی یہی قرات تھی اور حضرت عمرؓ نے اس عورت سے فرمایا کہ ایک عورت عمر پر غالب آ گئی۔ ایک روایت میں آپ نے فرمایا۔ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کرو اگر چہ وہ ذوالقصہ کی بہن ہو یعنی یزید بن حصین حارثی کی بیٹی۔ اور جس نے اس حکم کے بعد بھی مہر زیادہ مقرر کیا تو میں یہ زائد رقم لے کر بیت المقدس میں جمع کر دوں گا۔ یہ سن کر ایک دراز قد اور چپٹی ناک والی عورت کھڑی ہوئی اور کہا کہ آپ یہ حکم نہیں دے سکتے۔ آپ نے فرمایا۔ کیوں نہیں؟ تو اس نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔

وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ یعنی تم عورت سے مہر واپس کیسے لے سکتے ہو حالانکہ تم اسے تنہائی میں مل چکے ہو۔ حضرت ابن عباسؓ مجاہد اور سدی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد میاں بیوی کا باہمی تعلق ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی اور پھر ان دونوں میاں بیوی نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے قسمیں اٹھائیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی اب بھی توبہ کرتا ہے۔ آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ مرد نے کہا میں نے جو مال اسے مہر میں دیا ہے اس کا کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسی مہر کے بدلہ میں وہ عورت تم پر حلال ہوئی تھی اور اگر تم نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو پھر یہ مال تمہیں کسی صورت میں نہیں مل سکے گا۔ حضرت نضرہ بن ابی نضرہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک کنواری عورت کے ساتھ نکاح کیا جب اسے دیکھا تو حاملہ تھی۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے ان کے درمیان تفریق کر دی اور اس عورت کو مہر دینے کا حکم فرمایا جب کہ عورت کو کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ جو بچہ ہو گا وہ تمہارا غلام ہے۔ اور مہر خلوت کے بدلہ میں ہے(2)۔ یہی اس آیت کریمہ کا مفہوم ہے کہ جب میاں بیوی میں صحبت اور خلوت ہو چکی ہو تو مہر کیسے واپس کیا جا سکتا ہے۔

وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا: ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس میثاق سے مراد عقد نکاح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اب جب تمہارا ان سے نکاح ہو چکا ہے تو اچھے طریقے سے انہیں بساؤ یا عمدہ طریقے سے انہیں الگ کر دو۔ ایک حدیث میں ہے کہ تم ان عورتوں کو اللہ کی امانت سے لیتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی کلام سے انہیں حلال کرتے

1۔ مسند احمد: 41,40/1 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح: 241/2

ہو یعنی خطبہ نکاح میں کلمہ شہادت۔ رسول اللہ ﷺ کو معراج کی رات جو بہترین انعامات ملے ان میں سے ایک انعام یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کی امت کا کوئی خطبہ جائز نہیں حتیٰ کہ وہ گواہی دیں کہ تم میرے بندے اور رسول ہو۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا۔ اپنی عورتوں سے اچھا سلوک کرو، تم نے ان کو اللہ کی امانت سے لیا ہے اور ان کو اللہ کے کلمہ کے ساتھ حلال کیا ہے۔

وَلَا تَنۡكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سوتیلی ماؤں کی حرمت کو بیان فرمایا کر ان کی تعظیم وتوقیر کو ظاہر فرمایا ہے حتیٰ کہ بیٹے پر وہ عورت بھی حرام ہے جس کے ساتھ والد نے صرف نکاح ہی کیا ہو۔ اس پر تمام امت کا اجماع ہے حضرت ابوقیس انصاریؓ جب انتقال فرما گئے تو ان کے بیٹے قیس نے اپنی سوتیلی ماں کو شادی کا پیغام بھیج دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تمہیں اپنا بیٹا خیال کرتی ہوں۔ تمہارا شمار قوم کے نیک لوگوں میں ہوتا ہے۔ لیکن میں اس مسئلہ کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گی۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور اپنا تمام قصہ بیان کیا آپ نے ارشاد فرمایا ابھی تم اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ اس کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ حضرت ابوقیس بن اسلت جن کی بیوی ام عبیدہ ضمرہ تھی اور اسود بن خلف جن کے گھر میں ابوطلحہ کی صاحبزادی تھی اور اسود بن مطلب کی بیٹی فاختہ جس کے خاوند کا نام امیہ بن خلف تھا کے بارے میں نازل ہوئی۔ امام سہیلی فرماتے ہیں کہ دور جاہلیت میں سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کرنا عام رواج تھا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ۔ یعنی سوائے اس کے جو پہلے گزر چکا۔ اور اس طرح ارشاد فرمایا کہ دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے مگر جو پہلے گزر چکا ہے اس پر مؤاخذہ نہیں۔ کنانہ بن خزیمہ نے اپنے باپ کی عورت کے ساتھ نکاح کیا تھا اور اسی کے بطن سے نضر بن کنانہ پیدا ہوا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے اوپر کی نسل باقاعدہ نکاح سے ہوئی نہ کہ زنا سے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ چیز جائز تھی اور وہ لوگ اسے نکاح شمار کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں وہ تمام عورتیں حرام تھیں جن کی حرمت اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہے سوائے اس کے کہ وہ سوتیلی ماں اور دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کو حلال سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما کر ان دونوں صورتوں کو حرام کر دیا۔ یہ حضرات عطاء اور قتادہ کا قول ہے۔ لیکن امام سہیلی نے جو کنانہ کا قصہ نقل کیا ہے وہ محل نظر ہے۔ بہر حال امت محمدیہ میں یہ حرام اور انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ بے شک یہ فعل بہت بے حیائی اور نفرت کا فعل تھا اور بہت برا طریقہ تھا۔ ایک اور مقام پر قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ ''ترجمہ: اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کی باتوں کے جو ظاہر ہوں ان سے اور چھپی ہوئی ہوں''۔ وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيۡلًا ''ترجمہ: اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ''۔ اور اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ''مَقۡتًا'' کے لفظ کا اضافہ کیا ہے۔ اس کا معنی بغض ہے اور یہ بذات خود بہت بری بات ہے۔ کیونکہ جو بیٹا اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیتا ہے تو اس کا یہ نکاح باپ کے ساتھ بغض کا سبب بنتا ہے کیونکہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ جو شخص کسی عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے وہ اس کے پہلے خاوند کے ساتھ بغض رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے امت پر امہات المومنین کے ساتھ نکاح کرنا حرام قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات ہونے کی وجہ سے امتی کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں اور حضور ﷺ مثل باپ کے۔ بلکہ امت کے اجماع سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ والد سے بھی عظیم ہیں، آپ کی محبت ہماری اپنی جانوں کی محبت پر بھی مقدم ہے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں کہ ''مَقۡتًا'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فعل

پر ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے اور ''سَآءَ سَبِیْلًا'' سے مراد یہ ہے کہ لوگوں نے یہ برا راستہ اختیار کیا تھا لیکن اب جو اس فعل کا مرتکب ہوگا اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا اور اس کا سارا مال بیت اللہ میں جمع کرا دیا جائے گا اس آیت کے نزول کے بعد ایک شخص نے اپنے والد کی بیوی کے ساتھ نکاح کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو بھیجا کہ وہ اسے قتل کرے اور اس کا مال ضبط کر لے آئے۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں میرے چچا حارث بن عمیر نبی پاک ﷺ کا عطا کردہ جھنڈا ہاتھ میں لیے میرے قریب سے گزرے۔ میں نے پوچھا کہ حضور ﷺ نے آپ کو کہاں بھیجا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے مجھے اس آدمی کی گردن اڑانے بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی عورت کے ساتھ نکاح کر لیا ہے(1)۔

مسئلہ: اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ جس عورت سے باپ نے مباشرت کر لی خواہ نکاح کر کے یا ملکیت میں لا کر، یا کسی شبہ کی بنا پر۔ وہ عورت بیٹے پر حرام ہو جائے گی۔ لیکن اگر مباشرت نہ کی ہو، لیکن اگر شہوت کے ساتھ اس کو چھوا ہو یا اس کے ایسے اعضاء دیکھے ہوں جن اعضاء کو دیکھنا اجنبی عورت ہونے کی حیثیت سے جائز نہ ہو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ عورت اس صورت میں اس کے بیٹے پر حرام ہو گی۔ حضرت خدیج حمصیؒ جو کہ امیر معاویہؓ کے غلام تھے انہوں نے ایک خوبصورت لونڈی حضرت معاویہؓ کے لیے خریدی اور اس کو بغیر کپڑوں کے ان کے پاس بھیج دیا۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اس سے اشارہ کر کے کہنے لگے کہ اچھی نفع کی چیز ہے اگر اس کے لیے مال ہوتا۔ پھر کہنے لگے کہ اسے یزید کے پاس بھیج دو پھر فرمایا نہیں۔ پہلے ربیعہ بن عمرو الجرشی کو بلاؤ جو بہت بڑے فقیہ تھے جب وہ آئے تو امیر معاویہؓ نے ان سے مسئلہ پوچھا کہ میں نے اس لونڈی کے کچھ اعضاء دیکھ لیے ہیں اب میں اسے اپنے لڑکے یزید کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں کیا میں اسے بھیج سکتا ہوں۔ حضرت ربیعہ نے فرمایا امیر المومنین ایسا نہ کیجئے۔ اب یہ اس کے قابل نہیں رہی۔ فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر فرمایا کہ عبداللہ بن مسعدہ فزاری کو بلاؤ۔ ان کا رنگ انتہائی گندم گوں تھا۔ آپ نے فرمایا یہ لونڈی لے جاؤ تا کہ اس کی وجہ سے تمہارے ہاں سفید رنگ کی اولاد پیدا ہو۔ یہ عبداللہ بن مسعدہ وہی ہیں جنہیں حضور ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو عطا کیا تھا۔ انہوں نے ان کی پرورش کی اور بعد میں آزاد کر دیا۔ یہ بعد میں حضرت معاویہؓ کے پاس چلے آئے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ؗ وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۟ۙ (۲۳) وَّ **الْمُحْصَنٰتُ** مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۲۴)

1۔ مسند احمد:291/4

''حرام کردی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری بہنیں رضاعت سے اور مائیں تمہاری بیویوں کی اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پارہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو اور اگر تم نے صحبت نہیں کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر (ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں) اور (حرام کی گئیں) بیویاں تمہارے ان بیٹوں کی جو تمہاری پشتوں سے ہیں اور (یہ بھی حرام ہے) کہ جمع کرو تم دو بہنوں کو مگر جو گزر چکا (سو وہ معاف ہے) یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے بہت رحم فرمانے والا ہے اور (حرام ہیں) خاوندوں والی عورتیں مگر (کافروں کی وہ عورتیں) جو تمہارے ملک میں آجائیں، فرض کیا ہے اللہ نے (ان احکام کو) تم پر اور حلال کردی گئی ہیں تمہارے لیے ماسوا ان کے تاکہ تم طلب کرو (ان کو) اپنے مالوں کے ذریعے پاکدامن بنتے ہوئے نہ زنا کار بنتے ہوئے پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے ان سے تو دو ان کو ان کے مہر جو مقرر ہیں۔ اور کوئی گناہ نہیں تم پر جس چیز پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ مقرر کیے ہوئے مہر کے بعد بے شک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے''۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ: نسبی، رضاعی اور سسرالی رشتے سے جو عورتیں نسب کے اعتبار سے جو عورتیں مرد پر حرام ہیں ان کا ذکر اس آیت میں کیا جارہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ سات عورتیں نسب کے اعتبار سے اور سات سسرال کے اعتبار سے حرام ہیں اور پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ جمہور علماء نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ زنا سے لڑکی پیدا ہو وہ زانی پر حرام ہے۔ کیونکہ یہاں بنات کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جو کہ عام ہے کیونکہ وہ بھی بیٹی ہے اور بیٹیاں حرام ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد کا مذہب ہے۔ امام شافعی ؒ سے اس کی اباحت نقل کی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ شرعی طور پر بیٹی نہیں ہے۔ پس جیسے ورثہ کے بارے میں یہ بیٹی حکم میں شامل نہ ہو کر ورثہ میں کوئی حصہ نہیں پاتی اسی طرح وہ اس آیت کی حرمت میں بھی داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيٓ أَرْضَعْنَكُمْ: اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا کہ جس طرح تمہاری وہ ماں تم پر حرام ہے جس نے تمہیں جنا ہے۔ اسی طرح تم پر وہ ماں بھی حرام ہے جس نے تمہیں دودھ پلایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رضاعت بھی اسے حرام کرتی ہے جسے ولادت حرام کرتی ہے۔ اور صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ رضاعت سے بھی وہ حرام ہیں جو نسب سے حرام ہیں۔ بعض فقہاء کرام نے اس میں سے چار صورتیں اور بعض نے چھ صورتیں خصوص کی ہیں۔ جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ اس میں سے کچھ بھی محسوس نہیں۔ کیونکہ اس کی مثل بعض صورتیں نسب میں بھی پائی جاتی ہیں اور بعض صورتیں ایسی ہیں جو سسرالی رشتے کی وجہ سے حرام ہیں۔ اس لیے اس حدیث پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ پھر ائمہ کرام کا اس میں بھی اختلاف ہے کتنی مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ تعداد متعین نہیں۔ دودھ پیتے ہی حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ امام مالک ؒ کا مذہب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر اور امام زہری کا بھی یہی قول ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں رضاعت کا لفظ عام ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ بچہ تین مرتبہ دودھ پیے تو حرمت ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک یا دو مرتبہ چوسنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی (1)۔ یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے اور یہ امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، ابوعبید، ابوثور ؒ کا مذہب ہے۔ یہی حضرت علی ؓ، سیدہ عائشہ ؓ، ام الفضل ؓ، ابن زبیر ؓ، سلیمان بن مالک اور سعید بن جبیر ؒ سے مروی ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ پانچ مرتبہ دودھ

1۔ مسلم، کتاب الرضاع، 1074،1073

پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے اس سے کم میں نہیں اور ان کی دلیل حضرت عائشہؓ کی وہ روایت ہے جس میں وہ فرماتی ہیں کہ پہلے قرآن مجید میں دس مرتبہ دودھ پلانے پر حرمت کا حکم نازل ہوا تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا اور پانچ مرتبہ کا حکم ہوا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے وصال تک اسی طرح پڑھا جاتا رہا۔ اور اس کی دوسری دلیل حضرت سہلہ بنت سہیل کی حدیث ہے جس کو حضور ﷺ نے حکم دیا تھا کہ وہ سالم کو جو حضرت حذیفہؓ کے غلام تھے پانچ مرتبہ دودھ پلائیں۔ یہ امام شافعی اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے۔ اور جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ رضاعت یعنی دودھ پینا بچپن کی عمر میں ہو، اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس رضاعت کا اثر رضائی ماں کے خاوند تک پہنچے گا یا نہیں۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کا قول ہے کہ اس کا اثر اس کے خاوند تک بھی پہنچے گا یعنی وہ اس بچے یا بچی کا رضائی باپ بن جائے گا۔ بعض سلف کا قول ہے کہ اس کا اثر دودھ پلانے والی تک ہی رہے گا اس کے خاوند تک نہیں پہنچے گا۔

وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ: اس میں بیان فرمایا کہ ساس بھی حرام ہے۔ یعنی جس لڑکی سے نکاح ہو جائے۔ صرف نکاح کرنے سے ہی اس کی ماں اس پر حرام ہو جاتی ہے خواہ صحبت کرے یا نہ کرے۔ مگر جب اس مرد نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس عورت کے ساتھ پہلے خاوند سے ایک لڑکی بھی ہے۔ اگر اس سے صحبت کی تو وہ لڑکی اس پر حرام ہو جائے گی اور اگر صحبت سے پہلے ہی طلاق دے دی تو وہ لڑکی حرام نہیں ہو گی۔ اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہاں ضمیر ''امہات اور ربائب'' کی طرف لوٹ رہی ہے اس لیے صرف نکاح کرنے سے یہ حرام نہیں ہو گی۔ یعنی بیٹی سے صرف نکاح کرنے سے اس کی ماں حرام نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے ساتھ صحبت کرنے کے بعد حرام ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کسی لڑکی سے نکاح کیا پھر اسے دخول سے پہلے ہی طلاق دے دی تو وہ اس کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے۔ جس طرح کہ ربیبہ لڑکی کی ماں کو دخول سے پہلے اگر طلاق دے دی تو اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص دخول سے پہلے اپنی عورت کو طلاق دے دے تو وہ اس کی ماں کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر وہ عورت دخول سے پہلے فوت ہو گئی اور اس کی میراث اس نے لے لی سو اب اس کی ماں کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ ہے۔ اور اگر دخول سے پہلے طلاق دے دی تو پھر اگر چاہے تو کر سکتا ہے۔ حضرت بکر بن کنانہ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے میرا نکاح طائف کی ایک عورت سے کر دیا۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا باپ جو کہ میرا چچا بھی تھا فوت ہو گیا۔ اس کی ماں بہت مالدار تھی، میرے والد نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اس سے نکاح کر لو۔ میں نے حضرت عباسؓ سے یہ مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کی ماں سے نکاح کر سکتے ہو۔ پھر میں نے ابن عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ تم اس سے نکاح نہ کرو میں نے اپنے والد کو ان دونوں فتووں کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کو خط لکھا جس میں ان دونوں فتووں کا ذکر بھی کیا۔ تو انہوں نے جواباً تحریر فرمایا کہ میں حرام کو حلال نہیں کر سکتا اور نہ ہی حلال کو حرام کر سکتا ہوں۔ تم جانو اور تمہارا کام۔ اس کے علاوہ بھی عورتیں تو بہت ہیں۔ یعنی انہوں نے نہ منع کیا نہ اجازت دی۔ چنانچہ میرے باپ نے اس کی والدہ کے ساتھ میرا نکاح کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ اس عورت کی لڑکی اور ماں دونوں حکم میں برابر ہیں۔ اگر تم نے اس کے ساتھ دخول نہ کیا ہو تو یہ دونوں حلال ہیں۔ لیکن اس کی سند میں ایک راوی مبہم ہے اور یہی قول حضرات علی، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور حضرات مجاہد اور سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے۔ حضرت معاویہؓ نے اس میں توقف اختیار کیا ہے۔ شوافع میں سے ابوالحسن، احمد بن محمد صابونی سے یہی قول مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی ایسا ہی ایک قول مروی ہے لیکن بعد میں آپ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ قبیلہ فزارہ کی شاخ بنو کمخ کے ایک شخص نے کسی عورت کے ساتھ نکاح کیا۔ اس کے بعد اس نے جب اس لڑکی کی والدہ کو دیکھا تو اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا کہ میں اب لڑکی کی

والدہ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اس لڑکی کو طلاق دے کر اس کی والدہ سے نکاح کر سکتے ہو۔ اس شخص نے ایسے ہی کیا اور اس عورت سے اس کی اولاد بھی ہوئی۔ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مدینہ تشریف لائے اور اس مسئلہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ حلال نہیں ہے۔ پھر آپ واپس کوفہ تشریف لے گئے اور اس شخص کو کہا کہ یہ عورت تم پر حرام ہے اس لیے اسے چھوڑ دو اس نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے کہ لڑکی صرف عقد نکاح سے حرام نہیں ہوتی جب تک کہ مرد اس کی ماں سے مباشرت نہ کر لے۔ لیکن اس کے برعکس ماں لڑکی کے ساتھ صرف عقد نکاح ہوتے ہی حرام ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے پہلے طلاق دے دے یا وہ دخول سے پہلے مر جائے تو اس کی ماں اس کے لیے حلال نہیں ہوگی کیونکہ یہ مبہم ہے اس لیے اس کو ناپسند فرمایا ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عمران بن حصینؓ اور حضرات مسروق، طاؤس، عکرمہ، حسن بصری اور بہت سے تابعین سے مروی ہے۔ یہی ائمہ اربعہ اور فقہائے سبعہ کا مذہب ہے۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ صحیح قول انہی حضرات کا ہے جو ساس کو دونوں صورتوں میں حرام بتاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حرمت کے ساتھ دخول کی شرط نہیں لگائی جیسا کہ لڑکی کی ماں کے لیے یہ شرط لگائی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ پر اجماع ہے اس لیے اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔ نبی کریم ﷺ سے بھی ایک ضعیف روایت میں جس کی سند محل نظر ہے، مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کر لے تو اس کے لیے اس عورت کی ماں کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں۔ چاہے اس کے ساتھ دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ جس کسی نے کسی عورت کی ماں سے نکاح کیا اور دخول سے پہلے طلاق دے دی تو اب چاہے تو اس کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ کمزور ہے لیکن اس مسئلہ پر امت کا اجماع اس کی صحت کا مقتضی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ تمہاری پرورش میں وہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہوں وہ بھی حرام ہیں بشرطیکہ تم نے اپنی ان سوتیلی لڑکیوں کی ماں سے صحبت کی ہو۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ خواہ گود میں پلی ہوں یا نہ پلی ہوں حرام ہیں۔ کیونکہ عموماً ایسی لڑکیاں اپنی ماں کے ساتھ ہی ہوتی ہیں اور اپنے سوتیلے باپوں کے ہاں ہی پرورش پاتی ہیں اس لیے یہاں فرما دیا کہ وہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہوں۔ حالانکہ یہ حکم اس کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا'' ترجمہ: اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہیں''۔ یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ اگر وہ خود پاکدامنی نہ چاہتی ہوں تو انہیں بدکاری پر مجبور کیا جائے۔ حضرت ام حبیبہؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میری بہن سے نکاح کر لیجئے، آپ نے فرمایا کیا تم یہ پسند کرتی ہو۔ عرض کی ہاں، میں آپ کو خالی نہیں رکھ سکتی اور میں اپنی بہن کو بھی اس کار خیر میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ میرے لیے حلال نہیں انہوں نے عرض کی ہمیں تو معلوم ہوا ہے کہ آپ ابوسلمہ کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ان کی وہ بیٹی جو ام سلمہ سے ہے۔ عرض کی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا اول تو وہ مجھ پر حرام ہے اس لیے کہ وہ میرے پاس پرورش پا رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تب بھی وہ مجھ پر حرام ہے کیونکہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔ ثوبیہ نے مجھے اور ابوسلمہ کو ایک ساتھ دودھ پلایا تھا۔ خبردار! اپنی بیٹیاں اور بہنیں مجھ پر پیش نہ کیا کرو(1)۔ بخاری شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر میں ام سلمہ سے نکاح نہ بھی کرتا تو تب بھی وہ میرے لیے حلال نہ تھی۔ یہاں آپ نے حسرت کی اصل صرف نکاح کو قرار دیا ہے۔ یہی مذہب ائمہ اربعہ، فقہائے سبعہ اور جمہور علمائے خلف وسلف کا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اگر وہ لڑکی اس شخص کی گود میں پرورش پا رہی ہے تب تو اس پر حرام ہے ورنہ نہیں۔ حضرت اوس بن حدثان فرماتے ہیں کہ میری بیوی اولاد چھوڑ کر فوت ہو گئی اس سے مجھے بہت افسوس ہوا۔ ایک دن حضرت علی بن ابی طالبؓ سے ملاقات ہوئی۔ مجھے غمگین دیکھ کر مجھ سے دریافت

1۔ فتح الباری، کتاب النکاح 140/9

کیا کہ کیا بات ہے۔ میں نے تمام قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا اس کے پہلے خاوند کی کوئی بیٹی ہے۔ میں نے کہا ہاں وہ طائف میں رہتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے نکاح کرلو میں نے یہ آیت کریمہ پڑھ کر سنائی اور ان سے پوچھا کہ اس کا پھر کیا مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ لڑکی تمہاری گود میں ہوتی تو حرام ہوتی۔ اور وہ تمہاری گود میں نہیں بلکہ طائف میں ہے۔ اگر چہ اس کی سند صحیح ہے لیکن یہ قول انتہائی غریب ہے۔ اسی قول کو داؤد ظاہری اور اس کے ساتھیوں نے اختیار کیا ہے اور رافعی کی روایت کے مطابق امام مالک کا بھی یہی مذہب ہے۔ ابن حزم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے شیخ ابوعبداللہ ذھبی فرماتے ہیں کہ میں نے یہ روایت شیخ ابن تیمیہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اسے مشکل قرار دیا اور توقف کیا۔ حجور سے مراد گھر ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابوعبیدہ سے مروی ہے کہ اگر لونڈی ملکیت میں ہو اور اس کے ساتھ اس یک لڑکی بھی ہو تو اس کے بارے میں حضرت عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ ایک کے بعد دوسری جائز ہوئی یا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ پسند نہیں کرتا۔ اس کی سند منقطع ہے۔ یہی سوال حضرت ابن عباسؓ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک آیت کریمہ سے یہ حلال معلوم ہوتی ہے اور دوسری سے حرام۔ اس لیے میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا۔ شیخ ابوعمرو بن عبدالبر فرماتے ہیں کہ علماء کا اس امر میں اختلاف نہیں کہ جب کوئی شخص اپنی لونڈی کے ساتھ وطی کرے تو اب اس کی بیٹی کے ساتھ وطی کرنا حلال نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے نکاح میں بھی حرام قرار دیا ہے اور لونڈی احکام نکاح کا تابع ہے۔ سوائے اس روایت کے جو کہ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے۔ لیکن علمائے مجتہدین اور ان کے متبعین میں سے کسی نے اس قول کو اختیار نہیں کیا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ربیبہ کی لڑکی اور اس لڑکی کی لڑکی اسی طرح جس قدر یہ رشتہ نیچے چلا جائے سب حرام ہیں۔ اسی طرح ابوالعالیہ سے یہی مروی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" سے مراد نکاح کرنا ہے۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رخصتی ہو جائے، کپڑا ہٹا لیا جائے، چھیڑ چھاڑ شروع ہو جائے اور مرد ارادہ کر کے بیٹھ جائے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ اگر یہ کام عورت کے گھر میں ہو تو آپ نے فرمایا کہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اس عورت کی لڑکی اس پر حرام ہو جائے گی۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ صرف خلوت اور تنہائی ہو جانے سے اس لڑکی کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اگر مباشرت کرنے، ہاتھ لگانے، اور شہوت سے اس کے عضو کی طرف دیکھنے سے پہلے طلاق دے دی تو بالاجماع اس کی لڑکی اس پر حرام نہیں ہوگی جب تک کہ اس سے مباشرت نہ کر لے۔

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ: یہاں بیان فرمایا کہ تمہاری وہ بہوئیں بھی تم پر حرام ہیں جو تمہاری اپنی اولاد کی بیویاں ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں حرام نہیں۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا...... (احزاب:37)" ترجمہ: جب زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش پوری کر لی تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کر دیا تا کہ ایمان والوں کو کوئی حرج نہ ہو۔ اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ کر لیں۔ اور اللہ کا حکم ہر حال میں ہو کر رہتا ہے"۔ حضرت ابن جریج فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ نبی علیہ السلام نے جب حضرت زید کی زوجہ سے نکاح کر لیا تو مشرکین مکہ نے طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات نازل فرمائیں۔ 1۔ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ......۔ 2۔ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (احزاب:4)۔ 3۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ...... (احزاب:40) حضرت حسن بن محمد فرماتے ہیں کہ یہ آیات مبہم ہیں۔ مبہم کا معنی یہ ہے کہ ان میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں شامل ہیں۔ صرف نکاح ہوتے ہی حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ خواہ صحبت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اور اس مسئلہ پر سب کا اتفاق ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ رضاعی بیٹے کی عورت کیسے حرام ہے جیسا کہ

جمہور علماء نے فرمایا ہے حالانکہ آیات کریمہ میں صلبی بیٹے کا ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حرمت رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ثابت ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہو جاتے ہیں۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ: اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا کہ بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ یہی حکم مِلْكِ يَمِيْن کی لونڈیوں کا ہے۔ کہ وہاں بھی دو بہنوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں مباشرت کرنا حرام ہے۔ مگر جو زمانہ جاہلیت میں ہو چکا اس سے ہم درگزر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ آئندہ یہ کام کسی وقت بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد فرمایا: لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى (دخان:56) وہاں موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے بجز اس پہلی موت کے پس معلوم ہوا کہ آئندہ کبھی موت نہیں آئے گی۔ صحابہ کرامؓ، تابعین، آئمہ عظام اور علمائے خلف وسلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ دو بہنوں سے ایک کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔ جو شخص مسلمان ہوا اور اگر اس کے نکاح میں دو بہنیں ہوں تو اسے اختیار ہے کہ ایک کو رکھ لے اور دوسری کو طلاق دے دے۔ ابو فیروز اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب میں مسلمان ہوا تو میرے نکاح میں دو بہنیں تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے مجھے ایک کو طلاق دینے کا حکم فرمایا(1)۔ اور ترمذی کے الفاظ ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ دونوں میں سے جسے چاہو اختیار کر لو۔ حضرت ابو الخراشؓ سے مروی ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت میرے نکاح میں دو بہنیں تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب واپس جاؤ تو ان میں سے ایک کو طلاق دے دینا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ابوخراش وہی ضحاک بن فیروز ہو اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور شخص ہو۔ ابن مردویہ دیلمی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے نکاح میں دو بہنیں ہیں۔ آپ نے فرمایا ان میں سے ایک کو طلاق دے دو۔ جس دیلمی کا پہلے ذکر ہے وہ ضحاک بن فیروز دیلمی ہیں ان کا شمار یمن کے ان امراء میں ہوتا ہے جنہوں نے مدعی نبوت اسود عنسی کو قتل کیا۔ دو لونڈیوں کو جو آپس میں بہنیں ہوں ایک ساتھ جمع کر کے ان کے ساتھ وطی کرنا بھی حرام ہے۔ اس کی دلیل اسی آیت کا وہ عمومی حکم ہے جو بیویوں اور لونڈیوں دونوں کو شامل ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ مکروہ ہے۔ اس پر سائل نے کہا کہ قرآن میں اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے الفاظ ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تیرا اونٹ بھی تیرے دائیں ہاتھ کی ملکیت میں ہے۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ سے یہی مروی ہے۔ اگرچہ بعض سلف صالحین نے اس مسئلہ میں توقف فرمایا ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک آیت اسے حلال کرتی ہے اور دوسری حرام۔ اس لیے میں اس سے منع نہیں کرتا۔ سائل وہاں سے نکلا تو راستے میں ایک صحابی سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے ان سے بھی یہی سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں ایسا کرنے والے کو عبرت ناک سزا دیتا۔ حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ غالباً یہ صحابی حضرت علیؓ ہیں۔ حضرت زبیر بن عوامؓ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر "استذکار" میں فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے راوی قبیصہ بن ذویب نے حضرت علیؓ کا نام اس لیے نہیں لیا کہ وہ عبدالملک بن مروان کا مصاحب تھا اور ان لوگوں پر آپ کا نام گراں گزرتا تھا۔ حضرت ایاس بن عامرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ میری ملکیت میں دو لونڈیاں ہیں جو دونوں آپس میں بہنیں ہیں۔ ایک سے میں نے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور میرے ہاں اس سے اولاد بھی ہوئی ہے اب میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی بہن جو میری لونڈی ہے کے ساتھ تعلق قائم کروں۔ اس میں شریعت کا کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی لونڈی کو آزاد کر کے پھر اس کی بہن سے تعلق قائم کر سکتے ہو۔ اس نے کہا کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ میں اس کا نکاح کرا دوں پھر اس کی بہن سے مل سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اس صورت

1۔ مسند احمد 232/4

میں یہ خرابی ہے کہ اگر اس کا خاوند اسے طلاق دے دے یا انتقال کر جائے تو وہ لوٹ کر تمہاری طرف آ جائے گی۔ اس لیے اسے آزاد کر دینے میں زیادہ سلامتی ہے۔ پھر میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ آزاد عورتوں اور لونڈیوں کے احکام حرمت وحلت کے لحاظ سے یکساں ہیں البتہ تعداد میں فرق ہے۔ یعنی آزاد عورتیں چار سے زیادہ جمع نہیں کر سکتے ہو اور لونڈی کی تعداد میں کوئی قید نہیں اور اسی طرح رضاعت بھی کسی عورت کا دودھ پینے سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جونسب سے حرام ہوتے ہیں۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ روایت ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص مشرق یا مغرب سے صرف اس روایت کو سننے کے لیے مکہ کے لیے سفر کرے تو اس کے لیے یہ سودا مہنگا نہیں۔ یہ خیال رہے کہ حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے جس طرح حضرت عثمانؓ سے مروی ہے یعنی آپ نے فرمایا کہ ان دو لونڈیوں کو جو آپس میں بہنیں ہوں بیک وقت ان کے ساتھ مباشرت کرنے کو ایک آیت نے حرام قرار دیا ہے اور دوسری نے حلال۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میری لونڈیاں میری قرابت کے باعث تو حرام ہوتی ہیں لیکن جو قرابت ان کی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہے اس سے حرام نہیں ہوتیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ دور جاہلیت میں بھی لوگ ان تمام رشتوں کو حرام سمجھتے تھے جن کو تم اسلام میں حرام سمجھتے ہو۔ سوائے اس کے کہ وہ سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کرنا، دونوں بہنوں کو ایک عقد میں جمع کرنا حرام نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرما کر ان دونوں کو حرام کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو آزاد عورتیں حرام ہیں لونڈیاں بھی وہی حرام ہیں۔ لیکن لونڈیوں کی تعداد متعین نہیں۔ امام شعبی کا بھی یہی قول ہے۔ ابوعمرو فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے قول کی مثل دوسرے بزرگوں کے اقوال بھی موجود ہیں۔ لیکن اول تو ان سے اس قول کی روایت میں سخت اختلاف ہے۔ دوسرے محققین علماء نے اس قول کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ حجاز، عراق، شام، بلکہ شرق وغرب کے فقہاء نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔ سوائے چندان لوگوں کے جو اپنے آپ کو ظاہری کہتے ہیں اور قیاس کے مخالف ہیں۔ گویا انہوں نے ایک متفق علیہ مسئلہ کی مخالفت کی ہے۔ وگرنہ فقہاء کی جماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس طرح دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ اسی طرح لونڈیوں میں جو دو سگی بہنیں ہوں ان کے ساتھ بھی بیک وقت مباشرت کرنا حرام ہے۔ اور اہل اسلام کا اس امر پر اجماع ہے کہ اس آیت کریمہ میں جس طرح ماں، بہن اور بیٹی کو حرام قرار دیا گیا ہے اسی طرح یہ تمام رشتے لونڈیوں میں بھی حرام ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں حکم میں برابر ہیں۔ اسی طرح دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے اور عورت کی ماں کے ساتھ نکاح کرنے اور دوسرے خاوند کی لڑکی سے نکاح کرنے کا بھی یہی حکم ہے۔ اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے اور یہی مخالفین کے خلاف ہماری بھرپور دلیل ہے۔ (تَمَّ الْجُزْءُ الرَّابِعُ بِعَوْنِهٖ تَعَالٰی)

(پارہ پنجم) وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ: اس آیت کریمہ میں بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ اجنبی عورتیں جو کسی کے نکاح میں ہوں تم پر حرام ہیں۔ مگر وہ عورتیں جو کافر ہوں اور میدان جنگ سے قید ہو کر تمہارے پاس آئیں تو وہ ایک حیض گزرنے کے بعد تم پر حلال ہیں۔ حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ غزوہ اوطاس میں ہم نے کچھ شادی شدہ عورتوں کو قید کیا۔ ہم نے ان کے بارے حضور ﷺ سے پوچھا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ اس حدیث کو امام مسلم، نسائی، احمد اور امام عبدالرزاق وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد کے یہ الفاظ ہیں کہ صحابہ کرام نے جنگ اوطاس میں کچھ عورتوں کو قید کیا جن کے خاوند مشرک تھے اور بعض صحابہؓ نے ان کے ساتھ مباشرت نہ کی پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ طبرانی کی روایت کے مطابق یہ غزوۂ خیبر کا واقعہ ہے۔ علمائے سلف کی ایک جماعت نے اس آیت کریمہ کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ لونڈی کو بیچ دینا ہی اس کے خاوند کی طرف سے طلاق کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے

1۔ مسند امام احمد 72/3

جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے کہ اس لونڈی کا بکنا ہی طلاق ہے اور پھر وہ یہ آیت کریمہ تلاوت فرماتے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی منکوحہ لونڈی بیچی جائے تو اس کا آقا اس کے جسم کا زیادہ حقدار ہے۔ حضرات ابی بن کعبؓ، جابر بن عبداللہؓ کا یہی فتویٰ ہے کہ اس کا فروخت کرنا ہی اس کی طلاق ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ لونڈی کی طلاقیں چھ ہیں: 1۔ اس کا فروخت کرنا، 2۔ آزاد کرنا، 3۔ ہبہ کرنا 4۔ برأت کرنا 5۔ خاوند کا طلاق دینا۔ روایت صرف پانچ مذکور ہیں (مترجم)۔ حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ منکوحہ عورت سے نکاح کرنا حرام ہے۔ مگر لونڈی کا بکنا ہی اس کی طلاق ہے۔ یہ ان علماء کے اقوال ہیں جنہوں نے فرمایا کہ لونڈی کا فروخت کرنا ہی اس کی طلاق کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ لیکن جمہور علماء اس کے خلاف ہیں ان کے نزدیک لونڈی کو بیچنا طلاق کے قائم مقام نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ خریدار بیچنے والے کا نائب ہوتا ہے اور بیچنے والا اس نفع کو اپنی ملکیت سے نکال رہا ہے اور وہ اس کو سلب کر کے بیچ رہا ہے۔ اور ان کی دلیل حضرت بریرہؓ کی حدیث ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا اور ان کا نکاح ان کے خاوند حضرت مغیثؓ سے فسخ نہ ہوا۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بریرہؓ کو نکاح کے فسخ کرنے یا باقی رکھنے کا اختیار دیا۔ تو انہوں نے نکاح کو فسخ کرنا پسند کیا۔ ان کا قصہ بہت مشہور ہے۔ اگر لونڈی کو بیچنا اس کی طلاق کے قائم مقام ہوتا تو جیسا کہ یہ بزرگ فرماتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ اس کو یہ اختیار نہ دیتے۔ اور آپ کا یہ اختیار دینا نکاح کے باقی رہنے کی دلیل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وہی لونڈیاں مراد ہیں جو جنگ میں قید ہو کر آئی ہوں۔ واللہ اعلم۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں محصنات سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں یعنی یہ پاکدامن عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جب تک کہ تم نکاح گواہ، مہر وغیرہ پورے کر کے ان کی عصمت کے مالک نہ بن جاؤ۔ خواہ ایک سے نکاح کرو خواہ دو، تین یا چار سے۔ یہ حضرت ابوالعالیہ اور طاؤس سے مروی ہے۔ حضرت عمرؓ اور عبیدہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ چار سے زائد عورتیں تم پر حرام ہیں لیکن لونڈیوں میں تعداد کی کوئی قید نہیں۔

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ: یعنی چار عورتوں کے علاوہ باقی کا حرام ہونا اللہ تعالیٰ نے تم پر لازم کر دیا ہے اس لیے اس کے حکم کو لازم پکڑ و اور اس کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ: یعنی اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کے حرام ہونے کا ذکر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام کے لیے حلال ہیں۔ یہ حضرت عطاء کا قول ہے۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ چار سے کم تم پر حلال ہیں لیکن یہ قول قرین قیاس نہیں اور صحیح قول حضرت عطاء کا ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد لونڈیاں ہیں۔ اور یہی آیت ان لوگوں کی دلیل ہے جو دو بہنوں کو جمع کرنے کی حلت کے قائل ہیں اور ان لوگوں کی بھی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ اسے ایک آیت حرام کرتی ہے اور دوسری حلال۔

وَاَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ: یعنی ان حلال عورتوں میں سے چار کے ساتھ بطریق شرعی مال کے بدلے میں نکاح کر سکتے ہو لیکن لونڈیوں میں تعداد کی حد مقرر نہیں۔ یہاں نکاح شرعی مراد ہے اس لیے فرمایا کہ تم ان عورتوں کے ساتھ نکاح زنا سے بچنے کے لیے کرو۔ صرف نفسانی خواہشات مقصود نہ ہوں۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ: جن عورتوں سے تم فائدہ اٹھاؤ ان سے اس فائدہ کے مقابلہ میں مہر ادا کرو جیسا کہ پہلے ارشاد فرمایا: وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (نساء:21)۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (نساء:4)۔ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا (بقرہ:229)

اس آیت کے عموم سے نکاح متعہ پر استدلال کیا گیا ہے۔ یہ نکاح ابتداء اسلام میں مشروع تھا لیکن بعد میں منسوخ ہو گیا۔ امام شافعیؒ

اور علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ نکاح متعہ دو مرتبہ مباح ہوا اور پھر منسوخ ہوا۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ مرتبہ مباح ہوا اور منسوخ ہوا۔ اور بعض کا قول ہے کہ صرف ایک بار مباح اور پھر منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد پھر مباح نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور چند دیگر صحابہ کرام سے ضرورت کے وقت اس کی اباحت مقرر ہے۔ امام احمد بن حنبل سے بھی ایک ایسی ہی روایت مروی ہے۔ حضرات عبداللہ بن عباس، ابی بن کعبؓ اور حضرات سعید بن جبیر اور سدی سے "مِنۡهُنَّ" کے بعد "اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى" کی قرات مروی ہے لیکن جمہور اس کے خلاف ہیں۔ اس کا بہترین فیصلہ حضرت علیؓ کی وہ روایت ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ خیبر کے دن نکاح متعہ اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرما دیا(1)۔ حضرت معبد جہنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی رخصت دی تھی۔ غور سے سنو! بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک حرام کر دیا ہے۔ جس کے پاس اس قسم کی کوئی عورت ہو اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے اور جو کچھ تم نے انہیں پہلے دے دیا ہے وہ ان سے نہ لو(2)۔ صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے یہ حجۃ الوادع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور یہ حدیث کئی مختلف الفاظ سے مروی ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ: جن لوگوں نے اس آیت کو نکاح متعہ پر محمول کیا ہے وہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جب مدت مقررہ گزر جائے تو مزید مدت بڑھا لینے اور جو کچھ پہلے دیا ہے اس کے علاوہ اور دینے میں کوئی گناہ نہیں۔ سدی فرماتے ہیں کہ اگر چاہے تو پہلے سے مقرر کردہ مہر کے بعد جو اسے دے چکا ہے وقت کے ختم ہونے سے پیشتر ہی کہہ دے کہ میں اتنی اتنی مدت کے لیے پھر متعہ کرتا ہوں۔ پس اس نے رحم کی برأت سے پہلے یہ زیادتی مقرر کر لی اور جب مدت پوری ہو جائے تو وہ شخص اس عورت پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا۔ وہ عورت اس سے جدا ہو جائے گی اور اس عورت پر لازم ہو جائے گا کہ ایک حیض تک ٹھہر کر اپنے رحم کی صفائی کر لے۔ اس صورت میں اگر کوئی فوت ہو گیا تو وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ اور جن حضرات نے اس آیت کریمہ کو نکاح مسنونہ پر محمول کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا معنی واضح ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً (نساء:4) کی تفسیر ہے۔ یعنی مہر مقرر کرنے کے بعد اگر عورت مکمل مہر یا اس کے کچھ حصے سے دستبردار ہو جائے تو اس میں بیوی کا کوئی گناہ نہیں حضرمی فرماتے ہیں کہ یہ لوگ پہلے مہر مقرر کر دیتے تھے اور پھر جب تنگدست ہو جاتے تو اس کی بیوی مہر معاف کر دیتی۔ یہ ان کے لیے جائز ہے۔ اسی مفہوم کو اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس آیت میں باہمی رضامندی سے یہ مراد ہے کہ وہ شخص پہلے اپنی بیوی کو مکمل مہر ادا کر دے اور پھر اسے اختیار دے دے چاہے تو اس کے ساتھ رہے چاہے تو الگ ہو جائے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ حرمت و حلت کے احکام بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں کا ذکر ہونا نہایت ہی مناسب ہے کیونکہ ان احکام میں جو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ان کو وہی بخوبی جانتا ہے۔

وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ ؕ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ

1۔ فتح الباری 166/9   2۔ مسلم، کتاب النکاح 1024

اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع

''اور جو نہ رکھتا ہو تم میں سے اس کی طاقت کہ نکاح کرے آزاد مسلمان عورتوں سے تو وہ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہیں تمہاری کنیزیں جو مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو بعض تمہارا بعض (کی جنس) سے ہے۔ تو نکاح کر لو ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اور دو ان کو مہر ان کے دستور کے موافق (تاکہ نکاح سے) وہ پاکدامن بن جائیں نہ (اعلانیہ) زنا کار اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ دوست۔ اور جب وہ نکاح سے محفوظ ہو جائیں پھر اگر وہ ارتکاب کریں بدکاری کا، تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لیے ہے۔ یہ (لونڈیوں سے نکاح کی اجازت) اس کے لیے ہے جسے خطرہ ہو بدکاری میں مبتلا ہونے کا اور تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لیے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو شخص آزاد، پاکدامن عورتوں سے نکاح کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ مومن لونڈیوں سے نکاح کر لے۔ ربیعہ فرماتے ہیں کہ یہاں طول سے مراد خواہش اور قصد ہے یعنی لونڈی سے نکاح کرنے کی خواہش۔ امام ابن جریر نے اس قول کو رد کیا ہے۔

فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: یعنی وہ کسی مومن لونڈی کے ساتھ نکاح کر لے۔ جو مسلمانوں کی ملکیت میں ہو۔ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام امور کے حقائق اور اسرار کو بہتر جانتا ہے۔ لیکن تم لوگ صرف ظاہر بین ہو۔ پھر ارشاد فرمایا کہ ان لونڈیوں سے ان کے مالکوں سے اجازت لے کر نکاح کرو اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح میں اس کا ولی اس کا آقا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح غلام کے نکاح کا ولی بھی اس کا آقا ہے وہ اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ جو غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی کرتا ہے تو وہ زانی ہے۔ اگر لونڈی کی مالکہ عورت ہو تو اس کی اجازت سے اس لونڈی کا نکاح وہی کرے جو عورت کا نکاح کر سکتا ہے۔ کیونکہ حدیث پاک میں ہے کہ عورت عورت کا نکاح نہ کرائے اور نہ ہی عورت خود اپنا نکاح کرے۔ اور جو عورت خود اپنا نکاح کرتی ہے وہ زانی ہے۔

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی ان لونڈیوں کے مہر خوشدلی سے ادا کرو۔ اور ان کو حقیر سمجھتے ہوئے مہر میں کمی نہ کرو۔ محصنات کا معنی زنا سے پاک ہونا ہے اس لیے ارشاد فرمایا کہ نہ تو وہ ایسی عورتیں ہیں جو کسی دوسرے کو اپنے سے زنا کرنے سے نہ روکتی ہوں۔ اور نہ ہی ایسی ہوں جو دوسروں کے ساتھ خفیہ دوستی لگاتی ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسافحات سے مراد وہ عورتیں ہیں جو علی الاعلان زنا کا ارتکاب کرتی ہیں۔ اور اگر ان کے پاس کوئی اس ارادے سے آئے تو انہیں روکتی نہیں۔ اور ''مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ'' سے مراد وہ عورتیں ہیں جو خفیہ طور پر اپنے آشنا بنا لیتی ہیں۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لونڈی ہے جو کسی ایک شخص کو اپنا آشنا بنا لیتی ہے اور اس کا اقرار بھی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ: اُحْصِنَّ کو اَحْصَنَّ بھی پڑھا گیا ہے لیکن دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ یہاں احصان سے کیا مراد ہے۔ اس میں دو قول ہیں۔ 1۔ یہاں اس سے مراد اسلام ہے۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت انسؓ اور بہت

سے تابعینؒ سے مروی ہے۔ حضرت امام زہری نے بھی اسے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ لیکن یہ منقطع ہے۔ اور ربیع کی روایت کے مطابق یہی امام شافعی کا قول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سنت اور اکثر اہل علم کی اجماع سے استدلال کر کے ہم نے یہ قول اختیار کیا ہے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ احصان سے مراد ان کا مسلمان اور پاکدامن ہونا ہے۔ لیکن یہ حدیث منکر ہے اور اس کی سند انتہائی ضعیف ہے اس لیے یہ قابل استدلال نہیں۔ حضرت قاسم اور سالم کا بھی یہی قول ہے۔

2۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں احصان سے مراد شادی شدہ ہونا ہے۔ یہ ابن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ، طاؤس، سعید بن جبیر، حسن بصری اور قتادہؒ کا قول ہے۔ ابو علی طبری نے اپنی کتاب "الایضاح" میں امام شافعی سے یہی قول نقل کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ لونڈی کا محصن ہونا یہ ہے کہ کوئی آزاد اس سے نکاح کر لے۔ اور اسی طرح غلام کا محصن ہونا یہ ہے کہ وہ کسی آزاد عورت کے ساتھ نکاح کر لے۔ اس قول کو ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اور ابن ابی حاطب نے امام شعبی اور نخعی سے یہی قول روایت کیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ دونوں قراتوں کے اختلاف سے معنی مختلف ہیں۔ اگر اُحصن پڑھا جائے تو اس کا معنی نکاح ہے۔ اور اگر اَحصن پڑھا جائے تو اس کا معنی مسلمان ہونا ہے۔ ابن جریر نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ لیکن بظاہر یہاں اس سے مراد نکاح کرنا ہی ہے۔ کیونکہ آیات کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا ذکر تو آیت کریمہ میں صراحۃً مذکور ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ "اِذَآ اُحْصِنَّ" سے مراد نکاح کرنا ہے۔ بہر حال جمہور کے مذہب پر اشکال باقی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی لونڈی زنا کرے تو اس کی سزا پچاس درے ہے خواہ مسلمان ہو یا کافر۔ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ لیکن آیت کا مفہوم اس بات کا مقتضی ہے کہ غیر محصنہ لونڈی زنا کرے تو اس کی کوئی حد نہیں۔ اس کے مختلف جواب دیے گئے ہیں 1۔ جمہور فرماتے ہیں کہ آیت کے منطوق کو اس کے مفہوم پر مقدم کیا جائے گا۔ اس لیے ہم نے ان روایات کے عموم کو آیت کے مفہوم پر مقدم کیا ہے جن میں لونڈیوں کو حد لگانے کا حکم ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! اپنی لونڈیوں پر حد لگاؤ۔ خواہ وہ محصنہ ہوں یا غیر محصنہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنی لونڈی کے زنا کرنے پر حد لگانے کا حکم فرمایا چونکہ وہ حالت نفاس میں تھی اس لیے مجھے خوف ہوا کہ وہ کوڑے لگنے سے کہیں مر نہ جائے۔ چنانچہ میں نے اسے اس وقت حد نہ لگائی اور حضور ﷺ کو اس حال سے آگاہ کیا، آپ نے فرمایا تم نے اچھا کیا۔ جب تک وہ صحیح نہ ہو جائے اسے حد نہ لگانا(1)۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ جب وہ فارغ ہو جائے تو اسے پچاس کوڑے لگا دینا۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے اور اس کا زنا ظاہر ہو جائے تو اس پر حد لگائے اسے برا بھلا نہ کہے اور اگر پھر زنا کرے تو اسے حد لگائے اور برا بھلا نہ کہے۔ اور اگر تیسری بار زنا کرے اور اس کا زنا ظاہر ہو جائے تو اسے بیچ دے اگرچہ بالوں کی ایک رسی کے بدلے میں فروخت کرے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ اگر تین بار اس سے یہ فعل سرزد ہو جائے تو چوتھی مرتبہ اسے فروخت کر دے۔ حضرت ابو ربیعہ مخزومی فرماتے ہیں کہ ہم چند قریشی نوجوانوں کو حضرت عمر فاروقؓ نے عمارۃ کی لونڈیوں میں سے کسی ایک پر حد جاری کرنے کو فرمایا تو ہم نے اس کو پچاس کوڑے لگائے۔

2۔ جن لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ لونڈی جب زنا کرے اور محصنہ نہ ہو تو اس پر کوئی حد نہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس لونڈی کو تعزیری سزا دی جائے گی۔ یہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے حضرات طاؤس، سعید بن جبیر، ابو عبید قاسم بن سلام اور داؤد ظاہری کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور ان کی سب سے بڑی دلیل مفہوم آیت ہے اور یہ شرط کے مفاہیم میں سے ہے۔ اور اکثر کے نزدیک حجت ہے اس لیے اس کو عموم

1۔ مسلم، کتاب الحدود، 1330

سے مقدم کیا جائے گا۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ اور زید بن خالدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس لونڈی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے زنا کیا ہو اور محصنہ نہ ہو تو آپ نے فرمایا کہ اگر وہ زنا کرے تو اس کو حد لگاؤ اور اگر دوبارہ کرے تو اس کو حد لگاؤ پھر اس کو بیچ دو اگر چہ ایک رسی کے بدلے میں۔ راوی حدیث ابن شہاب فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے یہ تیسری مرتبہ کے بعد فرمایا کہ چوتھی کے۔ کا جواب دیتے ہیں کہ اس حدیث میں کوڑوں کی تعداد مقرر نہیں جیسا کہ محصنہ لونڈی کے بارے میں مقرر فرمائی۔ اسی طرح قرآن پاک میں بھی واضح طور پر فرما دیا گیا کہ لونڈیوں کی سزا آزاد محصنہ کے مقابلہ میں نصف ہوگی۔ پس اس لیے اس آیت کریمہ اور اس حدیث میں اس طرح تطبیق کرنا واجب ہے۔ اور یہ حکم حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں اس سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ آپ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لونڈی پر حد نہیں یہاں تک کہ وہ محصنہ ہو جائے۔ یعنی نکاح کر لے۔ اور جب وہ خاوند کی وجہ سے محصنہ ہو جائے تو آزاد عورت کے مقابلہ میں اس کی نصف حد ہے۔ یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ میں بھی ہے۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اس کو مرفوع کہنا خطا ہے کیونکہ یہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے۔ بیہقی نے اسے عبداللہ بن عمران سے روایت کیا ہے اور اسے موقوف کہا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ والی احادیث ایک واقعہ کا فیصلہ ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ والی حدیث کے کئی جوابات ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اس لونڈی پر محمول ہے جو منکوحہ ہو اس طرح ان دونوں حدیثوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس حدیث میں حد کا لفظ کسی راوی کا اپنا اضافہ ہے۔ تیسرا یہ کہ اس حدیث کو دو صحابی روایت کرتے ہیں جب کہ ابو ہریرہؓ والی حدیث کو وہ اکیلے ہی روایت کرنے والے ہیں اور وہ حدیث جو دو صحابہ سے مروی ہو وہ اس حدیث میں مقدم ہوتی ہے جو ایک صحابی سے مروی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کو امام نسائی نے صحیح مسلم کی شرائط کے مطابق عباد بن تمیم سے روایت کیا ہے۔ جو اس حدیث کو اپنے چچا جو کہ بدری صحابی ہیں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب لونڈی زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ، پھر زنا کرے کوڑے لگاؤ، تیسری بار زنا کرے تو کوڑے لگاؤ اور چوتھی بار اس کو بیچ دو، اگر چہ بال کی رسی کے بدلے میں بیچو۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ بات بعید نہیں کہ کسی راوی نے جلد (کوڑے مارنا) پر حد کا اطلاق کر دیا ہو۔ کیونکہ اس کی سزا کوڑے ہے۔ اس نے اسی کو حد سمجھ لیا ہو۔ یا اس نے تادیباً لفظ حد کا اطلاق کیا ہو جیسا کہ لفظ حد کا اطلاق اس سزا پر بھی کیا گیا ہے جو مریضانی کو کھجور کے اس گچھے سے مار کر دی جاتی ہے جس میں سو چھوٹی چھوٹی شاخیں ہوں۔ اسی طرح لفظ حد کا اطلاق اس شخص کی سزا پر بھی کیا جاتا ہے جس نے اپنی بیوی کی لونڈی کے ساتھ زنا کیا ہو اگر چہ اس کی بیوی نے اس کو اجازت بھی دے دی ہو۔ اس کو سو کوڑے لگانا تعزیراً اور تادیب کے طور پر ہے۔ جیسا کہ امام احمد اور دوسرے بزرگوں کا خیال ہے۔ کیونکہ حقیقی حد صرف یہ ہے کہ کنوارے کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اور شادی شدہ یا لوطی کو رجم کیا جائے واللہ اعلم۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ لونڈی جب تک منکوحہ نہ ہو اسے زنا پر نہ مارا جائے اس کی سند تو صحیح ہے۔ لیکن اس کا یہ مذہب غریب ہے۔ اگر تو انہوں نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس کو نہ مارا جائے اور نہ ہی حد لگائی جائے تو ممکن ہے انہوں نے اس کریمہ کے مفہوم پر عمل کرتے ہوئے فتویٰ دے دیا ہو اور انہیں یہ حدیث نہ پہنچی ہو۔ اور اگر ان کی یہ مراد ہو کہ اس کو حد نہ لگائی جائے تو اس سے تادیباً کوڑے مارنے کی نفی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ کا قول ہے۔

3۔ یہ آیت کریمہ منکوحہ لونڈی کی سزا پر دلالت کرتی ہے کہ اسے آزاد عورت کے مقابلہ میں نصف حد لگے گی لیکن منکوحہ ہونے سے پہلے وہ بھی کتاب وسنت کے عموم میں داخل ہے۔ یعنی اس کو بھی سو کوڑے لگیں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ’’ ترجمہ: جو عورت اور مرد زنا کار ہوں تو لگاؤ ہر ایک کو ان میں سے سو (سو) درے‘‘۔ جیسا کہ حدیث پاک

میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے راستہ نکال لیا ہے۔ اگر دونوں غیر منکوحہ ہوں تو ان کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اگر دونوں منکوحہ ہوں تو ان کی سزا سو کوڑے اور پتھروں سے رجم کرنا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اسی مفہوم کی اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں۔ یہی قول داؤد ظاہری کا ہے لیکن یہ انتہائی ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے منکوحہ لونڈیوں کی پچاس کوڑے مارنے کا حکم دیا ہے اور شادی سے پہلے اس کی یہ سخت سزا کیسے ممکن ہے۔ حالانکہ شریعت کی اصل اس کے برعکس ہے۔ شارع ﷺ سے صحابہ کرام نے غیر منکوحہ زانیہ لونڈی کے بارے میں پوچھا، آپ نے جواب دیا اسے کوڑے مارو۔ لیکن یہ کہا کہ منکوحہ لونڈی کے لیے سو کوڑے مارنے کا حکم نہیں تھا۔ ورنہ "لم تحصن" کے الفاظ ذکر کرنے کا کیا فائدہ تھا۔ اس لیے کہ یہ آیت کریمہ نازل نہ ہو چکی ہوتی تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن چونکہ اس آیت کریمہ کے نزول سے منکوحہ لونڈی کا حکم جان لیا تھا تو آپ سے منکوحہ لونڈی کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے اسے بیان کر دیا۔ جیسا کہ جب یہ آیت کریمہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (احزاب:56) نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے آپ پر صلوٰۃ پڑھنے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے صلوٰۃ کا طریقہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ سلام تو تم پہلے جانتے ہو۔

4۔ مفہوم کے متعلق یہ ابوثور کا جواب ہے جو کئی اعتبار سے داؤد ظاہری کے قول سے بھی عجیب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ منکوحہ لونڈی کی سزا آزاد عورت کے مقابلہ میں نصف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آزاد عورت کی حد اس صورت میں رجم ہے اور رجم آدھا نہیں ہو سکتا اس لیے اس صورت میں لونڈی کو رجم کرنا پڑے گا، نکاح سے پہلے اسے پچاس کوڑے لگیں گے کیونکہ اس حالت میں آزاد عورت کی سزا سو کوڑے ہیں۔ دراصل انہیں اس آیت کو سمجھنے میں خطا ہوئی ہے۔ اس طرح انہوں نے جمہور علماء کی مخالفت کی ہے۔ بلکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس میں اختلاف نہیں کہ غلام کو زنا کی صورت میں رجم نہیں کیا جائے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ لونڈیوں پر محصنات کے مقابلہ میں نصف عذاب ہے۔ اور محصنات کے لفظ میں جو الف لام ہے وہ عہدی ہے یعنی وہ محصنات جن کا بیان آیت کے شروع اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ میں گزر چکا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد صرف آزاد عورتیں ہیں ان کے شادی شدہ ہونے کی قید نہیں لگائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کریمہ میں عذاب سے مراد وہ ہے جو نصف ہو سکتی ہو اور وہ کوڑے ہیں نہ کہ رجم۔ مسند امام احمد کی حدیث ابوثور کی روایات کی تردید کرتی ہے کہ ایک صفیہ نامی لونڈی نے ایک غلام سے زنا کیا، اس سے بچہ پیدا ہو گیا تو اس زانی نے اس بچے پر دعویٰ کر دیا۔ جب یہ مقدمہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا تو آپ نے انہیں حضرت علیؓ کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے فرمایا میں وہی فیصلہ کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ہے۔ بچہ تو لونڈی کے آقا کا ہوگا اور زانی کو پتھر ہیں۔ پھر آپ نے دونوں کو پچاس پچاس کوڑے لگائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت کریمہ کے مفہوم سے اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ کرنا مراد ہے۔ یعنی منکوحہ لونڈی پر آزاد عورت کے مقابل میں نصف سزا ہے، اس پر رجم کی صورت نہیں ہے نکاح سے پہلے نہ نکاح کے بعد۔ بلکہ سنت سے ثابت ہے کہ دونوں حالتوں میں اس کی سزا کوڑے ہیں، یہ صاحب "الافصاح" کا قول ہے۔ اور یہی قول امام شافعیؒ سے بھی منقول ہے جس کو امام بیہقی نے اپنی کتاب "سنن الآثار" میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ قول آیت کریمہ کے الفاظ سے بہت بعید ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سزا نصف ہے (منکوحہ لونڈیاں) لیکن غیر منکوحہ کی سزا کا نصف ہونا اس سے کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ منکوحہ لونڈی پر حد امام وقت ہی جاری کرے گا۔ اس صورت میں اس کے آقا کے لیے حد جاری کرنا جائز نہیں۔ اور یہی امام احمدؒ کا قول ہے اور نکاح سے پہلے آقا لونڈی پر حد جاری کر سکتا ہے اور یہ حد دونوں صورتوں میں آزاد عورت کے مقابلہ میں

نصف ہوگی۔ لیکن یہ قول بھی بعید ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ اس پر دلالت نہیں کرتی۔ کیونکہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو ہمیں معلوم نہ ہوسکتا کہ لونڈیوں کے لیے نصف حد ہے۔ تو اس صورت میں انہیں بھی عموم میں داخل کر کے پوری حد یعنی سو کوڑے اور رجم ان پر بھی واجب ہوجاتا۔ جیسا کہ عام روایات سے ثابت ہے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا اے لوگو! اپنے غلاموں پر حد جاری کرو خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ اور جو عام روایات پہلے گزر چکی ہیں ان میں منکوحہ اور غیر منکوحہ کی کوئی تفصیل نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ والی حدیث جس سے جمہور علماء نے استدلال کیا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے اور زنا ظاہر ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اس پر حد جاری کرے اور ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے۔ آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ زانیہ لونڈی کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں۔ منکوحہ ہو یا غیر منکوحہ۔ اس کے بعد جلاوطن کیا جائے گا یا نہیں اس میں تین قول ہیں۔ 1۔ جلاوطن کیا جائے گا۔ 2۔ نہیں کیا جائے گا۔ 3۔ نصف سال تک کیا جائے گا۔ پورا سال نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ آزاد عورتوں کے لیے ہے۔ یہ تینوں قول امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جلاوطنی تعزیر کے طور پر ہے حد میں شامل نہیں اور یہ حاکم وقت کی رائے پر موقوف ہے۔ اگر چاہے تو جلاوطنی کرے یا نہ کرے مرد اور عورت دونوں اس میں داخل ہیں۔ امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق جلاوطنی صرف مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں کیونکہ یہ عورتوں کی عزت اور عصمت کے خلاف ہے۔ اور حدیث پاک میں مردوں کو جلاوطن کرنے کا حکم وارد ہے نہ کہ عورتوں کو۔ حضرت عبادہ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر منکوحہ کو حد لگانے اور ایک سال تک جلاوطنی کا حکم فرمایا تھا۔ اس سے معنوی طور پر یہ مراد ہے کہ وہ محفوظ رہے اور اگر عورت کو جلاوطن کیا جائے تو وہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ دوسرا یہ کہ منکوحہ لونڈی کو پچاس کوڑے لگائیں جائیں گے اور اس کی تادیب کے لئے کچھ مار پیٹ کی جائے گی۔ پہلے حضرت سعید بن جبیرؒ سے گزر چکا ہے کہ نکاح سے پہلے اسے نہیں مارا جائے گا۔ لیکن اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ اسے سرے سے ہی کچھ نہ مارا جائے گا تو یہ ان کی تاویل ہوگی۔ وگرنہ یہ بھی دوسرے قول میں داخل ہے۔ تیسرا یہ کہ نکاح سے پہلے سو کوڑے لگائے جائیں اور اس کے بعد پچاس۔ اور یہ ابوداؤد ظاہری کا قول ہے جو کہ تمام اقوال میں سب سے زیادہ ضعیف اور عجیب ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ نکاح سے پہلے پچاس اور نکاح کے بعد رجم کیا جائے۔ یہ ابوثور کا قول ہے جو کہ زیادہ ضعیف اور عجیب تر ہے۔ واللہ اعلم

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ: یہاں ارشاد فرمایا کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح مذکورہ شرائط کی موجودگی میں صرف انہی کے لیے مباح ہے جنہیں زنا میں واقع ہونے کا خطرہ ہو اور شادی کے بغیر ان کا گزارہ نہ ہوسکتا ہو اور اس وجہ سے وہ سخت تکلیف میں ہوں تو اس صورت میں ان لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنا ان کے جائز ہے۔ اگرچہ اس حالت میں بھی اپنے نفس پر کنٹرول کرنا اور ان سے نکاح نہ کرنا بہت بہتر ہے۔ چونکہ اس سے جو اولاد ہوگی وہ اس کے آقا کی غلام ہوگی۔ ہاں اگر خاوند غریب ہے تو امام شافعیؒ کے ایک غریب قول کے مطابق اس کی اولاد آقا کی ملکیت میں نہیں ہوگی۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ: اس آیت کریمہ سے جمہور علماء نے لونڈی کے ساتھ نکاح کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ لیکن یہ اس وقت جب وہ آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور اسے زنا میں واقع ہونے کا خوف ہو۔ کیونکہ اس میں خرابی یہ ہے کہ لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں اولاد غلام ہوجاتی ہے۔ اور دوسری ذلت یہ ہے کہ وہ آزاد عورتوں سے ہٹ کر لونڈیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے اس مسئلہ میں جمہور علماء کی مخالفت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں شرط نہیں بلکہ جس کے نکاح میں کوئی آزاد عورت نہ ہو اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ خواہ وہ لونڈی مومنہ ہو یا اہل کتاب میں سے۔ اگرچہ اسے

آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت بھی ہو اور بدکاری کا خوف بھی نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (مائدہ: 5) وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام اور یہ آزاد اور غیر آزاد سب کو شامل ہے۔ اور محصنت سے مراد پاکدامن اور عفت مآب عورتیں ہیں۔ لیکن یہ آیت بھی ظاہرا جمہور علماء کے مذہب پر دلالت کرتی ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٢٦ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝٢٧ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝٢٨

”چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ کھول کر بیان کر دے (اپنے احکام) تمہارے لیے اور چلائے تم کو ان (کامیاب لوگوں) کی راہوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو پیروی کر رہے ہیں اپنی خواہشوں کی کہ تم (حق سے) بالکل منہ موڑ لو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہلکا کرے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) اور پیدا کیا گیا ہے انسان کمزور“۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ: اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمالیا ہے کہ وہ حلال وحرام کے مسائل کو کھول کر بیان کر دے جس طرح اس صورت اور دوسری صورتوں میں بیان فرمایا ہے۔ اور تمہیں پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے قابل تعریف راستوں پر چلائے تاکہ تم اس شریعت پر عمل پیرا ہو جاؤ جو اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اور وہ گناہوں سے تمہاری توبہ کو قبول کرنا چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ یعنی وہ اپنے اقوال وافعال اور شریعت کو نافذ کرنے میں حکیم ودانا ہے۔

يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ: یہود ونصاریٰ اور بدکاری کے مرتکب شیطان کے پیروکار تمہیں راہ راست سے ہٹا کر باطل کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ شریعت کے احکام اور اوامر ونواہی میں تمہارے ساتھ رعایت کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے کچھ شرائط کے ساتھ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنا حلال کر دیا۔

وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا: کیونکہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے ضعیف اور کمزور ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرماتا ہے، سختی نہیں کرتا۔ کیونکہ انسان اپنے نفس اور عزم وحوصلے کے اعتبار سے کمزور ہے۔ حضرت طاؤس فرماتے ہیں کہ مرد عورت کے معاملے میں کمزور ہے۔ وکیع فرماتے ہیں کہ عورتوں کے پاس مرد کی عقل جاتی رہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ معراج سے واپس آتے ہوئے جب سدرۃ المنتہیٰ کے قریب پہنچے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ نے کیا فرض کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دن رات میں پچاس نمازوں کا حکم دیا ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ واپس جائیے اور اپنے پروردگار سے اس میں تخفیف طلب کیجیے۔ آپ کی امت میں اس کی طاقت نہیں۔ میں آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں۔ وہ اس سے کم تعداد سے بھی عاجز آ گئے آپ کی امت تو سمع وبصر اور دل کے اعتبار سے ان سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ آپ واپس گئے تو دس نمازیں معاف ہو گئیں۔ واپس آئے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی گفتگو ہوئی حتیٰ کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ

تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٢٩﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿٣٠﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ناجائز طریقہ سے مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ ہلاک کرو اپنے آپ کو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے اور جو شخص کرے گا یوں، سرکشی اور ظلم سے تو ڈال دیں گے ہم اسے آگ میں اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے۔ اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے روکا گیا ہے تمہیں جن سے تو ہم محو کر دیں گے تمہارے (نامہ اعمال) سے تمہاری برائیاں اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ میں''۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقے سے کھانے سے منع کیا ہے۔ ناجائز طریقے سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو غیر شرعی ہیں خواہ اس کا تعلق سود سے ہو یا جوا سے۔ یا کوئی ایسا حیلہ اختیار کیا گیا ہو جس سے ظاہری طور پر جواز پیدا ہوتا ہو لیکن حقیقت میں وہ سود کو حلال کرنے کا ایک حیلہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کپڑا خریدتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر مجھے پسند آ گیا تو رکھ لوں گا۔ ورنہ اس کے ساتھ ایک درہم بھی لوں گا۔ تو آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ یعنی اس کو ناجائز قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے۔ یعنی منسوخ نہیں اور نہ ہی قیامت تک منسوخ ہوگی۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو مسلمانوں نے کہا کہ ہمیں اپنے مالوں کو باطل طریقے سے کھانے سے منع کر دیا گیا ہے۔ اور کھانا ہی ہمارا افضل ترین مال ہے۔ اس لیے ہم میں سے کسی کے پاس کھانا نہ کھائے۔ اور اس طرح انہوں نے ایک دوسرے کے پاس کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ: لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ...... (نور:61)۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً: یہاں تِجَارَةٌ کو تجارۃٌ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس طرح استثناء منقطع ہے۔ گویا یوں فرمایا جا رہا ہے کہ حرمت والے اسباب سے مال نہ ہو۔ لیکن جائز تجارت سے ہو۔ جو فروخت اور خریدنے والے کی باہمی رضامندی سے طے ہو۔ یہ آیت کریمہ اس طرح ہے جس طرح کہ ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (انعام:151) ''ترجمہ: اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے حرام کر دیا ہے اللہ سوائے حق کے''۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا: لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ''ترجمہ: نہ چکھیں گے وہاں موت کو ذائقہ بجز اس پہلی موت کے''۔ اسی آیت کریمہ سے امام شافعیؒ نے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ قبول کے بغیر بیع صحیح نہیں اور اس لیے کہ یہی باہمی رضامندی کی دلیل ہے۔ صرف باہمی لین دین کرنا بعض اوقات رضامندی کی دلیل نہیں بنتی۔ لیکن امام مالک، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح زبانی بات چیت رضامندی کی دلیل ہے اسی طرح باہمی لین دین بھی باہمی رضامندی کی دلیل ہے بعض نے کہا ہے کہ معمولی چیزوں میں باہمی لین دین سے بیع ہو جاتی ہے اور اس میں قبول کرنے کی شرط نہیں ہے۔ اس قول کو محققین نے احتیاطاً اختیار فرمایا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیع باہمی رضامندی سے ہوتی ہے اور سودا اس کے بعد اسے اختیار ہوتا ہے کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے۔ یہ حدیث مرسل ہے اور کامل باہمی رضامندی کا مقصد یہ ہے کہ انہیں مجلس کے اختتام تک اختیار بھی ہو۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بائع اور مشتری دونوں کا

اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں(1)۔ بخاری کے الفاظ ہیں کہ جب دو شخص باہمی خرید وفروخت کریں تو جدا ہونے سے پہلے پہلے ہر ایک کو اختیار رہا ہے۔ اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے امام احمد، امام شافعی اور جمہور سلف وخلف نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ اختیار عقد کے بعد تین دن تک ہے اور بعض اوقات ایک سال تک ہے۔ جیسا کہ ایک گاؤں والے آپس میں معاملات طے کرتے ہیں۔ امام مالک کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک مطلق لین دین سے بیع صحیح ہو جاتی ہے اور امام شافعی کے مذہب کا بھی ایک قول یہی ہے۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ وہ معمولی چیزیں جن کو لوگ بیع شمار کرتے ہیں ان میں صرف لین دین ہی کافی ہے۔ بعض اصحاب کا یہی اختیار کردہ قول ہے۔ جیسا کہ متفق علیہ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ : اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کر کے اس کی نافرمانی کر کے اور ناجائز طریقے سے اپنا باہمی مال کھا کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔ یعنی جس چیز کا حکم فرماتا ہے یا جس سے منع فرماتا ہے اس میں تمہارے لیے رحمت ہے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ جب انہیں نبی کریم ﷺ نے غزوۂ ذات السلاسل میں بھیجا تو ایک سخت سرد رات میں مجھے احتلام ہو گیا۔ اور مجھے نہانے سے جان کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا میں نے تیمّم کیا اور اپنے ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھا دی۔ اور جب ہم واپس حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے آپ کی خدمت میں یہ واقعہ ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: اے عمرو! تو نے جنابت کی حالت میں ہی اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھا دی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے سخت سردی میں احتلام ہو گیا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے غسل کیا تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ مجھے اللہ کا یہ قول: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یاد آ گیا اس لیے میں نے تیمّم کی اور نماز پڑھا دی۔ آپ یہ سن کر مسکرا دیئے اور کچھ ارشاد نہ فرمایا(2)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ دوسرے صحابہ نے حضور ﷺ سے یہ واقعہ ذکر کیا۔ آپ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو بلایا اور اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے ڈر تھا کہ سردی مجھے مار ڈالے گی اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یہ سن کر آپ خاموش رہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے آپ کو کسی لوہے سے قتل کر دیا وہ قیامت تک جہنم کی آگ میں اپنے آپ کو لوہے سے قتل کرتا رہے گا۔ اور جس نے زہر کھا کر خودکشی کی وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں زہر کھاتا رہے گا(3)۔ ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے جس چیز سے خودکشی کی قیامت کے دن اسے اسی چیز کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ حضرت عبد اللہ بجلیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں سے کسی کو زخم لگ گیا اس نے چھری پکڑی اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ کو کاٹ لیا جس سے اس کا خون بند نہ ہونے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے اس بندے نے اپنے طور پر جلدی کی ہے۔ میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا: جو شخص کسی چیز کو حرام سمجھنے کے باوجود اس کا ارتکاب کرے گا اور ظلم وزیادتی کرتے ہوئے اس پر جرأت کرے گا تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم اسے نار جہنم میں داخل کر دیں گے۔ یہ سخت وعید ہے، ہر عقلمند آدمی کو حضور قلب سے اسے سننا چاہیے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

وَاِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ: یعنی اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو معاف فرما کر جنت میں داخل کر دیں گے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا: وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا۔ حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ

1۔ مسلم، کتاب البیوع 1163　2۔ مسند احمد 204،203/4　3۔ مسلم، کتاب الایمان 104،103

تعالیٰ کی طرف سے جو قرآن پاک ہمیں پہنچا ہے اس میں ہم نے اس آیت کی مثل نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کبائر کے علاوہ باقی تمام گناہوں سے درگزر فرمایا ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنے مال و دولت اور اہل و عیال چھوڑ کر اس کی راہ پر نکل پڑیں۔ اس آیت کریمہ کے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں۔ ان میں بعض کو ہم بیان کریں گے۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ جمعہ کا دن کیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ یہ وہی دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ جمعہ کا دن کیا ہے جو شخص بھی جمعہ کے دن اچھی طرح پاکیزگی حاصل کر کے جمعہ کے لیے آتا ہے اور نماز ختم ہونے تک خاموشی سے بیٹھا رہتا ہے۔ تو اس کا یہ عمل آئندہ جمعہ تک کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے جب تک کہ وہ کسی کو قتل کرنے سے بچا رہے (1)۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اس میں آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ پھر اپنا سر مبارک جھکا دیا یہ دیکھ کر ہم میں سے ہر ایک شخص اپنا سر جھکا کر رونے لگا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ نے کس چیز پر قسم اٹھائی۔ پھر سر مبارک اٹھایا اور آپ کے چہرے مبارک پر خوشی کے آثار تھے اور آپ کا خوش ہونا ہمارے نزدیک بہترین سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ محبوب تھا۔ آپ نے فرمایا جو شخص پانچ نمازیں پڑھتا ہے، رمضان کے روزے رکھتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور ساتھ کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے۔ اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اسے کہا جائے گا۔ سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ (2)

تفسیر: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! وہ گناہ کون سے ہیں۔ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، جادو کرنا، سود خوری، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے فرار ہونا، سیدھی سادی پاک عورتوں پر تہمت لگانا۔ اور ایک دوسری روایت میں جادو کی جگہ ہجرت کر کے واپس اپنے وطن لوٹنے کا ذکر ہے۔ اس حدیث پاک میں جو سات گناہ ذکر کیے گئے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے علاوہ اور گناہ کبیرہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں جو مفہوم مخالف کے قائل ہیں۔ لیکن یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔ اور خصوصاً جب اس کے خلاف دلیل موجود ہو یہاں تو صاف لفظوں میں دوسرے کبائر کا ذکر احادیث میں مذکور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا کہ خبردار! غور سے سنو! اللہ کے اولیاء صرف وہی ہیں جو پانچ فرض نمازیں ادا کرتے ہیں۔ رمضان کے روزے رکھتے ہیں اور یہ روزے اس نیت سے رکھتے ہیں کہ یہ ان پر فرض کیے گئے ہیں اور نیکی سمجھتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور ان کبائر سے بچتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! گناہ کبیرہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا گناہ کبیرہ دس گناہ ہیں۔ شرک کرنا، ناحق مومن کو قتل کرنا، میدان جنگ سے فرار ہونا، یتیم کا مال کھانا، سود خوری، پاکدامن پر تہمت لگانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور بیت اللہ کی حرمت پامال کرنا جو زندگی اور موت میں تمہارا قبلہ ہے اور جو شخص مرتے دم تک ان گناہوں سے اجتناب کرتا رہا، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا رہا وہ جنت میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ سونے کے محلات میں رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ایک دن منبر پر تشریف فرما ہوئے اور دو دفعہ فرمایا میں قسم نہیں کھاتا نیچے اتر کر دو مرتبہ ارشاد فرمایا تمہیں خوشخبری ہو جس نے پانچ نمازیں پڑھیں اور ساتھ کبائر سے اجتناب کیا تو اسے جنت کے دروازوں سے آواز دی جائے گی کہ وہ داخل ہو جائے۔ راوی فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ سے پوچھا کیا حضور ﷺ نے ان گناہوں کو بیان بھی فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ والدین کی نافرمانی، شرک، ناحق قتل، پاکدامن پر تہمت، یتیم کا مال کھانا، میدان

1۔ مسند احمد 439/5 2۔ تفسیر الطبری 39,38/5

جنگ سے فرار، سود خوری۔ حضرت طیسلہ بن میاس بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوگیا جسے میں کبیرہ شمار کرتا تھا۔ میری ملاقات ابن عمرؓ سے ہوگئی۔ میں نے انہیں عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوگیا ہے جسے میں کبیرہ خیال کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: وہ کیا ہے۔ جب میں نے بیان کیا تو فرمایا وہ کبیرہ نہیں ہے۔ گناہ کبیرہ نو ہیں۔ شرک، ناحق قتل، میدان جنگ سے فرار، پاکدامن پر تہمت، سود خوری، ظلماً یتیم کا مال کھانا، مسجد الحرام میں الحاد پھیلانا، جادو کرنا، والدین کو رلانا۔ طیسلہ بیان کرتے ہیں کہ جب ابن عمرؓ نے دیکھا کہ میرا خوف کم نہیں ہوا تو فرمایا کیا تم نار جہنم سے ڈرتے ہو تو میں نے کہا ہاں۔ فرمایا کیا تم جنت میں داخل ہونے کو پسند کرتے ہو؟ میں نے عرض کی ہاں۔ فرمایا کیا تمہارے والدین زندہ ہیں۔ میں نے عرض کی میری والدہ زندہ ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تم اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ گے اور اسے کھانا کھلاتے رہو گے اور ان گناہوں سے بچتے رہو گے تو یقیناً جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حضرت طیسلہ سے مروی ہے کہ میں عرفہ کی شام کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس حاضر ہوا وہ پیلو کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے سر پر پانی ڈال رہے تھے، میں نے اسے کبائر کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے گناہ کبیرہ کی پوری پوری تفصیل بیان کی اور جب پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کا ذکر کیا تو میں نے پوچھا یہ بھی قتل کی مثل گناہ کبیرہ ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس روایت میں جادو کا بھی ذکر ہے۔ حضرت ایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کی عبادت کی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا، نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، رمضان کے روزے رکھے اور کبائر سے اجتناب کیا تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ ایک شخص نے کبائر کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا اللہ کے ساتھ شریک کرنا، کسی مسلمان کو قتل کرنا، میدان جنگ سے فرار ہونا(1)۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو خط لکھوا کر بھیجا جس میں فرائض، سنن اور دیت کے احکام تھے اور یہ خط حضرت عمرو بن حزمؓ کے ہاتھ بھیجا اور اس خط میں یہ بھی تھا کہ قیامت کے دن سب سے بڑا گناہ شرک، کسی مسلمان کا ناحق قتل، میدان جنگ سے فرار، والدین کی نافرمانی، پاکدامن پر تہمت، جادو کا علم سیکھنا، سود کھانا اور یتیم کا مال کھانا ہے۔ ایک روایت میں جھوٹی گواہی کا بھی ذکر ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے کبائر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شریک کرنا، کسی کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی، پھر ارشاد فرمایا کہ کیا تمہیں سب سے بڑے گناہ کبیرہ کے بارے میں نہ بتادوں؟ ہم نے عرض کی کیوں نہیں۔ ہمیں ضرور بتایئے آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جھوٹی گواہی دینا(2)۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں سب سے بڑے گناہ کبیرہ کے بارے میں نہ بتادوں۔ ہم نے عرض کی ضرور یارسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی بات کہنا، یہ بات کر کے آپ تکیے کو چھوڑ سیدھے بیٹھ گئے اور بار بار اس کو دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش آپ خاموش ہو جائیں۔ ایک دوسری روایت میں بچے کو قتل کرنے کا ذکر بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ میں نے عرض کی پھر اس کے بعد۔ فرمایا کہ تم اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کرو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانا کھائے گا۔ میں نے عرض کی اس کے بعد کونسا بڑا گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم اپنی پڑوسن سے زنا کرو۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ...... (فرقان:68) (3)۔ ”ترجمہ: اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پوجتے اور اس نفس کو قتل نہیں کرتے جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔“ اور دوسری روایت میں شراب پینے کو بھی گناہ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن

1۔ مسند احمد 414,413/5 2۔ مسند احمد 131/3 3۔ البخاری 9/8

عاص حطیم کعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ سے کسی نے شراب کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کیا میرے جیسا بوڑھا شخص اللہ کے گھر میں بیٹھ کر اللہ کے رسول پر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ شراب پینا تمام گناہوں سے سب سے بڑا ہے اور تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ شرابی نماز کا تارک ہوتا ہے اور اپنی والدہ خالہ پھوپھی سے بھی بدکاری کرنے سے نہیں چوکتا۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروقؓ اور بہت سے صحابہؓ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سب سے بڑے گناہ کبیرہ کی بحث چل پڑی لیکن وہ کسی فیصلے تک نہ پہنچ سکے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے مجھے اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے پاس پوچھنے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ سب سے بڑا گناہ شراب پینا ہے۔ میں نے واپس آ کر انہیں بتایا۔ یہ جواب سن کر وہ بڑے متعجب ہوئے اور خود حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے انہیں بتایا کسی نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کا واقعہ بیان کیا کہ جس نے ایک شخص کو گرفتار کیا تھا۔ پھر اسے کہا کہ اگر تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو درج ذیل امور میں سے ایک کرلو۔ یعنی شراب لو، کسی کو ناحق قتل کرلو یا خنزیر کا گوشت کھالو۔ اس نے غور و فکر کے بعد ان افعال میں سے شراب پینے کو اختیار کرلیا اور جب اس نے شراب پی لی تو نشے میں اس نے وہ تمام کام کر ڈالے جن کو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ واقعہ سن کر رسول اللہ ﷺ سے ہمیں فرمایا کہ جو شخص شراب پیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں کرتا۔ اور شراب پینے والا اسی حالت میں اگر مر جائے اور اس کے مثانہ میں تھوڑی سی شراب ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ جنت حرام کر دیتا ہے اور اگر شراب پینے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ یہ حدیث غریب ہے۔ ایک اور حدیث میں جھوٹی قسم کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس جہنیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، جھوٹی قسم، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جو شخص جھوٹی قسم کھا کر بات کرے اور اس میں مچھر کے پر کے برابر زیادتی کرے اس کے دل میں سیاہ داغ بن جاتا ہے جو قیامت تک باقی رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنے والدین کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے۔ عرض کی کوئی اپنے والدین کو کیسے گالی دے سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کسی کے ماں باپ کو گالی دے اور وہ جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی دے۔ ایک روایت میں فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے والدین پر لعنت کرے۔ عرض کی گئی کوئی شخص اپنے والدین کو لعنت کیسے کر سکتا ہے؟ فرمایا کہ وہ کسی کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی دے(1)۔ حضور ﷺ نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا کفر ہے(2)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کو بے عزت کرنا اور ایک گالی کے بدلے دو گالیاں دینا سب سے بڑا گناہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا اس نے اپنے اوپر کبائر کا دروازہ کھول لیا۔ حضرت ابوقتادہ فرماتے ہیں کہ ہمارے سامنے حضرت فاروق اعظمؓ کا جو خط پڑھا گیا اس میں تھا کہ دو نمازوں کو بغیر عذر جمع کرنا گناہ کبیرہ ہے اور اسی طرح میدانِ جنگ میں سے فرار ہونا، اور لوٹ کھسوٹ بھی گناہ کبیرہ ہے۔ الغرض جو شخص ظہر اور عصر یا مغرب اور عشاء پہلے وقت یا پچھلے وقت بغیر کسی عذر شرعی کے جمع کر کے پڑھتا ہے وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔ اس سے آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں جو شخص سرے سے ہی نماز کو ترک کر دیتا ہے اس کا کیا حال ہوگا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن اور مشرک کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز ہے۔ ایک دوسری روایت میں فرمایا کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز ہے جس

1۔ صحیح بخاری، 3/8 2۔ صحیح بخاری، 18/8

نے اسے چھوڑا اسے نے کفر کیا۔ مزید فرمایا جس نے عصر کی نماز ترک کی اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے اور جس کی عصر کی نماز رہ گئی گویا کہ اس کا مال اور اہل عیال ہلاک ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے۔ ایک شخص حاضر خدمت میں ہوا اور کبائر کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، اللہ کی رحمت ونعمت سے مایوس ہو جانا، اس کی پوشیدہ تدبیر سے بےخوف ہو جانا سب سے بڑا گناہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: سب سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی ہے۔ یہ روایت انتہائی غریب ہے۔ پہلے ایک حدیث میں گزر چکا ہے کہ ہجرت کے بعد پھر واپس لوٹنا گناہ کبیرہ ہے۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ لیکن اس کی سند محل نظر ہے اور اس کو مرفوع کہنا صحیح نہیں ہے۔ ٹھیک بات وہی ہے جس کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ حضرت علیؓ کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ نے فرمایا: لوگو! کبیرہ گناہ سات ہیں۔ یہ سن کر لوگ متوجہ ہو گئے۔ آپ نے اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا اور پھر فرمایا کہ تم مجھ سے اس کے بارے میں کیوں نہیں پوچھتے۔ لوگوں نے عرض کی یا امیر المومنین! یہ گناہ کونسے ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، ناحق قتل کرنا، پاک دامن پر تہمت لگانا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا اور میدان جنگ فرار ہونا اور ہجرت کے بعد واپس لوٹنا۔ راوی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ ہجرت کے بعد واپس لوٹنا کیسے گناہ کبیرہ میں داخل ہے۔ تو انہوں نے فرمایا اے بیٹے! یہ کتنی بری بات ہے کہ ایک شخص ہجرت کرے پھر مال غنیمت میں اس کا حصہ مقرر ہو جائے اور مجاہدین میں اس کا نام درج ہو جائے اور وہ تمام ان چیزوں کو چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ جائے اور پہلے کی طرح بدو بن جائے۔ حضرت سلمہ بن قیس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ان چار چیزوں سے بچو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، کسی کو ناحق قتل نہ کرو، زنا نہ کرو اور نہ ہی چوری کرو۔ روای فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے میں ان سے اجتناب کرتا ہوں(1)۔ حضرت ابن عباسؓ سے پہلے روایت گزر چکی ہے کہ وصیت کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ حضرت ابوامامہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ٹیک لگا کر آرام فرما رہے تھے کہ صحابہ کرام نے آپ کے سامنے کبائر کا ذکر چھیڑ دیا کہ شرک، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے فرار، پاکدامن پر تہمت، والدین کی نافرمانی، جھوٹی بات، مال غنیمت میں خیانت، جادو اور سود خوری گناہ کبیرہ ہیں۔ یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے عہد اور قسموں کو توڑتے ہیں اس کا شمار کس میں کرو گے اس کی سند میں ضعف ہے لیکن حدیث حسن ہے۔

کبائر کے بارے میں سلف صالحین کے اقوال: حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ مصر میں چند لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے پوچھا کہ قرآن پاک میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر عمل کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اس پر ہمارا عمل نہیں ہے۔ ہم امیر المومنین حضرت عمرؓ سے ان کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کو لے کر مدینے پہنچے۔ حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے پوچھا مصر سے کب آئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ چند دن پہلے۔ پھر آپ نے پوچھا کیا اپنے والد کی اجازت سے آئے ہو۔ آپ نے اس کا جواب دیا اور اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کو جمع کرو۔ جب وہ جمع ہوئے تو آپ نے ان میں سے ایک شخص سے فرمایا کہ میں تجھے اللہ تعالیٰ اور حق اسلام کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے مکمل قرآن پاک پڑھا ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ پھر فرمایا کہ تم نے مکمل قرآن اپنے دل میں محفوظ کیا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ وہ شخص کہتا ہے کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حضرت عمرؓ دلائل کے ذریعے غالب آ جاتے۔ پھر فرمایا کیا تم نے اپنی بصارت، بول چال میں اس کا احاطہ کیا ہے۔ پھر آپ

1۔ مسند احمد: 339/4

نے ان میں سے ہر ایک سے اسی طرح سوال کیا۔ پھر فرمایا کیا تم عمرؓ کو اس تکلیف میں ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ کی کتاب پر قائم کر دے۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی معلوم تھا کہ ہم سے خطائیں سرزد ہوں گی۔ پھر آپ نے یہی آیت ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا'' تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا کیا اہل مدینہ کو تمہارے یہاں آنے کا سبب معلوم ہے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر انہیں معلوم ہو جاتا تو مجھے انہیں وعظ کرنا پڑتا۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اگرچہ حضرت حسن بصری اور حضرت عمرؓ کے درمیان انقطاع ہے۔ لیکن اس واقعہ کا مشہور ہو جانا ہی اس کی صحت کے لیے کافی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ کبائر یہ ہیں۔ 1۔ شرک، 2۔ ناحق قتل، 3۔ یتیم کا مال کھانا، 4۔ پاکدامن عورت پر تہمت لگانا، 5۔ میدان جنگ سے فرار، 6۔ ہجرت کے بعد واپس لوٹنا، 7۔ جادو، 8۔ والدین کی نافرمانی، 9۔ سود خوری، 10۔ جماعت مسلمین سے الگ ہونا، 11۔ سودا کر کے اس کو توڑ دینا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول پہلے گذر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اس کی رحمت سے مایوس ہونا، اس کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہونا۔ آپ سے ہی مروی ہے کہ سورۂ نساء کی ابتداء سے لے کر تیس آیات تک کبائر کا ہی بیان ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا'' تلاوت فرمائی۔ حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، سیراب کرنے کے بعد باقی پانی روک لینا، بلاعوض اپنے نر کو کسی کی مادہ کے لیے نہ دینا۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فالتو پانی نہ روکا جائے تاکہ اس سے گھاس وغیرہ اگ سکے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تین اشخاص کو قیامت کے دن رحمت کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ نہ ان کا گناہوں سے تزکیہ کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو صحرا میں بچے ہوئے پانی سے مسافروں کو روکے۔ مسند امام احمد کی روایت میں ہے کہ جو شخص فالتو پانی اور گھاس سے لوگوں کو روکتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان پر فضل واحسان نہیں فرمائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ گناہ کبیرہ وہ ہیں جو عورتوں سے بیعت لینے کے ضمن میں ذکر کیے گئے ہیں اور اس سے ان کی مراد یہ آیت کریمہ ہے: اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّ لَا يَسْرِقْنَ..... (الممتحنہ: 12)'' ترجمہ: اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی، نہ چوری کریں گی، نہ بدکاری کریں گی، نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ جھوٹا الزام لگائیں گی جو انہوں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لیا ہے۔ اور نہ ہی کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی۔'' حضرت انس بن مالکؓ سے مروی روایت پہلے گذر چکی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کبائر کے بارے میں اقوال: ایک دفعہ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے ذکر کیا کہ کبیرہ گناہ سات ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سات سے زیادہ ہیں۔ حضرت طاؤس فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے پوچھا کہ سات گناہ کبیرہ کون سے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان کی تعداد ستر تک ہے۔ سات تو معمولی چیز ہے۔ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ وہ سات کبیرہ گناہ کون سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کی تعداد ستر ہے۔ سات تو معمولی ہیں۔ ایک شخص کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ان کی تعداد سات سو ہے۔ اور سات تو بہت معمولی تعداد ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ استغفار کرنے سے کوئی کبیرہ کبیرہ نہیں رہتا، اور اصرار کرنے سے کوئی صغیرہ صغیرہ نہیں رہتا۔ اسی آیت کی تفسیر میں آپ سے مروی ہے کہ کبیرہ ہر وہ گناہ ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نار جہنم، غضب الٰہی، یا عذاب کا ذکر کیا ہے۔ ایک روایت میں فرماتے ہیں کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ منع فرمادے وہ کبیرہ ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ چیز جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔

کبائر کے بارے میں تابعین کے اقوال: حضرت عبیدہؒ سے کبائر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ شرک کرنا، ناحق قتل، میدان جنگ سے فرار، بہتان باندھنا، ہجرت کے بعد واپس لوٹنا۔ راوی حدیث ابن عون اپنے شیخ سے پوچھتے ہیں۔ کیا جادو بھی

گناہ کبیرہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ لفظ بہتان بہت سی برائیوں کو شامل ہے۔ حضرت عبید بن عمیر فرماتے ہیں کہ گناہ کبیرہ سات ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کے بارے میں آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ 1۔ شرک کرنا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ...... ''ترجمہ: اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ تو اس کی حالت ایسی ہے۔ گویا آسمان سے گرا ہو پس کسی پرندے نے اسے اچک لیا ہو یا ہوا نے اسے کسی دور جگہ پھینک دیا ہو''2۔ یتیم کا مال کھانا اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا...... ''ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ تو بس کھارہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ''۔ 3۔ سود خوری کرنا اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا...... ''ترجمہ: جو لوگ سود کھایا کرتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنادیا ہو''۔ 4۔ بہتان باندھنا اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ...... ''ترجمہ: جو لوگ تہمت لگاتے ہیں پاکدامن عورتوں پر جو انجان ہیں، ایمان والیاں ہیں ان پر پھٹکار ہے دنیا اور آخرت میں، اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے''۔ 5۔ میدان جنگ سے فرار ہونا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا'' ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم مقابلہ کرو کافروں کے لشکر جرار سے تو مت پھیرنا ان کی طرف اپنی پیٹھیں''۔ 6۔ ہجرت کے بعد وطن واپس لوٹنا اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ...... ''ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹ گئے باوجود کہ ان پر ہدایت کی راہ ظاہر ہو چکی تھی''۔ 7۔ مومن کو ناحق قتل کرنا۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا...... ''ترجمہ: جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے ہمیشہ رہے گا اس میں......''۔ حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ گناہ کبیرہ سات ہیں۔ ناحق قتل، یتیم کا مال کھانا، سود خوری، پاکدامن عورت پر تہمت لگانا، جھوٹی گواہی، والدین کی نافرمانی، میدان جنگ سے زار۔ حضرت مغیرہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو گالی دینا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ علماء کی ایک جماعت صحابہ کرام کو گالی دینے والے کی تکفیر کی قائل ہے۔ اور یہی حضرت امام مالکؒ سے مروی ہے۔ محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں: میں خیال نہیں کرتا کہ جو شخص حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے بغض رکھتا ہو وہ حضور ﷺ سے محبت رکھتا ہو۔ حضرت زید بن اسلمؒ آیت کریمہ ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا'' کے تحت فرماتے ہیں کہ کبائر یہ ہیں۔ شرک، اللہ کی آیات، اور اس کے رسولوں سے کفر، جادو، قتل اولاد، اللہ کے لیے بیوی اور اولاد کا قائل ہونا، اور اسی قسم کے دوسرے اقوال اور اعمال کہ جن کی وجہ سے کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ مگر وہ گناہ جس سے انسان دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ عمل بھی مقبول ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ گناہوں کو نیکیوں کے بدلے میں معاف فرمادیتا ہے۔ حضرت قتادہؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے جو کبائر سے اجتناب کرے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ کبائر سے اجتناب کرو، صراط مستقیم پر قائم رہو خوش باش رہو، صحیح سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری شفاعت میری امت میں سے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ہے۔ اس حدیث کو امام عبدالرزاق نے اپنی ''مصنف'' میں حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ حسن اور صحیح ہے۔ اس حدیث کے شواہد صحیح احادیث میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ نے شفاعت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میری شفاعت متقی، مومن کے لیے ہے نہیں بلکہ یہ شفاعت گنہگاروں اور خطا کاروں کے لیے ہے۔

گناہ کبیرہ کے بارے میں علماء اصول کے اقوال: بعض نے کہا ہے کہ گناہ کبیرہ وہ ہوتا ہے جس پر کوئی شرعی حد مقرر ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ جس گناہ پر کتاب وسنت سے کوئی مخصوص وعید ہو۔ ابوالکریم بن محمد رافعی اپنی کتاب ''شرح الکبیر'' میں فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور بعد میں آنے والے سلف صالحین کے درمیان گناہ کبیرہ کے بارے میں اختلاف ہے اور اسی طرح کبیرہ اور صغیرہ میں

فرق کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ اس میں مختلف اقوال ہیں۔ 1۔ وہ گناہ جو حد کا موجب ہو۔ 2۔ وہ گناہ جس کے ارتکاب پر قرآن وسنت کی سخت وعید ہو۔ 3۔ امام الحرمین فرماتے ہیں کہ ہر وہ گناہ جسے کرنے والے کی دین کے معاملہ میں لاپروائی ظاہر ہو۔ 4۔ قاضی ابو سعید فرماتے ہیں کبیرہ وہ ہے جس کا حرام ہونا نص قرآنی میں ثابت ہو۔ اور ہر وہ نافرمانی جس پر حد شرعی ہو۔ خواہ وہ حد قتل ہو یا اس کے علاوہ۔ اسی طرح ہر اس فرض کو ترک کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے جسے فوری ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح جھوٹی گواہی، جھوٹی روایت اور جھوٹی قسم بھی اسی میں شامل ہے۔ قاضی رویانی فرماتے ہیں کہ کبائر سات ہیں۔ ناحق قتل، زنا، لواطت، شراب نوشی، چوری، غصب، قذف (تہمت) دوسری روایت میں جھوٹی گواہی بھی شامل ہے۔ صاحب ''العمدہ'' نے درج چیزوں کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ سود خوری، بلا عذر رمضان کا روزہ چھوڑنا، جھوٹی قسم، قطع رحمی، والدین کی نافرمانی، میدان جنگ سے فرار، یتیم کا مال کھانا، ناپ تول میں خیانت، بغیر کسی عذر کے نماز کو وقت سے پہلے یا بعد میں پڑھنا، بلاوجہ کسی مسلمان کو مارنا، رسول اللہ ﷺ پر قصداً جھوٹ باندھنا (جھوٹ منسوب کرنا) صحابہ کرام کو گالی دینا، بلا عذر گواہی کو چھپانا، رشوت لینا، عورت اور مرد کے درمیان دلالی کرنا، حاکم وقت کے پاس چغلی کھانا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، قدرت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے باز رہنا، قرآن کو سیکھ کر بھول جانا، جانور کو آگ میں جلانا، عورت کا بلاوجہ اپنے خاوند کے پاس نہ جانا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہونا، علمائے کرام اور حاملین قرآن کی بے ادبی کرنا، ظہار کرنا، مردار اور خنزیر کا گوشت کھانا مگر اضطراری حالت میں جائز ہے۔ اس کے بعد امام رافعی فرماتے ہیں کہ ان میں سے بعض میں توقف کی گنجائش ہے۔ کبائر کے بارے میں بعض بزرگان دین نے کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں۔ ہمارے شیخ ابو عبداللہ ذہبی نے ایک کتاب لکھی ہے جن میں تقریباً ستر کبائر کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ گناہ کبیرہ وہ ہے جس پر شارع علیہ السلام نے جہنم کی وعید سنائی ہو۔ اگر اس قسم کے گناہ شمار کیے جائیں تو وہ بہت سے ہیں۔ اگر گناہ کبیرہ کی یہ تعریف کی جائے کہ ہر وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ اس اعتبار سے تو بہت زیادہ ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْــَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

''اور نہ آرزو کرو اس چیز کی بزرگی دی ہے اللہ نے جس سے تمہارے بعض کو بعض پر مردوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور مانگتے رہو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل (وکرم) کو بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا: حضرت ام سلمہؓ نے ایک مرتبہ عرض کی یارسول اللہ ﷺ مرد جہاد کرتے ہیں اور ہم اس ثواب سے محروم ہیں۔ اسی طرح میراث میں بھی ہمیں مردوں کے مقابلہ میں نصف حصہ ملتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ جب ام سلمہؓ نے یہی بات عرض کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ...... ''ترجمہ: میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت۔'' بعض روایات میں آتا ہے کہ عورتوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش ہم مرد ہوتیں تو ہم بھی ان کی طرح جہاد کرتیں۔ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یارسول اللہ! میراث میں مرد کو عورت کے مقابلے میں دگنا حصہ ملتا ہے۔ اور دو عورتوں

کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ کیا اعمال میں بھی ایسا ہی ہے کہ عورت ایک نیکی کرے تو اس کی آدھی نیکی لکھی جاتی ہے؟ اس پر اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ سدی فرماتے ہیں کہ مردوں نے کہا کہ ہمیں عورتوں کے مقابلے میں نیکیوں کا دوگنا اجر ملے گا جس طرح میراث میں ہمیں ان کے مقابلے میں دوگنا حصہ ملتا ہے۔ اور عورتوں نے کہا کہ ہمیں شہادت کا اجر ملنا چاہیے۔ ہم جہاد نہیں کر سکتیں، اگر ہم پر جہاد فرض ہو جائے تو ہم بھی جہاد کریں گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ان خواہشات سے روک دیا اور فرمایا کہ میرا فضل و احسان طلب کرتے رہا کرو۔ حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ انسان کو یہ آرزو نہیں کرنی چاہیے کہ فلاں کا مال اور اولاد میری ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس چیز سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا فضل و احسان طلب کرتے رہا کرو۔ اس سے اس صحیح حدیث پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا جس میں نبی کریم نے فرمایا ہے کہ صرف دو شخصوں پر رشک کیا جا سکتا ہے 1۔ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہو اور اس کو راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہو۔ اس کو دیکھ کر کوئی شخص کہے کاش! فلاں کی طرح میرے پاس بھی مال ہوتا میں اس کو راہ خدا میں خرچ کرتا۔ وہ دونوں اجر و ثواب میں برابر کے حقدار ہوں گے۔ اس آیت کریمہ میں اس چیز سے منع نہیں کیا گیا۔ کیونکہ حدیث پاک میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی نیک مقصد کے لیے یہ تمنا کرنا صحیح ہے کہ اس کے پاس بھی فلاں شخص کی طرح مال ہو۔ اور آیت کریمہ نے عین تمنا سے روکا ہے۔ یعنی دنیاوی اور دینی امور میں اس قسم کی آرزو جائز نہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا : یعنی مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو اس کے عمل کی جزا ملے گی۔ اگر اچھا عمل ہوگا تو جزاء اور اگر برا ہوگا تو سزا ملے گی۔ یہ ابن جریر کا قول ہے۔ اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو میراث میں وہی حصہ ملے گا جو ان کے لیے مقرر ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و احسان کا سوال کیا کرو، اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت دی ہے اس کی آرزو نہ کیا کرو۔ کیونکہ اس کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس قسم کی آرزو کوئی فائدہ نہیں دے سکتی بلکہ تم مجھ سے میرے فضل و احسان کا سوال کیا کرو۔ میں تمہیں عطا فرما دوں گا۔ کیونکہ میں کریم تمہیں بے بہا عنایت کرنے والا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و احسان کا سوال کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔ یاد رکھو! کہ کشادگی اور وسعت کا انتظار کرنا سب سے اعلیٰ اور افضل عبادت ہے (1)۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اس سے وسعت اور کشادگی کی امید رکھتا ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا : یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز بخوبی جانتا ہے۔ جو دنیا کا طلبگار ہو اسے دنیا عطا کر دیتا ہے اور جو فقیری کا طالب ہو اسے فقیری عطا کر دیتا ہے۔ اور جو رسوائی کا سزاوار ہو اس کو اس کے اسباب کی طرف چلا دیتا ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝

''اور ہر ایک کے لیے بنا دیے ہیں ہم نے وارث اس مال سے جو چھوڑ جائیں ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور وہ لوگ جن سے بندھ چکا ہے تمہارا عہد و پیمان تو دو انہیں ان کا حصہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے۔''

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ :حضرت ابن عباس ؓ اور بہت سے دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں موالی سے مراد وارث ہیں اور حضرت ابن عباس ؓ سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے مراد عصبہ ہیں۔ ابن جریر کا قول ہے کہ عرب چچا کے بیٹے کو بھی مولیٰ کہتے ہیں۔ اس

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب الدعوات: 78,77/13

طرح آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے لوگو! ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے عصبہ بنا دیا ہے جو اس مال کے وارث ہوں گے جسے اس کے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ کر مریں۔

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ: یعنی وہ لوگ بھی وارث بنیں گے جن کو تم نے قسمیں کھا کر اور باہمی عہد و پیماں سے حلیف بنا لیا ہے۔ اور ان قسموں کے ساتھ جو تم نے ان کے ساتھ وعدے کیے ہیں۔ ان وعدوں کو پورا کرو، اور میراث میں سے ان کا حصہ دو۔ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا۔ پھر منسوخ ہو گیا اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ انہوں نے جن کے ساتھ وعدے کیے ہیں وہ پورے کریں۔ سعید بن جبیرؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ موالی سے مراد میراث ہیں اور وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ کا مفہوم یہ ہے کہ جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو حضور ﷺ نے مہاجرین اور اہل مدینہ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا اس طرح ہر مہاجر اپنے انصاری بھائی کا وارث بنتا اور اس انصاری کے ذو رحم رشتہ دار وارث نہ ہوتے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو اس نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ اب مہاجرین کی صرف مدد کرو، عطیہ دے دیا کرو اور دین کے معاملہ میں نصیحت کیا کرو۔ لیکن میراث کا حکم ختم ہو گیا البتہ ان کے لیے وصیت کر سکتے ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسلام سے پہلے یہ دستور تھا کہ دو شخص آپس میں معاہدہ کر لیتے ہیں کہ تو میرا وارث ہوگا اور میں تیرا ہوں گا۔ اس طرح قبائل عرب بھی ایک دوسرے کے حلیف بن جاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دور جاہلیت کا جو بھی معاہدہ ہے اسلام اس کو برقرار رکھتا ہے لیکن اسلام میں اب اس قسم کے معاہدے کی گنجائش نہیں۔ ان تمام معاہدوں کو اس آیت کریمہ: وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ..... (انفال:75) ''ترجمہ: اور رشتہ دار ورثہ میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں حکم الٰہی کے مطابق۔'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس قسم کے معاہدوں کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور جو معاہدے دور جاہلیت میں ہو چکے ہیں اسلام انہیں باقی رکھتا ہے۔ مزید ارشاد فرمایا کہ اگر مجھے سرخ اونٹ دیے جائیں اور اس معاہدے کو توڑنے کے لیے کہا جائے جو دار الندوہ میں ہوا تھا میں اس کو پسند نہیں کروں گا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں بچپن میں اپنے چچاؤں کے ساتھ حلف مطیبین میں حاضر ہوا تھا۔ اگر مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جائیں تو اس معاہدہ کو توڑنا پسند نہیں کروں گا اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ اور الفت قائم کی۔ حضرت قیس بن عاصمؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ سے دور جاہلیت کے معاہدے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ دور جاہلیت کے معاہدوں کو نبھاؤ اور اسلام میں اس قسم کے معاہدہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی روایت مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ حضرت داؤد بن حصین روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت ام سعد بنت ربیع کے پاس قرآن پاک پڑھتا تھا اور میرے ساتھ ان کے پوتے موسیٰ بن سعد بھی پڑھتے تھے۔ یہ ام سعد بچپن میں ہی یتیم ہو گئی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کی پرورش کی تھی۔ میں نے قرآن پاک پڑھتے ہوئے اس آیت میں ''عَقَدَتْ'' کی بجائے ''عَاقَدَتْ'' پڑھا تو انہوں نے مجھے ٹوکا اور فرمایا ''عَقَدَتْ'' پڑھو۔ یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے بارے میں نازل ہوئی۔ جو ابتداء میں مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ قسم اٹھائی تھی کہ وہ اسے وراثت میں حصہ نہیں دیں گے۔ اور جب مسلمانوں کو قوت و غلبہ حاصل ہوا تو وہ مسلمان ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ ان کو ان کا حصہ دو۔ لیکن یہ قول انتہائی غریب ہے۔ اور پہلا قول ہی صحیح ہے کہ ابتدائے اسلام میں لوگ معاہدہ کر کے ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے تو اس آیت کریمہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ لیکن ان کے لیے حکم دیا گیا کہ اس سے پہلے جو معاہدہ کر چکے ہیں وہ پورا کرو۔ ان احادیث طیبہ سے ان علماء کے قول کا رد ہو جاتا ہے جو آج بھی وراثت میں باہمی معاہدے کے قائل ہیں۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور ایک

روایت کے مطابق امام ابن حنبل کی رائے ہے۔لیکن صحیح قول جمہور علماء کا ہے۔اور یہی قول امام شافعیؒ امام مالک اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد کا بھی ہے۔اور اس آیت کریمہ میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص وارث اس کے قریبی رشتہ دار ہوں گے خواہ والدین ہوں یا دوسرے رشتہ دار۔لیکن ان کے علاوہ دوسرے لوگ وارث نہیں بن سکتے۔حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حصہ دار وارثوں کو دے کر جو باقی بچے وہ عصبہ کو دے دیں اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ترکہ کو پہلے ان وارثوں پر تقسیم کرو جن کا ذکر میراث کی دو آیتوں میں ہو چکا ہے اور ان کو عطا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ عصبہ کو دے دو۔اور اس آیت کریمہ کا یہ بھی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے جن کو تم حلیف بنا چکے ہو ان کو میراث سے حصہ دو مگر اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد عہد و پیمان موثر نہیں ہوں گے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت کریمہ نے ماضی و مستقبل دونوں کے عہد و پیمان کو منسوخ کر دیا ہے اب انہیں کسی صورت میں بھی وراثت میں حصہ نہیں ملے گا۔حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اب ان کا حصہ یہی ہے کہ ان کی مدد کی جائے اور دین کے معاملہ میں انہیں نصیحت کی جائے اور ان کو عطیہ وغیرہ دیا جائے۔اس کے علاوہ ان کے لیے وصیت بھی کر سکتا ہے۔لیکن انہیں میراث میں حصہ نہیں ملے گا۔آپ فرماتے ہیں کہ دور جاہلیت میں دو شخص آپس میں معاہدہ کر لیا کرتے تھے کہ ان میں سے جو بھی پہلے مرے گا دوسرا اس کا وارث ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے آیت ''اُولُوا الْاَرْحَامِ'' نازل فرما کر اس کو منسوخ کر دیا۔اور فرمایا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو یعنی اگر کل مال تیسرے حصے سے وصیت کرنا چاہو تو وصیت کر سکتے ہو اس طرح بہت علمائے سلف سے مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ منسوخ ہو چکی ہے اور اس کی ناسخ آیت ''اُولُوا الْاَرْحَامِ'' ہے۔حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ میراث میں سے ان کا حصہ دے دو۔حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی ایک شخص کو اپنا مولیٰ بنایا تھا اور پھر اسے اپنا وارث بھی بنایا۔حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو دوسروں کی اولاد کو اپنا بیٹا بنا لیتے اور پھر انہیں اپنا وارث بنا لیتے۔اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما کر حکم دیا کہ تم وصیت کے ذریعے تو انہیں کچھ دے سکتے ہو لیکن میراث قریبی رشتہ داروں اور عصبہ کا حق ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹیوں کو میراث دینا ناپسند فرمایا۔لیکن وصیت میں ان کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ''فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ'' کا معنی یہ ہے کہ ان کی نصرت و اعانت کرو اور دین کے معاملہ میں ان کو نصیحت کرو۔اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ میراث سے ان کو حصہ دو۔اور اگر آیت کے یہ معنی کیے جائیں تو پھر یہ آیت نہ منسوخ ہوگی اور نہ یہ یہ کہنا پڑے گا کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔بلکہ آیت کریمہ کی دلالت اس بات پر ہوگی کہ تم نے دوسرے لوگوں کی اعانت، وصیت اور نصیحت کا جو معاہدہ کیا ہے اسے پورا کرو۔اس طرح یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔لیکن ان کا قول محل نظر ہے۔کیونکہ دور جاہلیت میں جو معاہدے ہوتے تھے ان کی دو قسمیں تھیں۔کچھ معاہدے باہمی تعاون اور مدد و نصرت کے لیے ہوتے تھے اور بعض معاہدے ایک دوسرے کا وارث بننے کے لیے کیے جاتے۔جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔اور اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی گزر چکا ہے کہ ابتدائے اسلام میں مہاجر اپنے انصاری بھائی کا وارث بنتا تھا اور اس کے قریبی ذو رحم رشتے دار وراثت سے محروم ہو جاتے۔یہاں تک کہ یہ حکم نازل ہونا۔ان اقوال کے پیش نظر امام ابن جریر اس آیت کے محکم اور غیر منسوخ ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝

''مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر اس وجہ سے کہ فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر اور اس وجہ سے کہ مرد خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں سے (عورتوں کی ضرورت و آرام کے لیے) تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں، حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں (مردوں کی) غیر حاضری میں اللہ کی حفاظت سے اور وہ عورتیں اندیشہ ہو تمہیں جن کی نافرمانی کا تو (پہلے نرمی سے) انہیں سمجھاؤ اور (پھر) الگ کردو انہیں خواب گاہوں سے اور (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو انہیں پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تمہاری تو نہ تلاش کرو ان پر (ظلم کرنے کی) راہ یقیناً اللہ تعالیٰ (عظمت و کبریائی میں) سب سے بالا سب سے بڑا ہے''۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ: اس آیت کریمہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ مرد عورت کا حاکم، رئیس اور سردار ہے۔ اور اس کی کج روی پر تادیب کرنے والا ہے۔ کیونکہ مرد عورت سے افضل ہے۔ اس لیے نبوت مردوں کے ساتھ خاص ہے اور یہی وجہ ہے کہ شرعی طور پر خلیفۃ المسلمین مرد ہی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جنہوں نے کسی عورت کو اپنا والی بنالیا ہو (1)۔ مردوں کی فضیلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب و سنت سے ان کے ذمہ لازم ہے۔ مثلاً مہر، نان ونفقہ اور دیگر ضروریات زندگی۔ اس طرح مرد فی نفسہ عورت سے افضل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا امور میں اس کو فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ اسے عورت پر حاکم بنایا جائے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: 228) ''ترجمہ: البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے''۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''قوّٰمون'' کا معنی یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں کا رئیس بنا دیا گیا ہے اور عورتوں پر لازم ہے کہ وہ ان تمام امور میں مردوں کی اطاعت کریں جن کی بجا آوری کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ اولاد کی نگہداشت اور مرد کے مال کی حفاظت بھی اسی میں شامل ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں شکایت کی کہ اس کے خاوند نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ آپ نے اسے بدلہ لینے کا حکم فرمایا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور وہ عورت یونہی واپس لوٹ گئی۔ حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس عورت نے عرض کی کہ اس کے خاوند نے اسے مارا ہے جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر نشان پڑ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اس کے لیے مناسب نہیں تھا اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یعنی مرد کو اختیار ہے کہ وہ عورت کی تادیب کرے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے کچھ اور چاہا تھا اور اللہ نے کچھ اور فرمادیا۔ حضرت شعبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں مال خرچ کرنے سے مراد مہر ادا کرنا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اگر مرد عورت پر زنا کی تہمت لگائے تو اس کو لعان کرنے کا حکم ہے۔ اور اگر عورت مرد پر زنا کی تہمت لگائے اور اسے ثابت نہ کر سکے تو اسے کوڑے لگانے کا حکم ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ: نیک اور صالح عورتیں وہ ہیں جو اپنے خاوند کی اطاعت کرتی ہیں اور اس کی غیر موجودگی میں اس کی عزت اور مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ اور حقیقت میں محفوظ تو وہی ہوتا ہے جس کی حفاظت اللہ کرنے والا ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ

1۔ صحیح بخاری، 70/9

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین عورت وہ ہے جب اس کا خاوند اسے دیکھے تو وہ اسے خوش کردے، جب وہ اس کو حکم دے تو اس کی اطاعت کرے، اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے مال اور عزت کی حفاظت کرے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی عورت پانچ نمازیں پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے، اپنی خاوند کی اطاعت کرے تو اسے کہا جائے گا کہ یہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے(1)۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ: یعنی جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں خوف ہو۔ نشوز کا معنی بلند ہونا ہے۔ اور اس سے مراد وہ عورت ہے جو اپنے خاوند پر حاوی ہونا چاہتی ہے۔ اس کی حکم عدولی کرتی ہے۔ اس سے اعراض کرتی ہے۔ اس کے ساتھ دشمنی رکھتی ہے۔ جب کسی عورت پر یہ علامات ظاہر ہوں تو مرد کو چاہیے کہ وہ پہلے اسے زبانی وعظ نصیحت کرے اور خاوند کی نافرمانی میں اللہ کی سزا سے ڈرائے اور اسے بتائے کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کی اطاعت اس پر لازم کی ہے اور اس کی نافرمانی کو حرام کیا ہے۔ کیونکہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ کیونکہ مرد کو عورت پر بہت بڑا حق حاصل ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کرے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں(2)۔ اور مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ جس رات عورت ناراض ہو کر اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑ دے تو فرشتے صبح تک اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ اس لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ایسی عورت کو پہلے سمجھاؤ اور اگر وہ نہ مانے تو انہیں اپنے بستر سے الگ کردو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ اس کو اپنے ساتھ ہی سلائے لیکن خود کروٹ بدل کر سوئے اور اس کے ساتھ مجامعت نہ کرے۔ بلکہ اس سے بات چیت بھی ترک کرسکتا ہے۔ یعنی اسے پہلے سمجھائے اگر وہ بات نہ مانے تو اس کا بستر الگ کردے، اس کے ساتھ بات چیت نہ کرے لیکن اس کو طلاق نہ دے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! عورت کے ہم پر کیا حقوق ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم کھانا کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ، اس کے چہرے پر نہ مارو، اس کو برا بھلا نہ کہو اور اگر جھگڑا ہو جائے تو اسے گھر سے نہ نکالو(3)۔

وَاضْرِبُوْھُنَّ: اگر وہ عورت وعظ و نصیحت اور بستر سے جدا کرنے کے باوجود باز نہ آئے تو اسے معمولی مار پیٹ سکتے ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، وہ تمہاری خدمت گار اور محتاج ہیں۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ اس شخص کو گھر میں داخل نہ ہونے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور اگر وہ تمہاری یہ بات نہ مانیں تو انہیں سزا کے طور پر معمولی مار بھی سکتے ہو اور تم پر ان کا یہ حق ہے کہ تم انہیں اپنی حیثیت کے مطابق کھلاؤ، پلاؤ اور پہناؤ۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح نہیں مارنا چاہیے کہ جسم پر نشان پڑ جائیں۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ ایسی مار نہ ہو جس سے کوئی عضو ٹوٹ جائے اور یا اس کے جسم پر کوئی عیب پڑ جائے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پہلے عورت کا بستر الگ کرو، اگر وہ مان جائے تو فبہا ورنہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مارنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن وہ اس طرح مارے جس سے اس کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹے اور اگر وہ اس سے بھی باز نہ آئے تو اسے اجازت ہے کہ اس سے فدیہ لے کر طلاق دے دے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی لونڈیوں کو نہ مارو۔ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ عورتیں آپ کے اس حکم سے دلیر ہوگئی ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب

1۔ مسند احمد: 191/1 2۔ فتح الباری: 293/9 3۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح: 245/2

عورتوں کی طرف سے شکایت ملی ہے کہ ان کے خاوند ان کو مارتے ہیں۔ یاد رکھو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اچھے نہیں ہیں (1)۔ حضرت اشعث بن قیسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت عمر فاروقؓ کا مہمان تھا۔ انہوں نے کسی وجہ سے اپنی زوجہ محترمہ کو مارا اور پھر مجھے فرمانے لگے اے اشعث! میری تین باتیں یاد رکھو جن کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے ایک یہ کہ مرد سے نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی بیوی کو کس لیے مارا ہے۔ دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سویا جائے اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی (2)۔

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا: یعنی اگر عورت اپنے مرد کی اطاعت کرے اور اس کے تمام جائز اوامر کی بجا آوری کرے تو پھر اس پر کسی قسم کی سختی نہ کرو اور نہ اسے مارو پیٹو اور نہ یہ کہ اس سے اعراض کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا: وہ مرد جو بغیر کسی وجہ کے اپنی عورتوں کو تنگ کریں یا ان پر زیادتی کریں تو اللہ تعالیٰ خود ان سے زیادتی کا انتقام لے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عظمت و کبریائی میں سب سے بالا اور سب سے بڑا ہے۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝

"اور اگر خوف کرو تم ناچاقی کا ان کے درمیان تو مقرر کرو ایک پنچ مرد کے کنبہ سے اور ایک پنچ عورت کے کنبہ سے اگر وہ دونوں (پنچ) ارادہ کریں گے صلح کرانے کا تو موافقت پیدا کر دے گا اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہر بات سے خبردار ہے"۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ: اس سے پہلی آیات میں عورت کی نافرمانی اور کجروی کو بیان کیا۔ اور یہاں اس حال کا بیان ہے جب مرد اور عورت دونوں ناراض ہوں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں جب ایسی صورت حال بن جائے تو حاکم کسی شریف سمجھدار شخص کو مقرر کرے جو دیکھے کہ ظلم اور زیادتی کس طرف سے ہے پھر ظالم کو ظلم سے روکے اور اگر معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہو گیا ہو اور بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہو تو عورت اور مرد ہر دو کی طرف سے ایک ایک منصف مقرر کرے۔ یہ دونوں مل کر تحقیق کریں اور جس امر میں مصلحت دیکھیں اس کا فیصلہ کر دیں یعنی اگر ان دونوں کے اتفاق میں مصلحت ہو تو صلح کرا دے اور اگر ان کی علیحدگی میں مصلحت ہو تو ان میں علیحدگی کرا ئیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا ان دونوں کے اتفاق میں ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ دونوں صلح کرانے کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ وہ دونوں تحقیق کریں اگر غلطی مرد کی طرف سے ہو تو وہ اس کی عورت کو روک لیں اسے اپنی روش درست کرنے پر مجبور کریں گے اور اس دوران عورت کا نان نفقہ اس کے ذمہ لازم کریں گے۔ اگر غلطی عورت کی طرف سے ہو تو اس کو نان نفقہ نہیں دلائیں گے اور اس کو خاوند کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور کریں گے اور اگر وہ طلاق کا فیصلہ دے تو خاوند کو طلاق دینا پڑے گی اور اسی طرح باہمی مل جل کر رہنے کا فیصلہ کریں تو ان کا یہ فیصلہ بھی مانا جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر انہوں نے فیصلہ کیا کہ میاں بیوی مل جل کر رہیں اور ان میں سے ایک نے تو اس فیصلے کو قبول کر لیا اور اسی حالت میں ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو گیا تو ان میں جو راضی ہو گیا تھا وہ دوسرے کا وارث بنے گا اور جو راضی نہیں ہوا تھا وہ دوسرے کا وارث نہیں بنے گا۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کو حکم بنا کر بھیجا اور فرمایا کہ اگر تم نے ان دونوں کے درمیان صلح کرانا چاہو گے تو صلح ہو جائے گی

1۔ ابوداؤد، کتاب النکاح 245/2	2۔ مسند احمد 20/1

اور اگر تفریق کرنا چاہو تو تفریق ہو جائے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عقیل بن ابی طالبؓ نے فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ سے نکاح کیا تو اس نے کہا کہ تم میرے پاس رہو گے اور میں خود تم پر خرچ کروں گی۔ اب صورت حال یہ ہوگئی کہ جب حضرت عقیل ان کے پاس جاتے تو وہ پوچھتی کہ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کہاں ہیں۔ وہ فرماتے ہی کہ تیری بائیں جانب جہنم میں یہ بات ان پر گراں گزری۔ اس نے پردہ کیا اور حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوگئی اور تمام قصہ بیان کیا۔ آپ یہ سن کر مسکرائے اور حضرت ابن عباسؓ کا خیال تھا کہ ان دونوں کے درمیان تفریق کردی جائے۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میں بنو عبد مناف کے دو افراد کے درمیان تفریق ناپسند کرتا ہوں۔ یہ دونوں حضرات جب حضرت عقیلؓ کے گھر آئے تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے اور دونوں میاں بیوی اندر ہیں۔ دونوں واپس چلے گئے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ایک میاں بیوی اپنا جھگڑا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی تھے۔ آپ نے دونوں طرف سے ایک آدمی چن کر حکم بنا دیا اور فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا کیا کام ہے۔ اگر تم ان دونوں کے درمیان صلح کرانا چاہو تو صلح کرا سکتے ہو۔ اگر تفریق کرنا چاہو تو تفریق کر سکتے ہو۔ یہ سن کر عورت نے کہا کہ میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں خواہ ملاپ کی صورت میں ہو یا جدائی کی سورت میں۔ لیکن مرد کہنے لگا کہ مجھے جدائی ناپسند ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تمہاری بات صحیح نہیں۔ قسم بخدا میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گا حتی کہ تم کتاب اللہ کا فیصلہ قبول کرلو خواہ تمہارے حق میں ہو یا خلاف۔ علماء کا اجماع ہے کہ ان دونوں منصفوں کو صلح اور تفریق کا اختیار ہے۔ حتی کہ ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو ایک، دو یا تین طلاقوں کے ساتھ تفریق کر سکتے ہیں اور یہی امام مالک سے روایت ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ وہ صلح تو کرا سکتے ہیں لیکن تفریق نہیں اور یہی قتادہ، زید بن اسلم، احمد بن حنبل، ابوثور اور داؤد ظاہری کا مذہب ہے اور ان کی دلیل اسی آیت کا یہ حصہ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا ہے کیونکہ اس میں تفریق کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ دونوں طرف سے وکیل ہیں تو ان کا حکم جمع و تفریق دونوں صورتوں میں بلا اختلاف نافذ ہوگا۔ ائمہ کرام کا اس میں اختلاف ہے کیا یہ دونوں حکم حاکم وقت کی طرف سے مقرر کیے جائیں گے اگرچہ میاں بیوی ان پر راضی نہ ہوں یا دونوں حکم میاں بیوی کی طرف سے وکیل ہوں گے۔ پہلے قول کو جمہور علماء نے اختیار کیا ہے اور ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا (نساء:35) قرآن پاک میں ان دونوں کو حکم کہا گیا ہے۔ اس لیے حکم کا فیصلہ قطعی ہوگا خواہ کوئی راضی ہو یا ناراض آیت کا ظاہر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور بعض علماء نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے اور وہ دلیل دیتے ہیں کہ جب حضرت علیؓ کے پاس مقدمہ پیش ہوا اور خاوند نے کہا کہ میں تفریق کو قبول نہیں کروں گا تو آپ نے فرمایا کہ تم جھوٹ بولتے ہو تمہیں بھی وہی اقرار کرنا پڑے گا جو عورت نے کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر دونوں حکموں کا فیصلہ موثر ہوتا تو آپ خاوند سے اقرار نہ کراتے۔ شیخ ابن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ علمائے کرام اس بات پر اجماع ہے کہ اگر دونوں حکموں کا اس بات پر اختلاف ہو جائے تو دوسرے کا قول معتبر نہیں ہوگا اس امر پر بھی اجماع ہے کہ اگر وہ میاں بیوی میں اتفاق کرانا چاہیں تو ان کا فیصلہ نافذ ہوگا اور اگر جدائی کرانا چاہیں تو ان کا فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ لیکن جمہور علماء کا مذہب یہی ہے کہ اس میں بھی ان کا فیصلہ نافذ ہوگا خواہ انہیں وکیل نہ بھی بنایا گیا ہو۔

وَ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَ مَا

مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾

''اور عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی کو اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو نیز رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پڑوسی جو رشتہ دار ہے اور پڑوسی جو رشتہ دار نہیں اور ہم مجلس اور مسافر اور جو (لونڈی غلام) تمہارے قبضہ میں ہیں (ان سب سے حسن سلوک کرو) بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کو جو مغرور ہو فخر کرنے والا ہو''۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ صرف اسی کے لیے عبادت کرو، اس کے توحید کا اقرار کرو، مخلوق میں سے کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ کیونکہ تمام مخلوق کا خالق اور رازق وہی ہے وہی ہر وقت اور ہر حال میں اپنی مخلوق پر فضل واحسان فرماتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے۔ عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اس کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ پھر فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کے ذمہ کرم پر بندے کا کیا حق ہے تو فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کو عذاب نہ دے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ یہ دونوں انسانوں کو عدم سے وجود میں لانے کا سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اکثر مقامات پر والدین کے ساتھ احسان کو اپنی عبادت کے ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ'' ترجمہ: میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کرو۔'' ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ'' ترجمہ: آپ کے رب نے حکم فرمایا ہے کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔'' پھر ارشاد فرمایا کہ رشتہ داروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو حدیث پاک میں ہے کہ مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہی ہے لیکن قریبی رشتے دار کو دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ پھر یتیموں کا ذکر فرمایا کہ ان کے ساتھ بھی احسان کرو کیونکہ ان کے سر سے باپ کا شفیق سایہ اٹھ گیا جو ان کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا اور ان پر خرچ کرتا تھا اس لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ احسان، مہربانی اور شفقت کے ساتھ پیش آؤ۔ پھر مساکین پر احسان کرنے کا ذکر کیا اور ان سے مراد وہ صاحب حاجت اور ضرورت مند ہیں جن کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اور ضروریات پوری کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ فقیر اور مساکین کا مکمل بیان سورہ برات کی تفسیر میں آئے گا۔ اس کے بعد اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم فرمایا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى'' سے مراد وہ پڑوسی ہے جس کے ساتھ رشتہ داری بھی ہو اور ''وَالْجَارِ الْجُنُبِ'' سے مراد وہ پڑوسی ہے جس کے ساتھ رشتہ داری نہ ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں ''وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى'' سے مراد مسلم پڑوسی ہیں اور ''وَالْجَارِ الْجُنُبِ'' سے مراد یہودی اور نصرانی ہیں۔ حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ ''وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى'' سے مراد بیوی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ ''وَالْجَارِ الْجُنُبِ'' سے مراد رفیق سفر ہے۔

پڑوسیوں کے بارے میں احادیث طیبہ: 1۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جبرئیل پڑوسیوں کے بارے میں مجھے وصیت کرتے رہے حتیٰ کہ مجھے یہ گمان ہوا کہ پڑوسی وارث بنا دیئے جائیں گے (1)۔ 2۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ کے نزدیک بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا خیر خواہ ہو اور بہترین ہمسایہ وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کا خیر خواہ ہو (2)۔ 3۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی شخص کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنا پیٹ تو بھر لے اور جبکہ اس کا پڑوسی بھوکا رہے (3)۔ 4۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: زنا کے بارے

1۔ مسند احمد 85/2 2۔ مسند احمد 167/2 3۔ مسند احمد 55,54/1

میں تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے عرض کی اس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور یہ قیامت تک حرام رہے گا۔ آپ نے فرمایا۔ دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے والا اس شخص سے کم گنہگار ہوگا جو اپنے پڑوسی کی عورت سے زنا کرے پھر فرمایا۔ چوری کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ عرض کی اس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور قیامت تک حرام رہے گی۔ آپ نے فرمایا اگر کوئی شخص دس گھروں سے چوری کرے تو اس کا یہ گناہ اس کے مقابلہ میں ہلکا ہے جو اپنے پڑوسی کی چوری کرتا ہے۔ اس حدیث کو صرف امام احمد نے ہی روایت کیا ہے لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت اس کی تائید کرتی ہے۔ آپ نے عرض کی یارسول اللہ! کونسا گناہ بڑا ہے۔ فرمایا، سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے۔ جواب دیا کہ تو اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر دے کہ وہ تیرے ساتھ مل کر کھائے گا۔ پھر عرض کی اس کے بعد کون سا گناہ فرمایا۔ پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرنا۔ 5۔ ایک انصاری صحابی روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے گھر سے نکلا اور جب میں آپ کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص کھڑا ہے اور آپ اس کی طرف متوجہ ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ شاید اسے آپ سے کوئی ضروری کام ہے۔ حضور ﷺ بہت دیر تک اس کے ساتھ کھڑے گفتگو فرماتے رہے حتیٰ کہ مجھے یہ خیال گزرا کہ آپ اتنی دیر کھڑا رہنے کی وجہ سے تھک گئے ہوں گے۔ جب وہ شخص چلا گیا تو میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ اس کے ساتھ بہت دیر تک کھڑے رہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اسے دیکھا ہے۔ عرض کی ہاں۔ فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون ہے؟ فرمایا یہ جبرائیل تھے اور مجھے پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں تاکید کر رہے تھے حتیٰ کہ مجھے خیال ہوا کہ وہ پڑوسی کو وارث بنا دیں گے۔ پھر فرمایا اگر تم انہیں سلام کرتے تو وہ سلام کا جواب دیتے(1)۔ 7۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں۔ ایک شخص مضافات مدینہ سے حاضر ہوا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اور جبرائیلؑ اس جگہ نماز پڑھ رہے تھے جہاں نماز جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔ جب جبرائیلؑ واپس لوٹ گئے تو اس شخص نے عرض کی یارسول اللہ! یہ کون شخص تھا جو آپ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اسے دیکھا۔ عرض کی ہاں۔ فرمایا تم نے خیر کثیر دیکھی ہے یہ جبرائیلؑ تھے۔ جو مجھے پڑوسی کے بارے میں وصیت کر رہے تھے حتیٰ کہ مجھے خیال گزرا کہ اسے وارث بنا دیا جائے گا۔ 7۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ پڑوسیوں کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جس کا صرف ایک حق ہوتا ہے۔ یعنی اس کا حق دیگر پڑوسیوں کے مقابلے میں ادنیٰ ہے۔ دوسرا وہ کہ جس کے دو حق ہیں اور تیسرا وہ جس کے تین حق ہیں اور یہ حق کے اعتبار سے تمام پڑوسیوں سے افضل ہے۔ ایک حق والا پڑوسی وہ ہے جو مشرک ہو اور رشتہ دار نہ ہو۔ اور دو حق والا پڑوسی وہ ہے جو مسلمان ہو اس کا ایک حق پڑوسی ہونے کے اعتبار سے ہے اور دوسرا مسلمان ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اور تین حقوق والا ہمسایہ وہ ہے جو مسلمان بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو۔ اسے پڑوسی مسلمان اور رشتہ دار ہونے کی وجہ سے تین حقوق حاصل ہیں۔ 8۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے دو پڑوسی ہیں میں ان میں سے کس کو ہدیہ بھیجوں۔ فرمایا جس کا دروازہ تمہارے قریب ترین ہو(2)۔ 9۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ قیامت کے دن سب سے پہلا جھگڑا جو اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوگا وہ دو پڑوسیوں کا ہوگا۔

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ: حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عورت ہے اور ان کے دوسرے مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد رفیق سفر ہے۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مطلق دوست ہے خواہ وہ سفر میں ہو یا حضر میں۔'' ابن

1۔ مسند احمد 32/5 2۔ مسند احمد 175/6

سبیل'' سے مراد مہمان ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ مہمان ہے جو دوران سفر کسی کے پاس ٹھہرا ہو۔ سورۂ برأت میں بھی ''ابن سبیل'' کا ذکر آئے گا۔

وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ: یہاں غلاموں کے بارے میں نصیحت کی جا رہی ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ کیونکہ غلام انتہائی بے بس ہوتا ہے اور اپنے آقا کے سامنے اس کی حیثیت قیدی کی سی ہوتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے وصال سے پہلے اپنی امت کو وصیت فرمائی کہ نماز اور غلاموں کا خوب خیال رکھنا۔ حضرت مقداد بن معد یکربؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو تو خود کھائے گا وہ تمہارے لیے صدقہ ہے اور جو تو اپنی بیوی اور غلام کو کھلائے گا وہ بھی تمہارے لیے صدقہ ہے(1)۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اپنے داروغہ سے پوچھا کیا تم نے غلاموں کو خوراک دے دی ہے۔ اس نے بتایا کہ نہیں۔ فرمایا جاؤ انہیں خوراک دو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی شخص کے لیے یہی گناہ کافی ہے کہ وہ ان کی خوراک روک لے جن کی خوراک کا وہ مالک ہے(2)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ غلام کو کھانا کھلاؤ، ان کو کپڑے پہناؤ اور اس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو(3)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب تم میں سے کسی کا غلام کھانا لے کر آئے اور اگر تم اسے اپنے ساتھ نہیں بٹھاتے تو تو کم از کم اسے ایک یا دو لقمے ہی دے دو کیونکہ اس نے اس کھانے کو تیار اور گرمی برداشت کرنے کی تکلیف اٹھائی ہے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائے اور اگر کھانا کم ہو تو اسے ایک دو لقمے دے دو۔ حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، یہ غلام بھی تمہارے بھائی ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ اور جس کا بھائی اس کے ماتحت ہوا اسے چاہیے کہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اسے سے کوئی ایسا کام نہ لے جو اسے عاجز کر دے، اور اگر اسے کوئی مشکل اور سخت کام سونپے تو اس میں اس کی مدد کرے(4)۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا: اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑا خیال کرے، خود پسند، متکبر اور لوگوں پر فخر کرتا ہوا اپنے آپ کو ان سے بہتر سمجھتا ہو۔ یعنی وہ شخص اپنے آپ کو تو بہتر سمجھتا ہے لیکن حقیقت میں اللہ کے نزدیک انتہائی حقیر اور لوگوں کی نگاہ میں مبغوض ہوتا ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ''مُخْتَالًا'' کا معنی متکبر ہے اور ''فَخُورًا'' کا معنی یہ ہے کہ جب وہ کسی کو عطا کرتا ہے تو اس پر فخر کرتا ہے لیکن خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔ ابو رجاء ھروی فرماتے ہیں کہ جو بھی شخص بد اخلاق ہوگا وہ متکبر اور خود پسند ہوگا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا کہ جو شخص اپنے والدین کا نافرمان ہوتا ہے وہ سرکش اور بد بخت ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ آیت کریمہ: وَّبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا (مریم: 32) ''ترجمہ: اور مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا اور مجھے جابر اور بد بخت نہیں بنایا''۔ حضرت مطرف فرماتے ہیں کہ مجھے ابو ذرؓ سے ایک حدیث پہنچی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں آپ سے ملاقات کر کے خود یہ حدیث سنوں۔ ایک دن ان سے میری ملاقات ہوگئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی طرف سے مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں کو پسند کرتا ہے اور تین کو ناپسند۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ سچ ہے۔ میں بھلا اپنے خلیل ﷺ پر کیسے بہتان باندھ سکتا ہوں۔ میں نے عرض کی کہ وہ تین شخص کون ہیں جس کو اللہ ناپسند کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا مختال اور فخور اور فرمایا کہ تم نے قرآن میں یہ آیت کریمہ نہیں پڑھی إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ...... ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے سے بچو کیونکہ یہ تکبر اور خود پسندی کی علامت

1۔ مسند احمد 131/4 2۔ مسلم، کتاب الزکاۃ: 292 3۔ مسلم، کتاب الایمان: 1284 4۔ فتح الباری، کتاب الایمان: 84/1

ہے جسے اللہ پسند نہیں کرتا۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾ وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَ مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

''جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں لوگوں کو بھی بخل کرنے کا اور چھپاتے ہیں جو عطا فرمایا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (وکرم) سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور روز قیامت پر اور وہ (بدقسمت) ہو جائے شیطان جس کا ساتھی پس وہ بہت برا ساتھی ہے۔ اور کیا نقصان ہوتا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور روز آخرت پر اور خرچ کرتے اس سے جو دیا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اللہ تعالیٰ ان سے خوب واقف ہے''۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ: یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جو بخل کرتے ہیں اور اپنے مال وہاں خرچ نہیں کرتے جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً ماں باپ کو عطا نہیں کرتے رشتہ داروں، یتیموں، غرباء، مساکین، پڑوسیوں، مسافروں اور اپنے غلاموں پر احسان نہیں کرتے وہ خود بھی اللہ کے حق کو ادا نہیں کرتے مزید برآں لوگوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بخل سے بڑھ کر کوئی بیماری نہیں۔ بخل سے بچو۔ تم سے پہلی قوموں کو بھی اس لیے تباہ و برباد کیا گیا کہ وہ صلہ رحمی نہیں کرتے تھے اور فسق و فجور پر ابھارتے تھے۔

وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: یعنی بخیل اللہ کی نعمتوں کو چھپاتا ہے، انہیں ظاہر نہیں کرتا یہ نعمتیں نہ اس کے کھانے پینے میں ظاہر ہوتی ہیں اور نہ ہی کسی کو عطا کرنے اور خرچ کرنے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿۸﴾ (العادیات: 8-6) اس آیت کریمہ میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو چھپاتے ہیں اس لیے انہیں دھمکی آمیز لہجے میں فرمایا: وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا یہاں کفر کا معنیٰ چھپانا ہے۔ کیونکہ بخیل اللہ کی نعمتوں کو چھپاتا اور پوشیدہ رکھتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کی نعمتوں کا منکر ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو نعمت عطا کرتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس کی نعمت کا اثر اس پر ظاہر ہو۔ نبی کریم ﷺ کی ایک دعا کے یہ الفاظ ہیں: ''اے اللہ ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر گزار بنا دے اور ان کی وجہ سے ہمیں مدح سرا اور ان نعمتوں کو قبول کرنے والا بنا دے اور ہم پر ان نعمتوں کی تکمیل فرما دے''۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان یہودیوں کے اس بخل کے بارے میں جو انہوں نے حضور ﷺ کی صفات چھپانے میں کیا۔ اس لیے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم نے کافروں کے لیے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بلاشبہ اس آیت کو یہود کے بخل پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں مال میں بخل کا بیان ہو رہا ہے البتہ علم میں بخل بھی اس میں بدرجہ اولیٰ داخل ہے۔ اس سے پہلے قریبی رشتہ داروں، غرباء و مساکین پر خرچ کرنے کا بیان ہوا اور اسی طرح اس کے بعد والی آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے مال اور ریاکاری کے طور پر خرچ کرتے ہیں یعنی ان کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ ان کے جود و سخا کی تعریف کریں، اللہ کی رضا ان کے پیش نظر نہیں

ہوتی۔ حدیث پاک میں ہے کہ تین قسم کے لوگوں پر سب سے پہلے جہنم کی آگ جلائی جائے گی۔ 1۔ ریا کار عالم 2۔ ریا کار نمازی، 3۔ ریا کار سخی۔ صاحب مال اللہ کی بارگاہ میں عرض کرے گا اے باری تعالیٰ! میں نے ہر محبوب چیز تیری بارگاہ میں خرچ کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم جھوٹ کہتے ہو، تمہارا تو یہ ارادہ تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں۔ اور دنیا نے تمہیں سخی مشہور کر دیا۔ یعنی تم نے دنیا میں ہی اپنی جزا وصول کر لی اور یہی تمہارا ارادہ تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے عدی بن حاتم سے فرمایا کہ تمہارے باپ نے سخاوت سے جو چاہا تھا اسے مل گیا۔ ایک دن آپ سے عبداللہ بن جدعان کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا اس کی سخاوت اور غلاموں کو آزاد کرنا اسے کوئی فائدہ دے گا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے ایک دن بھی اپنے رب سے یہ دعا نہیں مانگی کہ اے رب قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف کر دے۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر۔ یعنی شیطان نے انہیں اس فعل بد پر برانگیختہ کیا اور اللہ کی اطاعت سے پھیر دیا اور انہیں مختلف قسم کی امید دلا کر انہیں اپنا ہم نشیں بنا لیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

''اس شخص کے بارے میں نہ پوچھو بلکہ اس کے دوست کے بارے میں پوچھو کیونکہ ہر دوست اپنے دوست کا پیروکار ہوتا ہے''

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ: یعنی ان کو کیا نقصان ہوگا اگر وہ اللہ پر ایمان لا کر صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔ اور ریاء کو چھوڑ کر اخلاص کو اپنا لیں اور دار آخرت میں بہتر جزاء کے لیے اپنی امیدیں اللہ تعالیٰ سے وابستہ کر لیں اور اپنے مال کو ان امور پر خرچ کرے جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا: یعنی اللہ تعالیٰ اچھی اور بری نیت کو بخوبی جانتا ہے۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ کون اس کی توفیق کا مستحق ہے۔ پس وہ اسے توفیق عطا کرتا ہے، اس کی راہنمائی فرماتا ہے۔ اور اس سے ایسے اچھے کام لیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص اس کی بارگاہ عالی میں حاضر ہونے کا مستحق نہ ہو اسے اپنے دروازے سے دھتکار دیتا ہے۔ اور جسے وہ اپنے دروازے سے دور کر دے اس کی دنیا و آخرت تباہ ہو جاتی ہے۔ (اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝

''بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرا برابر بھی۔ (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دوگنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب!) ہم لے آئیں گے آپ کو ان سب پر گواہ اس روز تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ کاش! (انہیں دبا کر) ہموار کر دی جاتی ان پر زمین اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات''۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ: اللہ تعالیٰ ان آیات میں ارشاد فرماتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ اگر کسی کی نیکی رائی کے دانے کے برابر یا اس سے بھی کم ہوگی تو اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ بلکہ اسے دوگنا کر دے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَ

نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ...... (الانبیاء:47)'' ترجمہ: اور ہم قیامت کے دن صحیح تولنے والے ترازو رکھ دیں گے''۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس وصیت جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو فرمائی، کی خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے: يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ..... (لقمان:16)'' ترجمہ: پیارے فرزند! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر وزنی ہو خواہ وہ کسی چٹان میں ہو یا آسمان وزمین میں تو اللہ تعالیٰ اسے لے آئے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت باریک بین، ہر چیز سے باخبر ہے۔'' اسی طرح سورۂ زلزال میں ارشاد فرمایا: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ...... (الزلزال:7)'' ترجمہ: پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا'' اور شفاعت والی طویل حدیث میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ واپس جاؤ اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان دیکھو اسے جہنم سے نکال لاؤ۔ اس طرح بہت سی مخلوق جہنم سے آزاد ہو جائے گی۔ حضرت ابو سعید خدریؓ اس حدیث کو روایت کرتے ہوئے بیان فرماتے کہ اگر چاہو یہ آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ...... پڑھ لو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں قیامت کے دن اللہ کے کسی بندے یا بندی کو لایا جائے گا اور پکارنے والا تمام اہل محشر کو باآواز بلند کہے گا کہ یہ فلاں کا بیٹا یا بیٹی ہے۔ جس کسی کا کوئی حق اس کے ذمے ہو وہ آکر اس سے وصول کر لے۔ اس وقت حالت یہ ہوگی کہ عورت چاہے گی اس کا حق اس کے ماں باپ، یا بھائی یا شوہر پر ہوتا کہ وہ یہ حق ان سے وصول کر لے۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (مؤمنون:101)'' ترجمہ: کوئی رشتے داریاں نہیں رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے''۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں سے جو چاہے گا معاف فرما دے گا۔ لیکن حقوق العباد معاف نہیں فرمائے گا اور ارشاد فرمائے گا کہ لوگوں کو ان کے حقوق دو۔ بندہ عرض کرے گا اے باری تعالیٰ! دنیا ختم ہو چکی ہے میں ان کے حقوق کیسے ادا کروں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ اس کے نیک اعمال لو اور ہر صاحب حق کو اس کے مطابق دے دو۔ اب اگر وہ بندہ اللہ کا دوست ہوگا اور اس کی نیکیوں میں ذرہ برابر بھی نیکی بچ گئی تو اللہ تعالیٰ اسے بڑھا دے گا اور اس کے باعث اسے جنت میں داخل کر دے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ اور اگر وہ بندہ بدبخت ہوگا تو فرشتہ کہے گا اے پروردگار! اس کی نیکیاں تو ختم ہو گئی ہیں لیکن ابھی بہت سے حق دار ابھی باقی ہیں۔ ارشاد ہوگا ان کی برائیاں لو اور اس کی برائیوں کے ساتھ ملا کر دو پھر نار جہنم میں ڈال دو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (انعام:160)'' ترجمہ: اور جو کوئی ایک نیکی لائے گا اس کی مثل دس نیکیاں ہوں گا''۔ بدوؤں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک شخص نے عرض کی۔ پھر مہاجرین کو کیا اجر ملے گا تو آپ نے فرمایا کہ ان کو اس سے بھی افضل اجر ملے گا اور پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ حضرت سعید بن جبیر اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ نیکی کی وجہ سے مشرک کے عذاب میں کمی کر دی جائے گی لیکن وہ جہنم کے عذاب سے کبھی نہیں نکل سکے گا۔ اور اس کی تائید اس صحیح حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے چچا ابو طالب آپ کی مدد کرتے تھے اور لوگوں کی ایذا رسانیوں سے آپ کو محفوظ رکھتے تھے۔ کیا یہ چیز ان کو کوئی فائدہ دے گی۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جہنم کے سب سے ہلکے طبقے میں ہوں گے۔ اگر میرا تعلق ان سے نہ ہوتا تو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حکم صرف ابو طالب کے لیے خاص ہو اور دوسرے کفار اس کے حکم میں شامل نہ ہوں۔ کیونکہ مسند طیالسی میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی مومن کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا، دنیا میں رزق کی صورت میں اس کا بدلہ عطا فرماتا ہے اور آخرت میں ثواب کی صورت میں۔ مگر اپنی نیکیوں کا کافی صلہ دنیا میں ہی پالیتا ہے۔ جب کہ قیامت کے دن اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی۔

وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا: حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن بصری، قتادہ اور ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ ''اجر عظیم'' سے مراد جنت ہے۔ ہم بھی اس کے فضل و احسان کے وسیلہ سے جنت کا سوال کرتے ہیں۔ حضرت ابو عثمانؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ خبر پہنچی کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو ایک نیکی کے بدلے میں ایک لاکھ نیکیاں عطا فرمائے گا۔ ابو عثمان فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ حدیث سنی تو میں نے اہل بصرہ سے کہا کہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں تمہاری نسبت زیادہ رہا ہوں اور میں نے ان سے یہ حدیث نہیں سنی۔ پھر میں نے اس حدیث کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ میں مدینہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ حج پر تشریف لے گئے ہیں۔ یہ سن کر میں بھی ان کے پیچھے حج کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کی کہ اہل بصرہ آپ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ کیا آپ نے واقعی یہ حدیث بیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اے ابو عثمان! اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ کیا تم نے یہ آیت کریمہ نہیں پڑھی: مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا...... (بقرہ:245) ''ترجمہ: کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے اور اللہ تعالیٰ اس قرض کو کئی گناہ بڑھا دے''۔ اور ایک اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا قَلِيْلٌ (توبہ:38) ''ترجمہ: سو نہیں ہے سروسامان دنیاوی زندگی، آخرت میں مگر قلیل''۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کو بڑھا کر دو لاکھ بنا دے گا یہ حدیث اگرچہ غریب ہے مگر دوسری اسناد سے بھی مروی ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کی ہولناکی اور شدت کو بیان فرمایا ہے کہ اس دن کیا حالت ہوگی جس دن ہر نبی اپنی امت کے متعلق گواہی دے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا...... ''ترجمہ: جگمگا اٹھے گی زمین اپنے رب کے نور سے، اور رکھ دیا جائے گا دفتر عمل، اور حاضر کیے جائیں گے انبیاء اور (دوسرے) گواہ'' اور اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ''ترجمہ: اور قیامت کے دن اٹھائیں ہر امت پر ایک گواہ ان پر انہی میں سے''۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں پڑھ کر کیا سناؤں حالانکہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے۔ فرمایا ہاں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے سے قرآن پاک سنوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سورۂ نساء سے تلاوت شروع کی اور جب میں آیت ''فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا'' پر پہنچا تو فرمایا بس کرو۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے (1)۔ حضرت محمد بن فضالہ انصاری اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ قبیلہ بنوظفر میں تشریف لائے اور آپ اس چٹان پر بیٹھ گئے جو آج بھی بنوظفر کے محلّہ میں موجود ہے۔ آپ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور معاذ بن جبلؓ اور دیگر صحابہ بھی تھے۔ آپ نے ایک قاری کو حکم فرمایا کہ قرآن پڑھو۔ انہوں نے تلاوت شروع کی اور جب وہ اس آیت کریمہ ''فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا'' پر پہنچے تو آپ اس قدر روئے کہ آپ کے دونوں رخسار اور ڈاڑھی مبارک تر ہو گئے اور عرض کرنے لگے اے پروردگا! جو لوگ میرے سامنے موجود ہیں ان پر تو میں گواہی دوں گا اور جن کو میں نے دیکھا نہیں ان پر گواہی کیسے ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک میں ان میں سے ہوں میں ان پر گواہ ہوں۔ اور جب تو مجھے اٹھا لے گا تو تو ہی ان پر نگہبان ہوگا۔ امام ابوعبداللہ القرطبی نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں ایک باب باندھا ہے جس میں انہوں نے حضور ﷺ کی امت پر شہادت کو بیان کیا ہے۔ آپ سعید بن مسیب سے روایت کرتے ہیں کہ ہر روز امت کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، 94/9

حضور ﷺ پر پیش کیا جاتا ہے۔ آپ ان کے اسماء اور اعمال کو جانتے ہیں اس لیے قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے۔ پھر انہوں نے یہی آیت کریمہ تلاوت کی(1)۔ یہ اگرچہ حضرت سعید بن مسیبؒ کا قول ہے اور اس کی سند میں انقطاع بھی ہے۔ لیکن امام قرطبی نے اسے قبول کیا ہے۔ اسے بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ہر پیر اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ پر، اور جمعہ کو انبیاء اور والدین پر لوگوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں تعارض نہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ہمارے نبی کی خصوصیت کی وجہ سے ہر روز ان کی امت کے اعمال ان پر پیش کیے جاتے ہوں اور جمعہ کو دیگر انبیاء کے ساتھ بھی پیش کیے جاتے ہوں۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرنے والے قیامت کے دن آرزو کریں کہ کاش یہ زمین پھٹ جائے اور ان کو نگل جائے۔ اور یہ اس وقت کہیں گے جب رسوائی اور ذلت میں گرفتار ہوں گے اور ان کو زجر و توبیخ کی جائے گی۔ ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ...... ''ترجمہ: اس دن دیکھ لے گا ہر شخص ان اعمال کو جو اس نے آگے بھیجے تھے اور کافر کہے گا کاش میں خاک ہوتا۔''

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا: یہاں بیان کیا گیا ہے کہ کافر اس دن اپنی تمام بداعمالیوں کا اقرار کر لیں گے اور کوئی چیز بھی نہ چھپا سکیں۔ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ قرآن پاک میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ مشرکین قیامت کے دن کہیں گے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ(انعام:23) ''ترجمہ: ہمارے رب اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔'' دوسری جگہ ارشاد ہے: لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ان دونوں آیات کا کیا مفہوم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی آیت کا تعلق اس وقت کے ساتھ ہے جب وہ اہل اسلام کو جنت میں داخل ہوتا دیکھیں گے تو وہ کہیں گے آؤ ہم بھی شرک کا انکار کرتے ہیں تو اس وقت کہیں گے ہم مشرک نہیں تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں بولنے لگیں گے تو اب وہ اللہ کے سامنے کوئی چیز چھپا نہ سکیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کی کہ قرآن پاک میں بعض ایسی چیزیں ہیں جن میں مجھے اختلاف نظر آتا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تمہیں قرآن کے بارے میں شک ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ لیکن مجھے ظاہری طور پر تعارض نظر آتا ہے۔ اس نے یہی دو آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ تو آپ نے ان کا مفہوم اسے سمجھایا اور ان دونوں آیات کے درمیان تطبیق بیان کی۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ اس سائل کا نام نافع بن ازرق تھا۔ اور آپ نے اسے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تم کسی محفل سے آ رہے ہو۔ اور تم نے اپنے ساتھیوں کو کہا ہوگا کہ میں ابن عباسؓ سے قرآن کی متشابہ آیات کے متعلق سوال کروں گا۔ پس اب اگر تم واپس ان کے پاس جاؤ تو انہیں بھی یہ سمجھا دینا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝

''اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جب کہ تم نشہ کی حالت میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو (زبان سے) کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں مگر یہ کہ تم سفر کر رہے ہو یہاں تک کہ تم غسل کر لو اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں

1۔ التذکرہ فی احوال الموتی:294

سے قضائے حاجت سے یا ہاتھ لگایا ہو تم نے (اپنی) عورتوں کو پھر نہ پاؤ تم پانی تو (اس صورت میں) تیمّم کر لو پاک مٹی سے اور (اس کا طریقہ یہ ہے کہ) ہاتھ پھیر و اپنے چہروں پر اور اپنے بازوؤں پر بے شک اللہ معاف فرمانے والا ہے بڑا بخشنے والا ہے''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں نمازی کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اور اس طرح جنبی کو مسجد میں آنے سے منع کیا ہے۔ مگر ایسا شخص کسی ضروری کام کی وجہ سے ٹھہرے بغیر ایک دروازے سے دوسرے دروازے کی طرف سے نکل جائے تو اس کا گزرنا جائز ہے۔ اور نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانے کا حکم شراب کی حرمت سے پہلے کا تھا۔ جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے۔ جس کو ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ...... (بقرہ:219) کی تفسیر کے تحت ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت حضرت عمرؓ کے سامنے تلاوت فرمائی تو انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے بارے میں کوئی واضح حکم نازل فرما اور جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کو تلاوت فرمائی تو انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں یہی دعا کی۔ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں نے نماز کے اوقات میں شراب کو ترک کر دیا تھا حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ...... ''اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور بت اور جوا کے تیر سب ناپاک ہیں۔ شیطان کی کارستانیاں ہیں۔ سو بچو ان سے تا کہ تم فلاح پا جاؤ...... کیا تم باز آنے والے ہو۔'' یہ آیت کریمہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کی اے باری تعالیٰ ہم اس سے باز آ گئے، ہم اس سے باز آ گئے۔ ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ جب سورۂ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی رسول اللہ نے ایک شخص کو مقرر فرما دیا جو نماز کے وقت اعلان کرتا کہ کوئی نشہ کی حالت میں نماز کے لیے نہ آئے۔ حضرت سعدؓ فرماتے ہیں کہ میرے بارے میں چار آیات نازل ہوئیں۔ ایک دفعہ ایک انصاری صحابی نے کھانے کا اہتمام کیا اور مہاجرین و انصار میں سے کچھ صحابہ کو دعوت دی۔ ہم نے خوب کھایا پیا اور شراب پی حتیٰ کہ مخمور ہو گئے۔ پھر ہم اپنے مفاخر بیان کرنے لگے۔ ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی پکڑی اور اس کو حضرت سعدؓ کی ناک پر دے مارا جس سے آپ کی ناک پر نشان پڑ گیا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ اسلام نے شراب کو ابھی حرام نہیں کیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ امام مسلمؒ نے اس حدیث کو تفصیلاً اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لیے کھانے کا اہتمام کیا اور ہمیں دعوت دی۔ کھانے کے بعد انہوں نے ہمیں خوب شراب پلائی۔ شراب کی وجہ سے ہم بیخود ہو گئے۔ اس اثناء میں نماز کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے ایک شخص کو امام بنایا اس نے نماز میں سورۂ کافرون اس طرح پڑھی: قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَ نَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ تفسیر ابن جریر میں ہے کہ حضرت علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایک اور شخص نے مل کر شراب پی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کو نماز پڑھائی اور سورۂ کافرون کو خلط ملط کر کے پڑھا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے اور ابن جریر کی روایت میں ہے کہ نماز پڑھانے والے حضرت علیؓ تھے۔ نشہ کی حالت میں وہ قرآن پاک کو صحیح طریقہ سے نہ پڑھ سکے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ نماز پڑھانے والے حضرت عبدالرحمٰن ہی تھے۔ اور انہوں نے سورت اس طرح پڑھی: قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ وَ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(2)۔

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب التفسیر: 157/11 2۔ تفسیر الطبری: 95/5

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لوگ نماز کے اوقات میں شراب پینے سے اجتناب کرتے تھے۔ پھر شراب کی حرمت کا قطعی حکم نازل ہوا۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں شراب کا نشہ مراد نہیں بلکہ نیند کا خمار مراد ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ اس سے مراد شرابی کا نشہ ہے۔ اور یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو نشہ کی حالت میں ہوں۔ لیکن یہ نشہ اتنا نہ ہو کہ جس کی وجہ سے وہ احکام شرع نہ سمجھ سکتے ہوں کیونکہ ایسے نشے والا شخص مجنون کے حکم میں ہوتا ہے۔ اصولیین کے نزدیک بھی یہ خطاب اسی شخص کو ہے جو کلام کو سمجھتا ہو۔ نہ کہ ایسے کو جو نشہ میں مخمور ہو جو یہ نہ سمجھتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیونکہ خطاب کو سمجھنا ہی کسی کو مکلّف بنانے کی شرط ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں کنایۃً کلی طور پر شراب سے اجتناب کرنے کا حکم ہو۔ کیونکہ مسلمان کو دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور شراب ان نمازوں کو ان کے صحیح اوقات میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح اس آیت کا معنی اس آیت کی طرح ہو جائے گا جس میں ارشاد فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ یعنی اس آیت میں ان کو اسلام کی حالت میں مرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی حکم ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیشہ اللہ کی اطاعت میں لگے رہو کسی شخص کے نشہ میں ہونے کی حد یہ ہے کہ وہ اپنی بات نہ سمجھ سکتا ہو۔ کیونکہ نشے میں مخمور شخص قرآن پاک کی قرأت صحیح طریقے سے نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس میں فکر و تدبر کر سکتا ہے اور اس حالت میں خشوع خضوع بھی پیدا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو نماز کی حالت میں اونگھ آ جائے وہ جائے اور سو جائے حتیٰ کہ جب اسے معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تب نماز پڑھے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ نیند کی حالت میں استغفار کرنا چاہتا ہو اور اس کے منہ سے غلط الفاظ نکل جائیں۔

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ: حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں داخل نہ ہو جب تک کہ غسل نہ کر لے۔ ہاں مسجد میں ٹھہرے بغیر اگر گزرنا چاہتے ہو تو اس کی اجازت ہے۔ حضرت یزید بن ابی حبیب فرماتے ہیں کچھ انصاری صحابہ کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔ اور جب وہ جنابت کی حالت میں ہوتے تو پانی لینے کے لیے انہیں مسجد سے گزرنا پڑتا تھا۔ پھر ان کے لیے یہ رخصت نازل ہوئی۔ صحیح بخاری کی روایت بھی حضرت یزید بن ابی حبیب کے قول کی تائید کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکر کے دروازے کے سوا باقی تمام کے دروازے بند کر دو۔ یہ ارشاد آپ نے اپنی ظاہری زندگی کے آخری ایام میں فرمایا۔ کیونکہ آپ کے علم میں تھا کہ آپ کے بعد ان کے ابوبکر جانشین ہونگے اور انہیں ہر وقت بکثرت مسجد میں آنے کی ضرورت ہوگی تا کہ مسلمانوں کے اہم امور کا فیصلہ کر سکیں۔ اس لیے آپ نے مسجد میں کھلنے والے تمام دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا اور حضرت ابوبکر کا باقی رہنے دیا(1)۔ بعض کتب حدیث میں حضرت ابوبکر کی جگہ حضرت علی کا نام ہے لیکن وہ خطاء ہے اور صحیح وہی ہے جس کا ذکر بخاری شریف میں ہے۔ اس آیت کریمہ سے اکثر آئمہ نے استدلال کیا ہے کہ جنبی کا مسجد میں ٹھہرنا حرام ہے مگر گزرنا جائز ہے۔ یہی حکم حیض اور نفاس والی عورت کا ہے۔ مگر بعض علماء نے ان کے مسجد میں گزرنے کو بھی منع فرمایا ہے۔ کیونکہ ان سے مسجد کے آلودہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اگر مسجد کے آلودہ ہونے کا خدشہ نہ ہو تو گزرنا جائز ہے وگرنہ حرام ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو حکم فرمایا کہ مسجد سے چٹائی لا کر مجھے دو۔ انہوں نے عرض کی کہ میں حالت حیض میں ہوں۔ آپ نے فرمایا تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت کا مسجد میں گزرنا جائز ہے اور نفاس والی کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت عائشہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں حائضہ عورت اور جنبی کے لیے مسجد کو حلال نہیں کرتا۔ ابو مسلم خطابی فرماتے ہیں کہ محدثین کی

1۔ فتح الباری، کتاب الصلوٰۃ 1: 558

ایک جماعت نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس میں افلت نامی راوی مجہول ہے۔ ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور ان کی سند میں افلت کی جگہ محدوج ذہلی کا ذکر ہے۔ اور یہ حدیث ام سلمہؓ سے مروی ہے۔ لیکن امام ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ یہ حدیث بھی حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے علی! میرے اور تیرے علاوہ اس مسجد میں جنبی ہونا کسی اور کے لیے حلال نہیں (1)۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے، اس کا ایک راوی ''سالم'' متروک ہے۔ اور ان کے شیخ عطیہ بن ضعیف ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں کوئی شخص نماز کے قریب نہ جائے مگر مسافر اگر جنبی ہو جائے اور اسے پانی نہ ملے تو وہ پانی نہ ملنے تک اسی حالت میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیر اور ضحاکؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن کثیر فرماتے ہیں کہ ہم سنا کرتے تھے کہ یہ حکم سفر کے لیے ہے اس کی تائید وہ حدیث پاک بھی کرتی ہے جو حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ پاک مٹی مسلمان کے لیے طہارت ہے اگر اسے دس سال تک پانی نہ ملے۔ اور جب تو پانی پائے تو اس کا استعمال کر۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ ان دونوں قولوں میں سے پہلا قول ہی اولیٰ ہے یعنی حالت جنابت میں ضرورۃً مسجد سے گزرنا جائز ہے۔ کیونکہ مسافر اگر حالت سفر میں جنبی ہو جائے اور وہ پانی نہ پائے تو اس کا واضح حکم آگے بیان کر دیا جائے گا۔ عابر کا معنی راستے سے گزرنے والا ہے۔ اس کا مصدر عَبْرٌ اور عُبُوْرٌ آتا ہے۔ اور جب کوئی کسی نہر کو پار کرے تو اس وقت کہتے ہیں عَبَرَ نَهْرًا فُلَانٌ۔ اسی طرح وہ اونٹنی جو اپنی قوت اور ہمت کی بنا پر طویل سفر طے کرنے پر قادر ہو اسے عبر الاسفار کہتے ہیں۔ امام ابن جریرؒ نے اس قول کی تائید کی ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے اور آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی یہی واضح ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس ناقص حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے جو مقصود نماز کے خلاف ہو۔ اسی طرح نماز کے محل یعنی مسجد سے بھی ناقص حالت میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے۔ یعنی حالت جنابت میں جو کہ نماز اور مسجد کی پاکیزگی کے خلاف ہے۔

حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا: یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ کی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ حالت جنابت میں مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں یہاں تک کہ غسل کر لے یا پانی کی عدم موجودگی میں تیمّم کر لے۔ اس طرح اگر پانی تو موجود ہے لیکن وہ شخص جو کسی عذر کے باعث پانی کے استعمال پر قادر نہیں ہے وہ بھی تیمّم کر سکتا ہے۔ لیکن امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جنبی جب وضو کر لے تو اس کا مسجد میں ٹھہرنا جائز ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ حضرت عطاء ابن یسار فرماتے ہیں میں نے کئی صحابہ کرام کو دیکھا ہے کہ وہ حالت جنابت میں وضو کر کے مسجد میں بیٹھے رہتے تھے۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: وہ مرض جس سے تیمّم جائز ہو جاتا ہے۔ مرض سے مراد وہ مرض ہے جس میں پانی کے استعمال سے یا تو عضو کے ضائع یا خراب ہونے کا خطرہ ہو، یا اس کے بڑھنے کا خدشہ ہو۔ بعض علماء نے ہر قسم کی بیماری میں تیمّم کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی بیمار تھے۔ نقاہت کی وجہ سے وضو کے لیے نہ اٹھ سکے اور نہ ہی ان کا کوئی خادم تھا جو انہیں پانی پکڑاتا۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ یہ روایت مرسل ہے۔ سفر میں بھی تیمّم کی اجازت ہے، سفر خواہ لمبا ہو یا چھوٹا۔ غائط سے مراد نرم اور پست زمین ہے اور کنایۃً اس سے پیشاب اور پاخانہ مراد ہے۔

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ: اسے لَمَسْتُمْ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کرام اور فقہاء کرام کے دو قول ہیں۔ 1۔ اس سے مراد

1۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب المناقب 74/13

مباشرت ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ: وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ...... "ترجمہ: اور اگر تم مباشرت سے پہلے طلاق دو اور مہر مقرر کر چکے تھے تو نصف مہر ادا کرو"۔ میں یہی معنی مراد ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ...... "ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو تو پھر انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم ان سے مجامعت کرو پس تمہارے لیے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو۔" حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے کہ اس کا معنی جماع ہے۔ اور اس طرح حضرت علیؓ اور ابی بن کعبؓ امام مجاہد، طاؤس، حسن بصریؒ اور بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اس لفظ کے بارے میں بحث چل نکلی۔ بعض موالی نے کہا کہ اس سے مراد جماع نہیں اور بعض عربوں نے کہا کہ اس سے مراد جماع ہے۔ میری ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ تم کس گروہ کے ساتھ تھے۔ میں نے کہا کہ میں موالی کے ساتھ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تو مغلوب ہو گئے کیونکہ لمس، مس اور مباشرت سب کا معنی جماع ہے۔ اور یہاں یہ لفظ جماع کے لیے کنایۃً استعمال ہوا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ملامست کا معنی جماع ہے لیکن اللہ انتہائی کریم ہے اس لیے صراحۃً ذکر کرنے کی بجائے کنایۃً ذکر کرتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد مطلق مس کرنا یعنی چھونا لیا ہے۔ خواہ کسی عورت کو ہاتھ کے ساتھ چھوئے یا جسم کے کسی اور حصے سے تو اس پر وضو واجب ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ لمس سے مراد جماع سے کمتر چیز نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ بوسہ بھی لمس میں داخل ہے اور اس سے بھی وضو واجب ہو جاتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت کے ساتھ معانقہ کرنے، اسے ہاتھ سے چھونے اور اس کا بوسہ لینے سے وضو ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ بھی عورت کا بوسہ لینے کے بعد وضو کے قائل تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ بھی لمس میں شامل ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ مرد کا عورت سے بوس و کنار کرنا، اور اسے ہاتھ سے چھونا ملامست میں داخل ہے۔ اس لیے جو مرد اپنی بیوی کا بوسہ لے اور اسے اپنے ہاتھ سے چھوئے اس پر وضو کرنا لازمی ہے۔ لیکن آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے وضو کی حالت میں اپنی زوجہ کا بوسہ لیا اور اسی وضو کے ساتھ نماز پڑھی۔ نیا وضو نہ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سلسلہ میں آپ سے دو روایتیں ہیں۔ اگر ان دونوں روایتوں کو صحیح مان لیا جائے تو وضو والی روایت کو استحباب پر محمول کیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ عورت کو مطلق چھونے سے وضو کے قائل امام شافعی اور ان کے اصحاب، اور امام مالک ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ اور وہ اپنے مذہب کی تائید میں کہتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں "لٰمَسْتُمُ اور لَمَسْتُمُ" دو قرأتیں ہیں۔ اور قرآن پاک میں لمس کا لفظ ہاتھ سے چھونے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ (انعام: 7)۔ اور اگر ہم اتارتے آپ پر کتاب کاغذ پر اور وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے۔ اسی طرح حضرت ماعز اسلمی نے جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے اقرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ شاید تم نے اس کا بوسہ لیا، یا ہاتھ سے چھوا ہو یعنی آپ نے لمست کا لفظ استعمال کیا جس کا معنی ہاتھ سے چھونا ہے۔ اسی طرح حدیث پاک میں ہے وَالْيَدُ زِنَاهَا اللَّمْسُ: ہاتھ کا زنا چھونا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کوئی دن ایسا گزرتا نہ جس میں رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لاتے اور بوسہ نہ لیتے۔ اور اپنے دست مبارک سے نہ چھوتے۔ اسی طرح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع ملامست سے منع فرمایا ہے اور اس میں ہاتھ سے چھونا مراد ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لغت میں لمس کے لفظ کا اطلاق جس طرح ہاتھ کے چھونے پر کیا جاتا ہے اسی طرح جماع پر کیا جاتا ہے۔ کسی شاعر کا قول ہے:

ع وَلَمَسْتُ كَفِّيْ اَطْلُبُ الْغِنَا

''ترجمہ: میں نے اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ کے ساتھ ملا دیا کیونکہ میں غناء کا طالب تھا۔''

اسی طرح انہوں نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بھی استدلال کیا ہے۔ آپ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کی یا رسول اللہ اس شخص کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے جو کسی اجنبی عورت سے ملا اور اس نے اس عورت کے ساتھ سوائے جماع کے تمام وہ کیا جو میاں بیوی آپس میں کرتے ہیں پس اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ؕ ''ترجمہ: نماز قائم کیجئے دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات کے حصوں میں۔ بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے''۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ ﷺ اس آدمی کو فرمایا وضو کرو اور نماز پڑھو۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کی کیا یہ حکم اسی کے لیے خاص ہے یا سب مومنون کے لیے عام ہے۔ آپ نے فرمایا یہ حکم سب مومنوں کے لیے عام ہے(1)۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے زائدہ سے روایت کیا ہے لیکن اس کی سند متصل نہیں۔ امام نسائی نے اسے ابن ابی لیلیٰ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ان حضرات نے اس حدیث پاک سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو وضو کا حکم اس لیے دیا تھا کیونکہ اس نے عورت کو صرف چھوا تھا، جماع نہیں کیا تھا۔ اس حدیث کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اول تو یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ ابن ابی لیلیٰ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کے درمیان ملاقات ہی ثابت نہیں۔ دوسرا یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے اسے فرض نماز کا حکم فرمایا ہو جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ سے بھی مروی حدیث میں ہے کہ جو شخص بھی کوئی گناہ کرتا ہے اور پھر وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ یہ حدیث سورۂ آل عمران کی آیت: ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ (عمران:135) کی تفسیر کے تحت گزر چکی ہے۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں ان دونوں قوموں میں سے پہلا قول احسن ہے یعنی جن لوگوں نے یہاں لمس سے مراد جماع لیا ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کا بوسہ لیا اور تجدید وضو کے بغیر ہی نماز پڑھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وضو فرماتے پھر بوسہ لیتے پھر نماز ادا فرماتے اور وضو کا اعادہ نہ کرتے۔ آپ سے ہی مروی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کا بوسہ لیا اور پھر وضو کا اعادہ کیے بغیر ہی نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ راوی حدیث حضرت عروہ عرض کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ وہ زوجہ محترمہ آپ ہی ہیں تو آپ مسکرا دیں(2)۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے لیکن اس حدیث کی دوسری بھی اسناد ہیں۔ اور اس حدیث کو حضرت عائشہؓ سے روایت کرنے والے حضرت عروہ بن زبیرؓ ہیں۔ ابن جریر کی روایت میں ہے کہ سیدہ عائشہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وضو کے بعد میرا بوسہ لیا کرتے تھے اور ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں ان کا بوسہ لیتے تھے۔ اس سے نہ آپ کا روزہ ٹوٹتا اور نہ آپ وضو کا اعادہ فرماتے۔ حضرت زینب سہمیہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بوسہ لیتے اور پھر وضو کے اعادہ کے بغیر نماز پڑھ لیتے(3)۔

فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا: اس آیت کریمہ سے بہت سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ جس شخص کو پانی نہ ملے اس کے لئے تیمم جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ پانی کو تلاش نہ کرلے اور اگر اس نے پانی کو تلاش کیا اور اس کو پانی نہ ملا تو اس وقت اس کے لیے تیمم جائز ہوگا۔ کتب فقہ میں پانی کو تلاش کرنے کی کیفیت بھی ذکر کی گئی ہے۔ حضرت عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ایک کونے میں بیٹھے ہوئے دیکھا جس نے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی کیا تم مومن نہیں ہو۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ! میں مومن ہوں۔ لیکن حالت جنابت میں ہوں اور پانی بھی موجود

1۔ مسند احمد 244/5 | 2۔ تفسیر الطبری 105/5 | 3۔ تفسیر الطبری 105/5

نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایسی صورت میں تیرے لیے مٹی کافی ہے تیمّم کا لغوی معنی قصد کرنا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں تَيَمَّمَكَ اللّٰهُ بِحِفْظِهٖ اللہ اپنی حفاظت کے ساتھ تیرا قصد کرے۔ اسی طرح امراء القیس کے اس قول "تَيَمَّمَتُ الْعَيْنَ" میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ صعید زمین کے ظاہری حصے کو کہتے ہیں۔ اس میں مٹی، ریت، درخت، پتھر اور گھاس وغیرہ سب شامل ہیں۔ اور یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو مٹی کے جنس سے ہو جیسے ریت، ہڑتال، چونا وغیرہ۔ اور یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے اس سے مراد صرف مٹی ہے اور یہ امام شافعی اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ اور ان کی دلیل یہ آیت کریمہ: فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ہے اور اس مراد نرم چکنی مٹی ہے۔ اور ان کی دوسری دلیل حضرت حذیفہ بن یمانؓ کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں تمام لوگوں پر تین اعتبار سے فضیلت دی گئی ہے۔ 1۔ ہماری نماز کی صفوں کو فرشتوں کی صفوں کی طرح بنا دیا ہے۔ 2۔ تمام روئے زمین ہمارے لیے مسجد بنا دیا گیا ہے۔ 3۔ پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی کو ہمارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک میں مقام فضیلت میں مٹی کو خاص کر دیا ہے۔ اگر کوئی دوسری چیز اس کے قائم مقام ہوتی تو اسے بھی یہاں بیان کر دیا جاتا اور یہاں "طیباً" سے مراد حلال ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ مٹی جو پاک ہو۔ جیسا کہ ابو ذرؓ نے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پاک مٹی مسلمان کے لیے طہارت و پاکیزگی ہے خواہ وہ دس سال تک پانی نہ پائے۔ لیکن جب پانی اس کو ملے تو اسے استعمال کرلے اور یہی اس کے لیے بہتر ہے(1)۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ پاک کھیت کی مٹی ہے۔

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ: تیمّم پاکیزگی میں وضو کا بدل ہے۔ نہ کہ تمام اعضاء پر مسح کرنے کا بدل ہے۔ بلکہ صرف چہرے دونوں ہاتھوں پر مسح کرنا ہی کافی ہے۔ اسی پر اجماع ہے۔ لیکن تیمّم کی کیفیت میں ائمہ کرام کے بہت سے قول ہیں۔ امام شافعی کا جدید مذہب یہ ہے کہ چہرے اور دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ "يَدَيْنِ" کا اطلاق کندھوں تک بھی ہوتا ہے اور کہنیوں تک بھی ہوتا ہے جیسا کہ آیت وضو میں ہے اور اس کا اطلاق کلائی تک بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ چور کی حد کے بارے میں ارشاد فرمایا فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (المائدہ:38) فرماتے ہیں کہ تیمّم کی آیت میں "ید" کا لفظ مطلق ہے اور آیت وضو میں مقید (کہنیوں تک) ہے۔ اس لیے مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔ کیونکہ دونوں میں وصف طہوریت پایا جاتا ہے اور بعض لوگ اس کی دلیل میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تیمّم کی دو ضربیں ہیں۔ ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری کہنیوں تک۔ لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں ضعف ہے جس کی وجہ سے یہ حدیث ثابت نہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک زمین پر مارے اور ان کے ساتھ چہرے کا مسح کیا اور پھر دوبارہ مارا اور ان کا اپنے ہاتھوں پر مسح کیا(2)۔ اس کی سند میں بھی محمد بن ثابت العبدی ہیں جن کو بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس حدیث کو بعض دوسرے ثقہ راویوں نے بھی روایت کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اسے عبداللہ بن عمرؓ کے فعل پر موقوف ہے۔ امام بخاری، ابوزرعہ اور ابن عربی فرماتے ہیں کہ یہی صحیح ہے۔ یعنی یہ حدیث موقوف ہے نہ مقطوع۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو مرفوع کرنا منکر ہے۔ امام شافعیؒ کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو حضرت صمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تیمّم اس طرح کیا کہ اپنے چہرے مبارک اور اپنے دونوں بازوؤں پر مسح کیا۔ ابوجہیم روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بول کرتے ہوئے دیکھا اور اسی حالت میں سلام کیا، آپ نے جواب نہ دیا فارغ ہو کر آپ دیوار کے پاس گئے اور اپنے دونوں ہاتھ اس پر مارے اور ان کے ساتھ چہرے مسح کیا اور پھر دوبارہ دیوار پر ہاتھ مار کر ہاتھوں کا

1۔ الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان: 304,303/2   2۔ سنن ابی داؤد، کتاب التیمم: 90/1

مسح کیا اور پھر میرے سلام کا جواب دیا۔ امام شافعیؒ کا قدیم مذہب یہ ہے کہ چہرے اور کلائیوں تک ہاتھوں کا دو ضربوں سے مسح کرنا واجب ہے۔ ایک تیسرا قول یہ ہے کہ ایک ضرب کے ساتھ چہرے اور کلائیوں کا مسح کرنا کافی ہے۔ ایک شخص حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اگر میں جنبی ہو جاؤں اور پانی نہ پاؤں تو کیا کروں۔ آپ نے فرمایا کہ نماز نہ پڑھو۔ مجلس میں حضرت عمارؓ موجود تھے۔ انہوں نے عرض کی یا امیر المومنین کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں اور آپ ایک لشکر میں تھے اور ہم جنبی ہو گئے ہمیں پانی نہ ملا۔ لیکن میں مٹی میں لوٹ پوٹ ہوا اور نماز پڑھ لی۔ پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے سن کر فرمایا تمہیں اتنا ہی کافی تھا پھر نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو جھاڑ کر اپنے چہرے اور ہاتھوں (کلائیوں تک) کا مسح کر لیا۔ حضرت عمارؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تیمّم میں صرف ایک ہی ضرب ہوتی ہے۔ یعنی ایک دفعہ ہاتھ زمین پر مار کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرلے(1)۔ حضرت شقیقؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ابو یعلی نے حضرت عبداللہؓ سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص پانی نہ پائے تو کیا وہ نماز نہیں پڑھے گا تو حضرت عبداللہ نے فرمایا کیا تم کو یاد نہیں کہ جب آپ کو اور مجھے رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کے لیے بھیجا اسی دوران میں جنبی ہو گیا تھا تو میں نے زمین پر لوٹ پوٹ کر نماز پڑھ لی۔ واپس اسی واقعہ کی حضور ﷺ کو خبر دی تو حضور ﷺ مسکرا دیے اور فرمایا کہ تمہارے لیے اتنا کرنا ہی کافی تھا۔ اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا اور پہلے دونوں ہاتھوں کا کلائیوں تک مسح کیا اور پھر اسی ضرب کے ساتھ چہرے کا مسح کیا۔ پھر حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ مطمئن نہیں ہوئے۔ یہ سن کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا پھر تمہارا سورۂ نساء کی اس آیت کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر پانی نہ پاؤ تو مٹی کے ساتھ تیمّم کرو۔ حضرت عبداللہ اس کا جواب نہ دے سکے اور فرمانے لگے کہ اگر ہم نے انہیں تیمّم کے لیے رخصت دی ہے تو ممکن ہے کہ جس کو پانی ذرا ٹھنڈا محسوس ہو وہ بھی تیمّم کرنے لگے۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد فرمایا: فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ (یعنی) ''ترجمہ: مسح کرلو اپنے چہرے اور بازوؤں کا اس سے''۔ اس آیت کریمہ سے امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ تیمّم ایسی پاک مٹی سے ہونا چاہیے جس پر غبار ہو تاکہ ہاتھوں اور چہرے پر کچھ غبار لگ جائے۔ اس سے پہلے ابن صمہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ انہوں نے آیت پیشاب میں نبی کریم ﷺ کو سلام کیا لیکن انہوں نے جواب نہ دیا اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ دیوار کے پاس گئے اپنی چھڑی سے دیوار کو کھرچ کر اس سے تیمّم کیا۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ: یعنی اللہ تعالیٰ دین کے معاملے میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تمہیں پاک اور صاف کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے پانی کی عدم دستیابی میں تمہارے لیے پاک مٹی سے تیمّم کرنا مباح قرار دیا۔ تیمّم تمہارے لیے بہت بڑی نعمت ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ اور یہ نعمت صرف امت محمدیہ کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئیں۔ 1۔ ایک مہینے کی مسافت تک میری مدد کی۔ 2۔ زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک کرنے والا بنا دیا گیا۔ میرے جس امتی کو جہاں نماز کا وقت ہو جائے وہیں پڑھ لے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کے پاس ہی مسجد اور وضو ہوتا ہے۔ 3۔ میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں تھا۔ 4۔ مجھے شفاعت دی گئی۔ 5۔ پہلے نبی کو ایک قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا لیکن مجھے تمام لوگوں کے لیے مبعوث کیا گیا(2)۔ اور مسلم کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ جس میں ارشاد فرمایا کہ مجھے لوگوں پر تین چیزوں سے فضیلت دی گئی ہے۔ ہماری نماز کی صفوں کو فرشتوں کی

1۔ مسند احمد: 265/4   2۔ فتح الباری، کتاب التیمم: 436,435/1

صفوں کی طرح بنایا گیا ہے۔ زمین کو ہمارے لیے مسجد بنا دیا گیا اور ہم پانی نہ پائیں تو اس کی مٹی ہمارے لیے باعث پاکیزگی ہوتی ہے۔ اور اس آیت کریمہ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ اپنے چہرے اور اپنے ہاتھوں کا مسح کرلو، بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔ یہ بھی اس کے عفو درگزر کا حصہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تیمم کو مشروع کیا۔ اور اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تمہارے لیے اس کے ساتھ نماز مباح قرار دیا۔ اور یہ سب تمہیں آسانی پہچانے اور رخصت عطا کرنے کے لیے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ناقص حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔ یعنی نشے کی حالت میں۔ یہاں تک کہ ہوش آجائے اور اپنے کہے کو سمجھنے لگے۔ اور اسی طرح جنابت کی حالت میں غسل سے پہلے نماز منع ہے یہاں تک کہ غسل کرے۔ اور بے وضو کو نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ وہ وضو کرلے لیکن جب وہ مریض ہو یا پانی کو نہ پائے تو اللہ نے اسے تیمم کرنے کی رخصت دی ہے۔ اور یہ اپنے بندے پر اس کی خاص رحمت اور شفقت ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ

آیت تیمم کا سبب نزول: ہم اس آیت کریمہ کا سبب نزول اس لیے ذکر کر رہے ہیں کیونکہ سورۂ نساء میں جو تیمم کے بارے میں آیت ہے وہ سورۂ مائدہ کی آیت سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اور اس کی دلیل یہ کہ یہ آیت کریمہ شراب کی حرمت سے پہلے نازل ہوئی اور شراب جنگ احد کے کچھ عرصہ بعد اس وقت حرام ہوئی جب حضور علیہ السلام نے بنو نضیر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اس کے برعکس سورۂ مائدہ کا شمار ان سورتوں میں ہوتا ہے جو آخر میں نازل ہوئیں اور خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ سبب نزول یہاں ہی ذکر کیا جائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انہوں نے حضرت اسماءؓ سے ایک ہار عاریۃً لیا۔ دوران سفر مجھ سے یہ ہار گم ہوگیا۔ رسول اللہ علیہ السلام نے کچھ لوگوں کو اس کی تلاش کے لیے بھیجا۔ ہار تو مل گیا لیکن اسی دوران نماز کا وقت ہوگیا۔ ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ اس لیے بغیر وضو کے ہی انہوں نے نماز پڑھ لی اور رسول اللہ علیہ السلام کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت اسید بن حضیرؓ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے عرض کی اللہ تعالیٰ آپ کو جزا خیر عطا فرمائے قسم بخدا! جو تکلیف بھی آپ کو پہنچی ہے اس کا انجام اللہ تعالیٰ آپ کے لیے اور مسلمانوں کے لیے بہتر بنا دیتا ہے(1)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ ایک سفر میں نکلے۔ جب ہم مقام بیضاء یا ذات الجیش کے مقام پر پہنچے تو میرا ہار ٹوٹ کر گر گیا تو رسول اللہ علیہ السلام وہاں اپنے صحابہ کے ساتھ اس کی تلاش کے لیے اقامت پذیر ہوگئے۔ وہاں نہ تو پانی قریب تھا اور نہ ہی ان کے پاس پانی تھا۔ آپ فرماتی ہیں جناب ابو بکر تشریف لائے اس وقت رسول اللہ علیہ السلام میری ران پر سر رکھ کر آرام فرما تھے۔ اور فرمانے لگے کہ تم نے رسول اللہ علیہ السلام اور سب لوگوں کو یہاں روک دیا ہے۔ اور اب نہ تو قریب پانی ہے اور نہ ہی ان کے پاس پانی موجود ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ انہوں نے مجھے خوب جھڑکا اور جانے کیا کیا کہا۔ اور اپنے ہاتھ سے میرے پہلو پر کچوکے لگائے۔ میں نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی کیونکہ رسول اللہ کا سر مبارک میری ران پر تھا۔ صبح جب رسول اللہ علیہ السلام بیدار ہوئے اور پانی نہ پایا تو اللہ تعالیٰ نے تیمم کی یہ آیت کریمہ نازل فرمائی اور سب نے تیمم کیا۔ حضرت اسید بن حضیرؓ کہنے لگے اے آل ابو بکر! یہ تمہاری پہلی برکت نہیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ جب ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا جس پر ہم سوار تھے تو اس کے نیچے سے ہار مل گیا(2)۔ حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے ذات الجیش کے مقام پر رات کے آخری حصے میں قیام کیا۔ آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ بھی تھیں۔ آپ کا ایک ہار جو یمنی موتیوں کا بنا ہوا تھا گم ہوگیا۔ آپ نے اس ہار کی تلاش کے لیے لوگوں کو روک دیا یہاں تک کہ جب صبح روشن ہوگئی اور ان کے پاس پانی بھی نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے مٹی کے ساتھ پاکیزگی حاصل کرنے کی

1۔ مسند احمد: 57/6 2۔ فتح الباری، کتاب التیمم: 431/1

رخصت عطا فرمائی۔ مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اٹھے اور اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا اور پھر ان کو بلند کیا اور ان کو جھاڑے بغیر ان کے ساتھ اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کا کندھوں اور بغلوں سمیت مسح کیا۔ ابن ابی یقظان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ حضرت عائشہ کا ہار گم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ وہیں اقامت پذیر ہو گئے یہاں تک فجر کا وقت ہو گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ کو بہت ناراض ہوئے۔ جب آیت تیمّم نازل ہوئی تو آپ خوش ہو گئے اور انہیں فرمانے لگے کہ تم بڑی برکت والی ہو کہ تمہاری وجہ سے یہ رخصت نازل ہوئی ہے۔ راوی فرماتے ہیں پھر ہم نے ایک ضرب کے ساتھ اپنے چہروں کا مسح کیا اور دوسری ضرب کے ساتھ اپنے ہاتھوں کا کندھوں اور بغلوں تک مسح کیا۔ حضرت اسلع بن شریک فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی ہانک رہا تھا۔ رات انتہائی سرد تھی۔ میں جنبی ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے کوچ کا ارادہ فرمایا تو میں نے پسند نہ کیا کہ میں اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی ہانکوں۔ اور مجھے یہ بھی خوف تھا کہ میں نے ٹھنڈے پانی کے ساتھ غسل کیا تو میں ہلاک ہو جاؤں گا یا بیمار پڑ جاؤں گا۔ میں نے ایک انصاری کو اونٹنی ہانکنے کے لیے کہا۔ اور خود آگ جلا کر پانی گرم کیا اور غسل کیا۔ پھر دوڑ کر حضور اور آپ کے صحابہ کے ساتھ جا ملا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے اسلع! کیا وجہ ہے کہ تمہاری اونٹنی کی چال تبدیل ہو گئی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اونٹنی کو میں نہیں چلا رہا تھا بلکہ ایک انصاری چلا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا وجہ تھی۔ میں نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یہ حدیث ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ٚ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

"کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے وہ مول لے رہے ہیں گمراہی کو اور (یہ بھی) چاہتے ہیں کہ بہک جاؤ تم بھی راہ راست سے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو اور کافی ہے (تمہارے لیے) اللہ حمایتی اور کافی ہے (تمہارے لیے) اللہ تعالیٰ مددگار ہے۔ کچھ لوگ جو یہودی ہیں پھیر دیتے ہیں (اللہ کے کلام کو) اس کی اصلی جگہوں سے اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی اور (کہتے ہیں) سنو تم نہ سنائے جاؤ اور (کہتے ہیں) "رَاعِنَا" بل دیتے ہوئے اپنی زبانوں کو طعنہ زنی کرتے ہوئے دین میں اور اگر وہ (یوں) کہتے ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اسے) مان لیا اور (ہماری عرض) سنئے اور نگاہ (کرم) فرمایئے ہم پر، تو ہوتا بہت بہتر ان کے لیے اور بہت درست۔ لیکن (اپنی رحمت سے) دور کر دیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے"۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ پر جو کلام نازل فرمایا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سابقہ انبیاء سے جو علم ان کے پاس پہنچا ہے اس کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ صرف اس مقصد کے لیے کہ وہ اس کے بدلے معمولی دنیوی منفعت حاصل کریں۔ بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل کیے ہیں کاش تم بھی ان کا انکار کر دو

اور جو علم نافع اور ہدایت اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائی ہے اسے ترک کر دو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو بخوبی جانتا ہے۔ اس لیے وہ ان سے تمہیں محتاط رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے حمایت کرنے والا کافی ہے اور جو اس سے مدد طلب کرتا ہے اس کے لیے وہ مددگار کافی ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا: یہاں "من" جنس کے بیان کے لیے آیا ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ "ترجمہ: بتوں کی نجاست سے پرہیز کرو"۔ میں ہے۔ یعنی یہ یہود اللہ کے کلام کی غلط تاویل کرتے ہیں اور اللہ کی مراد کے علاوہ اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ اور پھر یہ کام ان سے خطأً صادر نہیں ہوتا بلکہ قصداً کیا کرتے ہیں۔ اور اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ کہتے ہیں اے محمد! جو آپ کہتے ہیں ہم ان کو سنتے ہیں لیکن اس میں آپ کی اطاعت نہیں کریں گے۔ یہ مجاہد اور ابن زید کا قول ہے اور ان کے کفر اور عناد میں یہی قول زیادہ بلیغ ہے۔ یعنی وہ اللہ کے کلام کو سمجھنے کے بعد اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل پر وہ کس سزا کے مستحق ہوں گے۔

وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ: وہ کہتے ہیں کہ آپ وہ سنیں جو ہم کہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا کرے آپ نہ سنیں۔ یہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ مجاہد اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ آپ سنیں لیکن آپ کا قول ہمارے لیے قابل قبول نہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے۔ اور یہ بطور تمسخر اور مذاق سے کہا کرتے تھے۔ (عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ)

وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ: یعنی بظاہر تو وہ کہتے تھے "راعنا" جس کا معنی ہے ہماری بات غور سے سنیے! لیکن حقیقت میں وہ اس سے دوسرا معنی مراد لیتے تھے۔ یعنی آپ کے لیے رعونت کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس کی تفصیلی بحث آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (بقرہ: 104) کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یعنی ان یہود کے دلوں میں تو کچھ اور ہوتا ہے لیکن ظاہر میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کر کے دین اسلام پر طعنہ زنی کے مرتکب ہوتے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا: ان کے دل بھلائی سے بہت دور ہیں، ان میں کوئی نفع بخش چیز داخل نہیں ہو سکتی اور اس کی تفسیر بھی پہلے گزر چکی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ ان میں نفع بخش ایمان نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۞ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ۞

"اے وہ لوگو جنہیں دی گئی کتاب ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہم نے تاکہ تصدیق کرے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے (ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم مسخ کر دیں چہرے پھر پھیر دیں انہیں پشتوں کی طرف یا لعنت کرے ان پر جس طرح ہم نے لعنت کی سبت والوں پر اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے گناہ عظیم کا"۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کے رسول محمد ﷺ پر نازل کردہ کتاب پر ایمان لے آئیں۔ جو ان کی کتابوں میں موجود بشارت کی تصدیق کرتی ہے۔ اور یہاں ان کو اس چیز سے ڈرایا گیا ہے کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے چہرے مسخ کر دیے جائیں گے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا: بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ تمہارے چہروں کو مسخ کر دیا جائے۔ یعنی ان کے منہ الٹے کر دیے جائیں گے اور ان کی آنکھیں پچھلی طرف کر دی جائیں گی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ ہم تمہارے چہروں کو مٹا دیں یعنی آنکھیں کان اور ناک سب مٹا دیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چہرے کو الٹا کر دیا جائے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے چہروں کو گردن کے پیچھے لگا دیا جائے گا اور وہ الٹے پاؤں چلیں گے اور ان کی آنکھوں کو بھی پچھلی طرف لگا دیا جائے گا(1)۔ یہ سزا اور عذاب زیادہ سخت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ضرب المثل بیان کی ہے جس میں ان کے حق میں روگردانی کرنے، باطل کی طرف مائل ہونے اور صراط مستقیم سے گمراہی کی طرف رجوع کرنے کا بیان ہے۔ گویا کہ وہ اس طرح الٹے پاؤں چل رہے ہیں اور بعینہ اسی طرح ہے جس طرح بعض مفسرین نے اس آیت کریمہ: اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ'' ترجمہ: ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے پس وہ ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اس لیے ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں''۔ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک ضرب المثل ہے جو ان کی گمراہی اور راہ ہدایت قبول نہ کرنے کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو صراط المستقیم سے پھیر کر گمراہی کی طرف لوٹا دیا جائے۔ سدی نے بھی یہ فرمایا ہے کہ قبل اس کے کہ ہم ان کو حق سے روک دیں اور کفر کی طرف لوٹا دیں اور ان کو بندروں کی طرح بنا دیں۔ ابوزید نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ قبل اس کے کہ ہم ان کو حجاز کی سرزمین سے شام کی زمین کی طرف دھکیل دیں۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کعب الاحبارؓ نے جب یہ آیت کریمہ سنی تو مسلمان ہو گئے۔ عیسیٰ بن مغیرہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم نے حضرت ابراہیمؒ کے پاس کعب کے اسلام کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ وہ بیت المقدس جا رہے تھے۔ مدینہ پاک سے گزرے تو حضرت عمرؓ سے ملاقات ہو گئی تو آپ نے فرمایا اے کعب مسلمان ہو جاؤ تو انہوں نے جواب دیا کہ تم اپنے قرآن پاک میں یہ آیت نہیں پڑھتے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (جمعہ:5)'' ترجمہ: ان کی مثل جنہیں تورات کا حامل بنایا گیا تھا پھر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا اس گدھے کی سی ہے جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہیں''۔ اور میں بھی تو ان لوگوں میں سے ہوں جن کو حامل تورات بنایا گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے انہیں چھوڑ دیا۔ جب وہ حمص پہنچے وہاں ایک شخص کو آیت: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا تلاوت کرتے سنا تو مسلمان ہو گئے اس ڈر سے کہ کہیں اس آیت کریمہ میں بیان کردہ عذاب ہم پر نہ آ جائے اور پھر اپنے وطن یمن پہنچے اور اپنے تمام اہل خانہ کو لے کر مسلمان ہو گئے۔ ایک دوسری روایت میں ان کے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کے استاد ابو مسلم جلیلی ان کو ملامت کیا کرتے تھے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں سستی کی۔ ایک دفعہ انہوں نے حضرت کعبؓ کو بھیجا کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا یہ وہی نبی ہیں جس کے اوصاف تورات میں بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ جب میں مدینہ پہنچا تو ایک قاری کو قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ میں نے جلدی سے پانی تلاش کر کے غسل کیا اور اپنے چہرے کے اوپر ہاتھ مسخ ہونے کے خوف سے بار بار مارتا رہا اور پھر مسلمان ہو گیا۔

1۔ تفسیر الطبری: 121/5

اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ : اصحاب سبت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہفتہ کے دن حیلے سے مچھلیوں کا شکار کر کے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا۔ جس کے نتیجے میں ان کی شکلیں مسخ کر کے بندر اور خنزیر کی طرح بنا دیا گیا۔ اس واقعہ کی تفصیل سورۂ اعراف میں ذکر کی جائے گی۔

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا : یعنی جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم دیتا ہے تو اس کی نہ تو کوئی مخالفت کر سکتا ہے اور نہ ہی انکار۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ شرک کرنے والے کو معاف نہیں کرتا اور شرک کے علاوہ باقی تمام گناہوں کو جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

آیت مذکورہ کے بارے میں وارد احادیث: 1۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندے کے گناہ تین طرح کے ہیں۔ 1۔ وہ گناہ ہیں جن کی اللہ تعالیٰ پروا نہیں کرتا۔ 2۔ وہ گناہ ہیں جن میں سے اللہ تعالیٰ کسی چیز کو نہیں چھوڑتا۔ 3۔ وہ گناہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرماتا۔ اور تیسری قسم سے مراد شرک ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ ''ترجمہ: یقیناً جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک بنائے گا تو حرام کر دیا اللہ تعالیٰ نے اس (بندے) پر جنت''۔ اور وہ قسم جس کی اللہ تعالیٰ پروا نہیں کرتا وہ بندے کا اپنے نفس پر ظلم کرنا ہے۔ اس کا تعلق بندے اور رب کے درمیان ہوتا ہے یعنی نماز، روزہ وغیرہ کا ترک۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے۔ اور وہ قسم جس کو بالکل نہیں چھوڑتا، اس سے مراد بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہے۔ اس کا بدلہ اور قصاص ضروری ہوگا(1)۔ 2۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ظلم کی تین قسمیں ہیں۔ 1۔ وہ ظلم جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتا۔ 2۔ وہ ظلم جس کو اللہ معاف فرما دیتا ہے۔ 3۔ وہ ظلم جس کو اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑتا۔ پہلے ظلم سے مراد شرک ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ''ترجمہ: یقیناً شرک ظلم عظیم ہے''۔ دوسری قسم کے ظلم سے مراد وہ ظلم ہے جو بندہ اپنے نفس پر کرتا ہے اور اس کا تعلق بندے اور رب کے درمیان ہوتا ہے۔ تیسری قسم کے ظلم سے مراد بندوں کا آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہے۔ جس کا بدلہ ضروری ہے(2)۔ 3۔ حضرت معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو بخش دے مگر وہ شخص جو کفر کی حالت میں مرا ہو یا جس شخص نے کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کیا ہو۔(3) 4۔ حضرت ابو ذرؓ رسول اللہ ﷺ سے حدیث قدسی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے میرے بندے! جب تک میری عبادت کرتا رہے گا اور میرے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ رکھے گا تو میں تیری خطاؤں کو معاف کر دوں گا۔ اے میرے بندے! اگر تو میرے پاس زمین بھر خطائیں لے کر آئے گا اور شرک نہ کیا ہوگا تو میں تجھے زمین بھر مغفرت عطا کروں گا(4)۔ 5۔ حضرت ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس بندے نے لا الہ الا اللّٰہ کہا اور پھر اسی پر اس کا انتقال ہوا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے عرض کی خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔ آپ نے فرمایا ہاں خواہ وہ زنا کرے یا چوری کرے۔ ابو ذر فرماتے ہیں کہ میں نے تین بار یہ کلمات دہرائے تو آپ نے یہی جواب ارشاد فرمایا۔ اور چوتھی مرتبہ فرمایا ابو ذر کی ناک خاک آلود ہو۔ یہ سن کر ابو ذر اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے نکلے اور وہ یہ الفاظ دہرا رہے تھے کہ اگرچہ ابو ذر کی ناک خاک آلود ہو۔ اس کے بعد جب بھی یہ حدیث روایت کرتے یہ الفاظ ضرور دہراتے۔ دوسری سند سے مروی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ ابو ذر فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ طیبہ کے باہر میدان میں جا رہا تھا۔ ہماری نظریں احد

1۔ مسند احمد: 240/6 2۔ کشف الاستار عن زوائد البزار: 158/4 3۔ مسند احمد: 99/4 4۔ مسند احمد: 154/5

پہاڑ پر تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر! میں نے عرض کی لبیک یا رسول اللہ! فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا آ جائے۔ میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ تیسری شام تک اس میں کچھ باقی رہ جائے۔ سوائے اس دینار کے جسے قرضہ چکانے کے لیے رکھ لوں۔ میں اس سونے کو اللہ کے بندوں میں مٹھی بھر بھر تقسیم کر دوں گا۔ پھر کچھ دیر ہم آگے چلے تو حضور ﷺ نے فرمایا یہیں ٹھہرے رہو یہاں تک میں واپس آ جاؤں۔ آپ تشریف لے گئے اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے کچھ آوازیں سنیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ حضور ﷺ کو کوئی پریشانی پیش نہ آ گئی ہو۔ میں نے پیچھے جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن مجھے آپ کا فرمان یاد آ گیا کہ یہاں سے نہ ہٹنا حتی کہ میں واپس آ جاؤں۔ اس لیے میں وہیں انتظار کرتا رہا۔ جب آپ واپس تشریف لائے تو میں نے ان آوازوں کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا جبرائیل (علیہ السلام) میرے پاس آئے تھے۔ جو کہہ رہے تھے کہ آپ کی امت میں سے جو اس حال میں دنیا سے رخصت ہوگا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا خواہ وہ زنا کرے یا چوری۔ فرمایا ہاں اگرچہ وہ زنا کرے یا چوری(1)۔ اسے بخاری اور مسلم نے بھی روایت کیا ہے اور ان کے یہ الفاظ ہیں۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک رات باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ اکیلے تشریف لے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شاید آپ کسی کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے چاند کی روشنی میں چل پڑا۔ آپ نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور ارشاد فرمایا تم کون ہو؟ عرض کی میں ابوذر ہوں۔ اللہ کرے میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا ابوذر آؤ۔ میں تھوڑی دیر آپ کے ساتھ چلا تو آپ نے ارشاد فرمایا آج جو غنی ہیں قیامت کے دن وہ فقیر ہوں گے مگر وہ شخص جس کو اللہ نے مال عطا فرمایا اور اس نے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور نیک عمل کرتا رہا۔ پھر آپ تھوڑی دیر چلتے رہے پھر ارشاد فرمایا یہاں بیٹھ جاؤ۔ آپ نے مجھے اس جگہ بٹھایا جہاں میرے اردگرد پتھر تھے اور فرمایا یہاں بیٹھے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آ جاؤں۔ آپ دور میدان میں نکل گئے یہاں تک میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ کو گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ پھر میں نے دیکھا آپ یہ فرماتے ہوئے آ رہے ہیں اگرچہ زنا کرے یا چوری۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے عرض کی اللہ کرے میں آپ پر قربان ہو جاؤں یہ آپ کس کے ساتھ گفتگو فرما رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کوئی آپ کو جواب دے رہا تھا۔ آپ نے فرمایا جبرائیل میرے پاس آئے اور کہا کہ اپنی امت کو خوشخبری دے دو کہ ان میں جو اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا ہوگا، جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے پوچھا اے جبرائیل! اگرچہ اس نے زنا کیا ہو یا چوری کی ہو۔ اس نے کہا ہاں۔ میں نے پھر یہی کلمات دہرائے تو اس نے جواب دیا ہاں اگرچہ وہ شراب بھی پیئے(2)۔ 6۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! جنت اور دوزخ کو واجب کرنے والی دو چیزیں کون سی ہیں آپ نے فرمایا جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کیے بغیر مرا اس کے لیے جنت واجب ہوگی اور جو اس کے ساتھ شرک کرتے ہوئے مرا اس کے لیے جہنم واجب ہوگی۔ دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا تھا اس کے لیے مغفرت حلال ہوگئی اگر اللہ چاہے اسے عذاب دے چاہے معاف فرما دے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشتا جو اس کے ساتھ شرک کرتا ہے اور اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دیتا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ بندے پر ہمیشہ اللہ کی مغفرت رہتی ہے جب تک کہ پردے نہ پڑ جائیں۔ عرض کی گئی پردے سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ اور جو شخص اس حال میں اللہ سے ملے کہ اس نے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے مغفرت ثابت ہو جاتی ہے اگر چاہے تو اسے عذاب دے چاہے

1۔ مسلم، کتاب الزکاۃ: 687 2۔ فتح الباری، کتاب الرقاق: 260/11

اسے معاف فرما دے۔ پھر آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ 7۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص کو اس حالت میں موت آ ئی کہ اس نے اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا تھا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا(1)۔ 8۔ حضرت ایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن صحابہ کرامؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہارے رب عزوجل نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں اپنی امت میں سے ستر ہزار کا بے حساب جنت میں جانا پسند کرلوں یا اس بات کو پسند کرلوں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی چیز میری امت کے بارے میں پوشیدہ ہے۔ ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا آپ کا پروردگار اس چیز کو محفوظ چھپا کر رکھے گا۔ آپ یہ سن کر گھر تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد تکبیر پڑھتے ہوئے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے رب نے مجھے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار کی زیادتی عطا فرمائی ہے۔ اور پوشیدہ حصہ اس کے علاوہ ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ جب یہ حدیث بیان کر چکے تو ابورہم نے پوچھا اس پوشیدہ چیز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ بات سن کر لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے اور کہنے لگے تمہیں اس سے کیا لگے۔ اس پر ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا اسے چھوڑ دو۔ میں تمہیں اس کے بارے میں اپنے گمان بلکہ یقین کے مطابق بتاتا ہوں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص نے سچے دل سے یہ گواہی دی کہ اللہ وحدہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے رسول اور بندے ہیں وہ جنت میں داخل ہو جائے گا(2)۔ 9۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ہی مروی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میرا بھتیجا حرام سے باز نہیں آتا۔ آپ نے پوچھا اس کی دینداری کیسی ہے۔ عرض کی نماز پڑھتا ہے، اللہ کی توحید کا اقرار بھی کرتا ہے۔ فرمایا پہلے اس سے اس کا دین بطور ہبہ طلب کرو پھر اگر انکار کرے تو اسے خرید لو۔ اس نے اس شخص سے جا کر طلب کیا تو اس نے انکار کر دیا اور واپس آ کر حضور ﷺ کو بتایا۔ اور عرض کی کہ وہ اپنے دین کے بارے میں بڑا حریص ہے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ 10۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اپنے نفس کی ہر اچھی بری خواہش کو پورا کیا آپ نے تین بار ارشاد فرمایا کیا تو گواہی نہیں دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اس نے عرض کی جی ہاں۔ آپ نے فرمایا تمہاری یہ گواہی ان تمام چیزوں پر غالب آ جائے گی(3)۔ 11۔ ضمضم بن جوش یمامی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا اے یمامی! ہرگز کسی شخص کو یہ نہ کہنا کہ اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا یا تجھے کبھی جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا حضرت! اس طرح تو ہم غصے میں اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کو کہتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا آئندہ اس طرح نہ کہنا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بنی اسرائیل میں دو شخص تھے۔ ان میں ایک تو عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا اور دوسرا بڑا گنہگار تھا۔ دونوں کا آپس میں بھائی چارہ تھا۔ وہ عابد جب بھی دوسرے کو گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھتا تو اسے کہتا کہ گناہ سے باز آ جاؤ۔ وہ جواب دیتا کہ میرا معاملہ میرے رب کے سپرد ہے۔ تمہیں مجھ پر نگہبان تو نہیں بنایا گیا۔ حتیٰ کہ ایک دن اس عابد نے دیکھا کہ وہ شخص کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس نے کہا افسوس ہے تجھ پر اب بھی باز آ جاؤ۔ اس نے جواب دیا میرا معاملہ میرے رب کے سپرد ہے تمہیں مجھ پر نگہبان نہیں بنایا گیا۔ اس نے کہا قسم بخدا اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا اور نہ ہی تجھے جنت میں داخل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو قبض کرنے کے لیے ملک الموت کو بھیجا۔ جب وہ دونوں اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس گنہگار سے فرمایا جاؤ میری رحمت کی بناء پر جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور اس عابد سے کہا کیا تو حقیقت میں جانتا تھا۔ پھر کہا کیا تو اس چیز پر قادر تھا جو میرے قبضہ قدرت میں ہے۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے جہنم میں پھینک دو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات

1۔ مسند احمد: 79/3 2۔ مسند احمد: 413/5 3۔ مسند ابی یعلی: 155/6

کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اس نے اپنے منہ سے ایک ہی کلمہ نکالا تھا جس نے اس کی دنیا وآخرت کو تباہ کر دیا(1)۔ 12۔حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جس شخص نے یہ یقین کر لیا کہ میں گناہوں کی بخشش پر قادر ہوں تو میں اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہوں اور کوئی پروا نہیں کرتا جب تک وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے(2)۔13۔حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس امر پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گا اور جس امر سے سزا کا ذکر کیا ہے وہ اس کے اختیار میں ہے۔حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ہم صحابہؓ قاتل، یتیم کا مال کھانے والے، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے والے اور جھوٹی گواہی دینے والے کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا کرتے تھے یعنی ان کے جہنمی ہونے میں ہمیں کوئی شک نہیں تھا۔حتی کہ یہ آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ نازل ہوئی۔اس کے بعد صحابہ کرامؓ ان لوگوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ جب ہم نے یہ آیت کریمہ سنی تو ان لوگوں کے بارے میں اس قسم کی گفتگو سے باز آ گئے اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم گناہ کبیرہ کے مرتکب لوگوں کے لیے استغفار نہیں کیا کرتے تھے حتی کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے سنا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے اہل کبائر کے لیے موخر کر رکھا ہے(3)۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ...... (زمر:53) ”ترجمہ: آپ فرمائیے اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر، مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے، یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“۔نازل ہوئی۔تو ایک شخص نے یہ سن کر عرض کی یا رسول اللہ! کیا اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا بھی، آپ نے اس کی بات ناپسند فرمائی اور پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ سورۂ حٰم السجدہ کی یہ آیت کریمہ توبہ کے ساتھ مشروط ہے یعنی جب کوئی شخص کسی گناہ سے توبہ کرے اگرچہ وہ گناہ اس سے بار بار سرزد ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول کرتا ہے۔اس لیے ارشاد فرمایا: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا......یعنی وہ توبہ کی شرط کے ساتھ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے کیونکہ اگر یہاں توبہ کی شرط نہ لگائی جائے تو شرک بھی ان میں داخل ہو جائے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے علاوہ تمام گناہوں کو جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔اگرچہ اس نے توبہ نہ بھی کی ہو۔اگر اس آیت کا یہ مفہوم لیا جائے تو یہ پہلی صورت سے زیادہ امید افزا ہے۔واللہ اعلم۔

مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ: یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ کی مثل ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے۔آپ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے تو آپ نے فرمایا تو کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا۔حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہ کبیرہ کے بارے میں نہ بتادوں۔اور وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے۔پھر آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔اور پھر ارشاد فرمایا کہ اس کے بعد والدین کی نافرمانی کرنا بھی بڑا گناہ ہے۔پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ...... (لقمان:14) ”ترجمہ: کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا، آخر کار میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے“۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٤٩﴾

1۔مسند احمد: 323/2 2۔المعجم الکبیر: 241/11 3۔کشف الاستار عن زوائد البزار: 84/4

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جو پاکباز بتلاتے ہیں اپنے آپ کو بلکہ (یہ تو) اللہ (کی شان ہے کہ) پاکباز بنا دے جسے چاہے، اور وہ نہیں ظلم کیے جائیں گے کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر۔ دیکھئے کیسے گھڑتے ہیں اللہ پر جھوٹ اور کافی ہے (انہیں رسوا کرنے کے لیے) یہ کھلا گناہ۔ کیا نہیں دیکھا تم نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے وہ (اب) اعتقاد رکھنے لگے ہیں جبت اور طاغوت پر اور کہتے ہیں ان کے بارے میں جنہوں نے کفر کیا کہ یہ کافر زیادہ ہدایت یافتہ ہیں ان سے جو ایمان لائے یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن پر لعنت کی ہے اللہ تعالیٰ نے اور جس پر لعنت بھیجے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کا کوئی مددگار''۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ: حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ وہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں، اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوگا۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ وہ دعا کے موقع پر اپنے بچوں کو آگے کرتے اور نماز میں بھی ان کو اپنا امام بناتے۔ ان کا گمان تھا کہ یہ بے گناہ ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ ہمارے جو بچے فوت ہو گئے ہیں انہیں اللہ کے ہاں قرب حاصل ہے جس کی وجہ سے ہماری شفاعت کریں اور اللہ کے سامنے ہماری صفائی بیان کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ پر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی ایک دوسری روایت میں آپ نے یہود کے اپنے بچوں کو امام بنانے کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی گنہگار کو کسی بے گناہ کی وجہ سے پاک نہیں کرتا۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ بچوں کی طرح ہمارا کوئی گناہ نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کی مذمت میں اتری جو ایک دوسرے کی تعریف بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں اور دوسرے کی صفائی بیان کرتے ہیں۔ حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم بے جا مدح کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دیں (1)۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے شخص کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا کہ تجھ پر افسوس کہ تو نے اپنے بھائی کی گردن کو توڑ دیا۔ پھر فرمایا جب تمہیں آپس میں اپنے ایک ساتھی کی تعریف کرنی ہو تو وہ کہے کہ میرے خیال کے مطابق وہ ایسا ہے۔ لیکن وہ یہ نہ کہے کہ وہ حقیقتاً اللہ کے نزدیک بھی وہ ایسا ہی ہے (2)۔ حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص کہے کہ میں مومن ہوں وہ کافر ہے اور جو کہے کہ ہم عالم ہوں وہ جاہل ہے۔ اور جو کہے کہ میں جنتی ہوں وہ جہنمی ہے۔ دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ تم خود پسند نہ بن جانا۔ معبد جہنی فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ بہت کم حدیث روایت کرتے تھے اور بہت کم ایسا ہوگا کہ آپ نے جمعہ کے موقع پر یہ احادیث بیان نہ کی ہوں۔ 1۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ بوجھ عطا فرما دیتا ہے۔ 2۔ یہ مال انتہائی خوشنما اور دلکش ہے جو

1۔ مسلم، کتاب الزہد: 2297 2۔ مسلم، کتاب الزہد: 2296

اس کو حق کے ساتھ لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دیتا ہے۔3۔ بے جا تعریف وتوصیف سے بچو کہ یہ گردن پر چھری چلانے کے مترادف ہے(1)۔اور اس آخری حدیث کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ انسان صبح اپنے دین کو لے کر باہر نکلتا ہے اور جب واپس لوٹتا ہے تو اس کا دامن دین سے خالی ہوتا ہے۔کیونکہ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ملتا ہے جو اسے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔وہ قسمیں اٹھا کر اس کی مدح وتعریف کرتا ہے۔ممکن ہے اسے اتنی تعریف کے بعد کوئی شے نہ ملے لیکن اس نے اپنے اللہ کو ناراض کر لیا، پھر آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔اس کا تفصیلی بیان فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (نجم:32) کی تفسیر کے تحت آئے گا۔

بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ: چونکہ اللہ تعالیٰ تمام امور کی حقیقت اور اصلیت کو بخوبی جانتا ہے اس لیے وہی بہتر فیصلہ کر سکتا ہے اور وہ کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔یعنی اگر کسی کا اجر کھجور کی گٹھلی کے ریشے کے برابر بھی ہوگا تو وہ اسے ضائع نہیں کرے گا۔بہت سے مفسرین نے فرمایا ہے کہ "فتیلہ" کھجور کی گٹھلی کے درمیان باریک سے ریشے کو کہتے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ دھاگہ ہے جسے انسان اپنی انگلیوں سے بٹتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: اپنے آپ کی صفائی اور پاکیزگی بیان کرنے میں وہ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں۔اسی طرح وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم یہود ونصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔اور ہمیں چندروز آگ میں رہنا پڑے گا۔اور اپنے بڑوں کے نیک اعمال پر بھروسہ کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ والدین کے اعمال بیٹوں کو کوئی فائدہ نہیں دیں گے۔جیسا کہ ارشاد فرمایا: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ..... (بقرہ:134) پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کا یہ کذب وافتراء ہی ایک ایسا واضح گناہ ہے جو ان کے لیے کافی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ: حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ "جبت" سے مراد جادو اور "طاغوت" سے مراد شیطان ہے۔اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جبت سے مراد شیطان ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے اور ایک دوسری روایت میں مروی ہے کہ اس سے مراد شرک اور بت ہیں۔شعبی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کاہن ہیں۔بعض نے فرمایا ہے کہ "جبت" سے مراد حیی بن اخطب مراد ہیں۔مجاہد فرماتے ہیں اس سے کعب بن اشرف مراد ہے، جوہری صحاح میں فرماتے ہیں کہ "جبت" کلمہ کا اطلاق بت، کاہن، جادوگر اور کئی دوسری چیزوں پر ہوتا ہے۔ایک حدیث پاک میں ہے کہ فال، پرندوں کے اڑنے یا ان کے ناموں سے شگون لینا اور زمین پر لکیریں کھینچنا سب "جبت" میں داخل ہیں(2)۔وہ فرماتے ہیں کہ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے کیونکہ اس میں ج اور ت ایک ہی کلمہ میں جمع ہو گئے ہیں۔حسن بصری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد شیطان کی بھنبھناہٹ ہے۔"طاغوت" کے بارے میں بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے طواغیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان سے مراد وہ کاہن ہیں جن پر شیطان نازل ہوتا ہے۔مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد انسانی صورت میں وہ شیطان ہے جن کے پاس لوگ مقدمے لے کر جاتے ہیں اور انہیں اپنا حکم سمجھتے ہیں۔حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی عبادت اللہ کے سوا کی جائے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یعنی وہ اپنی جہالت اور بے دینی کی وجہ سے کافروں کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔اس طرح وہ اس

1۔مسند احمد 93/4　　2۔مسند احمد 60/5

کتاب کا بھی انکار کرتے ہیں جو ان کے پاس موجود ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف اہل مکہ کے پاس گئے اہل مکہ نے کہا کہ تم اہل علم و کتاب ہو۔ ہمیں ہمارے اور محمد (ﷺ) کے بارے میں بتاؤ وہ کہنے لگے تمہارا اور محمد (ﷺ) کا کیا مقابلہ ہے۔ اہل مکہ کہنے لگے کہ ہم صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کے لیے اونٹنیاں ذبح کرتے ہیں، پانی کی جگہ دودھ پلاتے ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرتے ہیں حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں محمد (ﷺ) ہیں جو ہمارے ساتھ قطع رحمی کرتے ہیں قبیلہ غفار کے چند لوگ ان کے ساتھ ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو حاجیوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اب تم خود ہی فیصلہ کرو کہ ہم بہترین یا وہ۔ اس پر ان دونوں نے کہا کہ تم ہی بہتر ہو اور سیدھے راستے پر گامزن ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان کے بارے میں إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ بھی نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ بنو وائل اور بنو نضیر کے سردار جب قریش ظلکے پاس آئے تو انہوں نے کہا یہ یہودیوں کے علماء اور پہلی کتابوں کا علم رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان سے پوچھو کیا ہمارا دین بہتر ہے یا محمد ﷺ کا۔ جب انہوں نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ تمہارا دین ان سے بہتر ہے تم ان سے اور ان کے متبعین سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ: اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے اور یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ دنیا و آخرت میں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا کیونکہ وہ مشرکین سے مدد طلب کرنے گئے تھے اور انہوں نے یہ بات اسی لیے کی تھی تاکہ انہیں اپنی مدد کے لیے مائل کر لیں اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے بہت سے قبائل جمع کر کے اور اپنے ساتھ ملا کر مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ حتیٰ کہ نبی پاک ﷺ نے اپنے صحابہ سے مل کر مدینہ کے اردگرد خندق کھودی۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾ فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾

''کیا ان کے لیے کوئی حصہ ہے حکومت میں اگر ایسا ہوتا تو نہ دیتے یہ لوگوں کو تل برابر کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے (وہ حسد کی آگ میں جلا کرنے) ہم نے تو مرحمت فرمادی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب اور حکمت اور عنایت فرمادی ہے انہیں عظیم الشان سلطنت تو ان سے کوئی ایمان لائے اس کے ساتھ اور کسی نے منہ پھیر لیا اس سے اور کافی ہے (انہیں جلانے کے لیے) جہنم کی دھکتی ہوئی آگ''۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ: ارشاد باری تعالیٰ ہے کیا وہ ملک کے کسی حصے کے مالک ہیں۔ یہ سوال انکار کے طور پر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ملک کے کسی حصے کے مالک نہیں پھر اس کے بعد ان کے بخل کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ ملک کے کسی حصے کے مالک ہوتے تو وہ لوگوں کو اور خصوصاً رسول اللہ ﷺ کو کچھ عطا نہ کرتے۔ ''نَقِيرًا'' سے مراد وہ باریک سا نشان ہے جو گٹھلی کی ایک طرف ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کو ایک دوسری آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: قُل لَّوْ أَنتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي...... ''ترجمہ: فرمائیے اگر تم مالک ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے تو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں۔ واقعی

انسان بڑا تنگدل ہے''۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ: اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب (ﷺ) کو نبوت کے جس عظیم منصب سے نوازا ہے اس پر وہ حسد کرتے ہیں چونکہ آپ کا تعلق عرب سے تھا بنی اسرائیل سے نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اسی حسد کی بناء پر آپ کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں ''النّاس'' سے مراد ہم لوگ نہ کہ دوسرے پھر ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے قبائل جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ ان پر کتاب نازل فرمائی۔ بعض کو بادشاہت بھی عطا فرمائی۔ وہ بڑی حکمت سے امور سلطنت چلاتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان میں بعض ایمان لائے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو انعام واکرام کیا تھا اس کی تصدیق کی اور بعض نے اس سے اعراض کر کے انکار کیا اور لوگوں کو بھی اس سے روکنے لگے۔ یعنی جب انہوں نے اپنی ہی قوم میں سے مبعوث نبی (ابراہیم علیہ السلام) کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے مخالف ہو گئے تو یہ آپ کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ حالانکہ آپ کا تعلق بنی اسرائیل سے بھی نہیں ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے بعض محمد (ﷺ) پر ایمان لے آئے اور بعض نے اعراض کیا اور آپ سے اعراض کرنے والے یہ کافر شدت سے تکذیب کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ حق اور ہدایت سے بہت دور ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ارشاد فرمایا کہ انہیں جلانے کے لیے جہنم کی دھکتی ہوئی آگ کافی ہے۔ یعنی یہ سزا ان کو ان کے کفر وعناد اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتب اور اس کے رسولوں کی مخالفت کی وجہ سے دی جائے گی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

''بے شک جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا ہم ڈال دیں گے انہیں آگ میں جب کبھی پک جائیں گی ان کی کھالیں تو بدل کر دے دیں گے ہم انہیں کھالیں دوسری تا کہ وہ (مسلسل) چکھتے رہیں عذاب کو بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کیے عنقریب ہم داخل کریں گے انہیں باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں تا ابد۔ ان کے لیے ان باغوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم داخل کریں گے انہیں گھنے سایہ میں''۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: اللہ تعالیٰ نے یہاں اس سزا کے بارے میں فرمایا ہے جو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ان لوگوں کو دے گا جنہوں نے اس کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں سے اعراض کیا۔ ارشاد فرمایا ہم ان کو اس آگ میں اس طرح داخل کریں گے کہ وہ آگ ان کو ہر طرف سے گھیر لے گی۔ پھر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو گی بلکہ یہ سزا ان کے لیے دائمی ہو گی۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب ان کی کھال جل جائے گی تو اس کے بدلے میں ایک نئی کھال انہیں دی جائے گی جو کاغذ کی مانند صاف ہو گی۔ حضرت یحییٰ بن یزید خضرمیؒ فرماتے ہیں کہ کافر کی سو کھالیں ہوں گی اور ہر کھال کو مختلف قسم کے عذاب دیئے جائیں گے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ ان کی کھال جلے گی۔ اور جب بھی فرشتے انہیں حکم دیں گے پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عمرؓ کے پاس جب یہ آیت کریمہ پڑھی تو

آپ نے اسے دوبارہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اس نے دوبارہ پڑھی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے پھر فرمایا اس کی تفسیر یہ ہے کہ ان کی ایک گھڑی میں سو مرتبہ کھال تبدیل کی جائے گی۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس طرح سنا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب یہ آیت کریمہ دوبارہ پڑھی گئی تو حضرت کعب نے عرض کی اے امیر المومنین! میں اس کی وہ تفسیر بیان کرتا ہوں جو میں نے مسلمان ہونے سے پہلے پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا، بیان کرو! اگر یہ رسول اللہ ﷺ کے قول کے موافق ہوئی تو ہم قبول کریں گے ورنہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ تو انہوں نے بیان کیا۔ میں نے یہ پڑھا ہے کہ ایک گھڑی میں ایک سو بیس مرتبہ انکی جلد کو تبدیل کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا میں نے بھی ایسا ہی رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ حضرت ربیع بن انسؓ فرماتے ہیں کہ پہلی کتابوں میں لکھا ہے کہ جہنمی کی جلد چالیس ہاتھ اور اس کا دانت ستر ہاتھ اور اس کا پیٹ اتنا بڑا ہوگا کہ اس میں اگر پہاڑ بھی ڈال دیا جائے تو وہ سما جائے۔ اور جب آگ ان کی کھالوں کو جلادے گی تو اس کی جگہ نئی کھالیں آجائیں گی۔ ایک حدیث میں تو اس سے بھی زیادہ لمبائی بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دوزخ میں جہنمی بہت بڑے ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان کے کان کی لو سے کندھے تک کا فاصلہ سات سو سال کا ہوگا اور جلد کی موٹائی ستر گز اور ان کی ایک داڑھ احد پہاڑ کی مثل ہوگی(1)۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہاں جلد سے مراد ان کے لباس ہیں۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ آیت کے ظاہری مفہوم کے مخالف ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہاں ان خوش بخت لوگوں کے بارے میں بیان کیا جارہا ہے جو جنت عدن میں اقامت پذیر ہوں گے۔ ان کے نیچے جگہ جگہ نہریں رواں ہوں گی۔ بلکہ وہ جہاں چاہیں گے وہیں نہر رواں ہو جائے گی اور وہ اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ یعنی یہ عورتیں حیض، نفاس، میل کچیل، گھٹیا اخلاق اور ناقص صفات سے پاک ہوں گی۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ وہ گندگی اور میل کچیل سے پاک ہوں گی۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ وہ بول و براز، حیض، منی، تھوک، نخامہ وغیرہ سے پاک ہوں گی۔

وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا: یعنی ان کو ایسے سایہ میں داخل کریں گے جو انتہائی گھنا، خوشبودار اور دلفریب ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کے سایہ میں سوار اگر ایک سال تک بھی چلتا رہے تو وہ سایہ ختم نہیں ہو گا۔ اس درخت سے مراد شجرۂ خلد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں اور جب بھی فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو انصاف سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت ہی اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے تمہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہر چیز دیکھنے والا ہے"۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے امانت کی صاحب امانت کے سپرد کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت سمرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے تمہارے پاس کوئی امانت رکھی ہے اسے اس کی امانت واپس کرو۔ اور جو تمہارے ساتھ خیانت

1۔ مسند احمد 26/2

کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ آیت کریمہ کے الفاظ عام ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر واجب کردہ حقوق کی ادائیگی کو بھی شامل ہے جیسے نماز، روزہ، زکوۃ، کفارہ اور نذر وغیرہ اور اس طرح بندوں کے باہمی حقوق کو بھی شامل ہے جیسے کسی نے کسی کے پاس امانت رکھی اور امانت رکھنے والے کے پاس کوئی دلیل یا گواہ نہ بھی ہو تب بھی اس پر لازم ہے کہ امانت مالک کو واپس کر دے۔ اگر اس نے اس دنیا میں ایسا نہ کیا تو قیامت کے دن اس کی پکڑ ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ہر صاحب حق کو اس کا حق دلوایا جائے گا یہاں تک کہ اگر بے سینگ بکری سینگی والی بکری نے مارا ہوگا تو اسے بھی بدلہ دیا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ شہادت امانت کے سوا ہر شی کو مٹا دیتی ہے۔ قیامت کے دن اس کو اللہ کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا کہ امانت ادا کر وہ کہے گا کہ اب میں امانت کیسے ادا کر سکتا ہوں جب کہ دنیا ہی موجود نہیں۔ اسی اثناء میں وہ امانت جہنم کے پیندے میں نظر آئے گی۔ وہ اس میں چھلانگ لگا دے گا اور اسے اپنے کاندھوں پر اٹھائے گا لیکن وہ اس کے کاندھوں سے نیچے گر جائے گی۔ وہ پھر اسے اٹھائے گا اور وہ گر جائے گی۔ اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس عذاب میں مبتلا رہے گا۔ حضرت زاذانؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ حدیث سن کر حضرت براء کے پاس حاضر ہوا اور انہیں یہ حدیث بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ میرے بھائی نے سچ کہا ہے اور پھر یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ نیک اور بد دونوں کو شامل ہے۔ ابو العالیہ کا قول ہے کہ جس چیز کا حکم دیا جائے اور جس سے روکا جائے یہ سب امانت میں شامل ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ عورت کا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا بھی امانت میں داخل ہے۔ ربیع بن انسؒ فرماتے ہیں کہ تیرے اور غیر کے درمیان جتنے بھی معاملات ہیں یہ سب امانت میں شامل ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ حاکم وقت عید والے دن اپنے خطبہ میں عورتوں کو نصیحت فرمائے۔ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا اور لوگوں کو امن وسکون حاصل ہو گیا تو آپ بیت اللہ میں تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا۔ جب حجر اسود کے پاس سے گزرتے تو اپنی چھڑی مبارک سے اس کا بوسہ لیتے۔ پھر آپ نے طواف مکمل کر کے عثمان بن طلحہ کو بلایا۔ جو بیت اللہ کے کلید بردار تھے۔ اس سے چابی لی اور دروازہ کھلوا کر بیت اللہ شریف میں داخل ہو گئے۔ وہاں لکڑی کا ایک بت تھا جس کو آپ نے دست مبارک سے توڑا اور اسے نیچے پھینک دیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ ثابت کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی۔ تمام گروہوں کو اکیلے ہی شکست سے دوچار کیا۔ ہر قسم کی خاندانی شرافت، مال اور خون کے جھگڑے میرے ان قدموں تلے ہیں سوائے بیت اللہ کی خدمت گزاری اور حاجیوں کو پانی پلانے کے۔ اسی طویل حدیث میں ذکر ہے کہ پھر آپ مسجد حرام میں بیٹھ گئے۔ حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ بیت اللہ کی چابی مجھے عنایت فرمائیں تاکہ حاجیوں کو پانی پلانے کے منصب کے ساتھ ساتھ کعبہ شریف کی چوکیداری کا منصب بھی ہمیں مل جائے اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ عثمان بن طلحہ کہاں ہے۔ اسے بلایا گیا تو آپ نے فرمایا عثمان! یہ لو اپنی چابی۔ یہ وفا اور وعدہ پورا کرنے کا دن ہے(1)۔ حضرت ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت عثمان بن طلحہ کے بارے میں نازل ہوئی جن سے رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کی چابی لی تھی۔ جب آپ بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو آپ یہ آیت کریمہ تلاوت فرما رہے تھے آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا اور اسے چابی عطا فرما دی۔ حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کعبہ سے باہر نکلے تو یہ آیت کریمہ تلاوت فرما رہے تھے۔ میں نے آپ کو اس سے پہلے یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے نہیں سنا(2)۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ شریف

1۔ سیرۃ ابن ہشام: 312/2 2۔ تفسیر الطبری: 145/5

فتح کیا تو آپ نے حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا اور فرمایا کہ مجھے چابی دو۔ جب انہوں نے چابی دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو حضرت عباسؓ کھڑے ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں حاجیوں کو پانی پلانے کے منصب کے ساتھ ساتھ بیت اللہ کی چابی برداری کا منصب بھی مجھ عطا فرمادیجئے۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ نے اپنے ہاتھ کو تھوڑا سا پیچھے کرلیا تو رسول اللہ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا، عثمان مجھے چابی دو۔ انہوں نے چابی دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو حضرت عباسؓ نے پھر وہی بات کی۔ تو انہوں نے یہ سن کر پھر اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عثمان! اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو مجھے چابی دو۔ انہوں نے چابی دے دی اور عرض کی کہ یہ اللہ کی امانت ہے۔ آپ نے دروازہ کھولا وہاں آپ نے ابراہیم علیہ السلام کا مجسمہ دیکھا جس کے ساتھ ہی فال نکالنے والے تیر رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ان مشرکین پر اللہ کی لعنت ہو حضرت ابراہیم اور ان تیروں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ پھر آپ نے پانی منگوایا اور اس میں ڈبو کر ان تمام مجسموں کو ختم کر دیا۔ پھر مقام ابراہیم کو بیت اللہ سے نکال کر کعبہ کی یوار میں نصب کرادیا۔ پھر آپ باہر تشریف لائے۔ بیت اللہ شریف کا طواف فرمانے لگے۔ اسی اثناء میں حضرت جبرئیلؑ یہ آیت کریمہ لے کر حاضر ہوئے۔ یہ مشہور روایات ہیں جو اس آیت کریمہ کا سبب نزول ہیں۔ بہرحال اس آیت کریمہ کا حکم عام ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس اور محمد بن حنفیہ نے فرمایا ہے کہ یہاں ہر نیک اور بد کو امانت واپس کرنے کا حکم ہے۔ حضرت عثمان بن طلحہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان مسلمان ہوئے اور یہ شیبہ بن عثمان کے چچا کے بیٹے ہیں۔ ان کی نسل کے پاس کعبہ شریف کی کلید برداری کا منصب آج تک موجود ہے۔

وَ إِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ: یہاں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس لیے محمد بن کعب، زید بن اسلم اور شہر بن حوشب فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان حکماء اور امراء کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید اس وقت تک حاکم کو حاصل رہتی ہے جب تک وہ عدل کا دامن نہ چھوڑے۔ اور جب وہ ظلم کرنے لگتا ہے تو وہ اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیتا ہے(1)۔ ایک صحابی کا قول ہے کہ ایک دن کا عدل چالیس سال کی عبادت کے برابر ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ: یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو امانت ادا کرنے، لوگوں کے درمیان انصاف کرنے اور اس کے علاوہ دوسرے شرعی احکام کا حکم دیا ہے یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو سننے والا اور تمہارے افعال کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور پھر ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔ حضرت ابو یونس فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سنا کہ انہوں نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی اور اپنے انگوٹھے کو اپنے کان کے اوپر اور ساتھ والی انگلی یعنی شہادت کی انگلی کو اپنی آنکھ پر رکھا اور فرمایا کہ میں نے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ اور اسی طرح آپ نے اپنی انگلی اور انگوٹھے کو رکھا تھا۔ ابو زکریا فرماتے ہیں کہ ہمارے استاد مقری نے بھی ہمیں یہ کیفیت بیان کی ہے۔ پھر آپ نے اپنے دائیں کے انگوٹھے اپنی دائیں آنکھ پر رکھا اور شہادت کی انگلی کو دائیں کان پر رکھا(2)۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح، حاکم نے مستدرک اور ابن مردویہ نے ابو عبد الرحمٰن مقری سے روایت کیا ہے۔ اور اس حدیث کے راوی ابو یونس حضرت ابو ہریرہؓ کے غلام ہیں جن کا نام سلیم بن جبیر ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام: 775　　2۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ 233/4

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۧ ﴿۵۹﴾

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو (اپنے ذیشان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں پھر اگر جھگڑنے لگو تم کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور (اپنے) رسول (کے فرمان) کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز قیامت پر یہی بہتر ہے اور بہت اچھا ہے اس کا انجام"۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت عبداللہ بن حذافہ بن قیسؓ کے بارے میں نازل ہوئی جب ان کو رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹے سے لشکر میں بھیجا۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر کو کسی مہم کے لیے روانہ کیا اور ایک انصاری صحابی کو ان کا امیر مقرر کیا۔ جب وہ مدینہ طیبہ سے دور نکل گئے تو انہیں کسی بات پر غصہ آ گیا اور کہنے لگے کیا تمہیں رسول اللہ ﷺ نے میری اطاعت کا حکم نہیں دیا۔ انہوں نے جواب دیا، کیوں نہیں۔ انہوں نے کہا پھر لکڑیاں اکٹھی کرو۔ جب لکڑیاں اکٹھی ہو گئیں تو ان کو آگ لگائی اور پھر کہا کہ اس آگ میں کود جاؤ۔ ان میں سے ایک نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم نے آگ سے نجات حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے دامن میں پناہ لی ہے۔ اس لیے ان سے ملاقات سے پہلے جلدی نہ کرو۔ پھر اگر وہ تمہیں یہی حکم دیں تو پھر بے جھجک آگ میں کود پڑنا۔ جب یہ لوگ واپس مدینہ طیبہ پہنچے تو حضور ﷺ کو سارا واقعہ بیان کیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم آگ میں داخل ہو جاتے تو اس سے کبھی بھی نکل نہ پاتے۔ فرمانبرداری اور اطاعت تو صرف نیکی میں ہوتی ہے(1)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سمع و اطاعت مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ چیز اسے پسند ہو یا ناپسند۔ جب تک اسے (اللہ اور اس کے رسول) کی معصیت کا حکم نہ دیا گیا ہو(2)۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سمع و اطاعت پر ہماری بیعت لی خواہ ہم خوش ہوں یا ناخوش تنگی میں ہوں یا آسانی میں۔ اگرچہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جا رہی ہو(3)۔ اور ہماری بیعت اس بات پر بھی تھی کہ ہم صاحب امر سے اس کے امر کو نہ چھینیں۔ مگر یہ کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھو اور تمہارے پاس قرآن و حدیث سے کوئی دلیل ہو۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ کسی ایسے حبشی غلام کو تم پر امیر بنا دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح ہو(4)۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل (رسول اللہ ﷺ) نے مجھے یہ وصیت کی ہے کہ میں سنوں اور اطاعت کروں اگرچہ امیر کٹی ہوئی ناک والا حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو(5)۔ خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا اگر کسی غلام کو تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ قرآن کے احکام کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں اگرچہ وہ کٹی ناک والا حبشی غلام ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد تمہارے پاس مختلف حاکم آئیں گے نیک اپنی نیکی کے ساتھ اور بد اپنی بدی کے ساتھ۔ پس ان امور میں ان کی بات سنو اور اطاعت کرو جو حق کے موافق

1۔ مسند احمد: 82/1 — 2۔ مسلم، کتاب الامارۃ: 1469 — 3۔ مسلم، کتاب الامارۃ: 1470

4۔ فتح الباری، کتاب الاحکام 121/13 — 6۔ مسلم، کتاب الامارۃ: 1467

ہوں۔اوران کے پیچھے نماز پڑھو۔اگر وہ نیکی کریں تو اس کا تمہیں بھی فائدہ ہے اور انہیں بھی فائدہ ہے۔اور اگر وہ کوئی برائی کریں تو اس میں تمہیں فائدہ ہوگا اور اس کی ذمہ داری انہی پر ہوگی(1)۔آپ سے ہی ایک اور حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں مسلسل رسول آتے رہے لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔اور میرے بعد کثرت سے خلفاء ہوں گے۔عرض کی آپ ہمیں ان کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں۔فرمایا کہ ان میں سے پہلے کی بیعت کرو اور پھر اس کے بعد آنے والے کو اس کے حقوق اسے عطا کرو۔اللہ تعالیٰ اسے اس کی رعایا کے بارے میں خود ہی پوچھے گا(2)۔حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے امیر کا کوئی ناپسندیدہ کام دیکھے تو اسے صبر کرنا چاہئے۔جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور پھر اسی حالت میں مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے(3)۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت یا دلیل نہیں ہوگی۔اور جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں کوئی بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرا(4)۔حضرت عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں مسجد حرام میں داخل ہوا تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص بیت اللہ کے سایے میں تشریف فرما تھے۔لوگ آپ کے اردگرد جمع تھے۔میں بھی وہاں بیٹھ گیا۔فرمانے لگے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے ہم ایک جگہ اترے تو ہم میں سے بعض خیمہ لگانے میں مصروف ہو گئے۔بعض تیر اندازی میں مشغول ہو گئے اور بعض جانور چرانے چلے گئے۔اسی اثناء میں منادی رسول نے نداء دی۔ہم سب آپ کی خدمت میں جمع ہو گئے۔تو آپ نے فرمایا مجھ سے پہلے جتنے بھی نبی گزرے ہیں۔ان میں سے ہر ایک کا فرض تھا کہ وہ اپنی امت کو ان تمام نیکیوں سے آگاہ کرے جو وہ جانتا ہے۔اور ان تمام برائیوں سے ڈرائے جنہیں وہ جانتا ہے۔اس امت کی عافیت اس کے ابتدائی زمانے میں ہے اور آخر زمانے میں بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہوں گی۔اور ایسے امور پیش آئیں گے جن کو تم ناپسند کرو گے اور پھر لگاتار کئی فتنے رونما ہوں گے۔جب ایک فتنہ آئے گا تو مومن سمجھے گا اسی میں میری ہلاکت ہے۔پھر یہ گزر جائے گا۔اور دوسرا فتنہ آئے گا۔مومن پھر یہی کہے گا۔پس جو پسند کرتا ہے کہ نار جہنم سے اسے بچالیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔جب کسی نے کسی امام کی بیعت کر لی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اسے چاہئے کہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کی اطاعت کرے اور اگر کوئی دوسرا شخص اس سے یہ امارت چھیننا چاہے تو اس کی گردن اڑا دو۔راوی فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرو کے قریب ہوا اور عرض کی کہ میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تو نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔انہوں نے اپنے کانوں اور دل کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور فرمایا میرے ان کانوں نے سنا ہے اور اس دل نے محفوظ رکھا۔پھر راوی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی پھر تمہارا چچازاد بھائی معاویہ (رضی اللہ عنہ) ہمیں آپس میں باطل طریقے سے مال کھانے ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ......(نساء:29)''ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنا آپس ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ۔مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔نہ اپنے آپ کو ہلاک کرو۔بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے''۔یہ سن کر عبداللہ تھوڑی دیر خاموش رہے۔

1۔تفسیر الطبری 150/5
2۔فتح الباری، کتاب الانبیاء 495/6
3۔مسلم، کتاب الامارۃ 1478
4۔مسلم، کتاب الامارۃ 1478

پھر فرمایا کہ اللہ کی اطاعت میں ان کی اطاعت کرو اور اگر اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کی اطاعت نہ کریں (1)۔ حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ جس میں حضرت عمار بن یاسرؓ بھی شامل تھے۔ یہ لشکر مدینہ طیبہ سے نکل کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ اور منزل کے قریب پہنچ کر رات کے آخری حصے میں پڑاؤ کیا۔ دشمن کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ہو گئی اور وہ رات ہی کو فرار ہو گئے۔ ان میں سے صرف ایک شخص رہ گیا اور اپنا مال و متاع لے کر رات ہی کو مسلمانوں کے لشکر میں آ گیا۔ اور حضرت عمار کے پاس آیا اور انہیں کہا اے ابو یقظان! میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ میری قوم نے جب تمہارے متعلق سنا تو وہ بھاگ گئی۔ میں اکیلا ہی باقی رہ گیا۔ کیا میرا اسلام مجھے کل فائدہ دے گا آپ نے فرمایا ہاں آپ کا اسلام آپ کو فائدہ دے گا اور فرمایا یہاں ہمارے پاس ٹھہر جاؤ۔ صبح کے وقت جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے حملہ کیا تو وہاں اس شخص کے علاوہ کسی کو نہ پایا۔ انہوں نے اس کو قید کر لیا اور اس کا مال بھی لے لیا۔ جب حضرت عمارؓ کو یہ خبر ملی تو آپ حضرت خالدؓ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اس آدمی کو چھوڑ دو، یہ مسلمان ہو چکا ہے۔ اور یہ میری امان میں ہے۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا تم نے اسے کس طرح پناہ دے دی ہے۔ اس پر دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی۔ پھر یہ معاملہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے حضرت عمارؓ کی پناہ کو جائز قرار دے دیا۔ اور فرمایا دوبارہ کسی کو اپنے امیر کی طرف سے پناہ نہ دینا۔ اس پر ان دونوں میں سخت کلامی ہو گئی تو حضرت خالدؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! دیکھیے! یہ ناک کٹا غلام مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا خالد! جو عمار کو گالی دیتا ہے اللہ اسے ناپسند کرتا ہے، جو اس سے بغض رکھتا ہے اللہ اس سے بغض رکھتا ہے اور جو اس پر لعنت کرتا ہے اللہ اس پر لعنت کرتا ہے۔ حضرت عمارؓ غصے میں تھے، وہاں سے اٹھے اور چل دیئے۔ حضرت خالدؓ ان کے پیچھے گئے اور ان کا دامن پکڑ کر معذرت کی حتیٰ کہ وہ ان سے راضی ہو گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''اولی الامر'' سے مراد اہل فقہ اور اہل دین ہیں۔ مجاہد، عطاء، حسن بصری اور ابو العالیہؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد علماء ہیں۔ ظاہری بات تو یہ ہے کہ یہ حکم ہے۔ امراء اور علماء دونوں کو شامل ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ''ترجمہ: کیوں نہیں منع کرتے ان کے مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے۔'' اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ''ترجمہ: اہل ذکر سے سوال کرو اگر تم نہیں جانتے۔'' حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ قرآن کی ان آیات اور احادیث سے ثابت ہوا کہ علماء اور امراء دونوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی اطاعت کرو یعنی اس کی کتاب پر عمل کرو اور رسول کی اطاعت کرو یعنی اس کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرو یعنی ان امور میں جن میں وہ تمہیں اللہ کی اطاعت کا حکم دیں۔ اور اگر اللہ کی معصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت نہ کرو۔ کیونکہ اللہ کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت کرنا صحیح نہیں۔ جیسا کہ پہلے حدیث پاک گزر چکی ہے کہ اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہ کرو (2)۔

1۔ مسلم، کتاب الامارۃ 1472   2۔ مسند احمد 426/4

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ: حضرت مجاہد اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف لوٹاؤ۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل واضح حکم ہے کہ اگر لوگوں کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے خواہ اس کا تعلق دین کے اصول سے ہو یا فروع سے انہیں چاہئے کہ اس سلسلہ میں قرآن اور سنت کو فیصل بنائیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (شوریٰ:10) "ترجمہ: اور جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد کردو"۔ یعنی جو حکم قرآن وحدیث کا ہے وہی حق ہے۔ اس کے علاوہ سب گمراہی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اگر تم اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو یعنی اگر تم سچے مسلمان ہو تو اپنے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات اور لڑائی جھگڑوں میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو اپنا فیصل بنالو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص کتاب و سنت کو اپنا فیصل اور حکم نہیں مانتا وہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔ پھر ارشاد فرمایا: اپنے جھگڑوں میں قرآن وسنت کو فیصل بنانا اور ان کی طرف رجوع کرنا ہی بہتر ہے۔ عاقبت اور انجام کے اعتبار سے یہی بہتر ہے۔ اور اسی سے تمہیں اچھی جزاء ملے گی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿٦٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿٦٢﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿٦٣﴾

"کیا نہیں دیکھا آپ نے ان کی طرف جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس (کتاب) کے ساتھ جو اتاری گئی آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے (اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لیے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا اور چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک۔ اور جب کہا جائے انہیں آؤ اس (کتاب) کی طرف جو اتاری ہے اللہ نے اور (آؤ) رسول ﷺ (پاک) کی طرف تو آپ دیکھیں گے منافقوں کو کہ منہ موڑ لیتے ہیں آپ سے روگردانی کرتے ہوئے پس کیا حال ہوتا ہے جب پہنچتی ہے انہیں مصیبت بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے پھر حاضر ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی (کہتے ہیں بخدا) نہیں قصد کیا تھا ہم نے مگر بھلائی اور باہمی مصالحت کا۔ یہ لوگ ہیں خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے (اے حبیب!) چشم پوشی فرمائیے ان سے اور نصیحت کرتے رہیے انہیں اور کہیے انہیں تنہائی میں ایسی بات جو موثر ہو"۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ: ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے جو اس کے رسول اور سابقہ انبیاء پر

1۔ مسند احمد 426/4

نازل کردہ کتابوں پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود جب اس لڑائی جھگڑے میں فیصلے کا موقع آتا ہے تو کتاب وسنت کو اپنا فیصل نہیں مانتے بلکہ کسی اور طرف نکل جاتے ہیں۔ اس آیت کے شان نزول میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک انصاری اور یہودی کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ یہودی کہنے لگا چلو محمد (ﷺ) سے فیصلہ کراتے ہیں لیکن وہ انصاری کہنے لگا چلو کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جو بظاہر تو اسلام کا اظہار کرتے لیکن در پردہ اپنے جاہلی امیروں کو اپنا حکم بناتے۔ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں بعض دوسرے اقوال بھی ہیں۔ لیکن یہ آیت کریمہ اپنے حکم کے اعتبار سے عام ہے اور ہر اس شخص کی مذمت کرتی ہے جو کتاب وسنت سے اعراض کر کے باطل کو اپنا حکم بناتا ہے۔ یہاں طاغوت سے بھی یہی مرد ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مقدمات کے فیصلے کرانے کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان تو چاہتا کہ وہ انہیں بہت دور تک بہکا دے۔ ''صدود'' کا معنی یہ ہے کہ وہ تکبر کی وجہ سے آپ سے منہ موڑ لیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ''ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تو وہ کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا''۔ اس کے برعکس اللہ نے مومنین کے بارے میں ارشاد فرمایا: اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ..... (نور:51) ''ترجمہ: ایمان والوں کی بات تو اتنی ہے کہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ فرما دے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے فیصلہ سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں بامراد ہیں''۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ منافقین کی مذمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ ان کی اس وقت کیا حالت ہوگی جب ان کے گناہوں کے سبب سے ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ تمہاری بارگاہ میں چلے آتے ہیں اور معذرت کرتے ہیں اور قسمیں کھا کر عرض کرتے ہیں کہ ہم جو غیر کے پاس گئے تھے اور آپ کے دشمنوں کو جو فیصل بنایا تھا اس کا مقصد صرف ان کے ساتھ رواداری کا اظہار کرنا تھا۔ اور ان کے فیصلہ کے صحیح ہونے کا ہم اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مفہوم کو اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ ''ترجمہ: سو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے کہ وہ دوڑ دوڑ کر یہود ونصاریٰ کی طرف جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہی کہ کہیں ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ تمہیں فتح کامل دے دے یا ظاہر کر دے اپنی طرف سے کامیابی کی کوئی بات۔ تو پھر ہو جائیں اس پر جو انہوں نے چھپا رکھا تھا اپنے دلوں میں نادم''۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ابو برزہ اسلمی ایک کاہن تھا جو یہود میں اختلاف کے وقت فیصلے کیا کرتا تھا۔ ایک واقعہ میں مشرکین بھی فیصلے کے لیے اس کے پاس چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ: لوگوں کی ایک قسم جنہیں منافقین کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے۔ عنقریب انہیں اس کی سزا بھی دے گا۔ کیونکہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں جو ظاہر و باطن تمام احوال سے آگاہ ہے۔ اس لیے آپ ان سے اعراض کریں اور ان کے دلوں میں نفاق کی جو بیماری ہے ان پر سختی نہ کریں اور ان کو اس منافقت اور شر انگیزی سے باز رہنے کی نصیحت کریں۔ اور ایسے فصیح وبلیغ کلام سے گفتگو فرمائیں جو ان کو ان افعال سے روک دے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

"اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنے آپ پر حاضر ہوتے آپ کے پاس اور مغفرت طلب کرتے اللہ تعالیٰ سے نیز مغفرت طلب کرتا ان کے لیے رسول (کریم) بھی تو وہ ضرور پاتے اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ فرمانے والا نہایت رحم کرنے والا۔ پس (اے مصطفیٰ) تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کرلیں دل وجان سے"۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ: یہاں ارشاد ہوتا ہے ہر رسول کی اطاعت اس کی امت پر اللہ کی طرف سے فرض کر دی گئی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ رسول کی اطاعت وہی کرے گا جس کو میں توفیق عطا کروں گا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ یہاں بھی "اذن" سے مراد حکم خداوندی قدرت الٰہی اس کی مشیت اور توفیق مراد ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ گنہگاروں اور خطاکاروں سے ارشاد فرماتا ہے کہ جب ان سے کوئی غلطی اور خطا ہو جائے۔ انہیں چاہئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور وہاں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کریں کہ وہ ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے گا اور رحم فرما کر ان پر اپنی مغفرت کے دروازے کھول دے گا۔ شیخ ابو منصور صباغ اپنی مشہور کتاب میں عتبی سے روایت کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی قبر انور کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور عرض کی "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" میں نے قرآن کریم کی ایک آیت سنی ہے "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا......" میں اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا ہوں اور آپ کو اپنے رب کی بارگاہ میں شفیع بناتا ہوں۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے۔

يَا خَيْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ اَعْظُمُهٗ　　　فَطَابَ مِنْ طِيْبِهِنَّ الْقَاعُ وَالْاَكَمُ
نَفْسِيَ الْفِدَآءُ لِقَبْرٍ اَنْتَ سَاكِنُهٗ　　　فِيْهِ الْعِفَافُ وَ فِيْهِ الْجُوْدُ وَ الْكَرَمُ

(اے ان سب سے افضل ترین ہستی جن کے جسد خاکی کو اس سرزمین میں دفن کیا گیا ہے۔ جنکی خوشبو سے میدان اور ٹیلے مہک اٹھے۔ میری جان اس قبر پر قربان ہو جس میں آپ محو استراحت ہیں۔ اسی میں پارسائی ہے اور اسی میں جود و سخا ہے)۔

عتبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ شعر کہنے کے بعد اعرابی تو لوٹ گیا اور مجھے نیند آ گئی۔ میں نے خواب میں نبی پاک کی زیارت کی کہ آپ فرما رہے تھے کہ اے عتبی! جاؤ اعرابی کو خوشخبری دے دو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا ہے (1)۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات مقدسہ کی قسم کھا کر ارشاد فرماتا ہے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے تمام معاملات اور امور میں رسول اللہ ﷺ کو اپنا حکم اور فیصل تسلیم نہ کرے اور جو آپ فیصلہ فرمائیں اس

1۔ "الشامل"، العتبی

کو حق سمجھتے ہوئے اپنے ظاہر اور باطن سے اس کی پیروی نہ کرے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا یعنی جب وہ آپ کو فیصل بنالیں تو دل و جان سے آپ کی اطاعت کریں اور آپ جو فیصلہ فرمادیں اس کے بارے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ کیونکہ آپ کی بارگاہ میں نہ تو کسی کی انکار کی گنجائش ہے اور نہ ہی لڑائی جھگڑے۔ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی خواہش کو ان احکام کے تابع نہ کر دے جن کو میں لے کر آیا ہوں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت زبیرؓ کا کسی انصاری آدمی کے ساتھ پانی کی باری پر جھگڑا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے زبیر! پہلے اپنے باغ کو سیراب کرلو پھر اپنے پڑوسی کے لیے چھوڑ دو۔ اس پر انصاری نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے یہ حکم اس لیے فرمایا ہے کہ وہ آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے۔ یہ سن کر آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور آپ نے فرمایا اے زبیر! اپنے باغ کو سیراب کرو اور پھر پانی کو روکے رکھو یہاں تک کہ پانی باغ کی دیواروں تک پہنچ جائے۔ پھر پڑوسی کے لیے پانی چھوڑ دینا۔ آپ نے جو حکم فرمایا تھا اس میں حضرت زبیر اور انصاری دونوں کے لیے سہولت تھی۔ لیکن جب اس انصاری نے اس حکم کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھا تو آپ نے حضرت زبیر کو اپنا پورا حق وصول کرنے کا حکم فرمادیا۔ حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی ہے(1)۔ مسند امام کی مرسل روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ یہ انصاری صحابی بدری تھے۔ ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں جھگڑا اس بات پر تھا کہ پانی کا کھال پہلے حضرت زبیرؓ کے باغ سے گزرتا تھا اور اس کے بعد انصاری کے باغ سے۔ وہ انصاری چاہتے تھے کہ حضرت زبیر پانی کو نہ روکیں تاکہ بیک وقت دونوں باغ سیراب ہوتے رہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر کو حکم فرمایا کہ پہلے تم اپنا باغ سیراب کرلو پھر پڑوسی کے لیے چھوڑ دیا کرو۔ حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ یہ جھگڑا حضرت زبیر اور حاطب بن ابی بلتعہ کے درمیان ہوا تھا۔ اس آیت کریمہ کا ایک شان نزول یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دو آدمی اپنا مقدمہ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کے درمیان فیصلہ فرما دیا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا اس نے کہا ہمیں عمر بن خطابؓ کے پاس بھیج دیجئے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے اس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ دونوں اس کے پاس پہنچے اور تمام واقعہ بیان کیا کہ ہمارے درمیان جھگڑا ہوا اور حضور ﷺ نے اس کا فیصلہ فرمایا۔ جس کے حق میں فیصلہ ہوا اس نے حضرت عمرؓ سے کہا اے عمر! حضور ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ فرما چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آ کر تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں۔ آپ اندر گئے اور تلوار لے کر باہر نکلے اور اس شخص کی گردن اڑا دی جس نے کہا تھا کہ ہمیں عمرؓ کے پاس بھیج دو۔ یہ دیکھ کر دوسرا شخص بھاگ کھڑا ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کی کہ عمر نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا اور اگر میں وہاں سے نہ بھاگتا تو میری بھی خیر نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے خیال نہ تھا کہ عمر ایک مومن کا خون بہانے میں اتنا جری ہو جائے گا۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس شخص کا خون رائے گاں ہو گیا اور حضرت عمرؓ اس کے قتل سے بری ہو گئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو ناپسند کیا کہ یہ طریقہ اس کے بعد لوگوں میں جاری نہ ہو جائے اس لیے اس کے ساتھ ہی یہ آیت کریمہ: وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ نازل فرمائی۔ اسے ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں ابن لہیعہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ابن لہیعہ ضعیف راویوں میں سے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دو شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے جو صاحب حق تھا، کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا اس نے کہا میں اس فیصلے پر راضی نہیں ہوں۔ دوسرے نے کہا اب تم کیا چاہتے ہو۔ اس نے کہا چلو حضرت ابوبکرؓ کے پاس چلتے ہیں۔ دونوں آپ

1۔ فتح الباری، کتاب التفسیر 254/8

کے پاس پہنچے تو آپ نے واقعہ سن کر فرمایا کہ وہی حق ہے جو رسول اللہ ﷺ فرما چکے ہیں۔ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا اور کہا کہ چلو حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں۔ جب حضرت عمرؓ نے یہ حال سنا آپ اندر تشریف لے گئے اور تلوار لا کر اس کا سر قلم کر دیا جس نے رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۙ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

''اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر کہ قتل کروا ؤ اپنے آپ کو یا نکل جاؤ اپنے گھروں سے بجا نہ لاتے اس کو مگر چند آدمی ان میں سے اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہوتا بہتر ان کے لیے اور اس طرح سختی سے (اللہ کے احکام پر) ثابت قدم ہو جاتے۔ تو اس وقت ہم بھی عطا فرماتے انہیں اپنے پاس سے اجر عظیم۔ اور ضرور پہنچاتے انہیں سیدھے راستہ تک۔ اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ کی اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔ یہ (محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کا اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا''۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ: اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے کہ اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کو ان منع کردہ امور کا حکم دیا جائے جن کا ارتکاب وہ اس وقت کر رہے ہیں وہ نہ کریں۔ کیونکہ ان کی طبیعتیں اتنی گھٹیا ہیں کہ وہ اللہ کے حکم کی مخالفت کے عادی ہو چکے ہیں یہاں اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں اپنے علم کا اظہار فرمایا ہے جو واقع ہی نہیں ہوئیں اور ان چیزوں کے بارے میں علم کا عالم کیا ہوگا جو واقع ہونے والی ہیں۔ یہ سن کر ایک صحابیؓ نے عرض کی کہ اگر ہمارا رب ہمیں حکم دیتا تو ہم اس کی تعمیل کرتے۔ مگر اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اس امتحان سے محفوظ رکھا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سنی تو ارشاد فرمایا کہ میری امت کے کچھ ایسے افراد بھی ہیں کہ جن کے دلوں میں ایمان مضبوط پہاڑوں سے بھی زیادہ مستحکم ہے(1)۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے حضرت ثابت بن قیسؓ سے فخر سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے نفسوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا تو ہم نے اپنے آپ کو قتل کر ڈالا تھا اور اگر اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ حکم دے تو ہم پھر تعمیل حکم کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم فرما دیتا تو ابن ام عبد ہی اس حکم کو بجالانے والوں میں سے ہوتے۔ شریح بن عبید فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی تو عبداللہ بن رواحہؓ کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا اور فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم دے دیتا تو یہ بھی اس حکم کو بجالانے والے چند خوش نصیبوں میں ہوتے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ ان امور کو بجالاتے ہیں جن کو کرنے کا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے اور ان امور سے اجتناب کرتے جن سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہے تو یہ ان

1۔ تفسیر الطبری 161,160/5

کے لیے بہتر ہوتا اور یہ چیز ان کے دلوں میں ایمان کی پختگی کا باعث ہوتی تو ہم اس پر ان کو اپنے خاص فضل واحسان سے اجر عظیم یعنی جنت عطا کرتے اور دنیا وآخرت میں صراط مستقیم پر چلنے میں راہنمائی کرتے۔

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل پیرا ہوگا اور ان کے منع کردہ امور سے اجتناب کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں خاص مقام عطا فرمائے گا اور اس کو اپنے انبیاء کا رفیق بنادے گا اور ان صدیقوں کا جو مرتبے میں انبیاء کے بعد ہیں پھر شہداء کا اور پھر نیک مومنوں کا۔ جن کے ظاہری اعمال اور باطنی احوال اللہ تعالیٰ کی رضا کے موافق ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر نبی کو اس کے مرض کے دوران اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا یا آخرت میں رہنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ جس مرض میں آپ نے وصال فرمایا اس میں آپ کی آواز بہت پست ہوگئی تھی۔ میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيۡقِيۡنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيۡنَ‌ۚ آپ کی زبان مبارک میں یہ الفاظ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ آپ کو اختیار دے دیا گیا(1)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا: "اللّٰھم الرفیق الاعلی" اے اللہ! میں بلند وبالا رفیق کا طالب ہوں۔ اس کے بعد آپ اس دار فانی سے رحلت فرماگئے(2)۔

آیت مذکورہ کا شان نزول: حضرت سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا اور رنگ اڑا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے وجہ دریافت فرمائی تو عرض کی یا رسول اللہ! آج ایک چیز کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ عرض کی کہ ہم صبح وشام آپ کے چہرہ انور کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اور آپ کی ہم نشینی کا شرف پاتے ہیں۔ کل قیامت کے دن آپ انبیاء کے ساتھ بلند مقام پر فائز ہوں گے۔ یوں ہم آپ کے روئے تاباں کی زیارت نہیں کر سکیں گے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ خاموش ہوگئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ آیت کریمہ لے کر حاضر ہوئے اور آپ نے اپنے صحابی کو یہ خوشخبری سنائی(3)۔ یہ روایت بہت سے تابعین نے مرسلاً بیان کی ہے۔ اور یہ سند ان تمام سے بہتر ہے۔ حضرت ربیع فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم نے کہا کہ یقیناً حضور ﷺ کا درجہ آپ پر ایمان لانے والوں سے بہت بڑا ہے۔ پس جب ہم سب جنت میں جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کی زیارت کیسے کر سکیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلند درجوں والے نچلے درجے والوں کے پاس اتر آئیں گے۔ اور جنت کی کیف آفرین بہاروں میں جمع ہو کر اللہ کی نعمتوں کو یاد کریں گے اور اس کی حمد وثناء بیان کریں گے۔ اور اپنی من پسند نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے(4)۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابی حضور ﷺ کے خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ آپ مجھے میری جان، میرے اہل وعیال اور اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ جب میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں اور مجھے آپ کی یاد ستاتی ہے تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا اور جلدی سے آکر آپ کی زیارت سے قرار حاصل کر لیتا ہوں۔ اور جب میں اپنی موت اور آپ کے وصال کا تصور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ آپ انبیاء کے ساتھ مقام رفیع پر فائز ہوں گے اور میں جنت میں داخل ہو بھی گیا تب بھی آپ کی زیارت سے مشرف نہیں ہوں گا۔ نبی کریم ﷺ خاموش رہے حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یہ روایت کئی اسناد سے مروی ہے۔ حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کاشانہ انور کے دروازے کے پاس رات گزارتا اور تہجد کے وقت وضو اور دوسری ضروریات آپ کے لئے بجالاتا۔

1۔ مسلم 137/7 2۔ بخاری 57/6 3۔ تفسیر الطبری 123/5 4۔ تفسیر الطبری 164/5

ایک دفعہ حضور ﷺ نے مجھے فرمایا اے ربیعہ! مانگو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طلب گار ہوں۔ آپ نے فرمایا اس کے علاوہ اور کچھ۔ میں نے عرض کی بس یہی۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اگر میری رفاقت کے طلب گار ہو تو کثرت سجود کے ساتھ میری اعانت کرو(1)۔ عمرو بن مرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پانچوں نمازیں پڑھتا ہوں۔ اپنے مال کی زکوٰۃ دیتا ہوں۔ اور رمضان کے روزے رکھتا ہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ان اعمال پر فوت ہوگا وہ قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح میری یہ دو انگلیاں یعنی آپ نے اپنی دو انگلیوں کا اشارہ کیا۔ مگر یہ شرط ہے کہ وہ اپنے والدین کا نافرمان نہ ہو۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہزار آیتیں پڑھیں۔ قیامت کے دن وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سچا اور ایماندار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا(2)۔ اور اس سے بڑی بشارت اس حدیث میں ہے جس کو صحاح اور مسانید نے صحابہ کرام ﷺ کی ایک بہت بڑی تعداد سے تواتر سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کسی قوم سے محبت رکھتا ہے لیکن عمل کے لحاظ سے ان تک نہ پہنچ سکا۔ آپ نے فرمایا کہ حشر میں انسان اسی کے ساتھ ہوگا دنیا میں جس سے محبت کرتا تھا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر صحابہ کرامؓ بہت خوش ہوئے۔ ایک دوسری روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا میں رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے محبت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے قیامت کے دن ان کے ساتھ اٹھائے گا۔ اگرچہ میرا عمل ان کے عمل کی طرح نہیں(3)۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت اپنے سے بلند درجے والے جنتیوں کو ان کے بالا خانوں میں اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم مشرق مغرب میں چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا یہ مقامات انبیاء کے لیے مخصوص ہیں کہ ان تک کوئی اور نہیں پہنچ سکتا۔ آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ وہاں وہ لوگ بھی پہنچیں گے جو اللہ تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی(4)۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک حبشی کچھ سوال پوچھنے کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے فرمایا کہ سوال پوچھو اور اس کو سمجھو۔ عرض کی یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو صورت رنگ اور نبوت میں فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اگر میں اس چیز پر ایمان لاؤں جس پر آپ ایمان لائے اور ان احکام پر عمل پیرا ہو جاؤں جن پر آپ عمل پیرا ہیں کیا میں بھی آپ کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ جنت میں حبشی کا رنگ اتنا سفید اور روشن ہوگا کہ ایک ہزار کی مسافت سے بھی اس کی نورانیت نظر آئے گی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ "لا الہ الا اللہ" کہنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس عہد وعدہ ہے اور جس نے "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ" پڑھا اس کے نامہ اعمال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اتنی نیکیوں کے بعد پھر ہم کیسے ہلاک ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک شخص اتنے اعمال لے کر آئے گا کہ ان کو اگر پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو وہ بھی بوجھل ہو جائے لیکن جب اس کے مقابلے میں اللہ کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت آئے گی تو وہ نعمت ہی ان اعمال کو ختم کر دے گی۔ مگر یہ کہ اللہ کی رحمت

1۔ مسلم، کتاب الصلوٰۃ: 353 2۔ عارضۃ الاحوذی، ابواب البیوع 212/5
3۔ فتح الباری، کتاب الادب 557/10 4۔ مسلم، کتاب الجنۃ: 2177

اور فضل واحسان اس پر اپنا سایہ کر دے گا۔ اور یہ آیات نازل ہوئیں: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ ...... نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا اس حبشی نے عرض کی یارسول اللہ! جنت میں آپ کی آنکھیں جن چیزوں کا نظارہ کریں گی کیا میری آنکھیں بھی ان کو دیکھ سکیں گی۔ فرمایا۔ ہاں۔ یہ سن کر وہ اتنا روئے کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے خود اپنے دست مبارک سے اس صحابی کو قبر میں اتارا۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اس کا فضل اور خصوصی رحمت ہے وہ جسے چاہے نواز دے، اپنے اعمال سے حاصل کرنا مشکل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے کہ کون اس ہدایت کا حق دار ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

''اے ایمان والو! ہوشیار رہو پھر (وقت آجائے تو) نکلو ٹولیاں بن کر یا نکلو سب مل کر۔ اور بے شک تم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ضرور دیر لگائیں گے اور پھر اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت تو وہ کہے احسان فرمایا ہے اللہ نے مجھ پر کہ میں نہیں تھا ان کے ہمراہ (جنگ میں) حاضر۔ اور اگر ملے تمہیں فضل (فتح اور مال غنیمت) اللہ کی مہربانی سے تو ضرور کہے جیسے نہیں تھی تمہارے درمیان اور اس کے درمیان دوستی کاش میں بھی ہوتا ان کے ہمراہ تو حاصل کرتا بڑی کامیابی۔ پس چاہیے کہ لڑا کرے اللہ کی راہ میں (صرف) وہ لوگ جنہوں نے بیچ دی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض اور جو شخص لڑے اللہ کی راہ میں پھر (خواہ) مارا جائے غالب آئے تو (دونوں حالتوں میں) ہم دیں گے اسے اجر عظیم''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو دشمنوں سے محتاط اور ہوشیار رہنے کا حکم فرما رہا ہے۔ یعنی وہ ہتھیار بند ہو کر دشمن کے مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو کر مجاہدین کی تعداد بڑھائیں تاکہ جب جہاد کا وقت آئے تو حالات کے مطابق گروہ در گروہ یا ایک لشکر جرار کی صورت میں نکل کر کھڑے ہوں۔ ''ثبات'' ثبت کی جمع ہے اور اس کی جمع کبھی کبھار ثبین بھی آتی ہے اور اس کا معنی گروہ ہے۔

وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ: مجاہد اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ مقاتل فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ منافقین جہاد نہیں کرتے بلکہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور اس کا یہ معنی ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی جہاد میں سستی کرتے ہیں اور دوسروں کو جہاد سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ عبداللہ بن ابی یہ کہا کرتا تھا وہ خود بھی جہاد میں شریک ہونے سے پس وپیش کرتا اور دوسرے لوگوں کو بھی جہاد سے روکتا۔ اور اگر جہاد میں مسلمان شہید ہو جاتے یا اللہ کی حکمت کی وجہ سے دشمن کو غلبہ حاصل ہو جاتا تو یہ پیچھے رہ جانے والے منافقین کو کہتا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ہم اس کے معرکہ میں شامل نہیں ہوئے اور اسے اپنے اوپر اللہ کی نعمت تصور

کرتا۔لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ کتنے بڑے اجر وثواب سے محروم ہو گیا ہے۔اور اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے فتح ونصرت اور مال غنیمت حاصل ہو تو اس کی حالت بری ہو جاتی ہے گویا کہ اس کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور مال غنیمت نہ ملنے کی وجہ سے بڑی حسرت سے کہتا کہ کاش ان کے ساتھ میں بھی شریک ہوتا اور مجھے مال غنیمت میں حصہ مل جاتا۔یعنی دنیاوی مال و دولت ہی اس کا مقصد حیات ہے۔پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مومنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جہاد کریں جو اپنے دین کو دنیا کے حقیر مال متاع کے بدلے میں بیچ دیتے ہیں۔ان کا یہ فعل کفر کے مترادف ہے۔پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا خواہ شہید ہو جائے یا فتح ونصرت سے ہمکنار ہو ہم اسے اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہد کا اللہ تعالیٰ خود ضامن ہوتا ہے۔اسے یا تو شہادت کے رتبے پر فائز کر کے جنت میں داخل کر دیتا ہے یا مال غنیمت اور اجر وثواب کے ساتھ واپس اس کے گھر لوٹ دیتا ہے(1)۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

''اور کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جنگ نہیں کرتے ہو راہ خدا میں حالانکہ کئی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آکر) عرض کرتے ہیں اے رب ہمارے نکال ہمیں اس بستی سے ظالم ہیں جس کے رہنے والے۔اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے دوست۔اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار۔جو ایمان لائے ہیں وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں وہ جنگ کرتے ہیں طاغوت کی راہ میں تو (اے ایمان والو) لڑو شیطان کے حامیوں سے بے شک شیطان کا فریب کمزور ہے''۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی ترغیب دلا رہا ہے۔اور مکہ میں بے بس مجبور مرد، عورتوں اور بچوں کو جو وہاں کے ماحول سے پریشان ہیں ان کو وہاں سے نکالنے کا حکم فرما رہا ہے۔اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس شہر یعنی مکہ سے نکال دے۔یہاں کے رہنے والے بڑے ظالم ہیں اپنے خاص فضل واحسان سے ہمارے لیے کوئی دوست اور مددگار مقرر فرما دے۔حضرت عبید اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس ؓ سے سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اور میری والدہ بھی مُسْتَضْعَفِيْنَ میں تھیں ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھ کر فرمایا کہ میں اور میری والدہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے معذور رکھا(2)۔پھر ارشاد فرمایا کہ ایمان والے تو اللہ کی رضا، خوشنودی اور اس کی اطاعت کے لیے جہاد کرتے ہیں اور کافر شیطان کی اطاعت میں جنگ لڑتے ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنے پر برانگیختہ کیا اور حکم دیا کہ شیطان کے چیلوں کے خلاف جہاد کرو۔اور شیطان کا مکر وفریب بلاشک وشبہ بڑا کمزور ہے۔

1۔فتح الباری، کتاب فرض الخمس:220/6 2۔فتح الباری، تفسیر سورۃ النساء:255/8

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

''کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں جب کہا گیا کہ روکو اپنے ہاتھوں کو اور قائم رکھو نماز اور ادا کرد زکوٰۃ (ان باتوں کو تو مان لیا) کہ جب فرض کیا گیا ان پر جہاد تب ایک گروہ ان میں سے ڈرنے لگ گیا لوگوں سے جیسے ڈرا جاتا ہے خدا سے یا اس سے بھی زیادہ۔ اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! کیوں فرض کر دیا تو نے ہم پر جہاد۔ (اور) کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں تھوڑی مدت تک۔ (اے ترجمان حقیقت انہیں) کہو دنیا کا سامان بہت قلیل ہے اور آخرت زیادہ بہتر ہے اس کے لیے جو تقویٰ اختیار کیے ہے اور نہیں ظلم کیا جائے گا ان پر کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر۔ جہاں کہیں تم ہو گے آلے گی تمہیں موت اگرچہ (پناہ گزیں) ہو تم مضبوط قلعوں میں اور اگر پہنچے انہیں کوئی بھلائی تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر پہنچے کوئی تکلیف تو کہتے ہیں یہ آپ کی طرف سے ہے (اے میرے رسول) آپ فرمایئے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ کیا ہو گیا ہے اس قوم کو بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں جاتے جو پہنچے آپ کو بھلائی سو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے آپ کو تکلیف سو وہ آپ کی طرف سے ہے اور بھیجا ہے ہم نے آپ کو سب لوگوں کی طرف رسول، اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کا) گواہ''۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ: ابتداء اسلام میں جب مؤمنین مکہ میں تھے تو انہیں نماز کا حکم دیا گیا۔ اگرچہ وہ مالدار نہ تھے لیکن انہیں زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا تھا کہ فقراء اور مساکین کے ساتھ ہمدردی اور غمگساری کا اظہار ہو سکے۔ اور انہیں مسکین کی ایذاء سانیوں سے درگزر اور ان پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حالت مسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کو دشمن کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا جائے تاکہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں لیکن حالات اس کے موافق نہ تھے۔ اس کے کئی سبب تھے۔ دشمن کے مقابلہ ان کی تعداد انتہائی قلیل تھی۔ دوسرا یہ کہ مسلمان انہی کے شہر میں رہائش پذیر تھے۔ اور وہ شہر تمام روئے زمین سے محترم اور معزز تھا۔ اس لیے انہیں جہاد کا حکم نہ دیا گیا۔ لیکن اس کے برعکس جب وہ مدینہ طیبہ پہنچے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو انہیں جہاد کا حکم دیا گیا۔ اس کے باوجود کہ پہلے وہ دشمن کے خلاف جہاد کی شدید خواہش کرتے تھے لیکن جب ان کو جہاد کا حکم دیا گیا تو ان میں بعض نے شدید گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ جہاد کے اس حکم کو کچھ مدت کے لیے مؤخر کر دیا جاتا۔ اس میں خونریزی ہوتی ہے، بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو جاتی

ہیں۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ ...... ''ترجمہ: اور اہل ایمان کہتے ہیں کیوں نہ اتری کوئی سورت (جہاد کے بارے میں) پس جب اتاری جاتی ہے کوئی واضح سورت اور اس میں جہاد کا حکم ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں نفاق کا روگ ہوتا ہے، وہ دیکھتے ہیں آپ کی طرف، اس طرح جیسے وہ شخص دیکھتا ہے جس پر موت کی غشی طاری ہو۔'' حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے کچھ ساتھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب ہم مشرک تھے تو بڑی عزت والے تھے۔ اب مسلمان ہوگئے ہیں تو لوگ ہمیں کمزور اور ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ ہمیں کفار کا مقابلہ کرنے سے روکتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ ہمیں کمزور سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ابھی تک عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے تم ان لوگوں کے ساتھ جنگ کا خیال نہ کرو۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ہجرت مدینہ کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا تو یہ لوگ اس سے پس و پیش کرنے لگے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ مکہ میں مسلمانوں پر صرف نماز اور زکوٰۃ فرض تھی۔ انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں جہاد فرض کرنے کا سوال کیا۔ جب بعد میں جہاد فرض ہوا تو ان میں بعض نے پس و پیش کی اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا اور کیوں نہ ہمیں تھوڑی سی مدت کے لیے مہلت دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا اے محبوب ان لوگوں کو بتادو کہ دنیا کا سامان بہت قلیل ہے اور آخرت زیادہ بہتر ہے۔ اس کے لیے جو متقی ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ: یعنی متقی کی آخرت اس کی دنیا سے بہتر ہے۔

وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا: اور تم پر کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ تمہارے مال کی پوری پوری جزاء دی جائے گی۔ یہاں لوگوں کو دنیا سے اعراض کرنے، آخرت کی رغبت دلانے اور جہاد پر برانگیختہ کرنے کا اشارہ ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے جو دنیا سے کم لگاؤ رکھتا ہے۔ کیونکہ دنیا ابتداء سے لے کر انتہا تک اس آدمی کی طرح ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سوتا ہے اور خواب میں کوئی محبوب چیز دیکھتا ہے پھر بیدار ہوجاتا ہے۔ ابن نعیمؒ فرماتے ہیں کہ ابو مسہرؒ یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

وَلَا خَيْرَ فِي الدُّنْيَا لِمَنْ يَكُنْ لَهُ ... مِنَ اللّٰهِ فِيْ دَارِ الْمَقَامِ نَصِيْبُ

فَاِنْ تُعْجِبِ الدُّنْيَا رِجَالًا فَاِنَّهَا ... مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَالزَّوَالُ قَرِيْبُ

اس شخص کا دنیا میں کوئی بھلائی نہیں جس کا کل آخرت میں اللہ کی جناب سے کوئی حصہ ہے۔ اگر دنیا بعض لوگوں کو خوش رکھتی ہے (تو انہیں معلوم ہونا چاہیے) کہ یہ دنیا متاع قلیل اور زوال پذیر ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ تم میں سے ہر ایک کا انجام موت ہے اور اس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ''ترجمہ: جو کچھ زمین میں ہے فنا ہونے والا ہے''۔ دوسرے مقام پر فرمایا (كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ) ''ترجمہ: ہر نفس چکھنے والا ہے موت''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ''ترجمہ: اور نہیں مقدر کیا ہم نے کسی انسان کے لیے جو آپ سے پہلے گزرا (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا''۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر شخص کا انجام موت ہے۔ موت سے اسے کوئی چیز نہیں بچا سکتی خواہ جہاد کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے جو اس سے آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے بستر مرگ پر

1۔ المستدرک، کتاب التفسیر 307/2 2۔ تفسیر الطبری 171/5

فرمایا کہ میں بہت سے معرکوں میں شریک ہوا۔ میرے ہر عضو پر تلوار، نیزے، تیروں کے زخم کے نشان ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی موت بستر مرگ پر آرہی ہے۔ اور شہادت کا رتبہ نصیب نہ ہوا۔ موت سے ڈرنے والے بزدلوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے (1)۔ یہ موت ہر حال میں آ کر رہے گی خواہ تم اپنے آپ کو بلند و بالا اور مضبوط قلعوں میں بند کر لو۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں بروج سے مراد آسمان کے برج ہیں مگر یہ قول ضعیف ہے اور صحیح یہی ہے کہ اس سے مراد محفوظ مقامات ہیں۔ یعنی کسی قسم کی احتیاط اسے بچا نہیں سکتی۔ جیسا کہ ابن ابی سلمٰی کا شعر ہے۔

وَمَنْ هَابَ اَسْبَابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهُ وَلَوْ رَامَ اَسْبَابَ السَّمَآءِ بِسُلَّمِ

(جو موت کے اسباب سے ڈرتا ہے، موت اسے پا لیتی ہے۔ اگرچہ وہ سیڑھی لگا آسمان پر بھی چڑھ جائے۔) بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے "اَلْمُشَيَّدَة اور مَشِيْدَة" دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ بعض نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے کا معنی بلند و بالا ہے اور دوسرے کا معنی چونے وغیرہ سے مزین کیا ہوا ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے یہاں ایک طویل قصہ نقل کیا ہے۔ وہ امام مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ پہلے زمانے میں ایک حاملہ عورت تھی۔ جب اس کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی تو اس نے اپنے ایک ملازم کو آگ لانے کے لیے بھیجا۔ جب وہ باہر نکلا تو اسے ایک شخص ملا۔ اس نے اس ملازم سے پوچھا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے یا لڑکا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ اس پر اس نے کہا یہ لڑکی سو مردوں سے زنا کرے گی اور پھر اس عورت کا ملازم اس کے ساتھ شادی کرے گا۔ آخر کار لڑکی کی موت مکڑی کی وجہ سے ہوگی۔ یہ سن کر ملازم واپس لوٹا اور چھری سے اس بچی کا پیٹ چاک کر دیا اور اس خیال سے وہاں سے بھاگ نکلا کہ اب وہ مر چکی ہوگی۔ اس کی ماں نے اس کا پیٹ سی دیا۔ کچھ مدت کے بعد اس کا زخم صحیح ہو گیا اور وہ پروان چڑھنے لگی۔ حتیٰ کہ جب وہ جوان ہوئی تو اس کا شمار شہر کی خوبصورت ترین دوشیزاؤں میں ہونے لگا۔ وہ ملازم وہاں سے سمندر کے ساتھ کسی اور ملک چلا گیا اور کافی عرصہ کے بعد بہت سے مال و دولت کے ساتھ وطن واپس لوٹا۔ یہاں آ کر ایک بوڑھیا سے کہنے لگا کہ میں شہر کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اسی بڑھیا نے اسی لڑکی کا نام لے کر کہا کہ اس سے خوبصورت تمہارے شہر میں کوئی نہیں۔ اس نے کہا اسے میری طرف سے شادی کا پیغام دے دو۔ اس طرح ان دونوں کی شادی ہوگئی اور ان دونوں میاں بیوی میں بہت محبت ہوگئی۔ ایک دن اس نے باتوں باتوں میں اپنے خاوند سے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اس نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ وہ کہنے لگی کہ میں ہی وہ لڑکی ہوں جس کے پیٹ کو تو نے چاک کیا تھا۔ پھر اس نے پیٹ پر زخم کا نشان بھی دکھا دیا۔ جب اسے یقین ہو گیا تو کہنے لگا کہ اگر تو وہی لڑکی ہے تو تم مجھے دو چیزیں بتا دو۔ ایک تو یہ تو نے سو آدمیوں سے زنا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ہو چکا ہے۔ لیکن میں ان کی تعداد نہیں جانتی۔ اس نے کہا کہ ان کی تعداد پوری سو ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ تیری موت مکڑی کے سبب ہوگی۔ اس کے بعد اس شخص نے اس کے لیے ایک بلند و بالا اور محفوظ ترین محل تعمیر کروایا تاکہ وہ مکڑی سے بچ سکے۔ ایک دن وہ دونوں میاں بیوی آرام کر رہے تھے کہ اچانک اس شخص نے چھت میں ایک مکڑی دیکھی اور اپنی بیوی کو بھی دکھائی۔ اس نے کہا کہ تم مجھے اس سے ڈراتے ہو قسم بخدا! میں اسے اپنے ہاتھ سے مار دوں گی۔ اس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ مکڑی کو اتار کر میرے پاس لاؤ۔ جب انہوں نے مکڑی اس کے پاس رکھی تو اس لڑکی نے اسے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ مسل کر اسے مار ڈالا لیکن اسی دوران مکڑی کے زہر کا ایک قطرہ اس کے انگوٹھے کے ناخن اور انگلی کے درمیان پڑا جس کی وجہ سے اس کی ساری ٹانگ سیاہ ہوگئی اور آخر اسی کے باعث اس کی موت واقع ہوگئی (2)۔ جب

1۔ اسد الغابہ 111/2 2۔ تفسیر الطبری 173,172/5

باغیوں نے حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کیا اور آپ کو شہید کرنے کے درپے ہوگئے تو آپ نے امت محمدیہ کے لیے دعا مانگی اور اشعار کہے جن کا مفہوم یہ ہے۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ موت کسی معزز آدمی کو نہیں چھوڑتی۔ اس نے عاد کے لیے نہ کوئی پناہ گاہ چھوڑی اور نہ کوئی مکان۔ وہ بند قلعے میں محصور لوگوں کے پاس بھی پہنچ جاتی ہے۔ اور پہاڑ کی بلند و بالا چوٹیوں پر بھی اپنا وار کرتی ہے۔'' یہاں ہم بادشاہ ''سرطرون'' کے قتل کا قصہ نقل کرتے ہیں۔ ابن ہشام کا قول ہے کہ کسریٰ سابور ذوالاکتاف حضر کے بادشاہ ساطرون کو قتل کرنے گیا تھا۔ اور سابور بن اردشیر بنی ساسان کا پہلا بادشاہ تھا۔ جس نے طوائف الملوکی کو ختم کر کے ایران میں شہنشاہیت کی بنیاد رکھی لیکن ذوالاکتاف سابور بن اردشیر کے بہت بعد آیا ہے۔ علامہ سہیلی نے اس واقعہ کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ سابور نے ساطرون کے ملک پر حملہ کیا۔ ساطرون مقابلے کی تاب نہ لاکر قلعے میں محصور ہوگیا۔ اس حملے کی وجہ یہ تھی کہ ساطرون نے سابور کی غیر موجودگی میں اس کے ملک پر حملہ کیا تھا۔ اور ساطرون دو سال تک قلعے میں محصور رہا۔ محاصرے کے دوران ایک دن ساطرون کی بیٹی نضیرہ نے قلعے کی دیوار سے نیچے جھانکا تو اس کی نظر سابور پر پڑ گئی جو اس وقت زرق برق لباس میں ملبوس تھا۔ اور سر پر ہیرے موتیوں، سونے اور جواہرات سے مرصع تاج رکھا ہوا تھا۔ اس کے اس شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ وہ اس پر فریفتہ ہوگئی اور اسے خفیہ طور پر پیغام بھیجا کہ اگر میں قلعے کا دروازہ کھول دوں تو میرے ساتھ شادی کرو گے۔ اس نے ہاں میں جواب دے دیا۔ اس کا باپ ساطرون شراب کا رسیا تھا۔ اس کی ہر رات شراب کے نشے میں گزرتی۔ اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرہانے کے نیچے سے قلعے کی چابیاں لیں اور اپنے ملازم کے ذریعے سابور کے پاس بھیج دیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے قلعے کا دروازہ کھولنے کے گر سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور یہ کہ وہ ایک سرمئی رنگ کی کبوتری لے اور اس کے پاؤں کو کسی نوجوان لڑکی کے حیض کے خون سے رنگے۔ پھر اسے چھوڑ دے جب یہ کبوتری قلعہ کی دیوار کے اوپر گرے گی تو قلعہ کا دروازہ خود بخود کھل جائے گا۔ اس نے ایسے ہی کیا اور دروازہ کھل گیا۔ اس نے ساطرون کو قتل کر کے بہت سے لوگوں کو تہہ تیغ کر دیا اور شہر کو اجاڑ دیا۔ اور اس لڑکی کو ساتھ لے گیا اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ ایک رات وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اور نیند نہ آنے کی وجہ سے کروٹیں بدل رہی تھی تو سابور نے شمع منگوائی تاکہ دیکھا جائے کہ بستر پر کوئی چیز تو نہیں ہے۔ جب بستر دیکھا تو اس سے ''آس'' کی ایک چھوٹی سی پتی نکلی۔ سابور نے کہا اسی وجہ سے تمہیں نیند نہیں آتی۔ اور وہ اس کی نازک مزاجی پر بڑا حیران ہوا اور اس سے پوچھنے لگا کہ تیرا باپ تیرے لیے کیا انتظامات کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے لیے نرم ریشم کا بستر بچھایا جاتا تھا۔ اور باریک ریشمی لباس پہنتی تھی۔ اور مجھے نیلوں کا گودا اور مکھن کھلاتا تھا اور خالص انگوری شراب مصفّٰی شہد کے ساتھ پلاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی نازک اندامی کا یہ عالم تھا کہ اس کی پنڈلی کا گودا بھی باہر سے نظر آتا تھا۔ یہ سن کر سابور نے کہا کہ جس باپ نے تجھے اتنے ناز و نعم سے پالا اس کا بدلہ تم نے اسے یہ دیا کہ اسے قتل کرا دیا۔ میں اپنے بارے میں تجھ سے کیا توقع رکھ سکتا ہوں۔ پھر اس نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کے بالوں کو گھوڑے کی دم کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی کہ اس کے بالوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا گیا۔ جس سے وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اس واقعہ کو عرب شعراء نے بھی اپنے اپنے کلام میں نظم کیا ہے۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ: اگر زرخیزی اور خوشحالی ہو یعنی مال، اولاد اور رزق کی فراوانی ہو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن اگر قحط سالی میں مبتلا ہو جائیں اور مال و دولت میں کمی ہو جائے یا اولاد میں سے کسی کو موت آ جائے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کی اتباع اور آپ کے دین کو اختیار کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ جیسا کہ فرعون کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کرتی تھی: فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ...... (اعراف: 131)'' ترجمہ: اور جب ان پر خوشحالی کا دور آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر

انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں سے بدفالی پکڑتے ہیں۔'' ایسے یہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ...... (الحج:11) اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کنارے پر کرتا ہے۔ پھر اگر اسے کوئی بھلائی پہنچے تو مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پہنچے تو فوراً دین سے منہ پھیر لیتا ہے۔ یہی حال منافقین کا تھا۔ جو ظاہری طور پر اسلام میں داخل ہو چکے تھے لیکن حقیقت میں اسے ناپسند کرتے تھے۔ جب انہیں کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ اس کا سبب یہ بتاتے کہ نبی (ﷺ) کی متابعت کی وجہ سے ہم پر یہ مصائب نازل ہو رہے ہیں۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ یہاں ''حَسَنَةٌ'' سے مراد یہ ہے کہ زرخیزی اور خوشحالی ہو، ان کے مویشیوں کی بھڑ وتری میں اضافہ ہو اور ان کی عورتوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور ''سَيِّئَةٌ'' سے مراد قحط سالی اور مال ودولت میں کمی ہے۔ جس کی نسبت وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کرتے اور کہتے کہ ہم پر یہ سب مصائب اس لیے نازل ہوئے کہ ہم نے اپنے قدیم دین کو ترک کر دیا اور محمد (ﷺ) کی اتباع کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس غلط عقیدے کی تردید کے لیے ارشاد فرمایا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضا، قدر اور حکم سے ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہر نیک و بد، مومن و کافر پہ جاری ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہر نیکی اور بدی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور پھر ان کے قول جو کہ شک وشبہ، کم علمی، جہالت اور ظلم کی وجہ سے صادر ہوا ہے اس کی تردید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ: آیت کریمہ: كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے بارے میں ایک غریب حدیث بزاز نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کچھ لوگوں کی معیت میں آرہے تھے کہ ان کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ اور وہ دونوں حضور ﷺ کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہاری آوازیں کیوں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! حضرت ابوبکر صدیقؓ کہہ رہے تھے کہ نیکیاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں اور برائیاں ہماری اپنی طرف سے۔ آپ نے پوچھا اے عمر! اس کے بارے میں تو نے کیا کہا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ نیکیاں اور برائیاں دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں سب سے پہلے اختلاف جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام میں ہوا تھا۔ میکائیل نے وہی کہا تھا جو ابوبکر نے کہا ہے۔ اور جبرائیل کا موقف وہی تھا جو عمر کا موقف ہے۔ پس جب اہل آسمان میں اختلاف ہو گیا تو اہل زمین کے درمیان اختلاف ہونا ہی تھا۔ چنانچہ دونوں فیصلے کے لیے حضرت اسرافیل علیہ السلام کے پاس گئے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ نیکیاں اور برائیاں سب اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر اور عمرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ میرا یہ فیصلہ یاد رکھو۔ اگر اللہ یہ چاہتا کہ اس کی نافرمانی نہ ہو تو ابلیس کو پیدا نہ کرتا۔ شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث باتفاق محدثین موضوع ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ لیکن یہ خطاب عمومی طور تمام لوگوں کو شامل ہے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ: یعنی جو بھی تمہیں بھلائی اور نیکی حاصل ہو وہ محض اللہ کے فضل واحسان اور اس کے کرم کی وجہ سے ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ '' ترجمہ: اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے۔ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے۔ اور (وہ کریم) درگزر فرما دیتا ہے تمہارے بہت سے کرتوتوں سے''۔ حضرات سدی، حسن بصری، ابن جریج اور ابن زید فرماتے ہیں ''فَمِنْ نَّفْسِكَ'' سے مراد یہ ہے کہ تمہارے گناہوں کے سبب سے ہے۔ اور قتادہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے ابن آدم! یہ تمہارے گناہوں کی سزا ہے۔ رسول

اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو کوئی خراش آئے یا اس کا قدم پھسل جائے، یا اسے کوئی پریشانی لاحق ہو تو یہ سب اس کے اپنے گناہوں کا نتیجہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ اور یہی مضمون ایک صحیح حدیث میں بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ مومن کو کوئی رنج یا کوئی مشقت پہنچتی ہے حتیٰ کہ اگر اسے کانٹا بھی لگے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ حضرت ابوصالح فرماتے ہیں کہ تمہیں جو بھی کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے گناہوں کے سبب ہے لیکن اس کو مقدر کرنے والا اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔ ایسے مطرف بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ تم تقدیر کے بارے میں کیا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں سورۂ نساء کی یہ آیت کافی نہیں ہے۔ پھر آپ یہ آیت پڑھ کر سناتے اور فرماتے قسم بخدا لوگوں کو تقدیر کے سپرد نہیں کیا گیا بلکہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی لیے وہ اسی کی طرف جاتے ہیں۔ یہ جبریہ اور قدریہ کی تردید میں ٹھوس اور مضبوط قول ہے۔ اور اس کی تفسیر و تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا: یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے تاکہ آپ ان تک اللہ کے احکام پہنچائیں اور ان کو ان اعمال سے آگاہ کریں جن کو وہ پسند اور ناپسند فرماتا ہے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: اور اس امر پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے کہ اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا (دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں) تمہارے اور ان کے سبھی احوال اس کے مشاہدے میں ہیں اور آپ نے ان تک جو اللہ کا پیغام پہنچایا ہے وہ اس سے بھی آگاہ ہے۔ اور وہ کفر اور عناد کی وجہ سے آپ کے خلاف جس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اس کو بخوبی جانتا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾

”جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی اور جس نے منہ پھیرا تو نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان کا پاسبان بنا کر۔ اور کہتے ہیں ہم نے حکم مان لیا۔ اور جب باہر نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو رات بھر مشورہ کرتا ہے ایک گروہ ان میں سے اس کے برعکس جو آپ نے فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ لکھ رہا ہے جو وہ راتوں کو سوچا کرتے ہیں پس رخ (انور) موڑ لیجیے ان سے اور بھروسہ کیجیے اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز“۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ: اللہ تعالیٰ اپنے پیارے محبوب اور رسول کے بارے میں خبر دے رہا ہے کہ جس نے اس کی اطاعت کی سو اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی سو اس نے میری نافرمانی کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی زبان حق ترجمان سے وہی نکلتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے میری اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی یقیناً اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے اپنے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی یقیناً اس نے میری نافرمانی کی (1)۔

وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا: یعنی آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینا ہی لازم ہے۔ پس جو آپ کی اطاعت کرے گا وہ

1۔ فتح الباری، کتاب الجہاد 116/6

سعادت مندی اور نجات سے بہرہ مند ہوگا اور آپ کو بھی اس کی نیکیوں کا اجر ملے گا اور جو آپ سے روگردانی کرے گا وہ خائب خاسر ہوگا اور آپ پر اس کے گناہوں کا کوئی ذمہ نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ رشد و ہدایت پا جاتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے(1)۔

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ: یہاں اللہ تعالیٰ منافقین کے بارے میں خبر دے رہا ہے کہ وہ ظاہری طور پر رسول اللہ ﷺ کی موافقت اور اطاعت کرتے ہیں لیکن جب وہ آپ کی محفل سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور تنہائی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں تو آپ کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور خصوصاً رات کے وقت اپنی خفیہ محفلوں میں دین اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کی سازشوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اور اپنے ان فرشتوں کو ان کی ہر حرکت لکھنے کا حکم فرماتا ہے جو اس نے بندوں پر مقرر کر رکھے ہیں۔ یعنی اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ منافقین کو سرزنش کر رہا ہے کہ وہ ان تمام خفیہ سازشوں اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور نافرمانی کے بارے میں در پردہ مجلسوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ یہ لوگ اگرچہ ظاہری طور پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور موافقت کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے پوشیدہ رازوں سے بھی آگاہ ہے۔ اس لیے وہ انہیں عنقریب سزا دے گا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا...... (نور: 47)'' ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ہم فرمانبردار ہیں۔ پھر ایک فریق ان میں سے منہ موڑ لیتا ہے (ایمان اور اطاعت کے) اس دعویٰ کے بعد اور یہ لوگ ایماندار نہیں ہیں''۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: آپ ان سے درگزر فرمائیں اور حلم و بردباری سے پیش آئیں اور ان امور پر ان کا مؤاخذہ نہ کریں۔ اور لوگوں پر ان کا حال ظاہر نہ کریں۔ لیکن ان سے بے خوف رہیں۔ اللہ پر توکل کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اوپر توکل کرنے والے کا معین و مددگار ہوتا ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝۸۲ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۳

''تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں؟ اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر۔ اور جب آتی ہے ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا خوف کی تو چرچا کرنے لگتے ہیں اس کا اور اگر لوٹا دیتے اسے رسول (کریم) کی طرف اور با اقتدار لوگوں کی طرف اپنی جماعت سے تو جان لیتے اس خبر (کی حقیقت) کو وہ لوگ جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں بات کا ان میں سے۔ اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور (نہ ہوتی) اس کی رحمت تو ضرور تم اتباع کرنے لگتے شیطان کا سوائے چند آدمیوں کے''۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو قرآن پاک تدبر اور غور و فکر سے پڑھنے کا حکم دے رہا ہے۔ کہ اس کے فصاحت و بلاغت سے بھرپور الفاظ اور حکمت و دانش سے لبریز محکم معانی میں فکر و تدبر کرو اور ان سے اعراض کر کے انہیں پس پشت نہ ڈالو۔ اسی لیے اللہ

1۔ مسلم، کتاب الجمعہ: 594

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا '' ترجمہ: کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگا دیے گئے ہیں''۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ: اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہ ہوتا اور کسی انسان کا وضع اور اختراع شدہ ہوتا جیسا کہ ان جاہل مشرکین اور منافقین کا خیال ہے۔ تو وہ اس میں بہت زیادہ تضاد اور اختلاف پاتے۔ قرآن پاک میں اس تضاد اور اختلاف کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے علمائے راسخین کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ قرآن پاک کی تلاوت سن کر یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی محکم اور متشابہ آیات سب حق ہیں اس لیے وہ متشابہ کو محکم کی طرف لوٹاتے ہیں اور اس طرح ہدایت پا جاتے ہیں۔ اور اس کے برعکس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ محکم آیات کو متشابہ کے ساتھ ملا دیتے ہیں اور اس طرح وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علمائے راسخین کی مدح وستائش کی ہے۔ کج روی اختیار کرنے والوں کی مذمت بیان کی ہے۔ حضرت عمر بن شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی ایسی مجلس میں بیٹھے تھے کہ جس کے بدلے میں مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جائیں تو میں پسند نہ کروں۔ فرماتے ہیں کہ ہم دونوں رسول اللہ ﷺ کی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ بزرگ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے در اقدس پر بیٹھے تھے تو ہم ادب واحترام کی وجہ سے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ وہ قرآن پاک کی کسی آیت کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ دوران گفتگو ان میں کچھ اختلاف ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی آواز کچھ بلند ہو گی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ غصہ کی حالت میں باہر نکلے، آپ کا چہرہ مبارک سرخ تھا۔ آپ نے فرمایا خاموش رہو تم سے پہلی امتیں بھی اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ وہ اپنے انبیاء کے ساتھ اختلاف کرتی تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات میں تحریف کر دیتی تھیں۔ قرآن حکیم اس لیے نازل نہیں کیا گیا کہ اس کی بعض آیات بعض آیات کو جھٹلائیں بلکہ یہ تو ایک دوسرے کی تصدیق وتائید کرتی ہیں پس تمہیں اس میں سے جو کچھ سمجھ میں آئے اس پر عمل کرو اور جو کچھ سمجھ نہ آئے وہ کسی صاحب علم سے پوچھ لو(1)۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ تقدیر پر بحث کر رہے تھے۔ اور راوی حدیث فرماتے ہیں کہ کاش میں اس مجلس میں حاضر نہ ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم آپ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہاں بیٹھے دو آدمیوں کا آپس میں کسی آیت پر اختلاف ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی آواز بلند ہو گئی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں کو اس لیے ہلاک کیا گیا کہ وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب میں اختلاف کرتے تھے(2)۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ: یہاں ان لوگوں کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے جو بغیر تحقیق کے خبر کو پھیلا دیتے ہیں حالانکہ ممکن ہے کہ وہ خبر صحیح نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے لیے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو آگے بیان کر دے(3)۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قیل وقال سے منع فرمایا ہے۔ یعنی لوگوں کی باتوں کو بغیر غور وفکر کے آگے بیان کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ عادت بری ہے کہ کوئی شخص بات کرے اور پھر کہے کہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کوئی قول بیان کرے اور اسے معلوم بھی ہو کہ یہ بات غلط ہے تو اس کا شمار بھی جھوٹوں میں ہوگا(4)۔ اور مناسب ہے کہ ہم یہاں اس صحیح حدیث کو ذکر

1۔ مسند احمد 181/2　　2۔ مسند احمد 178/2　　3۔ مسلم، المقدمہ: 10　　4۔ مسلم، المقدمہ: 9

کریں جو حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے۔ آپ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ آپ اپنے گھر سے نکلے اور مسجد نبوی میں پہنچے اور وہاں بھی لوگوں کو یہ بات کرتے ہوئے سنا۔ لیکن آپ بذات خود حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ آپ نے نفی میں جواب ارشاد فرمایا۔ انہوں نے یہ سن کر نعرہ تکبیر بلند کیا اور لوگوں کو بتایا کہ آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق نہیں دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں ہی اس معاملہ کی تہہ تک پہنچا تھا(1)۔ اور ''يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ'' کا معنی ہے کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچنا۔ جب کوئی شخص کنواں یا چشمہ کھودے اور اس کی تہہ تک پہنچ جائے تو عرب کہتے ہیں ''اِسْتَنْبَطَ الرَّجُلُ الْعَيْنَ''

لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اگر تم پر اس کا فضل و رحمت نہ ہوتی تو تم سب شیطان کی پیروی کرتے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿٨٤﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿٨٥﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾ۧ

''تو (اے محبوب!) جہاد کرو اللہ کی راہ میں نہ تکلیف دی جائے گی آپ کو سوائے اپنی ذات کے اور ابھاریں آپ ایمان والوں کو (جہاد پر) عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ روک دے زور ان لوگوں کا جو کفر کر رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی گرفت بہت سخت ہے نیز وہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔ جو کرے گا سفارش اچھی ہوگا اس کا حصہ اس میں سے اور جو کرے گا سفارش بری تو ہوگا اس کے لیے بوجھ اس سے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اور جب سلام دیا جائے تمہیں کسی لفظ دعا سے تو سلام دو تم ایسے لفظ سے جو بہتر ہو اس سے یا (کم از کم) دوہرا دو وہی لفظ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ اللہ، نہیں کوئی معبود بغیر اس کے وہ ضرور جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن نہیں ذرا شک اس (کے آنے) میں اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات کہنے میں''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ بذات خود اس کی راہ میں جہاد کریں اور اگر کوئی اس جہاد سے اعراض کرتا ہے تو اس کا بوجھ آپ پر نہیں ہوگا۔ اسی لیے ارشاد فرمایا کہ آپ صرف اپنی ذات ہی کے مکلّف ہیں، حضرت ابو اسحٰقؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت براء بن عازبؓ سے پوچھا کہ اگر ایک مسلمان کے مقابلہ میں سو دشمن ہوں تو کیا وہ اس کے ساتھ جہاد کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو تو آپ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کی راہ میں جہاد کرے اور مسلمانوں کو بھی جہاد کی ترغیب دیں۔ اور پھر ابن عازب نے فرمایا کہ تم نے یہ جو آیت پیش کی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے(2)۔ حضرت براءؓ روایت کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو

1۔ فتح الباری، کتاب النکاح 279/9 2۔ مسند احمد 281/4

آپ نے صحابہ کرام کو فرمایا کہ میرے رب نے مجھے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے تم بھی اس کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ حدیث غریب ہے۔

وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی مسلمانوں کو بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی ترغیب دلائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر کے دن صفیں سیدھی کرتے ہوئے صحابہ سے ارشاد فرمایا اس جنت کے لیے کھڑے ہو جاؤ جس کی چوڑائی زمین و آسمان کی مثل ہے(1)۔ جہاد کی ترغیب میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر لازم ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے خواہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرے یا وہیں رہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی کیا ہم اس کی بات کی لوگوں کو خوشخبری نہ سنا دیں۔ آپ نے فرمایا جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ اور ان ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان۔ تم جب بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے جنت الفردوس طلب کیا کرو۔ وہ بہترین اور سب سے اعلیٰ جنت ہے۔ اسی کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے۔ اور اسی سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں(2)۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابو سعید! جس نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور رسول اللہ ﷺ کو اپنا نبی اور رسول اللہ مان لیا اور اس پر راضی ہو گیا تو اس پر جنت واجب ہو گئی۔ یہ سن کر حضرت سعید بہت خوش ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! دوبارہ ارشاد فرمایئے آپ نے اس بات کو دہرا دیا اور فرمایا کہ اس کے علاوہ ایک اور عمل بھی ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ بندے کے سو درجات بلند کرتا ہے۔ ان ہر دو درجات کے درمیان اتنا فاصلہ اور وسعت ہے جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ عرض کی یہ عمل کیا ہے۔ فرمایا جہاد فی سبیل اللہ(3)۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یعنی جب مسلمانوں کو جہاد پر برانگیختہ کریں گے تو دشمن کے مقابلہ کے لیے اسلام اور اہل اسلام کی حفاظت، کے لیے ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اور دشمن کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہو گی۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ اہل کفر کی قوت اور ظلم کو ختم کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی گرفت بہت سخت ہے اور وہ ان کو دنیا و آخرت میں سخت سزا دینے پر قادر ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ...... ”ترجمہ: یہی حکم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا لیکن وہ آزمانا چاہتا ہے تمہیں بعض کو بعض سے“۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً: جو شخص کسی نیکی اور بھلائی کے کام میں کسی کی سفارش یا کوشش کرتا ہے تو اسے بھی اس نیکی کا حصہ ملتا ہے اور اس کے برعکس برائی کے کام میں معاون و مددگار رہتا ہے تو اس برائی کا بوجھ اس پر بھی پڑتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ارشاد فرمایا (جب کوئی آدمی کام کے لیے آئے) تو سفارش کیا کرو تمہیں اس کا اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان مبارک پر جو چاہے فیصلہ فرما دے(4)۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ایک دوسرے کی سفارش کرنے کے لیے اتری ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ سفارش کرنے پر اس کا اجر مل جاتا ہے خواہ کام ہو یا نہ ہو۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حفاظت کرنے والا ہے۔ مجاہد نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ اور اس کا حساب لینے والا ہے۔ ابن زید کے نزدیک اس کا معنی قادر ہے۔ عبداللہ بن کثیر

1۔ مسلم، کتاب الامارة 1510
2۔ فتح الباری، کتاب الجہاد 11/6
3۔ مسلم، کتاب الامارة 1501
4۔ فتح الباری، کتاب الزکاة 299/3

فرماتے ہیں کہ ''مُقِیتٌ'' کا معنی ہمیشگی اختیار کرنے والا ہے اور ضحاک فرماتے ہیں کہ اس کا معنی رازق ہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ سے کسی نے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کے عمل کے مطابق عطا کرنے والا ہے۔

وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا: جب کوئی مسلمان تمہیں سلام کرے تو اس کا جواب اس سے افضل طریقہ سے دو کم از کم اس کی مثل ہی جواب دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ افضل جواب دینا مستحب ہے اور مثل جواب دینا فرض ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی السلام علیک یا رسول اللہ۔ آپ نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ پھر دوسرا شخص حاضر ہوا تو اس نے عرض کی السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ۔ آپ نے جواباً فرمایا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پھر تیسرا شخص آیا اور عرض کی السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ نے جواباً فرمایا وعلیک۔ اس شخص نے عرض کی یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ فلاں فلاں شخص نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے ان کا جواب کچھ الفاظ کے اضافہ کے ساتھ دیا۔ لیکن مجھے آپ نے ایسا جواب نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا تم نے ہمارے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سلام کرنے والے کو جواب اس سے افضل یا اس کی مثل دو۔ اور ہم نے جواب تمہارے سلام کی مثل دے دیا ہے۔ یہ حدیث پاک اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سلام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سے کیا جائے اور اس سے زائد الفاظ سے نہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر سلام میں اس سے زیادہ الفاظ ہوتے تو حضور ﷺ صحابی کا جواب زائد الفاظ سے دے دیتے۔ حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور السلام علیکم یا رسول اللہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا دس نیکیاں۔ اور دوسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ یا رسول اللہ! اور پھر بیٹھ گیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا بیس نیکیاں۔ تیسرا شخص حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ نے جواب دیا اور فرمایا تیس نیکیاں (1)۔ پھر اس حدیث کو ابوداؤد ترمذی اور نسائی وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق میں سے جو بھی تمہیں سلام کرے اس کا جواب دو۔ اگرچہ وہ مجوسی ہو۔ انہوں نے اس آیت کو عموم پر محمول کیا ہے۔ حضرت ابوقتادہؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے سلام کا جواب اس سے بہتر دو اور اگر کوئی ذمی سلام کرے تو اس کا جواب اسی طرح لوٹا دو۔ لیکن ان کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ پہلے صحیح حدیث میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر کوئی مسلمان سلام کرے تو اس کا جواب اس سے بہتر دو اور اگر وہ سلام کے تمام الفاظ استعمال کرے تو تم بھی اس کی مثل جواب دے دو۔ البتہ ذمی لوگوں کو سلام کرنے میں ابتداء نہیں کرنی چاہئے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی تمہیں سلام کہے تو اسی کی مثل جواب دے دینا چاہئے۔ کیونکہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی یہودی تمہیں سلام کرتا ہے تو وہ تمہیں سام کہتا ہے تو تم جواب میں علیک کہہ دو۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہود ونصاریٰ کو سلام کرنے میں ابتداء نہ کرو۔ اور اگر راستہ میں تمہارا آمنا سامنا ہو جائے تو انہیں تنگ راستے کی طرف مجبور کرو (2)۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ سلام کرنا مستحب اور جواب دینا فرض ہے۔ اور یہی جمہور علماء کا قول ہے کہ جس کو سلام کیا جائے اس کے لیے جواب دینا واجب ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔ کیونکہ اس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے حتیٰ کہ تم کامل مومن بن جاؤ اور تم کامل مومن نہیں بن سکتے حتیٰ کہ تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو۔ کیا تمہیں میں ایسی بات نہ بتا دوں کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو تمہاری باہمی محبت پروان چڑھنے لگے۔ فرمایا اپنے درمیان سلام کی کثرت کرو۔

1۔ مسند احمد: 439/4 2۔ مسلم، کتاب السلام: 1705

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط : یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی خبر دی ہے اور اس امر کو بیان کیا ہے کہ وہی تمام مخلوق کے لیے الوہیت میں یکتا ہے۔ اور اس جملہ میں ضمنی طور پر قسم کا مفہوم پایا جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد والے جملہ کی ابتداء میں جو لام ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے ماقبل جملہ میں قسم کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قسم بھی ہے اور اس بات کی خبر بھی ہے کہ وہ یقیناً تمام اگلے پچھلے لوگوں کو میدان محشر میں جمع کرے گا۔ اور ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا: یعنی اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہے اس کی کلام وعدہ و وعید سب سچ اور حق ہیں کیونکہ وہی معبود حقیقی ہے اور اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ط اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ط وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿٨٨﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ص وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ج فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ لا فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿٩٠﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ط كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ج فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ط وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿٩١﴾

''سو کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ منافقوں کے بارے میں (تم) دو گروہ بن گئے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اوندھا کر دیا انہیں بوجہ ان کرتوتوں کے جو انہوں نے کیے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسے راہ دکھاؤ جسے گمراہ کر دیا اللہ نے اور جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے (ہدایت کا) راستہ۔ وہ دوست رکھتے ہیں اگر تم بھی کفر کرنے لگو جیسے انہوں نے کفر کیا تاکہ تم یکساں ہو جاؤ۔ پس نہ بناؤ تم ان سے اپنے دوست یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اللہ کی راہ میں۔ پس اگر وہ (ہجرت سے) منہ موڑیں تو پکڑ لو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں کہیں پاؤ ان کو اور نہ بناؤ ان سے (کسی کو) اپنا دوست اور نہ مددگار۔ مگر ان کو (قتل نہ کرو) جو تعلق رکھتے ہیں اس قوم سے کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ ہے یا آ گئے ہوں تمہارے پاس اس حال میں کہ تنگ ہو چکے ہوں ان کے سینے کہ جنگ کریں تم سے یا جنگ کریں اپنی قوم سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو مسلط کر دیتا انہیں تم پر تو وہ ضرور لڑتے تم سے پھر اگر وہ کنارہ کر لیں تم سے اور نہ جنگ کریں تمہارے ساتھ اور بھیجیں تمہاری طرف صلح (کا پیغام) تو نہیں بنائی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان پر (زیادتی کرنے کی) راہ تم پاؤ گے۔ چند اور لوگ جو

چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور امن میں رہیں اپنی قوم سے۔ (لیکن) جب کبھی پھیرے جاتے ہیں فتنہ کی طرف تو منہ کے بل گر پڑتے ہیں اس میں سو اگر نہ کنارے کریں تم سے یا نہ بھیجیں تمہاری طرف صلح (کا پیغام) اور نہ روک لیں اپنے ہاتھ تو پکڑ لو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں تم پاؤ انہیں اور یہی لوگ ہیں کہ دیا ہے ہم نے تمہیں ان پر کھلا اختیار"۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ: اس میں اختلاف ہے کہ منافقوں کے کس معاملہ کے بارے میں مسلمانوں کے دو گروہ تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میدان احد کی طرف جب تشریف لے گئے۔ تو کچھ منافقین بھی آپ کے ساتھ تھے جو جنگ سے پہلے واپس لوٹ آئے تو ان منافقین کے بارے میں بعض مسلمان کہنے لگے کہ انہیں قتل کر دینا چاہئے اور بعض نے کہا کہ انہیں قتل نہیں کرنا چاہئے یہ بھی ایماندار ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شہر طیبہ ہے یہ میل کچیل کو اس طرح دور کر دے گا جیسے بھٹی لوہے کی میل کو دور کر دیتی ہے(1)۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس لوٹا اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات سو صحابہ باقی رہ گئے(2)۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ میں بظاہر مسلمان ہونے کا اظہار کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ اپنے کسی مقصد کے لیے مکہ سے نکلے اور کہنے لگے کہ ہمیں اصحاب رسول (ﷺ) کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی اور جب مسلمانوں کو ان کے بارے میں خبر پہنچی تو بعض کہنے لگے کہ ان بزدلوں کو قتل کر دینا چاہئے کیونکہ یہ تمہارے خلاف تمہارے دشمن کی مدد کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے کہا سبحان اللہ! کیا تم ان لوگوں کو قتل کرو گے جو تمہاری مثل کلمہ گو ہیں۔ کیا صرف اسی لیے کہ انہوں نے ہجرت نہیں اور اپنے گھروں کو نہیں چھوڑا ہم ان کے خون اور مال کو کیسے حلال سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح ان کے اس معاملہ میں دو گروہ ہو گئے رسول اللہ ﷺ وہاں موجود تھے لیکن آپ نے کسی گروہ کو نہیں روکا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ واقعہ افک میں جب رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر عبداللہ بن ابی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ کون ہے جو مجھے اس کی ایذاء سے بچائے تو اس پر قبیلہ اوس اور خزرج کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ لیکن یہ قول غریب ہے(3)۔

وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو نافرمانی اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور باطل کی پیروی کرنے کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور مسلمانوں کو ارشاد فرمایا کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا اور جن کو اللہ گمراہ کر دے ان کی ہدایت کا کوئی راستہ نہیں اور نہ ہی اس کو اس سے کوئی چھٹکارا دلا سکتا ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ: یعنی وہ تمہیں گمراہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ تم بھی ان کے برابر ہو جاؤ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ سخت دشمنی رکھتے ہیں اور تمہیں ناپسند کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے کسی کو اپنا دوست یا مددگار نہ بناؤ حتیٰ کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں اور اگر وہ ہجرت نہ کریں اور کفر کا اظہار کریں تو ان کو جہاں بھی پاؤ قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور معاون نہ بناؤ یعنی جب تک وہ اپنے کفر پر قائم ہیں ان سے دشمنان خدا کے خلاف مدد طلب نہ کرو اور ان کے ساتھ دوستی نہ لگاؤ۔ یہاں کچھ لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو کسی ایسی قوم کے پاس پناہ لے لیں۔ جس کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔ اب اس معاہدہ کی پاسداری کی وجہ سے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے گا۔ سراقہ بن مالک مدلجی بیان کرتے ہیں کہ جب مسلمانوں کو غزوۂ بدر، احد اور دوسرے غزوات میں فتح حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے غلبہ اور شان و شوکت کو دیکھ دیگر قبائل مسلمان ہونے لگے تو مجھے خبر

1۔ مسند احمد: 14/5　　2۔ سیرۃ ابن ہشام: 64/2　　3۔ فتح الباری تفسیر سورۃ النور: 453/8

ملی کہ رسول اللہ ﷺ حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں ایک لشکر میری قوم بنو دلج کی طرف بھیجنے والے ہیں۔ چنانچہ میں مدینہ طیبہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو احسان کا واسطہ دیا۔ لوگوں نے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ آپ نے فرمایا اسے کہنے دو جو کچھ یہ کہنا چاہے۔ میں نے عرض کی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے میری قوم کی طرف لشکر بھیجنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے ساتھ اس شرط پر صلح کر لیں کہ اگر قریش مسلمان ہو گئے تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ اگر وہ مسلمان نہ ہوئے تو پھر بھی آپ ان کے ساتھ سختی سے پیش نہ آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اس کے ساتھ جاؤ اور اس کے کہنے کے مطابق اس کی قوم کے ساتھ صلح کر لو۔ حضرت خالدؓ بن ولید ان کے ساتھ گئے اور اس شرط پر ان کے ساتھ صلح کر لی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے اور اگر قریش مسلمان ہو گئے تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ: وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ نازل فرمائی۔ ابن مردویہ نے اس واقعہ کو حماد بن سلمہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ آیت کا یہ حصہ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ...... (نساء:90) نازل ہوا۔ اور سباق کلام کے زیادہ مناسب اور موافق ہے۔ اور صحیح بخاری میں صلح حدیبیہ کے واقعہ کے یہ الفاظ ہیں کہ جو چاہے اہل مکہ کے ساتھ صلح اور معاہدہ کر لے اور جو چاہے وہ محمد ﷺ اور اس کے صحابہ کرام کے ساتھ صلح اور معاہدہ کر لے(1)۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ...... (توبہ:5) ''ترجمہ: اور جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں تم انہیں پاؤ''۔ سے منسوخ ہو گئی۔

اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ: یہاں پہلے حکم سے ایک اور گروہ کا استثناء کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جن کو زبردستی میدان جنگ میں لایا جاتا ہے۔ دلی طور پر تمہارے ساتھ جنگ کرنے کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کے لیے یہ بھی مشکل ہے کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر اپنی قوم کے خلاف صف آراء ہوں بلکہ یہ لوگ نہ تمہارے ساتھ ہیں اور نہ تمہارے خلاف ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ: یعنی یہ اللہ کی تم پر مہربانی ہے کہ اس نے ان کو تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے روک دیا۔ پس اگر وہ کنارہ کر لیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کا پیغام بھیجیں اب تمہارے لیے یہ مناسب نہیں کہ تم اس حالت میں ان کے ساتھ جنگ کرو۔ اس کی مثال بنو ہاشم کے وہ لوگ ہیں جو غزوہ بدر میں مشرکین کے ساتھ مکہ سے آئے تھے لیکن جنگ کو ناپسند کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عباسؓ اور ان کے ساتھی تھے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت عباسؓ کو قتل کرنے سے منع فرمایا تھا اور انہیں قید کرنے کا حکم فرمایا تھا۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ: یہ لوگ ظاہری صورت میں تو ان لوگوں کی طرح ہیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے لیکن ان کی نیت اور ان کی نیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ وہ منافقین ہیں جو حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کے سامنے آکر اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں تاکہ ان کے جان مال اور اولاد محفوظ ہو جائیں اور درپردہ کفار کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر ان کے معبودان باطل کی عبادت کرتے ہیں تاکہ ان کے نزدیک بھی ان کا اعتبار قائم رہے۔ درحقیقت یہ باطن میں ان کفار و مشرکین کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ''ترجمہ: اور جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' اور یہاں ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ جب بھی ان کو فتنے کا موقع ملتا ہے تو اس میں منہمک ہو جاتے ہیں سدی فرماتے ہیں کہ یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ یہ مکہ کے ان لوگوں کے بارے

1۔ مسند احمد: 325/4

میں نازل ہوئی جو رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے اور ریاکاری کے طور پر بظاہر مسلمان ہو جاتے اور جب واپس مکہ جاتے تو بتوں کی پوجا میں بھی شریک ہو جاتے۔ تا کہ وہ مشرکین سے بھی امن میں رہیں اور مسلمانوں سے بھی محفوظ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں حکم دیا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی روش سے باز نہ آئیں تو ان کو قتل کر دو۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ: یعنی اگر وہ گروہ تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے کنارہ نہ کریں اور نہ ہی صلح وسلامتی کا پیغام دیں اور نہ ہی اپنے ہاتھوں کو جنگ سے روکیں تو ان کو قید کر لو اور انہیں جہاں بھی پاؤ قتل کر دو اور یہی وہ لوگ ہیں جن پر ہم نے تمہیں کھلا اور واضح اختیار دیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِـيْمًا ﴿٩٢﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْھَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿٩٣﴾

”اور نہیں (جائز) کسی مومن کے لیے کہ قتل کرے کسی مومن کو مگر غلطی سے اور جس نے قتل کیا کسی مومن کو غلطی سے تو (اس کی سزا یہ ہے کہ) آزاد کرے مسلمان غلام اور خون بہا ادا کر دے مقتول کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ خود ہی (خوں بہا) معاف کر دے پھر اگر ہو (مقتول) اس قوم سے جو دشمن ہے تمہاری، لیکن وہ (مقتول) خود مومن ہو تو (قاتل) آزاد کرے ایک مسلمان غلام اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ ہو چکا ہے تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ تو (قاتل) خوں بہا دے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے ایک مسلمان غلام تو جو شخص غلام نہ پا سکے تو روزے رکھے دو ماہ لگاتار (اس گناہ کی) توبہ اللہ کی طرف سے (یہی مقرر ہے) اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا۔ اور جو شخص قتل کرے کسی مومن کو جان بوجھ کر تو اس کی سزا جہنم ہے ہمیشہ رہے گا اس میں اور غضب ناک ہوگا اللہ تعالیٰ اس پر اور اپنی رحمت سے دور کر دے گا اور تیار کر رکھا ہے اس نے اس کے لیے عذاب عظیم“۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی بھی صورت میں اپنے مسلمان بھائی کو قتل کرے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی مسلمان جو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ کا خون کسی کے لیے حلال نہیں۔ مگر تین صورتوں میں: 1۔ اگر کسی نے قتل کیا ہو تو اس کے بدلے میں اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ 2۔ شادی شدہ زانی کو۔ 3۔ اپنے دین سے مرتد ہونے والے اور سواد اعظم سے جدا ہونے والے۔ لیکن یہ بات ضروری ہے کہ ان تین صورتوں میں عوام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کو قتل کرے بلکہ یہ سلطان وقت اور اس کے نائب کی ذمہ داری ہے۔

اِلَّا خَطَـًٔا ۚ: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ استثناء منقطع ہے۔ اور اس قسم کا استثناء کلام عرب میں بہت پایا جاتا ہے۔ اس آیت

کریمہ کے شان نزول میں اختلاف ہے۔ امام مجاہد اور کئی دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ عیاشؓ بن ابی ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی جو ابوجہل کا ماں کی طرف سے بھائی تھا۔ جس کا نام اسماء بنت مخرمہ تھا۔ انہوں نے ایک مشرک شخص کو دیکھا کہ وہ ایک آدمی کو اسلام لانے پر سزا دے رہا تھا۔ اور وہ شخص حارث بن یزید غامدی تھا۔ عیاشؓ ابن ابی ربیعہ نے اپنے دل میں یہ بات ٹھان لی کہ جب اسے موقع ملے گا وہ اس سے بدلہ ضرور لے گا۔ لیکن قدرت خدا کی وہ مسلمان کو سزا دینے والا شخص خود مسلمان ہو کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گیا لیکن حضرت عیاش کو اس بات کا علم نہ ہو سکا اور فتح مکہ کے دن اس پر حملہ کر کے اس گمان میں قتل کر دیا کہ وہ اپنے قدیم دین پر قائم ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت ابودرداء کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے ایک مشرک کو قتل کرنے کے لیے تلوار بلند کی تو اس نے تلوار دیکھ کر کلمہ پڑھ لیا لیکن اس اثناء میں تلوار اپنا کام دکھا چکی تھی۔ جب اس واقعہ کا علم حضور علیہ السلام کو ہوا تو حضرت ابودرداءؓ نے عرض کی کہ اس شخص نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا(2)۔ یہ واقعہ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے۔ لیکن وہاں ابودرداء کی جگہ کسی اور صحابی کا ذکر ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا: اگر کوئی انسان کسی کو خطأً قتل کر دے تو اس پر دو چیزیں واجب ہوتی ہیں۔ 1۔ کفارہ کیونکہ اس نے بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے گو خطأً کیا ہے۔ اور کفارے سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمان غلام آزاد کرے، کافر غلام کا آزاد کرنا کافی نہیں ہوگا۔ حضرات ابن عباسؓ، امام شعبی، ابراہیم نخعی اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ چھوٹے بچے کو آزاد کرنا کافی نہیں ہے۔ ہاں اگر اتنا بڑا ہو کہ اسلام اور ایمان کے مفہوم کو سمجھتا ہو تو پھر جائز ہے۔ اور ابن جریر کا مختار قول یہ ہے کہ اگر اس غلام لڑکے کے والدین مسلمان ہوں تو اس کا آزاد کرنا صحیح ہے ورنہ نہیں۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک غلام کا مسلمان ہونا ضروری ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ایک انصاری صحابی ایک سیاہ فام لونڈی کو لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی میرے ذمہ ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اگر آپ کے خیال میں یہ مومنہ ہو تو میں اسے آزاد کر دوں۔ تو رسول اللہ علیہ السلام نے اس لونڈی سے پوچھا کیا تو گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس نے کہا ہاں۔ فرمایا کیا تو گواہی دیتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے جواب دیا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان رکھتی ہے۔ اس نے جواب دیا ہاں۔ آپ نے فرمایا اسے آزاد کر دو(3)۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے اگرچہ اس میں صحابی کا نام ذکر نہیں کیا گیا اور صحابی کا نام مذکور نہ ہونا اس کی صحت کے منافی نہیں۔ اس حدیث کو امام مالک، شافعی، مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ اور معاویہ بن حکم کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ جب وہ صحابی لونڈی لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اس سے پوچھا اللہ تعالیٰ کہاں ہیں۔ اس نے جواب دیا آسمان میں۔ فرمایا میں کون ہوں۔ اس نے جواب دیا آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا اسے آزاد کر دو یہ مومنہ ہے(4)۔ 2۔ دیت (خون بہا) اور اس کا تعلق قاتل اور مقتول کے اہل خانہ کے ساتھ ہے اور یہ دیت ان کو مقتول کے بدلے میں دی جاتی ہے اور قتل خطا کی دیت پانچ قسم کے سو اونٹوں پر مشتمل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے قتل خطاء کی دیت میں فیصلہ فرمایا کہ بیس اونٹنیاں جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہوں اور اسی عمر کے بیس اونٹ اور بیس اونٹنیاں جو تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہیں اور بیس اونٹنیاں جو چوتھے سال میں داخل ہو چکی ہوں اور بیس اونٹنیاں جو پانچویں سال میں داخل ہو چکی ہوں۔ مقتول

1۔ تفسیر الطبری: 204/5 — 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد: 44/5
3۔ مسند احمد: 451/3 — 4۔ الموطا، کتاب العتق: 774

کے ورثاء کو دی جائیں(1)۔ یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر موقوف ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار قسم کے اونٹ واجب ہیں۔ یہ دیت قاتل کے رشتہ داروں پر واجب ہے اس کے اپنے مال میں واجب نہیں ہوتی۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قتل خطاء کی دیت کا یہی فیصلہ کیا کہ قاتل کے دشتہ دار ادا کریں گے۔ امام شافعیؒ نے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ایک وہ حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بنوہذیل کی دو عورتوں کی آپس میں لڑائی ہوگئی۔ ان میں ایک نے دوسری کو پتھر مارا جس کی وجہ سے وہ عورت بھی فوت ہوگئی اور اس کا بچہ بھی۔ جب یہ مقدمہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ اس کے بچے کی دیت غلام یا لونڈی کا بیسواں حصہ ہے۔ اور اس عورت کی دیت قتل کرنے والی عورت کے وارثوں پر ہوگی(2)۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وجوب دیت میں عمد خطاء خطاء محض کے حکم میں ہے۔ لیکن چونکہ اس میں عمد کا شبہ پایا جاتا ہے اس لیے اس میں تین قسم کے سو اونٹ واجب ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو بنوخزیمہ کی طرف ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے بنوخزیمہ کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ بجائے اس کے کہ کہتے اسلمنا (ہم مسلمان ہوئے) نادانی میں صَبَأْنَا (ہم بے دین ہوئے) یہ سن کر حضرت خالدؓ نے انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے اپنے دونوں دست مبارک بلند کیے اور عرض کی اے باری تعالیٰ میں خالد کے فعل سے تیری بارگاہ میں برات کا اظہار کرتا ہوں اور پھر آپ نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ وہ ان کے مقتولوں کی دیت ادا کریں جو ان کا نقصان ہوا ہے اسے بھی پورا کریں۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر یا اس کے نائب کی خطا کا بوجھ بیت المال پر ہوگا۔

اِلَّاۤ اَنْ یَّصَّدَّقُوْا ؕ: یعنی یہ دیت مقتول کے اہل خانہ کو دے دی جائے گی ہاں اگر وہ معاف کر دیں تو پھر دیت واجب نہیں ہوگی۔

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ: یہاں یہ مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے کہ اگر مقتول مسلمان ہو اور اس کے ورثاء کافر اور حربی ہوں تو قتل پر دیت واجب نہیں ہوگی۔ اس صورت میں قاتل پر صرف ایک غلام کو آزاد کرنا واجب ہوگا۔

وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ: اگر مقتول کے ورثاء ذمی ہوں یا وہ لوگ ہوں جن کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہو تو ان کو ان کے مقتول کی دیت دی جائے گی۔ پھر اگر مقتول مومن تھا تو دیت کامل دی جائے گی اور اگر کافر تھا تو بعض ائمہ کے نزدیک پھر بھی دیت مکمل ادا کی جائے گی۔ بعض نے کہا کہ کافر ہونے کی صورت میں مقتول کی دیت نصف ہوگی اور بعض کا قول ہے کہ تہائی۔ اور اس صورت میں قاتل پر مسلمان غلام آزاد کرنا بھی لازم ہے۔

فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ٘: یعنی جو شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا وہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اگر کسی نے بغیر کسی عذر شرعی یعنی بیماری، حیض ونفاس وغیرہ کے روزہ چھوڑا تو اسے پھر نئے سرے سے دو ماہ روزے رکھنے پڑیں گے۔ سفر کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ شرعی عذر ہے اور بعض نے اس کو عذر شمار نہیں کیا۔

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ: یعنی اگر غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو دو مہینے روزے رکھنا ہی خطا قتل کرنے والے کی توبہ کے قائم مقام ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی شخص روزہ رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو کیا اس پر کفارہ ظہار کی طرح ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا واجب ہے۔ اس میں دو قول ہیں 1۔ ہاں جیسا کہ کفارہ ظہار میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ خوف دلانے، ڈرانے اور کسی نفس کو بیجا قتل

1۔ النسائی، کتاب القسامۃ: 43/8 2۔ فتح الباری، کتاب الدیات: 252/12 3۔ فتح الباری، کتاب المغازی: 56/8

کرنے سے محتاط کرنے کا مقام ہے اس لیے یہاں کھانا کھلانے کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اس میں کچھ سہولت اور وسعت پائی جاتی ہے۔ 2۔کھانا نہیں کھلایا جائے گا کیونکہ اگر یہ واجب ہوتا تو اس کو یہاں بیان کر دیا جاتا اور اس کو بوقت حاجت مؤخر نہ کیا جاتا۔ قتل خطاء کا حکم بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قتل عمد کا حکم بیان فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا: اس گناہ عظیم کے مرتکب کے لیے انتہائی سخت وعید بیان فرمائی گئی ہے اور اس گناہ کا ذکر قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر شرک کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ''ترجمہ: اور نہیں پوجتے اللہ کے سوا کسی اور خدا کو اور نہ ہی قتل کرتے ہیں اس نفس کو۔ جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے۔ مگر حق کے ساتھ''۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا...... (انعام:151) ''ترجمہ: آپ فرمایئے آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو کچھ حرام کیا تمہارے رب نے تم پر (وہ یہ) کہ نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی چیز کو ....اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے حرام کر دیا اللہ تعالیٰ نے سوائے حق کے'' کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنے کی حرمت میں بہت سی آیات اور احادیث وارد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں کے درمیان خون کا فیصلہ کیا جائے گا(1)۔ حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن اللہ کی اطاعت میں اور نیک عمل میں سرگرم رہتا ہے جب تک کسی مومن کو ناحق قتل نہ کرے اور جب اس کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ تو اس کی قوت عمل میں کمی آجاتی ہے(2)۔ ایک حدیث میں ہے کہ دنیا کا تباہ ہو جانا اللہ کے نزدیک کسی مسلمان کے قتل سے آسان ہے(3)۔ ایک روایت میں فرمایا اگر زمین و آسمان والے کسی مسلمان کے قتل پر جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو منہ کے بل نار جہنم میں پھینک دے(4)۔ فرمایا جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل پر اعانت کی اگرچہ اشارہ و کنایہ سے کام لیا ہو۔ تو وہ قیامت کے دن اس حالت میں حاضر ہوگا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ہوگا کہ یہ شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہے(5)۔ حضرت ابن عباسؓ کا تو یہ خیال تھا کہ جو شخص کسی مومن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی توبہ مقبول نہیں۔ حضرت ابن جبیر فرماتے ہیں کہ جب اہل کوفہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہو گیا تو میں حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا یہ آخری آیت ہے جس کو کسی دوسری آیت نے منسوخ نہیں کیا(6)۔ اسے مسلم، نسائی اور ابوداؤد وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اس کو کسی دوسری آیت نے منسوخ نہیں کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ میں جس توبہ کا ذکر ہے وہ اہل شرک کے لیے ہے۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں میں نے ابن عباسؓ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا جو شخص اسلام اور احکام اسلام سے بخوبی واقف ہوا اور پھر کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے اس کی توبہ مقبول نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم ابن عباسؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت بڑھاپے کی وجہ سے آپ کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ آپ سے کسی شخص نے پوچھا کہ جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے اس کی کیا سزا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے اس نے عرض کی اگر وہ شخص توبہ کر لے اور اعمال صالحہ پر کاربند ہو کر ہدایت یافتہ ہو جائے۔ آپ نے فرمایا اس کی ماں اس پر روئے اسے توبہ اور ہدایت کہاں نصیب ہوتی ہے۔ قسم ہے اس ذات

1۔ مسلم، کتاب القیامۃ:1304 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الفتن:104/4 3۔ سنن ابن ماجہ:2619

4۔ سنن ابن ماجہ:2620 5۔ سنن ابی داؤد:105/4 6۔ تفسیر الطبری:219/5

کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں نے تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے والے کی ماں اس کو روئے۔ قیامت کے روز مقتول اس قاتل کا دایاں یا بایاں ہاتھ تھامے عرش رحمٰن کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس کا خون بہہ رہا ہوگا۔ وہ عرض کرے گا یا باری تعالیٰ! اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کس جرم میں قتل کیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک اس کو کسی آیت نے منسوخ نہیں کیا اور آپ کے وصال کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا(1)۔ حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرات زید بن ثابتؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، نیز ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، عبید بن عمیر، حسن بصری، قتادہ اور ضحاکؒ کا بھی یہی مذہب ہے کہ قتل عمد کرنے والے کی توبہ مقبول نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مقتول قیامت کے دن قاتل کو پکڑ کر لائے گا اور عرض کرے گا اے پروردگار! اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کس جرم میں قتل کیا ہے۔ قاتل کہے گا کہ میں نے اسے تیری عزت کے لیے قتل کیا تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ اس کا قتل میرے لیے ہے اور ایک دوسرا شخص اپنے قاتل کو پکڑ کر حاضر کرے گا اور عرض کرے گا اے پروردگار! اس سے پوچھ اس نے مجھے کیوں قتل کیا تو وہ قاتل کہے گا کہ میں نے اسے اس لیے قتل کیا کہ فلاں کی عزت بلند ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے اس کی عزت اس کو کوئی نفع نہیں دے گی اور یہ اس کے گناہ کا ذمہ دار ہوگا اور اسے نار جہنم میں پھینک دیا جائے گا(2)۔ حضرت معاویہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف کر دے مگر وہ شخص جو کفر کی حالت میں مرے یا وہ جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے(3)۔ اس حدیث کو حضرت ابودرداءؓ نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا۔ لیکن یہ حدیث منکر ہے اور اس کی سند قابل اعتماد نہیں۔ حضرت حمیدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو العالیہ میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت میرے پاس میرے دوست بھی تھے۔ فرمایا تم دونوں نوجوان ہو اور مجھ سے زیادہ حدیث کو یاد رکھ سکتے ہو۔ آؤ حدیث سننے کے لیے بشر بن عاصم کے پاس چلتے ہیں۔ جب ان کے پاس پہنچے تو انہیں فرمایا کہ ان کو حدیث سناؤ۔ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا۔ انہوں نے ایک قبیلے پر حملہ کر دیا وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی بھاگا جا رہا تھا کہ ایک لشکری اپنی تلوار لہراتے ہوئے اس کے پیچھے لگ گیا۔ اس بھاگنے والے شخص نے کہا میں مسلمان ہوں۔ لیکن لشکری نے اس کی بات پر غور نہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ سخت ناراض ہوئے جب قاتل کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے دوران خطبہ ہی عرض کی کہ اس نے قتل سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان کہا تھا۔ تو آپ نے اس کی طرف سے چہرہ انور کو پھیر لیا اور خطبہ ارشاد فرماتے رہے۔ اس نے دوسری بار یہی عرض کی۔ آپ نے پھر اعراض فرمایا اور خطبہ جاری رکھا۔ اس سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے پھر تیسری بار عرض کی قسم بخدا اس نے قتل کے ڈر سے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ کے چہرۂ مبارک سے ناراضگی کے آثار عیاں تھے اور تین دفعہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومن کو قتل کرنے والے کو ناپسند فرماتا ہے(4)۔ یہ مذہب مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے والے کی توبہ کے عدم قبولیت کا ہے۔ اور دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان ہے اور جمہور سلف و خلف علماء کا بھی یہی مذہب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ شخص توبہ کرے اور اللہ کی بارگاہ میں رجوع کرے اور خشوع خضوع کا اظہار کرتے ہوئے نیک اور صالح اعمال پر کاربند ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا اور مقتول کو اپنی جناب سے عوض دے کر اسے راضی کر لے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ ...... اِلَّا

1۔ تفسیر الطبری 218/5 — 2۔ سنن نسائی، کتاب التحریم: 84/7 — 3۔ مسند احمد: 99/4 — 4۔ مسند احمد: 288/5

مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا...... (فرقان:70-68) ''ترجمہ: مگر وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے تو وہ یہ لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے اور اس نے اللہ کی طرف رجوع کیا جیسے رجوع کا حق ہے''۔ یہ خبر ہے اور خبر میں نسخ میں احتمال نہیں ہوتا۔ اس آیت کریمہ کو مشرکین کے ساتھ خاص کرنا اور اس آیت کریمہ کو مومنین کے ساتھ خاص کرنا خلاف ظاہر ہے اور کسی دلیل کا محتاج ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ...... ''ترجمہ: آپ فرمایے اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔ یہ حکم عام ہونے کی وجہ سے تمام گناہوں کو شامل ہے خواہ اس کا تعلق کفر سے ہو یا شرک سے، شک سے ہو یا نفاس سے، قتل سے ہو یا فسق سے۔ یا اس کے علاوہ کسی اور گناہ سے۔ جو بھی شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ...... ''ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا (اس جرم عظیم) کو کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور بخش دیتا ہے اس کے ماسوا جتنے جرائم ہوں جس کے لیے چاہتا ہے''۔ یہ آیت کریمہ بھی شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں جس آیت کی تفسیر ہم بیان کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اس آیت کو ذکر کیا ہے۔ تاکہ اس کی بارگاہ بیکس پناہ میں امید وابستہ کرنے میں مزید تقویت پیدا ہو جائے۔ یہاں بخاری اور مسلم کی اس حدیث کو ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے سو افراد کو قتل کیا اور پھر اس نے ایک عالم سے دریافت کیا کہ کیا میرے لیے توبہ کی گنجائش ہے۔ اس نے جواب دیا کہ تیرے اور تیری توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے اور پھر ارشاد فرمایا کہ فلاں شہر جہاں اللہ کے نیک لوگ عبادت کرتے ہیں۔ میں چلے جاؤ۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ پیغام اجل آ گیا اور رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح کو قبض کیا(1)۔ جب بنی اسرائیل کا یہ حال ہے تو اس کی امت کی توبہ بدرجہ اولیٰ قبول ہوگی۔ کیونکہ اس امت سے تو اللہ تعالیٰ نے وہ تمام بوجھ اٹھا دیے جو ان سے پہلی امتوں پر تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر آسان اور سہل دین کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ پس اس آیت کریمہ میں جو قاتل کے لیے جہنم کی سزا بیان کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ سزا دینا چاہے تو وہ سزا دے سکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ اور بہت سے سلف صالحین سے اس آیت کی یہی تفسیر مروی ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یہ سزا دی جا سکتی ہے لیکن اس شخص کے اعمال صالحہ اس سزا کے آڑے آ جاتے ہیں اور اگر کوئی نیک عمل اور توبہ نہ ہو تو اسے اس کی یہی سزا ہوگی۔ ہاں اگر حضرت ابن عباسؓ کے قول کو تسلیم کر کے اس کے جہنم میں داخل ہونے کو فرض کر لیا جائے اور اسی طرح اگر قاتل کا کوئی نیک عمل بھی نہ ہو جو اسے سزا سے بچائے تو وہ جہنم میں داخل ہو جائے تو پھر بھی ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہے گا بلکہ یہاں خلود سے مراد بہت دیر کے لیے جہنم میں رہنا ہے نہ کہ ہمیشہ کے لیے۔ حضور ﷺ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ جس کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا اس کو جہنم سے نکال دیا جائے گا۔ جو حضرت معاویہؓ کی حدیث بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر اور مومن کو قتل کرنے والے کا گناہ معاف نہیں کرے گا۔ تو یہاں عسیٰ ترجّی (امید) کے لیے ہے۔ ان دونوں صورتوں میں ترجی کا منتفی ہونا ان دونوں میں سے کسی ایک کے واقع ہونے کی نفی نہیں کرتا اور وہ قتل ہے۔ اور جہاں تک کافر کا معاملہ ہے اس کے لیے واضح حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف نہیں کرے گا اور اسی طرح مقتول کا قیامت کے دن قاتل سے مطالبہ اس لیے ہے کیونکہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جو کہ توبہ سے ساقط نہیں ہوتے بلکہ انہیں ادا کرنا لازم

1۔ مسلم، کتاب التوبۃ: 2118 2۔ فتح الباری، کتاب الایمان: 72/1

ہوتا ہے۔ اور یہ صرف مقتول کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ باقی تمام حقوق العباد بھی اس میں شامل ہیں اور امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ توبہ کے ساتھ ساقط نہیں ہوتے۔ اور توبہ کی صحت کے لیے ان حقوق کی ادائیگی ضروری ہے۔ اگرچہ قیامت کے دن ان حقوق کی ادائیگی ممکن نہیں لیکن ان کا مطالبہ ضرور ہوگا اور مطالبہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو سزا بھی ملے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ مقتول کے کچھ نیک اعمال ہوں جن کو قاتل کے نامہ اعمال میں شامل کرلیا جائے اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل واحسان سے قاتل کو جنت میں داخل کردے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل وکرم سے مقتول کو جنت کے محلات، اس کی نعمتیں اور اسکے درجات بلند فرما کر اس کو راضی کرلے۔ واللہ اعلم

قتل عمد کے مرتکب کے کچھ احکام ایسے ہیں جن کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے اور کچھ احکام ایسے ہیں جن کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے۔

دنیاوی احکام یہ ہیں کہ مقتول کے ورثاء کو مکمل اختیار اور غلبہ دے دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِيِّهٖ سُلۡطٰنًا (بنی اسرائیل:33) یعنی ان کے ورثاء کو یہ مکمل اختیار ہے چاہیں تو قاتل کو قصاص میں قتل کرادیں، یا معاف کردیں یا اس کا خون بہا لے لیں جو تین قسم کے اونٹوں پر مشتمل ہوگا۔ تیس جو چوتھے سال میں داخل ہوں اور تیس پانچویں سال میں داخل ہونے والی اور چالیس گابھن اونٹنیاں۔ جیسا کہ فقہ کی کتب میں تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔ ائمہ کرام کا اس بات میں اختلاف ہے کیا اس صورت میں اس پر غلام آزاد کرنا، یا ساٹھ پے در پے روزے رکھنا، یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا واجب ہے۔ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب اور فقہاء کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ یہ اس پر واجب ہے کیونکہ جب یہ کفارہ قاتل پر قتل خطاء میں واجب ہے تو قتل عمد میں بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا۔ جب انہیں یہ کہا گیا کہ یمین غموس (کسی گزشتہ یا موجودہ چیز کے بارے میں جھوٹی قسم کھانا) میں کفارہ واجب نہیں ہوتا تو انہوں نے جواب دیا کہ جان بوجھ کر چھوڑی گئی نماز کی قضا لازم ہے جیسا کہ علماء کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ خطأ چھوڑی گئی نماز کی قضا بھی لازم ہے۔ امام احمد کے اصحاب اور کچھ دوسرے علمائے فرماتے ہیں کہ قتل عمد اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس میں کفارہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ان کے نزدیک ان دوصورتوں کے درمیان اور جان بوجھ کر چھوڑی ہوئی نماز کے درمیان تفریق کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وہ عمداً چھوڑی ہوئی نماز کی قضا کے وجوب کے قائل ہیں۔ قتل عمد میں وجوب کفارہ کے قائلین درج ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

1۔ حضرت واثلہ بن اسقع روایت کرتے ہیں کہ بنوسلیم کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی ہمارے ایک ساتھی نے کسی کو عمداً قتل کردیا ہے۔ آپ نے فرمایا اسے ایک غلام آزاد کرنا چاہئے تاکہ اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے میں اس قاتل کے ہر ہر عضو کو نار جہنم سے آزاد کردے۔ اسی مفہوم کی دو اور احادیث انہی صحابی سے مروی ہیں (1)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوۡا وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤى اِلَيۡكُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا ۚ تَبۡتَغُوۡنَ عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ فَعِنۡدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيۡرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡكُمۡ فَتَبَيَّنُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۹۴﴾

''اے اہل ایمان! جب تم سفر پر نکلو اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) تو خوب تحقیق کرلو اور نہ کہو اسے جو بھیجتا ہے تم پر سلام کہ تم مومن نہیں ہو تم تلاش کرتے ہو سامان دنیوی زندگی کا۔ پس اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں (وہ تمہیں غنی کردے گا) ایسے ہی (کافر) تم بھی تھے اس سے پہلے پھر احسان فرمایا اللہ نے تم پر تو خوب تحقیق کرلیا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے جو کچھ تم کرتے

1۔ مسند احمد،391/3

ہو خبردار ہے''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بنو سلیم کا ایک شخص بکریاں چراتا ہوا صحابہ کرامؓ کے پاس سے گزرا اور انہیں سلام کیا۔ وہ آپس میں کہنے لگے کہ یہ شخص مسلمان تو نہیں ہے لیکن اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں سلام کیا ہے اس لیے انہوں نے اسے پکڑا کر قتل کر دیا اور بکریاں لے کر مدینہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی(1)۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور حاکم نے بھی مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اسی طرح امام ابن جریر نے اسے روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کی سند ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ اور ممکن ہے بعض محدثین کے نزدیک بعض اسباب کی وجہ سے اس حدیث کی صحت محل نظر ہو۔ یعنی اس سند کے علاوہ سماک سے اس کو کسی نے روایت نہیں کیا۔ باقی عکرمہ سے اس کی روایت بھی محل نظر ہے اور وہ شخص جس کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اس میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے محلم بن ابی جثامہ اور بعض نے اسامہ بن زید بتایا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اقوال بھی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ تینوں اعتراض قابل توجہ نہیں ہیں۔ کیونکہ سماک سے اس حدیث کو کئی ایک کبار محدثین نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح عکرمہ کی روایت کو بھی بخاری نے حجت مانا ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ یہی روایت ایک دوسری سند سے بھی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ: ایک شخص کو اس کے والد اور قبیلہ والوں نے اپنے مسلمان ہونے کی اطلاع دینے کے لیے نبی کریم علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا۔ وہ رات کی تاریکی میں مسلمانوں کے پاک لشکر کے قریب سے گزرا انہوں نے اسے پکڑا کر قتل کر دیا حالانکہ اس نے انہیں بتایا کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن انہوں نے اس کی بات کو تسلیم نہ کیا اس کے والد فرماتے ہیں کہ میں حضور علیہ السلام کی خدامت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے ایک ہزار دینار اور دیت عطا فرمائی اور بڑی عزت و احترام سے روانہ کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔

محلم بن جثامہ کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے ایک چھوٹا سا لشکر اضم کی طرف بھیجا۔ جب یہ لشکر بطن اضم میں پہنچا تو عامر بن اضبط الاشجعی اپنی سواری پر سوار مع اسباب ان کے قریب سے گزرے تو انہوں نے صحابہ کرامؓ کو سلام کیا۔ انہوں نے سلام کی وجہ سے اسے قتل کرنے سے اعراض کیا لیکن محلم بن جثامہ کی عامر کے ساتھ پرانی رنجش تھی۔ انہوں نے اسے قتل کر کے اس کی سواری اور اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اور جب واپس آ کر رسول اللہ علیہ السلام کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ عامر نے بھی انہیں اسلامی طریقہ کے مطابق سلام کیا لیکن ان کے درمیان زمانہ جاہلیت کی کوئی رنجش تھی۔ جس کی بناء پر محلم نے تیر مار کر اسے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر رسول اللہ علیہ السلام کے پاس پہنچی تو عامر کی طرف سے عیینہ اور اقرع نے بات کی اقرع نے کہا یا رسول اللہ! اگر آج یہ خوش ہوا ہے تو کل اسے حساب بھی دینا ہوگا۔ عیینہ نے کہا نہیں قسم بخدا ہم اس کو نہیں چھوڑیں گے حتیٰ کہ اس کی عورتیں وہ مصیبت چکھیں جو ہماری عورتوں نے چکھی ہے۔ محلم اپنی دونوں چادریں اوڑھے ہوئے حضور علیہ السلام کے سامنے بیٹھ گیا تا کہ رسول اللہ علیہ السلام اس کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیری بخشش نہ کرے۔ وہ وہاں سے روتا ہوا اٹھا اور ابھی سات دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کا پیام اجل آ گیا۔ جب اسے دفن کیا گیا تو زمین نے اسے باہر پھینک دیا۔ جب رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت میں یہ عرض کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ زمین تمہارے ساتھی سے بھی برے لوگوں کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے لیکن یہ حکمت خداوندی ہے وہ تمہیں نصیحت کرنا

1۔ مسند احمد: 229/1 2۔ تفسیر الطبری: 223/5

چاہتا ہے۔ اس طرح اس کے بعد اس کی لاش کو دو پہاڑوں کے دامن میں رکھ کر اوپر سے پتھر ڈال دیئے گئے۔ پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1)۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مقداد کو جب انہوں نے اس مومن کو قتل کر دیا جو کافروں کے ساتھ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ جب وہ اسے قتل کرنے لگے تو اس نے اپنے اسلام کا اظہار بھی کیا تھا، کو ارشاد فرمایا کہ تم بھی تو پہلے مکہ میں اسی طرح اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ اس کو امام بخاری نے تعلیقاً روایت کیا ہے(2)۔ اسی روایت کو حضرت ابن عباسؓ نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا جس میں حضرت مقداد بن اسلم بھی تھے، جب وہ اپنی منزل پر پہنچے تو انہوں نے پایا کہ دشمن فرار ہو چکا ہے اور صرف ایک شخص باقی ہے جس کے پاس بہت سا مال ہے۔ اس نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں لیکن حضرت مقداد نے آگے بڑھ کر اسے قتل کر دیا ایک صحابی نے کہا اے مقداد تو نے ایک کلمہ گو کو قتل کر دیا۔ قسم بخدا! میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں یہ واقعہ ضرور عرض کروں گا اور جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا۔ اے مقداد! تو نے ایک کلمہ گو کو قتل کر دیا۔ کل تم قیامت کے دن کیا جواب دو گے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ تو آپ نے حضرت مقداد کو ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو تو نے قتل کیا وہ شخص مومن تھا اور اپنی کافر قوم کے ساتھ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے ایمان کا اظہار بھی کیا لیکن اس کے باوجود تو نے اسے قتل کر دیا۔ اسی طرح تو بھی تو مکہ میں اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا(3)۔

فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ: یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ تمہیں غنی کر دے گا اور یہ اس سامان دنیا سے بہتر ہے جس نے تمہیں اس شخص کو قتل کرنے پر برانگیختہ کیا ہے جس نے تمہیں سلام بھی کیا اور اپنے ایمان کو بھی ظاہر کیا۔ لیکن تم نے اس سے اعراض کر کے اس پر یہ تہمت لگائی کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ کیا ہے تاکہ تم دنیاوی سامان زیست حاصل کر سکو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے پاس تمہارے لیے اس سے بہتر رزق حلال ہے۔

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَيْكُمْ: یعنی پہلے تمہارا حال بھی اس شخص کی طرح تھا جس نے اپنی کافر قوم کے ساتھ اپنے ایمان کو چھپایا جیسا کہ حدیث میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ ''ترجمہ اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، کمزور اور بے بس سمجھے جاتے تھے ملک میں)۔ حضرت سعید بن جبیرؒ کی تفسیر کے مطابق اس کا یہی معنی بنتا ہے کہ تم مشرکین میں اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ جس طرح اس چرواہے نے اپنے ایمان کو چھپایا ہوا تھا۔ یہی مختار قول ابن جریر کا ہے(4)۔ اور ایک دوسرے قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ اس سے پہلے تم مسلمان نہیں تھے پس اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا یعنی تمہاری توبہ کو قبول کیا۔ اسی لیے حضرت اسامہؓ نے یہ قسم اٹھائی تھی کہ وہ اس کے بعد کسی کلمہ گو سے جنگ نہیں کریں گے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس واقعہ میں آپ پر بڑی ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا۔

فَتَبَيَّنُوْا: یعنی خوب تحقیق کر لیا کرو۔ یہ ماقبل کلام کی تاکید ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس سے جو کچھ تم کرتے ہو خبردار ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ اس میں سخت وعید ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰہِ

1۔ تفسیر الطبری 222/5
2۔ فتح الباری، کتاب الدیات: 187/12
3۔ کشف الاستار عن زوائد البزار، تفسیر سورۃ النساء، 45/3:
4۔ تفسیر الطبری: 226/5

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

''نہیں برابر ہو سکتے (گھروں میں) بیٹھنے والے مسلمان سوائے معذوروں کے اور جہاد کرنے والے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے بزرگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (گھروں میں) بیٹھ رہنے والوں پر درجہ میں۔ اور سب سے وعدہ فرمایا ہے اللہ نے بھلائی کا لیکن فضیلت دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے۔ (ان کے لیے) بلند درجے ہیں اللہ (کی جناب سے) اور (نوید) بخشش اور رحمت اور ہے اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا''۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ: حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت کو بلایا اور اسے لکھنے کا حکم فرمایا۔ اسی اثناء میں حضرت ابن ام مکتوم جو نابینا صحابی تھے وہ آئے اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں شکایت کی کہ میں نابینا ہوں۔ میں کیسے جہاد میں شرکت کر سکتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ ''غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ'' نازل فرمائے(1)۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت زید بن ثابت قلم دوات اور لکھنے کے لیے اونٹ کی ہڈی لے کر آئے۔ آپ نے فرمایا لکھو: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ آپ کے پیچھے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم بیٹھے ہوئے تھے۔ عرض کی یا رسول اللہ! میں نابینا ہوں تو اسی وقت (غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ) کے الفاظ نازل ہوئے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھ میں جہاد کی استطاعت ہوتی تو میں جہاد کرتا حضرت زید فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مجھے یہ آیت کریمہ لکھوا رہے تو آپ کی ران مبارک میری ران کے اوپر تھی اور آپ پر جب دوبارہ وحی کی کیفیت طاری ہوئی تو میری ران پر اس قدر بوجھ پڑا تو مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں میری ران ٹوٹ ہی نہ جائے۔ اور مسند امام احمد میں اس روایت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہوئی جس کی وجہ سے آپ پر ایک مخصوص کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت زید فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نے حضور ﷺ کی ران سے زیادہ کوئی چیز بوجھل نہیں پائی۔ پھر جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے فرمایا اے زید! لکھو۔ میں نے اونٹ کی ایک چوڑی ہڈی پکڑی اور یہ آیت کریمہ تحریر کر دی۔ جب اس آیت میں ابن ام مکتوم نے مجاہدین کی فضیلت سنی تو عرض کی یا رسول اللہ! جو شخص جہاد کی استطاعت نہیں رکھتا اس کا کیا ہوگا۔ حضرت زید فرماتے ہیں کہ ابھی ان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ حضور ﷺ پر وحی کی کیفیت طاری ہوگئی اور جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے فرمایا اے زید پڑھو۔ میں نے پڑھا تو آپ نے ''غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ'' کے الفاظ زیادہ کرا دیے میں نے درمیان میں یہ الفاظ زیادہ کر دیئے۔ گویا کہ آج بھی بعد میں لکھے ہوئے ان الفاظ کو لکھنے کا منظر میرے سامنے ہے۔ اور یہ الفاظ میں نے وہاں لکھے جہاں اس ہڈی میں شگاف تھا(2)۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں ''مجاہدین'' سے مراد وہ صحابہ کرامؓ ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور ''قاعدون'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس میں شریک نہ ہو سکے آپ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت عبداللہ بن جحش اور ابن ام مکتوم جو کہ دونوں نابینا تھے، نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہمیں

1۔ فتح الباری، تفسیر سورۃ النساء 259/8 2۔ مسند احمد 190/5: فتح الباری، کتاب الجہاد: 46/6

رخصت ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور ان صحابہ کو رخصت دے دی۔ اور آیت کا معنی یہ ہوا کہ مجاہدوں کو جہاد میں شریک نہ کرنے والوں پر فضیلت حاصل ہے لیکن معذور افراد مستثنیٰ ہیں۔ یعنی پہلے مطلق حکم نازل ہوا تھا۔ پھر جب غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ کے الفاظ نازل ہوئے تو ان الفاظ کی وجہ سے ان افراد کو خارج کر دیا گیا جن کے لیے کوئی ایسا عذر شرعی تھا جس کی وجہ سے وہ جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً نابینا و لنگڑا پن، مرض پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جہاد میں شریک نہ ہونے والوں پر مجاہدین کی فضیلت کو بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق معذور افراد اس میں داخل نہیں ہیں۔ اور یہی تفسیر اولیٰ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم جب جہاد کے لیے کوئی سفر طے کرتے ہو یا کسی وادی کو عبور کرتے ہو وہ بھی تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ! وہ مدینہ میں بیٹھ کر ہمارے ساتھ کیسے شریک ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں وہ تمہارے ساتھ شریک ہیں کیونکہ وہ اپنے عذر کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکتے۔ اس مفہوم کو ایک شاعر نے یوں نظم کیا ہے۔

یَا رَاحِلِیْنَ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ لَقَدْ
سِرْتُمْ جُسُوْمًا وَ سِرْنَا نَحْنُ اَرْوَاحًا
اِنَّا اَقَمْنَا عَلٰی عُذْرٍ وَ عَنْ قَدْرٍ
وَمَنْ اَقَامَ عَلٰی عُذْرٍ فَقَدْ رَاحَا

(اے بیت اللہ کی طرف کوچ کرنے والو! تم اپنے جسموں کے ساتھ سفر کر رہے ہو اور ہم روحانی طور پر اسی سفر پر گامزن ہیں۔
ہم عذر اور تقدیر کے فیصلہ کی وجہ سے یہاں مقیم ہیں اور جو عذر کی وجہ سے مقیم ہو وہ گویا کہ سفر کرنے والا ہے)

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ: حسنیٰ سے مراد جنت اور بہت بڑا انعام ہے۔ اس آیت کریمہ میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔

وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان درجات کو بیان فرمایا ہے۔ جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو فضیلت عطا فرمائی۔ یعنی وہ ان کو بلند و بالا جنت میں بالا خانے عطا فرمائے گا۔ ان کے گناہوں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے گا اور اپنے خاص فضل و احسان سے اپنے انوار و تجلیات، اور رحمت و برکت کی بارش سے نوازے گا۔ اسی لیے ارشاد فرمایا: دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے سو درجے تیار کیے ہیں۔ ان ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوگا جتنا زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جس نے اللہ کی راہ میں ایک تیر بھی چلایا اسے بھی جنت میں درجہ ملے گا۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ درجہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ تمہارے گھر کے بالا خانے کی طرح نہیں ہوگا بلکہ دو درجوں کے درمیان سو سال کا فاصلہ ہوگا (1)۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ

1۔ فتح الباری، کتاب الجہاد: 11/6

وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾ ع

"بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر فرشتوں نے انہیں کہا کہ تم کس شغل میں تھے (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا ہم تو بے بس تھے زمین میں۔ فرشتوں نے کہا کیا نہیں تھی اللہ کی زمین کشادہ تاکہ تم ہجرت کرتے اس میں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جہنم بہت بری پلٹ کر آنے کی جگہ ہے۔ مگر باقی کمزور بے بس مرد اور عورتیں اور بچے جو نہیں کر سکتے تھے (ہجرت کی) کوئی تدبیر اور نہیں جانتے تھے (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہ۔ تو یہ لوگ ہیں جن کے بارے میں امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا ان سے اور اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے۔ اور جو شخص ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں پائے گا زمین میں پناہ کے لیے بہت جگہ اور کشادہ روزی اور جو شخص نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف پھر آلے اس کو (راہ میں) موت تو ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ: حضرت محمد بن عبدالرحمٰن ابوالاسود فرماتے ہیں کہ یزید کی طرف سے مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے لیے جس لشکر کو تیار کیا گیا تھا اس میں میرا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے حضرت ابن عباسؓ کے غلام اور شاگرد عکرمہ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے بڑی سختی سے اس میں شامل ہونے سے منع کیا اور بتایا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بعض مسلمان جو مشرکین کے لشکر میں شامل ہو کر ان کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنتے تھے اور بعض اوقات ان میں سے کوئی تیر لگنے سے ہلاک ہو جاتا یا وہ مسلمانوں کی تلواروں کی زد میں آ کر ہلاک ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے لیکن اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر مشرکین مکہ ان کو اپنے ساتھ لے آئے اور ان میں سے بعض غزوۂ بدر میں قتل ہو گئے تو مسلمانوں نے کہا کہ یہ ہمارے مسلمان ساتھی تھے۔ ان کو مجبور کر کے جنگ میں شریک کیا گیا تھا اس لیے وہ ان کے لیے استغفار کرنے لگے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اس کو لکھ کر مکہ میں باقی ماندہ مسلمانوں کو بھیج دی گئی۔ اور انہیں آگاہ کر دیا گیا کہ اب ان کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔ یہ حکم سن کر وہ وہاں سے نکلے مشرکین مکہ نے ان کو پکڑ لیا تو انہوں نے اسلام چھپانے کے لیے تقیہ کیا تو یہ آیت کریمہ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ (عنکبوت:10) نازل ہوئی۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ان قریشی نوجوانوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مکہ میں کلمہ پڑھ لیا تھا۔ ان میں علی بن امیہ بن خلف، ابوقیس بن ولید بن مغیرہ، ابومنصور بن حجاج اور حارث بن زمعہ بھی شامل تھے۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی جو ہجرت کے موقع پر مکہ میں ہی رہ گئے تھے اور جنگ بدر کے موقع پر مشرکین کے ساتھ

1۔ فتح الباری، کتاب الجہاد، تفسیر سورۃ النساء: 262/8

آئے اور ان میں بعض وہاں قتل ہو گئے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جس کا حکم ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو ہجرت پر قدرت رکھنے کے باوجود مشرکین کے ہاں اقامت پذیر رہے درآنحالیکہ وہاں اپنے دینی شعائر کو ادا نہ کر سکتا ہو۔ اگر ایسا شخص ہجرت نہیں کرتا تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور بالاجماع حرام کا مرتکب ہے۔ ایسے لوگوں کو اس آیت کریمہ میں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والا کہا گیا ہے۔ جب فرشتے ان کی ارواح قبض کرنے کے لیے آتے ہیں تو وہ ان سے پوچھتے ہیں تم یہاں کیوں ٹھہرے رہے اور تم نے ہجرت کو کیوں ترک کیا۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم بے بس تھے۔ یہاں سے نکلنے پر قادر نہ تھے۔ تو فرشتے انہیں جواب میں کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔ حضرت سمرہ بن جندب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مشرکین کے ساتھ میل جول رکھے اور ان کے ساتھ سکونت اختیار کرے وہ بھی ان کی مثل ہے (1)۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ جب غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت عباس، عقیل اور نوفل کو قید کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ اپنا اور اپنے بھتیجے کا فدیہ ادا کرو۔ انہوں نے جواب دیا کیا ہم آپ کے قبلہ کی طرف نمازیں نہیں پڑھتے۔ اور کیا ہم کلمہ شہادت کا اقرار نہیں کرتے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے یہ کیا مباحثہ شروع کر دیا ہے۔ اس میں تم مغلوب ہو جاؤ گے۔ پھر آپ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی (2)۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ: یہاں ان لوگوں کی استثناء کی گئی ہے جو ترک ہجرت میں معذور تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مشرکین کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور اگر یہ ہجرت پر قادر بھی ہوتے تو انہیں راستے کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا'' ترجمہ: یعنی یہ لوگ نہ تو ہجرت کی کوئی تدبیر کر سکتے تھے اور نہ ہی وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ جانتے تھے''۔

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کا ترک ہجرت پر مؤاخذہ نہیں کرے گا بلکہ معاف فرما دے گا۔ عسیٰ کا کلمہ کلام الٰہی میں یقینی اور اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے۔ جب آپ نے ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہا تو سجدہ کرنے سے پہلے عرض کی اے باری تعالیٰ! عیاش بن ابی ربیعہ، سلمہ بنت ہشام، ولید بن ولید اور دوسرے بے بس مسلمانوں کو مشرکین کے چنگل سے نجات عطا فرما۔ قبیلہ مضر پر اپنی گرفت کو سخت کر دے اور ان پر ایسی قحط سالی نازل فرما جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں ہوئی (3)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد اپنے دست اقدس بلند کیے اور قبلہ رو ہو کر یہ دعا مانگی اے اللہ! ولید ابن ولید، عیاش بن ابی ربیعہ، سلمہ بن ہشام اور دوسرے بے بس مسلمانوں کو مشرکین کے پنجہ سے چھٹکارا دلا۔ اور آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ آپ نماز ظہر کے بعد بھی یہی دعا مانگا کرتے تھے۔ اس حدیث کے صحیح بخاری میں بھی شواہد ہیں۔ اور اس سند کے علاوہ دوسری اسناد سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میری والدہ ان بے بس اور مجبور بچوں اور عورتوں میں شامل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ترک ہجرت پر معذور قرار دیا (4)۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یہاں ہجرت کرنے اور مشرکین کو چھوڑنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ مومن ان کو چھوڑ کر جہاں بھی جائے گا اسے وہاں کوئی نہ کوئی پناہ گاہ مل جائے گی۔ ''مُرٰغَمًا'' مصدر ہے۔ عرب کہتے ہیں ''رَاغَمَ فُلَانٌ قَوْمَهٗ مُرَاغَمًا وَ مُرَاغَمَةً۔'' یعنی فلاں اپنی قوم کو چھوڑ گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے بھی اس کا معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا فرمایا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کا معنی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد: 93/3
2۔ تفسیر الطبری: 235/5
3۔ فتح الباری، تفسیر سورۃ النساء: 264/8
4۔ فتح الباری، تفسیر سورۃ النساء: 263/8

ناپسندیدہ چیز سے دور ہٹنے والا ہے۔ اور سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی قلعہ یا پناہ گاہ ہے۔ ظاہر معنی یہی ہے کہ اس کے پاس ایسی قوت ہو جس کے ساتھ وہ دشمن سے نجات پا سکے۔

وَّسَعَةً : کئی ایک مفسرین نے اس کا معنی رزق بیان کیا ہے جیسا کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرتا ہے وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف اور قلت سے غناء کی طرف راہ پالیتا ہے۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا: یعنی جو شخص ہجرت کے نیت سے اپنے گھر سے نکلے اور راستے میں اسے پیام اجل آجائے تو اسے اللہ کی بارگاہ سے ہجرت کا ثواب مل جاتا ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق اجر مل جاتا ہے۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی سو اس کی اللہ و رسول کے لیے ہجرت ہوگی اور جس نے دنیا کے حصول کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کے لیے ہجرت کی تو اسے ہجرت کا کوئی ثواب نہیں ملے گا اور اس کی ہجرت اس کے مقصد کے مطابق ہوگی (1)۔ یہ حدیث ہجرت اور باقی تمام اعمال کو شامل ہے۔ اور یہی مفہوم اس حدیث میں بھی پایا جاتا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنو اسرائیل کے ایک شخص نے ننانوے قتل کیے اور پھر اس شخص کو قتل کر کے سو مکمل کر لیے جس سے اس نے توبہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور پھر ایک عالم کے پاس گیا اور اپنی توبہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ تمہاری توبہ کے بارے میں کون حائل ہو سکتا ہے۔ اور پھر اسے حکم دیا کہ وہ اس شہر سے کوچ کر کے فلاں شہر چلا جائے جہاں اللہ کے نیک بندے اقامت پذیر ہیں۔ جب وہ شہر سے ہجرت کر کے نکلا تو راستے میں ہی پیام اجل آگیا۔ تو رحمت اور عذاب کے فرشتوں کے درمیان اختلاف ہو گیا رحمت کے فرشتوں نے کہا کہ یہ توبہ کر کے نکلا تھا۔ عذاب کے فرشتوں نے کہا کہ یہ اس منزل تک ابھی نہیں پہنچا تھا جہاں اس نے جانا تھا۔ انہیں حکم ہوا کہ دونوں طرف سے زمین ناپی جائے اور جس شہر کے زیادہ قریب ہوگا اسی میں اس کا شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ وہ اس طرف سے سکڑ جائے جس طرف نیک لوگوں کی بستی تھی۔ اور دوسری طرف کی زمین کو حکم دیا کہ وہ پھیل جائے اور جب انہوں نے زمین ناپی تو اس سمت والی زمین ایک بالشت کے قریب نکلی جس کی طرف ہجرت کر کے وہ جا رہا تھا۔ اس طرح رحمت کے فرشتے اس کو لے گئے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی لفظ ہیں کہ جب اس کی موت کا وقت ہوا تو وہ اپنا سینہ گھسیٹتا ہوا اس بستی کی طرف ہو گیا جس کی طرف وہ ہجرت کر کے جا رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عتیک فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے گھر سے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلا۔ اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کہاں ہیں؟۔ اور اپنی سواری سے گر کر مر گیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ کرم پر واجب ہو جاتا ہے یا اس کو کسی چیز نے ڈس لیا اور اس سے اس کی موت واقع ہوگئی یا وہ طبعی موت مر گیا تو اس کا اجر بھی اللہ کے ذمہ کرم پر واجب ہو جاتا ہے (2)۔ راوی فرماتے ہیں طبعی موت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے "مَاتَ حَتْفَ اَنْفِهٖ" کے الفاظ ارشاد فرمائے جن کو میں نے آج سے پہلے کسی عرب سے نہیں سنا۔ آپ نے ارشاد فرمایا جس کو اچانک قتل کر دیا گیا اس نے جنت کو اپنے اوپر لازم کر لیا (3)۔ حضرت زبیر بن عوامؓ فرماتے ہیں کہ حضرت خالد بن حزامؓ حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے تو دوران سفر انہیں سانپ نے ڈس لیا جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ حضرت زبیر فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہی حبشہ پہنچ چکا تھا اور ان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مہاجرین کے ساتھ اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی رشتہ دار تھا لیکن میرے ساتھ میرے قبیلہ بنو اسد کا کوئی شخص نہ تھا۔ میں حضرت خالد بن حزام کا انتظار کر رہا تھا لیکن جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو مجھے سخت

1۔ فتح الباری، بدء الوحی: 9/1 2۔ مسند احمد: 36/4 3۔ مسند احمد: 306/4

افسوس ہوا۔ یہ روایت انتہائی غریب ہے کیونکہ یہ واقعہ مکہ شریف کا ہے حالانکہ یہ آیت مدنی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا خیال ہو کہ اس کا حکم عام ہے اگرچہ یہ اس واقعہ کا شان نزول نہ تھا۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ضمرہ بن جندبؓ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کے لیے نکلے لیکن آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں انتقال کر گئے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ابوضمیرہ بن عیص جو کہ نابینا تھے اور مکہ میں مقیم تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب آیت کریمہ: اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً نازل ہوئی تو میں نے یہ سوچا کہ میں تو مالدار ہوں اور ہجرت کے لیے تدبیر اور حیلہ کر سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر انہوں نے نبی پاک ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کی تیاری کی لیکن ابھی مقام تنعیم ہی میں تھے کہ پیام اجل آ گیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت ابو مالک روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جو شخص میری رضا اور خوشنودی کے لیے میرے وعدے کو سچا جان کر اور میرے رسولوں پر ایمان لا کر میری راہ میں نکلتا ہے تو وہ اللہ کی ضمانت میں ہوگا چاہے تو اس کو مقام شہادت پر فائز کر کے جنت میں داخل کر دے، چاہے تو اس کو واپس لوٹا دے، اس کو اجر اور مال غنیمت بھی عطا فرما دے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے فضل و احسان سے بھی نواز دے۔ اگر اسے قتل کر دیا گیا یا وہ گھوڑے اور اونٹ سے گر کر فوت ہو گیا یا کسی چیز نے اسے ڈس لیا یا اپنے بستر پر طبعی موت مر گیا تو وہ بھی شہید ہے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ اس کے لیے جنت ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حج کے لیے اپنے گھر سے نکلا اور راستے میں ہی فوت ہو گیا تو قیامت تک اس کے نامہ اعمال میں حج کا ثواب لکھا جائے گا اور جو عمرہ کے لیے نکلا اور فوت ہو گیا تو قیامت تک جہاد کرنے والے کا ثواب اسے ملتا رہے گا۔ یہ حدیث اس سند کے اعتبار سے غریب ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾

''اور جب تم سفر کرو زمین میں تو نہیں تم پر کچھ حرج اگر تم قصر کرو نماز میں اگر ڈرو تم اس بات سے کہ تکلیف پہنچائیں گے تمہیں کافر، بے شک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں''۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جب تم سفر پر نکلو۔ یہی الفاظ سورۂ مزمل میں بھی سفر کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ ''ترجمہ: وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ سفر کر رہے ہوں گے زمین میں''۔ تو تم پر نماز میں تخفیف کرنے سے کوئی حرج نہیں۔ اور یہ تخفیف یا تو کمیت میں ہوگی یعنی چار کی بجائے دو رکعت۔ جیسا کہ جمہور علماء نے اس آیت سے اس کو سمجھا ہے۔ اور اس سے سفر میں نماز قصر کرنے پر استدلال کیا ہے۔ اگرچہ بعض مسائل میں ان کا اختلاف ہے۔ بعض تو یہ شرط لگاتے ہیں نماز کی قصر کے لیے ضروری ہے کہ سفر طاعت کا ہو جیسے جہاد، حج، عمرہ، حصول علم، زیارت وغیرہ۔ یہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت عطاء اور ایک روایت کے مطابق امام مالک سے مروی ہے۔ انہوں نے اس آیت کریمہ: اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ کے ظاہر سے استدلال کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ سفر قربت خداوندی کا ہو بلکہ اس سفر کا مباح ہونا ہی کافی ہے اور انہوں نے اس آیت کریمہ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ ''ترجمہ: پس جو لاچار ہو جائے بھوک میں درآنحالیکہ وہ گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو''۔ سے استدلال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں جس طرح مجبوری کی حالت میں مردار کھانا مباح ہے بشرطیکہ وہ گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو اس لیے نماز کی قصر کے لیے بھی شرط ہے کہ وہ سفر معصیت کا نہ ہو۔ یہ

امام شافعی، امام احمد اور دوسرے ائمہ کا قول ہے۔ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ! میں تاجر ہوں اور اکثر بحرین آنا جانا رہتا ہے تو آپ نے اسے دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم فرمایا۔ یہ حدیث مرسل ہے اور بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں مطلق سفر ہی کافی ہے خواہ وہ مباح ہو یا محظور (ممنوع) حتی کہ اگر کوئی ڈاکہ وغیرہ ڈالنے کے لیے نکلتا ہے تو اس کے لیے بھی نماز قصر کرنے کی رخصت ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ، ثوری اور داؤد ظاہری کا قول ہے اور وہ اس آیت کریمہ کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اور یہ قول جمہور علماء کے خلاف ہے اس آیت کریمہ میں قصر نماز کے لیے کافروں کے خوف کی جو شرط لگائی گئی ہے یہ اس وقت کے مخصوص حالات کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ ہجرت کے بعد ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے اکثر سفر خوف کی حالت میں ہوتے تھے کیونکہ مشرکین کے خلاف وہ عام جنگ کے لیے نہیں نکلتے تھے۔ بعض اوقات کسی چھوٹے سے لشکر کو کسی مہم پر بھیج دیا جاتا تھا۔ تمام قبائل عرب اسلام اور اہل اسلام کے دشمن تھے۔ اس لیے قدم قدم پر دشمن کا خوف رہتا تھا۔ اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جب کسی آیت کے منطوق کو باعتبار غالب یا کسی خاص حادثہ میں ذکر کیا جائے تو اس کا مفہوم معتبر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامنی کا ارادہ کریں اس کا مطلب یہ نہیں لیا جاسکتا کہ اگر وہ پاکدامنی کا ارادہ نہ کریں تو ان کو بدکاری پر مجبور کرنا جائز ہے۔ حضرت عالیہ بن امیہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ سے اس آیت کریمہ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا کے بارے میں پوچھا کہ اس میں خوف کے وقت نماز قصر کرنے کا حکم ہے۔ حالانکہ اب تو امن کا دور ہے۔ آپ نے فرمایا میرے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے پس اس صدقے کو قبول کرو(1)۔ حضرت ابوحنظلہ الحذاءؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سفر کی نماز کے بارے میں پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا دو رکعات ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ قرآن پاک میں تو خوف کے وقت قصر کرنے کا حکم ہے۔ حالانکہ ہم تو امن میں ہیں تو آپ نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ کی یہی سنت ہے(2)۔ ابوداکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سفر کی دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ رخصت آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو اسے واپس لوٹا دو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر میں امن کی حالت میں دو دو رکعات پڑھیں۔ اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ شریف سے مکہ شریف تک اور پھر واپسی میں مدینہ تک دو دو رکعات پڑھتے رہے۔ راوی نے پوچھا کہ آپ کا مکہ میں کتنے دن کے لیے قیام تھا۔ فرمایا دس دن(3)۔ حضرت حارثہ بن وہب الخزاعی فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منیٰ میں دو دو رکعات نماز پڑھی۔ حالانکہ وہاں لوگوں کی کثرت اور امن وامان تھا۔ اس کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کے ساتھ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کے خلافت میں ابتدائی دور میں دو دو رکعات پڑھیں۔ پھر وہ اپنی خلافت کے آخری ایام میں چار رکعات پڑھنے لگے(4)۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زیدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے منیٰ میں ہمیں چار رکعات پڑھائیں جب اس کا ذکر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھ کر فرمایا کہ میں نے منیٰ میں رسول اللہ ﷺ، حضرات شیخین کے ساتھ دو رکعات پڑھیں کاش! میرے حصے میں ان چار رکعات کے بدے میں دو مقبول رکعتیں ہوتیں(5)۔ یہ تمام احادیث صراحۃً اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز کی قصر کے لیے خوف کا پایا جانا شرط نہیں ہے۔ اسی

1۔ مسند احمد: 25/1 2۔ مسند احمد: 31/2 3۔ ابن ماجہ، کتاب الاقامہ: 342
4۔ فتح الباری، کتاب تقصیر الصلوٰۃ: 563/2 5۔ ایضاً

لیے بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں قصر سے مراد نماز کی کیفیت میں قصر کرنا ہے نہ کہ کمیت یعنی تعداد رکعات میں۔ یہ امام مجاہد، ضحاک اور سدی کا قول ہے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بیان کردہ حدیث ہے کہ نماز، سفر و حضر میں دو دو رکعات فرض کی گئی ہیں۔ پھر سفر کی نماز کو دو رکعات ہی برقرار رکھا گیا۔ مگر حضر کی نماز میں دو رکعات کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس لیے علمائے کرام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جب سفر میں اصل نماز دو رکعات ہی تھیں تو پھر ان میں کمیت کے اعتبار سے قصر کیسے ہوسکتی ہے۔ اور اس سے واضح دلیل حضرت عمرؓ کی حدیث ہے۔ آپ نے فرمایا سفر، عیدالاضحیٰ، عیدالفطر اور جمعہ کی رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے بموجب دو رکعات ہیں اور یہ مکمل نماز ہے، قصر نہیں(1)۔ اس کو نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند امام مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ امام مسلم نے اپنے صحیح کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ ابن ابی لیلیٰ کا حضرت عمرؓ سے سماع ثابت ہے۔ اگرچہ یحییٰ بن معین، ابو حاتم اور نسائی اس کی نفی کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی محمد ﷺ کی زبان اقدس کے ذریعہ حضر میں چار رکعات اور سفر میں دو رکعات اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے(2)۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول حضرت عائشہؓ کے مذکور قول کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے اصل نماز کے بارے میں خبر دی کہ اس کی دو رکعات ہیں لیکن حضر کی نماز میں دو رکعات زیادہ کر دی گئیں اور جب یہ چیز ثابت ہوگئی تو اب یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ حضر کی نماز کے چار فرض ہیں جیسا کہ ابن عباسؓ نے فرمایا واللہ اعلم۔ لیکن حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہؓ دونوں کی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر کی نماز میں دو رکعات ہے جو کہ مکمل نماز ہے، قصر نہیں اور اسی طرح حضرت عمرؓ کی حدیث سے بھی صراحۃً ثابت ہو چکا ہے۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ میں قصر سے مراد نماز کی کیفیت میں قصر کرنا ہے۔ جیسا کہ خوف کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا: اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اور اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ الآیہ تو یہاں نماز قصر کا مقصود، کیفیت اور صفت بیان کر دی۔ اس لیے امام بخاری نے صلوٰۃ الخوف کے باب کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ...... اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا سے شروع کیا ہے اور اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوران جنگ مجاہد سواری کے اوپر ہی دو رکعات پڑھے خواہ اس کا منہ کسی سمت ہو۔ حضرت سدی فرماتے ہیں کہ جب تو نے سفر میں دو رکعات پڑھ لیں تو یہی نماز قصر ہے۔ ہاں اگر دشمن کا خوف ہو تو پھر قصر کی ایک رکعت ہے۔ حضرت مجاہد اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ دن ہے جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ عسفان کے مقام پر تھے۔ اور مشرکین ضجنان کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ پس دونوں لشکر آمنے سامنے تھے کہ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تو آپ نے صحابہ کرام کو معمول کے مطابق چار رکعات پڑھائیں۔ اسی اثناء میں مشرکین نے ارادہ کیا کہ وہ حملہ کر کے مسلمانوں کے مال و متاع پر قبضہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ابن جریر نے اس کو مجاہد، سدی، جابر اور عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کر کے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ حضرت خالد بن اسیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ ہم قرآن پاک میں صلوٰۃ خوف میں قصر کرنے کا حکم تو پاتے ہیں لیکن صلوٰۃ سفر میں قصر کرنے کا حکم نہیں پاتے۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ ہم نے اپنے نبی ﷺ کو سفر میں قصر کرتے ہوئے پایا ہے اس لیے ہم بھی اسی پر عمل پیرا ہیں۔ انہوں نے صلوٰۃ خوف کو صلوٰۃ قصر کا نام دیا اور اس آیت کو بھی صلوٰۃ خوف پر محمول کیا نہ کہ صلوٰۃ سفر کی قصر پر۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی اس کا اقرار کیا اور سفر میں قصر کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے عمل سے استدلال کیا نہ کہ نص قرآنی سے۔ حضرت سماک حنفیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سفر کی نماز کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ سفر کی دو رکعات ہیں اور یہ مکمل نماز ہے۔ قصر نہیں قصر

1۔ مسند احمد: 237/1 2۔ مسلم، صلوٰۃ المسافرین: 479

تو نماز خوف میں ہوتی ہے۔ میں نے عرض کی کہ پھر یہ صلوٰۃ خوف کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دشمن سے خوف کے وقت امام ایک گروہ کو ایک رکعت نماز پڑھائے پھر یہ لوگ دشمن کے مقابلہ میں چلے جائیں اور پھر دوسرا گروہ آ کر امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے۔ اس طرح امام کی دو رکعات مکمل ہوں گی اور ہر ایک گروہ کی ایک ایک رکعت ہوگی (1)۔

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲

''اور (اے حبیب!) جب آپ ان میں موجود ہوں اور قائم کریں آپ ان کے لیے نماز تو چاہیے کہ کھڑا ہو ایک گروہ ان سے آپ کے ساتھ اور وہ پکڑ رکھیں اپنے ہتھیار پس جب سجدہ کر چکیں تو وہ ہو جائیں تمہارے پیچھے اور آ جائے دوسرا گروہ جس نے (ابھی) نماز نہیں پڑھی پس (اب) وہ نماز پڑھیں آپ کے ساتھ اور لیے رہیں اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار تمنا کرتے ہیں کافر اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے اسلحہ سے اور اپنے ساز و سامان سے تو وہ ٹوٹ پڑیں تم پر یک بارگی اور نہیں کوئی حرج تم پر اگر ہو تمہیں بارش کی وجہ سے یا ہو تم بیمار تو اتار دو اپنے ہتھیار مگر (دشمن کی نقل و حرکت سے) ہوشیار رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا''۔

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ: صلوٰۃ الخوف کی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی دشمن قبلہ کی جانب ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس۔ بعض اوقات نماز چار رکعات والی ہوتی ہے اور بعض اوقات تین رکعات والی جیسا کہ مغرب۔ کبھی دو رکعات والی ہوتی ہے جیسا کہ فجر اور سفر کی نماز۔ بعض اوقات تو نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنگ شدت اختیار کر جاتی ہے تو ہر کوئی علیحدہ علیحدہ اپنی نماز پڑھ لیتا ہے۔ خواہ قبلہ کی جانب منہ ہو یا نہ ہو۔ پیدل ہوں یا سوار۔ بلکہ اس حالت میں تو یہ بھی جائز ہے کہ دوران نماز ہی آگے بڑھتے جائیں اور دشمن پر وار کرتے رہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس حالت میں ایک ہی رکعت پڑھی جائے گی جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث گزر چکی ہے۔ امام احمد بن حنبل، عطاء، جابر، حسن بصری، مجاہد، حکم، قتادہ اور حماد کا یہی قول ہے۔ اور محمد بن نصر مروزی سے یہ مروی ہے کہ خوف کے وقت فجر کی ایک ہی رکعت پڑھی جائے گی۔ یہی ابن حزم کا قول ہے۔ اسحاق بن راھو یہ فرماتے ہیں کہ دشمن کے ساتھ سخت مقابلہ کے وقت اشارے کے ساتھ صرف ایک ہی رکعت کافی ہے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو ایک سجدہ ہی کر لے۔ کیونکہ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ایک تکبیر ہی کافی ہے۔ شاید اس سے مراد ایک رکعت ہو۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبل اور آپ کے اصحاب کا مذہب ہے۔ یہی قول حضرت جابر بن عبد اللہ، ابن عمر، کعب اور کئی دوسرے صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ ان صحابہ کرام کی روایات سے ظاہراً یہی

1۔ تفسیر الطبری 247/5

معلوم ہوتا ہے کہ ایک تکبیر بھی کافی ہے جیسا کہ اسحٰق بن راہویہ کا مذہب ہے۔ اور یہی قول امیر عبدالوہاب بن بخت مکی کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک تکبیر پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کو چھوڑے نہیں بلکہ دل میں نیت کر لے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ لڑائی اور مقابلے کے عذر کے باعث نماز کو مؤخر کرنا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ نبی کریم نے غزوۂ خندق کے دن ظہر اور عصر کی نماز کو مؤخر کیا حتی کہ سورج کے غروب ہونے کے بعد ان دونوں نمازوں کو پڑھا اور اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی اور پھر عشاء۔ اسی طرح آپ نے جس لشکر کو بنو قریظہ کی طرف بھیجا انہیں بھی ارشاد فرمایا کہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں جا کر پڑھنا۔ جب راستے میں ہی نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ بعض صحابہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کا مقصد یہ تھا کہ ہم جلدی جلدی بنو قریظہ پہنچیں نہ یہ کہ ہم نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کریں۔ اس لیے انہوں نے راستے میں ہی وقت پر نماز پڑھ لی۔ بعض نے نماز کو مؤخر کیا اور بنو قریظہ میں پہنچ کر سورج غروب ہونے کے بعد پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا آپ نے کسی فریق سے ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا(1)۔ ہم نے اپنی کتاب ''سیرت النبویہ'' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ حقیقت میں حق کے زیادہ قریب وہ گروہ تھا جس نے نماز عصر کو اس کے وقت میں پڑھا۔ لیکن دوسرا گروہ بھی معذور تھا۔ اور نماز کو مؤخر کرنے میں اس کا عذر جہاد اور ان لوگوں کا محاصرہ کرنے میں جلدی کرنا تھا۔ جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑا۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ الخوف کے نازل ہونے کی وجہ سے یہ تمام منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس وقت نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب نازل ہو گئی تو نماز کی تاخیر کو منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت ابو خدریؓ کی حدیث سے یہی ظاہر ہے۔ اس کو امام شافعی اور دوسرے اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ لیکن امام بخاری نے اپنی صحیح کے باب ''الصلوة عند مناهضة الحصون ولقاء العدو'' میں امام اوزاعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر فتح بالکل قریب ہو اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو تو ہر شخص اشارے کے ساتھ اپنی نماز پڑھے اور اگر اشارے پر بھی قادر نہ ہوں تو نماز کو مؤخر کریں۔ یہاں تک کہ جنگ ختم ہو جائے یا دشمن سے امن میں ہو جائیں تو پھر دو رکعات پڑھیں۔ اگر اس پر بھی قادر نہ ہوں تو ایک رکعت ادا کریں اور اگر ایک رکعت پر قادر نہ ہو تو صرف تکبیر کہنا کافی نہ ہوگا بلکہ وہ امن تک نماز کو مؤخر کریں گے۔ یہی قول مکحول کا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں تستر کے قلعہ کے محاصرہ کے وقت موجود تھا۔ فجر کا وقت ہو گیا لیکن جنگ بڑی شدت سے جاری تھی اس لیے ہم نماز نہ پڑھ سکے اور سورج کے طلوع ہونے کے بعد، ہم نے نماز پڑھی۔ اس وقت ہم حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے ساتھ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح و نصرت کے ساتھ نوازا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اگر اس نماز کے بدلہ میں مجھے دنیا و مافیہا مل جائے تو میں تب خوش نہ ہوں(2)۔ اس کے بعد امام بخاری نے غزوۂ خندق کے دن نماز کو مؤخر کرنے والی حدیث کو ذکر کیا ہے اور پھر اس حدیث کو ذکر کیا ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو بنو قریظہ میں عصر کی نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ شاید ان کے نزدیک یہی مذہب زیادہ پسندیدہ ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ فتح تستر کا واقعہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی خلافت کا ہے اور یہ کہیں بھی منقول نہیں کہ آپ نے نماز کو مؤخر کرنے پر انکار کیا ہو یا کسی اور صحابی نے اس پر انکار کیا ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی صلوٰۃ الخوف مشروع تھی۔ کیونکہ جمہور علمائے سیرت کے مطابق غزوۂ ذات الرقاع جس میں آیت صلوٰۃ الخوف نازل ہوئی۔ غزوۂ خندق سے پہلے واقع ہوا تھا۔ ان علماء سیر میں محمد بن اسحٰق، موسیٰ اشعریؓ کی حدیث ہے۔ کیونکہ آپ غزوۂ خیبر میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ مزنی، قاضی ابو یوسف اور اسماعیل بن علیہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ کے نماز مؤخر کرنے کی وجہ سے صلوٰۃ الخوف منسوخ ہو گئی۔ یہ انتہائی عجیب قول ہے کیونکہ غزوۂ خندق کے بعد بھی صلوٰۃ الخوف احادیث

1۔ فتح الباری، کتاب الخوف 436/2 2۔ فتح الباری، کتاب الخوف 434/2

سے ثابت ہے۔ اس لیے غزوۂ خندق کے دن نماز کو مؤخر کرنے کو امام اوزاعی اور مکحول کے قول پر محمول کرنا بہتر اور اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ: یعنی جب آپ خوف کی حالت میں انہیں نماز پڑھائیں۔ یہ حالت پہلی حالت کے علاوہ ہے کیونکہ پہلی حالت یعنی انتہائی خوف کے وقت ایک رکعت ہی کافی ہے۔ ہر کوئی شخص اپنی الگ نماز پڑھے گا۔ چاہے پیدل ہو یا سوار، قبلہ رو ہو یا نہ ہو۔ اور پھر یہاں اس حالت کا ذکر کیا جارہا ہے جس حالت میں تمام لوگ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہتے ہوں۔ جو لوگ جماعت کے وجوب کے قائل ہیں انہوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ جماعت کی وجہ سے بہت سے اعمال کو جائز قرار دے دیا گیا۔ اگر جماعت واجب نہ ہوتی تو ان کو جائز قرار نہ دیا جاتا۔ جنہوں نے اس آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد صلوٰۃ الخوف منسوخ ہوچکی ہے کیونکہ یہاں وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ میں خاص رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے۔ تو ان کا یہ استدلال انتہائی ضعیف ہے۔ اور یہ استدلال بعینہ ان لوگوں کے استدلال کی طرح جنہوں نے حضور ﷺ کے وصال کے بعد زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور اس آیت کریمہ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً...... ''ترجمہ: اے حبیب! ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے تاکہ آپ انہیں پاک اور انہیں بابرکت فرمائیں نیز ان کے لیے دعا مانگیں۔'' استدلال کیا اور کہنے لگے کہ ہم آپ کے بعد کسی کو زکوٰۃ نہیں دیں گے بلکہ اپنے ہاتھوں سے جسے چاہیں زکوٰۃ دیں گے اور ہم اپنی زکوٰۃ اسی کو دیں گے جس کی دعا ہمارے لیے سکون کا باعث ہو۔ لیکن ان کا یہ استدلال انتہائی ضعیف تھا اس لیے صحابہ کرامؓ نے ان کے اس اعراض کو مسترد کیا اور انہیں زکوٰۃ دینے پر مجبور کیا اور جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ان کے ساتھ قتال کیا۔ اس نماز کا طریقہ ذکر کرنے سے پہلے ہم اس آیت کریمہ کا شان نزول بیان کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ بنو نجار کے کچھ لوگوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم دوران سفر کیسے نماز ادا کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ نازل فرمائی۔ پھر سال بھر وحی کا سلسلہ منقطع رہا اور اس کے تقریباً ایک سال بعد جب رسول اللہ ﷺ مشرکین کے ساتھ جنگ کے لیے مدینہ شریف سے نکلے تو ظہر کی نماز صحابہ کرام کے ساتھ پڑھی تو مشرکین کہنے لگے موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ ہم نے اس نماز کی حالت میں یکبارگی سے حملہ کیوں نہ کرلیا۔ بعض مشرکین نے کہا تمہیں اس قسم کا موقع پھر بھی مل سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت سے پہلے یہ آیت کریمہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا نازل فرمائی۔ اس طرح صلوٰۃ الخوف کا حکم نازل ہوا اگرچہ اس روایت کا سیاق انتہائی غریب ہے۔ لیکن اس کی تائید میں دوسری اور روایات بھی ملتی ہیں جن کو امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو عیاش زرقی فرماتے ہیں کہ ہم عسفان کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں مشرکین کا ایک دستہ ہمارے سامنے قبلہ کی جانب سے آگیا رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی، تو وہ کہنے لگے کاش! اس حالت میں ہم ان پر حملہ کردیتے اور پھر کہنے لگے کہ اس کے بعد آنے والی نماز (عصر) ان کو اپنی جان اور اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ پس جبرائیل علیہ السلام ظہر اور عصر کے درمیان یہ آیات لے کر نازل ہوئے۔ راوی فرماتے ہیں کہ جب نماز عصر کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہتھیار لگانے کا حکم دیا اور دو صفیں بنا کر حضور ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ ہم سب قیام اور رکوع میں شریک رہے لیکن سجدہ میں صرف پہلی صف ہی شریک ہوئی اور دوسری صف والے کھڑے ان کی حفاظت کرتے رہے۔ پھر جب سجدہ سے فارغ ہوکر پہلی صف کھڑی ہوئی تو دوسری صف والوں نے سجدہ کیا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مقام عسفان میں دو مرتبہ نماز پڑھائی۔ ایک دفعہ مقام عسفان میں اور دوسری دفعہ قبیلہ بنو سلیم کے علاقہ میں (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ اس کے اور بھی شواہد موجود ہیں۔ ان

1۔ تفسیر الطبری 244/5

میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے جب آپ نے تکبیر کہی تو انہوں نے بھی تکبیر کہی۔ جب آپ نے رکوع کیا تو لوگوں نے بھی رکوع کیا، اسی طرح سجدہ بھی کیا اور جب آپ دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوئے تو ان لوگوں نے جنہوں نے آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھی تھی وہ دشمن کی طرف چلے گئے اور دوسرے گروہ نے آپ کے ساتھ آکر نماز ادا کی۔ اس طرح دوران نماز ہی وہ ایک دوسرے کی حفاظت کرتے رہے۔ حضرت سلیمان بن قیس یشکری نے حضرت جابرؓ سے پوچھا کہ نماز قصر کی آیت کب نازل ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ ہم شام کی طرف سے آنے والے قریش کے قافلہ کے لیے نکلے۔ ہم نحلہ کے مقام پر تھے کہ دشمنوں میں سے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ کیا آپ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے کہا آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ آپ نے میرا فرمایا میرا اللہ۔ پھر آپ نے تلوار پکڑی اور اس کو ڈرایا دھمکایا اور پھر آپ نے ہتھیار سنبھالنے اور کوچ کرنے کا حکم دیا اور جب نماز کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ کو دو رکعات پڑھائیں دوسرا گروہ ان کی حفاظت کرتا رہا۔ پھر یہ پیچھے ہٹے اور پچھلی صفوں میں آ گئے اور پچھلی صفوں والے آگے چلے گئے اور انہوں نے آپ کے ساتھ دو رکعات پڑھیں۔ اسی دن اللہ تعالیٰ نے نماز قصر کرنے کا حکم نازل فرمایا اور مسلمانوں کو ہتھیار تھامنے کا حکم دیا۔ اور مسند کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ شخص جو تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا اس کا نام غورث بن حارث تھا۔ وہ کہنے لگا آپ کو مجھ سے کون بچائے گا۔ آپ نے فرمایا میرا اللہ۔ یہ سن کر اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ تلوار آپ نے اٹھائی اور فرمایا کہ اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ اس نے کہا مجھ پر رحم فرمائیے۔ آپ نے فرمایا کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا نہیں۔ لیکن میں یہ عہد کرتا ہوں کہ میں نہ تو کبھی آپ کے ساتھ لڑائی کروں گا اور نہ ہی اس قوم کے ساتھ تعاون کروں گا جو آپ کے ساتھ لڑ رہی ہے۔ اس پر آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ جب وہ اپنی قوم کے پاس گیا تو کہا کہ میں اس شخص کے پاس سے آیا ہوں جو تمام روئے زمین سے افضل و بہتر ہے۔ اس روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ یزید فقیر نے حضرت جابرؓ سے سفر کی دو رکعات کے بارے میں پوچھا کیا میں ان میں قصر کروں۔ آپ نے فرمایا سفر میں دو رکعات ہی مکمل نماز ہے۔ قصر تو صرف جہاد کے وقت ہی ہوتی ہے یعنی جب دشمن کا خوف ہو تو پھر ایک رکعت ہی نماز پڑھی جاتی ہے۔ پھر آپ نے اس نماز کا طریقہ بیان کیا جو پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ صحابہ کرام کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ کو دشمن کے سامنے کر دیا اور دوسرے گروہ کو ایک رکعت پڑھائی۔ پھر سامنے والے پیچھے آ گئے اور جنہوں نے ایک رکعت پڑھی تھی وہ آگے چلے گئے اور دوسرے گروہ نے آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھی۔ اس طرح آپ کی دو رکعت ہوئیں دونوں گروہوں کی ایک ایک۔ اس حدیث کو نسائی نے شعبہ سے روایت کیا ہے اور اس کے علاوہ دوسری اسناد بھی ہیں۔ صحیح مسلم میں یہی حدیث دوسری سند سے مروی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے محدثین نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ "وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ" سے مراد صلوٰۃ خوف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو ایک رکعت پڑھائی۔ دوسرا گروہ دشمن کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس گروہ نے ایک رکعت پڑھی اور پہلا گروہ دشمن کے مقابلہ میں چلا گیا۔ پھر آپ نے سلام پھیرا تو ہر گروہ نے باقی ماندہ ایک ایک رکعت مکمل کی(2)۔ اس حدیث کو بہت سے محدثین نے اپنی کتب میں معمر کی سند سے روایت کیا ہے۔ کئی اور دوسرے صحابہ کرام سے بھی یہ حدیث پاک مروی ہے۔ ابو بکر بن مردویہ نے اس حدیث کی تمام اسناد اور الفاظ کو اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ نماز

1۔ مسند احمد 390/3 2۔ مسند احمد 298/3

خوف کے دوران ہتھیار اٹھانے کے حکم کو بعض علماء نے وجوب پر محمول کیا ہے۔انہوں نے اس آیت کریمہ کے ظاہر سے استدلال کیا ہے اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے۔ اللہ کا تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ...... اس پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی جب تم جنگ کے لیے بالکل تیار ہو اور تمہیں ہتھیار لگانے کی ضرورت ہو تو ہتھیار لگالو۔ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿١٠٣﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ إِنْ تَكُوْنُوْا تَأْلَمُوْنَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُوْنَ كَمَا تَأْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٠٤﴾

''جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے) پھر جب مطمئن ہو جاؤ (دشمن کی طرف سے) تو ادا کرو نماز (حسب دستور) بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقرر وقت پر۔ اور نہ کمزوری دکھاؤ (دشمن) قوم کی تلاش میں۔ اگر تمہیں دکھ پہنچا ہے تو انہیں بھی دکھ پہنچتا ہے جیسے تمہیں دکھ پہنچتا ہے۔ اور تم تو امید رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے اس (ثواب) کی جس کی وہ امید نہیں رکھتے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کے بعد بکثرت ذکر کرنے کا حکم فرمایا ہے اگرچہ دوسری نمازوں کے بعد بھی پسندیدہ اور محبوب ہے لیکن یہاں خصوصی طور پر اس کے حکم کو ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس نماز میں آنے جانے کی رخصت اور اس کے ارکان میں تخفیف کی اجازت دی گئی ہے جو دوسری نمازوں میں نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حرمت والے مہینوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کیا کرو۔ اگرچہ یہ ظلم دوسرے مہینوں میں ممنوع ہے لیکن ان مہینوں کی عظمت اور حرمت کی وجہ سے اس سے بچنے کی مزید تاکید فرمائی گئی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ...... یعنی مومن کو اپنے تمام احوال میں ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا اور جب تم دشمن کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ، حالات خوف ختم ہو جائے اور تمہیں سکون و اطمینان حاصل ہو جائے تو پھر نماز کو حسب دستور یعنی اس کی تمام حدود کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کے رکوع و سجود کو اطمینان کے ساتھ مکمل کرتے ہوئے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرو۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا: حضرت ابن عباسؓ نے ''موقوت'' کا معنی مفروض بیان فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں جس طرح حج کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ یہی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک قول ہے، حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نماز کو مسلمانوں پر متفرق طور پر فرض کیا۔ جب ایک نماز کا وقت ختم ہوتا ہے دوسری نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ: اپنے دشمن کی تلاش میں کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ کرو بلکہ مکمل جدوجہد اور کوشش کر کے اس کے ساتھ جنگ کرو اور ہر گھات کی جگہ میں تاک لگائے رکھو۔

إِنْ تَكُوْنُوْا تَأْلَمُوْنَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُوْنَ: یعنی جس طرح میدان جنگ میں تمہیں درد و آرام اور زخموں اور قتل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس طرح کفار یا مشرکین بھی ان اوامر سے دوچار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: إِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ

''ترجمہ: (احد میں) اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو (بدر میں) تمہاری دشمن قوم کو بھی ایسی چوٹ لگ چکی ہے۔''

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ: یعنی درد وآرام اور تکالیف برداشت کرنے میں تم دونوں برابر ہو لیکن تم اللہ کی بارگاہ سے ثواب اور نصرت وتائید کی امید رکھتے ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے اور اپنے نبی کی زبان حق ترجمان پر وعدہ فرمایا ہے اور یہ وعدہ حق اور سچ ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں مشرکین کو اس قسم کی کوئی امید نہیں۔ اس لیے تمہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے، اس کے دین کی اشاعت کرنے اور اعلائے کلمہ حق میں شدید رغبت اور آرزو رکھنی چاہیے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ جن شرعی اور آفاقی احکام واحوال کا فیصلہ فرماتا ہے اور ان کو نافذ کرتا ہے وہ ان کو بخوبی جانتا ہے۔ اور وہ اپنے ان افعال میں بڑا دانا ہے۔ یعنی وہ ہر حال میں حمد وثناء کا سزاوار ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿١٠٥﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِـيْمًا ﴿١٠٧﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿١٠٨﴾ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾

''بے شک ہم نے نازل کی ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ تاکہ فیصلہ کریں آپ لوگوں میں اس کے مطابق جو دکھا دیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے اور نہ بنیے بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے۔ اور مغفرت طلب کیجیے اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور مت جھگڑیں آپ ان کی طرف سے جو خیانت کرتے ہیں اپنے آپ سے بے شک اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا اسے جو بڑا بددیانت (اور) بدکار ہے۔ وہ چھپا سکتے ہیں (اپنے ارادے) لوگوں سے لیکن نہیں چھپا سکتے اللہ تعالیٰ سے اور وہ تو (اس وقت بھی) ان کے ساتھ ہوتا ہے جب راتوں کو مشورہ کرتے ہیں ایسی باتوں کا جو پسند نہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے گھیرے ہوئے ہے۔ سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو کہ جھگڑتے ہو ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں پس کون جھگڑے گا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی طرف سے قیامت کے دن یا کون ہوگا (اس روز) ان کا وکیل''۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ: اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے آپ پر جو کتاب نازل فرمائی ہے یقیناً وہ حق ہے، اس میں موجود تمام اخبار اور فرامین حق ہیں۔

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ: اس آیت کریمہ سے بعض علمائے اصول نے یہ استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرنے کا اختیار تھا۔ اسی طرح انہوں نے ام سلمہؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حجرہ مبارک کے دروازے پر کچھ جھگڑنے والوں کا شور سنا۔ آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: میں ایک انسان ہوں جو کچھ سنتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ تم سے کوئی اپنی دلیل کو اچھے طریقے سے پیش کرنے پر قادر ہو جس کی وجہ سے میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں۔ اور اگر

میں اس طرح کسی کے بارے میں فیصلہ کروں اور فی الحقیقت اس کا حق دار نہ ہو تو وہ سمجھ لے کہ جہنم کی آگ کا ٹکڑا ہے۔ اب وہ چاہے تو اسے لے لے، چاہے تو اسے چھوڑ دے (1)۔ حضرت ام سلمہؓ سے ایک دوسری روایت ہے دو انصاری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں وراثت کے سلسلہ میں ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے یہ جھگڑا ان کے درمیان کافی قدیم تھا اور ان کے پاس کوئی گواہی وغیرہ بھی نہ تھی تو اس وقت آپ نے ان کو یہی حدیث بیان فرمائی اور فرمایا اگر میں کسی کے حق میں اس کے بھائی کی کسی چیز کا فیصلہ کر دوں تو وہ نہ لے کیونکہ گویا وہ نار جہنم کا ایک ٹکڑا ہے جس کو وہ قیامت کے دن گلے میں لٹکائے ہوئے آئے گا۔ یہ سن کر وہ دونوں صحابی رونے لگے اور ان میں سے ہر ایک کہنے لگا کہ یہ حق میرے بھائی کو دے دو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم ایسا کہہ رہے ہو تو جاؤ اس کو آپس میں تقسیم کر لو۔ ہاں اس کو برابر تقسیم کرنے کے لیے قرعہ ڈال لینا اور پھر بھی تم میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کو معاف کر دے۔ حضرت اسامہ بن زید کی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جن احکام میں وحی نازل نہیں ہوتی ان میں اپنی رائے کے ساتھ فیصلہ کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ انصار کا ایک گروہ جہاد کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلا۔ ان میں کسی ایک کی زرہ چوری ہو گئی۔ اس نے ایک شخص پر شک کیا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ طعمہ بن ابیرق نے میری زرہ چرائی ہے۔ جب چور نے یہ دیکھا تو اس زرہ کو ایک بے قصور آدمی کے گھر میں پھینک دیا ہے کہ اس کے گھر سے برآمد ہو جائے گی۔ تم رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ اور عرض کرو یا رسول اللہ! کہ ہمارا ساتھی تو اس چوری کے الزام سے بری ہے۔ زرہ کو تو فلاں شخص نے چوری کیا تھا۔ ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ زرہ اس کے گھر میں ہے۔ اس لیے ہمارے ساتھی کی بے گناہی کا اعلان لوگوں کے سامنے فرمائیے اور اس کی حمایت بھی کیجئے۔ کیونکہ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اس کی بے گناہی اور برأت کا اظہار فرما دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور وہ لوگ جو جھوٹ کو چھپا کر آپ کے پاس آئے تھے ان کے بارے میں يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ...... اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بے گناہ پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا...... ''ترجمہ: جو شخص کوئی خطا کرتا یا گناہ اور پھر کسی بے گناہ پر تہمت لگا دیتا ہے تو تحقیق وہ اس بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھاتا ہے۔'' یعنی وہ چور اور اس چور کی حمایت کرنے والوں نے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اس روایت کا سیاق انتہائی غریب ہے۔ مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدی اور ابن وید وغیرھم نے فرمایا ہے کہ یہ آیت کریمہ بنو ابیرق کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس واقعہ کو ابن اسحٰق نے تفصیلاً روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح اس واقعہ کو امام ترمذی اور ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت قتادہ ابن نعمانؓ فرماتے ہیں کہ بنو ابیرق کے قبیلہ میں ایک گھر تھا جس میں بشر، بشیر و مبشر نام کے آدمی تھے۔ بشیر بڑا منافق تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے ہجو میں شعر کہتا پھر ان کو کسی عرب شاعر سے منسوب کر دیتا اور ان اشعار کو بڑے مزے سے پڑھتا جب صحابہ کرام کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا قسم بخدا! یہ شعر اسی خبیث آدمی کے ہیں وہ لوگ زمانہ جاہلیت سے ہی مفلس چلے آ رہے تھے۔ اس دور میں اہل مدینہ کی خوراک کھجوریں اور جو تھیں اگر کوئی مال دار آدمی ہوتا تو وہ شام سے آنے والے قافلے سے میدہ خرید لیتا جس کو اپنی ذات کے لیے خاص کر دیتا اور باقی اہل خانہ کھجور اور جو پر ہی گزارہ کرتے۔ میرے چچا رفاعہ بن زید نے اس قافلہ سے ایک میدہ کا تھیلا خریدا اور اسے بالا خانے میں محفوظ کر دیا۔ اس بالا خانہ میں تلواروں اور زرہوں کے علاوہ دوسرے ہتھیار بھی تھے۔ کسی نے رات کے وقت اس بالا خانہ میں نقب لگائی اور میدہ اور ہتھیار چرا کر لے گیا۔ صبح میرے چچا میرے پاس آئے اور مجھے تمام واقعہ بیان کیا۔ جب ہم نے تحقیق کی تو لوگوں نے ہمیں بتایا کہ آج رات ہم نے بنو ابیرق کے گھر آگ جلتے دیکھی ہے

1۔ فتح الباری، کتاب الشہادات 288/5

اور ہمارا خیال ہے کہ وہ تمہارے گھر سے چرائے ہوئے اناج ہی کو پکا رہے ہیں۔ ابھی ہم اپنے ہی گھر میں اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے کہ بنوابیرق نے آکر ہمیں بتایا کہ تمہارا چور لبید بن سہل ہے۔ ہمیں یہ معلوم تھا کہ وہ یہ کام نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ ایک مسلمان تھا۔ جب لبید نے یہ بات سنی تو غصے میں تلوار سونتے ہوئے گھر سے نکلے اور بنوابیرق کو کہا کہ اگر میں نے چوری کی ہے تو میری چوری ثابت کرو ورنہ اس تلوار کے ساتھ تمہاری گردنیں اڑا دوں گا۔ یہ سن کر وہ منت سماجت کرنے لگے اور کہنے لگے نہیں آپ نے چوری نہیں کی۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ چوری کرنے والے بنوابیرق ہی ہیں۔ میرے چچا نے مجھے کہا بیٹا جاؤ رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر کرو۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ ہمارے قبیلہ کے کچھ لوگ بڑے ظالم ہیں انہوں نے میرے چچا رفاعہ بن زید کے گھر میں نقب لگائی اور ان کے ہتھیار اور اناج چوری کر کے لے گئے۔ آپ نے انہیں حکم فرمائیں کہ ہمیں ہمارے ہتھیار واپس کر دیں، اس کے علاوہ اناج کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس کے بارے میں تحقیق کروں گا۔ جب بنوابیرق نے یہ بات سنی تو اپنے قبیلہ ہی کے ایک شخص اسید بن عروہ کے پاس آئے اور اس کے بارے میں اس کے ساتھ مشورہ کیا۔ اور پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کہ قتادہ بن نعمان اور ان کے چچا نے بغیر کسی دلیل کے ان شریف لوگوں پر چوری کا الزام لگا دیا ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں بھی آپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے ان شریف لوگوں پر بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے چوری کی تہمت لگا دی۔ میں یہ سن کر پریشانی کی حالت میں واپس لوٹا اور یہ سوچ رہا تھا کہ کاش میں اپنے اس دعویٰ سے دستبردار ہو جاتا اور آپ کے ساتھ اس کے بارے میں کوئی بات نہ کرتا اسی دوران میرے چچا آ گئے، مجھ سے پوچھا۔ بیٹے! چوری کا کیا فیصلہ ہوا۔ میں نے ان کو یہ تمام واقعہ سنا دیا۔ وہ کہنے لگے ہم اللہ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر یہ آیات نازل فرمائیں۔ خیانت کرنے والوں سے مراد بنوابیرق ہیں اور آپ کو استغفار کا حکم اس فرمان کی وجہ سے ہوا ہے جو آپ نے حضرت قتادہ کو فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا اگر یہ لوگ اپنے گناہ سے توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے گا اور جو شخص خود گناہ کر کے کسی اپنے گناہ سے توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادے گا اور جو شخص خود گناہ کر کے کسی دوسرے پر الزام لگا دے تو یہ بہت بڑا بہتان اور واضح گناہ ہے۔ یعنی بنوابیرق نے جو حضرت لبید بن سہل پر چوری کا الزام لگایا تھا۔ اور یہ آیات فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا تک نازل ہوئیں۔ ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بنوابیرق سے ہتھیار لے کر رفاعہ کو واپس کر دے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میرے چچا بڑھاپے کی وجہ سے نابینا ہو چکے تھے مجھے ان کے اسلام کے بارے میں بھی کچھ شک تھا۔ میں جب ان کے پاس ہتھیار لے کر گیا تو انہوں نے کہا اے بیٹے! انہیں اللہ کی راہ میں وقف کر دو۔ جس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ سچے مسلمان تھے۔ بشیر یہ آیات سن کر مشرکین کے ساتھ جا ملا اور سلافہ بنت سعد بن سمعیہ کے پاس مقیم ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْحَقُّ...... نازل فرمائیں۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے اپنے اشعار میں بشیر کی سخت ہجو کی۔ جب سلافہ نے یہ ہجو سنی تو غصے میں آکر اس کا سامان اٹھایا اور اپنے گھر سے باہر کھلے میدان میں پھینک دیا اور کہا کہ تو میرے پاس کوئی خیر کی خبر نہیں لایا۔ بلکہ حسان بن ثابت کی ہجو کے اشعار لایا ہے(1)۔ اس روایت کو کئی ایک محدثین نے تفصیلاً اور مختصراً اپنی کتب میں روایت کیا ہے۔ اس کی مکمل تفصیل حاکم ابوعبداللہ نے اپنی مستدرک میں ابن اسحاق سے اس واقعہ کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اپنی سیرت میں ذکر کی ہے جس میں حسان بن ثابتؓ کے اشعار بھی مذکور ہیں۔

1۔ سیرۃ ابن ہشام 1/525،524

يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ: یہاں منافقین کی حماقت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بدکاریوں کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتے ہیں تا کہ وہ لوگوں پر اعتراض نہ کریں۔ لیکن اللہ سے وہ حیاء نہیں کرتے۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ وہ تو دل کے بھیدوں کو بھی جاننے والا ہے اور ان کے تمام اسرار پر مطلع ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ: یہ منافقین کے لیے وعید اور دھمکی ہے کہ وہ اپنے برے اعمال سے باز آ جائیں۔ پھر ارشاد فرمایا:

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: یعنی اگرچہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ لوگ دنیاوی حکمرانوں کے سامنے جو ظاہر کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اپنے جھوٹے دلائل کی وجہ سے غالب آ بھی گئے تو کل قیامت کے دن ان کے اس جھوٹے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے ان کا وکیل کون ہوگا۔ یعنی اس دن ان کا کوئی وکیل اور مددگار نہیں ہوگا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۤئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۤــــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۤىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

''اور جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم کرے اپنے آپ پر پھر مغفرت مانگے اللہ تعالیٰ سے تو پائے گا اللہ تعالیٰ کو بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا۔ اور جو کمائے گناہ کو تو وہ کماتا ہے اسے اپنے لیے اور اللہ تعالیٰ علیم (و) حکیم ہے۔ اور جو شخص کمائے کوئی خطایا گناہ پھر تہمت لگائے اس سے کسی بے گناہ کو تو اس نے اٹھالیا (بوجھ) بہتان کا اور کھلے گناہ کا۔ اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل آپ پر اور اس کی رحمت تو تہیہ کر لیا تھا ایک گروہ نے ان سے کہ غلطی میں ڈال دیں آپ کو اور نہیں غلطی میں ڈال رہے مگر اپنے آپ کو اور نہیں ضرر پہنچا سکتے آپ کو کچھ بھی اور اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت اور سکھا دیا آپ کو جو کچھ بھی آپ نہیں جانتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل عظیم ہے''۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا: اللہ تعالیٰ یہاں اپنی جود وسخا اور فضل واحسان کو بیان فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ کر کے اس کی بارگاہ میں رجوع کرے وہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ خواہ وہ گناہ کسی قسم کا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اپنے بندوں پر اپنے عفو و درگزر، حلم وکرم، وسعت رحمت اور مغفرت کو بیان فرمایا ہے۔ پس جو شخص کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے گناہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا حتی کہ اس کے گناہ زمین وآسمان اور پہاڑوں سے بھی بڑے ہوں اور وہ شخص اللہ کی بارگاہ میں دامن طلب پھیلا کر مغفرت کا خواستگار ہو تو اللہ اسے معاف فرما دیتا ہے(1)۔ بنو اسرائیل میں جب کسی سے گناہ کا ارتکاب ہو جاتا تو اس کے دروازے پر اس کے گناہ کا کفارہ لکھ دیا جاتا اور اگر ان کے کپڑے پر پیشاب لگ جاتا تو اسے قینچی کے ساتھ کاٹنے کا حکم تھا۔ ایک شخص نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خیر بھی عطا فرمائی۔ تو آپ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں یہ سہولت عطا کی ہے وہ بنی اسرائیل سے بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے

1۔ تفسیر الطبری 273/5

لیے پانی کو پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیا اور فرمایا اگر کسی سے گناہ سرزد ہو جائے یا وہ اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے تو اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں پر توبہ کرے تو وہ بہ قبول فرمالیتا ہے! ایک عورت حضرت عبداللہ بن مغفل کے پاس آئی اور پوچھا کوئی عورت بدکاری کا ارتکاب کرے جس کی وجہ سے اسے حمل ہو جائے پھر جب بچہ پیدا ہو تو وہ اسے قتل کر دے۔ اس کے بارے میں بتائیے کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی سزا نار جہنم ہے۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی آپ نے بلایا اور اسے یہ آیت "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا" پڑھ کر سنائی۔ اس نے جب یہ آیت کریمہ سنی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو پونچھا اور چلی گئی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں جب بھی رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث یا بات سنتا ہوں تو اللہ تعالیٰ اس سے مجھے نفع پہنچاتا ہے۔ یہ حدیث مجھے حضرت ابوبکرؓ نے بتائی ہے اور انہوں نے سچ فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بھی کوئی مسلمان گناہ کر بیٹھے اور پھر دو رکعت نماز پڑھ لے اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی مغفرت طلب کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے مغفرت طلب فرما دیتا ہے(1)۔ پھر آپ نے یہ دو آیات پڑھیں مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ...... اور وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا ...... (آل عمران: 135)" ترجمہ: اور یہ لوگ جب کوئی برا کام کر بیٹھیں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو فوراً اللہ کا ذکر کریں اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں"۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جب بھی کوئی بندہ گناہ کر بیٹھے اور پھر اچھے طریقے سے وضو کر کے نماز پڑھے اور اپنے گناہ کی معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر اس کی بخشش لازم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ...... حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ کسی مجلس سے کسی کام کے لیے تشریف لے جاتے اور واپس آنے کا ارادہ ہوتا تو مسجد میں اپنے نعلین مبارک یا کپڑا وغیرہ چھوڑ جاتے۔ ایک دفعہ آپ حسب معمول اپنے نعلین مبارک مسجد میں چھوڑے باہر تشریف لے گئے۔ میں نے پانی کا کوزہ لیا اور آپ کے پیچھے ہولیا۔ آپ کچھ دیر کے بعد بغیر قضائے حاجت کے واپس لوٹے اور ارشاد فرمایا کہ کہ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت کریمہ: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا نازل ہوئی۔ میں نے ارادہ کیا کہ اپنے صحابہ کو یہ خوشخبری سنا دوں۔ حضرت ابودرداء فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے آیت کریمہ: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ " ترجمہ: جو برا عمل کرے گا اسے اس کی سزا ملے گی"۔ نازل ہوئی تھی جو صحابہ کرام پر بڑی شاق تھی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر چہ کوئی شخص زنا اور چوری کرے اور پھر اپنے رب سے مغفرت طلب کرے تو کیا وہ اسے معاف کر دے گا۔ آپ نے فرمایا ہاں میں نے دوسری دفعہ پھر عرض کی تو آپ نے ہاں میں ارشاد فرمایا۔ اور جب میں نے تیسری بار عرض کی تو آپ نے ارشاد فرمایا ہاں اگر چہ وہ زنا اور چوری بھی کرے تو پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے۔ اگر چہ ابودرداء کی ناک خاک آلود ہو۔ راوی فرماتے ہیں کہ ابودرداء اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد اپنی انگلی ناک پر مارا کرتے تھے۔ یہ روایت اپنے سیاق کے اعتبار سے انتہائی ضعیف ہے، اس کی سند میں بھی ضعف ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا: یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (انعام: 164) کے مثل ہے۔ یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کو نفع نہیں پہنچائے گا بلکہ ہر انسان اپنے اعمال کا خود جوابدہ ہوگا۔ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ وہ علیم حکیم ہے اور یہ سب اس کے علم و حکمت اور عدل و رحمت کا حصہ ہیں۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا: اس سے مراد بنو ابیرق ہیں جنہوں نے چوری جیسے فعل شنیع کا ارتکاب کر کے اس کا الزام ایک شریف آدمی لبید بن سہل پر لگا دیا جب کا تفصیلی بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد زید بن سمین یہودی ہے۔ اس

1۔ مسند احمد: 1/8-9

کے قبیلہ والوں نے اس پر چوری کا الزام لگا دیا حالانکہ وہ اس سے بری تھا در حقیقت وہ لوگ ظالم اور خائن تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مطلع کیا۔ یہ آیت کریمہ چونکہ شان نزول کے اعتبار سے خاص ہے لیکن حکم کے اعتبار سے عام ہے کہ جو شخص بھی اس قسم کے فعل و شنیع کا مرتکب ہوگا اسے یہ سزا ملے گی۔

لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ: اس آیت کا تعلق بھی بنو ابیرق کے قصہ کے ساتھ تھا۔

لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ط : اس گروہ سے مراد اسید بن عروہ اور اس کے ساتھی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر بنو ابیرق کی تعریف کی اور قتادہ بن نعمانؓ کو ملامت کیا کہ انہوں نے ان نیک اور بے گناہ لوگوں پر چوری کی تہمت لگائی۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس جھگڑے کا فیصلہ نازل فرما کر اپنے رسول ﷺ کو اس سے آگاہ فرما دیا اور تمام افعال میں تائید ونصرت اور حفاظت فرما کر آپ پر خاص احسان فرمایا۔ کتاب سے مراد قرآن پاک اور حکمت سے مراد سنت ہے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط : یعنی اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے آپ جن امور سے آگاہ نہیں تھے اللہ نے ان پر آپ کو مطلع کر دیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ..... (شوریٰ: 52) ''ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی آپ کی طرف (جانفزا) کلام اپنے سے بھیجا نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے''۔ اور اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ..... (قصص: 89) ''ترجمہ: اور آپ کو تو یہ امید نہ تھی کہ نازل کی جائے آپ کی طرف کتاب مگر یہ محض رحمت ہے آپ کے رب کی''۔ اس لیے ارشاد فرمایا: وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۔

لَا خَيْرَ فِىْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ط وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ع

''نہیں کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا یا نیک کام کا یا صلح کرانے کا لوگوں میں اور جو شخص کرے یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضامندیاں حاصل کرنے کے لیے تو ہم عطا فرمائیں گے اسے اجر عظیم۔ اور جو شخص مخالفت کرے (اللہ کے) رسول ﷺ کی اس کے بعد کہ روشن ہوگئی اس کے لیے ہدایت کی راہ اور چلے اس راہ پر جو الگ ہے، مسلمانوں کی راہ سے تو ہم پھرنے دیں گے اسے جدھر وہ خود پھرا ہے اور ڈال دیں گے اسے جہنم میں اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے''۔

لَا خَيْرَ فِىْ كَثِيْرٍ: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ لوگوں کی اکثر کلام میں کوئی بھلائی یا خیر نہیں ہوتی سوائے ان امور کے کہ وہ کسی کو صدقہ، نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کروانے کا حکم دیں۔ محمد بن زید فرماتے ہیں کہ ہم حضرت سفیان ثوری کی قیادت میں نکلے تو وہاں حضرت سعید بن حسان بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ سفیان ثوریؒ نے کہا کہ تم نے جوام صالح سے روایت کردہ حدیث مجھے سنائی تھی۔ مجھے دوبارہ سناؤ۔ انہوں نے حدیث کی سند بیان کر کے فرمایا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ انسان کی تمام گفتگو اس کے لیے وبال جان ہوتی ہے سوائے اللہ

کے ذکر، نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے (1)۔ حضرت سفیان نے فرمایا کیا تم نے اللہ کا یہ ارشاد: لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ نہیں پڑھا۔ اس حدیث میں بعینہ اس کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ حضرت ام کلثوم بنت عقبہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان صلح کرواتا ہے اور نیکی اور بھلائی کی اشاعت کرتا ہے۔ وہ جھوٹا نہیں ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین امور میں اس کی رخصت دی ہے۔ جنگ لوگوں کے درمیان صلح کرانے اور اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے۔ حضرت ام کلثوم بنت عقبہ کا شمار ان مہاجر صحابیات میں ہوتا ہے جنہوں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بیعت کی(2)۔ حضرت ابو درداءؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کیا تمہیں ایسے عمل کے بارے میں نہ بتاؤں جو نماز، روزے اور صدقہ سے بھی افضل ہے۔ لوگوں نے عرض کی کیوں نہیں، ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا یہ عمل جھگڑنے والوں کے درمیان صلح کرانا ہے اور ان کے درمیان فساد ڈالنا تو نیک اعمال کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے(3)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ایوب انصاریؓ سے فرمایا کیا میں تمہیں ایک تجارت سے آگاہ نہ کروں۔ عرض کی (ضرور) کیوں نہیں۔ فرمایا جب لوگوں میں جھگڑا ہو جائے تو ان میں صلح کرائیں اور جب ان میں دوری پیدا ہو جائے تو ان کو قریب کرو۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ: اور جو شخص یہ کام اللہ اور اس کے رسول کی رضا و خوشنودی کے لیے اخلاص اور نیکی کی نیت سے کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا کرے گا۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ: یعنی جب کوئی رسول اللہ ﷺ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور راہ پر چل نکلے یعنی شریعت کا حکم کچھ ہو اور اس کا عمل کچھ اور وہ حق کے واضح اور ظاہر ہونے کے باوجود بھی جان بوجھ کر اپنی اس روش پر گامزن رہے تو ہم اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیتے ہیں۔

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور جو مسلمانوں کی راہ کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ بناتا ہے وہ بھی رسول اللہ کے حکم کی مخالفت کرنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخالفت کبھی تو رسول اللہ ﷺ کے صریح حکم ہوتی ہے اور کبھی اس حکم کی جس پر امت کا اجماع ہو چکا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو کسی خطا پر جمع ہونے سے محفوظ فرمایا ہے۔ یہ عظمت و شان انہیں اپنے نبی ﷺ کے وسیلہ سے عطا ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں جن میں سے بعض احادیث کو ہم نے اپنی کتاب ''احادیث رسول'' میں بیان کیا ہے۔ بعض علماء ان احادیث کے معنوی طور پر متواتر ہونے کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ انتہائی غور و فکر کے بعد اس آیت کریمہ سے اجماع امت کے دلیل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ یہ انتہائی قوی اور خوبصورت استدلال ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے آیت کریمہ کی اس پر دلالت کو بغیر خیال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی راہ کی مخالفت کرنے والے کے لیے یہ وعید سنائی ہے۔

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى: اگر اس نے اپنی اس روش کو نہ چھوڑا تو ہم بھی اس کو اس کی سزا دیں گے وہ اس طرح کے ہم اس کے سینے میں اس چیز کو مزین کر دیں گے اور آہستہ آہستہ وہ جہنم تک پہنچ جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ..... (القلم:44) پس (اے حبیب!) آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور اسے جو کتاب کو جھٹلاتا ہے ہم ان کو بتدریج گمراہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (صف:5) ''ترجمہ: پس جب انہوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا''۔ آخرت میں ان کا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1۔ الدر المنثور 220/2 2۔ ابن ماجہ، ابواب الفتن 1315 3۔ مسند احمد 444/6

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ...... (صافات:22) ''ترجمہ: (اے فرشتو!) جمع کرو جنہوں نے ظلم کیا اور ان کے ساتھیوں کو اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ کو چھوڑ کر پھر سیدھا لے چلو انہیں جہنم کی راہ کی طرف۔'' اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ...... (الکہف:53) ''ترجمہ: اور دیکھیں گے مجرم جہنم کی آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں۔ اور نہ پائیں گے اس سے نجات پانے کی جگہ''۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشا اس (جرم عظیم) کو کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے اس کے ماسوا جتنے جرائم ہوں جس کے لیے چاہتا ہے اور جو شریک ٹھہرائے (کسی کو) اللہ کے ساتھ تو وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا۔ نہیں عبادت کرتے یہ مشرک اللہ کے سوا مگر دیویوں کی اور نہیں عبادت کرتے مگر شیطان سرکش کی۔ لعنت کی ہے اس پر اللہ نے اور اس نے کہا تھا کہ میں ضرور لوں گا تیرے بندوں سے (اپنا) حصہ مقرر۔ اور میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور میں ضرور انہیں جھوٹی امیدوں میں رکھوں گا اور میں ضرور حکم دوں گا انہیں پس وہ ضرور چیریں گے جانوروں کے کان اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ ضرور بدل ڈالیں گے اللہ کی مخلوق کو۔ جو شخص بنا لے شیطان کو (اپنا) دوست اللہ کو چھوڑ کر تو نقصان اٹھایا اس نے کھلا نقصان۔ شیطان (جھوٹے) وعدے کرتا ہے ان سے اور (غلط) امیدیں دلاتا ہے انہیں اور نہیں وعدہ کرتا ان سے شیطان مگر فریب کا۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور نہ پائیں گے اس سے بچ نکلنے کی جگہ۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے داخل کریں گے ہم انہیں ان باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات کرنے میں''۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ: اس آیت کریمہ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے اس سورت کی ابتدا میں ہم نے اس کے متعلق احادیث کو بھی بیان کر دیا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں قرآن پاک میں میرے لیے اس سے زیادہ کوئی محبوب آیت نہیں۔

مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ: اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے۔ وہ راہ حق کو چھوڑ کر گمراہی کے راستے کو اختیار کر لیتا ہے اور صراط مستقیم سے دور ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال کر دنیا آخرت میں خائب وخاسر ہو جاتا ہے اور دنیاوی آخروی سعادت سے

محروم ہو جاتا ہے۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ: حضرت ابی بن کعبؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مشرکین ہر بت کے ساتھ ایک دیوی کی پوجا بھی کرتے تھے(1)۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''اِنٰثًا'' سے مراد بت ہیں۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اور وہ کہتے تھے کہ ہم ان کی پوجا صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے ہمیں اللہ کا قرب حاصل ہو جائے۔ انہوں نے ان کو اپنا رب بنا لیا تھا۔ اور عورتوں کے مشابہ ان کی مورتیاں بنالی تھیں اور یہ کہتے کہ یہ اس خدا کی بیٹیوں کے مشابہ ہیں جس کی ہم پوجا کرتے ہیں اور یہ تفسیر اللہ کے اس ارشاد: اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى (نجم:19) کے مثل ہے۔ اور یہی مفہوم ان دو آیتوں میں پایا جاتا ہے۔ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (زخرف:19) ''ترجمہ: اور انہوں نے ٹھہرایا فرشتوں کو جو رحمٰن کے بندے ہیں عورتیں''۔ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصافات:158) ''ترجمہ: اور ٹھہرا دیا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان رشتہ''۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ''اناثا'' سے مراد مردے ہیں۔ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں اس سے مراد ہر ذی روح چیز ہے۔ خواہ لکڑی ہو یا پتھر(2)۔ لیکن یہ قول غریب اور عجیب ہے۔

وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا: شیطان نے ہی انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیں اور اسی نے ان کے سامنے اسے مزین کر کے پیش کیا۔ اس لیے حقیقت میں وہ اسی شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (یٰسین:60) ''ترجمہ: کیا میں نے تمہیں یہ تاکیدی حکم نہیں دیا تھا اے اولاد آدم کہ شیطان کی پوجا نہ کرنا''۔ اسی لیے قیامت کے دن فرشتے ان مشرکین کے متعلق کہیں گے جو دنیا میں ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اے اللہ تو ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔ تو ہمارا مالک ہے، ہمارا ان کے ساتھ کیا واسطہ۔ بلکہ یہ تو جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے۔

لَّعَنَهُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکار دیا اور اپنی رحمت سے دور کر کے اپنے جوار قدس سے نکال دیا۔

لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ: نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا سے مراد معین اور معلوم مقدار ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ہزار میں سے نوسو ننانوے جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں۔

وَلَاُضِلَّنَّهُمْ: میں انہیں حق سے دور کر دوں گا۔ اور ان کے لیے ترک توبہ کو مزین کروں گا۔ اور ان میں مختلف قسم کی آرزوئیں اور خواہشیں پیدا کروں گا۔ اور انہیں ٹال مٹول کرنے کا حکم دوں گا۔ اور اس طرح میں ان کو گمراہ کر دوں گا۔

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ: حضرت قتادہ اور سدی فرماتے ہیں اس سے مراد کانوں کو چیر کر علامت بنانا ہے، بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ نامی جانوروں کے اوپر خاص علامت لگانا۔

فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جانوروں کو خصی کرنا ہے۔ حدیث پاک میں اس کی ممانعت بھی وارد ہوئی ہے۔ (شاید اس صورت میں حکم ہے کہ جانور کی نسل ختم ہونے کا خدشہ ہو)۔ حضرت حسن بصریؒ صحیح مسلم میں چہرے پر اس قسم کے نشان بنانے کی ممانعت آئی ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو ایسا کرے اس پر اللہ کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو چہرے پر اس قسم کے نشان بنواتی ہیں اور بناتی ہیں۔ چہرے کے بال نوچتی ہیں اور دوسروں سے نچواتی ہیں اور خوبصورتی کے لیے دانتوں کو رگڑتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بناوٹ کو تبدیل کرتی ہیں(3)۔ پھر آپ نے فرمایا کیا میں ان پر لعنت نہ کروں جن پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت

1۔ مسند احمد 135/5 2۔ تفسیر الطبری 279/5 3۔ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ 1678

فرمائی۔ اور یہ حکم قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ اس سے آپ کی مراد یہ آیت کریمہ: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:7) ''ترجمہ: اور رسول (کریم ﷺ) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو۔ اور جس سے تمہیں روکیں۔ اس سے رک جاؤ''۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد اللہ کے دین کو بدلنا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا...... (الروم:30) ''ترجمہ: نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رخ سیدھا کرلیں اس دین کی طرف پوری یکسوئی سے۔ (مضبوطی سے پکڑ لو) اللہ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے۔'' اور یہ معنی مراد لینا اس وقت صحیح ہوگا جب اس سے امر مراد لیا جائے گا اور پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کی فطرت (دین) کو تبدیل نہ کرو اور لوگوں کو ان کی فطرت پر چھوڑ دو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہ اس کے ماں باپ ہوتے ہیں جو اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح اس جانور کا بچہ صحیح سلامت پیدا ہوتا ہے پھر لوگ اس کا کان کاٹ دیتے ہیں(1)۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا ہے۔ شیطان انہیں اپنے دین سے برگشتہ کردیتے ہیں۔ اور ان پر وہ چیزیں حرام کردیتے ہیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی ہیں۔

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو ساتھی بنالیتا ہے وہ دنیا و آخرت میں ایسا خسارا اور نقصان اٹھاتا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں پھر ارشاد فرمایا کہ شیطان ان سے جھوٹے وعدے کرتا ہے اور غلط امیدیں دلاتا ہے اور دھوکہ اور فریب کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اصل حقیقت کی خبر دی جارہی ہے کہ شیطان اپنے پیروکاروں کو سبز باغ دکھاتے ہوئے کہتا ہے کہ تم دنیا و آخرت میں کامیاب ہو حالانکہ یہ سب جھوٹا اور اختراع ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کا وعدہ دھوکے اور فریب پر مبنی ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت کریمہ میں ہے کہ شیطان قیامت کے دن اپنے پیروکاروں کو کہے گا۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ..... (ابراہیم:22): ''ترجمہ: اور شیطان کہے گا جب (سب کی قسمت) کا فیصلہ ہوچکے گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ سچا تھا۔ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا۔ پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی۔ اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تمہیں (کفر) کی دعوت دی اور تم نے فوراً قبول کرلی۔ تو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں آج تمہاری فریاد رسی کرسکتا ہوں۔ اور نہ تم میری فریادرسی کرسکتے ہو اور میں انکار کرتا ہوں اس امر سے کہ تم نے مجھے شریک بنایا اس سے پہلے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: شیطان کے وعدوں کا اعتبار کرنے والوں ٹھکانہ جہنم ہی ہوگا اور اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کچھ متقی اور سعادت مند لوگوں اور ان کے لیے تیار کردہ نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: وہ لوگ جنہوں نے دل کی گہرائی سے اللہ کے احکام کی تصدیق کی اور اپنے ظاہری اعضاء سے اس کے احکام کی تعمیل کی اور ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جس کے چھوڑنے کا اس نے حکم دیا۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ ہم انہیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے ندیاں رواں ہوں گی۔ یعنی وہ ان ندیوں کو جہاں چاہیں گے لے جائیں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ ہے۔ جو لامحالہ پورا ہوگا۔ اسی لیے اس وعدہ کو مصدر ''حَقًّا'' کے ساتھ موکد کیا گیا۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون وعدہ کو سچا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کے سوا کوئی

1۔ فتح الباری، 493/11

پروردگار ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ سب سے سچی کلام اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے۔ اور سب سے برا کام دین میں نئی بات کو گھڑنا ہے۔ اور ایسی نئی بات بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

''(نجات کا انحصار) نہ تمہاری جھوٹی امیدوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی جھوٹی امیدوں پر (بلکہ) جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی اس کی۔ اور نہ پائے گا اپنے لئے اللہ کے بغیر کوئی دوست اور نہ مددگار اور جس نے عمل کئے اچھے مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو سو وہی لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور نہ ظلم کئے جائیں گے تل بھر اور کون بہتر ہے دینی لحاظ سے اس شخص سے جس نے جھکا دیا ہو اپنا چہرہ اللہ کے لئے اور وہ احسان کرنے والا ہو اور پیروی کی ملت ابراہیم کی اس حال میں کہ وہ ہر باطل سے منہ موڑے ہوئے ہو، اور بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل۔ اور اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے میں لینے والا ہے''۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ: حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان اہل کتاب آپس میں فخر کرنے لگے۔ اہل کتاب کہنے لگے کہ ہمارا نبی تمہارے نبی سے پہلے مبعوث ہوا اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے نازل ہوئی۔ اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سے زیادہ قریب ہیں۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہمیں تم سے زیادہ قرب الٰہی حاصل ہے۔ کیونکہ ہمارے نبی ﷺ خاتم النبیین ہیں اور ہماری کتاب قرآن تمام کتب سابقہ کی ناسخ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حجت و دلیل کو تمام اہل ادیان پر غالب کر دیا ہے(1)۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اہل عرب کہا کرتے تھے کہ ہم مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوں گے اور نہ ہی ہمیں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ یہود و نصاریٰ کہا کرتے تھے کہ جنت میں وہی داخل ہوں گے۔ اور اگر ہمیں جہنم میں جانا بھی پڑا تو یہ چند روز کے لیے ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں واضح کر دیا کہ دین صرف آرزوئیں اور اس طرح کے بلند بانگ دعوے کرنے کا نام نہیں بلکہ دین تو ایمان کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو دلوں میں راسخ ہو جائے اور ظاہری اعمال اس کی تصدیق کریں۔ جو شخص کسی چیز کا دعویٰ کرتا ہے صرف دعویٰ کرنے سے اسے وہ چیز حاصل نہیں ہو جاتی اور نہ ہی کسی شخص کے یہ کہنے پر کہ وہ حق پر ہے اس کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں واضح کر دیا کہ صرف آرزو اور خواہش کرنے سے ہی عذاب سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہاں تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسل کی اتباع پر دارومدار ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر الطبری 288/5

نے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جو کوئی برا عمل کرے گا اس کو اس کی سزا ملے گی۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر یہ آیت بڑی گراں گزری۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ جب آخرت میں ہر برے عمل کی سزا دی جائے گی تو پھر فلاح اور نجات کیسے ممکن ہوگی۔ آپ نے فرمایا اے ابوبکر! اللہ تجھے معاف کرے۔ کیا تم پر غم و حزن اور مصائب نہیں آتے۔ انہوں نے عرض کی کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا بس یہی مومن کی جزاء ہے (1)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے خادم کو فرمایا کہ جس جگہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو سولی پر لٹکایا گیا ہے اس جگہ سے نہ جانا۔ خادم بھول گیا اور آپ کو اسی راستے سے لے گیا۔ جب آپ کی نظر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پر پڑی تو آپ نے تین دفعہ فرمایا اللہ تمہیں معاف فرمائے قسم بخدا مجھے معلوم ہے کہ آپ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور صلہ رحمی کرنے والے تھے اور مجھے اللہ کی بارگاہ سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ادنیٰ لغزشوں کا ازالہ دنیا میں ہی کر دیا ہے اور اس کے بعد تمہیں عذاب نہیں دے گا۔ اور پھر فرمایا کہ میں نے ابوبکر صدیقؓ سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن و نیا میں جو برا عمل کرتا ہے اس کی اسے دنیا میں ہی سزا مل جاتی ہے (2)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے حضرت ابن زبیر کو سولی پر لٹکے ہوئے دیکھا تو فرمایا اے تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ میں نے یہ حدیث تمہارے والد سے سنی ہے (3)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر! کیا میں تمہیں وہ آیت نہ سناؤں جو ابھی نازل ہوئی۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیوں نہیں، ضرور سنایئے۔ جب آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی تو مجھے یوں لگا جیسے میری کمر ہی ٹوٹ گئی ہو۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے پوچھا اے ابوبکر! تمہیں کیا ہو گیا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔ ہم میں سے کون ہے جس سے خطا اور غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں ہماری خطا کے اوپر سزا دی جائے گی تو ہم میں سے کون بچے گا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابوبکر! تمہیں اور تمہارے مومن ساتھیوں کو دنیا میں ہی بدلہ دے دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ سے تمہاری ملاقات ہوگی تم گناہوں سے پاک صاف ہو گے۔ اور دوسرے لوگوں کے گناہوں کو جمع کر دیا جائے گا اور قیامت کے دن انہیں ان پر سزا دی جائے گی۔ اس حدیث کو ترمذی نے یحییٰ بن موسیٰ سے روایت کیا ہے اور اس کے ایک راوی کو ضعیف اور دوسرے کو مجہول قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن جریر، ابن مردویہ نے دوسری اسناد سے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اس آیت کریمہ کی تلاوت کی اور کہا کہ اگر ہم سے ہر عمل کی باز پرس کی گئی تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا مومن کو دنیا میں جو مصائب و آرام میں مبتلا کیا جاتا ہے وہی اس کا بدلہ اور جزاء ہے (4)۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ! مجھے معلوم ہے کہ قرآن میں سب سے سخت آیت کون سی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ کون سی آیت ہے۔ میں نے یہی آیت کریمہ تلاوت کی تو آپ نے فرمایا کہ بندہ مومن کو جو بھی تکلیف اس دنیا میں پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے (5)۔ حضرت علی بن زید کی صاحبزادی روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا ہے مجھ سے اس کے بارے میں تمہارے علاوہ کسی نے نہیں پوچھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ مومن بخار، مصیبت، کانٹا چبھنے کی تکلیف حتیٰ کہ اگر وہ اپنی نقدی آستین میں رکھ کر بھول جائے اور پھر تلاش

1۔ مسند احمد: 11/1　　2۔ مسند احمد: 6/1　　3۔ کشف الاستار، تفسیر سورۃ النساء، 46/3
4۔ تفسیر الطبری 294/5　　5۔ تفسیر الطبری 295/5

کرنے پر اپنی جیب میں ڈال لے تو اس میں اس کو جو پریشانی اور تکلیف ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ مومن کو ہر چیز کا اجر ملتا ہے حتیٰ کہ موت کے وقت روح قبض کرنے کے وقت اس کو جو تکلیف ہوتی ہے اسے اس کا بھی اجر ملتا ہے۔ ایک اور روایت میں ارشاد فرماتی ہیں کہ جب بندے کے گناہ بہت زیادہ ہو جاتے ہیں اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جو اس کے گناہوں کا کفارہ بن سکے تو اللہ تعالیٰ اسے غم وحزن میں مبتلا کر دیتا ہے تا کہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ تو صحابہ کی طبیعت پر یہ حکم گراں محسوس ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صراط مستقیم پر قائم رہو، میانہ روی اختیار کرو۔ مسلمان کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کو کانٹا چبھے تو وہ اس کے گناہ کا کفارہ بن جاتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو ہم بہت غمگین ہوئے اور رونے لگے اور عرض کی یا رسول اللہ! اس آیت نے تو ہمارے لیے کچھ چھوڑا نہیں۔ آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن تم خوش ہو جاؤ، اعتدال کی راہ اختیار کرو اور صراط مستقیم پر قائم رہو۔ دنیا میں جو بھی مصیبت تم پر نازل ہوگی وہ تمہارے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ خواہ تمہیں کانٹا بھی چبھے (2)۔ زینب بنت کعب بن عجرہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کرتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! ہمیں جو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں ہمیں ان کے بدلے میں کیا ملتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ وہ گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ یہ سن کر میرے والد نے دعا کی کہ مرتے دم تک بخار ان سے جدا نہ ہو لیکن یہ بخار انہیں حج، عمرہ، جہاد فی سبیل اللہ اور فرض نماز سے نہ روکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ جو انسان بھی آپ کے جسم کو چھوتا اسے بخار کی تپش محسوس ہوتی حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا (3)۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی یا رسول اللہ! اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص بھی کوئی عمل کرے گا اسے اس کی سزا ملے گی۔ آپ نے فرمایا ہاں کہ جو شخص بھی کوئی برا عمل کرے گا اسے اس کی سزا ملے گی۔ آپ نے فرمایا یہ بات ٹھیک ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جو ایک نیکی کرے گا اسے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ سو افسوس ہے اس شخص پر جس کی برائیاں اس کی نیکیوں پر غالب آ جائیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کافر ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت کریمہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَهَلْ نُجْزِيٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (سبا: 17) (4)۔ ''ترجمہ: اور بجز احسان فراموش کے ہم کسے ایسی سزا دیتے ہیں۔'' حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ یہاں سوء سے مراد شرک ہے۔

وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اگر وہ شخص توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ صحیح قول یہی ہے کہ یہاں لفظ سوء سے ہر قسم کی برائی مراد لی جا سکتی ہے جس کا بیان پہلے احادیث میں گزر چکا ہے۔ اس قول کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى: پہلے اللہ تعالیٰ نے برائیوں کی سزا کا ذکر کیا اور یہ بیان کیا ہے کہ جو بندہ اس کا ارتکاب کرے گا اس کو اس کی سزا ضرور ملے گی خواہ دنیا میں ملے جو کہ بندے کے لیے بہت اچھی ہے۔ خواہ آخرت میں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا وآخرت میں عافیت عطا فرمائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل واحسان اور لطف وکرم کا بیان شروع کیا ہے۔ اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے نیک اعمال کو اپنی مہربانی اور فضل سے قبول کر لیتا ہے۔ خواہ عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت مگر اس کا صاحب ایمان ہونا شرط

1۔ مسند احمد 248/2 2۔ فتح الباری، کتاب المرضیٰ 103/10 3۔ مسند احمد 23/3 5۔ تفسیر الطبری 292/5

ہے۔ یہاں یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ اور ان کی نیکیوں میں کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا۔ "نقیر" اس چھوٹے سے نشان کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے۔ اور "فتیل" اس باریک سے دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ "قطمیر" اس انتہائی نازک غلاف کو کہتے ہیں جو گٹھلی کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ تینوں کلمات قرآن میں استعمال کیے گئے ہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا: یعنی اس سے بہتر دین والا شخص کون ہوسکتا ہے جو اپنے تمام عمل اللہ کی رضا اور نیکی کی نیت کے ساتھ کرتا ہے اور اس دین حق کی اتباع کرتا ہے جس کو اللہ کے رسول لے کر آئے۔ ان دو شرطوں کے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ یعنی وہ عمل خالص اور صحیح ہو۔ خالص عمل وہی ہوگا جو اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔ اور صحیح عمل وہ ہوگا جو شریعت کے مطابق ہوگا۔ یعنی اس کا ظاہر اتباع شریعت کے ساتھ مزین ہو اور اس کا باطن اخلاص کے ساتھ منور ہو۔ جب ان شرطوں میں کوئی مفقود ہو جائے تو وہ عمل قبولیت کے لائق نہیں رہے گا۔ اگر عمل میں اخلاص نہ ہو تو ایسا عمل منافقت و ریاکاری بن جاتا ہے اور اگر اتباع شریعت مفقود ہو جائے تو وہ گ[illegible] بہالت بن جاتا ہے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں یعنی اخلاص اور اتباع شریعت کا جامع ہوگا تو یہی وہ عمل ہے جس کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ اس لیے ارشاد فرمایا: وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ ملت ابراہیمی کی پیروی کرنے سے رسول اللہ ﷺ روز قیامت تک تم اور آپ کے نقش قدم کی پیروی کرنے والوں کی اتباع ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ..... (آل عمران:68) "ترجمہ: بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم علیہ السلام سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی۔ نیز یہ نبی (کریم ﷺ) اور جو اس پر ایمان لائے، اللہ مددگار مومنوں کا"۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (النحل:123) "ترجمہ: اور پھر ہم نے وحی نزل فرمائی (اے حبیب) آپ کی طرف کہ پیروی کرو ملت ابراہیم کی جو یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھا"۔ حنیف اس کو کہتے ہیں جو قصداً شرک سے بیزار ہو اور کلیۃً حق کی اطاعت میں مشغول ہو۔ حتیٰ کہ کوئی روکنے والا اس کو روک نہ سکے۔

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع میں ترغیب کے لیے یہ آپ کا وصف بیان کیا گیا ہے کیونکہ وہ امام مقتدیٰ ہیں۔ اور آپ خلت کے اس بلند مرتبہ پر فائز ہیں جو مقامات محبت میں سب سے بلند ہے اور آپ کو یہ مقام اللہ تعالیٰ کی کثرت سے اطاعت کرنے کی بدولت حاصل ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى "ترجمہ: اور ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں جو پوری طرح احکام بجالائے"۔ علمائے سلف صالحین فرماتے ہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو بھی حکم دی سر تسلیم خم کرتے ہوئے اسے سر انجام دیا۔ [illegible] ت عبادت میں سے ہر مقام میں کوئی چھوٹی یا بڑ[illegible] نیز آپ کو عبادت سے مشغول نہ کر سکی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ان دو آیات [illegible] کیا ہے۔ وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ..... "ترجمہ: اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو پورے طور بجالایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔ عرض کی میری اولاد سے بھی۔ فرمایا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک"۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا..... "ترجمہ: بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے۔ یکسوئی سے حق کی طرف مائل [illegible]۔ اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے"۔ حضرت معاذ بن جبلؓ جب یمن تشریف لے گئے اور صبح کی نماز میں آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی تو [illegible] ایک شخص نے کہا کہ حضرت ابراہیم کی والدہ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں (1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو خلیل اللہ کا لقب ملنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک علاقے میں قحط پڑ گیا آپ اپنے کسی دوست کے پاس موصل اور بعض نے لکھا ہے

1۔ [illegible]

کہ مصر گئے تا کہ وہاں سے کچھ اناج لائیں۔لیکن آپ کو وہاں سے اناج مہیا نہ ہو سکا اور جب واپس اپنے شہر کے قریب پہنچے اور ایک ریت کے ٹیلے کے قریب سے گزرے تو آپ نے دل میں سوچا کیوں نہ بوریاں اس ریت سے بھرلوں تا کہ اہل خانہ میرے خالی ہاتھ لوٹنے پریشان نہ ہوں۔ یہ سوچ کر آپ نے ریت سے بوریاں بھرلیں۔قدرت خداوندی سے وہ ریت آٹا بن گئی۔آپ گھر جا کر آرام فرما ہو گئے۔گھر والوں نے ان بوریوں کو کھولا آٹا نکال کر اسے گوندھا اور روٹیاں پکائیں۔آپ بیدار ہوئے۔روٹیاں دیکھ کر اہل خانہ سے پوچھا کہ یہ آٹا کہاں سے آیا ہے۔انہوں نے کہا کہ یہ وہی آٹا ہے جو آپ اپنے دوست کے ہاں سے لے کر آئے ہیں۔آپ نے فرمایا کہ ہاں میں یہ آٹا اپنے دوست جَلَّ جَلالہ سے لے کر آیا ہوں۔اس وجہ سے اللہ نے آپ کو خلیل اللہ کا لقب عطا فرما دیا(1)۔لیکن اس واقعہ کی صحت محل نظر ہے۔زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی روایات میں سے ہے جس کی تصدیق کی جاسکتی ہے نہ تکذیب۔اور صحیح بات یہ ہے کہ آپ کو خلیل اللہ کا لقب اس لیے دیا گیا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت تھی۔اور آپ ہر اس اطاعت کو بجالائے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب تھی۔حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبوں میں ارشاد فرمایا اے لوگو! اگر میں اہل زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر بن ابی قحافہ کو بناتا۔لیکن تمہارا صاحب (محمد رسول اللہ ﷺ) اللہ کا خلیل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنا خلیل بنایا ہے۔جس طرح ابرہیم کو بنایا(2)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ کچھ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے۔جب آپ اپنے کاشانہ انور سے باہر تشریف لائے تو آپ نے سنا کہ صحابہ کرام یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ تعجب ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اپنی مخلوق سے خلیل بنایا۔ایک دوسرے صحابی نے کہا اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے موسیٰ کو کلیم بنایا۔تیسرے نے کہا کہ حضرت عیسیٰ کو روح اور کلمہ بنایا۔چوتھے نے کہا کہ آدمؑ کو صفی بنایا۔یہ باتیں سن کر آپ قریب آئے اور انہیں سلام کیا اور فرمایا میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں اور تمہاری یہ بات ٹھیک ہے کہ آدم صفی اللہ، ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح وکلمۃ اللہ ہیں۔تمہاری یہ بات بالکل صحیح ہے۔ہاں سنو! میں حبیب اللہ ہوں اور یہ میں بطور فخر نہیں کہہ رہا۔قیامت کے دن میں ہی سب سے پہلے شفاعت کروں گا اور میری شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی اور میں یہ بات فخر سے نہیں کہہ رہا۔اور میں سب سے پہلے جنت کے دروازے پر دستک دوں گا۔اللہ تعالیٰ دروازہ کھولے گا اور اس میں مجھے اور میرے ساتھ مومن فقراء کو داخل کرے گا۔اور مجھے اس پر فخر نہیں۔اور قیامت کے دن اولین وآخرین میں سب سے زیادہ میں معزز ومحترم ہوں گا۔میں یہ فخر کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ حقیقت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔اس حدیث کے سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن صحاح ستہ وغیرہ میں ہمیں اس کے شواہد موجود ہیں(3)۔حضرت ابن عباس مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ خلت ابراہیم کے لیے، کلام موسیٰ کے لیے تھا اور دیدار محمد ﷺ ہے(4)۔اسی مضمون کی روایات حضرت انس بن مالکؓ اور کئی دوسرے صحابہ کرامؓ، تابعین کرام اور ائمہ سلف صالحینؒ سے مروی ہیں۔حضرت عبید بن عمیرؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے عادت مبارکہ تھی کہ وہ مہمان کے ساتھ کھانا تناول فرمایا کرتے تھے۔ایک دن وہ مہمان کی تلاش میں نکلے۔لیکن کوئی مہمان نہ مل سکا۔جب گھر پہنچے تو وہاں ایک آدمی کھڑا دیکھا آپ نے فرمایا اے اللہ کے بندے! تم میری اجازت کے بغیر اندر کیسے داخل ہو گئے۔اس نے کہا کہ میں اس گھر کے مالک حقیقی کے حکم سے داخل ہوا ہوں۔فرمایا تم کون ہو؟ عرض کی میں ملک موت ہوں۔مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کی طرف بھیجا ہے کہ میں

1۔تفسیر الطبری 297/5 2۔فتح الباری، کتاب الصلوۃ 558/1 3۔ترمذی، ابواب المناقب 103/12
4۔المستدرک، کتاب التفسیر 369/2

اسے خوشخبری سناؤں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا خلیل بنالیا۔ فرمایا وہ کون ہے۔ قسم بخدا اگر تم نے مجھے بتادیا اور وہ شخص زمین کے کسی دور دراز گوشہ میں بھی ہوا تو میں اس کے پاس ضرور پہنچوں گا۔ اور باقی زندگی اس کا پڑوسی بن کر گزاردوں گا فرشتے نے جواب دیا وہ اللہ کا بندہ آپ ہی ہیں جن کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ واقعی میں ہی وہ بندہ ہوں۔ فرشتے نے عرض کی ہاں آپ ہی ہیں۔ فرمایا کس بناء پر اللہ نے مجھے اپنا خلیل بنایا ہے۔ عرض کی آپ لوگوں کو عطا کرتے ہیں ان سے کوئی سوال نہیں کرتے۔ حضرت اسحاق بن یسار فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں خشیت القاء کردی جب سے آپ کے دل کی دھڑکن دور سے ہی سنائی دیتی تھی۔ جیسا کہ ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے کی پر پراہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہی مروی ہے کہ آپ کے سینہ مبارک میں ایسی آوازیں آتیں تھیں۔ جیسا کہ ابلتی ہوئی ہنڈیا سے آواز آتی ہے(1)۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ : یعنی زمین و آسمان کی ہر چیز اس کی ملکیت اور غلامی میں ہے اور اس کی مخلوق ہے۔ اور وہی تمام چیزوں میں بغیر کسی روک ٹوک کے تصرف کرنے والا ہے۔ اس کے حکم سے کسی مجال انکار نہیں اور وہ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی عظمت و قدرت، عدل و حکمت اور لطف و مہربانی سے کرتا ہے۔ اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا : اللہ تعالیٰ کا علم تمام مخلوق کو محیط ہے۔ اپنے بندوں کا کوئی راز اس سے مخفی نہیں اور زمین و آسمان کی وسعتوں میں ذرا بھر یا اس سے چھوٹی یا بڑی اس کے علم سے باہر نہیں۔ ذرہ ہماری نظر سے تو چھپ سکتا ہے لیکن اس کی نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

''اور فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے عورتوں کے بارے میں آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے تمہیں ان کے بارے میں اور وہ آیتیں جو پڑھی جاتی ہیں تم پر اس کتاب (قرآن) میں (ان میں احکام ہیں) ان یتیم بچوں کے متعلق جنہیں تم نہیں دیتے ہو جو (حق) مقرر کیا گیا ہے ان کے لیے اور خواہش کرتے ہو کہ خود نکاح کرلو ان کے ساتھ (ان کا مال دبوچنے کے لیے) اور (قرآن میں احکام ہیں) کمزور بچوں کے متعلق۔ اور (وہ یہ) کہ قائم رہو یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر اور جو کرو گے بھلائی (کے کاموں) سے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے''۔

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ : حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی پڑوس میں کوئی یتیم بچی ہو۔ وہی اس کا ولی وارث ہو۔ اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملالے اور پھر اس کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش کرے کہ اس کی شادی غیر کے ساتھ کردی تو وہ بھی اس کے مال میں شریک ہوجائے گا۔ اس طرح وہ اس کو شادی کرنے سے روکتا ہے تو ایسے شخص کے بارے میں یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد جب لوگوں نے ان یتیم بچیوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا۔ آپ فرماتی ہیں: وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ سے مراد پہلی آیت کریمہ: وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي

1۔ مسند احمد 25/4

الْیَتٰمٰی ..... (النساء:3) ''ترجمہ: اور اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو گے تم یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو) ان سے نکاح نہ کرو'' ہے۔

وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ: آپ فرماتی ہیں کہ اس مراد یہ ہے کہ جب اس یتیم بچی کے پاس مال کم ہوتا یا وہ کم خوبصورت ہوتی تو وہ اس کے ساتھ نکاح نہ کرتے۔ یہاں ان کو اس بات سے روک دیا گیا کہ اگر وہ کسی مال اور حسن و جمال والی یتیم بچی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں تو عدل و انصاف سے کریں۔ اس آیت کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ جس آدمی کی کفالت و پرورش میں کوئی یتیم بچی ہے اور وہ اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کا اس سے نکاح جائز ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے حکم فرمایا ہے کہ وہ اسے پورا پورا حق مہر ادا کرے۔ اگر یہ نہیں کر سکتا تو اسے چھوڑ کر کسی اور سے نکاح کر لے۔ یہ مفہوم اس سورت کی پہلی آیت کا ہے جو ابتدا میں گزر چکی ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کی بدصورتی یا کسی اور وجہ سے اس کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ اس ڈر سے کسی اور جگہ نکاح نہیں کرنے دیتا کہ اگر اس نے کسی اور سے شادی کر لی تو اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ مال میں شریک ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ دور جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ یتیم بچی کا والی اس پر اپنا کپڑا ڈال دیتا۔ اس طرح کرنے سے اب اس کے ساتھ کوئی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اگر وہ لڑکی خوبصورت ہوتی تو وہ خود اس کے ساتھ شادی کر لیتا اور اس کا مال کھاتا اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو اسے دوسروں سے نکاح کرنے سے روک دیتا۔ اور اس کے مرنے بعد اس کے مال کا وارث بن جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کر دیا اور مسلمانوں کو اس سے روک دیا۔

وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ: اس زمانہ میں لوگ چھوٹے بچے اور بچیوں کو ترکہ سے حصے نہیں دیا کرتے تھے۔ قرآن نے اس رسم کو ختم کر دیا اور ہر ایک کے لیے اس کا حصہ مقرر کر دیا اور فرمایا کہ لڑکا اور لڑکی خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے ان میں سے ہر ایک کو اس کا حصہ دو۔ لیکن لڑکی کو ایک حصہ اور لڑکے کو دو حصے۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ: حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح تم مال و دولت اور حسن و جمال والی عورت کے ساتھ نکاح کر کے اسے اپنے لیے خاص کر لیتے ہو اس طرح غریب اور بدصورت کے ساتھ نکاح کر کے اسے اپنے لیے خاص کر لو۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِیْمًا: یہ ارشاد نیکی کے کام پر برانگیختہ کرنے اور حکم الٰہی کی پیروی پر رغبت دلانے کے لیے نازل ہوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس لیے ہر عمل کی مکمل جزاء عطا فرمائے گا۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَیْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِیْمًا ﴿۱۳۰﴾

''اگر کوئی عورت خوف کرے اپنے خاوند سے (اس کی) زیادتی یا روگردانی کی وجہ سے تو نہیں کوئی حرج ان دونوں پر کہ صلح کر لیں آپس میں اور صلح ہی (دونوں کے لیے) بہتر ہے اور موجود رکھا گیا ہے نفسوں میں بخل اور اگر تم احسان کرو اور مرتکب بنو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا انصاف کرو اپنی

بیویوں کے درمیان اگر چہ تم اس کے بڑے خواہشمند بھی ہو تو یہ نہ کرو کہ جھک جاؤ (ایک بیوی کی طرف) بالکل اور چھوڑ دو دوسری کو جیسے وہ (درمیان میں) لٹک رہی ہو اور اگر درست کرلو (اپنا رویہ) اور پرہیزگار بن جاؤ تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔اور اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو غنی کر دے گا اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے اور اللہ تعالیٰ وسیع بخشش والا حکمت والا ہے''۔

وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ: اللہ تعالیٰ نے یہاں میاں بیوی کے احوال واحکام کا ذکر کیا ہے۔کبھی مرد اپنی بیوی سے ناراض ہوتا ہے اور کبھی راضی اور خوش۔اور بعض اوقات ایسے حالات بھی بن جاتے ہیں کہ وہ اسے جدا کر دیتا ہے۔پہلی حالت میں جبکہ عورت کو خاوند کے ناراض ہونے کا خوف ہو تو عورت اسے راضی کرنے کے لیے اپنے تمام حقوق یا بعض سے دستبردار ہو سکتی ہے۔مثلاً نان ونفقہ، اور خاوند کے پاس شب باشی کے حقوق کو معاف کر سکتی ہے۔اور مرد کے لیے انہیں قبول کرنا جائز ہے۔اور عورت کے لیے بھی اس میں کوئی حرج نہیں۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر وہ آپس میں صلح کرلیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں اور صلح فراق سے بہتر ہے۔حضرت ام المومنین سودہ بنت زمعہؓ کی عمر جب بہت زیادہ ہوگئی اور انہیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ انہیں جدا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔انہوں نے عرض کی کہ وہ اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دیتی ہیں آپ نے ان کی یہ بات قبول فرمالی اور انہیں اپنے حرم میں شامل رکھا۔تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1)۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میاں بیوی جس چیز پر بھی صلح کرلیں جائز ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے وقت نو ازواج مطہرات تھیں اور آپ نے ان میں آٹھ کے لیے باری مقرر کر رکھی تھی۔ کیونکہ ان میں حضرت سودہؓ نے اپنی باری حضرت سیدہ عائشہ کو عطا فرمادی تھی۔حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ شب باشی کے معاملہ میں ہمارے ساتھ برابری کا سلوک کرتے تھے۔کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔اور عموماً آپ اپنی ہر زوجہ کے گھر تشریف لے جاتے، گفتگو فرماتے، حتیٰ کہ سب سے آخر میں اس کے پاس تشریف لے جاتے جس کی باری ہوتی اور اس کے پاس رات گزارتے۔حضرت سودہ بنت زمعہؓ کی عمر جب زیادہ ہوگئی اور انہیں خوف محسوس ہوا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ مجھے چھوڑ نہ دیں۔انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری باری عائشہ کو دے دیجئے۔آپ نے ان کی یہ بات قبول فرمالی۔حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔حضرت قاسم بن ابوبزہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت سودہ بنت زمعہ کو طلاق کی خبر پہنچائی تو وہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں آگئیں اور جب آپ تشریف لائے تو عرض کی میں آپ کو اس ذات کا واسطہ دیتی ہوں جس نے اپنا کلام آپ پر نازل فرمایا اور آپ کو اپنی تمام مخلوق سے برگزیدہ بنایا۔آپ اس طلاق سے رجوع کر لیجئے۔میں اب بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔مجھے مرد کی کوئی خواہش نہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ قیامت کے دن مجھے آپ کی زوجہ کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔یہ بات سن کر آپ نے رجوع کرلیا۔اس کے بعد انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں اپنے دن رات کی باری آپ کی محبوب زوجہ سیدہ عائشہ کو دیتی ہوں۔بخاری میں ہے کہ یہ آیت کریمہ اس عورت کے بارے میں نازل ہوئی جو انتہائی بوڑھی ہو چکی ہو اس کا خاوند اس سے پیار نہ کرتا ہو اور اسے طلاق دینا چاہتا ہو تو وہ کہے کہ میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کرتی لیکن آپ مجھے طلاق نہ دیں۔حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جس کسی آدمی کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک بوڑھی یا بدصورت ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتا ہو اور اس وجہ سے اسے طلاق دینا چاہتا ہو تو وہ کہے کہ تم مجھے طلاق نہ دو۔میں تم سے کوئی مطالبہ نہیں کرتی۔حضرت ابن سیرین سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمر بن خطابؓ سے کسی آیت کے بارے میں سوال کیا۔آپ نے اس

1۔البیہقی، کتاب القسم والنشوز: 297/7 2۔المستدرک، کتاب النکاح: 186/2

کے انداز سوال کو ناپسند فرمایا اور اسے درہ مارا۔ ایک دوسرے آدمی نے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس قسم کے احکام کے متعلق سوال کرنا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی شخص کی بیوی بوڑھی ہو چکی ہو اور اس سے اولاد بھی نہ ہوئی اور وہ اولاد کی خاطر کسی نوجوان لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہو تو وہ دونوں جس چیز پر بھی اتفاق کر لیں جائز ہے۔ ایک شخص نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو بدصورتی، بڑھاپے، بداخلاقی، ٹھگنے پن کی وجہ سے ناپسند کرتا ہو اور اسے طلاق دینے کا ارادہ کرے اور وہ عورت اس سے جدا نہ ہونا چاہتی ہو اور وہ اپنا حق مہر چھوڑ دے تو اس پر صلح جائز ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی باری کسی دوسری بیوی کو دے دے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرات عبیدہ سلمانی، مجاہد بن جبیر، شعبی، سعید بن جبیر، حسن بصری اور کئی دوسرے آئمہ کرام سے مروی ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ حضرت سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ محمد بن مسلم کی بیٹی حضرت رافع بن خدیج کے نکاح میں تھیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ مجھے طلاق نہ دیں۔ آپ کا جو حکم ہو وہ مجھے منظور ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے بارے میں ذکر کیا ہے جو اپنی عورت کو کسی وجہ سے ناپسند کرتا ہے تو اس شخص کو چاہیے کہ وہ عورت کو اس بات سے آگاہ کر دے کہ وہ عورت کو طلاق دینا چاہتا ہے یا اس بات پر اتفاق کر لیں کہ وہ عورت اس کے پاس ہی رہے گی اور وہ اس کی باری اور نان ونفقہ میں دوسری بیوی کو اس پر ترجیح دے گا۔ تو ان کا اس بات پر اتفاق کر لینا صحیح ہے۔ اس کو سعید بن مسیب اور سلیمانؒ نے بیان فرمایا ہے کہ یہی وہ صلح ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت رافع بن خدیج انصاری صحابی رسول ہیں ان کی بیوی جب بوڑھی ہو گئی تو انہوں نے ایک نوجوان عورت سے شادی کر لی اور اس نئی بیوی کو ان پر ترجیح دی تو انہوں نے ان سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ اس پر انہوں نے انہیں ایک طلق دے دی اور جب عدت ختم ہونے کی قریب تھی کو رجوع کر لیا اور پھر نئی بیوی کو ان پر ترجیح دینے لگے یہ دیکھ کر انہوں نے پھر طلاق کا مطالبہ کیا تو آپ نے انہیں طلاق دے دی۔ اس کے بعد پھر جب وہی صورت حال پیش آئی تو انہوں نے پھر طلاق کا مطالبہ کیا تو انہوں نے فرمایا اب تمہاری صرف ایک طلاق باقی رہ گئی ہے اگر اسی حالت میں گزارہ کر سکتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں طلاق دے دیتا ہوں۔ ان کی بیوی نے جواب دیا میں اس حال پر راضی ہوں۔ اور طلاق نہیں لیتی۔ اس طرح انہوں نے طلاق نہ دی اور انہیں اپنے ساتھ رہنے دیا۔ سو اس طرح ان کا اس بات پر اتفاق ہو گیا اور حضرت رافع نے بھی اسے گناہ خیال نہ کیا کیونکہ ان کی بیوی اس حالت میں رہنے پر راضی ہو گئی تھی(1)۔ اس آیت کا مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ خاوند کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ دوسری بیوی کو خواہ طلاق دے دے۔ لیکن اس کو طلاق دینے سے بہتر ہے کہ اس کو اپنے پاس رکھے اور اپنی دوسری بیوی کو پہلی بیوی پر ترجیح دے۔ لیکن اس سے بھی بہتر مفہوم یہ ہے کہ اگر عورت اپنے بعض حقوق کو چھوڑنے اور خاوند کے ساتھ ہی رہنے پر متفق ہو جائے اور خاوند اس بات کو منظور کر لے تو یہ اس کو کلی طور پر چھوڑنے سے بہتر ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سودہ بن زمعہ کو پنے حرم میں ہی شامل رکھا۔ اور اس کے مقابلہ میں انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہ کو دے دی۔ آپ کے اس فعل میں امت کے لیے بہترین نمونہ ہے اور اس چیز کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے نامساعد حالات میں بھی عورت کو طلاق نہ دی جائے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی میاں بیوی کا اتفاق طلاق سے بہتر ہے۔ اور طلاق ناپسندیدہ ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک حلال کاموں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے(2)۔

1۔ سنن بیہقی، کتاب القسمۃ والنشوز: 296/7 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق: 255/2

وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا: اگر تم ناپسندیدگی کے باوجود صبر کرو اور اپنی عورتوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرو تو اللہ تعالیٰ اس کو بہتر جانتا ہے اور تمہیں اس کی جزاء عطا فرمائے گا۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا: اے لوگو! تمہارے بس کی بات نہیں کہ تم اپنی بیویوں کے درمیان عدل کر سکو۔ اگر تم ظاہری طور پر ہر ایک بیوی کے لیے علیحدہ علیحدہ باری مقرر کر بھی دو تو محبت، شہوت اور جماع میں برابری نہیں کر سکو گے۔ حضرت ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ کیونکہ آپ کو ان کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ حضرت عائشہ فرمایا کرتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی تمام ازواج کے درمیان مساوات کرتے اور پھر عرض کرتے اے باری تعالیٰ! یہ تقسیم تو میرے بس میں ہے وہ قلبی تعلق جس کا تو مالک ہے اور میرے بس میں نہیں اس پر ملالت نہ کرنا(1)۔

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ: یعنی جب تمہارا رجحان کسی ایک بیوی کی طرف ہو جائے تو اس کی طرف مکمل طور نہ جھک جاؤ تاکہ دوسری بیوی معلق نہ ہو جائے یعنی وہ اس طرح نہ خاوند والی رہے گی نہ مطلقہ۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی طرف جھک جائے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس طرح پیش ہوگا کہ اس کا ایک حصہ جھکا ہوا ہوگا۔

وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا: یعنی اگر تم اپنے امور کی اصلاح کرو اور اپنی بیویوں کے معاملہ میں عدل و انصاف سے کام لو۔ اور اپنے تمام احوال میں ڈرتے رہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری اس کوتاہی کو معاف کر دے گا جو کسی بیوی کی طرف زیادہ رجحان رکھنے کی وجہ سے ہوئی۔

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ: اور یہ تیسری حالت بیان کی جا رہی ہے۔ یعنی اگر وہ میاں بیوی آپس میں گزارہ کر سکیں اور ان میں جدائی واقع ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کو مستغنی کر دے گا۔ یعنی خاوند کو اس کے عوض بہتر بیوی عطا فرما دے گا اور اس بیوی کو اس کے بدلے میں بہتر خاوند عطا فرما دے گا۔

وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا: اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان بہت عظیم اور وسیع ہے اور اس کے تمام افعال، احکام اور شریعت حکمت پر مبنی ہیں۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

"اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بے شک ہم نے حکم دیا ان لوگوں کو جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور (حکم دیا) تمہیں بھی کہ ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور اگر کفر کرو تو بے شک اللہ تعالیٰ کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور ہر تعریف کا مستحق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جو کچھ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، 242/2

آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز۔ اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو! اور لے آئے دوسروں کو اور اللہ تعالیٰ اس بات پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص ارادہ کرتا ہو صرف ثواب دنیا کا (تو یہ اس کی اپنی کم نظری ہے) اللہ کے پاس تو دنیا و آخرت (دونوں) کا ثواب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر بات سننے والا ہر چیز دیکھنے والا ہے"۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہی زمین و آسمان کا مالک ہے، وہی حاکم حقیقی ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا کہ ہم نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی یہی نصیحت فرمائی تھی کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کریں۔ اور یہی وصیت تمہارے لیے ہے اور پھر ارشاد فرمایا کہ اگر تم کفر کرو گے زمین اور آسمان کی ہر چیز اللہ کی ملکیت میں ہے۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ اسی طرح ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرمایا تھا کہ اے قوم اگر تم کفر کرو اور تمام اہل زمین بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ غنی ہے اور ستائش کے قابل ہے۔ یعنی وہ اپنے بندوں سے مستغنی ہے اور اپنے ان تمام احکام میں جو وہ اپنے بندوں کو دیتا ہے قابل تعریف ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ کے لیے ہے اور وہی کارساز کافی ہے۔ یعنی وہ ہر نفس کے ہر فعل پر شاہد اور ہر چیز کا نگہبان ہے۔

وَ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ: یعنی اگر تم اس کی نافرمانی کرو گے تو وہ اس پر قادر ہے کہ تمہیں ہلاک کر کے تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو لے آئے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ "ترجمہ: اور اگر تم روگردانی کرو گے تو تمہارے عوض دوسری قوم لے آئے گا"۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ مخلوق خدا اس کے حکم کی نافرمانی کرے وہ اس کے نزدیک انتہائی ذلیل ہوتی ہے۔ اسی طرح ارشاد فرمایا اگر وہ چاہے تمہیں ہلاک کر دے اور نئی مخلوق لے آئے اور اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا: اے وہ شخص جس کا مقصد صرف حصول دنیا ہی ہے غور سے سنو! کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت کی نعمتیں ہیں اور اگر تو دنیا و آخرت کی نعمتوں کا سوال کرتا تو وہ تجھے عطا کر کے غنی کر دیتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا ..... (بقرہ:200) "ترجمہ: اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ۔ بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچا دے ہمیں آگ کے عذاب سے"۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ (الشوریٰ:20): یہی مفہوم اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں بھی ارشاد فرمایا ہے: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ...... "ترجمہ: جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم تاپے گا وہ اسے اس حال میں کہ وہ مذمت کیا ہوا اور ٹھکرایا ہوا ہو"۔ ابن جریر کا قول ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا سے مراد منافقین ہیں۔ جنہوں نے حصول دنیا کے لیے ایمان کو ظاہر کیا تو ان کو مسلمانوں کے ساتھ دنیا مل جائے گی۔ یعنی مال غنیمت میں حصہ ملے گا اور آخرت میں نار جہنم میں انہیں سزا ملے گی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ ابن جریر نے اس آیت کریمہ سے وہی مفہوم مراد لیا ہے جو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا...... "ترجمہ: جو طلبگار ہیں دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے تو ہم پورا بدلہ دیں گے انہیں ان کے اعمال کا اس دنیا میں اور انہیں اس دنیا میں اور انہیں اس دنیا میں نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا"۔ بلاشبہ اس آیت کریمہ کا معنی ظاہر ہے لیکن ان کا اس آیت سے پہلے پہلی آیت کی تفسیر بیان کرنا محل نظر ہے۔ چونکہ اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے اس

لیے کوتاہ ہمت کو نہیں چاہیے کہ وہ صرف حصول دنیا پر ہی اقتضا کر لے۔ بلکہ اسے تو بلند ہمت ہونا چاہیے تا کہ دنیا و آخرت کے بلند مقام اور مقاصد کو حاصل کرے۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس ذات کے قبضہ قدرت میں ہے جو ہر نفع نقصان کا مالک ہے۔ اس کے سواء کوئی معبود نہیں۔ وہی لوگوں کے درمیان سعادت وشقاوت کو تقسیم کرنے والا ہے۔ وا پنی اس تقسیم میں عادل ہے۔ کیونکہ وہ جس چیز کو جس کا اہل سمجھتا ہے۔ عطا فرما دیتا ہے اس لیے ارشاد فرمایا: وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

”اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر گواہی دینے والے محض اللہ کے لیے چاہے گواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف (جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے)وہ دولت مند ہو یا فقیر پس اللہ زیادہ خیر خواہ ہے دونوں کا تو نہ پیروی کرو خواہش نفس کی انصاف کرنے میں۔ اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑ و تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے“۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو حکم فرما رہا ہے۔ اے ایمان والو! عدل وانصاف پر مضبوطی سے قائم رہو۔ عدل کو چھوڑ کر دائیں بائیں نہ دیکھو احکام الٰہی کی ادائیگی میں کسی سے نہ ڈرو۔ کوئی لالچ، خواہش نفسانی تمہیں عدل سے دور نہ کر دے اور اس سلسلہ میں تم ایک دوسرے کے معاون مددگار بن جاؤ۔ اور اگر تمہیں گواہی دینا پڑ جائے تو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے دو۔ جب تمہاری گواہی اللہ کے لیے ہو گی تو یہ ہر قسم کے جھوٹ وفریب، تحریف سے خالی اور سچی گواہی ہو گی۔ اور اگر چہ گواہی تمہارے خلاف بھی ہو اور اس میں تمہارے نقصان کا اندیشہ بھی ہو تو سچ اور حق کا دامن نہ چھوڑو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مطیع اور فرمانبرداروں کے لیے ہر مشکل میں کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا ہے۔ اسی طرح والدین اور قریب کے رشتہ داروں میں گواہی دینا پڑے تو کسی قسم کی رعایت نہ کرنا اگر چہ انہیں اس وجہ سے نقصان ہی ہو۔ کیونکہ حق کا ہی بول بالا ہوتا ہے۔ گواہی کے معاملہ میں نہ تو کسی دولت مندی اور غناء کا خیال رکھنا اور نہ ہی کسی کے فقیر کی وجہ اس پر ترس کھانا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کا نگہبان اور والی ہے اور وہ تم سے بہتر جانتا ہے کہ ان کی بہتری کس چیز میں ہے اور اسی طرح خواہشات نفسانی، عصبیت اور کسی کے ساتھ ناراضگی عدل ترک کرنے پر نے ابھارے بلکہ تمہیں چاہیے کہ ہر حال میں عدل کو اپنا شعار بنا لو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ ”ترجمہ: اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو یہی زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ خوب خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو“۔

جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو اہل خیبر کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان کے پھلوں کی پیداوار کا اندازہ لگا کر بیت مال کا حصہ وصول کریں۔ ان یہودیوں نے ان کی رشوت دینا چاہی تا کہ وہ اس معاملہ میں نرمی سے کام لیں تو آپ نے انہیں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ میرے نزدیک تمام مخلوق سے زیادہ محبوب ہیں اور تم میرے نزدیک کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہو۔ لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ سے محبت کی وجہ سے تمہارے سے دشمنی کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہیں کروں گا۔ جب انہوں نے یہ بات سنی تو کہنے لگے۔ ایسی ہستیوں کے ساتھ زمین کا نظام قائم ہے۔ سورۂ مائدہ کی تفسیر میں یہ حدیث مکمل آئے گی۔

وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا: حضرت مجاہد اور کئی دوسرے مفسرین نے بیان فرمایا ہے کہ اَللَّيُّ کا معنی تحریف کرنا اور قصداً جھوٹ بولنا ہے۔ اس طرح معنی یہ بن جائے گا کہ اگر تم گواہی میں کوئی تحریف وتبدیلی کرو گے تو بے شک اللہ تعالیٰ اسے باخبر ہے اور تمہیں اس کی سزا دے گا۔ ''اعراض'' کا معنی شہادت کو چھپانا اور ترک کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو گواہی کو چھپائے گا وہ سخت گنہگار ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بہترین گواہ وہ ہے جو دریافت کرنے سے پہلے ہی سچی گواہی دے دے(1)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ‌ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓـئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿۱۳۶﴾

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل فرمائی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی اس سے پہلے اور جو کفر کرے اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت کے ساتھ تو وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا: یہاں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو حکم دے رہا ہے کہ وہ ایمان میں پورے پورے داخل ہو جائیں اور اس کے تمام احکام اور ارکان پر کاربند ہو جائیں۔ یہاں اہل ایمان کو جو اللہ تعالیٰ نے ''اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ ......'' کا حکم دیا ہے اس کو تحصیل حاصل نہیں کہہ سکتے بلکہ یا تکمیل کامل ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ ایمان پر مضبوطی سے قائم ہو جیسا کہ ہر مسلمان ہر نماز پر اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ کہتا ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں اس ہدایت پر ثابت قدم رکھ۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومنین کو اپنے اوپر اور اپنے رسول پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوۡا بِرَسُوۡلِهٖ ''ترجمہ: اے ایمان والو! تم ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ایمان لے آؤ اس کے رسول پر'' اس کے بعد ارشاد فرمایا اس کتاب پر یعنی قرآن حکیم پر ایمان لاؤ جو میں نے اپنے رسول پر نازل کیا اور ان تمام کتابوں پر بھی ایمان لاؤ جو اس سے پہلے میں نے نازل کیں۔ یہاں قرآن پاک کے بارے میں ''نَزَّلَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور دوسری کتاب سماویہ کے بارے میں انزل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ قرآن پاک تھوڑا تھوڑا کر کے ضرورت کے مطابق نازل ہوا اور اس کے برعکس پہلی کتب سماویہ یکبارگی نازل ہوئیں۔ پھر ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور اور قیامت کے دن کے قیام کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوگا اور ہدایت کے راستہ سے نکل کر گمراہی کی راہ میں بھٹک جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَـغۡفِرَ لَهُمۡ وَلَا لِيَـهۡدِيَهُمۡ سَبِيۡلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِيۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمَا ۙ ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيۡنَ يَتَّخِذُوۡنَ الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ‌ ؕ اَيَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ؕ ﴿۱۳۹﴾ وَقَدۡ نَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الۡكِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكۡفَرُ بِهَا وَيُسۡتَهۡزَاُ بِهَا

1۔ مسلم، کتاب الاقضیۃ: 1344

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ﴿۱۴۰﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر بڑھتے گئے کفر میں نہیں ہے سنت الٰہی کے متعلق بخش دے انہیں اور نہ (یہ) کہ پہنچائے انہیں راہ (راست) تک۔ خوشخبری سنا دو منافقوں کو کہ بلاشبہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ منافق جو بناتے ہیں کافروں کو (اپنا) دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت؟ تو (وہ سن لیں) عزت تو صرف اللہ کے لیے ہے سب کی سب۔ اور تحقیق اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ حکم) کتاب میں کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جارہا ہے ان کا اور مذاق اڑایا جارہا ہے ان کا تو مت بیٹھو ان (کفرو استہزاء کرنے والوں) کے ساتھ یہاں تک کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں ورنہ تم بھی انہیں کی طرح ہو گے بیشک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہاں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے بارے میں بیان کیا ہے جو ایمان لا کر پھر مرتد ہو جاتا ہے، پھر مسلمان ہو جاتا ہے اور پھر اس کے بعد راہ کفر اختیار کر کے اس پر جم جاتا ہے۔ اگر وہ اسی حالت میں مر گیا تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی راہ بھی نہیں دکھاتا۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نہ تو انہیں بخشے گا اور نہ ہی راہ ہدایت نصیب فرمائے گا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا کا معنی یہ ہے کہ وہ کفر و شرک پر ہی ڈٹے رہے یہاں تک کہ ان کو موت نے آلیا حضرت علیؓ یہ آیت کریمہ تلاوت کر کے ارشاد فرماتے کہ مرتد کو تین دفعہ توبہ کے لیے کہا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا کہ ان کا بھی یہی حال ہے پہلے ایمان لائے پھر کفر کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اس کے بعد بیان فرمایا کہ یہ منافقین مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ یعنی یہ حقیقی دوست انہی کے ہیں پوشیدہ طور پر ان سے محبت کا اظہار کرتے ہیں جب تنہائی میں انہیں ملتے ہیں تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ ہم نے جو ایمان ظاہر کیا ہے یہ صرف مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہے۔ اللہ ان کی اس روش کو ناپسند کرتے ہوئے فرماتا ہے کیا یہ منافقین ان کافروں کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ تمام عزتوں کا مالک تو اللہ ہی ہے جو وحدہ لاشریک ہے وہ جسے چاہے عزت بخش دے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (فاطر:10) ''ترجمہ: جو عزت کا طلب گار ہو (وہ جان لے) ہر قسم کی عزت اللہ کے لیے ہے''۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا: وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون:8) ''ترجمہ: حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لے اور ایمان والوں کے لیے ہے۔ مگر منافقوں کو (اس بات کا) علم ہی نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر تم حقیقی عزت چاہتے ہو تو یہ تمہیں اللہ کی بارگاہ سے ملے گی اس لیے اس کے مومن بندوں میں شامل ہو جاؤ تا کہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد اور نصرت فرمائے۔ اس موقع پر امام احمد کی یہ روایت بھی قابل ذکر ہے۔ حضرت ابو ریحانہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص فخر و غرور اور اپنی عزت ظاہر کرنے کے لیے اپنا نسب، اپنے کافر باپ دادوں سے ملائے اور اس طرح شمار کرتے کرتے نو جد تک پہنچ جائے تو وہ بھی ان کے ساتھ دسواں جہنمی ہے(1)۔

1۔ مسند احمد:134/4

قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ: یہاں ارشاد فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو سننے کے بعد بھی باز نہ آئے اور کافروں کی اس مجلس میں بیٹھے رہے یہاں اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا جا رہا تھا۔ اور ان کا تمسخر اڑایا جا رہا تھا۔ تو تمہارا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوگا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ دستر خوان پر نہ بیٹھے جہاں شراب کا دور چل رہا ہو۔ اس آیت کریمہ میں جس ممانعت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس سے مراد سورہ انعام کی یہ آیت کریمہ ہے جو مکہ میں نازل ہوئی: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حضرت مقاتل بن حیان فرماتے ہیں کہ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ کا حکم اس آیت کریمہ: وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ..... (انعام:69)'' ترجمہ: اور نہیں ہے ان پر جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔ ان کافروں سے حساب سے کچھ بوجھ۔ البتہ پرہیزگاروں پر نصیحت کرنا فرض ہے شاید وہ باز آجائیں''۔ سے منسوخ ہو گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ: یعنی جس طرح یہ منافقین کفر میں کافروں کے ساتھ شریک رہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو جہنم میں دائمی طور پر رہنے کے لیے ان کے ساتھ شریک کر دے گا۔ اور یہ وہاں عذاب و سزا بیڑیوں اور طوق، کھولتے ہوئے پانی اور پیپ پینے کے ساتھ شریک ہوں گے۔

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾

''وہ جو انتظار کر رہے ہیں تمہارے (انجام) کا تو اگر ہو جائے تمہیں فتح اللہ کی طرف سے (تو) کہتے ہیں کیا نہیں تھے ہم بھی تمہارے ساتھ اور اگر ہو کافروں کے لیے کچھ حصہ (کامیابی سے) کہتے ہیں کیا نہیں غالب آ گئے تھے ہم تم پر اور (اس کے باوجود) کیا نہیں بچایا تھا ہم نے تم کو مومنوں سے۔ پس (اے اہل نفاق!) اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور ہرگز نہیں بنائے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر (غالب آنے کا) راستہ''۔

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ: یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں بیان فرمایا ہے کہ یہ مسلمانوں کی شکست وزوال اور کفر کے غلبہ وتسلط کے انتظار میں رہتے ہیں اور اگر اللہ مسلمانوں کو فتح ونصرت مال غنیمت اور کامیابی عطا فرما دے۔ تو یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم بھی تو تمہارے ساتھ تھے اور اگر بعض اوقات صورت حال اس کے برعکس ہو جائے جیسا کہ غزوۂ احد میں ہوا تو یہ بغلیں بجانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے خفیہ طور پر تمہاری بہت مدد کی اور مسلمانوں کو نقصان میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا اور اسی وجہ سے تم مسلمانوں پر غالب آئے ہو۔ سدی فرماتے ہیں: نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ کا معنی یہ ہے کہ ہم تم پر غالب آنے والے تھے اور یہ ان کافروں سے اظہار محبت ہے کیونکہ وہ مسلمان، کافر دونوں سے چالبازی اور مکر وفریب سے کام لیتے تھے۔ تاکہ وہ کافروں کی نظر میں بلند مرتبہ رہیں اور مسلمانوں کی نگاہ سے بھی نہ گریں اور یہ ان کے ضعف ایمان اور قلت ایمان کی دلیل ہے۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ: اے منافقو! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہارا فیصلہ فرما دے گا۔ اس دنیاوی زندگی میں تم پر جو شریعت کے احکام جاری ہوتے ہیں اس سے دھوکہ نہ کھا جانا کیونکہ اس میں اللہ کی خاص حکمت ہے، قیامت کے دن تمہیں یہ ظاہری اعمال فائدہ نہیں دیں گے بلکہ اس دن تو دل اور سینے کے پوشیدہ رازوں کو بھی ظاہر کر دیا جائے گا۔

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا: ایک آدمی حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اس آیت کریمہ کا معنی پوچھا تو آپ نے فرمایا میرے قریب ہو جاؤ اور پھر اس آیت کریمہ کے ماقبل جملے کو ملا کر تلاوت فرمائی تو اس کا معنی واضح ہو گیا۔ یعنی قیامت کے دن کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔ اور یہی حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین سے مروی ہے۔ حضرت سدیؒ فرماتے ہیں کہ "سبیل" کا معنی محبت ہے اور اس آیت کریمہ کو اس کے ظاہری مفہوم پر محمول کرنا بھی صحیح ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر اس قسم کا غلبہ عطا نہیں فرمائے گا کہ وہ ان کا کلی طور پر استحصال کر سکیں۔ بعض اوقات ان کو مسلمانوں پر فتح حاصل ہو سکتی ہے لیکن دنیا و آخرت میں بہترین انجام مسلمانوں ہی کا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا...... "ترجمہ: بے شک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی اس دنیاوی زندگی میں، اور اس دن بھی جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔" جس طرح آیت کریمہ منافقین کے رد میں ہوگی جو کہ مسلمانوں کی قوت وسلطنت کے زوال کے انتظار میں رہتے تھے۔ اور خفیہ طور پر کافروں کے ساتھ تعلق قائم کرتے تھے۔ تاکہ جب وہ کافر مسلمانوں پر غالب آئیں تو یہ ان سے مفاد حاصل کر سکیں۔ جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ...... (المائدہ)" ترجمہ: تو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں مرض ہے کہ وہ دوڑ دوڑ کر یہود و نصاریٰ کی طرف، کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہیں ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے......"۔ بہت سے علمائے کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مسلمان غلام کو کافر کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں ایک مسلمان پر کافر کا غلبہ اور مسلمان کی تذلیل ہوتی ہے۔ اور بعض علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں وہ اس غلام کو اپنی ملک سے اسی وقت زائل کر دے

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

"بیشک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) اور جب کھڑے ہوتے ہیں نماز کی طرف تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر (وہ بھی عبادت کی نیت سے نہیں بلکہ) لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ذکر کرتے اللہ تعالیٰ کا مگر تھوڑی دیر ڈانوا ڈول ہو رہے ہیں کفر و ایمان کے درمیان نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے۔ اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے ہدایت کا راستہ"۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: سورہ بقرہ کی ابتداء میں بھی یہ آیت کریمہ: (يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) گزر چکی ہے۔ اور یہاں بیان فرمایا کہ یہ منافقین بزعم خویش اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے رہے ہیں حالانکہ اس ذات کو کون دھوکہ دے سکتا ہے جو سینے میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی جانتا ہے لیکن یہ لوگ اپنی جہالت اور کم عقلی کی وجہ سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ لوگوں کے سامنے ان کی یہ منافقت چھپی ہوئی ہے اور ان پر شریعت کے ظاہری احکام لاگو ہوتے ہیں۔ اسی طرح روز قیامت بھی اللہ کے سامنے حکم چل جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن قسم اٹھائیں گے کہ ہم تو صراط مستقیم پر گامزن تھے اور وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ جھوٹی قسمیں ان کو بڑا فائدہ دیں گی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ (مجادلہ:18) "ترجمہ: اس روز اللہ تعالیٰ سب کو اٹھائے گا تو قسمیں کھائیں گے اللہ کے سامنے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں"۔

وَهُوَ خَادِعُهُمْ : اللہ تعالیٰ ان کو ان کی منافقت کی اس طرح سزا دیتا ہے کہ ان کو سرکشی اور گمراہی میں ڈھیل دیتا جاتا ہے اس طرح وہ دنیا میں صراط مستقیم سے دور ہو جاتے ہیں اور قیامت کے دن بھی ان کا یہی حال ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ......وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ'' ترجمہ: اس روز کہیں گے منافق مرد اور عورتیں ایمان والوں سے ذرا ہمارا بھی خیال کرو، ہم بھی روشنی حاصل کرلیں تمہارے نور سے، انہیں کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور وہاں نور تلاش کرو......''۔ حدیث پاک میں ہے جو شخص لوگوں کے عیوب کو سنتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو ظاہر کر دیتا ہے اور جو ریا کاری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس کی ریا کاری کی سزا دیتا ہے (1)۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرشتوں کو ظاہری طور پر حکم دے گا کہ اس بندے کو جنت کی طرف لے جاؤ اور وہ اس جہنم کی طرف لے جائیں گے۔

وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى : نماز جو کہ افضل ترین اور بہترین عبادت ہے۔ اس کے بارے میں منافقین کا حال بیان کیا جا رہا ہے کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں نماز سے جی چراتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ نہ تو ان کی نیت نماز پڑھنے کی ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں اس پر یقین ہوتا ہے اور نہ یہ خشیت الٰہی کا شعور۔ اس لیے وہ نماز کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کسی بھی شخص کو سستی کی حالت میں نماز کے لیے نہیں کھڑا ہونا چاہیے۔ بلکہ بڑی خوشدلی اور ذوق وشوق سے نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہیے کیونکہ نمازی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی دعا، کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مغفرت بھی فرماتا ہے۔ پھر آپ یہ آیت کریمہ تلاوت فرماتے۔ اس آیت کریمہ میں منافقین کی نماز کے قوت ظاہری حالت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان کے خبث باطن کا بیان بھی کیا گیا ہے کہ وہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز میں نہ تو اخلاص ہوتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق اور رابطہ وہ صرف لوگوں کو دکھانے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے لیے نمازیں پڑھتے ہیں اس لیے وہ ایسی نمازوں میں شریک نہیں ہوتے جن میں لوگ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ اگر عشاء کی نماز کی تاخیر سے پڑھی یا فجر کی نماز کو اندھیرا میں پڑھا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منافقین پر سب سے بوجھل فجر اور عشاء کی نماز ہے۔ اگر انہیں ان نمازوں کی فضیلت معلوم ہو جائے تو وہ گھٹنوں کے بل چل کر ان نمازوں کے لیے آئیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا ارادہ کیا کہ میں نماز کے لیے حکم دوں اور جب تکبیر ہو جائے تو کسی شخص کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے مقرر کر دوں اور پھر میں کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر جاؤں جن کے ہاتھ میں لکڑیوں کا گٹھا ہو اور ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے (2)۔ ایک دوسری روایت میں یہ ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر ان میں سے کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ انہیں چوسنے والی (ہڈی) یا دو اچھے کھر ملیں گے تو وہ نماز میں ضرور حاضر ہوتا۔ اگر ان کے گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں ان کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دیتا (3)۔ حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کے سامنے تو اچھی طرح نماز پڑھتا ہے لیکن تنہائی میں اس طرح نہیں پڑھتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی اس نماز کے ساتھ اپنے رب کی اہانت کی ہے۔

وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا: یعنی وہ اپنی نماز میں نہ تو خشوع وخضوع کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں بلکہ انتہائی غفلت اور لاپرواہی سے نماز پڑھتے ہیں۔ اور اللہ کی رحمت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے۔ آپ نے یہ تین بار کہا کہ وہ سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرتا

1۔ فتح الباری، کتاب الرقاق: 335/11 2۔ فتح الباری، کتاب الاذان: 141/2 3۔ مسند احمد: 479/2

رہتا ہے اور جب سورج شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو یہ جلدی جلدی چار رکعت پڑھ لیتا ہے اور اس میں خدا کا ذکر برائے نام ہی کرتا ہے۔(1)

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ: یعنی جو منافقین ایمان وکفر کے درمیان متحیر و متردد ہیں نہ تو ظاہری اور باطنی پر مسلمانوں کے ساتھ ہیں اور نہ کافروں کے ساتھ بلکہ ظاہری طور مسلمانوں کے ساتھ اور باطنی طور پر کافروں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔اور بعض شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔کبھی ان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کی طرف جھک جاتے ہیں۔حضرت مجاہد نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ یہ منافقین نہ تو صحابہ کرام کے ساتھ ہیں اور نہ یہ یہودیوں کے ساتھ۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منافق کا حال اس بکری کی طرح ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان ہوتی ہے کبھی اس طرف چلی جاتی ہے کبھی اس طرف۔اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس ریوڑ کے ساتھ چلے۔حضرت ابن ابی عبیدہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک دن مکہ مکرمہ میں عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے فرمایا کہ قیامت کے دن منافق کا حال اس بکری کی طرح ہوگا جو دو ریوڑوں کے درمیان ہو کبھی اس طرف آئے اور ان کو سینگ مار جائے اور کبھی ان کو(2)۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے انہیں بتایا کہ حدیث کے الفاظ اس طرح نہیں ہیں۔لوگوں نے میرے والد صاحب کے بارے میں بتایا کہ یہ بھی ثقہ ہیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔لیکن اللہ جانتا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ نے یہی الفاظ سنے ہیں۔حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ مومن، منافق اور کافر کی مثال ان تین آدمیوں کی سی ہے جو کسی دریا کے کنارے پر پہنچے تو ان میں سے ایک دریا میں داخل ہوا اور اسے عبور کر گیا۔ پھر دوسرا داخل ہوا اور جب درمیان میں پہنچا تو باہر کھڑے نے آواز دی کہ کیوں ہلاک ہونا چاہتے ہو واپس آ جاؤ اور جو عبور کر چکا تھا اس نے کہا جان بچانا چاہتے ہو تو ادھر آ جاؤ یہ سن کر وہ کبھی اُدھر دیکھے اور کبھی ادھر۔حتیٰ کہ سیلاب کا ایک ریلا آیا اور اس کو بہا کر لے گیا۔جو دریا کو عبور کر گیا وہ مومن تھا، جو دریا میں غرق ہوا وہ منافق اور جو کنارے پر کھڑا رہا وہ کافر(3)۔حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ منافق نہ تو مخلص مسلمان ہیں اور نہ ہی صراحتہً مشرک۔اور پھر اس کے بعد آپ نے وہی حدیث الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ بیان کی جو گزر چکی ہے۔ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ منافق کی مثال اس بکری سی ہے جو سرسبز ٹیلے پر چڑھتے ہوئے دو ریوڑوں کو دیکھتی ہے اور ان میں ایک کے پاس آ کر سونگھتی ہے لیکن اسے پہچان نہیں سکتی اور پھر اسی طرح دوسرے ریوڑ کے پاس آتی ہے اور اسے سونگھتی ہے۔ لیکن اسے پہچان نہیں سکتی(4)۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا: یعنی جس کو اللہ تعالیٰ راہ راست سے ہٹا دے وہ اپنے لیے مرشد یا ولی کہاں سے پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو راہ نجات سے دور کر دیا ہے اس لیے ان کے لیے نہ کوئی ہادی ہے نہ کوئی رہبر اور نہ ہی ان کو اس حال سے نکالنے والا ہے۔اللہ کے حکم کے سامنے کسی کی تاب نہیں۔اور کوئی اس سے سوال نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی مخلوق سے ہی باز پرس کی جا سکتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ

1۔مسلم، کتاب المساجد:434 2۔مسند احمد:68/2 3۔الدر المنثور:720/2 4۔تفسیر الطبری:336/5

بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

''اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ بنا دو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے خلاف واضح دلیل۔ بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے اور ہرگز نہ پائے گا تو ان کا کوئی مددگار۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ کا (دامن رحمت) اور خالص کر لیا اپنا دین اللہ تعالیٰ کے لیے تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور عطا فرمائے گا اللہ تعالیٰ مومنوں کو اجر عظیم۔ کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر کرنے لگو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو ان سے دوستی لگانے، ان کی سنگت اختیار کرنے اور ان کے ساتھ میل جول رکھنے اور مومنین کو پوشیدہ راز ظاہر کرنے سے منع کر رہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ...... (آل عمران:28) ''ترجمہ: نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنین کو چھوڑ کر اور جس نے کیا یہ کام پس نہ رہا اس کا اللہ سے کوئی تعلق مگر اسی حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ''۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے خلاف واضح دلیل بنا لو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں ''سلطان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا معنی دلیل اور محبت ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ: یہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن منافقین کو دی جانے والی سزا کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آگ کے نیچے ہوں گے۔ دوسرے مفسرین نے فرمایا ہے کہ جس طرح جنت میں مختلف درجات ہیں اسی طرح دوزخ میں مختلف درکات ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہیں آگ کے صندوقوں میں بند کر کے پھینک دیا جائے گا(1)۔ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ایسے دروازوں والے کمرے ہیں جن سے منافقین کو داخل کر کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور ان کے اوپر نیچے آگ جلا دی جائے گی۔ حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اس سے مراد لوہے کے صندوق ہیں جن میں منافقین کو بند کر دیا جائے گا اور ان صندوقوں کو اس طرح بند کیا جائے گا کہ ان کو کھولنے کا کسی کو علم نہ ہوگا۔

وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا: یعنی ان منافقوں کا کوئی ایسا مددگار نہ ہوگا جو ان کو اس دردناک عذاب سے چھڑا کر باہر نکال سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ پھر ان منافقین میں اگر کوئی دنیا میں ہی توبہ کر لے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ بشرطیکہ سچے دل سے توبہ کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر سختی سے کاربند ہو جائے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا: یعنی جنہوں نے ریا کو اخلاص سے بدل دیا تو ان کا نیک عمل ان کو فائدہ دے گا اگر چہ وہ قلیل ہو۔ حضرت معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے دین کو خالص کر لو تو تھوڑا سا عمل بھی تمہارے لیے کافی ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ: یعنی جو لوگ سچے دل سے توبہ کریں گے وہ قیامت کے دن مومنوں کے گروہ میں داخل ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ مومنین کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ ہر ایک سے غنی و بے نیاز ہے اور وہ بندوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے سزا دیتا ہے۔

1۔ تفسیر الطبری:338/5

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ: یعنی تم نیک عمل کرتے رہو اور اللہ اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔

وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا: جو اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ عزت وعظمت سے نوازتا ہے۔ اور جو اپنے دل کے ساتھ ایمان لاتا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہے اور اسے اجر عظیم عطا کرے گا۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

''نہیں پسند کرتا اللہ تعالیٰ کہ برملا کہی جائے بری بات مگر (اس سے) جس پر ظلم ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ اگر تم ظاہر کرو کوئی نیکی یا پوشیدہ رکھو اسے یا درگزر کرو (کسی کی) برائی سے تو بیشک اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا قدرت والا ہے''۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ: حضرت ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے لیے بددعا کرے مگر مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ ظلم کرنے والے کے خلاف اس کے ظلم کا برملا اظہار کر سکتا ہے اور اس کو بددعا بھی دے سکتا ہے۔ لیکن وہ صبر کرے یہ صبر کرنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ حضرت عطاء روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی کوئی چیز چوری ہوگئی تو وہ چور کے لیے بددعا کرنے لگیں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! اپنی اس بددعا کے ساتھ اس سے چوری کے گناہ کو کم نہ کرو(1)۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ بددعا نہیں کرنی چاہیے بلکہ یہ کہنا چاہیے اے اللہ! تو چور کے خلاف میری مدد کر اور اس سے میرا حق واپس دلوا دے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ظالم کے لیے مظلوم کو بددعا کرنے کی رخصت تو ہے لیکن اسے حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ ابن مالک جزری اس آیت کی تفسیر کے تحت میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تمہیں برا بھلا کہتا ہے تو تم بھی اس شخص کا جواب دے سکتے ہو۔ لیکن اگر کوئی بہتان باندھتا ہے تو اس کا جواب نہیں دینا چاہیے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ (الشوریٰ:41) ''ترجمہ: اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد پس یہ لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں''۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو آدمی آپس میں جو بھی گالی گلوچ کریں اس کا گناہ ابتداء کرنے والے پر ہے(2)۔ ہاں اگر مظلوم حد سے تجاوز کر جائے تو یہ الگ بات ہے۔ حضرت مجاہد اس آیت کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی کے پاس مہمان بن کر جائے اور میزبان حق میزبانی سے عہدہ برانہ ہو اور جب وہ باہر نکلے تو کہے کہ فلاں نے مجھے اپنا مہمان بنایا حق میزبانی ادا نہ کیا۔ تو اس کا یہ عمل صحیح نہیں ہوگا ہاں اگر اس پر ظلم ہو تو اظہار ظلم کے لیے اپنی آواز بلند کر سکتا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! آپ ہمیں مختلف مقامات پر بھیجتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہماری مہمان نوزی نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ تمہاری مہمان نوازی کریں جس طرح کہ مہمان نوازی کرنے کا حق ہے تو ٹھیک ہے وگرنہ تم مناسب حق ان سے لے سکتے ہو(3)۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو مسلمان کسی کے پاس مہمان بن کر جائے اور وہ اس کی مہمان داری اور ضیافت نہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب: 278/4 2۔ ایضاً: 274/4 3۔ فتح الباری، کتاب المظالم: 107/5

کرے تو ہر مسلمان کے لیے اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنا حق ضیافت اس کے مال سے وصول کر لے(1)۔ حضرت امام احمدؒ ان احادیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ضیافت کرنا واجب ہے۔ اسی قسم کی ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرا ایک پڑوسی مجھے اذیت پہنچاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے گھر کا سامان باہر نکال کر رکھ دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب جو بھی اس کے پاس سے گزرتا تو اس سے پوچھتا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے تو وہ جواب دیتا کہ میرا پڑوسی مجھے اذیت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ایسے پڑوسی پر اللہ کی لعنت ہو اور اللہ اسے رسوا کرے۔ جب پڑوسی نے یہ بات سنی تو آ کر یہ کہنے لگا اپنا سامان گھر لے جاؤ میں تمہیں اب کبھی تکلیف نہیں دوں گا(2)۔

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا: اے لوگو! اگر تم نیکی کو ظاہر کرو یا اس کو پوشیدہ رکھو۔ یا کسی زیادتی کرنے والے کو معاف کرو تو تمہارا یہ عمل اللہ کے قرب کے باعث ہوگا۔ اور اس کا تمہیں بہت زیادہ اجر و ثواب عطا کرے گا۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ اپنے بندے کو سزا دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف فرما دیتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا: حاملین عرش اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں کہ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے تو علم کے باوجود حلم و بردباری سے کام لیتا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں اے اللہ! تیری ذات پاک ہے تو قدرت کے باوجود بھی معاف فرما دیتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔ صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا جو بندہ معاف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کرتا ہے۔ جو اللہ کے لیے تواضع کرتا ہے اللہ اسے سربلند کر دیتا ہے(3)۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓىِٕكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۵۲﴾

''بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں بعض رسولوں پر اور ہم کفر کرتے ہیں بعض کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ کفر و ایمان کے درمیان اختیار کر لیں کوئی (تیسری) راہ یہی لوگ کافر ہیں حقیقت میں اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا اور جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ اور اس کے (تمام) رسولوں کے ساتھ اور نہیں فرق کیا انہوں نے کسی میں ان سے یہی لوگ ہیں دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو زجر و توبیخ کی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے منکر ہیں۔ ان کے درمیان تفریق ڈالنے والے ہیں۔ یہ بعض انبیاء پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور اس کا سبب محض خواہش نفسانی کی اتباع اور اپنے آباؤ اجداد کے فرسودہ، بے بنیاد عقائد کی پیروی ہے۔ یہود حضرت عیسیٰ اور محمد علیہ السلام کے سوا دوسرے انبیاء پر ایمان

1۔ مسند احمد 133/4 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب 339/4 3۔ مسلم، کتاب ابر: 2001

رکھتے ہیں اور اسی طرح نصاریٰ خاتم النبیین کے علاوہ باقی انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ سامری حضرت یوشعؑ کے بعد کسی کی نبوت کے قائل نہیں۔ اور مجوس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ زرادشت کو اپنا نبی مانتے تھے لیکن جب وہ ان کی شریعت کے منکر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اٹھالیا۔ واللہ اعلم۔ مختصر یہ کہ جس نے ایک نبی کا انکار کیا گویا اس نے تمام کا انکار کیا۔ کیونکہ ہر اس نبی پر ایمان لانا واجب ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا اور جس نے کسی حسد، تعصب یا نفسانی خواہش کی وجہ کسی نبی کی نبوت کا انکار کیا تو شریعت کی نظر میں اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ (النساء:150) یعنی یہاں واضح کر دیا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے منکر ہیں۔ اور ایمان لانے میں ان کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ کہ ہم بعض رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر و ایمان کے درمیان کوئی تیسری راہ اختیار کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا حقیقت میں یہی لوگ کافر ہیں۔ یعنی ان کا کفر یقینی اور ثابت شدہ ہے کیونکہ جس نبی پر وہ ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ شریعت کی نگاہ میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ اگر وہ انہیں اللہ کا رسول مان کر ایمان لاتے تو اس رسول معظم پر بھی ایمان لے آتے جو سب سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ اگر وہ آپ کی نبوت میں صحیح غور و فکر کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ آپ کی نبوت و رسالت واضح، ظاہر اور قوی ہے۔

وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ جس طرح انہوں نے ہمارے نبیوں کی نبوت کا انکار کر کے ان کی اہانت کی ہے اس طرح ہم نے بھی ان کے لیے سخت عذاب تیار کیا ہے۔ اور ان کا یہ انکار صرف اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے ان کی تعلیمات میں غور و فکر ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس سے اعراض کر کے بلاضرورت دنیا کا حقیر مال جمع کرنے میں مشغول ہو گئے یا وہ نبوت کو جانتے تھے لیکن اس کے باوجود حسد اور تعصب کی بناء پر اس پر ایمان لائے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہودی علماء کرتے تھے۔ یہ صرف حسد کی بناء پر انہوں نے آپ کی مخالفت و تکذیب کی۔ حتیٰ کہ آپ کے ساتھ جنگ و جدال کرنے کے سے بھی باز نہ رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیا کی ذلت مسلط کر دی۔ اور آخرت میں بھی ان کا یہی انجام ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (بقرہ:61)۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اس سے امت محمدیہ مراد ہے۔ کیونکہ یہ امت اللہ کی نازل کردہ ہر کتاب پر ایمان رکھتی ہے اور اسی طرح تمام انبیاء پر بھی ان کا مل ایمان ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (بقرہ:285) پھر اللہ تعالیٰ نے اس اجر عظیم، ثواب عمیم اور عطائے کریم کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے مومن کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ ان مومنین کو ان کا اجر عطا فرمائے گا کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔

وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا: یعنی اگر کسی مومن سے گناہ سرزد ہو جائے تو اللہ اس کا گناہ معاف فرمانے اور رحم کرنے والا ہے۔

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَیْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِیْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا

مِّنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا ﴿۱۵۴﴾

''مطالبہ کرتے ہیں آپ سے اہل کتاب کہ آپ اتروا دیں ان پر کتاب آسمان سے سو وہ تو سوال کر چکے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑی بات کا انہوں نے کہا تھا (اے موسیٰ علیہ السلام) دکھاؤ ہمیں اللہ کھلم کھلا تو پکڑ لیا تھا انہیں بجلی کی کڑک نے بسبب ان کے ظلم کے پھر بنا لیا انہوں نے بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد کہ آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی دلیلیں پھر بھی ہم نے بخش دیا ان کا یہ (سنگین) جرم۔ اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) کو واضح غلبہ۔ اور ہم نے بلند کیا ان کے اوپر طور کو ان سے پختہ وعدہ لینے کے لیے اور ہم نے فرمایا انہیں کہ داخل ہو جاؤ اس دروازہ سے سجدہ کرتے ہوئے اور ہم نے فرمایا انہیں کہ حد سے نہ بڑھنا سبت میں اور ہم نے لیا تھا ان سے پختہ وعدہ''۔

يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ :حضرت محمد بن کعب قرظی، سدی اور ابن قتادہ فرماتے ہیں کہ یہود نے حضور ﷺ سے مطالبہ کیا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات لکھی ہوئی نازل ہوئی تھی۔ اسی طرح آپ بھی آسمان سے لکھی کتاب لائیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا ہوا خط اترے جس پر لکھا ہو کہ حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرو۔ اور ان کا یہ مطالبہ عناد، کفر، ہٹ دھرمی پر مبنی تھا۔ جس طرح کہ کفار مکہ بھی اس قسم کے سوال کیا کرتے تھے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاسراء میں فرمایا ہے: وَقَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ يَنۡۢبُوۡعًا (بنی اسرائیل:90) اسی لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤى اَكۡبَرَ مِنۡ ذٰلِكَ :یعنی انہوں نے حضرت موسیٰ سے یہ بھی سوال اپنی سرکشی، بغاوت اور عناد کی بناء کیا تھا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

ثُمَّ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ :یعنی مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے لشکر کو بحر احمر میں غرق کر دیا اور حضرت موسیٰ کی قوم صحیح سلامت گزر گئی۔ یہ لوگ سمندر عبور کر کے تھوڑے دور ہی گئے تھے کہ انہوں نے وہاں کچھ لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمیں بھی ایسا معبود بنا دیجیے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات کے لیے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو آپ کے بعد آپ کی قوم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اس واقعہ کی مکمل تفسیر سورۂ اعراف اور طٰہٰ میں بیان کی گئی ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائے تو اللہ نے اس سزا کے طور پر انہیں یہ حکم دیا کہ ان میں سے جنہوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی وہ پوجا کرنے والوں کو قتل کریں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو معاف کر دیا۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) کو واضح برتری اور غلبہ عطا فرما دیا۔

وَرَفَعۡنَا فَوۡقَهُمُ الطُّوۡرَ :یعنی جب انہوں نے تورات کے احکام پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر پہاڑ کو بلند کر دیا اور انہیں تورات کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا تو یہ سب سجدے میں گر گئے اور سجدہ کی حالت میں ہی کنکھیوں سے دیکھنے لگے کہ کہیں یہ پہاڑ ان کے اوپر نہ گر جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ..... (الاعراف:171) ''ترجمہ: اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ کے پہاڑ اس طرح کہ گویا وہ سائبان ہو اور خیال کرنے لگے

کہ وہ ضرور گر پڑے گا ان پر......"۔

وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا: یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ بیت المقدس کے دروازے سے سجدے کی حالت میں (حِطَّةٌ) کہتے ہوئے یعنی طلب مغفرت کی دعائیں طلب کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ لیکن انہوں نے اس حکم کی مخالفت کی اور وہ اپنے پیٹھ کے بل گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ اور حِطَّةٌ کی جگہ حِنْطَةٌ فِيْ شَعْرَةٍ کہنے لگے۔

قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ: یعنی ہم نے ہفتہ کا دن جو ان کی عبادت کا دن تھا اس کی حرمت کا لحاظ رکھنے کی نصیحت کی اور یہ حکم دیا اللہ تعالیٰ نے اس جو چیز حرام کی ہے اس سے بچو اور اس پر ہم نے ان سے سخت اور مضبوط وعدہ لے لیا لیکن انہوں نے حسب عبادت مخالف اور نافرمانی کی روش اختیار کی اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس فعل کا ارتکاب کرنے لگے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں اس کا تفصیلی بیان فرمایا ہے۔ اور اس کا ذکر صفوان بن عسال کی حدیث میں بھی سورہ اسراء کی تفسیر کے تحت آئے گا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۞ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۞ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۞ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۞

"(ان پر پھٹکار کی) وجہ یہ تھی کہ انہوں نے توڑ دیا اپنے وعدہ کو اور انہوں نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا اور انہوں نے قتل کیا انبیاء کو ناحق اور انہوں نے یہ (گستاخانہ) بات کہی کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں۔ (یوں نہیں) بلکہ مہر لگا دی اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑی سی تعداد۔ اور ان کے کفر کے باعث اور مریم (علیہا السلام) پر بہتان عظیم باندھنے کے باعث۔ اور ان کے اس قول سے کہ ہم نے قتل کر دیا ہے مسیح عیسیٰ علیہ السلام فرزند مریم کو جو اللہ کا رسول ہے۔ حالانکہ نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ اسے سولی چڑھا سکے بلکہ مشتبہ ہوگئی ان کے لیے (حقیقت) اور یقیناً جنہوں نے اختلاف کیا ان کے بارے میں وہ بھی شک وشبہ میں ہیں ان کے متعلق نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی اور نہیں قتل کیا انہوں نے اسے یقیناً۔ بلکہ اٹھا لیا ہے اسے اللہ نے اپنی طرف اور ہے اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا اور کوئی ایسا نہیں ہوگا اہل کتاب سے مگر وہ ضرور ایمان لائے گا مسیح پر ان کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن وہ ہوں گے ان پر گواہ"۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: یہاں اہل کتاب کے ان گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق ہوئے اور اللہ کی رحمت سے محروم اور راہ حق سے محروم ہو گئے۔ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے پختہ وعدوں کو توڑا، اس کی آیات یعنی دلائل و براہین

اور معجزات کا انکار کیا جو انبیاء کے ہاتھوں سے رونما ہوئے۔ ناحق انبیاء کو قتل کیا۔ اسی طرح وہ کہتے تھے کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور کئی دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ان کا یہ قول مشرکین کے اس قول کی مثل ہے: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ (حم السجدہ:5) ''ترجمہ: اور ان (ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ہمارے دل علم وعرفان کا مرکز ہیں۔ یعنی یہ علوم وفنون کے جامع اور ان سے لبریز ہیں۔ اس کی تفسیر سورۂ بقرہ اس آیت: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَھُمُ اللّٰہُ بِکُفْرِھِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ کی تفسیر کے تحت گزر چکی ہے۔ پہلی تفسیر کے مطابق اس کا معنی یہ ہوگا گویا کہ وہ معذرت کر رہے ہیں کہ ان کے دلوں پر پردہ پڑنے کی وجہ سے وہ نبی ﷺ کی بات نہیں سمجھتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے۔ اور دوسری تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کے علم کے دعویٰ کی مکمل تردید کردی۔ اس کی تفسیر بھی سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے واضح اعلان فرمادیا کہ یہ اپنے کفر وعصیان کی وجہ سے بہت کم ایمان لائیں گے کیونکہ ان کے دل کفر وسرکشی کے عادی ہو چکے ہیں۔

وَّبِکُفْرِھِمْ وَقَوْلِھِمْ عَلٰی مَرْیَمَ بُھْتَانًا عَظِیْمًا: یہاں ان کے ایک قبیح جرم کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ انہوں نے اس بدکاری کا ارتکاب اس وقت کیا جب وہ حالت حیض میں تھیں۔ ان پر خدا کی لعنت ہو۔

قَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ: یہاں ان کے ایک اور جرم کا ذکر کیا ہے کہ وہ استہزاءاً اور مزاح کے طور پر کہا کرتے تھے کہ یہ مسیح (علیہ السلام) جو اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور ان کا یہ قول مشرکین کے اس قول کی مثل ہے جو وہ استہزاء رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہا کرتے تھے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ (الحجر:6): حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پورا واقعہ اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزات اور براہین کے ساتھ مبعوث فرمایا تو یہودی آپ سے حسد کرنے لگے۔ آپ مادرزاد اندھوں کو بینا کرتے، کوڑھی کو صحیح کردیتے، اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے، مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ اللہ کے حکم سے اڑنے لگتا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے معجزات تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے۔ لیکن ان واضح اور ظاہر معجزات کے باوجود یہودیوں نے آپ کی تکذیب اور مخالفت کی اور ہر ممکن اذیت پہنچانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی شہر میں باقاعدہ سکونت اختیار نہ کرتے بلکہ آپ اور آپ کی والدہ نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ جنگلوں اور صحراؤں کی سیاحت میں گزار دیا۔ یہودیوں نے اس پر ہی بس نہ کیا بلکہ اس زمانہ میں دمشق کے بادشاہ جو کہ مشرک تھا اور ستاروں کی پوجا کرتا تھا، کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے پیروکاروں کو یونانی کہا جاتا تھا جنہوں نے اس کو آپ کے خلاف اکسایا اور اسے بتایا کہ بیت المقدس میں ایک شخص (عیسیٰ علیہ السلام) ہے جو لوگوں کے درمیان فتنہ وفساد برپا کرتا ہے اور ان کو گمراہ کرتا ہے۔ رعایا کو بادشاہ کے خلاف بھڑکاتا ہے، بادشاہ یہ سن کر سخت غضبناک ہوا اور بیت المقدس میں اپنے گورنر کے نام خط لکھا کہ وہ (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھادے اور ان کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھے۔ اور اس طرح لوگوں کو ان کی اذیت سے بچائے جب یہ خط بیت المقدس پہنچا تو وہ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہودیوں کے ایک گروہ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت آپ کے ساتھ بارہ یا تیرہ اور ایک روایت کے مطابق سترہ حواری تھے۔ جمعہ کا دن، اور عصر کے بعد کا وقت تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ لوگ مکان میں داخل ہو کر آپ کو گرفتار کرلیں گے یا آپ کو ان کے پاس جانا پڑے گا۔ آپ نے اپنے حواریوں کو فرمایا۔ تم میں سے کون پسند کرتا ہے کہ اسے میرا مشابہ بنادیا جائے اور یہ لوگ اسے پکڑ کر سولی پر چڑھادیں جو اس

بات کو قبول کرے گا وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ یہ سن کر ان میں سے ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے یہ منظور ہے۔ شاید حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس نوجوان کو اس قابل نہ سمجھا۔ اس لیے آپ نے دوسری مرتبہ اور پھر تیسری مرتبہ اپنے الفاظ کا اعادہ کیا۔ مگر ہر دفعہ وہ نوجوان ہی آپ کی آواز پر لبیک کہتا۔ آپ نے فرمایا ہاں تم وہ خوش نصیب ہو۔ اللہ کے حکم سے فوراً اس کی شکل بدل گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہو گیا۔ اسی اثناء میں مکان کی چھت میں ایک شگاف پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اونگھ طاری ہوئی اور آپ کو اسی حالت میں اوپر اٹھالیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ...... (آل عمران:55) ''ترجمہ: یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف......''۔ اس کے بعد جب وہ حواری باہر نکلے تو ان لوگوں نے اس نوجوان کو عیسیٰ علیہ السلام گمان کرتے ہوئے پکڑ لیا اور رات کو سولی پر چڑھا کر اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ دیا۔ اس طرح یہ یہودی اپنے گمان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا کر بہت خوش ہوئے اور بڑے زور و شور سے اس کا اظہار کرنے لگے۔ نصرانیوں میں سے بھی کچھ کم عقل اور جاہل لوگوں نے اس کو سچ تسلیم کر لیا۔ سوائے ان حواریوں کے جو روح اللہ کے ساتھ اس گھر میں موجود تھے۔ اور جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر چڑھتے ہوئے دیکھا ان کے علاوہ اکثر لوگوں نے یہودیوں کی طرح گمان کیا کہ سولی پر حضرت مسیح ہی کو چڑھایا گیا ہے۔ یہاں تک انہوں نے یہ قصہ بھی گھڑا کہ حضرت مریم علیہ السلام اس سولی کے نیچے بیٹھی روتی رہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے ساتھ گفتگو بھی کی۔ واللہ اعلم۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی آزمائش اور امتحان تھا۔ اس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس حقیقت کو واضح اور ظاہر کیا۔ اور اسے اپنے معزز و مکرم رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ موید کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کہ تمام جہانوں کا رب ہے اور دل کے پوشیدہ رازوں سے بھی آگاہ ہے، زمین و آسمان کی ہر چیز کو جاننے والا اور عالم ما کان وما یکون ہے۔ اس سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔ وہی ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ: یعنی انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر نہیں لٹکایا بلکہ انہوں نے ان کے مشابہ کو دیکھا اور اسی کو روح اللہ گمان کرنے لگے۔ اسی لیے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ: یعنی انہوں نے یقینی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ شک اور وہم کا شکار تھے۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ: بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا ہے۔ وہ ذات جو انتہائی طاقتور ہے اور جو اس کے دروازے پر پناہ لیتا ہے اس پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ اس کے تمام امور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو آپ گھر میں تشریف لائے۔ آپ کے سر مبارک سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس وقت وہاں آپ کے بارہ حواری موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں سے بعض ایسے ہیں جو مجھ پر ایمان لانے کے بعد بھی بارہ مرتبہ میرا انکار کریں گے۔ پھر ارشاد فرمایا تم میں سے کون ہے جسے اللہ تعالیٰ میرے مشابہ بنا دے اور پھر اسے میری جگہ قتل کر دیا جائے اور پھر وہ جنت میں میرا رفیق ہو۔ یہ سن کر ایک نوجوان اٹھا۔ آپ نے اسے فرمایا تم بیٹھ جاؤ۔ آپ نے پھر یہی بات دوسری اور تیسری مرتبہ کہی تو وہی نوجوان کھڑا ہوا تو آپ نے فرمایا تم ہی وہ نوجوان ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس نوجون کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ کر دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا اور یہودیوں نے اس نوجون کو سولی چڑھا کر قتل کر دیا، حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی کے

مطابق حواریوں میں سے بعض نے بارہ مرتبہ آپ کا انکار کیا۔ اس کے بعد یہ لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ 1۔ یعقوبیہ یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود ہم پر نازل ہوا تھا جب تک چاہا وہ رہا پھر آسمان پر چڑھ گیا۔ 2۔ نسطوریہ کہتے تھے کہ اللہ کا بیٹا ہمارے پاس آیا تھا اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اپنے پاس اوپر بلا لیا۔ 3۔ اہل حق ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اور پھر جب ارادہ فرمایا تو اپنے پاس اوپر اٹھا لیا۔ پہلے دو گمراہ فرقے اہل حق کے مقابلہ میں قوی اور طاقتور تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کو قتل کر دیا۔ جس سے اہل حق کی تعداد بہت کم رہ گئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اس روایت کی سند صحیح ہے۔ اس کی مثل ایک روایت نسائی نے بھی حضرت ابو معاویہ سے روایت کی ہے۔ حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا محاصرہ کیا تو اس وقت آپ کے ساتھ سترہ حواری تھے۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنا دینا۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے کہ تم نے ہم پر جادو کر دیا ہے یا تو عیسیٰ کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم سب کو قتل کر دیں گے۔ یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے آج جو میری جگہ اپنی جان قربان کرے گا اسے اللہ تعالیٰ صلہ میں جنت عطا فرمائے گا۔ ایک حواری نے عرض کی کہ میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔ یہ کہہ کر وہ یہودیوں کے پاس گیا اور یہ کہا کہ میں ہی عیسیٰ علیہ السلام ہوں۔ انہوں اسے پکڑ کر قتل کیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ شک و شبہ میں پڑ گئے (1)۔ ابن جریر اپنی تفسیر میں ابن وہب سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو القاء کیا کہ وہ ان کو اس دنیا سے نکالنے والا ہے تو آپ پر موت کا تصور گراں گزرا جس سے آپ گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگے۔ آپ نے اپنے حواریوں کو بلایا اور فرمایا کہ آج رات ایک بہت ضروری کام ہے اس لیے تم سب اکٹھے ہو کر آنا۔ جب وہ رات کو آئے تو آپ نے خود ان کو کھانا کھلایا اور ان کی خدمت میں مشغول رہے اور جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ ان کے ہاتھ دھلانے لگے پھر آپ نے اپنے کپڑوں سے ان کے ہاتھ صاف کیے۔ حواریوں پر آپ کا یہ عمل بہت گراں گزرا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ اس رات میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں اگر کسی نے مجھے اس سے روکا تو اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں اور نہ میرا اس کے ساتھ۔ یہ سن کر سب نے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب آپ سب کام سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میں نے جو بھی آج تمہاری خدمت کی ہے اس لیے کہ میرا عمل تمہارے لیے اسوہ اور نمونہ بن جائے۔ تم میں سے کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی کوشش نہ کرے جس طرح میں نے تمہاری خدمت کی ہے اس طرح تم بھی خدمت کرنا۔ اور جس ضروری کام کے لیے میں نے تمہیں بلایا ہے وہ یہ ہے کہ آج رات تم سب مل کر بڑے خشوع خضوع سے اللہ کی بارگاہ میں دعا کرنا کہ وہ میری اجل کو مؤخر کر دے۔ جب وہ حواری دعا کرنے کے لیے تیار ہوئے اور انہوں نے دعا کرنے کا ارادہ کیا تو ان پر نیند طاری ہو گئی آپ انہیں بیدار کرنے لگے اور فرمانے لگے سبحان اللہ! کیا تم ایک رات بھی میرے لیے جاگ نہیں سکتے انہوں نے عرض کی کہ قسم بخدا ہمیں بھی معلوم نہیں کہ ہمیں کیا ہو گیا ہے اس سے پہلے تو ہم لگاتار کئی کئی راتیں جاگتے تھے لیکن اس رات جاگنے کی قوت و طاقت ہم میں نہیں۔ ہم جب بھی دعا کا ارادہ کرتے ہیں تو کوئی چیز قدرتی طور پر ہمارے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ چرواہا نہیں رہے گا اور بکریاں بکھر جائیں گی۔ اس طرح آپ نے انہیں اشارۃً اپنے اس دنیا سے کوچ کرنے کا بتا دیا پھر ارشاد فرمایا کہ یہ حق ہے کہ تم میں سے ایک شخص صبح مرغ کی اذان سے پہلے تین مرتبہ میرا انکار کرے گا اور تم میں سے ایک دوسرا مجھے چند درہموں کے عوض مجھے بیچ دے گا اور بیچ کر میری قیمت کھا جائے گا۔ یہ باتیں سن کر وہ حواری باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ یہودی آپ کی تلاش میں ہیں۔ انہوں

1۔ تفسیر المظہری: 12/6

نے شمعون حواری کو پکڑا اور کہنے لگے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے ہے۔ اس نے انکار کر دیا کہ میں ان کا حواری نہیں ہوں۔ یہ سن کر انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اسے یہودیوں کے دوسرے گروہ نے پکڑ لیا۔ اس نے پھر انکار کیا پھر جب اس نے مرغ کی اذان سنی تو رونے لگا اور بہت غمگین ہوا۔ صبح ہوتے ہی ایک حواری یہودیوں کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر میں تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتاؤں تو کیا دو گے تو انہوں نے کہا تمیں درہم۔ چنانچہ اس نے وہ رقم لی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتہ بتا دیا۔ اس سے پہلے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا تھے۔ لیکن اب انہیں یقین ہو گیا اور انہوں نے ان کو پکڑا اور رسیوں میں جکڑ کر کھینچنے لگے۔ اور کہنے لگے کہ تم ہی مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے اور شیطان کو بھگایا کرتے تھے، پاگلوں کو صحیح کیا کرتے تھے۔ کیا تم آج اپنے آپ کو اس رسی سے نہیں چھڑا سکتے۔ یہ کہہ کر وہ اس پر تھوکنے لگے اور کانٹے پھینکنے لگے حتیٰ کہ جب وہ اس لکڑی کے پاس آپ کو لے آئے جس پر وہ سولی دینا چاہتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو اوپر اٹھا لیا اور انہوں نے آپ کے مشابہ ایک شخص کو سولی پر چڑھا دیا پھر سات دن کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور وہ عورت جس کا علاج حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا وہ روتی ہوئی اس سولی کے پاس آئیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا تم کیوں روتی ہو مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس اٹھا لیا ہے اور مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی اور انہیں تو شبہ میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ میرے حواریوں کو کہنا کہ مجھے فلاں جگہ پر ملیں۔ جب یہ خبر حواریوں کو ملی تو وہ گیارہ حواری اس جگہ پہنچ گئے۔ صرف وہ حواری نہ پہنچا جس نے آپ کو بیچا تھا اور یہودیوں کو آپ کے متعلق بتایا تھا۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے کیے پر بہت نادم ہوا اور گلا گھونٹ کر خودکشی کر لی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ توبہ کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول کرتا۔ پھر آپ نے اس بچے کے بارے میں پوچھا جو ان کے ساتھ تھا اس کا نام یحییٰ تھا۔ آپ نے فرمایا یہ بھی تمہارے ساتھ رہے گا۔ آپ نے فرمایا جاؤ تم میں سے ہر ایک اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرے گا۔ جاؤ انہیں اللہ کے عذاب سے ڈراؤ اور دین کی دعوت دو(1)۔ یہ واقعہ انتہائی عجیب ہے۔ ابن اسحٰق کا قول ہے کہ بنی اسرائیل کے جس بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے تھے، اس کا نام داؤد تھا۔ جب ان لوگوں نے آپ کو قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ تو آپ پر سخت پریشانی اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس روایت کو نقل کرنے والوں کے قول کے مطابق آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اے باری تعالیٰ اگر تو موت کا پیالہ کسی سے دور کرنا چاہتا ہے تو مجھ سے دور کر دے۔ اور اس سخت پریشانی سے آپ کی یہ حالت ہو گئی کہ آپ کے جسم سے خون نکلنے لگا۔ اس وقت آپ کے ساتھ بارہ حواری تھے۔ جن کے نام فرطوس، یعقوبس، ویلاونخس، اندرالیس، فیلیبس، ابن یلما، متا، طوماس، یعقوب بن حلقیا، نداوسیس، قتابیا، لیودس رکریایوطا تھے۔ اور بعض کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوا تیرہ آدمی تھے۔ اور تیرھویں کا نام سرجس تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ سولی پر چڑھا دیا گیا۔ نصرانی اس سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی یہودیوں کی طرح یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہی سولی پر چڑھایا گیا ہے۔ اس طرح وہ رسول اللہ ﷺ کی اس سچی خبر کا بھی انکار کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دی۔ المختصر یہودی جب آپ کو قتل کرنے کے لیے آپ کے مکان میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ تیرہ حواری تھے اور چودھویں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ اور بعض کے نزدیک بارہ حواری تھے اور تیرھویں آپ تھے۔ ابن اسحٰق فرماتے ہیں کہ مجھے ایک عیسائی، جو کہ مسلمان ہو گیا تھا، نے خبر دی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام آ گیا کہ میں تمہیں اوپر اٹھانا چاہتا ہوں تو آپ نے اپنے حواریوں کو فرمایا۔ تم میں کون یہ پسند کرتا ہے کہ وہ جنت میں میرا رفیق ہو

1۔ تفسیر الطبری، 13/6

اور جو شخص یہ پسند کرتا ہے اسے میری جگہ قتل ہونا پڑے گا۔ سرجس نے کہا اے روح اللہ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ آپ نے اسے اپنی جگہ بٹھا دیا۔ پھر آپ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا اور یہودیوں نے سرجس کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ یہودیوں کو اس مکان میں داخل ہونے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کی تعداد معلوم تھی۔ لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے لیودس رکریا یوطا کو تیس درہم دیے کہ وہ انہیں بتائے کہ ان میں عیسیٰ علیہ السلام کون ہیں۔ اس نے کہا کہ جب تم داخل ہو گے تو میں ان کا بوسہ لوں گا پس تم انہی کو پکڑ لینا۔ جب وہ داخل ہوئے سو اس اثناء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ لیودس نے سرجس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں دیکھا تو اس کا بوسہ لینے لگا یہودیوں نے اسے پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ بعد میں لیودس شرمندہ ہوا اور اپنے گلے میں رسی ڈال کر خودکشی کر لی۔ یہ نصرانیوں کے نزدیک ملعون شخص ہے۔ بعض نصرانی کہتے ہیں کہ لیودس ہی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا گیا۔ انہوں نے اسی کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ وہ چلاتا رہا کہ میں عیسیٰ نہیں ہوں۔ میں تو تمہارا وہی ساتھی ہوں جس نے تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ لیکن کسی نے اس کی نہ سنی (1)۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس شخص کو سولی چڑھایا جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنایا گیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ ابن جریر کے مطابق آپ کے تمام حواریوں کو آپ کا ہم شکل بنا دیا گیا تھا۔

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ: اس کے بارے میں ابن جریر فرماتے ہیں کہ اس کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی وفات سے پہلے تمام اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ یعنی جب آپ دجال کو قتل کرنے کے لیے آسمان سے نازل ہوں گے۔ تو اس وقت تمام مذاہب یکجا ہو جائیں گے۔ یعنی تمام لوگ دین اسلام کے پیرو ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ حضرت ابو مالک فرماتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو تمام اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئیں گے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نجاشی اور ان کے ساتھی ہیں۔ آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ قسم بخدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان میں زندہ ہیں۔ جب وہ نازل ہوں گے تو سب لوگ ان پر ایمان لے آئیں گے۔ آپ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اوپر اٹھا لیا ہے اور وہ قیامت سے پہلے آپ کو پھر دنیا میں بھیجے گا تو نیک و بد تمام آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ یہی قتادہ، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اور کئی دوسرے مفسرین کا قول ہے۔ اور یہی قول حق ہے۔ ان شاء اللہ ہم قطعی دلائل کے ساتھ بیان کریں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہر اہل کتاب آپ پر اپنی موت سے پہلے ایمان لاتا ہے کیونکہ موت کے وقت ہر انسان پر حق و باطل عیاں ہو جاتا ہے (3)۔ اس وقت ہر اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کو تسلیم کر لیتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہر یہودی مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ یہی قول مجاہد کا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی اہل کتاب کی گردن تلوار سے اڑا دی جائے تو روح نکلنے سے پہلے پہلے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ اور وہ گواہی دیتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت میں "قَبْلَ مَوْتِهٖ" کی جگہ "قَبْلَ مَوْتِهِمْ" ہے یعنی ہر یہودی مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی یہودی چھت سے گر کر مر جائے تو آپ نے فرمایا کہ وہ چھت سے زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی ایمان لے آتا ہے۔ حضرات مجاہد، عکرمہ، ابن سیرین،

1۔ تفسیر الطبری: 14/6 2۔ تفسیر الطبری: 18/6 3۔ تفسیر الطبری: 19/6، 21

ضحاک، جویبر وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ ایک قول حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ اہل کتاب میں سے ہر ایک مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے گا۔ آپ کے اس ارشاد میں پہلے قول کی تائید کا احتمال بھی ہے۔ اور اس قول کی تائید کا احتمال بھی ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمام اہل کتاب اپنی موت سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں گے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ ہر نصرانی اور یہودی موت سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے گا۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ ان تمام اقوال میں سب سے واضح قول پہلا ہی ہے۔ یعنی جب قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے تو تمام اہل کتاب آپ کے وصال سے پہلے آپ پر ایمان لائیں گے۔ اور ان کا یہ قول بلا شک وشبہ صحیح ہے۔ کیونکہ ان آیات کریمہ کے سیاق کا مقصد یہودیوں کے اس دعویٰ کو باطل کرنا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ اسی طرح نصاریٰ کے اس جاہل گروہ کے عقیدے کو غلط ثابت کرنا ہے جنہوں نے یہودیوں کی اس بات کو حق تسلیم کر لیا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے درحقیقت بات ایسی نہیں جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ آپ کے مشابہ کو قتل کیا اور انہیں اس بات کا علم بھی نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ اوپر اٹھا لیا وہ ابھی وہاں زندہ ہیں اور قیامت سے پہلے نیچے اتریں گے۔ جس کا ذکر صحیح متواتر احادیث میں موجود ہے جن کو ان شاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔ مسیح دجال کو قتل کریں گے۔ صلیب توڑیں گے خنزیر ماریں گے۔ جزیہ کو قبول نہیں کریں گے۔ بلکہ ان کا یہی اعلان ہوگا مسلمان ہو جاؤ ورنہ تلوار کے ساتھ تمہارا فیصلہ ہوگا۔ اس کریمہ میں یہی بیان ہوا ہے کہ اس وقت تمام اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اور کوئی بھی آپ کی تصدیق کرنے میں پیچھے نہیں رہے گا۔ یعنی یہ یہودیوں کا گمراہ ٹولہ اور بعض نصرانی جن کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر کے سولی پر چڑھا دیا گیا یہ سب اس وقت آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا: یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اہل کتاب کے ان تمام اعمال کی گواہی دیں گے جن کا مشاہدہ انہوں نے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے کیا اور پھر زمین پر دوبارہ نازل ہونے کے بعد کیا۔ اور جن مفسرین نے اس آیت کی تصدیق یہ کی ہے کہ ہر اہل کتاب اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ اسلام یا حضرت محمد ﷺ پر ایمان لے آئے گا۔ تو یہ واقعہ کے مطابق ہے۔ کیونکہ موت کے وقت ہر شخص پر وہ چیز ظاہر ہو جاتی ہے جس سے وہ جاہل ہوتا ہے اس لیے وہ اس پر ایمان لے آتا ہے لیکن وہ ایمان جو انسان موت کے فرشتے کو دیکھ کر لاتا ہے وہ اس کے لیے مفید نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتداء میں ارشاد فرمایا: وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ (النساء:18) ''ترجمہ: اور نہیں ہے یہ توبہ ان لوگوں کے لیے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آ جائے کسی ایک کو ان میں سے موت تو وہ کہے بے شک میں اب توبہ کرتا ہوں......''۔ اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (المومن:84) ''ترجمہ: پھر جب انہوں نے دیکھ لیا ہمارا عذاب تو کہنے لگے ہم ایمان لائے ایک اللہ پر۔'' آیت کریمہ کی یہ تفسیر امام ابن جریر کے اس استدلال کے ضعف پر دلالت کرتی ہے جو انہوں نے دوسرے قول کی تردید کے لیے کیا ہے۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس تفسیر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو کسی یہودی یا نصرانی کے اقرباء اس کے ورثاء نہیں بن سکتے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ پر ایمان لا کر مرا تو وہ مومن شمار ہوگا اور اس کے دوسرے رشتہ دار کافر ہوں گے اور کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا(1)۔ ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس حالت میں ایمان لانے سے لازم نہیں کہ وہ اس سے مسلمان ہو جائے گا۔ کیونکہ حالت نزع میں ایمان اس کے لیے مفید ہے نہ اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

1۔ تفسیر الطبری:21/6

اسی طرح ابن عباسؓ کے اس قول میں غور وفکر کریں کہ وہ کسی دیوار سے گرتے ہوئے تلوار کے وار سے پہلے یا کسی درندے کے اسے چیر پھاڑ کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا مگر اس کا یہ ایمان لانا اس کے نفع بخش نہیں ہوگا اور نہ ہی اسے حالت کفر سے حالت اسلام کی طرف پھیرے گا۔ جو شخص بھی اس میں اچھی طرح غور وفکر کرتا ہے۔ تو اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ درحقیقت یہی تفسیر صحیح ہے۔ بہر حال اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان میں زندہ ہیں اور وہ قیامت سے پہلے زمین پر اتریں گے اور ان یہود ونصاریٰ کی تکذیب فرمائیں گے جن کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مختلف قسم کے متضاد خیالات تھے۔ جن کا حق سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہ دونوں گروہ آپ کے بارے میں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ یہودی تو آپ کی شان میں تنقیص کرتے ہیں۔ انہوں نے آپ پر آپ کی والدہ پر بڑے غلط قسم کے الزامات لگائے۔ اور نصاریٰ نے آپ کی شان حد سے بڑھا دی۔ اور آپ کی طرف لایعنی باتیں منسوب کر دیں اور یہود کے مقابلہ میں آ کر آپ کو مقام نبوت سے اٹھا کر مقام الوہیت پر پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب ونقائص سے مبرا ہے۔

قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے زمین نازل ہونے کے بارے میں احادیث

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے عنقریب تم میں حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) عادل حاکم بن کر نازل ہوں گے۔ وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو ماریں گے، جزیہ کو ختم کریں گے، مال اتنا بڑھ جائے گا کہ اسے کوئی قبول کرنے والا نہیں ہوگا حتیٰ کہ ایک سجدہ دنیا ومافیہا سے زیادہ پسندیدہ ہوگا پھر آپ نے فرمایا اگر چاہو تو یہ آیت کریمہ ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُـؤۡمِنَنَّ بِهٖ'' پڑھ کر دیکھ لو(1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے بھی روایت کیا ہے اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ اس وقت سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوگا جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد بھی حضرت ابو ہریرہؓ نے مذکورہ آیت تین مرتبہ تلاوت فرمائی۔ اور یہ وضاحت فرمائی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے تمام اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور مسند امام احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہما السلام فج روحاء کے مقام سے حج یا عمرہ یا ان دونوں اکٹھا احرام باندھیں گے (2)۔ اور مسند امام احمد کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے خنزیر کو ماریں گے، صلیب مٹا دیں گے، نماز باجماعت ہوگی اور اتنا مال عطا کریں گے کہ کوئی قبول نہیں کرے گا، خراج کو ختم کر دیں گے، روحاء کے مقام پر نازل ہوں گے، یہاں سے حج یا عمرہ یا ان دونوں کا اکٹھا احرام باندھیں گے۔ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے آیت کریمہ: وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ...... پڑھی اور فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے اہل کتاب آپ پر ایمان لائیں گے۔ راوی حدیث حضرت حنظلہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ تمام کی تمام حدیث نبوی ہے یا آخری الفاظ حضرت ابو ہریرہؓ کے ہیں (3)۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی کہ جب تم میں مسیح بن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے اور تمہارے امام تم میں سے ہوں گے (4)۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمام انبیاء آپس میں ان بھائیوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا والد تو ایک ہو لیکن مائیں مختلف ہوں۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین تو ایک ہی ہے۔ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے سب سے زیادہ قریب ہوں کیونکہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں۔ بس وہ نازل

1۔ فتح الباری، کتاب الانبیاء: 490/6
2۔ مسلم، کتاب الحج: 915
3۔ مسند احمد: 290/2
4۔ فتح الباری، کتاب الانبیاء: 491/6

ہونے والے ہیں۔ جب تم انہیں دیکھو گے تو تم انہیں پہچان لو گے۔ میانہ قد، سرخ وسپید چہرہ ہوگا اور ہلکے پیلے رنگ کی دو چادریں پہنے ہوئے ہوں گے۔ ایسے محسوس ہوگا کہ ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں، صلیب توڑ دیں گے، خنزیر ماریں گے، جزیہ ختم کریں گے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں گے ان کے زمانہ میں اسلام کے سوا تمام دین ختم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مسیح دجال کو ہلاک کرے گا۔ تو پھر روئے زمین پر امن کا دور دورہ ہوگا یہاں تک کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائیوں کے ساتھ، اور بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چریں گے، بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے سانپ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ آپ چالیس برس تک زمین پر ٹھہریں گے پھر آپ کا وصال ہوگا اور مسلمان آپ کی نماز جنازہ ادا کریں گے (1)۔ ابن جریر کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ آپ لوگوں سے اسلام کے لیے جہاد کریں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک رومی اعماق یا دابق کے مقام پر نازل نہ ہوں گے۔ ان کے مقابلہ کے لیے مدینہ طیبہ سے ایک لشکر نکلے گا جو اس وقت کے بہترین لوگوں پر مشتمل ہوگا۔ جب وہ صف بندی کریں گے تو رومی کہیں گے کہ ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ہم میں سے جو اپنا دین بدل کر تمہارے ساتھ مل گئے انہیں ہمارے حوالے کردو۔ ہم ان کے ساتھ لڑیں گے۔ مسلمان کہیں گے قسم بخدا ہم ان کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ پس جنگ شروع ہوگی۔ مسلمانوں کے لشکر کا ایک تہائی حصہ شکست کھا کر فرار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کبھی قبول نہیں فرمائے گا۔ ایک تہائی شہید ہو جائیں گے۔ اور یہ اللہ کے نزدیک بہترین شہداء میں ہوں گے۔ ایک تہائی کو فتح حاصل ہوگی پھر ان کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا۔ یہی لوگ قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ ابھی وہ اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں کے ساتھ لٹکا کر مال غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے کہ شیطان بلند آواز سے پکارے گا کہ تمہارے بچوں میں دجال آ گیا۔ وہ اس کی جھوٹی بات کو سچ گمان کر کے واپس لوٹیں گے۔ جب وہ شام پہنچیں گے تو دجال بھی آ جائے گا۔ اسی اثناء میں جب کہ وہ اس کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تیاری کر رہے ہوں گے کہ نماز کا وقت ہو جائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے اور وہ ان کی امامت کرائیں گے۔ جب دشمن خدا ان کو دیکھے گا تو اس طرح گھلنے لگے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے اسی حالت میں چھوڑ دیں گے تو وہ گھلتے گھلتے ہلاک ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسے ان کے دست مبارک سے ہلاک کرائے گا۔ اور آپ مسلمانوں کو اپنے نیزے پر لگے ہوئے اس کا خون دکھلائیں گے۔(2) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ معراج کی رات میری ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوئی۔ وہ آپس میں قیامت کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی۔ پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باری آئی تو آپ نے فرمایا کہ قیامت کے آنے کا صحیح وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ عہد لیا ہے کہ قیامت سے پہلے دجال کا خروج ہوگا۔ اس وقت میرے پاس دو شاخیں ہوں گی۔ جب وہ مجھے دیکھے گا تو اس طرح پگھلنے لگے گا جس طرح سیسہ پگھلتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کر دے گا جب مجھے دیکھے گا۔ یہاں تک کہ درخت اور پتھر بھی بولیں گے اور کہیں گے: ہمارے پیچھے کافر ہے آؤ اسے قتل کردو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمام کافروں کو ہلاک کر دے گا اور مسلمان اپنے اپنے وطنوں کو لوٹ جائیں گے۔ اس وقت یاجوج ماجوج قوم نکلے گی۔ وہ ہر طرف نکلتے ہوئے شہروں کو روندے جائیں گے۔ اور جس چیز کے پاس سے ان کا گزر ہوگا اسے ہلاک کر دیں گے، پانی سے گزریں گے تو اسے پی جائیں گے۔ لوگ واپس آ کر مجھ سے ان کی شکایت کریں

1۔ مسند احمد: 406/2 2۔ مسلم، کتاب الفتن: 2221

گے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ ان سب کو ہلاک کر دے گا۔ ان کے مردہ جسموں کی بدبو سے آب و ہوا متعفن ہو جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا۔ بارش کے تیز پانی سے ان کی لاشوں کو سمندر میں پھینک دے گا۔ پس اس وقت قیامت اس طرح قریب ہو گی جس طرح کہ وہ حاملہ عورت جس کے حمل کے دن مکمل ہو چکے ہوں اور گھر والوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ دن کو بچہ جنتی ہے یا رات کو(1)۔ حضرت ابونضرہ روایت کرتے ہیں کہ ہم عثمان بن ابی العاص کی خدمت میں جمعہ کے دن حاضر ہوئے۔ تاکہ قرآن پاک کے اپنے لکھے ہوئے نسخہ کو ان کے نسخہ کے ساتھ ملائیں۔ جب جمعہ کا وقت قریب آیا تو آپ نے ہمیں غسل کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے غسل کیا پھر آپ خوشبو لے آئیں ہم نے خوشبو لگائی پھر مسجد میں ایک شخص کے پاس بیٹھ گئے تو انہوں نے دجال کے بارے میں حدیث بیان کی۔ پھر جب حضرت عثمان تشریف لائے تو ہم سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد ہم بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے تین شہر ہوں گے۔ ایک دو سمندروں کے سنگم پر، دوسرا حیرا میں اور تیسرا شام میں۔ لوگ تین گھبراہٹوں میں مبتلا ہوں گے۔ پھر دجال نکلے گا۔ مشرق کی طرف سے اسے شکست ہو گی وہ سب سے پہلے اس شہر کا قبضہ کرے گا جو سمندروں کے سنگم پر واقع ہو گا۔ اہل شہر تین حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ تو یہی کہے گا کہ ہم یہیں ٹھہریں گے، ہم دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک گروہ صحرائی بدوؤں کے ساتھ مل جائے گا اور تیسرا گروہ قریب ترین شہر میں چلا جائے گا۔ دجال کے ساتھ ستر ہزار کا لشکر ہو گا۔ جن کے سروں پر تاج ہو گا۔ ان میں اکثریت یہودی مردوں اور عورتوں کی ہو گی۔ مسلمان سمٹ کر ایک گھاٹی میں محصور ہو جائیں گے وہ اپنے جانور چرنے کے لیے بھیجیں گے، دجال کا لشکر ان پر قبضہ کر لے گا۔ جس سے مسلمانوں کو ان سے بڑی تکلیف ہو گی۔ اس طرح وہ شدید قحط سالی اور تکلیف میں مبتلا ہو جائیں گے حتیٰ کہ وہ اپنی کمانوں کی تانتوں کو جلا کر آئیں گے۔ وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ اچانک سمندر کی طرف سے کوئی شخص نداء دے گا تمہارے لیے امداد آگئی وہ ایک دوسرے کو کہیں گے کہ یہ کسی آسودہ شخص کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ بن مریم فجر کی نماز کے وقت نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر انہیں کہے گا اے روح اللہ! آگے بڑھیے! اور ہمیں نماز پڑھائیے۔ وہ فرمائیں گے کہ اس امت کے لوگ ایک دوسرے کے امیر ہیں اس لیے مسلمانوں کا امیر آگے بڑھے گا اور نماز پڑھائے گا۔ نماز کے بعد حضرت عیسیٰ اپنا نیزہ پکڑیں گے اور دجال کی طرف جائیں گے وہ آپ کو دیکھ کر سیسے کی طرح پگھلنے لگے گا۔ آپ اس کے سینے پر وار کر کے اسے قتل کر دیں گے اور اس کے لشکر کو شکست دیں گے۔ اس دن انہیں کوئی چیز انہیں پناہ نہیں دے گی۔ حتیٰ کہ درخت بھی کہے گا اے مومن! میرے پیچھے کافر ہے اسے قتل کر دو۔ پتھر بھی کہے گا یہ کافر ہے اسے قتل کر دو(2)۔ حضرت ابو امامہ باہلی روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ہمیں آپ نے زیادہ تر دجال کے بارے میں آگاہ کیا اور ہمیں دجال کے فتنہ سے ڈرایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب سے اولاد آدم کو پیدا کیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک دجال سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہر نبی نے اپنی امت کو دجال کے فتنہ سے آگاہ کیا۔ میں سب سے آخری نبی ہوں تم سب سے آخری امت۔ اور وہ یقیناً تم میں ہی آئے گا۔ اگر تو میری موجودگی میں آ گیا تو میں اسے نبٹ لوں گا اور اگر میرے بعد آئے گا تو ہر انسان اپنا خود ذمہ دار ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا نگہبان ہو گا۔ وہ شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا۔ پھر دائیں بائیں گھومے گا۔ اے لوگو! ثابت قدم رہنا میں تمہارے سامنے اس کی ایسی علامت بیان کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے کسی نبی نے بیان نہیں کی وہ سب سے پہلے دعویٰ نبوت کرے گا۔ لیکن خبردار میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کے بعد وہ تمہارا رب ہونے کا دعویدار ہو گا۔ خبردار مرنے سے پہلے تم اپنے رب کا دیدار نہیں کر سکتے۔ دوسری علامت یہ کہ وہ

1۔ مسند احمد: 375/1 2۔ مسند احمد: 216/4

کانا ہوگا اور تمہارا رب ایسا نہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہوا ہوگا۔ ہر مومن اسے پڑھ لے گا خواہ وہ پڑھا ہوا یا ان پڑھ۔ اس کے ساتھ ایک جنت اور آگ ہوگی، اس کی آگ حقیقت میں جنت ہے اور اس کی جنت حقیقت میں جہنم ہے۔ اور جس کو وہ اپنی آگ میں ڈالے اسے اللہ سے مدد مانگنی چاہیے اور سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھنی چاہئے تو یہ آگ اس کیلئے ٹھنڈک اور سلامتی بن جائے گی جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی۔ اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک اعرابی کو کہے گا کہ اگر میں تیرے مرے ہوئے ماں باپ کو زندہ کر دوں کیا تو مجھے رب مان لے گا۔ تو وہ کہے گا ہاں۔ اسی وقت شیطان اس کے ماں باپ کی صورت میں ظاہر ہوگا وہ دونوں اسے کہیں گے کہ بیٹا اس کو مان لو یہ تمہارا رب ہے۔ اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک شخص کو پکڑ کو آرے سے چیر کر دو حصوں میں تقسیم کر دے گا۔ اور لوگوں سے کہے گا کہ میرے اس بندے کی طرف دیکھنا میں اسے ابھی زندہ کرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود کہے گا میں اس کا رب نہیں ہوں پھر وہ اس کو زندہ کرے گا اور یہ خبیث دجال اس آدمی سے پوچھے گا۔ تمہارا رب کون ہے۔ وہ جواب دے گا میرا رب اللہ ہے اور تو دشمن خدا دجال ہے۔ خدا کی قسم! مجھے تو آج پختہ یقین ہو گیا ہے کہ تو ہی دجال ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جنت میں اس آدمی کا درجہ میری امت میں سب سے بلند ہوگا۔ حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں کہ ہمارا خیال تھا یہ شخص حضرت عمر بن خطابؓ ہوں گے۔ آپ کے شہید ہونے تک ہمارا یہی خیال رہا۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کا ایک فتنہ یہ ہوگا کہ وہ آسمان کو برسانے کا حکم دے گا تو بارش برسنے لگے گی۔ زمین کو اگانے کا حکم دے گا تو زمین اگنے لگے گی۔ اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک قبیلہ کے پاس سے گزرے گا۔ جب اہل قبیلہ اس کی تکذیب کریں گے تو اس کے تمام جانور ہلاک ہو جائیں گے۔ اور دوسرے قبیلے کے پاس سے گزرے گا تو وہ اس کی تصدیق کریں گے تو وہ آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا تو بارش ہو جائے گی زمین کو فصلیں اگانے کا حکم دے گا تو فصلیں اگیں گی۔ اور ان کے جانور موٹے تازے اور فربہ اور بہت زیادہ دودھ دینے والے ہو جائیں گے۔ مکہ مدینہ کے علاوہ تمام روئے زمین کا چکر لگائے گا اور جب مکہ یا مدینہ کا رخ کرے گا تو ہر راہ پر تلواروں سے مسلح فرشتوں کو پائے گا حتیٰ کہ سبخاء ظریب الاحمر کے قریب نازل ہوگا۔ اس وقت مدینہ طیبہ میں تین زلزلے آئیں گے جس کی وجہ سے تمام مرد اور عورتیں نکل کر دجال کے لشکر میں چلے جائیں گے۔ مدینہ طیبہ ان خبیث لوگوں کو اس طرح دور پھینکے گا جس طرح بھٹی لوہے کی میل کچیل کو دور کر دیتی ہے اس دن کا نام یوم اخلاص ہوگا۔ یہ بات سن کر حضرت ام شریکؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس وقت عرب کہاں ہوں گے۔ فرمایا ان کی تعداد اس وقت قلیل ہوگی اور ان کی اکثریت اس وقت بیت المقدس میں ہوگی۔ اور ان کا امام ایک نیک آدمی ہوگا۔ ان کا امام ابھی صبح کی نماز پڑھانے نکلے گا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے۔ وہ امام الٹے پاؤں پیچھے ہٹے گا تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھائیں۔ آپ اپنا دست مبارک اس کے کندھے پر رکھ کر فرمائیں گے آگے بڑھو اور نماز پڑھاؤ۔ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس طرح وہ امام نماز پڑھائیں گے۔ جب نماز ختم ہوگی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ دروازہ کھولو۔ دروازہ کھلے گا تو سامنے دجال ستر ہزار یہودیوں کے لشکر کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ ان کے ہاتھ میں ساگوان کے دستے والی سونے سے آراستہ تلواریں ہوں گی دجال آپ کی طرف دیکھے گا تو پانی کی طرح گھلنے لگے گا۔ اور پھر تیزی سے بھاگنے لگے گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ میں تجھے ایک ایسی ضرب لگاؤں گا جس سے تم نہیں بچ سکو گے۔ چنانچہ آپ اسے مشرقی باب لد کے پاس اسے پکڑ لیں گے اور وہیں اسے قتل کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ لشکر یہود کو تباہ کر دے گا۔ وہ یہودی جس چیز کے پیچھے چھپیں گے اللہ اس چیز کو قوت گویائی عطا کرے اسے کوئی پتھر پناہ دے گا نہ شجر، نہ کوئی دیوار اور نہ کوئی جانور۔ لیکن برگد کا درخت نہیں بولے گا کیونکہ یہ یہودیوں کا مقدس درخت ہے۔ اس کے علاوہ ہر شجر و حجر کہے گا اے مسلم! آ یہ یہودی ہے

اسے قتل کر دو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دجال چالیس سال اس زمین پر رہے گا۔ اس کا ایک سال نصف سال کے برابر اور باقی ایام شرارہ کی مثل ہوں گے۔ ایک شخص صبح کے وقت شہر کے ایک دروازے سے چلے گا ابھی وہ دوسرے دروازے تک نہیں پہنچے گا کہ شام ہو جائے گی۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ہم ان چھوٹے دنوں میں نماز کیسے پڑھیں گے فرمایا ان دنوں میں اندازہ کر لیا کرنا۔ جس طرح کہ ان دنوں میں اندازے کے ساتھ نماز پڑھا کرو گے۔ آپ نے فرمایا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام عادل حاکم اور منصف امام بن کر میری امت میں داخل ہوں گے۔ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو ہلاک کریں گے، جزیہ کو ختم کریں گے صدقہ چھوڑ دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ بچہ سانپ کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈال دے گا تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بچیاں شیروں کے ساتھ کھیلیں گی۔ وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بھیڑیاں بکریوں میں اس طرح پھرے گا جس طرح ان کا محافظ کتا۔ دنیا امن سے اس طرح بھر جائے گی جس طرح برتن پانی سے۔ سب کا کلمہ ایک ہوگا اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی، جنگ وجدل ختم ہو جائے گا۔ قریش دوسروں سے اپنا ملک حاصل کر لیں گے۔ زمین چاندی کی مثل منور ہو جائے گی اور حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ کی طرح پیداوار دے گی۔ حتیٰ کہ انگور کا ایک خوشہ ایک جماعت کے لیے کافی ہوگا۔ اور انار اتنا بڑا ہوگا کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت اسے کھا کر سیر ہو جائے گی۔ بیلوں کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اور گھوڑا صرف چند درہموں میں ملے گا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ گھوڑے کیوں اتنے سستے ہو جائیں گے۔ فرمایا جنگ کے لیے اب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ عرض کی گئی بیل کیوں مہنگے ہوں گے۔ فرمایا تمام زمین پر کاشت کاری کی جائے گی۔ دجال سے پہلے تین سال لوگوں پر بہت سخت ہوں گے۔ ان میں قحط سالی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ پہلے سال آسمان کو حکم دے گا کہ وہ ایک تہائی بارش کو روک لے اور زمین کو حکم دے گا کہ ایک تہائی پیداوار روک لے، تیسرے سال آسمان کو مکمل بارش روکنے کا حکم دے گا تو بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں برسے گا زمین کو مکمل پیداوار روکنے کا حکم دے گا تو زمین کوئی چیز نہیں اگائے گی۔ اس قحط سے تمام جانور ہلاک ہو جائیں گے۔ مگر جسے خدا چاہے۔ عرض کی گئی لوگ اس زمانہ میں کیسے زندہ رہیں گے فرمایا اس وقت ان کی غذا کے قائم مقام تسبیح وتہلیل اور تکبیر وتحمید ہو جائے گا۔ عبدالرحمٰن مہاروی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث معلمین کو پہنچانی چاہیے تاکہ وہ بچوں کو سکھا دیں بلکہ کہ ان کو یہ حدیث لکھوا دینی چاہیے (1)۔

اس حدیث کی یہ سند اگرچہ غریب ہے لیکن دوسری کتب حدیث میں اس کے شواہد ملتے ہیں۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ تم یہود کے ساتھ جنگ کرو گے اور ان کو قتل کر دو گے۔ یہاں تک کہ پتھر کہے گا اے مسلم! یہ یہودی ہے آؤ اسے قتل کرو۔ اور مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ قیامت قائم ہونے سے پہلے مسلمان یہودیوں سے جنگ کریں گے اور ان کو قتل کر دیں گے۔ حتیٰ کہ یہودی جس درخت یا پتھر کے پیچھے چھپے گا تو وہ درخت اور پتھر کہیں گے اے مسلمان اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے ہے آؤ اسے قتل کر دو۔ سوائے برگد کے درخت کے۔ کہ وہ یہودیوں کا مقدس درخت ہے۔ ایک دن صبح کے وقت حضور ﷺ نے دجال کا ذکر کیا۔ دوران گفتگو آپ کبھی بلند ہوتے اور کبھی پست حتیٰ کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ دجال اس نخلستان میں ہے۔ جب ہم شام کو واپس آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہمارے اڑے چہروں کو دیکھ کر فرمایا تمہیں کیا ہوا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! صبح آپ نے دجال کا ذکر کیا تھا ہمیں یہ خیال ہوا کہ دجال اس نخلستان میں ہے۔ فرمایا دجال کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کا مجھے تمہارے لیے خوف ہے۔ اگر تو دجال میری موجودگی میں نکلا تو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں میں خود اس کا کام تمام کر دوں گا اگر وہ میرے بعد آیا تو ہر انسان خود اپنا نگہبان ہوگا اور اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا نگہبان ہے۔ وہ دجال نوجوان، گھنگریالے بالوں والا ہوگا اور اس کی ایک آنکھ ابھری ہوئی ہوگا۔ وہ عبدالعزیٰ بن قطن کے بہت مشابہ

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن: 1363,1359

ہوگا پس تم میں سے جو بھی اسے پائے وہ اس پر سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے۔ وہ شام وعراق کے درمیانی علاقہ سے نکلے گا۔ دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔ اے اللہ کے بندو۔! ثابت قدم رہنا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ زمین میں کتنی مدت ٹھہرے گا۔ فرمایا چالیس دن۔ اس کا ایک دن سال کے برابر اور ایک مہینے کے برابر اور ایک جمعہ کے برابر ہوگا اور باقی دن تمہارے عام دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کی اس کا وہ دن جو ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں ایک دن کی نماز ہمارے لیے کافی ہوں گی۔ فرمایا نہیں بلکہ عام دنوں کے ساتھ اندازہ لگا کر نماز پڑھنا۔ عرض کی ہمیں اس کی تیز رفتاری کے بارے میں بتائیں۔ فرمایا اس کی رفتار ان بادلوں کی طرح ہوگی جن کو تیز ہوائیں اڑاتی ہیں۔ اس کا گزر ایک قوم کے پاس سے ہوگا۔ وہ انہیں دعوت دے گا تو وہ اس کی تصدیق کر دیں گے۔ وہ آسمان کو حکم دے گا تو بارش ہوگی، زمین کو حکم دے گا تو فصل اگے گی جس کی وجہ سے ان کے جانور موٹے تازے اور بہت زیادہ دودھ دینے والے ہو جائیں گے۔ پھر اس کا گزر کسی دوسری قوم کے پاس سے ہوگا وہ اس کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے۔ جب وہ وہاں سے جائے گا تو ان کے مال و مویشی ہلاک ہو جائیں گے۔ کسی کھنڈر سے گزرے گا اور اسے کہے گا کہ اپنے خزانے کو باہر نکال دے تو اس کے خزانے شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے لگ جائیں۔ پھر ایک کڑیل جوان کو بلائے گا۔ تلوار کے ساتھ اس کے دو ٹکڑے کر کے اتنی دور پھینک دے گا جتنی دور تیر نشانے پر پہنچتا ہے پھر وہ اسے بلائے گا تو وہ ہنستا مسکراتا ہوا آجائے گا۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کو دمشق کے سفید مشرقی منارے کے قریب اتارے گا۔ آپ نے دو چادریں اوڑھی ہوئی ہوں گی اور آپ کے دونوں ہاتھ فرشتوں کے کندھوں پر ہوں گے، جب آپ سر کو جھکائیں گے تو اس سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے۔ جب سر کو اوپر کریں گے تو وہ قطرے موتیوں کی طرح جھڑیں گے۔ جس کافر تک آپ کے سانس کی گرمی پہنچے گی وہ مر جائے گا اور آپ کی سانس وہاں تک پہنچے گی جہاں تک آپ کی نظر پہنچتی ہے۔ آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے باب لد کے پاس اسے پکڑ کر قتل کر دیں گے۔ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ انہیں وحی فرمائے گا کہ میں نے اپنے کچھ بندوں کو بھیجا ہے جن کے ساتھ کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم میرے ان بندوں کو کوہ طور پر لے جاؤ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا وہ ہر طرف سے نکلیں گے۔ ان کا پہلا گروہ بحیرہ الطبریہ کے پاس پہنچے گا تو اس کا سارا پانی پی جائیں گے۔ جب ان کا آخری گروہ وہاں آئے گا تو وہ کہے گا کہ شاید کسی زمانے میں یہاں پانی تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھ مومن کوہ طور پر محصور ہوں گے اور ان کی یہ حالت ہوگی کہ ان کے لیے بیل کا ایک سر اس سے بھی اچھا معلوم ہوگا جسے تمہیں آج ایک سو دینار محبوب ہوں۔ اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے مومن دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ یہاں یاجوج ماجوج کی گردنوں میں ایک گلٹی پیدا کر دے گا جس کی وجہ سے وہ تمام ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی کوہ طور سے نیچے اتریں گے تو ایک بالشت زمین بھی نہیں پائیں گے جو ان کی لاشوں اور بدبو سے خالی ہوگی۔ پھر جناب عیسیٰ علیہ السلام اور مومنین اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کی گردنوں کی مثل پرندے بھیجے گا جو انہیں اٹھا کر پھینک دیں گے جہاں اللہ تعالیٰ چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ بارش نازل کرے گا جس سے کوئی گھر یا خیمہ نہیں بچے گا اور زمین ہتھیلی کی طرح دھل کر صاف ہو جائے گی۔ پھر زمین کو حکم ہوگا کہ اپنے پھل نکالو اور اپنی برکتیں لٹاؤ۔ اس وقت ایک پورا گروہ ایک انار سے سیر ہوگا۔ اور اس کے چھلکے کو سائبان بنا لے گا۔ اور ایک اونٹنی کا دودھ پورے قبیلے کے لیے کافی ہوگا۔ لوگ اسی حالت میں زندگی گزار رہے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ ہوا بھیجے گا جو مومنوں کی بغلوں کے نیچے سے گزرے گی۔ اور اس کے ساتھ ان کی روح قبض ہو جائے گی بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ دھینگا مشتی

میں مصروف ہوں گے ان پر قیامت واقع ہو جائے گی(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن نے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے بھی روایت کیا ہے جس کو ہم سورۂ انبیاء میں آیت کریمہ: حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ (الانبیاء:96) کی تفسیر کے تحت ذکر کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ یہ حدیث کون سی ہے جو آپ بیان کرتے ہیں۔ آپ بیان کرتے ہیں فلاں وقت قیامت قائم ہوگی۔ آپ نے یہ سن کر سبحان اللہ یا لا الٰہ الا اللہ پڑھا اور فرمایا کہ میرا تو یہ ارادہ ہے کہ میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کروں۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ تم کچھ مدت کے بعد بڑے بڑے امور دیکھو گے۔ اللہ کے گھر کو جلا دیا جائے گا اور یہ یہ واقعہ رونما ہوگا۔ پھر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت میں دجال آئے گا اور چالیس سال تک ٹھہرے گا اور یہ مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے چالیس دن، چالیس ماہ، یا چالیس سال فرمائے۔ پھر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم علیہ السلام کو بھیجے گا۔ ان کی صورت عروہ بن مسعود کی طرح ہوگی۔ وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ پھر لوگ سات سال اس طرح گزاریں گے کہ کسی کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ٹھنڈی ہوا بھیجے گا جو روئے زمین پر ہر شخص کی روح قبض کرلے گی جس کے دل میں ذرا ایمان یا بھلائی ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی پہاڑ کی غار میں داخل ہو گیا تو وہ ہوا اس کے پیچھے داخل ہو جائے گی اور اس کی روح قبض کر لے گی۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ بدترین لوگ رہ جائیں ہیں۔ جو پرندوں کی طرح ہلکے اور اور درندوں کی ذہنیت کے مالک ہوں گے انہیں کوئی اچھائی یا برائی کی تمیز نہیں ہوگی۔ شیطان انسانی شکل میں ظاہر ہو کر انہیں کہے گا کہ تم میرا حکم کیوں قبول نہیں کرتے۔ وہ کہیں گے تمہارا حکم کیا ہے۔ وہ انہیں بتوں کی عبادت کرنے کا حکم دے گا۔ وہ وافر رزق میں اچھی زندگی گزاریں گے۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ جس کو لوگ غور سے سنیں گے۔ اس کی آواز سب سے پہلے وہ شخص سنے گا جو اپنے اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے اپنے حوض کو درست کر رہا ہوگا۔ وہ آواز سن کر بے ہوش ہو جائے گا اور اس کے بعد تمام لوگ بے ہوش ہو جائیں گے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ شبنم یا سایہ کی مثل یا بارش نازل فرمائے گا جس سے لوگوں کے جسم دوبارہ اگ پڑیں گے۔ اس کے بعد دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو لوگ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ پھر انہیں کہا جائے گا اے لوگو! اپنے رب کی طرف چلو۔ پھر انہیں حکم ہوگا ٹھہرو۔ اور ان سے حساب کتاب ہوگا۔ پھر فرشتوں کو حکم ہوگا کہ ان میں سے جہنم کا حصہ نکالو۔ عرض کریں گے کتنا۔ حکم ہوگا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ یہی وہ دن ہے جو نو جوانوں کو بوڑھا کر دے گا۔ اور یہی وہ دن ہے جس دن معاملہ انتہائی سخت ہوگا(2)۔ اور مسند کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عیسیٰ بن مریم مسیح دجال کو باب لد کے قریب یا لد کی جانب قتل کریں گے(3)۔ ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اس کے بعد امام ترمذی نے کچھ صحابہ کے نام ذکر کر کے فرمایا ہے کہ اس باب میں ان صحابہ سے بھی احادیث مروی ہیں۔ اور ان سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں حضرت عیسیٰ کے دجال کو قتل کرنے کا ذکر ہے کیونکہ وہ احادیث جن میں صرف دجال کا ذکر ہے وہ بہت زیادہ اور شمار سے باہر ہیں۔ حضرت حذیفہ بن غفاریؓ فرماتے ہیں کہ عرفات سے واپس آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس سے گزرے اس وقت ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیوں کو نہ دیکھو۔ 1۔ سورج کا مغرب سے نکلنا، 2۔ دھواں کا اٹھنا، 3۔ دابۃ الارض کا نکلنا، 4۔ یاجوج ماجوج کا نکلنا، 5۔ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول، 6۔ دجال کا آنا، 7۔ مشرق، 8۔ مغرب، 9۔ جزیرۂ عرب میں زمین کا دھنسنا، 10۔ عدن سے ایک ایسی آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانک کرلے جائے گی۔ وہ رات بھی ان کے ساتھ گزارے گی۔ جب وہ دن کے وقت آرام کریں گے تو وہ ان کے ساتھ ہوگی(4)۔ اس حدیث کو مسلم

1۔ مسلم، کتاب الفتن: 2255,2250 2۔ ایضاً: 2260,2258 3۔ مسند احمد: 320/3 4۔ مسلم، کتاب الفتن: 2226,2225

اور اصحاب سنن نے بھی روایت کیا ہے۔ اسی طرح حدیث مسلم شریف میں حذیفہ بن اسیدؓ سے موقوفاً مروی ہے۔ حضرات ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن مسعود، عثمان بن ابی العاص، ابو امامہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمرو بن عاص، مجمع بن حارثہ، ابو شریحہ اور حذیفہ بن اسیدؓ کی روایت کردہ یہ احادیث متواتر ہیں۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے اور دمشق میں مشرقی مینارے سے ظاہر ہونے کا بیان ہے۔ ان احادیث میں آپ کے نازل ہونے کے وقت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ کہ آپ صبح کی نماز کے وقت نازل ہوں گے۔ اس زمانے یعنی 741 ہجری جامع اموی کا یہ مینار سفید پتھر سے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مینار پہلے آگ لگنے سے جل گیا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ملعون عیسائیوں نے اس کو آگ لگائی تھی۔ غالب گمان یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی مینار سے ظاہر ہوں گے، خنزیر کو ہلاک کریں گے۔ صلیب کو توڑیں گے اور جزیہ کو ختم کریں گے اسلام کے سوا کسی دین کو قبول نہیں کریں گے جیسا کہ پہلے صحیح احادیث میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور نبی پاک ﷺ نے بہت عرصہ پہلے ہی اس کی خبر دے دی اور اس چیز کو ثابت کر دیا بلکہ یہ ایک شرعی حکم کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس زمانہ میں ان تمام اہل کتاب کے شکوک وشبہات ختم ہو جائیں گے اور یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ (النساء:159) یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: (وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ) کی مثل ہے۔ اس کو لَعَلَمٌ بھی پڑھا گیا ہے جس کا معنی نشانی اور علامت ہے، یعنی آپ کا نزول قرب قیامت کی نشانی ہے۔ کیونکہ آپ مسیح دجال کے بعد نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اسے آپ کے ہاتھوں ہلاک کرے گا۔ جیسا کہ صحیح حدیث ہے: اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی شفاء بھی نازل فرمائی ہے۔ آپ کے زمانے میں یاجوج ماجوج نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کی برکت سے انہیں ہلاک کرے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ..... (الانبیاء:96) ''ترجمہ: یہاں تک کہ جب کھول دیے جائیں گے یاجوج وماجوج اور ہر وہ بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے.....''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حلیہ مبارک

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ جس میں حضور ﷺ نے فرمایا جب تم (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھو گے تو پہچان لو گے۔ میانہ قد، سرخ وسپید رنگت، زرد رنگ کی دو چادریں اوڑھے ہوئے ہوں گے۔ ایسے معلوم ہوگا جیسے ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ اگرچہ آپ کے سر مبارک میں تری نہیں ہوگی۔ حضرت نواس بن سمعانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کے سفید مشرقی مینارے کے پاس نازل ہوں گے۔ زرد رنگ کی چادریں اوڑھے ہوئے اور اپنے دست مبارک دو فرشتوں کے کندھوں پر رکھے ہوئے ہوں گے۔ جب آپ سر مبارک جھکائیں گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ اور جب سر مبارک اٹھائیں گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے سفید موتی جھڑتے ہیں۔ جس کافر تک آپ کی سانس کی ہوا پہنچے گی وہ مر جائے گا۔ اور آپ کے سانس کی ہوا وہاں تک پہنچے گی جہاں تک آپ کی نگاہ پڑے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معراج کی رات میری ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ وہ میانہ قد، سیدھے بالوں والے، قبیلہ شنوءہ کے آدمیوں کی مثل معلوم ہوتے تھے۔ پھر میری ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ وہ میانے قد، سرخ رنگت والے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی حمام سے نکلے ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو زیادہ میرے مشابہ تھے۔(1) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

1۔ فتح الباری، کتاب الانبیاء:477,476/6

نے ارشاد فرمایا کہ میں نے حضرت موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو سرخ رنگ، گھنگریالے بالوں اور کشادہ سینے والے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام گندمی رنگ کے جسم اور سیدھے بالوں والے تھے۔ جٹ مردوں کی مثل معلوم ہوتے(1)۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا نا ہونے کے عیب سے پاک ہے۔ اور مسیح دجال کی دائیں آنکھ کانی ہوگی۔ جیسا کہ پھولا ہوا انگور۔ ایک اور روایت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خواب میں کعبہ کے قریب عیسیٰ (علیہ السلام) کو دکھایا، خوبصورت گندمی رنگ والے تھے۔ ان کے بالوں کی لٹیں کندھوں پر پڑ رہی تھیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر طواف کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ مسیح بن مریم (علیہ السلام) ہیں۔ پھر میں نے اس کے پیچھے ایک آدمی دیکھا جس کے بال الجھے ہوئے اور داہنی آنکھ کانی تھی۔ ابن قطن کے بہت مشابہ تھا۔ ایک شخص کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر طواف کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ یہ مسیح دجال ہے(2)۔ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رنگ سرخ بیان نہیں فرمایا بلکہ گندمی فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ نے مذکورہ حدیث بیان کی۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ابن قطن کا تعلق قبیلہ بنوخزاعہ کے ساتھ تھا۔ یہ زمانہ جاہلیت ہی میں مر گیا تھا۔ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہونے کے بعد چالیس سال زمین پر ٹھہریں گے۔ پھر جب آپ کا وصال ہوگا تو مسلمان آپ کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ اور مسلم شریف کی حدیث ہے کہ وہ سات سال ٹھہریں گے۔ ممکن ہے کہ چالیس سال میں وہ مدت بھی شامل ہو جو آپ نے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے گزاری۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھایا تو اس وقت آپ کی عمر 33 سال تھی۔ ان میں یہ سات سال ملائے جائیں تو چالیس سال پورے ہو جائیں گے۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ اہل جنت کی شکل وصورت حضرت آدم علیہ السلام کے مشابہ اور ان کی عمریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر یعنی تینتیس سال ہوں گی۔ ابن عساکر کی ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے جب حضرت عیسیٰ کو آسمان پر اٹھایا گیا تو آپ کی عمر ڈیڑھ سو سال تھی۔ لیکن یہ قول انتہائی ضعیف اور شاذ ہے۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بعض سلف صالحین سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک میں دفن کیا جائے گا۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام گواہی دیں گے کہ انہوں نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا اور خود بھی اس کی عبودیت کا اقرار کیا۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کے آخر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ...... (المائدہ: 116)'' ترجمہ: اور جب پوچھے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے کہا تھا لوگوں سے کہ بنا لو مجھے اور میری ماں کو دو خدا اللہ کے سوا۔ وہ عرض کریں گے پاک ہے تو ہر شریک سے کیا مجال تھی میری کہ میں کہوں ایسی بات، جس کا نہیں ہے مجھے کوئی حق''۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝١٦١ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ

1۔ فتح الباری، کتاب الانبیاء: 477/6 2۔ ایضاً

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

''سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کردیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لیے اور بوجہ روکنے یہود کے اللہ کے راستے سے بہت لوگوں کو۔ اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کیے گئے تھے اس سے اور بوجہ ان کے کھانے کے لوگوں کے مال ناحق اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے ان میں سے عذاب دردناک۔ لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان سے (وہ بھی) اور (جو) مسلمان ہیں ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور صحیح ادا کرنے والے نماز کے اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان لانے والے اللہ اور روز آخرت کے ساتھ یہی ہیں جنہیں عنقریب ہم دیں گے اجر عظیم''۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا: اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان فرمایا ہے کہ اس نے ان پر بہت سی ایسی پاکیزہ چیزیں حرام کردیں جو ان پر پہلے حلال تھیں۔ اور اس کا سبب وہ شنیع جرائم تھے جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے۔ مفسرین کرام نے اس کے دو مفہوم بیان کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ تحریم اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر میں مقرر تھی کہ یہ اللہ کی نازل کردہ کتاب میں تاویل اور تحریف کریں گے اور وہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں ان کو اپنے اوپر حرام کریں گے اور اس طرح اپنی طرف سے ہی اپنے نفسوں پر تشدد اور تنگی لازم کرلیں گے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ تحریم شرعی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تورات میں کچھ چیزوں کو حرام کردیا جو پہلے ان پر حلال تھیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ...... ''ترجمہ: سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کے لیے مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر.... ''یعنی حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنے اوپر اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام کیا تھا۔ اس کے علاوہ باقی تمام کھانے بنی اسرائیل پر حلال تھے۔ پھر تورات میں ان میں سے بعض چیزیں ان پر حرام کردی گئیں۔ جیسا کہ سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا...... (انعام: 146)'' ترجمہ: اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کردیا ہر ناخن والا جانور اور گائے بکری سے ہم نے حرام کی ان پر دونوں کی چربی۔ مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے... ''۔ یعنی ہم نے یہ چیزیں ان پر اس لیے حرام کیں۔ کیونکہ وہ اس کے مستحق تھے۔ اور یہ ان کی اپنی ہی سرکشی، بغاوت، اپنے رسول کی مخالفت اور باہمی افتراق و اختلاف کا سبب اور نتیجہ ہے۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے یہود پر ان کے ظلم ڈھانے کی وجہ سے وہ پاکیزہ چیزیں حرام کردیں جو ان کے لیے حلال تھیں۔

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا: اور دوسری وجہ یہ بیان کی کہ یہ لوگ خود بھی اتباع حق سے گریز کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس سے روکتے تھے۔ اور یہ چیز ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اور وہ قدیم زمانے میں ہی اپنی اس عادت کے ساتھ مشہور تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ رسولوں علیہم السلام کے دشمن تھے۔ انہوں نے بہت سے انبیاء کو قتل کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا: یہاں تیسری وجہ بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سود لینے سے منع کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی اور مختلف حیلے بہانوں سے لوگوں سے سود کھایا اور باطل طریقوں سے لوگوں کے مال کو ہڑپ کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ یعنی ان میں سے وہ لوگ جو دین میں ثابت قدم ہیں اور جن کو علم نافع میں رسوخ حاصل ہے۔ اس کی

تفسیر سورۂ عمران میں گزر چکی ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ کا عطف ''اَلرَّاسِخُوْنَ'' پر ہے۔ اس کی خبر یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرات عبداللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، اسد بن مسعید، اسد بن عبیدؓ کے بارے میں نازل ہوئی جو یہودیت کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے اور حضور ﷺ پر نازل شدہ احکام کی تصدیق کی۔

وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ: تمام آئمہ کرام کے مصاحف نیز ابی بن کعب کے مصحف میں بھی ''اَلْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ'' لکھا ہوا ہے۔ اور ابن جریر کے قول کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں ''وَالْمُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ'' ہے۔ علامہ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ پہلے ائمہ کرام کی قرأت ہی صحیح ہے۔ پھر آپ نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جن کا گمان تھا کہ یہ کتابت کی غلطی کی وجہ سے لکھا گیا ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا قول تو یہ ہے کہ یہ مدح کے طور پر منصوب ہے جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (البقرہ: 177) ''ترجمہ: اور جو پورا کرتے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں اور کمال نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت''۔ اور یہ اسلوب کلام عرب میں عام پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے۔

لَا يَبْعُدَنْ قَوْمِي الَّذِيْنَ هُمْ اُسْدُ الْعُدَاةِ وَآفَةُ الْجَزْرِ
اَلنَّازِلِيْنَ بِكُلِّ مُعْتَرَكٍ وَالطَّيِّبُوْنَ مَعَاقِدَ الْاَزْرِ

میری وہ قوم ہلاک نہ ہو جو دشمنوں کے لیے زہر قاتل، اور اونٹوں کے لیے مصیبت ہے۔ ہر معرکہ میں نازل ہوتی ہے۔ اور وہ پاک دامن ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مجرور ہے۔ اور اس کا عطف ماقبل یعنی بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یعنی وہ نماز کو قائم کرنے پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اس کے فرض ہونے کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ یا اس سے مراد فرشتے ہیں۔ یہی ابن جریر کا مختار قول ہے اور معنی یہ ہوگا کہ وہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور فرشتوں پر بھی۔ لیکن ان کا یہ قول محل نظر ہے۔

وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں زکوٰۃ سے مراد صرف مال کی زکوٰۃ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں اس سے مراد جان کی زکوٰۃ ہو۔ اور بیک وقت یہ دونوں چیزیں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم

وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ: یعنی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور اچھے و برے اعمال کی جزاء و سزا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں۔ جنہیں ہم اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

''بے شک ہم نے وحی بھیجی آپ کی طرف جیسے وحی بھیجی ہم نے نوح علیہ السلام کی طرف اور ان نبیوں کی طرف جو نوح علیہ السلام کے بعد آئے۔ اور (جیسے) وحی بھیجی ہم نے ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام

اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰ علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، یونس علیہ السلام، ہارون علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی طرف اور ہم نے عطا فرمائی داؤد علیہ السلام کو زبور۔ اور (جیسے وحی بھیجی) دوسرے رسولوں پر جن کا حال بیان کر دیا ہے ہم نے آپ سے اس سے پہلے اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر ہم نے اب تک آپ سے نہیں کیا اور کلام فرمایا اللہ نے موسیٰ سے خاص کلام (بھیجے ہم نے یہ سارے) رسول خوشخبری دینے کے لیے اور ڈرانے کے لیے تاکہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر رسولوں کے (آنے کے بعد) اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے (کوئی تسلیم نہ کرے تو اس کی مرضی)''۔

اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سکن اور عدی بن زید نے کہا اے محمد! ہمیں معلوم نہیں کہ حضرت موسیٰ کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل کی ہو تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ...... (النساء:153) جب نازل فرمائی اور رسول اللہ ﷺ نے یہود کے سامنے اس کی تلاوت فرمائی اور ان کو ان کے اعمال خبیثہ سے آگاہ کیا تو انہوں نے اللہ کے نازل کردہ کلام کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی نہ موسیٰ پر نہ عیسیٰ پر اور نہ ہی کسی اور نبی پر۔ رسول اللہ ﷺ رانوں کے اردگرد ہاتھوں کا دائرہ بنائے ہوئے بیٹھے تھے۔ آپ یہ سن کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ کسی ایک پر بھی نازل نہیں کیا۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ...... (انعام:91)'' ترجمہ: اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا......''۔ لیکن محمد بن کعب قرظی کا یہ قول محل نظر ہے۔ کیونکہ یہ سورۂ انعام کی آیت ہے جو کہ مکیہ ہے اور سورۂ نساء کی مندرجہ بالا آیات مدنیہ ہیں۔ اور یہ آیات یہودیوں کے رد میں نازل ہوئیں جس وقت انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ان پر کتاب نازل کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے عیوب اور ہرزہ سرائیاں بیان کیں اور ان کے کذب و افتراء کا پول کھولا۔ اور پھر اس کے بعد ذکر کیا کہ اس نے اپنے محبوب بندے اور رسول محمد ﷺ پر وحی نازل فرمائی۔ جیسا کہ آپ سے پہلے انبیاء پر وحی نازل فرمائی۔ زبور اس کتاب کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل فرمائی۔ انبیاء کے احوال اور واقعات سورۂ انبیاء میں ذکر کریں گے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ: یعنی کچھ رسولوں کا ذکر ہم اس آیت کے نازل کرنے سے پہلے مکی سورتوں میں ذکر کر چکے ہیں۔ وہ انبیاء جن کے اسماء مبارکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ذکر کیے ہیں۔ حضرت آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب، یوسف، ایوب، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلیمان، الیاس، الیسع، زکریا، یحیٰ، عیسیٰ، اکثر مفسرین کے نزدیک ذوالکفل علیہم السلام اور ان سب کے آقا و مولیٰ حضرت محمد ﷺ۔

وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ: یعنی ان کے علاوہ بہت سے انبیاء کرام ایسے بھی ہیں جن کا قرآن پاک میں ذکر نہیں۔ اسی وجہ سے انبیاء اور رسل کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کے بارے میں حضرت ابوذر ذکر کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! انبیاء کتنے ہیں۔ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے عرض کی ان میں سے رسول کتنے ہیں۔ فرمایا تین سو تیرہ۔ میں نے عرض کی ان میں سب سے پہلا کونسا ہے۔ فرمایا حضرت آدمؑ۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ! کیا وہ نبی مرسل ہیں۔ فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور ان میں اپنی خاص روح پھونکی اور پھر ان کے اعضاء کو برابر کیا۔ پھر فرمایا اے ابوذر! ان میں سے چار سریانی ہیں۔ حضرت آدم، شیث، نوح، خنوخ (ان کا مشہور نام ادریس ہے۔) یہ وہی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھا۔ ان میں چار عربی ہیں۔ حضرت ہود، صالح، شعیب، اور ہمارے نبی بنی اسرائیل میں سے سب سے پہلے نبی حضرت موسیٰ اور آخری نبی حضرت عیسیٰ ہیں۔ تمام

نبیوں میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم اور آخری ہمارے نبی ہیں۔ اس طویل حدیث کو ابن حبان نے اپنی کتاب "انواع التقسیم" میں ذکر کیا ہے۔ اور اس کے راوی ابراہیم بن ہشام کو وضع حدیث سے متہم کیا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے دوسرے ائمہ حدیث نے بھی ان پر جرح کی ہے۔ یہی حدیث ایک دوسری سند سے حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے۔ لیکن اس سند میں معان بن رفاعہ سلامی اور علی بن یزید دونوں راوی ضعیف ہیں۔ اسی طرح اس کے ایک اور راوی قاسم بن ابوعبدالرحمٰن بھی ضعیف ہیں۔ مسند ابی یعلی میں حضرت انسؓ بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار نبی مبعوث فرمائے۔ چار ہزار بنی اسرائیل کی طرف اور باقی تمام لوگوں کی طرف۔ لیکن یہ سند بھی ضعف سے خالی نہیں۔ اس میں ربذی اور اس کے شیخ رقاشی دونوں ضعیف ہیں۔ ابو یعلی کی ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا آٹھ ہزار میرے نبی بھائی گزر چکے ہیں۔ ان کے بعد (حضرت) عیسیٰ آئے اور ان کے بعد میں آیا۔ ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا مجھے آٹھ ہزار انبیاء کے بعد مبعوث کیا گیا۔ ان میں چار ہزار بنی اسرائیل میں آئے۔ یہ سند اگرچہ غریب ہے لیکن اس کے تمام راوی معروف ہیں سوائے احمد بن طارق کے کہ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ان کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے بارے میں مجھے کوئی خبر نہیں۔

انبیاء کی تعداد کے بارے میں حضرت ابوذر کی حدیث: حضرت ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں میں مسجد نبوی میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ تنہا تشریف فرما ہیں میں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ نماز بہترین چیز ہے اس میں زیادتی کرو یا کمی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کونسا ہے۔ فرمایا اللہ پر ایمان لانا اور جہاد کرنا۔ عرض کی سب سے افضل مومن کون ہے؟ آپ نے فرمایا جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ عرض کی یا رسول اللہ! سب سے زیادہ محفوظ مسلمان کون ہے۔ فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ! سب سے افضل ہجرت کونسی ہے۔ فرمایا برائیوں کو چھوڑنا۔ عرض کی یا رسول اللہ! سب سے افضل نماز کونسی ہے۔ جس میں قیام لمبا کیا جائے۔ عرض کی یا رسول اللہ! کیا غلام آزاد کرنا افضل ہے۔ فرمایا جس کی قیمت بہت زیادہ ہو اور اپنے مالک کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ میں نے عرض کی کونسا صدقہ افضل ہے۔ فرمایا، کم مال والے کا کوشش سے صدقہ کرنا اور چپکے سے فقیر کو دے دینا۔ میں نے عرض کی سب سے عظیم آیت کونسی ہے۔ فرمایا آیت الکرسی۔ پھر ارشاد فرمایا اے ابوذر! کرسی کے سامنے سات آسمانوں کی حیثیت اس طرح ہے جس طرح چٹیل میدان میں پڑا ہوا چھوٹا سا حلقہ۔ اور عرش کو کرسی پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح چٹیل میدان کو اس حلقہ پر۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! انبیاء کتنے ہیں۔ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ عرض کی کہ ان میں سے رسول کتنے ہیں۔ فرمایا تین سو تیرہ اور یہ ایک بہت بڑی پاکیزہ جماعت ہے۔ میں نے عرض کی ان میں سے سب سے پہلے کون ہے۔ فرمایا آدم۔ میں نے عرض کی کیا وہ نبی مرسل ہیں۔ فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور ان میں اپنی روح پھونکی۔ انکے اعضاء کو معتدل بنایا۔ پھر فرمایا اے ابوذر! ان میں سے چار سریانی ہیں۔ (حضرت) آدم، شیث، خنوخ (ادریس) اور انہوں نے یہ سب سے پہلے قلم کے ساتھ لکھا۔ نوح اور چار عربی ہیں۔ حضرت ھود، حضرت شعیب، حضرت صالح اور اور تمہارے نبی اے ابوذر۔ بنی اسرائیل کے پہلے نبی موسیٰ ہیں اور آخری عیسیٰ ہیں۔ سب سے پہلے رسول حضرت آدم اور آخری حضرت محمد ﷺ۔ میں نے عرض کی اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں۔ فرمایا ایک سو چار۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیث پر پچاس، حضرت خنوخ پر تیس، اور حضرت ابراہیم پر دس صحیفے نازل فرمائے۔ حضرت موسیٰ پر تورات سے پہلے دس صحیفے نازل فرمائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل، زبور اور فرقان کو نازل فرمایا۔ میں نے عرض کی صحف ابراہیم میں کیا تھا۔ فرمایا ان تمام کا لب

لباب یہ تھا'' اے مغرور اور آزمائش میں مبتلا بادشاہ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بھیجا کہ تو دنیا کو جمع کرے بلکہ میں نے تو تمہیں اس لیے بھیجا ہے تا کہ تو مظلوم کی پکار کو مجھ سے ہٹا دے۔ کیونکہ میں مظلوم کی پکار کو رد نہیں کرتا خواہ وہ کافر ہی ہو۔ اور ان میں یہ بھی تھا کہ عاقل کو چاہیے کہ وہ اپنے اوقات کو مختلف حصوں میں تقسیم کرے۔ کچھ وقت اپنے رب کے ساتھ مناجات کرنے کے لیے، اور کچھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کے لیے اور کچھ اللہ کی صنعت میں غور و فکر کرنے کے لیے، اور کچھ ضرورت کے مطابق کھانے پینے کے لیے مقرر کر لے۔ صاحب عقل کو چاہیے کہ اپنے آپ کو تین باتوں میں مصروف رکھے۔ توشہ آخرت کے حصول، یا گزر اوقات کے لیے تگ و دو، یا غیر حرام چیزوں میں لذت حاصل کرنے میں۔ عقلمند کو چاہیے کہ وہ اپنے وقت کا خیال رکھے، اپنے حال میں مست رہے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔ اور جو شخص اپنے عمل کے مطابق اپنی کلام کا حساب رکھے تو اس کا کلام انتہائی قلیل ہوگا۔ ہاں وہ مفید چیزوں میں موقع و محل کے مطابق گفتگو کر سکتا ہے۔ میں نے عرض کی حضرت موسیٰ کے صحف میں کیا تھا۔ فرمایا کہ اس میں عبرتیں ہی عبرتیں تھیں۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جسے موت کا یقین ہے اور پھر وہ مسکراتا ہے، تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے اور پھر اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کی بے ثباتی کو دیکھتا ہے اور پھر اس پر مطمئن ہو کر بیٹھتا ہے۔ اور تعجب ہے اس شخص پر جو قیامت کے دن حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا۔ میں نے عرض کی کہ حضرت ابراہیم اور موسیٰ کی تعلیمات کا کچھ حصہ قرآن پاک میں بھی نازل ہوا آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ یہ آیت پڑھو! قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ: 14) میں نے عرض کی مجھے نصیحت فرمائیے۔ فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور تمہارے ہر عمل کی یہی بنیاد ہے۔ میں نے عرض کی مزید نصیحت فرمائیے۔ فرمایا تلاوت قرآن اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہو۔ یہ آسمان میں تمہارے لیے مقبولیت اور زمین میں تمہارے لیے نور کا باعث ہوگا عرض کی مزید فرمائیے۔ فرمایا بہت زیادہ ہنسنے سے بچو کیونکہ یہ دل کو مردہ اور چہرے سے نور کو دور کر دیتا ہے۔ عرض کی مزید ارشاد فرمائیے۔ فرمایا کہ جہاد کو لازم پکڑو کیونکہ یہی میری امت کی رہبانیت ہے۔ عرض کی مزید ارشاد فرمائیے۔ فرمایا اچھی بات کے علاوہ خاموشی اختیار کرو۔ کیونکہ خاموشی سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اور یہ دینی معاملات میں معاون و مددگار ہوتی ہے۔ عرض کی کچھ اور فرمائیے۔ فرمایا اپنے سے نچلے درجے والے کی طرف دیکھو اور اپنے اوپر لے درجے کی طرف نہ دیکھو۔ اس طرح تم اللہ کی نعمتوں کو حقیر نہیں جانو گے۔ عرض کی کچھ اور فرمائیے۔ فرمایا کہ مساکین سے محبت کرو اور ان کے ساتھ بیٹھا کرو۔ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو حقیر نہیں جانو گے۔ عرض کی اور کچھ بیان فرمائیں۔ فرمایا قریبی رشتہ داروں سے تعلق قائم کرو اگرچہ وہ تجھ سے تعلق توڑیں۔ عرض کی کچھ اور فرمائیے۔ فرمایا کہ حق بیان کرو اگرچہ کڑوا ہو۔ عرض کی اور۔ فرمایا کہ اللہ بارے میں کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈرو۔ میں نے عرض کی اور۔ فرمایا کہ اپنے نفس کے عیوب میں غور و فکر کرو گے تو تمہیں لوگوں کے عیوب نظر نہیں آئیں گے۔ جس امر کو تم پسند کرتے ہو لوگوں سے اس کے کرنے پر ناراض نہ ہو۔ اور تیرے لیے یہی عیب کافی ہے کہ تو لوگوں کے عیب کو جانے لیکن اپنے نفس کے عیوب سے غافل ہو۔ پھر آپ نے اپنا دست مبارک میرے سینے میں مار کر فرمایا تدبیر کی مثل کوئی عقل نہیں۔ حرام چیزوں سے رکنے کی مثل کوئی پرہیزگاری اور حسن خلق کی مثل کوئی حسب و نسب نہیں (1)۔ مسند امام احمد میں بھی یہ حدیث کچھ اختصار کے ساتھ مروی ہے۔ حضرت ابو وداک روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے مجھ سے پوچھا کیا خارجی دجال کے قائل ہیں۔ میں نے عرض کی نہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں ایک ہزار بلکہ اس سے زیادہ نبیوں کے بعد آنے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اس نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا۔ لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ علامات بتا دیں جو کسی

1۔ مسند احمد: 265/5

کو نہیں بتائیں۔ فرمایا دجال بھینگا ہے، تمہارا رب ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی دائیں آنکھ بھینگی اور اوپر کو اٹھی ہوئی ہے۔ جیسے چونے کی سفید دیوار پر سینڈ لگا ہوا ہو۔ اس کی بائیں آنکھ چمکتے ستارے کی طرح ہے۔ وہ ہر زبان میں گفتگو کرے گا۔ اس کے پاس سرسبز جنت کی صورت ہوگی۔ جس میں پانی رواں ہوگا۔ اور اسی طرح نار جہنم کی سیاہ اور دھواں والی صورت ہوگی (1)۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ انبیاء کا خاتم ہوں۔ ہو سکتا ہے اس میں ہزار کا لفظ زائد ہو کیونکہ دوسری روایت میں ذکر ہے کہ میں ایک ہزار یا اس سے زیادہ نبیوں کا خاتم ہوں۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا: یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم کی صفت سے مشرف فرمایا ہے۔ ایک شخص ابو بکر بن عیاشؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے ایک شخص کو آیت کے اس حصے کو اس طرح وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اس طرح صرف کافر کر سکتے ہیں۔ پھر فرمایا میں نے اعمش سے، اعمش نے یحییٰ بن وثاب سے، انہوں نے عبدالرحمٰن سلمی، انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب سے اور حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا پڑھا۔ حضرت ابو بکر بن عیاشؒ اس لیے سخت ناراض ہوئے تھے کیونکہ اس طرح پڑھنے سے قرآن پاک کی لفظی اور معنوی تحریف ہوتی ہے۔ شاید یہ کوئی معتزلی ہو جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نہ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور نہ ہی اپنی مخلوق میں سے کسی اور سے۔ ایک معتزلی نے کسی بزرگ کے سامنے كَلَّمَ اللّٰهَ (بالنصب) مُوْسٰى تَكْلِيْمًا پڑھا تو انہوں نے فرمایا اے ناہنجار! تم نے یہاں تو اللہ کے کلام میں تحریف کر دی لیکن اس آیت: وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ (الاعراف: 143) میں کیا کرو گے۔ کیونکہ اس میں تاویل وتحریف کی کوئی گنجائش نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلام سے مشرف فرمایا تو آپ رات کی تاریکی میں چٹان پر چلتی ہوئی چیونٹی کو بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ یہ حدیث غریب ہے۔ اس کی اسناد صحیح نہیں۔ مگر اس کو موقوف تسلیم کر لیا جائے تو یہ اچھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اس دن آپ نے صوف کا جبہ، شلوار پہنی اور صوف ہی کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ اور آپ نے گدھے کی جلد کے نعلین پہن رکھے تھے جسے ذبح کے ذریعے پاک نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تین دن میں ایک لاکھ چالیس ہزار کلمات کے ساتھ کلام کیا یہ تمام کے تمام نصائح تھے۔ لیکن اس روایت کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس کے راوی جویبر انتہائی ضعیف ہیں اور ضحاک کی حضرت ابن عباسؓ سے ملاقات ثابت نہیں حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ جبل طور پر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا تو یہ اس کلام کے برعکس تھا جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کے ساتھ اس دن فرمایا جب موسیٰ نے اللہ کو پکارا تھا۔ جب حضرت موسیٰ نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے موسیٰ میں نے تو ابھی تم سے دس ہزار زبانوں کی قوت سے کلام کیا ہے حالانکہ میرے پاس تمام زبانوں کی قوت بلکہ اس سے بھی زیادہ قوت موجود ہے۔ جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی طرف لوٹے تو وہ آپ سے کلام ربانی کے وصف کے بارے میں پوچھنے لگے۔ آپ نے فرمایا مجھ میں اس کا وصف بیان کرنے کی طاقت نہیں۔ انہوں نے عرض کی کہ کوئی تشبیہ بیان کر دیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے بجلی کے کڑکنے کی آواز نہیں سنی وہ کلام اس کے مشابہ تھی لیکن اس جیسی نہیں تھی۔ اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنے کلام کے سوا تمام زبانوں میں گفتگو کی۔ حضرت موسیٰ نے عرض کی اے باری تعالیٰ! یہ آپ کا کلام ہے۔ فرمایا نہیں۔ اگر میں اپنے کلام کے ساتھ گفتگو کرتا تو

1۔ مسند احمد: 79/3

تم اس کو برداشت نہ کر سکتے۔ عرض کی کیا تیری مخلوق میں سے کسی کا کلام تیرے کلام کے مشابہ ہے۔ یہ روایت بھی حضرت کعب الاحبار پر موقوف ہے۔ اور وہ عموماً گزشتہ کتابوں سے اسرائیل روایت بیان کرتے ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح ہر قسم کی روایات شامل ہوتیں ہیں۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ: یعنی یہ رسول اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والوں کو اس کی رضا اور خوشنودی کی خوش خبری دیتے ہیں اور اس کے حکم کی مخالفت کرنے، اور اس کے رسولوں کو جھٹلانے والے کو عذاب سے ڈراتے ہیں۔

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کو نازل فرمایا اور اپنے رسولوں کو وعدہ و وعید کے ساتھ معبوث فرمایا اور یہ بھی بیان فرمادیا کہ کونسی چیز اس کی رضا اور خوشنودی کا باعث ہے اور کونسی چیز اس کی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا سبب ہے۔ تا کہ کسی معذرت کرنے والے کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ..... (طہٰ:134) ''ترجمہ: اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس سے پہلے تو کہتے اے ہمارے رب کیوں نہ بھیجا ہماری طرف رسول......''۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَوْلَاۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ...... ''ترجمہ: (اور اس کی وجہ یہ ہے) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ان کو پہنچے انہیں کوئی مصیبت ان اعمال کے باعث جو انہوں نے کیے تھے تو وہ یہ کہنے لگے کہ اے رب کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف رسول......''۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیرت مند کوئی نہیں۔ اسی لیے اس نے تمام ظاہری اور باطنی برائیوں کو حرام کیا۔ اس سے بڑھ کر کوئی مدح پسند نہیں اس لیے اس نے اپنی مدح خود کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی عذر قبول اور پسند کرنے والا نہیں۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے نبیوں کو خوشخبری سنانے اور اپنے عذاب سے ڈرانے والے بنا کر معبوث کیا۔ دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور اپنی کتابیں نازل فرمائیں(1)۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

''لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اس کتاب کے ذریعے جو اس نے آپ کی طرف اتاری اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور کافی ہے اللہ تعالیٰ بطور گواہ۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور روکا (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے وہ گمراہ ہوئے اور گمراہی میں دور دور نکل گئے۔ بے شک جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ بخش دے انہیں اور نہ یہ کہ دکھائے انہیں (سیدھی) راہ بجز جہنم کی راہ۔ کے ہمیشہ رہیں گے اس میں ابد تک اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔ اے لوگو! تحقیق آ گیا تمہارے پاس رسول حق کے ساتھ تمہارے رب کی طرف سے پس تم ایمان

1۔ البخاری:72/6، مسلم:100/8

لاؤ یہ بہتر ہے تمہارے لیے اور اگر تم انکار کرو تو بے شک اللہ ہی کا ہے اور جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا''۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ: چونکہ اس سے قبل مذکورآیات میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا اثبات اور مشرکین واہل کتاب میں سے منکرین کا رد تھا۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا کہ آپ کی مخالفت اور تکذیب کرنے والے آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ اللہ تو گواہی دیتا ہے کہ آپ وہی رسول ہیں جن پر اس نے اپنی کتاب قرآن کریم کو نازل فرمایا۔ جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ...... (حم السجدہ:42) ''ترجمہ: اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل اور نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے......''۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس علم کو نازل فرمایا جس پر اپنے بندوں کو مطلع کرنے کا ارادہ فرمایا۔ یعنی اس میں واضح دلائل، ہدایت، فرقان، اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور اس کی ناراضگی اور ناپسندیدگی کے احکام اور ماضی و مستقبل کے بارے میں غیبی علوم اور اپنی ان صفات قدسیہ کو ذکر کیا جن کو نہ تو کوئی نبی مرسل جانتا ہے اور نہ کوئی مقرب فرشتہ۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (البقرہ:255) اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا (طٰہٰ:110) حضرت عطاء بن سائب فرماتے ہیں کہ مجھے ابوعبدالرحمٰن سلمٰی نے قرآن پاک پڑھایا۔ جب ہم میں سے کوئی قرآن پڑھ لیتا تو فرماتے کہ تم نے اللہ کے علم کو حاصل کیا ہے۔ آج تم سے کوئی بھی افضل نہیں سوائے اس کے جو عمل میں تم سے بڑھ جائے۔ پھر یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ فرشتے بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر وحی کی گئی اور آپ پر نازل کیا گیا وہ حق اور سچ ہے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کا ایک گروہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے انہیں ارشاد فرمایا قسم بخدا! مجھے معلوم ہے کہ تم یقیناً جانتے ہو گے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نہیں جانتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ...... (النساء:166) نازل فرمائی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یعنی ان لوگوں نے ایک تو بذات خود کفر اختیار کیا اور حق کی اتباع نہ کی اور دوسرا لوگوں کو حق کی اتباع سے روکا۔ اس طرح یہ لوگ حق سے بہت دور نکل گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات، کتابوں اور رسولوں کے منکرین اور اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے کی سزا بیان کی ہے کہ وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا اور نہ ہی اس کی نیکی اور بھلائی کے راستے کی طرف راہنمائی کرے گا سوائے جہنم کے راستے کے اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ یہ استثناء منقطع ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جہنم میں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ چیز بہت آسان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ: اے لوگو! تمہارے پاس محمد ﷺ اللہ کی طرف سے ہدایت، دین حق اور واضح بیان کو لے کر تشریف لائے۔ پس تم اگر ان پر ایمان لے آؤ اور ان کی اتباع کرو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔

وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یعنی اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم اور تمہارے ایمان سے مستغنی ہے۔ تمہارا کفر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ (ابراہیم:8) ''ترجمہ: نیز یہ بھی فرمایا موسیٰ نے اگر تم ناشکری کرنے لگو اور جو بھی سطح زمین پر ہے، ناشکری کرے تو بے شک اللہ تعالیٰ اور سب تعریفوں کا

مستحق ہے"۔ اور یہاں بیان فرمایا۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: یعنی اسے بخوبی علم ہے کہ تم میں جو ہدایت کا مستحق ہے اسے ہدایت عطا فرما دیتا ہے اور جو ضلالت و گمراہی کا مستحق ہوا سے اس راہ پر ڈال دیتا ہے۔ اس کے تمام اقوال و افعال شرعی احکام اور قضا و قدر سب حکمت پر مبنی ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

"اے اہل کتاب نہ غلو کرو اپنے دین میں اور نہ کہو اللہ تعالیٰ کے متعلق مگر سچی بات بیشک مسیح عیسیٰ علیہ السلام پسر مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ جسے اللہ نے پہنچایا تھا مریم کی طرف اور ایک روح تھی اس کی طرف سے پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور نہ کہو تین (خدا ہیں) باز آ جاؤ (ایسا کہنے سے) یہ بہتر ہے تمہارے لیے بے شک اللہ تو معبود واحد ہی ہے پاک ہے وہ اس سے کہ ہو اس کا کوئی لڑکا اسی کا (ملک) ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز"۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو دین کے معاملے میں غلو کرنے اور حد سے زیادہ تجاوز کرنے سے منع کر رہا ہے۔ اور نصاریٰ میں یہ چیز بہت پائی جاتی ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو اس مقام و مرتبہ سے بھی بلند کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے آپ کو مقام نبوت سے نکال کر معبود بنا دیا اور خدا کی طرح پوجا کرنے لگے اور بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے تو حضرت عیسیٰ کے متبعین اور حواریوں کے بارے میں انتہائی غلو سے کام لیا حتیٰ کہ ان کو گناہوں سے معصوم جاننے لگے اور آنکھیں بند کر کے ان کے ہر قول کی اتباع کرنے لگے خواہ وہ حق ہو یا باطل، گمراہی ہو یا ہدایت، شر ہو یا جھوٹ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ "ترجمہ: انہوں نے بنا لیا اپنے پادریوں اور راہبوں کو پروردگار اللہ کو چھوڑ کر"۔ حضرت عمر روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اس طرح نہ بڑھانا جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کر بڑھایا۔ میں تو اللہ کا بندہ ہوں مجھے عبد اللہ اور رسول اللہ کہہ کر پکارنا(1)۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی اے محمد! (ﷺ) اے ہمارے سردار، اے ہمارے سردار کے بیٹے! ہم میں سے سب سے بہتر کے بیٹے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! سوچ سمجھ کو بولو کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔ میں محمد بن عبد اللہ، اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ خدا کی قسم میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس مقام و مرتبہ سے بلند کرو جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے(2)۔

وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: اللہ تعالیٰ پر افترا نہ باندھو۔ اس کے لیے بیوی اور بچے کا عقیدہ نہ رکھو۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے منزہ اور بالاتر ہے۔ وہ اپنی عظمت اور کبریائی میں یکتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ ہی اس کے سوا کوئی پروردگار ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ: یعنی حضرت مسیح اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ اور اس کی مخلوق کا ایک فرد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلمہ

1۔ مسند احمد: 23/1، البخاری: 204/4 2۔ مسند احمد: 153/3

کن کہنے سے پیدا ہوئے، اس کے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو مریم کی طرف القاء کیا یعنی آپ کو اس کلمہ کے ذریعے پیدا کیا جس کے ساتھ جبرائیل کو مریم کی طرف بھیجا۔ انہوں نے اپنے رب کے حکم سے ان میں اس روح کو پھونک دیا۔ اور یہ پھونک حضرت جبرائیل نے حضرت مریم کے سینہ پر ماری تھی۔ جس کی وجہ سے آپ حاملہ ہوئیں اور حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ اس لیے حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ والد کے ذریعہ پیدا نہیں ہوئے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو بھیجا تھا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے میں بھی اسی مفہوم کو بیان کیا ہے: مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ...... ''ترجمہ: نہیں مسیح ابن مریم مگر ایک رسول۔ گزر چکے ہیں اس سے پہلے بھی کئی رسول.....''۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ''ترجمہ: بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت آدم کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے، پھر فرمایا اسے ہو جا تو ہو گیا۔ وَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا...... ''ترجمہ: اور یاد کرو اس خاتون کو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو۔ پس ہم نے پھونک دیا اس میں اپنی روح سے اور ہم نے بنایا اسے اور اس کے بیٹے کو سارے جہاں والوں کے لیے نشانی''۔ مَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا'' ترجمہ: مریم دختر عمران ہی ہے جس نے اپنے گوہر عصمت کو محفوظ ہی رکھا.....''۔ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ'' ترجمہ: نہیں ہے عیسیٰ مگر ایک بندہ ہم نے انعام فرمایا ان پر.....'' حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ القائے کلمہ سے مراد کن فیکون ہے۔ شاذ بن بن یحییٰ فرماتے ہیں کہ وہ کلمہ حضرت عیسیٰ نہیں بن گیا بلکہ اس کلمہ سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ اور یہ قول ابن جریر کے قول سے بہتر ہے۔ انہوں نے اَلْقٰهَاۤ اِلٰی مَرْیَمَ کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ وہ کلمہ جبرائیل نے حضرت مریم کو سکھا دیا اسی طرح آیت کریمہ: اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (آل عمران: 45) کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ اے مریم اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا کلمہ سکھاتا ہے۔ لیکن صحیح قول یہی ہے کہ اس سے مراد وہی کلمہ ہے جو حضرت جبرائیل حضرت مریم کے پاس لے کر آئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان میں پھونکا۔ جس کی وجہ سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے یہ گواہی دی کہ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں۔ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول، کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ جنت حق ہے اور جہنم حق ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ خواہ اس کے اعمال کیسے ہوں گے۔ (1) ایک روایت میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دے گا۔ وہ جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔ اس آیت کریمہ اور حدیث شریف میں ''وَرُوْحٌ مِّنْهُ'' کے الفاظ کا یہی مفہوم ہے جو کہ اس آیت کریمہ: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ'' ترجمہ: اور اس نے مسخر کر دیا جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین سے سب کا سب اپنے حکم سے'' کا ہے۔ یعنی یہ روح اللہ کی مخلوق ہے اور خاص اس کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ یہاں ''مِنْ'' برائے تبعیض نہیں ہے۔ جیسا کہ نصرانیوں کا یہ قول ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا جز خیال کرتے ہیں۔ بلکہ یہاں لفظ مِنْ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ''رَسُوْلٌ مِنْهُ'' یعنی اس کی طرف سے رسول۔ اور بعض نے اس کا معنی مَحَبَّةٌ مِنْهُ۔ لیکن پہلا قول ہی زیادہ اظہر ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ کی تخلیق شدہ روح سے پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس روح کی نسبت اپنی ذات کی طرف اس کی عظمت بیان کرنے کے لیے کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور خانہ کعبہ کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ (الاعراف: 73)'' ترجمہ: یہ اونٹنی اللہ کی ہے''۔ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ (الحج: 26)'' ترجمہ: میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک رکھو''۔ اسی طرح ایک صحیح حدیث کے الفاظ ہیں'' میں اپنے

1۔ البخاری: 201/4، مسلم: 42/1

رب کے پاس اس کے گھر میں جاؤں گا'' یہاں بھی اضافت تشریفیہ ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: یعنی اس بات کی تصدیق کرو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ کوئی بیوی اور یہ یقین کرلو کہ حضرت عیسیٰ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اسی لیے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ (حضرت) عیسیٰ وران کی والدہ کو اللہ کے ساتھ شریک نہ بناؤ۔ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ اور مبرا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تو یہ ارشاد فرمایا اور سورۂ مائدہ میں یہ ارشاد فرمایا: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدہ: 73) اور اسی سورت کے آخر میں ارشاد فرمایا: وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ...... ''ترجمہ: اور جب پوچھے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ بنالو مجھے اور میری ماں کو دو خدا اللہ کے سوا......''۔ اور اس سورت کی ابتداء میں ارشاد فرمایا: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (المائدہ: 17)۔ نصاریٰ کی جہالت کی انتہا ہے کہ ان کے کفر کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی ضابطہ۔ بلکہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کے اقوال اور گمراہ کن عقیدے ہیں۔ بعض تو آپ کو اِلٰہ سمجھتے ہیں۔ بعض اللہ کا شریک اور بعض اللہ کا بیٹا۔ اس طرح ان کے مختلف گروہ اور ان کی مختلف آراء ہیں کسی بزرگ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ اگر دس نصرانی جمع ہو جائیں وہ گیارہ مختلف آراء میں بٹ جائیں گے۔ سعید بن بطریق اسکندری، جس کا زمانہ تقریباً چوتھی صدی ہجری ہے، نے ذکر کیا ہے کہ نصرانیوں کے مشہور بادشاہ قسطنطین، بانی قسطنطنیہ، کے زمانہ میں نصرانی علماء کی ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی۔ جس میں دو ہزار سے زیادہ پادری شریک ہوئے۔ ان کی آراء میں اس قدر اختلاف تھا کہ یہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ اگر پچاس آدمی ایک رائے پر متفق ہوئے تو اس کے مقابلہ میں بیس دوسری رائے پر ہوئے۔ اسی طرح اگر سو کا ایک قول پر اتفاق ہوا تو ستر کا دوسرے قول پر۔ الغرض اتنی بڑی تعداد میں سے صرف تین سو اٹھارہ ایک رائے پر متفق ہو سکے۔ بادشاہ نے صرف اسی رائے کو لے لیا اور باقی آراء کو چھوڑ کر اسی کی تائید ونصرت کی۔ بادشاہ بڑا فلفسی اور شاطر تھا۔ اس نے باقی تمام اقوال اور آراء کو سرے سے ہی ختم کر دیا اور اپنے اس عقیدے کو رائج کرنے کے لیے کنیسے بنائے۔ کتابیں لکھوائیں، قانون وضع کیے۔ ان پادریوں نے اسی زمانے میں امانت کبریٰ کا عقیدہ وضع کیا اور اپنے چھوٹے بچوں کو اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ تاکہ یہ عقیدہ ان کے دل ودماغ میں راسخ ہو جائے۔ ان لوگوں کو ملکیہ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری کانفرنس کی جس میں یعقوبیہ نامی نیا فرقہ معرض وجود میں آیا۔ تیسری کانفرنس میں میں نسطوریہ فرقے کا ظہور ہوا۔ یہ تینوں فرقے حضرت مسیح کے بارے میں اقانیم ثلاثہ کو ثابت کرتے ہیں۔ لیکن اس کی کیفیت میں ان کا اختلاف ہے۔ اسی طرح لاہوت اور ناسوت کے بارے میں اپنے گمان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ کیا یہ دونوں حضرت عیسیٰ کے بارے متحد ہو گئے یا نہیں۔ یہ تینوں فرقے ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تینوں کافر ہیں۔

اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ: ان برے عقائد سے بعض آجاؤ اللہ تعالیٰ تو صرف ایک ہی ہے۔ اس کی ذات اس چیز سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: یعنی ہر چیز اس کی ملکیت اور اس کی مخلوق ہے۔ زمین اور آسمان میں ہر چیز اس کی تابع اور فرمانبردار ہے۔ وہ ہر چیز کا کارساز اور نگران ہے۔ تو پھر اس مخلوق میں سے کوئی اسی کی بیوی اور بیٹا کیسے ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ایک آیت میں ارشاد فرمایا: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...... (الانعام: 101) اور سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (مریم: 88)۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ

عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝

''ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلد ہی جمع کرے گا ان سب کو اپنے ہاں۔ پھر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اجر اور زیادہ بھی دے گا انہیں اپنے فضل (وکرم) سے لیکن جنہوں نے عار سمجھا (بندہ بننے کو) اور تکبر کیا تو عذاب دے گا انہیں دردناک عذاب اور نہ پائیں گے اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار''۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ: حضرت ابن عباسؓ اس کا معنی بیان فرماتے ہیں کہ حضرت مسیح اللہ کا بندہ ہونے میں اپنے آپ کو بڑا خیال نہیں کریں گے۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ انہیں اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوگی۔ بعض حضرات نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں۔ لیکن ان کا استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ یہاں ملائکہ کا عطف مسیح پر ہے اور استنکاف کا معنی رکنا ہے اور فرشتوں میں یہ قدرت حضرت مسیحؑ سے زیادہ ہے اسی لیے یہاں ان کا عطف کیا گیا ہے اور رکنے پر زیادہ قادر ہونے سے ان کی افضلیت لازم نہیں آتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس طرح لوگ حضرت مسیحؑ کی پوجا کرتے تھے اسی طرح وہ فرشتوں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمادیا کہ یہ فرشتے بھی اس کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: ''وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ'' ترجمہ: اور کفار کہتے ہیں بنا لیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا یہ کیونکر ہو سکتا ہے بلکہ وہ تو اس کے معزز بندے ہیں''۔ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ: یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کو اپنے سامنے جمع فرمائے گا اور ان کے درمیان عادلانہ فیصلہ فرمائے گا۔ جس میں کسی پر ظلم وستم نہ ہوگا۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک اعمال کے مطابق انہیں اجر وثواب عطا فرمائے گا۔ بلکہ اپنے خاص فضل واحسان اور رحمت واسعہ سے مزید انعام بھی فرمائے گا۔ ایک مرفوع حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی وضاحت فرمائی ہے کہ ''اُجُوْرَهُمْ'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل فرمائے گا۔ اور زیادتی فضل کا معنی یہ ہے کہ جن لوگوں کے لیے نار جہنم واجب ہو چکی ہوگی ان کے لیے ان لوگوں کی شفاعت قبول فرمالے گا جن کے ساتھ انہوں نے دنیا میں کوئی احسان کیا ہوگا۔ لیکن اس کی سند ثابت نہیں ہاں اگر اس کو عبداللہ بن مسعودؓ پر موقوف مانا جائے تو ٹھیک ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا: اور وہ لوگ جو اللہ کی اطاعت اور عبادت سے رکے رہے اور تکبر کرتے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے سوا کوئی معاون ومددگار نہیں پائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ'' ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل وخوار ہو کر''۔ یہ لوگ اس طرح اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے اور تکبر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ان کو ذلیل وخوار کرکے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝

''اے لوگو! آ چکی ہے تمہارے پاس ایک (روشن) دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے اتارا ہے تمہاری طرف نور درخشاں۔ تو جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ (کی رسی) کو تو عنقریب داخل کرے گا اپنی رحمت اور فضل میں اور پہنچائے گا انہیں اپنی طرف لے جانے والی سیدھی راہ پر)''۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ: اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ تمہارے پاس میری ایک بہت بڑی دلیل آ گئی ہے اور یہ وہ دلیل ہے جو ہر قسم کے عذر کو ختم کرنے والی اور تمام قسم کے شکوک وشبہات کو زائل کرنے والی ہے۔

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا: ہم نے تمہاری طرف ایسا روشن نور نازل کیا ہے جو حق کو واضح کرنے والا ہے۔ ابن جریج اور کئی دوسرے مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس نور سے مراد قرآن ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ: یعنی وہ لوگ جو اللہ کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تمام امور میں اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور قرآن پاک کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔

فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ: تو اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرما کر انہیں جنت میں داخل فرمائے گا اور کئی گنا اجر وثواب عطا فرمائے گا اور اپنے خاص فضل واحسان سے ان کے درجات کو بلند فرمائے گا۔

وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: یعنی ان کی راہنمائی ایسی واضح اور سیدھے راستے کی طرف فرمائے گا جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو گی۔ دنیا وآخرت میں مومن کی یہ صفت ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنے تمام عقائد واعمال میں سلامتی اور استقامت کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ اور آخرت میں اس صراط مستقیم پر گامزن ہوگا جو اسے جنت میں پہنچا دے گا۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی سیدھی راہ اور مضبوط رسی قرآن ہی ہے(1)۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

''فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے آپ فرمایئے اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے تمہیں کلالہ (کی میراث) کے بارے میں اگر کوئی ایسا آدمی فوت ہو جائے نہ ہو اس کی کوئی اولاد اور اس کی ایک بہن ہو تو بہن کا نصف حصہ ہے اس کے ترکہ سے اور وہ وارث ہوگا اپنی بہن کا اگر نہ ہو اس کی بہن کی کوئی اولاد پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا اس سے جو اس نے چھوڑا اور اگر وارث

1۔ تحفۃ الاحوذی: 218/8

ہوں بہن بھائی مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد (بھائی) کا حصہ دو عورتوں (بہنوں) کے حصے کے برابر ہے صاف صاف بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے (اپنے) احکام تا کہ گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ: حضرت براء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی سب سے آخری نازل ہونے والی سورت سورۂ برأت ہے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ''یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ'' ہے(1)۔حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف لائے۔میں اس وقت بیمار تھا اور بے ہوش پڑا تھا۔آپ نے وضو فرمایا اور پھر مجھ پر وضو کا پانی ڈالا اور جب مجھے کچھ افاقہ ہوا تو میں نے عرض کی کہ میں وراثت کے لحاظ سے کلالہ ہوں۔میری میراث کیسے تقسیم ہوگی۔تو اللہ تعالیٰ نے آیت فرائض نازل فرمائی(2)۔بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ میراث کی آیت نازل ہوئی۔حضرت ابوزبیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ''یَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ'' میرے بارے میں نازل ہوئی۔اس طرح اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ یہ لوگ کلالہ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔کلالہ کے بارے میں مکمل بحث پہلے گزر چکی ہے۔یہ اکلیل (تاج) سے ماخوذ ہے جو سر کو تمام اطراف سے گھیر لیتا ہے اس لیے اکثر علماء نے اس کی تفسیر بیان کی ہے۔کہ اس سے مراد مرنے والا وہ شخص ہے جس کی کوئی اولاد ہو نہ باپ۔اور بعض نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ میت ہے جس کی کوئی اولاد نہ ہو۔جیسا کہ آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ: امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ پر بھی کلالہ کا حکم مشتبہ ہو گیا تھا۔جیسا کہ صحیحین میں ہے آپ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں کے بارے میں میری خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ ان کی وضاحت فرما دیتے۔1۔دادا کی میراث 2۔کلالہ 3۔سود کے ابواب(3)۔آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جتنا کلالہ کے بارے میں پوچھا ہے اتنا کسی اور کے بارے میں نہیں پوچھا۔حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگشت مبارک میرے سینے پر مار کر فرمایا تمہارے لیے سورۂ نساء کی وہ آخری آیت کافی ہے جو گرمیوں میں نازل ہوئی(4)۔ایک اور روایت میں فرماتے ہیں کہ اگر میں رسول اللہ ﷺ سے اس کی مزید وضاحت طلب کر لیتا تو یہ میرے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ پسندیدہ ہوتا۔حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا تمہارے لیے موسم گرما میں نازل ہونے والی آیت ہی کافی ہے۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ حضرت عمرؓ کو اس آیت کو سمجھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اس میں تمہارے لیے کفایت ہے اس لیے وہ اس کا معنی پوچھنا بھول گئے۔اس لیے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر میں اس کا معنی پوچھ لیتا تو یہ میرے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ پسندیدہ ہوتا(5)۔حضرت سعید بن مسیّبؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے نبی پاک ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ بیان نہیں کر دیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ سورۂ نساء کی ابتداء میں میراث کے بارے میں جو آیت نازل کی ہے وہ اس میت کے بارے میں ہے جس کی اولاد ہو نہ والد۔اور یہ دوسری آیت میاں بیوی اور ماں کی طرف سے بھائیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔اور سورۂ نساء کی آخری آیت سگے بہن بھائیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔اور سورۂ انفعال کی آخری آیت قریبی رشتہ داروں کے بارے میں نازل ہوئی۔

1۔البخاری:63/6 2۔مسند احمد:298/3 3۔البخاری:157/7،مسلم:60/6
4۔مسلم:345/8 5۔مسند احمد:26/1،مسلم:61/5 6۔مسند احمد:38/1

کلالہ کی بحث

اِنِ امۡرُؤٌا ھَلَكَ: ھلک کا معنی وہ مر گیا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ (القصص:88)۔ ''ترجمہ: یعنی اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے''۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ (الرحمٰن:26) ''جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے۔ باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات۔ جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے''۔

لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ: یعنی کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو۔ بعض مفسرین نے اس سے استدلال کیا ہے کہ کلالہ میں شرط یہ ہے کہ اس کی کوئی اولاد نہ ہو۔ والد کا نہ ہونا شرط نہیں۔ حضرت عمرؓ کا بھی یہی قول ہے۔ لیکن صحیح قول جمہور کا ہے اور حضرت ابوبکرؓ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد ہو نہ باپ۔ آیت کریمہ کے یہ الفاظ: وَّلَهٗۤ اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ ۚ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر بہن کے ساتھ باپ بھی ہوتا تو اس کو ترکہ سے حصہ نہ ملتا کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ باپ، بہن کو ترکے سے محروم کر دیتا ہے۔ تو اس طرح قرآن حکیم کی صریح نص سے ثابت ہوگا کہ کلالہ وہ ہے جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اسی طرح اشارۃ النص سے یہ ثابت ہوا کہ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ اس کا والد نہ ہو۔ کیونکہ میت کی بہن کو والد کے ساتھ نصف نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اس صورت میں کلی طور پر محروم رہتی ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک عورت اپنے خاوند اور سگی بہن کو چھوڑ کر مر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے ترکہ کا نصف خاوند کے لیے اور نصف اس کی بہن کے لیے ہے۔ جب آپ سے اس کا حوالہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی فیصلہ فرمایا تھا(1)۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بیٹی اور بہن چھوڑ کر فوت ہو جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کو نصف ملے گا۔ کیونکہ وہ اس صورت میں ایک بیٹی چھوڑ گیا ہے اور ولد کا اطلاق بیٹی پر ہوتا ہے۔ اس لیے بیٹی کی موجودگی میں بہن کو کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن جمہور صحابہ کرام نے اس مسئلہ میں ان کی مخالفت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بیٹی کو نصف ملے گا اور بہن کو بھی نصف ملے گا عصبہ ہونے کی وجہ سے اور اس کی دلیل حضرت اسودؓ کی روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بیٹی کے لیے نصف اور بہن کے لیے بھی نصف کا فیصلہ کیا(2)۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص بیٹی، پوتی اور بہن چھوڑ کر فوت ہو جائے تو میراث کیسے تقسیم ہوگی۔ آپ نے فرمایا بیٹی کے لیے نصف اور بہن کے لیے نصف ہے۔ پھر فرمایا جاؤ عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھ لو وہ بھی اس مسئلہ میں میری موافقت کریں گے۔ جب وہ شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں حضرت موسیٰ اشعریؓ کے فیصلے سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اس میں وہی فیصلہ کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ بیٹی کو نصف ہی ملے گا۔ پوتی کو چھٹا حصہ۔ اس طرح دو ثلث مکمل ہو جائیں اور جو باقی بچے گا وہ بہن کو ملے گا۔ جب حضرت ابوموسیٰ کو مسئلہ مذکور کے بارے میں اس رائے کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا جب تک تمہارے پاس یہ صاحب علم موجود ہے مجھ سے سوال نہ کیا کرو(3)۔

وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ ۚ: یعنی اگر بہن فوت ہو جائے اور اس کی نہ کوئی اولاد ہو نہ والد تو بھائی اس کے کل مال کا وارث ہوگا۔ کیونکہ اگر اس کا والد زندہ ہوتا تو اس صورت میں بھائی کو کچھ نہ ملتا۔ ہاں اگر بھائی کے ساتھ کوئی دوسرا مقرر حصے والا ہوتا جیسے خاوند یا ماں کی طرف سے بھائی۔ تو انہیں اس کا حصہ دے کر جو باقی بچتا ہے وہ بھائی کو دے دیا جاتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فرائض کو ان کے اہل کے ساتھ ملاؤ اور جو باقی بچے وہ اس مرد کا جو سب سے زیادہ قریب ہو(4)۔

1۔ تحفۃ الاحوذی: 406/8 2۔ مسند احمد: 188/5 3۔ البخاری: 189/8 4۔ البخاری: 188/8

فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ : یعنی اگر کلالہ کے طور پر مرنے والے کی دو بہنیں ہوں تو ان کو دو ثلث ملے گا۔ اسی طرح اگر دو سے زیادہ ہوں تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض فقہاء نے دو بیٹیوں کے حصے کا حکم اسی سے اخذ کیا ہے۔ جس طرح کہ دو سے زائد بہنوں کے ترکے کا حکم بیٹیوں کے ترکے حکم سے اخذ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (النساء:11) اسی طرح ارشاد فرمایا: وَإِنْ كَانُوٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ یہ حکم بیٹوں، پوتوں اور بھائیوں کے عصبہ ہونے کے لحاظ سے ہے کہ جب ان میں مذکر و مونث جمع ہو جائیں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ :یعنی اللہ تعالیٰ میراث کے مسائل کو تمہارے لیے بیان فرماتا ہے۔ اپنی حدود کو مقرر کرتا ہے۔ اور شریعت کے احکام کو بالکل واضح کر کے بیان فرما دیتا ہے۔

أَنْ تَضِلُّوا : یعنی یہ اللہ تعالیٰ اس لیے بیان فرماتا ہے تاکہ تم اس بیان و وضاحت کے بعد حق سے بہک نہ جاؤ۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ :یعنی وہ تمام امور کے عواقب، انجام اور ان کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے بندوں کے لیے کسی چیز میں بھلائی ہے اور کون مرنے والی کی وراثت کا حقدار ہے۔ حضرت محمد بن میرین روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ہمراہ کسی سفر پر جا رہے تھے۔ حضرت حذیفہؓ کی اونٹنی کا سر رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کے کجاوے کے قریب تھا اور حضرت عمرؓ کی اونٹنی کا سر حضرت حذیفہؓ کی اونٹنی کے سر سے ملا ہوا تھا۔ اسی حالت میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ حضرت حذیفہ کو سنا دی اور انہوں نے حضرت عمر کو۔ اس کے بعد جب عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا قسم بخدا! میں نے جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا وہ تمہیں سنا دیا۔ قسم بخدا! میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ حضرت عمرؓ یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے باری تعالیٰ! اگرچہ تو نے اس حکم کو ان کے لیے واضح کر دیا ہے لیکن یہ میرے لیے واضح نہیں ہوا۔ لیکن یہ روایت منقطع ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں حضرت حذیفہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تھا۔ حضرت سعید بن میتب فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کلالہ کی میراث کے بارے میں دریافت کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ شاید حضرت عمرؓ اسے صحیح طور پر سمجھ نہ پائے۔ اس لیے آپ نے حضرت حفصہ سے کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ طبع مبارک خوشگوار ہو تو اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھنا۔ جب انہوں نے حضور ﷺ کی طبیعت کو خوشگوار پایا تو آپ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا شاید تمہارے والد نے یہ پوچھنے کے لیے کہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طریقہ سے صحیح طور پر سمجھ سکیں گے۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے۔ ہاں میں اس کو صحیح طریقے سے سمجھ نہیں سکا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب حضرت حفصہ نے رسول اللہ ﷺ کلالہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اونٹ کے شانے کی ہڈی کے اوپر آیت لکھوا دی اور فرمایا کہ تمہیں تمہارے والد نے یہ پوچھنے کے لیے کہا تھا۔ کیا ان کے لیے موسم گرما میں نازل ہونے والی آیت کافی نہیں۔ اور موسم گرما کی آیت سے مراد سورۂ نساء کی یہ آیت ہے: وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ (النساء:12) جب صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا تو سورۂ نساء کی یہ آخری سوت نازل ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ طارق بن شہاب فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اونٹ کے شانے کی ہڈی لی اور صحابہ کرام کو جمع کیا اور فرمایا کہ آج میں کلالہ کے بارے میں ایسا فیصلہ کروں گا کہ پردہ نشین عورتوں کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں ایک کمرے میں ایک سانپ نکل آیا جس کو دیکھ کر تمام لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امر کو

مکمل کرنے کا ارادہ فرماتا تو میں اس کو مکمل کر دیتا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگر میں رسول اللہ ﷺ سے تین باتوں کے بارے میں پوچھ لیتا تو یہ میرے لیے تین سرخ اونٹوں سے زیادہ پسند ہوتا۔ 1۔ آپ کے بعد خلیفہ کون ہوگا۔ 2۔ وہ لوگ جو زکوٰۃ کے قائل تو ہیں لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کرتے کیا ان کے ساتھ جہاد کرنا جائز ہے۔ 3۔ کلالہ (1)۔ اسی مفہوم کی ایک اور روایت اس سے مروی ہے جس میں زکوٰۃ کی جگہ سود کا ذکر ہے حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے آخری وقت ان کے پاس موجود تھا میں نے ان سے سنا کہ بات وہی صحیح ہے جو میں کہتا ہوں۔ میں نے عرض کی آپ کیا فرماتے ہیں فرمایا کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو۔ ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ میرا اور ابوبکرؓ کا کلالہ میں اختلاف ہو گیا اور بات وہی تھی جو میں کہتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے سگے بھائیوں اور ماں کی طرف سے سگے بھائیوں کو جب کہ وہ جمع ہوں ثلث میں شریک کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اس کے خلاف تھے۔ حضرت سعید بن مسیّب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دادا کی میراث اور کلالہ کے بارے میں ایک کاغذ پر لکھا اور پھر آپ نے اللہ سے استخارہ کیا اور یہ دعا کی اے اللہ! اگر اس میں کچھ بہتری ہے تو اس حکم کو نافذ فرما دے حتیٰ کہ جب آپ کو زخمی کیا گیا تو آپ نے وہ کاغذ منگوا کر مٹا دیا اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں کیا لکھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس کاغذ میں دادا کی میراث اور کلالہ کے بارے میں لکھا تھا اور اللہ تعالیٰ سے استخارہ بھی کیا تھا لیکن میرا خیال ہے میں تمہیں اس چیز پر چھوڑ دوں جس پر تم ہو۔ آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ مجھے حیاء آتی ہے کہ اس مسئلہ میں ابوبکر کی مخالفت کروں۔ حضرت ابوبکر صدیق فرمایا کرتے تھے کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد ہو نہ والد۔ اور یہی قول جمہور صحابہ کرام، تابعین ائمہ اربعہ اور افقہائے سبعہ کا تھا۔ اور اسی پر قرآن کی دلالت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی۔ ارشاد فرمایا: یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ واللہ اعلم۔

تَمَّتْ بِعَوْنِہٖ تَعَالٰی وَ بِجَاہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ

1۔ البخاری: 178/8، مسلم 59/5

خوشخبری

معروف محدث ومفسر حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا عظیم شاہکار

تفسیر مظہری (مکمل دس جلدیں)

جس کا جدید، عام فہم، سلیس اور مکمل اردو ترجمہ "ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف"

نے اپنے نامور فضلاء جناب الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان صاحب

جناب الاستاذ سید محمد اقبال شاہ صاحب اور جناب الاستاذ محمد انور مگھالوی صاحب

سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے

الحمد للہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اس علمی کارنامے کو شاندار معیار طباعت کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

تفہیم قرآن کریم کے لئے شائقین ہر اچھے بک سٹال سے طلب فرمائیں۔